ناگر میگزن

ایڈیٹر عبدالباسط ایم اے (علیگ)

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

عبدالباسط ایم اے علیگ

سکرٹری :- محمد حسین خاں بی اے (علیگ)　　اسسٹنٹ ایڈیٹر :- جلیل احمد (علیگ)

ہزہائینس نواب کرنل حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر
بی-اے (علیگ) سی-ایس- آئی- سی- وی- او
فرماں روائے بھوپال

اورنگِ بھوپال

پر

نونہالِ علی گڑھ

بشریٰ فقد انجز الاقبال ما وعدا
وکوکب المجد فی افق العلےٰ صعدا

الحمد للہ کہ اُس حق کو کارفرمائے ازلی نے جس منتخب ہستی کے لئے مقدر فرما دیا تھا اس کے بحق دار پہنچ جانے کا اعلان کر دیا گیا۔ یعنی شہزادۂ عالی مقام جناب حاجی **حمید اللہ خان والاشان** وارثِ تخت و تاج حکومتِ بھوپال بنائے گئے۔

خدائے علیم و بصیر روزِ اول سے ہر فرد بشر کی قابلیت واستعداد سے واقف ہوتا ہے اور اپنی چشمِ ہمہ بیں سے ہر امر کی صلاح و فلاح کو معائنہ فرما لیتا ہے۔ وہ اہلِ دنیا کے مدتِ تصور سے بھی بہت قبل یہ فیصلہ فرما چکا تھا کہ علیا حضرت ثریا مرتبت والاجاہ نواب سلطان جہاں بیگم فرمانروائے سلطنت بھوپال جانشین سلطنت کی حکمرانی کے لئے بیگم صاحبہ کے سب سے چھوٹے فرزند دلبند کو ہونا چاہیے۔ چونکہ کارکنانِ قضا و قدر نے اس ملک بھوپال کی جہانبانی و پاسبانی کے لئے بیگم صاحبہ دام اقبالہا کے سب

خُردبخت جگر کے ہی دل میں طاقت اور دماغ میں صلاحیت اور راز سراپا اہلیت ملاحظہ کرلی تھی لہذا یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ ازلی حکم، وہ خداوندی انتخاب، وہ منشاء الٰہی تبدیل کیا جاسکتا۔

وہ دنیا کی کونسی طاقت اور کونسا جذبہ ہوسکتا تھا جو بیگم صاحبہ کو ایک لمحہ کے لئے بھی تائید الٰہی کے الہامی تلقین سے منحرف ہونے کی زراسی بھی جرأت دلا سکتا؟ اس تائید غیبی نے حضرت عالیہ موصوفہ کو اس کبرسنی اور ضعیفی میں سات سمندر پار ایوانِ حکومت برطانیہ تک بھیجنے پر مجبور کیا۔ اور یہی وہ تائید غیبی تھی جس نے اپنی پوری شان و شوکت اور دبدبہ و جلال کے ساتھ وزراے برطانیہ کے دماغوں کو متاثر کیا۔

اس اعلان کو جو آج شاہ برطانیہ کے قلم و زارت سے لکھا گیا ہے ہم وہ فیصلہ ناطق سمجھتے ہیں جو کل شہنشاہ عالم و عالمیان اپنی واحد قدرت کاملہ سے لکھ چکا تھا۔

قابل صد تحسین ولائق ہزار آفرین ہے علیا حضرت کی وہ ہمتِ شجاعانہ اور عملِ فرزانہ جس کا ثبوت ممدوحہ عالیہ نے اس ولیعہدی کے معاملہ کی سعی و کوشش میں ظاہر فرمایا۔

ہر چند کہ وابستگان علی گڑھ اور علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک ایک فرد اور ہر ہر ذرہ کو بیگم عالی مقام کے جوبلی کے زرّیں موقع پر رونق آرائے مجلس اور عزت افزاے جشن نہ ہونے کا تاحیات رنج و افسوس رہے گا

لیکن اب ممدوحۂ فاضلہ کی اس شادمانی و کامرانی کے مژدہ سے علی گڑھ اور علی گڑھ کے تمام متوسلین فرط انبساط و وفور نشاط سے اپنے دلوں کو لبریز پاتے ہیں۔

علیا حضرت کی رعایا پروری، نسواں نوازی، علم دوستی، خدا پرستی اور ملک و ملت کی

خدمت و ہمدردی کا وہ کوس افسانہ ہی جو چاردانگ عالم میں بج رہا ہی جس عقل و فراست، شان و شوکت اور خیر و برکت کی حمایت کے ساتھ بھوپال کا تاج زیب فرق مبارک فرما کر دنیائے نسواں میں پیش کیا ہی وہ دنیا کے مردوں کے لئے بھی ایک سبق آموز اور پسندیدہ نمونہ فرخندہ ہی۔ اگر ایسی لائق ماں کو ایسا ہی لائق فرزند جانشینی کے لئے ملا ہی تو نہ صرف بیگم صاحبہ قابل صد ہزار مبارک باد ہیں بلکہ جملہ مسلمانانِ ہند مستحقِ خوش بختی ہیں۔

شہزادہ بہادر حاجی **حمید اللہ خاں** دام اقبالہ نے جو علمی اور عملی قابلیت علی گڑھ کا ... کی

اور جن احسن کارگزاریوں کا ثبوت بھوپال کے سرکاری اعلیٰ عہدوں

ممتاز اور بلند پایہ حیثیت اپنے اندر رکھتا ہی شہزادہ بہادر موصوف علی گڑھ

لائق ترین فرزند اور حرمین شریفین کے حاجی ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہ...

ماں کے لائق پوت بیٹے اور سچے حاجی رہیں۔

ہم نہایت ادب و احترام اور دلی جوش و مسرت کے ساتھ علی گڑھ، علی گڑھ یونیورسٹی، علی گڑھ اولڈ بوائے علی گڑھ کے زمین و آسمان اور یہاں کی فضا کے ایک ایک ذرہ کی طرف سے مادر مشفقہ عالیہ محترمہ اور پسر گرامی تابندہ کی خدمات میں فرزندانہ اور برادرانہ گلدستۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

اگر بھوپال کو یہ فخر ہی کہ اس کا تاج ایک محبوب اور ہوشمند کے سر پر زیب دیا جائیگا، تو علی گڑھ کو بھی آج یہ ناز ہی کہ اورنگ بھوپال پر ایک حمیدہ صفات علیگ جلوہ فرما ہوگا۔

اس موقع پر ہم جناب ممدوح کے اس زمانہ کی تصویر جب کہ وہ اس درسگاہ میں تعلیم پاتے تھے نہایت مسرت کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

عبد الباسط
ایڈیٹر

قطعۂ تاریخ

ذیل کا قطعۂ تاریخ ہم کو جناب محمد حاذق صاحب بی اے ایل ایل بی نے مرحمت فرمایا ہے
موقع اور وقت کے لحاظ سے بہت موزوں ہے اس لیے ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں

پرنس آں حمید اللہ ذی حشم — کہ باشد بتانِ شہی مستحق
بباید بہ توصیفِ او دفترے — نشاید بمدحش چنیں یک ورق
ولی عہدِ تختِ بھوپال یافت — بالطاف و اکرامِ ربِّ الفلق
نہ چوں ارضِ بھوپال بالد بریں — کہ دیدش چنیں طرحِ نظم و نسق
علی گڑھ بنازد بریں مژدہ ہم — کہ بردا و زمیدانش گوئے سبق
نویدِ طرب روے ہر کس شگفت — فلک برخش بستہ رنگِ شفق
ز اکنافِ عالم ہدایا رسید — بدرگاہِ والا طبق بر طبق
تہی دست حاذق بشانِ نیاز — بنازد کہ بودش با وہم سبق

درین خرمی بہرِ تاریخ او
رقم زد ـ بجدار بخشیدہ حق

۱۳۴۴ ھ

بھوپال دارالشرف والاقبال

(از قاضی جلال)

شہر بھوپال جو عوام الناس میں بھوپال تال کے نام سے معروف ہے اس نامور ریاست کا دارالحکومت ہے جو
جغرافی حیثیت سے ہندوستان کا قلب، دکن کا دماغ اور مالوہ کی جان ہے۔ مناظر
باصرہ نواز کو ہندوستان کا تفریح گاہ کہیں تو نادرست نہ ہوگا۔ برف آلود چوٹیو
ساحل بحر کی موج ریزیوں کو نظر انداز کرکے اور کوئی شان دار نظارہ عدود ر
تماشائے قدرت کو سیر نہ کردے اور سیاحان روئے زمین کے دامن تمنا کو گلہائے مراد سے پورم پور نہ بھردے۔
ریاست کیا ہے ایک رفیع الشان فراغ منظر قدرتی پارک ہے جس کی لطافت، جس کی سرسبزی۔ اور جس کی
بلندی و پستی قابل دید ہے نہ لائق شنید۔ سطح مرتفع پر جا بجا پُر پیچ پہاڑیاں گویا حسن فطرت کا اُبھار ہیں اور چوڑی
چکلی تالیں اُن کی دراز دامنی کا معیار۔ سوئٹزرلینڈ اپنی سمندر نما جھیلوں پر اتراتا ہے لیکن بھوپال کے تالوں کی
یہ خصوصیت ان میں کہاں کہ با وجود پہنائی وہ اپنے چولی اور دامن ایک ساتھ دکھلاتے ہیں۔ حالانکہ سوئٹزرلینڈ
کے بحر نما جھیلوں کے پرلے کنارے دائرہ نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جنگل ثمردار درختوں سے لدے پھندے۔
فراز و نشیب اناج کے کھیتوں سے ہرے بھرے۔ جہاں کہیں آبادی کی قلت سے تھوڑی بہت جگہ خالی ہے۔ وہاں
مشاطۂ قدرت نے نئے نئے سنگھار کی طرح ڈالی ہے۔ جگہ جگہ ندی نالے۔ قدم قدم پر سوت اور چشمے عروس بہار کی
زیب و زینت بنے ہوئے ہیں۔ جنگلات کے فلک بوس درخت گویا دوسرے صوبوں کے سربلند اشجار سے مقابلہ
کے لئے تنے ہوئے ہیں۔ نظر فریب وادیوں میں گنجان جھاڑیاں۔ جھاڑیوں میں شیروں کی کچھار۔ خوش منظر گھاٹیوں میں
لہلہاتے سبزہ زار۔ ان میں سانبر کے غول اور ہرن اور چکارے قطار در قطار گویا شکاریوں کی جنت نگاہ

بھوج پال ٹھیرایا جس کا سلیس تلفظ بھوپال ہوا۔ ایک صاحب کی رائے میں بھوپال کا ماخذ بھوپالہ ہے جو
کے نام نامی سے نسبت رکھتا ہو۔ غرض اس کا بانی کوئی بھی ہو تاریخی حیثیت سے میں اس کو شہر روضۃ الکبریٰ
ں کی فہرست میں شامل کرتا ہوں کیونکہ جس نظر انتخاب نے اٹلی کے سات پہاڑوں کو منتخب کرکے اس
لاجواب شہر کی بنا ڈالی اسی طرح شہر بھوپال جدید کی معمار اول بانی ریاست سردار دوست محمد خاں نے
ہی سات آٹھ پہاڑیوں کے متصلہ جھنڈ کو چھانٹ کر ۱۷۲۲ء قلعہ فتحگڈھ کی تعمیر کی۔ اس کے گرد شہر
حسن وخوبی کے لحاظ سے آج عروس ہند بنا ہوا ہے۔ اس اسلامی ریاست کی (خدا اس کو تا ابد قائم رکھے)
رنگ زریں بنیاد پڑی۔ خاندان حکومت کے مورث اعلیٰ عالی جناب سردار دوست محمد خاں صاحب مرزائی
مالکن موضع گنداسرحدی علاقہ تیراہ کے ورکزئی افغان کو پرگنہ بیرسیہ عطیہ شاہی میں ملا اور جس پر وہ بعد وفات
عالمگیر ۱۷۰۷ء سے ۱۷۲۲ء تک قابض رہے۔ سردار مرحوم اپنے والد ماجد سردار نور محمد صاحب کی معیت
سنہ جلوس عالمگیری (۱۶۹۶ء) میں وارد ہندوستان ہوئے اور اپنے قبیلہ کی نو آبادی لوہاری جلال آباد
ضلع مظفر نگر میں قائم کی۔ بعد ازاں لشکر شاہی دہلی میں شامل ہو کر مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے مالوہ آئے ہوئے
چند سال مالوی راجاؤں کو اپنی فوجی خدمات سے مدد دی۔ ان دنوں بیرسیہ دہلی کے ایک شخص تاج محمد کے
میں تھا جس کے کارندے بوجہ مرہٹی تاخت کے انتظام سے قاصر رہے تا آنکہ سردار موصوف نے بعد وفات
وہاں کے نظم ونسق کی ذمہ داری قبول کی اور اپنے جواں ہمت اور جنگجو قبیلہ کی مدد سے اطراف وجوانب کے
نوں پر اپنی سطوت اور جبروت کا سکہ بٹھا دیا۔ جگدیش پور کو فتح کرکے اس کا نام اسلام نگر رکھا اور اسی کو قلعہ بند
کے اپنا دار الصدر اور مستقر ٹھیرایا۔ حکومت مغلیہ کی پر آشوب حالت اس بدامنی کے زمانہ میں اس درجہ کو
پہنچ چکی تھی کہ خود براہ راست وہاں کے تسلط سے قاصر رہ کر حکومت دہلی نے ایک محال شاہی کا اجارہ سردار
دوست محمد خاں مرحوم کے حوالہ کیا۔ اس بہادر سردار کی طاقت یوماً فیوماً آندھی دھاندی کی طرح بڑھتی گئی
کہ اس کی جنگ آزما فوجیں محمد فاروق گورنر بھیلسہ کے لشکر سے جا بھڑیں لیکن اس جنگ میں سردار ممدوح
کے بھائی شیر محمد خاں مقتول ہوئے اور قریب تھا کہ حملہ آور فوج منتشر ہو جائے کہ کمینگاہ سے دوست محمد خاں صاحب
تازہ دم سواروں کے ساتھ محمد فاروق کے دستہ پر جا پڑے اور اس کو ملک عدم کے بحر احمر میں ڈبا کر

ریزی ہاتھی پر قبضہ کیا اور نہایت گرم جوشی اور فاتحانہ طمطراق کے ساتھ طبل فتح اور شادیانۂ نصرت بجواتے ہوئے
بھیلسہ کا رخ کیا۔ رعایا اور قلعداروں نے سمجھا کہ فاروق صاحب فتح کا ڈنکا بجاتے واپس آئے فوراً دروازے
کھول دیئے اور بلا خوں ریزی و شمشیر زنی بھیلسہ کا قلعہ افغانی حکومت میں آگیا۔ اس کے قبضہ سے سردار موصوف کا تسلط
[illegible] سیہور تک ہوگیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ سید حسن علی خاں کا دور دورہ ہے۔ حضرت نظام دکن پر
مسلط ہیں اس لئے دونوں میں سیاسی رقابت ہے۔ کوٹہ کا راجہ سیدوں کا طرفدار ہے اور بوندی والا ان کا مخالف ہے
چھترسال بندیلہ کو اپنا ہمدرد بنالیا ہے۔ چنانچہ محرم ۱۱۳۲ھ (۱۷۱۹ء) میں سردار دوست
دلاور خاں اور راجہ نروار کے متحدہ فوجوں نے بوندی کی جانب باگ اٹھائی اور
پر قیامت ڈھائی جس سے شرقی جانب کے علاقہ پر تصرف کیا۔ [illegible]
منہ کی کھائی۔ ادھر شجاع پور کے [illegible] مشہور ہوگیا [illegible] انتظامات افغانی سردار کے [illegible]
راجہ کی جو شامت آئی اس نے رانی کملاپتی کے شوہر نظام شاہ والی گنور گڈھ کو شہید [illegible] مسموم کیا۔ رانی نے دوست محمد
خاں کے ذریعہ اس سنگ دل قاتل سے انتقام لیا۔ [illegible] ریاست ہوا اور بالآخر رانی کے بعد گنور گڈھ بھی سردار
کے ظل حمایت میں آگیا۔ اب سردار ممدوح نے نوابی کا خطاب اختیار اور حکومت خود اختیاری کا اظہار کیا لیکن
میں شمالی جانب سے ایک طوفان اٹھا۔ نظام نے حیدرآباد کے لیے بیٹے ناصر جنگ کی بغاوت دبانے جاتے
وقت مالوہ کے تاخت اور نواب بھوپال کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ اسلام نگر کے قریب نظام کی ٹیکری اسی نظامی عسکر
کی یادگار ہے۔ شاہی فوج کی تاب مقاومت نہ پاکر نہایت دوراندیشی سے اپنے بیٹے یار محمد خاں کو بطور یرغمال حوالہ
کرکے اس طوفان خوں بار سے نجات حاصل کی۔ بالآخر ایک سپاہی جو محض ایک تلوار، اپنا قوت بازو اور تائید
ایزدی لے کر مالوہ میں یکہ و تنہا داخل ہوا تھا وہ تیس سال کی محنت و جفاکشی اور قیود ملک گیری اور ملکداری کے
سنگلاخ مراحل اور منازل طے کرکے ۶۶ سالہ عمر پاکر ۱۷۲۶ء میں راہی ملک بقا ہوا۔ لیکن اپنے جانشینوں کے
لئے ایک مستحکم، منتظم، مامون اور مصئون ریاست چھوڑ گیا جس کا مزار متصل دروازہ بالا قلعہ ایک ایسے افغانی سپاہی
کی روح فاتحہ خوانوں کے دلوں میں پھونکتا ہے جو نہ صرف صاحب سیف تھا بلکہ صاحب سیاست بھی۔ جس نے اس پُرآشوب

طوفاں خیز زمانہ ہر بونگ میں اس ریاست کی ایسے طالع سعید میں بنا ڈالی جو زمانہ کی مخالف ہواؤں اور
اب کے مہلک تھپیڑوں سے محفوظ رہتی آئی اور آج وہ ہر اعتبار سے مسلمانانِ ہند کے لئے بالخصوص مایۂ فخر اور
یۂ ناز ہے۔ سردار مرحوم کے پانچوں بھائی وہ جنگ آزما اور شیر نیستانِ دلاوری تھے جنھیں سے ایک نے بھی فرش
بن پر جان نہ دی بلکہ ایک ایک کر کے میدان جدال و قتال میں شربت شہادت نوش فرمایا۔ بعد وفات
ب دوست محمد خاں ارباب دربار نے ان کے ہشت سالہ بیٹے سلطان محمد خاں کو مسند نشیں کیا۔ لیکن حضرت
ام نے سردار یار محمد خاں کی یاوری کی اور ماہی و مراتب اور طبل و علم عطا کر کے ایک فوج قاہرہ کے ساتھ بھوپال روانہ کیا۔
جو باسانی اپنے چھوٹے بھائی کو مسند انداز کر کے ریاست پر مسلط ہو گئے اور سترہ سال تک حکومت آپ کے
م جاری رہا۔ ۱۷۳۹ء میں ہندوستان کے دو صد سالہ مغلیہ سلطنت کا ستارہ جو شاہنشاہ دین پناہ عالمگیرؒ کی وفات
نصف النہار اقبال و اجلال پر پہونچکر مائل بہ ہبوط ... نادری حملے اور باجی راؤ کے ہاتھوں نظام کی شکست سے
بد سریع السیری کے ساتھ ڈوبنے لگا۔ صوبے خود بخود خود مختار ہو گئے لہٰذا بھوپالی حکومت کی آزادی میں نسبتاً اور
ی اضافہ ہوا۔ یار محمد خاں صاحب کا عہد توسیع ریاست کے مسئلہ میں برابر کامیاب رہا۔ ان کے بعد نواب
فیض محمد خاں صاحب بعمر یازدہ سال ۱۷۴۲ء میں اپنے باپ کے جانشین ہوئے اور ... تک ۲۲ برس تمام
حکومت آپ کے ہاتھ میں رہی۔ آپ کے عہد میں دیوان بیجے رام کا عہدۂ وزارت پر متمکن رہنا اسلامی رواداری
کی ایک تاریخی مثال ہے۔ جانشینی کے وقت بھوپال کے چند ارباب حل و عقد نے سلطان محمد خاں صاحب کو مسند آرا
کیا لیکن وزیر باتدبیر کی بروقت دلیری سے انھیں ناکامی نصیب ہوئی۔ بالآخر مولائی بی صاحبہ کی بزرگانہ دست اندازی
سے قصہ رفع دفع ہو گیا اور مذکور الاول کو راحت گڈھ کی جاگیر دے کر رضامند کر لیا گیا۔ اس وقت تک قلعہ رائسین
مقبوضات دہلی میں شامل تھا۔ نواب فیض محمد خاں کے لشکر نے اس کے خواجہ سرا گونر کو قتل کر کے فتح کر لیا اور
فرمان شاہی کی رو سے قلعہ مذکور معہ علاقہ معمور نواب صاحب کو تفویض کر دیا گیا۔

۱۷۴۵ء میں علاقہ سیہور، آشٹہ، اچھاور، بھیلسہ وغیرہ مرہٹوں کے دست برد میں آیا لیکن ۱۷۶۱ء کی جنگ
پانی پت نے ان کا زور توڑ دیا اور ہمیشہ کے لئے علاقہ ان کی تاخت سے محفوظ ہوا۔ بجے رام کا جانشین دیوان
[illegible] الاشہاد [illegible] طرفداری کا سکہ بجایا۔

ذبیحہ گاؤ حکماً مسدود کیا۔ پٹھان شرفا کو نجبہ عقوبت میں لیا۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد کے اصول پر دو بگڑے دل پٹھانوں نے
دیوانجی بہادر کو گھاٹ کا راستہ دکھلایا۔ مقتول کی جگہ غیرت خاں کو دی گئی لیکن وہ بھی سیاسی شہادت کے جام سے شیریں
کام ہوئے۔ پھر ان کے قائم مقام ایک لالہ صاحب قوم کے کایستہ کامیاب وزیر ثابت ہوئے۔ بالآخر ... سال کے بعد
ان کا بھی وہی حشر ہوا جو گھاسی رام جی کا ہوا تھا۔ نواب محمد فیاض خاں عزلت پسند ... قوی ... فت
بلند لیکن دل کے نرم اور شریف المزاج حاکم تھے۔ بعد ازاں ان کے بھائی حیات
حسب معمول ممولا بی بی نے جانشینی کے مدعیوں سے جھگڑا چکایا۔ آپ بھی بالطبع
گونڈا و برہمن آپ کی دست حق پرست پر داخل دائرہ اسلام ہوئے اور ان میں سے
وزارت کی کرنیل گوڈارڈ کی شہورت ... ۱۷۷۸ء براہ بھوپال فولاد خاں کے عہد وزارت میں ہوئی اور کو
کسی عہدنامہ کی پابندی ریاست پر عائد نہ تھی پھر بھی با وفاداری نیت سے ریاست نے فوج انگریزی کی ہر طرح مدد
کی اس کی بابت ایک دمہ دار کرنیل کی رائے ہے کہ وہ فیاضانہ مہربانی کبھی بھی لائق فراموشی نہیں۔ یہ زمانہ مرہٹوں بلکہ یعنی
پنڈاریوں کے عروج کا تھا۔ فولاد خاں قتل کیا گیا اور دوسرے نومسلم جوان چھوٹے خاں کو قلمدان وزارت سپرد ہوا اس نے
پنڈاریوں سے ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ وہ بندہ بے دام بن گئے اور بھوپال ان کی زد سے کچھ عرصہ کے لئے مامون
ہو گیا لیکن اس کی سخت گیری پٹھانوں کو اس قدر تکلیف دہ ہوئی کہ ایک رکن خاندان نجات خاں نام عید الفطر کے
دن ممولا بی بی کے محل میں نواب صاحب سے ملاقی ہوئے اور شکایت کرتے کرتے خنجر سے ان پر حملہ کرنا چاہا۔
لیکن ایک جاں نثار چوبدار کے عصائے نقرئی کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ پل جو اس قدر پائیدار ہے اس چھوٹے خاں
کی یادگار رہی۔ وزرا میں مرید محمد خاں کے ظلم وستم کی داستانیں زبان زد خلایق ہیں جس سے بالآخر تنگ آ کر نواب صاحب
نے اس کی خدمات سے سبکدوشی چاہی لیکن مرہٹے اور امیر خاں اس کے طرفدار تھے۔ مرید نے اسلام نگر کا قلعہ
مرہٹوں کو دے دیا۔ امیر خاں اور صوبہ دار بالا راؤ قبضہ کے لئے بڑھے لیکن موتی بیگم ہمشیرہ حیات محمد خاں کی دلیری نے
بر وقت کام دیا۔ قلعہ سے گولہ باری ہوئی جس کی تاب نہ لا کر مرہٹے اور پنڈاری پسپا ہوئے اور چالیس ہزار فوج کے
سایہ میں بھوپال کے مقابل خیمہ زن ہوئے۔ بہادر نواب بھی افغانی دلیری کے ساتھ مقابلہ کے لئے تیار ہوا اور اس
میدان میں جہاں آج باغ دل کشا وغیرہ واقع ہیں صف آرائی کر کے مرہٹوں کے اس ٹڈی دل کو شکست دی سنگدل

یہ محمد بھی سرونج کی طرف فرار ہوا لیکن وہاں مقید ہوجانے پر ریزہائے الماس کے ذریعہ خودکشی کرڈالی۔ بھوپالیوں
کے دل میں اس شخص کی نفرت اس رہم سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ تک ان میں سے جب کوئی سرونج جاتا تو مرید خاں کی
قبر پہ پانچ مرتبہ کفش کاری کئے بغیر واپس نہ آتا۔ دلاورزماں وزیر محمد خاں نے البتہ وزارت سنبھالا قلعہ رائسین کو واپس
لیا، ہوشنگ آباد پر ڈورے ڈالے لیکن چندہی روز اس پر متصرف ہوسکے۔ پنڈاری سردار کریم خاں سے سازش کی
چپانیر چیتو کو بودوباش کے لئے دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بازوئے قلعہ شکن نے آشٹہ، سیہور، دوراہہ، دیواس
بار دگر حدود بھوپال میں شامل اور ضلع سیونی تک پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ باوجود اس کے اس آشوب زمانہ کی کیفیت
اس واقعہ سے عیاں ہے کہ آمدنی کے لحاظ سے ریاست کی آمدنی صرف پچاس ہزار روپیہ سالانہ تک گرگئی تھی۔
میں غوث محمد بن نواب حیات محمد خاں نے وزیر کے عروج زیر اقتدار سے خائف ہوکر پنڈاریوں اور سیندھیا کی
مدد چاہی۔ قلعہ اسلام نگر اور ۴ لاکھ نقد اور کچھ سالانہ کی چاٹ لگائی۔ شرطیں قبول ہوئیں لیکن سندھیا نے کوئی
عملی حصہ نہ لیا۔ اس کشمکش میں نواب صاحب کا پیمانہ عمر لبریز ہوکر نومبر ۱۸۰۷ء میں چھلک گیا۔ غوث محمد خاں صاحب
مسند نوابی پر متمکن ہوئے لیکن زمام حکومت بدستور وزیر صاحب کے پنجہ فولادی میں رہی۔ نواب صاحب نے صادق
بھونسلوی جنرل کی مدد سے وزیر کو گنور گڈھ چلے جانے پر مجبور کیا لیکن دبیر باتدبیر چندہی روز میں بھوپال واپس آئے
اور نواب صاحب کو نشانہ طعن وتشنیع بنایا۔ آپ نے عذر کیا کہ فلاں فلاں عمال کی صلاح سے ایسا ہوا چنانچہ وہ صلاح کار
پکڑے آئے۔ لالہ جی مصطفےٰ اور لالہ جی روپ چند کو ہاتھیوں سے روندوایا اور بخشی منی لال اور منشی سورج مل کو
وہاں توپ کا لقمہ بنوایا۔ اگلے سال امیر خاں کی معیت میں ساگر پر حملہ کیا۔ نواب صاحب آخر نہیں اور ایک ہی سال میں
ان کو کنارہ کش ہونا پڑا۔ مرہٹوں کا زور سندھیا اور بھونسلا کے جوڑ توڑ، پنڈاریوں سے سازباز اور ان کی تگ وتاز سے قریب تھا
کہ نصیب اعدا بھوپال ہاتھ سے نکل جائے لیکن وزیر محمد خاں کے زور بازو اور مافوق البشریت تگ و پو نے دشمنوں کے دست برد
سے اپنی ریاست ابدمدت کو بچایا۔ اپنی جسارت اور قابلیت کا ڈنکا بجایا۔ ۱۸۱۴ء میں نواب مذکور نے ایسٹ انڈیا کمپنی
سے معاہدہ کی طرح ڈالی لیکن بوجوہ اس کی تکمیل معرض تعویق میں ہی رہی تاآنکہ مارچ ۱۸۱۶ء میں وزیر محمد خاں صاحب
نے بعمر ۵۱ سال اس عالم دار وگیر کو خیرباد کہا۔ عالم بقا کا راستہ لیا۔ سرجان مالکم صاحب مرحوم کے اوصاف گستری میں
رطب اللسان ہیں اس شر انگیز اور بلاخیز عہد میں بقول صاحب موصوف وزیر محمد خاں جیسے افغان کا ہی کام تھا کہ

اس ریاست کو تموج انقلاب و گرداب شورش سے بچا سکے اور اپنے شکستہ جہاز کو ایک تدبر سیاسی ہمند
میں ناخدائی کر کے ساحل امن و سکون پر لگا سکے۔ نواب مرحوم نے اپنے دوسرے صاحبزادہ نظر محمد خاں کی پیشانی پر
جوہر قابلیت کا ستارہ چمکتا ہوا دیکھ لیا تھا اس لئے انھیں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی اور یہی ہونہار [illegible] یگانہ روزگار
فرزند [illegible] بھوپال کا وارث قرار دیا گیا۔ اس نونہال گلشن کامگاری کی شادی [illegible]
نواب غوث محمد [illegible] نواب [illegible] کا م انگریزوں سے عہد نامہ [illegible]
میں [illegible] قریب اور رفیق [illegible] سرکار کمپنی کی طرف سے [illegible] لارڈ ہیسٹنگز کے [illegible]
حسب ذیل تھے۔

پیمان دوستی نسلاً بعد نسل ہر کہ دشمن [illegible] ریاست مذہب سرکار ذوی الاقتدار [illegible] عقیدت
از طرف بھوپال وفا شعار [illegible] باواسطہ [illegible] استعانت و اخلاص مندی [illegible]
[illegible] آویزش اور خانہ جنگی سے احتراز بحالت تنازعہ گورنمنٹ کی [illegible] سو پیدل اور
چھ سو سوار بطور امدادی فوج معاونت سرکار بحالت سفر [illegible] قلعہ [illegible] گڑھ یا گنگا ڈونگی کی
فراہمی و ذمہ داری رسد میں ریاست کی امداد بذمہ نواب حال و اولادہ الامجاد تا ابد الآباد و فرمان روایان ریاست بحالہم
کلیتاً صاحب اختیار۔ قوانین انگریزی کو نہ دخل نہ ضوابط کمپنی سے اس کو سروکار۔ فقط نتیجہ اس عہد بندی کا یہ ہوا کہ
ایک ہی سال میں بدشواری ایک لاکھ کا محاصل چھلانگ بھر کر بہ سہولت ۵ لاکھ پر پہونچا لیکن جوں ہی کہ ریاست نے
شاہراہ ترقی پر قدم زن کرنا شروع کی جو ناگہانی حادثہ عظیم پیش آیا اس نے نہ صرف ریاست بھوپال بلکہ اکناف و اطراف تک
تمام خیر سگالان ریاست کو ماتمی لباس پہنایا یعنی یہ سرچشمہ کامرانی و کامگاری آناً فاناً ۲۲ محرم کو ۱۲۳۵ھ (نومبر ۱۸۱۹ء)
ایک بچہ ہشت سالہ کے ہاتھ سے نشانہ تفنگچہ بنا۔ اور صرف ساڑھے تین سال اپنے بے مثل کارنامے دکھلا کر عین عنفوان شباب
میں بعمر ۲۸ سال شکارگاہ اسلام نگر میں نذر قزاق اجل ہوا۔ سرجان مالکم لکھتے ہیں کہ جو ناموری اس چند سالہ حکمرانی
میں نواب نظر محمد خاں صاحب نے حاصل کی وہ بڑے سے بڑے عہد حکومت میں کسی دوسرے فرمانروا کو نصیب ہوئی
ہو گی۔ آپ کے عہد معدلت مہد کا ایک واقعہ نہیں جو ظلم و ستم کی آلودگی کا متہم ہو۔ آپ کی شرافت طبع کے ثبوت کے لئے
یہ دلیل کافی ہے کہ آپ نے محض نواب غوث محمد خاں صاحب کے لحاظ و ادب سے اپنے کو نواب نہیں کہلوایا گو گورنمنٹ عالیہ

اسی خطاب سے آپ کو یاد کرتی رہی۔ نواب مرحوم نے قدسیہ بیگم کے [illegible]
قرار دیا کہ مرحوم کے بھتیجے منیر محمد خاں کو بہ نگرانی قدسیہ بیگم صاحبہ جانشین [illegible]
سکندر بیگم صاحبہ سے کی جاوے تاکہ حکومت کی [illegible]
کی حیثیت سے فرمان فرمائے بھوپال رہیں [illegible] منیر محمد خاں صاحب [illegible]
کیا۔ خانہ جنگی کی نوبت پہونچی [illegible] پولیٹکل ایجنٹ [illegible]
دست برداری حاصل کی۔ بیگم صاحبہ [illegible] حکومت چھوڑنا گوارا [illegible]
مسئلہ حتی الامکان بامر گورنمنٹ تعویق میں [illegible]
کو پہونچی لیکن باتباع [illegible]
میں بھی کھینچا کھینچ ہونے لگی تا آنکہ نواب صاحب [illegible]
بچاکر سیہور پہونچے اور کچھ سپاہی فراہم کرکے دوبارہ [illegible] میں کامیاب ہوئے
ابتدائی مرحلہ میں پولیٹکل ایجنٹ نے بیگمات کا ساتھ دیا [illegible] مقابلہ میں نواب کو شکست ہوئی لیکن
چند روز بعد وہی صاحب بھوپال وارد ہوئے اور گورنر جنرل [illegible] کی خواہش کا اظہار کرکے ۵ لاکھ
سالانہ تاحیات کے وثیقہ پر بیگم صاحبہ سے دست کشی کرائی قدسیہ بیگم کی وفات [illegible]
اور انھوں نے اپنا کل اندوختہ اپنی پوتی شاہجہاں بیگم کے لئے ہبہ کیا۔ الغرض [illegible]
میں بااختیار ہوئے۔ اور دونوں ماں بیٹیاں قلعہ اسلام نگر میں جاکر [illegible] اسی قلعہ شاہجہاں بیگم
صاحبہ کا مولد مسعود ہے۔ مگر نواب صاحب کی عمر نے مساعدت نہ کی اور بعالم شباب [illegible] میں بعمر ۲۷ سال
داعی اجل کو لبیک کہا۔ قلب شہر سے جہانگیر آباد کی طرف فوجی کیمپ کا منتقل کرنا آپ ہی کا کام ہے۔

گورنمنٹ نے سکندر بیگم کی طرح ۱۱ اپریل ۱۸۴۷ء کو نواب مرحوم کا جانشین ہفت سالہ عمر
شاہجہاں بیگم صاحبہ کو تسلیم کیا۔ فوجدار محمد خاں برادر قدسیہ بیگم زیر نگرانی سکندر بیگم صاحبہ وزیر دربار
مقرر ہوئے۔ مگر دوعملی نے پھر ایک بار خلش برپا کی۔ آخر کار بیگم صاحبہ کے مقابلہ میں فوجدار صاحب
نیچا دیکھنا پڑا عہدہ سے مستعفی ہوئے اور سکندر بیگم صاحبہ کی سطوت اور سیاست کا غلغلہ عالم میں بلند ہوا

"سکندر بیگم۔ یور ہائنس کی شرکت اس دربار میں نہایت ہی خوش آئند ہے۔ مجھے عرصہ سے یہ خواہش تھی کہ ملکہ کی گورنمنٹ کے ساتھ جو سلوک آپ نے کیا ہے اس کا شکریہ ادا کروں۔ یور اسی ایک ریاست کے حکمران ہیں جو برٹش طاقت کے خلاف کبھی مسلح نہ ہوئے۔ یہ صفات نہایت نمایاں اور ممتاز رہے اور زمانہ حال میں جب کہ آپ کی ریاست ہمارے دشمنوں سے گھری ہوئی مبتلا تھی آپ نے عورت ہوتے ہوئے اس کے معاملات کی ایسی دلیری اور قابلیت سے ہماری امداد کی جو ایک مدبر سلطنت اور ایک سپاہی کے لئے زیبا ہو سکتی ہے۔"

دربار کے اسی سال بمقام الہ آباد نشان جی سی ایس آئی حاصل کیا۔ ازاں بعد تین مرتبہ ہندوستان کے اکثر شہروں کی سیاحت فرمائی اور ۱۸۶۳ء میں بہ نیت ادائی حج مع سکندر بیگم صاحبہ حج و زیارت سے مشرف ہوئیں۔ چنانچہ یہ خصوصیت ہندی حکمرانوں میں سب سے پہلے آپ ہی کو نصیب ہوئی۔ انجام کار اس برگزیدہ ذات نے بعمر ۵۱ سال ۲۳ رجب ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) سفر آخرت اختیار کیا۔

نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ گو برائے نام ۱۸۴۵ء میں خلعت جانشینی زیب تن فرما چکی تھیں مگر دوبارہ ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو باضابطہ مسند نشین ریاست ہوئیں۔ آپ کی داد و دہش حاتمانہ فیاضی، شاہانہ اولو العزمی مذاق تعمیر زبان زد خلائق ہے۔ ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۵۸ء بطالع سعید و نیکو اس ذات بابرکت و مجسمہ حسنات کا ظہور ہوا جس کا نام نامی و اسم گرامی علیا حضرت ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ جی سی ایس آئی جی سی آئی ای سی آئی متع اللہ المسلمین بطول بقائہا ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت طفولیت میں سرکار خلد نشیں سکندر بیگم صاحبہ کے ظل عاطفت میں اس انتظام سے ہوئی جس طرح ایک بلند پایہ شہزادی کی ہو سکتی ہے۔ ۱۸۷۴ء میں سرکار کی شادی سلطان دولہا نظیر الدولہ میاں احمد علی خاں بہادر احتشام الملک سے ہوئی ۱۸۷۵ء میں صاحبزادی بلقیس بیگم صاحبہ کی ولادت ہوئی۔ ان کے بعد ۱۸۷۶ء میں نواب نصر اللہ خاں بہادر فرزند نرینہ چار بہنوں کے بعد پیدا ہوئے۔ نومبر ۱۸۷۸ء صاحبزادہ کرنل محمد عبید اللہ خاں مرحوم کی تاریخ ولادت ہے اور ۹ ستمبر ۱۸۹۴ء کی مبارک ساعت میں کوکب درخشاں سمار بختیاری یعنی صاحبزادہ بلند اقبال محمد حمید اللہ خاں بہادر

وصیات کے لحاظ سے آپ کا وجود باجود ہر فرمانروا کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اس دورِ تہذیب میں علیٰ
ت کی ذات مجموعہ صفات مسلمانانِ عالم کے لئے۔ یہ صد فخر اور سرمایہ افتخار و ناز ہے۔ آپ ہی کے وجود
سے تاریخ ملوک الاسلام کو حاصل یہ امتیاز ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے تین پیشروؤں کو پیش کرکے یہ
کے ثابت کر سکتی ہے مسلمانوں کے صنف نازک کو بھی جب کبھی مالک الملوک موقع دیتا ہے تو وہ اپنے علم و فضل
و کمال۔ استعداد ملک گیری و ملک داری۔ عدل گستری۔ دین پروری۔ رعایا نوازی۔ حسن شفقت سیاسی
معاملات رزم و بزم میں اپنے محدود حدود کے اندر رشک سرائے وجم و فیصلہ ملوک عرب و عجم ثابت کر دیتی
۔ نئی تہذیب اور جدید دورِ تمدن کے ساتھ ہزار ترقی بلندی پر ان کا قدم ہے۔ ہندوستان کا کوئی اسلامی
ہ کالج یا یونیورسٹی ایسی نہیں جو بھوپال کے سرچشمہ فیض سے سیراب نہ ہو۔ کوئی علم دوست
با نہیں جو کسی نہ کسی طرح اس درگاہ عالی جاہ سے فیضیاب نہ ہو۔ سرکار عالیہ کا عہد فرمانروائی
زنامہ تاریخ عالم اسلامی میں ایک یادگار رفیع رہے گا۔ بحیثیت خط حکومت دست بدست ایک
درالوجود مثال ہے اس کے صلہ میں ریاست بھوپال ایک نظم درجہ میں دولت گونا گوں سے آمدنی
لا مال ہے۔

(باقی دارد)
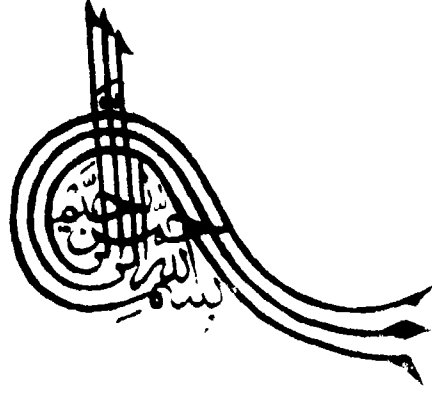
جلد ۴ | بابت ماہ مارچ، اپریل و مئی سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۱

شذرات

علی گڑھ میگزین کا نام جن جن مشہور و معروف آدبائے روزگار کے ساتھ وابستہ رہا ہے وہ خود اس امر کی کافی
یل ہیں کہ یہ ابتدائی زمانہ سے ہی ایک ممتاز حیثیت رکھتا آیا ہے۔ چنانچہ اس کی تاریخ کا پہلا باب مولانا شبلی نعمانی کے
م نامی سے شروع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ مولانائے موصوف کے زمانہ میں علی گڑھ منتھلی کے نام سے جاری ہوا۔ ایام
قبولیت میں جن ادبی ہاتھوں میں اس نے تربیت پائی وہ مولانا شبلی، مولوی عبدالقادر، مرزا محمد سعید، خاں صاحب
بر ولایت حسین اور قاضی جلال الدین صاحبان ہیں۔ ایک عرصہ تک یہ رسالہ اپنے مشرقی اور مغربی ہر دو رخ سے

بیک وقت نمایاں ہوتا رہا چنانچہ اسی طرح مغربی حصہ کی ادارت بھی تھیوڈور بیک ایل ٹیننگ جے ایچ ٹول [illegible]
اور اے ایف رحمٰن صاحبان کے مقتدر ہاتھوں میں رہی بہرحال اسی وقت سے معلوم ہوتا تھا کہ بمصداق [illegible]

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارہ بلندی

کسی زمانہ میں یہ رسالہ ادبی دنیا میں مزید نمایاں حیثیت حاصل کرے گا چنانچہ ادب اردو کا جو تخم مولانا [illegible]
نے ایم اے او کالج کے بستان ادب میں بویا تھا اور جس کو مولوی عبد القادر، مرزا محمد سعید، خانصاحب میر [illegible]
اور قاضی جلال الدین صاحبان نے اپنے دماغی مساعی جمیلہ سے سیراب کیا تھا بالآخر تجربہ کار باغبان [illegible]
فیض یاب ہوکر مسلم یونیورسٹی کے لئے نخل بارآور ہوا اور جس نونہال ادب کا نشوونما اس طرح شروع ہوا تھا
بالآخر حسب دستور فطرت اپنے عنفوان شباب میں نہایت آب و تاب کے ساتھ ادبی دنیا میں کامیاب ثابت ہو
اپنے ہم عصر ادبی رسائل سے بجاطور پر خراج تحسین وصول کرنے لگا۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب کہ اس کا بچپن کا نام علی گڑھ منتھلی سے تبدیل ہوکر علی گڑھ میگزین ہو گیا
اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد اس کا انگریزی حصہ بھی اردو حصہ سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا یہ دور اصطلاح میگزین میں
"عہد رشیدی" کے نام سے موسوم ہے جس میں ہمارے مکرم دوست رشید احمد صاحب صدیقی نے اپنے پیشرو
کی امانت کو اپنے ذاتی شغف وانہماک سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ دور تقریباً دو سال تک رہا۔ اس زمانہ میں
اس رسالہ نے جو خاص امتیاز حاصل کیا وہ اظہر من الشمس ہے لیکن عین اس وقت جب کہ برگزیدہ بزرگان ادب
اس کو بنظر شفقت دیکھنے لگے تھے اور ادب اردو سے ذوق رکھنے والے اس کے لئے چشم براہ تھے۔ انقلاب زمانہ
نے اس میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر دی یعنی اس کو ایک بالکل نئی دنیا میں منتقل کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ
اراکین یونیورسٹی نے یہ طے کیا کہ یہ ادبی رسالہ جس کا مقصد صرف طلباء کو جرنلزم یا مضمون نگاری میں ذوق سلیم
پیدا کرانا ہے۔ صرف اسی وقت اپنے مقاصد میں اصلی معنوں میں کامیاب کہا جا سکتا ہے جب کہ اس کا نظم ونسق خود
طلباء کے ہاتھوں میں ہو۔ میگزین کے لئے یہ وہ نازک وقت تھا جب اس کا جادۂ مستقیم پر قائم رہنا مشکل نظر آتا تھا
جس معیار پر میگزین پہنچ گیا تھا اس کو قائم رکھنا بذات خود ایک اہم کام تھا۔

اس وقت رشید صاحب کی نظر انتخاب خواجہ منظور حسن صاحب پر پڑی انھوں نے ایسے نازک وقت میں ادارت کے بار گراں کو اپنے محسن کے مشوروں کے مطابق جس خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ ظاہر ہے۔ میگزین کا معیار قائم رکھنے کے لئے جو روش ان کو اختیار کرنا پڑی اس کے متعلق اگرچہ مشہور ہے کہ وہ متعصبانہ تھی لیکن ضرورت وقت کے لحاظ سے موزوں معلوم ہوتی تھی چنانچہ وہ ان کو اپنے مقصد میں کچھ حد تک ثابت ہوئی۔ اس زمانہ میں جس قدر ذخیرہ ادبی نظم و نثر کا انتظام رہا وہ کافی پیمانہ پر ہے

...

ان کے بعد میں اتفاق حسین صاحب مسعود نے "سنت دیرینہ" پر قائم رہنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی مساعی قابل ستائش ہیں انھوں نے میگزین کے لئے جس بے خودی سے کام لیا اور اپنا بیشتر حصہ وقت اس کو موقت الشیوع بنانے میں صرف کیا وہ شکریہ کے مستحق ہے۔

...

مسعود صاحب کی ادارت کے بعد اس کا انتظام ہمارے دوست بشیر احمد صاحب صدیقی کی سپرد ہوا۔ انھوں نے جوبلی نمبر کی تیاری میں باوجود تنگی وقت جس قدر جانفشانی سے کام کیا اس کا خود جوبلی نمبر شاہد عادل ہے۔ بشیر احمد صاحب کا جو تعلق نسبتاً میگزین کے عہد رشیدی سے ہے وہ سب پر روشن ہے اور اس لئے وثوق کے ساتھ امید کی جاتی تھی کہ جوبلی نمبر کو دیکھتے ہوئے اور اس مشہور امید افزا مصرع کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیدا

ہر مابعد نمبر اپنے ماقبل سے بہتر اور برتر ہو کر نکلے گا۔ لیکن افسوس کہ ضوابط یونیورسٹی کی پابندی کی بنا پر ان کو اس کام سے اس واسطے جلد سبکدوش ہونا پڑا کہ وہ دائرۂ متعلمی سے نکل کر حلقۂ معلمی میں مستقلاً داخل ہو گئے اور بجائے ادارت میگزین ان کو مارین کورٹ کے حصہ اطفال الصغار کی تربیت و نگرانی سپرد کی گئی جو اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس سے بھی زیادہ اہم کام ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنے حلیۂ ظاہری اور اوصاف باطنی کی وجہ سے

مولانا سلیم صاحب جیسے مقدس بزرگ کے سچے جانشین ثابت ہوں گے۔

اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ صیغۂ ادارت میں انتخاب جدید عمل میں آیا اور خوش نصیبی یا بدنصیبی سے "قرعۂ فال بنامِ منِ ... زدند" بتعمیلِ ارشاد یہ خدمت ہمیں قبول کرنا پڑی۔ ہم اگرچہ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں اس کو معیارِ قدیم پر قائم رکھنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ آخر ماہ فروری میں ہمارے پیش رو نے ہم کو اس کا چارج دیا۔ جوبلی نمبر کے بعد سے کوئی پرچہ نہ نکل سکا تھا مضامین کی فراہمی ان کی ترتیب و انتخاب پھر رمضان شریف اور اس پر تعلیمی انہماک اور ان کے علاوہ چند دیگر موانع ایسے حائل رہے جن کی وجہ سے اس کی اشاعت میں اس قدر تاخیر ہوئی۔ ہم اپنی ذاتی خامیوں کا اعتراف کرتے ہوئے مودبانہ عرض کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

قلم ادارت اپنے محور سے اس قدر جلد جلد گردش کرتا رہے گا اور مدیرانِ میگزین سے

ہر لحظہ بشکلے دگر آں یار برآمد

ہر پرچہ ایک مدیر جدید کے نام سے منسوب ہوتا رہے گا تو

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت   رفت منزل بدیگرے پرداخت

کے اصول پر سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور کا رنگ آجائے گا جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ میگزین کی ادارت موجودہ حالات میں جو بظاہر آسان معلوم ہوتی ہے بذاتِ خود ایک مستقل کام ہے۔ موجودہ ضوابط کے مطابق اس کا ہر دوسرے مہینے شائع ہونا طے پایا ہے۔ یہ جدید طریقہ بہر طور مستحسن نظر آتا ہے کہ میگزین کا حصہ اردو اور انگریزی یکے بعد دیگرے ماہ بماہ علی الترتیب شائع ہوتا رہے لیکن پابندی اشاعت اسی وقت ممکن ہے جب کہ مدیر کم از کم ایک یا دو سال کے لئے مستقل طور پر کام کا ذمہ دار رہے۔ ہمارے معزز معاصرین اور مضامین نگار صاحبان کو اس کے بروقت نہ پہنچنے کی جس حد تک شکایت ہو بجا ہے اور ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کا علاج اب تک بجز "عفو تقصیر" کوئی بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا ہے چنانچہ ہم بھی نہایت عاجزانہ طور پر اسی کو بطور حفظ ما تقدم پیش کرتے ہیں۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی توقف نہ ہوگا کہ میگزین طلبا کا ہے اور ان کا ہی زیادہ حق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی

"سنت دیرینہ" کے مطابق روایات قدیمہ پر کاربند ہوتے ہوئے اس کے معیار کو قائم رکھنا بھی ہم ان کا اہم ترین فرض خیال کرتے ہیں جس کی بدولت آج جب کہ ملک میں ہر نوع کے بے شمار رسائل نکل رہے ہیں ہمارا رسالہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ صرف اس خیال کو مدنظر رکھکر اگر ہم رطب و یابس میں انتخاب کو ترجیح نہ [illegible] تو [illegible] انجام دینے میں کوتاہی کرینگے۔ اس میگزین میں بیرونی مضامین کی فراہمی صرف اس لئے [illegible] طلباء کے لئے نمونہ ہوں۔

***

موجودہ زمانہ کا رجحان خاط مغربی کورانہ تقلید میں فسانہ نویسی ہوگیا ہے جس کو ہمارے مقامی مضامین نگاروں نے بھی بہت آسانی سے اختیار کرلیا ہے لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ بالعموم آخر میں چند بے ربط الفاظ کا ایک مہمل مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ہم اپنے مقامی معزز مضامین نگاروں کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ وہ سنجیدہ، علمی، اخلاقی اور ادبی مضامین میں سعی فرمائیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس کوشش میں طوالت پسند طبائع خود بخود اعتدال کی جانب مائل ہوجائیں گی

***

ہم اپنا خوشگوار فرض خیال کرتے ہیں کہ گزشتہ پنجاہ سالہ جوبلی کی نمایاں کامیابی پر اراکین یونیورسٹی کو بالعموم اور جناب وائس چانسلر اور پرو وائس چانسلر صاحبان کو بالخصوص تہ دل سے ہدیہ مبارکباد پیش کریں کہ آن کی مساعی جمیلہ سے نہایت شان و شوکت کے ساتھ جوبلی کے شاندار اجلاس بخیر و خوبی تمام ہوئے جو مدت تک مسلمانوں کے دلوں میں تا دیر قائم رہیں گے۔ جشن جوبلی جو اب ماضی ہوچکا ہے مستقبل کے لئے بطور روایات تادیر قائم رہے گا۔

حال ہی میں مصر کے مشہور رسالہ الزہراء بابت ماہ جنوری و فروری میں جوبلی کے متعلق ایک مضمون عربی میں ہماری نظر سے گزرا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ درسگاہ علی گڑھ کی جوبلی ہندوستان سے باہر بھی اسی طرح مشہور ہوئی ہے جس طرح ہندوستان میں۔ اردو کانفرنس، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، کانفرنس مدیران اور مشاعرہ یہ سب جلسے اس سلسلہ میں جوبلی کے عظیم الشان پنڈال میں مختلف اوقات میں منعقد ہوئے۔ حاضرین کی تعداد باوجود وسعت پنڈال ہر اجلاس میں بہت کافی ہوتی تھی۔ مہمانوں کے قیام کے لئے علاوہ یونیورسٹی کی تمام عمارات اور قرب و جوار کی کوٹھیوں کے

وہاں وسیع کیمپ پنڈال کے قریب بہت شاندار تیار کیا گیا تھا۔ ہندوستان کے دور دور مقامات سے مشہور و ممتاز مہمانان تشریف فرما ہوئے۔ مہمانان کے لئے جس قدر بڑے پیمانہ پر انتظام قیام کیا گیا تھا باوجود اس کے ۵۔ مئی ۱۹۲۵ء کو کیمپ میں گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ طعام کے لئے علیحدہ انتظام کیمپ میں کیا گیا تھا۔ ہم کو نہایت مسرت ہے کہ مہمانان کو باوجود اس قدر کثرت تعداد کے کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور سب مطمئن رہے۔

جوبلی کا مقصد سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ہماری موجودہ تعلیمی درسگاہ کو مسلمانان ہند ایک وقت خاص میں جمع ہوکر بچشم خود ملاحظہ کریں اور جو غلط فہمیاں اس کے متعلق باہر کسی نہ کسی طرح سے مشہور ہو گئی ہیں ان کا مقابلہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے اصول کے مطابق کریں اور یہاں کی درس و تدریس نیز تعلیمی، اخلاقی اور جسمانی ترقیوں کو جن میں یہ درسگاہ دوسری ہم عصر درسگاہوں سے ممتاز ہے خود دیکھیں اور جو شبہات و تشکوک ہوں وہ رفع کرلیں۔ شکر ہے کہ سب اصحاب ہم خیال ہوکر اور اپنے تشکوک رفع کرکے بہ طمانیت قلب واپس تشریف لے گئے۔ یہ دراصل جوبلی کی سب سے زیادہ اہم اور نمایاں کامیابی تھی۔ مالی امداد بھی اس موقع پر مختلف اضلاع سے پانچ لاکھ کے قریب ہوئی جن میں سب سے زیادہ مالی مدد ہماری یونیورسٹی کے سرپرست جناب نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب بالقابہ نے کی ہے جو ایک لاکھ روپیہ ہے لیکن ہمارے نزدیک تمام مسلمانان ہند کا متحد الرائے ہوکر انسٹی ٹیوشن کے متعلق نیک خیال قائم کرلینا موجودہ مجموعی مالی امداد سے کہیں زیادہ ہے اور وہ بذات خود آئندہ بہت سی رقوم کا پیش خیمہ کہی جاسکتی ہے۔

اسی سلسلہ میں جناب مہاراجہ صاحب الور کی اس تاریخی موقع پر تشریف آوری اُن کا وسیع اخلاق اور فیاضانہ عطیات قابل ذکر ہیں۔ جناب مہاراجہ صاحب موصوف نے جس شاہانہ دریا دلی سے کام لیا اور اراکین و طلباے یونیورسٹی کے ساتھ جو مخلصانہ برتاؤ کیا وہ ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ہماری جوبلی کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ہم سب کے دل نشین رہے گا۔ ان کی فیاضی کی بے مثل مثال ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد اور ارتباط قدیم کا مجسمہ بناکر دونوں قوموں کے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی نظیر ہے جو اُن ہزاروں لکچروں اور وعظوں سے کہیں زیادہ با اثر او

نتیجہ خیز ہیں جو زیور تقریر سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے پلیٹ فارموں سے آئے دن سننے جاتے ہیں۔ اس موقع پر جو نظم ہمارے ایک ذی علم اولڈ بوائے جناب اقبال سہیل صاحب نے پڑھی تھی وہ کسی دوسری جگہ اس میگزین میں درج کی جاتی ہے

مشاعرہ جیسا کہ انتظام کیا گیا تھا اپنی شان کا نرالا تھا۔ تمام ہندوستان کے مشہور
اور خیال تھا کہ یہ مشاعرہ تمام مشاعروں میں مخصوص رہے گا۔ اس کا افتتاح علی سر امام صاحب کی
نے طبع زاد زبانی فرمائی جس میں پروفیسر دل محمد صاحب کی نظم خاص طور پر قبول عام ہو
ہو جانے پر درج کی جائے گی۔ ہمیں افسوس ہے کہ شرکاء کے تخیلات حسب دستور مشاعرہ میں زیادہ جوش زن ہوئے
اور مشاعرہ کا انتظام زیادہ طمانیت بخش نہ ہو سکا۔ اس کے متعلق بعض اخبارات میں بے جا طور پر نکتہ چینی کی گئی ہے
پریزیڈنٹ صاحب مشاعرہ نے ہمیں امید دلائی ہے کہ وہ آئندہ اشاعت میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالیں گے۔

ایک عرصہ سے یہ سنا جاتا تھا کہ جناب سجاد حیدر صاحب یلدرم کا زمانہ رجسٹراری قریب ختم ہے اور اسی وجہ سے وہ عنقریب اپنے ڈپٹی کلکٹری کے عہدۂ جلیلہ پر پھر واپس تشریف لے جائیں گے لیکن ہمیں مسرت ہے کہ اراکین یونیورسٹی نے اُن کے قیام میں آئندہ ماہ دسمبر تک توسیع کردی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب سید صاحب موصوف کا ارتباط ادب اردو کے ساتھ بالعموم اور ہمارے میگزین کے ساتھ بالخصوص خواہ وہ کہیں بھی ہوں ہمیشہ یکساں رہے گا لیکن اُن کے علی گڑھ کے قیام سے میگزین یقیناً زیادہ مستفید ہو سکتا ہے۔ میگزین کی تاریخ میں کوئی دور بمشکل ایسا نظر آتا ہے جس میں سید سجاد حیدر صاحب کی قلمی معاونت نہ رہی ہو۔ چنانچہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ وہ ہندوستان سے باہر بلاد اسلامی کی سیاحت فرما رہے تھے اُنھوں نے اپنے میگزین کو فراموش نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے آپ کو بھی خوش قسمت خیال کرتے ہیں۔

ہمارے مکرم دوست جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی ہمارے انسٹی ٹیوشن کے اُن مفتخر اولڈ بوائز میں سے ہیں جن سے ہر شخص بوجہ ان کے "کمالات" کے بخوبی واقف ہے۔ وہ جرمنی سے حال ہی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے جرمنی میں جس امتیازی کامیابی حاصل کی ہے وہ قابل رشک ہے اور قوم کو ان پر بجا ناز ہے۔ وہاں سے آتے ہی جامعہ ملیہ دہلی کے پرنسپل منتخب کئے گئے ہیں ہم موصوف کو اُن کی اس نمایاں کامیابی پر اور جامعہ ملیہ کو اُن جیسے شریف الطبع، موزوں اور قابل قدر شخص کے انتخاب پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اُن کے پچھلے دنوں علی گڑھ تشریف آوری کے موقع پر اراکین یونین کی جانب سے یونین ہال میں بہت شاندار طور پر استقبال کیا گیا۔ جس کے جواب میں انھوں نے چند نصیحتیں طلباء کو کیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ حسب وعدہ علم المعیشت پر مختلف تقاریر کو متعلمین یونیورسٹی کو [illegible] فرماتے رہیں گے اور اس کے ساتھ ہی اس میگزین کو بھی جس سے ان کو بہت کچھ دلچسپی رہ چکی ہے فراموش نہ فرمائیں گے۔

جناب ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر فلسفہ ان برگزیدہ حضرات میں سے ہیں جن کے قیام پر ہماری یونیورسٹی بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک عرصہ تک یورپ کی مختلف مشہور یونیورسٹیوں میں بسلسلہ تعلیم مقیم رہے ہیں اور فلسفہ کے تمام مراحل طے کر کے گزشتہ سال عہدہ پروفیسری مقرر ہوئے۔ گزشتہ ستمبر میں وہ انگلستان اس مقصد سے تشریف لے گئے تھے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی گراں قدر ڈگری سے بھی جو ان کے لئے بہت ہی سہل الحصول تھی محروم نہ رہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو مقالہ انھوں نے وہاں پیش کیا وہ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف آخر جنوری میں بخیر و عافیت وہاں سے اپنے مقاصد میں کامیاب واپس تشریف لے آئے ہیں۔ پچھلے عرصہ میں فلاسفیکل سوسائٹی کی جانب سے ان کو ڈائننگ ہال میں بڑے پیمانے پر ڈنر دیا گیا جس میں پر جوش تقاریر ہوئیں۔ ہمیں امید ہے کہ فلسفہ طلباء ڈاکٹر صاحب کے تبحر علمی اور وسیع تجربوں سے پورے طور پر مستفید ہونگے۔

جناب ڈاکٹر کریم حیدر صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر علم المعیشت تقریباً ایک سال بسلسلہ ممبری جنگ کمیشن کمیٹی یونیورسٹی سے باہر تھے اور حال ہی میں واپس تشریف لائے ہیں ہم نہایت مسرت سے یہ خبر شائع کرتے ہیں کہ عنقریب ہی وہ زراعتی رائل کمیشن کے ممبر منتخب ہوئے ہیں جس کے سلسلہ میں ان کو ہندوستان سے باہر بھی سفر اختیار کرنا پڑے گا۔ ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کو ان کے اس معزز عہدہ پر مبارکباد دیتے ہیں

ڈاکٹر اے ایس ٹرنیٹن صاحب پروفیسر عربی ۸ ماہ مئی ۱۹۲۶ء کو بمبئی سے بعزم انگلستان روانہ ہوئے جب سے وہ یہاں تشریف لائے ہیں تقریباً ساڑھے پانچ سال بعد پہلی مرتبہ اپنے وطن تشریف لے جانے والے ہیں شروع اکتوبر میں واپس تشریف لائیں گے

آخر ماہ نومبر میں ہز اکسیلینسی فیلڈ مارشل فخری پاشا" نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے ہماری یونیورسٹی کو معہ اپنی بیگم صاحبہ کے معزز فرمایا۔ یونین ہال میں جناب ممدوح کا خیر مقدم کیا گیا۔ اپنے محدود قیام کے زمانہ میں یونیورسٹی کے ہر شعبہ کو انھوں نے نہایت دلچسپی سے معائنہ فرمایا۔ یہاں سے تشریف لے جانے کے بعد جشن جوبلی کی مبارکباد کا جو خط بنام جناب وائس چانسلر صاحب ارسال فرمایا ہے اس کا بجنسہ عکس بزبان ترکی معہ ترجمہ ہم درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ جناب ممدوح کو جو شغف ہماری یونیورسٹی سے ہے وہ کس درجہ کا ہے

ہز اکسیلینسی فخری پاشاہ ترکوں کی اُن چند نامور ہستیوں میں سے ہیں جن کے کارنامے تاریخ عالم میں ہمیشہ کے لئے جگہ پائیں گے۔ عثمان پاشا۔ مدافع "پلیونا" ادھم پاشا فاتح تھسلی۔ انور پاشا مجاہد درسنو اور غازی مصطفے کمال پاشا بانیِ انقلاب جدید۔ ترکی جیسے وطن ملت کے لئے جاں فروشانہ خدمات کرنے والوں کی صف میں فخری پاشا بھی نظر آتے ہیں۔ یورپ کی گزشتہ جنگِ عظیم میں جب ٹرکی کو بھی بغیر شریک ہوئے چارہ کار باقی نہ رہا اُس وقت فخری پاشا خواب گاہِ رسولِ عربیؐ کی حفاظت فرما رہے تھے یعنی ارض حجاز کے کمانڈر انچیف اور مدینۂ طیبہ کے گورنر تھے۔ کسے گمان ہوسکتا تھا کہ فخری پاشا مسلمانوں ہی کے نرغہ میں

پھنس جائینگے مگر جو بات کہ کسی مسلمان کے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی وہی ہو کر رہی یعنی شریف حسین نے اس نازک زمانہ میں جب کہ دنیائے اسلام کی حیات و ممات حکومت عثمانی کے بقا و استحکام کے ساتھ وابستہ تھی حجاز میں اپنے بادشاہ کے خلاف علم بغاوت و عصیان بلند کیا مختصر یہ کہ فخری پاشا یکہ و تنہا مدینہ منورہ میں محصور ہوگئے باہر کی دنیا سے نامہ و پیام کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ محاصرہ بلا انقطاع دو سال کامل جاری رہا۔ ماتحت افسروں نے بار بار عرض کیا کہ شہر محاصرین کے حوالہ کر دیا جائے کیونکہ کہیں سے کمک بھیجنے کی امید نہ تھی مگر محاصر حسین اور محصور فخری دو جدا جدا طبیعتیں لے کر دنیا میں آئے تھے۔ فخری ہراس اور نا امیدی کے لفظ سے نا آشنا، حسین اخلاق جنگ، آئین عسکری سے بے پرواہ۔ شریف حسین نے اُن کو اس کی بھی اجازت نہ دی کہ مدینہ طیبہ کی غیر محارب آبادی سے نکل جائیں۔ بہادر فخری پاشا کامل دو سال تک جنگ کرتے رہے اور انھوں نے اس وقت ہتیار ر رکھے جب کہ ان کو معلوم ہوگیا کہ قسطنطنیہ میں متارکہ کے بعد دول متحدہ کا داخلہ ہوگیا ترکی میں جانبازان ملت کے جس وقت نام لئے جاتے ہیں اُس وقت غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد شاید ایک ہی آدھ نام کے بعد فخری پاشا کا نام آتا ہے حال کے ترکی اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ ہز اکسیلینسی فخری پاشا سرعسکر افواج قاہرہ ترکی یعنی ہز بری فوجوں کے کمانڈر انچیف مقرر ہو کر تشریف لے گئے ہیں

این ماتم سخت ست کہ گویند جواں مرد

نہایت افسوس ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج کے ایک ہونہار طالب علم نور اسلام صاحب نے دفعتاً بتاریخ ۱۳ اپریل یوم شنبہ بوقت ۹½ بجے شب کے اس عالم فانی کو خیرباد کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

مرحوم جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کے قریبی عزیز تھے اور ایف اے کے درجہ میں تعلیم پاتے تھے۔ ان کا سلسلۂ علالت بہ مشکل چند گھنٹہ رہا۔ آخر تک سرسامی کیفیت میں ان پر غشی طاری رہی جو صرف مرض الموت سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے اعزا کو صبر جمیل۔ آمین۔

عبدالباسط بی اے
اڈیٹر

شملہ کا لکاریلوے پر ایک نظارہ

ماتھے پہ بندی آنکھیں جادو
ہونٹوں کی بجلی گرتی تھی ہر سو
چال لچکتی بات بہکتی
جیسے کسی نے پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا لمحہ میں راہو
ایسی بھڑک تھی خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا کہاں سے آہو!

یلدرم

تذکرۂ منصور کے چند اوراق

از

مولوی محمد امین صاحب پروفیسر عربی (چٹگام)

[اس م]ضمون کے لئے ہم اپنے مکرم دوست مولوی محمد امین صاحب پروفیسر عربی کے ممنون ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اپنی تصنیف سے یہ علمی مضمون عنایت فرمایا ہے ہمیں امید ہے کہ وہ حسب وعدہ آئندہ بھی ہمارے میگزین کو اپنی علمی معلومات سے مشرف فرماتے رہیں گے۔ مولوی صاحب موصوف کو ایم اے اوکالج سے بہت کچھ تعلق رہا ہے۔ امیر خسرو کی کلیات اب تک ان کی یادگار موجود ہے۔

ایڈیٹر

بحث حقیقت اعتقاد | اس رسالہ میں حقیقت اعتقاد پر مفصل بحث کی گئی ہے اُن میں سے عامل اعتقاد یعنی وہ اسباب کہ جن سے جذبہ اعتقاد ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کو عامل اعتقاد کہتے ہیں علم النفس میں ان عوامل کی بہت سی قسمیں بیان کی گئی ہیں [ا]س رسالہ میں حقیقت اعتقاد کے ضمن میں اُن تمام عوامل سے بھی بحث کی گئی ہے جس میں مذہبی عامل بہت معرکۃ الآرا بحث ہے جس کو میں نمونۃً بغرض دلچسپی نقل کرتا ہوں۔

مذہبی عامل | اعتقاد کے مختلف اشکال اور مدارج کی مفصل بحث جیسے غیر مہذب اور وحشیوں کا اعتقاد، مہذب اقوام کی اوہام پرستی، عالم محسوسات کے متعلق اعتقاد، قانون فطرت اور نظام حسن کا اعتقاد، اخلاقیات اور شرایع کا عقیدہ، فنون جمیلہ کے [مقا]صد و اغراض کا اعتقاد، طویل اور مہتم بالشان بحث ہے جس میں عام بحث کو تمثیلات سے بیان کرنے کی حاجت ہے لہذا [ان م]یں سے ہر ایک صورت کو خاص طور پر زیر بحث لانے میں خاص دلیل اور مخصوص ثبوت پیش کرنے کی حاجت ہے [رو]من کیتھولک یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ مذہبی عقیدہ کی بعض صورتوں میں، عام طور پر نہیں، ایک ایسی حالت ہے [جو] دوسرے عقیدوں کی سی نہیں ہے۔ مسٹر نیومن ڈموسکی کی تائید کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انسانی یا فطری [عق]یدہ اور الہامی یا مافوق البشری عقیدہ میں بہت بڑا فرق ہے"۔ الہامی عقیدہ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ "...

یقین ہی جو تمام تر الہام پر مبنی ہوتا ہے اور محض خدا کی مہربانی پر اس کا وجود ہی جو خود بخود دل میں پیدا ہوتا ہے اس قسم کے عقائد دوسروں سے صرف درجہ ہی میں متفاوت نہیں ہیں بلکہ یہ قسم ہی اوروں سے بہت بالاتر ہی اس کی فضیلت کی بنیاد تجربیات پر نہیں ہے بلکہ تجربیات سے بہت بالاتر ہے۔ یہ وہ فرق ہی جس کی بنیاد اصول مابعد الطبیعات پر قایم ہے۔ اعتقاد کا اصلی ماخذ ہی" نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس کی کیفیت کی بحث میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مذہبی عقیدہ اس قسم کے امتیازات نہیں پیدا کرتا جس سے ہم مجبور ہوں اس کو دوسرے عقائد سے بالکل جدا کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے اجزا باہم مختلف ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہی کہ اس کی کمیت اور شدت پر اُس کا خاص اثر ہی لیکن نفسیات کے نقطۂ نظر سے یہ فرق اصولی یا حقیقی نہیں ہی۔ اس خاص قسم کے عقیدہ میں جو حقیقت کہ پیش کی جاتی تھی یا جس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہی وہ باعتبار دوسرے قسم کے عقائد کے زیادہ مفصل اور وسیع پیمانہ پر زیر بحث ہوتی ہی۔ جو تنقیحات کہ قایم کی جاتی ہیں بہت سے مقدمات پر مبنی ہوتی ہیں۔ زندگی مذہبی اعتقاد کی روشنی میں خودی کا ایک مختصر ناٹک ہی جو زمان و مکان کے پس پردہ کھیلا جا رہا ہے۔ یہ سب ضمنی حقائق کے جز بن جاتے ہیں جو مشیتِ باری تعالیٰ کے کل میں شامل ہیں۔ خودی کے تنگ دائرہ سے باہر ہو کر بہت پیچھے وہ جاتے ہیں اس کے نقطۂ نظر سے شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہی مکمل اور پایدار وقعت حاصل کرتی ہی۔ یہ بات سمجھنے کے قابل ہی کہ اس قسم کے اعتقاد کے ساتھ یہ مفہوم کیوں کر پیدا ہوتا ہی کہ اس سے نجات حاصل ہوگی۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہی کہ یہ مسئلہ کیوں کر حل ہوا اس قسم کے اعتقاد کے متعلق یہ خیال دل نشیں ہوتا ہی۔ ایسے اعتقاد دل میں پیدا کرنے سے حاصل نہیں ہوتے بلکہ خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے اس سے عام طور پر ہر شخص واقف نہیں ہی۔ اصولاً یہ عقیدہ ترتیب مقدمات سے نتیجہ کی صورت میں حاصل نہیں ہوتا جیسے کہ اشکال منطقیہ ترتیب مقدمات سے نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ اعتقاد عام طور پر کسی بڑی حاجت اور ضرورت اہم کے احساس مبہم سے کم و بیش پیدا ہوتا ہی۔ جس قدر ضرورت و حاجت بڑھتی ہی اُسی کے ساتھ ساتھ اُسی قدر یہ جذبہ بھی ترقی کرتا ہی۔ یہ ایسی زبردست طاقت ہی جو اپنی جابرانہ حکومت سے اُن تمام مضامین کو دبا لیتی جو اس طاقت سے ٹکراتے ہیں معتقد کو اپنے تجربہ کی حقیقت پر ایسا زبردست یقین ہوتا ہی کہ اُس کو کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ اس قسم کے اعتقاد کے اسباب کی تحقیقات، جس کا تعلق بیشتر فلسفہ اور دینیات سے ہی، ایک غور طلب مسئلہ ہی کوئی شخص اس تحقیقات کو اس بنیاد پر ناپسند کرے تو کچھ عجب نہیں کہ اس سے اس کے کیفیت وجدانی کی صفائی کو ٹھیس لگے گی۔ بلا کسی توقف

جب ہم مذہبی اعتقاد پر غور کرتے ہیں اور نفسیات کے نقطۂ نظر سے اس کی کیفیت حاصلہ پر لحاظ کرتے ہیں تو ہم کو نمایاں طور پر وہ اول جذبات یہاں پر موجود نظر آتے ہیں جس کے اندر ذہنی عامل بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

مذہبی اعتقاد مختلف صورتوں سے حاصل ہوتا ہے کبھی تو تلاش سے کبھی کسی خاص جانب توجہ مبذول کرنے سے بھی عقل و فہم کو کام میں لانے سے۔ اس کے لئے بہت بڑے خوض و غور کی چنداں حاجت نہیں ہوتی بلکہ یہ محض ارادہ ہے معتقد کسی اعتقاد تک اس لئے پہونچتا ہے کہ وہ اُس کی جستجو کرتا ہے اس نظریہ کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کی بنیاد براہ راست دلائل پر قایم نہیں ہے بلکہ ارادہ اور جذبات کی تاثیر سے مذہبی اعتقاد راسخ ہوتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے اس دعوی کا کافی ثبوت علم النفس سے مل سکتا ہے۔

چونکہ مذہبی اعتقاد کی نوعیت ایک خاص قسم کی ہے اس لئے اس میں تمدنی عامل کو بہت بڑا دخل ہے۔ زیادہ تر اس کی بنیاد مدارس کے اثر، طریق تعلیم آپس کی صحبتیں وغیرہ ہیں جن کے ذرایع سے سوسائٹی جس میں انسان زندگی بسر کرتا ہے اپنے مذہبی عقائد کو ظاہر کرتی ہے اور اپنی مذہبی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے

سری کرشن جی بھگوت گیتا میں اعتقاد کی جو تحقیق پیش کرتے ہیں علم النفس کے نقطۂ نظر سے نہایت مکمل اور تمام تر واقعیت پر مبنی ہے جس کے ثبوت کا بیشتر حصہ عملی اور مجاہدات و ریاضات نفس پر مبنی ہے۔ محققین یورپ کی تحقیقات کا دائرہ چونکہ محسوسات کے نقطۂ مرکزی پر چکر کرتا ہے اس وجہ سے جن مسائل کا حل روحانیات سے تعلق رکھتا ہے ان میں اُن کی تحقیقات کسی تشفی بخش نقطہ تک نہیں پہونچتی۔ مسٹر ہیوم۔ مسٹر بین۔ مسٹر مل۔ مسٹر بگیاٹ۔ مسٹر ڈ ہوسکی وغیرہ نے علم النفس پر بہت کچھ زور آزمائی کی ہے اور مسئلہ اعتقاد کی بہت بڑی تحقیقات دنیا کے سامنے پیش کی ہے مگر جس نقطہ تک سری کرشن جی پہونچے ہیں یہ لوگ اُس سے اب تک بہت پیچھے ہیں۔ حکما اسلام نے تیسری صدی کے بعد سے اس طرف توجہ کی اور صدیوں کی مسلسل کوششوں سے اس کو مکمل اور مدون فن بنا دیا۔ اب یہ فن جس حالت میں ان کی کوششوں سے پہونچا ہے دنیا کی ساری قوموں سے بہت آگے بڑھ گیا۔ اس پر مفصل بحث اس رسالہ میں آگے آئے گی۔

سری کرشن جی بھگوت گیتا ادھیائے ۱۷ منتری ۲ میں لکھتے ہیں۔

त्रिविधा भवति श्रद्धा देहि नाम सा स्वभाव जा ॥

सात्विकी राजसी चैव तामसी चेतितां श्रण ॥२॥

ترجمہ ۔ عقیدہ انسان کا خاصۂ طبعی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں ستوگنی ۔ رجوگنی ۔ تموگنی اُن کے حالات مجھ سے سن ۔ ادھیائے ۱۷ منتر ۲

सत्वानु रूपा सर्वस्य श्रद्धाभवति भारत ॥

श्रद्धामयोऽयपुरुषो यो यच्छ्रद्धः सएवसः॥३॥

ترجمہ ۔ اے اوجن ہر بشر کا عقیدہ اُس کے طبیعت کے موافق ہوتا ہے اور عقیدہ کا جزو بشریت ہے پس جس کا جو عقیدہ ہے وہی اُس کی ہستی ہے ادھیائے ۱۷ منتر ۳

ہنود کے مذہب کے مطابق ستوگن ۔ رجوگن ۔ تموگن انھیں تین صفات کے مجموعہ کا نام طبیعت ہے جو ہر انسان میں پیدائش کے ساتھ ساتھ مخلوق ہوتے ہیں پھر صحبت کے اثر سے ایک خاص یقین پیدا ہوتا ہے جس کو ہم عقیدہ سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اس لحاظ سے ہر انسان کا ایک خاص عقیدہ ہونا لازم ۔ یہ عقیدہ اُس انسان کی حالت پر مبنی اور انھیں صفات سہ گانہ ۔ ۲ ۔ کے شدت وضعف پر عقیدہ کے شدت وضعف کا انحصار ہے ۔ ان تین صفات میں جو صفت جس قدر شدید یا ضعیف ہوگی اُسی قدر اس صفت کے مناسب عقیدہ بھی شدید یا ضعیف ہوگا ۔ جس کا دارو مدار فطرت پر ہے ۔ فلسفہ ہنود کی رو سے اعتقاد فطری خاصہ ہے ، جس طرح صفرا ۔ سودا بلغم ۔ خون کے مجموعہ کا نام طبیعت ، مزاج ہے اور انھیں امزجہ میں سے کسی ایک کی زیادتی یا کمی سے انسان کے اخلاقی حالات کا ظہور ہے مثلاً صفرا کی زیادتی سے انسان ذہین تیز فہم ، ذکی الحاسہ ہوتا ہے ۔ بلغم کی زیادتی سے غباوت ، کسل ، بزدلی ، وغیرہ صفات پیدا ہوتے ہیں جن کا نام خاصۂ فطری ہے جو انسانی زندگی کا جزو اعظم ہیں اور تمام اخلاقیات کا انھیں پر دارومدار ہے اسی طرح اعتقاد کی نشو و نما بھی انھیں مواد کے زیر اثر ہے چنانچہ اسی نظریہ کو سری کرشن جی آگے منتروں میں بوضاحت بیان کرتے ہیں ۔

यजंते सात्त्विका देवा न्यक्षरक्षांसि राजसाः॥

प्रेतान्भूत गणांश्चान्ये यजंते तामसाजनाः॥४॥

ترجمہ ستوگنی انسان دیوتاؤں کو رجوگنی یکش اور راکشسوں کو اور تموگنی بھوت اور پریتوں کو پوجتے ہیں

ادھیائے ۱۷، منتر
نیک خصلت انسان علویات کی پرستش کرتے ہیں اور افعال نیک کے پابند رہتے ہیں اہل غرض سفلی قوتوں کو اپنا معبود بناتے ہیں اور اُس کو خوش رکھنے کے لئے طرح طرح کے اعمال کرتے ہیں۔ بدخصلت لوگ مرگھٹ بھوت وغیرہ کو پوجتے ہیں۔

आशास्त्र विहितं घोरं तप्यंत ये तपो जनाः ॥
दंभाहंकार संयुक्ताः कामराग बलान्विताः ॥ ५॥
कर्षयंतः शरीरस्थभूत ग्राममचेतसः ॥
मांचैवांतः शरीरस्थं तान्वि द्ध्यासुरनिश्चयान् ॥६॥

ترجمہ۔ جو بدعقل اُس سخت ریاضت کو جس کی شاستر میں اجازت نہیں ہے پابند ہوتے ہیں وہ مکر و پندار رکھنے میں خواہش و تمنّا سے مغلوب ہیں۔ ادھیائے ۱۷، منتر ۵
اور عناصرِ جسمانی اور میری ذات کو جو اُن کے دل میں مقیم ہے تکلیف پہونچاتے ہیں ان کا عقیدہ تموگنی سمجھ ادھیائے ۱۷، منتر ۶

आहारस्त्वपि सर्वस्य त्रिविधोभवति प्रियः ॥
यज्ञस्तथा दानंतेषांभेद मिमं श्रृणु ॥ ७ ॥

ترجمہ۔ جگ۔ غذا۔ تپ اور دان جو تین تین قسم کے ہیں ہر ایک کو جداگانہ پسند ہوتے ہیں اُن کے فرق کو سمجھو۔ ادھیائے ۱۷، منتر ۷

आयुः सत्वबला रोगाय सुख प्रीतिविवर्धनाः ॥
रस्याः स्निग्धाः स्थिरा हृद्या आहाराः सात्विकप्रियाः ॥८॥

ترجمہ۔ جو غذا عمر، قوت تولید، طاقت، صحت، آسایش، اور خوشی کو بڑھاتی ہے اور ذائقہ دار، مقوی خوشگوار اور مرغن ہوتی ہے وہ ستوگنی کو مرغوب ہوا کرتی ہے۔ ادھیائے ۱۷، منتر ۸
कट्वम्ल लवणात्युष्ण तीक्ष्णरूक्ष विदाहिनः ॥

आह्मपयान्नस्येष्ठा दुःखशोकामय प्रदा : ॥९॥

ترجمہ - جو غذا کڑوی، کھٹی، نمکین، گرم، چرپری، رُوکھی اور جلن پیدا کرنے والی ہے اور تکلیف
اور بیماری کا باعث ہے وہ رجوگنی کو مرغوب ہوتی ہے۔ منتر ۹

यात याम गतरसं पूति पर्युषितं चयत् ॥
उच्छिष्टमपि चामेध्यं भोजनंतामसप्रियम्॥१०॥

ترجمہ باسی، بد ذائقہ، متعفن، جھوٹی، اور ناپاک، تموگنی کو مرغوب ہوتی ہے۔ ۱۰ ادھیائے ۱۷ منتر
اس جگہ سری کرشن جی اس امر کو دکھلا رہے ہیں کہ کون سی غذا کس مزاج کو ترقی دینے والی ہے۔ چونکہ یہ
ذکر کیا جا چکا ہے کہ عقائد کا دارومدار حالت مزاجی پر ہے اور غذا کا تعلق مزاج کے ساتھ ایسا ہے جیسے روح کا تعلق
کے ساتھ۔ غذا ہی جسم انسانی میں امزجہ کو تقویت دینے والی چیز ہے جسم انسانی میں ہر خلط اپنے مناسب غذا پسند کرتی
ہے اور اسی غذا سے مزاج کو قوت پہونچتی ہے اگر غذا امزاج کے مخالف ہو تو نظام جسمانی اپنی صحیح حالت پر قائم نہیں رہ سکتا
اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس قسم کی غذا جس شخص کو پسند ہو اس سے اس شخص کی حالت مزاجی کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا
ہے چونکہ یہ بات پیشتر بیان کی جا چکی ہے کہ عقائد کا دارومدار بیشتر حالت مزاجی پر ہے۔ لہٰذا اس سے بدیہی طور پر یہ بات
سمجھی جاتی ہے کہ انھیں غذاؤں کی رغبت کی حالت سے کیفیت اعتقادی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے اس لئے کہ جب انسان
کی کیفیت مزاجی سے اس کے عقیدہ کا اندازہ سمجھا جا سکتا ہے اور پھر غذا سے اس کی کیفیت مزاجی کا اندازہ ہو سکتا ہے
تو اس سے صحیح طور پر یہ نتیجہ نکلا کہ غذا کی رغبت سے عقیدہ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بلحاظ اس کے کہ کس شخص کو کس قسم کی
غذا مرغوب ہے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی غذا سے رغبت رکھنے والوں کی کیفیت مزاجی کیا ہوگی اور جب
حالت مزاجی معلوم ہو گئی تو اسی سے عقیدہ کی حالت کا سمجھنا بدیہی طور پر آسان ہو گیا۔ لہٰذا یہ امر بھی بدیہی ہے کہ
انھیں غذاؤں کی رغبت اور نفرت کے لحاظ سے اس اصول پر عقیدہ کی حالت کا اندازہ کرنا بھی آسان ہوگا۔ اس لئے
ہم اس نقطہ تک بآسانی پہونچ سکتے ہیں کہ انھیں غذاؤں کے ذریعہ سے عقائد کی اصلاح بھی ممکن ہے۔
سری کرشن جی اپنے ان منتروں میں یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ جس طرح اصلاح اخلاق کے مختلف ذرایع کام میں
لائے جاتے ہیں اسی طرح اصلاح عقائد کا سب سے مؤثر ذریعہ اصلاح حالت مزاج ہے جس میں سب سے بڑا جز

چنانچہ ہنود کے تصوف یعنی جوگ میں غذاؤں کی حالت پر ثرا زور دیا گیا ہی۔

अफलाकांक्षिभिर्य ज्ञोविधिदृष्टोय इज्यते ॥
यष्टव्य मेवेति मन समाधाय ससात्विक:॥ ११॥

ترجمہ جو جگ اس کے نتیجہ کی امید نہ رکھ کر اور فرض سمجھ کر با قاعدہ طور پر کیا جاتا ہے وہ ستوگنی کو مرغوب

ادھیائے ۱۷ منتر ۱۱

अभि संधायतु फलंदम्भा र्थमपि चैवयत् ॥
इ न्यते भरत श्रेष्ठ तं यज्ञं विद्धि राजसम् ॥ १२॥

ترجمہ۔ اے ارجن جو جگ آہوتی مطلب برآری کے لئے ہوئے عقیدہ سے کیا جاتا ہی اُسے رجوگنی

ادھیائے ۱۷ منتر ۱۲

विधि हीन मसृष्टान्नं मंत्रहीन मदाक्षणम् ॥
श्रद्धाविरहितं यज्ञं तामसं परि चक्षते ॥१३॥

ترجمہ۔ جو جگ آہوتی، منتر، دچھنا، بغیر عقیدہ بے قاعدہ طور پر کیا جاتا ہے اُسے تاستر گنی کہتے

ادھیائے ۱۷ منتر ۱۳

ان تین منتروں میں اس امر کا اظہار مقصود ہی کہ کس قسم کے عقائد سے عموماً کس قسم کے اعمال صادر ہوا کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اعمال ہمیشہ ارادہ کی طاقت سے صادر ہوا کرتے ہیں ارادہ کی سب سے زبردست قوت عقیدہ ہی یہ وہ مشین ہی کہ جس کی طاقت سے ارادہ کا پہیہ چکر کرتا ہے اور اس پہیئے کے چکر سے جسم انسانی کے اعضا حرکت کرتے ہیں۔ اس لئے اس سانچہ میں ڈھلکر جو شکل تیار ہوگی اُس کے خط و خال سے اُس سانچہ کی شکل نمایاں ہوگی جس طرح اخلاق کے اقسام ہیں اور انھیں اخلاقی کیفیات کے تناسب سے صدور اعمال ہوتا ہے ان عقائد کے نتائج اعمال کو اس جگہ ان منتروں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اعمال مذہبی خواہ جس قسم کے ہوں اُن کا منشا صدور کیفیت اعتقادی ہے لہذا انھیں اعمال سے کسی فرد خاص کی حالت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہی۔

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ عقائد کا تعلق عمر و تجربہ سے بھی بہت کچھ وابستہ ہے۔ ہر عمر میں جس طرح جذبات
کی کیفیت بدلتی رہتی ہے اُسی طرح ان کیفیات کے ساتھ عقیدہ بھی رنگ بدلتا رہتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ جذبات بھی
عوامل اعتقاد میں سے زبردست عامل ہے۔ اگرچہ عقیدہ بذات خود بھی ایک قسم کا جذبہ ہے۔ ہیوم کی رائے ہے کہ فرضی قصے
اور عقائد میں فرق یہ ہے کہ عقائد کے ساتھ میلان طبعی ہوتا ہے اور فرضی قصص کی حالت ایسی نہیں ہے۔ اس ذکر سے ہمارا
یہ مقصود نہیں کہ ہم یہاں حسیات سے بحث کریں بلکہ ہم اس صورت استدلال سے نتیجہ کو آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ وہ
طبعی یا فطری جذبہ جو زندگی کے کسی نہ کسی لمحہ یا گھنٹہ میں جاری و ساری رہتا ہے شخصی عقاید پر بالذات طور سے اثر ڈالتا ہے
یہ آثار بالواسطہ موثر نہیں۔ مذہبی جوش۔ سوشیل سرگرمی عشق، غصہ۔ میلان طبعی۔ یہ کیفیات شخص میں پیشتر سے پیدا ہو
اُن خیالات کو قبول کر لیتی ہیں جو ان میں سے کسی ایک کے مناسب ہوتی ہیں۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ عام طور
میں وہ اشخاص جو دموی المزاج ہیں یا جوانی میں جب کہ قوت جوانی اپنی پوری طاقت سے کام کرتی ہے تو اعتقاد کی قوت
بھی اصولاً بہ نسبت مرطوب المزاج آدمی سال خوردہ کے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ نیز یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ جیسا کہ جیمس
کی رائے ہے کہ ایک وہمی آدمی جس کا خیال ہمیشہ برائی کی طرف دوڑتا ہے جو احساسات کو مفلوج اور بے کار رہ جانے والا
بنا دیتا ہے اُس کے مظنونات کو عام طور پر لوگ یقین نہیں کرتے اگرچہ وہ قابل اطمینان بات بھی کہے۔ اوسط
درجہ کے امزجہ اس کے خلاف ہیں۔ جب کسی خاص اعتقاد سے جذبہ فطری موافق ہو جاتا ہے تو اس سے اعتقادات
پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جب کیفیت مزاجی کمزور ہوتی ہے تو اُسی نسبت سے اعتقاد کو بھی گزند پہنچ
جس وقت مذہبی سرگرمی سے عشق کم زور پڑ جاتا ہے اس وقت حسنی اعتقادات میں جن کو محسوسات ٹھہرا
ہوئے ہیں کمزوری آنے لگتی ہے۔ جس زمانہ میں جذبات کا اثر کمزور ہوا اُس وقت اگر اعتقاد کی حقیقت بتائی
جائے تو اُس کے تمام اجزا ترکیبی بیّن طور پر سامنے آجائیں گے۔ مسٹر ہن نے جومی ٹیلر کے اس مقولہ کو کہ "اعتقاد
کرو تو تم کو محبت ہوگی" بجائے اس کے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ محبت کرو تو تم کو اعتقاد ہوگا۔ نقل کرتے ہوئے
جذباتی عامل اعتقاد کے نفوذ کو تسلیم کرتا ہے۔ تحقیق حق تو خود ہی ایک جذبہ ہے جو انسان میں پیدا ہوتا ہے
صداقت کی محبت یہ ایک ایسا جملہ ہے جو بہت ہی پرمعنی ہے اکثر اس کا استعمال اس امر کے ثابت کرنے
کے لئے کیا جاتا ہے کہ جس چیز سے ہم کو محبت ہے وہ حق ہے۔ جیسا کہ سری کرشن جی اسی ادھیائے کے ستائیسویں شلوک

لکھتے ہیں کہ:-

यज्ञे तपसि दाने च स्थितिः सदिति चोच्यते ॥
कर्म चैव तदर्थीयं सदित्येवाभिधीयते ॥२७॥

ترجمہ- نیک اعمال- ریاضت اور خیرات پر اعتقاد رکھنا اور ان کا عمل میں لانا بھی ست کہلاتا ہے- ست یعنی حق سے عالم کا ظہور ہے اور اُسی کی وجہ سے عالم کو قیام ہے پس جگ، تپ وغیرہ اعمال کی پیدائش حق سے ہے اور ان کا عقیدہ راسخہ بھی حق پر مبنی ہے-

अश्रद्धया हुतं दत्तं तपस्तप्तं कृतं च यत् ॥
असदित्युच्यते पार्थ न च तत्प्रेत्य नो इह ॥२८॥

ترجمہ- جو نیک اعمال، خیرات اور زہد بے اعتقادی سے کئے جاتے ہیں وہ است کہلاتے ہیں اور ان کا زمانہ حال اور استقبال میں وجود نہیں ہے-

حق اور باطل کی تمیز کا نہ ہونا بے اعتقادی ہے اور وہ بے کار ہے اس لئے جو عمل بے اعتقادی سے کئے جاتے ہیں سب بے کار ہیں- اس وجہ سے کہ کسی عمل کا صدور اگر اس کے حق سمجھنے کے جذبہ سے خالی ہے جس کو ہم اعتقاد سے تعبیر کرتے ہیں تو عمل اضطراری یعنی بلا ارادہ سمجھا جائے گا ظاہر ہے کہ اعمال غیر ارادی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور نہ اُس کے کرنے والے پر کوئی حکم کیا جا سکتا جس طرح کہ مجانین کے اعمال غیر معتبر اور خارج از اعتبار ہیں اسی طرح اعمال غیر ارادی کا بھی حال ہے اس سے ثابت ہوا کہ اعمال سے پیشتر ارادہ کا ہونا ضروری ہے اور ارادہ کی بنیاد انہیں فطری جذبات پر ہے جو امزجہ کے تناسب سے خلقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتے ہیں جس کا مفصل ذکر پیشتر گزر چکا۔

نقوش

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے ۔۔۔ بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا!

رکھ ہاتھ دل پر میر کے دریافت کر کیا حال ہے ۔۔۔ رہتا ہے اکثر یہ جواں کچھ ان دنوں بیتاب سا
میرؔ

صُبحیات

مکرمی و محبی مولوی عبداللہ صاحب۔ عنایت نامہ پہنچا۔ جوبلی نمبر پہنچنے پر ایک خط مبارکباد کا بھیج چکا ہوں۔ اب اس عنایت نامہ کے جواب میں "صبحیات" کے عنوان سے کچھ اشعار بھیجتا ہوں۔

وحیدالدین سلیم۔ کرشنا منزل۔ چراغ علی کی گلی، حیدرآباد دکن

اُلٹ دیتا نقاب اُس گل کا اُلٹے ہاتھ سے میں بھی
سہارا اگر ترا تھوڑا سا اے بادِ سحر ہوتا

یکایک پو اگر پھٹتی تری صبحِ تجلّی کی
سحر کا رنگ دُھندلا صورتِ شمعِ سحر ہوتا

فرشِ زمیں پہ نورِ سحر لوٹنے لگا
جس جا شگفتہ کوئی گل یا سمن ہوا

پرتو سے تیرے حسن کے تارِ نظر مرا
روشن ہوا تو نورِ سحر کی کرن ہوا

روشن ہے تیرے عکس سے یہ جلوہ زارِ صبح
کلیاں ترے چمن کی ہے گویا بہارِ صبح

میں تیرہ بخت تجھ سے جدا اس طرح رہا
جس طرح شام ہو نہ سکی ہم کنارِ صبح

پیچھے ترے نہاں ہے وہ حسنِ نظر گداز
ہٹ جا نظر کے سامنے سے اے غبارِ صبح

کس بادشاہِ حسن کا لاتا ہے تو پیام
آتا ہے کس طرف سے تو اے شہسوارِ صبح

یہ تند مے ہے کس نے بھری جامِ مہر میں
اس راز کو بتائے گا کیا شیر خوارِ صبح

کیا نور کی پھوار سی پڑتی چمن میں ہے
گرتی کس آب و تاب سے ہے آبشارِ صبح

اے وہ کہ تیری ضو سے ہیں کافور ظلمتیں
تجھ پر نثار صبح ہے۔ میں ہوں نثارِ صبح

شبنم میں جس کے جام کو رکھ کر کیا ہے سرد
ساقی! پلا مجھے وہ مئے خوشگوارِ صبح

پرتو ترے جمال کا بھی اس میں ہے شریک
سورج کی روشنی پہ نہیں کچھ مدارِ صبح

کس لطافت سے یہ مے کھینچتی ہے بادِ سحر
دیکھ شبنم کی جھلک پھول کے پیمانے پر

شمع کو چھیڑ نہ اے موجِ نسیمِ سحری
دل لرزتا ہے مرا شعلہ کے تھرانے پر

یہ کیسی زندگی افسردہ ہے اے نوجواں تیری
کہ رو دیتی ہے آکر گھر میں تیرے صبح خنداں تک

نشاط آمادہ ہو۔ پھر خود نسیمِ فصلِ گل بن کر
پیامِ زندگی لے جا جوانانِ گلستاں تک

چاک سے میرے نکلتے ہیں ہزاروں خورشید
صبحِ رخشندۂ فطرت کا گریباں ہوں میں

بچ کے چل مجھ سے ذرا موجِ نسیمِ سحری
بزمِ قدرت کے لئے شمعِ شبستاں ہوں میں

ہوتا ہے وقتِ صبح عجب نور کا سماں
جب نرم نرم سبزہ بدلتا ہے کروٹیں

ہر باغ میں طیورِ سحر کے وہ چہچہے
ہر دشت میں نسیم کی وہ سرسراہٹیں

وہ چرخِ سبز فام پہ کرنوں کا پھوٹنا
پانی میں نورِ صبح کی وہ جھلملاہٹیں

پانی کی چادروں کے وہ پُرجوش زمزمے
گلہائے رنگ رنگ کی وہ مسکراہٹیں

موروں کا صحنِ باغ میں وہ رقصِ دلفریب
ہرنوں کی سبزہ زار میں وہ اچپلاہٹیں

وہ بلبلوں کا شاہدِ گل سے خطابِ عشق
وہ قمریوں کی سروِ چمن سے لگاوٹیں

وہ مندروں میں گھنٹیوں کا شورِ دل خراش
تسبیحِ زاہدانہ کی وہ گنگناہٹیں

سُن نغمہ گوشِ ہوش سے۔ گزرے جو بادِ صبح
تارِ شعاعِ مہر کو لرزاں کئے ہوئے

ہے کون شہ سوار کہ چوگانِ نور سے
لاتا ہے گوئے مہر کو غلطاں کئے ہوئے

اک بار نورِ صبح کی صافی میں چھان کر
دے مئے شفق کے رنگ کی پیرِ مغاں مجھے

پَو پھٹتے ہی جو صبحِ ازل میں ہوئیں عیاں
تجھ میں دکھائی دیتی ہیں وہ جھلکیاں مجھے

فلسفۂ مسرت

از

محمد لیاقت اللہ خاں صاحب نظر بریلوی

قلبِ انسانی واردات ومحسوسات کا ایک لطیف ساز ہے جس کے ہر پردے میں مختلف نغمے اور تاریں گوناگوں آوازیں پوشیدہ ہیں۔ خارجی تاثرات کا مضراب جب ان تاروں کو چھیڑتا ہے تو ان میں سے طرح طرح کے سرور انگیز یا درد خیز ترانے نکل کر فضائے ہستی کو اپنی کیفیات سے معمور کرتے رہتے ہیں اثر کو ہم کبھی آہ اور کبھی واہ کہتے ہیں۔ کبھی لذت اور کبھی الم سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان اپنی حیات شعوری میں ان کیفیات قلبی کے کسی ایک رُخ سے ہر لحظہ متاثر ہوتا رہتا ہے اور ہر وہ حالت جس میں الم یا انقباض نہ ہو یا افسردگی کے مقابلے میں لذت وانبساط کا احساس زیادہ ہو مسرت کہلاتی ہے۔ لذت اور مسرت میں یہ فرق ہے کہ لذت ایک وقتی احساس ہے اور مسرت ایک مستقل جذبہ۔ احساس ایک ابتدائی کیفیت ہے اور ارتقائے احساس کی آخری منزل جذبات مختلفہ تک پہونچکر ختم ہوتی ہے گویا احساس خالقِ جذبہ ہے یا یوں کہیے کہ احساسات وہ عناصر ہیں جن سے جذبات کی تکوین ہوتی ہے۔ خواہش کے پورے ہونے سے انسان جو کیفیت محسوس کرتا ہے اُس کو لذت کہتے ہیں اور ناکامی کے مایوس کن اثر کا نام الم ہے۔ مسرت یا غم اُس کیفیت ثانیہ کا نام ہے جو قلب انسانی میں لذت والم کے پیہم محسوس ہونے سے شگفتگی یا افسردگی کی شکل میں پیدا ہوجاتی ہے۔ بہر تقدیر مسرت وغم محض اعتباری یا اضافی کیفیات ہیں جن کی ہستی باہم دگر لازم وملزوم ہے۔ ایک کا قیاس دوسرے کے وجود کے بغیر ممکن نہیں۔

خوش رہنے کی تمنا جس قدر عام ہے اُسی قدر محدود تعداد اُن اشخاص کی ہے جو خوش رہنے کا طریقہ جانتے ہوں۔ دنیا ایسے آدمیوں سے خالی نہیں جن کے پاس ہر طرح کا سامان مسرت موجود ہے لیکن پھر بھی افسردہ رہتے ہیں۔ افسردگی اُن کی فطرت ہے۔ اگر ایسے اشخاص جنت الفردوس میں بھی ہوں تو غمگین رہنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ

کسی کی ذات میں مسرت وبہجت کی استعداد نہ ہو تو روئے زمین کے کل خزانے حسن اور اس کی دلچسپیاں
خوش نہیں کر سکتیں۔ بلاشبہ قدرت ہمارے واسطے خوش رہنے کا سامان مہیا کر سکتی ہے مگر خوش نہیں کر سکتی
اس لئے کہ خوشی ایک اکتسابی شے ہے اور خوش رہنا خود ہماری ذاتی سعی پر منحصر ہے۔ ایک شخص اپنی موجودہ
حالت سے دل برداشتہ و پریشان خاطر رہتا ہے۔ دوسرا ہر شے میں اپنی مسرت کا سامان دیکھ لیتا ہے اور خوش
رہتا ہے۔ ان میں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسرت کی تلاش مسرت کے منافی ہے اور مسرت کی جستجو نہ کرنا ہی

مسرت

نمائش گاہ ہستی میں ہر شخص ظاہری اسباب مسرت فراہم نہیں کر سکتا لیکن یہ ہر شخص کے اختیار میں ہے کہ
انہیں چیزوں سے جو اس کے قبضہ قدرت میں ہوں محظوظ ہونے کا عادی بنے۔ رسکن کہتا ہے کہ "اسباب مسرت کی
تلاش نہ کرو بلکہ ہر شے سے اکتساب حظ کی کوشش کرو۔" دنیا کو دار المحن کہنا انسان کی انتہائی ناشکرگزاری ہے۔
ہماری زندگی دراصل خوشی کی زندگی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں غم کا وجود نہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ انسان
دنیا میں خوش رہنے کے واسطے پیدا ہوا ہے اور بقول ایپکٹیٹس کے "اگر کوئی خوش نہیں تو قصور خود اس کا ہے"
معمولی تکلیفوں اور چھوٹی چھوٹی تشویشوں کو مصائب کے نام سے پکارنا اور ان سے مرعوب ہو کر ان کو
فی الحقیقت مصیبت بنا لینا صرف ناشکرگزاری ہی نہیں بلکہ انتہا درجہ کی کمزوری ہے۔ پانی کے ایک قطرے کو جسے
ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں اگر خوردبین سے دیکھیں تو قطرہ سمندر معلوم ہوگا اور چھوٹے چھوٹے کیڑے جنہیں ہم
اپنی کمزور نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے بڑے بڑے جانوروں کی مثل لاکھوں کی تعداد میں تیرتے ہوئے نظر آئیں گے
اور ایک ایسا بھیانک منظر پیش کریں گے جو روزانہ پانی پیتے وقت کبھی خیال میں نہ آیا ہوگا۔ اسی طرح ایک معمولی
تشویش کا نظارہ بھی قوت واہمہ کی خوردبین کی مدد سے بہت بھیانک اور مصیبت آفریں بن جاتا ہے اور ایسا ہی پریشان
و رغارت گر صبر و شکیب ثابت ہوتا ہے جیسی کہ بڑی سے بڑی مصیبتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اسی تشویش کو اہمیت
نہ دیں اور اپنے تصور میں اس کی بری سے بری خیالی تصویر نہ بنالیں تو وہ اندوہناک ہرگز نہیں ثابت ہو سکتی۔
کلارک اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ "ہزارہا غم ایسے ہوتے ہیں جن کے پرواز میں ہم مخل نہ ہوں تو بہت جلد
اڑ جائیں" بلاشبہ اگر ہم چاہیں تو ہمارا اندوہ سے بآسانی سبکدوش ہو سکتے تھے۔ غم کو غم نہ سمجھنا ہی مسرت

پڑے کہ ایسی صورت میں خارجی واقعات باقی رہتے ہیں مگر تاثیر بدل جاتی ہے۔ اسی فلسفہ کو غالب اس طرح بیان کرتا ہے

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مصیبت کا برداشت کرنا گوئیٹے کے الفاظ میں "مقدر کو فتح کرنا ہے"۔ عقلمند انسان مصیبت پر بیٹھ کر رویا نہیں کرتا بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصیبت سے ڈرنا خود ایک مصیبت ہے۔ اس طرح ہم اکثر فرضی مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں جو دراصل وقوع پذیر بھی نہیں ہوتے۔ ڈر انسان کو دماغی کاوشوں میں مبتلا رکھتا ہے اور سکون قلب کا دشمن ثابت ہوتا ہے جو خوشی کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ شیکسپیر کہتا ہے کہ "بزدل انسان اپنی موت سے پیشتر ہزار مرتبہ مرتا ہے اور بہادر انسان بجز ایک مرتبہ کے کبھی نہیں مرتا"۔

زندگی کی مشکلات جن کو ہم مصائب سے تعبیر کرتے ہیں دراصل ایک حد تک مسرت کی ممد و معاون ہیں۔ مشکلات پر فتح پانا اور مصائب کا برداشت کرنا اپنے اندر خوشی کا خزانہ مخفی رکھتا ہے۔ نسیم بہار کے جھونکے، جنگل کی سرد ہوا اور برسات کے دلفریب مناظر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت بخشتے رہتے ہیں لیکن ریگستانوں میں موسم گرما کی تمازت آفتاب اور قطبین میں برف باری اور طوفان کا دلیرانہ مقابلہ کرنے والے بھی کم لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ہر تبدیلی جو بادی النظر میں مصیبت معلوم ہوتی ہے دراصل مصیبت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ظاہری شکل اکثر فریب دہ ہوتی ہے اور نظر تعمق سے دیکھا جائے تو ہماری اکثر کلفتیں اور مصائب چھپی ہوئی نعمتیں ہوتی ہیں۔

مصائب کا ہونا اس لئے بھی ضروری ہے کہ انسان آسایش اور راحتوں کا پورا لطف اٹھا سکے۔ ایک عربی مثل ہے کہ "ہر چیز کا عرفان اس کی ضد سے ہوتا ہے"۔ انسان محنت نہ کرے تو آرام میں کیا لطف پائے گا۔ اگر جدائی نہ ہو تو وصل میں کیا لذت ہو سکتی ہے؟ تندرستی کا لطف وہی سمجھ سکتا ہے جو بیماری کی صعوبتیں اٹھا چکا ہو۔ پانی ہر تشنہ لب کے لئے خوشگوار ہوتا ہے مگر اس کی لذت اس روزہ دار سے دریافت کرنا چاہئے جس نے گرمیوں کا پہاڑ سا دن غروب آفتاب کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گزارا ہو۔

خوش رہنے کے واسطے کسی خاص ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ خوشی انسان کا فطری انعام ہے جس سے ہر امیر و غریب۔ ذی مرتبہ اور رادنےٰ طبقہ کا شخص یکساں طور پر بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ پھولوں کی سیج پر لیٹ

بچے کو تھپک تھپک کے سلاتی ہے لیکن ایک غریب مزدور ٹوٹی ہوئی چٹائی اور پھٹے ہوئے ٹاٹ پر اپنے جگر کو کلیجے سے لگائے ہوئے رات بسر کرتی ہے۔ گو ظاہری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن باطنی بات کا اثر دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔

جاہ و عزت۔ شان و شوکت خوش رہنے کے واسطے ضروری نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم جس قدر بلند مرتبہ ہوتے اسی قدر زیادہ خوش ہوتے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی خوشی محض حریف کے مقابلے میں حاصل ہوتی ہے زمیندار اس وجہ سے کہ وہ کسانوں سے یا راجہ اس وجہ سے کہ وہ زمینداروں سے بلند مرتبہ ہے خوش نہیں ہوتا۔ اسی طرح بادشاہ کو راجاؤں سے بلند مرتبہ ہونے کی وجہ سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن وہی زمیندار قرب و جوار کے دیگر زمینداروں کے مقابلے میں امیر سمجھا جاتا ہو یا سرکار میں اس کا اعزاز مقابلۃً زیادہ ہو تو اس تفوق کی وجہ سے جو اس کو دوسرے زمینداروں پر حاصل ہوتا ہے مسرور رہتا ہے۔ اسی طرح راجہ دوسرے راجاؤں کے مقابلے میں اور بادشاہ اپنے ہم چشم بادشاہوں کے مقابلے میں ممتاز ہو کر خوشی حاصل کرتا ہے۔

مقابلہ اعلےٰ اور ادنےٰ ہر طبقہ کے واسطے عام ہے لہذا بلند و ممتاز ہونے کی خوشی میں امیر و غریب سب کا یکساں حصہ ہے۔ ایک درزی جو اپنے کام میں ماہر ہو اور اس کے مقابلہ کا دوسرا درزی شہر بھر میں نہ ہو ممتاز ہونے کی خوشی سے اُسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح ایک فوجی افسر یا سلطنت کا ناظم یا مصنف جن کی شہرت تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہو۔ اس جگہ یہ کہنا شاید ناموزوں نہ ہو کہ دوسروں سے ممتاز اور بلند ہونے کی خوشی پائدار نہیں ہوتی کیوں کہ جب ہم کسی حریف سے بلند ہو جاتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ہم اس مسرت سے لطف اندوز ہوں نئے حریف پر اپنی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں اور ہم اُن سے بلند ہونے کی سعی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں جب تک ایک بھی مدِ مقابل رہتا ہے جاری رہتی ہے اور جب کوئی نہیں رہتا تو اس مسرت ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے [illegible] دارو مدار مقابلہ پر تھا۔

مسرت کا انحصار فراوانیِ دولت پر بھی نہیں ہے۔ ان دو تاجروں کے حالات پر غور کیجئے جو مساوی سرمایہ سے زر کی سعی میں منہمک ہیں۔ ایک شخص کو پہلے مہینے میں بارہ سو پھر گیارہ سو اور اسی ترتیب سے سال بھر ہر مہینے [illegible] روپیہ کم کا نفع ہوا اور دوسرے شخص کو پہلے مہینے میں سو، دوسرے مہینے میں ایک سو دس اور اسی طرح ہر

مہینے میں پچھلے مہینے سے دس روپیہ زیادہ کا نفع ہو تو سال ختم ہونے پر باوجودیکہ پہلے شخص کا کُل نفع دوسرے شخص
کے کُل نفع سے تعداد میں زیادہ ہوگا لیکن ان دونوں کی خوشی میں بیّن فرق ہوگا۔ اس لئے کہ پہلا تاجر باوجود کثیر نفع
ناکام ہے اور دوسرا اپنے نفع میں تدریجی ترقی دیکھ کر شادماں۔

حقیقتاً مسرت کے لئے دولت مستلزم نہیں۔ جو شخص نیک عمل نہ ہو اور جس کا دل محبت کے خزانے سے پر
نہ ہو وہ زر اور طاقت کا مالک تو بن سکتا ہے مگر خوشی نہیں حاصل کر سکتا۔ تمام حکمار کا اس پر اتفاق ہے کہ خوشی
سے نہیں خریدی جا سکتی اور نہ طاقت سے مفتوح ہو سکتی ہے۔" میں نے کسی کتاب میں اس بادشاہ کی حکایت
دیکھی ہے جو ہر وقت متفکر رہتا تھا اور آخر نجومیوں سے خوش رہنے کی ترکیب پوچھی۔ نجومیوں نے جواب دیا۔
کسی شخص کا کرتا جو ہمیشہ مسرور رہتا ہو مل جائے تو آپ اس کو پہن کر خوش رہ سکتے ہیں۔ ایک مدت تلاش کرنے کے بعد
ایک شخص ایسا ملا بھی تو بدقسمتی سے اُس کے جسم پر کرتا ہی نہ تھا۔ ینگ اپنی ایک نظم میں کہتا ہے کہ "دولیا زر
سے انسان کو حقیقی مسرت حاصل ہو سکتی ہے؟ اپنے چاروں طرف دیکھو کس قدر خوشنما مصائب اور شاندار تکلیفیں
دکھائی دیتی ہیں۔ میں اس باطنی رنج و آلام پر جس پر نمائشی شان و شوکت کا ملمع ہو رشک نہیں کر سکتا۔"

بلاشبہ افلاس فکر و تشویش کا باعث ہے مگر حصول دولت سے فکر و تشویش کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی نوعیت
بدل جاتی ہے۔ حضرت سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

اگر دنیا نباشد دردمندیم
وگر باشد بمہرش پای بندیم

زنجیر اگرچہ سونے کی ہو زنجیر ہی ہے۔ آسکن کہتا ہے کہ "جھونپڑے میں رہنا اور چھپر کھٹ کا خواب دیکھنا
مسرت بخش ہے بہ نسبت اس کے کہ محل میں رہے اور تمنا کرنے کے لئے کوئی چیز نہ ہو۔"

خواہشات نفسانی کا پورا ہونا موجب مسرّت نہیں۔ کیونکہ نفسانی خواہشوں کے پورے ہونے سے جو لذت
حاصل ہوتی ہے وہ وقتی ہوتی ہے۔ لذیذ سے لذیذ کھانا کھا چکنے کے بعد اس کی لذّت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پلاؤ اور
باجرے کی روٹی حلق سے نیچے اُترنے کے ساتھ ہی برابر ہو جاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ ان لذتوں کے تواتر
سے احساس لذّت میں کمی آنے لگتی ہے یعنی وہ اعضا جن سے ہم کسی لذت کا احساس کرتے ہوئے متواتر

رح کام کرتے کرتے اُس لذت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کتنا ہی مرغوب طبع کھانا ہو مگر جب روزانہ کھایا
ئے تو پیشتر کی طرح لذیذ نہیں رہتا۔

انسان کے طبائع اس قدر مختلف ہیں کہ وثوق کے ساتھ کوئی ایسی شاہراہ جس پر چلنے سے ہر انسان خوش
سکے معین نہیں کی جاسکتی۔ جس طرح خوشی ایک اضافی یا اعتباری کیفیت ہے خوشی کے اسباب بھی اعتباری
ہیں۔ وہی چیز کسی کو خوش کرتی ہے اور کسی کو رنجیدہ۔ ایک ہی چیز بہ اوقات مختلف کبھی خوشی کا باعث ہوتی ہے اور کبھی رنج
ہٰذا میں صرف انہیں چیزوں کا بیان کروں گا جن سے اکثر اشخاص عام طور پر خوش نظر آتے ہیں۔

دنیا میں محبت صرف ایسی چیز ہے جس کو انبساط و مسرت کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ اشخاص جو تجرد کی زندگی بسر
نہیں کرتے بلکہ اپنے عزیز و اقربا، بیوی بچوں اور یار دوستوں کی صحبت میں اپنا وقت گزارتے ہیں اکثر خوش
رہتے ہیں۔ بچوں کی معصومیت۔ والدین کی شفقت۔ بہنوں کی محبت۔ بھائیوں کی ہمدردی گھر کو جنت کا نمونہ
بنادیتی ہی۔ جیریمی ٹیلر کہتا ہی "جو شخص اپنے بچوں سے محبت کرتا ہی وہی کہہ سکتا ہے کہ ان حسین امانتوں کے کتنے
الفاظ انسان کے دل کو رقص میں لانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ ان کی بچپن کی ادائیں ان کے ادھورے
بول۔ ان کا روٹھنا۔ ان کا بھولا پن۔ ان کی ضروریات اس شخص کے لئے جو ان سے محبت کرتا ہو اور ان کی صحبت
سے لطف اٹھاتا ہو راحت و مسرت کے چھوٹے چھوٹے سرچشمے ہیں لیکن جو شخص اپنے اہل و عیال سے محبت نہیں
کرتا ایک روحانی عذاب میں مبتلا رہتا ہے اور ایسے شخص کو خدا کی کوئی نعمت خوش نہیں کرسکتی" محبت خواہ وہ
کسی ایک مخصوص ہستی سے ہو یا عامۃ الناس سے ایک ایسی مسرت ہی جو کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی اور ایک ایسا
نشہ ہی جس کا اثر ماحول کو پُرکیف بنادیتا ہی۔ اس کی کلفتیں فرح بخش اور کاوشیں روح افزا ہوتی ہیں۔ ملٹن نے
خوب کہا ہے "باہمی محبت انسانی خوشی کی انتہا ہی"

مشاغل میں مصروفیت انسان کو خوش رکھتی ہی۔ یہ مسلم امر ہے کہ انسان کے خیالات اسی وقت پریشان
رہتے ہیں جس وقت کوئی کام اُس کے سامنے نہیں ہوتا۔ ایک ہفتہ کی محنت شاقہ انسان کو اس قدر مضمحل نہیں
کرتی جتنی ایک دن کی پریشانی۔ انسان تھک کر جب آغوش سکون میں آرام کا طالب ہوتا ہو تو ایک ایسی
محسوس کرتا ہی جو عیش پرست کو کبھی میسر نہیں آسکتی۔ وہ مشاغل جو جسمانی محنت سے متعلق ہیں انسان کی صحت و

ستی کے لئے ضروری ہیں اور تندرستی ایک مسلمہ نعمت ہے۔ تندرست انسان اپنے اندر بغیر کسی خارجی سبب کے
سرت کی لہریں محسوس کرتا ہے۔ لانگ فیلو کا مقولہ ہے کہ "تندرستی کی موجودگی میں زندگی راحت و مسرت سے
ہیں کورٹ کہتا ہے کہ "دماغی محنت راحت قلب کا موجب ہے" لہذا ہر وہ معصوم مشغلہ جو ہماری توجہ کو جذب کر سکے
ام اس سے کہ اُس کا تعلق جسمانی محنت سے ہے یا دماغی ریاضت سے مسرت کا باعث ہوتا ہے۔

خوش آیند توقعات میں بھی خوشی کا راز مضمر ہے بشرطیکہ ان کی بنیاد نیکی پر ہو۔ نیک اعمال باوجود تکالیف کے
فرح بخش ہوتے ہیں اور عصیاں اگرچہ ان سے وقتی لذت حاصل ہوتی ہے حقیقی خوشی کو غارت کرنے والے ثابت
ہوتے ہیں۔ کسان کی مشقت، طالب علم کی محنت، مصنف کی دماغ سوزی۔ شاعر کی فکر اور زاہد کا ریاض خوش
آیند توقعات کی وجہ سے اپنے اندر خوشی کا وہ خزانہ رکھتے ہیں جو وقتی لذتوں کا بڑے سے بڑا ذخیرہ بھی ہم نہیں پہنچا
سکتا۔ لہذا خوشی کے لئے ضروری ہے کہ انسان ایسے مشاغل جن سے آئندہ توقعات وابستہ ہوں اختیار کرے اور
اپنا دماغ خوش آئند تصورات میں منہمک رکھے۔ توقعات یا امیدیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو خود ہمارے عمل پر
منحصر ہوتی ہیں اور ایک وہ جن کا انحصار ہماری سعی پر نہیں ہوتا۔ پہلی قسم خوشی کی حامل ہوتی ہے لیکن دوسری قسم
ہم کو بہت جلد بے صبر بنا دیتی ہے اور انتظار تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

عام طور پر تمناؤں کا شاہد مقصود سے ہم آغوش ہو جانا مسرت کن خیال کیا جاتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ خواہشوں
کو پورا کرنے کے بجائے خواہشوں کو محدود کرنے میں حقیقی مسرت ہے۔ کیونکہ آرزوؤں کا سلسلہ لامتناہی ہے پھر ہر خواہش
کا پورا کرنا انسان کے احاطۂ اختیار میں نہیں مگر یہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ خواہشوں کو روکے اور اُن پر غالب آجائے۔
صوفیائے کرام نے نفس کو مغلوب کیا اور خواہشوں کو اپنا مطیع بنا کر وہ مسرت پائی جو کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی
سلطان سنجر نے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی کو ملک نیمروز نذر کرنا چاہا لیکن حضرت نے ذیل کا قطعہ جواب میں تحریر فرما
جس سے آپ کا استغنا ظاہر ہوتا ہے ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد | در دل بود اگر ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب | من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

وہ طرز معاشرت جو انسان کو سادہ زندگی بسر کرنے میں مدد دے سبب مسرت ہوتی ہے اور اُس کی

انبساط کا پیغام بن جاتی ہو۔ ایک عیش پرست اپنے دستر خوان کے لذیذ کھانوں میں اُس سے زیادہ لطف نہیں ایک دہقان اپنی سوکھی روٹی میں پاتا ہی۔ اسی طرح ان دو شخصوں کی حالت پر غور کیجیے جن میں سے ایک اپنا دن مزدوری میں گزارتا ہی اور دوسرا شطرنج کھیلنے میں۔ دونوں کو اپنے اپنے مشغلہ میں دلچسپی ہوتی ہی اور اپنا وقت اطمینان سے گزارتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ مزدور کے واسطے تعطیل ایک نعمت ہوتی ہے برخلاف اس کے شطرنج باز کے لئے تعطیل قیامت ہوتی ہے یعنی اس کو شطرنج کھیلنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے اپنا دن کاٹنا ایک مصیبت ہو جاتا ہی وہ مضطرب رہتا ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ کیسا ہی تکلیف دہ فعل ہو جب انسان اس کا عادی ہو جاتا ہی تو پھر تکلیف کا احساس باقی نہیں رہتا۔ آتش کہتا ہے ؎

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انسان

زہر پی کر مزۂ شیر و شکر لیتا ہے

مضمون طویل ہو گیا۔ آخر میں صرف اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ خوشی کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہر وہ انسان جو مقصد حیات کو سمجھے۔ اپنے مفوضہ کاموں میں وقت کو صرف کرے۔ خواہشوں کو محدود کرے طمع و حسد خود غرضی اور تکبر جیسی خصائل رذیلہ سے بچے۔ خدمت خلق اور باہمی محبت و ہمدردی کو اپنا شیوہ بنائے خوشی کی زندگی بسر کرتا ہے۔

سقراط کہتا ہے کہ ”دنیا میں سب سے بہتر انسان وہ ہی جو اپنی ذات کو کامل بنانے کی کوشش کرے اور سب سے زیادہ خوش وہ ہے جو یہ محسوس کرے کہ وہ کامل بن رہا ہی“

تحفۂ عید

از ممتاز احمد صاحب بسمل

سنتے ہیں جلوہ گر ہی فلک پر ہلال عید ۔۔۔ اے چشم شوق تجھ کو مبارک وصال عید

چہرے سے اپنے آج ہٹا دو نقاب کو ۔۔۔ پنہاں جمال میں ہی تمہارے جمال عید

شوق سے ملتے ہیں یاران وطن آج گلے ۔۔۔ تجھ سے فرقت میں سلے رنج و محن آج گلے

نامۂ شوق بنے وجہ مسرت بسمل ۔۔۔ یوں ملے دور سے اہل وطن آج گلے

غزل بے نظیر ہم رنگ غنچۂ وزیر

از

استاد فرزانہ ابوالمعانی مرزا یاس یگانہ لکھنوی

زمیں کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پہ آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

زبانِ دل خراش و داستانِ ظلم ارے توبہ
دہلتا ہے قفس ہنگامۂ آرا الاماں ہو کر

ہزاروں کے دور میں دل کی لگی بجھتی تو کیا بجھتی
ہمیں خود آشیاں سے اُڑ گئے ہو کر دھواں ہو کر

نوید خشک سن کر جن کے منہ سے پھول جھڑتے تھے
چمن کو صبر کر بیٹھے وہ آخر بدگماں ہو کر

وبالِ رنگ و بو سے چھوٹتے ہی پر نکالیں گے
گرانبارِ بہار آخر سبکدوشِ خزاں ہو کر

زمانے بھر کے منہ تکتے ہیں کیوں اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہی جن کو رنگ و بوئے رائگاں ہو کر

بہارِ لکھنؤ کو خونِ دل سے کس نے سینچا ہے
خدا لگتی بھی کہہ دے گا کوئی تیغِ زباں ہو کر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر

ہزاروں شمع لاکھوں دل تری محفل میں جلتے ہیں
جلیں گبر و مسلماں کیوں نہ یکدل یک زباں ہو کر

پرائے درد کی کوئی نگہبانی کرے کب تک
حقیقت کھل نہ جائے اضطرابِ ارزاں ہو کر

جہنم ہو کہ جنت طائرِ جاں تھم نہیں سکتا
کہیں پرواز کی حد مل سکے گی لامکاں ہو کر

خودی کی کیفیت سے چونکتے ہی دیکھتا کیا ہوں
کہ اُترا نشۂ ہستی خمارِ جاوداں ہو کر

پیامِ غفلتِ جاوید ہے جلوہ حقیقت کا
سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خوابِ گراں ہو کر

اُٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیبِ دشمناں ہو کر

پھڑکتے ہیں مگر بے درد منہ سے کچھ نہیں کہتے
نگاہِ یاس نے مارا ہے درد بے زباں ہو کر

روشنی کی رفتار

از

مولوی حامد حسن صاحب قادری اڈیٹر سعد

روشنی کی رفتار کا اندازۂ تحقیق سائنس کے تجربات و تحقیقات کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ اس دریافت نے علم ہیئت کے بعض نازک و لاینحل مسئلے حل کر دیئے۔ مثلاً آفتاب کا فاصلہ اس سے بھی قبل دریافت کیا گیا تھا۔ ریمر اور ...ے نے قابل قدر اصول دریافت کئے اور ان کے مطابق زمین سے آفتاب کے فاصلہ کا اندازہ کیا گیا۔ لیکن ...ارِ نور کے علم نے اس فاصلہ کو قطعی متعین کر دیا۔

روشنی کی رفتار کا اندازہ کرنے کے لئے مختلف چیزوں کی رفتار پر غور کرو۔ ایک میل ٹرین پلیٹ فارم سے کس سرعت کے ساتھ گزرتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک لمحہ میں آئی، گزری اور غائب ہو گئی۔ رائفل کے نشانہ ...قریب کھڑے ہو کر دیکھو کہ گولی کیسی تیزی سے آواز کے ساتھ ہی نشانہ پر آکر لگتی ہے جتنا فاصلہ میل ٹرین ایک منٹ میں طے کرتی ہے گولی ایک سکنڈ سے کچھ ہی زیادہ عرصہ میں طے کر لیتی ہے۔ اب ایک قدم اور بڑھاؤ، دیکھو شہاب ...س سرعت سے فضائے آسمانی میں سفر کرتا اور آنِ واحد میں ایک سنہری لکیر بنا کر مٹ جاتا ہے۔ شہاب کی رفتار گولی ...رفتار سے بدرجہا تیز ہے یعنی انتہائی تیز رفتار گولی سے بھی نوگنی زیادہ۔ ایک نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری اشیا ... معلومہ میں کسی چیز کی رفتار شہاب کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن روشنی کی رفتار سے اس کو بھی کوئی نسبت ...۔ ایک چھوٹا بچہ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنی دیر میں دوڑ کر پہنچتا ہے اس کی رفتار پر غور ...ور شہاب کی سرعتِ سیر پر نظر کرو۔ جس طرح شہاب کی رفتار بچے کی رفتار سے کہیں بڑھی ہوئی ہے اسی طرح ...شنی کی رفتار شہاب کی رفتار سے بمراتب زیادہ ہے۔

بظاہر ایسی محیر العقول رفتار کی پیمائش ناممکن معلوم ہوتی ہے، برقی پیغام بجلی کے تار پر جس سرعت سے سفر ...ہی روشنی کی رفتار اس سے دس گنی زیادہ سریع السیر ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زیر آب پیغام رسانی کے ذریعہ

کے مقابلے میں ایک سوگنی زیادہ تیز رفتاری سے زمین پر آجاتی ہیں۔ جو سیارے کے سب سے تیز رفتار سیارے کی رفتار کی
رفتار نور کے ایک ہزارویں حصہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہماری زمین اٹھارہ میل فی سکنڈ کی رفتار گردش دور
کرتی ہے۔ جب ہم اوپر کو سانس لیتے ہیں تو سانس کو نیچے چھوڑنے سے قبل زمین میں میل سے زیادہ فاصلہ طے کر
لیتی ہے۔ پھر بھی زمین کی رفتار کے مقابلے میں کچھ بھی حقیقت نہیں۔ زمین کی حرکت ایک چھوٹی سی شمع سے نکلنے والی شعاع
کی رفتار کے دس ہزارویں حصے کے برابر بھی نہیں۔ آکسیجن اور ہائڈروجن کے مرکب کو جلانے سے کس قدر رہیبت ناک
آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور کس حیرت انگیز سرعت سے پھٹنے والے گیسوں میں آگ پھیل جاتی ہے۔ لیکن اس کی رفتار
روشنی کی رفتار کے سامنے بالکل بے حقیقت ہے۔ اس آگ کی رفتار ایک لاکھ گنی بڑھ جائے تب کہیں اس روشنی
رفتار سے مقابلہ کر سکتی ہے جو اس آگ سے نکل کر فضائے بسیط میں سفر کرتی ہے۔ کوہ آتش فشاں کا پھٹنے کا دنیا میں
سے عظیم الشان اور پر ہیبت واقعہ حادثہ کراکٹوا تھا۔ اس حادثہ کی اطلاع تموجات ہوائی کے ذریعہ سے ہزاروں
پہونچی تھی لیکن باوجود اس سرعتِ تموج کے ہوا نے جس رفتار سے آواز رسانی کی خدمت انجام دی وہ ایتھر کی
کے دجور روشنی کے سفر کا ذریعہ ہے) اس لاکھویں حصہ کے برابر تھی۔ بڑے بڑے طوفان میں جو شہروں کے تختے
دیتا ہے جہازوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور ہزاروں جانوں کو لقمۂ اجل بنا دیتا ہے۔ اس قیامت خیز ہوا کو اس رفتار کا ایک د
حصہ بھی کبھی نصیب نہیں ہوا جس رفتار سے روشنی کی ایک شعاع مکھی کے پر کی نازک جھلی سے بغیر کسی آزار ر
کے گزر جاتی ہے۔ دم دار ستارے بعض اوقات نہایت سرعت سے حرکت کرتے ہیں لیکن کس قدر دلچسپ با
کہ جس زمانے میں ہیلیر کومٹ (ایک خاص دم دار تارہ جو اپنے دریافت کرنے والے ھیلی کے نام سے موسوم ہے)
نظام شمسی سے سب سے بعید فاصلہ پر تھا اس نے ایک سکنڈ میں اس فاصلہ کا دس کروڑواں حصہ بھی طے نہیں کیا جو ر
تنے وقت میں طے کر لیتی ہے۔ خون جو ہماری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے اگر چاہے کہ اس رفتار کا مقابلہ کرے جس
شعاع نور ہمارے پردۂ چشم پر پڑتی ہیں تو اس کو اپنی رفتار ایک کروڑ گنی کرنی پڑے گی۔

روشنی کی اس سرعتِ رفتار پر نظر کر کے مشکل سے یقین آسکتا ہے کہ اس کا صحیح تعین ممکن ہے۔ اور اگر ممکن
ہے تو اس کے لئے نازک اور مکمل آلہ کی ضرورت ہوگی۔ رفتارِ نور کی دریافت کے لئے سب سے صحیح اور قطعی ذریعہ
[illegible] ہے ہم اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ تم ایک آئینہ کے سامنے کھڑے ہو اور تمہارے اور آئینہ کے بیچ میں ایک متحرک دیوار یا پردہ حائل
ہے اور اس دیوار میں مساوی فاصلہ پر تین کھڑکیاں ہیں جس وقت کوئی کھڑکی ٹھیک تمہارے چہرے کے سامنے ہوگی
تمہارا عکس آئینہ میں نظر آئے گا اور جب کھڑکی سامنے سے ہٹ جائے گی اور دیوار کا حصہ مقابل آجائے گا تو عکس نظر
نہ آئے گا۔ اب فرض کرو پردہ متحرک اپنی جگہ پر رہے اور آئینہ کو بہت دور مثلاً دس میل کے فاصلہ پر رکھ دیا جائے۔ اس صورت
میں اگرچہ دس میل کے فاصلہ پر تم کو اپنا عکس آئینہ میں نظر نہیں آسکتا۔ لیکن یہ کوئی دشوار امر نہیں۔ ہم دوربین سے مدد
لے سکتے ہیں اور اتنے فاصلے پر بھی عکس نظر آسکتا ہے اس لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک شخص آئینہ سے دس میل کے فاصلہ
پر کھڑا ہوا اپنی شکل آئینہ میں دیکھ رہا ہے۔ جب دیوار متحرک کی پہلی کھڑکی اس شخص کے چہرے کے مقابل آئے گی تو روشنی
اس کے چہرے سے آئینہ تک دس میل کا سفر کرے گی اور دس میل واپس آئے گی۔ اس بیس میل کے سفر میں کچھ
نہ کچھ وقت صرف ہوگا اس لئے کہ روشنی کی رفتار کتنی ہی تیز سہی پھر بھی غیر محدود تو نہیں ہے روشنی کی اس آمد و رفت
میں ایک سکنڈ کا دس ہزارواں حصہ صرف ہوتا ہے۔ اور اگر اس عرصہ میں دیوار اتنی دور نہ ہٹ جائے کہ پہلی اور دوسری
کھڑکی کا درمیانی حصہ چہرے کے مقابل آکر عکس کو آئینہ پر پڑنے سے مانع ہو تو انسان پہلی کھڑکی میں سے اپنا عکس
بالیقین دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر دیوار متحرک کی رفتار تیز کردی جائے تو قبل اس کے کہ روشنی آئینہ سے واپس آئے
پہلی اور دوسری کھڑکی کے درمیان کا حصہ دیوار چہرے کے مقابل آجائے گا اور آدمی اپنا عکس آئینہ میں نہ دیکھ سکے گا
فرض کرو کہ دیوار متحرک کی رفتار کو اور تیز کردیا جائے تو اب یہ صورت ہوگی کہ جتنی دیر میں روشنی بیس میل کا سفر کرے گی
اتنی دیر میں اتنی دور ہٹ جائے گی کہ روشنی کی واپسی سے قبل پہلی اور دوسری کھڑکی کے درمیان کا حصہ دیوار
چہرے کے مقابل سے گزر جائے گا اور جب روشنی واپس آئے گی تو اس کی شعاعیں دوسری کھڑکی میں سے گزر کر
آدمی کی آنکھ پر پڑیں گی۔ اب یہی تجربہ پھر کیا جائے اور اب کے دیوار کی رفتار کو اور بھی تیز کردیا جائے تو اس مرتبہ
روشنی کے پہلی کھڑکی سے گزرنے کے بعد اس کے واپس آنے سے قبل پہلی اور دوسری کھڑکیوں کا درمیانی حصہ
نیز دوسری کھڑکی چہرے کے سامنے سے گزر جائیں گے اور دوسری اور تیسری کھڑکی کے درمیان کا حصہ
آکر روشنی کو نگاہ تک پہونچنے سے روک دے گا۔ اب کے ایک بار پھر تجربہ کیا جائے اور دیوار کی رفتار
پہلے سے بھی بڑھا دیا جائے تو تیسری کھڑکی چہرے کے مقابل آجائے گی یعنی جتنے عرصہ میں روشنی پہلی کھڑکی سے

گزر کر دس میل جائے گی اور دس میل واپس آئے گی اتنے عرصہ میں دیوار میں کھڑکی سے تیسری کھڑکی تک [illegible]
اور انسان کے چہرے کی روشنی جو پہلی کھڑکی سے گزر کر آئینہ تک پہنچی تھی واپس ہو کر تیسری کھڑکی میں سے گزر
پر پڑے گی۔ اس طرح رفتارِ دیوار کے تناسب سے روشنی کی رفتار دریافت ہو سکتی ہے چونکہ دیوار کی رفتار [illegible]
متعین ہے اس لئے روشنی کی رفتار بھی متیقن ہوگئی۔

اس تقریر میں صرف اصول کا خاکہ سمجھایا گیا ہے [illegible] سکے عملی تجربہ کے لئے نہایت نازک [illegible]
آلات درکار ہیں۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ روشنی کی رفتار تقریباً [illegible] ہزار میل فی سکنڈ ہے۔
اللہ اکبر اس رفتار کا کیا ٹھکانا ہے! اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض

حُسن

(از شمس الحق نظامی بھوپالی)

مظہرِ نورِ خدا ہے عارضِ تابانِ حسن — مایہ دارِ جلالی ہے گوشۂ دامانِ حسن
کائناتِ دو جہاں کا رازِ سربستہ حسن ہے — نازشِ سیمائے قدرت ہو وہ زیورِ حسن ہے
پھول ہے اک نو شگفتہ گلشنِ امکاں میں حسن — راحتِ انسان ہے گویا گردشِ دوراں میں حسن
حسن موجودات میں اک بحرِ ناپیدا کنار — حسن وہ گلشن خزاں نا آشنا جس کی بہار
وسعتِ صحرا کے ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے حسن — موجِ دریائے سکوں پرور میں خوابیدہ ہے حسن
حسن ہے ہنگامہ آرا محفلِ خاموش میں — حسن سوتا ہے سکوتِ شام کی آغوش میں
حسن سے روشن ہے ظلمت خانۂ سینائے عشق — حسن ہی سے ہے سرور انگیز ہر مینائے عشق

خانۂ دل می کنم ویراں و دارم آرزو
جلوہ فرماید دریں ویرانہ حسنِ دل فروز

قند پارسی

ہادی صاحب کی ذات شعر و شاعری کے لحاظ سے یونیورسٹی اور کالج سے بہت زیادہ متعلق ہے کوئی طالب علم ایسا ہوگا جو آپ سے واقف نہ ہو۔ ہادی صاحب نے فارسی شاعری میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ صاحب موصوف نے ہم پر عنایت فرما کر میگزین کے لیے ذیل کی عمدہ نظم مرحمت فرمائی ہے۔

ایڈیٹر

درزمرهٔ تعطیلات مجلهٔ شریفهٔ ملی گڑھ میگزین دو غزلهائے در پارسی از نگاهم گزشته مرا وادار نمود که از غزلیات خودم که درین زبان تیرہ ساخته ام چند قطعه را برائے درج در مجلهٔ مزبور تقدیم نمایم۔ نیز لازم دارد که این مجله که تحت مدیریت اعضائے ہیچو دارالعلوم مہے بجا ب است زبانهائے ملی ما ہم نشان داده باشد۔ خاصه از زبان پارسی که بدوا وہم تاکنوں سرچشمهٔ تخیل ما بوده صرف نظر داشتن ابداً بر بے حقوقی و بے کفایتی ما دلالت می کند۔ باید که ما بر طوریکه ممکن باشد این زبان را ہم بهد وشی اُردو پیش رفت نمائیم و لزوم و اہمیت آنرا برادب خواہاں و معارف پروران عصر حاضر تحمیل نموده آنها را وادار نمائیم که مقالهائے نثر و منظومات را در پارسی ساخته برائے استفادهٔ عموم محصلان بمعرض نشر و اجرا بگزارند تا رشتهٔ این زبان ملی بالآخره از دلهائے ما کنده نشود۔ ہادی مچھلی شہری۔)

دل که از تیر نگاہت سر و ساماں گیرد — داخلِ دامنِ ہر زخم گلستاں گیرد
چه کنم چارهٔ وحشت که در ایام بہار — دل غمدیده ز سیر گل و ریحاں گیرد

در رهِ عشق چه آرام و خنک می سوزد
هر که از حسن تو آتش بدل و جان گیرد

دلم از یادِ تو آشفته شود روز فراق
ابر چون روے هوا را بگلستان گیرد

بسکه از آتش عشق تو نصیبے دارم
ذوق سوزِ دلِ من شمع شبستان گیرد

هر خدنگے که ز آغوش زنش دور شود
مسکن خود بدل خاک نشینان گیرد

مضطرب حال بود چون نه چرا در رهِ عشق
[illegible] گیرد

پائے رنجم نگذارد بمنزل برسم
دل [illegible] ره جانان گیرد

در بهاران چو رسد مژدهٔ آبادیِ باغ
دل [illegible] گیرد

آه پر دود ببین نالهٔ پُرسوز شنو
[illegible] گیرد

نشود راحت و آرام نشیند سر راه
[illegible] شوق [illegible] بیابان گیرد

پس بیایم ز نگاهش سر مستی و سرور
آنچه را [illegible] دامن گیرد

دل سوزی بنشم از تو بجانان طرب
ذوق از ساغر عشقت [illegible] گیرد

ابر از دود دلم بر فلک آید بوجود
بحر از چشم ترم حاصل طوفان گیرد

بند هر چند بپائے من خسته بهند
کیست کز دست جنون دامن گریبان گیرد

شوقم از خرمنِ امید ندارد سر و کار
آنچه گیرد ز دل سوخته سامان گیرد

چون ز بربادی من نام و نشانِ خواهی
یاب آن ذره که هم شکل بیابان گیرد

ناصحا صرفِ نظر دار ز چشمان ترم
نیست آسان که کسی این رهِ طوفان گیرد

نوک پیکان ستم فیض رسان کرد مرا
هادیا رنگ ز خونم گل و بستان گیرد

قبرستان

اس ویران اور اُداس بستی میں داخل ہوکر دل کی عجیب حالت ہوگئی۔ جدھر نگاہ جاتی تھی ٹوٹی پھوٹی
نچی قبروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اصل بستی یہی ہے۔ جہاں کے بسنے والے نقل مکان نہیں کرتے جو ایک
آیا جانے کا نام نہیں لیتا ترقی بھی اسی آبادی کو ہے ہر روز نئے مکان بنتے ہیں اور فانی شہر کے باشندے آ
ہر میں آن رہتے ہیں اور یہاں ان کو کچھ ایسی راحت ملتی ہے کہ دوبارہ تبدیلی مکان کی ضرورت ظاہر نہیں
ے۔

اس بستی کے رہنے والے بڑے ملنسار ہیں۔ اُن کے پاس جتنی دیر بیٹھو ناراض نہیں ہوتے نہ اُکتاتے
اور چلے آؤ تو کچھ عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں کرتے جیسا ہمارے فانی شہروں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ملاقاتی
ر چلا جاتا ہے تو اس کی رفتار۔ گفتار۔ کردار پر بحث اور نکتہ چینی کی جاتی ہے اور پیٹھ پیچھے برائیاں بیان
اتی ہیں۔ اب یہاں امیر غریب چھوٹے بڑے ایک ہی فرش پر اخلاص پیار سے پڑے سوتے ہیں۔ اس چپ چاپ
میں میری فانی ہستی کے سوا اور کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ ہوا بادلوں کو کھینچ کھینچ کر لا رہی تھی اور سورج کے چہر
تاب ڈال رہی تھی ابر خاصا گہرا ہوگیا۔ اور قبرستان کے درختوں پر تکلیف دینے والی مایوسی اور خاموشی چھانے لگی
گھٹا نے روشنی کم کردی تھی۔ اور تاریکی کی باریک چادر پھیلا دیتی تھی۔ دل نے اس منظر سے غیر معمولی تاثرات حاصل
کے بے خودوں کی شان اختیار کر لی۔ میں نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں اُس وجدانِ باطن کو ادا کروں۔ اسی حال میں ایک
ار پر نظر پڑ گئی جو ایک سوکھے درخت کے سایہ میں پڑا ہوا تھا۔ کھجور کی ایک ہری ٹہنی اس مٹی کے
تھی اور مرجھائے ہوئے پھولوں کا سہرا اس کے ایک رُخ پر پڑا ہوا تھا۔
ا کہ کسی مرنے والے کی تازی قبر ہے۔ یہ سبز شاخ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق نشان
طور پر لگائی گئی ہے مگر یہ پھولوں کا سہرا کیوں ڈالا ہے؟ شاید مرنے والا سہرا باندھنے کے دنوں میں
نا دو نامراد چل بسا اب کسی نے حسرت و یاس کے اظہار میں قبر کے سہرا باندھا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی غم زدہ

ماں نے جس کو بیٹے کے منہ پر سہرا دیکھنے کا ارمان تھا [illegible]
میں سلاکر سہرے کی تمنا پوری کی ہو۔ بہرحال یہ مرجھایا ہوا سہرا خاک کے ذرّوں سے ہم آغوش سہرا عبرت کا
لکھ رہا تھا اس خاک میں اگر روح ہوتی تو یہ سہرا سینکڑوں آنکھوں کو تر و تازہ کرتا۔ آج بے جان مٹی میں یہ نازک پھول
خار سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

خاموش

بادۂ کہن در ساغرِ نو

ذرّہ چاہے تو تھکا دے مجھے صحرا ہوکر

نام بدنام ہوا عاشق و شیدا ہوکر — رضا — اک زمانہ کا براہوں میں تمہارا ہوکر

اشک آنکھوں میں ہیں شوق سے گھر ہی اُن کا — دلگیر — اس کا رونا ہے کہ بہ جاتے ہیں دریا ہوکر

آپ اگر آئے نہ تھے موت تو آتی لیکن — حاذق — ہجر میں وہ بھی رہی آپ کا وعدا ہوکر

سرگزشت اپنی محبت میں فقط اتنی ہے — بے باک — خاک میں مل گئے ہم خاک سے پیدا ہوکر

لذتِ درد کا پھر شوق اٹھا ہے قاتل — بدر جلالی — زخم بے چین ہوا جاتا ہے اچھا ہوکر

منع ہم کرتے ہیں کیوں غیر سے ملنے کے لئے — احسن — سوچنا تم کبھی اس بات کو تنہا ہوکر

سنگِ در سے ترے حرف خطِ قسمت نہ مٹے — ابر قدوائی — خود پشیماں میں ہوا ناصیہ فرسا ہوکر

مبدرِ حسن کی کر حسن کی دیوی میں تلاش — جلال — کیوں رہا جاتا ہے محوِ رخِ زیبا ہوکر

واہ کیا عشق کی سرکار ہے اللہ اللہ — یاس — بیٹھے ملتے ہیں جہاں خلق میں رسوا ہوکر

چشمِ تر! اشک مسلسل کی روانی دیکھی — خفی — پاؤں پھیلائے ہیں ہر قطرہ نے دریا ہوکر

پاؤں لٹکائے ہوئے قبر میں بیٹھے ہیں ریاض
کعبہ جائیں گے مگر آپ کلیساء ہوکر — ریاض

جامع
مشیر علوی

پان اسلامزم کی حقیقت

(از مولوی ابرار حسین صاحب فاروقی)

مضمون کا عنوان صاف بتاتا ہے کہ میں "اتحاد اسلامیت" کے ارتقاء سے بحث نہیں کروں گا بلکہ اس کی تاریخی
ہیت و شرعی اصلیت اور تدریجی انحطاط پر تبصرہ کروں گا۔ مگر اس تبصرہ سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ "اتحاد
اسلامیت" کے ہم معنی ترکیبی لفظ "پان اسلامزم" کے مالۂ و ماعلیہ سے ناظرین کو آگاہ کر دوں۔

پان اسلامزم کی حقیقت اور اس کا علمی پہلو

حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز کم از کم مسلمانوں کے لئے نئی نہیں ہے مذہب اسلام کا
اصول اساسی "انما المؤمنون اخوۃ" ہے لیکن یوروپ کی قوت ایجاد کا کیا کہنا جو صرف
مادیات اور اشیا ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ ناموں کے اتحاد کرنے میں بھی اس کو
کمال مہارت ہے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ نیا نام دیکھ کر متعلق بے تعلق ہو جاے اور غیر متعلق ہوشیار ہو جائے
یوں کہنا چاہیئے کہ سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھے اور جاگتی ہوئی سو جائے۔ ابھرتی ہوئی قوم کا یہ خاصہ ہے کہ ہر نئی
بات پر غائر نظر ڈالتی ہے چنانچہ "پان اسلامزم" کا نام بھی اسی مصلحت سے ایجاد ہوا تھا کیونکہ یہ تقاضائے فطرت
انسانی ہے کہ نیا نام دیکھ کر خوامخواہ طبائع کا رجحان ادھر ہوتا ہے تاکہ اس کی اصلیت اور حقیقت معلوم کرے اس کی
بعینہ ایسی ہی مثال ہے جس طرح سے کہ موجودہ زمانہ میں اشتہارات کی سرخیاں بغیر ادنیٰ اشارہ کے راہ گیروں
کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں اور بالآخر ان کو اپنے سے متعارف کرا لیتی ہیں۔ یہی مصلحت ایجاد اس نام کی بھی ہے جس
سے یوروپ کو بیدار کرنے کی خاطر اس کو بنا دیا تھا غرضکہ اس کی اصلیت و حقیقت میں اجنبیت نہیں ہے ہاں
اجنبیت کے محاصرہ سے اس کی ظاہری صورت مسخ ہو گئی ورنہ یہ وہ "اخوت" و "اتحاد" ہے جس کی بنیاد آج
سے تیرہ سو برس قبل جب کہ بربریت شجاعت کے ہم معنی تھی حسن سلوک بزدلی کی تفسیر تھی۔ جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ
خونخوار قبائل کے خون آشامی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ تاراجی تاخت و تاراج کا قلع قمع ہو گیا۔ خونی
قبائل نصرت افسانے بن گئے "اشداء علی الکفار رحماء بینھم" کا دائمی خطاب شیرین

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

لازمی تعلیم کا مذہبی قانون

یہ اسلام ہی ہے جس نے دنیا میں یہ احساس پیدا کیا کہ انسان کی انسانیت علم ہے علم روشنی کے ہم معنی ہے اور جہل تاریکی کے۔ اسی نے اپنے مخاطب اولین کو یہ حکم دیا "اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ"[1] یہ کیا ہے؟ کیا لازمی تعلیم عمومی کا اس سے بہتر کوئی قانون ہو سکتا ہے؟ کیا اصلاح افراد یا جماعت کے مفہوم کو یہ حکم صریحی ظاہر نہیں کرتا ہے؟ بلکہ اسلام اور مدعیان اصلاح اگر اس حکم پر غور کریں تو اس صاف اور صریحی حکم میں کئی باتیں ملینگی

۱- درجہ تعلیم کو مقید نہیں کیا گیا ہے۔ جس طرح سے کہ اکثر متمدن ممالک نے ابتدائی تعلیم کو لازمی اور ثانوی اور اعلیٰ کو اختیاری کر رکھا ہے۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم تک کو لازمی قرار دیا ہے جیسا کہ "چین" کا لفظ صاف بتاتا ہے۔ اس کی عملی حیثیت یہ تھی کہ اسلامی حکومتوں نے درسگاہان اسلام کے بڑے بڑے قرطبہ۔ قیروان مصر۔ دمشق۔ بغداد۔ نیشاپور وغیرہ میں قائم کرکے اسی علمی و تعلیمی ذوق کا ثبوت دیا جو آج تک تاریخ کے اٹلنے سے خبرات کا پتہ دیتے ہیں اس کے علاوہ تمام تعلیم مفت تھی۔ حتیٰ کہ طالب علموں کو درسگاہیں کھانا و کپڑا بھی مہیا کرتی تھیں جن کا مشت نمونہ از خروارے الازہر اور مدرسۃ العلوم دیوبند ہیں۔ یہ وہ رفاہی خدمت تھی جو یورپ کی تعلیمی قربان گاہ پر نثار ہوگئی۔ یہ وہ خدمت تھی جس کو جنوبی امریکہ کے حکومت جمہوریہ نے بیسویں صدی میں اپنی مملکت میں جاری کرکے خراج تحسین لیا۔[2]

۲- یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں یہ قانون نافذ فرمایا گیا اس زمانہ میں اسلام حجاز کے گہوارہ میں پرورش پا رہا تھا وہ گہوارہ جو جہالت کی تاریکی سے محصور تھا۔ جو اصحاب کہ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے آغوش میں آگئے تھے وہ سب اسی تاریکی کے روشن ہونے والے مہتاب تھے۔ لہٰذا ان میں روشنی یا بالفاظ دیگر اصلاح پیدا کرنے کے لئے "لازمی تعلیم" کا یہ قانون نافذ فرمایا گیا۔ جو صاحب بصیرت "اصول فقہ" سے آگاہ ہوں گے وہ اچھی طرح سے "امر بالوجوب"[3] کے قاعدہ سے واقف ہوں گے۔ اس جبری قانون کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے بلکہ ان بیدار قوموں کے قوانین و آئین اٹھا کر دیکھیے جنھوں نے

---

[1] علم حاصل کرو اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ (حدیث نبوی صلعم) ۱۲

[2] حکومت جمہوریہ چلی (جنوبی امریکہ) کی قومی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر گلوس نے مسلم یونیورسٹی طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے فخریہ کہا تھا کہ "چین میں ابتدائی سے یونیورسٹی تعلیم تک مفت رائج ہے" ۱۲

[3] اصول فقہ کا یہ مسئلہ ہے کہ جس بات کا شرع حکم دیتی ہے وہ واجب ہو جایا کرتی ہے۔ واجب کا منکر کافر اور اس کا نہ کرنے والا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہل اسلام میں گناہ ہے۔ مذہبی و اسلامی اہمیت ملاحظہ ہو۔

"لازمی تعلیم" کے خلاف ورزی پر سزائیں مقرر کر رکھی ہیں۔

۳۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف متعلم و درجہ تعلیم کو عمومیت حاصل ہے بلکہ علم کو بھی مقید نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ یہ بالکل مسلم ہے کہ چین میں اس وقت تک اسلام نہیں پھیلا تھا جس سے یہ خیال ہو سکے کہ "العلم" سے مراد وہ مخصوص علم ہے جو مذہبیات تک محدود ہے اور نہ یہ مراد ہو سکتی ہے کہ صرف وہ علم جو مذہبیات اسلامیہ سے خارج ہے بلکہ اگر اس کو لوہ رضا پر محمول نہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ حدیث شریف اگر ایک طرف علوم جغرافیہ و تاریخ کی ترغیب دیتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتاتی ہے کہ چین اس زمانہ میں مرکز العلوم تھا۔ باوجودیکہ وہ سزائیں کلیتاً اسلام کی روشنی سے بے بہرہ تھیں لیکن پھر بھی وہاں سے حصول علم میں مضائقہ نہ کیا گیا اس لئے پڑھ کر ذوق علم و اصلاح اور رواداری کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

۴۔ اس سے و نیز حدیث شریف "العلم علمان علم الادیان و علم الابدان" سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم کی دونوں قسموں کا حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ دین و دنیا دونوں پر قبضہ رہے۔ علم دنیا اس لئے تاکہ دہ نسبت نہ آنے پائے جو بجائے اصلاح کے تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ علم دین اس لئے کہ اپنے معبود حقیقی کی طرف سے غفلت نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ اسی غفلت کا نام جو علم دین کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دنیا ہے

چیست دنیا؟ از خدا غافل بدن

نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(مولنا رومی رح)

حصول دنیا کے متعلق رسول اللہ کا صاف اور صریح ارشاد ہے "خَيْرُكُمْ مَنْ لَمْ يَتْرُكِ الْآخِرَةَ لِدُنْيَاهُ وَلَا دُنْيَاهُ لِآخِرَتِهِ" کیا یہ ارشاد دنیاوی علوم کی ترغیب دیتا ہے یا ان سے باز رکھتا ہے؟ نہیں بلکہ ترغیب دیتا ہے کیونکہ "الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" اس کی صاف تفسیر ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آخرت مقدم ہے۔ اور اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ علم حرام اور جہل سے بدتر ہے جو بجائے روشنی کے تاریکی پیدا کرے۔ بجائے انسان بنانے کے حیوان بنائے۔ اخلاق کے بجائے بداخلاقی سکھائے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اصول اسلام و علوم دین سے متعلم بے بہرہ ہوتا ہے۔ اس لئے مسلمان کا مذہبی اور انسانی فرض یہ ہے کہ وہ مذہبی تعلیم کو مقدم رکھے۔ یعنی ضروری تو دونوں قسم کی تعلیم کو سمجھے لیکن تقدم کا لحاظ رکھے۔ اس لئے کہ محض اصطلاحی دینی تعلیم سے اس کا مقصد زندگی پورا نہیں ہوتا ہے بلکہ زندگی دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اس کے علاوہ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس نے رسول اللہ صلعم کے حکم کے ایک حصہ کی تعمیل

علم کی دو قسمیں۔ علم دین اور علم بدن۔ تم سے بہتر وہ ہے جو آخرت کو دنیا اور دنیا کو آخرت پر نہ چھوڑے۔

یا اور دوسرے کی خلاف ورزی۔

۵۔ حدیث شریف متذکرۃ الصدر اور ارشاد الٰہی[۱] سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حصول علم کا واحد طریقہ یہی نہیں ہے کہ ایک جگہ بیٹھ کر چند کتابیں پڑھ لی جائیں بلکہ دوسرا طریقہ جو عملی ہو وہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی سیاحت کر کے عملی علم حاصل کیا جائے۔ جو یقیناً کتابی علم سے کسی حالت میں کم وقیع و مفید نہیں ہے۔ اور اس کا بین ثبوت مسلمان عربوں کے وہ کارنامے ہیں جو تاریخوں میں زرین حروف سے لکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اس زمانہ میں سفر کئے جب کہ ایک ملک سے ایسی ہی اجنبیت تھی جس طرح سے کہ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے۔ جب کہ دریا کا سفر وہم و خیال میں بھی موت کے مساوی تھا۔

پان اسلامزم کا عملی پہلو

"اتحاد اسلامیت" کا یہ تو عملی پہلو تھا اب اس کا عملی پہلو ملاحظہ ہو۔ شارع اسلام بابی وامی نے نماز باجماعت کی تاکید فرمائی تاکہ اہل محلہ روزانہ پانچ وقت ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے سے موانست اور الفت کو بڑھائیں ہفتہ میں ایک روز ایسا رکھا جس میں اہل شہر ایک جگہ جمع ہو کر نہ صرف باجماعت نماز ادا کریں بلکہ ضروری پند و نصائح سے بھی مالامال ہوں۔ اسی لئے اس باجماعت نماز کا نام "نماز جمعہ" رکھا جس کو عید المومنین سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی عبادت کے ساتھ موانست و الفت کی ترغیب ہو۔ پھر سال بھر میں ایک دن تمام جہان کے مسلمانوں کے لئے ایسا مقرر کیا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثنا اس معہودہ مرکز پر جمع ہو کر عمومی اخوت سے بہرہ اندوز ہوں۔ اس عظیم اجتماع کو عبادات کا جزو اعظم قرار دیکر اس کو "حج بیت اللہ" کے مبارک نام سے موسوم کیا۔ اور اس تمام مجمع کو جس نے اقطار و امصار سے آکر "ام القریٰ" کے عتبہ عالیہ پر اپنی جبین نیاز کو جھکایا اور جس نے ایک دوسرے سے برادرانہ بغل گیری کا فخر حاصل کیا " حاجی حرمین الشریفین" کا قابل فخر دائمی خطاب دیکر لالوں لال کر دیا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی "اخوت" اور "اتحاد اسلامیت" کا کوئی مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس پر طرّہ یہ ہے کہ تیرہ سو برس سے بندگی کا یہ لاثانی طریقہ بلا کسی اصلاح اور ترمیم کے برابر جاری ہے۔ حالانکہ اس اسلامی سالانہ اجتماع کا نہ کہیں دفتر نظارت ہے نہ کوئی صدر ہے۔ اور نہ سکرٹری لیکن جس تنظیم سے یہ اجتماع ہوتا ہے اور جس خشوع و خضوع سے یہ عبادت ہوتی ہے اور جس خلوص اور جوش ہے اعلائی

---

[۱] New- world of Islam, foot not page 39

دری" کے اراکین ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس کا سکہ حریف اقوام کے بہروپیوں پر بھی بیٹھ چکا ہے جو مخالفت
ے باوجود بھیس بدل کر وہاں پہنچے اور یہ عدیم النظیر منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ چنانچہ ایک امریکن اسلام پر
مرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اگرچہ مکہ (شریف) میں غیر مسلم کے داخلہ کی ممانعت ہے لیکن چند یوروپین نے بھیس بدل کر
"حج" کیا اور اپنے مشاہدات لکھے۔ دیکھو سیوک ہرگونجی "مکہ" مطبوعہ ہیگ ۱۸۸۸ء"

اس جرمنی سیاح کے علاوہ اور بہت سے گئے اور انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے مشاہدات سپرد قلم کئے۔ غالباً یہ بہروپئے
پنے زعم باطل میں رازہائے سربستہ کی عقدہ کشائی کے لئے گئے ہوں گے مگر ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ "جادو گھر" نہیں
ہے بلکہ اللہ کا گھر ہے جس راز کو فرعونی جادو گھر بھی نہ معلوم کر سکے اور آخر کار خدائی جادو ان پر چل گیا اور وہ فرعون کی
رعونیت سے پھر گئے۔

پان اسلامزم کا دوسرا عملی پہلو

اس کا دوسرا عملی پہلو "خلافت" تھا جو یوروپین اقوام کے نزدیک حج سے زیادہ خطرناک تھا۔
جس کی پامالی کے اس قدر پیچھے پڑے کہ آخر کار اس کا نام ہی ہٹ گیا۔ خلافت و حج میں فرق
صرف اس قدر ہے کہ حج بالاتفاق اسلام کا ایک مذہبی رکن ہے اور خلافت مختلف فیہ مسئلہ ہے
سی وجہ سے اگرچہ اسلامی مرکزیت کے مٹانے میں حریف کامیاب ہو گئے مگر دینی مرکزیت نہ مٹا سکے کوشش میں
س کے بھی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

(باقی آئندہ)

۵۰

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے

(از جناب محمد عظمت اللہ خانصاحب دہلوی بی اے (علیگ)

ہام لٹ کی مشہور اُدھیڑبُن نے عظمت صاحب کو اس نظم کی طرف توجہ دلائی، یہ مان کر کہ موت ایک ایسی نیند ہے جس میں کسی ڈراؤنے خواب کا بھی خدشہ نہیں ہماری زندگی اور ہمارے خیالات پر اس قسم کے یقین کا کیا اثر ہوگا، عظمت صاحب کا ذاتی خیال اس نظم میں یہ ہے کہ اس طرح کے یقین کا بہت ہی اچھا اثر ہوگا،

جس خوبی کے ساتھ اس اثر کو اس "لی رِک" میں ہمارے دوست نے ظاہر کیا ہے وہ ان کا مخصوص حصہ ہے، ہم ان کی توجہ کے ممنون ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی اس قسم کی چیزوں کے ہم ہمیشہ مشتاق رہیں گے

(ایڈیٹر)

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے　　　مصیبت کے مارے کریں خودکشی

کہ دنیا میں دُکھ کے سوا کچھ نہیں　　　نہیں دُکھ سے خالی یہاں خودخوشی

سوا اس کے دُکھ کی دوا کچھ نہیں

مُندے آنکھ بس بیخبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے　　　تو خوشیاں منائیں بلا روک ٹوک

کہ پھر جی کو مرنے کی دُگدا نہ ہو　　　مٹے من چبھی دُکھ کے کانٹے کی نوک

مرے بعد کا کوئی کھٹکا نہ ہو

مُندے آنکھ بس بیخبر رُوح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے　　　تو خوشیوں کی قیمت بڑھے دس گنی

ہر اک کو خوشی کی ہی ہو لَو لگی　　　نہ ہو دھیان سے دُکھ کی کوئی دُکھی

بلا دُکھ کی جس آن حد سے بڑھی

منہ سے آنکھ بس بے خبر روح ہووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — تو مٹ جائے یک لخت فکرِ مآل

ہے اک بڑی ہی خرابی کا گھر — کہ پیدا اسی سے ہر دُکھ کا خیال

اسی نے دلوں میں بسایا ہے ڈر

منہ سے آنکھ بس بے خبر رُوح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — نہ پھر مرنے والوں پہ روئے کوئی

ہوئے جاں بحق دُکھ سے پائی نجات — کسی کے لئے جان کھوئے کوئی

نہیں اس میں یوں بھی کوئی ڈر کی بات

منہ سے آنکھ بس بے خبر روح سووے

اگر موت بن خواب کی نیند ہووے — حقیقی محبت بڑھے حق کے ساتھ

محبت میں ڈر کا گذر ہی نہیں — رہے دل پہ ہر وقت خالق کا ہاتھ

کہاں دُکھ جو مرنے کا ڈر ہی نہیں

منہ سے آنکھ بس بے خبر روح ہووے
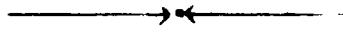
مکتوبِ مہدی

(افادی الاقتصادی ایم، مہدی حسن مرحوم)

افادی الاقتصادی مرحوم کی "افادات" پر میگزین کی کسی گزشتہ اشاعت میں تفصیل کے ساتھ ریویو ہوچکا ہے۔ مرحوم کے خطوط ادب و انشا کی جان ہیں جو اُن کے احباب کے پاس بقول مولانا سلیمان ندوی صاحب تعویذ اور بن کر حرز جان کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔ ہم کو یہ خط جناب دلگیر اکبرآبادی سے موصول ہوا ہے جن کے ہم مشکور ہیں

(ایڈیٹر)

تحصیل بارہ۔ ضلع الہ آباد

۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء

پیارے دلگیر

خط ملا، تھوڑی دیر کے لئے آپ کی پیدا کردہ حرارت میری رگوں میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے لیکن اس نہ سے کیف ہو رہا ہوں کہ آپ باوصف خلوص، وہاں بیٹھ کر، اندازہ نہیں کر سکتے۔

آشنائے سخن کو سابقہ بھی پڑا تو کس سے؟ ڈیڑھ سو برس کی بڑھیا یعنی قانون سے، جس کے چہرے کی جھریاں میری دماغ میں گرہیں ڈالتی ہیں۔

بھئی، ۱۰ اپریل تک ضبط کیجئے، آخری موقع (چانس) ہے۔ یا تخت یا تختہ! تحصیلداری کی ہوس نہیں، لیکن غیرتِ نفس گوارا نہیں کرتی کہ کسی سے گھٹ کر رہوں، لاج آپڑی ہے، خدا بات رکھ لے، پھر میں آپ کا ہوں اور جہاں تک باتیں بنانے کا تعلق ہے، نقاد میرا۔

بعض سرخیاں جو میں آپ کے لطف طبع کے لئے لکھ دیتا ہوں، یہ صرف اس لائق ہیں کہ شوخی تحریر کے لحاظ سے "مطائبات نثر" کے تحت میں کبھی کبھی ان کو جگہ دیجئے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں جو کسی ادبی رسالہ کے نئی نفسیات ادب کے لحاظ سے مقصود بالذات ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ تصنیفی عہد کا قبلی کے ساتھ خاتمہ ہوگیا!

موجودہ نسل قدیم لٹریچر بالکل نہیں جانتی اور کتنی ہی روشن خیالی ہو بے گھر کی پونجی (آریجنیلیٹی) سے کام نہیں چلتا،
نوجوان گروہ کے ہاتھ میں قلم ہے، اسے زیادہ سے زیادہ "عیب پوش" سمجھئے، یعنی معلومات اور قابلیت کے
سے ایک انچ بھی نہیں لیکن چاہتا ہے کہ ایک فٹ نہیں ایک گز سمجھا جائے۔ ایک آدہ مستثنیات لائق غیرت
ہوں تو ان سے کام نہیں چلتا۔

ماجد بی۔ اے کی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع آپ نے دیکھی؟ یہ البتہ ہونہار ہے اور ایک دن حکمائے ادب میں
پیش ہوگا اس لئے کہ اس میں گہرائی موجود ہے، نری باتیں بنانا نہیں جانتا۔

نیاز سے کیا فرمائش کروں، وہ صحیح مذاق تصنیف کی طرف نہیں آتے۔ "عہد زرین یعنی عباسی دور کے ارتقاء
" پر لکھواتے۔ بہتیرے سنجیدہ عنوان ہیں لیکن لکھنے والے کہاں سے آئیں گے؟

میں یورپ کی مدد سے کام چلا سکتا ہوں لیکن پہلے بارہ چھوڑا سے اور اکبرآباد کے کٹڑے میں میوے کی دکان
یاد کیجئے۔

لطیف صاحب سے (جن کا پتہ سمجھ میں نہ آیا، ڈھولی کھار۔ کیا چیز ہے؟ یار کا دروازہ اور پائے گس کی تیلیاں!)
کہئے گا جس قسم کا ٹھوس لٹریچر وہ چاہتے ہیں، مواد کی کمی نہیں، لیکن پہلے پائنیر کا سا خوش سواد اور نشاط افزا دفتر
بائیں باغ پیدا کر دیجئے اور اسی کے قدردان نہیں صرف پڑھنے والے دیجئے جو سر بکف نہیں زر بکف ہوں۔ پھر
آپ چاہتے ہیں، نہ ہو تو میرا ذمہ!

رہی چھم چھم (یا اُن کی گھٹ کھٹ) یہ جاتے ہوئے نشۂ جوانی کا اترا ہوا خمار ہے جو کبھی کبھی "صحافی" کی اوٹ
سے بے نقاب ہو جاتا ہے۔

میرے سب سے پہلے مضمون کا عنوان ان شاء اللہ "اَدَبُ الاَسَاتِذَہ" ہوگا۔ نیاز اگر عہد زرین کو نہ سنبھال
سکیں تو یہ عنوان دیجئے:—

"کل جو گذر گئی۔ بے کار۔ جو آنے والی ہے غیر اختیاری ہے زندگی تو آج صرف آج کا نام
ہے!"

میں تم سبھوں کی بے غایت شاعری سے اسی لئے تو جلتا ہوں کہ کام کی بات آتی نہیں یا کرنی نہیں چاہتے۔ اچھا

ماما انسان، ہیولی ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہاں یہ آج کل آئے دن آپ کی "آنکھیں کیوں دکھتی ہیں"، کیا کسی نے "نمک کی چاٹ پر لگایا ہے"
لطیف صاحب کو یہ چند سطریں دکھا دیجئے گا، ان کے خط کے ایک ضروری حصے کا جواب رہ گیا تھا
گورکھپور۔ نقاد کے لئے لکھتا ہوں، جواب باصواب پر آپ کو اطلاع دوں گا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

ہمیشہ آپ کا

مہدی

جذبات شوق

گویا تنِ فگار سے کانٹا نکل گیا

لو آج وحشتوں کا بھی ارمان نکل گیا
دستِ جنوں کا زور گریباں پہ چل گیا

اب کیا بساطِ عشق میں رکھا ہے میرے بعد
بازی ہی وہ بگڑ گئی نقشہ بدل گیا

کل جا کے پُل صراطِ محبت پہ ہم نفس
کچھ پاؤں ڈگمگائے تھے لیکن سنبھل گیا

شکوہ ہے کچھ خزاں کا نہ صیاد سے گلا
بس! کیا کہیں کہ رنگِ چمن ہی بدل گیا

باقی تھا ایک قطرۂ خون یادگارِ عشق
سوزِ تپِ فراق سے اب وہ بھی جل گیا

کیا پوچھتا ہے حال اسیروں کا ہم قفس
پرواز کی صدا سے کلیجہ دہل گیا

اے شوق دم نکلتے ہی نیند آئی چین بھر
گویا تنِ فگار سے کانٹا نکل گیا

تردامن
محمد مظہر جلیل۔ شوق

رباعیات

۱

اُٹھ صبح ہوئی خبر ہے غافل تجھ کو — فیضانِ سحر نہیں ہے حاصل تجھ کو
مشکیں کس لی ہیں کروٹوں نے تیری — شکنیں بستر کی ہیں سلاسل تجھ کو

۲

وہ کون ہے جو نہیں ہے نخچیر اجل — عالم ہے سبھی بستۂ زنجیر اجل
پیری میں کمر جھکی تو دل نے یہ کہا — چلتا ہے اسی کمان سے تیر اجل

۳

ہر اصل میں نیست ہست سمجھے ہو جسے — ہر شان بلند، پست سمجھے ہو جسے
توڑو اصنام نفس و پندار کو تم — ہر فتح یہی شکست سمجھے ہو جسے

۴

اوروں کو بھی دو جو تمکو حاصل ہے فراغ — ملتا ہے یہیں سے امنِ عالم کا سراغ
پہنچا ہے جہاں میں ایک ہی ایک کو فیض — جلتا ہے چراغ سے اسی طرح چراغ

۵

انسان اگرچہ مست و سرشار نہیں — لے کام نہ عقل سے تو ہشیار نہیں
غافل ہے جو حق سے زندگی کیا اُسکی — جو خواب میں جاگتا ہے بیدار نہیں

(حامد حسین قادری بدایونی)

شہر صفی آباد کا خاکہ

شہر صفی آباد اپنی آب وتاب کے لحاظ سے پیرس کا اعلیٰ نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں کی عمارات - درگاہیں مساجد۔ شوالے - گورنمنٹ بلڈنگز - میونسپل ہال - پوسٹ آفس و سرائیں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ بعض بعض کی مثال تو صفحۂ ہستی پر ملنا کل ہے اگر یوں کہوں کہ دنیا کے ہفت عجائبات میں داخل ہوں تو بیجا نہ ہوگا - یہاں کا سفید سنگ مرمر کا تالاب اپنی پیرانہ سالی میں حمام باد گرد سے کہاں عمیق و وسیع - مقبرے جو گنتی میں نہیں آتے لکھنؤ و دہلی کے مقابرت کہاں عالیشان و مستحکم - پارک اس کثرت سے کہ لکھنؤ بھی شرمندہ - سڑکوں کی صفائی پر سینیٹری انسپکٹر کی جان قربان۔ ٹریفک کی یہ کثرت کہ اموات جا بجا - گاڑیوں کی گھنٹیاں - کاروں کی صدائے مہیب - یکوں کی کھڑکھڑاہٹ - سائیکل کی ٹن ٹن - اس پر لوگوں کا سر شام بازار میں ہجوم ایک قیامت خیز منظر پیش کرتا ہے - شام اودھ کا نقشہ چوک میں اور صبح بنارس دریائے صفی آباد کے کنارے مشاہدہ میں آتی ہے - صبح ہوئی کہ جوق جوق لوگ اشنان کرنے روانہ ہوئے - اس میں کچھ عورتیں اور بچے بھی ہیں - کوئی سواری پر کوئی بیچارہ غریب اپنے خدا کی یاد میں پیدل چلا جاتا ہے - دریا کے کنارے سفید دھوتیوں کی کثرت صبح کو فرش آب پر چادر مہتابی کا کام کرتی ہے اشنان کے وقت لوگوں کی گن گناہٹ چنگ و نے کے آوازوں سے زیادہ دل کش - یہاں کا کلاک ٹاور جو چھوٹے بچوں کو ڈرانے کی غرض سے ایک شکل مہیب سے مخاطب کیا جاتا ہے اپنے طویل القامت ہونے پر نازاں - اشوک کی لاٹھ اور قطب مینار کے سر اس کے آگے پست - اس کے چاروں طرف دل کش سبزہ زار ہزاروں کے لئے فرش زمردین کا کام دیتا ہے -

شہر میں نئے بگڑے ہوئے دو چار ڈاکٹروں کی دوکانیں بھی لوگوں کی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں - واقعی یہ ڈاکٹر مسیح الملک و عیسیٰ دوراں ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں - وہ زود اثر دوائیں اور پر تکنیکل تدبیریں کہ دیدہ شنیدہ ان کے سامنے کلکتہ و لکھنؤ کے میڈیکل ہال کے ڈاکٹروں کی زبانیں بند - وہ تجربہ کہ آن واحد میں علاج کے طالب کولا علاج - نزع کے مریض کو قبر کے سپرد - زندہ کو مردہ کرنا ادنےٰ کام ہے - جب سے انھوں نے بازار کو شل عمل

بیابانی کے گھیر رکھا ہے - ہزاروں کو عدم آباد کی سیر کرادی - شہر ویران قبرستان آباد کرنے میں طاق - کیوں نہ ہو
کوئی کمپونڈر - کوئی نوخیز صاحب زادہ جو کہ دنیا کے نشیب و فراز کیا اپنے گھر کی حالت سے بھی واقف نہیں - دو چار
دوائیں لیکر بازار میں دوکان رکھلی اور انھیں دواؤں کا مرکب تیار کر کے مریض کی سپرد کیا وہ بے چارہ استعمال
کرنے تہی خدا کے فضل سے صحیح و سالم - مہر سکوت اپنی زبان پر لگائے ہوئے تفکرات دنیا سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے

پولیس کی ایمانداری

ہر مقام کی فلاح و بہبودی وہاں کے نظم و نسق پر مبنی ہوتی ہے - اور ایسی حالت میں لوگ آرام و چین سے
زندگی بسر کرتے ہیں - مگر وہ جہاں پولیس لوگوں کے مال و متاع کو افسروں کے منہ کا نوالہ بنا رہی ہو اور لوگوں
کے خون سے کشت رشوت ستانی کی آب پاشی کی جارہی ہو ایسی حالت میں پبلک کا عیش تو طلسم ہوش ربا کا فسانہ ہو جاتا
ہے اور سوا اس کے کہ ایسی کاشت کے درو کے وقت چند تن مردہ کے پژمردہ پودے جابجا ویرانہ میں پائے جائیں
کچھ ہاتھ نہ آئے گا - لیکن کچھ فریادرس اپنا سر دیواروں سے ٹکراتے ہوئے ملیں گے جن کا نہ کوئی حامی و مددگار
نہ کوئی ہمدم و غمگسار وہ بیچارے بجائے اس کے کہ کوئی ان کا غم غلط کرے بید - کوڑوں اور حوالات کی دھمکیوں
سے خاموش کئے جاتے ہیں - پولیس کی حالت ناگفتہ بہ - خود ہی خون کرائیں اور خود ہی تفتیش کو جائیں - پبلک
کو بہلانے اور تشفی و دلاسا دینے کا کیا انوکھا طریقہ ہے - بعد انکوائری جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ قاتل کا ہاتھ آنا ناممکن
بے چارے کسی مظلوم کو متہم کر کے خون ناحق کا دھبہ اس کے سر لگایا جاتا ہے - وہ بے چارہ اپنی عدم کوششوں
پر نالاں و گریاں حوالات کے قعر عمیق میں پھینکدیا جاتا ہے جہاں سے اس مظلوم ستم دیدہ کی آواز تک نہیں سنائی دیتی -
اس کی موافقت میں موقع پر دو چار گواہ تیار کر لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے - قاتل اگر تلاش بھی کر لیا تو زر
بر سر فولاد نہی نرم شود کا مسئلہ درمیان میں آتا ہے اور یہی طریقہ قاتل کی رہائی کا وسیلہ ہوتا ہے - اس کا جرم دوسرے
کے سر لگا - فرضی قاتل تلاش کر کے پابہ زنجیر کر لیا - اب اگر اللہ میاں بھی آجائیں تو یہ شقی القلب کچھ سماعت نہیں کرنے
کے - رہا بے چارہ مقتول مرنے کے بعد بھی اسے آرام نہیں ملتا - اسپتال میں اس کی لاش کی اچھی طرح
مہمان نوازی کی جاتی ہے بعدہٗ اس کا جسد مردہ زاغ و زغن کی دعوت کا باعث ہو جاتا ہے - رہے اس کے اعزا

بھی بیچارے بے جا دھمکیوں سے راہ پر لگائے جاتے ہیں اور رشوت دے دلا کر رام کئے جاتے ہیں۔ قاتل و مقتو
کا دیوالہ نکل گیا لیکن ان کا مذاق ٹھہرا کہ مرے دونے بیٹھے۔

شہر میں جا بجا سُرخ صافوں کی لال بتیاں جلتی ہوئی اکثر روزانہ دکھائی دیتی ہیں۔ ہر وقت یہ لوگ اپنی فکر
میں رہتے ہیں۔ اور شہر کا گشت اس خیال سے ہوتا ہے کہ کچھ ٹکے ہاتھ آئیں۔ روپیہ لیا اور جرائم سے چشم پوشی کی۔ پولیس
کے اعلیٰ افسر سے قطع نظر کرتے ہوئے اس کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ وہ صاحب جن کی سپرد شہر ہے اس فکر و گھات میں
رہتے ہیں کہ کسی طرح چاندی سے بھینٹ ہو عام آزادی اپنے ماتحتوں کو دے رکھی ہے کہ جو چاہے کریں مگر میرے
عیش پسندی میں فرق نہ آئے۔ قمار بازی کا شہر میں ہونا بہترین آمدنی کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ
ہے کہ لوگ جب نانِ شبینہ کو محتاج ہوتے ہیں تو دوسروں کا مال تکنے لگتے ہیں۔ شب کو اسی محکمہ کی نگرانی میں
ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ کانسٹبلوں کا پہرہ ہو رہا ہے۔ گھر والے اطمینان سے سو رہے ہیں۔ اگر کچھ کھٹکا بھی ہوا تو غا
پہرہ دینے والوں کی آوازوں نے اُن کو اور اطمینان دلا دیا وہ بے چارے پھر اطمینان کی نیند سونے لگے۔ نقب ز
نے اپنا کام کیا ہے گھر کا کل اثاثہ صاف کر دیا۔ نصف خود لیا اور نصف خود حق دار کو دیا جس کی امداد پر وہ اپنی ز
بسر کرتے ہیں۔ جب لگی ہوئی نقب زنی کی تیاری۔ رات کو نقب زنوں کو اپنے کام میں مشغول رکھنے کے لئے کہ
صورتیں ایک جا پیش ہو جاتی ہیں۔ اولاً پولیس کی باطنی اعانت۔ ثانیاً میونسپلٹی کی لالٹینوں کی روشنی جو کہ چ
سحری سے بھی بدتر۔ ثالثاً ان کی مفلوک الحالی اور قمار بازی نقب زنی پر مجبور کرتی ہے رابعاً شب کو پولیس کا پہرہ جو
سے گھر والے اطمینان کی نیند سوتے ہیں۔

علاوہ بریں رشوت ستانی کا اعلیٰ نمونہ اگر آپ کو دیکھنا ہے تو ذرا سرِ شام بازار میں تشریف لائیے۔ اد
قرصِ آفتابی کو زوال ہوا یعنی اس نے اس مکار و افسانہ ساز دنیا سے منہ موڑا کہ اُدھر ایک صاحب اپنی دولت مع
اس طرح برآمد ہوتے ہیں کہ جسم نازنین پر ایک شربتی اچکن۔ پائجامہ اگر تنگ مہری کا ہوا تو گھٹنوں تک چ
اور اگر کشادہ مہری کا ہوا تو ٹھوکر کے اشارہ سے ہاتھ بھر آگے۔ اس میں ایک ریشمی ازار بند گھٹنوں تک لٹکا
ایک عجیب ہیئت سے ایک نازک چھڑی ہاتھ میں ہلاتے ہوئے سر بازار چھپانے ہوئے چھم چھم کرتے چلے جا رہے
جسم کی نازکی کی کوئی حد نہیں۔ ہزار جگہ سے بل کھا رہا ہے جس کو دیکھ کر نگار خانہ چین کی تصاویر خاموش مشتو

ربی کی جانیں قربان - اس پر طرہ یہ کہ محکمہ پولیس کی افسری ایں چہ بوالعجبیست جو کہ بمصداق غالب مرحوم کے شعر کے ہے ؎

اس نازکی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میونسپلٹی کی خوش سلیقگی

ممبر میونسپل بورڈ عالی قدر مراتب کوئی رئیس - کوئی وکیل کوئی آنریری مجسٹریٹ ہر ایک اختراع قانون میں طاق -
س ہانی و بہزاد کے تصویر کشی میں شہرۂ آفاق - جب چاہا حسب موقع قانون بنا لیا - موجودہ بورڈ میں دو پارٹی - ایک
دوسرے کو زیر کرنے کی کوشاں - تبدیل کی خواہاں - حسب منشا ٹیکس کی اجراء - بورڈ کی ممبری ان کے لئے
زندگی کا پیام - ہر ایک نازاں اور اپنے خیال میں مست - الیکشن کے وقت جان توڑ کوشش کرنے کو تیار لیکن
ر غور کیا جائے تو کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ نہیں - سڑکوں کی وہ حالت کہ خرقہ پوشان کی گدڑی
سی رفوگر کی دوکان جا بجا پیوند لگ رہے ہیں - بارش میں گہر والات سے زیادہ تکلیف دہ - ادھر پانی برسا
دھر نالے نالیوں نے شور مچانا شروع کیا - جا بجا کیچڑ - کہیں سڑکوں پر قعر عمیق اگر گر جائے تو سیدھا بیکنڈ کا راستہ
لے - گھر سے نکلے جوتا ہاتھ میں - قدم رکھتے ہی کیچڑ کا چھینٹا سر پر - گھٹنوں تک پائجامہ چڑھائے ہوئے جوتا کیچڑ میں
ت پت چھپ چھپ کرتے چلے جا رہے ہیں - کہیں سر بازار اگر گر پڑے تو دیکھنے والوں کے لئے ہنسی و مذاق کا باعث
ئے کنکڑ کی سڑک سے گزرے تو کیچڑ کی کثرت سے اگر پیر پھسلا تو اڑا اڑا .... دھڑم - نالی میں بیچوں بیچ کر
سلے کھائے - خوش قسمتی سے دو چار گھونٹ بھی بدحواسی میں پی گئے - ایسی حالت میں جس کا سہارا ڈھونڈھے
س کو بھی لے ڈوبے - گھر بچے سے اگر پاس ہوئے تو کمر کمر تک پانی میں اترے - یکہ کی سواری میں جان کا خطرہ
ب تو جانور کی لاغری - دوسرے یکہ کی شکستہ حالی - تیسرے سڑکوں کی ناہمواری ہر آن یہ خیال دلاتی ہے
ب یکہ الٹا اب ٹوٹا کہ ناگہاں وہ وقت آ ہی جاتا ہے - کوئی تو زخمی ہوتا ہے کوئی کیچڑ میں لت پت - گھوڑا علیحدہ

اپنی جان لیکر بھاگا لیکن کرایہ دار یکہ کی بے بال و پری پر سسکتے ہوئے اپنی راہ لیتے ہیں اور بمصداق اس مثل کی تنزندگی اٹھانا پڑتی ہے کہ ایک تو نقصان مایہ دوسری شماتت ہمسایہ ۔ اگر رات ہوئی تو دو چار دھکّے بھی کھائے ٹوٹے بھی گئے اور پولیس کے ہاتھ پابہ زنجیر ہوے ۔ صفائی کا وہ انتظام کہ جمعدار اپنی فوج کو لئے ہوئے جابجا جھاڑو نیچے کے ہتیاروں کے ساتھ صفائی کے میدان میں موجود۔ آن کی آن فضلہ کا ڈھیر سرراہ لگا دیا گویا راستوں پر راہگیروں کے مشام کو معطر بنانے کے لئے مشک ختن اکٹھا کیا ہے یا یوں کہوں کہ اصغر علی کی پرفیوم ہاوس (Perfume House) کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔ سڑکوں کو ایسا صاف کر دیتا ہے کہ ہمارے معزز ممبروں کے دل لوٹ ہو جاتے ہیں گھروں کی صفائی کا یہ حال کہ بہتر بہتر ہونے کی حیثیت سے مغرور ۔ دو چار پنجے مارے اور اپنی راہ لی ۔ اگر کسی نے ٹوکا تو انہی ہتیاروں سے زبان کھینچنے کو تیار ۔ کون بولے سوائے خاموشی کے کیا چارہ ۔ روشنی کی کثرت کا احاطہ کرنا غیر ممکن ۔ چند گیس کے لالٹینوں کے پلرس اب تک اس کی شان پر دال ہیں ۔ لالٹین زمانہ جنگ میں اس خیال سے اتار لی گئیں کہ شاید رات کو غنیم کا حملہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ نہ ہو جائے ۔ ان کی جگہ پر معمولی لالٹینیں لگا دی گئی ہیں جن کی روشنی محدود ۔ محلہ میں دو ایک لالٹینیں وہ بھی شکستہ ۔ کبھی روشن کبھی غائب ۔ کبھی اس کے اندر لیمپ روشن کبھی مٹی کی ڈبیہ پر چمنی لگی ہوئی ۔ یہی تو وجہ ہے کہ اندھیرے میں لوگ کنوئیں میں گر کر جان بحق ہو جاتے ہیں اور میونسپلٹی والے ان کی فاتحہ تک نہیں دلاتے ۔ وہ بھی عاقبت میں دامنگیر ہوں گے ۔

سید ہدایت حسین زیدی

سحرِ سہیل

(از مولانا اقبال احمد خاں صاحب سہیل ایم اے، ایل ایل بی علیگ)

جوبلی کے سلسلہ میں جہاں ہمیں دیگر بزرگانِ قوم و اہلِ قلم حضرات سے شرفِ نیاز حاصل ہوا وہاں جناب سہیل سے بھی سعادتِ تعارف نصیب ہوئی۔ کون نہیں جانتا کہ سہیل کی اعجاز نگاری و شگفتہ بیانی ہماری رسمی تحسین و ستائش سے ارفع و بے نیاز ہے۔ ذیل کی پاکیزہ و دل نشین نظم کی شانِ نزول ملاحظہ ہو:- ۲۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کی شام کو نواب راجہ صاحب الور مسلم یونیورسٹی یونین ہال میں تشریف لانے والے تھے، وقتِ مقررہ سے کوئی آدھ گھنٹہ قبل ڈاکٹر صاحب (جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پرو وائس چانسلر) کا اصرار ہوا کہ سہیل کی نظم اس موقع پر ضرور پڑھی جائے۔ وقت کی قلت، مہمانوں کی آمد، شدید مستعجل تقاضہ، اس شان سے جو نظم لکھی گئی ہو وہ ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ ناظرین اندازہ فرمائیں کہ اس میں کون سا شعر ایسا ہے جسے پڑھ کر دل میں ایک لطف و ارتعاش نہیں پیدا ہوتا۔ رنگینی، نازکی اور شگفتگی سہیل کے کلام کے نمایاں خصوصیات ہیں جو ان کی نظموں کو ایک خاص رنگ بخشتے ہیں، (ایڈیٹر)

نسیمِ صبح نسیمے ز کوئے یار آورد — پئے نوازشِ جان نافۂ تتار آورد

زہے خجستہ نسیمے کہ در ریاضِ علوم — نویدِ خرمیِ فصلِ نوبہار آورد

خوشا نویدِ گرامی کہ شبنمستاں را — امیدِ مقدمِ خورشید کامگار آورد

ہزار گرانئیہ در نوشتن نمی گنجد — کنوں کہ مہرِ درخشندہ در کنار آورد

رواقِ یونین از سر کشد بچرخ رواست — کہ توئی منزلِ خود چوں تو شہریار آورد

سحابِ جود و کرم آفتابِ دانش و داد — ز فیضِ اوست کہ نخلِ مراد بار آورد

ہزار نقش بہ تیغِ زنوک کلک انگیخت — ہزار پیکرِ معنی بہ روئے کار آورد

سپاس بندہ نوازی زہم گناں بپذیر — کہ مقدمت ہمہ را وجہِ افتخار آورد

جنابِ صدرِ گرامی عزل اللہ خاں — گلِ نیاز بہ ہیئت پئے نثار آورد

سہیلِ خستہ نہ دانش گہ ہر چہ دور افتاد
بہ ارمغانِ تو اشعارِ آبدار آورد

عظمت نپولین کا دیباچہ

فرانس کی رگوں سے خون کا ایک دریا بہ رہا تھا - وہ انقلاب عظیم جس کا سنگ بنیاد مرالو (Mirabeau) نے ۱۷۸۹ء میں اصلاحات سیاسی و معاشرتی - حقوق عامہ اور مجلس شوریٰ کی خاک پر رکھا تھا - بہت جلد ہوشیار اور ماہرِ فن معماروں کی دسترس سے نکل کر ان ہاتھوں میں جا پڑا جو تعمیر کی قوت سے محض بے بہرہ اور تخریب کی فطرتِ ثانیہ سے معمور تھے - بادشاہِ وقت لوئی شانزدہم (Louis XVI) اور وزراء و امرائے زمانہ کے دماغ معطل اور اجسام مفلوج تھے - خیالات کی طوفان خیز موجوں کا کون طاقت مقابلہ کر سکتی تھی؟ اُدھر "مرالو" نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر آئین نوازی و جہاں بینی کی قوت قدسیہ کو اپنے ساتھ دفن کر دیا - انجام یہ ہوا کہ کینہ توزی اور انتقام گیری نے آزادی کو معزول کر دیا اور مفید اصلاحات کی جگہ ہٹ دھرمی اور خونریزی نے لے لی - دو سال کے اندر اندر لوئی شانزدہم جیسا کہ نیک طینت و رعایا دوست بادشاہ اور ملکہ ماریا تھریسا (Maria Thrasia) جیسی حکمران کی بیٹی "ملکہ" دونوں کے سر ہزاروں تماشائیوں کی باطنی مسرت کے مابین تن سے جدا کر دیئے گئے اور ان کا اکلوتا بیٹا جو ولی عہد سلطنت تھا ایک معمولی شہری کی طرح اپنی مختصر زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا -

لیکن اگر ایک طرف شاہی خاندان اس طرح پامال ہو رہا تھا اور امرا و رؤسا کے گروہ جان بچا کر سرحد فرانس سے باہر نکل گئے تھے یا نذرِ اجل کر دیئے گئے تھے تو دوسری جانب خود قائدین قوم و ملک کی جماعت اجتماع کے اس ناقابل تسخیر جذبۂ عناد و غضب سے محفوظ نہ تھی جس نے اب تمام اور کوپس نشت ڈالکر منظر عام پر اپنا قبضہ جما لیا تھا - "رابس پیئر" (Robespierre) جس نے سب سے پہلے لوئی شانزدہم

ے قتل کی تجویز پیش کی تھی اپنے جمہوریت مآب ہاتھوں سے باشندگانِ ملک و محبانِ وطن کا بے دریغ خون
ارہا۔ "ڈانت" (Danton) جیسا انقلاب پسند مدبر جو مرا تو، کے بعد فرانس کا آخری سرمایۂ حیات
مید تھا اسے آلہ سے ہلاک کیا گیا جس کا استعمال بادشاہ اور ملکہ پر ہوا تھا۔ ۴۹ دن کے اندر ۱۳۶۰ آدمیوں
کم موت صادر کرنے کے بعد آخر کار "رابس پیر" پستول کی ایک ضرب سے مجروح کیا گیا اور دست و پا بستہ
ل پھونچا۔ راستہ میں ایک مقام پر گاڑی ٹھہری اور یہ زاہد متقشف جو کل تک تمام ملک کا لات و ہبل تھا اپنی
ں بے ہوشی سے بیدار ہوا جس کی اب بقا۔ کوئی پرواہ نہ کرتا تھا تو اس کی نظر اپنے مکان کے دروازہ پر پڑی
ے خون سے اس لئے رنگین کر دیا گیا تھا تاکہ رابس پیر کی خونریزیوں کی یادگار منائی جائے"۔

"رابس پیر" کے قتل پر فرانس نے اس طرح سانس لی کہ گویا ایک عظیم بوجھ اس کے سینہ سے ہٹ گیا
ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی رگوں سے خون کا بہنا اب تک بند نہیں۔ "فررن" (Freron) جس کی ہولناکیوں
بیان کرنے کے لئے ایک دفتر بے پایان درکار ہے ملک کے جذبات میں غضب و رجعت دیکھ کر خائف ہوا تھا
دیم روایات اور رابس پیر کی خون ریزیوں میں اس کی بھی شرکت ہے۔ اس کے سر کا بھی مطالبہ کرے گی گو یہ کا
ہ اس محض بے بنیاد ثابت ہوا کیوں کہ ان دنوں "رابس پیر" کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ابنائے
رس نے اس مقولہ کو مبنی برحق و صداقت ثابت کیا کہ "اجتماع کا حافظہ کمزور ہوتا ہے" اور فی الفور اس
خوار دہشت ناک انسان کو حالات موجودہ کا "ہیرو" قرار دیا۔ پھر کیا تھا "فررن" نے اپنے اخبار میں
یت زور و شور کے ساتھ اس امر کی اشاعت شروع کی کہ ملک کو صحیح طور پر امن و صلح حاصل کرنے کے لئے
رابس پیر کی ذم" کا بھی خاتمہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ صبح کو اپنے اخبار میں اشتعال انگیز مضامین لکھتا اور
ام کو اپنا مضبوط عصا لے کر گروہِ "جیکوبن" (Jacobin) کی سرکوبی کے لئے نوجوانوں
ایک جماعت کی سپہ سالاری کرتا تھا۔

فاقہ کشی اور افلاس کی ناقابل بیان آفتوں نے صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیا فرانس کی حالت اس وقت
۱۷۹۵ء میں ایک مدت کی بیمار انسان کی سی تھی جو محنت و کوشش پر آرام و راحت کو ترجیح دینے پر مجبور ہو
۱۷۸۹ء کا وہ بخار جس نے ہر فرد بشر کو آزادی کا شیدائی۔ حریت کا دلدادہ اور جمہوری سلطنت کا

خدا کار بنا دیا تھا اس طرح اتر گیا تھا کہ اب نبض کی حرکت بھی بمشکل محسوس ہوتی تھی۔ ابنائے فرانس آزادی۔ حریت
جمہوری سلطنت۔ حقوقِ انسانی۔ مجالس شوریٰ الغرض ہر اس شے سے جو اس کے قبل ان کے لئے سرمایۂ
حیات تھی عاجز و بے پروا تھے تمام جذبات ہیجان و انفعال کی جگہ ایک جذبۂ یاس نے لے لی تھی۔ ان کے
دل میں اگر کوئی شے باقی رہ گئی تھی اور اگر ان کے قلوب میں کسی کیفیت کا وجود تھا تو اسے صرف "نفرت" کا نام
دیا جا سکتا ہے۔ انقلاب سے نفرت۔ آزادی سے نفرت۔ جمہوریت سے نفرت۔ حکومت سے نفرت۔ بادشاہ
سے نفرت۔ قائد سے نفرت۔ الغرض فرانس کے تمام مذہبی۔ سیاسی و معاشرتی اعتقادات شکست ہو چکے تھے
اور وہ ایک جان بلب بیمار کی طرح اپنا سر تکیہ پر رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ اس وقت اس موت اور غفلت
و خاموشی سے بیدار کرنے کے لئے اسے ایک ایسے انسان کی ضرورت تھی جو فرانس کے بختِ خفتہ کو یکایک
مطلعِ عالم پر چمکا کر یاس کی جگہ امید۔ غفلت کی جگہ حرکت۔ جمود کی جگہ بیداری۔ بداعتمادی کی جگہ اعتقاد اور
نفرت کی جگہ محبت پیدا کر دے اور چوں کہ فطرتِ عالیہ کو فرانس کی عظمت کا قایم رکھنا منظور تھا اس لئے اب
زبردست انسان سیاسیاتِ عالم میں اپنا اول قدم رکھنے والا تھا۔

اگست ۱۷۹۵ء میں فرانس نے ایک جدید آئین تیار کیا جسے "نظامت" کا لقب دیا گیا ہے اور پانچ
"منتظمین" حکومت عالیہ فرانس کے اربابِ حل و عقد قرار دئے گئے۔ مگر ان "شاہانِ پنجگانہ" کا نام کچھ
آسان نہ تھا۔ کیوں کہ اس سے پہلے صغیر السن لوئی سیزدہم (Louis XVII) لقمۂ حوادث بن چکا تھا
اور اب "شاہ پرستوں" کے نقطۂ نظر سے فرانس کے تاج و تخت کا جائز وارث "کامٹی دی پراوِس"
(Comti de provence) یا لوئی سیزدہم (Louis XIII) تھا جو جلا وطن امرا کی تعداد کثیر اور
حکومتِ برطانیہ کے بحری بیڑے کے ساتھ اپنے اختیار کردہ خطاب کو مبنی بر حق ثابت کرنے کی سعی بلیغ
کر رہا تھا۔ اگرچہ ساحل "لوئی برن" ([illegible]) پر اترنے کی کوشش ناکام ثابت ہوئی
اور بات سو "شاہ پرستوں" کو بیک وقت گولی کا نشانہ بنا دیا گیا مگر بادشاہ کی موافقت اور قدیم طرزِ حکومت
کی جانب رجعت قہقری کا جو جذبہ رعایا کی ایک کثیر تعداد کے دلوں میں پیدا ہو چکا تھا اس کا سدباب
نہ ہو سکا اور اکتوبر میں آغاز تک اس جماعت نے اس قدر قوت مجتمع کر لی تھی کہ "نظامت" کا عروج د

ں ملوکیت کی گرج سے کانپ رہا تھا۔ فاقہ کشوں کے ایک اجتماع کثیر نے جو سڑکوں پر ہر قسم کی بدترین اشیا
شکم پری کی سعی حاصل کرتے پھرتے تھے بھوک کی شدت پر موت کو ترجیح دے کر اس خونریز انقلاب میں
ت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حالت نہایت درجہ نازک تھی۔ نہایت عجلت کے ساتھ "شاہان پنجگانہ" کا ایک
"براس" (Barras) سپہ سالار اعظم قرار دیا گیا مگر اسے اپنے فنون سپہ سالاری و حکمت جنگ
ر وسہ نہ تھا اس لئے اس کو ضرورت ہوئی کہ کسی دلیر شجاع ماہر فن کو اپنا حلیف و مددگار بنائے اور یہ
ب لازمی تھا کہ اس "جیکوبن" (Jacobins) جماعت سے ہوتا جو اس وقت نہایت بری نگاہ سے
ا جاتی تھی۔ براس کی نظر کارسکا (Corsica) کے ایک قلیل القامت افسر پر پڑی جس نے "تولن"
(Toulon) کی لڑائی میں "بے خوفوں" کی ایک جماعت مرتب کر کے "براس" (Barras) اور "فررن"
(Freron) کو انگریزوں اور "شاہ پرستوں" سے اس شہر کو چھین لینے میں امداد دی تھی۔ اور جو اس وقت
بس پیر" (Robespierre) کی حمایت و موافقت کے شک و شبہ کی بنا پر ایک معمولی جرم کے لئے
ست کر دیا گیا تھا اس کا چہرہ نہایت زرد تھا۔ اس کی آنکھیں لمبے لمبے بالوں کے نیچے چمک رہی تھیں۔
وہ اپنے میلے کچیلے "یونیفارم" میں ایک بدنما بد ہیئت و ناقابل لحاظ انسان معلوم ہوتا تھا۔ اس قلیل القامت
ناپختہ انسان کو لوگ "بونا پارٹ" (Bonaparte) کہتے تھے۔ براس نے "بونا پارٹ" کو
سپہ سالار نہیں بنایا جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اسے اپنے قریب رکھا۔ اور
کے صلاح و مشورہ سے مستفید ہوا۔ "براس" کو کیا معلوم تھا کہ چار سال کے اندر اندر کارسکا کا یہ
سپاہی اسے فرانس سے جلا وطن کر کے اپنے سر پر اپنے ہاتھ سے تاج رکھنے والا ہے۔

"براس" کے پاس توپیں نہ تھیں اور یہ بات ظاہر تھی کہ آج کی جنگ کا فیصلہ توپوں سے ہونے
والا ہے۔ پچاس توپوں کا ایک ذخیرہ "لس سیلنس" (Les Sablons) کے مقام پر موجود تھا اور اس امر کا ہر وقت اندیشہ تھا
کہ افواج نظامت نے پہلے ان پر قبضہ نہ کر لیا تو باغیان انقلاب انھیں اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ بونا پارٹ
سے مشورہ کیا گیا تو اس نے یہ صلاح دی کہ "مرات" (Murat) کو اس کام پر مامور کیا جائے جو ایک
قابل جیکوبن اور شجاع ترین انسان ہے چنانچہ فی الفور حکم صادر ہوا اور "مرات" (Murat) جو جوزی۔

نغارسے گھوڑا اڑاتا ہوا ’’ لیس‘‘ (Les Sablons) پہونچا تو کیا دیکھتا ہے کہ باغیانِ انقلاب کی ایک جماعت اسی مقصد کے لئے وہاں آچکی ہے ’’ مرات‘‘ (Murat) نے فی الفور حملہ کر دیا اور بہت جلد ان لوگوں کو وہاں سے بھگا کر اپنے کام کو انجام تک پہونچایا - اور اسی طرح گھوڑا اڑاتا ہوا ۱ بجے صبح کے وقت پچاس توپیں لئے ہوئے پیرس آن موجود ہوا -

توپوں کی آمد سے بیشتر ’’ ٹولیرس‘‘ (Tuileries) پر قبضہ کرنا دو گھنٹہ سے زیادہ کا کام نہ تھا - مگر اس وقت پانی موسلا دھار برس رہا تھا اور باغیانِ انقلاب سپہ سالار ’’ ڈنکن‘‘ (Donican) کو اگرچہ خون کے دریا بہا دینے میں کوئی دریغ نہ تھا مگر پانی میں بھیگنے پر زبردست اعتراض تھا - بارش ختم ہوئی تو ٹولیرس کے محل کے ہر چہار جانب محاصرہ شروع ہوا اور جنگ کی نقل و حرکت کا آغاز کیا گیا باغیانِ انقلاب کے سردار ’’ ڈنکن‘‘ (Donikun) نے مجلس شوریٰ کے پاس سفید جھنڈا لیکر ایک سفیر روانہ کیا جس کا پیغام صرف یہ تھا کہ ان خطرناک آدمیوں سے ہتھیار لے لئے جائیں جنھیں نہایت غلطی سے مسلح کر دیا گیا ہے - مجلس شوریٰ نے سفیر کی بات سننے سے انکار کیا مگر اسے یقین کامل تھا کہ نہایت جلد یہ محل خاک کا ڈھیر ہونے والا ہے - یکایک توپوں کی آواز سے زمین و آسمان دہل گیا بونا پارٹ تاریخ عالم میں اپنا پہلا قدم رکھ رہی تھی - اور یہ اس کی شاہانہ سلامی تھی -

بونا پارٹ نے اس استقلال و دوربینی کے ساتھ جو اس کا امتیازی نشان تھا - توپوں کا دہانہ یک لخت ’’ ڈنکن‘‘ (Donikun) کے قلب کی جانب پھیر دیا - سردار ڈنکن کے ہمراہی وہ لوگ تھے جن کی ہمت و جرأت کا فتح کرنا آسان نہ تھا مگر بونا پارٹ نے بہت جلد ’’ سینٹ راچ‘‘ (Saint Rach) کو جس پر اس جماعت کی مرکزی فوج نے تسلط جما لیا تھا - اڑا دیا اور ڈنکن اور اس کے حامیوں کو پیچھے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا - دریا کے بائیں کنارے سے جو حملہ کیا گیا اس کا بھی یہی حشر ہوا - ہر چہار جانب بھاری توپوں کے دہانے کھلے ہوئے تھے جو انسانوں کو ہضم کرتے جاتے تھے - آخر کار مراس نے حملہ کیا اور بہت جلد ’’ ٹولیرز‘‘ (Tuileries) کا تمام گرد و نواح اسی طرح سنسان و خاموش ہو گیا جس طرح وہ شور و شغب سے معمور تھا -

تین دن کے بعد "براس" نے ان افسروں کو مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کیا جنھوں نے اس کو
ہم میں امداد دی تھی۔ جس وقت "بونا پارٹی" اپنی خدمات کے اعتراف کے لیے طلب کی گئی تو "فررن"
(Freron) نے اس کی تعریف و توصیف میں یہاں تک کہنے سے دریغ نہ کیا کہ اس شخص نے ملوکیت
ہ پرستی کے سانپ کو اپنے زوردار بازوؤں سے کچلا ہے۔ "فررن" (Freron) جو نپولین کی بہن
سے شادی کرنے کا متمنی تھا ان خوشامدانہ الفاظ سے اپنی حیات لطیف کا سامان فراہم کر رہا تھا اور
س" (Barras) نے جو اس قلیل القامت و منکسر المزاج انسان میں اپنی عظمت و قوت کو مضمر
ھا تھا اس امر کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ "فررن" کی تردید کرے۔ براس نے "افواج داخلہ" کی سپہ سالاری
بنے لیے مخصوص رکھی اور "بونا پارٹی" کو اپنی نیابت میں مقرر کیا مگر بہت جلد خود مستعفی ہو کر اس کی عنانِ
ت بونا پارٹی کے ہاتھ میں دے دی۔

"عامۃ الناس ایک دوسرے سے دریافت کر رہے تھے "یہ بونا پارٹی کون شیطان ہے؟"
"جنگ اطالیہ کی توپوں کی گرج عنقریب اس سوال کا جواب دینے والی تھی"

(باقی آئندہ)

محمد عدیل عباسی

اندازِ خودنمائی

گلابی جاڑے کے دوپہر میں جس کسی کو بھی چند لمحات ایسے میّسر آئے ہوں کہ یکسوئی کے ساتھ آرام کر چکا ہو نہ اسے صنفِ نازک کے سست خرام نے چونکایا ہو اور نہ کسی دوست کی یاد نے تو بیداری کے بعد سب سے پہلے شکم کی آواز پر لبیک کہنا ہوتا ہے خصوصاً جب کہ وہ ڈائننگ ہال کے من و سلویٰ سے بدمذاقی کر رہا ہے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی میں ایک روز اسی حالت میں خواب سے بیدار ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک دعوتی رقعہ ہمارے محترم میاں محمد شریف صاحب کی جانب سے موصول ہوا۔ سب سے پہلے (Menu) پر نظر پڑی۔ واللہ باچھیں کھل گئیں۔ جلد جلد منہ کی معمولی قلعی کر کپڑے پہننے لگا اس سے فارغ ہوا آئینہ اٹھایا کہ آیا یہ مثال ہی پوری ہو سکتی ہے یا نہیں۔ حلویٰ خوردن را روئے باید۔ ہر شخص کو اپنا چہرہ کم و بیش بھلا معلوم ہوتا ہے اور ایسا تو شاید ہی کوئی ہو کہ جسے ایک آدھ بار یہ دھوکا نہ ہوا ہو کہ فلاں شخص نے میری طرف نگاہِ غلط انداز ڈالی تھی میں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ آئینہ دیکھ کر اس کی تصدیق ہوگی اور اپنے دوست سلطان حمید صاحب کا فقرہ کچھ اور معین ہو گیا۔ انھوں نے مجھے ایک بار ایسی حالت میں دیکھ کر کہا تھا ؎ حاجت نہیں بناؤ کی اے نازنین تجھے۔ قصہ مختصر یہ مراحل نہایت خوش کن خیالات میں طے ہو گئے۔ کمرہ بند کر دو قدم چلا تھا کہ۔ مجھے یکایک وقت کا خیال آیا میں نے خیال کیا بہت پہلے تو نہیں چل رہا ہوں۔ احتیاطاً دعوت نامہ دیکھ لوں۔ دوبارہ لوٹ کر کمرہ کھولا اور دعوتی رقعہ اٹھایا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی اور میرے منہ سے یک بیک یہ نکل گیا ؎

مار ڈالا انتظارِ یار نے

اس قدر بھی تازہ دم اچھی نہیں

رقعہ میں (To Mohummad al B.P.M) لکھا تھا۔ اسے رکھ بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے
اتنے میں میرے آقائے نامدار آتے ہوئے دکھلائی دیے۔ ان کی عجیب شان ہے۔ دور سے ایک
آنکھ دباتے کچھ مسکراتے ہوئے چلتے ہیں گویا ڈائننگ ہال سے میٹھے ٹکڑے لے کر آ رہے ہیں یا کلاس
کی چھٹی کی خبر لا رہے ہیں۔ مگر اس وقت ان کے چہرہ سے غیر معمولی خشونت کے آثار پائے جاتے تھے
میں نے سلام کرنے میں سبقت کی پھر تو وہ رام دکھائی دیے۔ میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور
جلد چائے بنانے کی فرمائش کر دی۔ انھوں نے پانی طیار کیا۔ شکر کے نہ ہونے کی اطلاع کی۔ میں نے
بنئے کے نام رقعہ لکھ دیا۔ پھر فرمایا دودھ بھی نہیں ہے۔ میں بدحواس ہو گیا کہ اب کیا کروں۔ مجھے ایک
جملہ یاد تھا یعنی "مہینہ کا اخیر ہے روپیہ ختم ہو گیا ہے کہیں سے لاؤ پھر دے دیں گے"۔ اور اس جملہ کو
اس وقت بھی بعجلت تمام کہہ گیا مگر میرے آقائے نامدار فوراً مسکرائے۔ ان کا تبسم دیکھ کر مجھے یاد آیا
کہ ابھی تو مہینہ کی صرف ساتویں ہے۔ ذرا دیر بعد خیال آیا کہ گھبرانے کی کیا بات ہے آقائے نامدار خوب جانتے
ہیں کہ ہمارے ہاں مہینہ کی شروع صرف اسی روز سمجھا جاتا ہے جس روز تنخواہ ملتی ہے دوسرے روز
سے آخری ایام آ جاتے ہیں۔ بہر حال چائے ہو ہی گئی۔ شام کو ٹہلنے کے لئے نکلا اور اس واقعہ کے
بعد جی نہ چاہا کہ لا کلاس جاؤں۔ کمرہ پر پہونچا اور کھانا کھا کر سو رہا۔

صبح ہوئی اٹھا جواہر منزل گیا اور وہاں کے حالات نے اس مصرعہ کو یاد دلا دیا ؎ "در بند ایں مباش کہ نہ
شنید یا شنید" ورنہ بہت دیر تک انتظار ہی کرتا ہوتا۔ واپس آ کر نماز پڑھی یہ دن کسی طرح گذرنا چاہتا
ہی نہ تھا۔ کسی نہ کسی طرح دوپہر ہوئی اور وہ ساعت مسعود بھی بالآخر آ ہی گئی۔ میں نے جلد جلد کپڑے
پہن ایک طالب علم کی سائیکل پر قبضہ کر اپنے محترم کے بنگلہ پر جا پہونچا۔ اس وقت کوئی سوا تین بجے تھے
دروازہ بند پایا۔ حیران ہوا کہ الٰہی کیا ماجرا ہے۔ کیا چائے کا دور ختم ہو گیا اور یونہی واپسی کی نوبت آئے
گی مگر ایک خادمہ سے معلوم ہوا کہ میاں صاحب موصوف غسل فرما رہے ہیں۔ اسی درمیان میں ایک
اور صاحب تشریف لائے۔ میں گھبرایا یہ کہاں سے وارد ہوئے خواہ مخواہ کے شریک ہو رہیں گے
مگر ان کے بشرے سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی یہی خیال ہو رہا ہے۔ چنانچہ اثنائے گفتگو میں معلوم ہو گیا۔ تقریباً

وسنے چار بجے ہوں گے کہ شریف صاحب خود باہر آئے اور معذرت کے ساتھ اندر لے گئے اس دن اتفاق لوریوان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور بیگم شریف صاحب کی طبیعت کئی روز پہلے سے خراب تھی۔ ان وجوہ سے غالباً شریف صاحب بھول گئے تھے۔ مگر ذرا دیر بعد میں نے دیکھا کہ چاء کا سامان آنا شروع ہوگیا ایک دو قسم کے۔ پیڑے۔ مٹھائی۔ نمکین۔ گھر کی بنی ہوئی مٹھائی۔ خشک وترمیوہ غرضکہ ہر وہ چیز جو ایک مولوی نما انگریزی خواں کے شکم سیری کے لئے کافی ہو آگئی۔ کھانا شروع کیا۔ گفتگو بھی مختلف موضوع پر شروع ہوئی۔ میں نے تعلیم میں عام تعلیم کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر جناب شریف بالقابہ نے اکسفورڈ و کیمبرج کے قصے سنائے اور ان میں بعض باتیں ایسی کہیں جن پر اگر ہمارے یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد عامل ہو جائیں تو ہمیں اُمید ہے کہ بہترین ہوسکتی ہے موصوف نے فرمایا کہ بھائی مسلم یونیورسٹی میں اگر اس طرز کو اختیار کرلیا جاتا تو میری رائے میں یقیناً نہایت نفع ہوتا اور بہت سے صلاحیت رکھنے والے مزاج ترقی پر پہونچ جاتے۔ یہ طرز یہ ہے کہ اگر ہر مضمون میں چند ہونہار ایم یا بی۔ اے کا انتخاب کرلیا جایا کرے اور ان کو سو روپیہ ماہوار خرچ کے لئے دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ تم تحقیقات علمیہ میں لگے رہو۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ مختلف جماعتوں میں اپنے مضمون پر ہفتہ میں دو چار لیکچر دے دیا کرو۔ اس طرح کم سے کم ہر مضمون میں پانچ پانچ طالب ہوکر بیس پچیس ایسے ہو جاتے کہ ایک علمی فضا پیدا کردیتے اور پروفیسرز کا ہاتھ بٹاتے۔ ان کو یونیورسٹی کا فیلو کہا جاتا اور ہر شخص چند دنوں میں ان کے حصول کی کوشش کرتا۔ ممکن ہے چند ہونہار انھیں میں ایسے ہوتے کہ آیندہ چلکر اچھے معلم نکل آتے اور انھیں کو مستقلاً یونیورسٹی میں ملازم رکھ لیا جاتا۔

اس طور معتدبہ نفع یونیورسٹی کو بھی پہونچتا اور ہونہار اور قابل طلبا بھی نکلتے۔ یہ اسکیم مجھے بہت ہی پسند آئی کاش یونیورسٹی کے بااثر حضرات بھی میرے ہمنوا ہو جاتے۔ اور کاش شریف صاحب اس کے متعلق اپنی انتہائی کوشش کرتے۔

سلسلہ کلام یہیں تک پہونچا تھا کہ معلوم ہوا کوئی باہر انتظار کررہا ہے۔ شریف صاحب نے دیکھا تو سائیس گاڑی لیکر حاضر ہے انھیں یاد آیا کہ آج جناب نواب صاحب چھتاری کی آمد کے سلسلہ میں پارک

ں جلسہ ہے ۔ اس درمیان میں میں نے اور ساتھیوں نے خوب اطمینان سے کھا پی لیا تھا پس کوئی ئ
ت بہت پر لطف باقی بھی نہیں تھی ۔ چنانچہ سائیس کی آمد سے فائدہ اٹھا کر ہم لوگ وہاں سے رخصت
ِ ئے ۔ چلتے وقت البتہ یہ کہہ دیا گیا کہ اس عجلت میں چار دعوت ناکافی رہی اس لئے کہ تبادلی صرف ڈنر سے
لمن ہے ۔ شریف صاحب نے اسے منظور بھی فرمالیا تھا ۔ دیکھیں کب تک نوبت آتی ہے ۔

فرمودۂ حاذق

حقیقت میں جو صورت جلوہ گر ہے — وہ در پردہ میرا حسن نظر ہے
اگر جاری رہیں اشک ندامت — تو کیا اندیشۂ دامان تر ہے
لگا رکھا ہے ان کا درد دل میں — یہی اک مرہم زخم جگر ہے
اسیران قفس ہیں فارغ البال — وبال جاں ہوائے بال و پر ہے
یہ سمجھایا خودی کو بیخودی نے — وہی ہے باخبر جو بیخبر ہے
جہاں گم گشتگان دل پڑے ہیں — وہی شاید کسی کا رہگذر ہے
نہ تو چھپتا نہ یوں بدنام ہوتا — ترا پردہ ہی ترا پردہ در ہے
مآل عشق بھی واعظ بتادے — تجھے تو عاقبت تک کی خبر ہے

ذرا آنکھیں اٹھا کر دیکھ حاذق
تماشا طور کا پیش نظر ہے

تتلی

(از جناب ابوالبنیان حضرت ذرّہ کاکوروی اورنگ آباد دکن)

سیارۂ فطرت ہوں   گہوارۂ حیرت ہوں
آمادۂ وحشت ہوں   آوارۂ الفت ہوں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

جلوؤں کی تمنائی   فطرت کی تماشائی
دل دادۂ رعنائی   پھولوں کی ہوں شیدائی
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

مردودِ تکبر ہوں   مقبول تصور ہوں
مصروفِ تحیر ہوں   مشغول تفکر ہوں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

توقیرِ تنعم ہوں   تاثیرِ ترنم ہوں
تصویرِ تبسم ہوں   تفسیرِ تکلم ہوں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

اک جوششِ رندانہ   اک گردشِ پیمانہ
اک لغزشِ مستانہ   یا جلوۂ جانانہ
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

خمخانۂ ہمدم ہوں   اک نور کا عالم ہوں
اک کیفِ مجسم ہوں   اک جنبشِ پیہم ہوں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

گلشن کی مجلّی ہوں — پھولوں کی تسلّی ہوں
کیا مستِ تجلّی ہوں — مصروفِ تعلّی ہوں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

پر نور زمانہ ہے — بجلی کا خزانہ ہے
کیا وقت سہانہ ہے — دل محوِ ترانہ ہے
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

ہیں ساتھ میں ہمجولی — صورت کی ہوں میں بھولی
ساری ہو میری چتلی — کہتے ہیں سب مجھے تتلی
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

گلشن کی ضیاؤں میں — پوشیدہ نواؤں میں
عشرت کی ہواؤں میں — پر نور فضاؤں میں
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

منقوش سُنہرے پَر — ہیں جن میں جڑے گوہر
یا اوڑھے ہوں میں چادر — رنگین پری پیکر
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

میں صورتِ پروانہ — ہوں درد کا افسانہ
ملبوس گدایانہ — اور دُھن ہے فقیرانہ
رقاصۂ فطرت ہوں
جاں دادۂ نکہت ہوں

پیامِ شوق

یہ خط پڑھ کر لکھنے والے کو نہ پہچاننا تعجب ہو۔ آغا صاحب تو چھپ سکتے نہیں؟
مگر تعجب اس بات کا ہو کہ یہ ان کے جانشین کون پیدا ہو گئے؟

(ایڈیٹر)

میری کبھی کی اچھی سی سہیلی۔ پیاری جمیلہ! نہ معلوم کتنے دنوں سے تمہیں لکھنے کی دل میں ٹھانی تھی لیکن خدا خدا کر کے آج وہ گھڑی آئی ہے۔ جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہے۔ بھلا تمہیں اب گھر بار کے کام دھندوں میں چھٹکارا کہاں کہ اس داستان کو اول سے اخیر تک اوسان سے ایک بار بھی پڑھ لو۔ تم تو دیکھتے ہی کانوں پہ ہاتھ دھرو گی کہ اے ہے! کون پڑھے اس شیطان کی آنت کو مگر تمہیں بھی میرے سر کی قسم جو اسے سب کو ہی نہ دیکھو۔ پھر چاہے مجھے دل میں کتنا ہی بُرا کیوں نہ کہہ لینا۔ مگر دس کام چھوڑ کر اس کو ضرور پڑھنا۔ جب سے تم چھوٹی ہو۔ وہ دن ہے اور آج کا دن جو ایک سانس کا بھی دار ہوا ہو۔ جب تک ایک دیس رہنا ہوا تو کبھی کبھار دیکھ کر ہی دل بھلا لیا۔ اور اب تو ہزاروں کوس برسوں کا رستہ۔ تم کہاں۔ ہم کہاں۔ مگر خیر جب تک سانس ہے آس ہے۔ تم تو جی میں کہتی ہو گی آنکھ سے دور دل سے دور۔ اور یہ انگریزوں میں بھی کہاوت ہے۔ مگر یقین جانو کوئی کمبخت دن ایسا ہوتا ہو گا جو دس پانچ بار تمہاری یاد نہ آ جاتی ہو۔ تمہیں تو اس کا کیوں یقین آنے لگا ہے۔ تم تو اپنی ہی سی بات سب کی جانتی ہو۔ بہتیرا اس کمبخت دل کو سمجھایا کہ ارے جی کون کس کا ہوا ہے۔ بھلا کسی کو کیا پڑی جو کسی کو یاد کرے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں گرفتار۔ نت نئی سہیلیاں۔ نیا نیا بہنیلا۔ یہ بھی بس منہ دیکھی کی محبت ہوتی ہے پھر بھولے کو جو پوچھے۔ کبھی چھٹے چھمانس یاد ہو گئی تو ہو گئی ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح۔ اور جہاں گذرے دو ایک برس پھر تو جیسے کسی کی کبھی جان پہچان ہی نہ تھی اگر اتفاق سے کسی کے گھر بیاہ شادی میں

ہوا بھی تو سو غیروں کے ایک غیر بہت کیا تو سلام کے نام ہاتھے کی کھی مار لی۔ گویا بڑا ہدف پہ تیر مارا۔ اور دنیا
ر کا احسان کیا۔

تم بچاری کا کیا گِلا شکوہ۔ اب تو سارے زمانہ کی ہی ریت ہے۔ پہلے یہ باتیں نہ تھیں۔ بڑھو بوڑھوں
ے سنا ہے پہلے تو جس سے جس کی ایک بار منہ ملاقات ہوگئی پھر کیا مجال جو ٹس سے مس ہو۔ مرتے مر جائیں
ساتھ نہ چھوڑیں وقت بے وقت کے شریک۔ خدا نہ کرے کوئی ہرج مرض ہوا تو ایسی جی کو لگ جاتی
ہے کسی اپنے کی بلکہ ایک بار تو اپنے بھی گھبرا جائیں لیکن یہ جو کبھی الکسا دیں یا ماتھے پر شکن تک لائیں۔ پھر
نی کی خوشی۔ غم کا غم۔ پھر جب تو وہ ست جُگ لد آیا۔ ایک دوسرے کا کام آسانی سے نکل جاتا
۔ سب ہنسی خوشی تھے۔

تو کیا بات تھی کہ ایک کا دوسرے کو درد تھا اور اخیر دم تک کا ساتھی۔ اور اب تو ہر جگہ اس کے خلاف
دیکھ لو تو کیا نتیجہ ہے؟ گھر گھر لڑائی کٹائی۔ مار پٹائی۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جلے۔ قرب قیامت کی
نی ہے۔ میں نے اکثر اس کو سوچا کہ آخر یہ بات کیوں ہوگئی تو میں تو جانوں جب سے اس ملک میں یہ
لوگ آئے ہیں جب سے ہی یہ باتیں پیدا ہوئی ہیں۔ غدر سے پہلے کوئی اُن کو جانتا بھی نہ تھا۔ سب
سیدھے سادھے لوگ باگ تھے۔ ان نگوڑوں میں بھلا محبت اور اخلاص کہاں سے آیا۔ بس جو ہے
ہری ٹیپ ٹاپ ہے۔ ظاہر میں تو ایسے ملیں گے جیسے ان سے زیادہ کوئی اور دنیا کے پردے پہ
در داغرضا نہیں۔ اور پیٹھ پیچھے جو کبھی نام بھی لیں۔ ان میں وفا کہاں۔ جہاں منہ پھیرا اور انھوں
نے آنکھیں پھیریں۔ سو جب سے ان کی حرص کی ہر بات میں ان کی ریس برتی بس جب سے ہی ان
ی عادتیں ہوگئیں وہی مثل ہوگئی کہ ؎

حرص پہ مری جولاہی
سوتن پہ چین بندھائی

اب جسے دیکھو فرنگی بنا چلا آ رہا ہے۔ گِٹ پِٹ گِٹ پِٹ کرتے۔ ٹوپ ٹائی لگائے چرٹ پیتے اکڑتے
رہتے ہیں۔ نہ عربی جانیں نہ فارسی اور اردو بولنا تو کالے آدمیوں کا کام ہے۔ انگریزی ظاہر ہی ہے

کہ کیا خاک آئے گی۔ بس ادھر کے ہوئے نہ اودھر کے ہوئے آج لعل سے یارانہ ہے تو کل اس سے آشنائی ہوا کسی تیسرے سے جا دوستی کی۔ بھلا ان مٹکیوں کی دوستی کسی کام کی جب ایک کے ہی ہو کے نہ رہے تو کسی دوسرے کے تو کیا خاک ہوں گے۔ پھر ان سے بھلائی کی کیا اُمید۔ دوستی کیا ہوئی بازار کا سودا سلف ہو گیا جہاں پیسہ ڈالا سستا مول دیکھا خرید لیا۔ بس تو نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ نہ تو میرا نہ میں تیرا۔ کام پڑ گدھے کو باپ بنا لیا کام نکل گیا مونچھوں کو تاؤ دیا۔

اے ہے! خدا بچائے اس چودھویں صدی سے ابھی جانیں اور کیا کیا ہونا ہے! اس سے آگے ہی زمانہ کے آدمی اچھے تھے اپنی کیسی پیار محبت سے گذار گئے۔ اور اس دنیا میں تو ایک کا کام دوسرے سے نکلتا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ ہی پہچانتا ہے۔ جب دل میں ہی دکھ درد نہ ہوگا تو کسی کا کام کیا خاک بھوبل ہوگا دکھاوے کی ظاہرداری ہوگی۔

اب تو سو دو سو میں ایک آدھ ہی ہو تو ورنہ سب کے سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

میری پیاری بہن! ذرا وہ دن تو یاد کرو جب ہم تم ایک ہی مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے۔ وہ بھی کیا بے فکری کا زمانہ تھا۔ پھر ہم تم دونوں کو ایک ہی کمرہ میں جگہ ملی تھی۔ صبح ہوئی۔ تم نے آگ جلائی میں۔ پتیلی چڑھائی اور ذرا کی ذرا میں ہنڈ کلھیا پک کر تیار ہو گئی۔ دونوں نے مل جل کر پیار محبت سے کھالی کمرہ میں سب طرح کی دال اور چاول رکھے رہا کرتے تھے۔ پھر مدرسہ ساتھ جانا۔ ساتھ آنا۔

پڑھنے سے جی اکتایا۔ اچھی اچھی باتیں کرلیں۔ نہ کسی کے لینے میں۔ نہ دینے میں۔ اچھے میں نہ بُرے میں۔ اپنے اپنے کام سے کام۔ ایک دوسرے کا کیسا کچھ دُکھ درد تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک دور میرے درد ہوا اور تم نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں نے بہتیرا کہا کہ ننھی! ذرا سی تو آنکھ لگا لے جی اور سا ہو جائے گا۔ مگر ایک نہ سُنی۔ اور اسی طرح صبح کر دی۔ ایسی آپس میں محبت تھی کہ اس کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کبھی جدائی ہوگی۔ لیکن نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو تم نے آنکھیں پھیریں؟ ہم تو جانیں تمہاری بڑی آپا کا آن دیس میں بیاہ ہونا ہے اور یہ گھڑی ہے جو کبھی بات رہی ہو۔ منہ پھیرے پہ کبھی بول چال ہو بھی گئی تو کیا ہوا۔ وہ پہلی سی بات کہاں؟ سچ تم کی تو با

اور ہوتی ہے اور یوں اوپرے دل سے دنیا داری برتنے کو ل بھی لئے تو کیا ہوا ۔ اللہ میاں نے دل
سوٹی سب کو دی ہے ۔ اس پہ ظاہر داری اور سچ مچ کا حال سب کھل جاتا ہے ۔ ایک بجاری بڑی بی
ے گھر آیا کرتی تھیں ہم ان سے خوب قصے کہانیاں سنا کرتے تھے ان کی ہی زبانی کہنا یاد ہے کہ ملک بنگال
ں بڑی بڑی کرنی کرتوتیں اور جادو ٹونے ہوتے ہیں ۔ اچھے خاصے آدمی کو جانور بنا دیتے ہیں ۔ ایسی ایسی
ھیاں جن کی صورت دیکھے ڈر لگے ۔ چٹے بال منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ٹھوڑی آگے کو نکلی ۔ ہاتھ
ڈنڈا لئے ۔ ناک کے بانسہ پہ عینک لگی گھروں گھروں دل ملواتی اور آپس میں دل برائی کراتی پھرا کرتی
ں انھیں ایسے ایسے ٹوٹکے ۔ گنڈے اور تعویذ یاد ہیں کہ بات کی بات میں ایک کا دل دوسرے سے
پھیر دیں اور چاہیں تو دونوں کو ملا دیں ۔ اب نہ جانیں انھیں کمین کی کوئی بوڑھیا بڑے لاٹھ صاحب کے
ھ جب وہ کلکتہ دیس سے دلی دیس میں بادشاہت کرنے کو آئے تھے لگی لپٹی چلی آئی اور نہ جانے ان
یم صاحبہ لاٹھ صاحب کا دل اپنے بس میں کروانے کو ساتھ لوا لائیں کہ جو یہ کار اب دلی میں بھی ہونے لگے ۔ اور نہ
نے تمہاری آپا کی ہی سسرال میں کسی نے تمہیں کچھ کرا دیا ۔ میں نے پرسوں سنہری مسجد میں ایک مولوی
حب عربی کے طالب علم کے پاس پانچ پیسہ بھیجکر فال کھلوائی تھی تو انھوں نے بھی یہی بتایا کہ ہو نہ ہو کسی
ن نے کچھ کرایا ہے ۔ ایک کالا مرغ مانگ بھیجا ہے اس کے خون سے تعویذ لکھیں گے ۔

اچھی بہن! یہ تو تمہیں بھی یاد ہو گا ۔ کل کی سی بات ہے جب تمہاری بڑی آپا کے بچہ نے سارا گھر سر پر
الیا تھا رو رو کر دیدے لال انگارہ کر ڈالے تھے اور اپنے اوپر روٹی پانی تک حرام کر لیا تھا ۔ تو وہ کیا تھا ۔ اس
نے ایک طوطا پالا تھا دو سال تک اسے پڑھایا ۔ خوب بولتا تھا آدمیوں کی سی باتیں کرتا تھا ۔ وہ ہر وقت
س کی خبرگیری کرتا تھا اور دانہ پانی کا خیال رکھتا تھا ۔ ایک روز کہیں اتفاق سے اس کی کھڑکی کھلی رہ گئی ۔
دہ اس میں سے نکل دیوار پر جا بیٹھا وہاں سے غائب ہو گیا نہ معلوم کس طرف کو اڑ گیا ۔ بھلا اُسے
خیال ہوتا طوطا چشمی تو دنیا میں مشہور ہے جب باہر سے کھیل کود کر بچہ اندر آیا تو دیکھا کہ طوطا غائب ہے ۔
ر کیا تھا مچلنے لگا ۔ سارے گھر کا اللہ آمین کا بچہ سب نے ہی سمجھایا ۔ طرح طرح کے بہانے کئے مگر
سے تو اسی طوطے کی رٹ لگی تھی ۔ ایک سال روتا رہا ۔ اس کی ننھی سی جان پہ اس کا ایسا دکھ لگ گیا

کہ جب خود کھانا کھانے بیٹھتا طوطے کو ٹکڑا دینے کا خیال کر کے آنکھوں میں آنسو بھر آتے - کسی کو
اپنے عزیز قریب کے مرنے کا بھی اس قدر خیال نہ ہوگا جو اسے اس پرند کا ہوا - تو بھلا یہ کیا تھا؟ پاس
رہنے کی محبت ہی تو تھی ورنہ ننھا سا جی وہ کیا جانے نگوڑی محبت کس بلا کا نام ہے - کیا اس سے اچھا
طوطا نہ ملتا - مگر وہی پاس رہنے کی جو چیک یا اُنسیت ہوتی ہے وہ اس معصوم ناسمجھ کو بھی خدا نے دی
تھی - وہ تو پھر بھی جان دار تھا خود تمہارے کپڑے چیتھڑے کی گڑیا بھلا اس کی بھی کوئی حقیقت ہے مگر
جب تمہارا بھائی تم سے چھین کر پھاڑ ڈالتا تھا تو تم گھنٹوں پلنگ کے سانکھے میں سر دیئے پڑی رہا کرتی
تھیں تو یہ کیا تھا - وہی دل کا لگاؤ -

جب ناسمجھ بچوں کا ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے یہ حال ہو تو پھر تم ہی دل میں سوچو اور انصاف کرو
کہ اگر کوئی انسان انسان کے پاس رہے اور پھر الگ ہو جائے تو اس کا کیا کچھ حال ہوگا ؟

انسان کو تو اللہ میاں نے سب سے ہی اچھا کر کے بنایا ہے اور جتنی چیزیں دنیا میں ہیں
سب اس کے لئے بنائی ہیں تو وہ تو سب سے ہی اچھا ہوا - خیر پور والی بڑی بی کہا کرتی تھیں کہ
اللہ میاں نے جب آدمی کا خمیر بنایا تو جیسے آٹے کے خمیر میں دہی کا سہیجا دیتے ہیں اس کے خمیر
میں اُنسیت کا سہیجا دیا گیا بس جب سے ہی آدمی کا نام انسان ہو گیا - پھر بھلا جس میں اُنسیت
نہ ہو وہ انسان ہی کدھر سے ہوگا - اگر یہ نہ ہو تو بھلا اس میں اور جانوروں میں کیا فرق رہا ان کا
تو یہ ہے کہ بس کھا لیا - پی لیا - غصّہ آیا تو آگ بگولا ہو کر مارنے کو دوڑ پڑے - ان کو اللہ نے تمیز
شعور ہی نہیں دیا کہ جو کسی بات کو سوچیں یا کسی کا دکھ درد کریں -

اس دنیا میں تو دل کو بھی دل سے چین ہوتا ہے - یہ دل بھی کیا چیز ہے ایک آن کی آن
میں چین سے بے چین ہو جاتا ہے - اس روز سیدھے سبھاؤ میرے منہ سے یہی نکل گیا ادھر سے
آ گئے میاں مسعود - یہ آج کل کے زمانہ کے پڑھے لکھے جنٹلمین ہیں - بی - اے کا امتحان دیا ہے لگا
لگے دلیلیں چھانٹنے کہ یہ دل ول کوئی چیز ہی نہیں صرف ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جو کچھ ہے وہ دماغ
ہے اور انسان کا خیال ہے نہ کوئی چیز دراصل خوبصورت ہے اور نہ کوئی بدصورت یہ سب کچھ

ـرے ہی خیالات اور دماغوں کا نتیجہ ہے کہ جو کسی چیز کو اچھا کہتے ہیں اور کسی کو برا کہنے لگتے ہیں
ہ جو چیز ایک کو بھلی معلوم ہوتی دوسرے کو اس کی طرف رغبت بھی نہیں ہوتی اگر خوبصورتی بدصورتی
صل کوئی چیز ہوتی تو سب کو یکساں معلوم ہوتی۔ اسی طرح یہ ذائقہ ہے اگر یہ کوئی چیز علیحدہ ہوتی
ہمیشہ سب کا ذائقہ یکساں ہوتا لیکن بخار والے کو ہر چیز کڑوی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی
سننا۔ دیکھنا۔ غرض نہ معلوم کیا کیا بکواس کی۔ مجھے تو اب یاد بھی نہ رہی۔ میں نے اول تو جواب
پھر سوچ لیا کہ کون منہ لگے۔ ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ بھلا اپنے آگے یہ کسی کی چلنے دیتے
!

جہاں انگریزی پڑھی اور لگے شین شتاخ جھاڑنے خدا کو آنکھ سے نہیں دیکھا تو عقل سے
پایا ہے۔ باوا دادا کے وقت سے سنتے چلے آتے ہیں کہ یہی آدمی کا دل ہے جو آجاتا ہے اور لوٹ
ہو جاتا ہے اور سب کو یہی دھڑکنا سنائی دکھائی دیتا بھی ہے۔ پڑوس میں ایک بڑی بی رہتی
ان کا ایک جوان بیٹا خدا کی پھٹکار لڑکر گھر سے بھاگ گیا اس کو فرنگیوں نے بھرتی کر کے
پر بھیج دیا وہاں سے مدت بعد خبر ملی کہ وہ کام آگیا۔ بس بیچاری ان بڑی بی کا حال دیکھا نہیں
تھا ایسی بلکیں تڑپیں کہ اللہ دشمن کو بھی ایسا دکھ نہ دے۔ ہر وقت دل پکڑے ہوئے رہتی تھیں
کہتی تھیں کہ ہائے کوئی دل نکال کر لے گیا۔ ہم نے تو نہ دیکھا کہ میاں مسعود کے مطابق سر پکڑ کر
ئی ہوتیں کہ ہائے کوئی دماغ نکال کر لے گیا۔ یہ ساری فرنگیوں کی باتیں ہیں۔ ہاں یوں کہو کہ
کے اپنے دل نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ تو پتھر ہے جب تو کسی کا دکھ درد نہیں ہوتا اس لڑائی میں
دوں مار ڈالے۔ بس یہی سب کو سکھاتے ہیں۔ ہاں ان کے تو پاس جو کچھ بھی ہے وہ کھوپڑی
اس سے ہی ساری دنیا کے کام لیتے ہیں۔ سنا ہے کہ اب کوئی ایسا آلہ ایجاد ہوا ہے کہ ولایت
ت ہمارے ملک میں بیٹھے ہی بیٹھے سننے میں آجاتی ہے۔
یہ سب ان کے ہی دماغ کا نتیجہ نہیں تو کیا ہے۔ دل کا تو ان کے یہ حال ہے کہ نہ کسی کی محبت
ے انس۔ اور دماغ کا یہ حال کہ ہزاروں ایجادیں کر ڈالیں۔

اے لو! تم بھی کہو گی کہ خط کیا ہے شیطان کی آنت ہے بڑھتے پڑھتے آند آگئی اور یہ ہے کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔ پھر تم اس گھریلو زبان کی بھی عادی نہیں ہو تم تو عربی فارسی کے بڑے بڑے لغت بولتی ہو۔ خیر بعض مردوں نے بھی اب تو یہی طرز اختیار کر لیا ہے۔ تم تو اخبار رسالوں میں پڑھنے کی عادی ہو گی۔ اچھا لو اب رخصت۔ مگر ہم تو جب جانیں جب بغیر ہمارا نام بتلائے بغیر آتا پتہ لوٹ جواب دے دو۔ تمہاری اچھی سلطانہ تمہیں سلام کہتی ہیں۔

حسیّات اشک

زلبس راہِ وفا دارد نیاز او نیازِ من — بہ سوز ہجر ہم آغوش گردیدست سازِ من

اگر افتد گرہ در رشتہ کارے چہ غم دارم — کہ مشکل را کند آسان کریم کارسازِ من

چہ اعجاز ست در حسن قدیم از جلوہ پیرائی — کہ محمودش بطرز دلربائی شد ایازِ من

دلِ آگہ زرازِ حسن و عشق یار میداند — کہ پیوند دگر دارد حقیقت با مجازِ من

جگر از سوزشِ کم آتش و آب دگر وارد

نویدِ کلکِ مژگاں پارۂ سوز و گدازِ من

افاداتِ ثاقب

از

(مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی)

رہینِ خود فراموشی گلوں کو یاد کیا کرتے
اب اس سے بڑھ کے پاسِ خانۂ صیاد کیا کرتے

تصورِ عیش کا کرتے ہیں تو غم اور بڑھتا ہے
جو یاد آنے سے بھولا ہوئے ہم یاد کیا کرتے

اسیری راستا دیتی نہیں دل کو تصور کا
قفس والے خیالِ خاطرِ آزاد کیا کرتے

زمانہ ہو نہ جاتا دست کش آخر تو کیا کرتا
جو زیرِ خاک ہیں ظالم انھیں برباد کیا کرتے

خوشی ناخوش بسر کی عمر طوفانِ حوادث میں
مخالف تھی ہوائے عالم ایجاد کیا کرتے

بنایا ہم نے دل کو عشق میں کہنے کی باتیں ہیں
بھلا ہم اپنے ہاتھوں اپنا گھر برباد کیا کرتے

ہماری طرح مہماں چند دن کا تھا نشیمن بھی
جسے ویران ہونا تھا اُسے آباد کیا کرتے

خدا جانے زبانِ حال کیا کہتی رہی ورنہ
ہم اک تصویرِ غم تھے عشق میں فریاد کیا کرتے

یہ حسن و عشق کے اسرار ہیں سمجھیں گے دل والے
ہم ان کو بھولتے کیونکر وہ ہم کو یاد کیا کرتے

رسائی کب تھی ان کی بزم میں اچھا جو ہوتی بھی
تو ہم کیا ان سے کہتے اور وہ ارشاد کیا کرتے

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے ثاقب
مقامِ شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

پُراسرار جوگن

از

جناب محمود الحسن صاحب بی اے

میرے ایک دوست جن کے متعلق غلط بیانی کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا اپنی ایک عجیب سرگزشت بیان کرتے ہیں
واقعہ یقیناً صحیح ہے اور اس کے غلط ہونے کی وجہ بھی کوئی بظاہر نہیں معلوم ہوتی۔

ایک سال وہ اجمیر شریف کے عرس میں شریک ہونے کے لئے گئے۔ وہ طبعیت کے بہت آزادمنش اور بے پروا آدمی واقع ہوئے ہیں موسیقی اور شاعری کی طرف بھی کچھ رجحان ہے۔ عرس میں اس قسم کے آدمیوں کی ایک کثیر تعداد شریک ہوتی ہے۔ قال وحال کی محفلیں سرود کے جلسے عقیدتمندی کے اظہار عجیب وغریب مناظر وہاں کی پرکیف صحبتیں ہیں۔

لیکن جو لوگ کسی قدر سنجیدہ اور با مذاق ہیں وہ عامیانہ مجمعوں میں شریک نہیں ہوتے بلکہ خاص خاص جلسوں میں شرکت کرنا پسند کرتے ہیں۔

میرے دوست بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھے۔ وہ آخری شب کے ایک جلسہ میں اتفاق سے شریک ہو گئے یہ مختصر صحبت چند باکیف لوگوں پر مشتمل تھی جس پر ایک عجیب قسم کا سکون اور سکوت طاری تھا۔ درمیان میں ایک کم سن مغنیہ ستار پر نغمہ سنج تھی اُس کی آواز میں کچھ اس بلا کا سوز وگداز اور ایک خاص کشش تھی کہ تمام سامعین بے خود معلوم ہوتے تھے اور ہمہ تن گانے کی طرف متوجہ تھے۔ میرے دوست کو بیٹھتے ہی ایک سحر سا محسوس ہوا اور عجیب حالت اُن پر طاری ہوگئی معلوم ہوتا تھا کہ گانے والی ایک ساحرہ ہے جو آواز کے زیر وبم سے ان کی روح کو مسحور کر رہی ہے۔

اُن کا بیان ہے کہ اس وقت میں صرف مغنیہ کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس کی آواز سن رہا تھا۔ تمام ماسوا خیالات میرے دماغ سے دور ہوگئے تھے تمام کائنات میرے خیال سے محو ہوگئی۔ یہاں تک کہ اپنی ذات کا احساس

وشعور بھی جاتا رہا۔ غزل تمام ہوئی اور مغنیہ ایک سکوت کے ساتھ ستار لئے ہوئے اٹھی اور ایک طرف کو چل دی میرے دوست بھی اس کے پیچھے پیچھے بغیر کسی مقصد کے چلے جا رہے تھے۔ ایک نامعلوم قوت ان کو اُس اجنبی گانے والی کے ہمراہ لے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر میں وہ عمارتوں کے سلسلہ سے نکل کر سڑک پر پہونچ گئی اور کچھ دیر بعد وہ آبادی سے بھی آگے بڑھ گئی اور ویرانہ کی طرف چلی۔ میرے ازخود رفتہ دوست اُس کے ہمراہ اُسی طرح پیچھے جا رہے تھے تھے۔ تقریباً میل بھر چلنے کے بعد وہ رکی اور لوٹ کر ایک شخص کو پیچھے آتا ہوا دیکھ کر رک گئی۔ چلنے والا اب اُس کے قریب پہونچ گیا۔ قریب آتے ہی اس نے کسی قدر سختی کے ساتھ پوچھا۔ تو کون ہے؟ اور میرے پیچھے کیوں آ رہا ہے۔ اس سوال نے آنے والے کو چونکا دیا۔ اس کی خود فراموشی کسی قدر دور ہوئی اور اس نے جواب کی کوشش کرتے ہوئے کہا

یہ سوال اس سے کرو جو اپنے ارادہ سے آ رہا ہو اور اپنے بس میں ہو۔ میں نہ اپنے ارادہ سے آ رہا ہوں اور نہ اپنے اختیار میں ہوں۔

کم سن جوگن اس جواب کے بعد کسی قدر خاموش ہوئی اور کہنے لگی۔ اجنبی رہرو! خواہ تم کوئی بھی اور کسی خیال سے میرے ہمراہ آ رہے ہو میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ میرے ساتھ مت آؤ۔ اُس کے قریب مت آؤ جس کو دنیا سے اب کوئی تعلق نہیں اور دنیا کو جس کے ساتھ کوئی علاقہ نہیں۔

میرے دوست۔ میں جو کچھ کہتا تھا کہہ چکا۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مجھے اس وقت بس اسی قدر احساس ہے۔

میں کون ہوں۔ بقول تمہارے ایک اجنبی رہرو۔ میں تمہارے ساتھ کیوں آ رہا ہوں اس کا جواب میرے پاس نہیں۔

اس وقت لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ اچھا آؤ۔ ایک روح کو میں اور آزمانا چاہتی ہوں۔

میرے دوست نے آخری فقرہ سُنا اُن کے بدن میں ایک غشی سی پھیل گئی۔ اُن کے اعضا متحرک ہو گئے
ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جوگن اسی طرح خاموشی اور سبک رفتاری کے ساتھ چلی جا رہی تھی چاندنی کرنیں
اُس کے کھلے ہوئے بالوں کے ساتھ شوخیاں کر رہی تھیں ہوا کے سرد جھونکے اس کی ساری کے دامنوں سے اٹکھیلیاں
کر رہے تھے۔ جوگن اپنا ستار لئے ہوئے سر جھکائے چلی جا رہی تھی اور میرے دوست ایک عصبی ہیجان کی مانند
میں اُس سے متابعت کر رہے تھے۔ کچھ دور اور چلنے کے بعد جوگن رُکی۔ رہرو۔ اب تمھاری حالت بدل گئی۔
اس وقت تم اپنے ہوش میں ہو۔ غالباً تم اس ویرانہ میں ایک وحشت پسند عورت کے ساتھ چلتے ہوئے ڈر رہے
ہو کیا تم جانا چاہتے ہو۔ بہتر ہے تم جاؤ۔ اُس روح کو تنہا چھوڑ دو جس کا دنیا میں کوئی سہارا نہیں اور جس سے دنیا کا
کوئی تعلق نہیں۔ جوگن کی آواز یہ کہتے ہوئے غمناک ہو گئی۔ وہ ایک دل آویز انداز سے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے
گہری نظروں سے میرے دوست کو دیکھا ان کو محسوس ہوا کہ اُس کی نظریں اُن کی روح میں پیوست ہو رہی ہیں۔
جوگن نے اس حالت میں کہا۔ تم تو بہت دلیر آدمی ہو مجھے معلوم ہے تم اپنے ہم صحبتوں میں بڑے منچلے اور دلاور
مشہور ہو۔ شہر کے لوگ تمھارے نام سے ڈرتے ہیں۔ پولیس تم کو اکثر شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ خیال ہے کہ تم
ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہو۔ ضلع کے بدمعاشوں سے تمھارا تعلق ہے۔ تمھاری دلیری کی آزمائش بھی ہو گی
ہے تعجب ہے کہ تم ایک بے کس اور کمزور عورت کے ساتھ رات کی خاموش فضا میں چاند کی سکون بخش روشنی میں گھبرا رہے
ہو۔ اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ میرے دوست ایک عالم تحیر میں غیب داں جوگن کے الفاظ سن رہے تھے۔ جو
بظاہر حالات صحیح تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے قلب میں طمانیت پیدا ہو رہی تھی۔ چند منٹ میں ان کو کامل
سکون حاصل تھا۔

عجیب و غریب ساحرہ! خدا کے لئے تم بتلاؤ کہ تم کون ہو۔ تم مجھے کیسے جانتی ہو اور تم یہاں مجھے کیوں
لائی ہو۔ تم میری کیا آزمائش کرو گی۔ میں ڈرتا نہیں میں تمھاری آزمائش کے لئے تیار رہوں لیکن تمھاری آزمائش کی
نوعیت نے مجھے مضطرب کر دیا معلوم نہیں میں اس میں کامیاب ہوں یا نہوں۔
جوگن انداز دلکش سے مسکرائی۔ اُس کے دانت موتیوں کی آب و تاب کے ساتھ چمکے۔ وہ اور زیادہ شاندار
اور بارعب معلوم ہونے لگی۔

معلوم ہوتا تھا کہ یونانیوں کی متخیلہ موسیقی کی دیوی یہ ہی ہے جو چاندنی رات میں ستار ہاتھ میں لئے ہوئے ایک
لربائی میں کھڑی ہے اور ایک اُس کا پرستار اُس کے سامنے مؤدب کھڑا ہے۔

اب تمہیں سکون حاصل ہے۔ آؤ میرے ساتھ چلے آؤ لیکن جو کچھ تم دیکھو اس کے متعلق ایک بھی سوال
۔ یہ میری ہمراہی کی شرط ہے۔ کیا تم اس کے پابند رہو گے میرے دوست نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کسی قدر
ے ساتھ اس اقرار کا اظہار کیا۔ جوگن پھر آگے چلی۔ کچھ دور فاصلہ پر ایک مقبرہ نظر آیا جس کا سفید گنبد چاند کی روشنی
ک رہا تھا۔ اس میں تیز روشنی ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناعم جوگن مقبرہ کے دروازہ پر پہونچ کر رکی اور کہا
ب مزار بزرگ پر فاتحہ پڑھو اور اندر چلے آؤ۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد میرے دوست کو کامل اطمینان حاصل
ن کی قوت ارادی اُن کے اعصاب میں پورے طور پر واپس آگئی تھی۔ دہشت کا اثر اُن کے دل سے
ہوگیا تھا۔

مقبرہ کے اندر جو روشنی تھی اس کا مخرج کہیں نہ معلوم ہوتا تھا۔ جوگن نے ستار قریب میں رکھ لیا اور ایک
ن خوبصورت جانور کی کھال پر جو ایک کونہ میں بچھی ہوئی تھی بیٹھ گئی۔ میرے دوست سے کہا بیٹھ جاؤ اور میرے
آ کر بیٹھو نامعلوم مخرج سے آنے والی روشنی حسین جوگن کے سیاہ بالوں پر پڑ رہی تھی وہ سر جھکا کر خاموش
اور اپنی انگلی سے کھال کے نرم بالوں کو ادھر اُدھر ہٹانے لگی۔ یہ اس وقت کا ایک معصومانہ کھیل تھا۔
نے حضرت کے مزار پر مجھے گاتے ہوئے دیکھا اور میرا گانا سنا اس کے بعد تم میرے ساتھ ہو گئے۔ میرے
میں کوئی کشش تھی یا میری صورت میں کوئی دل کشی تھی جو تم کو بقول تمہارے یہاں لئے چلی آئی۔ جوگن یہ کہکر
ں اور ملکی نظر سے اپنے سامنے کو دیکھا۔

خدا کے لئے ایسے سوال مجھ سے نہ کرو جن کا جواب دینے کی مجھ میں طاقت نہیں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم
نہیں کہہ سکتا۔ جوگن خاموش ہوگئی اس نے اپنا ستار اٹھا لیا اور نہایت دردانگیز طریقے پر تان سے یہ غزل شروع کی۔

سینہ ہا ئیم ہم ز سوز ہجر تو بریاں شدہ

دیدہ ہا ئیم ہم ز درد عشق گریاں آمدہ

اس طرح اس نے چند اور اشعار اس عاشقانہ غزل کے پڑھے۔

میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تو

جوگن کی نرگسی آنکھوں سے باریک قطرے موتیوں کی طرح گرنے لگے تھے اُس کی آواز میں لرزش پ
ہوگئی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے احساسات کو ضبط کر رہی ہے۔ جوگن درد بھرے نغمے فضائے خاموش
کر رہی تھی معلوم ہوتا تھا کہ فضائے خاموش میں اس کے نغموں نے ایک تموج پیدا کر دیا ہے۔ در و دیوار
بھرے راگ سے متحرک معلوم ہوتے تھے۔ میرے دوست کیفیات اور تاثرات کے جس دریا میں غ
اُس کا اندازہ خود اُن کو ہی نہ تھا۔ جوگن نے غزل ختم کرنے کے بعد ستار ایک طرف کو رکھ دیا اور
خاموش ہوگئی۔

پھر وہی گہرا سکوت طاری تھا۔ کچھ دیر سکوت کے بعد اُس نے سر اٹھایا اور اچانک طور پر ایک
کیا جس نے میرے دوست کو کسی قدر بدحواس کر دیا۔ تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟ میرے دوست
اپنے خیال کی پریشانی سے مقابلہ کرتے ہوئے کسی قدر تامل کے بعد جواب دیا محبت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ تمھا
اس سوال سے کیا تھی؟

آہ۔ دنیا کے سادہ لوح انسان محبت صرف ایک قسم کی ہوتی ہے۔ صرف ایک سے ہوتی ہے
صرف ایک بار ہوتی ہے۔ میرے دوست نے پھر کسی قدر متانت سے جواب دیا۔ ایسی محبت سے میں
جوگن نے کسی قدر استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ سچ کہو کیا میرا خیال غلط ہے۔ کیا واقعی مجھے
ہوا کیا مجھے ابھی تک اتنی بھی تمیز نہیں ہوئی۔ جو روح دنیا کی پوشیدہ باتوں کو جان سکتی ہے جو آنکھوں سے
چیزوں کو دیکھ سکتی ہے وہ ایک قلب کی کیفیات کا غلط اندازہ کرتی ہے۔ ہاں مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے
میں جہالت میں مبتلا ہوں۔ اجنبی انسان! خدا کے واسطے مجھے معاف کرو۔ میں نے تم کو فضول پریشان کیا
مجھے دھوکا ہوا۔ تم اب جاؤ۔ اس ویرانہ میں اس عورت کی ملاقات کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ اس واقعہ
ہمیشہ کے لئے فراموش کر دو۔

میرے دوست۔ تم نے میرے متعلق ایک اور غلط خیال کیا۔ میں اس واقعہ کو نہیں بھول سکتا۔ یہ میر

سے باہر ہے۔ اگر پہلے کوئی دھوکا تمہیں میرے متعلق ہوا تو یہ دوسرا دھوکہ ہے۔ یہ پراسرار ملاقات یہ خیال
یں کرسکتا۔ یہ مجھے ہمیشہ بے چین رکھے گی۔ کیا تمہارا کام یہ ہے کہ تم انسانی روحوں کو مضطرب کرتی رہو۔
گن - نہیں۔ یہ میرا مطلب نہیں بھولنے سے میری مراد یہ نہیں کہ تم میرا خیال نہ کرو۔ اس ملاقات کے
نہ سوچو۔ لیکن میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گی۔ میں تم سے پھر ملوں گی اور ضرور ملوں گی۔ ابھی تم ناقص ہو۔ تم
کی تکمیل کرو۔ تم کسی روح سے محبت کرو۔ تمہارا سینہ تنگ ہے۔ اس کو وسیع کرو۔ دل کے اندر تحرک
کرنے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد میرے پاس آؤ اور ضرور آؤ۔ تمہاری مجھے ضرورت ہے۔ لیکن ابھی نہیں
ت میں نہیں۔ ایک تبدیلی کے بعد۔ تمہارے روحانی عناصر کی تکمیل کے بعد۔
یرے دوست جوگن کی اس عجیب گفتگو پر حیران تھے۔ انھوں نے کہا۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو مجھے کس سے
ا چاہیے۔ جوگن - ہاں محبت کرو اور کسی کے ہو جاؤ۔ تمہارے دل میں اہلیت ہے۔ محبت کی قابلیت
سے کام لو۔ قدرت کے فیضان کی ناشکری نہ کرو۔ ان نعمتوں کو بے کار نہ جانے دو۔ ان ہی کی وجہ سے
رے متعلق دھوکہ ہوا۔ میں محبت کی اہلیت کو محبت سمجھی لیکن میں کسی سے محبت کروں۔ کیا محبت میرے
ہے۔ میرے ارادہ کی ماتحت ہے؟
وگن دل آویزی کے ساتھ ہنسی۔ محبت کی اہل روح! محبت کسی کے اختیار میں نہیں ہوتی۔ محبت کا ارادہ
ن نہیں۔ لیکن تلاش و جستجو یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ ایک مضطرب روح کہیں تمہاری منتظر ہے اس سے
دو محبت کے اس لافانی سمندر میں غرق ہو جاؤ جس کی حدیں سرحد ادراک سے بھی پرے ہیں۔ میری
رہنمائی کرو۔ میں کہاں تلاش کروں۔
گن غمناک ہو کر۔ آہ اگر مجھ میں راہ نمائی کی قابلیت ہوتی تو سب سے پہلے اپنی راہ کشائی کرتی۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یں خود گم کردہ راہ ہوں۔ ایک گم گشتہ روح تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کرسکتی۔ لیکن تلاش کرو۔
کے ہر ذرہ میں دیکھو۔ قدرت کے وسیع خزانوں اور جواہر ریزوں میں تلاش کرو۔ سمندر کی گہرائی میں
یں ڈھونڈوں۔ ریگستان کے چمکنے والے ذرات ریگ میں دیکھو۔ سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر تلاش

ویرانوں کی وحشت میں۔ بیابانوں کی وسعت میں۔ جنگل کے گنجان درختوں انسان کی خوشنما آبادیوں میں کعبہ کے سجدہ ریزوں میں۔ دیر کے صنم پرستوں میں۔ نغمہ طرازوں کی نغمہ سنجیوں میں۔ ماتم گساروں کی آہ و زاریوں میں محفل عشرت کے چہچہوں میں۔ مرغزاروں کی روح افزا سرسبزیوں۔ شب غم کی جانگداز تاریکیوں میں دیکھو اور تلاش کرو زمین پر چلو۔ پانی پر سفر کرو۔ ہوا پر اُڑو۔ کہیں نہ کہیں تم کو تمہارا محبوب ملے گا۔ اُس کا آغوش محبت تمہارے لئے کھلا ہوگا۔ جاؤ تلاش کرو۔ محبت کرو اور پھر مجھ سے ملو۔

میری کرم فرما میں تم سے کہاں ملوں۔

جوگن۔ اس کی فکر مت کرو۔ جب تم اس قابل ہوگے تم مجھ سے مل جاؤگے۔ میں خود تمہاری منتظر ہوں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تنہا روح جاؤ اور اپنے ساتھی کو تلاش کرو۔

جوگن نے یہ فقرہ فیصلہ کن طریقہ پر کہا۔ اور میرے دوست کو رخصت کردیا۔

مقبرہ سے باہر آتے ہی۔ اندر کی روشنی غائب تھی۔ سہیل آسمان پر ضیا پاشیاں کر رہا تھا۔ چاند کی تابش کم ہو چلی تھی۔ طلوع کے آثار ظاہر ہوئے۔ میرے دوست کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک عجیب و غریب خواب کے بعد بیدار ہوئے ہیں۔

اجمیر سے واپس آنے کے بعد آج تک اُن کے خیالات ویسے ہی قایم ہیں۔ وہ پر اسرار جوگن کے حکم کی تعمیل میں فقیرانہ لباس میں مصروف تلاش ہیں۔ خدا معلوم کب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں۔

کفِ گل فروش

نظری: بوئے یار من ازیں سست وفا می آید — ساغر از دست بگیرید من از کار شدم

سودا: کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا، کہ چلا میں

سعدی: دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟

میر: پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے؟

ترانۂ بے صدا

از

نواب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر

(دواس آبنائی کے تتبع میں)

(۱)

پردۂ ابر میں مستور ہوا ماہِ تمام ہر طرف دورۂ خاموشی و تنہائی ہے
بحرِ امواج ذرا بند کر آنکھیں اپنی! چھائی خواب کی ہر چار طرف چھائی ہے
نغمہ ریزی کی کوئی حد بھی ہے تار نہ ٹوٹے تھک گیا ہوگا اب آرام بھی دم بھر کرلے

نیند کے لوٹ مزے!

ساری دنیا پہ چلا راگ کا تیرے جادو کون ہے جو متاثر نہ ہوا نغموں سے
خامشی نور بچھاور کے لئے لائی ہے تھک گیا ہوگا اب آرام بھی دم بھر کرلے

نیند کے لوٹ مزے!

مضطرب میں لبِ ساحل ہوں ارے قلزمِ حسن دیکھ لوں تجھ کو نظر بھر کے تو چین آجائے
ٹکٹکی باندھ کے لیکن کوئی کیونکر دیکھے تھک گیا ہوگا اب آرام بھی دم بھر کرلے

نیند کے لوٹ مزے!

(۲)

بے صدا ایک ترانے سے یہ دل بسمل ہے پرسکوں خواب وہ دے جیسے ہو عطرِ انفاس
اے مرے دوست مرے محسنِ شیریں گفتار! تجھ کو جانا نہیں ہرچند ہے تو میرے پاس

اف رے اندازِ حیا!

اب بھی فکر ہے کب خواب سے ہو کر بیدار پرطرب راگ وہ چھیڑے کہ سُروں میں ڈوبا
از سمک تا بہ سماں وجد ہو جس سے طاری رقص زہرہ کرے اور گائے ثریا ٹپا

گونج اٹھے ساری فضا!

چشم بر راہ اسی آس میں بیٹھا ہوں میں دم آخر جو دھندلکے میں ادھر تو آئے
التجا ہے یہی اے دوست یہی حسرت ہے پرسشِ حالتِ بیمار کو گر تو آئے
ہاتھ یوں شوق میں اٹھ جائے مرے دل کی طرف جس طرح کوئی اشارہ کرے منزل کی طرف

رہبرِ راہِ فنا

اکبر سے بڑا اورنگ زیب تھا

یہ مضمون ہمارے مکرم فرادوست مولوی عبدالباقی صاحب ایم اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڈھ نے عنایت فرمایا ہے ہمیں امید تھی کہ اُن کے مضمون کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے عربی سے ضرور ہوگا لیکن موجودہ مضمون کو پڑھ کر ہم اپنی کوشش میں ناکامیاب رہے تاہم آئندہ توقعات وابستہ ہیں۔

ایڈیٹر

اکبر اور اورنگ زیب کے متعلق مختلف طبقہ مورخین میں باہم اختلاف ہے۔ یورپ کے مورخین خصوصیت کے ساتھ اکبر کو قابل دانش مند اور مدبر قرار دیتے ہیں اور انھیں مورخین کا پیرو وہ گروہ بھی ہے جس نے یورپ کے آغوش میں پرورش پائی ہے اورنگ زیب اس جماعت کے نزدیک بڑا ضرور رہے مگر مدبر کی حیثیت سے اُس کا پہلو بہت کمزور رہا۔ اس کے متعلق صرف ایک دو کمزوریوں کا اعلان نہیں کیا جاتا بلکہ مسلسل سیاسی غلطیوں اور کمزوریوں کا مرتکب قرار دیا جاتا ہے سلطنت مغلیہ کا زوال صحیح معنوں میں اورنگ زیب کے ہاتھوں سے ہوا اورنگ زیب کی کوتاہ نظری نے جماعت کو مشتعل کر دیا خود ارکان سلطنت میں کدورت اور کشیدگی تھی۔ ہندوستان سے امان جاتا رہا اور معرکہ روز بروز گرم ہوتا گیا۔ جس ہندوستان میں اکبر نے صلح آشتی کی بنیاد ڈالی تھی اُس چمن میں اورنگ زیب نے آگ لگا دی۔ ہندوستان میں مختلف مذہب کے لوگ آباد ہیں، مختلف خیال کے لوگ بستے ہیں۔ مختلف رسم و رواج کے پابند ہیں۔ اسی لئے جب اورنگ زیب نے اسلام کو بجبر پیش کرنا چاہا تو ساری خدائی برہم ہوگئی۔ اورنگ زیب کا جو سلوک ارکان سلطنت کے ساتھ تھا وہ بھی خوشگوار نہ تھا۔ ان امراء اور اراکین میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اورنگ زیب کی رائے میں متحد ہوتا یا اورنگ زیب کی طرف سے اس کو اطمینان ہوتا۔ غرض اسی طرح کچھ اور جزئی اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب اکبر سے کہیں فروتر ہے۔ مگر ہماری رائے اس معاملہ میں مختلف ہے۔ ہمارے خیال میں اورنگ زیب ہر حیثیت سے اکبر سے زیادہ عالی دماغ اور بیدار مغز تھا۔ دونوں میں نمایاں فرق ہے زمانہ کی رفتار کے ساتھ جا رہا تھا۔ اس نے اس راز کو ضرور سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان جیسے مختلف الاقوام ملک :

حکومت کرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس کے لئے اُس نے جو کچھ جائز ناجائز صورتیں اختیار کی ہیں
ے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اکبر کی حکومت اُس محفل سرود کے مشابہ ہے جس میں آدمی خوش ہوتا ہے اور بہت
اپنے ایمان اور ضمیر کے خلاف کر گزرتا ہے۔ مگر جب مجلس اُٹھ جاتی ہے تو تنہائی میں بہت سی حرکات پر شرمندگی
وس آتا ہے۔ مجھ کو اس سے انکار نہیں ہے کہ اکبر نے صلح و آشتی کے ذریعہ سے ہندوستان کی مشہور جنگ جو
قوم کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اور اس طرح سے سلاطینِ مغلیہ عرصۂ دراز تک ان زبردست ریاستوں کی طرف سے
ہے۔ مگر پھر بھی اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکبر کے زمانہ میں جو کچھ ہوا وہ ایک دماغ کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ
اق سے بیدار مغزوں کی ایک جماعت مل گئی تھی جس نے زمانہ کی اچھی طرح سے نباضی کی اور اس کی رفتار
شاہدہ کیا اور اس کی اقتدا پسند کر لی اکبر کی تمام تر کامیابی کا یہی راز ہے۔ اورنگ زیب جس زمانہ میں سریر
پر آیا تو ہندوستان میں وہ لوگ نایاب تھے جو اورنگ زیب کا ہاتھ بٹاتے۔ اس کی مثال طلوع فجر کی ہے
مان کے تمام ستارے غائب ہو جاتے ہیں اور مشرق کے افق پر جھلملاتا ہوا ایک ستارہ رہ جاتا ہے اس راز کو
زیب بھی سمجھ رہا تھا کہ اگر میں زمانہ کی اقتدا کروں تو سارا زمانہ میرے زیر نگیں ہوگا مگر ابتدا سے اُس کو ایک ضمیر
قدم قدم پر روک دیتا تھا۔ اورنگ زیب سب کچھ کر سکتا تھا مگر اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام کرنا اس کے لئے دشوار
مثال کے سقراط کو لے لیجئے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے خیال سے مارا جاتا اور یونانیوں میں ہر دل عزیز بن کے رہتا
نے ایسا نہیں کیا۔ جامِ زہر میں اس کے نزدیک وہ زہر نہیں تھا کہ جو اپنے ضمیر کے خلاف کرنے میں تھا اور
تو یہی ہے کہ سقراط کے جام زہر ہی سے اس کی بلند آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح اورنگ زیب کی اولوالعزمی
ت اُس کے فعلوں سے ثابت ہوتے ہیں۔ دو قسم کے لوگ دنیا میں بڑے سمجھے جاتے ہیں۔ ایک وہ
کی رفتار کو پہچانتے ہیں اور اس کی اقتدا کر کے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ اکبر ایسی جماعت کا ایک مرد تھا۔
وہ لوگ جو اپنے کو زمانہ سے بھی بڑا سمجھتے ہیں اور اپنے کو مقتدا سمجھ کر زمانہ کو اپنے پیچھے کھینچنا چاہتے ہیں۔
ت پہلی جماعت سے ہر طرح اعلیٰ اور بلند ہے۔ اس جماعت کو ہزاروں دقتوں دشواریوں اور مشکلات کا سامنا
اس جماعت کا وہی آدمی کامیاب ہوتا ہے جو واقعۃً اپنے ملک سے عمومی حیثیت میں زیادہ ذہنی اور گراں
ہ پورے ملک و ملت کا بار اُٹھا سکے۔ خود ہمارے زمانہ میں ایک شخص موجود ہے جو کبھی گوشہ میں پناہ لیتا ہے

کبھی تحمل کے ساری قوم کو تبلیغ کرتا ہی کبھی دنیا اس کی آواز پر لبیک کہتی ہی اور کبھی برافروختہ ہو کر اس کی محبت سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ غرض یہ شخص بھی عجب انوکھا ہی مگر باوجود امن اور آشتی پسندی کے اُس کی کامیابی کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہیں۔ زیادہ تر اس کی وجہ یہ ہے کہ جس چیز سے وہ مقابلہ کر رہا ہی اس کے پورے بار کا متحمل نہیں ہی۔ اورنگ زیب بھی اس جماعت کا ایک فرد تھا کہ جس نے ساری عمر اس تمنا میں گزار دی کہ وہ تمام زمانہ کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ بہت سے ورموں پر نشتر لگانا پڑے گا اور مریضوں کی فریاد بلند ہو گی مگر اس نے اس کی پرواہ نہ کی ایسا آدمی بڑا مغرور ہوتا ہے مگر اس کی کامیابی آسان نہیں ہوتی۔ غور کرو تو دنیا میں ایک آدھ مثال مل جائے گی۔ جو اس شان کی ہو اور پھر اس کو کامیابی کش مکش کے بعد حاصل ہو گئی ہو۔ اورنگ زیب کوتاہ نظر نہیں تھا بلکہ وہ زمانہ کوتاہ نظر تھا جس میں اتنا بڑا دور اندیش شخص موجود تھا۔ اورنگ زیب کی ناکامیابی اس سے قطعاً نہیں ثابت ہوتی کہ اُس کے بعد سلطنت کا شیرازہ یکایک منتشر ہو گیا بلکہ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اورنگ زیب کے بعد کوئی ایسا شخص اورنگ زیب کا جانشین نہیں ملا جو زمانہ کو اپنی طرف کھینچتا اپنے رنگ میں رنگتا اور اورنگ زیب کی پالیسی کو سنبھال سکتا۔ اورنگ زیب نے خود اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا کہ زمانہ کس طرح اپنی رفتار پر آنا چاہتا ہے اور وہ کس طرح ہر کام پر زد لگانے کے لئے تیار تھا۔ جو لوگ اورنگ زیب کے جانشین ہوئے وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ کم سے کم زمانہ کے ساتھ ہی چلتے۔ اورنگ زیب سے مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ناراض تھی۔ وہ اس وجہ سے کہ اورنگ زیب کا محاسبانہ طرز اُن کو کسی طرح پسند نہ تھا ہنود و جماعت اورنگ زیب سے اس لئے ناراض نہیں تھی کہ وہ سخت گیر ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان میں ایک دلیر جنگ آزما پیدا ہو گیا تھا اور وہ بجائے خود آزادی اور استقلال کا دلدادہ تھا اس نے اپنی قوم کو اپنے علم کے نیچے لانے کی کوشش کی اور اورنگ زیب کی اقتدار کے استیصال کے لئے ہمہ تن آمادہ ہو گیا۔ اورنگ زیب محسوس کرتا تھا اور پوری طرح اس کو یقین تھا کہ جس امر کے وہ درپے ہے وہ لقمہ تر نہیں ہی بلکہ ایک دشوار گزار مسئلہ ہی۔ مگر اُس کو اپنی ہمت اور زور کا بھروسہ تھا خونی معرکوں سے آزردہ اور ملول ضرور تھا مگر ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا تھا کہ آخر الحیل السیف اورنگ زیب کی اس شان کا پتہ تفصیلی واقعات سے چلتا ہی اور جزئی واقعات اُس کی جلالت کے شاہد ہیں۔ تاریخ پر اس حیثیت سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہی اور اس وقت یہ فیصلہ آسان ہو گا کہ اکبر اور اورنگ زیب میں کون بڑا اور لائق ہی۔ (باقی آئندہ) عبدا[illegible]

اسلام کی علمی اور اخلاقی فتوحات

اور

اُن کا احیاء علی گڑھ میں

(از انیس رضوی امروہوی)

بند اوّل

ایک شب محوِ خیالِ صحبتِ دوشینہ تھا — میرا دل تاریخِ عہدِ رفتہ کا آئینہ تھا
کھنچ رہا تھا سامنے دورِ گزشتہ کا سماں — آرہا تھا یاد مجھ کو وہ عرب کا آشیاں
پیش تھا آنکھوں کے منظر سروری دربار کا — دیکھتا تھا میں تماشا خُلق کا ایثار کا
بڑھ رہا تھا چار سو جُند رمۂ دینِ متیں — اور ملائک دے رہے تھے مژدۂ فتحِ مبیں
ہند اک گوشہ ہماری کشورستانی میں تھا — اور ادھر صحرائے اعظم اپنی نگرانی میں تھا
الغرض سارا جہاں ہم سے جلا پانے لگا — پرچمِ توحید چاروں سمت لہرانے لگا

گشت حاکم بر ممالک کلکِ گوہر زائے ما
بود نگرانِ دو عالم چشمِ شب پیمائے ما

بند دوم

رزم سے پھر بزم کی جانب جو دل مائل ہوئے — عہدِ رفتہ کے خزانے علم کے حاصل ہوئے
دفن تھیں سب حکمتیں ایران اور یونان کی — تھی ریاضی دورِ تاریکی میں ہندوستان کی
مٹ رہا تھا نام سقراط اور افلاطون کا — داغ تھا دنیا پہ اُن کے فلسفے کے خون کا

تازہ پھر مسلم نے کی عصرِ کہن کی داستاں | پھر لگایا علم و حکمت کی کتابوں کا نشاں
یاد مومن کو جو قولِ اُطلُبُ العِلمَ آگیا | وہ دلِ شوریدہ کو سرتا بہ پا گرما گیا
زندگی غازی کی پھر تحصیلِ عرفاں پر مٹی | بن گئی ہر شہر میں ایک ایک یونیورسٹی
یثرب و بغداد و غرناطہ دمشق و قرطبہ | تھا سیوطہ واز برو غزنیں میں اک اک جامعہ
خوشہ چیں اس باغ کے محسودِ عالم بن گئے | جن سے ارکانِ خلافت اور محکم بن گئے
حجۃ الاسلام و سینا ابنِ رشد و بو ھزیل | جامی و رومی و فارابی نظامی و طفیل
یہ انھیں انہارِ علم و فضل سے سیراب تھے | یہ اسی رودادِ عزوجاہ کے کچھ باب تھے
ان سے تابانِ مذہب اسلام کا جلوہ ہوا | بوسہ گاہِ پادشاہاں ان کا نقشِ پا ہوا
جس کسی کو ان کے در کی ناصیہ سائی ملی | اس کو صد کشور کی گویا مسند آرائی ملی

مور را از فیضِ حکمت شد سلیمانِ زمن
گشت یک طفلک ز ما ہمسرِ سلطانِ زمن

بند سوم

آسماں نے پھر جو رُخ بدلا ستانے کے لئے | کر دیئے ساماں فراہم سب مٹانے کے لئے
پیس ڈالا رفتہ رفتہ گردشِ ایام نے | خوب گھس گھس کر مٹایا چرخِ نیلی فام نے
آخرش انوارِ یزداں پر اندھیرا چھا گیا | ہائے اُس خورشیدِ بے ہمتا پہ بادل آگیا
کھنچ گیا پھر سامنے دورِ جہالت کا سماں | بن گئے افرادِ مسلم ایک قومِ جاہلاں
رہ گیا ازہر کا باقی ٹمٹماتا سا چراغ | صفحۂ تاریک پر جیسے کہ اک چُٹ نوردِ اغ
ماسوا سب نے چکھا ایک قطرۂ آبِ فنا | رفتہ رفتہ سب نظامِ علم برہم ہوگیا
کارواں بے راہ تھا پھر وادی و کہسار تھا | پھر خزاں کا دور تھا پھولے پھلے گلزار میں
قیس عامر نجد کے جنگل سے پھر بیگانہ تھا | "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

پڑ رہی تھی ہر طرف اک یاس و حسرت کی نظر ‏ ڈھونڈھتا تھا میں کہ کچھ تو اپنی مل جائے خبر
ہو رہا تھا سر بزمِ محفل سے سینہ پاش پاش ‏ آ رہی تھی ہر طرف سے یہ صدائے دل خراش

محو ظلمت شوکتِ غرناطہ بغداد شد
حیف آن ایوانِ تعلیم و حکم برباد شد

بند چہارم

دفعتاً پھر کر جو دیکھا دیدۂ ناکام نے ‏ دیکھتے کیا ہیں علی گڈھ کی فضا ہے سامنے
وہ عبادت گاہِ باری وہ عظیم الشان حال ‏ جن کی ہر ہر اینٹ سے پیدا ہے شانِ ذوالجلال
وہ کتب گاہِ لٹن وہ یادگارِ آسماں ‏ وہ منازل جن سے ہیں مشتاق اور یک کانشاں
کوششوں کا سید مرحوم کی ثمرہ ہے یہ ‏ محسن و مشتاق کی امید کا خاکہ ہے یہ
ہے ادھر محوِ دعا حضرت کی روح پُر فتوح ‏ دوسری جانب تبسم ریز ہے سید کی روح
"آفتابِ" علم کی ہر سو "ضیا" پھیلی ہوئی ‏ اور اک مسحور کن گویا فضا پھیلی ہوئی
مچ رہی ہے شرق سے تا غرب دنیا میں دھوم ‏ ہے علی گڈھ آج کل ماوائے اخلاق و علوم
یثرب و بغداد کی واحد نشانی ہے یہی ‏ قیروان و قرطبہ کا آج ثانی ہے یہی
اس سے پھر جاری فیوضِ علم کا چشمہ ہوا ‏ یاں سے پھر پر تو فگن اسلام کا لمعہ ہوا
پھر نظر آئی مسلماں کو صراطِ مستقیم ‏ پھر دل و جاں کو معنبر کر گئی بادِ شمیم
نجد کی وادی میں پھر جوشِ جنوں کا طور ہے ‏ پھر انھیں عشاقِ علمِ معرفت کا دور ہے
مژدہ اے رندانِ فن، مطلوع شد صبح بہار ‏ شد جہانِ علم از فیضِ علیگڈھ آشکار

خیز کیں جوشِ بہاراں ولولہ انگیز شد
باز مینائے شرابِ معرفت لبریز شد

حُسنِ تکلّم

عورتوں کی ترقی و فلاح دراصل مردوں کی ترقی و فلاح ہے اور اُن کی تباہی تمام ملک و ملّت کی تباہی ہے۔
ایک مشہور زنانہ کالج سے متعلقہ خوش نما اور فرحت بخش چمن میں ایک لڑکی ٹہل رہی ہے اور کسی گہرے خیال میں غرق معلوم ہوتی ہے اس کی نظریں روش پر جھکی ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ روش کے ہر ذرہ کو غور سے دیکھ رہی ہے حالانکہ اس کو روش کا خیال بھی نہیں۔ کچھ آہٹ پاکر وہ چونکی ادھر اُدھر دیکھ کر نظریں جھکالیں۔ ایک گہری سانس لی اور ایک قریب ہی پڑی ہوئی بنچ پر بیٹھ گئی اور اوپری نظروں سے پھولوں کے تختہ کو دیکھنے لگی۔ چمن کے جانفزا پھول حُسن کی نیرنگیاں پیش کر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں مل کر اُن کی خوشبو تمام چمن کو مہکا رہی تھی ہر ذی حس دماغ کو پھولوں کی لطافت سے متاثر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر مصروف گل گشت لڑکی اپنے خیال کے گرداب میں کچھ ایسی گرفتار تھی کہ اس کو اس منظر میں کچھ دل کشی نہ محسوس ہوئی اور وہ پھر کھڑی ہو گئی اور واپسی کے خیال سے چمن کے دروازے کی طرف چلنے لگی۔ تھوڑی دور ہی چلنے پائی تھی کہ دروازے سے اُس کی ہم وضع اور ہم عمر لڑکی آتی ہوئی نظر آئی وہ اس کو دیکھ کر رُک گئی۔ لڑکی نے قریب پہونچ کر بلند آواز سے سلام علیکم کہہ کر اس کو مخاطب کیا۔ نجمہ!

"میں ناشتہ کا انتظار کئے بغیر کمرے سے چلی آئی۔ مجھے خیال تھا کہ تم میرے آنے سے ناامید ہو کر کہیں واپس نہ آجاؤ۔ تم تو اس قدر سویرے ہی ٹہلنے نکل آتی ہو لیکن آج تو خاص سردی ہے۔ مجھے تو کمرے سے نکلتے ہی سردی معلوم ہونے لگی۔" نجمہ نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ واللہ یہ صرف اس لئے کہ تم صبح کی چہل قدمی کی عادی نہیں ہو۔ صبح کی چہل قدمی صحت پر نہایت اچھا اثر ڈالتی ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں ایک عرصہ سے دماغی کمزوری اور اختلاج کی مریض تھی لیکن جب سے میں نے پابندی کے ساتھ صبح کا ٹہلنا شروع کیا ہے میری صحت بہت بحال ہو گئی ہے میں اب کافی دماغی محنت کرتی ہوں اور کوئی خاص تکان محسوس نہیں ہوتا۔ پہلے دو گھنٹے مسلسل میں کتاب نہ دیکھ سکتی تھی۔

صبح کا ٹہلنا دماغی کام کرنے والوں کے لئے نہایت ضروری ہے میں نے اکثر بڑے آدمیوں کے واقعات
گی میں پڑھا ہے کہ سب اس مفید اصول پر عامل رہے ہیں۔

گلیڈاسٹون وزیر اعظم انگلستان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب تک صبح کو چھ سات میل کا چکر نہ کر لیتا تھا۔ وہ
کام نہ کرتا تھا۔ اپنے انتہائی مصروفیت کے دنوں میں بھی اس کو ترک نہیں کیا۔

میں تمھیں ہمیشہ صبح کے ٹہلنے پر آمادہ کرتی ہوں مگر تمھاری کاہلی کا خدا بھلا کرے تم ایک دن بھی وقت پر چمن
ں نہ آسکیں۔ رابعہ نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ جواب دیا دیکھیں یہ آپ کی چہل قدمی اور چمن کی سیر کب تک جاری
کتی ہے۔ کالج کا زمانہ تعلیم بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس میں آپ پڑھ بھی لیجئے اور سیر و تفریح بھی کر لیجئے اس کے بعد
گی جن اصول کے ماتحت ہوگی وہ سب کو معلوم ہے۔

نجمہ نے اپنی سہیلی کے جواب کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا رابعہ میں تمھاری دوراندیشی کی داد نہیں دوں گی
اگر اپنی زندگی میں مفید اصول کے عادی ہو جائیں تو ہم حالات کی تبدیلی میں بھی ان کو قائم رکھ سکتے ہیں۔

رابعہ:۔ نہیں میں اس وقت فلسفیانہ بحث کے لئے قطعی تیار نہیں۔ اس کو چھوڑو۔ مثل مشہور ہے۔ نائی نائی
کتنے ہیں۔ جمان سب آگے آئے جاتے ہیں۔ میں صرف یہ کہوں گی کہ ہم کو ان ہی اصول کا عادی ہونا چاہئے
ن پر ہم بغیر کسی دقت کے عامل رہ سکیں۔

میری روشن خیال بہن! میں تمھاری بلند خیالی سے ہمیشہ گھبراتی ہوں اس لئے کہ تم اپنے دماغ میں جو خیال
م کر لیتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ ناقص ہوتا ہے لیکن تم یہ نہیں سوچتیں کہ وہ ہماری موجودہ زندگی طرز معاشرت
مطابق بھی ہے یا نہیں۔ صبح کی چہل قدمی میں تسلیم کرتی ہوں کہ تندرستی کے لئے اکسیر ہے اور دماغی نشو و نما میں
ون ہے لیکن ذرا اپنے گھرانوں کی عورتوں کی زندگی پر نظر تو ڈالو کتنی ایسی ہیں کہ اس پر عمل کر سکتی ہیں۔ گھر کے کاروبا
ہر کی خدمت شعاری۔ بچوں کی دیکھ بھال۔ صبح ہی سے ناشتہ کی فکر اور گھر کے دھندے جو سورج کے طلوع
نے سے پہلے ہی عورتوں کو گھیر لیتے ہیں کب اس کی اجازت دیں گے کہ بیوی صاحبہ علی الصباح اپنی تندرستی
تفریح کی خاطر چمن کی روشوں کو پامال کرتی پھریں۔ میں کبھی ایسی باتوں کی قائل نہیں جو صرف خیالی فائدہ پیش
ی ہوں۔ دنیائے عمل خیالی دنیا سے بالکل جدا ہے تم اس کا اندازہ اس وقت نہ کر سکو لیکن ان سے پوچھو جن پر

گزرتی ہے۔

نجمہ:۔ رابعہ کی دلیل اور واقعات کی قوت سے متاثر ہوگئی اور گفتگو کا پہلو بدل کر کہنے لگی لیکن میری دنیا شناس بہن یہ کیا ضرور ہے کہ ہمارے مستقبل ہماری اور دوسری بہنوں کی طرح تاریک ہوں۔ تم شاید ہوا کے رخ کو بدلا ہوا نہیں دیکھ رہیں تم کو یقین ہے کہ ہماری معاشرت اسی طرح پر فرسودہ طریقوں پر قایم رہےگی اور اس میں اصلاح نہ ہو سکےگی۔

عورت ہمیشہ خادمہ کا کام کرےگی۔ اس کے فرائض ہمیشہ وہی رہیں گے جو مہذب قوموں میں ایک نرس یا ایک میڈ کے ہوتے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ جب ہمارے خیال میں اتنی تبدیلی ہوگئی ہے کہ ہم تعلیم نسواں کو جائز اور ضروری سمجھنے لگے ہیں تو توقع ہوتی ہے کہ ہم اور مفید تبدیلیوں کے لئے طیار ہو جائیں گے۔

رابعہ:۔ انھیں صاف الفاظ میں کہو کہ تم یورپ اور مغربی دنیا کی آزادیِ طلب عورتوں کے اصول کی حامی ہو۔ جو نظامی زندگی کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جو مشرقی ممالک میں کبھی قابلِ عمل نہیں ہو سکتے۔

نجمہ۔ رابعہ! تم میرا مطلب نہیں سمجھتیں۔ میں ان اصول کی کیسے حامی ہو سکتی ہوں۔ اور ایک وہ لڑکی جس نے مشرق کی فضا میں پرورش پائی ہے جس کی رگوں میں شرافت کا خون گردش کر رہا ہے۔ ان اصول کی کبھی حامی نہیں ہو سکتی۔ لیکن میرا منشا صرف یہ ہے کہ ہم کیوں نہ صرف پھول توڑلیں اور کانٹے چھوڑدیں۔

رابعہ۔ بہن یہ صرف شاعرانہ خیال ہے۔ فطرت انسانی نے اس پر کبھی عمل نہیں کیا۔ جب دو قوموں میں باہم ارتباط ہوتا ہے اور ایک قوم دوسرے کی تقلید کرتی ہے تو وہ پھول چننا اور کانٹے الگ کردینے پر کبھی اکتفا نہیں کر سکتی۔ پھول چننے میں کانٹے پھولوں کے ساتھ لگے چلے آتے ہیں اور گل چیں کو جب احساس ہوتا ہے جب اس کا ہاتھ خون آلودہ اور اس کا دامن گل کانٹوں کی خلش سے چاک ہوتا ہے۔ دور کیوں جاؤ۔ تمھاری ترکی بہنوں کی مثال سامنے ہے کیا تم کہہ سکتی ہو کہ ترکوں نے یورپ کی تہذیب سے صرف اچھی باتیں اختیار کیں اور بری باتیں چھوڑ دیں واقعات چھپے ہوئے نہیں۔ معلوم کرلو۔ آج ایک نوجوان ترکی عورت ایک پیرس کی رقاصہ سے کسی بات میں کم نہیں۔ وہی وضع قطع وہی لباس کا تراش خراش وہی ہیٹ۔ وہی بے پردگی و بے شرمی۔ وہی فراموشی غرض جدید تہذیب و تمدن کے تمام برکات آج ترکی میں پائے جاتے ہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ عورت کی حیثیت بلحا

مارے ایک خانمہ یا نرس کی نہیں رہی لیکن اگر اُس کی شان ایک ایکٹرس کی طرح ہوتی تو میں کہوں گی کہ یہ
تی معکوس ہے۔

مشرقی زندگی کی چند خصوصیات ہیں جن کی لطافت مغربی عورتیں کبھی پورے طور پر محسوس نہیں کر سکتیں
ہماری زندگی سے رہیں تو یہ تمام شیرازہ پریشان ہو جائے گا۔ اور ہم سے بھی سکون و اطمینان اسی طرح رخصت
جائے گا جس طرح آج یورپ کی عورت ردس سے محروم ہے۔

نجمہ:- بہن بحث کو طول کیوں دے رہی ہو مشرقی اور مغربی زندگی کے اختلاف مذاق سے بحث نہیں میں
رف یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر ہماری معاشرت میں خامیاں اور خرابیاں ہیں اور ہم ان کو محسوس بھی کر رہے ہیں تو
کو رفع کرنے کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔

رابعہ:- لیکن بہن بحث تو اسی نقطہ پر پیدا ہوتی ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ آج ہم کیوں اُن خرابیوں کو محسوس
نے لگے اور ہماری نانیوں اور دادیوں نے اُن کے خلاف کیوں نہ احتجاج کیا اگر وہ تکلیف د مضرت کا باعث تھیں
ہ پہلے کیوں نہ محسوس ہوئیں جدید تعلیم کی عینک سے وہ خرابیاں کیوں نظر آتی ہیں اور وہ عینک اتار دی جائے
بر وہ بات نہیں باقی رہتی۔ یہیں پر یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھائی اور برائی کا معیار دنیا میں کیا ہے؟ یہ بات ایسی ہے
کا فیصلہ کبھی نہیں ہوا۔ تم ایک رسم کو اچھا کہتی ہو دوسری قوم اُسی رسم کو برا کہتی ہے۔ ایک فعل تمہاری نگاہ میں
ب ہے دوسری قوم اُس کو موزوں خیال کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اپنے نقطۂ نظر سے تم جن باتوں کو خرابیاں
ہی ہو وہی بعض لوگوں کی نگاہ میں اچھائیاں ہوں اور جو تمہاری نظر میں اچھائیاں ہیں وہ ایک طبقہ کے
ل میں نہایت بری باتیں ہوں۔

تم پردہ کی رسم کو لو۔ مسلمان اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمان اس رسم کے زبردست حامی ہیں اور
برائیوں کی روک تھام اس میں مضمر پاتے ہیں لیکن دوسری قومیں اس رسم کو ذلت اور حقارت سے دیکھتی ہیں
کے خیال میں یہ جہالت کا اقتضا ہے اور عورت کے متعلق مرد کی بے اعتمادی کا اظہار ہے۔

نجمہ:- بہن خیر د۔ میں تمہاری تقریر کا ماحصل سمجھ گئی۔ دنیا میں ایک اصول پر قومیں متحد نہیں ہوتیں۔ لوگوں کے
مختلف ہیں۔ نقطۂ خیال جدا جدا ہیں۔ یہ ہی تمہارا مطلب ہے۔

رابعہ:- بالکل یہ ہی۔

نجمہ:- اس سے تم یہ نتیجہ نکالتی ہو کہ اصلاح معاشرت کا خیال ہی فضول ہے اس لئے کہ نقائص ا
برائیوں کا تعین جب نہیں ہو سکتا تو ان کی اصلاح کیسے ہو۔ اگر یہ ہی ہے تو استدلال کی غلطی ہے۔
قوموں کا مذاق اور نقطۂ خیال مخصوص حالات کے اعتبار سے جن میں وہ زندگی بسر کرتی ہیں مختلف
ہوتا ہے اور جزوی باتوں میں وہ اختلاف کرتی ہیں لیکن اصول زندگی پر پھر متحد ہوتی ہیں۔
اصول اخلاق کو لیجئے۔ کون مہذب قوم ان سے منکر ہو سکتی ہے۔ صداقت۔ دیانت۔ تمیز وانسانیہ
خوش خلقی۔ تواضع تحمل و برداشت یہ تمام باتیں ہر قوم میں اخلاق کی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔
ترقی کا جذبہ اور اپنی حالت کو بہتر کرنے کی خواہش ہر زندہ قوم میں مشترک ہوتی ہے۔ اکتساب
حصول علم کا خیال ہر قوم میں مشترک ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنی اقتصادی اور صنعتی ترقی چاہتی ہے۔ اس سے
معلوم ہوا کہ اقوام کی ترقی اور زندگی کی روح ایک ہی ہوتی ہے اور اُس کے طریقہ حصول میں جو اختلاف ہوتا ہے
جزوی ہے۔ اور جزویات کو اصول پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ تنزل پذیر قومیں تو جزویات اور
لا یعنی باتوں کی فکر میں رہتی ہیں اور ترقی پسند قومیں اصول کو پیش نظر رکھ کر اُن کے حصول میں کوشاں نظر آتی ہیں
ہندوستان کی جدید ترقی اور اُس کے حالات پر نظر ڈالو یہ ہی اصول اور جزویات کی کشاکش یہاں
بھی پاؤگی۔

سرسید بانی علیگڑھ کالج نے جب اس تحریک کی ابتدا کی تو اصلاح کا ایک مستحکم اصول، ترقی تعلیم
ان کے پیش نظر تھا۔
انھوں نے سمجھ لیا کہ تعلیم کے بغیر قوم کا ادبار دور نہیں ہوگا۔ اس کی ترویج میں انھوں نے کوششیں
کیں اور باوجود ایک شدید مخالفت کے طوفان کے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے ہوا کے
رخ کو مخالف سمت میں دیکھا اور ضروریات زمانہ کو محسوس کیا اور ان کے مطابق مسلمانوں کو تیار کرنے کی
سعی کی اور وہ سعی مشکور ہوتی آج سرسید کے کالج کی بدولت ہزارہا مسلمانوں کے خاندان کشادگی اور عزت کے
ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہزارہا تعلیم یافتہ مسلمانوں کے گروہ نظر آتے ہیں جو اگر یہ تحریک نہ ہوتی

خدا معلوم کس حالت میں ہوتے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ موجودہ تعلیم میں نقائص نہیں۔ یہ کبھی کسی چیز کی بابت جس کا تعلق انسانی تخیل سے ہی نہیں کہا جا سکتا۔ نقائص سے پاک تو خدائی کام ہوتے ہیں۔ لیکن یہ طرز تعلیم محض اس لئے قابل تسلیم ہے کہ ہماری ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اور زندگی کے موجودہ حالات میں مفید ہے۔ اور تمہارے مقاصد میں معاون ہے اس روشنی میں تعلیم نسواں اور اصلاح زندگی کے مسائل کو لو۔ مردوں کی تعلیم کی طرح عورتوں کی تعلیم بھی لازمی ہے اور ان کی زندگی میں اصلاح کے ساتھ عورتوں کے طریقۂ زندگی میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ فطرت کا اقتضا ہے اور ترقی کی روح کا مظاہرہ کہ عورت مرد کے پہلو بہ پہلو ہنگامۂ حیات میں چلنا چاہتی ہے۔ مرد جس زمانہ میں وحشی تھا عورت بھی ویسی جنگلی اور وحشی رہی۔ جس قدر مرد متمدن ہوتا گیا اسی قدر عورت بھی تمدن کو اختیار کرتی گئی۔ مرد نے تہذیب و تعلیم کی طرف جتنا رجحان کیا عورت کا رجحان بھی اتنا ہی اس طرف غالب ہوا۔ مذہب کو جس طرح مرد نے تسلیم کیا، عورت نے بھی اس کی پیروی کی۔ سیاست اور قوانین کی متابعت جس طرح مرد نے ضروری رکھی عورت بھی ان قوانین کی پابند سمجھی گئی۔

سوسائٹی کا ارتقا ان ہی اصول کے ماتحت ہوا۔ ان سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اب آئندہ بھی جتنی پرواز مرد کی ہوگی اسی مناسبت کے ساتھ عورت بھی پرواز کرنا چاہے گی۔ اس نظریہ کے لحاظ سے تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ کیوں عورت کی تعلیم و ترقی کے خیال سے لرزنے لگتے ہیں۔ کیوں اُن میں یہ بزدلی پیدا ہو گئی ہے کہ عورت کی زندگی میں وہ ذرہ بھر تبدیلی نہیں چاہتے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی ہر کوشش کے لئے تیار ہیں۔ ناانصافی اور ہٹ دھرمی کی اس سے زیادہ عجیب مثال کیا ہو گی کہ مرد کو تعلیم و تربیت دے کر مہذب زندگی کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور عورت کو جہالت اور ادبار کے تاریک گوشوں میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ بہن خیال کرو کہ ایک گاڑی کا ایک پہیہ تو نہایت صاف صیقل بر شائر دیا ہوا ہے اور دوسرا پہیہ زنگ خوردہ لوہے اور ناقص لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ کیا تم کہہ سکتی ہو کہ وہ گاڑی پختہ و خام سڑکوں پر چل سکیگی۔ یہ مثال بجنسہ مرد و عورت کے اختلاف زندگی کی ہے۔ جہالت کبھی کسی قوم کی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ پرانے فرسودہ اصول کبھی کسی قوم کو ترقی کی سطح پر نہیں پہونچا سکتے۔ ہندوستان میں اگر عورتیں اسی طرح جاہل رکھی گئیں اور ان کی تربیت کی طرف توجہ نہ کی گئی تو یہ ملک ایک قدم بھی زندہ قوموں کے ساتھ منزل حیات میں نہ چل سکے گا۔ زندگی میں ترقی کرنے کے لئے مرد

اور عورت کی مشترکہ اور متحدہ کوششوں کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب دونوں کو اس کا اہل بنایا جائے ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں سب اس ضرورت کو محسوس کر رہی ہیں اور اس کے حصول میں کوشاں ہیں۔

اس سال ہندوستان کی قومی پارلیمنٹ کی لیڈر اور صدر ایک عورت ہے اور ملک نے تسلیم کیا کہ اس نے اس خوبی سے فرائض صدارت انجام دیئے کہ قابل سے قابل مرد سے بھی اس سے بہتر توقع نہیں ہو سکتی۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عورت کے دماغ میں بھی وہ تمام صلاحیت اور اہلیت موجود ہے جس کی دنیا کے بڑے کاموں میں ضرورت حقیقت یہ ہے کہ آج ہندوستان کے ہر گھر سے سروجنی پیدا ہو سکتی ہے اگر اس احمقانہ قدامت پرستی اور فرسودگی خیال کو دور کر کے اُن کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ بعض خصوصیات عورت کی فطرت میں قدرت نے ایسے ودیعت کیے ہیں جن سے اگر وہ کام لے تو دنیا میں ایک خوش کن انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ حب الوطنی۔ ایثار، صبر، برداشت استقلال و سرگرمی یہ عورت کے کریکٹر کا جوہر ہونے چاہئیں۔ ان سے کتنے مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ کیوں نہ آخر ہمارے مقاصد زندگی بھی بلند ہوں۔ ہم اپنے سامنے کیوں روشن نصب العین نہ رکھیں اور اس کے لئے جدوجہد کیوں نہ کریں۔ میں ہرگز یہ نہیں کہہ رہی کہ تمام ایشیائی زندگی کی خصوصیات کو چھوڑ دو مذہب کا احترام۔ کریکٹر کی مضبوطی۔ وفا شعاری شوہر پرستی یہ سب عورت میں اسی طرح رہیں۔ محبت کا مادہ عورت کے دل میں وافر طور پر موجود ہے۔ وہ کیوں نہ جائز طور پر وسیع ہو کر مذہب و ملک و قوم کی محبت کو احاطہ کرے۔

رابعہ:۔ نجمہ کے جوشِ تقریر سے مغلوب ہو کر۔ نہیں میں تمہاری فصاحت و بلاغت اور دلائل کے سامنے پست ہو جاتی ہوں اور اپنے خیال کو حقیر سمجھنے لگتی ہوں۔ میں مانتی ہوں کہ تمہارا مقصد بقول اقبال

"مقصدے از آسماں بالاترے"

ضرور ہے۔ روشن خیالی کا یہی تقاضا ہے اور تمہاری تعلیم و تربیت کا بھی یہی منشا ہے کہ تم ایسے پاکیزہ خیالات اپنے دماغ میں رکھو اور عمدہ مقاصد زندگی پیش نظر رکھو۔ مگر نہیں ٹھنڈے دل سے خیال کرو اور سوچو کہ ہم کو کیا کرنا ہے اور ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

مسلمانوں کے تخیل کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جذبات سے جلد مغلوب ہوجاتی ہے اور ان جذبات میں سرگرم عمل ہوکر نہایت بلند اور خوشنما مقاصد سامنے رکھ لیتی ہے لیکن مقاصد کو سامنے رکھنا ایک شے ہے اور ان کا حصول کلی دوسری شے ہے۔ عورت کی ترقی کا کتنا دل آویز نصب العین ہے کہ وہ سروجنی بن جائے۔ اور بقول تمہارے ہندوستان کی ہر عورت سروجنی بن سکتی ہے لیکن خیال تو کرو کہ کیا ہر عورت کو سروجنی بن جانے کے مواقع حاصل ہیں ۳۳ کروڑ نفوس کی آبادی میں تم نسائی ترقی کا ایک آئیڈیل سروجنی کی ذات میں پیش کررہی ہو اور ملک کی ہزاروں ستم رسیدہ ہاجرہ اور نسیمہ چمپا اور سیتاؤں کو نظر انداز کررہی ہو۔ جو نا معلوم پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزر کررہی ہیں جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ جن کے پاس تن پوشی کو بھی کپڑا نہیں۔ جن کے بچے سردی میں ٹھٹھرتے ہیں اور گرمی کی تپش میں جلتے ہیں جو اگر بیمار ہوتی ہیں تو اتنی بھی استطاعت نہیں کہ کسی حکیم یا ڈاکٹر کو بلاکر دکھا دیں اور دوا استعمال کریں۔ ان غریب اور بے کس عورتوں کے سامنے سروجنی کی مثال پیش کرو اور ملک و ملت کی خدمت کے نصب العین پیش کرو تو یہ محض جنون کی ولولہ انگیزی سے زیادہ نہیں۔

ہندوستان کی ہر عورت سروجنی بن جانے کی اہل ہو لیکن وہ نہ سروجنی بن سکے گی اور نہ بن جانا چاہے گی اصلاح کا اگر جذبہ دل میں درد پیدا کرتا ہے تو پہلے ان عورتوں کی خبر لی جائے اور اُن کے افلاس اور پستی کو دور کرنے کے سامان کئے جائیں۔ جس وقت ملک اقتصادی حالت سے مساوی درجہ اختیار کرے اس وقت اعلیٰ نصب العین کی اشاعت کرو۔ جب آپ اصلاح کا بیڑا اٹھائیں گی تو ہزارہا جزوی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اس کی وسیع خیالی کو محدود ہونا پڑے گا عملی مشکلات اور مجبوریاں درپیش ہوں گی آپ کو ان لوگوں کی اصلاح اور درستی کی کوشش کرنا ہوگی جو محدود حلقہ میں زندگی بسر کررہی ہیں جن کے خیالات محدود ہیں۔ اور اسی محدود حلقہ میں اُن کی مسرت اور اطمینان کے ذرائع پیدا کرنے ہوں گے۔ یہ خیال اگر ہو تو یقیناً اصلاح کا سچا خیال ہے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا تم ہی کو اس کام کے لئے منتخب کرے اور تم ہی ان پست بہنوں کی آسائش کے لئے ذریعے پیدا کرسکو تمہاری پرجوش طبیعت اور تمہارا دردبھرا دل اور قابلیت یہ سب ظاہر کرتی ہیں کہ تم اس کی اہل ہو۔

نجمہ نے اپنی سہیلی کی اس توصیف سے کسی قدر جھینپ کر، بہن میری تقریر کا مقصد یہ نہیں کہ تم میری ذات کو اس بحث میں شامل کردو۔ ہم تو اصول کی بحث کر رہے تھے اور مجھے مسرت ہے کہ میں اس بحث میں کامیاب ہوئی تم بھی اصلاح کی ضرورت کو محسوس کرنے لگیں لیکن تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ بھی صحیح ہے۔ ہمارے ملک کا افلاس اور غربت بھی بڑے درجہ تک ہماری پستی کا باعث ہے۔ لیکن اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جس کو تم سبب کہہ رہی ہو وہ نتیجہ ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا نصف حصہ بے کار ہے عورت دولت پیدا کرنے میں مرد کی قطعی معاونت نہیں کر رہی ہے اور مرد خود نہیں چاہتے کہ وہ ان کی معاون رہے۔ اقتصادیات کا موٹا سا مسئلہ یہ ہے کہ خرچ کی مناسبت سے دولت کی پیدائش ہوتی ہے ہمارے ملک میں دولت کی پیدائش محدود ہے اور خرچ وسیع۔ ایک مرد کے ساتھ آٹھ دس لواحقین ہیں۔ وہ ایک فرد دولت حاصل کرتا ہے اور آٹھ دس نفر اس کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ اگر حصول معاش میں عورت مرد کا ساتھ نہ دے گی تو خاندان کا افلاس دور نہ ہو سکے گا۔ ملک کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی نے بھی اسی امر کو پیش نظر رکھ کر چرخہ کے رواج پر انتہائی زور دیا ہے مقصد یہ ہے کہ عورت بھی بے کاری سے نکل کر آمدنی کے جائز ذرائع پیدا کرے عورتیں اگر جاہل اور بے کار نہ رکھی جائیں تو معاش کے حصول میں مدد دے کے دوش بدوش کام کر سکتی ہیں۔ عورت کی پستی اور تنگ دستی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہی ہے کہ وہ مرد کی محتاج ہے۔ اور اقتصادی حیثیت سے اس کی دست نگر۔

نجمہ کی یہ تقریر سن کر رابعہ نے اس سے مخالفت کی جرأت نہ کی اس لئے کہ وہ خود ہی اس ضرورت کو محسوس کر رہی تھی۔ اُسے اپنے محلہ کی ایک شریف عورت کا خیال آیا جس کا شوہر کئی بچے چھوڑ کر مر گیا تھا اور وہ غریب انتہائی افلاس اور مصیبت میں زندگی بسر کر رہی تھی اگر وہ حصول معاش میں مرد کی دست نگر نہ ہوتی تو آج اُس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

نجمہ نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا تو رابعہ ہماری بحث اب اچھے پہلو پر آگئی خیال کی غلطی کو دور کرو اصلاح کی ضرورت سے انکار نہ کرو بلکہ طریقۂ اصلاح کی معقولیت پر غور کرو۔ ہم یورپ کی کورانہ تقلید ہرگز نہیں چاہتے ہم اپنی مشرقی خصوصیات کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اکبر کا شعر مجھے یاد آتا ہے لیکن اس سے کسی قدر اختلاف ضرور ہے۔

زاہدہ جھکی نہ تھی تسلیم سے بیگانہ تھی
اب ہی شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

میرے خیال میں تعلیم کے بعد عورت چراغ خانہ ضرور رہے گی بلکہ اس کی روشنی اور معین ہوکر گھر کے تمام
اریک گوشوں کو منور کر دے گی شمع انجمن وہ ہو یا نہ ہو۔ اور ہاں اگر شمع انجمن کو رکیک معنی نہ پہنائے جائیں تو
عورت کے لئے شمع انجمن ہونا بھی معیوب نہ ہونا چاہیئے۔ سروجنی کی شخصیت میں دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔
وہ شمع انجمن بھی ہے اور چراغ خانہ بھی ہے۔

خیر بہن یہ تو شاعرانہ لطیفہ تھا اور یہ تمام بحث، مباحثہ حسنِ تخیل سے زیادہ نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہی کہ ہر احساس
مرد کو ہندوستان کی بدنصیب جاہل اور حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرنے والی عورتوں کی حالت زار سامنے رکھنا
نہایت ضروری ہی۔ اور ان کی بہتری اور بحالی کی تدبیر سوچنا ہم سب پر فرض ہی۔
خدا کا شکر ہے کہ قوم اب ان ضرورتوں سے غافل نہیں رہی۔ میری بہت سی لائق اور درد مند بہنیں جن کی
گروہ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال ہیں، عورتوں کی اصلاح اور ترقی میں کوشاں ہیں۔ دہلی میں حال ہی میں
ایک انجمن کی بنیاد پڑی ہے جس کا مقصد عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور نگہداشت ہے عطیہ بیگم اس کی
روح رواں ہیں۔

رابعہ:۔ ہاں بہن عطیہ کے ساتھ ایک قومی مجمع میں جو افسوس ناک برتاؤ ہوا اُس سے تم کیا اثر
لیا ہو۔

نجمہ:۔ بہن وہ اُسی مصیبت چند قدامت پسندی اور فرسودگی خیال کا مظاہرہ تھا۔ کام کرنے والے ایسی
باتوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اور جو ہوتے ہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ناکامیابی ہر مرحلہ میں پیش آتی ہی لیکن اگر ہمت
مستقل ہے تو کامیابی کی روشنی دور سے نظر آ رہی ہی۔
رابعہ:۔ لیکن بہن تم مانو یا نہ مانو میرا خیال یہ ہی کہ جب تک مردوں کے تعلیم یافتہ گروہ اصلاح کی کوششوں
میں ہمارے معاون نہ ہوں گے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔
نجمہ:۔ بہن یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ ہم کبھی یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ ہم مردوں سے بے نیاز ہو کر کچھ

کر سکتے ہیں۔ شرقی نسائیت کا ہمیشہ جوہر امتیاز یہ رہا ہے کہ وہ مرد کی پرستار اور وفا شعار رہی ہے عورت نے مرد کے لئے جانی قربانیاں کی ہیں۔ اپنی وفاشعاری اور پاس رفاقت کو اتنا نباہا کہ مرد کے مرنے کے بعد اُس نے اپنی زندگی کو لاحاصل سمجھ کے نذر آتش کر دیا۔ مشرقی تاریخ میں ایسے مظاہرے ہزارہا ملیں گے ان میں جہالت شامل تھی لیکن عورت کے جذبات محبت اور وفاپرستی کا کتنا شاندار اظہار تھا ہم اب بھی طبقہ نسواں میں وہی امتیاز قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ عورت مراحل حیات میں مرد کی رفیق اور معاون ہے۔ یہ ہی اُس کا مقصدِ زندگی ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُسے پورے طور پر تیار کرنا تعلیم و تربیت کا صحیح مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک مرد ہمارا ساتھ نہ دیں۔ ان کو سمجھ لینا چاہئے کہ عورت کی ترقی و فلاح دراصل خود ان کی ترقی و فلاح ہے اور عورت کی پستی تمام ملک و ملت کی پستی ہے۔

نجمہ اپنی گفتگو کو ختم کر چکی اور پر اثر طریقہ پر بھرائی ہوئی آواز میں یہ کہتی ہوئی بورڈنگ کو رابعہ کے ساتھ روانہ ہوئی۔ بہن رابعہ دیکھو ہماری زندگی میں یہ مقاصد کہاں تک پورے ہوتے ہیں مگر ہر عورت اور اسی طرح ہر مرد کا فرض ہے کہ ان مقاصد کے حصول میں سعی کرے۔

نجمہ اور رابعہ کالج کی ممتاز اور قابل ترین طالبات میں شمار ہوتی ہیں۔ دونوں نہایت وسیع النظر ہیں۔ لیکن رابعہ میں نجمہ کے مقابلہ میں کسی قدر قدامت پسندی ضرور ہے لیکن نہ اتنی کہ ترقی میں مانع ہو۔

ناقل

غزل

نتیجۂ فکر جناب مفتی ساجد حسین صاحب شوقؔ

جب کبھی اندازۂ دنیا کیا — غم بقدر آرزو پیدا کیا
یہ تنگ ظرفی نے میری کیا کیا — جو نیاز عشق کو رسوا کیا
کم نگاہی مانعِ حیرت ہوئی — جلوۂ خود بیں کو میں دیکھا کیا
اعتبارِ مدعا کے واسطے — ہم نے دل نذرِ غم فردا کیا
قطرہ کی ہستی نظاہر کچھ نہ تھی — اس کی ہمت نے اُسے دریا کیا

شوقؔ اس کی سادگی تو دیکھئے
اعتبارِ شکوہ بے جا کیا

بیوہ اور ہلالِ عید

از

(مسٹر مکرم احمد علوی ممتاز)

پھر وہ اعلان اضطراب ہوا — پھر تخیل میں انقلاب ہوا

پھر وہی آہ پھر وہی فریاد — پھر تلاطم میں ہے کسی کی یاد

پھر گھرا ہے ہجوم یاس میں دل — آہ کیسے کٹے گی یہ منزل

اس بلا کی خلش ہے سینے میں — آج پھر شک ہے میرے جینے میں

پاش پاش آج پھر کلیجہ ہے — اُف محبت کا یہ نتیجہ ہے

کاٹے کھاتی ہے رات پھر مجھ کو — اُف ہے دو بھر حیات پھر مجھ کو

رات بھر بیٹھی آہ کرتی ہوں — زندگی یوں تباہ کرتی ہوں

کیا کہوں کس کی یاد آتی ہے — اور گھنٹوں مجھے رُلاتی ہے

غم سے پیمانۂ فضا لبریز — میری خوشکیفیوں سے اس کو گریز

دل کے حجرے پڑے ہیں کیوں ویراں — گم ہیں کس کی تلاش میں ارماں

اُف جوانی کی ناشکیبائی — اس پہ اشکوں کی یہ پذیرائی

اُف شب غم ہے اور اک دلگیر — پھرتی آنکھوں میں ہے کوئی تصویر

یہ مجھے کس لئے تحیر ہے — کس کا ہر دم مجھے تصور ہے؟

آج کیوں اشک بار ہیں ارماں؟ — آج کیوں بیقرار ہیں ارماں؟

آج کیوں خامشی کا عالم ہے؟ آج کیوں حسرتوں کا ماتم ہے؟
آج کیوں ارتعاش ہے ہر دم؟ آج کیوں ہے یہ گریۂ پیہم؟

آ تصور گلے لگا لوں تجھے وہ نہیں تو تجھی سے مل لوں گلے
میری جلوت کا ایک باغ ہے تو سونی خلوت کا شب چراغ ہے تو
دے نہ جنبش مرے تخیل کو آہ موقع نہ دے تامل کو
عید کا چاند تو نکل آیا ہاں مگر چاند ہے کہاں میرا
عید کا دن ہے کل مسرت ہے اپنے یاروں سے سب ملیں گے گلے
لیکن ان سے ذرا کوئی پوچھے ایک بیوہ گلے ملے کس سے
آہ محروم ہوں تو اک میں بس مجھ سا مظلوم کون ہے بےکس
آئی جس کی بہار میں ہو خزاں کیا کرے بدنصیب وہ گریاں
نصف شب - پھر سکوت طاری ہے اُف - کہ آنکھوں سے خون جاری ہے
ہے یہ شب کا سکوت یا اک ملفہ مستتر جس میں ہے کسی کا راز
لاج ہے تیرے ہاتھ ضبط حیات منتشر ہو رہے ہیں پھر جذبات
آہ یہ ضبط کوشیاں میری اُف - یہ پیہم خموشیاں میری
آہ ناکام آرزوہوں میں آہ بدنام آرزوہوں میں
حریت کیسی؟ ہے یہ مجبوسی نوجوانی اور اُس پہ مایوسی

جس کا ہر لفظ لفظ عبرت بیز
ہے فسانہ مرا وہ درد انگیز

مطبوعاتِ جدیدہ

جلال الدین خوارزم شاہ اردو زبان کے محسن اور ہماری یونیورسٹی کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر بی اے ان ندو
ل لوگوں میں سے ہیں جو اپنے چند در چند مشاغل اور کثرت کار کے باوجود ادب اردو کی خدمت سے جیتے جی دست بردار نہیں ہو سکتے
ن کا ذوق ادب ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا میدان عمل تلاش کر لیتا ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ اردو زبان میں ادب لطیف کا رنگ انھیں کا جمکایا ہوا ہے
س وقت ملک میں جتنے نمونے ادب لطیف کے موجود ہیں ممکن ہے ان کے متعلق اختلاف آرا ہو سکے لیکن سید صاحب کی تصانیف کے
تعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کے طرز انشا کے جتنے پاکیزہ نمونے اب تک ملک میں پیش کئے گئے ہیں سب میں ان کے
سن خیال اور ندرتِ احساس کی جھلک ہے اُن کا ذوقِ صحیح انھیں کبھی عام راستہ پر نہیں چلنے دیتا۔ وہ ہر مرتبہ ایک نرالی شان سے
لوہ آرا ہوتے ہیں ترکی ترجموں میں انھیں جو مہارت ہے اس کی بنا پر مشہور ہے کہ "نیالستان" کے "خارستان و گلستان" ترکی
بان میں اس قدر شگفتہ و دلکش نہیں ہیں جتنے دلچسپ انھوں نے ترجمہ کر کے ہمارے لئے بنا دیئے ہیں۔

میگزین کے انھیں صفحات پر یہ ڈرامہ بالاقساط تین سال تک نکل چکا ہے اُس کا مصنف ترکی زبان کے ان مصنفین
س ہے جن کی شہرت کو بقائے دوام حاصل ہے اور یہ وہ ڈرامہ ہے جسے ترکی ادب میں کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے سید صاحب اس سے
پہلے اردو داں پبلک کو "خالدہ خانم" "ندیم استنبولی" اور دیگر ترکی مصنفین سے ایک سے زیادہ مرتبہ روشناس کرا چکے ہیں اس مجث
س آپ نے نامق کمال بے کو ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح پیش کیا ہے کہ بے اختیار اس کی عظمت و برگزیدگی کا اعتراف
ا ہوتا ہے جلال الدین خوارزم شاہ اسی کا ترجمہ ہے اور ہمارے خیال میں سید صاحب کا بہترین کارنامہ ہے۔

ڈرامہ کا پلاٹ اس وقت سے متعلق ہے جب چنگیز خاں نے اپنے تشدد و مظالم سے عالم اسلام کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا
ال الدین ایسے وقت میں دنیائے اسلام کی محافظت میں اٹھتا ہے اور وہ خدمات کرتا ہے جس کی بجا طور پر ایک غیور و باعصمت پادشا
، توقع کی جا سکتی ہے اس کا کریکٹر اردو ڈرامہ نویسی کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہوگا۔ تمام کتاب عالی خدمات سے لبریز ہے
ہ حوصلگی کے سلسلہ میں ہم رسالہ اردو کی اس رائے سے بالکل متفق ہیں کہ کسی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے
تاب ڈاکٹر اقبال کی نظموں کا جواب ہے انداز بیان شروع سے آخر تک پر لطف و دلکش ہے اور کسی جگہ سے کتاب ترجمہ

نہیں معلوم ہوتی۔

رسالہ اردو میں اس پر کافی ریویو ہو چکا ہے جس کے بعد ہم کو اس کے متعلق زیادہ عرض کرنا عبث معلوم ہوتا ہے

کتابت اور طباعت میں ہم مسلم یونیورسٹی پریس کا نام پیش کرتے ہیں جو اپنی خوبی کے لئے کافی مشہور ہو چکا ہے

ضخامت ۹۷ صفحہ ہیں اور مسلم یونیورسٹی پریس مسلم یونیورسٹی بک ڈپو یا جناب مترجم صاحب سے بقیمت عہ مل سکتی ہے۔

حلقۂ مسموم اردو ادب کی گزشتہ دس سال کی رفتار سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تاثرات بالآخر ہندوستان کی قدامت پسندی پر غالب آتے جاتے ہیں ایک حد تک تو یہ ایک فطری تقاضا ہے کیوں کہ حکومت حمایت کے علاوہ مغربی تمدن اور مغربی خیالات کی عالمگیر مقبولیت اب قدیم سے قدیم خیالات کو پامال کر رہی ہے۔ علاوہ بریں اردو کا مذاق جو زیادہ تر متقفہ اور مسجع عبارت۔ صنائع لفظی و معنوی پر منحصر تھا اس قدر بے سود اور زود ورازکار ثابت ہوا کہ اگر بیرونی اثرات نہ بھی ہوئے تو بھی یہ کچھ عرصہ میں معدوم ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریر ہو یا تقریر نظم ہو یا نثر جس قدر سیدھی اور سلیس بات کا اثر ہوتا ہے مشکل یا پر تکلف فقروں میں نہیں ہوتا۔ آج کل انگریزی تصنیفات کے ترجموں کی غیر معمولی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ علوم یعنی منطق فلسفہ اور اقتصادیات وغیرہ کے ترجمے اگرچہ فی نفسہٖ نہایت قابل قدر ہیں اور ان سے اُن کے مصنفین کی عالی ہمتی اور ضرورت شناسی ظاہر ہوتی ہے تاہم اگر بجائے تراجم کے ان ہی مضامین میں ہمارے اہلِ علم خود کتابیں تصنیف کریں تو ان کے اور اردو کے لئے زیادہ باعث فخر ہوتا۔

برخلاف اس کے خالص ادبی تصانیف کے ترجمے اس حیثیت سے مفید بلکہ ضروری ہیں کہ وہ مغربی خیالات اور محسوسات کو بجنسہٖ نقل کرتے ہیں اور عوام میں ایک صحیح ذوق پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح ہم کو ایک اعلیٰ تر تمدن کے متعلق نہ صرف آگاہی ہوتی ہے بلکہ ان قومی عادات و خصائل کا احساس ہوتا ہے جن سے وہ قومیں معراج کمال تک پہنچیں ان ہی وجوہ سے ترجمے زیادہ عام پسند ہوتے جاتے ہیں مگر ساتھ ہی اس امر کا لحاظ رہنا چاہیے کہ صرف بہترین اور مسلم الثبوت مصنفین کے افسانے ترجمہ ہوں ورنہ اصل مقصد یعنی اعلیٰ اخلاق اور بلند ہمتی پیدا کرنا مفقود ہو جائے گا۔

منجملہ جدید مصنفین کے سر کانن ڈائل کو جو ہر دلعزیزی نصیب ہوئی ہے وہ یقیناً حق بجانب ہے کیونکہ شروع سے اخیر تک اس کی کسی کتاب میں کوئی ایسی تحریر نہیں جو اخلاقی پایہ سے گری ہوئی ہو اور ساتھ ہی اُس کے اس قدر دلچسپ اور پسندیدہ ہیں کہ ہر قسم کے مذاق کے لوگ ان سے مساوی طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شرلاک ہومز کے متعلق جتنی

ہیں شائع ہو چکی ہیں غالباً بہت کم لوگ اُن سے ناواقف ہوں گے حال ہی میں ہماری نظر سے اس کی ایک تصنیف کا
ترجمہ گزرا جس کو پروفیسر نصیر احمد خاں صاحب ایم اے بی ایس سی علیگ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے شائع کرایا ہے
ترجمہ کے نام "حلقۂ مسموم" سے یقیناً اس کے نفس مضمون کا کچھ پتہ نہیں چلتا مگر اسی کو سرسری نظر ہی سے دیکھنے پر معلوم ہوتا
ہے کہ قابل قدر کتاب ہے۔ سر کانن ڈائل روحانیات کے بڑے متبحرِ عالم تسلیم کئے جاتے ہیں اور اُن کی جملہ تصانیف میں
رنگ غالب نظر آتا ہے مگر اس کتاب میں انھوں نے بالخصوص اس امر کا التزام کیا ہے کہ موجودہ سائنٹفک ترقیوں
اور ایجادات کو قدرت کی نیرنگیوں کے ایک ادنیٰ کرشمہ کے سامنے ہیچ ہوتا ہوا دکھایا ہے قیامت یا کائنات کی فنا کے
متعلق ہر قوم کی جداگانہ خیالات اور اعتقادات ہیں۔ اس تصنیف کا مقصد غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی متمدن
اقوام کے نزدیک اگر ایسا حادثہ ممکن ہے تو وہ کیا صورت اختیار کرے گا اور سائنس داں دنیا اس سے بچنے کے لئے
کیا تدبیریں کرسکتی ہیں۔

یہ تصنیف علمی یا طبعی طور پر یقیناً بہت قابل قدر ہے اور ترجمہ بھی فائق مترجم نے نہایت قابلیت سے کیا ہے عبارت
بہت سلیس اور عام فہم ہے۔ صفحات ۱۳۱ - اور قیمت عہ ملنے کا پتہ پروفیسر موصوف عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

نشاطِ روح محسوسات کی دنیا جس قدر وسیع ہے اسی قدر انسان اس کے اظہار سے قاصر ہے نظم کے
ذریعہ بعض ذوق سلیم رکھنے والوں نے ان خصوص میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے اور اس ضمن میں غالب مرحوم کا نام
لینا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ آج کل جب کہ قحط الرجال ہے یہ مستزاد ہے کہ ہر شخص ایسے کام کو لے بیٹھتا ہے جس کا وہ مطلقاً اہل نہیں
ہوتا۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی موجودہ دور کے شعرا تک پہونچتی ہے جو حشرات الارض سے کم نہیں جس کو دیکھنے سے شاعر
بننے کی فکر میں مبتلا ہے مگر حقیقی معنوں میں وہ کہاں تک اس لطیف شئے کی شریک ہے۔ ارباب بصیرت سے مخفی نہیں۔

ایسی حالت میں جب کسی گوشہ سے صحیح آواز آتی ہے تو اُن سے لطف اندوز ہونیوالوں کا فقدان نظر آتا ہے اور
ہمت شکن فضا یقیناً صبر آزما ہے لیکن ایک اصلی شاعر در اصل ان باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے مثال کے طور پر ہم
جناب اصغر گونڈوی کو لیتے ہیں اس وقت ہمارے سامنے ان کا مختصر دیوان "نشاط روح" ہے۔ یہ کچھ عجیب بات ہے کہ اختصار
میں غالب مرحوم کے دیوان کے ساتھ ہی وابستہ ہے تاہم جو رتبہ ان کا اردو شاعری میں ہے محتاج بیان نہیں۔
جناب اصغر کے اس مختصر دیوان میں جو جو جواہر ریزے موجود ہیں ارباب ذوق کے لئے کچھ عجیب ہی سامان

نشاط پیدا کرنے والے ہیں اور وہ بھی روح کے لئے جناب موصوف نے اردو شاعری کو یقیناً کچھ نئی چیز عطا فرمائی ہے دیوان جناب اقبال سہیل کے تبصرہ سے مزین ہے۔ یہ تبصرہ بجائے خود ادب اردو میں ایک زرین اضافہ ہے ہماری رائے میں یہ دیوان کالجوں کے درسیات میں شامل کئے جانے کے قابل ہے۔

میں نے عموماً اصغر صاحب کی خصوصیات شاعری پر نظر نہیں ڈالی ہے کہ اس کے لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے جس کی فی الحال گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ سہیل کے تبصرہ کے بعد اس ضمن میں لکھنا بھی تحصیل حاصل ہے لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ مختصر تقطیع قیمت عمار ملنے کا پتہ دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ یا خود جناب مصنف سے مل سکتی ہے

تاریخ السلف ایسی کتاب ہے جو اردو لٹریچر میں ایک نرالی حیثیت رکھتی ہے جناب مولوی سید عبدالباری صاحب معنی اجمیری نے حضرت خواجہ صاحب اجمیری کے حالات پر تنقید کی ہے اور انھیں تاریخ کی روشنی میں لانے کی کامیاب کوشش کی قید سے آزاد رطب و یابس کشف و کرامات کا طومار جمع کر دیا جایا کرتا ہے۔ جن میں سے اکثر خوارق عادات پر مشتمل ہوتے ہیں اور سب ضرورت کسی بزرگ سے منسوب کر دیئے جاتے ہیں اور ان سے خوش عقیدہ لوگوں کی سامعہ نوازی کے سوا نہ تو تاریخ و تذکرہ کا اصل فائدہ ملتا ہے اور نہ اُن بزرگوں کے سادہ اور پاک طرز زندگی کے قابل تقلید اعمال روشنی میں آتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لئے نمونہ اور جادہ پیمایان طریق کے لئے مشعل ہدایت بن سکیں۔

مصنف موصوف نے حضرت خواجہ صاحب کے حالات پر تاریخی اصول سے روشنی ڈالی ہے اس کے شروع میں مولوی سید سلیمان صاحب ندوی نے بطور مقدمہ اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا ہے جس سے اس کتاب کے متعلق حقیقی رائے معلوم ہو جاتی ہے یہ کتاب ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ ہے اور طباعت و کتابت صاف ہے چونکہ اس پر کوئی قیمت درج نہیں ہے اس لئے قیاس یہ ہے کہ جناب مصنف نے خوش عقیدہ حضرات کے لئے یہ قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔
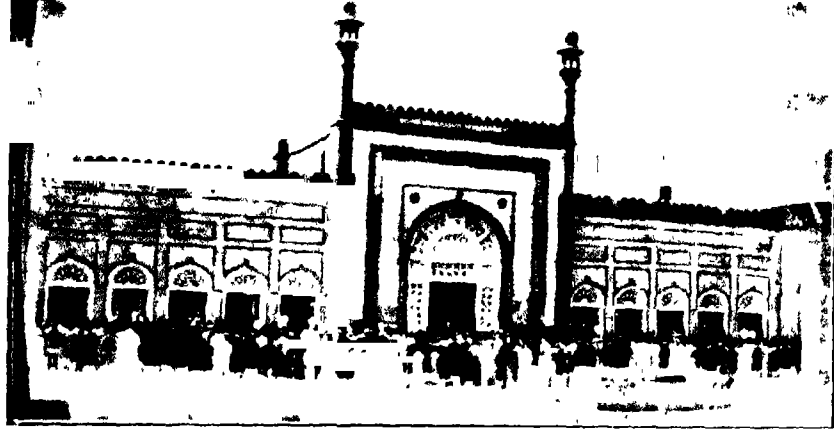
علی گڑھ میگزین

(اڈیٹر) عبدالباسط ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

علی گڑھ میگزین

مُرتبہ

مولوی عبدالباسط صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

سکرٹری :- محمد حسین خاں بی اے

شذرات

سب سے اہم تعلیمی واقعہ وسط نومبر میں مسلم یونیورسٹی کا جلسہ تقسیم اسناد ہے۔ اس جلسہ کی اہمیت متعدد وجوہ سے قابل ذکر ہے جس کی بابت میگزین تعطیلات نمبر میں لکھا جا چکا ہے۔ ان میں سب سے اہم واقعہ ہر ہائی نس سرکار عالیہ بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا کا اس پیرانہ سالی میں اپنے قدوم میمنت لزوم سے بحیثیت چانسلر سرفراز فرمانا ہے۔ پھر اعلیٰ حضرت قدر قدرت گردوں رکاب نواب مستطاب ہز ہائی نس نواب افتخار الملک سکندر صولت عالی جناب حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ فرماں روائے دارالاقبال بھوپال کی بحیثیت فرماں روائے بعد مسند نشینی پہلی مرتبہ رونق افروزی ہے۔ اس موقع پر حضور ممدوح نے گراں قدر شاہانہ عطیہ مبلغ دو لاکھ روپیہ یونیورسٹی کو عطا فرمایا جس کے لئے ہم ان کے تہ دل سے شکرگزار ہیں اور تمام ارکین دارالعلوم کو اس عظیم الشان کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

تمام جلسے جو اس سلسلہ میں منعقد ہوئے وہ نہایت خوش اسلوبی سے انجام پائے جس کی نمایاں کامیابی کے لئے تمام ارکین یونیورسٹی قابل صد ستائش اور مستحق تہنیت و مبارک باد ہیں۔ ہم تمام ان کامیاب طلبا کو جن کو اس شاندار موقع پر اسناد ملی ہیں دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اور ان سے متوقع ہیں کہ وہ دنیا میں پہلا قدم رکھکر اپنی علمی مادر مشفقہ کو کبھی فراموش نہ کرینگے بلکہ ہمیشہ اس کی بہبودی کو مد نظر رکھیں گے۔

ہر ہائی نس سرکار عالیہ بھوپال اور ہز ہائی نس نواب صاحب ممدوح کے گراں قدر اور پر جوش خطبے جو جلسۂ تقسیم اسناد اور نصر اللہ خاں ہوسٹل کی رسم افتتاح کے تاریخی مواقع پر پڑھے اور سُنائے گئے وہ ان تمام محاسن سے معمور تھے جو ایک حقیقی دیندار، روشن ضمیر اور روشن خیال سے متوقع ہو سکتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الحقیقت سچے خیر خواہ اور ہمدرد قوم اور پکّے حامی ملت کے دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔

سرکار عالیہ نے اس شاندار موقع پر تمام ارکین دار العلوم اور طلباء کو مخاطب فرما کر سب سے زیادہ جس چیز پر زور دیا ہے وہ ان الفاظ سے ظاہر ہے:۔

"حضرات! ہماری قوم نے انتہائی جدوجہد کے بعد یہ یونیورسٹی قائم کی ہے اور اس کو مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ تو قدرتی طور پر ہم اس دار العلوم میں "مسلم" کی نسبت سے جو برکت حاصل ہونا چاہیئے ہم اس کے آرزومند ہوتے ہیں . . . . . . پس اس نسبت سے ہم اس کے طلباء کو ارکان اسلام کا پابند اور اسلام کی ترقی میں سرگرم کوشش دیکھنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک رنج دہ بات ہوگی کہ اس دار العلوم اسلامی کے مسلمان دنیوی کاروبار میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ نہ تو ان کو اپنے ہادی برحق کی پیروی اور نہ ارکان اسلام کے پابندی کا خیال رہے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ہماری یونیورسٹی کے بہی خواہ چانسلر کے زبان فیض ترجمان سے نکلے ہیں۔ ہمارے دار العلوم میں اگر کوئی خصوصیت ہو سکتی ہے تو وہ سب سے زیادہ پابند شریعت ہونا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نہ صرف طلباء بلکہ تمام ارکین یونیورسٹی اور وہ حضرات کہ جن کو اس دار العلوم سے کسی نوعیت سے بھی تعلق ہے ان زرّیں الفاظ پر عملی طور پر کاربند رہ کر سرکار عالیہ دام اقبالہا کو خوش رکھنے کی سعی فرمائینگے جس کی بدولت وہ نہ صرف اپنے چانسلر کی نظروں میں بلکہ اسلام اور شریعت

کے نزدیک بھی سرخرو ہونگے۔

امسال کانووکیشن کے خطیب اسناد جناب سید سلطان احمد صاحب وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی منتخب ہوئے تھے جناب سید صاحب نے نہایت پُرزور الفاظ میں اپنا خطبہ جلسۂ تقسیم اسناد کے روز پڑھا۔ سید صاحب موصوف نے اپنے خطبہ میں سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا تھا کہ طلباء یونیورسٹی اور کالج کو دماغی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی اور اخلاقی تربیت کی بھی اسی قدر ضرورت ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ تقریباً تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اس کی کمی ہے اگرچہ جسمانی ترقی کی کمی ایک بڑی حد تک ورزشی کھیل کود پورا کر دیتے ہیں لیکن اخلاق یا کیرکٹر کی کمی کی طرف کہیں توجہ نہیں کی جاتی۔ واقعتہ الامر "کیرکٹر" ہی وہ چیز ہے جس کے لئے تمام یونیورسٹیوں کو جلد متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہم جناب سید سلطان احمد صاحب کے اس سنجیدہ اور پُر از معلومات خطبہ کے لئے شکرگزار ہیں۔

ایک مضمون پان اسلامزم یا اتحاد اسلامیت کے عنوان سے گزشتہ میگزین کے دو نمبروں میں شائع ہو چکا ہے ہم اس مضمون کے لئے اپنے مکرم دوست جناب ابرا حسن صاحب فاروقی کے سپاس گزار ہیں جنھوں نے اس قدر اہم اور مفید مضمون کو نہایت خوش اسلوبی سے ترتیب دے کر سپرد میگزین فرمایا۔
اس مضمون میں جناب مصنف نے پان اسلامزم کو دراصل کوئی جدید چیز نہیں بتایا ہے بلکہ دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ نہ صرف اسلام کا بلکہ تمام دنیا کے تمدن کا سنگ بنیاد ہے۔ اور ہر مسلمان کا ہر شرعی فعل پان اسلامزم کا جزو لاینفک ہے گویا بالفاظ دیگر حق اللہ اور حق العباد کے مجموعہ کا نام ہی اتحاد اسلامیت یا پان اسلامزم ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ قابل مصنف نے مجددین اتحاد کی زندہ جاوید مساعی کو ان کے اجمالی سوانح عمری کے ساتھ ظاہر کیا ہے
اُمید ہے کہ جناب مولوی صاحب موصوف اسی طرح اپنے مفید مضامین سے مستفید فرماتے رہیں گے۔

ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ بار بار اعلان کرنا پڑتا ہے کہ یہ میگزین دراصل طلباء کا ہے اور ان کا فرض اولین

طلباء یونیورسٹی اور کالج کو جزو لازم سکھانا ہے۔ جہاں ہماری یونیورسٹی نے جسمانی، اخلاقی، روحانی اور دماغی نشو و نما کے لئے مختلف نوع سے سامان بہم کئے ہیں وہاں اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ وہ طلباء جن کو ادب سے ذوق ہے وہ اس کے ذریعہ سے اپنے ادبی ذوق میں ترقی کریں۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر طبیعت انسانی متعدد قسم کی دلچسپیوں سے یکساں طور پر وابستہ نہیں ہوسکتی اور جس طرح بہت سے ٹینس، کرکٹ اور ہاکی کے کھلاڑی ایک ہی دارالعلوم میں رہ کر اسی انہماک سے یونین حال میں تقریر نہیں کرسکتے۔ اسی طرح بہت سے مقرر یونین میگزین نوازی سے فطرتاً محروم ہوسکتے ہیں لیکن ہم اس کے ساتھ ہی یہ ایک لمحہ کو تسلیم نہیں کرسکتے کہ اس کثیر مردم شماری میں معدودے چند حضرات بھی ایسا ذوق سلیم نہ رکھتے ہوں۔ جن کے ہوتے ہوئے اور میگزین کا معیار قدیم قائم رکھتے ہوئے میگزین کو بار بار بذریعہ نوٹس اور اعلان مضامین کے لئے دست طلب دراز کرنا پڑے۔ ہمیں امید ہے کہ ارباب ذوق ادب آیندہ میگزین نوازی سے دریغ نہ فرمائیں گے۔ بلکہ علمی، ادبی، تاریخی مضامین لکھنے کی سعی کریں گے

جناب ضیاء الحسن صاحب مرحوم اور جناب راجہ محمد درویش صاحب مرحوم سے یونیورسٹی اور کالج کا کون شخص ہے جو واقف نہیں یا جن کی یاد ان کے احباب کے لئے اشکباری کا سامان نہ پیدا کردے۔

ضیاء الحسن صاحب مرحوم نے اپنے دوران قیام یونیورسٹی میں جو ہر دلعزیزی حاصل کی تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ طالب علمی کوئی شخص ایسا نہ تھا جو ان کا دوست نہ ہو۔ اس کے بعد جو تعلیمی کامیابیاں ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات پاس کرکے حاصل کیں اس کا صلہ ان کو انٹرمیڈیٹ کالج کی ریاضی کی لیکچراری تھی اگرچہ اس عہدہ پر بہت ہی تھوڑے دن فائز رہے لیکن ہر فرد ان سے یکساں مسرور تھا۔ انھوں نے اپنی دائمی مفارقت سے جو صدمہ پہنچایا ہے اس کی تلافی محال ہے۔ ذیل کے تاریخی دو قطعات ہم کو محمد حسین خاں صاحب کی عنایت سے موصول ہوئے ہیں جو درج کئے جاتے ہیں

قطعہ تاریخ وفات جناب ضیاء الحسن صاحب مرحوم

ضیا نور چشم جناب ضیا — کہ بود ست چشم چراغ وطن
امید از من و تو بخلد آرمید — ندانم چہ دیدست از انجمن
بتاریخ فوتش عظامی بگفت — تقاشد زفوت ضیاء الحسن

۱۰۳ — ۱۳۴۴-۱۰۳-۱۴۴۷

قطعہ تاریخ وفات راجہ محمد درویش خاں مرحوم

دردے بدل رسید خارے بجان خلید — کاں سرو بوستان جمال از جہاں برفت
ہاتف الف کشید چنیں گفت سال فوت — درویش آہ آہ ز دنیا جواں برفت

۱ — ۱۳۴۵ = ۱ - ۱۳۴۶

ایڈیٹر:- عبد الباسط

رباعیات گرامی

(۱)

خاور چکد از چشم بایں تیرہ شبی
کوثر چکد از لبم بایں تشنہ لبی
اے دوست ادب کہ در حریم دل ماست
شاہنشہ انبیا رسول عربی

(۲)

اے ساقی با بادہ بدہ عصمت تیز
کآمد بادا رو گیر باطل بستیز
در ساغر ما اے ساقی خم خانہ راز
آں بادۂ زرد و اسمۂ احمد ریز

(۳)

اے ختم رسل جان جہاں فارقلیط
خوانند ترا بر آسماں فارقلیط
می گفت مسیح در بشارات جلیل
من می روم آید بجہاں فارقلیط

(۴)

پیغمبر را علیؑ وصی اکمل
آں شاہ سوار عرصۂ علم و عمل
بر لوح وفا بحرف جلی بر خواں
اوّل ہمہ ثانی ست ثانی اوّل

[۲] اوّل خود ثانی ست و ثانی اوّل

امرء القیس اور شاعری

(از مولوی عبد الباقی صاحب ایم اے ایل ایل بی)

گو اس پر اتفاق نہیں ہے کہ شعراء جاہلیت میں بہتر شاعر کون ہے مگر عام طور پر اہل ذوق نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ قابل ترجیح امرء القیس بن حجر بن حارث کندی ہے عرب کے مشاہیر شعرا میں سب سے زیادہ نمایاں اسی کا نام ہے یونس بن حبیب کا قول ہے کہ علماء بصرہ کے نزدیک امرء القیس سب میں بہتر اور قابل ترجیح ہے اہل کوفہ نے اعشیٰ کو قابل ترجیح بتایا ہے اور اہل حجاز اہل بادیہ زہیر اور نابغہ کو بہتر بتاتے ہیں کسی نے فرزدق شاعر سے پوچھا کہ "اے ابوالفرس! سب سے بڑا شاعر کون ہے؟" کہا "ذوالقروح یعنی امرء القیس" امرء القیس کی کنیت ذوالقروح بھی تھی مرنے کے کچھ دنوں پہلے تمام بدن زخموں سے بھر گیا تھا زہر کی وجہ سے تمام بدن پر دانے نکل آئے قسطنطنیہ سے واپسی میں اسی میں مبتلا رہ کر انگورہ میں مرگیا اپنے پھوڑے پھنسیوں کا ذکر امرء القیس نے اس شعر میں کیا ہے ؎

وبدّلت قرحاً دامیاً بعد صحۃ   فیالک من بوسی تحولن ابوسا

اس شعر کی وجہ سے بعد کو ذوالقروح کے لقب سے مشہور ہوا۔ فرزدق سے یہ بھی پوچھا گیا کہ امرء القیس کی ترجیح پر کیا دلیل ہے۔ فرزدق نے امرء القیس کا یہ شعر پڑھا ؎

وقاھم جدھم ببنی ابیھم   وبالاشقین ما کان العقاب

(ترجمہ) ان کو کوشش نے اُن کی اولاد پدری کی وجہ سے بچا دیا۔ اور اشقیا پر عذاب نہ آیا۔

جب لبید شاعر کوفہ میں قبیلہ بنو نجد میں اُترا تو لوگوں نے ایک شخص کو بھیجکر دریافت کیا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ کہا "الملک الضلیل" یعنی امرء القیس اُس شخص کو دوبارہ بھیجا اور پوچھا پھر کون؟ کہا۔ مقتول لڑکا یعنی طرفہ پوچھا پھر کون؟ کہا۔ بوڑھا ابوعقیل یعنی خود یہ اُن لوگوں کے خیالات ہیں جن کو کلام کے تنقید کا صحیح ذوق حاصل تھا اور بلاغت کے معیار سے واقف تھے جو کلام کے نشیب و فراز جودت و رکاکت سے باخبر تھے اگر ان راؤں کو علیحدہ کر دیا جائے اور امرء القیس کا کلام پڑھا جائے تو چند خوبیاں ہر جگہ نمایاں معلوم ہونگی۔

۱۔ امرء القیس پہلا شخص ہے جس نے جید اشعار اور چست تشبیہ کی بنیاد ڈالی ہے بشار بن برد کا قول ہے جب امرء القیس کا یہ شعر میں نے سنا ؎

کان قلوب الطیر رطبا و یابسا لدی وکرھا العناب والحشف البالی

تو بے حد پسند آیا اور اسی وقت سے برابر سوچتا رہا کہ اس پایہ کا کوئی شعر میں بھی کہوں ایک عرصہ کے بعد بشار نے یہ شعر کہا ؎

کان مثار النقع فوق رؤوسنا واسیافنا لیل تھاوی کواکبہ

بشار مادر زاد اندھا تھا جب اُس نے یہ شعر کہا تو کسی نے اُس سے کہا کہ اب تک کسی نے اتنی عمدہ تشبیہ نہیں دی تھی تم نے کبھی دنیا دیکھی نہیں پھر یہ تشبیہ کیوں کر پیدا کرلی۔ بشار نے کہا کہ۔ بصارت کا فقدان قلب کے ذکاء کو قوی کر دیتا ہے اور چونکہ محسوسات سے اُس کو روک دیتا ہے اس وجہ سے اُس کی حس بڑھ جاتی ہے اور طبیعت روشن ہو جاتی ہے یہ قول اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر بشار کو اس کا اقرار ہے کہ یہ تشبیہ امرء القیس کے تشبیہ کا نتیجہ ہے اور اُس کی آب و تاب اور رونق بشار کی تشبیہ میں موجود ہے۔ امرء القیس کا دوسرا شعر یہ ہے جس میں وحشی گاؤں کے شکار کا تذکرہ ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ خیمہ کے اردگرد گاؤں کی آنکھیں الگ پڑی ہیں ؎

کان عیون الوحش خول خباءنا وارحلنا الجزع الذی لم یثقب

اور اس طرح کے اشعار جن میں تشبیہ نہایت پُر رونق ہو امرء القیس کے کلام میں بکثرت ملیں گے۔

۲۔ امرء القیس کے پہلے جو عرب میں شعرا گزرے ہیں اُن کا کلام زیادہ تر روکھا اور بھونڈا سا ملے گا۔ لطیف معنی اوّل اوّل امرء القیس نے پیدا کئے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امرء القیس کے قبل جو شعراء

گزرے ہیں اُن کے کلام میں لطف، رونق اور شادابی نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کلام نازک خیالات سے پُر اگر کسی شاعر کا ملے گا تو وہ امرأ القیس ہے۔ امرأ القیس کا شعر ہے ؎

سموت الیھا بعد نام اھلھا   سمو حباب الماء حالا علی حال

اپنی دبی چال اور پوشیدہ آمد و رفت کو نہایت ہی خوب صورتی سے ادا کیا ہے بعد کے کسی شاعر نے اُس مضمون کو دوسرے نہج سے ادا کیا ہے۔ مگر وہ خوبی پیدا نہ ہو سکی ؎

ادب الیھا دبیب الکری   واسمو الیھا سمو النفس

وضاح یمن شاعر نے بھی اسی مضمون کو ادا کیا ہے اُس کا شعر ہے کہ ؎

اسقط علینا کسقوط الندی   لیلۃ ناہٍ ولا زاجر

ان دونوں شعروں کو پڑھئے تو دونوں میں بین فرق معلوم ہوتا ہے۔ جو شوکت اور آب و تاب امرأ القیس شعر میں ہے وہ وضاح یمن کے شعر میں قطعاً نہیں ہے۔ سموت کا لفظ اور بعد ما نام اھلھا خاص لطف رکھتا ہے۔ وہ خوبی و چستی اور انسانی جذبہ دوسرے شعر میں بالکل نہیں ہے امرء القیس کا دوسرا شعر ہے ؎

یعنی الفراش وجھھا لضجیعھا   کمصباح زیت فی قنادیل ذبال

چہرہ کی خوبصورتی اور رونق کو جس پیرایہ سے ادا کیا ہے وہ عجب پُر لطف ہے اسی مضمون کو متنبی نے اخذ کر کے کہا ہے ؎

امن ازدیارک فی الدجی الرقباء   اذ حیث کنت من الظلام ضیاء

اس کے مقابلہ میں متنبی کا شعر بالکل پھیکا پڑ جاتا ہے گو متنبی نے اس معنی کو امرء القیس سے لیا ہے مگر اضافہ تو درکنار اتنی عمدگی اور لطافت بھی پیدا نہ کر سکا جو امرء القیس کے شعر میں نمایاں ہے۔

باقی آئندہ

اُمّید کی کرن

جناب وحید الدین صاحب سلیم

خاتمہ تیرا اب اے ظلمتِ ہجراں ہوگا — صبحِ اُمید کا پھر جلوہ نمایاں ہوگا

منتظرِ شاہدِ مقصود کی رہتی ہے نگاہ — شعلۂ برق اسی تار پہ رقصاں ہوگا

طیش میں اشک کا جو قطرہ گرا دامن پر — اسی قطرہ سے بپا عیش کا طوفاں ہوگا

خاک میں تخمِ تمنا جو دبایا تھا کبھی — اب وہی تخم نمو پاکے گلستاں ہوگا

زیرِ خاکسترِ پروانہ جو پنہاں تھا شرر — پھر بھڑک کر وہی اب شمعِ شبستاں ہوگا

جس سے اُٹھتا نظر آتا تھا شبِ غم کا دھواں — مطلعِ صبح وہی چاکِ گریباں ہوگا

پارۂ سنگ نے جھیلی ہے شعاعِ خورشید — اب بدل کر وہی اک لعلِ بدخشاں ہوگا

خون جب پنجۂ مژگاں سے ٹپکتا تھا کبھی — خوشنمائی سے وہ اب پنجۂ مرجاں ہوگا

پہلے جس دشت پہ پھیرا تھا اُداسی نے قلم — اب وہی تختۂ مشقِ گل و ریحاں ہوگا

سیل جس دامنِ کہسار پہ رویا برسوں — اب وہی جوشِ گل و لالہ سے خنداں ہوگا

رہ چکا زرد جمالِ گلِ کنعاں جس میں — گلشنِ مصر وہی گوشۂ زنداں ہوگا

قطرۂ نیساں کا تھا گرداب میں گرنے والا — سیپ میں جا کے وہ اب گوہرِ غلطاں ہوگا

آگ جلتی کبھی دیکھی نہیں جس قُلّے پر — اب وہی برقِ تجلّی سے درخشاں ہوگا

جس میں پالے نے نہ چھوڑا اثرِ نشو و نما	اب وہی نخل ثمر ریز و گل افشاں ہوگا
جس میں تھا امّتِ موسیٰ کو ٹھہرنا مشکل	منّ و سلویٰ کا اُسی دشت میں ساماں ہوگا
کل سکندر تھا اندھیرے میں جہاں سرگرداں	موج زن آج وہیں چشمۂ حیواں ہوگا
خاک اُڑاتا تھا جہاں غولِ بیاباں کا گروہ	گرم پرواز وہیں تختِ سلیماں ہوگا
جس شبستاں پہ نشۂ جہل کا چھایا تھا کبھی	اب وہی خُمکدۂ حکمتِ یوناں ہوگا
پہلے اُٹھتے تھے جہنّم کے شرارے جس جا	اب وہیں جلوہ نما گلشنِ رضواں ہوگا
ظلمتِ فصلِ خزاں چھائی تھی جس مسکن پر	اب وہ پھولوں کی تجلّی سے چراغاں ہوگا
جلوۂ شاہدِ مقصود جو تھا زیرِ نقاب	رو برو چشمِ تماشا کے وہ عریاں ہوگا
یاس کی نیند سے اُٹھے گا جو آنکھیں ملتا	صبحِ اُمید کے جلوہ سے وہ حیراں ہوگا

پرسماں دیکھ کے ہر غمزدہ مانندِ تسلیم
وجد میں آ کے مسرت سے غزل خواں ہوگا

حصنِ حصین
موت کے مقابلے کے لئے

(ترجمہ رابرٹ لوئی اسٹیونسن)

موت جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ بذاتِ خود اتنے سخت اور فیصلہ کن اور نتائج میں اس قدر خوف ناک اور
انگیز ہوتے ہیں کہ انسان کے تجربات میں ان کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ موت تمام حادثات پر فائق ہے اس لئے کہ سب سے
ی حادثہ ہے۔ وہ کبھی ٹھگ کی طرح اپنے شکار پر دفعۃً حملہ کر دیتی ہے۔ اور کبھی باقاعدہ محاصرہ کرتی ہے اور برسوں
ا قلعہ کو فتح کرتی ہے اور جب موت اپنا کام ختم کر دیتی ہے تو دوسرے انسانوں کی زندگیوں میں عجیب خلل اور انتشار
ا ہو جاتا ہے۔ گویا ایک کیل اکھڑ گئی جس پر بہت سی محبتیں آویزاں تھیں۔ کرسیاں خالی، سیر و تفریح تنہا اور بستر خواب
لے رہ جاتے ہیں۔ پھر جب موت ہمارے دوستوں کو لیجاتی ہے تو ان کو تمام و کمال نہیں لے جاتی بلکہ ایک مضحکہ انگیز
ناک اور ناقابل برداشت بقیہ چھوڑ جاتی ہے جس کا جلد سے جلد نظروں سے پوشیدہ کرنا لازم ہوتا ہے۔ چنانچہ
م مصری سے لے کر عیسائیوں کے حلقہ تک اسی کے مناظر و مشاہد ہیں۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگرچہ دنیا میں بہت کم چیزیں ہیں جن کا ذکر موت کے ذکر سے زیادہ ہیبت و وحشت پیدا کرتا ہو،
موت کا اثر ہمارے حالات و مشاغل پر مطلق نہیں ہوتا۔ جنوبی امریکہ کے ان شہروں کا حال کس کو نہیں معلوم جو آتش فشاں
وں کے دامن میں آباد ہیں۔ اس جوارِ ہلاکت کا اہلِ شہر پر ذرّہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ مجالسِ عیش و نشاط گرم ہیں
ہائے ضیافت روشن ہیں، محادثاتِ عشق و محبت جاری ہیں۔ اسی اثناء میں بنیادیں پاؤں کے نیچے ہلتی ہیں پہاڑ
دل سے آواز غیظ و غضب بلند ہوتی ہے اور ایک لمحہ میں یہ سارا زندہ خراب آباد آسمان تک بلند ہونے والا ہے

اور انسان اور اس کی نشاط آفرینیاں خاک میں ملنے والی ہیں۔ اس بات کا یقین آنا مشکل ہے کہ آتش انگیز پہاڑ سے بعید فاصلے پر بھی انسان کو بھوک لگ سکتی ہے۔ چہ جائیکہ مین دامن کوہ میں۔ اس درجہ خوف ناک ہلاکت کے اس قدر قریب زندگی بسر کرنا انتہا درجہ کی بیباکی وجسارت معلوم ہوتی ہے اور پنیر اور مرتوں سے لذت اندوز ہونا خالقِ مطلق کا جسارت آمیز مقابلہ کرنے کے مترادف نظر آتا ہے۔ یہ مقام ان تارک الدنیا اشخاص کے لئے موزوں ہے جن کا مقصدِ حیات سخت سے سخت ریاضت واذیت برداشت کرنا ہے۔ یا وہ بدمست شیطان نژاد افراد یہاں رہ سکتے ہیں جو تمام افکار دنیا غرقِ مے ناب کر سکتے ہیں۔

تاہم اگر اس حالت پر سکون وسنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو ساکنانِ جنوبی امریکہ کی زندگی تمام نسل آدم کی عام زندگی کے مقابلہ میں خطرہ وہلاکت کی نہایت دھندلی تصویر نظر آئے گی یہ تمام دنیا جو آنکھیں بند کئے سرعت کے ساتھ ایک پُر ہجوم فضا میں کروروں بے بصر، سریع السیر، متخالف السمت عالموں کے ساتھ سفر کر رہی ہے ذرا سے صدمہ سے ایک ادنیٰ گولۂ بارود کی طرح نذرِ دود وآتش ہوجانے کا امکان رکھتی ہے۔ خود جسم انسانی اور اس کے تمام اعضا بارود کی تھیلیوں سے زیادہ کیا وقعت رکھتے ہیں۔ ہمارا ہر سانس اور ہر نوالہ نتابہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم زندگی کے تخیل محض ہی میں گرفتار رہیں یا تباہ کن حادثات سے اتنے ہی خوف زدہ بنے رہیں جیسا بعض فلاسفر ہم کو بنانا چاہتے ہیں تو طبل جنگ بجتے رہیں گے اور کوئی میدان جنگ کا رخ نہ کرے گا۔ جھنڈے ہلتے رہیں گے اور کوئی جہاز پر قدم نہ رکھے گا۔ غور کرو کہ اگر یہ فلاسفر درست کہتے ہیں تو کھانے کی میز کے روزانہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم کو کس قدر ہمت واستقلال سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جب کہ یہ مقام تاریخ عالم کی ہر رزم گاہ سے زیادہ ہلاکت آفریں ہے اور ہمارے اسلاف کے بیشتر حصہ کی شہادت گاہ۔ کون عورت تعلق ازدواج پر آمادہ ہو سکتی ہے جب کہ یہ چیز سب سے زیادہ طوفان خیز سمندر سے بھی بڑھکر خطرناک ہے۔ اور بوڑھا ہونا تو اس حساب سے قیامت کا سامنا کرنا ہے۔ اس لئے کہ ایک خاص فاصلہ کے بعد ہم جو قدم اٹھاتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی برف کی تہ پتلی ہوتی جاتی ہے اور ہمارے گرد ہمارے رفیقِ سفر اس میں غرق ہوتے جاتے ہیں۔ ستر برس کی عمر کے بعد انسان کی زندگی معجزہ معلوم ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنی پرانی ہڈیاں رات بسترِ خواب پر پھیلاتا ہے تو ظن غالب یہی ہوتا ہے کہ اب روز روشن کا جلوہ اس کو نصیب نہ ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بوڑھے آدمی اس کی پروا کرتے ہیں؟ مطلق نہیں۔ وہ بدستور مصروفِ مسرت ونشاط نظر آتے ہیں۔ رات کو لذیذ غذا

ستے ہیں۔ دلچسپ قصّے بیان کرتے ہیں۔ اپنے ہم عمر اور کم عمر لوگوں کی موت کا حال سُنتے ہیں نہ اس نظر سے کہ یہ ان کے لئے
ب تنبیہ ہی بلکہ اس طفلانہ مسرت کے ساتھ کہ ہم طول حیات میں اوروں سے بازی لے گئے اور جب کہ ہوا کا ایک
و نکا شمع گداختہ کی طرح ان کے شعلہ حیات کو خاموش کرسکتا ہی یا ایک لغزشِ پا شیشۂ نازک کی مانند ان کے جام ہستی کو
ر چور کرنے کے لئے کافی ہی ان کے دل مسرور و بے خوف ہوتے ہیں اور اس منزل حیات پر پہنچ کر بھی جس کے
مابلہ میں وادی بیک لاوہ (کریمیا کا میدانِ کارزار) ایسی محفوظ و پُرامن ہی جیسے کرکٹ کا میدان۔ یہ شیوخ فانی
ندہ ہانے نشاط آگیں میں مصروف ہوتے ہیں۔ بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہی کہ کرشیس[*] کا غار میں کود پڑنا زیادہ
یری کا کام تھا یا کسی نوّے برس کے بوڑھے کا لباسِ شب خوابی پہن کر بسترِ خواب پر دراز ہونا۔

ہمارا عرصۂ حیات ایک دیا سلائی کے جلنے کی مدت سے زیادہ طویل نہیں ہم ہنجر کی بوتل کی ڈاٹ کھولتے ہیں وہ
ی لمحہ میں زلزلہ ہم کو نگل لیتا ہی کیا یہ عجیب نہیں کیا یہ غیر موزوں نہیں۔ کیا یہ انتہا درجہ کا ناقابل یقین نہیں کہ ہم
ہر کا اتنا زیادہ خیال کریں اور ہلاکت کن زلزلہ کا اس قدر کم؟ محبتِ زیست اور خوفِ مرگ دو مشہور لفظ ہیں کہ ہم
ن پر جتنا غور کرتے ہیں یہ اسی قدر غیر الفہم معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلم امر ہی کہ کشتیوں کی غرقابی کے حادثات بالکل معدوم
ہ جائیں اگر لوگ بادبانوں کی چادروں کو بجائے باندھ دینے کے ہاتھوں میں پکڑے رہیں۔ لیکن کوئی بندہ خدا ایسا
ہیں کرتا یہ موت کے مقابلہ میں انسان کی بے پروائی اور دلیری کیسی عجیب مثال ہی۔

حقیقت یہ ہی کہ ہم کو تصور ہی نہیں کہ موت اپنے ماحول، واقعات و اثرات کے علاوہ کیا چیز ہی اور اگرچہ ہم زندگی کا
تجربہ رکھتے ہیں لیکن روئے زمین پر کوئی فرد بشر ایسا نہیں جو تخیل کی بلندی سے پرواز کے ذریعہ سے بھی لفظ "حیات"
ے حقیقی معنے قائم کرسکا ہو۔ تمام ادبیات جاب اور عمر خیام سے لے کر طامس، کارلائل اور والٹ وہٹمین تک
س ایک کوشش ہیں اس امر کی کہ انسانی زندگی پر اس قدر وسعتِ نظر کے ساتھ غور کیا جائے کہ ہم ماحولِ حیات سے تعریف
ت تک پہنچ سکیں۔ ہمارے علماء اپنا تمام زور علم صرف کرکے ہم کو یہ کہکر مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ زندگی ایک بخار ہی
یک نمائش ہی یا خواب کی ہم ترکیب ہی۔ فلسفہ مدتوں سے اسی کام میں مصروف ہی اور بے شمار باتوں سے بے نیاز سر

---

[*] کرشیس روم کا ایک بہادر تھا۔ اس کا زمانہ ۳۶۲ سنہ قبل مسیح ہی۔ روم میں یکایک ایک غار نمودار ہوگیا تھا۔ ملک کے مخزنِ غیب نے یہ بتلائے دی
دم کی کوئی سب سے قیمتی چیز پھینکی جائے تو غار خود بخود بند ہو جائے گا۔ کرشیس یہ سُن کر گھوڑے پر سوار ہوا اور غار میں کود پڑا۔

اس مسئلہ پر مٹے ہیں اور خشک و تاریک و بے نتیجہ جلدوں میں الفاظ کے انبار لگائے گئے ہیں تب کہیں فلسفہ کو یہ عزت حاصل
ہوئی ہے کہ فخر کے ساتھ اس موضوع پر اپنی یہ رائے پیش کرے کہ "زندگی مستقل امکانِ احساس کا نام ہے" حقیقت میں کیا
شاندار نتیجہ ہے! ایک شخص گوشت سے محبت کرسکتا ہے۔ شکار سے محبت کرسکتا ہے۔ عورت سے محبت کرسکتا ہے لیکن مستقل
امکانِ احساس سے زنہار محبت نہیں کرسکتا۔ وہ عمیق غار سے، دنداں ساز سے، مسلح دشمن سے، باغسال و گور سے
ڈر سکتا ہے لیکن موت کے تصور مجرد سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم زندگی سے ان معنوں میں
محبت نہیں کرتے کہ اس کی حفاظت و احتیاط میں سرتاپا منہمک رہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہم زندگی سے محبت کرتے
نہیں بلکہ جینے پر مرتے ہیں۔

زندگی کے ہر رخ پر لاطائل و بے سود مباحثات ضرورت سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ علمائے مذہب نے مذہب
کو اس قدر محدود کردیا ہے کہ گویا جنازہ کا نہایت مختصر جلوس ہے اور مایوس طبع و بیزار ہستیاں اصحاب قبر کے آرزو مند
رہتے ہیں گویا وہ کوئی دنیا ہے بہت دور و دراز۔ ان دونوں جماعتوں کو اپنے کارنامہائے علم و تحقیق پر اس وقت
پشیمان ہونا چاہیئے جب کھانے کی میز کی طرف اپنی کرسیاں سرکاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لذیذ کھانا اور شراب کی
بوتل اس موضوع کی تمام مستند تصانیف کا شافی جواب ہے۔ عملی زندگی کے مشاغل میں انسان کو یہ مجادلات علمی بھول
جانے پڑتے ہیں۔ ممکن ہے کہ موت دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس وقت کام میں مصروف
ہیں وہ دروازہ کھٹکھٹایا کرے۔ تمام دنیا میں کوس رحلت بج رہا ہے تمام روئے زمین پر ہر لمحہ میں کوئی نہ کوئی ہستی
اپنے تمام آلام و مسرات کو ساتھ لئے رخصت ہوجاتی ہے۔ ہمارے لئے بھی جال بچھا ہوا ہے لیکن ہم کو زندہ رہنے کی اتنی
ضرورت ہے کہ خوفِ مرگ کے تصور کی فرصت نہیں۔

ہم سب احساسات کی قدر کرتے ہیں لیکن ان کے استقلال امکان کو سمجھنے کے لئے انسان کے سر کو بالوں سے
بے نیاز اور اس کے احساس کو سست و کند ہونے کی ضرورت ہے۔ خواہ ہم منبر پر چڑھ کر گرجیں یا نظموں میں زندگی کے خفقان
و غریب کاری پر گریہ و بکا کریں۔ خواہ صحیح و قوی زندگی بسر کریں یا انتظار مرگ سے صحت کو مرض الموت بنالیں ہر حال میں
ایک ہی نتیجہ ممکن العمل ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کو خوف و دہشت کی طرف سے کانوں کو بالکل بند کرلینا چاہیئے اور جو طرزِ
عمل اس کے سامنے ہے اس پر ہمت و یک سوئی کے ساتھ گام زن ہونا چاہیئے۔ جرأت و عقل دو انسانی اوصاف ایسے

ل بہتر سے بہتر تربیت کی ضرورت ہے عقل کا پہلا فرض یہ ہے کہ زندگی کی نازک حالت کو پہچانے اور جرأت کا پہلا کام
یہ موت کے مقابلہ میں ہرگز شکست قبول نہ کرے۔ کشادہ دلی اور دلیری جس میں نہ مستقبل کے لئے اضطراب و
ب ہو نہ ماضی پر رنج و ماتم۔ اس انسان کے لئے سلاح جنگ ہیں جو اس دنیا کے مقابلہ کے لئے آمادہ رہنا چاہتا
ور یہ سلاح نہ ی صرف اپنی ذات کے لئے نہ ہوگی بلکہ انسان کو صادق دوست اور لائق شہری بھی بنا دے گی
ت اور بزدل لوگوں سے حسن معاملہ کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ خوف و دہشت سے زیادہ قاتل کوئی چیز نہیں۔ جو
ں اپنی ذات کی سب سے کم پروا کرتا ہے وہ دوسروں کے لئے سب سے زیادہ وقت نکال سکتا ہے۔ وہ مشہور
۔ جو ٹین کے جوتے پہن کر باہر نکلتا تھا اور جس کی غذا صرف گرم دودھ پر محدود تھی اس کی تمام توجہ صرف اپنی
ا قوت ہضم کے نقطہ پر دائر رہتی تھی جب ضرورت سے زیادہ احتیاط قوائے دماغی پر مستولی ہونے لگتی ہے
جذبات ایثار و خیر رسانی مفلوج ہو جاتے ہیں انسان کی روح پست و مضمحل ہو جاتی ہے۔ وہ ایک خاص موزوں
ر کے مکان میں رہنا چاہتا ہے اور اس کے تمام اخلاق ٹین کے جوتوں اور گرم دودھ کے اصول کے تابع ہو جاتے
رف ایک جسم بے روح کی فکر و احتیاط اس درجہ غالب ہو جاتی ہے کہ بیرونی دنیا کی تمام آوازیں اس مختص حرارت
ہیں بہت سست و پست ہو کر پہنچتی ہیں۔ او ٹین کے جوتے جوئے خون اور آب باراں پر یکساں رفتار سے
تے ہیں۔ غیر ضروری احتیاط و حزم ناکارہ ہونے کے مساوی ہے شکی و وہمی مزاج کے انسان آگے نہیں
سکتے

لیکن جو شخص دل بدست و سر بکف رہتا ہے جو اپنی جان کو ایسی ہی چیز سمجھتا ہے جس کو دلیری کے ساتھ استعمال
ے اور خوشی کے ساتھ خطرے میں ڈال دیا جائے وہ دنیا سے ایک اور ہی حیثیت سے تعارف پیدا کرتا ہے وہ
ن کی صحت و تیزی کو قائم رکھتا ہے۔ تگا پوئے حیات میں اس کو تازہ جوش حاصل ہوتا جاتا ہے اور اگر آتش صحرا سے
خطرے کی طرف دوڑتا اور ہلاک ہو جاتا ہے تو دفعۃً آسمان کی طرف پرواز کرتا اور ایک درخشاں ستارہ بن جاتا ہے
ول ہے کہ صحت کا خدا حافظ ہے، جان کا خدا مالک ہے ایسا شخص مشکلات کی کلید کا حامل ہے اور تمام خطرات و
ت کی دلدل پر سے گزرتا ہوا مقصدِ حیات کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ موت اس کو اپنے آتش بار اسلحہ کا نشانہ

س قدیم عقیدے کی طرف اشارہ ہے کہ عظیم الشان انسان مرنے کے بعد ستارہ بن جاتے ہیں ۱۲

بنائے ہوئے ہے۔ حوادث ناگہانی اس کو چاروں طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے احباب واعزہ کی جماعت جو موت کے
نام سے لرزہ براندام ہے اس کی اولوالعزمانہ روش کی مخالفت میں ہاتھوں کو بلند کر رہی ہے لیکن وہ ان سب باتوں کی
کیا پروا کرتا ہے۔ وہ زندگی کا سچا عاشق ہے اس کا دل جوش و حوصلہ سے لبریز ہے وہ ایک سپاہی کی طرح جو کسی خطرناک
جنگ کی طرف سبقت کرتا ہے اپنی پوری رفتار کے ساتھ بڑھتا ہے اور منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

مخصوص حرارت کے کمرے میں رہکر زندگی کے تمام نتائج و مسرات سے محروم رہنا گویا سو سو بار مرنا ہے اور
سال تک مسلسل مرتے رہنا۔ گویا جیتے جی مرجانا ہے اور ایسا مرنا کہ جس میں آزادی بعد الموت کا لطف بھی میسر نہیں
گویا ایسی موت ہے کہ انسان اپنے انقلاب بیکسی کا خود ہی تماشائی ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مستقل امکان
ہے لیکن احساسات نہایت احتیاط سے بچے ہوئے الگ کھڑے ہیں۔ گویا فوٹو کی پلیٹ تاریک کمرے میں رکھی ہوئی
کوئی عکس اس پر نہیں پڑ سکتا۔ تندرستی کو ایک مسرف شخص کی طرح لٹا دینا اس سے بہتر ہے کہ بخیل کی طرح اس کو بے
بے سود بنا دیا جائے۔ زندہ رہنا اور سرمایۂ حیات کو ختم کر دینا بیمار بن کر روزانہ مرنے سے بدرجہا اولی ہے زندگی کی
جد و جہد ہر حالت میں شروع کر دو۔ اگر ڈاکٹر تمھیں زندگی کا ایک سال بھی نہیں دیتا، مگر اس کو ایک مہینے میں بھی تمام
پھر بھی تم دلیرانہ آگے بڑھو اور دیکھو کہ ایک ہفتہ میں کیا کچھ کر سکتے ہو۔ سود مند سعی و کوشش کی عزت کام کی تکمیل پر منحصر
نہیں ہے۔ جس شخص کا مقصدِ حیات سعی و عمل ہے اس کی موت دنیا میں ایک روح پھونک دیتی ہے اور وہ روح اس
قبل از وقت موت کے بعد بھی اس کو دنیا میں زندہ رکھتی ہے۔ جن لوگوں نے خلوص و صداقت کے ساتھ نیک کام کرنے
عزم کیا ہے ان ہی سے نیک کام صادر ہوئے ہیں خواہ وہ آخری دستخط کرنے سے قبل نذر اجل ہو گئے ہوں
دل جو قوت و نشاط کے ساتھ سینہ کے اندر تڑپتا رہا ہے دنیا میں پُر امید تحریک چھوڑ گیا ہے اور روایات انسانی
بہتر بنا گیا ہے اور اگر موت ان اشخاص کو جو بڑے بڑے مقاصد پیش نظر رکھتے ہوں۔ عظیم الشان تحریکوں کی بنا
نصب کر رہے ہوں۔ غازۂ امید سے ان کے چہرے سرخ ہوں۔ اپنی کامیابی کی دلائل فخر کے لہجہ میں پیش کر رہے
ہوں، ایک عمیق غار کی طرح درمیانِ سفر میں پکڑ لے۔ ان کے راستے کو قطع اور ان کی زبانوں کو خاموش کر
تو کیا ایسا خاتمہ دلیری و جوشش کی روح اپنے اندر نہیں رکھتا؟ اور کیا ایک شخص کا منازل حیات کے صعب گ
کوہستانوں کی چوٹی سے عرق ریز جد و جہد کے ساتھ اترنا سطحی میدانوں پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینے سے

زیادہ لائقِ احترام وقابل یادگار نہیں ہی؟ جب یونانیوں نے یہ لطیف وصحیح ضرب المثل بنائی ہو کہ "دیوتا جن سے محبت کرتے ہیں وہ جوان مرجاتے ہیں"۔ تو یقیناً اس قسم کی موت ان کی نظر میں تھی۔ اس لئے کہ انسان جس عمر میں بھی مرے بالیقین جوان مرگ ہی مرتا ہی۔ موت کی یہ مجال نہیں کہ انسان کے دل سے عزائم جلیلہ وخواب ہائے شیریں کو بھی لے جائے وہ زندگی کی گرم جوش جد وجہد میں جب کہ حیات بشری کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچنے کی اُمید سے اس کا پیمانۂ قلب لبریز ہوتا ہی ایک جست میں دوسری طرف پہنچ جاتا ہی۔ ابھی سنگ تراش صناع کے آلات کا شور خاموش نہیں ہو چکتا طبل جنگ کی صدا ختم نہیں ہو چکتی کہ خوش طالع وگرم خون روح (یعنی یہ صناع یا سپاہی) سحابِ عظمت وجلال کو گرد راہ کی طرح پیچھے چھوڑتی ہوئی عالم روحانی کا اختر تاباں بن جاتی ہی۔

حامد حسن قادری بچھرایونی

نقوش حسرت

اک سمت کہیں بزم طرب میں کوئی مسرور ہونٹوں سے ہی جام مے گلفام لگائے
اور ایک طرف بسترِ غم پر کوئی مہجور چھاتی سے پڑا ہی دلِ ناکام لگائے!

ہم سے روٹھو بھی تو لازم ہی اک ناز کے ساتھ پھر بھی ہم پہ کرو تم تو دل آویز کرو

باقی ہی جو کچھ کچھ خلش درد کبھو کی اب تک یہ مرے دل میں نشانی ہی کسو کی

حسرت موہانی

غزل

اب بھی کیا ہوگا نہ اندازۂ تاثیر مجھے / لے اُڑا سوئے فلک نالۂ شبگیر مجھے

بے خبر ہوں مجھے کچھ اپنی خبر تو ہولے / کس طرف لے کے چلی گردشِ تقدیر مجھے

اب نہ وحشت کے گلے ہیں نہ جنوں کے شکوے / منزلِ امن ہوا حلقۂ زنجیر مجھے

دل کو آغوشِ مصیبت میں لئے بیٹھا ہوں / اُٹھنے دیتی نہیں سنگینیِ تقدیر مجھے

حاصلِ عمرِ رواں ہونگی خطائیں میری / مرنے دے گی نہ کبھی لذتِ تعزیر مجھے

داغِ ناکامیِ اُمید کا مٹنا ہے محال / نظر آتی ہے اس آئینے میں تقدیر مجھے

آہ کرنے کو تو کرتا ہوں مگر اے غمِ دل / ڈر یہ ہے پھونک نہ دے گرمیِ تاثیر مجھے

ناخدا خود ہی نہ بیگانۂ ساحل ہو کہیں / کہیں لے ڈوبے نہ خود اپنی ہی تدبیر مجھے

اللہ اللہ یہ گرفتاریِ دل کی حالت / سانس بھی اب نظر آنے لگی زنجیر مجھے

ہوں مگر ہونے سے اپنے نہیں آگاہ ذرا / نظر آتا نہیں کچھ صورتِ تصویر مجھے

منزلِ غم میں بھی دشوار ہے رہنا تا دیر / دیکھوں لے جائے کہاں گردشِ تقدیر مجھے

آہِ سوزاں سے پتا دل کا لگالیں احباب / شمع کی طرح نہیں فرصتِ تقریر مجھے

اک غمِ عشق کی وسعت کا الٰہی یہ مآل / ساری دنیا نظر آنے لگی دلگیر مجھے

جس طرف دیکھو غمِ دل کے سوا کچھ بھی نہیں / نظر آتی ہے فقط ایک ہی تصویر مجھے

کیا سمجھتا تھا یہی داغ ہے ہادیؔ سب کچھ
اپنے ہی دل میں ملا حاصلِ تقدیر مجھے

ہادی مچھلی شہری

سامی زبانوں کی اصل عربی ہے

(از مولانا سید محمد بدرالدین صاحب علوی)

علم اللسان کے ماہرین نے زبان کی اولین دو بڑی قسمیں قرار دی ہیں ایک سامی دوسری یافثی۔ ان دونوں کے اقسام اولیہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں مواد کلمات کی حالت بالکل مختلف اور جداگانہ ہے یعنی سامی زبانوں میں تقریباً تمامتر مادّے سہ حرفی ہوتے ہیں۔ دو حرفی کا وجود نادر، برعکس اس کے یافثی میں مواد دو حرفی ہوتے ہیں سہ حرفی شاذ۔ کیوں یہ خصوصیت ہر ایک کو حاصل ہوئی۔ ایک طویل بحث ہے اور میرے دائرہ سے باہر اس جگہ اصل مقصود پر گفتگو سے پہلے سامی زبانوں کے چند خصوصیات کی طرف اجمالی اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک عجیب بات ان کی یہ ہے کہ ان کے اندر چند حروف ایسے پائے جاتے ہیں جن کا تلفظ غیر سامی لوگوں کو نہایت دشوار ہے یہ حروف ع، ق، ص، ط وغیرہ ہیں۔ یافثی میں ان کا وجود نہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بتا دینا اور بھی تعجب انگیز ہوگا کہ بنی سام عموماً حروف حلقیہ کے تلفظ پر فطرۃً قادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے شیر خوار بچے ب، م، د کے بعد حروف حلق کا تلفظ کرنے لگتے ہیں۔

یافثی زبانوں میں مونث اور مذکر کے لئے مستقلاً جداگانہ افعال وضمائر نہیں ہیں لیکن سامی زبانوں میں اس امتیاز کا بالاستقلال لحاظ ہے اور ہر ایک کے لئے جداگانہ افعال وضمائر کا استعمال ہوتا ہے۔

یافثی میں ضمائر فعل واسم وحرف سے متصل ہو کر استعمال نہیں ہوتے برعکس اس کے سامی میں اتصال بھی ہوتا ہے اور انفصال بھی اور ہر ایک کے لئے ایک موقع ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ اتصال کے موقع پر انفصال درست نہیں اور انفصال کے موقع پر اتصال نادرست۔

سامی زبانوں کے تحت میں عربی، سریانی، کلدانی، نبطی، حبشی، سامری وغیرہ داخل ہیں یہ سب

کسی اور زبان سے نکلی ہیں یا انھیں میں سے کوئی ایک بقیہ کے لئے اصل ہو۔ یہ مسئلہ علم اللسان کے ماہرین کے درمیان ما بہ النزاع ہے۔ پہلی صورت ضعیف ہے اور دوسری صورت میں تین گروہ ہیں ایک کا خیال یہ ہے کہ عبرانی اصل دوسرا کہتا ہے کہ نہیں بلکہ سریانی۔ تیسرا معتقد ہے کہ یہ شرف عربی کو حاصل ہے۔ ہر مذہب کے دلائل لکھکر اُن کی تنقید کر طویل ہے۔ اس لئے میں اس وقت محض عربی کی اصلیت کے چند دلائل پیش کرکے اُن اعتراضات کے جواب دینے کوشش کروں گا جو اس مسلک پر وارد ہوتے ہیں۔

پہلی دلیل عربی کو اصل قرار دینے والوں کی یہ ہے کہ ماہرین لغت تسلیم کر چکے ہیں کہ عبرانی اور سریانی کے بعض الفاظ کی اصل تلف ہوگئی ہے اور اُن کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی لیکن اُن الفاظ کی اصل عربی میں موجود ہے جو بجائے اس امر کی دلیل ہے کہ یہ دونوں زبانیں اُن الفاظ کو عربی سے لے گئی ہیں۔ اصول عربی میں پائے جاتے ہیں فروع اُن زبانوں میں یعنی اصول اُن میں نظر نہیں آتے اسی بنا پر کہدیا گیا کہ یہ الفاظ مجہول الحقیقت ہیں عربی کی طرف نظر کرنے سے حقیقت کھل جاتی ہے۔ لہذا اُن کا مجہول الحقیقت کہدیا جانا اس کی دلیل ہے کہ یہ اُس زبان سے نکلی ہیں جس میں اُن کی حقیقت اور اصل کا وجود ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ عبرانی اور سریانی میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جن کے بعض اجزا ساقط معلوم ہوتے ہیں اور وہ الفاظ نقصان پزیرفتہ ہیں۔ یہ اجزاء ساقطہ عربی میں موجود ہیں جیسے آنت کا نون اور ال تعریف کا لام وغیرہ کہ یہ اجزاء عربی میں موجود ہیں مگر عبرانی اور سریانی میں نہیں۔ اس اختلاف کی وجہ دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ الفاظ عربی سے باسقاط اجزا عبرانی اور سریانی میں لئے گئے ہیں یا اُن زبانوں سے عربی میں لئے گئے ہیں اور اجزاء اضافہ کردیئے گئے ہیں۔ پہلی صورت قرین قیاس ہے دوسری نہیں اس لئے کہ قاعدہ اکثریہ بلکہ کلیہ ہی سمجھنا چاہیئے کہ جب کوئی لفظ ایک زبان سے دوسری زبان میں جاتا ہے تو یہ نقل دلیل کثرت استعمال ہے اور کثرت استعمال طالب خفت۔ لہذا یہ لفظ سقوط اجزاء کو قبول کرتا ہے اور بمقابلہ منقول عنہ کے ناقص اور ساقط الاجزاء معلوم ہوتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حرف ض صرف عربی میں ہے عبرانی اور سریانی اس سے خالی ہیں لیکن ص اور س تینوں میں موجود ہیں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ عربی کے وہ الفاظ جن میں ض ہے عبرانی میں ص کے ساتھ

سریانی میں ع کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ارض اور قبض کو لیجئے۔ عبرانی ان کو ارص اور قبص
تلفظ کرتی ہے اور سریانی ارع اور قبع سے۔ اب اگر یہ فرض کیا جائے کہ ارض ارص سے خواہ ارع سے
بنا لیا گیا ہے تو اس کو تسلیم کرنا خلاف عقل ہے کیونکہ جب ص اور ع دونوں عربی میں موجود ہیں تو ایسی حالت
میں وہ کون وجہ ہو سکتی ہے جس نے اہل عرب کو ص یا ع کو ض سے بدلنے پر مجبور کیا ہو اور ارص یا ارع
کو ارض کر دیا ہو۔ لہذا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ الفاظ اصل میں عربی ہیں۔ عبرانی اور سریانی میں نقل ہو کر
گئے ہیں۔ یوں کہ ان زبانوں میں ض نہ تھا۔ بس گو وہ فطری اسباب اختلاف آب و ہوا زمان و مکان کے باعث
تلفظ کر سکتی تھیں اسی لئے ض کو چھوڑ کر ایک نے ص لے لیا اور دوسری نے ع۔ ایک ض ہی پر بس نہیں
ذ اور ث بھی عبرانی اور سریانی میں نہیں ہیں۔ جن عربی الفاظ میں یہ حروف ہیں وہ عبرانی اور سریانی میں
دوسرے حروف سے بدلے ہوئے ہیں چنانچہ ذ والے عبرانی میں د سے اور سریانی میں ز سے جیسے ذکر
عبرانی میں دکرا اور سریانی میں زکر۔ ث والے عبرانی میں ش سے اور سریانی میں ت سے جیسے ثلج عبرانی
میں شلج اور سریانی میں تلج۔ غرض کہ صدہا ہزارہا الفاظ اس طریقہ پر ان دونوں زبانوں میں عربی سے ماخوذ
ہیں جن کی بابت یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ عربی میں ان زبانوں سے آئے ہیں اس وجہ سے کہ اہل عرب کو تبادلہ
حرف کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔

یہ دلیل ایسی واضح ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا یہی ایک دلیل تنہا اس مسلک کے اثبات کے لئے
کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ایک دلیل اور بھی ذکر کر کے سلسلہ دلائل کو ختم کردوں گا مورخین کا اتفاق ہے کہ سب سے
پہلی کتاب جو عبرانی زبان میں لکھی گئی وہ سفر ایوب ہے۔ اب یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اس میں بے شمار الفاظ عربی کے
بھرے ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں عبرانی مستقل زبان نہ تھی بلکہ عربی مستقل اور جداگانہ تھی
رفتہ رفتہ اسباب فطری کے باعث تغیرات شروع ہوئے اور عبرانی کی صورت پیدا ہوئی جس زمانہ میں سفر ایوب
مدون ہوئی اس وقت تک عبرانی اس درجہ میں عربی سے جدا نہیں ہوئی تھی جس میں وہ بعد کو پہنچی۔

اب ان اعتراضات کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے جو عربی کے اصل السنہ سامیہ ہونے پر وارد ہوتے ہیں
سب سے بڑا شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اہل عرب کی ابتدا قحطان یا یقطان سے ہے یہ شخص عابر کا بیٹا تھا جو عبرانی بولنے والوں تک

مورث ہے نتیجہ یہ ہے کہ عربی عبرانی سے متاخر اور اُسی سے ماخوذ ہے نہ کہ اُس کا ماخذ۔

زرا غور کرنے سے اس اعتراض کی کوئی حقیقت نہیں رہتی زیادہ سے زیادہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عرب نام قحطان یا یقطان سے جاری ہوا اس سے پہلے یہ نام نہ تھا اور زبان بھی عربی نہیں کہلاتی تھی اور اس میں کوئی قباحت نہیں دلائل مذکورہ کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جو زبان عابر کی تھی اور اس کے اجداد جس کو بولتے چلے آرہے تھے بعینہ وہی قحطانی شاخ میں آکر عربی سے موسوم ہوئی۔ دوسری شاخیں جب علٰحدہ ہوئیں تو جو لوگ بعد میں عبرانی اور سریانی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ اپنی مورث کی زبان سے دور ہوتے چلے گئے اور اُن کی زبانیں باقتضائے قانون فطرت یعنی اختلاف آب و ہوا و زمان و مکان بالکل مختلف ہو گئیں برعکس اس کے جو لوگ بعد میں عرب کے نام سے مشہور ہوئے وہ اپنے مورث کی زبان علی حالہ بولتے چلے آئے تغیرات جو قانون فطرت کا لازمی نتیجہ تھے اُن کے یہاں بھی ہوئے۔ لیکن وہ ایسے نہ تھے کہ زبان بالکل بدل جائے بلکہ وہ ایسے تھے جیسے ایک زبان کے اندر مختلف ادوار میں ہوا کرتے ہیں اور جن کے باعث زبان کو کوئی شخص دوسری زبان نہیں کہہ سکتا۔ اب اس تقریر کے بعد قائل ہونا پڑے گا کہ عربی نام گو اصلی نہیں لیکن زبان یہی اصلی ہے۔ باقی رہا مورث کا مقدم ہونا تو یہ ناقابل التفات ہے۔ اگر محض مورث کا مقدم ہونا باعث قدامت لسان ہو تو لازم آئے گا کہ کلدانی زبان عبرانی کی بھی اصل ہو۔ کیوں کہ کلدانیوں کا مورث ارفکسد سام کا بیٹا ہے اور عبرانیوں کا مورث عابر سام کا پوتا ہے۔ لہذا عبرانی کلدانی سے متاخر اور ماخذ ہونی چاہیئے۔ حالانکہ اس کا کوئی قائل نہیں۔

دوسرا اعتراض عربی کے اصل ہونے پر یہ کیا جاتا ہے کہ عربی چھٹی صدی مسیحی سے قبل کتابت و قرأت میں نہیں آئی۔ یہ فخر عبرانی اور سریانی کو قدیم ترین زمانہ سے حاصل ہے۔ یہ اعتراض محض سطحی اور عامیانہ ہے کسی زبان کا لکھا پڑھا جانا۔ اُس کے وجود کے مرادف نہیں کہ عربی اس صفت سے متصف ہونے کے قبل معدوم سمجھی جائے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ عربی اس بات میں اور دیگر تمدنی اثرات سے متاثر ہونے میں عبرانی اور سریانی سے بہت پیچھے ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کا وجود بھی ان زبانوں کے بعد ہو۔ درحقیقت عرب کی زبان جو تغیرات سے محفوظ رہی اور مورث کی متروکہ حالت پر قائم و باقی رہی اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ وہ تمدنی

اثرات سے متاثر نہیں ہوئے۔ ایک بادیہ نشین قوم اُس کی حامل تھی جس کو تمدن سے انتہائی بُعد تھا دوسری طرف عبرانی اور سریانی برابر تغیرات قبول کرتی رہیں کیونکہ اُن کی حامل متمدن اقوام تھیں۔ اُن کے یہاں تغیر ناگزیر تھا کثرت استعمال جو تمدن کے لئے لازم ہے اُس کی وجہ سے اُن میں الفاظ کے اجزا ساقط ہوگئے اور الفاظ کی صورتیں بدل گئیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ زبانیں مورث کی زبان سے بالکل مختلف ہوگئیں۔ عربی ان تمام حوادث سے محفوظ رہی۔

وجدانیات

حسن لیلائے حقیقت اشک میرے دل میں ہے ۔۔۔ آنکھ جس کو ڈھونڈتی ہے وہ اسی محمل میں ہے

جلوۂ مقصود بھی آنکھوں میں جچتا ہی نہیں ۔۔۔ اللہ اللہ کس قدر رعنائی غم دل میں ہے

فصلِ لطف اندوزی دل کی گرانباری نہ پوچھ ۔۔۔ اے خوشا سوزے کہ پنہاں خرمنِ حاصل میں ہے

لطف سے ہر ہر قدم پر لوٹتا جاتا ہوں میں ۔۔۔ اک نشاط انگیز کیفیت رہِ منزل میں ہے

پے بہ پے حسرت مچلتی ہے نکلنے کے لئے ۔۔۔ اس کو کیا معلوم ہے دل کون سی مشکل میں ہے

ناز والے تجھ کو میں نے ہی کیا ہے بے نیاز ۔۔۔ تیری نیرنگی کا سارا راز میرے دل میں ہے

فرطِ محویت سے دیوانی ہوئی جاتی ہے موج ۔۔۔ کیا جنوں اندوز شیرینی لبِ ساحل میں ہے

اے نگاہِ شوق اے محوِ فریبِ بے خودی ۔۔۔ تجھکو کیا معلوم ہے کیا پردۂ محمل میں ہے

منزلِ جاناں میں الفت کے مزے ہیں گے ضرور
اس کی رہ میں اشک مٹ جانے کی حسرت دل میں ہے

مولوی ظفر حسین صاحب اشک بی اے

دعا

(ایک مجسمہ فرض کرکے)

از اختر شیرانی ایڈیٹر بہارستان

تاروں بھری رات سو رہی ہے
فطرت، مدہوش ہو رہی ہے

ہیں سبزہ و کوہسار، خاموش
ہر پھول، ہر آبشار خاموش

خاموش ہیں مرمریں فضائیں
مدہوش ہیں عنبریں ہوائیں

دنیا ساری نکھر رہی ہے
ہر شے کچھ غور کر رہی ہے

اس اُجلے سمے میں اک پری ہے
گویا کوئی شکلِ مرمری ہے

کمسن، معصوم، بھولی بالی
مکھڑے پہ گلاب کی سی لالی

رنگین پرپھٹ پھٹا رہی ہے
تاروں کی سمت جا رہی ہے

نظریں اوپر اُٹھی ہوئی ہیں
ننھی زلفیں چھٹی ہوئی ہیں

بکھرے ہوئے بال اُڑ رہے ہیں
ظلمات کے جال اُڑ رہے ہیں

آنکھوں میں چھلک رہے ہیں آنسو
گالوں پہ ڈھلک رہے ہیں آنسو

اک دُکھ بھرا گیت گا رہی ہے
روتی ہوئی اُڑتی جا رہی ہے

پھیلائے ہوئے ہے اپنی جھولی
ہونٹوں پہ ہے نرم نرم بولی

خالق کے حضور میں چلی ہے
کچھ رحم کی بھیک مانگتی ہے

سازِ زخمی کی ہے صدا یہ !!
ٹوٹے ہوئے دل کی ہے "دعا" یہ !!

لامتناہی

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاشکہ مکاں اپنا (غالب)

قبر کے اس جانب خدا نے ہمارے ذہن کے لئے جو جولانگاہ عطا کی ہے وہ لامحدود ہے (بیکن)

آ مان تمھیں آواز دے رہے ہیں اور تمھاری طرف گردش لگا رہے ہیں وہ اپنے دائمی ن کا اظہار تم پر کرنا چاہتے ہیں مگر تم ہو کہ ہنوز زمین ہی کو گھور رہے ہو (دانتے)

درختوں کی بہاروں میں، امواج کی روانی میں، اور ستاروں کی جگمگاہٹ میں یہ نغمۂ سامعہ نواز سنائی دیتا ہے: "سب سے بڑا لاثانی شاعر خدا اپنے تخت شاہنشاہی پر متمکن ہے اور جس کی شاعری تخلیق عوالم کی صورت میں ظہور پزیر ہوا کرتی ہے" (دانسن)

آسمان کے نیلے سمندر میں ستاروں کی چمک دار مچھلیوں کو تیرتے دیکھکر انسان کا خیال بحر سکوت میں رزن ہو جاتا ہے بعض اس قسم کے موقعے ہوا کرتے ہیں جب کہ انسان اس بات کا قائل ہو جاتا ہے کہ اس کو روحیت سے سابقہ ہے اور جوں ہی اس کی روح میں علویت اور بالغ نظری آجاتی ہے تو وہ خود کو مجبور اور بے سمجھنے لگتا ہے۔ جو حضرت داؤدؑ کے جذبات اس کو اپنے خالق سے یہ پوچھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ:

"اے خدا، انسان کیا شے ہے جس کا تو اس قدر خیال رکھتا ہے اور اس ابن آدم کی کیا ہستی ہے جس پر ، تجلیات کا انکشاف کرتا رہتا ہے"

رات میں جب کہ مطلع صاف ہو ایک شاعر کو جب وہ بلا امداد بیرونی بالراست آسمان کی طرف دیکھے تو تین ہزار سے کچھ کم ہی ستارے دکھائی دینگے، لیکن ایک معمولی سی دوربین کی مدد سے یہ تعداد کئی گنی ہوتی ہے اور موجودہ زمانے کی بعض بڑی بڑی دوربینوں سے تو یہ تعداد اس کرہ سماوی پر ایک کروڑ تک پہنچ گئی ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے اس زمانے کا تصور کیجئے جب کہ دوربین عالم وجود میں نہ آئی تھی اور اس کو بھی سوچئے کہ اس وقت عالم کی وسعت اور اس کے موجودات کے متعلق کیا اندازہ ہوگا۔ صاف ظاہر ہے کہ ان ستارے اور دوسرے اجرام فلکی کے متعلق جو انسان کی حد نظر سے ماورا ہیں کچھ بھی علم نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ کوئی بڑے سے بڑ خیال پرور فلسفی نے بھی یہ خواب نہ دیکھا ہوگا کہ ان کے دائرہ معلومات کے علاوہ اور کئی لاکھ اجرام فلکی بھی ہیں۔ جو کچھ انھیں دکھائی دیتا تھا اسی کو ابتدا اور اسی کو انتہا سمجھتے تھے اس کے ماورا کبھی ان کے طائر خیال پرواز کی جرأت بھی نہیں ہوئی ہوگی۔

علم ہئیت بہ نسبت دیگر علوم کے انسانی قوت تفہیم کی کمزوری کو علانیہ طور پر دکھلاتا ہے۔ رات کے وقت چمکدار آسمان پر نظر ڈالنے سے لاانتہا ساکت و صامت ستاروں کے نقوش دل پر بنتے ہیں اور ہم نہایت سے ان کو غیر متحرک ستاروں کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس سکون نصیب ہو ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

وہ اشخاص جو علم ہئیت سے روشناس نہیں ہرگز اس بات کو بلا تکلف نہ مانیں گے کہ ہماری زمین اور نظام کے دیگر ارکان سورج کے اطراف گردش لگانے کے علاوہ سورج کے ساتھ اس لامحدود فضا میں روزانہ میل کی رفتار سے غیر معلوم قطعات میں سے گزر رہے ہیں اور یہ واقعہ ہے۔

اس وقت سے جب انسان پہلی دفعہ اس کرۂ ارض پر نمودار ہوا، اس وقت سے جب کہ اہرام مصر بانیوں کا دورہ تھا۔ اس وقت سے جب کہ قیصر اور ہنی بال کی شہرت کے غلغلے چاردانگ عالم میں بلند ہو رہے تھے، ہر اس دور کی ابتدا سے جس کا اندراج تواریخ میں ہو چکا ہے بلکہ یوں کہئے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے ہماری زمین بلکہ سورج اور اس کا سارا نظام، ستارۂ ویگا   کی جانب بلا کی تیز رفتاری سے محو پرواز اس سفر کی ہمیں نہ ابتدا معلوم ہے اور نہ انتہا اس کی آج تک نہ کوئی منزل آئی اور نہ رفتار میں سستی پیدا رفتار کا صحیح تخمینہ تو ہمارے دائرہ امکان سے باہر ہے لیکن اتنا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رفتار

رفتار میل فی ثانیہ کے درمیان ہے چند ہی منٹ میں ہم ستارے ویگا کی طرف ہزاروں میل کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہاں کب پہنچیں گے؟ تخمینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مدت ایک کروڑ برس کے اندر اندر ہی ہوگی اور کوئی تعجب نہیں کہ یہ وقت پچاس لاکھ برس ہی میں آ جائے ہم ٹھیک طور پر نہیں کہہ سکتے مگر ہم یہ نہایت وثوق کے ساتھ کہیں گے کہ اگر قوانینِ فطرت اور قوانینِ حرکت کی حالت موجودہ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو تو ہم ضرور ایک نہ ایک دن وہاں پہنچ رہیں گے۔" (پروفیسر سمن نیوکومب)

مگر انسان جس کو اپنی عقل و دانش پر ناز ہے، مغالطہ پر مغالطہ کھائے گا لیکن پھر بھی اپنی قوت ادراک پر ...نڈ کئے جائے گا۔ اسی ایک درخشاں اور نظر کے خیرہ کرنے والے سورج کو لیجئے کہ وہ ہم کو کس قدر زبردست ...فہمی میں مبتلا کر رکھتا ہے بجائے اس کے کہ چاند کی طرح ہم اس کا قرص دیکھتے ہیں اس بڑی ہوئی نور کی چادر ... چمکیلے مادّے کی وجہ وہ بہت چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ کامل کسوف کے وقت جب یہ نقاب الٹ جاتا ہے تو حقیقت ...ں ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم آفتاب کو زمین کے کرۂ ہوائی سے گزر کر دیکھیں تو وہ زردی مائل سنہری ...) کی بہ نسبت زیادہ ترنیلا دکھائی دیگا اور اس نیلی گیند کی اطراف چمکدار قرمزی رنگ کی چادر ایک ...ن سمندر کی طرح دکھائی دیں گی جس کی گہرائی پانچ اور دس ہزار میل کے درمیان ہوگی۔ جس کے تموج سے ...نار منور گیس وقتاً فوقتاً کروڑوں میل کی اونچائی پر پھینکی جاتی ہوئی نظر آئے گی۔ اخراج توانائی کے اس ...گداز منظر کو دیکھکر ہم پر ایک ہیبت طاری ہوگی، اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ ہم اس کا نظارہ ہی نہ کریں اور اسی ...ہمی میں پڑے رہیں کہ سورج کی حالت میں کوئی تغیر ہی نہیں ہوا کرتا ہے۔

جدید یا قدیم غرض کسی بھی دور کی ہیئت کو لیجئے مگر کسی سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ اس نے اجرام فلکی کی تحقیق ...ہ ہمارے خیالات کی پرواز اور جولانیٔ طبع صرف اسی حد تک ہے جس حد تک کہ ہم تصور کر سکتے ہیں۔ انہی اشیاء ...لق رائے زنی کی جاتی ہے جن کے اپنے مستقل وجود کا ہمیں علم ہو۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس ...ے حد نظر کے ماورا بہت سارے موجودات مستور ہیں اور جو اپنا جلوہ دکھانے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ...لن ہے عنقریب ہمیں کوئی ایسے خاص ذرائع میسر آ جائیں جن کے ذریعہ ان کا وجود ہم پر منکشف ہو جائے۔

بطور مثال یہ واقعہ ملاحظہ فرمائیے کہ گزشتہ چند ہی سالوں میں دنیا کے بڑے بڑے ہئیت دانوں نے یہ بات تسلیم کر لی کہ ان نظر آنے والے چمک دار ستاروں سے کہیں زیادہ تاریک ستارے موجود ہیں اور قطعات فلکی جو ادھر اور اُدھر بالکل معرا دکھائی دیتے ہیں دراصل وہ ایک قسم کے غیر منور غبار سے پُر ہیں جو اپنے عقبی ستاروں کے حسنِ عریاں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔

یہ سمجھنا نہایت آسان ہے کہ ہماری قوّتِ بینائی، آلات یا ذرائع تحقیقات کی حساسیت کے ساتھ ساتھ جس سے نئے کُرّے انسانی علم کے حدود میں آتے جاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ہماری آنکھیں ان دیو ہیکل دوربینی عدسوں میں کُھلی ہیں، اور ہم بغیر پس و پیش کے اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ جسامت کی تعیین محض بینائی ہی پر منحصر ہے اس لئے کہ ان دُوربینوں کے استعمال سے نہ صرف ان بے شمار ستاروں کے وجود کا انکشاف ہم پر ہوا ہے بلکہ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ہماری زمین پر ایک سہانی رات میں چشمِ عریاں سے دکھائی دینے والے ان منور ستاروں (جس کی نظارہ پرستی ہمارے لئے وحشت بخش ہوتی ہے) کہیں زیادہ ان ستاروں کی روشنی آتی ہے جن کو ہم معمولی طور پر نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہمارے کرۂ ارض پر آنے والی ستاروں کی تعداد روشنی کا تین چوتھائی حصہ ہمارے محدود نظروں سے پوشیدہ ستاروں سے آتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم عالم کا کس قدر محدود حصہ دیکھا کرتے ہیں۔

یہ بجا طور پر فرض کیا جا سکتا ہے کہ علم الافلاک کے مطالعہ میں جوں جوں نادر آلات اور انوکھے ذرائع تحقیقات عمل میں لائے جائیں گے، بلا شبہ نئے نئے عوالم تاریکی سے روشنی میں آتے رہیں گے۔ اس امر پر یقین کرنے کے لئے ہمارے پاس کافی وجوہات موجود ہیں کہ وہ کروڑہا ان گنت ستارے جن کو ہم صرف بڑی بڑی دُوربینوں سے دیکھ سکتے ہیں یا جن کا عکس خاص آلات عکاس سے لیا جا سکتا ہے، ہمارے اس لامحدود فضائے عالم میں نور افشاں ہیں

یہ سب کچھ سہی، مانا کہ اختر شماری حد امکان میں ہے، ان کے صحیح محل وقوع کی تعیین ہو سکتی ہے لیکن آج تک اس بات کا تصور تک بھی نہ ہو سکا کہ ہماری فضائے لامحدود کے آخری خطوط کہاں ختم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مرور زمانہ کے بعد ذہن انسان ہماری کائنات کو سمجھ سکے لیکن لامحدودیت اس کی حد ادراک سے ماورا ہے اور اس غیر محدود فضا میں ہماری جیسی بے شمار عوالم کا وجود ممکن ہے۔

جب ہم اپنے سینوں میں محدود دل لئے ہوئے ان ستاروں کا فصل اس کرہ ارض سے پیمائش کرتے ہیں تو
بعد مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ ان بے انتہا دور ستاروں کے عقب میں بھی غیر مختتم فضا
پھیلی ہوئی ہے۔ بعض دھندلے ستاروں سے جو روشنی ہماری زمین پر آتی ہے اس کو ہم تک پہنچنے میں سیکڑوں
ل گزر جاتے ہیں دراں حالیکہ فضا میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے بعض ایسے بھی
ارے ہم سے اس قدر فصل پر موجود ہیں کہ ان کی روشنی کی کرنیں جو آج ہمارے زمین کے دامن کو چھوتی ہیں
ان ستاروں سے اس وقت کی نکلی ہوئی ہیں جب کہ ہماری دنیا کتم عدم سے عالم شہود میں نہ آئی تھی۔ ان تنے
یہ ممکن نہیں کہ ہماری اس تاروں بھری فضا کے پرے بہت سے ایسے نا معلوم عوالم موجود ہونگے جو ہم سے کہیں
ھکر ترقی کے منازل طے کر چکے ہونگے لیکن جن کی روشنی ہنوز ہم تک نہ پہنچی ہو؟

اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کو جانتے ہوئے بھی ان مظاہر قدرت کا ایک دلدادہ معلومات حاصل کرنے کی
وش خواہش کو اپنے دل میں لئے ہوئے اپنے خیالات کے مرکب پر پرواز کیا کرتا ہے وہ اس بات سے ضرور
اہ ہوتا ہے کہ اس کو اس طرح صرف کل کا ایک جز معلوم ہوگا، لیکن اس پر بھی وہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اس
تی مظہر العجائب کو سمجھے اور ان کی ترجمانی کرے وہ اس مرئی عالم کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے اور خیال ہی خیال
مختلف عوالم کو ارتقا کے مختلف منازل ایک غیر متشکل دھندلے غبار سے لے کر مکمل ستارے بننے تک طے
تے ہوئے دیکھتا ہے۔ جو اگرچہ اس وقت نہایت آب وتاب کے ساتھ درخشاں ہیں۔ لیکن بالآخر جن کا خاتمہ
ا اور وہ اس فضا کے تاریک اور زوال پذیر نظام میں شامل ہوجائے گی۔

ذہن انسانی ان چیزوں کو تصور میں لاسکتا ہے اس لئے کہ ان کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ لیکن ہمارا تصور
لکھڑا جاتا ہے جب ہمارے عالم جیسے لامحدود عوالم کو جو شائد اس سے بھی کہیں شاندار ہیں اپنے احاطہ میں لانے کے لئے
ماتا ہے۔ ہمارا دل اور کیسا دل؟ جس کی خاصیت رونا، اور معمولی سے خوف پر کانپ اٹھتا ہے اس لامحدودیت
ل ہونے کی تاب نہیں لاسکتا اور یقیناً خواب میں بھی یہ شان لامحدودیت ہیبت افزا ہوگی۔ جین پال رکٹر کے
پ خواب میں ایک آدمی کو صحن جنت میں بلایا گیا۔ جس کو اس غیر مختتم فضا میں ایک عالم کے بعد دوسرے عالم سے
ا پڑا۔ حتیٰ کہ اس کا دل مابقی لامحدود فاصلے کو طے کرنے کے تصور سے کانپ اٹھا۔ تب اس شخص نے ایک

لمبا سانس لیا، ٹھہر گیا، لرز گیا اور زار زار رونے لگا اس کے بھرے ہوئے دل نے غم کا اظہار آنسوؤں کی شکل میں کیا، وہ کہہ اٹھا :"

"اے میرے (رہبر) فرشتے میں اب آگے نہ بڑھوں گا اس لئے کہ انسان کی روح اس لامتناہی سے لرز جاتی ہے۔ صرف خدا کی ذات ہی ان عیوب سے مبرا ہے مجھکو قبر میں آرام سے سونے اور اس لامتناہی کے تعاقب سے باز رہنے دے کیونکہ مجھے اس کی انتہا کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔"

تب اس فرشتہ نے اپنا نورانی ہاتھ اس آسمانوں کے اسمان کی طرف اٹھایا اور کہا کہ :

" انتہا ! خدا کے عالم کی کوئی انتہا نہیں ہے اور یہ بھی دیکھ لے کہ کسی کو اس کی ابتدا بھی معلوم نہیں۔

مترجم
محمد ابراہیم بی اے
متعلم ایم ایس سی کلاس

تکرارِ لفظی

(از جناب محمد فاروق صاحب ایم ایس سی)

مالِ جذب تو دیکھو، بہم تمیز مشکل ہے — وہ کہتے ہیں کہ پیکاں ہے، میں کہتا ہوں مرا دل ہے

ب سے ہیں، حیا سے وہ، لگاتے ہاتھ ڈرتے ہیں — میں سمجھا ان کا پیکاں ہے، وہ یہ سمجھے مرا دل ہے

ہی اک چیز ہے جس میں خلش بھی ہے تپش بھی ہے — جو رستے دونو پیکاں ہے جو سے لو تو مرا دل ہے

میرا ہم نشیں بھی کچھ عجب بہروپیا نکلا — میرے سینہ میں پیکاں تھا، تمھارے ہاتھ میں دل ہے

م جانے دو دونوں کو، اب اس پر فیصلہ ٹھہرے — نہ آئے تیرا پیکاں ہے، جو آئے تو مرا دل ہے

یہ سب وہم و تخیل ہے، وگرنہ بات سچ یہ ہے
نہ کوئی چیز پیکاں ہے، نہ کوئی شے مرا دل ہے

دو شعر اور

ب عالم ہے یہ جس میں سفر بھی ہے حضر بھی ہے — یہ دنیا راستہ کا راستہ منزل کی منزل ہے

ان کل ابتدا کی تھی وہیں آج انتہا دیکھی — مآلِ زندگی میرے لئے تحصیلِ حاصل ہے

نئی نسل کا رجحانِ آزادی

(از جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی اے)

انسانی مدنیت کے اگر تاریخی دور قائم کرلئے جائیں اور اُن کی ارتقائی خصوصیات کا اندازہ کیا جائے تو تھوڑے غور سے معلوم ہوگا کہ ہر پہلا دَور دوسرے دَور کی روشِ زندگی کو کسی نہ کسی درجہ ضرور تبدیل کردے گا۔ یہ تبدیلیوں کا تسلسل خدا معلوم کب سے ہے اور کب تک رہے گا لیکن اسی سلسلہ میں اک عجیب خصوصیت انسانی ذہنیت کی یہ بھی نظر آتی ہے کہ ہر دور میں ابنائے زمانہ ان تبدیلیوں کے خلاف خاموش ناراضی کا اظہار ضرور کرتے رہے لیکن ان کی روک تھام اُن سے نہ ہوسکی۔ ہر دَور میں جدت پسند طبقہ کے ساتھ قدامت پسند بزرگ بھی ایسے موجود رہے جو موجودہ افتادِ زندگی کی بُرائیوں کو نمایاں کرتے رہے اور دَورِ گزشتہ کی خوبیوں کا اعتراف کرنا جنھوں نے اپنی اپنی وضعداری اور استقلالِ طبیعت کا مظاہرہ سمجھا۔ زمانہ کی نیرنگیاں اور اس کے ساتھ ساتھ خیال و مذاق کی تبدیلیاں اُن کی جمود پسند طبیعتوں کو مطمئن نہ رکھ سکیں۔ ان کے خیال میں گزشتہ انسانوں کی زندگیاں ہی نئی نسل کے لئے نمونۂ حیات رہنی چاہیئے تھیں۔ مستقبل کا تخیل اسی نسبت سے اُن کے لئے اور بھی زیادہ تاریک رہا۔

زمانہ کے متعلق جمود پسند طبائع کی یہ ستم ظریفی اُس انسان کے لئے جو کسی واقعہ کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتا یقیناً قابلِ افسوس ہونی چاہیئے۔ رفتارِ زمانہ کو مجموعی حیثیت سے بُرا سمجھنا اور مستقبل کے متعلق بدظن رہنا گویا خالقِ عالم کی وسیع قوتوں کی توہین کرنا ہے۔ ہاں اگر انسان اس صورت میں خود اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا نوحہ کرنا چاہتا ہے تو اتنا بے جا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تہذیب اور تمدنِ انسانی کا اگر ایک مکمل نمونہ بھی اصولِ اخلاق موضوعہ کے لحاظ سے بنا لیا جائے اور اس معیار کے لحاظ سے تہذیبی ارتقار کے ہر دور کا مطالعہ کیا جائے تو کوئی دَور بھی ایسا نہ ملے گا جو اپنی کمزوریوں

اور خامکاریوں کو کسی نہ کسی درجہ میں نہ ظاہر کرتا ہو۔ کوئی زمانہ بھی اُس نصب العین کے ماتحت پورے حسن و خوبی کے ساتھ شمع راہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ہادیِ برحق کی تعلیم سے متاثر ہوکر کچھ عناصر سوسائٹی میں ایسے پیدا ہوگئے ہوں جن کی زندگیاں اخلاق و مذہب کے اعتبار سے نمونہ بن سکتی ہوں لیکن عام حیثیت سے کوئی دَور بھی شمع راہ بننے کا اہل نہیں اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر صاحبِ بصیرت انسان کا فرض ہے کہ وہ خیال کی غیر محسوس تاریکی سے نکل کر انسانی تہذیب کے موجودہ منظر کو۔ جو نوعِ انسانی کے سالہا سال کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ سراہے اور اس کا احساس کرے کہ انسان بحیثیت اجتماعی تنزل کی طرف نہیں جارہا۔ اور مستقبل کے متعلق ہمیشہ اک روشن نصب العین سامنے رکھے اس طرح طبیعتوں سے وہ جمود دُور ہوجائے گا جو انسان کی صحیح ترقیوں میں حائل ہوتا ہے اور ہمارے دلوں میں عالی اور برتری کی وہ اُمنگیں پیدا ہونگی جن میں ہماری حیات کا راز پوشیدہ ہوگا۔

زمانہ کی یہ شکایت سنجی جو حقیقتاً اپنی پستی کا اعتراف ہے اُن قوموں میں زیادہ دیکھی جاتی ہے جو پیکارِ حیات میں تساہل اور مردہ دلی کی زندگی بسر کررہی ہیں۔ مصروف اور مشغول قوموں کے افراد کو اتنی مہلت کہاں کہ وہ اس جمود پسندی کا اظہار زمانہ کی گلہ مندیوں سے کریں۔

ہندوستان جس دورِ حیات سے گزر رہا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بُرائیوں سے بَری اور خامیوں سے پاک ہے لیکن منازل ترقی کے لحاظ سے پھر بھی وہ گزشتہ دور پر ترجیح دیئے جانے کا یقیناً حق رکھتا ہے لیکن یہاں بھی وہ فرسودہ خیال بزرگ ناپید نہیں جو موجودہ روشوں سے نالاں اور پُرانے اور پامال طریقوں کی مدح و ستائش میں مصروف رہتے ہیں۔ یقیناً ان کی زندگیاں اسی غم باطل میں بسر ہوجائیں گی اور وہ زمانہ کی خرابیوں میں بخیال خویش ذرا بھی اصلاح نہ کرسکیں گے۔ اُن کی ناکامی کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ نفسیات کے بہت معمولی اصولوں کو نظر انداز کئے ہوئے نوعِ انسانی کے ذہنی تبدیلیوں کی اہمیت کو ہی نہیں سمجھ رہے۔ یہ تبدیلیاں اس قدر ناگزیر ہیں کہ چند انسانوں کی مخالف قوتیں آن کو روک نہیں سکتیں۔ عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان تبدیلیوں کو بھی اصول فطرت کے ماتحت سمجھ لیا جائے اور ان سے مقابلہ کرنے کی سعی لاحاصل میں پڑکر اپنی قوتوں کو نہ ضائع کیا جائے۔

اس اصول کے ماتحت ہندوستان میں جو ذہنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان میں ایک نمایاں چیز نوجوان طبقہ کا رجحانِ آزادی ہے۔ آزادی میں اس اعتبار سے کہتا ہوں کہ یہ طبقہ بہت سی خود ساختہ رسمی پابندیوں سے بے نیاز رہ کر اپنے مذاقِ طبیعت کی پیروی کرنا مقدم سمجھتا ہے۔ یہیں پر اس سے اور قدامت پسند طبقہ سے وہ سخت تصادم ہوتا ہے جس کے باعث بہت سے گھرانوں میں جنگ زرگری کے مناظر پیش ہیں۔ ساس بہو کی مخالفت ماں اور بیٹیوں کے خیال کا اختلاف۔ باپ اور بیٹے کے مذاق کا فرق۔ غرض ہر پچاس برس سے کم عمر کے انسان کا مستقل فرقِ خیال و مذاق۔ یہ سب اس تبدیلی کی اہمیت کو روز بروز واضح کر رہے ہیں۔

فرسودگی پسند طبائع آزادی پسند طبقہ کے اس رجحان کو ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھ سکتے وہ اس کو ایک بغاوت کا پیش خیمہ سمجھ رہے ہیں جس کے انسداد کا وہ اپنے آپ کو حقدار سمجھتے ہیں۔ اُن کو شکایت ہے کہ نوجوان طبقہ اپنے بزرگوں کی تقلید کیوں نہیں کرتا اور اُن کے نقشِ قدم کو مرحلۂ زندگی میں اپنا رہنما کیوں نہیں بنایا۔ کاش وہ تھوڑی سی بیدار مغزی کو کام میں لائیں تو اُن کو معلوم ہو جائے کہ ایسی کورانہ پیروی نسل انسانی نے کبھی نہیں کی اگر خود اُن کے بزرگ زندہ ہوتے تو اُن کو بھی یہی شکایت اُن سے ہوتی۔ ہر نسل اپنا طبعی رجحان اور مذاق زندگی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اور زندگی کے ماحول کو اسی کے مطابق بنالیتی ہے۔ اسی میں اپنے قوائے ذہنی کی تکمیل کرتی ہے انسان کی یہ ذہنی تبدیلی اک عالمگیر قانون کے زیر اثر ہے۔ کم و بیش ہر انسان میں ترقی کرنے کا جذبہ ہے اور وہ اُس کو اپنی حالت کے تبدیل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ کبھی ایک حالت پر قانع نہیں رہتا وہ بہتر سے زیادہ بہتر راستے کی طرف خود بخود بڑھ رہا ہے اور روشن سے روشن تر مستقبل کی طرف رہنمائی چاہتا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ فرسودہ خیال بزرگوں کا یہ شکوہ سنج طبقہ بھی تبدیلی کے اس ہمہ گیر قانون سے نہ بچ سکا۔ اُس کی بھی حالت اپنے بزرگوں کی حالت سے یقیناً مختلف رہی ہوگی اگر اس نے اس کا احساس نہ کیا تو اس کو کج فہمی پر محمول کیجے۔

انسانی تمدن میں تدریجی ترقیوں سے انسان کی ضروریاتِ زندگی میں وسعت پیدا ہو رہی ہے اور اُن ضروریات کی تکمیل کی غرض سے اس کے اشتغال اور مصروفیات میں اضافہ اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ اور ان اشتغال زندگی کے ساتھ اس کے افکار ذہنی کا ترقی پزیر ہونا بھی بالکل یقینی ہے۔ یہی افکار و خیالات اپنی نوعیت کی اختلاف کے لحاظ سے اس کے طریقۂ زندگی پر اور اس کے عام اخلاق پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔

جن مراحل زندگی سے یورپ گزرا یا گزر رہا ہے اُن میں سے ایشیا کو گزرنا ناگزیر ہے۔ یورپ سے قریب ترین ایشیائی
ممالک کی زندگی میں جو انقلاب ہو رہے ہیں وہ اس راستہ کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں جو اچھا ہو یا بُرا لیکن ایک
راستہ ہے جس پر نوع انسانی چل رہی ہے اور جو دنیا کی متمدن اور مہذب قوموں کی شاہراہ ہے۔

ہندوستان جب تک دل چاہے پرانی زندگی کی داستان بارانہ دہرایا کرے اور "مشرق مشرق ہی ہے
مغرب مغرب ہی ہے" کے بے معنی اصول کو پیش نظر رکھے لیکن دوربین نظریں دیکھ رہی ہیں کہ مشکل سے دو صدیاں
گزریں گی اور ہندوستان بھی تہذیب اور تمدنِ جدیدہ کی تمام رعنائیوں سے ہم آغوش ہوگا۔ اس وقت موجودہ قدامت
آشنا بزرگ اطمینان سے قبروں میں سو چکے ہونگے اور چند شکوہ زن آوازیں بھی لوگ نہ سنیں گے وہ ہوگی دورِ حیات
کی مکمل تبدیلی۔

قدیم و جدید زندگی کے فرق کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اس کے حسن و قبح پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ
رسمی نقطۂ نظر سے حسن و قبح کے الفاظ کو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی کمزوریاں جن کا بدیہی احساس
ہوسکتا ہے اُن کو دور کرنا ہر ترقی پذیر دماغ کا اولین فرض ہے۔ کمزوریوں کا احساس جب ہو جائے تو اُن کی اصلاح بھی
آسان ہے۔ یہ اصول ہر وقت قابل عمل ہے اور اس پر ہم اپنی زندگی کی لطافتوں کو صدمہ پہنچائے بغیر بھی عامل رہ سکتے
ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم زمانہ موجودہ سے بیزار ہو جائیں بلکہ ہم اس کو کمزوریوں سے پاک کرنے کی کوشش کریں
پس پا افتادہ زمانہ ہمارا مطمح نظر نہ ہو بلکہ ترقی کا ایک روشن نصب العین ہمارے سامنے ہو۔

موجودہ زمانہ میں خیال و مذاق کی تبدیلیاں کچھ جدید الفاظ بھی اپنے ساتھ لا رہی ہیں۔ وہ الفاظ جن سے
ہمارے بزرگ ناآشنا تھے اور اس لئے اُن کی لطافتیں بھی اُن کے لئے بے معنی تھیں یا یوں کہئے کہ چونکہ اُن کے احساسات
غیر ذکی تھے۔ اس لئے اظہارِ مدعا کے لئے وہ معمولی الفاظ سے بھی قناعت کر سکتے تھے۔ اُن الفاظ میں سے انگریزی کا
ایک لفظ (
) رومانس ہے جس کا معنوی ترجمہ باعتبار اپنی کیفیات کے "لطف حیات" یا

نشاطِ زندگی" بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تمام ہنگامہ آرائیاں جن کا مفہوم اس لفظ سے ادا ہوتا ہے۔ دن بدن زندگی بن بڑھنا چاہتی ہیں۔ "رومانس" کے لطیف کیفیات کی تلاش انسانی جذبات کی نزاکت اور ترقی پذیر رنگینی کا اظہار ہے۔ یورپ میں ہر مرد اور عورت کی زندگی میں ایسا دَور آنا ضروری ہے جس میں وہ "رومانس" کے زندگی بخش مراحل سے گزرتا ہے اور وہ سب کیفیات اپنے قلب میں محسوس کرتا ہے جو حسن و عشق کے ارتباط سے پیدا ہوتی ہیں۔

"رومانس" کو شباب سے یقیناً گہرا تعلق ہے لیکن ہر "شباب" "رومانس" کا اہل ہے؟ یہ نہیں کہا جا سکتا "رومانس" کی لطافتوں سے کیف حاصل کرنے کے لئے ایک وجدانی ذوق کا ہونا ضروری ہے اور وہ شباب جس میں زہدِ خشک "عقل مصلحت اندیش" کی "بدتوفیقیاں" شامل ہو جائیں۔ اس کا اہل نہیں رہتا۔

بہرحال ہندوستان کے نوجوان طبقہ میں جو مغربی تعلیم سے متاثر ہو رہا ہے "رومانس" کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ ناولوں کی کثیر اشاعت شاعری کی طرف عام رجحان، افسانہ سے ایک عالمگیر دلچسپی۔ رسائل کے شیوع کی کثرت ادبِ لطیف کی فراوانی، اظہارِ خیال میں روز افزوں بیباکیاں، حجاب آمیز رسمیات کے خلاف خاموش جدوجہد پرانی جکڑبندیوں سے نکلنے کی کوشش۔ غرض ہر وہ تحریک جس کو آپ ضمیر کی آزادی سے تعبیر کریں۔ اس عنصرِ لطیف کے زندگی میں پیدا ہونے کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ ہندوستان کا شرمیلا نوجوان۔ یورپ کے بیباک فرد کی طرح آزادیِ پرواز چاہتا ہے۔ اس کو بھی دل میں سونے والے خاموش جذبات کا احساس ہو چلا ہے اور وہ ان جذبات کی ہنگامہ خیزیوں کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔

حالات بتا رہے ہیں کہ پرانی مشرقی روایات نوجوان طبقہ کے اس جوشِ خیال سے متصادم ہو کر ایک صدی بھی مشکل سے زندہ رہیں گی اور نتیجہ اس تصادم کا اخلاقی اعتبار سے کیا ہوگا۔ وہی جو عام طور سے اعتدال و افراط کی کشمکش کا ہوا کرتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قدیم و جدید خیال میں کوئی نمایاں تصادم نہ ہو۔ پرانے خیالات کے لوگ جب تک زندہ رہیں اپنی خصوصیات کو لئے رہیں اور دوسری نسل رفتہ رفتہ افتادِ زندگی کو بدلتی رہی اور تقلیدِ مغرب کی ولولہ انگیزیوں سے مغلوب ہو کر وہ زندگی یکبارگی نہ اختیار کرے جس کی کرشمہ سازیاں نظر افروز تو ضرور ہیں لیکن جو خطرات سے بھی خالی نہیں۔

حسن وعشق کی نیرنگیاں اگر اپنے ساتھ بداخلاقیوں کو لائیں حمیتِ قومی، غیرتِ نفس کو فنا کردیں۔ مردوں سے
یت اور عورتوں سے شرم وحیا کو مٹادیں تو سوسائٹی کے لئے ایک اخلاقی تباہی کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہیں ہندوستان
ں قدر مرد اور عورت کا ارتباط باہمی بڑھے گا حسن وعشق کی کارفرمائیاں ترقی کریں گی، رسمی قیود کم ہوتی جائیں گی
رومانس" کے لطیف عناصر بہ نا طریقہ پر اپنا کام کریں گے لیکن یقینی ہے کہ اگر مذہبیت اور اخلاقِ عامہ
ں پذیر ہوا تو ہندوستان کو بھی جلد ہی ان آفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جن سے آج یورپ جنگ آزما ہے
ی کے اس رجحان اور ہوا کے اس رخ کا مقابلہ تعصب اور فرسودگیِ خیال کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ قید اور
سے اخلاق کی تربیت صحیح نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اگر اس کا مقابلہ ناعاقبت اندیشی کے ساتھ کیا گیا تو
ن صبغہ افراط وتفریط کی گمراہیوں میں نہ مبتلا ہوجائے۔ لیکن ہاں رجحانِ آزادی کے اثراتِ بد سے تحفظ ممکن
ورنہ اس صورت میں کہ والدین اپنے بچوں کی تربیت میں انتہائی آزاد خیالی اور وسیع النظری کو کام میں
، ضروریات زمانہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر اُن کی تربیت صحیح اصول پر کی جائے اور مذہبیت اور اخلاق
اُن میں کافی طور پر پیدا ہوجائے تو وہ زندگی کے مکروہات میں گھر کر بھی اپنے اخلاق اور اعمال کی حفاظت
ں گے اور تربیت کی آزادی سے جو اعتمادِ نفس ان میں پیدا ہوجائے گا۔ وہ اُن میں بغاوت کی روح نہ پھونکے گا
ں کی تعلیم وتربیت کے ساتھ لڑکیوں کی نشوونما بھی انھیں اصول کے ماتحت کی جائے اور اُن کو بھی اپنی حفاظت
یں قدرت رکھنے کے قابل کردیا جائے۔ اُن کو ایک سکنڈ کے لئے بھی اس کا احساس نہ ہو کہ اُن کی عفت و
ت صرف اس لئے محفوظ ہے کہ مرد ان کی محافظت کررہا ہے اور وہ چہار دیواری کی پناہ میں بیٹھی ہوئی ہیں بلکہ
اخلاقِ انسانی کی صحیح عظمت کا احساس ہو۔ اُن پر اعتماد کیا جائے اور وہ بھی دوسروں پر اعتماد کریں۔

شادیوں کے معاملات والدین کے حسنِ انتخاب کے ساتھ اگر طرفین کی منشاء اور مرضی بھی شامل ہو اور اُن کی
، کا پاس کیا جائے تو ہر ازدواجی زندگی میں وہ مسرت پیدا ہوسکتی ہے جس کا تعلق "رومانس" سے ہے۔
محبت میں اگر بداخلاقی اور کریہہ نفسانیت کی آمیزش نہ ہو تو وہ یقیناً پُرکیف ہونی چاہیئے۔ کیا قباحت ہو
ت کے رشتہ میں وابستہ دو ہستیوں کو اس آسمان کے نیچے ہی متحد کردیا جائے اور یہیں پر ان کی روحانی

مسرتوں کی تکمیل ہو جائے لیکن اس نقطہ پر قدامت اور جدت کی کشاکش صاف نظر آتی ہے۔ ایک فرسودہ خیال انسان دو ہستیوں کے مابین شائبۂ انسیت بھی پاتا ہے تو اُن کا سخت ترین دشمن ہو جاتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش ہو کہ ان بدقسمت انسانوں کو ناکام محبت کی تلخ کامیوں کی نذر کر دیا جائے ؎

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

کا زریں اصول ہر زمانہ میں قابلِ عمل رہے گا۔ عافیت کی صورت یہی ہے جذبات کو پامال کرکے خاطر خواہ اصلاح نہیں ہو سکتی۔ صرف ایسا ماحول پیدا کر دینے کی ضرورت ہے جس میں پاکیزہ خیالات اور ستھرے جذ[بات] پیدا ہوں۔ کیوں نہ قدامت اور جدّت میں ایک پُرامن مفاہمہ کر لیا جائے

غزل

تجسس سے تو کیا ملتا یہ کب تا حدِ امکاں تھا
کہ تیرے بعد کا باعث ترا قربِ رگِ جاں تھا

دلِ ایذا طلب چشمِ حیا پرور سے حیراں تھا
کہ ہر تیرِ نظر اپنے نشانے سے گریزاں تھا

مرے خونِ تمنا پر نہ اک تو ہی پشیماں تھا
ترے ترکش میں جو ناوک تھا وہ سر در گریباں تھا

سحر ہوتے ہی کیا جانے یہ کیسا انقلاب آیا
شبِ وعدہ یہی دل تھا کہ جولانگاہِ ارماں تھا

جِلا ہوتی ہے استعداد پر گوشہ نشینی سے
گُہر ہونے کو مدت تک صدف میں آب پنہاں تھا

کسی کے روبرو کچھ بھی نہ گو ہم کہہ سکے لیکن
وفورِ شوق کا عالم خموشی سے نمایاں تھا

کوئی حد بھی ہے اس وسعت کی اے ناکامیِ وحشت
جنوں بڑھتے ہی ہر تارِ گریباں میں گریباں تھا

دلِ مرحوم بھی کیا رند مشرب تھا خدا بخشے
جو بت خانے میں ہندو تھا تو کعبے میں مسلماں تھا

غلط تھی ضبط ان میں عاشق و معشوق کی نسبت
کہ جل بجھنے میں پروانہ حریفِ شمعِ سوزاں تھا

مولوی ابو محمد متعلم ایل ایل بی فائنل کلاس صنبا[؟]

افکارِ شوق

(از جناب مولوی محمد حسن صاحب شوق)

دنیائے محبت نے جب اپنی بنا ڈالی — ان حسن پرستوں کی تقدیر مٹا ڈالی

اک ہستی باطل ہے دنیا جسے کہتے ہیں — اس نقش خیالی نے کیا دھوم مچا ڈالی

اربابِ وفا سے بھی بیشک انہیں نفرت ہے — خاکستر پروانہ محفل سے اٹھا ڈالی

اے دل ہے فقط تو ہی پابندِ وفا اب تک — سب اہل جہاں نے تو یہ رسم مٹا ڈالی

کب پھول چڑھاتے وہ تربت پہ مری آ کر — اک خاک کی چٹکی بھی لے کر نہ ذرا ڈالی

ہوتی ہے کسک دل میں اک درد سا ہوتا ہے — یہ ترچھی نظر کس نے پھر نام خدا ڈالی

شیون سے ترے دق ہیں سب اہل جہاں ظالم
دنیا ترے نالوں نے اے شوق ہلا ڈالی

اقرار محبت

رات آدھی سے زائد گزر چکی ہے۔ اندھیرا چاروں طرف چھایا ہوا ہے۔ تمام دنیا ایک سنّاٹے کے عالم میں محو حیرت بنی ہوئی
ہے۔ درختوں کا پتّا پتّا میٹھی نیند سو رہا ہے۔ سرد ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کبھی کبھی سنسناہٹ پیدا کردیتے ہیں۔ پھر وہی خاموشی
اور وہی تاریکی۔ انسان تو انسان پرند بھی پر نہیں مارتا ہے۔ ایک پہاڑی کے اوپر گو مختصر لیکن خوش نما مکان بنا ہوا ہے
مکان کے سامنے ایک بڑا تالاب ہے جو کہ رات کی سیاہ چادر اوڑھے اپنے خیالات میں غلطاں اور پیچاں ہے۔ سطح آب کی خاموشی
بھی کوئی بیتاب مچھلی تڑپ کر توڑ دیتی ہے۔

مکان کے بالائی حصے میں ایک آراستہ کمرہ ہے جس میں لکھنے کی میز پر لیمپ رکھا ہے۔ جس کی دھیمی روشنی کمرہ میں
اُجالا کررہی ہے۔ ایک طرف کھڑکی کی جانب پلنگ بچھا ہوا ہے جس پر ایک نازک اندام لڑکی جس کا سِن مشکل سے چودہ پندرہ
برس کا ہوگا سونے کے ارادہ سے بال کھولے ٹانگیں لٹکائے خاموش بیٹھی اور کچھ اپنے دل سے اُدھیڑبن میں مصروف
اس کی ٹھوڑی اس کے ہاتھوں کے اوپر جھکی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں بہار کی تاریکی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں
اس کا دل ڈری ہوئی بلّی کی طرح آہستہ آہستہ حرکت کررہا ہے۔ اس کے لمبے لمبے اور کالے بال شانہ اور رخسار پر
بے پروائی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں۔

اے بھولی لڑکی! تیرے ننھے سے دل پر کیا صدمہ گزرا کہ تو یوں اکیلی بیٹھی سوچ رہی ہے۔ تیرا دماغ اس لئے
نہیں بنا ہے کہ دنیا کے اہم مسئلوں پر غور کرے۔ تیرا نازک جسم تکلیف اُٹھانے کے لئے نہیں بنا ہے۔ تیرا دل صدمہ
اُٹھانے کے قابل نہیں ہے۔

ہاں دیکھو! اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اس نے آنکھ اُٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک سرد
آہ بھری جس کے ساتھ گراں قیمت الفاظ نکلے: **"اُف رے محبت"**

راقم

"ع"

تاریخ قنّوج کا ایک خونی ورق

(سید احمد علوی قادری علیگ)

آج سے ساڑھے سات سو برس قبل کا ذکر ہے شمع خلافت کا آخری باوفا پروانہ مستظہر بغداد میں رونق افروز ہے۔ الف لیلی کے جان عالم کو دنیا کو خیرباد کئے ہوئے تین صدیوں سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے۔ فاتح سومنات کی وفات کو ایک سو چھبیس برس کی طویل مدت ختم ہو چکی ہے۔ ہیکل سلیمانی میں محاربات صلیبی کا دور دورہ ہے۔ بھارت ورش میں مہاتما بودھ کی وفات کو دو ہزار چار سو برس سے زیادہ عرصہ گزرا ہے۔ رامائن اور گیتا کی واجب التوصیف اور شاندار روایات فراموش کی جا چکی ہیں۔ تمام خطۂ عالم سیاسی ارتقائی انقلابات کا تختۂ مشق بنی ہوئی ہے۔ دیکھنا چاہیئے اس وقت آریاورت کے سیاسی تماشاگاہ میں کون سا نظر فریب ناٹک ہو رہا ہے۔

(۱)

صلیب آتشیں مغربی جانب پوشیدہ ہو چکی ہے۔ ہزارہا سورما راجپوت اپنی زرنگار تلواریں سونتے ہوئے قنوج کی راجدھانی میں نہایت فخر و مباہات سے گشت لگا رہے ہیں۔ دریائے گنگا میں کچھ لوگ اشنان کے لئے جا رہے ہیں۔ حسین دل فریب باعصمت دوشیزگان قنوج کا ایک پاک جھرمٹ قریب کے ایک مندر میں سرگرم عبادت ہے۔ یہ مندر واجب التقدیس رشی "شیو" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مندر میں صبح و مسا خوش آیند نغمات الاپے جاتے ہیں۔ تشنہ کامان حقیقت "محبت" کے لطیف جام سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ عشق کے دیوتا کرشن کا پیام معرفت ہر تشنہ دہن کو سنایا جاتا ہے۔ دور دور سے جاتری اس واجب التقدیس قربان گاہ پر حاضری دینا سعادت ابدی تسلیم کرتے ہیں۔ قنوج کی راجدھانی تمام کلیہ ہند کے شمالی حصہ میں بہت مبارک اور اس کا قلعہ بہت مشہور سمجھا جاتا ہے۔ راٹھور راجپوت اپنے راج کا مبارک اور قابل ستایش مقام سمجھتے ہیں۔ زمانہ کا انقلاب

دیکھئے۔ قنوج وہی قنوج جس کی عظمت پارینہ کی داستانیں ہم سب کو ششدر رہ جانے کے لئے کافی تھیں آج ایک معمولی قسم کا قصبہ ہے تحصیل بھی۔ لیکن اُس کا نقشہ اُس کی معاشرت کا طریقہ اس کی حالت کا طرز اور اس کی ضروریات کا وتیرہ سب بدل گیا ہے ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

(۲)

سن بکرمی کا سولہ سو اکتیس ۱۶۳۱ سن مسیحی کا گیارہ سو پچھتر ۱۱۷۵ ہے اور شارع اسلام کی ہجرت کو ۵ صدیوں کا طویل زمانہ ختم ہوا ہے۔ قنوج کی راجدھانی پر خاندان راٹھور کا چشم و چراغ، رشک اسلاف راجہ جے چند رونق افروز ہے امن و امان ہر جگہ ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا ایک کامیاب راجہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ راجگان بھارت اُس کے عقیدت کیش ہیں۔ اس کی شجاعت کے سامنے گردن اطاعت خم کرنا عزت تصوّر کرتے ہیں۔ اُس کے پرجوش ولولے اور باعظمت حوصلے یقیناً قابل توصیف ہیں۔ دور آخر کے چند ناگفتہ بہ الزاموں کے بدنما داغوں سے اُس کا دامن آلودہ ہو گیا ہے قدیمی خانگی خصومتیں چوہان خاندان سے چلی آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے پہلو میں ایک غیر معمولی پرجوش قلب کا مالک ہے۔ کائنات اسی بے باک طبیعت کی مقتدر بالذات ہستیاں ہر دور میں پیدا نہیں کرتی قنوج کو اپنے اولوالعزم بادشاہ کا مسکن ہونے پر فخر ہے اور بجا فخر۔ نہیں آہ! کیا یہ وہی قنوج ہے جہاں آج گرے ہوئے محلوں کے نشان اپنے باوقار مکینوں کی یاد مرحوم کو تازہ کرنے کے لئے اب بھی موجود ہیں۔ چپہ چپہ بے کسی و حرمان کا مدفن ہے۔ اور کونہ کونہ "ہو" کے مقام سے زیادہ سنسان ؎

ہر ایک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

(۳)

قنوج کی شبستانِ نازہی چمنستان حیات ہے اور سحرستانِ عیش اور اس بہشت ارضی کی زندہ حور۔ راجہ جے چند کی اکلوتی حسین و جمیل راجکماری سنجوگتا۔ وہ ایک غیر معمولی حسن کی مالک ہے۔ اپنے زمانہ کے چند اُن منتخب

حسین ہستیوں میں تصوّر کی جاتی ہے کہ جن کے حضور میں دنیادی قوتوں کا جھک جانا ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے حسن بے حجاب کی تنویر۔ تجلی بند رابن کا شیرازہ حسن صورت کی حد کمال کا مکمل نمونہ۔ دل ربائی اور دلبری کا آئینہ حسن نسوانی کی مکمل تصویر۔ دل فریبیوں اور رعنائیوں کا ایک دل کش مجموعہ کہا جائے تو بجا ہے۔ شعراء کا کلام اُس کے عالم سوز حُسن کے غیر فانی تذکروں سے مملو ہے۔ قنوج والوں کا خیال ہے کہ راجکماری سنجوگتا کے مقابلہ میں موہنا کی ملاحت عذرا کی صباحت لبنیٰ کی رعنائیت سلمیٰ کی نزاکت اور شکنتلا کی نفاست کو وہی نسبت ہے جو فانوس برقی کو قمر سے بلکہ ایک ستم ظریف تو اس حد تک سنجوگتا کے حُسن نسوانی کا معترف ہے کہ اُس کا مقابلہ کرنا یا کسی دوسری دوشیزہ حسین ہستی سے نسبت دینا فطرت کی تحقیر و تضحیک خیال کرنا ہے۔

(۴)

شب کی خاموش گھڑیاں ہیں۔ اور تمام کائنات پر ایک خواب آسا سکون مسلّط ہے بشبستان ناز میں ہَل چَل ختم ہو چکی ہے۔ سہیلیاں سلام شبی کے بعد رخصت ہو گئی ہیں سنجوگتا اس وقت خدا معلوم کیوں اداس معلوم ہوتی ہے۔ گلاب آسا رخساروں پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہیں۔ خمیدہ صراحی دار گردن زمین کی طرف جھکی ہوئی ہے۔ حنائی ہاتھ سر پر ہے۔ رنج و یاسیت کا غلبہ غالب ہے۔ کسی بہت سخت رنج کے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ سنجوگتا کو اس حالت میں بہت عرصہ گزر گیا۔ اُس کی رشک نرگس آنکھیں خمار خواب سے آج نہ معلوم کیوں بیگانہ ہیں۔۔۔ آہستگی سے دروازہ کھلتا ہے۔ سنجوگتا ہوشیار ہوتی ہے اور اپنے سامنے اپنی رفیق طفلی "انسویا"، کو دیکھ کر محوِ حیرت بن جاتی ہے۔

انسویا:۔ سرکار دیبی جی کی دیا ہو۔ آپ کیسی ہیں .... ؟

سنجوگتا:۔ تم کیسے آئیں۔ اور کب ؟

انسویہ:۔ سرکار میں بہت دیر سے آئی ہوئی تھی اب دوبارہ کواڑ کھولنے گئی تھی اُس وقت آپ نے مجھ کو دیکھا میں پریشان ہو گئی تھی۔ آخر سرکار کیا معاملہ ہے۔ مجھ کو تو بتلائیے .... ؟

سنجوگتا:۔ کچھ دل چسپ باتیں کرو۔ تاکہ میرا غم غلط ہو۔ کیا میں کچھ غمگین معلوم ہوتی ہوں ؟

انسویہ:۔ سرکار لکشمی دیبی کی آپ پر دیا ہو۔ آپ تو بالکل بدل گئی ہیں۔ میں آپ پر قربان ہو جاؤں۔ کیا آپ مجھ سے

بھی کچھ چھپائیں گی ....؟

سنجوگتا :- تم میری بچپن کی راز دار ہو ——— لیکن تم اس راز کو ضرور پوشیدہ رکھنا۔

انسویہ :- میرے ماتا پتا آپ پر قربان ہوں ——— کہیں ایسا بھی میں کر سکتی ہوں ......

سنجوگتا :- مجھ کو معلوم تھا صرف میں نے احتیاطاً کہہ دیا تھا۔ تم جانتی ہو پتا جی "راجہ سایا" کی رسم ادا کرنا چاہتے ہیں۔ تمام راج کماروں کو نویدن بھیج دیا گیا ہے۔ اس سمے سب حاضر ہوں گے .... ماتا جی نے بھی مجھ سے کہا ہے کہ میرا "سوئمبر" بھی اُسی دن رچایا جائے گا۔ .. (فطرتاً راج کماری اس جملہ سے شرمندہ ہوگئی) .... اس خبر نے مجھے پریشان کر دیا ہے .... رونا شروع کر دیتی ہے ......

رفیق طفلی اپنی راج کماری کے آنسو پونچھتی ہے اور متعجب ہو کر کہتی ہے۔

" راجکماری ...... اس میں کیا عجیب بات ہے ...... آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کے پیروں میں عنقریب "پتی برت" کی زنجیر پڑے گی۔ .... رام چاہیں تو یہ "سنجوگ" ادتم ہوگا .... ہاں پتا جی اور ماتا جی کی جدائی سے آپ کو ضرور افسوس ہوگا۔ لیکن یہ افسوس کوئی نیا نہیں ہے .... کیا با عصمت سیتا جی کو یہ دن دیکھنا نہیں پڑا تھا .... ؟"

سنجوگتا :- .... انسویا .... مجھے پریشانی ان خیالات کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ رنجیدہ اس سے ہوں کہ اپنے حسب مرضی "سوئمبر" میں بر تلاش نہ کر سکوں گی ....

انسویہ :- راج کماری ...... برمالا آپ کے ہاتھ میں ہوگا .... سورما سے سورما۔ پوتر سے پوتر۔ اُتم سے اُتم حسین سے حسین راج کمار آئے ہیں۔ جس کو پسند کیجئے "برمالا" اُس کے گلے میں ڈال دیجئے گا۔

سنجوگتا :- کیا "بھارت ورش" میں ایسا بھی کوئی راج کمار ہے .... کہتے کہتے زبان رک گئی شرم سے آنکھیں جھک گئیں ....

انسویہ :- ..... راج کماری ...... مجھ سے شرم نہ کیجئے ...... کہئے کہئے ...... کون ؟ ......

راجکماری ... مشہوروں سے مشہور ...... سورماؤں سے سورما، بیروں میں بیر راجہ اجمیر و اندر پرست پرتھی راج — ——— کیا تم ایسی بھولی ہوگئی ہو کہ ایسا بڑا راج کمار "راجہ سایا" کی رسم میں حاضر ہوگا۔

کماری سنجوگتا کے لئے سوار پرتھی راج تمام مرد حرام ہیں ... میں اُس کی بہادری کی کہانیاں سُن چکی ہوں .....
ری" کے میدان میں کس بہادری سے ملکشوں کو شکست دے چکا ہے .... سُن لو۔ کوئی راج کمار سنجوگتا کے
ہیں ہاتھ سوا اُس پرتھی راج کے کوئی دوسرا نہیں لگا سکتا .... گنیش شی میری اس معاملہ میں سہایتہ کریں .....
انسویہ ... . رخصت ...."کل مندر" سے واپس آکر گفتگو کریں گے۔ ....

(۵)

اندر پرست کی راجدھانی ہے اور چوہان خاندان کا باعثِ فخر نازش اسلاف پرتھی راج سنگھاسن شہی پر
ن ہے۔ اعیان مملکت اور مشیرانِ سلطنت قرینہ قرینہ سے آداب شہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مودب بیٹھے ہیں۔
تمام نفاستوں - آرائشوں اور شاہانہ وقار کا ایک مستقل قابل یادگار تصویر بنا ہوا ہے قدم قدم سے ترقیت
مر غالب معلوم ہوتا ہے۔ راجہ پرتھی راج فخر خاندان چوہان ایک نہایت بیش قیمت تخت پر ہر ممکن شان و شوکت
ائز ہے۔ قیمتی و درخشندہ جواہرات سے اُس کا ملبوس ضوفشاں ہے۔ ... آداب شہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے
یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ اُدھر نگاہ اُٹھا سکے۔ تمام بھارت ورش میں قنوج کی "راجہ سایا" کی رسم نے آگ لگا دی
.. اندر پرست کی مشہور راج گدی میں بھی اس مبحث پر گفتگو ہو رہی ہے۔ .. ..

(۶)

راجہ پرتھی راج کسی عمیق خیال میں مستغرق ہے ...... دربار عام برخاست ہو چکا ہے ..... دربار خاص کا
آگیا ہے ..... صرف خاص الخاص امرا، اور رؤسا اس دربار خاص میں شریک ہو سکتے ہیں .... دفعتاً
راج اپنے مشیر اعظم سے کہتا ہے۔

"....... رام سنگھ .... کچھ سُنا .... ؟"

سنگھ - ..... ان داتا .... جو حکم ....

راج: ..... قنوج کے راجہ راٹھور کا دماغ نخوت سے خراب ہو گیا ہے ...... اُس کو مجھ سے قدیمی
خاندانی خصومت ہے .... خصومت کی وجہ ..... وہی اجمیر کی گدی پر میری تخت نشینی ہے۔ اس کا پیام میرے
پاس راجہ سایا میں شریک ہونے کے لئے آیا ہے .... میری "اشو میدھ" کی رسم میں اُس کی اتنی ہمت تو نہ پڑی

کہ وہ قربانی کے گھوڑے کو روک لیتا.... اُس وقت سے وہ آتش حسد سے جل رہا ہے..... اُس موقع سے زیادہ
اور کیا میرے ذلیل کرنے کی ترکیب سوچی جا سکتی تھی.......
اس موقع پر شیر صفت پرتھی راج کہتے کہتے غصہ سے کانپ اٹھتا ہے۔ اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ
انتہائی غیض و غضب کی حالت میں کف جاری ہو گیا۔ آنکھوں سے جہاں سوز شرارے نکلنا شروع ہوئے۔ "رک کر،
اور بھی سُنا...... میرے انکار پر اُس نے میرا بُت بنانے کا ارادہ کیا ہے اور دربان بنا کر صدر دروازہ پر کھڑا
کرنے کا ارادہ رکھتا ہے.....

رام سنگھ:۔ ... مہاراج شاید اسی ضد کی وجہ سے شہاب الدین کے مقابلہ میں اس نے سہایتا نہ
کی تھی .... لیکن "کرتیکا" نے آپ کی فوج کو فتح عطا کی

دوسرا وزیر:۔ ... شاید مہاراج یہ "راجا سایا" کی رسم اشوامیدھ کی رسم کے مقابلہ میں منائی جا رہی ہے
پرتھی راج ... رام سنگھ ... تم میری ہمراہی میں محل چلو کچھ ضروری گفتگو کرنا ہے۔ دربار خاص برخاست
کیا جاتا ہے۔ اور رام سنگھ مہاراج کے ساتھ محل میں داخل ہوتا ہے۔ ..

(۷)

رات کے سنسان اوقات ہیں۔ محل خاص میں مشیر سلطنت رام سنگھ دست بستہ خدمت میں حاضر ہے پرتھی راج
مسند شاہی پر متمکن ہے.... ....

مہاراج . رام سنگھ!

رام سنگھ:۔ ..... ان داتا .. حکم ...

مہاراج:۔ میں نے طے کر لیا ہے۔ جے چند کو اس کی اس حرکت کی عین اُس کے دربار میں سزا دوں۔ راجا یہاں
میں حاضر ہوں...... اور شاید تم کو معلوم نہیں ہے۔ پرتھی راج کی خوبصورت راجکماری سنجوگتا کی رسم "سوئمبر"
بھی اُسی دن ہوگی...... عین سوئمبر کے دن اس راجکماری کو بہادری سے بھگا لاؤں .... اور قنوج
کے راجہ کو اس سے زیادہ ذلیل کرنے کا اور کیا موقع ملے گا۔

رام سنگھ:۔ جان بخشی ہو تو عرض کروں......

راج:- اجازت ہے۔

سنگھ:- اس جنگ میں بڑی خرابیاں معلوم ہوتی ہیں۔ خون کی ندیاں بہیں گی۔ کاروبار بند ہو جائے گا
جانیں ضائع ہوں گی . . . اور سنا ہے شہاب الدین غوری پورے ساز و سامان سے حملہ کی
تیاری کر رہا ہے . .

راج:- چاہے انجام کچھ بھی ہو . . . چوہان راجہ زبان کا دھنی ہے جو وہ کہہ چکا ہے وہ کر کے چھوڑیگا۔
مجھ کو یا شاہ کی پرواہ نہیں ہے۔ سچ بات یہ ہے۔ میں سنجوگتا سے عشق رکھتا ہوں۔ اور اس محبت کے
انعام کو قنوج کے تاریخی میدان میں سرزمین عشق کی قربان گاہ پر حسن کی پاک بھینٹ چڑھاؤں گا۔
یا تو اس "کنول" کو سمندر سے لاؤں گا یا خود اسی کوشش میں سنجوگتا پر قربان ہو جاؤں گا . . . . آریا ورت
کے سورما میری سہایتہ کریں گے۔ اور میں کامیاب ہوں گا۔

(۸)

فرشتہ جمال اپنی انتہائی رعنائیت سے کائنات کے ذرہ ذرہ کو منور بنا رہا ہے۔ شب کے درمیانی خاموش لمحات
قنوج کے در و دیوار پر مکمل سکوت مسلط ہے۔ شور شغب جو دن کے لئے مخصوص ہے ختم ہو چکا ہے۔ والیان
ست کے خیمے دور تک پڑے ہوئے ہیں۔ یہ خاموشی کسی وقت سنتریوں کے تحکم آمیز للکار یا بھاری قدموں سے
ہوتی ہے۔ اور دوبارہ مکمل خاموشی چھا جاتی ہے۔ وحوش و طیور بھی اس وقت اپنے اپنے آشیانوں میں محو خواب ہیں۔
جانب دریائے گنگا میں شاہی تمکنت سے خاموش بہہ رہی ہے ایسے خطرناک اوقات میں جب کہ کوئی ذی حیات
ہستی ست لطف اندوز نہیں ہو رہا ہے۔ اس وقت حیرت پہ حیرت۔ راجکماری سنجوگتا۔ قصر شاہی کے پائیں
میں فرشتہ جمال کی الوہیت زا شعاؤں سے مستفید ہو رہی ہے اس کا زرد بعض اوقات سفید چہرہ اور اس کا
عفیف صدہا خیالات کا آماجگہ بنا ہوا ہے چہرہ کا رنگ لمحوں میں متغیر ہو جاتا ہے . . . . . . اس حالت میں اس کو
قریب تمام شب گزر گئی کہ دفعتاً وہ کہنے لگی:-

"میں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر افسوس کوئی نتیجہ نہ نکلا کل آہ! معلوم نہیں۔ میری سوئمبر کی رسم
ادا ہو گی۔ کل "چوہان سورما بیر" معمولی سپاہی کے روپ میں آوے گا . . . . . کیا وہ مجھ کو

سے بھگا لے جاوے گا۔۔۔۔۔۔ ؟ کیا تمام بہادر راج کماروں کے مجمع سے تن تنہا مجھ کو لے جا سکے گا۔۔۔۔ کیا
بھارت ماتا کے لائق و بہادر سپوت جو کل جمع ہوں گے اُس کے مقابلہ کے لئے تیار نہ ہو جائیں گے۔۔۔ اگر
وہ قتل ہو گیا۔۔۔ (اس خیال کے آتے ہی دنیا اُس کی نظروں میں سیاہ ہو جاتی ہے) میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی
اندر میری مدد کریں گے۔ وہ مجھ کو ضرور لے جاوے گا۔ وہ بہادر ہے۔ ضرور کامیاب ہوگا۔ اچھا تو کل میں قنوج میں
رہوں گی۔ میرے ماتا پتا کل مجھ کو بھول جائیں گے۔ نہیں۔ روئیں گے۔ اُن کے کلیجے رنج و غصہ سے ٹکڑے
ہوں گے۔ چوہان راجہ پتا جی کا دشمن ہے۔ اب تو کچھ بھی ہو۔۔ میں پرتھی راج کے ساتھ ضرور جاؤں گی

اس قسم کے خیالات نے سنجوگتا کو پریشان بنا رکھا تھا۔ رات کی تاریکی سپیدی صبح میں بدلنا شروع ہوئی
شجر و حجر میں حرکت پیدا ہو گئی ۔۔۔۔۔۔ دریائے گنگا کا سکون دور ہو گیا ۔۔ اکاش کی دیبی کا رنگ و روپ
زائل ہونا شروع ہوا ہے دیبی جی کی اچھوتیاں اور کنواریاں بھی ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جاتی ہیں
سجا سجایا اندر کا اکھاڑا اکھڑتا ہے۔۔۔ فضائے بسیط میں نفیر شروع ہوتا ہے منظر لطیف کی خوبصورتی ان
لمحات عزیز کی تقدیس راج کماری سنجوگتا کی روح میں بالیدگی کا کام دیتی ہے ۔۔۔ نسیم سحری گنگا یا غسل کرکے آتی
ہے اور خوبصورت سنجوگتا کے ملایم بالوں سے کھیلنا شروع کرتی ہے ۔۔ پھر یہ عشق نواز لیکن معصوم طرز سنجوگتا کو چند
لمحات کے لئے غیر معمولی خوش بنا دیتا ہے اُس کے نورانی حسین مصحف پر تبسم کی بے پایاں موجیں نمودار ہوتی ہیں
اور کھلائے ہوئے "کنول" میں دوبارہ شادابی اور لطافت کے آثار رونما ہو جاتے ہیں ۔۔۔۔۔ اور وہ بے خود
ہو کر کہتی ہے :-

"۔۔۔۔ آخر آج وہ دن آ گیا۔۔ جب میرے مصائب ختم ہو جائیں گے۔ مسرت و اطمینان کی راہیں میرے لئے
کھل جائیں گی۔۔۔ میں اُس وقت کے لئے تیار ہوں ۔۔۔۔ تکالیف برداشت کروں گی ۔۔۔ جو میرے پتیم۔ میرے "سوامی"
(الفاظ استعمال کر کے شرمندہ ہوتی ہے) کو میرے لے جانے میں برداشت کرنے ہوں گے ۔۔۔ میں نے
سب کچھ طے کر لیا ہے۔"

راج کماری سنجوگتا اس قسم کے خیالات میں غلطاں پیچاں تھی کہ قرب و جوار کے صنمکدوں سے خوش آیند
سامعہ نواز ناقوسوں کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوتی ہیں اور ان محبت زا صداؤں سے سنجوگتا کا خود ساختہ

خیالی طلسم شکست ہو جاتا ہے اور یہ عشق نواز آوازیں صبح کی واجب التعظیم اور غیر فانی نورانی لمحات جن میں مبارکبادی کا شادیانہ خیر مقدمی سناتی ہیں . . ہاں اسی وقت سنجوگتا ایک خوفناک ارادہ کی تکمیل کی قسم کھاتی ہے اور قرنوں کی آوازیں اس کے اس ارادہ کی تکمیل کی قسم پر ——— لبیک کہتی ہیں . . . . . خوفناک عزم ! خوفناک ارادہ . . جس کے انجام سے غریب سنجوگتا مطلقاً بے بہرہ ہے اس کو کیا معلوم کہ سنجوگتا ہی آئندہ سیاسی تماشاگاہ میں " ہیروئین " بن کر تیرہ مختلف سلطنتوں کو تباہ و برباد کر کے مسلم سلطنت کے قیام کی زبردست محرک بنے گی ! کسی من چلے ستم ظریف نے خوب کہا ہے کہ :

" عشق کا دیوتا جب کسی پر اپنا تیر چلاتا ہے تو اُس کا نخچیر نابینا ہو جاتا ہے اور عقل و دلائل اُس کے لئے باطل ہو جاتے ہیں "

(۹)

آخر وہ یوم مقررہ آتا ہے جس کے انتظار میں صدہا راتیں فنا ہو ہو کر صبح کی سپیدی میں اور سیکڑوں دن مٹ مٹ کر شب کی سیاہی میں تبدیل ہو چکے . . . کہ " سوئمبر " کا وقت مخصوصہ قریب آتا ہے ۔ راجسایا کی رسم ادا ہوتی ہے مشرق سے سیمرغ آتشیں پر کھولے ہوئے نمودار ہوتا ہے اور نقارخانہ کا ناقوس کبیر اس رسم کی ادائیگی کا اعلان کرتا ہے ۔ . قنوج میں خوشی و شادمانی مسرت و انبساط معلوم ہوتی ہے ۔ غیر معمولی چہل پہل ہے ۔ ہر وفادار شہری اس شاہی خوشی میں حصہ لینا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے ۔ تمام شہر میں آئینہ بندی کا حکم ہو گیا ہے ۔ گلیاں سڑکیں اور کوٹھے پر مرد و ں . عورتوں بچوں سے پر ہیں ۔ ہر طبقہ کا اژدہام کثیر ہے ۔ تل رکھنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ رؤسائے عظام اور دیگر ممتاز ہستیاں دربار شاہی کی جانب افتخار آمیز رفتار سے جا رہی ہیں . . اُن کے لباس قیمتی جواہرات اُن کو دیگر انسانی ہستیوں سے ممتاز بنا دیتے ہیں ۔ دارالعوام سے محل سرا کے صدر دروازہ تک دورویہ شاہی فوج کا دستہ استادہ ہے ۔ سوئمبر کی پاک رسم اسی بڑے دارالعوام میں ادا کی جانے والی ہے ۔ شاہی فوج کے اسلحہ اور وردیاں اس قدر زرق برق ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں ۔ سواروں کے داہنے ہاتھوں میں ریشمی شاہی پرچم ہے جس کی کلغیوں پر طلائی نشانات بنے ہوئے ہیں جو مثل نجوم سماوی کے چادر کافوری سے ضوفشاں ہوتے ہیں !

(۱۰)

دارالعوام کے صدر دروازہ پر جہاں دو رویہ فوج کا دستہ ختم ہوجاتا ہے - ایک مجسمہ طلائی مخلوق کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا حاجب وش استادہ ہے - اس مجسمہ کے طلائی ہاتھوں میں عصائے شاہی ہے اور فرق پر تاج مجسمہ سے سلطانت ملنت اور شاہانہ اعزاز ٹپک رہا ہے - اور آنکھوں سے خوفناک حرارت آفریں جہاں سوز شعلے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مبصرینِ فن ناقدانہ حیثیت سے مجسمہ کو دیکھتے ہیں اور دم بخود ہیں .. بھارت ورش کے سورما سے سورما بیر بھی اس مجسمہ کے سامنے جاکر سہم جاتے ہیں.... اور آنے والے خطرات سے آگاہ ہوکر دم بخود رہ جاتے ہیں اور اپنی عزت کی خیر مناتے دارالعوام میں داخل ہوجاتے ہیں اور بعض سادہ لوح سطحی طبیعت والے محض حقارت آمیز تبسم سے "پرتھی راج" کہہ کر دروازہ سے گزر جاتے ہیں - ہاں یہ مجسمہ پرتھی راج چوہان کا ہے جس کے اعزاز اور خودداری نے کسی طریقہ سے اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ وہ "راجا سایا" کی رسم میں شرکت کرے اور نہ صرف شرکت بلکہ عقیدت مندانہ طرز سے اپنی خدمت پیش کرے ——— اس لئے راجہ جے چند نے اُس کا مجسمہ بنوا کر دربانی کی خدمت اُس کے لئے مامور کی تھی تاکہ اس طریقہ سے تمام راجگانِ بھارت کی موجودگی میں چوہان راجا کی کافی تذلیل ہو ——— لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ مجسمہ اپنی طلائی آنکھوں سے اس درباری شان و شوکت پر مسکراتا نظر آرہا تھا - اور مسکراہٹ اس قدر خوفناک تھی کہ اکثر راجگانِ ہند کانپ اُٹھتے ہیں حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مجسمہ بجائے آلہ تضحیک کے حقارت آمیز تبسم سے راجا جے چند کے درباری اعزاز و وقار پر متبسم ہے -

(۱۱)

اندرپرست کا راجا مدبر ہے اور جنگجو بھی فطرت سے ایک غیر معمولی سیاسی طبیعت لے کر پیدا ہوا ہے - اور ساتھ ہی ایک دردمند قلب کا مالک ہے - اُس کو جنگل کی سنسناہٹ، آگ کے خوفناک شعلوں اور لڑائی کے پرہیبت میدانوں میں بھی راج کماری سنجوگتا کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی محو نہیں ہوتا ہے - اس کو سنجوگتا سے محبت ہی نہیں بلکہ اب اُس کا عشق دیوانگی کا رنگ اختیار کرچکا ہے - اندرپرست کی گلیاں بادشاہ کے محبت کے افسانوں سے آشنا ہیں - اُس کی زندگی کا مقصد عظیم یہی کہا جاتا ہے کہ وہ قنوج کے تاریخی میدان پر حُسن و عشق کا آخری فیصلہ بیش قیمت

تلوار کی جھنکار سے کرنا چاہتا ہے۔ سنجوگتا کا اندر پرست کی رانی ہونا ایک ایسا ضروری واقعہ سمجھا جاتا ہے کہ جس کے بغیر بہادر چوہان کی زندگی رائیگاں ہے۔ سنجوگتا کا قنوج سے لانا سمندر سے موتی کا نکالنا۔ دہکتے ہوئے شعلوں سے کسی کو بچانا اور تلواروں کی تیز رفتار میں کسی سر کے سلامت رہنے سے کم نہیں ہے۔ لیکن راجہ پرتھی راج قول کا دھنی ہے۔ بات کی بات میں افواجِ شاہی کو قنوج کی طرف رُخ کرنے کا حکم نافذ کرتا ہے۔ اس نادر شاہی حکم سے اندر پرست کی زمین لرز جاتی ہے۔ بہادروں کے زہرے آب ہو جاتے ہیں اور تمام شہر میں سناٹا پھیل جاتا ہے۔ لیکن کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ باعظمت اور باہمت بادشاہ کے ارادوں میں مخل ہو کیوں کہ عوام الناس کا یہ خیال ہی نہیں بلکہ ایمان ہے کہ "راجا پرماتما کا اوتار ہے"۔ فوج قنوج کی طرف روانہ کی جاتی ہے اور راجا پرتھی راج بھی سپاہیوں کے بھیس میں سنجوگتا کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے قنوج کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

(۱۲)

دار العوام کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ راجہ سایہ کی رسم ختم ہو چکی ہے۔ ہال شریف اور بہادر راج کماروں سے پُر ہے۔ سورج بنسی اور چندر بنسی راجگان اختصاصی جگہوں پر دکھائی پڑتے ہیں۔ راجگان نگدھ، ندیہ، گور، کاشی، مالوہ، مارواڑ، پاٹلی پتر، انہلواڑہ اور کشمیر اپنی مخصوص جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُن کے سفید برف آسا قیمتی صافوں، خوشنما ہیروں اور بیش قیمت جواہرات کی آب و تاب سے تمام ہال جگمگا اُٹھتا ہے۔ سب سے نمایاں اور بلند مقام پر وسط میں قنوج کا راجا جے چند سنگھاسن شاہی پر متمکن ہے۔ اس وقت ہال میں ایک عجیب قیامت آفریں سکوت مسلط ہے۔ کہ وقت معینہ آتا ہے اور ایک گوشہ سے سامعہ نواز موسیقی کا ساز چھڑنا شروع ہوتا ہے۔ قرنوں اور ناقوسوں کی روح افزا صدائیں مجمع ساکن کو متحرک بنانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

ایک لطیف ترنم آمیز آواز سے موسیقی ختم کی جاتی ہے۔ ہال کے فضا معلق میں تخت شاہی کے عقبی حصہ سے مجازی پردہ ہٹنا شروع ہوتا ہے اور حُسنِ حقیقت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مخلوق کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے لئے طلوع ہوتا ہے۔ لوگوں کی نظریں اوپر اٹھتی ہیں اور حاضرین جوشِ مسرت سے بے تاب ہو جاتے ہیں۔

(۱۳)

حاضرین کی دعا سے فضا معطر مترنّم بن جاتی ہے اور راج کماری سنجوگتا پری وش نمودار ہوتی ہے "فطرت کی لاڈلی۔ کنوارپت کی رنگین ریشمی ساری زیب تن کئے ہوئے ہے" جس کا مطلا اور مذہب کام۔ تناسب اعضا اور وقت معینہ کی موزونیت اس وقت فوق البشر ہستی بنانے میں کامیاب ہو رہا ہے۔ اوّل تو اُس کی ہستی پاک صانع نے خزینۂ حُسن یوں ہی بنائی ہے کہ ایک عالم کو اپنی نظر غلط انداز کا محتاج پاتی ہے لیکن آج تو اس سادگی نے اُس کو بنی نوع انسان کی ممتاز پری پیکر قابل پرستش دیوی بنا دیا ہے۔ اکثر خوش عقیدت راج کمار تو یوں کہہ اُٹھتے ہیں "کہیں حُسن کے دیوتا نے تو اوتار نہیں لیا ہے"

(۱۴)

سکونِ مطلق دو رہوتا ہے۔ قرنوں اور ناقوسوں کی صدائیں سوئمبر کی مبارک گھڑی کا پتہ دیتی ہیں۔ وید مقدس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ارض قنوج اور علی الخصوص ہال کا ذرہ ذرہ الہامی کلمات سے محو ترنم اور فضاء عنبریں کا چپہ چپہ مصروف دعا ہو جاتا ہے نسیم قدسی کی سبک روی اور فضاء بہشتی کی عطر بیزی سے آکاس کے قدس نشیں اور ہال کے ساکنانِ ارضی بارگاہ ربوبیت میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ وید مقدس کی تلاوت کے بعد فضا بسیط معطر ہو جاتی ہے اور ایک خوشنما "برمالا" سنجوگتا کو دیا جاتا ہے اور یہ درخواست کی جاتی ہے۔

"سنجوگتا پرماتما تمھاری سہائتہ کریں جاؤ برتلاش کرو۔"

(۱۵)

راج کماری سنجوگتا حسن کی دیبی اس وقت "برمالا" کو اپنے ہاتھوں میں لئے ششدر کھڑی ہے۔ تمام مجمع کی نگاہیں بے تابی سے اُس کی طرف اُٹھ گئی ہیں۔ لیکن راج کماری کی متجسس پتلیاں جس کی متلاشی ہیں ابھی تک وہ نظروں سے اوجھل ہے۔ لمحات گزرتے ہیں۔ ہر راج کمار اپنی ہستی کو خوش قسمت تصور کرتا ہے اور "برمالا" کی امید موہوم رکھتا ہے لیکن یہ طلسم خیالی بہت جلد شکست ہو جاتا ہے۔ مجسمہ طلائی کے قریب کسی کی صدر دروازہ پر آہٹ معلوم ہوتی ہے راج کماری سنجوگتا کو حرکت ہوتی ہے۔ وہ تمام مجمع کا ایک شعریت آمیز جائزہ لیتی ہوئی ہال کے اس سرے سے مجسمہ طلائی تک جاتی ہے۔ "برمالا" دونوں ہاتھوں سے اوپر اُٹھاتی ہے! حیرت پر حیرت! راٹھور خاندان کے

یف میدان کے مجسمہ طلائی کے گلے میں سرمایۂ رشک "برمالا" راج کماری آویزاں کر دیتی ہے۔ نعرہائے تحسین
ہونے کے بجائے مجمع پر سناٹا چھا جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی متنفس حرکت کر سکے۔ قیامت ہو گئی مجسم
نی راج اپنی زرہ بکتر سے آراستہ ہال میں نمودار ہوتا ہے اور راج کماری سنجوگتا نظروں سے اوجھل!
سورما بیروں کا مجمع غضب آلود ہو جاتا ہے۔ جاں بکف پرتھی راج کی شمشیر میان سے باہر آتی ہی بدنصیب
ہزساکی خیر خواہی خود اُن کے حق میں مہلک ثابت ہوتی ہے۔ سر تن سے جدا ہوتے ہیں۔ متعدد راج کمار
ں عزیز جانیں قربان گاہِ حُسن پر بھینٹ چڑھاتے ہیں اور راج کماری سنجوگتا کے ارادے درجۂ تکمیل تک
وپہنچتے ہیں۔ اور تلواروں کی جھنکار میں وہ اندرپرست کی رانی تسلیم کی جاتی ہے۔

(۱۶)

والی قنوج کی اس سے زیادہ اور کیا ذلت ہو سکتی ہے پانچ دن تک فریقین کی فوجوں سے لاطائل
مابلہ رہتا ہے ——— راجہ جے چند اس ذلت کو برداشت نہ کرنے پر پربت پار سلطان سے امداد کا طالب ہوتا
ہے اور بنی عم کے خون کا خود پیاسا بن جاتا ہے۔ پربت پاری سلطان اپنی گزشتہ شکست سے بہت کافی شرمندہ
ہر بہت بڑے ساز و سامان سے مملکتِ ہند پر فوج کشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ وہ تائید غیبی سمجھ کر فوراً اپنی
ساکرِ اسلامیہ کا جایزہ لیتا ہے۔ راجا جے چند اُس بادشاہ کو قتل جے پال کی مانند محض مبلغ ہی سمجھتا ہے۔ اُس کا
ل ہے کہ دہلی اجمیر کے بعد وہ آریہ ورت کا مسلم الثبوت مہاراجہ تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے۔

(۱۷)

سلطان شہاب الدین تراوری کے تاریخی میدان میں خیمہ زن ہے۔ سن مسیحی کا گیارہ سو ترانوے اور حضرت سرورِ کائنات
وفات کو پانچ صدیاں گزر چکی ہیں ...... آج سلطان شہاب الدین جنگ گزشتہ کی شکست کا بدلا لینا چاہتا ہے۔ تلوار دل
آوازیں اور شہیدوں کی آخری صدائیں میدان کارزار کو مہیب اور خوفناک بنا رہی ہیں ... صبح سے شام ہوتی
لیکن فتح کسی طرف ہوتی نظر نہیں آتی ...... غوری اور ہندی فوجوں کا مقابلہ بہت زور و شور کے ساتھ ہو
شیر صفت پرتھی راج شجاعت و مردانگی کی تصویر بنا ہوا گھوڑے پر سوار تنہا افواج کا جائزہ لے رہا ہے میمنہ
میسرہ پر نئی تازہ دم فوج متعین کرتا ہے کہ شب کی سیاہی جنگ کے ختم ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ ... اور

دونوں فوجیں اپنے شہدا کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوتی ہیں۔

(۱۸)

آج کے دن کی عزیز ترین گھڑیاں رانی سنجوگتا کے "سوامی" کی حیات مستعار۔ نہیں نہیں خود اس کی نشاط ہستی کی آخری ساعتیں ہیں۔ عساکر اسلامیہ میں شب بھر بڑی بے چینی سے سپیدۂ سحر کا انتظار کیا جاتا ہے۔ تکبیر جلالی کفرستان میں اسلامی تخم کی کاشت کرتی ہے۔ سلطان شہاب الدین خود نماز پڑھاتا ہے اور شمع صبحی کی چادر ترسِ آغاز جنگ کا کام دیتی ہے ..... ہندی فوجیں عصبیت و مذہبیت کے خوفناک جذبات سے متاثر ہو کر سر بکف جان دینے کے لئے ہمہ تن تیار و منتظر نظر آتی ہیں ... شام ہوتے ہوتے رستم ہندی شیر صفت پرتھی راج پر جلاّد کی شمشیر برہنہ کی حرکت ہوتی ہے۔ بھارت ماتا ہاتھ پھیلاتی ہے۔ برہما آغوش محبت کھولتا ہے اور بکمبر اضطراب بحر حقیقت میں غرق۔ نوک شمشیر کی جھنکار سے صدائے حبذا بلند ہوتی ہے۔ اور ہر قطرۂ خون بھارت ورش کے مقدس ریزہ پر "پرتھی راج" کا معزز نام مرتسم کر دیتا ہے ...... ہ

اللہ رے سحر عشق کی حسن آفرینیاں   اک سوز کے لئے یہ محبت کا جوش ہے

(۱۹)

اندرپرست کے شاہی محلوں میں اداسی چھائی ہوئی ہے پرتھی راج کی موت کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ بجلی کی طرح عزت سے موت کی خبر پھیل جاتی ہے۔ رانی سنجوگتا اس خبر کو سنتی ہے اور رسم جوہر کی ادائیگی کی تیاری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ "آتشکدہ" تیار ہوتا ہے۔ شعلوں کی بلند آہنگی فضائے عرش سے گفتگو شروع کرتی ہے۔ قدسیاں قدس نشیں اس کیف پرستاری پر مبارکباد کے عقیدتانہ پھول نثار کرتی ہیں۔ ساکنان ارض ملکوتی دم بخود رہ جاتے ہیں۔ سکان ارضی اس خرد ربا واقعہ سے محو حیرت بنے ہوئے ہیں... اس سکون مطلق میں آہ خفی سے جس میں تبسم کی خفیف لہر موجود ہے زیور کی جھنکار بلند ہوتی ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اور موجودات کا چپہ چپہ اس پیکر خاکی کے ہوش پران ہمت پر لرزہ براندام بن گیا ہے۔ سقف لاجوردی کے صاف و شفاف پردوں سے صدائے آہ اور رگِ فانی کے ذرات سے آواز الحذر اٹھتی ہے۔ شجر و حجر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ فضائے بسیط میں خاموشی چھا جاتی ہے اور رانی سنجوگتا شوہر پرستی کے قابل قدر جذبہ کو حریم قلب میں پنہاں کئے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ آگ کے بلند شعلے چند قدم آگے سے اس شہید عظم کا استقبال کرتے ہیں اور بگولہ سما پانی نورانہ در سے مہکتا رہو جاتا ہے!

جان دے دی ترے کوچہ میں تڑپ کر آخر
ہوگیا خاتمہ بالخیر وفاداروں کا

(۲۰)

ب قنوج کی تاریخ خونیں کی آخری عبرت خیز لڑائی بھی سُن لیجئے۔ سلطان شہاب الدین کی شمشیر خارا شگاف اپنے ہی
ربن پر تیز ہوتی ہے۔ دن نہیں گزرے کہ عساکر اسلامیہ فصیل قنوج کا محاصرہ کر لیتی ہے۔ تکبیر کی پر ہیبت و باعظمت صدائیں
ند ہوتی ہیں فصیل کا دروازہ آہنی گرزوں سے توڑا جاتا ہے۔ "یا علی" کے واجب التعظیم نعروں اور اللہ اکبر اللہ اکبر
وش پرور صداؤں سے کفرستانِ قنوج گونج اُٹھتا ہے۔ بہادر جری راجپوت آخری حملوں میں ناکامیاب ہوتے
ہیں بچہ بچہ شاہی خاندان کا تیغ کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ خاندان راٹھور کا آخری نام لیوا حسرت سے ایک لطیف
ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے اور دفعتاً ارض قنوج اسلامی تکبیروں کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

مرقع بھارت کی سیر کیجئے۔ تاریخ راجپوتانہ اور واقعات اندرپرست کی ورق گردانی کیجئے شاہانِ مالوہ اور حکایات
میر کے صفحات کی چھان بین کیجئے لیکن قنوج کی تاریخ قدیم کے مطلع پر ظلمت کی ایسی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں کہ مستند
اریخ سے بھی صحیح تر واقعات کا پتہ نہیں لگتا ہے۔ عہد ماضیہ میں راجپوت خاندان اس پر حکمراں تھے۔ چاندنی کی
ٹھنڈی روشنی پورے طور سے پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ تاریکی کی گھٹا چھا گئی —— —— اور رہی سہی
ت بھی خاندانی نزاعوں کی کشمکش سے ہمیشہ اور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی اور "تہذیب غوری" اخلاقِ اسلامی
سعادت سے خوشنما پرچم کلیہ ہند کی کفرستان پر لہلہاتا نظر آنے لگا!

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

(ایک انگریزی مضمون کے تخیل کا ممنون ہوں)

مشیر

ایک ہندی مسلمان کا پیغام

غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے نام

شمعِ بزمِ حریت ۔ روحِ اخوت السّلام　　گوہرِ یکتائے دریائے شجاعت السّلام
بعدِ شامِ غم نویدِ صبحِ عشرت السّلام　　السّلام اے شانِ ترکی فخرِ ملت السّلام

ہے صدا ہم قوم کی گو بانگِ بے ہنگام ہے
سن ذرا اک بے نوا ہندی کا یہ پیغام ہے

آہ کیا بتلاؤں کیا تھا جس نے تڑپایا مجھے　　کس لئے یوں لب کشائی کا خیال آیا مجھے
تیرے ہم وطنوں کی بیداری نے چونکایا مجھے　　گاہ گرمایا مجھے اور گاہ شرمایا مجھے

خرمنِ صبر آخرش جل بجھ کے خاکستر ہوا
دل ہوا خوں خوں اشک ۔ اشک آنکھ سے باہر ہوا

بے شبہ خودداری ترکی کا تو مفہوم ہے　　سربسر راز جہاں بینی تجھے معلوم ہے
تیری ہستی یادگارِ شوکتِ مرحوم ہے　　ہند تجھ سے سرفروشوں ہی سے تو محروم ہے

جائے حیرت ہے جو یوں ملت کی ناکامی مٹائے
خود اسی کا ملک پھر تہذیب اسلامی مٹائے

زیورِ عوراتِ ملت نیم عریانی ہوئی　　رقص سے تفصیلِ شانِ حسنِ نسوانی ہوئی
یورپی ملبوس کی ہر سو فراوانی ہوئی　　خوب اے دریائے مغرب تیری طغیانی ہوئی

فیصلہ کرتے تھے جو مقسومِ غیر اقوام کا
وہ اُٹھاتے ہیں جنازہ حرمتِ اسلام کا

محترم ملبوسِ قومی رونقِ میدانِ جنگ　　وہ سراپا سطوتِ دیں! وہ کلاہِ لالہ رنگ
جس کے نظارہ سے ہلتا تھا دلِ اہلِ فرنگ　　ہاں بتا اے مردِ غازی! پیکرِ جوش و امنگ

کیا جہاں بینی نہاں اُس کے مٹا دینے میں تھی
کیا ترقی قوم کی اُس کے بھلا دینے میں تھی

آ علی گڑھ میں کبھی باغِ تتاری کے نہال!　　اپنی یونیورسٹی میں آ کے دیکھ اس کا جمال

یونین کا نوجوانوں سے بھرے جس وقت ہال — اور یہ بن جائے سراپا مایۂ جاہ و جلال
جذبۂ مسلم کی یہ اک مختصر تفسیر ہے
یہ شہیدانِ وفا کے خون کی تصویر ہے

ہم نے مانا ضبط کھویا گردشِ ایام نے — چین لینے دی نہ دم بھر چرخِ نیلی فام نے
جلوۂ توپ و تفنگ حاضر تھا ہر دم سامنے — کر دیئے ویران گھر تقدیرِ خوں آشام نے
اس میں تہذیبِ سلف کی کیا مگر تقصیر تھی
یہ تو سب تقدیر یا بگڑی ہوئی تدبیر تھی

قوم کا اپنا تمدن قوم کا گنجینہ ہے — قوم ہے اُس کے فقط اک بے حرارت سینہ ہے
امتیاز و شانِ قومی کا یہی آئینہ ہے — منزلِ بہبودیِ ملت کا واحد زینہ ہے
ہے یہی تو زندگی ہر ملتِ بیدار کی
قوم کو لگتا ہے گھن تقلید سے اغیار کی

ترک! پیارے ترک! سُن یوں ہاتھ سے عزت نہ دے — دولتِ دنیا گئی۔ اب دولتِ غیرت نہ دے
بے بہا شرم و حیا کی اتنی کم قیمت نہ دے — نیم عریانی کی نازک جنس کو خلعت نہ دے
تو مسلماں ہے نکل! اس قیدِ بے زنجیر سے
ہاں مٹا دے مغربیت نعرۂ تکبیر سے

آ! وہی پہلے سے بن جائیں۔ ہلا دیں کائنات — ہو وہی تہذیبِ اسلاف اور وہی وضع و صفات
پھر بھریں پیمانۂ جذبات میں آبِ حیات — پھر بنا دیں اس وجودِ تلخ کو شہد و نبات
اہلِ عالم کو کلاہِ سرخ یک رنگی سکھائے
نعرۂ تکبیر یورپ کو ہم آہنگی سکھائے

مردِ غازی یہ صدا! الفت کا سوز و ساز ہے — زخم خوردہ قلب کے احساس کا پرداز ہے
کوئی گر سمجھے یہ قومی زندگی کا راز ہے — کیا ہوا کم مایہ ہندی کی اگر آواز ہے
آرزو ہے اے شبیہ تُرکی سدا خوش حال ہو
کاش پیدا اک وہاں بھی ڈاکٹر اقبال ہو

محمد شبیہ الحسن خاں
متعلم تھرڈ ایر کلاس

ادھ جلا سگرٹ

(۱)

میری عبرت آگیں حالات نہ دیکھ۔ میرا دل سوز فسانہ نہ سُن۔ ہاں اے گزرنے والے اپنے راستے چلے جا۔ شقی القلبی کو توجانے دے۔ اگر اثر پذیر دل پہلو میں ہے تو گھڑی بھر کے توقف سے میرا حال زار تجھ کو ایک دن کیا برسوں رولائے گا۔ پھر بھی میری دردبھری داستان بہت کچھ سبق آموز ہے۔ دنیا کی نت نئی چالیں، انقلاب کی کڈھب گردشیں کچھ انہیں کے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آتی ہیں۔ جو ان سے ناآشنا رہنا چاہتے ہیں تم غریبوں کی کیا۔ جو انقلاب کے بھنور میں ہر لمحہ ہر لحظہ چکر لگایا کرتے ہیں کبھی غالب کبھی مغلوب۔ گویا ہماری ہستی میں ہر دم فنا کی جھلک مضمر ہے لیکن یہ سب کے ساتھ ہے۔ عیش کے بدلے غم۔ غم کے عوض خوشی۔ اگر کچھ دنوں کے لئے حکومت ثروت، عزت اور دولت پاور رہی تو بعد چندے انقلاب نے وہ صورت دکھائی کہ اب اگلا سا عیش بھول کر بھی یاد نہیں آتا۔ نہ وہ جمشید کی حکومت نہ دارا سی ثروت۔ نہ فریدوں سی عزت، نہ قاروں سی دولت ہے۔ سب ہی خواب و خیال ہو گئے۔ مسہری کے عوض بانوں کا جھلنگا۔ کوٹھی کے بدلے گھاس پھونس کا چھپر رہ گیا۔ وہ ہی پھول جو صبح کو باغ کی زینت تھے شام کو گُل حسرت نظر آئے۔ وہ ہی جو صبح دم اپنی خوشبو سے بادِ صبا کو مست کر دیتے تھے، شام کو نظرِ نوک نشتر ہوئے۔ پھر بھی کسی کے گلے کا ہار، کسی کی کلائی کا گجرا بنے۔ پہننے والے کو خود ہی اُن پر پیار چلا آتا تھا۔ خوشی سے پھولوں نہ سماتا تھا۔ لیکن عبرت آگین ہے۔ ان کا آخری نتیجہ جو ابھی ابھی راحت رساں تھے وہی ایذا رساں بن گئے۔ کسی نے تنفر کی نظر سے اُنھیں جھٹک دیا۔ گُل کا چراغ یوں گل ہوا۔ اب عاشق زار عندلیب کی جاں ستاں سرگزشت بھی کچھ کم نہیں۔ صحنِ گلشن میں آنکھ کھولی۔ بہار نے لوریاں دیں دایہ کی طرح کھلایا۔ شاخ گُل کا پالنا جھولا یا۔ صیاد کی نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لئے باد بہار کے جھونکوں نے نگہبانی کی۔ جب عندلیب زار پر پرزوں سے درست کسی گل کی والہ و شیدا ہوئی اور ایک ایک تنکا جمع کر کے آشیاں بنایا تو ہائے بدقسمتی " برق وہ چمکی کہ دم بھر میں نشاں بھی تو نہ تھا۔

(۲)

اب تو اے گزرنے والے تیرا اصرار حد سے بڑھ گیا۔ میں اپنی درد بھری کہانی کہتا چلا لیکن اتنا یاد رکھ کہ
دامن صبر ہاتھوں سے نہ دینا۔ ملتی جلتی داستان سے گوشۂ دامن تر نہ کرنا۔ ہاں۔ میرا وطن کبھی وادیِ جمنا کا لہلہاتا ہوا
سبزہ زار تھا۔ خاص جونپور کا وہ تختہ جس کے ذرہ ذرہ پر زر و جواہر نثار تھے۔ اور تختہ مولوی خورشید کے نام سے مشہور
تھا۔ خورشید کی ضیا تو ایک وقت کے لئے فیض بخش ہوتی ہے۔ لیکن میرا فیض ہمہ وقت جاری تھا۔ کہاں کہاں کے لوگ
آتے تھے اور گوہر مقصود سے اپنا دامن بھرے خوشی خوشی واپس جاتے تھے۔ میری پرورش کن کن مصیبتوں سے
ہوئی۔ آفتاب کی تمازت نے کتنوں کو جھلسایا مگر میں اس کے دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ قدرت کے ہر مناظر
میرے لئے جلوہ افروز رہتے مگر میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ ہاں ایک مصیبت جس نے نہ صرف مجھ کو
بے وطن ہی کر دیا بلکہ میرے رنگ و روپ ہی کو بدل ڈالا آخر وہ روز دیکھنا نصیب ہوئی اور وہ بھی اپنے ہم وطنوں کی
بدولت۔ جب میرا نشو و نما باختتام پہونچی اور میں مرادوں پر آ گیا تو میرے ہم وطنوں نے بے رخی کی۔ انھوں نے
مجھ کو اپنے نزدیک زندہ درگور کرنے کی فکر کی تھی مگر ان کو اس کی کیا خبر تھی کہ گھر سے نکل کر میں پروان چڑھوں گا۔
اس طرح بنا توڑ مروڑ کر پکڑ جکڑ مجھے گھر سے نکالا۔

چار ناچار میں وطن کو خیرباد کہتا ہوا اپنے نئے پردیس کی طرف چلا۔ راستہ بھر کبھی وطن کی یاد ستاتی کبھی نئے لوگوں
سے ملنے کا خوف کھاتا۔ اور سمندر کا سفر جہاں کوسوں خشکی کا پتہ نہ تھا۔ کیا بتاؤں میں نے کن آفتوں سے ختم کیا۔ قدم
بڑھتا نہ تھا مگر ان ہم وطنوں کی بے رخی جب یاد آجاتی تو یہی دل چاہتا کہ یہ سات سمندر کیا ایسی دور نکل جاؤں
کہ پھر ان تک واپس نہ آؤں۔ مگر خوش قسمت تھا کہ پردیسیوں نے بڑا خیر مقدم کیا۔ میں ہاتھوں ہاتھ جہاز سے اتارا
گیا۔ جونپور کے جھونپڑے چولہے میں جائیں۔ پردیسیوں نے مجھے بڑی بڑی کوٹھیوں میں رکھا جہاں نہ شب کی شبنم
اپنا اثر کر سکتی تھی نہ دن کی دھوپ کمھلا سکتی تھی۔ اب میرا افسردہ چہرہ پھر بحال ہو چلا تھا۔ لوگ جوق جوق گروہ گروہ
آتے تھے۔ اور میری دید سے خوش خوش واپس جاتے تھے۔ ایک جگہ نہیں میری ضیافت کے سامان گھر گھر
کئے گئے۔ آج Lawrence Co کے یہاں تھا کل Mull & Co نے مدعو کیا۔ غرض کہ دن عید رات شب برات کا
مصداق تھا۔ اور وطن کبھی بھولے سے بھی یاد نہ آتا تھا۔

(۳)

"لیکن یکساں کبھی کسی کی نہ گزری زمانہ میں" وہ زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ہائے جنھوں نے مدعو کیا تھا اب وہی آنکھیں دکھانے لگے۔ اب پھر وطن کی یاد آئی کیونکہ موجودہ مصیبتیں تو پہاڑ ہوگئی تھیں۔ وطن میں تو لکڑیوں کی مار پڑتی تھی لیکن یہاں پہونچ کر مشینوں کے کولھو میں ڈال کر پیس دیا گیا۔ ہائے میری خوں فشانی پر بھی کوئی ترس نہ کھاتا تھا۔ جو تھا خوش گویا میری مصیبت دوسروں کے لئے راحت ہو رہی تھی اور ہونے والا بھی یہی تھا۔

وہ وہ مصیبتیں اُٹھائیں کہ اپنی جامہ ہستی کا ایک ایک تار علٰحدہ ہوگیا اور چار ناچار اصل ہیئت چھوڑ کر دوسرا رنگ اختیار کرنا پڑا اور ساتھ ہی نام کو بھی تبدیل کر ڈالا پہلے دیسی نام تھے کہیں خمیرہ خاں مشہور تھا کہیں پیار سے میاں بھاکو کہلاتا اور جب رنگ د روپ سے نکلتا تھا تو وطن والے دمیر اللہ چو سیر اللہ سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن اب پھر پردیسی نام رکھے۔ پردیسیوں نے عزت تو دی لیکن بُری گت بنا کے P.S Chart اور on cigar. J. G. cigarette اب لحظہ بہ لحظہ وطن کی یاد ستانے لگی۔ صرف یہی نہ تھا بلکہ اپنا جدید نام اور نئی صورت وطن والوں کو دکھلانے کا اشتیاق بڑھا تھا اور پردیسیوں نے بھی وطن واپس کرنے کا قصد کر دیا۔ اب شان ہی دوسری تھی جب وطن سے نکلا تھا تو اچکن کے ساتھ اور اب واپس ہوا ہوں تو سوٹ بوٹ میں۔

(۴)

میری واپسی وہ واپسی نہ تھی جیسے علیگڑھ کے طلبا قرض حسنہ لے کر دوسرے ممالک جاتے ہیں اور واپسی England Returne کے نام پر فخر کرتے ہیں۔ میرا جانا بھی تزک و احتشام کے ساتھ تھا اور واپسی بھی نہایت شان و شوکت سے۔ جب ساحل ہند پر قدم رکھا تو ہزارہا ہم وطن استقبال کو موجود۔ کیا ادنیٰ کیا اعلیٰ ہر شخص ہاتھ پھیلائے تیں نہیں بلکہ منہ پھیلائے لب سے لب ملانے کو بیقرار۔ لوگ طرح طرح سے اپنے قدیم نیازمند کو سرفراز فرما رہے ہیں کبھی تنہائی کا مونس قرار دیتے ہیں کبھی جلسوں کی زینت سمجھتے ہیں اور رئیس ہوں کہ تو نہال اپنے ہم وطنوں کا منہ چوم رہا ہوں۔ پردیس کی مصیبتیں اب بھولتا جاتا ہوں اور خوش ہوں کہ وطن کی ہر آفت قبول لیکن پردیس کی کوئی راحت منظور نہیں۔ ہاں اپنے ہم وطنوں سے ایک عرض ہے کہ میری مٹی اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے لگا دیں۔ ابھی حیات کا سلسلہ باقی رہتا ہے کہ وہ منہ سے جدا کر دیئے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ان باقیماندہ تار نفس کی بدولت مجھے پھر پردیس جانا پڑے اور یہاں خرابی میرے ٹکڑے جمع کرنے یہ سات سمندر کی سیر کرائیں۔

(عبدالعلی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج)
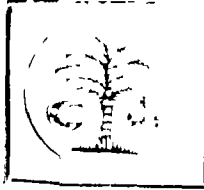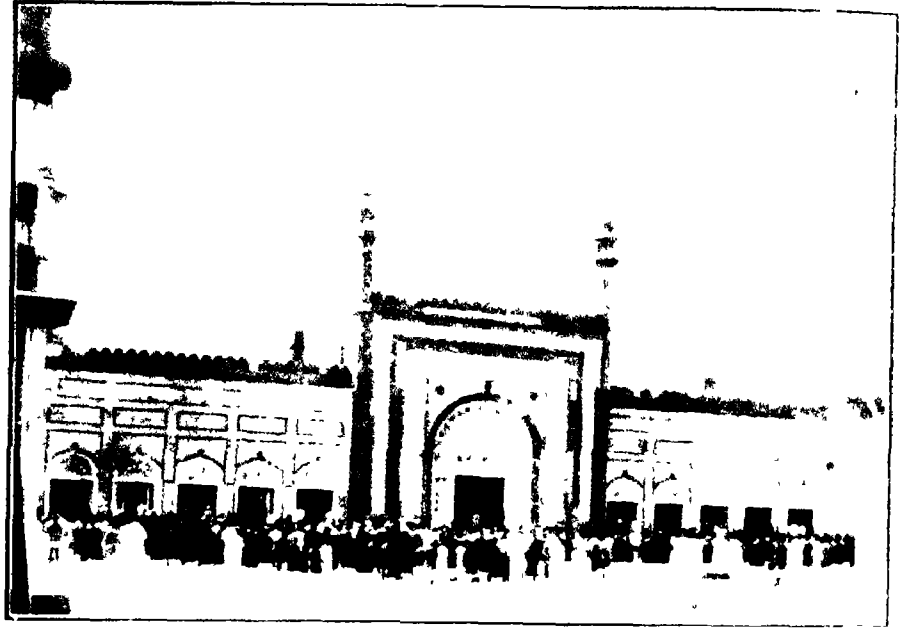
عبدالباسط ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مرتب : عبدالباسط ایم اے' ایل ایل بی (علیگ)

طابع و ناشر: محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر: مسلم یونیورسٹی پریس. علی گڑھ

فہرست مضامین

تصاویر: (۱) خان بہادر نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کے سی آئی ای و بی ای وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲) سب ... رت (عمل چغتائی)

مرتب: عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

علی گڑھ میگزین

نواب سر محمد مزمل اللہ خاں خان بہادر کے سی آئی ای، او بی ای وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرتبہ

مولوی عبدالباسط ایم اے ایل ایل بی (علیگ)

(انیسٹو مسلم یونیورسٹی)

جلد ۴ و ۵ | بابت دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء وجنوری فروری سنہ ۱۹۲۷ء | نمبر ۴

شذرات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کا سالانہ اجلاس بتاریخ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء اسٹریچی ہال میں منعقد ہوا ممبران کورٹ کی معقول تعداد جلسہ میں شریک تھی۔ سب سے اہم مسئلہ انتخاب وائس چانسلر درپیش تھا، ہر یونیورسٹی کی کشتی کا ناخدا دراصل اس کا وائس چانسلر ہوتا ہے جس کی اعلیٰ قابلیت حسن انتظام ذاتی تجربات، انسانی ہمدردی، قومی جوش، مخلصانہ جذبات اور خداترسی کی بناپر اس یونیورسٹی کی آئندہ بقا اور ترقی کا دارومدار ہوتا ہے وہی اس کو صدہا مصائب گوناگوں خطرات اور حوادثات زمانہ کے سیلاب سے بچاکر صلح و آشتی کے پُرامن و محفوظ کنارے جا لگاتا ہے۔

ہماری یونیورسٹی کے لئے اس پُرآشوب اور تلاطم خیز زمانہ میں جب کہ حوادثات کے بحر بیکراں میں طوفان عظیم

ا ایک ایسے تجربہ کار ہوشمند ناخدا کی ضرورت تھی جو خدا کی مدد سے اُس نازک اور اہم موقع پر اپنی قوم کی کشتی کو شن اسلوبی سے نکال سکے کہ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

اس میں کوئی شک نہیں کہ عالی جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے بحیثیت وائس چانسلر اپنے فرض منصبی ادا کرنے میں جس دل سوزی، مخلصانہ جوش اور سچی ہمدردی کا ثبوت دیا وہ ہمیشہ قابلِ یادگار رہے گا لیکن افسوس کہ نے مساعدت نہ کی اور ان کو اپنی طویل علالت کی وجہ سے علی گڑھ سے باہر جانا پڑا۔ چونکہ جناب صاحبزادہ صاحب کی جسمانی بالخصوص قلبی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ آئندہ وائس چانسلری جیسے مہتم بالشان اور ذمہ دارانہ عہدہ کے کماحقہٗ انجام دہی کر سکیں، اس لئے اُنھوں نے اپنا نام قبل از انتخاب واپس لے لیا۔

اس عہدہ کے لئے دوسرا نام عالی جناب معلی القاب خان بہادر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کے۔سی۔آئی پیش ہوا اور بالآخر بغیر اختلاف رائے طے ہوگیا۔

جناب نواب صاحب ممدوح کی ذات تعارف سے بے نیاز ہے اور آپ کے لئے مسلمانوں کی اس واحد مشرقی درسگاہ کی عنان حکومت کوئی جدید کام نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی آپ اس عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اور اس مرتبہ کا انتخاب کل شئی یرجع الی اصلہ کے اصول کا پورا مصداق ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں تمام انتظامات سیاسی جس تدبّر اور اصابت رائے کے ساتھ انجام پائے وہ نقش کالحجر ہیں۔ نواب صاحب اس صوبہ کے رئیس اعظم ہیں اور اپنے ذاتی اقتدار کی بدولت گورنمنٹ برطانیہ کے اعلیٰ حکام میں اپنے دوستانہ تعلقات کی بنا پر نہایت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں آپ کا تمام وقت مختلف قسم کے انتظامات اور اہتمامات کا ایک مستقل ٹائم ٹیبل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسا ذی وقار شخص کا جو اقتدار و وقعت کے ملاء اعلیٰ پر ہو اور جس کے فیاضانہ عطیات قومی اور ملکی فیاضیاں ہمیشہ وابستہ رہی ہوں کسی اعزازی ذمہ دارانہ اور اہم قومی کام کے لئے آمادہ ہو جانا مسلمہ طور پر اس کی ہمدردی اور سچی موانست پر ہی مبنی ہو سکتا ہے۔

وائس چانسلر کو جہاں درس گاہ کے اعلیٰ انتظام کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا لابدی ہوتا ہے وہاں قوم کے ان افراد کو جن کے نونہالان پر تعلیمی درس گاہ کا آئندہ انحصار ہے طمانیت خاطری کے اسباب مہیا کرنا بھی ازبس ضروری ہے

جس طرح بحیثیت ایک افسر اعلیٰ اس کو گورنمنٹ اور قوم کے ساتھ اپنے تعلقات میں توازن قائم کرنا پڑتا ہے اسی طرح اس کو معلمین اور متعلمین کے ساتھ بھی تعاون و تعامل بے حد ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی مشنری اس وقت تک صحیح معنوں میں عمدہ نہیں کہی جا سکتی ہے جب تک کہ اس کے چھوٹے بڑے سب پرزے یکساں طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہ چلتے رہیں کسی ایک ادنیٰ پرزے کی خرابی سے پوری مشین کے بے کار ہونے کا اندیشہ ہو جاتا ہے ہم مسرت کے ساتھ شائع کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ وائس چانسلر صاحب دام اقبالہٗ میں یہ سب صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ہم ارکین یونیورسٹی کو ان کے اس صحیح اور بہترین انتخاب پر ہدیہ مبارک باد کا مستحق تصور کرتے ہیں۔

ہم بحیثیت مدیر اپنا خوشگوار فرض سمجھتے ہیں کہ جناب نواب صاحب ممدوح کو اپنی و نیز جملہ طلباء کی جانب سے اس اعلیٰ ممتاز عہدے پہ فائز ہونے کی مبارک باد پیش کریں۔

ہم اس موقع پر نواب صاحب کی تہنیت شائع کرتے ہیں جو انتخاب وائس چانسلری سے پہلے کی ہے اور ہم سپاس گزار ہیں کہ جناب ممدوح نے ازراہ شفقت و عنایت ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی۔
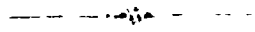
امسال کورٹ کے ممبران میں بہت سے جدید ممبروں کا اضافہ ہوا ہے ہم ان کو اس عہدۂ جلیلہ پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے ان کی آئندہ ذمہ داریوں کے احساس کی یاد دہانی کرتے ہیں کہ وہ اس مشرقی درس گاہ کو جو مسلمانوں کی واحد درس گاہ کہی جا سکتی ہے اپنی اصابت رائے اور دیگر مفید مشوروں سے محروم نہ فرمائیں گے اور اپنی ذمہ داری کا خیال کرتے ہوئے اس کے آئندہ مفاد کو ہمیشہ اپنے تمام ذاتی کاموں پر ترجیح دیں گے چونکہ ممبران کورٹ ہی کی وہ وہ جماعت ہے جس کے اختیار میں یہاں کے تمام اعلیٰ انتظامات ہوتے ہیں اگر تمام ممبرانِ کورٹ اس میں یکساں طور پر دلچسپی لیں اور یہاں کے نقائص و عیوب کو رفع کرنے کی سعی فرمائیں تو ان کی اجتماعی قوت اس میں کایا پلٹ کر سکتی ہے ہمیں امید ہے کہ ممبران کورٹ اس کی اصلاح کو اپنا فرض خیال فرما کر ہمہ تن متوجہ ہوں گے۔
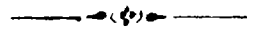
ہماری یونیورسٹی سے امسال اسمبلی میں جناب پروفیسر ڈاکٹر کریم حید صاحب لودھی ایم اے، پی ایچ ڈی اور صوبہ متحدہ کی کونسل میں جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب بی اے (آکسن) بار ایٹ لا کا انتخاب قابل ذکر ہے

اول الذکر زراعتی کمیشن پر دو سال کی رخصت پر تشریف لے گئے ہیں وہ اپنے فن علم المعیشت میں ماہر ہیں۔

پروفیسر محمد حبیب صاحب علاوہ فن تاریخ میں ماہر ہونے کے بہترین سیاست داں ہیں اور پولیٹیکل سائنس آپ کا ہمیشہ سے خاص مضمون رہا ہے۔ ہم قطع نظر اس سے کہ ان کے اس انتخاب کا تعلیم پر کیا اثر ہوگا ان کو اس انتخاب پر تہ دل سے مبارک باد دیتے ہیں اور ان کو قوم کے لئے سیاسی نقطۂ نظر سے بہت مفید خیال کرتے ہیں

اسی سلسلہ میں ہم اپنے اعزازی کلید بردار خزانہ جناب شیخ محمد عبداللہ صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اور سید طفیل احمد صاحب سابق سب رجسٹرار کو بھی تہنیت و مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ دونوں تجربہ کار صوبہ متحدہ کی کونسل میں قوم کی نمایاں ترقی کا باعث ہونگے۔

تمام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور کالجوں سے تقریری مقابلہ کا سالانہ جلسہ یونین حامد ہال میں ۷ دسمبر کو منعقد ہوا۔ تقریباً دس بارہ مرکزی تعلیم گاہوں سے چیدہ چیدہ مقررین نے شرکت کی۔ مضمون زیر بحث یہ تھا کہ آیا ہندوستان سوراج کے لئے تیار ہے ؟ تقاریر بزبان انگریزی ہوئیں جن میں ہماری یونیورسٹی نے خود مقابلہ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ مقررین نے نہایت عمدہ تقریریں کیں سامعین اور حاضرین سے یونین ہال اس قدر بھرا ہوا تھا کہ صحیح معنوں میں اوپر نیچے تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ علی گڑھ کا طرۂ امتیاز یونین حامد ہال کی تقاریر رہی ہیں اور بڑے سے بڑا مقرر اس ہال میں اپنی طوطی زبانی اور شیریں مقالی سے سامعین کو مسحور کر چکا ہے۔ لیکن اس ہال کا یہ جلسہ اس لحاظ سے پہلا جلسہ کہا جا سکتا ہے کہ اس عظیم الشان موقع کے لئے لکھنؤ گرلز کالج نے اپنے یہاں کی دو لڑکیاں مس کرشنا راؤ اور مس اسمٰعیل کو منتخب کر کے تقریری مقابلہ کے لئے بھیجا۔ صنف نازک کا اس ثقیل مجمع میں اپنے مرکز ثقل کو قائم رکھنا قابل داد ہے۔

نتیجہ ظاہر ہے کہ مغربی تہذیب اور اصول معاشرت پر نظر کرتے ہوئے فطرتاً مستحق انعام کون ہو سکتا تھا۔ بالآخر علی گڑھ کی خوشنما نقرئی مسجد لکھنؤ کے مسیحی گرلز کالج کو پیش کر دی گئی۔ ہم مس کرشنا راؤ اور مس اسمٰعیل کو ان کے حسن تقریر اور حصول انعام پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اپنے دوست اور سابق کلاس فیلو بشیر عالم صاحب کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہیں کہ وہ اس جنس میں کھوٹے آترے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مقابلہ

ایک جنس کا دوسرے ہم جنس کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور وہیں پر صحیح اندازہ مقابلہ کا کیا جا سکتا ہے۔ کسی ایک جنس کو
غیر جنس سے مقابلہ کرنے میں معیار کیا ہو سکتا ہے؟

ہم امید کرتے ہیں ارکین یونین مقتضائے فطرت کو فراموش کر کے اس مسئلہ کو انصاف کے ساتھ آئندہ
غور کریں گے

شروع جنوری سے جدید مانیٹروں کا انتخاب ہوا اور ہر سوسائٹی کے جدید معتمد اعزازی منتخب ہوئے ہم ان سب کو
ان کے عہدوں پر فائز ہونے کی مبارکباد پیش کرتے ہیں اس سلسلہ میں ہم اپنے دوست محمود علی خان صاحب کو
بالخصوص مبارکباد پیش کرتے ہیں جو طلبا کے مذاق مجوزی یعنی سینیر فورڈ مانیٹر منتخب ہوئے ہیں ہمیں امید ہے کہ تمام مانیٹران
اپنے فرض منصبی کو روایات قدیمہ کی بنا پر قائم رکھتے ہوئے اپنے جانشینان کے لئے عمدہ مثال قائم کرینگے۔

میگزین کا یہ نمبر ۱۹۲۶ء کے اختتام اور ۱۹۲۷ء کے افتتاح کا ایک مجموعہ ہے۔ ادب اردو کی مشہور معروف
ہستیوں کی دائمی مفارقت پر گریاں کناں ہے۔ یعنی سال کے اختتام پر جناب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر نے عالم فانی
کو کوچ کیا۔ رسال کے افتتاح پر جناب شاد عظیم آبادی نے اپنے ادبی دوست کا ساتھ دیا اور اس لحاظ سے اردوے ادب
کے لئے ۱۹۲۷ء کا آغاز ۱۹۲۶ء کے اختتام سے کچھ کم اندوہگیں نہ ثابت ہوا۔

۳۴۵

مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم ۱۰ ربیع الآخر ۱۲۷۰ھ بروز جمعہ اس دار فانی میں آئے اور ۱۰ جمادی الاول
بروز جمعہ اپنی عمر طبعی کے پورے چھہتر سال ختم کر کے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ حسن اتفاق کہ تاریخ، دن اور
وقت پیدائش و وفات ایک ہی ہے۔ مولانا مرحوم انشا پردازوں میں سب سے پرانے اور کہنہ انشا پرداز تھے۔
اپنی ادبی شہرت و ناموس کے لئے کبھی دوسری ہستی سے انتساب کے کبھی ممنون نہ تھے۔ ۱۸۸۲ء سے ۱۹۲۶ء تک
برابر اردوے ادب کی خدمت میں مشغول رہے۔ اس قدر طویل مدت تک یہ خدمت کسی اور اردو کے ادیب نے
اس قدر انہماک کے ساتھ انجام نہیں دی۔ آپ کی ذات اردوے ادب کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔ بلکہ آپ نے
اردو انشا پردازی کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا کیا اور سنجیدہ تصنیف

کے لئے ایسا راستہ صاف کر دیا جس کی وجہ سے اُردو کے ادب سے ذوق رکھنے والوں کو منزلِ مقصود تک پہنچنا آسان ہو گیا۔

مولانا مرحوم کو عربی کے ساتھ انگریزی سے بھی واقفیت تھی اور فرانسیسی زبان سے بھی آشنا تھے اور یورپ تک سیر کر آئے تھے۔ بظاہر عوام ان کو محض ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے یاد کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت علاوہ ناول نویسی کے وہ ایک عمدہ عربی کے ادیب اور فن تاریخ اور محاضرات کے ماہر بھی تھے۔ ان کے مشہور ناول منصور موہنا، فلورنڈا، فردوس بریں، مقدس نازنین، فتح اندلس، ملک العزیز ورجینا اور درگیش نندنی ہیں۔ مولانا کا آخری کارنامہ تاریخ اسلام ہے جس کی تصنیف کا کام جامعہ عثمانیہ کی فرمائش سے شروع کیا تھا اور چند حصص تصنیف کر چکے تھے۔

مرحوم بہت با اخلاق باوضع اور پابند اوقات لوگوں میں سے تھے جن سے ہر خرد و بزرگ یکساں طور پر خوش رہ سکتا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء کا آخری رسالہ "دلگداز" ہی جوان کی زیر ادارت شائع ہوا ہے یہ نمبر اس کی چھبیسویں جلد کا آخری نمبر ہے۔ علاوہ دلگداز کے اس سے پہلے تین اور رسالے بھی نکالے تھے جن کا نام پردۂ عصمت اتحاد اور تصوف تھا۔

اگر مولانا شرر مرحوم کی مفارقت بحیثیت ایک نثار پریشان کن تھی تو جناب میر علی محمد شاد کی دائمی علیحدگی بحیثیت ایک شاعر وہی اثر رکھتی ہے۔

آپ نظم اردو کے پرانے اُستاد عظیم آباد کے مشہور باکمال شاعر تھے ۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اپنے وطن عظیم آباد میں آپ نے وفات پائی۔ تقریباً ساٹھ سال سے زیادہ کی مشق سخن تھی۔ میر اور انیس کے مقلد اور متبع تھے۔ مرحوم کی تصنیفات میں علاوہ دیوان اور کلام منظوم کے نوائے وطن نثر میں موجود ہے۔

ہم جناب مولانا عبدالحلیم صاحب شرر اور جناب میر علی محمد صاحب شاد کے لئے دست بدعا ہیں کہ خداوند تعالےٰ ان دونوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اُن کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتے ہیں۔

الوداع

علی گڑھ میگزین جہاں اپنی نوعیت میں مختلف حیثیت سے ایک امتیازی شان رکھتا ہے وہاں اس کی ایک مابہ الامتیاز حیثیت یہ بھی ہے کہ اس کے قلم ادارت کو مجوزہ قانون یونیورسٹی کی بنا پر بلد جلد اپنے مرکزی محور سے گردش کرنا پڑتی ہے چونکہ یہ رسالہ متعلمین کی جماعت سے متعلق سمجھا جاتا ہے اس لئے وہ متعلم مدیر جو متعلمی کی انتہائی سرحد کو عبور کر کے معلمی کی سرزمین پر گامزن ہو جائے۔ اصول مذکورہ کی بنا پر قلم ادارت کا صحیح معنوں میں حامل نہیں ہو سکتا چنانچہ اسی نظریہ کی بنا پر و نیز دیگر ادبی مشاغل کی وجہ سے جو ہم بسلسلہ "ریسرچ" کر رہے ہیں آئندہ میگزین کی خدمت کرنے سے معذور ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق کہ ہمارے زمانہ میں میگزین کا معیار باعتبار مضامین، کتابت، طباعت اور فی الجملہ دیدہ زیبی کہاں تک کم و بیش رہا ہم خود کچھ لکھنا نہیں چاہتے بلکہ ناظرین کرام اور ہم عصر مدیران کے حسن تخیل پر چھوڑتے ہیں۔

ہم مسرت سے شائع کرتے ہیں کہ ہمارے جانشین ہمارے دوست جناب محمود الحسن صاحب بی اے یہاں کے قدیم طلباء میں سے ہیں اور اردو ادب سے ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں میگزین کو ہر لحاظ سے ترقی دینے میں کوشاں رہیں گے ہم ان کو یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہ میگزین دراصل طالب علموں کا ادبی کارنامہ ہے اور اس کے فرض نصب العین کی ترقی میں اس جماعت کو نظر انداز کر دینا ان کے جائز حق کا اتلاف ہوگا امسال انٹرمیڈیٹ کالج سے ایک اسسٹنٹ ایڈیٹر کا انتخاب بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس کی ضرورت بیحد تھی کہ ایک معاون انٹرمیڈیٹ کالج سے وہاں کے طلبا کے مضامین کے حصول اور ہمت افزائی کے لئے منتخب ہو ہم اراکین میگزین کے سپاس گزار ہیں کہ انھوں نے اس عہدہ کا اضافہ کیا اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیٹر صاحب و اسسٹنٹ ایڈیٹر صاحب اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی انجام دہی میں سعی بلیغ فرمائیں گے اور ایک دوسرے کے معاون رہیں گے۔ ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ عرض کرتے ہیں کہ ادارت میگزین ایک مستقل کام ہے اور

اپنے لئے کافی وقت چاہتا ہے۔

آخر میں ہمارا خوشگوار فرض ہے کہ ہم اپنے ان معاونین کا تہ دل سے شکریہ ادا کریں جن کی معاونت کے بغیر ہم ادارت کے اہم کام انجام نہیں دے سکتے تھے۔

سب سے اول ہمارے شکریہ کے مستحق ہمارے قدیم عنایت فرما جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب بالقابہٗ ہیں جن کے ارشاد کے مطابق ہم نے اس اعزازی عہدۂ ادارت کو اپنی بساط کے مطابق انجام دیا جناب ممدوح نے ہمیشہ ہمیں اپنے علمی مشوروں سے سرفراز فرمایا ہے ہم اپنے استاد مکرم جناب قاضی جلال الدین صاحب کے بھی سپاس گزار ہیں جنھوں نے بحیثیت سنسر ہمیشہ ہماری ہمت افزائی فرمائی اور اپنے دیرینہ تجربات ادارت سے مستفید فرمایا۔ قاضی صاحب کا تعلق میگزین سے اس وقت سے ہے جب کہ اس کا نام "علی گڑھ منتھلی" تھا اور جدید مدیر میگزین کے ذاتی تعلقات کی بنا پر ان کا تعلق دوچند سہ چند ہوگیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کے علمی تجربات آئندہ میگزین کے صفحات پر ضرور نمایاں ہونگے جو ناظرین کرام کے لئے باعث دلچسپی ہونگے اس قدر عرصہ کے بعد میگزین کا پھر اسی قدیم محور پر پہنچ جانا اس کی خوش قسمتی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم تمام ان مضامین نگار حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنھوں نے ہمارے زمانۂ ادارت میں ہماری قلمی اعانت فرمائی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سب حضرات آئندہ بھی اسی طرح اس رسالہ کی خدمت کو اپنا فرض تصور کرینگے۔

آخر میں ہمارے شکریہ کے مستحق جناب الحاج مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی اور ان کے تمام معاونین ہیں جنھوں نے اس کی کتابت و طباعت میں ہم کو مدد دی۔

نیاز کیش
عبدالباسط
اڈیٹر

اے دریں آدمیت اے شاعری کی جنت — اے صانع ازل کی نازک ترین صنعت
جلووں سے تیرے روشن صحرا و دشت و وادی — عفت کی پاک دیوی جنگل کی شاہزادی
گیسو پہ تیرے صدقے زلفیں سیہ گھٹا کی — گاتی ہیں گیت تیرے رنگینیاں فضا کی
بستی میں تو جو آئے ایک حشر سا بپا ہو — آبادیوں میں ہلچل شہروں میں غلغلہ ہو
میکش جو تجھکو دیکھے تھرا کے جام چھوٹے — تسبیح شیخ اُلجھے زاہد کا زہد لوٹے
افلاک سے فرشتے لے کر خراج اُتریں — زاہد کے عمامے شاہوں کے تاج اُتریں
آنسو ہوں خوں بداماں نالے شرر فشاں ہوں — کیا کیا نہ شاعروں کی ملبوس دھجیاں ہوں
چہروں سے اہل دل کے بے آب و رنگ کردے — دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کردے
تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا — اے کاش پاس تیرے میرا مقام ہوتا
شام و سحر کے جلوے مجھسے قریب ہوتے — یہ چاند اور تارے میرے رقیب ہوتے
کیوں؟ میری گفتگو سے حیرت کا جوش کیوں ہے — اے زمزموں کے چشمے اتنا خموش کیوں ہے
بجنے لگے وفا کی محفل میں شادیانے — کچھ بول بھی زباں سے اے سرمدی ترانے

(۴)

پھر سنے گئے وہاں کے اور میں قریب آیا — شرما کے اس نے منھ کو تب ہاتھ سے چھپایا
آخر کو وہ پری وش اس طرح مسکرائی — سینہ میں روح میری گھبرا کے تھرتھرائی
دل کو شکیب دینے سامانِ جنگ آیا — چہرہ پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا — اتنے میں آسماں پر چھانے لگا اندھیرا
کچھ جسم کو سمیٹا کچھ سانس کو سنبھالا — کندھے پہ سبز آنچل انگڑائی لیکے ڈالا
ہر شے سے پھوٹ نکلے جذبات عاشقانہ — اتنے ہی میں وہ گاڑی پھر ہو گئی روانہ
تھے مختلف مناظر ہر شے میں ہی نمایاں — لیکن خیال میرا اس میں ہی تھا نمایاں

مڑکر جو میں نے دیکھا امید مرچکی تھی
پٹری چمک رہی تھی گاڑی گزر چکی تھی

ناظر

نظریۂ تمدن

از

عبدالباسط ایم اے۔ ایل ایل بی

انسان جب اس عالم فانی میں اوّل مرتبہ قدم رکھتا ہے اور آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس تماشا گاہ اور اس کے بازیگروں کے حرکات و سکنات کا دلدادہ اور اس کے شعبدوں اور کرشموں کا تماشائی ہوتا ہے۔ گویا وہ زبانِ حال سے سوال کرتا ہے کہ میں کہاں آیا اور کیوں آیا؟ اور میری یہ انفرادی ہستی اس عظیم الشان دنیا میں کس کام کی انجام دہی کے لئے پیدا کی گئی؟ کچھ عرصہ تک تو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ اور لاینحل معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑے ہی زمانے میں صحیفۂ فطرت اس کی عقدہ کشائی کردیتا ہے اور انسان پر بہت جلد ان امور کا انکشاف ہوجاتا ہے صحیفۂ فطرت کا مطالعہ یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک بھی وہ اس عالم میں ہے اس کو اسی عالم کی چیزوں سے ساز باز کی ضرورت ہے جوں جوں غور و خوض کرتا ہے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے کُل مقصود کی تکمیل کا راستہ بالکل بے خار نہیں ہے بلکہ بہت ہی پُرخار راہ سے بچکر یہ منازل طے کرنا ہیں۔ جہاں قدم قدم پر بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا ہے۔ وہ ششدر و حیران رہ جاتا ہے جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس جیسی دیگر ہستیاں بھی جو اسی کی طرح کسی نہ کسی فرض کی ادائیگی کے لئے اسی راہ میں تگ و پو کررہی ہیں لیکن بجائے غرض مشترک ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے ان میں سے اکثر دوسروں کے لئے سدِ راہ نظر آتی ہیں۔ وہ خود بھی بعض دفعہ اپنے آپ کو انھیں کی سی کش مکش میں مبتلا پاتا ہے۔ اگر حس صحیح سے کام لیتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ باہمی کش مکش حقیقتاً اس کو تکمیل مقصد سے باز رکھنے والی ہے۔ بالآخر فطرت سلیمہ کی روشنی میں اس کو نظر آتا ہے کہ اس کو اور اس کے ابنائے جنس کو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ جب تک وہ اس میدان میں تگ و دو کررہے ہیں ان کو کسی ایسے ضابطہ کا پابند رہنا چاہیئے جو ان کی خدمات کو صحیح راستہ پر رکھنے کا ذمہ دار ہو اور جس کے ماتحت رہ کر ہر ایک اپنے مقاصد کی تکمیل میں ساعی رہ سکے۔

اگر قدرت کے عطا کردہ حواس سے صحیح کام لے تو اس کو معلوم ہوگا کہ انسان ایک مقصد خاص کے تکمیل کی غرض سے ایک محدود زمانہ کے لئے اس عالم میں بھیجا گیا ہے۔ اس کے لئے اس کو اپنے زمانہ سے پہلی ہستیوں کے طرز عمل پر نظر ڈالنے کی فطرتاً ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ ان کے دستور العمل کا جویاں ہوتا ہے جن کے کارناموں سے اس کو یہ سبق ملتا ہے

کہ بغیر اس خاص اصول کی پیروی کئے جنھیں اخلاف اسلاف کے لئے بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں چارہ نہیں ہے۔

ہم سنتے آئے ہیں کہ افکار انسانی کی یہ ساری گل تراشیاں، انسانی تجلیات کی بلند پروازیاں اور اس دنیا کی تمام بزم آرائیاں صرف ایک اساسی اصول پر کاربند رہنے کا نتیجہ ہیں جسے اصطلاح میں اصول تمدن کہتے ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں اور تہذیب جدید کی دلفریب گل کاریاں بھی اسی تمدنی زندگی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں۔ یہ بحر و بر میں بے خطر سیاحت اور یہ کوہ وجبل کی بے ضرر مساحت صرف تمدن کی بدولت آسان ہوگئی ہے۔ اسی تمدن سے اقوام نے ترقی کی اور مدارج عالیہ پر پہنچیں، فتح ونصرت ہم رکاب ہوئی اور اقبال سے برومند ہوئیں اور جب کبھی اس سے منھ موڑا اقبال نے ساتھ چھوڑا، تنزل نے منھ دکھایا اور ادبار میں گرفتار ہوئیں اور بالآخر قعر مذلت میں جاگریں۔ یہی تمدن ہے جس نے معمولی اقوام کو قعر مذلت سے نکال کر اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچایا اور ببانگ دہل سائر کائنات پر ثابت کردکھایا کہ میرا پیرو دنیا میں ہمیشہ سرخ رو رہے گا اور مجھسے برگشتہ دائمی ذلت ومصیبت میں مبتلا کردیا جائے گا۔

جب اس تمدن کے اس قدر اثرات ہیں تو فطرتاً ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ تمدن کے ان زریں اصول کو معلوم کرے اور حقیقت تمدن سے کماحقہٗ واقفیت پیدا کرے۔ لہذا ہم تمدن کے مالہ وماعلیہ سے بحث کرتے ہیں۔

تمدن عربی لفظ ہے جو لفظ مدینہ سے مشتق ہے جس کے لغوی معنیٰ شہر کے ہیں لیکن اصطلاح میں تمدن چند اشخاص کے یکجا ہوکر ایک شہر میں رہنے کو کہتے ہیں اور یہ اصطلاح تمام ان قوموں کی اظہار حالات کے لئے مستعمل ہوتی ہے جو بمقابلہ وحشی اور جنگلی لوگوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ مثلاً اقوام یورپ بلحاظ چینیوں اور تاتاریوں کے زیادہ متمدن سمجھی جاتی ہیں۔ امریکہ کے اصلی باشندے اور اہل آسٹریلیا سب سے کم متمدن خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آخرالذکر بھی یکجا طور پر شہروں ہی میں آباد ہیں، تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جو اول الذکر و آخرالذکر اقوام میں مابہ الامتیاز ہے؟

امثال متذکرہ بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدن کی اصطلاح دو معنوں کے لئے مستعمل ہوتی ہے، اول مفہوم تو اس کا یہ ہے کہ اس سے بالعموم انسانی ترقی مراد لی جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم کسی قوم کسی شہر و ملک کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت میں زیادہ مکمل اور سربرآوردہ دیکھتے ہیں یا ہم ان کو زیادہ خوش و خرم، لطیف و نظیف، زیرک و دانا اور زیادہ متحد

پاتے ہیں تو ان کو متمدن کہتے ہیں اور یہ تمدن کا عام مفہوم ہے۔

اس کے علاوہ ہم تمدن کو اک خاص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور اس حالت میں اس سے اک خاص قطع کی ترقی مراد لی جاتی ہے۔ جیسے کہ جنگلی اور وحشی جرگوں کے مقابلہ میں دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام متمدن سمجھی جاتی ہیں اور یہ تمدن کا دوسرا مفہوم ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا تمدن بحیثیت مجموعی کوئی اچھی چیز ہے یا بری؟ یا یہ کہ اس کے محاسن اس کے معائب پر غالب ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب انسانی تجارب و تواریخ کے مشاہدوں کی بنا پر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ تمدن بذاتِ خود نہ صرف اک بڑی خوبی ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کا سبب بھی ہے اور در اصل کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس سے وہ رابطہ نہ رکھتی ہو، وحشیانہ زندگی کی خواہ کچھ ہی خصوصیات کیوں نہ ہوں لیکن وہ محاسن تمدن کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ صفات جن کو سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اتار کر اصول قدیمہ کو اصول جدیدہ سے مبدل کرکے اختیار کرتی ہے انھیں سے تمدن ترکیب پاتا ہے۔ اک وحشی گروہ میں چند انفرادی ہستیاں یا چند اشخاص پراگندہ صورت میں آباد ہوتے ہیں اور غیر متمدن کہلائے جاتے ہیں لیکن ان کے مقابل میں اک گنجان آبادی جو مقررہ مسکنوں میں بود و باش رکھتی ہے اور ایک کثیر تعداد و جماعت کے ساتھ قصبات اور شہروں میں آباد ہے وہ متمدن کہلائی جاتی ہے۔ وحشیانہ زندگی میں تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں اگر برائے نام کہیں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اس قدر بے اصول ہوتے ہیں کہ ان کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے لیکن اس کے مقابل میں ایک متمدن ملک زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت سے مالامال ہوتا ہے، وہاں کا ہر اک مشغلہ کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے اور وہاں کا ہر کام ترقی کی شاہراہ پر انجام پاتا ہے۔ وحشی لوگوں میں ہر شخص انفرادی حیثیت سے صرف اپنی ذات کا فائدہ مدنظر اور ملحوظ خاطر رکھ کر محنت و مشقت کرتا ہے اور غیر متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دوسری طرف بنی آدم کی اک جماعت کثیرہ کو کسی اک غرض مشترک کے واسطے مصروف کار پا باہمی معاشرت میں اک دوسرے سے متحد خوش و خرم، شادان و فرحاں دیکھتے ہیں تو اس کو متمدن کہتے ہیں، وحشیانہ زندگی میں کسی قانون نظم و نسق اور داد رسی کا یا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں پایا بھی جاتا ہے تو صرف برائے نام اور وہ صرف اس ضرورت سے کہ منفرد اشخاص اک دوسرے کی ایذا دہی اور آزار رسانی سے محفوظ رہیں، نہ تو سائٹی کی منضبطہ و متفقہ قوت باقاعدہ طور پر صرف میں آتی ہے اور نہ اتحاد اور جماعت کے فوائد سے کوئی واقف ہوتا ہے بلکہ ہر شخص واحد اپنی قوت بازو یا ذاتی چالاکی پر

بھروسہ رکھتا ہے، برخلاف اس کے جس جماعت میں سوسائٹی کا نظم ونسق اس قدر کامل ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کی متفقہ قوت سے ہر اک فرد کی جان ومال محفوظ رہے اور امن وامان قائم رہے تو اس سوسائٹی کو ہم متمدن کہتے ہیں۔

اس موازنہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہم ترقی یافتہ انسان کو متمدن کہتے ہیں، اب ترقیاں بھی دو اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک ترقی وہ ہے جسے انسان اپنی ذاتی جد وجہد سے حاصل کرتا ہے۔ اور دوسری وہ جس کا حاصل کرنا ہر انسان کے پیش نظر اور مرکوز خاطر رہتا ہے۔ خواہ وہ اس کی عمر میں کسی وقت حاصل ہو، اب تمام ایجادات، انتظامات اور انکشافات جو زندگی کے ہر شعبہ میں کئے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو وحشیانہ حالت سے بالا اور بالا سے بالاتر اور پھر بالاترین مرتبوں پر پہنچا دیں اور یہ پہلی قسم کی ترقی ہے لیکن دوسری قسم یا بالفاظ دیگر ترقی کی انتہائی منزل یہ ہے کہ انسان میں جو اوصاف موجود ہوں وہ سب حالت اعتدال پر آجائیں اور انسان اس قدر تزکیۂ نفس کرے کہ اس کی روح صفات ملکوتی سے متصف ہو جائے۔ یہی وہ ترقی ہے جو اصل ترقی ہے اور یہی ترقی یافتہ انسان اصل معنوں میں متمدن کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ لیکن جدید مغربی تمدن کی غایت صرف اس عالم کون وفساد میں انسانی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم اور ما فی العالم اس کا مسخر ہو جائے اس نے ترقیات روحانی کو جو اصل ترقی ہیں بالکل پس پشت ڈال دیا ہے۔

انسان کا نصب العین مدارج ترقی کو طے کرنا اور اصل ترقی کے ملاء اعلیٰ پر پہنچنا ہے۔ انسان کو فطرت سے بہت کچھ عطا فرمایا گیا ہے۔ لیکن ان صفاتِ فطرت میں تصرفات کرنا اور غور وخوض کرکے اپنے لئے سامانِ ترقی فراہم کرنا متمدن انسان کا کام ہے۔ لہٰذا انسان کی ذہانت اور ذکاوت سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ۔ انسان کی سعی بلیغ اور کوشش لامتناہی علت ہے اور تمدن اس کا معلول۔ تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت واقتدار منفرد اشخاص اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور روز بروز جماعت کا زور بڑھتا اور اشخاص کا زور گھٹتا ہے۔ دوسرے وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اس مجموعے کو متحد کرکے اسے باا ثر بنائے۔

اگر ایک وحشی شخص کے حالات زندگی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے اس میں دلیری اور جوانمردی بھی پائی جاتی ہے۔ ہمت وجرأت بھی موجود ہوتی ہے۔ لیکن باوجود ان تمام محاسن کے، اس میں

کوئی ایسی نمایاں کمی اور خامی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے کل وحشی جرگے غریب و کمزور رہتے ہیں وہ کمی اور خامی کیا ہے؟
وہ ہی کمی اور خامی ہے جس کے سبب سے شیر اور بھیڑیئے باوجود قدرت و قوت، دلیری و ہمت انسان ضعیف البنیان
کمزور و ناتوان پر غالب نہیں آسکتے یعنی ان میں متحد ہو جانے کی قابلیت کا نہ ہونا اک ایسی کمی ہے جو ان وحشی جرگوں کو
افلاس میں مبتلا رکھتی ہے اور اُن کی آئندہ ترقیات میں سد راہ ہوتی ہے۔

یہ صرف متمدن افراد کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں اک وحشی غیر متمدن نہ یہ کر سکتا ہے کہ کسی غرض مشترک کے
واسطے وہ اپنے نفس پر سختی برداشت کرے اور حظ نفس کو چھوڑ دے نہ اس کے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور سے
بھی اس کی نفسانی خواہشات پر غالب آسکتے ہیں نہ اس کے طبعی رجحانات اس کی انجام بینی کی وجہ سے کم و بیش
ہو سکتے ہیں، عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا، ذاتی بہبود کے فوائد سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ لہذا ہر وہ بات جو دوسرے
کی رضا جوئی کے لئے ضروری ہوتی ہے اس کے دل سے دور رہتی ہے۔ بجنسہ یہی حالت جو افراد کی ہوتی ہے اس
جماعت کی بھی ہوتی ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں چونکہ جماعت نام ہے مجموعہ افراد کا اس لئے جس قدر کوئی گروہ
وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اسی قدر اشتراک عمل سے بعید تر ہوتا ہے۔

واقعات گزشتہ و حال پر اک سرسری نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ غیر متمدن اقوام کبھی متمدن اقوام سے باوجود
قوت، قدرت جنگ و جدل میں کامیاب نہیں ہوئیں۔ انھوں نے ہمیشہ متمدن اقوام کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں ہزیمتیں اٹھائیں
اور بالآخر متمدن اقوام نے فتح و نصرت کا جھنڈا بلند کیا اور بڑی بڑی سلطنتوں پر مدبرانہ حکومت کی، اقوام عالم کی تاریخ
اس پر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا دو قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح و کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہتا ہے
جو بلحاظ تمدن فائق ہوتا ہے۔ مسائل بین الاقوام تعداد افراد سے طے نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ان افراد کی ذاتی قابلیت ان کے
متحد ہو جانے اور غرض مشترک پر ذاتی خواہشات کو فدا کر دینے کی قابلیت اور صلاحیت سے تصفیہ پاتے ہیں۔ یہ اک
ایسا اصول ہے جس کا ہر شخص قائل ہے۔

ممالک غیر کو چھوڑ کر خود ہندوستان ہی کے صفحات تاریخ اس پر شاہد ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا
تھوڑے ہی سے غور کے بعد اس اصول کو بہمہ صفت اس پر منطبق ہوتا ہوا پا سکتا ہے۔ وہ برأ العین مشاہدہ کر لیتا ہے
کہ ہندوستان کی عنان سلطنت جو ہمیشہ سے اقوام غیر کے ہاتھوں میں رہی ہے اس کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دیسی ریاستیں جو ابھی مردانگی، شجاعت اور دلیری وجوانمردی میں زبان زد روزگار رہی ہیں جہاں کا اک اک سورما بڑے بڑے قدآور پہلوانوں کو یکہ و تنہا زیر کردیتا ہے اور اک اک شخص دس دس کے لئے کافی ہوتا ہے۔ جہاں غیرت و محبت اس درجہ تھی کہ مفتوح ہونے سے جل کر فنا ہوجانا بہتر خیال کیا جاتا تھا وہاں جب اس سے زیادہ متمدن اور متحد ہوجانے والی قوم سے مقابلہ ہوا تو بالآخر یہ سب خوبیاں رکھی رہ گئیں اور آخر کار اس نے سب کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کردیا اور سب کی ہستی اس طرح فنا ہوگئی کہ اسلاف اخلاف کے لئے محض افسانہ ہوکر رہ گئے۔

یہاں تک تمدن کے حسن و قبح سے بحث کرکے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تاریخ تمدن کی بابت علماے زمانہ کیا رائے رکھتے ہیں۔ نوع انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین میں جہاں اس کی ابتدائی آفرینش کے مسئلہ پر بے حد قیل و قال ہے وہاں وہاں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ پیدائش انسان کس صورت اور ترکیب سے ہوئی یعنی کون سے قوائے عقلی، دماغی سے انسان مرکب و مرتب ہوکر دنیا میں آیا؟ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں ان کے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے اور یہ وحشی اقوام جو آج غیر مہذب اور غیر متمدن کہلائی جاتی ہیں کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں یا کبھی اس سے زیادہ بہتر حالت میں تھیں اور اب گردش زمانہ سے ایسی غیر متمدن ہوگئی ہیں یا یہ ہنوز اپنی فطرت پر ہیں؟ بالفاظ دیگر زمانۂ تمدن و تہذیب مقدم ہے یا زمانۂ وحشت و جہالت؟ اس مسئلہ پر دو فریق جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔

انسان کی ابتداے آفرینش کے بارے میں قدماء کی رائے کو نظر انداز کرکے انیسویں صدی کو یورپ میں ڈارون نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ جانور ہے اس نظریہ کو نظریۂ ارتقا یا اےولیوشنری تھیوری) کہتے ہیں۔ ڈارون اور ہکسلے اس نظریہ کے قائل ہیں اگرچہ ہنوز اس کے دلائل تکمیل کو نہیں پہنچے ہیں اور سلسلۂ استدلال کی بہت سی کڑیاں علم انسانی کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ثبوت کے مرتبہ کی محتاج ہیں۔ لیکن مدعیان کا یہ دعویٰ ہے کہ جس قدر سائنس میں ترقی ہوگی اور علم انسانی ترقی کرے گا۔ اسی قدر وہ کڑیاں بھی ثبوت مزید کے دستیاب ہوجانے سے مضبوط و مستحکم ہوتی جائیںگی، سردست جس قدر دلائل پیش کئے گئے ہیں ان کی آب و تاب نے اہل نظر کی آنکھیں خیرہ کردی ہیں اور عام طور پر یہی رائے مقبول ہورہی ہے اور نہ صرف ہدایت انسان بلکہ تمدن کے نشو و نما کے بارے میں بھی ترقی امد روز افزوں ترقی کا ہر شخص قائل ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے تمدن کی ابتدا کب سے ہوئی ہے؟ اس بارے میں بھی دو مذہب ہیں اور دونوں

متضاد ہیں۔ ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ انسان کی ابتدائی حالت وحشت وجہالت کی تھی وہ براہین و دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ
بمرورِ ایام سے انسان نے بتدریج مدارج تمدن طے کئے ہیں اور اسلاف سے اخلاف زیادہ متمدن ہوتے چلے آئے ہیں
لیکن اک دوسرا گروہ محققین کا یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اپنی بالکل ابتدائی حالت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ
ب ہے اگرچہ اس کو علوم حکمیہ اور علوم نفسیہ کا علم نہ ہو لیکن اس میں قوائے ذہنی اور عقلی کسی طرح بھی کمتر درجہ کے نہ تھے
سی فریق کے ایک بڑے حامی ڈیوک آف ارگائل کی رائے یہ ہے کہ "انسان اپنے اعلیٰ درجہ تمدن اور شائستگی کی
حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزل میں پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اس کا علم زائل ہو سکتا ہے اور اس کا مذہب
چھوٹ سکتا ہے۔" بہرحال محققین آخر الذکر اس بات کے حامی ہیں کہ وحشی جرگوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی
وئی خاص قوت نہیں ہوتی اور نہ اس امر کا کوئی خاص بین ثبوت ملتا ہے کہ انھوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو بلکہ بعض
اقوام کی یکساں حالت پر غور کرتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کا مادہ سرے سے موجود ہی نہیں، جہاں وحشی
اقوام آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے بے حد کد و کاوش کے باوجود بھی کوئی ثبوت گزشتہ تمدن کا نہیں پایا،
یعنی طبقات زمین سے کوئی علامت تمدن قدیم کی نمایاں نہیں ہوئی گویا اس گروہ کے نزدیک زمانہ ترقی کی جانب
مائل نہیں ہے۔

یہ مسئلہ اکثر معرضِ بحث میں رہا ہے اور ہر دو فریق اپنے دلائل سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے
ہیں لیکن اگر انسانی حالت کو بنظر غور و امعان مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ اک کمزور مخلوق برہنہ جسم
نازک بدن اور ضعیف الاعضا جس کی حفاظت جسمانی کے لئے نہ کوئی ہتھیار ہے نہ کوئی یار و مددگار۔ اس زندگی کے جدال و
قتال میں مبتلا کی گئی ہے وہ رفیع الشان کوہستان کو نظر اٹھا کر دیکھتی ہے اور ان کی عظمت اس کے دل میں وحشت پیدا
کر دیتی ہے۔ وہ سنسان بیابانوں، عمیق غاروں اور وسیع بر و بحر کا مشاہدہ کرتی ہے، شیروں اور ہیبت ناک درندوں کی
آوازیں سنتی ہے اور اس پر سخت ہیبت طاری ہو جاتی ہے، فلک نیلگوں، روشن ستارے، آفتاب و ماہتاب اس کی
آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دیتے ہیں اور یہ سب چیزیں اس کو محوِ حیرت بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ اس کے بھوک پیاس
گرمی سردی روز پیدائش سے دشمن ازلی اس کے ساتھ ہیں، یہ حالت اس وقت تھی جب نوع انسان نے کتم عدم سے
اس عالمِ رنگ و بو میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ لیکن اس کمزور مخلوق نے تمام حوادث طبیعی کا مقابلہ کیا اور ان کو مغلوب و مقہور کر کے

اپنا اس قدر مسخر کر لیا کہ وہ سنگلاخ پہاڑوں میں بآسانی سرنگ لگا لیتی ہے۔ بر و بحر میں برسوں کا راستہ دنوں میں طے کر لیتی ہے آفتاب ماہتاب سب اس کے ادنیٰ خادم ہیں تو کیا اس علمی تدبر اور تفکر کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان صرف ایک مادّی جسم کا نام ہے۔ اور وہ ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے؟ بلکہ اس مادّی انسانی جسم کے غلاف میں ایک ایسا جوہر مخفی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات سے امتیاز اور خصوصیت حاصل ہے اور وہ مایہ الامتیاز شئے نہ تو نطق ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے اور نہ محض دینداری جیسا کہ ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے۔ بلکہ در اصل وہ عقلی اور اخلاقی ترقی کرنے کی بیش بہا استعداد اور قابلیت ہے۔ جس کی کوئی حد و غایت نہیں مقرر کی جا سکتی حیوان ایک خاص اور مقررہ وقت تک ترقی کر سکتا ہے، لیکن انسان کے لیئے کوئی حد نہیں ہے اس دعوے کی دلیل میں دو مشہور مغربی فلاسفر کی رائیں قابل لحاظ ہیں، ایک فرانسیسی فلاسفر لاوروس (Larousse) نے دائرۃ المعارف میں انسانی ترقی کی نسبت لکھا ہے کہ "ترقی انسانی کے لئے کوئی خاص حد قرار دینا ایک ایسی حرکت ہے جو معیوب خیال کی جا سکتی ہے۔" ایلیسیو رنیاں (Renan) اپنی کتاب تاریخ الادیان میں لکھتا ہے کہ "میں نے انسان کی حالت کو بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے بعض اوقات انسان اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اس امر کی سعی بلیغ کرتا ہے کہ اس کو وہ سبب معلوم ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو غیر محدود اختیار اور نا متناہی اقتدار حاصل ہے، نیز یہ کہ وہ اس تمام مادّی عالم پر مسلط ہو جائے۔" اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے جوہر کی برتری اور گراں مائگی کے لحاظ سے ان تمام مادّی چیزوں میں ممتاز ہے۔ جن کو قدرت نے مجرد القویٰ پیدا کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انسان کبھی یکساں حالت میں نہیں رہ سکتا بلکہ یوماً فیوماً ترقی کے میدان طے کرتا چلا جاتا ہے لیکن جس طرح انسان میں فضائل و کمالات کی طرف غیر متناہی درجات تک ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی گئی ہے۔ اسی طرح رذائل کے نامحدود درجات کی طرف تنزل کرنے کی استعداد بھی اس میں رکھی گئی ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددنٰہ اسفل سافلین کے یہی معنی ہیں۔ انسان نہ تو کوئی آسمانی فرشتہ ہے نہ وہ حیوان لایعقل ہے کہ زندگی کے تاثرات اور اس کے آلام کا احساس اس کے دل میں نہ ہو یا ہو تو کمزور ہو بلکہ وہ ان دونوں درجوں کے درمیان میں ہے۔" اگر وہ اپنے نفس کا کماحقہ احترام کرے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو سکتا ہے اگر نفسانی فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی کرنے لگے اور بشریت کے تسلط کا مطیع ہو جائے تو تنزل کے عمیق ترین قعر میں غرقاب ہو جاتا ہے ۔

آدمی زادہ طرفہ معجونیست　　　کز فرشتہ سرشتہ وز حیوان

گر کند میل ایں بود بہ ازیں　　　ور کند میل آں شود بہ ازاں

تاریخ تمدن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تمدن انسانی کی تقسیم چار بڑے بڑے عہدوں پر ہوسکتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان نے کس طرح مدارج ترقی طے کئے پہلا وہ دور ہے جس میں انسان دیگر حیوانات کے ساتھ خلط ملط رکھتا تھا اور انھیں سے گھلا ملا رہتا تھا۔ اس کے گرد و پیش نہایت عظیم الجثہ جانور رہتے تھے جن کا اب صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ بعض مقامات پر اسفل ترین طبقات ارض میں ان کے ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں اور وہ بھی شاذ اس وقت انسان کی حالت محض چارپایوں اور درندوں کی سی تھی اور غالباً اس کی زندگی اور ایک جانور کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا اس کے کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور کمزور جانور موجود تھے اور اس کی بود و باش کے لئے پہاڑوں کے غار اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں۔

دور ثانی وہ ہوا جس میں اس نے اور دیگر پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور ان سے کام نکالنا شروع کیا۔ یہ عہد حجریہ (Stone age) کہلاتا ہے اس وقت اس کے کل کام یا تو خود اس کی قوتِ بازو سے نکلتے تھے یا پتھروں کے ذریعے سے، پتھر ہی اس کے آلاتِ حرب و ضرب تھے۔ پتھر ہی اس کے ظروفِ اکل و شرب تھے اور پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا یہ عہد تمام اکنافِ عالم میں مشترک ہے۔

دور ثالث وہ ہوا جس میں برنجی اور مسی آلات اور اوزار بنائے گئے۔ اس عہد مس و برنج کو (Copper age) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انھیں کے یہاں یہ عہد صدیوں تک قائم رہا لیکن پالینیشیا، جنوبی افریقہ اور وسطی امریکہ میں عہد حجریہ کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ دور چہارم جس کو آہنی عہد یا (Iron age) کہتے ہیں شروع ہوگیا۔ اس عہد میں آہنی آلات تمام سابقہ آلات و ظروف پر سبقت لے گئے۔ لیکن اس عہد میں بھی آلات حجر موجود رہے مگر فوقیت لوہے کو رہی۔ اسی طرح دور چہارم اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں میں پایا گیا اور سلسلہ ترقی پکڑتا گیا۔

لیکن چار عہدوں کے علاوہ اک اور صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کئے جاتے ہیں کہ پہلا وہ دور تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا وہ مختلف درندوں اور پرندوں کو مار کر اپنی قوت لایموت مہیا کرتا تھا۔ پھر

دوسرے دور میں اس نے ترقی کرکے ماہی گیری شروع کی۔ دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے اس نے جال وغیرہ تیار کئے۔ پھر میوہ برداری پر اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور فواکہات کے مزے سے اس کے کام و دہن آشنا ہوئے۔ اب اس حالت میں لسے درختوں کی مختلف فصلوں کا علم ہوا اور تجربہ نے اس پر وہ نکات و رموز منکشف کردیئے جن سے اس نے درختوں کا بونا اور کاشت کرنا سیکھا۔ اس زراعت میں اس کو اس قدر فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنون وحرفت و مشقت میں اس نے اپنا قدم رکھا اور سوشل خیالات اور پولیٹکل معاملات کا چرچہ شروع ہوگیا۔ اس سلسلہ میں شخصی انتقام کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جرم اس لئے سزا کے قابل ہے کہ اس سے سوسائٹی کے امن عامہ میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح اک قبیلہ کی حکومت، ایک شخص واحد کے ہاتھ سے نکلکر متعدد گھرانوں اور خاندانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر دائرۂ تمدن ترقی کرتے کرتے اس قدر بڑھا کہ ملکی اور قوموں کی حکومت کے لئے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئی۔

تمدن اور مذہب

اگر تواریخ عالم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے ان کے مذہب سے وابستہ ہے اور اقوام کے عروج و زوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے۔ یہاں تک کہ زمانۂ قدیم سے اب تک یہ امر زیر بحث ہے کہ ان میں سے کون سبب ہے اور کون مسبب؟ زمانۂ گزشتہ کے محققین اور نیز اہل مذہب اس رائے پر پہنچے ہیں کہ تمدن سبب ہے اور مذہب اس کا نتیجہ۔ ان کی تالیف و تصانیف مذاہب کی نسبت طعن و تشنیع سے مملو نظر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ان کی روشنی طبع سے اس قدر خیرہ ہوگئی ہیں کہ مذہب ان کے نزدیک دراصل کوئی چیز ہی نہیں ہے وہ مذاہب کو صفحہ ہستی سے محو ہوجانے کی دھمکی دے رہے ہیں چنانچہ اس موقع پر ہم چند یورپین فلاسفروں کی رائے ان کی مشہور و معروف تصانیف سے اخذ کرکے اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں:۔

میسو بنجمن کونشان (Benjamin Constan) نے اپنی مشہور کتاب میں جس کا نام "مذہب اور اس کا سرچشمہ اور اس کی شکلیں اور اس کی ترقی" ہے ان امراض سے بحث کی ہے جنھوں نے باطل اعتقادات کی مدد سے انسانی گروہوں کے جسم کو گھلا ڈالا ہے۔ اور اس کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کا علاج شخصی آزادی ضمیر یا کانشنس کی آزادی، اعتقاد کی آزادی اور تمام ضروری آزادیوں کے بغیر ناممکن ہے۔ پھر لکھتا ہے کہ "اس

طریقے سے مذاہب اپنے ہر قسم کے زنگ اور میل سے پاک وصاف ہو جائیں گے۔ مگر ہم کو یقین نہیں کہ ایسا ہو سکے کیوں کہ مذہبی اصول و قواعد میں سے کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو اور چونکہ یہ اصول و قواعد منافی علم ہیں اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام مذاہب اور دین ضرور ایک روز صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں گے ۔"
یہاں ایک مشہور فلسفی نے اپنی رائے کے مطابق تمام مذاہب کے لئے بغیر کسی استثنا کے یک قلم پیشین گوئی کر دی ہے کہ ان کا زوال لازمی اور ضروری ہے۔ آگے چل کر وہی لکھتا ہے کہ " ہر ایک قاعدہ خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جو آئندہ زمانہ میں ترقی کے لئے سد راہ ہوگی چونکہ وہ قاعدہ عرصہ کے بعد ایک ساکن شکل اختیار کرے گا جس کا اتباع عقل انسانی کے لئے اپنے انکشافات میں جن کی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے ناممکن ہوگا۔ اور جب ایسا ہوگا تو اس منجمد قاعدہ کا مذہبی احترام دلوں سے مفقود ہو جائے گا اور ایسے اصول و قواعد کی تلاش ہوگی جو ان جدید ترقیات اور انکشافات کے منافی نہیں ۔"

علامہ وریشں مذہب کی نسبت اک موقع پر لکھتا ہے کہ " مذہبی فضیلت اور بالخصوص اعلیٰ درجہ کی فضیلت جو اولیاء اللہ کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہے کہ تم سیاسی اور مدنی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کرو تاکہ تمہارے لئے یہ امر ممکن ہو کہ تم رنج و غم اور شکستہ دلی کے ساتھ جنت کے انتظار میں سوکھتے رہو اور اپنی تمام خصلتوں اور خواہشوں کو قتل کر ڈالو اور اپنے نفس کو مٹا دو ۔"
غرض یہ ہے کہ فلاسفۂ یورپ اور ماہرین علوم مغربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان کی ترقی کا انحصار علم کی ترقی اور اس کے نشو و نما پر ہے اور علم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ عقل کو اس کے قیود سے آزاد کر دیا جائے اور علمی مباحث کے لئے کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور روک ٹوک باقی نہ رہے تاکہ اس مزاحمت سے وہ بدترین نتائج پیدا ہوں جو قدیم زمانوں میں علمی اور مذہبی گروہوں کے باہمی جدال و قتال سے پیدا ہوئے تھے ان کا اعتقاد یہ ہے کہ عقل و علم کی آزادی پر انسان کی مادی اور ادبی صلاح و فلاح منحصر ہے۔

علامہ لادوس (Larousse) اک مقام پر اس طرح پر رقمطراز ہے کہ " جب ہم کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ہم معقول چیزوں کا اعتقاد رکھیں تو اہل مذہب کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پھر وہ انسانی عقل کے مطیع کرنے کی

کوشش کرتے ہیں جو عدل وظلم اور خیر وشر کے درمیان تمیز کرنے کا دعوی کرتی ہے اور جب وہ عقل وبصیرت کو اس قدر اندھا کر دیتے ہیں کہ کرامات اور خوارق عادات اس کو بالکل معمولی اور عادی امور معلوم ہونے لگتے ہیں اور عقل سفید سیاہ اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتی ہے تو مذہب کہتا ہے کہ اطاعت کرو۔ کس کی اطاعت کریں؟ آیا عقل کی اطاعت کریں اپنے نیچرل فرائض کی؟ ذاتی احساسات کی؟ حقیقی قوانین فطرت کی جو انسان کے لئے مفید ہیں؟ ہرگز نہیں مگر تم اندھے بن کر اس کی اطاعت کرو جو خدا کے نام سے حکم دیتا ہے اور اگرچہ وہ بادشاہ کے قتل کرنے یا باپ کے مار ڈالنے کا بھی حکم دے یا ایک قتل عام برپا کرنے پر آمادہ کرے کیونکہ تجھ میں نہ روح ہے نہ ضمیر بلکہ تو خدا میں فنا ہو گیا ہے"۔

یہ وہ اعتقادات وخیالات ہیں جن پر ہمارے علمائے یورپ مذہب کے بارے میں فخر کرتے ہیں اور تمام ترقیات کو اپنے ذاتی عقول پر منحصر کرتے ہیں لیکن وہ اس زریں اصول سے بے خبر ہیں کہ الدین ھو العقل ولا دین لمن لا عقل له۔ اس میں شک نہیں کہ عقل نوع انسانی کی بہترین خصوصیت ہے اور خدائے تعالیٰ کی افضل ترین نعمت جو انسان کو عطا کی گئی ہے جس مقصد کے لئے یہ عظیم الشان نعمت عطا ہوئی ہے اگر اسی مقصد میں استعمال کی جائے اور اس کی صحت اور اعتدال قائم رکھنے کے لئے توجہ مبذول کی جائے تو اس سے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ اس عقل کی بنا پر جہاں علمائے یورپ مذہب کے اس قدر مخالف ہیں وہاں وہ اس امر کا بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ مذہبی احساس نفس انسانی میں اک ایسا فطری اور طبعی احساس ہے جیسا کہ انسان کو غذا اور ہوا کی ضرورت کا احساس ہے۔ چنانچہ علامہ جلبیلر (Geller) ایک جرمن فلاسفر اپنی کتاب تاریخ الاعتقاد میں لکھتا ہے کہ "مذہب مثل اس احساس کے جس کا وہ نتیجہ ہے ہمیشہ رہنے والی چیز ہے مگر مذہبی علوم مثل دیگر علوم و فنون کے ہیں جو رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کرتے جاتے ہیں جس قدر کہ انسانی عقل ترقی کرتی ہے اور انسانی تعلق ہمیشہ حقوق اور علم قوانین کے درمیان موجود رہتا ہے۔

خود لاروس ہی مذہبی نظامات کی نسبت طعن کرنے کے لئے لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتی ہے وہ مذہب نہیں ہے بلکہ وہ عام خیال ہے اور قوت طبیعت اور نیز وہ احساسات ہیں جن کی نشو ونما سوسائٹی اور خاندان کے درمیان ہوتی ہے۔ جس قدر کہ معلومات اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اسی قدر

عام خیال بھی اپنی موجودہ سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہی اگر مذہب کی تعریف یہ ہی کہ وہ ایسے عمدہ خیالات کا مجموعہ ہی جو تمام انسانی افراد کو ایک ایسی سوسائٹی میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہی جس کے افراد مادی فوائد سے متمتع اور روشن خیال ہوں تو بے شک اس صورت میں یہ قول صحیح ہوگا کہ مذہب نوع انسانی کے لئے ایک ضروری اور لابدی چیز ہی۔"

یہ امر کہ عقل انسانی خواہ ترقی کرکے کسی اعلیٰ ترین درجے پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر وہ بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی اس کی واضح دلیل ہی کہ علمائے یورپ نے بھی باوجود مخالفت مذہب بالآخر مجبور ہوکر ایک مذہب تصنیف کیا جس کا نام مذہب طبعی رکھا۔ اس کے علاوہ ہم روزانہ برائے العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی قوت سے متمتع ہیں دولت و ثروت میں قارون ثانی ہیں اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کی زبردست تعلیم حاصل کی ہی لیکن باوجود ان تمام باتوں کے ہر وقت ان کو ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور بے چینی سخت محسوس ہوتی ہی جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہی ان کو اپنے دل میں ایک ایسا تکدر و ملال محسوس ہوتا ہی جس کا کوئی سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا اور جو صرف اسی وقت زائل ہوجاتا ہی جب مذہب کی شراب طہور کا ایک تسکین بخش گلاس ان کو مل جاتا ہی یہی وجہ ہی کہ وہ لوگ اس پر اس قدر فریفتہ اور دلدادہ ہوجاتے ہیں کہ بعض مرتبہ تمام دنیوی جاہ و جلال اس کے سامنے ان کو ہیچ معلوم ہونے لگتا ہی چنانچہ ڈاکٹر گل امریکہ کے مشہور پروفیسر جو حال ہی میں ہندوستان بغرض سیاحت تشریف لائے ہیں اپنے ایک لکچر میں فرماتے ہیں کہ" امریکہ میں باوجود اس قدر تمول کے اب جس چیز کی ہر دل میں جستجو ہی وہ اخلاق، کیرکٹر یا مذہب ہی" ان کی رائے ہی کہ دنیا میں کوئی شخص خواہ جسمانی دماغی یا مالی کتنی ہی ترقیاں کیوں نہ کرے بغیر کیرکٹر یا مذہب کے ہرگز قابل قدر و منزلت نہیں ہوسکتا۔ اور اک لامذہب سوسائٹی کے لئے سم قاتل ہوتا ہی جس سے تمدن کا شیرازہ بکھر جاتا ہی۔

مذہبی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے اب ہم موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی انسان کے مدنی الطبع ہونے سے بحث کرتے ہیں یہ امر مسلم الثبوت ہی کہ انسان فطرۃً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہی۔ یعنی انسانوں کی ایک جماعت کثیرہ کا راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچنے اور آئندہ نسلوں کو راحت و آرام سے عمر طبعی تک پہنچانے کی غرض

سے باہم مل کر بود و باش اختیار کرنا انسانی فطرت ہے۔

جب راحت کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچنے اور آئندہ نسلوں کو عمر طبعی تک براحت آسائش پہنچانے کے لئے ایک کثیر جماعت باہم مل کر رہتی ہے تب اس میں تعامل اور تعاون شروع ہوتا ہے یعنی تمام وہ امور جو شخصی اہلی اور نوعی زیست کے باقی رہنے اور بہتر ہونے کے لئے ضروری ہیں ان کو وہ بہت سے اشخاص آپس میں علی قدر مراتب بانٹ لیتے ہیں۔ ہر شخص کے تمام ان کاموں میں سے جو وہ روزانہ انجام دیتا ہے بعض ایسے ہوتے ہیں جو وہ صرف اپنی ذات کے لئے کرتا ہے اور زیادہ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں

تصاحب و تعامل سے جو مطلق آزادی کسی جزیرے کے ایک تنہا باشندے کو ہو سکتی ہے اس میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے، تنہائی میں وہ اپنے فعل کا خود مختار تھا لیکن اجتماعی زندگی میں یہ ناممکن ہو جاتا ہے، یہاں دوسروں کا خیال غالب ہوتا ہے، تنہائی میں صرف اپنی زیست راحت سے بسر کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں نوع انسان کے زیست کی فکر اس پر اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب جب کہ بالطبع مدنی الطبع ہونا ثابت ہو گیا تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کن اصول پر ہونا چاہیئے۔ آیا اس کو اس ذاتی خواہشات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا چاہیئے یا اپنی ضروریات زندگی کو مقدم سمجھنا ضروری ہے۔ جب ہر فرد کے انفرادی افعال جو زیست میں دخل رکھتے ہیں اس امتیاز سے کئے جائیں کہ وہ فاعل کی زیست کو راحت و آرام کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچائیں تب وہ نافع للذات کہلاتے ہیں اور جب وہ اس اعتبار سے کئے جائیں کہ اُن سے اپنی ذات کے برخلاف دوسروں کو فائدہ ہو تب وہ نافع للغیر کہلاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنے ذاتی مقاصد کی طلب کا نام انانیت ہے اور دوسروں کے مقاصد کی طلب کو اخوانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان میں راحت پسند اور محنت پسند ہونا دونوں امر طبعی ہیں اور وہی تمام ان افعال کی بناء ہیں جن کا تعلق زیست سے ہے۔ اس لئے تمام افعال خواہ وہ نافع للذات ہوں یا نافع للغیر باہم ایسے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ تصاحب و تعامل کی حالت میں جس قدر نافع للذات افعال واجب ہیں اسی قدر نافع للغیر بھی واجب ہیں، اب وہ اشخاص جو صرف نافع للذات افعال کرتے ہیں اور نافع للغیر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اصول تصاحب

وتعامل کو برہم کرکے قوم کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں اور چونکہ خود بھی قوم کے ایک فرد ہیں اس لئے ہلاک ہوجاتے ہیں
اسی طرح وہ اشخاص جو اپنا وقت عزیز زیادہ تر افعال نافع للغیر میں گزارتے ہیں اور ضروری نافع للذات افعال کی
پروا نہیں کرتے وہ بھی بالآخر فنا ہوجاتے ہیں"

ہربرٹ اسپنسر نے اس موضوع پر کافی توجہ کی ہے اور انانیت واخوانیت دونوں کے باہم توافق وتطبیق کی کوشش
کی ہے۔ اس نے دکھایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی اگر افراط پسندی سے کام لیا جائے تو خود اس کی
بربادی لازم آتی ہے اگرچہ ہر شخص اپنے ہی اغراض کا طالب ہو تو کسی ایک فرد کی بھی غرض حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے
کہ ہر شخص اکثر حالات میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے اور تمام افعال اپنی زیست کے لئے انجام نہیں دے سکتا۔
دوسری طرف اگر ہر شخص اپنی ذات کو تمام تر صرف دوسروں ہی کے لئے وقف کردے تو یہ خود ان کے لئے مضر
ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ اگر ہر شخص خود اپنی خبرگیری سے بے پروائی برتے تو وہ اس اہلیت اور قابلیت کو نقصان عظیم
پہنچانے گا جو اس میں دوسروں کی اعانت کی ہے اور اصل فائدہ مفقود ہوجائے گا۔ اس بحث کو فلاسفر مذکور نے
نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کیا ہے اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہمارا مقصد نہ تو خالص انانیت ہونا چاہیئے
اور نہ محض اخوانیت بلکہ ان دونوں کی تطبیق وتوفیق۔

لیکن یہاں اگر ذرا نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ فی الحقیقت انانیت اور اخوانیت میں
اس سے بھی کم منافات اور تباین ہے جیسا کہ ہربرٹ اسپنسر کو نظر آتا ہے اس لئے کہ نفس کی حقیقی تکمیل صرف
مقاصد اجتماعیہ ہی کی تکمیل سے ممکن ہے۔ چنانچہ ہیگل کا مقولہ ہے کہ "ہم اپنی تکمیل اپنی قربانی ہی سے کرسکتے ہیں"
اور اس طریقے سے ممکن ہے ہم کو اپنی ذات کا تحقق ہوتا جاتا ہے۔ اسی حد تک کلی نقطۂ نظر سے قریب ہوتے جاتے ہیں
یعنی وہ نقطہ نظر جس سے ہماری نگاہ میں اپنی شخصی بھلائی کسی دوسرے کی بھلائی سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتی۔ اس میں
شک نہیں کہ اپنی انفرادی ترقی کا خیال دوسروں کی ترقی کے مقابلہ میں ہمارے لئے ہمیشہ لازمی ہے۔ کیونکہ اپنی
ذاتی ضرورتوں کو ہر شخص خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے اور اپنی ذاتی ترقی وتکمیل کے وسائل خود ہی خوب جانتا ہے۔ لیکن
اپنی ذات کی فلاح اندیشی جماعت کی فلاح اندیشی کے نقطہ نظر پر مبنی ہو تو اس کو صحیح معنوں میں انانیت نہیں کہا جاسکتا
اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کی تکمیل ہے لیکن جماعت کے لئے جس میں ذاتی خواہشوں کو اجتماعی منافع

کے لئے قربان کردیا جاتا ہے اور ذاتی ترقی کا اصل مقصد اجتماعی ترقی ہوتی ہے۔ جب یہ تسلیم ہوجائے تو انانیت اور اخوانیت میں کوئی تعارض باقی نہیں رہتا کیونکہ اس صورت میں ہم نہ صرف اپنی بھلائی چاہتے ہیں اور نہ محض دوسروں کی بلکہ دونوں کی، اور یہ سمجھ کر کہ دونوں ایک ہی کُل کے جزو ہیں۔

انفرادی ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے بالکل نیست ہے۔ چنانچہ ارسطو نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ "وہ ایک سیاسی حیوان ہے" اور اخلاقیات پر جب تک اس کو سیاسیات یعنی علم جماعت یا سوسائٹی کا ایک جزو نہ قرار دیا جائے تسلی بخش بحث نہیں ہوسکتی کیونکہ جس قدر بھی فرائض و محاسن اخلاق ہیں وہ ہر قدم پر ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط پر موقوف ہیں اگرچہ دور جدید انفرادی آزادی اور شخصی حریت کا حامی نظر آتا ہے، لیکن حکمائے قدیم کے خیالات اس کے بالکل برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون کی مشہور کتاب "جمہوریت" ہے جس میں وہ انسان کی اجتماعی فطرت سے اس درجہ متاثر تھا اور اجتماعی پہلو سے حیات انسانی کے مطالعہ کو اس قدر ضروری جانتا تھا کہ انفرادی محاسن اور شخصی آزادی کی تحقیق کی بجائے پہلے اس نے اچھی حکومت کے ممیزات معلوم کرنے کی کوشش کی، ان پر کافی روشنی ڈالنے کے بعد اس کے نزدیک عمدہ شخص واحد کا امتیاز نہایت آسان تھا، یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات میں افلاطون کی سب سے بڑی تصنیف اس کی کتاب جمہوریت ہے جس میں اس نے ایک نصب العین حکومت کا خاکہ کھینچا ہے؛ یونانیوں کے عام رائج تقسیم کی رو سے اس حکومت کے وجود کے لئے افلاطون کے نزدیک چار بڑے فضائل کا کسی شخص واحد میں پایا جانا ضروری تھا یعنی حکمت، شجاعت، عفت، اور عدالت ان فضائل کی جو اہمیت حکومت کے لئے ہے اس سے وہ انفرادی زندگی میں ان کی اہمیت کا نتیجہ نکالتا تھا۔

نہ صرف افلاطون بلکہ ارسطو کو بھی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کچھ کم دعویٰ نہ تھا۔ اس نے اخلاقیات پر جو بلند پایہ کتاب لکھی ہے اس کا حصۂ اولین یہی ہے کہ اخلاقیات سیاسیات کا ایک جزو ہے۔ اس کی تصنیف ان تمام فضائل سے مملو ہے جو کسی حکومت میں عمدہ شہریوں کے لئے ضروری ہیں اور جن کو وہ یونان میں موجود پاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ یونانیوں کا بہترین علم اخلاق ایک ایسی حکومت کے تخیل پر مبنی ہے جس کے اندر رہ کر افراد کو اپنی زندگی کی تکمیل کرنا چاہیئے۔ اور فرقہ رواقیہ یا (Stoic philosophers) کا مسلک صرف اس وقت وجود میں آیا جب کہ یونانی حکومت کا زمانہ گزر چکا تھا، اور ان پر روم کے باشندے فاتحانہ حکومت کرتے رہے تھے۔

رواقیت کی رو سے نکوکار انسان جس کو وہ حکیم کے نام سے موسوم کرتے تھے کسی خاص رشتہ اجتماعی کا پابند نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اپنی مستقل اور آزاد زندگی رکھتا تھا لیکن باوجود اس کے وہ اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک اعلیٰ اخلاقی عمدہ آدمی شہری ہوتا ہے۔ ان کی تعلیمات جسمانی، روحانی اور اخلاقی بلند اور اعلیٰ تھیں لیکن اصول تمدن سے اجتماعی روابط کی ان میں بہت کمی پائی جاتی تھی جس نے ان کو زمانہ کی نظروں میں تقریباً بے معنی اور خارج از انسانیت بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات انفرادی آزادی کے قریب لفاظیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے یہاں آکر ہم کو اس کا بھی انکشاف ہوجاتا ہے کہ مسیحیت میں رہبانیت کس حد تک جائز ہے۔ اس رواقیت کے اصول پر مسیحیت نے بھی یہی راہ اختیار کی یعنی عیسائی مذہب کی بنیاد بھی بلا قید ملک و ملت رواقیت ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی مستقل بالذات اور مستغنی عن الاجتماع حیات کی قائل نظر آتی ہے۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ "ہر شخص کو خود اپنی نجات کی راہ نکالنا چاہیئے اور زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے والدین، اعزہ و اقارب اور دوست احباب تک چھوڑ دینا چاہیئے۔ چنانچہ بڑے بڑے خدا پرست جنگل بیابان یا پہاڑ کی کھوہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا پسند کرتے رہتے ہیں اور اس متمدن زندگی پر اس رہبانیت کی زندگی کو بہمہ وجوہ ترجیح دیتے ہیں لیکن اگر اصول مسیحیت اور اس زمانہ کے حالات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت کو اپنے زمانہ میں چونکہ ایک بالکل نئے حالات کی دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اس لئے لازمی طور پر اس کو شروع میں رہبانیت پر کسی قدر زیادہ زور دینا پڑا لیکن جب اس نے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی دنیا کو فتح کر لیا تو اس کا اجتماعی رخ سامنے نظر آنے لگا اور بالآخر وہ اس امر پر زور دینے میں بھی کسی دوسرے مذہب سے پیچھے نہیں رہا کہ ؎

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

اور کمال اسی کے لئے خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اتحاد و اتصال ضروری ہوگیا چنانچہ عیسائی دنیا میں اب بھی روح زیادہ اہم وضروری خیال کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد جب ہم مذہب اسلام کی طرف نظر کرتے ہیں تو صاف الفاظ میں ہم کو نظر آتا ہے کہ **لا رھبانیۃ فی الاسلام** یعنی اسلام میں غیر متمدن زندگی کسی طرح جائز ہی نہیں ہے۔ اصول شرع یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی غیر متمدن زندگی بسر کرکے عاقبت میں نجات کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ رہبانیت کی زندگی کو سرے سے ہی ناجائز بتاتے ہیں اور اگر ذرا بھی غور و خوض سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ دراصل انسان ایک دوسرے کا دنیوی ضروریات میں اس قدر محتاج بنایا گیا ہے کہ وہ رہبانیت کی

زندگی براحت بسر نہیں کرسکتا یہ مسئلہ اس وقت بالکل صاف ہوجاتا ہے جب یہ فرض کرلیا جائے کہ کسی خاص جگہ کے تمام باشندے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگیں۔ قیاس اس کو تسلیم نہیں کرسکتا کہ ان کی مایحتاج اشیاء کی فراہمی کس صورت سے ممکن ہے جب ایک اصول چند افراد کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ محال محض ہو تو اقوام کے لئے وہ کس طرح قابل تقلید ہوسکتا ہے انسان کو شخصی زندگی قائم رکھنے والی چیزوں کے بعد جس اشد ضرورت کا احساس ہوتا ہے وہ نوع انسان کے گروہ کو یکجا جمع ہوکر رہنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر انسان ذاتی طور پر بالکل آزاد ہے اور کوئی چیز اس کو مقید نہیں کرسکتی لیکن اس کا اگر دوسرا رُخ اُلٹا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اس قدر ضعیف اور عاجز ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی حفاظت کی غرض سے اس آزادی کا ایک بہت بڑا حصہ قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے علمائے تمدن کا اتفاق ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے برخلاف اجتماع کے لئے مجبور ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے اور وہ اس سے کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہوسکتا لہذا ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہوکر رہے

بجز دیوانوں اور فاتر العقل لوگوں کے باقی ہر شخص کی زندگی تقریباً ایک مربوط شیرازہ ہوتی ہے اس کے افعال کم و بیش ایک مرتب نظم و نسق کے تحت میں واقع ہوتے ہیں۔ اوّل روز سے جب وہ اس عالم میں آنکھ کھولتا ہے تو اس کو ضروریات زندگی دوسرے کی طرف دست سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہے، ایک شیرخوار بچہ کو جب بھوک بیتاب کرتی ہے تو وہ روکر اپنی ماں سے دُودھ طلب کرتا ہے، جب وہ بڑا ہوتا ہے تو ستر پوشی کے لئے اس کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس طرح جب شیر مادر سے اس کا تغذیہ بند ہوجاتا ہے تو حیوانات اور نباتات کی طرف اس کو اپنی توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے جس قدر وہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کی ضروریات زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور روز بروز بے حد ہوتی جاتی ہیں۔ ان تمام ضروریات کو ایک فردِ واحد کسی طرح تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ دیگر افراد بنی نوع مل کر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی ضرورت کی انجام دہی میں وقت صرف کرتے ہیں۔

ایک بڑھئی عمدہ عمدہ کرسیاں، الماریاں اور انواع و اقسام کا فرنیچر تیار کرتا ہے وہ سب اس کی ذات خاص کے لئے بالکل بے کار ہے لیکن ایک عمدہ کوٹھی یا محل کے لئے نہایت ضروری ہے، بڑھئی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اناج اور کپڑا ہے لیکن وہ خود اس کے پیدا کرنے یا بنانے سے عاجز محض ہے۔ ایک کسان غلہ دے کر بڑھئی سے کولھو یا ہل تیار کرالیتا ہے، لوہار سے دیگر آلاتِ زراعت لیتا ہے، دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہے۔ درزی سے کپڑے سلواتا ہے۔ غرض ایک پیشہ ور کا

کام دوسرے پیشہ ور سے بآسانی نکل جاتا ہے اور اسی طرح متمدن زندگی ترقی کرتی جاتی ہے۔ اب ہر جگہ کا جداگانہ تمدن کہ وہاں کے باشندے کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں اس کے لئے کوئی خاص قانون مقرر نہیں ہو سکتا۔ آزاد رو سے آزاد رو اور وحشی سے وحشی شخص بھی اپنے اجتماعی ماحول کے اثر سے کلیۃً محفوظ اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا، جو جماعت، قوم یا نسل جس آب و ہوا یا خطہ زمین میں بود و باش اختیار کرتی ہے۔ اس کے ماحول سے اثر پذیر ہونا اس کو ناگزیر ہے۔

اسی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کا تمدن مختلف ہوتا ہے یہی اخلاقی آب و ہوا جس میں کوئی شخص زندگی گزارتا ہے اس کی خواہشوں کا اصلی عالم ہو جاتی ہے لیکن اصولاً ہر انسان اپنی ذات کو ذات نہیں بلکہ کسی جماعت کا ایک جزو سمجھتا ہے یہ ایک ایسی واضح خصوصیت ہے کہ مِل جیسے مصنف تک نے جو بعض حیثیات سے سخت انفرادیت کا قائل ہے اسی پر زور دیا ہے وہ کہتا ہے کہ " اجتماعیت اس قدر فطری اور لازمی شے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات یا عمداً تجرد کی کوشش کے سوا انسان اپنی ذات کا جماعت سے علیحدہ تخیل کر ہی نہیں سکتا اور جس قدر نوع انسان وحشیانہ عہد کی آزادی سے دُور ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ شیرازہ زیادہ مستحکم و مضبوط ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول کی جو چیز کسی حالت اجتماعی کے لئے لازمی ہوتی ہے وہ روز بروز ہر فرد جماعت کے تخیل کا غیر منفک جز بن جاتی ہے "

لہٰذا ہم جب کسی جماعت کو مشترک زبان، مشترک قانون، مشترک مذہب اور مشترک مقاصد کے رشتہ سے باہم پیوستہ دیکھتے ہیں تو ایک وسیع معنی کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی عالم میں زندگی گزارتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں شخصی اور انفرادی امتیازات قائم رہتے ہیں، بعض اشخاص ان مشترک رشتوں سے کم وابستہ ہوتے ہیں اور بعض زیادہ، بلکہ بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لحہ ہر آن ان میں سے ہر ایک کے عالم میں کافی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، تاہم مقامی رسوم و ماحول کا اثر ان کے شخصی امتیازات پر غالب ہوتا ہے۔ دوسروں کے متعلق معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی احتیاج بطور خود ہی کسی جماعت کے افراد میں ایک مجانست و موانست پیدا کر دینے کے لئے کافی ہیں اور جب اس پر تعلیم و تربیت کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی زندہ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے اہل یورپ اور بالخصوص اہل امریکہ موجود ہیں یہ لوگ ایک زبان رکھتے ہیں، ایک قانون کی کڑی سے منضبط ہیں اور اپنے تمام اجتماعی مقاصد میں بھی ہم آواز ہیں تعلیم و تربیت، اتحاد و انسیت سونے پر سہاگہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ متمدن اسی ضروریات زندگی میں بافراغت

بسر کرنے اور دیگر اقوام پر بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتے ہیں۔ موجودہ عظیم الشان جنگ میں امریکہ کا نمایاں حصہ اظہرمن الشمس ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان ہے جہاں چپہ چپہ کی زبان مختلف، ہر قوم و جماعت کا مذہب نیا، ہر ایک کا جداگانہ قانون نہ کوئی غرض و غایت مشترک، نہ اتحاد و موالنست، ایک دوسرے کا دشمن، ایک کی ترقی دوسرے کے لئے باعث حسد ہے۔ جگہ جگہ کا رسم و رواج مختلف، کسی ایک فرقہ کا لباس دوسری جماعت کے لئے باعث ننگ و عار ہے اور ایک قوم کا اکل و شرب دوسروں کے لئے باعثِ تضحیک و استہزا ہے۔ جہاں مغایرت کا یہ عالم ہو وہاں کی تمدنی حالت اور ترقی ظاہر ہے۔ اقوام سے لے کر ایک ایک فرد تک زندگی سے کوسوں پیچھے ہے اور مجبوراً تقلید کا حامی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی متحد قوم کے زیر اثر رہا ہے۔ اور ان کے طرز اور تمدنی معاشرت کو احتراماً واجب سمجھتا ہے۔

زمانہ حال کے مختلف مصنفین اس خیال کے حامی ہیں کہ جس طرح کسی جاندار کے جسم کے تمام اعضا میں ایک مشترک حیات کا کام کرتی ہے۔ اسی طرح کی ایک مشترک حیات انسانی جماعت کے مختلف اعضا یا افراد میں بھی پائی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس خیال کو تمثیل کے پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ یعنی انسانی جماعتوں اور حیوانی یا نباتاتی اجسام کی ساخت میں وجوہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تمثیلات بعض اوقات حقیقت فہمی میں معین ہوتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان سے بصیرت اور حقیقت رسی کی بجائے ذہانت اور طباعی کا ثبوت زیادہ ملتا ہے۔ بہر نوع انسانی شخصیت کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے بلکہ دوسری شخصیتوں کے ساتھ کچھ روابط قائم کئے بغیر اس کا تصور تک ناممکن ہے۔ انسان کی زندگی کا دارومدار انھیں روابط پر منحصر ہے۔ جن سے الگ کر لینے کے بعد یہ فنا ہوجاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ کسی عضو کو جسم سے کاٹ لیں تو وہ مردہ ہوجاتا ہے۔ آدمی کی زندگی جس نصب العین اور جن اخلاقی رسوم و عوائد میں نشو و نما پاتی ہے وہی اس کی اخلاقی زندگی کا تمام تر آب و رنگ ہوتے ہیں۔

فرائض تمدن جہاں ماہرین فلسفہ متفقہ طور پر اس کے حامی ہیں کہ نوع انسانی کے تمدن پر ملک یا آب و ہوا، غذا سرزمین اور مناظر فطرت اپنا کافی اثر ڈالتے ہیں وہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ نتائج جس چیز سے انسانی تمدنی زندگی پر مترتب ہوئے ہیں وہ اس کی فراہمی دولت ہے۔ ہر ملک ملت میں جب ایک خاص حد تک دولت جمع ہوجاتی ہے اس وقت وہ مختلف طریقوں سے ترقی کرنا شروع کرتے ہیں۔ خود علم کی ترقی، دولت کی افزونی سے وابستہ ہے۔ جس وقت تک ہر فرد خود اپنی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں ہمہ تن مصروف

رہے گا۔ اس وقت تک نہ تو کسی کو اعلیٰ ترین مشاغل کا ذوق و شوق ہوگا۔ اور نہ اس کی فرصت ملے گی کہ کوئی جدید ترقی کی جا سکے۔ اگر کسی سوسائٹی کے تمام افراد اس قدر صرف کر دیں جس قدر کہ وہ کماتے ہوں تو ان کے پاس کچھ سرمایہ ان لوگوں کے لئے نہ بچے گا جو فراہمی سرمایہ کے ناقابل ہیں۔ لیکن اگر خرچ سے آمدنی زیادہ ہوگی تو بافراغت لوگوں کی ایک ایسی جماعت قائم ہو جائے گی جو زیرک و فہم و عقل و دانش میں اپنے سے زیادہ متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہ ہونگے اور تھوڑے ہی عرصہ تک وہ ملک ترقی کرتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کی ضرورت باقی بھی نہیں رہے گی کہ تمام اشخاص انفرادی حیثیتوں سے علیحدہ علیحدہ رزق رسانی کے لئے محنت کریں بلکہ وہ اپنا وقت اس سے زیادہ کارآمد کام میں صرف کریں گے اور علم و عقل کی روشنی میں مختلف طلسمات نیرنگ عالم دیکھ سکیں گے اور اس طرح ایجاد و اختراع کا دروازہ کھل جائے گا۔

اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ قوانین انسانی اور حقوق الناس متمدن زندگی میں کس درجہ اثر رکھتے ہیں۔ یہاں یہ امر واضح ہو جانا چاہیئے کہ کسی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا انحصار صرف اکراہ اور اجبار پر موقوف ہوتا ہے۔ اس میں سلاطین وقت یا ان کے قوانین مروجہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے کیونکہ وہ اقوام جو بالطبع مطلق العنان ہوتی ہیں۔ ان کے لئے رعب سلطانی اور قوانین ملک بالکل بے اثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر وہ اقوام جو اصل معنوں میں امن پسند اور عاقل ہو جاتی ہیں تو ان کے لئے بھی قوانین کی فطرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی جو قوانین کہ ایک خاص وقت میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہی دوسرے وقت بے کار اور بتدریج مضر ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے بہترین اصول یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سخت اور قطعی قوانین وضوابط قائم کئے جائیں۔ افراد میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان میں فضائل حسنہ پیدا ہوں اور اعمال و افعال پسندیدہ پیدا ہوں لیکن ابتدا میں ناروا آزادی کی روک تھام کے لئے قوانین کا وجود ضروری ہے۔ چونکہ جس چیز کو لوگ اول خوف سے کرتے ہیں وہ بتدریج عادت ہو جاتی ہے اور پھر اسی کو وہ اپنی شعوری آزادی سے انجام دینے لگتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ اول قانون وجود میں آتا ہے پھر عادت اور پھر نیکی۔ اصل منشا قانون لوگوں کے حقوق و فرائض کی اقامت اور تنظیم ہے اور یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ جب ایک شخص کوئی حق رکھتا ہے تو دوسروں پر نہ صرف اس حق کی حرمت فرض ہو جاتی ہے بلکہ ساتھ ہی اس حق کو فلاح عامہ کے لئے استعمال کرنے کا فرض بھی اس پر عائد ہو جاتا ہے۔ یعنی حقوق الناس کے یہ معنی ہیں کہ رفاہ عام کے لئے اس کو بعض چیزوں کا مالک بنا دیا گیا ہے۔

حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل حقوق اللہ دوم حقوق العباد۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت

تخلیق اشرف المخلوقات کی بنا یا انتہا صرف ان دونوں اقسام کے حقوق کا اپنی زندگی میں کامل طور پر انجام دینا ہے حقوق اللہ سے وہ حق مراد ہیں جو خالق مطلق نے اپنی مخلوق کے ذمہ عائد کئے ہیں۔ ان حقوق کا ادا کرنا ہر فرد انسانی کے لئے خالق مطلق کی رضا جوئی کی غرض سے فرض ہے اگر اس کی غرض و غایت خوشنودی خالق نہ ہوگی تو وہ حق پورا نہ ہوگا۔ حقوق اللہ کی بابت اس قدر کہنا کافی ہے۔

دوسرے حقوق العباد ہیں ان میں سے بعض حقوق وہ ہیں جن کا تعلق افراد کو صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک شخص کے ذمہ دوسرے کے حقوق بحیثیت نوع انسان واجب ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے ہم ذاتی فرائض کو لیتے ہیں۔ ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ترکیب انسانی دو اجزاء سے ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں۔ ان میں سے ایک جسم اور دوسرا روح ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کی طبائع بالکل متغائر ہیں لیکن ان دونوں میں ایسا عجیب و غریب اتحاد پایا جاتا ہے کہ ایک کے موثر ہونے پر دوسرا ضرور موثر ہوتا ہے۔ لہذا ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ ان دونوں جوہروں کی حفاظت بخوبی کرے۔ علامہ لاک لکھتا ہے کہ "وہ سعادت و فلاح جس سے دنیا میں فائدہ اٹھانا انسان کے لئے ممکن ہے اس کے واسطے دو چیزیں لازمی ہیں اول عقل صحیح دوسرے جسم سالم" یہ دونوں نعمتیں تمام دیگر نعمتوں کی اصل ہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ دونوں موجود ہیں وہ خوش قسمت ہے۔ چونکہ یہی دونوں سعادت اور شقاوت کی بنیاد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو دو قسم کی ضروریات ہوتی ہیں ایک وہ ضروریات جو نفسانی سعادت اور روحانی فلاح کو مستلزم ہیں اور دوسری جسمانی ضروریات جو جسمانی سعادت کو مستلزم ہیں۔ اب نفسانی یا روحانی ضروریات تو وہ ہوئیں جن کے استعمال میں لانے سے انسانی نفس صحیح سالم اپنے فرائض کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے جو اس دنیوی زندگی میں اس کے ذمہ فرض کئے گئے ہیں۔

اب ان حقوق الناس میں سے جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے منجملہ دیگر حقوق کے اہم ترین حقوق حقوق زندگی آزادی، ملکیت، معاہدہ اور تعلیم قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا ہے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ تکمیل نفس ایک شخصی چیز ہے۔ ورنہ اگر آپ کو غیر شخصی چیز تصور کر لیا جائے تو پھر شخصی حیات اس پر قربان ہو سکتی ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نفس یا شخصیت کی تکمیل مقصود بالذات ہے وہ دراصل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اجتماعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ

بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں جہاں افراد کی قربانی جماعت کے لئے مستحق قرار دی جاتی ہے لیکن یہ صورتیں در اصل مستثنیات میں سے ہوتی ہیں۔ عام طور پر یہ اصول مسلمہ نہیں ہے بلکہ عمومی حیثیت سے انسانی فلاح، انسانی حیات کی بقا اور تحفظ اس کی مقتضی ہے۔ اس لئے حرمت حیات کا حق تمام حقوق میں اول ہے۔ غیر متمدن اقوام میں اس حق کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا اپنے ذاتی فوائد کو ملحوظ رکھ کر بچوں کو معرض ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں۔ اسیران جنگ اکثر بے دریغ تہ تیغ کر دیئے جاتے ہیں۔ متمدن اقوام اس حق کا پاس و ادب زیادہ کرتی ہیں۔ اور حتی الوسع ان مواقع سے احتراز کرتی ہیں جہاں اس حق کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حق زندگی کے بعد حق آزادی ہے۔ انسان فطری اور خلقی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے اس کو آزادی کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کسی ہادی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ انسان میں آزادی کا احساس منجملہ ان احساسات کے ہے جس کی طرف انسان فطرتاً مائل ہوتا ہے۔ یہی وہ آزادی ہے جس کا شعور ہر ذی عقل انسان اپنے نفس میں پاتا ہے تمام تاریخی واقعات اور حادثات جو تمام اقوام میں ہوئے ہیں اسی آزادی پر مبنی ہیں۔ وہ کون سی آزادی ہے جس کے وصول کی غرض سے یورپ نے نہایت جاں بازی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اپنی عزیز جانیں قربان کر دی ہیں؟ وہ کون سی آزادی ہے جس کی نسبت میسیو دی دیو (Deveux) کہتا ہے الحریۃ ھی اصل کل رقی الانسان "آزادی دنیا کی ہر قسم کی سعادت و فلاح سے افضل ہے" اور جس کی نسبت میسیو پاپچے لکھتا ہے کہ "آزادی ہر ایک انسانی ترقی کی اصل اصول ہے" اور جس کی وکٹیر ہیگو اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ "آزادی ایک ایسی ہوا ہے جو نفس انسانی کی زندگی کے لئے ایک ضروری چیز ہے" کیا اس آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان تمام قیود اور ہر قسم کے روابط سے آزاد ہو کر محض بے قید اور مطلق العناں ہو جائے۔ اگر اس آزادی کو اس کے ہم معنی کہا جاتا ہے تو یہ اس لفظ کا ناجائز استعمال ہے۔ خود سری یا مطلق العنانی کسی حالت میں بھی کسی خوش نظم یا متمدن سوسائٹی میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس سے تو یہ مراد ہوگی کہ کسی جماعت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ جو اس کا دل چاہے کرے۔ وہ آزادی جس کے اشتیاق میں تمام قوموں کے فلاسفر بے چین ہیں وہ معتدل آزادی ہے جس کی بدولت انسان اپنی تمام قوتوں کو جو قدرت سے اس کو عطا کی گئی ہیں بغیر کسی مزاحمت و خوف کے استعمال کر سکے۔ بشرطیکہ وہ ان حدود مقررہ سے تجاوز نہ ہو جو عادلانہ قوانین نے قرار دی ہیں کیونکہ اگر ان حدود سے تجاوز ہوگا تو وہ

قوم کے دیگر افراد کے لئے مضر ثابت ہوگا اور اس طرح اصول تمدن کے خلاف ہوگا۔

اس معتدل آزادی کے ضمن میں نفس کی آزادی، عقلی آزادی اور علمی آزادی آسکتی ہیں۔

حق آزادی کے بعد حق ملکیت آتا ہے اس سے جو فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ اور عادلانہ طور پر فلاح عامہ کے لئے استعمال کیا جائے وہ اقوام جو اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں ان کو یہ حق نہیں دینا چاہئے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اقوام میں یہ حق بالکل مفقود ہے۔ افلاطون کا یہ خیال ہے کہ ایک اعلیٰ نظام حکومت میں تمام چیزیں مشترک ہونا چاہئیں۔ اس کے نزدیک ملکیت شخصی کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر زمانہ موجودہ میں بالشویک حق ملکیت کو شخص ملکیت سے نکال کر ہر فرد بشر پر یکساں مشترک ملکیت میں دینا چاہتے ہیں وہ افلاطون کے اس معنی میں بھی ہم خیال ہیں کہ عقد یا نکاح بالکل لغو شے ہے۔ توالد و تناسل یا ترقی نسل کے لئے من جملہ دیگر اشیاء کے عورت کو بھی کسی شخص کی ملکیت میں نہ ہونا چاہیئے اس مشترک یکساں ملکیت سے جو اقوام کو نقصان پہنچتے ہیں ان کا اندازہ ان اقوام کی حالت دیکھنے سے بخوبی ہوجاتا ہے جن میں یہ اصول عرصہ تک ہی رائج رہے ہیں۔

دیگر اشیاء کی مشترکہ ملکیت سے جو ایک حد تک ناممکن الوقوع ہے صنف نازک کو ہی دیکھئے کہ جن مذاہب یا اقوام میں اس کا رواج ہے وہ آج مہذب اور متمدن اقوام میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ دراصل بے حیائی اور بے شرمی کا مجسمہ ہیں۔

حق معاہدہ وہ اخلاقی فرض ہے جس سے باہم ایک دوسرے سے جو معاہدہ ہو اس کو پورا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے تمدن کے ابتدائی درجات میں معاہدہ کوئی شے ہی نہیں ہوتی۔ اور ایفائے وعدہ سے ہر شخص ناآشنائے محض ہوتا ہے وہاں قوت بازو فیصلہ کن رکن ہوتا ہے۔ ہر وہ فرد جس میں سے نسبتاً دوسرے اشخاص سے قوت و طاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنا کام نکال لیتا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں اپنی طبیعی حالت سے معاہدہ کی طرف ترقی کرتی ہیں" جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر متمدن سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عہد یا معاہدہ کو جو آپس میں طے ہو ہر حالت میں پوری پابندی کے ساتھ وفا کرے۔ اگر ایفائے عہد کسی سوسائٹی سے مفقود ہوجائے تو اس کے افراد میں اتحاد و موانست ایک منٹ بھی قائم نہیں رہ سکتا اور نتیجہ پوری جماعت کی بربادی ہوتا ہے۔

اسی طرح تعلیم سے وہ حق مراد ہے کہ جس کے ذریعے سے نفس عاقلہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایک اعلیٰ نظام اور متمدن

سوسائٹی کے لئے نہ صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم ضروری اور لازمی چیز ہے۔ جس کے بغیر متمدن ہونا محال ہے۔ تمام کتب سیر اس پر شاہد ہیں کہ تمام وہ اقوام اور ممالک جو تمدنی ترقیات میں پیچھے ہیں وہ ہمیشہ سے تعلیم میں بالکل بے بہرہ رہی ہیں غیر متمدن زندگی کے زنگ جو چیز صیقل کرکے صاف کرتی ہے اور اس کو ابھار کر متمدن طبقہ سے لا ملاتی ہے وہ صرف تعلیم ہے اس سے واضح ہوگیا کہ تمام جماعتوں کے لئے جو تمدنی زندگی میں فائق ہونا چاہتی ہیں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کریں آج تمام وہ اقوام جو مدارج تمدن کے اعلیٰ پر نظر آتی ہیں صدیوں پہلے سے اپنے افراد کی تعلیم میں منہمک اور سرگرداں رہی ہیں۔ جب ان کے نفوس عاقلہ کی پوری طور پر تکمیل ہوچکی تو زمانہ کے متمدن افراد میں شمار ہونے لگی ہیں۔ یہاں تعلیم سے مراد کوئی خاص تعلیم مغربی یا مشرقی یا کسی خاص جگہ یا قوم کی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے ذریعے سے دماغ نشوونما پاکر جہالت کی تاریکیوں سے نکل جاتا ہے۔

ان تمام حقوق الناس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جس قوم وملت کے ہم فرد ہیں اس کی اعلیٰ ترین ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے ہماری زندگی کے نشوونما کو جو ذرائع اور وسائل درکار ہیں ان پر ہم کو پورا حق حاصل ہے اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا ہمارا تمدنی فرض ہونا چاہیئے۔

ترکیب تمدن

انفرادی ہستیاں جب کسی ایک رشتہ میں منسلک ہوتی ہیں تو ان کی مختلف صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں من جملہ ان کے سب سے اول مجموعہ ایک خاندان یا قبیلہ کی صورت میں ظہور پزیر ہوتا ہے۔ یہ جماعت چند افراد کے باہم رشتہ قرابت سے وابستہ ہونے کا نام ہے۔ اس کا اصل اصول موانست فطری ہوتی ہے اور یہی اس کے قیام کا باعث ہوتی ہے۔ اس کا مقصد دراصل بیچارگی طفولیت کی حفاظت وخبرگیری اور فطری محبت وموانست کے ساتھ ایک دوسرے سے ربط واتحاد ہے۔ یہ نظام قدرتی طور پر اس خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے کہ کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایام طفولیت یا شیر خوارگی میں جو حفاظت اور خبرگیری والدین کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر بھی کوئی نظام سلطنت نہیں کرسکتی۔ اسی طرح دوستی کا دائرہ جس قدر کم ہوگا۔ اسی قدر اس میں پائیداری اور خلوص زیادہ ہوگا خاندان کا ایک بزرگ مثل بادشاہ کے ہوتا ہے اس کے خورد سب اس کے احکام کے ماتحت ہوتے ہیں جب مشورہ خاندان وہ تمام امور کی انجام دہی کے لئے حسب مراتب احکام نافذ کرتا ہے۔ اور اس طرح تمام خاندانی کام انجام پاتے ہیں اندرونی اور بیرونی تمام معاملات خاندان کے سامنے پیش ہوتے ہیں اگر کوئی مسئلہ متنازع فیہ ہوتا ہے تو وہ ہر دو فریق کے

بیانات سن کر بزرگ خاندان کے ہاتھوں سے طے پاجاتا ہے۔ گویا خاندان ایک جمہوریت کا نمونہ ہے۔ گو چھوٹے پیمانہ پر ہو مگر اصول بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ اسی طرح چند خاندان مل کر جو ایک جماعت ہوتی ہے اس کو قوم کہتے ہیں۔ قوم میں بھی مثل خاندان کے تمام ان حقوق کی بدرجۂ اکمل پابندی ہوتی ہے۔ تمام قوم کا ایک سردار قرار دیدیا جاتا ہے اور اس کے مشورہ کے مطابق تمام قوم کے مراحل طے پاتے ہیں۔ ہر فرد قوم کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ تمدنی فرائض کی پابندی کرے۔ ایک قوم بحیثیت اپنی ذات کے بمقابلہ دوسری اقوام کے متحد ہوتی ہے۔ بیرونی دشمنوں سے محافظت اور اندرونی معاملات کی تنظیم اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ اب جب چند اقوام مل جاتے ہیں تو اس سے ایک ملک یا سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس طرح حکومتیں اور سلطنتیں معرض وجود میں آتی ہیں۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خاندانی تعلقات کی بنیاد باہمی فطری محبت پر ہوتی ہے لیکن اس سلسلہ سے قطع نظر کر کے ہم کاروباری زندگی پر سطحی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے برعکس ہیں چونکہ کاروبار میں صرف باہمی معاہدہ ہی شرط ہوتی ہے۔ اس کو کوئی تعلق فطری جذبات سے نہیں ہوتا ہے وہاں تعلقات مربیانہ ہوتے ہیں یہاں افسری اور ماتحتی کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اگرچہ خاندان میں بھی یہی حاکم و محکوم کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن نوعیت جداگانہ ہوتی ہے وہاں کوئی ایک مربی اپنے کم سن متعلقین کی بحیثیت مربی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ یہاں صرف ایک معاہدہ ہے جس کے لئے وہ ایک خاص کام کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے لیسے قوانین وضوابط ترتیب دیئے جائیں جن سے ماتحت لوگوں پر تشدد نہ ہو سکے۔ اور حاکم محکوم کو درجہ غلامی تک نہ پہنچا سکیں۔

زمانہ گزشتہ اور حال کا موازنہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ جس قدر زمانہ تمدنی ترقیات میں گامزن نظر آتا ہے اسی قدر خلوص و موانست میں کمی اور رسم و رواج میں ترقی روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ زمانہ سابق میں ایک آقا اور خادم کا باہمی کاروباری تعلق مثل ایک خاندانی تعلق کے ہوتا تھا۔ جو معاہدہ کاروباری حاکم و محکوم میں ہوتا تھا وہ موانست و خلوص کی زنجیر سے مستحکم ہو جاتا تھا۔ آقا کا اخلاق خادم کے اخلاص پر سمنٹ کا کام کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آقا کا برتاؤ مربیانہ ہوتا تھا اور خادم کا طرز عمل مودبانہ اور مخلصانہ۔ آقا کی خوشحالی اور نیک نامی سے خادم کو دلی مسرت ہوتی تھی اور اس پر کسی قسم کی مصیبت خادم کے لئے سوہان روح ہوتی تھی۔ لیکن فی زمانناً یہ باتیں محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں کہ وفادار خادم اپنے آقاؤں کے لئے اپنی عزیز جانیں تک قربان کر دیتے تھے۔

اسی طرح استادوں اور شاگردوں کا برتاؤ مخلصانہ اور مربیانہ ہوتا تھا۔ شاگرد اپنے اساتذہ کا خیال اپنے والدین سے زیادہ کرتے تھے۔ ان کے ادب میں اپنی بہبودی تصور کرتے تھے۔ کسی خاص علم کے استاد کی شاگردی کو اپنا فخر جانتے تھے اور صدہا کوس کی منازل پاپیادہ طے کرکے ان کے پاس پہنچتے تھے اور بالآخر ارسطو زماں اور افلاطون دوراں ہوتے تھے۔ علمائے سلف کے سوانح اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے شاگردانِ رشید کو مثل اپنی اولاد کے تربیت دیتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ خود جانتے ہیں وہ سب اپنے شاگردوں کو ذہن نشین کرادیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر شاگرد اپنے اُستاد سے کسی خاص فن میں زیادہ ماہر ہوجاتے تھے جن پر خود استاد فخر کرتے تھے اور وہ ان کے لئے مایۂ ناز ہوتے تھے اور اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ اُستاد اور شاگرد کا برتاؤ بے حد خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے جس کے بدلہ اس کے اُستاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو تعلیم دے اور وہ بھی ایک خاص وقت معینہ پر۔ استاد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مقررہ رقم کے عوض ایک محدود وقت میں اپنا کچھ حصہ وقت صرف کریں بالحاظ اس کے کہ ان کا مقصد اصلی حاصل ہو یا فوت۔ نہ ایک دوسرے کا خیال' نہ ادب' اور نہ پاس' نہ اخلاص' نہ مودت۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاگرد محض ڈگری یافتہ عالم بے عمل ہوتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب مربیانہ تعلق کسی فطری رشتۂ محبت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس میں کسی قسم کا خلوص باقی نہیں رہتا محض رسمی ضابطہ کی خانہ پُری رہ جاتی ہے اور آگے چل کر اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اب اگر کاروباری تعلقات خالص معاہدانہ حیثیت کے ہونگے تو ایک حد تک ناانصافی کے لئے ضرور سدباب ہوجائے گا اور پھر خود بخود رفق و وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا ہوجائیں گے۔ لیکن اگر خود معاہدہ ہی محض رسماً اور رواجاً ہوگا تو اس کا اثر بالکل برعکس ہوگا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ماتحتی کی سختی اور ناگوار صورتوں کے کم کرنے کے لئے معاونت اور اتحادِ عمل یعنی تعامل و تعاون کی صورتیں اختیار کی جائیں تاکہ مودت پیدا ہو۔

اگر لوگوں کے کاروباری تعلقات کو محض معاہدانہ رکھنا ہے تو ان مربیانہ اور ہمدردانہ فرائض کو جو افراد کے

ہاتھوں میں نہیں چھوڑے جاسکتے ہیں ایک خاص جماعت کو من حیث المجموع اپنے ذمہ لینا چاہئیں۔ اگرچہ یہ کام ایک مرکزی حکومت کا ہے لیکن یہ کام ہر شہر خود انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً حفظان صحت کا انتظام، وسائل تعلیمی کی فراہمی، حادثات کی روک تھام بصورت حفظ ماتقدم۔ اشیائے خوردنی میں میل یا اور دھوکہ بازی کا انسداد۔ اسی طرح وہ لوگ جو محنت و مزدوری کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے ان کے لئے ضروریات زندگی کی فراہمی وغیرہ۔ یہ سب امور تمدنی زندگی کے لئے لازمۂ انسانیت ہیں۔

ان تمام امور متذکرۂ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آیا کسی قوم کو انفرادیت کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے یا اشتراکیت کی طرف۔ اس مسئلہ پر دو گروہ جداگانہ متضاد رائے رکھتے ہیں۔

جماعت انفرادیہ کا یہ خیال ہے کہ تا بہ امکان افراد کی آزادی کو قائم رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن دوسرا گروہ اشتراکیہ یہ کہتا ہے کہ اصلی شے افراد کے افعال کو فلاح عام کے نقطۂ نظر سے منضبط اور محدود کرنا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں مخالف آرا کی تطبیق اس صورت سے بآسانی ممکن ہے کہ نہ تو کل کی فلاح بغیر افراد کی فلاح کے ممکن ہے اور نہ ہر شخص کو انفرادی آزادی بغیر اس شرط کے دی جاسکتی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس میں کوئی عام فلاح مضمر ہو لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ کن چیزوں میں لوگوں کو زیادہ آزادی دینا مستحسن ہے اور کن چیزوں میں ان کے افعال کی نگرانی اور تحدید ضروری ہے۔ بہرحال زمانہ موجودہ عمومی ترقی کے لئے اشتراکیت کا زیادہ حامی نظر آتا ہے اور فی الحقیقت یہی اصلی تمدن ہے۔

سیاست مدن سیاست مدن تمدنی منزل میں حکمت عملی کے اس حصّے کو کہتے ہیں جو ایک قوم، ایک شہر یا ایک ملک کے باہمی تعلقات کے حفظان کے متعلق اُن اصول سے بحث کرتا ہے جس سے تمام افراد میں طریقۂ عدالت جاری اور ساری رہتا ہے اور جس کی وجہ سے تمام افراد ترقی اور بہبودی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

ضروریات زندگی میں تعاون و تعامل کا لازم ہونا بیان کیا جا چکا ہے۔ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اس لئے سوسائٹی میں اعلیٰ و ادنیٰ شخص پورا آزاد اور مختار ہے لیکن بعض اوقات اعلیٰ شخص ادنیٰ پر بے جا دباؤ ڈالتا ہے اور اس کی آزادی میں مخل ہو جاتا ہے اس لئے یہ ضرورت پیش آئی کہ ابنائے جنس ایک دوسرے کی آزادی دستی سے محفوظ رہیں اور ہر شخص سوسائٹی میں اپنے اپنے مراتب کے مطابق عمل کرتا رہے اور اگر کوئی ایسا کام کرے

جس سے سوسائٹی کو نقصان پہنچے تو اس کو سزا دی جائے تاکہ آیندہ اس کو تنبیہ اور دیگر افراد کو عبرت حاصل ہو۔ تمدن کی ابتدائی حالت میں تمام سوسائٹی کو یہ اختیار تھا کہ جب سوسائٹی کے کسی ممبر سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو سب مل کر اس کے لیے سزا تجویز کر دیتے تھے۔ جرائم اور مجرموں کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف سزائیں تجویز کی جاتی تھیں اور اسی کے مطابق ان کو فیصلہ سنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان مختلف فیصلوں نے قانونی صورت اختیار کر لی اور سوسائٹی کے ان اقتدارات کا نام جو لوگوں میں قاعدۂ عدالت قائم رکھیں اور جو فرد اس قاعدہ کے خلاف ورزی کرے اس کو سزا دیں سیاست کہلانے لگا۔

شروع میں ہر مقدمہ میں سوسائٹی کے ہر فرد کو رائے دینے کا استحقاق یکساں تھا اور ہر ممبر کو یہ حق تھا کہ وہ قانون وضع کرے اور اس کا نفاذ کرے گویا اس میں ایک جمہوری سلطنت کی سی شان تھی۔ لیکن جب متمدن سوسائٹی میں ترقی ہوئی اور افراد میں ان کے حالات اور مذاق کے اعتبار سے کام تقسیم ہوئے تو ایک مقدمہ کے لیے تمام افراد کا جمع ہونا نہ صرف ان کے ذاتی کاموں میں ہی خارج ہوا بلکہ ایک طرح محال ہو گیا اس لیے انفصال مقدمات کے اختیارات ایک شخص واحد کو دیدیے گئے اور اس کا نام قاضی یا منصف ہوا لیکن قوانین سازی سوسائٹی کے ہاتھ میں رہی منصف کا کام ان منضبطہ قوانین قوم کے مطابق مجرموں کو سزا دینا قرار پایا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ضرورت بھی پیش آئی کہ اس سوسائٹی، شہر یا ملک کی حفاظت بیرونی حملوں سے کی جائے تاکہ امن قائم رہے اس لیے فوج کا قیام ضروری ہوا۔ جماعت میں سے چند اشخاص جو اس کام کے لیے موزوں و مناسب تھے فوج میں بھرتی کیے گئے اور ان کا جداگانہ قانون بنایا گیا۔ صلح و جنگ کا اختیار اور اس فوج کی عناں حکومت ایک خاص شخص کی سپرد کی گئی تاکہ وہ صرف انہیں امور پر اپنا وقت صرف کرے۔ اسی کو اندرونی اور بیرونی نقصانات کی تلافی کے تمام اختیارات دیے گئے اور اس کا نام حاکم یا بادشاہ ہوا۔ اب فوج کیلیے جو بجز محافظت قوم اور کوئی کام انجام نہیں دے سکتے تھے یا حاکم وقت کے ضروریات کے لیے خرچ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ چونکہ وہ اپنے لیے جداگانہ اکتساب معاش سے قاصر تھے اس لیے تمام سوسائٹی کے ذمہ ایک محدود رقم مقرر کی گئی اور اس کا نام ٹیکس یا خراج ہوا۔ اس ٹیکس کی آمدنی کچھ عدالت اور افواج کے اخراجات میں صرف ہوتی تھی اور حسب ضرورت بادشاہ کے صرف میں آتی تھی۔ عوام الناس بادشاہ کی عزت کرتے تھے اور اس کے احکام کی تعمیل۔ لیکن اگر وہ خلاف قانون کوئی حکم کرتا تھا تو سوسائٹی کے ہر فرد کو اس کو متنبہ کرنیکا

حق ہوتا تھا۔

جنگ کے موقع پر بادشاہ کی سپرد تمام انتظامات ہوتے تھے اور امن وصلح کے زمانہ میں اس کی حیثیت دیگر رؤسا شہر کی برابر ہوتی تھی باقی سلطنت کا نظم ونسق رعایا یا کونسل کی صلاح اور مشورے سے انجام پاتا لیکن بادشاہ کا اقتدار زیادہ ہوتا تھا اور اس کا ادب رعایا پر فرض تھا۔

اس طرح تمدن نے ترقی کرتے کرتے سلطنت قائم کرلی لیکن یہ سلطنت جمہوری سلطنت تھی جس میں بادشاہ یا حاکم کا انتخاب سوسائٹی یا رعایا کی رائے سے ہوتا تھا۔ قیام سلطنت کے بعد ہر فرد مجرم کو سزا دینے کا مستحق نہیں رہا بلکہ وہ عدالت سے سزا دلا سکتا تھا۔

مطلق العنانی یا غیر متمدن حالت میں اگرچہ ہر فرد کے اختیارات وسیع تھے لیکن اس آزادی کا فائدہ مفقود تھا اور اس آزاد زندگی میں کوئی بھی اپنی حفاظت خود نہیں کرسکتا تھا۔ اس وقت نہ تو کوئی قاعدہ، قانون تھا جو سب کے لئے یکساں ہو اور نہ جائز ناجائز کوئی معیار تھا بلکہ ایک ہی نوعیت کے مقدمات کے فیصلے مختلف طرائق سے ہوتے تھے اور اکثر میں طرفداری اور رعایات مدنظر رکھی جاتی تھیں، دوسرے کوئی ایک شخص مسلمہ طور پر منصف نہ تھا بلکہ ہر شخص خود ہی واضع قانون بھی ہوتا تھا اور خود ہی قانون نافذ کرتا تھا۔ اور خود غرضی کی بنا پر انصاف نہو سکتا تھا۔

جب سلطنت جمہوری قائم ہوئی تو اس نے امن عامہ کو قائم کیا۔ قوانین وضع کئے اور ان کے مطابق حکمرانی کی اور سوسائٹی میں نصفت وعدالت قائم کی اور ملک وسوسائٹی کو اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا۔ چونکہ قوانین کے وضع کرنے کا اختیار سوسائٹی کے ہر فرد کو تھا اس لیے اس میں بھی وہی دقت ہوئی کہ ہر شخص اس کو انجام نہ دے سکا اس لیے کل قوم نے اپنے سربرآوردہ اشخاص کو اپنی طرف سے اس کام کے لیے منتخب کردیا جو عقل و دانش اور علم ولیاقت میں دوسروں سے ممتاز تھے اور سب نے اس کو تسلیم کرلیا کہ ان کے وضع کردہ قوانین پر ہر شخص عمل پیرا ہوگا اور کسی کو اختلاف نہوگا۔ اس مجلس کو واضع قوانین یا لیجسلیٹو کونسل کے نام سے موسوم کیا۔ یہ وہ جماعت ہوتی ہے کہ جب اس کو ذی اختیار بنا دیا جاتا ہے تو تمام افراد قوم پر اس کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت فرض ہوجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقنن کے اختیارات سب سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن وہ قانون بنانے میں بالکل خود مختار نہیں ہوتا بلکہ اس کو امور ذیل کا پابند ہونا لازمی ہے۔

اول وہ اس امر کا خیال رکھے کہ وہ ایسے قوانین وضع کرے جن سے قوم وملک کی حالت درست ہو اور وہ خلاف فطرت نہوں بلکہ ہر ایک میں قوم کی فلاح وبہبودی منصور ہو۔

دوسرے وہ ایسے قوانین منضبط کرے جو ہر شخص کے لیے یکساں حکم رکھتے ہوں۔ افراط وتفریط سے بری اور عدل وانصاف پر مبنی ہو۔

تیسرے ان قوانین میں خلائق کی جان ومال کی حفاظت مدِ نظر ہو اور ٹیکس یا اخراج کا مقرر کرنا بغیر استصواب رائے قوم بے حد وحساب نہو۔ چوتھے وہ قوانین مستقل ہوں اور جلد جلد اس میں تغیر وتبدل نہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں عنان حکومت ہو اس کو خاص خاص ایسے اقتدارات بھی حاصل ہونا چاہئیں جو قانون مروجہ سے برتر ہوں۔ چونکہ بعض اوقات ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں جہاں مقنن کا قانون کوئی ہدایت نہیں کرتا۔ اس وقت چاہیئے کہ وہ اپنی ذاتی رائے سے فیصلہ کرے۔

غرض یہ سلطنت جمہوری ایسی سلطنت ہے کہ نیچرل یا فطری حالت میں جو اقتدارات واختیارات لوگوں کو فرداً فرداً حاصل تھے وہ انہوں نے سوسائٹی کو دیئے اور پھر سوسائٹی نے وہ ایک حکمران اور اس کے ماتحت چند افسران کو اس شرط پر دیتے کہ وہ ان کی جان ومال۔ عزت وآبرو کی ہر طرح حفاظت کرے اور ان کی بہبودی اور ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے۔ لیکن اس کو لوگوں کی جان ومال پر خود مختارانہ اختیار حاصل نہیں ہوسکتا۔

جب سوسائٹی تمدنی زندگی کی آخری منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے قوانین عدالت اعلیٰ پیمانہ پر ہوتے ہیں اور اس کی گورنمنٹ اپنے تمام افراد کی بھلائی اور بہبودی کے لیے اور تمام سوسائٹی کے انتظام کے خاطر تمدنی اصول وضع کرتی ہے اور ان کو مشتہر کرتی ہے اور رعایا کو ان پر کاربند رکھتی ہے۔

وضع قوانین۔ عدالت وسیاست۔ نظم ونسق۔ آئین ملک اور انتظام ایک عمدہ گورنمنٹ کا فرض ہے۔

صلح کل۔ امن جوئی۔ معاونت وہمدردی اور حفاظت تمدن کے معاون ہیں۔ لیکن دشمنی۔ حسد۔ زبردستی۔ جور وظلم۔ اور خانہ جنگی تمدن میں رخنہ انداز ہوتے ہیں جن سے اجزائے عالم کا مضبوط شیرازہ بکھر جاتا ہے اس لیئے گورنمنٹ خرابی کی رخنہ بندی اور مظلوم ومستحقین کی حفاظت کرتی ہے۔

کلامِ گرامی

بلبل گوید کہ نوبہارے خوشتر — گل خندہ زناں کہ شاخسارے خوشتر
شبنم بگریست گفت ہاں اے گلچیں — جز گریۂ ما نبود کارے خوشتر

دل بستگیِ صبحِ بہارے خوشتر — دل گرمیِ جلوہ ہائے یارے خوشتر
عارف کہ ز دردِ دوست برزد نفسے — آں یک نفس از لیل و نہارے خوشتر

از غصہ بخود پیچ و دوری این ست — حسرت مفروش ناصبوری این ست
باخود ز رہِ خودی رسیدن سہل ست — بیخود ز خود پرستی حضوری این ست

محسوسات فانی

میں ندامت جانکر خوش ہوں یہ منظر دیکھنا
وہ مجھے تڑپا کے تیرا پھر نہ مُڑ کر دیکھنا

دیدنی ہے رنگ۔ دل میں ڈوبکر کھنچنے کے بعد
تم ابھی کیا دیکھتے ہو تھم کے خنجر دیکھنا

ماسوائے دل میں ایک ہنگامہ برپا کر گیا
چشم کافر کا وہ دل لے کر مکرر دیکھنا

سانس کے جو آخری جھٹکوں میں اٹکی تھمی ہوئیں
ہائے ان ناشاد آہوں کا مقدر دیکھنا

میرے دل کو چین آجائیگی ضامن موت ہے
تم کسی دن نبض دل پر ہاتھ رکھکر دیکھنا

مژدہ فصلِ گُل کا لائے تو بھی باد بہار
ہر کڑی زنجیر کی زنداں سے باہر دیکھنا

جب ذرا پردہ سی جھانکا بجلیاں گرنے لگیں
ہے یہ کوئی دیکھنے میں بندہ پرور دیکھنا

تشنہ لب بھی تھا میں ساقی جان سی بیزار بھی
ساغر اور پھر زہر سے لبریز ساغر دیکھنا

صبح تک فانی ہر آواز شکست دل کے ساتھ
کیا قیامت تھا وہ تیرا جانب در دیکھنا

ترقی معکوس

عمومیت سے فردیت

مکالمہ ہندی و سندھی

(ملا شاہدی کے قلم سے)

رنگون سے دوسرے درجہ کے دو مسافر ایک باشندہ دہلی دوسرے باشندہ کراچی روانہ ہوتے ہیں حُسنِ اتفاق سے جہاز میں دونوں کو ایک ہی کمرہ میں جگہ دی گئی۔ ابتداً حسبِ دستور دونوں میں اجنبیت رہی لیکن جہاز کی روانگی کے تھوڑی دیر بعد ہی یہ اجنبیت نسبت سے بدل گئی اور وہ دونوں مسافر جو ابتک اپنے اپنے زعم باطل میں ایک دوسرے سے ہر اعتبار سے تفوق رکھتے تھے اور بات کرنا تو درکنار نظر بھر کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اب گھل مل گئے کیونکہ یوروپ کی تہذیب کا ایک یہ بھی طرۂ امتیار ہے کہ باوجود دعوے مساوات اور نام نہاد اخوت کے دو ہم مذہب، ہم ساتھ اور ہم مکتب جب تک باقاعدہ متعارف نہوں مہینوں بات چیت سے محروم رہتے ہیں۔ اسی اجنبیت زا تہذیب کے یہ دونو مسافر بھی باوجود ہم مذہب اور ہم ملکی ہونے کے تنکار رتھے۔ لیکن سفر اور بالخصوص لمبا سفر اس قسم کے لغو تہذیبوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ غریب الوطنوں کی اجنبیت کے لیے خود متعارف بن جاتا ہے اور اس طرح سے نہ صرف ہم قوم۔ ہم ملک۔ ہم مذہب کو ایک دوسرے سے شیر و شکر کر دیتا ہے بلکہ مشرقی اقلیم کے باشندہ کو مغربی اقلیم کے باشندہ سے متعارف کرا کر ایک دوسرے کا ہمنوا بنا دیتا ہے۔

غرضکہ اسی جبری تعارف نے ان دونوں کے اصول تہذیب کو مدِ نظر رکھکر ایک دوسرے سے شیر و شکر کر دیا۔ اب کیا تھا جتنا ہی زیادہ سفر گھٹتا جاتا ہے اعتماد اور دوستانہ بڑھتا جاتا ہے۔ رات دن میں صرف چند گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ دونوں قالباً جدا ہو جاتے ہیں لیکن قلباً ساتھ رہتے ہیں اگر جاگنے میں چند منٹ کے لیے بغرض رفع حاجت جدائی ہو جاتی تھی تو خیال ساتھ رہتا تھا اور جب سو جاتے تھے اور دونوں کے درمیان

نیند حائل ہو جاتی تھی جو صرف چند گھنٹہ کی مہمان رہتی تھی تو دوستانہ خواب پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔

سفر کی کٹھن مگر پُرلطف منزلوں نے دونوں میں تعارف پیدا کراتے ہی "وطن مالوف" پھر "دولت خانہ" اور "اسم گرامی" کے مراحل اُسی وقت طے کرا دیئے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب نے۔ دہلی "غریب خانہ" بتایا اور دوسرے نے کراچی۔ میں اسی مناسبت سے ان دونوں کے اصل نام سے قطع نظر کرکے ان کے نسبتی نام "سندھی اور ہندی" رکھے دیتا ہوں اس لیے کہ بالعموم تمام ہندوستان کے لوگ اس خاص خطہ کے باشندہ کو جو بنارس سے شروع ہو کر دہلی پر ختم ہوتا ہے "ہندوستانی" کہتے ہیں۔

الغرض جب تعارف پورا ہو چکا۔ بے تکلفی نے اپنے لیے میدان صاف کر لیا۔ اور مختلف موضوع پر گفتگو ہو کر ایک دوسرے کے آزمائش ہوئی۔ تو سندھی کی محدود معلومات نے بغرض استفادہ ہندی سے "پان اسلامزم" (اتحاد اسلامیت) کی وجہ تسمیہ اور حقیقت اس طرح دریافت کی۔

سندھی۔ جناب! اگرچہ میں بھی بفضلہ انگریزی علوم میں کافی دستگاہ رکھتا ہوں حسب استعداد تھوڑا بہت مطالعہ بھی ہے لیکن باوجود کافی غور و فکر کے بھی "پان اسلامزم" کی کنہ کو اس وقت تک نہیں پہنچا۔ اور نہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ ذہن نشین ہوئی لہذا براہ کرم آپ اس مخصوص مسئلہ میں میری رہنمائی فرمائیں۔ آخر یہ "پان اسلامزم" چیز کیا ہے۔ اگر یہ کوئی اسلامی چیز ہے جیسا کہ اس کے نام سے مترشح ہوتا ہے تو ہم نے کبھی بچپن میں تو اس کا نام سُنا نہیں ہماری عقل حیران ہے کہ یہ کونسی ٹکسال ہے جہاں سے قسم قسم کے عجیب و غریب نام جن کے تلفظ میں بھی بسا اوقات دشواری ہوتی ہے گھڑ گھڑ کر نکل رہے ہیں۔ مثلاً اسی کے وزن پر مسمریزم۔ بالشوزم۔ سوشیلزم۔ انارکزم وغیرہ وغیرہ۔

ہندی (دوستانہ لہجہ میں) پہلا اگر سنجیدہ جواب تو اس کا یہ ہے کہ اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے آپ "مسلم یونیورسٹی میگزین" مورخہ ماہ جون ۲۶ء دیکھیں جس میں علیگڑھ کے ایک پروفیسر نے "پان اسلامزم کی حقیقت" کے عنوان سے بہت ہی مشرح و مفصل مضمون لکھا ہے۔ دوسرے جواب میں یہ کہونگا کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست" ماشاء اللہ آج آپ سو برس کی متوفیہ کے متعلق استعجابانہ اور استفسارانہ سوالات فرما رہے ہیں۔ حالانکہ اُسی "ازم"

کی اولاد در اولاد پیدا ہو کر ایسے زمانہ خلفشار اور فرقہ وارانہ کشمکش میں موت کا انتظار کر رہی ہیں لہذا اب اُن کی اولادوں کے متعلق سوال کیجیے جن کی تعلیم و تربیت ہو رہی ہے کیونکہ مخصوص اُن کے لیے مدرسے کھول دیئے گئے ہیں

سندھی - بھئی خدا کے واسطے پہلے آپ "اُمّ الازم" کی تعریف کر دیجیے پھر اُس کے بعد اُس کی شاخوں کے متعلق بیان فرمائیے -

ہندی - "پان اسلامزم" کی حقیقت کے لیے تو وہی مذکورۂ بالا مضمون دیکھیے ہاں البتہ اس جگہ میں اُس کی شاخوں کے دیباچہ کے طور پر سرسری طور سے کچھ بیان کئے دیتا ہوں تاکہ شاخوں کے سمجھنے میں آسانی ہو حضرت یہ تین لفظوں کا مرکب نام ہے اس کے اجزاء ترکیبی پان - اسلام - ازم ہیں - "پان" یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "ایک" کے ہیں اور چونکہ خدا ایک ہے لہذا "خدا" کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے - اسی مناسبت سے اس کے معنی "وحدت اور اتحاد" کے لیے گئے - اسلام کی تشریح کی ضرورت نہیں وہ آپ کو معلوم ہے اب رہا "ازم" یہ تائے مصدری کے معنی دیتا ہے جس کو ٹھیٹ اُردو میں "یت" کے معنی کہنے چاہئیں - مثلاً دہریت - جنسیت فردیت وغیرہ وغیرہ - لہذا اس کے سب کے معنی لفظاً لفظاً "اتحاد اسلامیت" ہوئے -

غرضکہ یہ ایک تحریک تھی جس کی ابتداء ۱۸ ویں صدی کی آخر یا ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں شروع ہوئی اور اس تحریک کے مجدد اور رہبر و علامہ سید جمال الدین افغانی تھے جن کی تدفین کے ساتھ دفن ہو گئی -

سندھی - جن صاحب کا نام آپ نے لیا یہ کون بزرگ تھے -

ہندی - مذکورہ میگزین کے تعطیل نمبر ۲۶ سنہ ۶ میں ان حضرت کا بڑی مفصل ذکر ہے - لہذا اس کا دوبارہ بیان کرنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں ہے - غرضکہ یہ مخصوص "ازم" سید کے ساتھ دفن ہو گئی اور سب پیروان سید یکے بعد دیگرے اس پر نثار ہو گئے - اب کیا تھا نہ یہ "ازم" رہی اور نہ ازم والے رہے - بیشک اس نے اپنی اولاد میں سے "نیشنلزم" یا "قومیت و وطنیت" کو اپنا جانشین چھوڑا چونکہ اپنی ماں سے اس کو اتحاد کا کچھ ترکہ ملا تھا لہذا اس نے بڑے ہو کر قوموں کو "علم اتحاد" کے ذریعہ سے اپنی طرف مائل کر لیا - چنانچہ بھیڑ چال نے اُس کی آؤ بھگت کی اور حسب حال ہر قوم نے اُس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُس کی سلطنت کو تسلیم کیا -

سندھی - قطع کلام معاف کیجیے اُس کا کیا مقصد تھا -

ہندی - اس میں اور اس کی ماں کے مقصد میں صرف یہ فرق ہے کہ موخر الذکر کی حکومت تمام دنیا کی اسلامی ملت پر تھی اور مقدم الذکر کی حکومت ایک ملک کی مختلف اقوام پر تھی یا یوں کہیئے کہ ایک کا دائرہ بحیثیت رقبہ کے وسیع تھا تو دوسری کا دائرہ بحیثیت اقوام کے وسیع تھا - غرضکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک ملک کے لوگ خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں وہ سب باہم متحد ہو کر زندگی بسر کریں اور اس طرح سے ملک بلا کسی اجتماعی اور انفرادی خلفشار کے تجارتی - اقتصادی - علمی اور سیاسی ترقی کرتا چلا جائے - لیکن افسوس فنا سب کے لیے ہے - چنانچہ "وطنیت" کی حکمرانی بھی ایک خاص قسم کے اتحاد کی بنیاد ڈال کر فنا ہو گئی - گویا عمومی اتحاد نے خصوصی اتحاد کی جون کو "وطنیت" کے زمانہ میں اختیار کیا - مزید افسوسناک بات یہ ہے کہ جو اٹھ جاتا ہے اگرچہ وہ اپنا وارث چھوڑ جاتا ہے لیکن "نسبی اختلاط" کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات جو مورث میں ہوتی ہیں وارث میں نہیں پائی جاتی ہیں - اگرچہ ایک معقول زمانے تک اس کا بھی زور رہا - مگر افسوس کہ اس "قومیت" نے ہندوستان کو اس وقت فتح کیا جبکہ اس کے قوائے جسمانی اور روحانی دونوں جواب دے چکے تھے - بڑھاپے نے ایک حد تک حواس چھین لیے تھے، نہ نظر کام دیتی تھی اور نہ سماعت پھر بھی بچاری نے اپنی قوت سے زیادہ کام کیا - اور اپنی نزعی حالت میں وہ کرشمے دکھائے کہ ہر فرد بشر کی زبان سے "القوم" "القوم" "سوراجیہ" "ستیاگرہ" "نان کواپریشن" "ترک موالات" "ہندو مسلم اتحاد" کے بغیر نے نکل رہے تھے -

سندھی - جناب یہ بھی بہت اچھی چیز ہے - کیونکہ موجودہ سیاسی دور میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک ملک کی قومیں آپس میں متحد ہو کر اپنے ملک و وطن کی فلاح و ترقی کی کوشش کریں -

ہندی - جناب "ہے" نہ کہیئے بلکہ "تھی" کہیئے - کیونکہ یہ بھی اپنی زندگی کے مختصر دن پورے کر کے آخر کار اپنی اکلوتی بیٹی "کمونلزم" (فرقہ واریت) کی انقلابانہ اور باغیانہ سازشوں کی قربان گاہ پر نثار ہو گئی اور اس طرح سے "صاحبزادی ولیعہد" کی من مانی مراد پوری ہو گئی - اس میں کچھ شک نہیں کہ "قومیت" کی زندگی بھی ملک و قوم کے لیے مفید تھی - مگر وہ تو ہندوستان کی قسمت میں استبداد - استعباد - غلامی اور تنزل لکھا ہوا ہے پھر کیونکر ایسی مفید سرپرست ملکہ کو قبل از وقت اجل نہ آجاتی - غرضکہ صاحبزادی ولیعہد نے عنان حکومت سنبھالتے ہی سب سے پہلے ملک میں اپنے خود ساختہ لقب "ملکہ تفریق الہند اول" کا اعلان کیا - اور اس اسم بامسمیٰ بن کر زور شور سے حکمرانی شروع کر دی " وزیر سے چنیں شہر

یارے چناں" اپنی بنیاد حکمرانی کو مستحکم کرنے کے لیے اُس نے اپنے پیرو حکام مقرر کیے جنہوں نے اُس کی پالیسی پر پورا پورا عمل کیا۔ مثلاً کہیں "حفت یار جنگ" کو حاکم بنایا تو کہیں "باجہ نواز جنگ" کو افسری دی"۔ کہیں راجہ توڑول" حکمراں ہوئے تو کہیں" راؤ لڑانکا سنگھ" کہیں "مہاراؤ شدھی رائے" افسر بنائے گئے تو کسی جگہ "نواب تبلیغ الملک بہادر" غرضکہ اس طرح سے "قومیت" کے جتنے نمایندے "متحد الملک" اور "دیش بندھو" وغیرہ تھے وہ سب برطرف کئے گئے حتیٰ کہ جس قدر اُس زمانہ کے آثار تھے اُن کو "قبوں" کے حکم میں لاکر مسمار کر دیا گیا۔ اور بقولیکہ "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت" اپنی حسب دلخواہ عمارتیں "ملکہ تفریق الہند اول" نے بنوائیں۔ غرضیکہ "قومیت" کے قلعہ شہر پناہیں آشرم، مسمار کر کے کہیں اکھاڑے بنوا دیئے کسی جگہ اپنے نام کے باغ و پارک بنوا دیئے۔ کہیں بے تار کی تار برقی کے اسٹیشن قائم کئے۔ کہیں اپنا دفتر نظارت قائم کیا اور کہیں آتش گیر مادوں کے ذخیرے جمع کیئے "ملاپ" کے بجائے "نفاق کو پھیلایا۔ "الامان" کے بجائے "لاامان" کی اشاعت کی۔ غرضکہ وہ کیا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن "ملکہ تفریق الہند اول" اس سے بالکل بے خبر تھیں کہ جو کچھ وہ ملک میں جدید ترقی کر کے بیج بو رہی ہیں اور "پھوٹ" کی بیلیں لگا رہی ہیں وہ اُن کی "ولیعہد صاحبزادی تفریق ثانی" کی تیغ ابرو کے نظر ہو جائیں گی اور اس فرقہ وارانہ شیرازہ کے بھی ٹکڑے پارچے ہو جائیں گے۔

سندھی۔ جناب! آپ ہر اک تحریک سے برا اور مضر نتیجہ کیوں نکال لیتے ہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے جس کی آپ بھی تائید کریں گے کہ یہ تحریک تفریق بھی بجائے نقصان رسانی کے قومی اور ملکی حیثیت سے فائدہ رساں ہیں اور اس کو یوں سمجھیئے کہ تاوقتیکہ "پلٹن" مضبوط نہیں ہوگی "بریگیڈ" قوی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ "بریگیڈ" اگر قوی نہیں ہوگا تو "ڈویژن" طاقتور نہیں ہوگا۔ اور جب تک "ڈویژن" طاقتور نہیں ہوگا متحدہ لشکر کارآمد نہیں ہو سکتا۔

ہندی۔ بیشک آپ کی یہ منطقی دلیل بالکل درست ہے۔ لیکن اُس وقت جبکہ اس تفریق کا مقصد ملکی فلاح اور تنظیم ہو۔ یا "ملکہ تفریق الہند اول" کے نام حکومت کا پٹہ قدرت کی طرف سے استمراری اور دائمی ہو۔ لیکن مایوس کن تو یہی بات ہے کہ اول تو اس تفریق سے ملکی فائدہ مقصود نہیں ہے دوسرے جو عمارت یا آشرم ایک حکمراں بنا جاتا ہے اور اپنے دور حکومت کو پورا کر کے چلا جاتا ہے تو اُس کا قائمقام اُس تفریقی لائن میں مزید شاخسانے پیدا کر دیتا ہے جس سے بجائے قوت کے کمزوری پیدا ہوتی جاتی ہے کیونکہ جسقدر زیادہ تفریق پیدا ہوتی جائیگی۔ اُسی قدر اختلاف

بڑھتا جائیگا اور جسقدر اختلاف بڑھتا جائیگا اُسی قدر اتحاد گھٹتا جائیگا اور جسقدر اتحاد گھٹتا جائیگا اُسی قدر قومی قوت اور قومیت پامال ہوتی جائیگی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ مثلاً "ملکہ تفریق الہند اول" نے اپنی حکومت کی بنیاد بعض ذاتی یا ملکی مصالح کی بنا پر فرقہ وارانہ جوت پیزار پر رکھی تھی۔ یعنی ہندوستان کی دو بڑی قوموں کو شدھی اور تبلیغ کے لیے جو خالص مذہبی تحریک ہونی چاہیئے تھی کھڑا کر دیا کوئی مضائقہ نہیں تھا اگر یہ تحریک جادہ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھتی لیکن اس نے دنیاوی اغراض کا جامہ پہن لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں اکھاڑے بازی ہونے لگی۔ اُدھر دوسری طرف "ملکہ" کے نائب مناب جناب "لارڈ پراونشلزم" یعنی "نواب متعصب الدولہ بہادر حاکم صوبہ" نے الناس علیٰ دین ملوکھم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے مسلک کی جو تفریق لائن کا مسلمہ شاخسانہ تھا بنیاد ڈالی۔ اور باشندگانِ صوبہ جات کو باوجود ہم ملکی ہونے کے ایک دوسرے سے منحرف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجابی کو مدراسی سے، مدراسی کو بنگالی سے، بنگالی کو سندھی سے سندھی کو یوپی والے سے نہ صرف بیگانہ کر دیا بلکہ ایسی نفرت دلادی جیسی کہ ایک دشمن کو دوسرے دشمن سے ہوتی ہے "ملکہ تفریق الہند" کے شبابی جوش نے نواب مذکور کی ان تھک مساعی اور خدمات کا یہ صلہ دیا کہ باوجود اختلاف مذہب کے اُس سے عقد کر لیا۔ اب کیا تھا جو کچھ خواہش باقی رہی تھی وہ اس طرح سے پوری ہوئی۔

غرضیکہ ادہر "ملکہ تفریق الہند اول" نے ملک کی دو ممتاز قوموں کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا تو دوسری طرف حاکم صوبہ "نواب متعصب الدولہ" نے ایک صوبہ کے باشندے کو دوسرے صوبہ کے باشندہ سے متنفر کر دیا۔ انتہا یہ کہ مسلمان ایک ایسی قوم تھی جس نے اخوت کے مدرسہ کھول کر نہ صرف اپنی قوم کو ہمدردی اور بھائی چارے کا سبق سکھایا تھا بلکہ دوسری قوموں نے بھی استفادہ کیا تھا۔ لیکن انھیں کا یہ حال ہو گیا ہے کہ ایک صوبہ کا مسلمان دوسرے صوبہ کے مسلمان کی جائز غرض کو یہ کہکر مسترد کر دیتا ہے کہ "ہمیں دوسرے صوبہ سے کچھ واسطہ نہیں ہے"۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ "علیگڑھ جبلی" کے سلسلہ میں "مسلم یونیورسٹی" نے تمام ملک میں اپنے وفود بھیجکر نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ بلا استثنار تمام ہندوستانیوں کو دعوت شرکت دی اور اُن سے اعانت کی اپیل کی۔ کیونکہ یہ مسلّم ہے کہ "دار العلوم علیگڑھ" بالعموم تمام ہندوستانیوں اور بالخصوص تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور اسی وجہ سے اُس کے افادہ کا دروازہ ہر طالب کے لیئے بلا قید و بند کھلا ہوا ہے جس کے لیئے دار العلوم

کی زندہ جاوید تاریخ شاہد ہے۔ چنانچہ اراکین یونیورسٹی نے "ممبران اسٹاف" کے وفد مرتب کر کے تمام صوبوں میں امید اعانت میں بھیجے۔ اگرچہ کم و بیش کامیابی ہوئی لیکن توقع سے بہت کم کیونکہ یہ وہ عہد تھا جو نواب متعصب الدولہ کی جبروتی اثر میں تھا۔ غرضکہ منجملہ اور وفود کے ایک وفد ایک پروفیسر کی سرکردگی میں سندھ بھی بھیجا گیا۔ اللہ اللہ نواب مذکور نے بالواسطہ کیسے کیسے ہاتھ دکھائے۔ جس کے صلہ میں سمجھتا ہوں کہ "ملکہ تفریق الہند" نے ضرور اُن کو "رئیس المتعصبین" کا موزوں خطاب دیدیا ہوگا۔ اور "قاصر ہند" کا تمغہ بھی کیونکہ سندھ کا ہر گوشہ بہ یک زبان پاسخ گزار تھا "ہمارا صوبہ خود ضرورتمند ہے لہذا ہمیں دوسرے صوبہ سے کچھ واسطہ نہیں" یا "ہم اب تک بہت امداد کر چکے اب ہم نے اوروں کے لیئے امداد کا دروازہ بند کر دیا"، ایک بہت ہی مہتم بالشان آواز جس پر خصوصیت سے علی گڑھ کا سب سے زیادہ احسان تھا یہ تھی "دعوت شرکت کا خیر مقدم لیکن طلب اعانت مسترد"، اگرچہ رئیس الوفد نے اپنی گفتگوؤں اور تقریروں میں بدلائل و براہین اس کی وضاحت بہ تکرار کی کہ یہ سلوک جو صوبہ وارانہ تعصب کا یقینی نتیجہ ہے علی گڑھ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ "ملکہ تفریق الہند" اور "نواب متعصب الدولہ" کے حدود اختیارات سے باہر ہے بلکہ بجائے اسکے وہاں "امیر جامع الملل والامم" کی منصفانہ اور غیر متعصبانہ حکومت ہے وہ وہ سرزمین ہے جہاں "آفتاب" کی "ضیاء" پاشی سب پر بلا استثنا یکساں ہے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُس کی عمومی خدمات کا یہ انکاری اور تعصبی صلہ دیا جائے۔ لیکن یہ تمام دلائل کارپردازان نواب مذکور نے بدون غور فکر داخل دفتر کردیں اور تمام معروضات کو تعصب کی آگ میں جلا دیا۔ چنانچہ ایک جگہ نواب مذکور کے ایک ممتاز نمایندے سے رئیس الوفد نے خصوصی ملاقات کی۔ عرض مدعا سنتے ہی آگ تعصب بھڑکی اور صوبہ واریت کا تبلیغی راگ الاپ کر کسی قسم کی مدد کے لیے نہ تیار رہوئے۔ رئیس الوفد نے نہایت سنجیدگی سے جواباً کہا "میں اس تعصب کی آپ کو مبارکباد ضرور پیش کرتا اگر یہ کامل ہوتا"، اب کیا تھا دکھتی رگ پکڑی گئی تعصب کا لفظ سنتے ہی چراغ پا ہو گئے اور فرمانے لگے "اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ مجھکو علی گڑھ کا مخالف سمجھتے ہیں"۔ رئیس الوفد نے پھر اُسی انداز میں جواب دیا معاشا و کلا آپ تو آپ معمولی آدمی بھی علیگڑھ کا مخالف نہیں ہو سکتا ہے آپ لفظ تعصب سے اسقدر برافروختہ نہ ہوں کیونکہ یہ کامل اگر ہو تو بہت پسندیدہ ہے بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کامل دوسرا ناقص۔ یعنی اگر وسعت نظر سے مزین ہو تو کامل اور محمود ہے اور اگر تنگ نظری کا شکار ہو تو ناقص
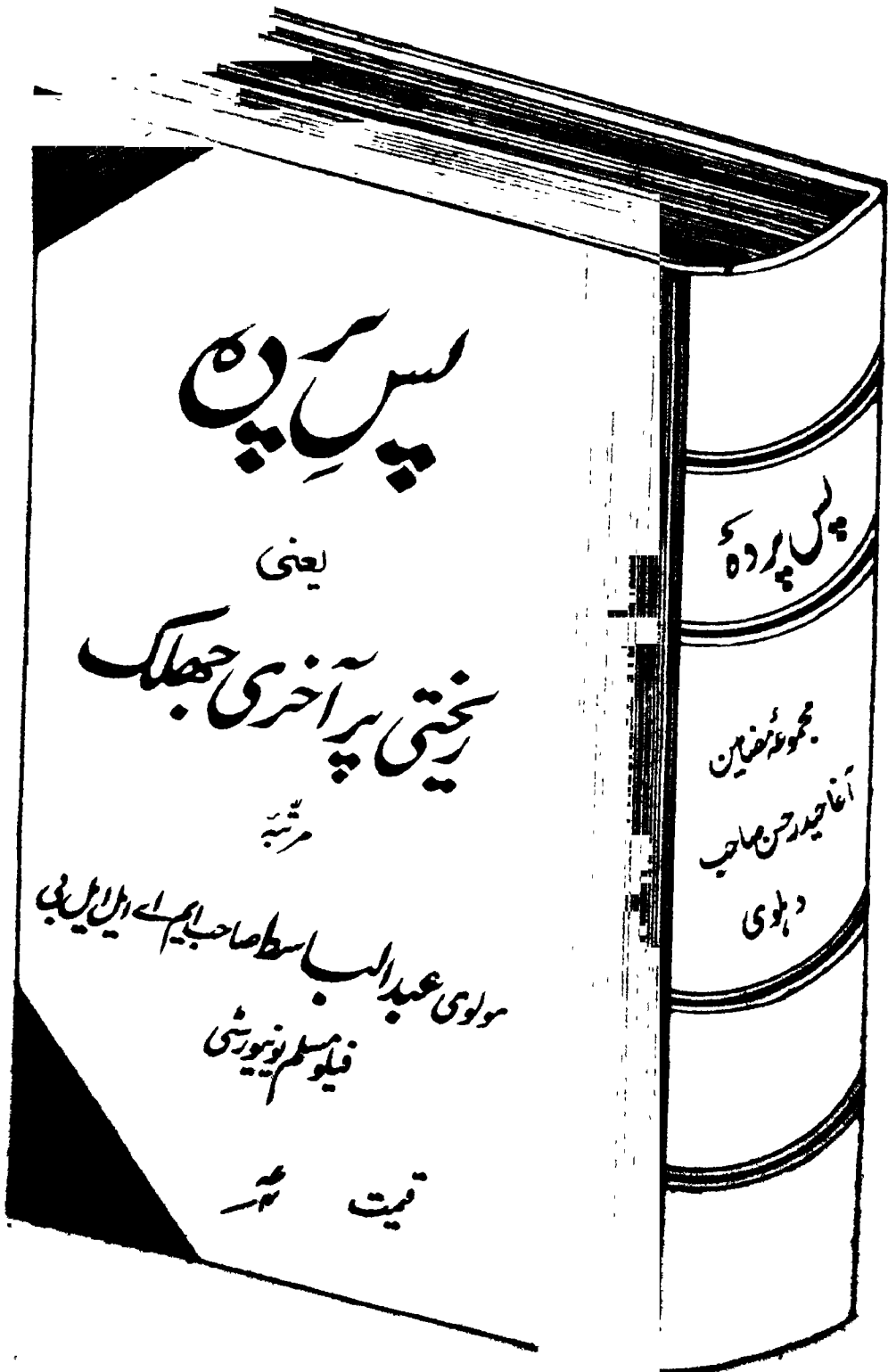
علی گڑھ میگزین

اور مذموم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تنگ نظر متعصب رفتہ رفتہ اپنے لیے بھی مضر ہو جاتا ہے کیونکہ کسی چیز کا ارتقا ہو یا انحطاط اپنی ابتدائی منزل پر نہیں رک جاتا ہے بلکہ قدرتاً اس کو جملہ منازل طے کر کے آخری منزل پر پہنچنا پڑتا ہے۔ غرضکہ اس مخصوص حکمرانی کا ڈنکا بج گیا۔ "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" بعضوں نے اس فرقہ وارانہ تعصب کو وبا سمجھا۔ چنانچہ اس کے دفعیہ کے لیے ڈاکٹروں اور حکیموں اور ویدوں کی طرف رجوع کیا۔

"حکومت" کے چیف میڈیکل آفیسر "جناب ڈاکٹر ڈوائڈ اینڈ رول" Devideandrule نے "بلا ڈونا" کا پلاسٹر دیکر بلا دونی کر دی اور پلاسر نکال دیا۔ بجائے "ایسٹرن سیرپ" کے "ویسٹرن سیرپ" دیدیا "سڈلس پاؤڈر" نے بارود کا کام دیا اور اس حال تک پہنچا دیا۔ "حکیم مسیح الملک" نے "خبث الحدید" "مرجان" "دم الاخوین" دے دے کر "تفریق الہند" اور "نواب متعصب الدولہ" سے خراج تحسین حاصل کیا۔ کویراج جوتی پرشاد صرف اسی پرشاد و خرم رہے کہ "گئو دنتی" اور "ہاتی بسنت" کی بسنت دیکھتے رہیں۔

غرضکہ اس ملکہ نے "پائزن" Poison (زہر) پھیلا کر وہ پائمردی دکھائی اور تہلکہ مچایا کہ "بھارت ماتا" اس پرچار کی اور دیوانی ہوگئی۔

سندھی۔ جناب! میں تو اس کو بھی ملک اور قوم کے لیے مضر نہیں سمجھتا ہوں۔ لہذا میں یہ کہونگا کہ جب تک "دسے" "مضبوط نہ ہونگے" "پلٹنوں" کا استحکام ناممکن ہے۔ لہذا اس قسم کی کشمکش کو کیوں "دکمینی" "تنظیم" نہ سمجھیے تاکہ پھر آپ کی پلٹن میں کوئی خامی نہ رہے۔

ہندی۔ آپ نے بالکل درست فرمایا۔ لیکن اگر تنظیم کا دائرہ یہیں تک محدود رہتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ غضب تو یہ ہے کہ "ملکہ تفریق الہند" اول کا بھی جنازہ اٹھ گیا اور اب "تفریق الہند" دویم وارث تخت و تاج ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ماں کی تفریقی حکمرانی کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اور تربیت اسی فضا میں پائی تھی۔ "نواب متعصب الدولہ" کے کارنامے بہت پسند آئے اس لیے انہوں نے ماں کا لقب اختیار کیا اور نام نواب مذکور کے نام کے وزن کا پسند کر کے "دسٹرکٹزم" (ضلعیت) رکھا۔ تاکہ "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" کے اصول پر تفریق میں جو کچھ خامی باقی رہ گئی تھی اس کو پورا کر دیں۔ چنانچہ اس نے خدمت مفوضہ کو خوب انجام دیا۔ لیکن اپنی ماں کے "آئین" میں اتنی ترمیم کی کہ وہ اختیارات جو حاکم صوبہ کے تھے حکام ضلع کو دیدیئے ۔ "دیوانہ را ہوئے بس است" خوب ہرائے

سے "ضلع وار تعصب" پھیلانا شروع کر دیا۔ ہمدردی کا دائرہ اتنا تنگ کر دیا کہ ایک ضلع کے لوگوں کو دوسرے ضلع کے لوگوں سے انتہائی متنفر کر دیا۔ یہ واضح رہے کہ یہ تمام تعصب فرقہ وارانہ تبلیغ سے باوجود دائرہ کی تنگی کے غافل نہیں رہا۔ اُس نے اس کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ جتنے حاکم مقرر کیے وہ سب نواب مذکور اور "تفریق الہند اول" کی قائم کردہ درسگاہوں کے تکمیل یافتہ تھے۔ مثلاً کسی جگہ "جھگڑالو خاں" اور "نفرت بیگ" کو حاکم بنایا تو کسی ضلع میں "رائے کٹار سنگھ" اور "لالہ پاکھنڈی لال" کو متعین کیا۔ غرضکہ جوت بیزار کی ہر کمی کو پورا کیا میں سمجھتا ہوں کہ اس جگہ بھی آپ اپنی پرانی منطق بگھاریں گے۔ اسی لیے میں بطور دفع دخل یہ کہے دیتا ہوں کہ اسی "رانی" کی حکمرانی رہتی جب بھی کوئی ہرج نہیں تھا۔ اس کو تھوڑے ہی دنوں میں موت آ گئی اور اس کی لڑکی "تفریق الہند سوئم" "لیڈی ٹاؤنزم (قصباتیت) گدی نشین ہوئی۔ اس نے ماں اور نانی کی پیروی کرتے ہوئے اس وبا کو اپنے سگوں" کی معرفت وہاں بھی پھیلایا۔ اب کیا تھا ایک گاؤں دوسرے گاؤں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اور قدیم نسبت میں وہ اجنبیت پیدا ہو گئی کہ اس کی ماں کے زمانے کے لوگ۔ نفرت جان۔ تعصب بیگ۔ جھگڑومل اور کپٹی لال تک اس آگ کو دیکھ کر انگشت بدنداں تھے۔ لیکن پھر بھی جناب یہ زمانہ بھی قابل شکر یہ تھا۔ کیونکہ ایک گاؤں میں تو کوئی خلفشار نہیں تھا۔ اس کی لڑکی "تفریق الہند چہارم" نے جو اپنی خوش قسمتی اور ملک کی بدقسمتی سے تیرہ ہی سال کی عمر میں سریر آرائے سلطنت ہو گئی تھی ملک کا تیں تیرا کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نام "پرنسس محلہ ازم" (محلہ واریت) تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بستی کے محلوں کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دیا اب آج چند روز پہلے کا وہ برادرانہ اور روادارانہ سلوک جو اہل قصبہ میں بلا خیال مذہب و ملت تھا بالکل فنا ہو گیا۔ لیکن افسوس یہ ہے اگر یہی طریق حکمرانی باقی رہتا تو آپ کی منطق کے اعتبار سے میں اس کی یہ تاویل کرتا کہ اس کو "گارڈ" کا استحکام اور اُس کی تنظیم سمجھا جائے تاکہ اس سے "پلاٹون" اُس سے "کمپنی" اور اُس سے "بٹالین" مستحکم ہو لیکن یہ مختصر ترین نظام مختصر ترین زمانہ کے بعد ہی فنا ہو گیا اور اُس کی جگہ اُس کی بڑی بیٹی "پرنسس ہاوسزم" (گھر واریت)، جو ہنوز کنواری ہی تھی تخت نشیں ہوئی۔ چنانچہ اس نے بھی وہی طریق حکمرانی جاری رکھا۔ لیکن ابھی تک نظام پورا قائم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ وہ نذر اجل ہو گئی۔ چونکہ لاولد و لازوج مری تھی لہذا اُس کی بہن "انڈیویجوئلزم (شاہزادی فردیت)" کے نام قرعہ حکومت نکل آیا۔ چنانچہ اس نے عنان حکومت اپنے ہاتھ

میں لی۔ اگرچہ بظاہر اس کا دائرہ حکومت اتنا وسیع نہیں تھا کہ اپنے اثر کو اپنے اسلاف کی طرح سے معمولی وسعت دے۔ لیکن اُس مشن کے پورا کرنے میں جس کی بنیاد اس کے پیشرو ڈال گئے تھے اس کو وہ یدِطولیٰ حاصل تھا کہ باید و شاید۔ چنانچہ اُس نے بیٹھتے ہی حسب ذیل اعلان شائع کیا:۔

"بنام منافقان ملک و ملت۔ معاندان عدل و انسانیت۔ محبان بغض و نفرت۔ دشمنانِ محبت و الفت۔ تخم ریزگان عداوت۔ دردگان موانست و محبہ رعایائے زادت صفاتکم العادیہ۔ وقویت قوایکم البہیمیہ۔

یہ مسلم ہے کہ تم نے یا تمہارے اسلاف نے جو حکومت کی خدمات کیں اُن کا حکومت کی طرف سے وقتاً فوقتاً بڑے بڑے صلے دیکر اعتراف کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تم سب کے سب اتحاد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو۔ میل جول کے جھگڑوں سے جو تمہاری آزاد زندگی کو جکڑے ہوئے تھے پاک ہو۔ اس کے لیے تم دوسری ترقی یافتہ قوموں کی طرف نگاہ کر کے دیکھ لو کہ باوجودیکہ وہ اپنے زعم میں آزاد ہیں لیکن کیا یہ آزادی اُن کو نصیب ہے؟ یہ عجیب آزادی ہے کہ اتحاد کی بیڑیاں پیروں میں ہیں۔ میل جول کی ہتکڑیاں ہاتھوں میں ہیں اور متفقہ ملک کے جیل خانوں میں قید ہو کر متحدہ حکومت کی پہرہ میں ہیں۔ لیکن تم ہو کہ ان تمام مصائب سے آزاد ہو۔ ان تمام پابندیوں سے بالاتر ہو۔ لہذا اب تم غور کرو کہ جو کچھ "مابدولت" کے اسلاف نے تم کو صلے دیئے اُس کے مقابلہ میں تمہاری بڑی سے بڑی خدمات ادنیٰ ہیں۔ جو کچھ تمہارے اسلاف نے خدمات انجام دیں۔ اُس کا صلہ مابدولت کے اسلاف نے دیا۔ اب "مابدولت" اُس کے صلہ میں تم لوگوں سے ایک ایسی خدمت کی خواستگار ہیں۔ جو آیندہ چل کر تمہاری اور تمہاری آیندہ نسلوں کے واسطے بہترین اور دائمی صلہ ہوگا۔ وہ یہ کہ اب تم سب انفرادی حیثیت سے بلا استثنا ایک دوسرے کے خلاف کھڑے ہو جاؤ۔ تاکہ ملک کا ہر فرد حقیقی معنوں میں آزاد ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دل سے اس کا خیال بالکل نکال دو کہ فلاں بھائی ہے اور فلاں بھتیجا ہے اور فلاں پڑوسی ہے اور فلاں ہم ملک ہے اور فلاں ہم مذہب ہے۔ بلکہ ہر شخص کو مخالف سمجھو۔ اس خدمت کو خواہ اپنے لیے مفید سمجھ کر انجام دو یا مابدولت کے حکم کی تعمیل سمجھ کر۔ بہرحال دونوں حالتوں میں تمہاری کامل نوزاد آزادی متصور ہے۔ اور یہی تمہارا صلہ ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

"قصر نفاق" سے مابدولت کی مہر و دستخط سے جاری ہوا ۔

پرنسس فردیت بنت ملکہ تفریق اللہ چہارم بنت ملکہ تفریق اللہ سوم بنت ملکہ تفریق اللہ دوم

بنت ملکہ تفریق اللہ اول زوجہ نواب متعصب الدولہ"

اس اعلان سے تمام لوگوں میں بجلی دوڑ گئی۔ چاروں طرف سے "نفسی نفسی" کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر جگہ اعلان کا خیر مقدم کیا گیا اور فوراً اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے فوری اثر کی مثال میں صرف "ہمدرد" "اور غریبوں کے اخبار" کا ہی حوالہ کافی ہے جن کی جوتی بیزار سے فردیت بھی لرزہ براندام ہے۔ اور "ہر ایک فردیت" کی حکمرانی کی یہ کہکر داد دیتا ہے کہ اللہ اللہ جس نے "ہمدرد" کے درد کو اڑا کر صرف "ہم" باقی رکھا "غریبوں کے اخبار" سے وہ زہر پھیلایا کہ امیروں کے اخبار "حسن کا ڈاکو" اور "دربار حرامپور" بھی مات ہو گئے اس کی چال بازیوں کا بھلا کیا ٹھکانا۔ اگر خدانخواستہ یہ حکومت پائیدار ہو گئی تو پھر "سوراج" کے تماشہ کو بھی ترس جائیں گے۔ ابھی خبر یہ تو ہے کہ "کمیٹی" کے سینگوں پر سوراج کی فانوسی تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دے جاتی ہیں۔ یا سورت میں اس کی صورت دیکھنے کی امید تو ہے لیکن اگر یہی لیل و نہار ہیں تو پھر "اڈ ڈائر" "اوڈائر" اور شالا مار۔ شالا مار۔ کی صدائے بازگشت۔ مارشل لا کی شکل میں سامنے آجائے گی۔

سندھی۔ جناب! میں تو یہ کہونگا کہ یہ بھی فال نیک ہے۔ بات یہ ہے کہ میں ہوں (optimist) یعنی "امیدوں سے لبریز" آپ کے لیے یہ فضا یاس انگیز ہو گر میرے لیے یہ بھی امید افزا ہے۔ کیونکہ جب تک انسان انفرادی حیثیت سے درست نہیں ہوگا اسوقت تک جماعت یا گروہ میں درستی نہیں آسکتی ہے۔ اور اس کے لیے اب میں یہ کہونگا اور بہت زور سے کہونگا کہ جب ہر سپاہی فرداً فرداً مضبوط ہوگا، اس وقت "گارد" مضبوط ہوگا اس سے "پلاٹون" اس سے "کمپنی" اور اس سے "بٹالین" وعلیٰ ہذا القیاس۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ ایسے سمجھدار اور وسیع معلومات کے آدمی ایسے مایوس ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب ہندوستان کی ترقی۔ بہبود اور آزادی یقینی ہو گئی ہے۔ جس کو آپ کچھ دنوں کے بعد محسوس کریں گے ۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ریل دفعتاً رکی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جمنا کے پل پر حسب دستور رُکی ہے۔ جامع مسجد کے دلکش منارے اور قطب صاحب کی لاٹ کے نظارے نے موضوع ہی بدل دیا اور سندھی اپنے سامنے درست کرنے میں مشغول ہو گیا سامان درست کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دہلی جنکشن کے بڑے پلیٹ فارم پر گاڑی ٹھہری اور ان دونوں مسافروں نے محبت آمیز الوداعی معانقہ کیا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ۔

افکارِ شوق

کن طرفہ اداؤں سے جلوہ نظر آتا ہے
یہ کچھ نہیں کہہ سکتا کیا کیا نظر آتا ہے

کثرت کی یہ شانیں ہیں ہر رنگ میں شامل ہے
وحدت کا یہ نقشہ ہے یکتا نظر آتا ہے

کیا فصلِ گل آنے تک انجامِ جنوں ہوگا
ہر چاک گریباں سے صحرا نظر آتا ہے

اے چشمِ حقیقت بیں کیا یہ دکھائی ہے
اک قطرے کی فطرت میں دریا نظر آتا ہے

کیوں عشق سے کرتے ہیں تعبیرِ جنوں پیدا
سودا یہ نہیں لیکن سودا نظر آتا ہے

آثارِ محبت سے آشنا ہوں فقط واقف
نقشہ تری صورت کا پیارا نظر آتا ہے

خون ٹپکے رگِ جاں سے اے شوق پلا دینا
کچھ خنجرِ قاتل اب پیاسا نظر آتا ہے

بُعدِ رابع

یعنی

چوتھی سمت

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۲)

از جناب محمد فاروق صاحب ایم ایس سی

پچھلا مضمون جب میگزین میں چھپنے کے بعد میری نظر سے گذرا تو مجھے محسوس ہوا کہ زمانہ کو چوتھی سمت قرار دینے کے لئے میں نے جو تمثیل بطور دلیل کے پیش کی ہے وہ اگرچہ اپنے اندر کافی وزن رکھتی ہے تاہم کچھ زیادہ توضیح چاہتی ہے لیکن اسی کے ساتھ میں اعادہ کی زحمت سے بھی بچنا چاہتا ہوں۔ پس یہ فرض کر کے کہ "زمانہ" کو بعض وجوہ سے ہم چوتھی سمت قرار دے سکتے ہیں میں بعض اُن خیال آرائیوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو فلاسفہ نے اس مبحث پر کی ہیں۔

خط میں ایک ہی سمت پائی جاتی ہے اس کا تقاطع اگر خط ہی کے ساتھ ہو صرف نقطہ ہوگا جس میں کوئی سمت نہیں ہے اسی طرح اگر سطح کے ساتھ اُس کا تقاطع واقع ہو تو بھی نقطہ ہی پیدا ہوگا۔ لیکن اگر جسم کے ساتھ اس کا تقاطع واقع ہو تو خط پیدا ہوگا۔ اسی طرح سطح کا تقاطع اگر خط کے ساتھ ہو تو نقطہ اور اگر دوسری سطح کے ساتھ ہو تو خط' اور جسم کے ساتھ ہو تو سطح پیدا ہوگی۔ جسم کا تقاطع خط کے ساتھ خط' سطح کے ساتھ سطح اور جسم کے ساتھ جسم پیدا کرتا ہے۔ اس تقدیر پر ہم کو دیکھنا ہے کہ مافوق الجسم یعنی چار سمتوں والے جسم کے تقاطع کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں مماثلت مذکور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چار سمتی جسم کا تقاطع خط کے ساتھ خط' سطح کے ساتھ سطح اور جسم کے

ساتھ جسم پیدا کرے گا۔ لیکن جو بات زیادہ حیرت میں ڈالنے والی ہو وہ یہ ہو کہ چار سمتی عالم میں خطوں اور سطحوں وغیرہ کا تقاطع وہ صورت نہیں رکھتا جو اس تین سمتی عالم میں پایا جاتا ہو۔ مثلاً معمولی اجسام کے باہم تقاطع سے صرف سطح پیدا ہوگی اور سطح اور جسم کے تقاطع سے بجائے سطح کے خط پیدا ہوگا۔ چوں کہ یہ تمام باتیں زیادہ تر خاص علم ریاضی سے متعلق ہیں اس لئے اُن سے قطع نظر کرتا ہوں اور چار سمتی عالم کے صرف بعض عجائبات کے بیان تک اس مضمون کو محدود کرنا چاہتا ہوں۔

چوں کہ چار سمتی عالم کا ہم کو کوئی تجربہ نہیں ہو اس لئے تین سمتی عالم کی مدد سے بطریق تمثیل بعض باتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہو کہ تین سمتوں سے بھی کم سمتوں کا وجود ہوسکتا ہو یا نہیں۔ اگر کوئی مثال دو سمتوں والے عالم کی موجود ہو تو جس قسم کی نسبت اس عالم کو تین سمتی عالم کے ساتھ ہوگی وہی نسبت تین سمتی عالم کو چار سمتوں والے کے ساتھ ہوگی۔ اگر غور کیجیے تو دو سمتوں والا عالم ایک طور پر موجود ہے یعنی سطح جس میں صرف لمبائی اور چوڑائی پائی جاتی ہے لیکن موٹائی نہیں ہو۔ اس عالم کے بعض معمے قابل غور ہیں۔

اس کاغذ کی سطح کو ہم ایک دو سمتی عالم فرض کرتے ہیں اور یہ تصور کرتے ہیں کہ اس میں بعض ذی روح اور ذی عقل ہستیاں موجود ہیں مثلاً ک ول م ن۔
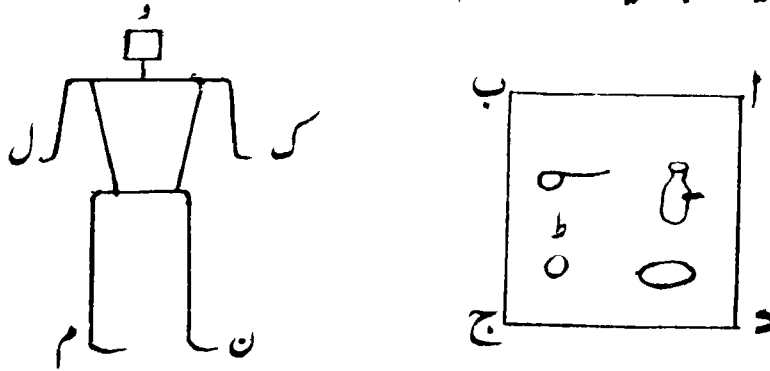
ان کا نام کو ”ملن“ صاحب ہو۔ چوں کہ سطح میں موٹائی نہیں ہے اس لئے جتنے اجسام اس عالم میں پائے جائیں گے ان میں صرف لمبائی اور چوڑائی پائی جائے گی۔ اس جسم کی حرکت صرف اسی سطح کے ساتھ وابستہ ہوگی اور سطح کے باہر اُسے کسی شے کا احساس نہ ہوگا۔ فرض کیجیے کہ اس عالم میں ایک مربع ا ب ج د ہو ”کولمن“ صاحب کے لئے یہ مربع بمنزلہ ایک صندوق کے ہو جس میں انھوں نے اپنی ضروری چیزیں رکھ دی ہیں اور ہر طرف

سے بند کردیا ہے ۔ مسٹر کولمن " کو پورا یقین ہے کہ صندوق ہر طرح سے مضبوط اور محفوظ ہے اور کوئی چیز نہ تو اُس کے اندر داخل ہوسکتی ہے نہ نکالی جاسکتی ہے ۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر عالم صرف سطح کاغذ تک محدود کردیا جائے تو کوئی جسم اس سطح پر چلتا ہو آ ب ج د کے اندر نہیں داخل ہوسکتا ہے جب تک کہ اُس کی دیواروں میں سے کسی ایک کو نہ توڑ دے ۔

میرا جسم تین سمتی عالم کا ایک جزو ہے اور میں اس سطح کاغذ سے علیحدہ بیٹھا ہوا ہوں ۔ اس لئے "کولمن" صاحب کو میرے وجود کا کوئی علم نہیں ہوسکتا ۔ میں نے بے تکلف اپنی پنسل سے اس صندوق کے اندر جو تول لکھی ہوئی تھی اس کی ایک سمت کو توڑ دیا اور اپنے داخلہ کا ایک اور نشان ط اس کے اندر بنا کر بغیر دیواروں کے توڑے ہوئے باہر چلا آیا ۔ اب جس وقت "کولمن" صاحب اس صندوق کو کھولیں گے تو اُن کو سخت حیرت ہوگی اور یقین کریں گے کہ ضرور یہ فعل کسی فرشتے یا بھوت یا جادوگر کا ہے ۔

لیکن میری جادوگری کا راز آپ بخوبی جانتے ہیں ۔ جس حالت میں کہ "کولمن" صاحب کا جسم دو ہی سمتوں تک محدود ہے اور ان ہی دو سمتوں کے اندر وہ حرکت کرسکتے ہیں ، مجھے تین سمتوں پر قدرت حاصل ہے اور میں نے ہوشیاری کے ساتھ ان دو سمتوں کو چھوڑ دیا جو مسٹر کولمن " کی دنیا میں پائی جاتی تھیں اور تیسری سمت یعنی کاغذ کے اوپر سے اپنی پنسل آ ب ج د کے اندر پہونچا دی اور بغیر بکس کو توڑے ہوئے اس کے اندر انقلاب پیدا کردیا ۔

اس تقدیر پر اگر چار سمتی عالم کا وجود ہو اور اس میں بھی ذی عقل ہستیاں موجود ہوں تو اول تو ہم کو اُن کے وجود کا کوئی علم نہیں ہوسکتا دوسرے ان کے لئے یہ بات بالکل ممکن ہوگی کہ ہمارے بند کمروں اور مقفل صندوقوں میں بے تکلف داخل ہوجائیں اور ان کی چیزوں میں خلل پیدا کردیں ۔

ایک اور مثال پر غور کیجئے ۔ آپ اکثر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے ہوں گے ۔ کبھی آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ جس طرح آپ کا ہم شبیہ یعنی عکس مرآتی کھڑا ہوا ہے آپ کبھی اُس حیثیت سے نہیں کھڑے ہوسکتے ؟ آئینہ میں آپ دیکھتے ہوں گے کہ جو آپ کا داہنا ہاتھ ہے وہ آپ کے ہم شبیہ کا بایاں ہاتھ ہے اور جو خال آپ کے بائیں گال پر ہے وہ اُس کی داہنی جانب ہے وغیرہ وغیرہ ۔ اب اگر آپ اپنے کو آئینہ کی پشت پر اسی نہج لیجا کر

کھڑا کریں جس رخ آپ نے اپنی عکس کو کھڑا دیکھا جب بھی آپ معلوم کریں گے کہ ایسا ناممکن ہے۔ آخر اس کا کیا سبب ہے ؟

میں پھر آپ کو "کولمن" صاحب کی دو سمتی دنیا کی مثال دے کر اس معمے کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے سامنے جو آئینہ ہے وہ ایک مجلا سطح ہے لیکن "کولمن" صاحب کا آئینہ صرف ایک خط ہوگا جسے ہم مجلا فرض کریں گے۔
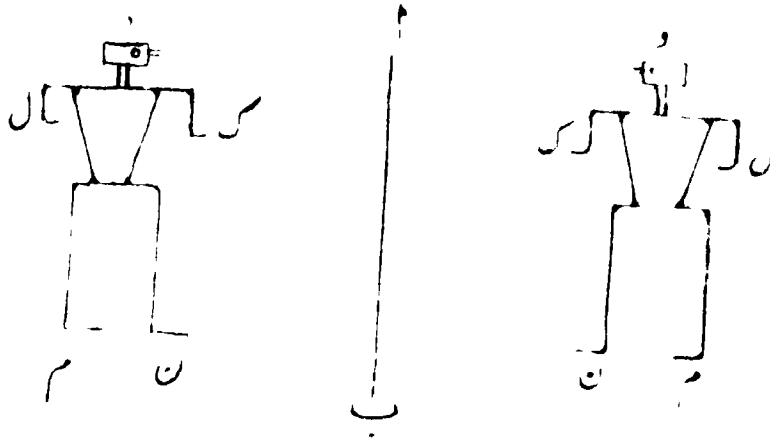
اب مسٹر کولمن" آئینہ "اب" میں اپنی صورت دیکھتے ہیں۔ اگر آپ اس ہم شبیہ کا کوئی نام رکھنا چاہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ترتیب کے لحاظ سے "کولمن" صاحب کے ہم شبیہ کا نام "لوکنم" ہوگا۔
بہرحال نام جو کچھ بھی ہو "کولمن" صاحب کے لئے یہ بات محال ہے کہ وہ اپنی دو سمتی دنیا میں اس طرح کھڑے ہو سکیں جس طرح ان کا ہم شبیہ کھڑا ہوا ہے بعض کوششیں "کولمن" صاحب کی قابل ملاحظہ ہیں۔
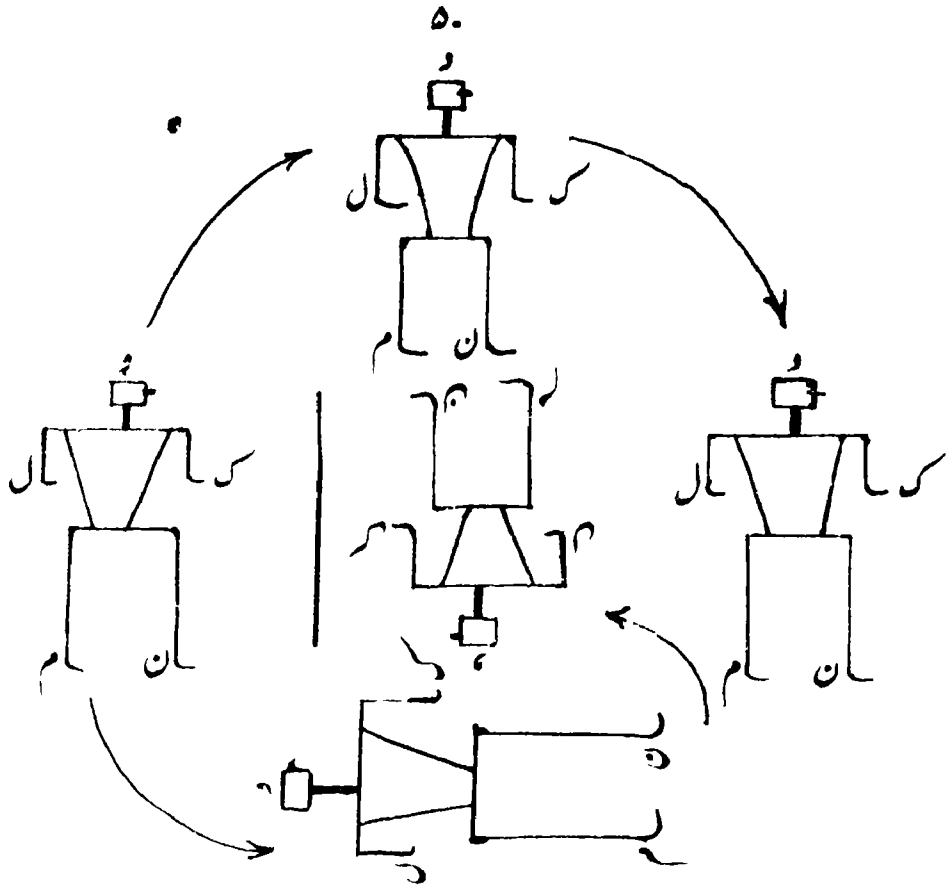
اب دیکھیے کہ باوجود تمام ترکیبوں کے "کولمن" "لوکنم" نہ ہوسکے لیکن میں اپنی جنبش قلم سے جب چاہوں ان کی جگہہ پر اُن کے ہم شبیہ کو یا اس کے برعکس اُن کو کھڑا کرسکتا ہوں ۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کاغذ کی سطحی دنیا سے باہر بیٹھ کر یعنی تیسری سمت سے اپنا عمل کر رہا ہوں ۔ زیادہ وضاحت کے لئے ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں ۔
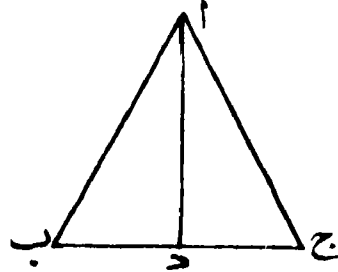
ا ب ج ایک مثلث ہے جس کے دونوں ضلع اب اور اج باہم برابر ہیں ا د قاعدہ ب ج پر عمود ہے یہ ظاہر ہے کہ ا د مثلث اب ج کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے یعنی مثلث اب د اور اج د ہر طرح آپس میں برابر ہیں ۔ ہم کو یہ بھی نظر آتا ہے کہ اگر ہم ا د کو آئینہ تصور کرلیں تو مثلث اب د مثلث اج د کا اس آئینہ میں عکس ہوگا ۔ اب

اگر ہم چاہیں کہ اب د کو اج د پر منطبق کریں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔ یعنی اب د کو سطح کاغذ سے باہر کی سمت میں گردش دے کر الٹ دیں۔ اس وقت اس کی صورت اس طرح ہو جائے گی جو بالکل اب ج پر منطبق ہو سکتی ہے۔

ا

ب د
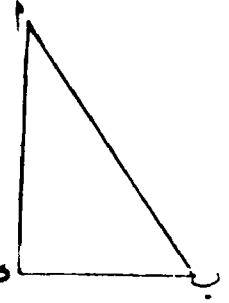
خلاصہ مقصد ان مثالوں سے یہ ہے کہ کوئی جسم اپنے عکس مراتی کی حیثیت صرف اس وقت اختیار کر سکتا ہے جب کہ اُسے کسی ایسی سمت میں گردش دی جائے جو اس جسم میں نہ پائی جاتی ہو۔ پس اگر ہم اپنے ہم شبیہ کے طریقہ پر کھڑے ہونا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ اپنے جسم کو ایک چوتھی سمت میں جو اس عالم سے خارج ہو گردش دیں۔

شاید یہ سوال پیدا ہو کہ اگر زمانہ چوتھی سمت ہے تو اس سمت میں کسی جسم کو گردش کیوں کر دی جا سکتی ہے۔ میری سمجھ میں بھی یہی بات آتی ہے کہ عملاً ایسا محال ہے۔ لیکن اگر کسی طریقہ پر بجائے مستقبل کی طرف سفر کرنے کے آپ یا رُخ پھیر دیں اور ماضی کی سمت اپنے کو حرکت کرتا ہوا تصور کریں تو شاید آپ اپنے کو اپنے عکس مراتی کا قائم مقام پائیں۔

اسی سلسلہ میں ایک حل طلب معما بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک روز ایک طالب علم کو بعد رابع کے بعض نکتے سمجھا رہا تھا اور مثال میں میں نے یہ بات پیش کی کہ میرے بائیں ہاتھ کا دستانہ داہنے ہاتھ والے دستانے کا عکس مراتی ہے اور اس لئے ایک دوسرے کے اندر نہیں آسکتا جب تک کہ اُسے چوتھی سمت میں گردش نہ دی جائے طالب علم نے مسکرا کر دستانے مجھ سے لے لئے اور دونوں کو اندر سے الٹ کر داہنے ہاتھ کا بائیں میں اور بائیں ہاتھ کا داہنے میں پہن لیا۔ میں اُس وقت سے حیرت میں ہوں کہ کیا چوتھی سمت میں گردش ممکن ہو گئی ؟

جو صاحب اس معمے کو حل کر دیں گے تو وہ اگر جماعت طلبہ میں سے ہیں تو دس روپیہ انعام کے مستحق ہوں گے اور اگر میرے ہم پیشہ ہیں تو اُن کو اجازت ہے کہ بے تکلف مجھے چار پر مدعو کر لیں لیکن معاملہ دونوں صورتوں میں اڈیٹر صاحب میگزین کی معرفت طے ہوگا۔

نوٹ ۔ ہم متوقع ہیں کہ ریاضی کے اس اہم مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لئے جناب ڈاکٹر صاحب ضرور اپنی توجہ مبذول فرمادیں گے تاکہ ہمیں بھی جلد بہ حیثیت ثالث اس بعد رابع کے فیصلہ میں بسمت خامس چار نوشی کے دور میں شرکت کا موقعہ مل سکے۔ (اڈیٹر)

اللغة العصرية

نقتبس هذه الارجوزة من صيفتنا مجلة الزهراء الغراء لشهر رجب سنة ١٣٤٢ نستدل بها على عمل هذا التيار المدهش الذى يوثر فى الألسنة كما يوثر فى الاقوام ويقلبها لظهر البطن
عبد الباسط - المدير

يا سادتى اذا سمعتم قصتى … نلتم ثوابًا وكشفتم غصتى
انى امرؤ لى شغف بلغتى … اعدّها كنزى واقصى نعمتى
اقضى نهارى باحثا وليلتى … عن جملة فصيحة او لفظة
وكلّ اسلوب فصيح اللهجة … يسرى الى النفوس سرى الخمرة
وقد بليت لتمام شقوتى … بصاحب يغرى لخير عصبة
لكنها شنت اضلّ غزوة … على لسان قد خلا من هجنة
ان قلت قل طول بديل طيلة … فليست الطيلة بالصحيحة
قال ولكن حبّذتها زمرتى … فهى طليّة باذن صحبتى
قلت وذا "التحبيذ" شر غلطة … فقال قد "استحسنت" تا من لغتى
قال اذا لم ترض عن تحبيذتى … فلست بالراضى على عقليتى
لانها تعرب عن نفسيتى … قد ادغمت فيها كعاطفيتى
وانت لو حققت فى شخصيتى … وهى التى تبرز منها روعتى
وكنت من يفكر فى تفكيرتى … وفيك تحليل كتحليليتى
اوكنت من يشعر مشعوريتى … لم تنتقد لفظى ولا طريقتى

ما قولكم يا قوم ضاقت حيلتى … فى فهم هذى اللغة العصرية

تدقیقات ادبی

جناب سید محمد داؤدی صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی مچھلی شہری

هر کسے میداند کہ ہمہ ذوق ادبی ما بیشتر از زبان پارسی ماخوذ می باشد حتی در باب نظم نگاری و شعر سازی ہم ازاں پیروی نمودہ ہماں شیوہ و اسلوبے را نصب العین خود ماں ساختہ ایم۔ ہیچ یک از ما انکار نمی تواند بکند کہ نغمہائے ایرانی ہمیشہ غذائے روحی برائے ما تہیہ کردہ است و لے از ہنگامے کہ زبانِ اُردو قدم بجادۂ تکامل گذاردہ و متحمل ہمہ گونہ حسیات رقت آور سے گردیدہ ما از زبان پارسی کہ حقیقتاً سرچشمۂ تخیل ما بودہ غمض نظر میداریم و ازیں رو تشویق ما دریں خصوص از میان رفتہ بستگی ما با آن زبان شیریں در عالم احتضار می ماند۔ ایں رویۂ ما ابداً بجفو و حق نشناسی ما دلالت کردہ ما را برائے ایراد و خردگیریہا وادار می نماید۔

اولیہا کہ در مضمار شعر و شاعری خامہ رانی کردہ اند ذوقِ ادبیت شاں در اُردو ہموارہ با ذوقِ ادبیت در پارسی راہ میرفت و سبب بایں ہر شاعرے با دیوان اُردو دارائے یک دیوان پارسی ہم مے بودہ ولے چنانچہ فوق بتذکرہ رسید آخریہا کہ عبارت از ادبائے کنونی مے باشد ابداً ہیچو ترتیباتے را ترک گفتہ اند۔

اگر احتمال بر اغراق نکردہ شود می توانیم بگوئیم کہ برائے تظاہرات حسیات رقیقۂ قلبی ہیچ زبانے نمی تواند با زبانِ پارسی برابری بکند۔ یک یک نقطہ ازیں تارے را نشاں میدہد کہ ہر آہنگش ہر چہ باریک تر مستقیماً بر دل شنوندگانش خوردہ باعث یک عالمِ ہیجاں میگردد۔ اگرچہ زبانِ پارسی تا اندازہ شایانے دارائے تالیفات و تصنیفاتِ فنی، اقتصادی و باستگی نبودہ ولے ازیں رو کہ یک رابطۂ مخصوصی با حیاتِ طبیعی بین الملی میدارد طرف توجہ جانب قرار گرفتہ چندیں مستشرقاں در اروپا پیدا کردہ است و از ہمہ ساحت عالم نقطۂ پیدا نیست کہ آہنگ ایں زبان شیریں بر سکنائے آں نخوردہ باشد، مے باشد زبانہائے اروپہ کہ بہ ہیچ رو خطاً و سواداً شبیہ بآن نیستند از آہنگ الفاظش بہرہ بر دارند ولے اُردو کہ جامہ اش تماماً از ہماں چوب قطع شدہ در ترنم و سامعہ نوازی

خودش را ہدست وہم آوردش نشان میدہد واگر ہمیں تشویقاتے کہ ادبائے ہندی از بابت آں بخرج دادہ تا مدت دیگرے ادامہ پذیرفت ممکن است کہ درآتی قریب اُردو از حیث تخیل وحیات رقیقہ دست بالا را داشتہ باشد۔ ولے دریں جا یک سوال مہمہ رخ میدہد وآن این است کہ درحالتیکہ اُردو از حیث کامل جملگی مدارج ارتقا راطے کردہ باشد آیا محتاج باعانۂ پارسی خواہد ماند یا خیر؟ جواب ایں سوال در اثبات وہم در نفی میتواند بشود۔ اداءِ اگر الفاظ مشکل کہ در اُردوے امروزی نمائش میکند جزو شیر مادر ہند ہا میتواند بشود جواب در نفی است ورنہ در اثبات۔ زبان اُردو باصورتیکہ در ہند رواج میدارد از یک حالت مخصوصی نشان میدہم یعنی در بیشتر نقاط زبان مادری ما از زبان ادبی کہ در کتب و رسائل ومجلہ ہا در وزنامہ ہا جلوہ نمائی میکند ابداً متغایر است و زبانیکہ بقلم میرود باآنکہ برائے حرف زدن وصحبت بکار مے بریم خیلے فرق دارد و تا ہنگامیکہ آں الفاظ و لغات کہ تنہا بقلم علاقہ دارد داخل شیرِ مادر بچہ ہا نشود اردو را خودی خود یک زبان مستقل ومضبوط قرار دادن مقارنِ صوابدید ادبیت نمی باشد و بدیں ملاحظہ لازم است کہ ما آں زبانہائے را کہ سرچشمۂ اُردو بودہ و برائے آں افکار و لغات تہیہ نمودہ تا تکامل زبان مزبور وہم بعد ہرگز ہرگز ترک نگوئیم۔ علاوہ بر زبانِ پارسی سبب بایں کہ ادبیت ما بیشتر ازاں ماخوذ مے باشد جزو تخیل ما گردیدہ ما بان یک علاقۂ طبیعی پیدا کردہ ایم وہنگامے کہ نگاہ ما بر اشعار پارسی کہ باسلوب در رشتے ساختہ شد میخورد ما در اعماق دلہائے خود ماں یک کیف مخصوصی راحس میکنیم وہیچو لذتے را پیدا نمائیم کہ از خواندن اشعار اردو ہرچہ تاثیر نائل نشدہ و بابستگی ما با زبانِ پارسی از بستگی با اردو قوی تر میباشد الحال از ہر جہت خواہ انعدم تکامل زبانِ اُردو و یا نیا بعلاقۂ مخصوصی کہ با زبانِ پارسی پیدا کردہ ایم مسؤل بحفظش مے باشیم وموظف ایم کہ ایں زبانِ شیریں را در اعماق دلہائے خود مان ہمچوں زبانِ اُردو بپرورانیم۔

بدیہی است کہ زبانِ پارسی خیلے پیش رفت نمودہ در نقاط عالم دخالتے پیدا کردہ است و در ہر جائے محصل موجود است کہ کمابیش با ایں زبانِ شیریں آشنائی ووقوفے را میدارد لذا کہ بہیچ قرار میخواہیم کہ ادب اردو را در بین آنہا پیش رفت نمائیم استعانہ بہ پارسی لازم می گردد۔

تاکنوں ہیچ یک از ادبائے اُردو اہمیت شایانے در نظر اردو بائیان تحصیل نمودہ جہتش جز ایں چیز دیگر نیست کہ اردو ہنوز خصوصیات بین المللی را احراز نہ نمودہ است۔

درین موقع یک نفر مے تواند بگوید که نشر و رواج زبان پارسی در هند چه طور معاون روشناسی اردو بممالک خارجه مے توانند بشود و چرا خود اردو را تا به آن درجه نرسانیم که می تواند اهمیت خودش را بر سکنائے خارج نقاط عالم تحمیل نماید- آرے این سوال بسیار اهمیت را میدارد و بنده هم معتقدم که برائے احراز این مقصد اردو باید خودی خود پیش رفت نماید ولے چنانکه در فوق ذکر شد مقصودم فقط این است که آقایان خارجی که با سواد پارسی آشنائی میدارند بسبب مشابهت خطی و سوادی اردو را مے توانند بزودی هر چه تمامتر بر میدارند- لذا بعلاوه آن بستگی که از روے ذوق با زبان پارسی میداریم ازین حیثیت هم تحصیلش بر ما لازم مے باشد-

درین موقع یک قضیه دیگرے هم رخ میدهد و آن این است که حالیه ادبیت در ایران رو بتجدد گذارده است و ادب خواهان در صدد جستجو افکار برآمده اند که از حسیات و افکار اروپائیان بهره ها برداشته پارسی را در صورت قشنگی نظر فریب جلوه بدهند- لذا اگر ما زبان پارسی را با وضعیت موجوده اخذ نمائیم بعلاوه اسلوب جدید خودش چیزے از افکار امروزی اقوام متجدده هم تحصیل نموده دو کار را به یک دست خواهیم کرد ولے این پیش نهاد یکنوع اندیشه را هم در بر میدارد- مے باشد که ادیب متجدد واقعاً صاحب ذوق سلیم باشد و مے باشد برضد آن- سیلاب تجدد بد را از نیک تمیز نمی دهد و ممکن است موقتاً در جوش افکار انقلاب سرمایهٔ پر قیمتش را هم بباد دهد و در حرص افزائش از داری در دستش هم دست را بشوید- همین نظریه در موضوع ادبیت ایرانی هم رخ داده و بعض بازی ازادبائے متجدد در فکر پیروی از اروپائیان خصوصیات ملی خودشان را فراموش نموده یکنوع ادبیت مجنس را پیدا نموده اند در جائیکه نغمات خوش آهنگ حضرت عارف قزوینی مایهٔ آوازه خوانی بلبلان شیوه طراز مے باشد صدائے زهنگام "قلیوقو"، "نسیم شمال" هم، گوشهائے ادب خواهان صحیح الذوق میخراشد-

مقبولیت زبانِ پارسی ابداً بنا بر آن حسیات رقیقه که در دل شنوندگان یک برق ابتهاجے زده از خود بیخود گردانید بوده است- اگر ما از آن اسلوب و سبک ترک گفته شعر را برائے تظاهرات سطحی بکار مے بریم یقیناً بدان صنعت مستظرفه که عبارت از رقتِ تخیل است لطمهٔ سختے وارد آورده ایم- شعر در حقیقت برائے اظهار واقعات مادی که از ظاهر طبیعت جلوه نمائی کند و بیشتر با باصره تعلق دارد نباشد- بلکه تکلیف عمدهٔ آن این است که چیزے را که بدان باصره پے نمی تواند ببرد (یعنی حسیات رقیقه و دقیقه که در اعماق دل مستتر می ماند) بروے کار آورده و در پیشگاه

مجسم نموده پیش چشمان جلوه بدهد - چنانچه شعر برای بودن شعر باید این خصوصیات را تا درجهٔ اتم دارا باشد - "تاج" آگره را برای تمثیل در نظر میگیریم - این عمارت منیع که یکی از عجائبات - عالم شمار میرود برای تذکارش دو نوع حیات را لازم دارد - حسن ظاهری وسطحی و یکنوع حسن مخصوصی که به تنها با صنائع مستظرفه علاقه دارد و عبارت از خیالات دقیقهٔ شاعر است - اگر میخواهیم معلوم ما بشود که عمارت مزبور رسمی بر باشد - چه نوع سنگ را بکار برده اند - چند تا درها - دریچه ها - گنبد ها - مناره ها وغیره را میدارد برای اظهار همچو ترتیبات "نثر" در مقابل "نظم" زیادتر آسان و درست است ولی اگر مقصود ما حرف راندن ازان حیات دقیقه‌ای باشد که تناسب ارکانش و منظرهٔ عمومی اش تولید می نماید استعداد به ملکهٔ شعری خیلی لزوم دارد و ما هرگز نمی توانیم آن حیات و مزایای مخصوصی را جز در شعر بطور دیگری نشان بدهیم متجددان در ادبیات را لازم است که همواره همچو ترتیبات و مقتضیات را در نظر دارند والا همهٔ زحمت شان از قبیل شعر ساختن بهدر رفته برای تغذیه شدن روح چیزی تهیه نخواهد داشت - ممکن است که همچو شعرا موقتاً طرف تمجید آقایان متجدد بیایند ولی در نتیجه تصانیف شان برای بالغ نظران هیچ تاثیری ولذتی را نخواهد داشت و اسم شان هم بر اثر ختام تماثیلات و مقتضیات عصری که تولید کنندهٔ افکار شان میبوده از صفحهٔ هستی محو خواهد شد - متجددان در ادبیات همه گونه آثار قدیمه را بنظر ایرادو نکته چینی می بینند ولی این همه احساسات موقتی پیدا شده و در آخر معلوم شان خواهد شد که چقدر از جادهٔ انصاف دورمی بوده اند -

این مسئله که ما همیشه در طرف تجدید اروپائیان می باشیم یک جهت دیگری را هم میدارد - و آن چنین است که زبانی را که ما از خارجیان بر میداریم بر حسب مثل "گل جدید لذیذ" برای ما لذتی تازه تولید می نماید و از این روی باشد که ما با ادبیات اروپائیان یک نوع بستگی موقتی و غیر طبیعی را پیدا کرده ایم والا اگر متفکرانه نظر بکنیم محسوس خواهیم داشت که ادبیات مشرق زمین خاصه اشعار و منظومات بمراتب بالاتر از ادبیات خارجیها می باشد - همان شعرای آسیا که عصراً مورد هزاران ایرادات بقلم یوروپی مآبان می باشند در ضمن حیات حسن و عشق همچو افکار رقیقه و دقیقه را بروز داده اند که مثلش در هیچیک از ادبیات اجانب دیده نمی شود - لهذا مناسب نمی باشد که ما از گفته و نوشته های متقدمین مان غمض نظر داشته آثار ذی قیمت شان را بر اثر مقتضیات عصری ضائع نمائیم - ولی این هم پسند نمی کنم که ادبیات ما از دائرهٔ تنگ زلف و کمر و بوس و کنار قدم بیرون نگذارده باشد -

بندہ این ہمہ تجددا تے را کہ در ادبیات اُردو رخ دادہ بنظر تحسین و قدردانی می نگرم۔ و لے با این ہمہ خواہشمندم کہ تخیل ما عیناً تخیل اروپائیان و متجددین ایرانی را دنبال کردہ خودش را گم نہ سازد و نغمہ ہائے بلبلان گلشنِ ادبیت ما در بانگ گوش خار "قلیوقو" تبدیل نیابد۔ اگر بعضی از ایرانیہا میخواہند کہ از جادۂ اعتدال تجدد قدم بیروں گذاردہ در پیروی اروپائیان خصوصیات ملی خودشان را بباد دہند برائے ما ہمراہی با افکار آنہا در ہر موقع و تا ہر اندازہ لازم نیست و بر مدلول "خذ ما صفا و دع ما کدر" کاربند شدہ از خزف حرف نظر داریم و از لآلی حیات پُر قیمت آنہا خزانۂ معرفت و ادبیت خود ماں را معمور و مملو سازیم۔

پروانہ

اے سوز کے دیوانے، اے عشق کے پروانے اے موت سے بیگانے، اے شمع کے پروانے

تو قیس ہے سرتاپا، اور شمع تری لیلی

سرشار محبت ہے پروردۂ فرقت ہے خوکردۂ وحشت ہے جاندادۂ اُلفت ہے

سودا ہے ترا سودا، ہے عشق میں تو یکتا

ننھا سا یہ دل تیرا ہے طور محبت کا موسیٰ کو بھی سودا تھا لیکن نہ ترا ایسا

ہوتا وہ اگر پختہ لازم تھا کہ جل جاتا

جلوہ جو ادھر دیکھا بیتاب ہوا گیا تھی دید رخ زیبا، پیغام اجل گویا

کیا ذوق محبت ہے، کیا شوق محبت ہے

رُباعیاتِ نعت

(۱)

ہے نعت کا شوق گو سخنداں تو نہیں
ہاں شکر ہے اور کوئی ارماں تو نہیں
جنت صلۂ نعت میں دیتے ہیں مجھے
یہ جنسِ عزیز اتنی ارزاں تو نہیں

(۲)

کیا بحرِ کرم حضور کا سینہ ہے
دل راست د مرحمت کا گنجینہ ہے
انوارِ خدا دیکھ لو اس کے اندر
قامت میں قدِ آدم آئینہ ہے

(۳)

دنیا میں رسول اور بھی لاکھ سہی
اپنا ہے مگر حضور کو تاجِ شہی
ہے خاتمۂ حسن عناصر ان پر
ہیں مصرعِ آخر اس رُباعی کے وہی

(۴)

روشن مجھے اب تیرہ شبی کرنے دے
رنجور ہوں درماں طلبی کرنے دے
ہٹ چشمِ تصوّر سے الگ اے دنیا
دیدارِ رسُولِ عربی کرنے دے

(۵)

جب راہ رَوِ عرب یہ طالب ہو جائے
پھر ہو تو فراقِ روح د قالب ہو جائے
معراج یہی ہے جسمِ خاکی کے لیے
گردِ رہِ کاروانِ یثرب ہو جائے

(۶)

سب شربتِ دیدار کو پینے پہنچے
ہم رہ گئے اوروں کے سفینے پہنچے
ہے بارِ جسد تو چھوڑ دے اس کو یہیں
یوں ہو کے سبک روح مدینے پہنچے

(۷)

پروا کسی راحت و اذیت کی نہیں
درگاہِ نبیؐ سے تابِ فرقت کی نہیں
لے پیکِ اجل روح کو یثرب لے چل
دیدار کی آرزو ہے جنت کی نہیں

حامد حسن قادری بچھرایونی

فطرت کی ستم ظریفی

از

تماشائی بریلوی

دنیا کے ناپیداکنار سمندر کی مسلسل اور متواتر موجیں ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ کنارے سے آآ کر ٹکراتی ہیں اور پھر واپس ہو کر سرگرم سفر ہو جاتی ہیں۔ لب ساحل پر بلبلے پیدا ہوتے ہیں، اور آن کی آن میں فنا ہوتے جاتے ہیں، مگر سمندر کی ترتیب میں ان بلبلوں کی زیست اور موت سے کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا، وہ اسی شانِ رعنائی، اور اسی انداز بے نیازی کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔ ابھی کل کا دن ہے کہ سید الطاف علی صاحب کی اہلیہ محترمہ جن کے ساتھ ان کے شوہر نامدار کو گہرا عشق تھا راہی ملک بقا ہوئیں، مہینہ دو مہینہ تک تو سید صاحب اس صدمہ جانکاہ کے اثر سے بہت دلگرفتہ اور مغموم رہے، مگر آخر کار ان کی طبیعت بہلتے بہلتے یکسو ہو گئی۔ کارگاہِ دہر کی نیرنگیاں کچھ عجیب محیر العقول ہوتی ہیں، بڑے بڑے شاہان نامدار ہزاروں سرو قد، سیمین بدن، غنچہ دہن مرتے چلے جاتے ہیں، آج مرے کل دوسرا دن، دنیا کی رونق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بیچارے سید صاحب اپنے شدید عشق و محبت کے باوجود دو تین ماہ سے زیادہ دامن صبر و شکیبائی کو اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے!

اس وقت اُن کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان ہو گی، مگر پولیس کی ملازمت، آفتاب کی حدت، اور آئے دن کی مشقت نے اُن کو قبل از وقت کمزور و ناتواں کر دیا تھا۔ چہرے پر تھوڑی تھوڑی جھریاں آ چکی تھیں۔ ڈاڑھی کے نصف سے زائد بال محتاجِ خضاب تھے، نہ وہ جوشِ جوانی تھا، اور نہ وہ رعنائی و زیبائی جو عنوانِ شباب میں نونہالانِ چمن کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز و مستغنی بنا دیتی ہے، پھر بھی سید صاحب کی ہمت مضبوط اور حوصلہ بلند تھا، مگر موجودہ حالت میں اُن کو ایک سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اُن کے دوستوں اور عزیزوں کو علم تھا کہ سید صاحب اپنی بیوی سے نہایت گہری اور سچی محبت رکھتے تھے، یہاں تک کہ وہ عشق کے درجہ تک پہونچ چکی تھی، اس لیے کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ عقد ثانی کے مسئلہ پر اُن سے بالمشافہ گفتگو کر سکے۔ ایک دو

صاحب نے اس سانحہ کے بعد ہی باتوں باتوں میں سید صاحب کا عندیہ لینا چاہا، مگر مناسب موقعہ نہ ہونے
کی وجہ سے صاف جواب پایا، صدمہ تازہ تھا، دل پر رنج والم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، ہوش و حواس پراگندہ
تھے، اس لیے یہ انداز گفتگو برہم کن ثابت ہوا مگر اب تین چار ماہ کے بعد خیالات اور جذبات میں ایک انقلاب
عظیم پیدا ہو چکا تھا، رنج والم کا بادل چھٹ گیا، صدمہ کا اثر محو ہو چکا تھا اور ہوش و حواس بجا ہو گئے، اسی اثنا
میں سید صاحب للت پور سے رخصت لیکر مکان گئے، اور وہاں تقریباً دو ماہ مقیم رہے۔ دراصل رخصت لیکر امروہہ
جانا محض آب و ہوا کی خرابی ہی کی وجہ سے نہ ہوا، بلکہ اس میں ع "کچھ شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی تھا"، اُن کا اصلی مقصد
یہ تھا کہ کچھ زمانہ تک وطن میں ہی رہیں، لوگوں سے ملیں جلیں، اعزا و اقارب سے ربط ضبط بڑھائیں، اپنی پہلی خوشدامن
صغرا بیگم سے مشورہ کریں، اُن کی پوری پوری امداد حاصل کریں، سب گھرانوں کا ذہنی جائزہ لیں، اور اگر تقدیر مساعد
کرے تو اس کارِ خیر سے فارغ بھی ہو جائیں۔ ویسے سید صاحب بذاتِ خود نہایت ذی وقار، اور صاحبِ مقدرت
سب انسپکٹر پولیس تھے، نہایت نیک نام اور کارگذار، اُن کا اعمال نامہ قابل دید تھا۔ سالانہ رپورٹ میں اُن کی
خاص طور سے تعریف و توصیف کی جاتی تھی۔ ڈیڑھ سو تنخواہ تھی، اور کم از کم اس سے پانچ چھ گنی زیادہ اوپر سے
یافت ہو جاتی تھی، گھر میں اثاثہ اچھا خاصہ امیرانہ تھا، زندگی نہایت خوشی اور فراغت کے ساتھ بسر ہوتی تھی اُن کے
صرف ایک لڑکی تھی جس کے جہیز وغیرہ کا سامان وہ عرصہ ہوا مکمل کر چکے تھے، جہاں چاہتے ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے،
جس طرح چاہتے شادی کرتے اور جب چاہتے دروازہ پر نوبت خانہ کا سامان کر دیتے، مگر پرانی لکیر کے فقیر
تھے، اُن کی دلی آرزو یہی تھی کہ جس طریقہ سے ہو اپنے ہی خاندان میں شادی ہو، کچھ مضائقہ نہیں، کسی گھر
میں ہو، مگر سسرال برادری سے خارج نہیں ہونا چاہیے۔ رسم کی پابندی اور دیرینہ روایات کو مذہبی حرمت
تک پہونچا دینا اُس کے دین و ایمان کا اہم ترین جز تھا۔

سید صاحب کے والد بزرگوار اُن کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے تھے، نہ صرف یہ بلکہ اُن کی والدہ صاحبہ
بھی دو سال ہوئے داغِ مفارقت دے گئیں تھیں، مزید برآں کوئی بھائی یا بہن ایسی نہ تھی جو اس کارِ خیر میں اُن
کی دستگیری کرتے، اور اُن کی معین و مددگار ثابت ہوتے، اور جس کے روبرو وہ اپنا داستانِ درد کہہ سکتے،
صرف اُن کی خالہ صاحبہ صغرا بیگم ایسی تھیں جو اس مشکل کو آسان کر سکتیں تھیں، اور جن کی امداد کے بغیر سید صاحب

اس معاملہ میں ذرا بھی پیشقدمی نہ کر سکتے تھے، مگر دقت یہ تھی کہ صغرا بیگم سید صاحب کی خوشدامن بھی تھیں، اور اس صدمۂ تازہ کے زمانہ میں اُن سے اس قسم کی اعانت کی توقع رکھنا عبث بھی تھا۔ اور ایک حد تک خلافِ عقل بھی ان ہی خیالات اور تفکرات میں غلطاں وپیچاں سید صاحب امروہہ میں وارد ہوئے! ور اپنی زندگی کے دن نہایت کرب اور بے چینی سے گذارنے لگے۔ ان کی حالت نہایت قابلِ افسوس تھی!

(۲)

کامنی، جادو نظر کامنی، پری پیکر کامنی، ایک خاص ادائے دلکش کے ساتھ محوِ خرامِ ناز ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ صرف حسین ہی حسین ہے بلکہ اس لیے مخصوص کہ اس کی قیامت خیز شوخی، اور فتنہ زائی نے امروہہ کی کل آب وہوا کو ایک خاص سکر شرابیت کے ساتھ معمور کر دیا تھا، ایسی ویسی شرابیت نہیں جس کا نشہ گھنٹہ دو گھنٹہ میں ہرن ہو جائے، بلکہ ایسی شرابیت جس کے متوالے گریبان چاک کر کے آوارۂ دشت وجبل ہو جاتے ہیں اور خارِ مغیلاں کو بستر استراحت سمجھتے ہیں۔ سُنا ہے کہ بوئے نافہ پوشیدہ نہیں رہتی، شاید نہ رہتی ہو، اور اغلباً نہیں رہتی ہو گی، مگر حُسن کی طبیعت رنیدیان تو یقیناً سنگین قلعہ کی بلند سے بلند چار دیواری کو عبور کر سکتی ہیں، اور حد نظر تک ایک ایسا دامِ محبت بچھا دیتی ہیں جس میں گرفتار ہونے کے بعد موت یا دیوانگی یقینی ہے۔

سید صاحب نے امروہہ میں داخل ہونے کے بعد ہی اس کا فراد کے حسن وجمال کا شہرہ سُن لیا تھا۔ اور دل ہی دل میں دعائیں مانگتے تھے کہ اگر یہاں سلسلہ جنبانی کامیاب طریقہ سے ہو سکے تو عجیب پُرلطف زندگی ہو جائے۔ میں ابھی جوان ہی ہوں ابھی میری عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ اچھا خاصا تندرست ہوں۔ پولیس کا افسر ہوں، ایسا افسر کہ جس کی سطوت سے کل علاقہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے، سینکڑوں چور اور ڈاکو جیل خانہ میں میرے ہی اک اشارہ پر سڑ رہے ہیں، ہزاروں کج کلاہ بانکے ترچھے ٹھاکروں و زمینداروں کو نیچا دکھا چکا ہوں، مجھے قوی اُمید ہے کہ میرے مقابلہ میں کوئی اور آرزو مند سرسبز نہ ہو سکے گا' یہ غلط فہمی بھی کیسی مضحکہ انگیز تھی!

کامنی جوان تھی، اور جوانی بذاتِ خود دنیا کو تباہ کر دینے والی فسوں سازی کا نام ہے، حسین تھی، ایسی حسین

کہ خاندان کی کوئی اور لڑکی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی، بلا کی شوخ اور طرحدار تھی، ایسی شوخ کہ اُس کی شوخی کے سامنے فتنۂ قیامت بھی کم نظر آتا تھا۔ سید صاحب کے خاندان کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایسے گھرانے کی جس کا وقار کسی سے کم نہ تھا، سید صاحب کی تلاش و جستجو، اُن کی کرب و بے چینی، اُن کی وارفتگی اور پریشانی یکایک اسی "نقطۂ رنگ و بو" کی جانب راجع ہوئیں اور اس شدت سے کہ وہ کامنی کے نادیدہ مشتاق ہو گئے، اور ایک دیوانگی کے جوش میں ہمیشہ کے لیے اُس کے ہو لیے۔

صغرا بیگم بڑی ہوشمند، ذہین پختہ کار، اور ذی فہم تھیں، ایک ہی نظر میں سب کچھ تاڑ گئیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کے اضطراب اور مدہوشی کو دیکھ کر کچھ محظوظ بھی ہوئیں اور دل ہی دل میں ہنسی ہونے لگیں کہ اس سن و سال میں یہ بے چینی اور دیوانگی کس قدر مضحکہ خیز ہے، اللہ رکھے خود اُس کی لڑکی جوان ہے دوسرے، بیوی ابھی مر چکی ہے، یہ جوشِ جنوں کسی طرح پسندیدہ نہیں، مگر خالہ ہونے کی وجہ سے اُن کو داماد ہونے کی وجہ سے بہت محبت تھی، اُن کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ اور اُن پر جان و مال ہر عزیز شے فدا کرتی تھیں دنیا کی بھری آبادی میں اس بھانجے اس نواسی کے علاوہ اور کوئی اُن کا سہارا نہ تھا۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ میری لڑکی تو مر چکی، مجھ پر جو آفت آنے والی تھی وہ آ چکی میرے دل پر جو صدمہ ہونے والا تھا وہ ہو چکا، اب میری بلا سے اس کے گھر میں کوئی بیاہ کر آئے، مجھے کیا مطلب؟ مجھے کیا سروکار، بہرحال مجھ سے اس کی یہ کیفیت یہ وحشت، اور پریشانی نہیں دیکھی جاتی میرا فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں۔

روز بروز سید صاحب کی حالت خراب ہوتی جاتی تھی دامنِ صبر و قرار اُن کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اور ایک مرغِ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے، آخر انسان کب تک آتش بجاں رہے۔ موقع مناسب پا کر ایک روز اپنی خوشدامن صغرا بیگم سے کہنے لگے۔

سید صاحب۔ اماں بی! اول تو للت پور کی آب و ہوا نہایت خراب ہے ...... اور ..... پھر کرنا چاہیے۔
صغرا بیگم۔ ہاں! میں خود دیکھ آئی ہوں، بڑا خراب ملک ہے۔ میں یہاں سے اچھی خاصی گئی تھی، وہاں پہونچکر بیمار پڑ گئی۔

سید صاحب۔ اور پھر..... وہاں میری طبیعت کسی طرح نہیں لگتی گھر کاٹے کھانے کو دوڑتا ہے۔

صغرا بیگم - (آبدیدہ ہوکر) اکبری کی موت نے تو مجھے اَدھمرا کر دیا . . . . اور تم کو بھی ایک مصیبت میں ڈال دیا۔

سید صاحب (رقت کے ساتھ) میں نے تو اسی وجہ سے رخصت لی ہے کہ اب وہاں واپس نہ جانا پڑے۔ کہیں اور کی تبدیلی ہو جائے۔

صغرا بیگم - خدا کرے کہ ایسا ہو آمین اس طرف کہیں قریب اگر آ جاؤ تو بہت اچھا ہو۔ اول تو وہ دور بہت پڑ سے ایک دن اور ایک رات کا سفر ہے۔ دوسرے آب وہوا خراب ہے، دوسرے وہ گھر منحوس ہے۔

سید صاحب - میں کوشش کر رہا ہوں، شاید تبادلہ ہو جائے!

صغرا بیگم - میں کہتی ہوں کہ تمہاری لڑکی جوان ہے، تمہیں کھانے پینے کی بھی تکلیف ہوگی، مجھ کمبخت کا کیا ہے آج مری کل دوسرا دن، یہ بیچاری اکیلی کس کے پاس رہے گی؟ (زار آبدیدہ ہوکر) کہ تم کہیں مناسب جگہ نکاح کر لو۔ ایسے بے گھرے کب تک رہو گے؟

نکاح کا نام سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ اور آنکھیں چمکنے لگیں۔ مگر حتی الوسع اپنے جذبات کو روکے رہے۔ گو بظاہری اور یکایک تبدیلی صغرا بیگم کی تیز نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

سید صاحب - اماں بی! میں کیا عرض کروں مجھے تو نکاح کے نام سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے نہ اس طرح آرام ہے، نہ اس طرح چین، سارے گھر کا سامان بے ترتیب پڑا ہوا ہے۔ نہ روٹی کا ٹھکانا ہے، نہ کپڑوں کا بندوبست۔

صغرا بیگم - اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ اس کام میں دیر نہیں کرنا چاہیئے۔

سید صاحب - اب جیسا آپ کا حکم ہو؟ مجھے اُس کی تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

صغرا بیگم - مگر یہ تو بتاؤ کہ کہاں نکاح کرو گے؟

سید صاحب - (شرما کر اور نگاہیں نیچی کر کے) جہاں آپ کی مرضی ہو!

صغرا بیگم - مجھ نگوڑی کی مرضی کا کیا - میری اکبری کو تو اللہ نے اٹھا لیا (آہِ سرد بھر کر) اب تم جہاں چاہو کرو۔ جس سے چاہو کرو۔ دوسرے بیسویں صدی میں بڈھوں کا وقر کوئی نہیں کرتا - اب تو وہ بے حیائی

اور بے شرمی ہونے لگی ہے کہ ہم بڈھے اگر مرجائیں تو اچھا ہے۔ ہمارے وقت میں ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔

ید صاحب۔ آپ نے درست فرمایا۔ اب تو زمانہ میں دوسرا رنگ غالب ہے۔

غرا بیگم۔ بس اب تو کچھ دنوں بعد لڑکیاں خود اپنا بر پسند کیا کرینگی۔ بس ہمیں تو خدا اُٹھا ہی لے تو اچھا ہے۔

ید صاحب۔ جی۔ بالکل صحیح فرمایا۔

غرا بیگم اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ تم مجھے اپنی مرضی تبلا دو۔

ید صاحب۔ میری وہی مرضی ہے جو آپ کی ہو۔

غرا بیگم۔ یہ تمہاری نیک بختی ہے کہ تم ہمارا اتنا خیال کرتے ہو۔ مگر میں بغیر تمہارے مشورہ کے اس میں کچھ نہ کرونگی۔ یہ سُنکر سید صاحب کچھ سراسیمہ ہوئے، اُن کو خوف ہوا کہ کہیں اس انکسار میں یہ سلسلہ کلام اسی جگہ نہ ختم ہو جائے۔ اور میں بے نیل مرام رہجاؤں۔ کچھ شرما شرما کر بولے۔

ید صاحب۔ (نیچی نگاہیں کر کے) اماں بی! دور جانے کی کیا ضرورت اسی محلہ میں چچا سید ارادت علی صاحب کے یہاں......

غرا بیگم۔ ارادت بھائی کے یہاں؟

ید صاحب۔ جی۔

صغرا بیگم اس داستان درد سے کما حقہ واقف تھیں، اور اسی لیے اس جواب کے لیے طیار بھی۔ کہنے لگیں...."تم نے اچھا کیا۔ ہمیں اپنے دل کی بات بتا دی۔ میں ضرور کوشش کرونگی"۔

ید صاحب۔ اماں بی! آپ کے احسانات میرے اوپر بے اندازہ ہیں۔ آپ کی مہربانیوں کا بوجھ میرے سر سے کبھی نہیں اُتر سکتا، اب بھی آپ ہی کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ کام بخیر و خوبی ہو جائے گا۔ یہ کہکر سید صاحب صغرا بیگم کے چہرے کو ذرا غور سے دیکھنے۔

صغرا بیگم۔ میں کوشش ضرور کرونگی، مگر کام ہونا اللہ کے ہاتھ ہے مجھے تو نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ بہت مشکل محض تمہارے اصرار کی وجہ سے میں اس کا تذکرہ کروں گی، ورنہ یہ بیل اس طرح منڈھے چڑھتی نہیں

معلوم ہوتی۔

سید صاحب ۔ میں تمام عمر آپ کا ممنوں رہونگا۔

صغرا بیگم ۔ اللہ مالک ہے ۔ بھائی ارادت کے ایک ہی بچی ہے ۔ وہ تو شاید بڑے چونچلے سے شادی کریں۔

یہ سُنکر سید صاحب کچھ بہت زیادہ متوحش ہوئے، چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ اس وقت اُن کے لب پر آہیں تھیں مگر نارسا، اور دعائیں تھیں مگر نا قبول۔

(۳)

کامنی بیگم کی والدہ محمودہ بیگم اس وقت باہر دھوپ میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی پان کھا رہی تھیں، پان کی دو تین گلوریاں کھانے کے بعد اُنہوں نے پاندان بند کیا اور چھالیہ کترنے میں مشغول ہوگئیں۔ موسم سرما شباب پر تھا، دھوپ نہایت لطیف اور شیریں معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اُن کے خیالات ایک تیز روانی کے ساتھ ایک خاص مسئلہ پر اُمنڈے چلے آ رہے تھے، اور وہ اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھیں -

"بھلا، میں یہ کہتی ہوں، کہ کہیں صغرا بیگم دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے۔ مجھے تو وہ بالکل پاگل معلوم ہوتی ہیں ۔ سراسر پاگل ۔ بالکل پاگل ۔ بھتیجے کی ایسی اندھی محبت بھی خدا کسی کو نہ دے۔ بھلا کہاں میری کامنی، اور کہاں وہ موا داروغہ جس کی کوئی کل ہی درست نہیں، وہ داروغہ ہے تو ہوا کرے، ہمیں کیا دیدیگا۔ میں کہتی ہوں کہ آخر صغرا بیگم کو کیا ہوگیا ہے۔ اُن کو منہ سے یہ بات نکالنے سے پہلے سوچنا چاہیئے تھا۔ میری بچی کی عمر ابھی اصل خیر سے سولہ سال کی ہے۔ وہ موا ہوگا پچاس سے اوپر۔ خود اُس کی لڑکی کامنی سے پانچ مہینہ بڑی ہے۔ اُس کمبخت کو چاہیئے کہ اپنی لڑکی کی شادی کا بندوبست کرے اُس کے لیے میاں تلاش کرے۔ اس کی بجائے، چلا اپنی شادی کو اور وہ بھی کس سے؟ کامنی سے ۔ بڑھاپے میں ان کمبخت مردوں کو کیا ہو جاتا ہے۔ اندھے ہو جاتے ہیں، اندھے نہ حیا رہتی ہے۔ اور نہ شرم۔ اس قدر کہنے کے بعد محمودہ بیگم کے خیالات کے روانی مسدود ہونے لگی، چھالیہ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اُچھل کر چارپائی کے نیچے جا گرا، اُس کو اُٹھانے کے لیے اُنہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نگاہیں بلند ہوئیں، سامنے اُن کے چارپائی کے قریب کامنی بیگم کے والد سید ارادت علی صاحب کھڑے تھے، اور ایک عجیب پیار و محبت کی للچائی ہوئی نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھ رہے تھے، اُن کی نگاہوں میں ایک عجیب سرور تھا۔ پیار تھا۔ نیاز تھا،

بے چینی تھی، اور بے قراری تھی، یہ اچانک منظر دیکھ کر محمودہ بیگم گھبرا گئیں، اور شرما کر بولیں۔
"ارے!" یہ کہکر پھر اُنہوں نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں، اور ارادت علی صاحب اُن کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئے، اور معاً محمودہ بیگم پاندان کھینچکر دوسرے پلنگ پر جا بیٹھیں، اس منظر عام میں ارادت علی صاحب اپنی بیوی کی اس نقل و حرکت کو عملی طور سے نہ روک سکے، ارادت علی۔ کیوں صاحب! اس قدر نفرت، ہم سے اسقدر نفرت؟
محمودہ بیگم۔ (بات کاٹکر) تم نے کچھ صغرا بیگم کی بھی کچھ سُنی؟
ارادت علی۔ کون صغرا بیگم؟
محمودہ بیگم۔ وہی تمہاری بھتیجی بہن۔
ارادت علی۔ (جوش میں آکر) نہیں صغرا بیگم کی تو کچھ نہیں سُنی، مگر محمودہ بیگم کی یہ حرکت دیکھی۔
محمودہ بیگم۔ (کچھ شرماکر) کون سی حرکت؟
ارادت علی۔ بتا دوں؟
محمودہ بیگم۔ تم نے پھر اول فول بکنا شروع کیا۔
ارادت علی۔ کیوں صاحب! کیا بڈھوں کے دل نہیں ہوتا۔ ہمیں اگر تم پر پیار آتا ہے تو اس میں کسی کا کیا ہرج؟
گفتگو کی یہ کشمکش چند فقروں کے بعد ختم ہوئی، اور ارادت علی صاحب کو شادی کا یہ نیا پیام سُنایا گیا۔ گو یہ بات نہایت تعجب خیز تھی کہ ان کو اپنی اولاد سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا، گو بیوی سے بہت محبت کرتے تھے، پھر بھی اُن سے مشورہ لینا ضروری تھا، اور اسی وجہ سے محمودہ بیگم نے یہ بات اُن کے سامنے چھیڑی تھی۔ اُن کو بھی یہ بات پسند نہ ہوئی، اور کیونکر پسند آتی۔ اول تو کامنی بیگم کی علمی استعداد سید صاحب سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے بھی قرون وسطیٰ میں اُردو مڈل کا امتحان پاس کیا تھا، اور اُس کے بعد سے آج تک سوائے روزنامچہ اور "غریب پرور سلامت" "جناب عالی" لکھنے کے اور کچھ نہ کیا تھا۔ وہ غریب اُردو و فارسی سے بخوبی واقف تھی اور علم ادب کی چاشنی سے لذت یاب ہو چکی تھی، انگریزی بھی تھوڑی بہت جانتی تھی، اسقدر کہ خط، تار پڑھ لیتی اور جواب لکھ دیتی۔ دوسرے عمر کا تفاوت اسقدر زیادہ تھا کہ خود سید صاحب کی لڑکی اُس سے عمر میں بڑی تھی دھراُٹھتی جوانی، دورِ شباب کی زرین صبح، شوخی و شرارت کا آغاز، فتنہ سامانی اور وارفتگی کی ابتدا،

[illegible] آفتاب [illegible] اور تنگ نظری، ادھر روشن دماغ، اور میوں اچھلنے اور کودنے والا [illegible] اور ان دونوں [illegible] حافظ و [illegible] کی مینا کاری ادھر دل مگر برف کی ایک قاش کی طرح سرد، [illegible] اور روزنامچہ کا سیاہ روغن ایک [illegible] کس طرح مسرت و شادمانی کا پیش خیمہ [illegible]

۴

[illegible] عقیدت کیشان محبت کا ہجوم تھا۔ [illegible] صاحب رضا جمع تھے۔ قوالوں کی ایک [illegible]

[illegible] وحشی! کجائی؟
[illegible] بسیار آشنائی"

قوالوں کی [illegible] بجلی گرا رہی تھی اور اکثر افراد بے چین و مضطرب ہو کر وجد میں آنے لگتے تھے۔ [illegible] موجود تھے، حزن و ملال نے اُن کو اچھا خاصا دیوانہ بنا دیا تھا۔ ان کی وہ [illegible] ہو چکی تھی۔ نہ وہ سطوت تھی اور نہ وہ عظمت و حشمت، سر کے بال پریشان، ڈاڑھی [illegible] اترا ہوا، آنکھیں بے رونق، اور وحشت سے لبریز، دل [illegible] کے ہاتھوں [illegible] تک کتاں کتاں آئے تھے۔ شاہ کلیر کے روضۂ اقدس سے ان کو ایک خاص لگاؤ تھا۔ آج سے نہیں مدتوں سے۔ کہا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ ملا، اور جو کچھ سرسبزی حاصل ہوئی وہ اسی چوکھٹ کا طفیل ہے، چنانچہ کاروبار عشق میں جی زچ ہو کر حسب معمول امروہے پاپیادہ کلیر شریف میں وارد ہوئے تھے۔ اور راستہ کی [illegible] سے شدید تکالیف اس یقین کامل کے ساتھ برداشت کی تھیں کہ اس عالیشان دربار سے کبھی خالی ہاتھ نہ جاؤں گا۔

اُس وقت مجمع پر ایک خاص اثر طاری تھا۔ قوالوں کی فسوں سازی اور جادو اثری اُن پر بھی اثر کئے بغیر نہ

رہی سید صاحب ایک خاص حالت کیف میں جھومنے لگے، اور اس شعر کو سنتے ہی بیتاب ہو گئے، دل و دماغ پر ایک قسم کا نشہ طاری ہونے لگا، اور حالت مدہوش میں ایک چیخ مار کر کھڑے ہو گئے قوالوں نے شعر کی تکرار سے درگاہِ اقدس کے کل فضا پر جادو ڈال دیا۔ کل مجمع بھی سید صاحب کے ساتھ ساتھ کھڑا ہو گیا، اور وہ ایک تیر کی طرح صفوں کو چیرتے ہوئے مزار مبارک پر جا پہونچے، اور پروانہ وار لوٹنے لگے۔ اُن کے دوست منشی مہربان علی، اور بابو احمد مرزا کہ اُن سے خاص اُنس رکھتے تھے اُن سے ملنے کلیر شریف آئے ہوئے تھے۔ اور اس وقت اس مجمع میں اُن کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ وارفتگی اور شوریدہ سری دیکھکر سراسیمہ ہو گئے تقریباً آدھ گھنٹہ بعد سید صاحب کو ہوش آیا، اور اُن کی حالت سنبھلی۔ جائے قیام پر واپس آئے، مگر نہایت مضمحل اور ناتواں گو انتشار قلبی ایک حد تک خاموش ہو چکا تھا۔

سید صاحب کو ساکت اور خاموش دیکھکر منشی مہربان علی بولے۔

میر صاحب! آج تو آپنے خوب تماشا دکھایا!"

سید صاحب۔ آپ اسے تماشا سمجھتے ہیں؟ میری جان پر بنی ہوئی ہے،

مہربان علی۔ واللہ میں ڈر گیا تھا۔

سید صاحب۔ کیوں؟

مہربان علی۔ خوف تھا کہ کہیں تم چل نہ دو۔ یہ کہکر مہربان علی نے ایک قہقہہ لگایا۔

سید صاحب۔ آپ بھی عجیب ذات شریف ہیں۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ آپ ہنس رہتے ہیں۔

مہربان علی۔ اور کیا میں بھی تمہاری طرح روؤں؟

سید صاحب۔ میاں! ہماری قسمت میں تو اب رونا ہی رونا ہے۔

مہربان علی۔ اچھا۔ اب میں تم کو ایک ایسی ترکیب بتاتا ہوں، جس سے تمہارا کام فوراً چل جائے گا۔

سید صاحب۔ (ذرا مسکرا کر) وہ کیا؟

مہربان علی۔ مانو گے؟

سید صاحب۔ (دل مضبوط کر کے) ضرور،

سید صاحب کچھ خائف بھی تھے، اور کچھ مسکرا بھی رہے تھے۔

مہربان - اچھا - اب لو سنو، تیر بہدف نسخہ ہے۔

سید صاحب - یا اللہ! کچھ کہوگے بھی!

مہربان - تو کہتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری وہاں شادی کیوں نہیں ہوتی؟

سید صاحب - ہاں معلوم ہے۔ چچا صاحب کو میری عمر پر اعتراض ہے۔

مہربان علی - بس ٹھیک سمجھ گئے۔ صرف تمہاری عمر پر اعتراض ہے، مگر عمر تو ذرا سی دیر میں کم ہو سکتی ہے۔

سید صاحب - (حیرت زدہ ہوکر) وہ کیسے؟

مہربان علی - بس اس ریش مبارک کو صاف کرا دو۔ چال ڈھال میں ذرا پھرتی پیدا کرلو۔ اچھے خاصے دیدار و جوان ہوجاؤگے۔

سید صاحب - تم، مذاق کر رہے ہو؟

مہربان علی - بالکل مذاق نہیں۔ نہایت قیمتی اور سنجیدہ مشورہ ہے دنیا میں ہزاروں آدمی محض عمر کم کرنے کے لیے ڈاڑھی منڈواتے، اور مونچھیں کترواتے ہیں، ایک دو نہیں، ہزاروں، میں نے سینکڑوں کو دیکھا ہے، ڈاڑھی صاف، مونچھیں برائے نام، چہرہ چکنا چپڑا، چال میں خواہ مخواہ کی طفلانہ شوخی اور طراری، سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں داخل ہوتے ہیں۔

سید صاحب - تو کیا پھر شادی ہو جائیگی۔

مہربان علی - کل ہی لو، کل ہی۔

سید صاحب کچھ تو دیوانے تھے، اور کچھ دنیا سے بیزار، یہانتک کہ فرط الم سے متاثر ہوکر بعض اوقات اُن کو زیست کی بھی توقع نہ رہتی تھی، ہر طرف موت ہی موت نظر آنے لگتی تھی، اور سیاہ بختی سے مجبور ہو کر دیوانہ وار چیخنے لگتے تھے، اس گفتگو کے بعد ہی جائے قیام سے کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے، اور ایسے غائب ہوئے کہ کسی سے کچھ کہا نہ سُنا۔ مہربان علی، اور بابو صاحب کو تشویش پیدا ہوئی۔ دونوں بیچارے شب کی تاریکی میں تلاش کرنے لگے، ہر طرف چھان مارا، مگر کہیں کچھ پتہ نشان نہ ملا، بہت پریشان اور بدحواس ہو گئے

لوگوں کو اس حادثہ کی اطلاع دی، اس تلاش و جستجو میں رات کے دس بج گئے، تاریکی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اُن کی پریشانی بھی بڑھتی جاتی تھی، دونوں ایک کوٹھری میں بیٹھے اسی مسئلہ پر بات چیت کر رہے تھے کہ یکایک کوٹھری کا دروازہ کھلا، اور سید الطاف علی صاحب آموجود ہوئے، مگر اُن کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر منشی مہربان علی اور بابو صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے ڈاڑھی صاف تھی، مونچھیں بہت باریک کتری ہوئی اور وہ صرف آدمی آدمی، چہرہ اوٹین اور ویٹولیا کی پالش سے گلنار بنا ہوا تھا، بڑی بے رونق آنکھوں میں سرمہ کی ایک خفیف سی تحریر تھی، اور موٹے موٹے ہونٹوں پر پانوں کی ایک سیاہ سیاہ دھڑی۔ چال میں ایک غضب کا بانک پن، بات چیت ایک قیامت خیز شوخی اور مسخراپن، کون ایسا تھا جو سید صاحب اس حال میں دیکھتا اور ہنستے ہنستے دیوانہ نہ ہو جاتا ؟ دلِ داغدار کی یہ ستم ظریفی، اور رایک معطل و ماؤف دماغ کے یہ جدت طرازی کس قدر دردناک طریقہ سے مضحکہ خیز تھی!!

(۵)

ماہوش کامنی۔ اپنے حسین بالاخانہ پر میز کے قریب بیٹھی ہوئی کسی گہرے خیال میں محو تھی۔ میز پر چند کتابیں منتشر پڑی ہوئی تھیں، بعض اُن میں سے بند تھیں، اور بعض کُھلی ہوئی۔ وہ کسی خیال میں غرق تھی، کسی گہرے خیال میں، مگر اُس کی پاک و صاف نگاہیں۔ ایک کھلے ہوئے صفحہ پر پڑ رہی تھیں، دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ وہ پڑھ رہی ہے، گو اُس کا سمندِ خیال کسی اور وادی میں سرگرم سفر تھا۔ اسی اثناء اُسے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی، اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کی سہیلی ثریا اُس کے قریب آچکی تھی۔

ثریا۔ بہن!۔ اتنا پڑھتے پڑھتے تمہارا جی نہیں اُکتا تا۔ کیا سب کتابوں کو چاٹ جاؤ گی ؟

کامنی ۔ جی نہیں۔ میں اتنا کہاں پڑھتی ہوں۔ اوّل تو اماں جان کے پاس سے فرصت نہیں ملتی پھر....

ثریا۔ ہاں! ... پھر عشق کا جادو ڈالنے سے فرصت نہیں ملتی ۔

کامنی (ترش رو ہو کر) کیسا عشق کا جادو ؟

ثریا ۔ جیسے تم کو خبر ہی نہیں ہے ۔

کامنی۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ کیا ہوا ؟

ریا - بالکل انجان ہو بنتیں کسی کی کا ہے کو خبر ہو گی -
کامنی - یا اللہ! تمہاری بات بھی عجیب ہوتی ہے جس کا نہ سر نہ پیر -
ریا - کچھ اور بھی سُنا ؟
کامنی - نہیں -
ثریا - سنو گی ؟
کامنی - اچھا - کہو کیا کہنا چاہتی ہو - تمہارے اس دیباچہ نے پریشان کر دیا
ثریا - سنا ہے کہ اس دیوانہ نے کسی کے کہنے سے ڈاڑھی مونچھیں سب صاف کرا دیں کمبخت قلندر بنا ہے ، قلندر -
کامنی - (ایک شرمگین تبسم کے ساتھ نگاہیں نیچی کر لیتی ہے) -
ثریا - اسے تو اچھا خاصا خفقان ہو گیا ہے - یہاں سے کلیہ شریف پیدل گیا ، وہاں یہ سوانگ بھرا ، نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے - ہر شخص اسے اُلو بناتا ہے - ہر شخص اسے چھیڑتا ہے - عجب دیوانگی ہے !
کامنی - (پھر مسکرا دیتی ہے)
ثریا - بہن! اب تو اس پر رحم کرو ، میری جان! یا ہنے والا بڑی مشکل سے ملتا ہے -
کامنی - آپ نے بھی کیا بلند مصرع پڑھا ہے ، قربان جاؤں ، ایسی شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تو شعر گفتن چہ ضرور
ثریا - تمہارا کیا ہے - تم نے لکھنؤ کے تمام اُستادوں کو یک قلم منسخ کر دیا - تمہارے ہاں تو سوائے میر کے سوز خوانی اور غالب کے تعلّی کے اور کچھ منظور و مقبول نہیں -
کامنی - ثریا بہن! تم سے میں ہار کہہ چکی ہوں ، شاعری کا مرتبہ نہایت بلند ہے - دنیا میں بہت کم شعرا پیدا ہوئے ہیں - ویسے نظم کرنے والے تو ہر شہر ، ہر قصبہ میں سینکڑوں مل جائیں گے -
ثریا - اچھا - اس وقت مجھے ذرا فرصت ہے - تم آج کچھ مجھے سنا دو
کامنی - کیا سُنو گی ؟
ثریا - سخندانِ فارس کا تیسرا لکچر -
کامنی - بہن! اس وقت کچھ جی نہیں ہوتا -

ثریا۔ نہ سناؤگی تو میں ابھی دیوار سے اپنا سر مار لونگی، یہ کہکر اُس نے ایک جست ماری، اور قریب تھا کہ دیوار سے اپنا سر ٹکرا دے کہ کامنی نے اُس کا شانہ پکڑ لیا، اور کھلکھلا کر ہنس پڑی حُسن اور جوانی کا یہ ناز آفرینی اور محبت کی یہ نازمندی ایک دنیا کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

(۶)

اس واقعہ کو ایک سال گذر گیا۔ پورا ایک سال۔ اس دوران میں صفحہ دہر پر ہزاروں تغیرات پیدا ہوئے اور فنا ہوتے گئے۔ انواع واقسام کی تبدیلیاں رونما ہوئیں، اور اپنا جلوہ چند روزہ دکھا دکھا کر غائب ہوگئیں۔ اول تو کچھ اس انداز سے بہار آئی، کہ ہوئے تھے دو مہ تماشائی" بیلو کے جھُرمٹ، اور گلہائے تر کے انبار دلوں کو سرور، اور زخمیوں کو انگور پہونچانے لگے، بلبلوں کے چہچہوں، اور قمریوں کی قہقہوں نے عشاق کو درس پائمالی دیا۔ مے خانہ کھُلے، شرب ناب کے دور چلے، ساقی، پری پیکر ساقی نے شراب کے گھونٹ اور آنکھوں کے اشاروں سے لوگوں کو متوالا بنانا شروع کیا۔ اور فضائے عالم کو مسرّت وشادمانی سے مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد موسم گرما شروع ہوا، نیلا آسمان آتشکدہ بن گیا، اور دنیا والوں پر آگ برسانے لگا۔ تیز، تند اور گرم ہوائیں چلنا شروع ہوئیں ہرے بھرے پودے مُرجھا گئے، اور بڑے بڑے تناور درخت خشک ہوکر فریاد وزاری کرنے لگے۔ پھر موسم برشگال کا دور دورہ ہوا، ایک عجیب قسم کے رسیلی رعنائیوں اور دلفریبیوں کی ابتدا ہوئی، دنیا کی ہر جان دار اور بے جان ہستی رحمتِ آسمانی سے سیراب ہونے لگی۔ سوکھے سوکھے درختوں اور پودوں میں حیات اور مسرّت کی لہریں بلند ہوئیں۔ پھُول اُگے۔ بیلیں پروان چڑھیں۔ "کوئل" آئی، اور" پی کہاں "کی دلدوز صداؤں سے کل عالم سرشار محبت کرنے لگی۔ یہاں تک کہ" بادہ پیمائی " اور" بادہ نوشی" میں ایک ہی قسم کا لطف آنے لگا۔ بعد ازاں موسم سرما کی آمد آمد ہوئی۔ سرد ہوائیں چلیں، آسمان پر کہر چھانے لگا۔ برف باری ہوئی، اور یہ ارض خاکی کرۂ زمہریر سے گوئے سبقت لیجانے لگا۔ اسی عرصہ میں بیچاری کامنی کے لایق رشک قسمت نظرِ بد کے گزند سے محفوظ نہ رہ سکی، اور اُس کے نازک سے دل کو ایک ایسا صدمہ جانکاہ پہونچا کہ وہ شدت سے بدحواس وسراسیمہ نظر آنے لگی۔ یعنی اُس کی والدہ محترمہ تین ماہ علیل رہکر راہئی ملک بقا ہوئیں، اور اُس گھر کو جو اُن کے حسن انتظام کی وجہ سے شیش محل بنا ہو

تھا ایک ماتم کدہ سے مبدل کر گئیں، کامنی - بکیں کامنی، جس کی شیریں نوائی، اور رنگین بیانی اُسی گھر کو عشرتکدہ بنا چکی تھی اب سراپا آہ تھی، سراپا درد اور سراپا اضطراب، اُس کی مظلوم نگاہیں، اور اُس کا مجروح دل ناممکن تھا کہ کسی پر اثر کیے بغیر نہ رہتا - اول تو مادرِ مشفقہ کی موت بجائے خود ایک ایسا دل کو پاش پاش کر دینے والا حادثہ ہے جس پر جسقدر بھی قائم کیا جائے کم ہے - پھر ایک ایسی ماں، جس کی محبت اور دلداری ضرب المثل تھی، اور جس کا انتظام اور سلیقہ بے مثل اور عدیم النظیر تھا، وہ کامنی کے نام کی سچی شیدائی تھی، اور جس محبت سے اُس نے اپنی اس اکلوتی بچی کو پالا تھا وہ کچھ وہی خوب جانتی تھی، یا پھر اُس کے بعد کامنی -

کامنی کے والد سید ارادت علی صاحب کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، مگر بچوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا - بچے بیمار ہیں تو اُن کی بلا سے - محمودہ بیگم جب تک زندہ رہیں انھوں نے کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ ارادت علی صاحب بچوں سے اسقدر بے پرواہ ہیں - گھر کا کل انتظام اُن ہی کے سپرد تھا، بچوں کی تعلیم، اُن کی دیکھ بھال اُن کی تربیت اور تہذیب اُن ہی کے ذمہ تھی - اور اس فرض کو اُنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا -

کامنی ہوشمند تھی، عاقل و فہیم تھی، اور آنے والی مصیبتوں کا ہولناک تخیل اُس کے ہوش و حواس سلب کرنے کے لیے کافی تھا - کامنی اُن کے مزاج سے، اُن کی خو، بو سے خوب واقف تھی، اس پر طرہ یہ کہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کی خبرگیری اُس کے فرائض میں شامل تھی، حالانکہ اپنی ماں کی حیات میں اُس نے سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کچھ نہ کیا تھا - اول تو بچوں کی تربیت بذاتِ خود کسقدر اہم ذمہ داری ہے، پھر گھر کا انتظام و انصرام، والد صاحب کے آرام و آسائش کا بندوبست، اپنی محبوب کتابوں سے کنارہ کشی، باپ کا استغنا، ماں کی دائمی جدائی، یہ تھا مصیبتوں کا وہ پہاڑ جس نے بیک وقت کامنی کا گلابی اور شیریں تخیل پر موت کی سی تاریکی طاری کر دی - صرف ارادت علی صاحب ہی اگر ذرا اور صاحبِ عقل ہوتے، اور اپنی اولاد کے ساتھ ذرا سا بھی لگاؤ رکھتے ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ کامنی کی تکالیف اور مصیبتیں نصف سے زائد کم ہو جاتیں -

(۷)

اب سید الطاف علی صاحب کی حالت نازک تر ہو چکی تھی، محبت کے اس آزار نے اُن کو یقیناً مبہوت

کردیاتھا خود پختہ کار سن رسیدہ سب انسپکٹر تھے، دنیا، اور دنیا والوں کے حالات سے کماحقہ واقف تھے سنجیدہ مہمات میں اپنی حالت زار پر خود نفریں کیا کرتے، اور اپنی قسمت پر کفِ افسوس ملتے تھے عشق نے جہاں غالب کو نکما کردیا تھا وہاں ان کو بھی کسی کام کا نہ رکھا تھا، یہاں تک کہ اگر اُن کی یہ شوریدہ سری اسی رفتار سے ترقی پذیر رہتی تو ان کو ملازمت سے بھی کنارہ کشی کرنا پڑتی، پھر بھی جوششِ جنوں میں مبتلا ہو جاتے تھے، اور کسی طریقہ سے چین نصیب نہ ہوتا تھا، اس وقت وہ شاہ آباد کے افسر انچارج تھے، گھر سے قریب، آب و ہوا لطیف دور دور اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کل علاقہ پر خوب اچھی طرح حاوی تھے، پھر بھی نہایت ملول و دلگیر رہتے تھے۔
ایک روز اُن کی خوشدامن صغرا بیگم سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگیں۔

صغرا بیگم۔ آخر اس پریشانی کا کوئی علاج بھی ہے؟

سید صاحب۔ (ایک آہِ سرد کھینچکر) اماں! اب اس کا علاج صرف موت ہے۔

صغرا بیگم۔ خدا کے خوف سے ڈرو۔ موت کا نام نہ لو۔

سید صاحب۔ (آبدیدہ ہو کر) مجھے تو اب موت کی موت نظر آتی ہے۔

صغرا بیگم۔ موت تمہارے دشمنوں کو آئے۔ ایک کامنی پر کیا موقوف ہے؟ میں اُس سے ہزار درجہ بہتر تمہارے لئے لادونگی۔ تم ذرا اپنے دل کو ٹھکانے لگاؤ۔

سید صاحب۔ (روکر۔ بھرائی ہوئی آواز سے) نہیں! اماں! ایسا نہ ہوگا۔

آنسوؤں کی لڑی سید صاحب کے رخساروں پر گذرتی ہوئی ریشِ اقدس تک آپہونچی، جواب پھر رونما ہو چلی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر صغرا بیگم بھی نہایت سراسیمہ ہوئیں اور مرض کو لاعلاج سمجھکر افسردہ خاطر ہونے لگیں۔
اسی اثناء میں ڈاک آئی۔ سید صاحب نے خطوط پڑھے، اس میں ایک خط منشی مہربان علی کا تھا۔

"مکرم بندہ۔ تسلیم۔ یہاں سب خیریت ہے۔ آپ کی خیر و عافیت درگاہ رب العزت سے نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ سید ارادت علی صاحب کی اہلیہ نے ایک ہفتہ ہوا تین ماہ علیل رہکر انتقال کیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، اللہ پاک پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمادے سید صاحب اس حادثہ کی وجہ سے بہت ملول اور غمگین ہیں بچے بھی نہایت پریشان ہیں۔

اللہ اُن پر رحم فرماوے ۔ والسلام ۔ فقط دعاگو مہربان علی

از امروہہ "

اس خط کو سنتے ہی صغرا بیگم اُچھل پڑیں ۔ چہرہ پر یکایک سُرخی دوڑ گئی، اور بے چین ہو کر بولیں ۔

" لو ۔ مبارک ہو ۔ اب اُمید ہے تمہارا کام ہو جائیگا ۔"

سید صاحب ۔ خیال تو میرا بھی یہی ہے (خوش ہو کر) تو اب کیا کرنا چاہیے ۔

صغرا بیگم ۔ بس اب اپنی پریشانی دور کرو ۔

سید صاحب ۔ جی ۔ بہت اچھا ۔

صغرا بیگم ۔ مجھے جلد امروہہ پہونچا دو ۔ اب دیر نہیں کرنا چاہیے ۔

سید صاحب ۔ بہت خوب ۔

یہ عجیب ماجرا ہے کہ ایک ہی واقعہ سے ایک طرف توصفِ ماتم بچھے، اور دوسری طرف شادیانے بجائے جائیں ۔

ایک ہی ہفتہ میں صغرا بیگم امروہہ پہونچ گئیں ۔ اور ایک حد تک اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوئیں ۔ ارادت علی صاحب پر اُن کا گہرا اثر تھا ۔ دونوں چچازاد بھائی بہن تھے اس لیئے ارادت علی صاحب صغرا بیگم کا بیحد خیال کرتے تھے، اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُن کے کہنے کو نہ ٹالتے تھے اس موقع پر صغرا بیگم نے اپنے پورے اثر سے کام لیا ۔ او ارادت علی صاحب سے انکار نہ ہو سکا ۔ یہی وہ دل ہلا دینے والا خطرہ تھا جس کے خوفناک تخیل نے بارہا کامنی کے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے، اور جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں کی دائمی مفارقت خود اپنی موت کے نام سے یاد کرتی تھی، ایک حد تک سید ارادت علی صاحب بھی مجبور تھے، خاندان میں کوئی اور ایسا تعلیم یافتہ نوجوان نہ تھا جو اس کشمکش میں کچھ سہولت پیدا کر سکتا ۔ خاندان کے نوجوانوں میں اکثر افراد اَن پڑھ، بے ڈھنگ، اور بے راہ تھے تقریباً سب بیکار، مجہول ۔ غافل اور کج فہم ۔ تعلیم سے کوسوں دور، بیفکر، شوریدہ سر، ایسی حالت میں ایسے خاندان کی لڑکیوں کی قسمت بہت قابلِ افسوس ہوتی ہے جن کی شادیاں ایک محدود دائرے سے باہر نہیں ہو سکتیں، حالانکہ یہ حدبندی خود ساختہ ہے جسے مذہب اور شرع سے کوئی علاقہ

نہیں۔ سید الطاف علی صاحب چاہتے تھے۔ کہ جسقدر جلد ہو اس کارِ خیر سے فراغت حاصل ہو جائے، اور اُن کے سر سے بوجھ اُترے تاکہ بے غل و غش زندگی کے باقی ایام گذار سکیں، دوسرے کوئی اور آرزومند ایسا نہ تھا جو اُن کی نظرِ انتخاب کو گرویدہ کر لیتا، اس لیئے اُن کو صغرا بیگم کا کہنا ماننا ہی پڑا، اور ایک ہفتہ بعد عربی کے چند الفاظ نے سید صاحب کو شوہر اور کامنی بیگم کو اُن کی محبوب دُلہن بنا دیا۔ ستم ہے کہ اُس ذی ہوش اور صاحبِ عقل و دانش ہستی کے جذبات کو ہمیشہ پامال کیا جاتا ہے جو حیات کی تمامتر دلکشی اور رنگینی کی ضامن ہوتی ہے۔

(۸)

"از شاہ آباد

مورخہ ۲۷ راکتوبر ۲۶ء

پیاری ثریا!" تمہارے لانبے، لانبے بالوں اور تمہاری ہیرا تراش چوڑیوں کو بار بار پیار کرنے کی آرزو! مجھے تم سے یہ اُمید نہ تھی کہ تم بھی مجھے حرف غلط کی طرح اپنے دل سے محو کر دو گی، آج مجھے شاہ آباد آئے کچھ اگلے دو ماہ ہوئے، مگر پیاری ثریا! تمہیں اپنی ہلاک کرنے والی ابروؤں کا واسطہ! سچ سچ بتانا تم نے مجھے کے خط لکھے۔ اور میرے خطوط کس کثرت کے ساتھ تمہارے پاس پہونچے، شروع شروع میں تمہارا صرف ایک خط آیا تھا، جو ابتک میرے پاس حرزِ جان کی طرح محفوظ ہے، اور جس کا جواب ہیں عرصہ ہوا دے چکی۔ بہن! اچھا کیا، تم نے مجھے مردہ سمجھ لیا، میں تمہاری ذہانت اور غیب دانی کے داد دیتی ہوں، میں صرف اسی حد تک زندہ ہوں کہ سانس کا ڈورا قائم ہے، ورنہ میری پیاری اماں! (اللہ اُن کو جنت الفردوس کی اچھی سے اچھی نعمتیں دے) اپنے ساتھ ساتھ میری روح، اور میری جان کو بھی عدم آباد لے گئیں، میں زندہ ضرور ہوں، مگر زندگی سے دور، ہاں! کوسوں، میلوں دور، زندگی کی روشنیوں سے دور، زندگی ہنگامہ آرائیوں سے دور، زندگی کے رنگ و بو سے دور، اور زندگی کی تمام لطافتوں اور مسرتوں سے دور،

بہن! میری اچھی بہن!! کیا پوچھتی ہو، کیسی گذرتی ہے؟ جب حسِ حیات ہی باقی نہ ہو تو گذرنے کا کیا سوال، میری زندگی، میری ناتواں زندگی کے ہر شعبہ پر یاس و نا اُمید ہوگا۔ ایک ایسا گہرا سیاہ بادل چھایا ہوا ہے جسے میرے علم میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اب دور نہیں کر سکتی، صبح ہوتی ہے، شام ہوتی ہے، رات ہوتی ہے

"

پھر صبح ہوجاتی ہے، مگر وقت کا اُلٹ پھیر، اور موسموں کا تغیر و تبدل اب میرے لیے سراسر بے معنی ہے، صبح کی مسرت زا راحتیں اب ایک خواب فصیل کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ جن کو عرصہ ہوا تمہاری پیاری اور دلکش صحبت میں اُٹھایا تھا۔ اور جن کی یاد بھی اب میرے دل داغدار سے محو ہو رہی ہے۔ برابر محو رہی ہے، شعرا کہتے ہیں کہ "شام" اور وہ بھی برسات کی شام، "شام عنبرین" ہے جسے بقول اُن کے رنگینوں کا سرچشمہ اور دلآویزیوں کا مخزن کہنا چاہئیے اگر شاعر ایسا کہتا ہے، کہنے دے، اُسے اپنا جی خوش کر لینے دے۔ رات کے متعلق۔۔۔۔ اور خصوصاً اُس رات کے متعلق جس میں جلوۂ ماہ بھی ہو ہر رنگ ہر توم، اور ہر طبقہ کے شعرا نے اپنی اپنی بساط کے موافق رنگین بیانی کی ہے۔ مگر میں تم کو صدق دل سے یقین دلانے کی کوشش کرتی ہوں (خدا کرے تم سچ سمجھو) کہ اب شب ماہتاب میرے لیئے ہر چاندنی رات۔ ایسی ہے جیسی مفلس کی جوانی، اور موسم سرما کی چاندنی!

اسقدر لکھنے کے بعد تم یہ شاید خیال کرو کہ میں یا تو دیوانی ہو چکی ہوں یا کسی خاص اور وقتی جذبہ کے ماتحت یاوہ گوئی کر رہی ہوں، مگر میں تمہاری پیاری پیاری کاکل مشکیں، اور تمہاری لانبی لانبی گداز اُنگلیوں کو پیش نظر رکھکر قسم کھاتی ہوں کہ اب فطرت کی کوئی نیرنگی ایسی نہیں ہے جو میرے مردہ دل پر ذرا سا بھی اثر پیدا کر سکے، اچھی ثریا کیا تم اس زندگی کو موت نہ کہو گی؟

"معاف کرنا۔ اگر تم میرے اس خط کو یاس و نا اُمیدی کے جذبات سے لبریز پاؤ، ایک ماہ سے زائد ہوا، رات و دن میں کوئی ایسا وقت نہیں ہوتا کہ مجھے بخار نہ رہتا ہو، ایسا تیز بخار نہیں کہ میں بیمار کہلائی جا سکوں اور بستر علالت سے وابستہ ہو جاؤں، مگر یہ زہریلا بخار ایسا ضرور ہے جو رفتہ رفتہ میرا کام تمام کر رہا ہے، جو آہستہ آہستہ میری رگ و پے میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے، اور جو خاموشی کے ساتھ میرے دل حزیں کو گھُل رہا ہے۔ دن رات میں دس بارہ دفعہ تھرمامیٹر لگاتی ہوں، مگر کبھی ۹۹ درجہ سے کم بخار نہیں ہوتا۔ کیا تم اسے بھی موت کا پیش خیمہ نہ کہو گی؟

اچھی ثریا! تمہیں یقین نہ آئے گا، مگر یہ واقعہ ہے کہ میں چپ چاپ ایک ایسے مصیبت اور ہولناک غار میں جانے کی طیاری کر رہی ہوں جس کے نام سے دنیا کی پوری آبادی لرزہ براندام ہو جاتی ہے، اور جس کا خوفناک تخیل میرے نظام عصبی میں بھی ارتعاشی کیفیت پیدا کر دیتا ہے!!

دنیا سے اب مجھے کوئی سروکار نہیں، کوئی واسطہ نہیں، کوئی تعلق نہیں۔ اس ارض خاکی نے جو جور و ستم میرے اوپر نازل کئے ہیں وہ میری بہن! تم خوب جانتی ہو، مجھے کہنے کی ضرورت ہے؟ مجھے دنیا اور دنیا والوں سے صرف ایک آرزو ہے، وہ یہ کہ مجھے آسانی اور خاموشی کے ساتھ اس تاریک غار میں چلا جانے دیں۔ مگر ثریا! تیرے فراق میں۔ ع

مر کے بھی چین نہ آیا تو کدھر جائیں گے؟

بہرحال اگر تم کو مجھ سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے، تم کو اگر ذرا سا بھی میرا پاس و لحاظ ہے تو خدا کے لیے اس خط کو دیکھتے ہی شاہ آباد آجاؤ، مجھ سے مل جاؤ، میری سن جاؤ، اپنی کہہ جاؤ، پھر خدا جانے کب تک قیامت آئے۔ تم خود دیکھ جاؤ کہ تمہاری چہیتی سہیلی کیسی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس دُنیا میں جانی والی ہے جہاں سے نہ کبھی اُس کی خیر و خبر آسکے گی، اور نہ تم پھر اُس کی کبھی آواز سُن سکو گی!

"تمہارے مدھ بھرے نینوں کو شدت سے پیار کرنے والی، تمہاری شوخ و شریر "سہیلی" اور تم پر جان فدا کرنے والی غم نصیب،

کامنی"

غزل زاہد

دے اثر اتنا تو اس آہِ دلِ ناشاد میں — کل نہ آئے ایخدا اُس کو بھی میری یاد میں

خون کا دعویٰ کروں کیا خون ہی مجھ میں نہ تھا — کچھ نہ لکھنا اے فرشتو نامۂ جلاد میں

جان دیدی ہے کسی بلبل نے شاید قید میں — آج خوشیاں ہو رہی ہیں خانۂ صیاد میں

آجتک میری محبت کا نہیں آیا یقیں — عمر ساری گو ہوئی برباد اُن کی یاد میں

خیر ہو گلشن کی زاہد یہ دعا کرتے رہو
جل گئی ہے باغباں میں آج اور صیاد میں

آہنگِ تپش

ذیل کی نظم ہم کو جناب اختر صاحب شیرانی ایڈیٹر ہندوستان کے ذریعہ سے موصول ہوئی ہے ہم ان کے سپاس گذار ہیں کہ اُنہوں نے میگزین نوازی کے لیے جناب تپش صاحب کے کلام کو منتخب فرمایا۔ جناب تپش صاحب تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کے کلام کا فیض تقریباً تمام مشہور رسائل کے لیے جاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آیندہ بھی ہم اس سے محروم نہ رہیں گے۔

اڈیٹر

از جناب شیخ عبداللطیف صاحب تپش۔ بی۔ اے۔ لاہور

کیا اعتبارِ حشر، فغاں تک خموش ہے
فردائے انتظار بھی مصروفِ دوش ہے

کیا کیا خیال ہے ہمیں امید مرگ پر
یعنی ہماری زیست تماشائے ہوش ہے

میں روسیاہ، سوختہ تابِ نور ہوں
ظلمت مری حقیقتِ موسیٰ کا جوش ہے

گل ہو رہا ہے، قصرِ تمنا کا ہر چراغ
پروانے نالہ کرتے ہیں، بلبل خموش ہے

خمیازۂ فسانہ بن اے اشک نامراد
ہستی مری، خمارِ محبت کا جوش ہے

چاکِ جگر کے وہم نے ڈھانکے ہیں دل کے عیب
پردہ دری کی فکر ہی خود پردہ پوش ہے

کی بندِ چشم شوق تو افسانہ بن گیا
خاموشیٔ نگاہ بھی اب بارِ گوش ہے

ہر زخمِ دل ہے، مشہدِ ارمان رنگ رنگ
بازیچۂ وفا، سبدِ گلفروش ہے

کیا بیکسی ہے قافلہ کائنات میں
امیدوارِ مرگ، طلبگارِ دوش ہے

مرنے کی آرزو نہ گئی بعد مرگ بھی
گھٹ کر بھی میری آہ میں جوشِ خروش ہے

کیا آنکھ اُٹھا کے دیکھوں سوئے قبلہ اے تپش؟
سر زیرِ بارِ منتِ بادہ فروش ہے!

رنگینیٔ تخیل

غمِ فردا و فکرِ دوش میں ہے — وہ بھی دیوانہ ہے جو ہوش میں ہے
دونوں عالم کی پاکدامانی — ساغرِ چشمِ مےفروش میں ہے
اضطرابِ جنوں معاذ اللہ — نہ یہ مستی میں ہے نہ ہوش میں ہے
واہ کیا شانِ مدعا کہئے — رازِ بنکر لبِ خموش میں ہے
اشک رکتے نہیں کسی صورت — ایک طوفان ہے کہ جوش میں ہے
منزلت کچھ مرے گناہوں کی — اُس نگاہِ عیوب پوش میں ہے

"ترکِ الفت" یہ کیا کہا بیخود
"دیکھ دیوانے اپنے ہوش میں ہے؟"

غزل

نتیجۂ فکر "تبسم نظامی"

ہوئی ہے "پھر جوان میری تمنا رائیگاں ہو کر — کہ دل پھر عمنولا ہے" محرمِ حسن نہاں ہو کر
محبت میں تری مرنا بھی مشکل اور جینا بھی — قضا مجکو ستاتی ہے حیاتِ جاوداں ہو کر
مری آنکھوں میں آجا" اشکِ خونِ آرزو بنکر — "تجھے اے دل" ملا کیا" میری پہلو میں نہاں ہو کر
فریبِ حسن "کیا ہے" انقلابِ دہر کیا شے ہے — "کرونگا غور فطرت پر خرابِ خاکداں ہو کر
بھڑک کر شعلۂ گل نے جلایا آشیانے کو — "کہ اب پھونکیگی "کس کو بجلیاں آتش فشاں ہو کر
ہوائیں اسقدر باندھی "غبارِ نامرادی نے — "زمیں کی خاک" "سر پر آرہی ہے آسماں ہو کر

طلسماتِ چمن کیا ہیں فریبِ گل فروشی ہے
کہیں رسوا نہ ہو جانا تبسم گلفشاں ہو کر

ہندوستان پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ

از جناب مولوی سید حسن صاحب برنی بی اے ایل ایل بی

لیونی کائتانی Leone Caetani اٹلی کا ایک امیر کبیر اور اسلامی تاریخ کا بے نظیر نقاد ہے۔ یوں تو اسلامی مباحث پر اُس کی کئی معرکۃ الآرا تصانیف ہیں لیکن سب سے بڑا علمی کارنامہ "تواریخ اسلام" Annali dell Islam ہے جس کی تدوین میں وہ ۱۹۰۵ء سے مصروف ہے اور ہجرت نبویؐ سے حضرت علیؓ کے عہد تک کی تاریخ دس ضخیم جلدوں میں لکھ چکا ہے۔

کائتانی کی یہ کتاب اُس کی دیگر تصانیف کی طرح اٹالین زبان میں ہے اور اس وجہ سے ہندوستان کے اہل علم کو اس سے مستفید ہونے کا بہت کم موقع ہے۔ اس خیال سے میں نے قصد کیا ہے کہ وقتاً فوقتاً کائتانی کی تصانیف سے بعض اہم اور دلچسپ مضامین ترجمہ کر کے اپنے اہل ملک کے سامنے پیش کروں۔ چنانچہ حال ہی میں میں نے رسالہ اردو کے لئے کائتانی کا ایک طویل مضمون ترجمہ کیا ہے جس میں اُس جعلی روایت کی تنقید کی گئی ہے جس میں کتب خانۂ اسکندریہ کی تباہی کو عربوں کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون رسالۂ مذکور کے اکتوبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اُس مضمون پر میں نے ایک مختصر تمہید بھی لکھی ہے جس میں کائتانی کی تصانیف پر تبصرہ کیا ہے اور اُس کا مرتبہ بحیثیت ایک مستشرق اور تاریخ اسلام کے محقق کے دکھایا ہے۔ بنابریں اس موقع پر ان خیالات کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

موجودہ مضمون ہمارے ملک کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اور کائتانی کی مذکورۂ بالا "تواریخ اسلام" کی جلد سوم صفحات ۸۱۹ - ۸۲۲ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

اس مضمون کی بنیاد اسلامی مورخ البلاذری کی کتاب "فتوح البلدان" کی وہ روایت ہے جس میں عربوں کے سب سے پہلے حملۂ ہند کا ذکر ہے جو کہ خلیفۂ دوم کے زمانہ میں سمندر کے راستہ سے ہوا تھا۔

احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ ۸۹۲ء) قدیم مورخین اسلام میں خاص امتیاز و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور فتوحات اسلامی کے متعلق اُس کی روایات معتمد و معتبر خیال کی جاتی ہیں۔ کتاب "فتوح البلدان" دو مرتبہ لائڈن (ہالینڈ) Lieden اور ایک مرتبہ مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

البلاذری نے علاوہ فتوح البلدان کے ایک اور ضخیم تاریخ "انساب الاشراف" کے نام سے بھی لکھی تھی جس میں نامآورانِ اسلام کے حالات انساب کے لحاظ سے مرتب کئے تھے۔ اس کتاب کا کچھ حصہ یورپ میں اور ایک کامل نسخہ قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔ ۱۸۸۳ء میں اہلوارت (Ahlwardt) نے "انساب الاشراف" کا ایک جزو جو کہ اُس کی بیس جلدوں میں سے گیارہویں جلد شمار کیا جاتا تھا شائع کیا تھا۔

W. Ahlwardt: Anonym Arabische Chronic, Leipzic

قسطنطنیہ کے مکمل نسخہ سے بیکر C H Becker و دیگر مستشرق مکمل کتاب شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔

البلاذری کی "فتوح البلدان" اس کی ایک بڑی تصنیف کا اختصار یا خلاصہ ہے جو اس نے خود ہی کیا تھا۔ وہ اصل کتاب اب دستیاب نہیں ہوتی۔ موجودہ کتاب فتوح البلدان کی خوبیاں تو ظاہر ہیں۔ لیکن اُس کے مختصر ہونے کی وجہ سے اس میں اتنا نقص ضرور ہے کہ اس میں بعض ضروری تفصیلات مفقود ہیں اور بعض اوقات متعدد روایات ایک جگہ مخلوط ہو کر رہ گئی ہیں۔ اختصار کا نقص اس روایت میں بھی موجود ہے جو کہ ہمارے مضمون سے تعلق رکھتی ہے۔

البلاذری کی اس روایت کا ماخذ ابوالحسن علی بن محمد المدائنی (متوفی ۲۲۵ھ ۸۳۹ء) ہے۔ الفہرست ابن الندیم (متوفی ۳۸۵ھ ۹۹۵ء) اور معجم الادبا یاقوت رومی (متوفی ۶۲۲ھ ۱۲۲۹ء جلد پنجم صفحہ ۳۰۹ و مابعد) کے

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ المدائنی چھوٹی بڑی ایک سو سے زیادہ تاریخی کتابوں کا مصنف تھا جن میں
سے ہمارے زمانہ میں کوئی کتاب دستیاب نہیں ہوئی۔ علاوہ البلاذری کے مورخ اعظم طبری (متوفی
سنہ ۳۱۰ھ ۹۲۲ء) نے اپنی تاریخ کبیر میں المدائنی سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے لیکن اس روایت کا تاریخ کبیر میں
کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن الاثیر (متوفی سنہ ۶۳۰ھ ۱۲۳۲ء) اور دیگر مورخین مابعد جن کا ماخذ طبری ہے
اس روایت سے بے خبر ہیں۔ المدائنی کی فہرست کتب کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب فتوح
میں اس کی تصنیف سے دو کتابیں "کتاب ثغر الہند" و "کتاب اعمال الہند" براہ راست ہندوستان
کی تاریخ سے تعلق رکھتی تھیں۔ المدائنی چونکہ عراق کا باشندہ تھا اس وجہ سے اس کی معلومات مشرقی
ممالک کے متعلق بہترین ہیں۔ بلحاظ المدائنی کے روایات کی عمدگی کے، کاشانی نے اس مورخ کو بلحاظ
پرمدنی اصول تنقید کا پیرو قرار دیا ہے جن کا معیار تحقیقات بلند ہے۔ وہ عراق کے ان مورخین کے
دائرہ سے باہر ہے جن کی اکثر روایات ضعیف، مبالغہ آمیز اور بہت کچھ ناقابل اعتماد ثابت ہوتی ہیں۔
جس روایت پر کاشانی نے یہ مضمون لکھا ہے جو ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اُس کے متعلق
خاص طور پر یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ آیا تاریخ اسلام کے اس قدر ابتدائی زمانے میں سمندر کے راستہ
سے اہل عرب ہندوستان پر حملہ آور بھی ہو سکتے تھے یا نہیں۔ سب سے پہلے اس امر کو طے کرنے
کے لئے یہ امر غور طلب ہے کہ آیا اس وقت عربوں کے پاس جہازوں کا بیڑہ موجود تھا جسے وہ
ایسی مہم میں کام لاسکیں۔ جیسا کہ کاشانی نے لکھا ہے یہ واقعہ ہے کہ جہازات کا جنگی بیڑہ کافی اہتمام
اور وقت اور تجربہ چاہتا ہے۔ اور ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ عرب دنیا کی
دو بڑی سلطنتوں ایران اور روم سے نبرد آزمائی میں مصروف تھے اُن کے لئے یہ ممکن تھا
یا نہیں کہ اتنی قلیل مدت میں وہ اپنی ایسی بحری قوت بھی قایم کر لیتے جو ایسی دور دراز اور پُرخطر
مہم کو سرانجام دے سکتے۔ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے تو یہ روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی
اور اگر اس کا جواب اثبات میں ہو سکتا ہے تو اس روایت کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی
کاشانی نے غور کرنے کے بعد اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اور وجوہ تائید میں

پیش کئے ہیں ہمارے خیال میں کافی مضبوط ہیں۔ سب سے پہلے کاٹانی نے یہ ثابت کیا ہے کہ خلیج فارس میں جو لوگ ملاحی اور جہاز رانی کا کام اسلام سے قبل کرتے تھے اُن میں سواحل عرب کے باشندے کافی تعداد میں موجود تھے اور وہ پہلے ہی سے ہندوستانی سواحل تک تجارتی کاروبار کی وجہ سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ اس بات کو مانتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آتی ہے کہ البحرین و عمان کے عاملوں کے لئے اس قسم کی مہم کا اہتمام چنداں مشکل نہ تھا جب کہ وہ اُن جہاز رانوں اور اُن کے جہازوں سے کام لے سکتے تھے۔

کاٹانی کا یہ خیال بھی صحیح ہے کہ فاروق اعظم بحری مہمات کے روادار یا حامی نہیں تھے۔ وہ اسلامی قوت کے انتشار بے جا استعمال کے ہمیشہ مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں بحری مہمات نے کوئی مسلسل اور مکمل ترقی نہیں کی۔

سید حسن برنی

یہ ناممکن ہے کہ ان منفرد روایات کی جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور جو اپنی نوعیت میں مدت تک یکہ و تنہا حیثیت رکھتی ہیں صحیح قیمت بتائی جا سکے۔ اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قدیم الایام سے عرب کے سواحل، بالخصوص خلیج فارس کے قریب کے سواحل اور ہندوستان کے مابین سمندر کے راستہ سے مسلسل طور پر تجارتی اشیاء کا تبادلہ جاری تھا۔ اُن ایام میں جن کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اُن سبک جہازوں کے ملاح جو کہ سواحل ایران و بلوچستان کے نواح میں عرصہ سے ہر قسم کے بحری خطرات کو برداشت کر کے سمندر کو چھانتے پھرتے تھے اغلباً عرب ہی تھے خلیج فارس کے سامی (عربی؟) ملاح اپنے فن میں اس قدر مشہور اور ہوشیار تھے کہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں فینیقیا کے ملاح بطور فخر کے اپنے آپ کو بحرین کے ملاحوں کی اولاد ظاہر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ کچھ عرصہ قبل سرزمین بحرین سے ترک وطن کر کے بحر الروم کے ساحل پر اس ملک میں آباد ہو جاتے تھے جو اُن کے نام سے مشہور رہے۔

خلیج فارس عربوں کی فتوحات کے وقت بھی ایشیائے قریب اور ہندوستان کے مابین تجارتی آمد و رفت کا خاص ذریعہ تھی اور جو جہاز کہ تجارتی مال ادھر سے اُدھر لاتے لے جاتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر سبک تھے

ساسانیوں کے زمانے میں دریائے فرات میں داخل ہوکر حیرہ تک پہونچ جاتے تھے (دیکھو نلدہ Annalen سنہ ۱۲ء ۱۲۰۰ نوٹ ۱ اور ۲ و الدہ Heyd) اُن اسباب میں جن کے باعث البصرہ نے آباد ہوتے ہی اس قدر ترقی کی یہ وجوہ بھی اضافہ طلب ہیں کہ اُس زمانہ میں بابل کے قریب کا فرات کا رستہ مٹی کے آجانے سے مسدود ہوگیا تھا اور ہندوستان سے آنے والے جہازوں کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنے تجارتی مال کو البصرہ ہی میں اُتار دیں جو کہ بابلی شاخ ہائے دریا کے دہانوں پر واقع تھا۔ آگے ملاقۂ بابل کے وسطی تجارتی مرکزوں تک جو کہ دریائے فرات کے کناروں پر آباد تھے۔ جہازوں کے لے جانے کا امکان نہیں تھا۔ اسی سبب سے البصرہ نے الابلہ یا اُپالوگوس Apologos کی جو کہ ساسانیوں کے زمانہ میں جہازوں کے پہونچنے کا پہلا مقام تھا جگہ لے لی اور تجارت کا اہم ترین مرکز بن گیا اور اس نے فی الواقع ہند اور چین کے مال کی مرکزی منڈی کی صورت اختیار کرلی حتیٰ کہ اسی وجہ سے "فرج الہند" کے نام سے شہرت پائی۔

ہیڈ (Heyd) نے بابل اور ہند کے پاس تجارت کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اُن ملّاحوں اور جہازرانوں کی قومیت کے بارے میں بھی بحث کی ہے جو کہ مال کو ایک طرف سے دوسری طرف لے جاتے تھے۔ رینو (Reinaud) کی رائے ہے کہ ساسانیوں کے زمانے میں اہل ایران کے پاس ایک عمدہ بیڑہ جہازوں کا موجود تھا۔ اور جو کہ اہل ہند خلیج میں زیادہ تر محض لٹیروں کی حیثیت سے آتے تھے۔ اس لئے ساسانی بیڑے کے جہازراں ایرانی ہی ہوں گے۔

(Memoire sur le Ryaame de la Insene etc. nei memoire de le Acodemie des Inseorphirs XXIV. II peg 199, 212, 213 ونیز Relfrons des Voyages faites par les Arabes I Into pag XXXVI e segg)

واقعہ یہ ہے کہ اہل ایران جہازراں قوم نہیں ہیں اور اسی وجہ سے کاترمیر (Quatremered) نے ایرانیوں کو نظرانداز کرکے اہل ہند کو اُن تجارتی بیڑوں کا ناخدا قرار دیا ہے جو کہ بحر ہند میں تجارت کے لئے آمد و رفت رکھتے تھے (دیکھو (Journal des Savants. 1846, pag 68 e segg)

ہیڈ (Heyd) نے بعض دیگر عمدہ دلائل اس خیال کی تائید میں پیش کئے ہیں کہ وہ ملاح ہندی ہو سکتے تھے اور یہ بھی نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ایران میں اپنے ملک کی پیداوار اپنے ہی جہازوں میں لے جاتے تھے۔ ہیڈ نے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اہل ایران جن میں الحیرہ کے عربوں کو بھی جو ساسانیوں کی رعایا تھے شمار کرنا چاہئے اپنے یہاں سے ہندوستان کو جہاز لے جاتے تھے جن میں مغربی ممالک کا تجارتی مال ہوتا تھا۔ یہ جہاز لنکا کو بھی بالخصوص جاتے تھے جہاں سے وہ تمام اشیا دستیاب ہوتی اور لائی جاتی تھیں جو ایشیائے قریب میں خاص طور پر مطلوب تھیں۔

ہیڈ کی عالمانہ بحث میرے خیال میں صرف ایک لحاظ سے ناقص ہے۔ ہیڈ نے جہازرانوں کی قومیت کے ثبوت میں ایسے حوالے نقل کئے ہیں جو کہ تاجروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے ایک مقام (دیکھو جلد اول صفحہ نوٹ ۴) تھیافیلکٹوس سموکاٹا (Theophylactus, Simocatta) سے نقل کیا ہے (دیکھو Ed. Bon p. 218) جس میں لکھا ہے کہ ایران کے یہودیوں نے بحرِ قلزم میں تجارتی جہازوں کے ذریعہ سے بہت کچھ دولت پیدا کی تھی۔

تاجروں کی قومیت سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جہازراں بھی جنھیں تاجروں نے اپنے تجارتی مال کو لانے لے جانے کے لئے مقرر کیا تھا اُن کے ہم قوم ہی تھے۔ اسی زمانے میں بھی بالکل اُسی طرح جیسا کہ اب بھی ہے مشرقی ممالک میں ملاح بہت سی قوموں سے تعلق رکھتے تھے ہمارے زمانے میں خلیج فارس کے ملاح سب ساحل عرب و ہند کے مسلمان ہیں۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔ اُن میں ملکوں کے باشندے جہازراں تھے اور اہل عرب نے اپنی قرون اولیٰ کی انتہائی بہادری کو کام میں لاکر اپنے ہم قوموں کی مدد سے غارتگروں کے جہازوں کو اپنے قبضہ میں لاکر بحری مہموں کو سرانجام کیا۔ جہازوں کی روانگی کے مقام اور اس واقعہ سے کہ حملہ ہند مغربی کے ایک حصہ پر ہوا یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہازراں عربی النسل تھے۔

وہ قول جو کہ لکڑی کے ٹکڑے پر کیڑے کے متعلق ہے (جس کا ذکر آگے آتا ہے)، ایک مقولہ ترکیبی ہے جو اس سے قبل عمرو بن العاص سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اس موقع پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قول فی الواقع صحیح یا معتبر ہے۔ البتہ عمرؓ کا عربوں کے واسطے بحری مہمات سے متنفر ہونا غالباً واقعی اور معتبر تاریخی امر ہے۔ حضرت عمرؓ بحیثیت ایک دانشمند

شخص کے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی قوت کو مختلف مہموں میں جن کا اہتمام اچھی طرح نہ کیا گیا ہو منتشر کر دیں۔ اس وقت یہ نہایت اہم تھا کہ شام و فلسطین میں تشویش پیدا نہ ہو نیز یہ بھی ناگریز تھا کہ پرخطر سمندر میں سفر کرنے سے پہلے بحرالروم سواحل عرب کے ملاح اور جہاز راں مسلمان ہو جائیں جنگی بیڑے کا طیار کرنا کوئی سہل کام نہیں ہے جیسا کہ رومۃ الکبری اور رومۃ الصغری کی تاریخ سے ثابت ہے۔ اس کے لئے وقت غور اور طویل طیاری کی ضرورت ہے۔ یہ فی الواقع حضرۃ عمرؓ کی دانشمندی کی دلیل ہے کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان ابھی ملاح اور جہازوں کا بیڑہ طیار کرنے سے رکے رہیں لیکن ہمت مند کے کام کی بھی تمیل نہیں ہوسکتی تھی اور بہت سے کپتانوں نے از خود بغیر حضرت عمرؓ کی اجازت حاصل کئے کام شروع کر دیا۔

الغرض میں حسب ذیل روایت کو معتبر قرار دیتا ہوں البتہ جیسا کہ رینو (Reinaud) نے قبل ازیں متنبہ کیا ہے۔ Fragments arabes et Persans relatif a l'Inde, Preface XIX, e Abulfeda, Geog Rein CCCXL) جو سنہ کہ اس واقعہ کے واسطے اس روایت میں بیان کیا جاتا ہے اس کے متعلق کسی قدر قبل از وقت ہونے کا احتمال ضرور ہے۔

علی بن محمد بن عبداللہ بن ابی سیف (ابوالحسن المدائنی) نے بیان کیا ہے کہ خلیفہ عمرؓ نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کو ۱۵ھ میں بحرین اور عمان کا عامل مقرر کیا (دیکھو کاتانی کی تواریخ ج ۳ ۱۴ھ ۲۵۴ و ۱۵ھ ۱۲۹) عثمان نے اپنے بھائی الحکم کو (اپنے ماتحت کے طور پر) بحرین بھیج دیا اور خود عمان چلا گیا۔ (یہاں سے) اس نے ایک لشکر تانہ کو روانہ کیا۔ (تانہ ہندوستان میں بمبئی کے قریب ہے۔ دیکھو مضمون ہذا کے اخیر میں نوٹ نمبر ا) جب لشکر واپس آیا تو حضرت عمرؓ کی اطلاع کے لئے اس کا حال لکھا۔ پس حضرت عمرؓ نے (اس سے خائف ہو کر کہ مسلمانوں نے ایسی دور دراز مہم کو سرانجام دیا) لکھا "اے ثقفی بھائی تو نے ایک کیڑے کو لکڑی پر بٹھا دیا۔ (یا اخا ثقیف حملت دودا علی عود) میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ اگر اس لشکر پر کوئی مصیبت آتی تو میں تیری قوم میں سے اس کے بدلے کے آدمی لے لیتا۔

(باوجود حضرت عمرؓ کے اس حکم کے) عثمان بن ابی العاص نے ایک دوسری مہم بسرکردگی اپنے بھائی

الحکم بن ابی العاص کے بروص (بھڑوچ) پر بھیجی اور اپنے دوسرے بھائی المغیرہ بن ابی العاص کو خلیج دیبل پر حملہ کرنے کو بھیجا۔ اس کا دشمن سے مقابلہ ہوا اور فتح پائی۔ (البلاذری ۴۳۱-۴۳۲) ع۵

نوٹ اول۔ یاقوت نے تانہ کا اپنی جغرافیائی ڈکشنری (معجم البلدان) میں کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں تانہ کا بحیثیت ہندوستان کے ایک بندرگاہ کے کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں سے بہت سے ہندوستانی ملاحوں کے جہاز عدن میں اتارنے کے لئے بہت سی تجارتی اشیاء لے جاتے تھے (دیکھو ج ۲ ص ۱۰۰ دیکھو بیرونی ص ۱۰۰ سطر ۱۶ و ص ۱۰۲ سطر ۱۲) رینو (Reinaue) نے اس مقام کو تھانہ سے جو بمبئی کے قریب ہے مطابق کیا ہے۔ (دیکھو بیرونی جلد ا ص ۲۰۹)

بقیہ دو مقامات کا جن کا ذکر البلاذری نے کیا ہے میں نے کوئی حوالہ کسی ڈکشنری میں جو میں نے دیکھی ہے نہیں پایا۔ رینو (Rein and) کا خیال ہے کہ برض یا بروص مثل "بروس" یا جیسا کہ عام طور پر لکھا جاتا ہے بروچ (؟ بہروچ = بَرُوگر (دیکھو بیرونی ص ۱۰۰ سطر ۱۶ و ص ۱۰۲ سطر ۱۲ و ص ۱۳۰ سطر ۱۸) واقع خلیج کھمبج ہے جو آج کل بھڑوچ کہلاتا ہے اور ساحل گجرات پر واقع ہے (دیکھو ایلیٹ (Elliot) جلد ا ص ۳۰۲) نولدیکے (Noeldeke Pesser page 108 n. 1) الدیبل وہ مشہور مقام ساحل ہند پر ہے جہاں پر لاہوراد

ع۵۔ دیکھو البلاذری فتوح البلدان ص ۴۳۸ مطبوعہ مطبع الموساعات مصر ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء و ترجمہ انگریزی فتوح البلدان جلد دوم صفحہ ۲ مطبوعہ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک ۱۹۲۴ء

"The Origins of the Islamic State, Part II, translated by Francis Clark Muragotten."

انگریزی ترجمہ میں مترجم نے ایک جگہ غلطی کی ہے۔ "و وجہ الحکم ایضاً الی بروص" کا ترجمہ:

"Alhakam sent an expedition against Barwas" کیا ہے

صحیح ترجمہ یہ ہے۔

"And Usman sent the above mentioned Alhakam to Baraus."

سید حسن برنی

ملتان کے دریا سمندر میں گرتے ہیں" دیکھو یاقوت جلد ۲ صفحہ ۶۲۸ ونیز بیرونی صفحہ ۶۴ سطر ۳ و صفحہ ۱۰۲ سطر ۶ - ۱۰ و صفحہ ۳۱۲ سطر ۱۵ -

ارمنی مصنف سیبوس (Sebeos) کی تاریخ کا حسب ذیل انتخاب شاید مندرجہ بالا مبحث سے ہی تعلق رکھتا ہے اور اس لئے یہاں درج کیا جاتا ہے :-

" خلیفہ (حضرت عمرؓ) نے جہازوں کے جمع کرنے اور جہاز رانوں کو بہم پہونچانے کا حکم دیا تاکہ سمندر کی راہ سے اُن میں جنوب و مشرق کی جانب ممالک فارس، سجستان، سنت (سندھ) سرس ممالک توران و مکران و حدود ہند تک رسائی ہوجائے - جب بیڑہ مرتب ہوگیا تو نہایت جلدی کے ساتھ احکام کی تعمیل کی گئی۔ تمام عالم میں تہلکہ پڑ گیا۔ قتل و غارت کے بعد حملہ آور سمندروں کو عبور کرکے اپنے ملکوں کو لوٹ آئے۔ صفحہ ۱۰۱

کیفیات

جواب دے ہی مجھے لو سنو طبیب کی بات
یہ اس کی بات نہیں ہو مرے نصیب کی بات

سنے نہ کان ملاحت اگر کہے کوئی
لگا کے کان ہمیشہ سنی رقیب کی بات

مجھے یہ ڈر ہی کہ ایسا نہ ہو دلِ بیتاب
عدو کے سامنے کہہ بیٹھے کچھ حبیب کی بات

کلام اشرف و ارذل میں فرق ہو کہ کہاں
صدائے زاغ میں آوازِ عندلیب کی بات

سالک کی ادا

از جناب مولوی سید عبدالوحید صاحب فدائی نیاز بیگ

یہ پوچھتا ہوا بیہوش ہوگیا ہوں میں | خبر ہوں اپنی الٰہی کہ مبتدا ہوں میں
تلاشِ حسنِ سماعت میں کھوگیا ہوں میں | کسے سناؤں کہ کس ساز کی صدا ہوں میں
وہ رمزِ حسن وہ الحان خوشنوا ہوں میں | ہزار پردوں میں بے پردہ بولتا ہوں میں
دکھادوں اپنی کسی پرمٹی ہوئی تصویر | جو مجھ سے پوچھے یہ فطرت بتا کہ کیا ہوں میں
پکڑ لے ہاتھ مرا بڑھ کے پنجۂ توحید | بلائے دورِ عناصر میں گھر گیا ہوں میں
کھلے گا حشر کے دن چشمِ شوق پر آخر | یہ دل کا زعم کہ آئینۂ خدا ہوں میں
بقا بنی مری آزادیوں کی یک رنگی | اسیرِ گیسوئے نیرنگیِ فنا ہوں میں
مرا خمار ہے نیرنگ دورِ بزمِ شہود | کہ بے خودی میں بھی اک رندِ پارسا ہوں میں
الجھ رہا ہے خضر سے کسی کا نقشِ قدم | اسے بھی ہے یہی دعویٰ کہ رہنما ہوں میں
یہی مآلِ فنا ہے، یہی کمالِ فنا | کہ اُن کی آنکھوں سے اب اُن کو دیکھتا ہوں میں
ترس رہا ہوں اسی سازِ بے صدا کے لئے | کہ جس کے تار کی اُتری ہوئی صدا ہوں میں
مجھی میں دیکھتے ہیں اپنی صاف صورت کو | جمال والوں کو آئینۂ صفا ہوں میں
وہ راز ہوں کہ میں دمساز "نحن اقرب" ہوں | مجھے سنو کہ بہت پاس کی صدا ہوں میں
مرا مجاز ہے آنکھیں سرِ حقیقت کی | وہ لکھ رہا ہوں جو خلوت میں دیکھتا ہوں میں
وہ میری شکل میں آکر بڑے غرور کے ساتھ | مجھی سے پوچھ رہے ہیں بتا کہ کیا ہوں میں
دوئی کی آنکھ الٰہی نہ دیکھ پائے مجھے | نگاہِ دیدۂ توحید میں چھپا ہوں میں

رسائیاں ہیں مری عرش تک بلا امداد — کہ اک دکھائے ہوئے قلب کی دوا ہوں میں
ہے میرا نقشِ قدم خود ہی رہ نمائے فنا — کہ ساز دل کی صدائے گریز پا ہوں میں
تھکی ہوئی ہے ازل سے مری تلاش نمود — کہ پہلے منزل مقصد سے کھو گیا ہوں میں
مری تلاش میں ہے منت مسیحائی — ہزار شکر کہ بے موت مر گیا ہوں میں
جو طے کروں تو بس اک سانس میں ہی بڑا پار — خود اپنی منزل مقصد کا فاصلہ ہوں میں
کئے ہیں کس نے مرے دم سے چار گھر روشن — کہ لَو چراغ عناصر کی بن گیا ہوں میں
نظر وہ ہوں کہ تعارف ہی ہے نظیر مرا — خود اپنے حسنِ حقیقت کا آئینہ ہوں میں
نگاہِ شوخ کی آنکھیں ہیں بستیاں میری — نظر میں اُن کی لپٹ کر تڑپ رہا ہوں میں
نہیں تخیل باطل نہیں کلام مرا — جو سن رہا ہوں وہی صاف کہہ رہا ہوں میں
چمک رہی ہے مرے دم سے منزل انفاس — مسافروں کو چراغِ رہ فنا ہوں میں

نیا نہیں ہے تعارف مرا طریقت سے
وہی پرانا فدا ہوں وہی فدا ہوں میں

ایک ہوا باز کی کہانی، اُس کی اپنی زبانی

اگرچہ یہ تمام حالت گو صرف گیارہ سکنڈ کے عرصہ میں گزر گئی لیکن اتنے سے عرصہ میں وہ کیفیتیں طاری ہوئیں کہ گیارہ سال تک یاد رہنے کے لئے کافی تھیں۔ مجھے کبھی یہ خواب وخیال بھی نہ تھا کہ اس جاں بازی کے کام میں ایسی عجیب کیفیتیں طاری ہونگی گو پورا پورا یقین تھا کہ مجھے اپنی طاقت کا مقابلہ دکھانا پڑے گا جب کہ میجر ہنسلے نے جو کہ مچل فیلڈ کے کمانڈر تھے مجھے طلب کیا اور کہا کہ بونس تمھارا اس کی بابت کیا خیال ہے۔ تم کو یہ عام خیال معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص زیادہ بلندی پر سے کودے تو وہ زمین تک پہونچنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جائے گا۔

میں نے یہ عام رائے بہت دفعہ سنی تھی اور میں نے فوراً تاڑ لیا کہ میجر صاحب کا اس خیال کو دُہرانے سے کیا مطلب ہے۔ اصل میں وہ ایک دوسرے افسر کے ساتھ اسی معاملہ پر گفتگو کر رہے تھے کہ ہوا میں زیادہ بلندی پر سے گرنے میں انسان کے حواس پر کیا حالت طاری ہوتی ہے اور جب میجر صاحب کا دھیان ہوا کے کسی معاملہ کی بابتہ جم جاتا ہے تو اس کو عقلی دلائل پر یقین نہیں کرتے جب تک کہ تجربہ اور مشاہدہ سے اس کا پورا پورا حال کھل نہ جائے اس واسطے میرے لئے یہ کہنے کے سوا کچھ نہ تھا کہ بہت اچھا میں اس خیال کی غلطی یا صداقت کو تجربہ سے ثابت کر دوں گا اس کے یہ معنی تھے کہ میں ایک ہوائی جہاز میں سے کافی بلندی سے ہوا میں کود دوں گا اور دیکھوں گا کہ کتنے فاصلے تک میں بے ہوش و حواس ہوا میں بغیر اپنی چھتری کو کھولے ہوئے گر سکتا ہوں۔ یہ ایک معمولی سا کام تو نہ تھا مگر چونکہ میں کئی سال سے چھتری کے ساتھ ہوا میں کودنے کا عادی تھا اور تمام فوج میں اس قسم کے نظارے دکھانے کے لئے میں ہمیشہ اپنے کو پیش کرتا رہا تھا اور ہر مرتبہ کامیاب رہا تھا اس لئے اس کام کے لئے مجھے ہی منتخب کیا گیا۔ میجر صاحب نے کہا کہ بونس تمہارے خیال میں اس کام کے لئے اتوار کا دن کیسا رہے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ بہت خوب ہوگا۔ اور اس کے بعد اتوار تک کے لئے اس معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا۔ میں اسی عرصہ میں برابر غور کرتا رہا اور میں نے جس قدر زیادہ

اس کی بابت سوچا اتنی ہی زیادہ دلچسپی بڑھتی گئی۔

یہ تجربہ فوجی نقطۂ نظر سے بہت گہری اہمیت رکھتا تھا۔ لڑائی کے زمانہ میں یہ معمولی بات تھی کہ ہوائی جہاز گھرے ہوئے دشمن کے غبارے پر گولے چلا کر اُس میں آگ لگا دیتا تھا اور اُس کے بعد نگہبان کو نشانہ بناتا تھا جو کہ غبارے میں سے کود کر چھتری کے ذریعے آہستہ آہستہ زمین پر اُترنے کی کوشش کرتا ہوتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں چھتری کی ساخت میں اس قدر ترقی کی جا چکی ہے کہ ہوا میں ہر قسم کے اہم خطرہ کے موقع پر اڑنے والا اُس کے ذریعہ کود کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ اور اب آئندہ زمانہ کی ہوائی لڑائی میں یہ ہوا کرے گا کہ جب ہوائی جہاز ایک دوسرے کو گولوں کے ذریعہ ہوا میں رہنے کے ناقابل بنا دیں گے، یا ایک دوسرے میں آگ لگا دیں گے تو چلانے والے چھتری کے ذریعہ کود اکریں گے۔ لیکن اگر اُن کو آہستہ آہستہ بغیر کسی حفاظت کے اُترنا پڑا تو وہ دشمن کے اُن ہوائی جہازوں کے گولوں کا آسان نشانہ ہوں گے جو تجسس کے لئے ادھر اُدھر منڈلاتے ہوں گے اور اس طرح ان کا بچ ادھر میں مرجانا بالکل یقینی ہوگا۔ ہوائی جہاز اور غبارے بنانا اتنا مشکل اور دقت طلب کام نہیں ہے جتنا کہ ایک ہوائی جہاز کے چلانے والے اور غبارہ کے نگہبان کو پورے طور پر سکھانا۔ لیکن اگر پناہ لینے والا ہوائی جہاز راں پہلے ہوا میں کئی ہزار فٹ کود نے کے بعد اپنی چھتری کو اس وقت کھولے گا جس وقت کہ وہ اپنی افواج کے اوپر ہوگا تو اس کا بچ جانا بالکل قرینِ قیاس اور یقینی ہے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تجربہ اس سے پہلے ہوا تھا وہ ایک اور فوجی افسر کا تھا جس نے ہوا میں پانچسو فٹ کودنے کے بعد اپنی چھتری کھولی تھی۔ اُس کو ایک چلتے ہوائی جہاز پر سے کودنا پڑا تھا اور وہ اپنی چھتری کو کھولنے میں کامیاب ہونے سے پہلے مندرجہ بالا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اس نے بیان کیا کہ جس وقت اس کا تیزی سے نیچے کی طرف آنا چھتری کے کھلنے کی وجہ سے رُکا تو وہ اُس وقت بے ہوشی کے قریب ہوگیا تھا لیکن اُس کے بیان میں خود اُس کے اس خیال نے شبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ چلتے ہوئے ہوائی جہاز پر سے ہوا میں کودنے کے وقت اس قدر سراسیمہ ہوگیا تھا کہ اُس وقت کی بابت جب کہ وہ نیچے کی طرف تیزی سے آرہا تھا سوائے خوف زدہ ہونے کے خیال کے اور کوئی دوسری کیفیت یاد نہیں۔ صرف اُس کو یہ ضرور یاد رہا کہ اس وقت اُس کے دل میں یہ پختہ خیال تھا کہ وہ زیادہ دیر تک ہوش میں نہیں رہے گا۔

میرا تجربہ بھی کچھ کم نہ تھا کیوں کہ میں نے چھتری کے ساتھ کم سے کم سو کودائیاں کی تھیں لیکن میں ہمیشہ کودتے ہی

نہایت چابکدستی کے ساتھ اپنی چھتری کو کھولنے میں کامیاب رہا تھا۔ بہرحال مجھے کامل یقین تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ فاصلہ ہوا میں تیزی کے ساتھ طے کرنے پر بھی اپنے ہوش وحواس میں رہوں گا لیکن زیادہ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی بابت میں اچھی طرح یقین نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک خیال کی صداقت کو پنسل اور کاغذ سے ثابت کرنے کا بیڑا نہیں اُٹھایا تھا بلکہ اپنے گوشت اور پوست سے۔

مجھ کو ہدایت کی گئی تھی۔ جوں ہی کہ میں محسوس کروں کہ میرے حواس جانے والے ہیں اسی وقت میں اپنے دائیں شانے کے اوپر والی رسّی کو زور سے کھینچوں جس کی وجہ سے فوراً چھتری کھل جائے۔ لیکن اگر خدانخواستہ میں ایک دم بے ہوش ہو جاؤں؟ مگر اس خطرہ کو جھیلنے کا بار میں اپنے سر لے چکا تھا۔

سب سے زیادہ فوری خدشہ اُس جھٹکے کا تھا جو اس وقت لگتا تھا جب کہ ایک دم چھتری کھلتی ہے کیونکہ میں نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں ایک ہزار فٹ سے زیادہ فاصلہ تک دیسے ہی کود دوں گا اور میرا نیچے کی طرف گرنا یک لخت اُن رسیوں کی وجہ سے رُکے گا جو میرے جسم پر لپٹی ہوئی ہونگی اگر گرنے کی رفتار بہت زیادہ تیزی کے ساتھ ہوئی تو آدمی کا مر جانا یا بہت بُری طرح زخمی ہونا یا ہمیشہ کے لئے بیکار ہو جانا ممکن ہوگا اور اگر اس جھٹکے کی وجہ سے بے ہوش اور بے قابو ہو گیا تو بہت خوفناک ہوگا کیونکہ چھتری کو قابو میں رکھنے کے لئے اور اپنے آپکو کسی درخت یا عمارت سے ٹکرانے سے بچانے کے لئے اس کو اپنے پہلوؤں کی طرف کھینچے رکھنا ضروری ہوگا۔ اور اس لئے بھی کہ بہت زیادہ ہچکولا نہ لگے جس کی وجہ سے زمین سے بُری طرح نہ ٹکرائے۔

آخرکار اتوار کا دن آیا۔ یہ ایک نہایت اچھا موسم بہار کا پُرفضا دن تھا اور ہوا بھی معمولی رفتار سے چل رہی تھی۔ ہر کس وناکس اس نظارہ کا مشاہدہ کرنے کے لئے میدان میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں نے لفٹنٹ کے ساتھ مل کر جن کو ہوائی جہاز چلانا تھا کل انتظامات مکمل کر لئے تھے اور فیصلہ کر لیا تھا کہ جس وقت ہوائی جہاز تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ جائے گا تو وہ جہاز کو چکر دیں گے اور دو بار فوجی عمارت کے اوپر سے گزریں گے۔ اور یہ بطور اشارہ کے ہوگا کہ اب ہم بالکل تیار ہیں۔ اس کے بعد وہ ہوائی جہاز کے انجن کو بند کر دیں گے اور نیچے کی طرف جہاز کو جانے دینگے ایسا کرنے کے دو وجوہات تھے اول تو یہ کہ اس طرح ہوائی جہاز کی رفتار کم ہو جائے گی یعنی بجائے نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار کے تقریباً چالیس میل فی گھنٹہ رہ جائے گی۔ کیونکہ ہوائی جہاز کے سامنے کی طرف تیز رفتاری کی وجہ سے زور کا دھکا

لگتے ہی گرنے کی رفتار اور بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انجن کے چلنے کی حالت میں ہوائی جہاز میں سے کودنا بہت خوفناک ہے کیونکہ ایسی صورت میں آگے لگے ہوئے پنکھے کی تیزی سے چکر کھانے کی وجہ سے ہوا میں ایک طوفان سا برپا ہو جاتا ہے اور اُس میں آدمی بگولے کی طرح چکر کھانے لگتا ہے۔ جو عام چھتری کے ساتھ کودنے کی صورت میں بھی خوفناک ہے۔ کیونکہ تھوڑے سے تھوڑے فاصلے میں کودنے میں بھی چھتری کے کھلنے کے وقت ایک جھٹکا لگتا ہے۔ اور اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ جھٹکا اُس وقت لگے جب کہ پاؤں نیچے کی طرف ہوں تاکہ جھٹکے کے اثرات تمام اُن رسیوں پر برابر تقسیم ہو جائیں جو پاؤں اور شانوں پر لپٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ گرتے ہوئے عام طور پر آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ پاؤں نیچے کی طرف رہیں لیکن ہوا کا دباؤ اس کے سر کو نیچا اور پاؤں کو اونچا کر دیتا ہے۔ ہوا میں آدمی اپنی حالت کو قایم رکھنے کی اسی طرح کوشش کرتا ہے جس طرح ایک غوطہ خور پانی میں اپنے بازوؤں اور سر کو چپوؤں کے طریقہ پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر آدمی ہوا میں کودتے ہوئے چکرا جائے تو اپنے آپ کو سیدھا نہیں رکھ سکتا اور اس وجہ سے اس کو جھٹکے کا بار اپنے بازوؤں کی رسیوں پر اٹھانا پڑتا ہے اور یہ آدمی کو بہت بُری طرح ہلاتا ہے۔

انجن چلنے لگا اور بمب پھینکنے والا بڑا ہوائی جہاز پہلے میدان میں دوڑا اور پھر آہستہ آہستہ بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میں نے ایک سگریٹ پیا اور پھر ہوائی جہاز کے کمرہ میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ زمین ہمارے نیچے بہت دور ہے۔ میں نے ریشم کی اُن رسیوں کو جن سے چھتری میری کمر پر بندھی ہوئی تھی اور جن کو کھینچنے سے وہ کھلتی تھی اُنگلی لگا کر دیکھا میں سوچتا تھا کہ کیا یہ ضرور میرے کھینچنے سے کھل جائے گی کیونکہ اگر یہ نہ کھلی تو فوراً خیال آیا۔ مگر نہیں نہیں۔ یہ ضرور کھل جائے گی۔ اُس کے بعد پھر میں تعجب سے سوچنے لگا کہ کیا ریشم کی یہ رسیاں اُس زوردار جھٹکے کو سہار سکیں گی جو چھتری کھولتے وقت لگے گا۔ یا یہ اُس کے زور میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مجھ کو تیزی کے ساتھ نیچے پھینک دیں گی۔ مجھے ان تمام باتوں کا اس سے پہلے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ مجھ کو یقین تھا کہ یہ ریشم کی رسیاں اس جھٹکے کے زور تک کے سہارنے کی طاقت رکھتی ہیں جو پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر سے کودنے کی حالت میں لگے گا لیکن موجودہ حالت میں میں ایک حد تک ہراساں ضرور ہو گیا۔ مجھ کو زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ کودنے کا وقت قریب تھا۔ ہم فوجی عمارت کے اوپر سے پہلی مرتبہ

گزر چکے تھے اور میں اپنی مقررہ جگہ پر کھڑا ہوگیا تھا۔ مجھے اُس جمپید میں سے کودنا تھا جس میں سے بم پھینکا جاتا تھا جو ایک قطعہ مربع تھا اور کمرہ کے عین وسط میں واقع تھا۔ میں سوراخ کے قریب گیا اور جھانک کر دیکھا۔ زمین بہت دور نظر آتی تھی۔ سوراخ کے آرپار جہاز کی لمبائی میں ایک موٹی سلاخ لگی ہوئی تھی۔ میں سہارا لے کر پہلے اُس پر کھڑا ہوگیا اور پھر آہستگی کے ساتھ اُس پر بیٹھ گیا۔ نیچے میدان تھا جس میں لاتعداد موٹر کاریں لائن میں کھڑی تھیں اور ہم میدان کے برابر والی عمارتوں پر سے گزر رہے تھے۔ جس وقت انجن ایک دم بند ہوا تو ایک صدمہ سا محسوس ہوا اور سناٹا چھا گیا۔ لفٹنٹ نے زور سے پکار کر پوچھا کہ کیا تم تیار ہو جس کا جواب میں نے اثبات میں دیا۔ ہوائی جہاز نیچے کی طرف جا رہا تھا اور میں نے اُس وقت تک انتظار کیا جب کہ فوجی عمارت بالکل نیچے نظر آنے لگی۔ کیوں کہ مجھ کو اُسی وقت کودنا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو آہستہ سے نیچے کی سمت اُتارا۔ سلاخ میں دونوں ہاتھوں سے لٹک گیا اور پھر کود پڑا۔

میری انگلیوں نے سلاخ کی گرفت کو چھوڑا ہی تھا کہ ایک بڑے زور کا تڑاقا ہوا جس کی آواز توپ چھوٹنے کی مانند تھی اور ساتھ ہی مجھ کو ایک زور کا دھکا لگا۔ جہاز راں نے تھوڑی غلطی کی کہ وہ زیادہ نیچا ہوگیا۔ اور چوں کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا اس لئے اُس نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ میں چند سکنڈ پہلے کود چکا ہوں انجن چلا دیا جس کی وجہ سے فوراً پنکھا چلنے لگا اور اس کی تیز و تند ہوا سے میرا سامنا ہوگیا۔ اور جس کی وجہ سے میں لٹو کی طرح نہایت تیزی کے ساتھ چکر کھانے لگا اور ساتھ ہی تیز رفتاری کے ساتھ نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ میں بہت دیر تک اس حالت کو تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا رہا لیکن جس وقت کہ میں اپنی ٹانگوں کو نیچے کرنے میں کامیاب ہوا اس وقت تک صرف چند سو گز ہوا میں نیچے آیا تھا۔ واللہ مجھے اس حالت میں آنے سے ایک گونہ اطمینان ہوگیا کیونکہ میں اُس آنے والے سخت جھٹکے کو اپنے بازوؤں پر لینا چاہتا تھا۔ اب جھٹکا لگنے سے پہلے میرے پاس صرف چند لمحے تھے جس میں میں اپنے احساسات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مجھ کو زمین اپنی طرف نہایت تیزی کے ساتھ دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور ساتھ ہی اُن لوگوں کے اوپر اُٹھے ہوئے چہرے بھی قریب تر نظر آتے جاتے تھے جو ایک جم غفیر فوجی اور شہری لباس میں میدان میں ہجوم کئے ہوئے تھا۔ میں ایک تیز ہوا کے جھونکے کے مقابلہ میں جو کہ زمین کی طرف سے اوپر کی طرف چل رہی تھی اور تیزی کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ اور میرے کانوں میں اُس ہوا کی وجہ سے

بہت زور کی جھنجھناہٹ معلوم ہوتی تھی لیکن میں ساتھ ہی محسوس کر رہا تھا کہ میں بالکل اصلی حالت میں ہوش وحواس میں ہوں۔ میں ہوا کے دباؤ کے اثر سے تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا لیکن میں نے احتیاط کے طور پر اپنے سانس کو روک رکھا تھا جس کا ارادہ میں نے کودنے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ پھر بھی میں احساس کر رہا تھا کہ میں اطمینان سے سانس لے سکتا تھا۔ مجھ کو بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ میں اتنی زیادہ اونچائی پر سے ہوا میں کودنے پر بھی زمین تک ہوش وحواس میں پہنچ سکتا ہوں اور اس طرح پارینہ خیال کو غلط ثابت کر رہا ہوں اور اس وجہ سے میں ایک حد تک اس کودنے کو دلچسپی کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت ایک زور کی آواز ہوئی اور سخت دھکا محسوس ہوا کہ اس سے پہلے عمر بھر میں کبھی نہیں لگا تھا۔ حالانکہ میں دو سال تک عام فوج کی گھونسے بازی میں اول رہا تھا اور ساتھ ہی پیشہ ور گھونسے باز بھی رہ چکا تھا اور ایک دفعہ اس زمانہ میں ایک دوسرے گھونسے باز سے مقابلہ کرتے ہوئے چوتھے چکر میں برابر چار دفعہ گرنے کے بعد بھی پانچویں دفعہ پسلیوں میں ایک نہایت زور کی ضرب کھانے کے بعد میں اپنے قدموں پر قائم رہا تھا۔ لیکن اس دھکے نے جس کو میں نے اپنے کودنے کے پانچویں سکنڈ میں محسوس کیا سب کو بھلا دیا۔ اصل میں میں گرتے ہوئے ہوا کے ایک ایسے حصے سے ٹکرا گیا جو اوپر کی طرف ترچھا جا رہا تھا جس سے میں ایک دھماکے کے ساتھ دوچار ہوا۔ اور اس دھماکے کا اندازہ صرف وہی لوگ خوب کر سکتے ہیں جن کو کبھی ہوائی جہاز میں بیٹھ کر اس قسم کی ہوا میں سے گزرنا پڑا اور دھکا محسوس کرنا پڑا ہو۔ میں بالکل لٹو کی مانند ہوا میں گھوم رہا تھا اور انجن کے پہیئے کی طرح سر کے بل چکر کھا رہا تھا۔ مجھ کو خیال ہوا کہ چکر کھانے کی حالت ہی میں چھتری کھول لینی چاہیئے خواہ اس کا جھٹکا رفتار میں تیزی ہی کیوں نہ پیدا کر دے لیکن فوراً اپنے دل سے جدوجہد کر کے میں نے اپنے آپ کو ایسا کرنے سے باز رکھا اور اپنے جسم کو سیدھا رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر میں اپنے جسم پر قابو نہ پا سکا لیکن پھر بھی کوشش کرتا رہا کیونکہ اس سے پہلے کہ میں زمین تک پہنچوں مجھ کو ضرور چکر کھانے سے نجات حاصل کرنی تھی اور میں یقین رکھتا تھا کہ اس سے پہلے کہ میں تقریباً ڈھائی ہزار فٹ کا راستہ ختم کروں ضرور اپنے آپ کو قائم کر لوں گا۔ لیکن اب مجھ کو خوف کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ میرے ہوش وحواس جلد خیرباد کہنے والے ہیں۔ اس کی وجہ ہوا کا دباؤ نہ تھی بلکہ چکر کھانا تھا۔ میں بدحواس ہو گیا تھا اور ہر لحہ میری بدحواسی بڑھتی جاتی تھی۔ اور دل کمزور ہوتا جاتا تھا۔ گو میں جھٹکے کے تمام زور کو شانوں پر لینا نہیں چاہتا تھا مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں زمین پر بیہوشی کی حالت میں گروں اور اس طرح میں چند سیکنڈ تک جو مینے

معلوم ہوتے تھے مذبذب حالت میں دو خوفناک صورتوں کے درمیان رہا۔ ان دونوں حالتوں میں سے پختہ ارادہ کرکے ایک کو اختیار کرنا لازمی تھا۔ اور وہ اس وقت ہوا جب کہ مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ اب میرا دل بیٹھا جاتا ہے جس کی وجہ سے خوف کے مارے میرے تمام بدن میں لرزا پڑ گیا۔ بے اختیاری کی حالت میں میرا ہاتھ میرے شانے کی طرف گیا لیکن یہ دیکھ کر میرا ہراس اور بڑھ گیا کہ میرے اعضاء وجوارح میرے قابو سے ایک حد تک باہر ہو چکے تھے لیکن چوں کہ میری انگلیاں رسی پر پڑ چکی تھیں میں نے بڑی کوشش سے زور لگا کر رسی کو کھینچا۔ ساتھ ہی ایک زور کا تڑاقا ہوا اور فوراً رسیوں میں کھنچاؤ محسوس ہونے لگا اور یہ معلوم ہوتا تھا گویا میری جان نکل رہی ہے کیوں کہ چھتری اُس وقت کھلی تھی جب کہ میں ترچھی حالت میں تھا اس لئے یہ حالت تھی کہ گویا شانے جڑ سے اکھڑ جائیں گے میں چند سیکنڈ کے لئے بے خبر سا ہو گیا لیکن میں نے تھوڑی دیر میں اپنے آپ کو آہستہ آہستہ ہوا میں نیچے جاتا ہوا معلوم کیا۔ میں نے اپنے شانوں کی حالت کا اندازہ کیا جن کی کیفیت سے معلوم ہوتا تھا کہ دو چار روز کام نہ دیں گے۔ اس کے علاوہ میں بالکل ٹھیک حالت میں تھا اور دل ودماغ باقاعدہ کام دے رہے تھے گو میں اب بھی تھوڑے تھوڑے ہچکولے کھا رہا تھا مگر میں نے جلد ہی چھتری کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اور بخیر و عافیت زمین پر اُتر آیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد میں دوبارہ پھر ہوائی جہاز میں اُڑا اور پہلے سے زیادہ بلندی سے ہوا میں کودا مگر اس دفعہ مجھے کچھ بھی نرالی بات محسوس نہ ہوئی کیونکہ مجھ کو پہلے تجربہ سے معلوم تھا کہ مجھ کو کیا کرنا چاہئے اور اس دفعہ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ میں اس دفعہ پورے ڈیڑھ ہزار فٹ ہوا میں ویسے ہی گرتا رہا۔ اس سے پہلے کہ چھتری کھولوں اور اُس کے بعد اُسی شام کو وقت گزارنے کے لئے بائسکوپ کے تماشہ میں چلا گیا۔

مترجمہ سید کاظم مرزا صاحب متعلم بی اے

مسلم یونیورسٹی

از "اسٹینڈرڈ میگزین" بابت اگست ۱۹۲۶ء

خطاب بہ علیگڑھ
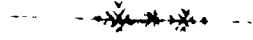
اے علی گڑھ ! اے علم بردارِ تہذیبِ حجاز
اے کہ در شوقت شدم سرتا بہ پا عجز و نیاز
کس طرف ہیں آج تیرے نغمہ ہائے دل نواز
کیا ہوئے وہ دل ستاں اوصاف محمود و ایاز
جن سے کل تھا عالمِ اسلام کو سودا ترا

یاد ہے کچھ صحبتِ دوشینہ کا خاکہ تجھے
کیوں نہیں اب اپنے رندوں کی کوئی پروا تجھے
کس لئے بخشے گئے تھے ساغر و مینا تجھے
سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

آج تو سر میں وہ اندازِ جنوں رکھتا نہیں
دل کو زخمِ عشق سے آلودہ خوں رکھتا نہیں
عامری تجھ میں نہیں، جوشِ فزوں رکھتا نہیں
یوں تو روشن ہے مگر سوزِ دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

تیری محفل تھی کہ تھی سرمایۂ دنیا و دیں
جس کا ہر ہر فرد اس خاتم میں تھا مثلِ نگیں
تیرے دیوانوں میں تھا سوزِ جگر ذوقِ یقیں
قیس پیدا ہوں تری محفل میں اب ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلا ترا

کیا ستم ہے، آج تیرے سر سے وہ سودا گیا
تیرے کالج سے وہ رنگ لیلیٰ و عذرا گیا
زندگی تیری گئی اور اس کا وہ نقشہ گیا
شوقِ بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا

آج کالج میں نہ دیو اسنے نہ فرزانے رہے

آہ! اب وہ جلوہ گاہِ شاہدِ محمل کہاں
اس تمیزِ یوپی و پنجاب نے کھویا نشاں
تیرے ہنگاموں کی رونق ہی نگاہوں سے نہاں
آج ہے خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں

رقص میں لیلا رہی لیلا کے دیوانے رہے

نا امیدی کیوں ہے یہ۔ اے حاملِ لاتقنطوا
تو بدل سکتا ہے گلشن کا نظامِ رنگ و بو
امتحاں گاہِ عمل میں شرط ہے بس آرزو
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا ہی تو

پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

او تغافل کیش پھر آیا ہے اب ہنگام کار
مطلعِ امید پر ہے پھر تجلی کی بہار
بادۂ الفت سے پھر رندوں کو کر دے پُرخمار
یاد رکھ تو بھی کہ اس ساقی کا ہے منت گزار

آج تک دنیا میں جس ساقی کے افسانے رہے

انیس رضوی

بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)
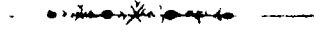
حسن وعشق - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا نے ان دونوں لفظوں کو کیوں اتنا ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا۔ حسن کے ساتھ عشق کا تخیل قایم ہو جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا عشق کا ذکر سنتے ہی حسن کی طرف خیال کا منتقل ہو جانا -

میں دنیا کی اس بدمذاقی کا توحہ کرتا ہوں وہ کیوں حسن کے ساتھ عشق کو مختص کئے ہوئے ہے -

ایک خوش مذاق انسان کے لئے اس سے زیادہ کوئی خیال روح فرسا نہیں کہ وہ محبت کا تعین حسن کے ساتھ دیکھے -

آخر میں ایک حسین چیز ہی کو کیوں محبت کے لئے انتخاب کرتا ہوں - یا جس چیز سے میں محبت کرتا ہوں وہ حسین ہی کیوں سمجھی جاتی ہے -

دنیا میں حسن وعشق کے متعلق یہ بدمذاقی خدا معلوم کب سے ہوا اور کب تک رہے گی -

یہ خیال دماغ انسانی پر اتنا مسلط ہو گیا ہے کہ ذہن میں ہر محبوب کا تخیل وہی ہونا چاہئے جو ایک سراپا زیبائی اور پیکر حسن وخوبی کا ہو سکتا ہے -

لیکن حقیقت کچھ اور ہے -

شعراء کی مصنوعی نغمہ سرائیوں اور افسانہ نگاروں کی تنگ خیالیوں سے قطع نظر کر کے جو اس غلط فہمی کی اشاعت کے زیادہ تر ذمہ دار رہیں، ایک بالکل غیر جانب دارانہ رائے محبت کی مختلف کیفیات پر قائم کیجئے - اور بہت سی ایسی محبتیں تلاش کیجئے جو حسن سے بے نیاز رہیں تو معلوم ہو گا کہ یہ جذبات لطیفہ حسن کی دل فریبیوں اور ناز و ادا کی کرشمہ سازیوں

سے متاثر ہوئے بغیر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

میرے خیال میں ہر انسانی مخلوق کو خواہ وہ ارباب دنیا کی نظر میں کتنی ہی مکروہ کیوں نہ ہو یہ حق ہے کہ وہ محبت کرے یا محبت کی جا سکے۔

محبت جس طرح تعین مقاصد سے بے نیاز ہے۔ اُسی طرح محبت تعین صورت سے بھی بے نیاز۔ محبت صرف ایک ارتباط روحی کا نام ہے۔ وہ روحیں جن میں بعض خصوصیات مشترک ہوں گی۔ ان میں یہ ارتباط پیدا ہو جائیگا خواہ اُن کی جسمانی ساخت دلفریب ہو یا کریہ المنظر۔

انسان جتنا فطرت صحیحہ سے بعید ہوتا جاتا ہے اتنا ہی وہ قدرت کی حقیقی لطافتوں سے محروم ہو رہا ہے وہ اپنی خیالی رنگینیوں میں گرفتار ہے۔ اور اُن ہی کو منتہائے نظر سمجھ رہا ہے۔ وہ ایک سراب نظر میں گھر ہوا ہے اور وہ اُس دھوکہ سے بے خبر ہے۔ اُن لطافتوں سے بھی لاعلم ہے جو کائنات کی ہر تخلیق میں پوشیدہ ہیں۔

نجمہ ایک دل کش لڑکی ہے۔ اور تمام جسمانی خوبیوں کی مالک ہے۔ ناز و ادا کی تمام نزاکتوں کی سرمایہ دار ہے۔ صرف وہ عام خیال کے مطابق محبت کئے جانے کی اہل ہے۔ وہ شعراء کا مرکز خیال ہے اور افسانہ نگار بھی اپنی تمام خیال آرائیوں کو اُس کی تعریف و توصیف میں صرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ خواہ وہ پیکر حسن نجمہ فطرت صحیحہ سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو اور سیرت کی تمام دل کش صفات سے محروم ہی کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ محبت کی حق دار ہے محض اس لئے کہ وہ اپنی جنبش نگاہ سے دلوں کو بسمل کر سکتی ہے۔ محض اس لئے کہ اُس کا خرام ناز جذبات میں طوفان پیدا کر سکتا ہے۔ اس لئے شعرا کی تمام نازک خیالیاں اس پر نثار ہیں اور ناول نویس۔ مصور۔ اور وہ تمام لوگ جو حسن ظاہری کے شیدا ہیں اس پر اپنی طبیعت کی جولانیاں ختم کر دیں گے۔

ایک وارفتہ سر بھی اُس سے محبت کرنے لگے گا۔ اُس کے تیر ادا کا مجروح ہوگا اُس کے ہجر میں روئے گا۔ اُس کی بے التفاتیوں اور بے مہریوں کا کبھی گلہ کرے گا۔ کبھی اُن سے اور برانگیختہ ہوگا۔ کبھی اُس کے دیدار سے مسرور ہوگا۔ اور کبھی مضطرب۔ غرض وہ سب کچھ کریگا جو ایک محب اپنی مطلوبہ کی محبت میں کر سکتا ہے۔

لیکن شاہدہ ایک مسکین لڑکی ہے۔ اخلاق کا مجسمہ۔ پاکیزگی خیال کا نمونہ۔ ارادہ کی مضبوط۔ وفا اور ایثار میں ثابت قدم محنت کی عادی۔ تکلیف کی خوگر۔ ذی حوصلہ۔ متواضع اہل اور درد مند۔ محبت آشنا غرض سب کچھ لیکن حسن صورت

کے لحاظ سے کم رو ہے۔ ایک متنفس بھی نہیں نظر آتا جو اُس کے لئے وارفتہ ہو، جو اُس کی خوبیوں کا گرویدہ ہو۔ جو اُس کی روحانی لطافتوں سے باخبر ہو اور جو اس میں وہ خصوصیات دیکھتا ہو جو ایک پاکیزہ انسان کے لئے ضروری ہیں۔

شاہدہ کا جامع صفات باطنی ہونا دنیائے محبت کی نظر میں کچھ نہیں۔ وہ دنیا کو متاثر نہیں کر سکی وہ کسی ایک فرد کی محبت کو بھی حاصل نہیں کر سکی محض اس لئے کہ وہ ناز آفرینیوں سے محروم ہے۔ اس کو اپنی خلقی بدصورتی کا احساس دلا دیا گیا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ باوجود انتہائی زیب و زینت کے بھی دنیا اس کو دلکش نہیں کہیگی۔

وہ جانتی ہے کہ وہ اس محبت کے لئے نہیں پیدا کی گئی جو نجمہ کے قدم کے ہر نقش پر نثار ہو سکتی ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ مرد عورتوں کے لئے کس طرح وارفتہ ہو جاتے ہیں۔ خدمت کے بھروسہ پر وہ زندہ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا میں وہ خدمت سے عزت و وقعت حاصل کرے گی۔ خادم ہو کر مخدوم بنے گی۔ خدمت اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ محبت کی تمام رنگینیوں سے وہ ناآشنا ہے۔ اے حسنِ حقیقی کے مظہر! اے دنیا کی بے کس مظلوم مخلوق! مایوس نہ ہو۔ دنیا ایسے دردمند افراد سے خالی نہیں جو حُسن پرستی کو محبت نہیں کہتے۔ جو سیرت کی خوبیوں کی قدر کرتے ہیں۔ جو حسن عارضی کی ولولہ خیزیوں سے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ یہ استقلال اور بردباری کے مجسمے۔ یہ قوی دل اور مضبوط خیال کے انسان صرف اُن ہی خوبیوں کے متلاشی ہیں جو تیری ذات میں جمع ہیں۔

اے محرومِ محبت۔ ناامید نہ ہو۔ اگر سطحی نظر رکھنے والوں کی نگاہوں کو تو متوجہ نہ کر سکی تو دوربین نظریں تجھے پہچانینگی اور تیری قدر کریں گی۔ تجھ سے محبت کریں۔ تیری شیفتہ ہوں گی۔

نجمہ کا ناز و انداز اُن کے لئے بے معنی چیز ہے۔ وہ اُن کی ساکن طبیعتوں کو متاثر نہیں کر سکتی۔ وہ اس کی تمام ظاہری خوبیوں کو عارضی سمجھتے ہیں۔ اور اُن صفات کی ادس میں تلاش کرتے ہیں جو تابندہ ہیں لازوال ہیں اور نجمہ اُن سے محروم ہے۔ قدرت یہ ناانصافی نہیں کر سکتی۔ جو برکات ایزدی تجھ کو عنایت ہوئیں وہ نجمہ کو نہیں مل سکتیں۔ نجمہ کی یہ بہار بھی بے پایاں ہے۔ تین ماہ کا مسلسل بخار اُن دلکش خوبیوں کو مٹا دیگا۔ نجمہ کا حسن بدروئی سے بدل جائیگا۔ اُس شیریں گفتاری، ترش روئی اور چڑچڑے پن میں تبدیل ہو جائیگی عالی خیال لوگ اس ناچیز حُسن۔ اس حقیر حُسن کے پرستار نہیں جس کی رنگینیوں کو بادِ خزاں کا خفیف جھونکا فنا کر سکتا ہے اور اُس کے بعد وہ تمام آتش افروزیاں جو حُسنِ ظاہری کی پیدا کی ہوئی ہیں سرد ہو سکتی ہیں۔

وہ نظریں جو گرویدگی کے ساتھ نجمہ پر پڑی تھیں اُس پر اُس حالت میں بے توجہی سے پڑینگی۔ اُس کا وارفتہ محب بھی اُس وقت

دل سرد ہوگیا ہوگا۔ اُس کی محبت متزلزل ہوگی۔ یا اگر حوادث زمانہ سے نجمہ بچ گئی تو عمر کے قدرتی انحطاط کا مقابلہ کب تک کریگی۔ رفتہ رفتہ اس کی رعنائی رخصت ہونی شروع ہوگی۔ اس کے گلگوں رخسار جو حسن کی تابش سے نظروں کو خیرہ کرتے ہیں اپنی تمام خوبصورتی کھوچکے ہوں گے۔ اُس کی نرگسی آنکھوں کی چمک اور شعلہ زنی جس میں کبھی شراب کی مستیاں نظر آتی تھیں اس وقت بے رونق ہونگی۔ اُس کی آواز کا لوچ غائب ہوچکا ہوگا۔ اُس کا شمشاد کو شرمندہ کرنیوالا قد اس وقت بے کسی کے ساتھ خم ہوچکا ہوگا نجمہ کے لئے اُسکی بہارِ حسن ایک خواب فراموش ہوگی۔ کیا نجمہ سے محبت کرنیوالوں کی سرگرمیاں اس وقت بھی قایم رہیں گی۔

لیکن حسنِ باطنی کی سرمایہ دار اور حسنِ ظاہری سے محروم شاہدہ اس وقت بھی اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کررہی ہوگی۔ اُس کو اپنے زوالِ حُسن کا غم نہ ہوگا اس لئے کہ اُس کو کبھی حسن کا احساس بھی نہوا تھا۔ نہ اُس کو اپنے محبت کرنے والوں کے جوش طوفان کے سرد ہونے کا افسوس۔ جو لوگ اُس کی اخلاقی خوبیوں کے گرویدہ تھے آج بھی ویسے ہی ہونگے کیونکہ وہ زوال پزیر نہیں۔ بلکہ تجربہ اور دانش کی تکمیل نے اُن میں اور اضافہ کردیا۔ انکو اور بھی جلا دی۔ شاہدہ وقار کے ساتھ اور عزت و وقعت کی زندگی بسر کررہی ہے۔ اُس کی زندگی یکساں ہے ہنگامہ آرائیوں سے وہ مجتنب ہے۔ مجنونانہ محبت کی وہ بے احتیاطیاں اور بے اعتدالیاں جو حسن ظاہری کی تباہی میں اور معاون ہوتی ہیں اُس تک نہ پہونچ سکیں۔ اُس کی باعظمت نسائیت اس قسم کی تمام مکروہات اور لغویات سے بری رہی۔ وہ اُس اعتماد اور وقار کی مالک ہے جو ہر عورت کو قدرت نے ودیعت کیا ہے۔ نجمہ زوالِ حسن کے بعد اپنی نظروں میں خود حقیر ہے۔ اُس کا اعتماد جو محض حسنِ ظاہری پر موقوف تھا اُس سے رخصت ہوگیا۔ محبت کرنے والوں کی وہ سرگرم توجہات جن کو وہ اپنے زعم حسن میں نہایت بے پروائی سے ٹھکرا دیتی تھی۔ اب حسرت کے ساتھ وہی ان توجہات کی متلاشی ہے لیکن اب کہاں؟ انصاف سے دیکھئے حسن و عشق کے الفاظ کی ایک دوسرے کے ساتھ پیوستگی کہاں تک حق بجانب ہے جب آپ کے خیال میں حسن کا مفہوم وہ ہو جو عام طور پر شاعروں اور افسانہ نویسوں کے خیال میں ہوتا ہے۔

ہر محبت کی کہانی کی ابتدا محبوبہ کے خط و خال کی تعریف اور اُس کے حسن و جمال کی مدح سے ضروری ہے۔ بغیر اُس کے کہانی نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ کم فہم لوگ ان مصنوعات سے محظوظ ہوتے ہیں اور یہ بھی خیال اُن کے دل میں بستا جاتا ہے کہ عشق کے لئے حُسن کی تلاش ضروری ہے اور حُسن ایک عشق کا طلبگار ہے۔ حسن عشق کا طلبگار رہو یا نہ ہو۔ کم از کم عشق کے لئے حسن ضروری نہیں کیوں نہ ہم اب اس فرسودہ نظریہ کو تبدیل کردیں اور کہیں:۔ "عشق حُسن سے بھی بے نیاز ہے"۔ یا حسن کے مفہوم کو درست کریں اور یوں کہیں:۔

"حُسن نام ہے صرف حُسنِ باطنی کا" پھر جمالِ ظاہری کیا رہ جائے گا۔ محض ایک "فریب نظر"۔

فارسی شاعری اور صوفیا کی امرد پرستی پر ایک نظر

(از جناب محمد علی خاں صاحب اثر ایچ۔ پی رامپوری)

فارسی شاعری پر عام اعتراض ہے کہ اس میں امرد کو محبوب بنا کر ایک خلاف فطرت امر سے ایران کی عاشقانہ شاعری کو جو تمام دنیا سے بالاتر اور لطیف ترتھی خاک میں ملا دیا اور یہ ایسا بدنما داغ ہے کہ جس کا دفعیہ قطعاً محال ہے۔ عرب و یورپ کی شاعری میں انسان کی اصلی فطرت کے مطابق مرد عاشق اور عورت معشوق ہے۔ ہندی زبان میں مرد معشوق اور عورت عاشق ہے جو فطرت کے قریب ہے۔ لیکن ایران میں مرد ہی کا عاشق و معشوق دونوں ہونا سراپا خلاف فطرت ہے چونکہ شاعری پر قوم کی اخلاقی حالت، تمدنی کیفیت رسم و رواج، ملک کی آب و ہوا وغیرہ کا کافی اثر ہوتا ہے اس لئے ایران کی اخلاقی حالت کے خراب ہو جانے سے شاعری پر بہت برا اثر پڑا۔ اور بدیں وجہ فارسی شاعری مخرب اخلاق ہونے کے علاوہ سراسر خلاف فطرت جذبات سے پُر ہے۔ بالخصوص جب اکابر دین اور بزرگان سلف کے کلام میں بھی یہی شاہد بازی دیکھی جاتی ہے تو سطحی نگاہ والا شخص اُن کے سوانح اور کلام سے دلیل جواز کا فائدہ اُٹھا کر یا تو خود گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا ان مقدس ہستیوں کے متعلق جو اعلیٰ درجہ کے اخلاقی رفارمر تھے سوءظنی سے کام لیتا ہے۔

اس قسم کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ بچہ بچہ کی زبان پر ہیں اور بالخصوص دیگر اہلِ مذاہب کے طعن آمیز لب و لہجہ کی سختی تو بالکل ہی ناقابل بیان ہے اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراضات ایک اسلامی سلطنت اور اسلامی زبان کی شاعری پر سخت بدنما داغ لگانے کو کافی ہیں۔ اور چونکہ اس عیب کے ناپاک چھینٹوں نے حضرات سعدیؒ و حافظؒ و شیخ بوعلی قلندرؒ وغیرہم جیسے اکابرِ دین کے دامن ہائے زہد و اتقا کو بھی داغ دار کرنا چاہا ہے اس لئے اپنی بے بضاعتی و کم مائگی علمی کے باوجود مجھے اس مبحث پر خامہ فرسائی کا خیال پیدا ہوا تاکہ اس داغ کو انکشاف حالات کے تیزاب سے اگر اڑا نہ سکوں تو کم از کم ہلکا ضرور کردوں لیکن افسوس کسی جامع تاریخ کا میسر نہ ہونا ایک مسلّمہ اعتراض کی تردید کی جانب کسی مشہور اہل قلم کا متوجہ نہ ہونا تحقیق کی

قلت بوجہ نااہلیت تحریر جواب میں قصور ہمت مانع کار ہوتے رہے لیکن مواد پیدا ہو چکا تھا۔ دن گزرتے گئے اور خلش برابر بڑھتی گئی آخر صوفیائے کرام کی محبت اور فارسی کی قدرے مناسبت نے بے خوف لومۃ لائم مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ جو کچھ رطب و یابس موجود ہو ہدیۂ ناظرین کروں اور حضرات اہل قلم سے استدعا کروں کہ وہ اس تحریک سے فائدہ اٹھا کر ان واقعات پر کافی طریقے سے روشنی ڈالیں تاکہ انکشاف حالات کی ہوا مطاعن کے ابر غلیظ کو صاف کرکے ایک خوشگوار اور درخشاں فضا پیدا کر دے اور اصلیت کا ماہتاب جلوہ فگن ہو کر اپنی ضو افشانی سے قلوب تشکک کے جلباب نفرت و حقارت کو مثل کتاں پارہ پارہ کر دے۔

چونکہ عدم قابلیت کا اعتراف کر چکا ہوں اس لئے ارباب نظر سے لغزشوں کو نظر انداز کرنے کی قوی امید کرتے ہوئے اس مبحث پر رائے زنی کرتا ہوں۔ وباللہ التوفیق والیہ الرشاد۔

اس مضمون میں امور ذیل تشریح طلب ہیں۔

(۱) محبت و عشق کی تعریف اس کے اقسام اور حصول پر رائے (۲) امرد سے عشق ہونے اور اس کے جواز و عدم جواز پر بحث (۳) ایران میں امرد کو محبوب کب اور کس طرح بنایا گیا (۴) صوفیائے کرام کا عشق امارد سے کیسا تھا (۵) نتیجہ مضمون۔

(۱)

اگرچہ محبت اور عشق کی تعریف اہل درد نے مختلف پیرایہ میں بیان کرکے اپنے تجربہ و تخیل کا نمونہ دکھایا ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ جب کسی شے کے دوست رکھنے کو کہتے ہیں اور جب اس میں درجۂ کمال پیدا ہو جاتا ہے اور سوائے خیال محبوب کے قلب و دماغ پر کسی شے کا استیلا باقی نہیں رہتا تو یہی محبت کی عروجی حالت عشق کہلاتی ہے۔ قلب انسان جو عجائب خداوندی کا زبردست مظہر ہے بے شمار طاقتوں سے پُر ہے۔ انسان جس قوت کو ترقی دینا چاہتا ہے وہ برابر ترقی پذیر ہوتی ہے اور دوسری قوتیں اگرچہ فنا نہیں ہوتیں لیکن دب ضرور جاتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص اپنی تمام کوششیں ریاضی میں مقصود کرکے اس ہی میں کمال پیدا کر لیتا ہے حالانکہ منطق و کلام و فلسفہ کی قوتیں بھی بدستور موجود ہوتی ہیں اور کوشش ان میں بھی حصول کمال ممکن ہے۔ غرض جس طرف توجہ کی جائے فیاض ازل کی عطا کردہ قوتیں یعنی حواس عشرہ ظاہری و باطنی آلات بن کر اس کے حصول میں معین ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح عرفان الٰہی کی قوت مبارکہ بھی انسان ضعیف البنیان کے قلب میں موجود ہے

جس کے حصول کا زبردست آلہ عشق ہے اور یہ قوتِ عشق دوسرے قوٰے کی طرح حصول عرفاں میں ممد و معاون ہو جاتی ہے گویا عرفاں کی روشنی عشق ہی کے لیمپ سے نکلتی ہے جس کا فتیلہ سوز حسن ظاہر ہے۔ یا یوں کہیئے کہ تجلی عرفاں کا طور عشق ہے اور شجرہ مبارکہ حسن ہے عشق کو فیاض ازل نے لقب امانت سے بھی ملقب فرمایا ہے کما قال اللہ تعالےٰ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان انہ کان ظلوما جہولا۔ عشق ہی ایک ایسی مافوق طاقت ہے جس سے انسان کو اشیائے محال کا حصول سہل ہو جاتا ہے اور جسم میں سرعت و ہمت کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں محض یہی ایک قوت ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات بنانے کی باعث ہے کیونکہ انسانی کمال عرفان ذات صمدیت ہے۔ بعض حالات میں دیدار کے بعد عشق کی طاقت متحرک ہوتی ہے اور بعض حالات میں آثار و اخبار درد طلب پیدا کر کے صحرائے عشق تک پہونچا دیتے ہیں۔ جہاں لیلائے مقصود کا نظارہ جمال روح افزا ہوتا ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

غرض مادہ عشق عروج انسان کا زینہ اول و آخر اور حصول کمال کا جزو اعظم ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اگرچہ فیض ازل نے ہر انسان کے قلب میں یہ مادہ آتشیں پنہاں کر رکھا ہے لیکن تاثر محض بہ صلاحیت واستعداد ہے۔ بعض طبیعتوں میں فطرتاً یہ مادہ نہایت صاف اور شفاف ہوتا ہے اور بعض میں سخت پرحجاب و زنگ آلود۔ یہ بھی واضح ہو کہ عشق کا وجود تجلی حسن پر منحصر ہے جس طرح نور آفتاب سے ذرات میں چمک کشش قمر سے مد و جزر طلوع سحر سے پرندوں کی نغمہ سنجی مرکز ارض میں کشش ثقل بطور لزوم ہے۔ اسی طرح حسن کے لئے عشق اور عشق کے لئے انجذاب الی المحبوب لازمی ہے۔ حدیث شریف میں ہے مَنْ عَشِقَ وَعَفَّ وَکَتَمَ وَمَاتَ۔ مَاتَ شَہِیْدًا۔ یعنی جس شخص نے عشق کیا اور رازداری و پاک دامنی کی حالت میں فوت ہوا وہ شہید ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ۔ خدائے تعالےٰ خود حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے

جائے نتواں یافت کہ از عکس جمالش

بالا شجرے دل جمہے لب شکرے نیست

یا یوں سمجھئے کہ حسن میں قوت جاذبہ اور قلب عاشق میں قوت سالبہ ہوتی ہے اور دونوں بجلیاں بغیر ایک دوسرے کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتیں اس لئے ان دونوں کے اتصال سے عشق کی کرنیں متحرک ہو کر باعث تنور قلب و تموج جذبات صادقہ ہوتی ہے۔ منقول ہے کہ شیخ ابو محمد روزبہان حبیب شیراز میں اول تشریف لائے تو ایک بڑھیا کو اپنی بی بی کی نسبت نصیحت کرتے ہوئے پایا " تو اپنے حسن کو پردہ حجاب رکھ کیونکہ اظہار باعث کم وقعتی ہے" شیخ کو کیف پیدا ہوا اور فرمایا اے عورت! حسن کو حجاب سے قطعاً ضد ہے۔ حسن عشق کے ساتھ اور عشق حسن کے ساتھ ہمیشہ یک جا رہنا چاہتے ہیں کیونکہ روز ازل میں حسن و عشق کا باہم عہد ہو چکا ہے کہ کبھی دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئیں گے۔

درحقیقت عشق صفات کمالیہ وجود حضرت جلت اوصافہ سے ایک صفت ہے اور سریان وجود کی وجہ سے ہر شے کا وجود بقدر استعداد و قابلیت اس صفت سے ذہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکما تمام مخلوقات میں سریان محبت کے قائل ہیں

سر حب ازلی در ہمہ اشیا ساریست

ورنہ برگل نزدے بلبل بے دل فریاد

لیکن متاخرین کی اصطلاح میں عناصر کی کشش کو میل کہتے ہیں اور محبت مخصوص بہ انسان ہے۔ اور یہ وہ درجہ ہے کہ جہاں قوت عقلی کا مطلق دخل نہیں۔ محبت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) طبعی۔ جیسے ماں کی محبت اولاد سے۔ (۲) ارادی جیسے شاگرد کی استاد سے۔ مرید کی پیر سے۔ محبت ارادی کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) یا تو لذت کی وجہ سے ہوگی (۲) یا نفع کی چنانچہ اول الذکر کے حدوث و زوال دونوں جلد ہوں گے اور ثانی الذکر کے بتاخیر۔ (۳) یا محض خیر کی وجہ سے (۴) یا مرکب خیر اور نفع سے۔ اول جلد پیدا ہوگی اور دیر تک رہے گی اور ثانی دیر سے پیدا اور دیر تک قایم رہے گی اس کے علاوہ محبت کے اقسام باعتبار درجات کے تین ہیں۔ اول محبت اور یہ عام ہے۔ اس لئے کہ ایک جماعت کثیرہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے صداقت یہ کم لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ تیسرے عشق یہ اخص ہے کیونکہ ایک دل میں دو اشخاص کا عشق نہیں ہو سکتا۔ اگر علت عشق افراط لذت ہے تو بہیمی ہے اور وہ مذموم ہے اور اگر افراط خیر ہے تو عشق نفسانی (روحانی) ہے اور منجملہ فضائل ہے۔

یہ مشہور ہے کہ انسان طبعاً مائل بہ انس پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی طرز معاشرت اور تمدن کا باہمی تآنس و موانست پر منحصر ہونا اس امر کی دلیل واضح ہے۔ اسی سبب سے شریعت نے بھی موانست و اجتماع تآنس کی تاکید یہاں تک فرمائی کہ عبادات میں بھی اس خیال کو ملحوظ رکھا۔

اگر سوال کیا جائے کہ انسان کو انسان سے بہ نسبت دوسری اشیاء کے زیادہ محبت ہونے کی کیا وجہ ہے تو اس کا جواب اَلجِنسُ اِلیٰ الجِنسِ یَمِیلُ کے علاوہ یہ ہے کہ انس انسان کا طبعی خاصہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کمال اس خاصیت کو ابنائے نوع سے ظاہر کرنے میں بدرجہ اتم ہو سکتا ہے۔ نیز انسان حضرت فیاض ازل کا مظہر اتم اور جامع کمالات و عجائبات ہے۔ حسن کی ایسی زندہ مثال جو تمام محاسن صوری و معنوی کی جامع ہو دوسرے مناظر میں کہاں دستیاب ہو سکتی ہے۔

پھول کی خوشنمائی رنگت کی شوخی۔ پتوں کی نزاکت۔ خوشبو کی دل آویزی ضرور اس قابل ہے کہ باعث دل کشی و سمندر میں وقت غروب آفتاب کی سرخی۔ بادلوں میں وقت غروب دھانی۔ سرخ۔ سبز۔ اور زرد رنگوں کی دھاری دار چادر۔ بلند پہاڑوں سے گرنے والی آبشار کی دلچسپ گنگناہٹ۔ کالی کالی گھٹاؤں کا ہجوم۔ بجلی کی چمک۔ سبزہ کی لہک بارش کا تقاطر۔ مور کا رقص۔ کوئل کی کوک۔ پپیہے کی ہوک۔ خوش الحان نغموں کے سامعہ نواز نغمے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سازوں کا مستانہ زیر و بم۔ یہ سب اشیا انسان کے دل کو ضرور جذب کرتی ہیں لیکن اُن کی تمام کائنات صرف نظر افروز یا سامعہ نواز ہو سکتی ہے۔ بخلاف انسان کے کہ اس کی صورت نظر افروز۔ کلام سامعہ نواز۔ رفتار و اطوار ادا و انداز دل ربا بالخصوص اوصاف و اخلاق کا نمایاں جوہر تو نباتات و جمادات کسی شے میں میسر ہی نہیں جس کی تفصیل کے واسطے ایک ضخیم جلد بھی ناکافی ہے۔ طبعی میل ان سب پر طرہ ہے۔ بوجوہ بالا میرے نزدیک اس مظہر اتم اور جامع کے مقابلہ میں کوئی دوسرا مظہر قابل ترجیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ انسان بالطبع مائل بہ انس ہے۔ محبت صداقت اور عشق کے تمام درجات اس کی تکمیل و ترقی کے لئے ازبس ضروری ہیں لہذا بجز اس کے چارہ نہیں البتہ حسب استعداد اس مادہ کا اظہار کم و بیش مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ جس شخص کا مزاج بوجہ نسبت اعتدال کے جس قدر لطیف و شریف ہوگا اُسی قدر اُس کا میلانِ طبع حسین صورتوں۔ پسندیدہ عادات عمدہ نغمات کی طرف بوجہ جنسیت زیادہ قوی ہو گا۔ عشق حقیقی کی نسبت ازلی ہر عمدہ صورت و سیرت کی جانب اس کی طبیعت کو منجذب کرے گی۔ اور یہ میلانِ طبع

طری ہوگا جو باعث قربت الی الاصل ہے۔ شیخ[1] ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں۔ من استانس باللہ فقد استانس بکل شیءٍ ملیحٍ و وجہٍ صبیحٍ یعنی جس کو خدا سے محبت ہوگی اس کو ہر ملیح شے اور حسین چہرے سے محبت ہوگی لیکن چونکہ عشق بہیمی کا خطرہ ہے اس لئے مجاز کو قنطرۃ الحقیقۃ کہہ کر فوراً عبور کی ہدایت کی گئی ہے۔ مبادا قوت شہوی غالب آکر منزل مقصود میں سد راہ ہو جائے کیونکہ عشق حقیقی اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ فیضان الٰہی کی پورے طور پر نظر انتخاب پڑے تجلیات کی بجلیاں حرمن قلب پر گر کر کل قیودات و علائق کو جلا کر فنا کردیں اس وقت دنیا کی ہر حسین شے میں ایک مخفی قوت جاذبہ اس کو اپنی طرف کھینچے گی اور رہ کشش راہبر کامل بن کر بارگاہ جلال تک پہونچانے کی کوشش کرے گی۔ حضرت سعدیؒ کا قول ہے ؎

تامل در آئینۂ دل کنی — صفائی بتدریج حاصل کنی
مگر بوئے از عشق مستت کند — طلبگار عہد الستت کند
بپائے طلب رہ بداں جا بری — وزیں جا بہ بال محبت پری

جس عاشق کے دل میں جذبات صادقہ پیدا ہو چکے ہوں وہ اپنے دل کی متاع حقیر کے عوض ایک نگاہ تغافل کیش اک خندہ نمک پاش کو خریدنا نہایت ارزاں خیال کرتا ہے۔ اور قطعاً یہ خیال نہیں کرتا کہ خریدار کون ہے اور کیا دیتا ہے اس کے نزدیک مرد و عورت بچہ و جوان سب یکساں ہوتے ہیں صرف برق حسن کی چمک پر لوٹ ہوجاتا ہے۔

دو عالم نقد جاں در دست دارند
بہ بازارے کہ سودائے تو باشد

دل جب تک لذت یاب درد نہ ہو ایک مضغۂ گوشت یا پارۂ سنگ ہے۔ اور درد ضرب عشق پر موقوف ہے جس کا خار انتگاف تیشہ دل کے پرخچے اڑا کر ایسا خستہ کردیتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس حتی کہ ایک معمولی سی ادا بھی تڑپانے کو کافی ہوجاتی ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

حضرت مولانا ابوالکلام صاحب مدظلہ العالی سوانح سرمد میں فرماتے ہیں۔

---

[1] اخلاق جلالی۔

"جس مردہ دل کو کبھی یہ وقت نصیب نہ ہوا کہ کسی بند نقاب کے ٹوٹنے کے تصوّر میں اپنے خرمن ہوش و حواس پر بجلیاں گرائے۔ اس کو شاہد حقیقت کا نظارہ حواس ظاہری سے کب کھو سکتا ہے جس بے جس کو کسی پیکر حُسن کی صدائے شیریں نے مبہوت و لایعقل نہ کر دیا ہو اُس کو ساز ازل کی نغمہ سرائی پر کیوں کر وجد آئے۔ غرض جس بدنصیب کو کسی مست حسن کی نگاہ بے محابا بے خود نہ کر سکی اسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا۔"

کیوں حسن مجازی ہو اثر جذب سے خالی

ہے عکس جمال ازلی حسنِ بشر بھی

(۲)

تقریر نمبر اول سے عشق کمال انسانی اور رجوع الی المبدأ ہونے کا جزو اعظم ثابت ہو چکا۔ دوسرے نمبر میں امر کے ساتھ امکان عشق اور جواز و عدم جواز سے بحث ہے۔

اس کے متعلق قبل از تفصیل اجمالاً یہ عرض کرنا مناسب ہے کہ اگر عشق میں شائبۂ ہوس نہیں ہے تو عورت ہو خواہ مرد سب سے عشق مستحسن اور منجملہ فضائل ہے اور اگر شائبۂ ہوس ہے تو دونوں سے ناجائز اور منجملہ رذائل ہے۔

ایک حسین و ملیح صورت جو اپنے خال و خد سے قلوب کو جذب کرنے والی ہو ایک بڑی رسیلی اور میگوں آنکھوں کا جام سرشار جو اہل درد کو مست و بے خود کرنے والا ہو۔ اعلیٰ مصنوع قدرت الٰہی ہونے کے اعتبار سے بدون تعین مرد و زن قابل عشق اور حقیقی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ارشاد باری نسبت تخلیق انسان ملاحظہ ہو۔ فصوّرکم فاحسن صُوَرَکم۔ اِنَّا خَلَقنا الاِنسَانَ فِی اَحسَنِ تَقوِیم۔ جب حضرت صمدیت انسان کی خود مداح ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ انسان انسان کے حسن صورت سے متکیف نہ ہو (ضمیر جمع مذکر حاضر بھی قابل ملاحظہ ہے اور لُطف سے خالی نہیں)

یہ شبانہ روز کا تجربہ ایک اور بدیہی امر ہے کہ ہم کوئی لطیف یا کثیف خیال ہر وقت اپنے ذہن نشین رکھیں تو لامحالہ ہم میں اُسی خیال کے مطابق اثرات پیدا ہونے لگیں گے۔ کیونکہ افراد انسان یا حالت مجموعی قوم و سلطنت میں ذہنی۔ دماغی۔ سیاسی عقلی روحانی و جسمانی جو انقلابات وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ محض استحکام خیال ہی کی بدولت ہیں۔ خیالات ہی پر دنیا کا قیام ہے۔ کسی شئے کا اچھا اور برا دو متضاد حالتیں پیدا کرنا خیال ہی کا کام ہے خیال ہی نیت یعنی ارادہ قلبی کا بانی ہے اور اس ہی پر تمام حسن و قبح ثواب و عقاب کا دار و مدار ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔ اِنّما الاعمالُ بِالنّیاتِ پس جب

پاکیزہ خیالات کے غلبۂ اثر سے ہم قوت شہوی کو مغلوب کرلیں گے تو اس وقت ہم سے صرف وہی امور سرزد ہوں گے جو ہر طرح پاکیزہ اور قوت شہوی کی حد سے بالاتر ہوں گے جن کو ملکات روحانی سے تعلق ہے۔ انسانی قوتوں کے اقسام مع مدارج ارتقا کے کلام معجز نظام الٰہی میں نفس امارہ ۔ نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کے ساتھ موسوم ہوئے ہیں ۔ نفس امارہ تو وہ قوت ہے جو انسان کو اخلاق قبیحہ و افعال شنیعہ کی طرف رغبت دلاتی ہے ۔ لوامہ وہ ہے جو کسی برے فعل پر انفعالی و پر ندامت جذبات پیدا کرتی اور ارتکاب فعل سے باز رکھتی ہے ۔ مطمئنہ وہ ہے جس میں ان تمام امور سے اطمینان اتم حاصل ہو جاتا ہے اور کوئی قوت غالب تو کیا مخالفت بھی نہیں کر سکتی ۔

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ عورت کے عشق میں ہمیشہ مضرت و استیلائے شہوت کا خطرناک پہلو موجود ہے کیونکہ عورت کا حسن فطرتاً مرد کی شہوات کا مرجع ہے بوجہ قانون تناسل و توالد کے اور ان ہر دو مقدمات ہوس کی یکجائی میں باوجود قدرت نفس ایک خطرناک نتیجہ کا پہلو موجود ہے ۔ بخلاف امرد کے ۔ کیونکہ اس کا حسن صورت صرف خال و خط یا ملاحت و صباحت کی وجہ سے باعث دل کش ہو سکتا ہے نہ کہ مرجع شہوات ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عام مناظر قدرت حتیٰ کہ سبزہ کی ایک ہری بھری شاخ بھی دل کشی کے سامان سے خالی نہیں جیسا کہ حضرت سعدیؒ کا شعر ہے ۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

پس امرد جو حسن صورت و سیرت کی زندہ تمثال ہے کیوں کر سامان کشش سے معرا خیال کیا جا سکتا ہے ؟

فارسی زبان کا لٹریچر دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ زمانہ امردیت ہی کے لئے انجذاب خاطر مخصوص نہیں بلکہ شعراء کی نظر میں ایک ڈاڑھی والا جوان بھی خوبیٔ خط میں امرد سے کم نہیں ۔ چنانچہ عنصری کی تعریف سبزہ ملاحظہ ہو ۔

مست است بتا چشم تو و تیر بدست ۔ بس کس کہ ز تیر چشم تو بخست
گر پوشیدہ عارضت زرہ عذرش ہست ۔ کز تیر ترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

(سعدیؒ) ہمہ دانند کہ من سبزہ خط دارم دوست ۔ نہ چو دیگر حیوان سبزۂ صحرائی را

(غالب) نہ لیوے گر خس جوہر طراوت سبزۂ خط سے ۔ لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

سبزرنگے بخط سبز مرا کرد اسیر　　دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

جو لوگ عشق مجازی کی بنیاد محض شہوت ہی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا تمام تر قیاس حیوانیت پر ہے اور وہ انسان کے امتیازی درجہ عرفان کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے حیوان کو اس کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلق زیادہ خامہ فرسائی مناسب نہیں کیونکہ ناظرین تفاوت حیوان و انسان کے مسئلہ کو خود اچھی طرح طے فرما سکتے ہیں۔ اگرچہ مولانائے روم رحمۃ اللہ علیہ نے خام اور پُر ہوس میلان طبع کو بخار گندم سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن عشق کا وجود دنیا کے ذرہ ذرہ میں مانا ہے حتیٰ کہ عشق کی ایسی بانسری بجائی کہ آج تک دنیا نغمہ ہائے پُر کیف کی صداؤں سے گونج رہی ہے۔ ان کے علاوہ اس بوالہوسی کی مذمت باوجود تعریف عشق تمام صوفیا شعراء نے کی ہے۔

(سعدی)　نظر خدائے بینان ز سر ہوا نباشد　　سفر نیاز مندان ز رہ خطا نباشد

(سرمد)　سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار　　ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

بعض صوفیانہ خیال کے اصحاب بزرگوں کی امرد پسندی کی دلیل حدیث نبوی "رایتُ ربی فی صورۃ الامرد المرد" بیان کرتے ہیں۔ میں محض بوجہ تعلق مضمون کے یہاں درج کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اگرچہ اپنی ناچیز تحقیق کی بنا پر صحت کا معترف نہیں ہوں۔ البتہ اگر حدیث درجہ صحت پر پہونچ جائے تو اس کی توجیہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔ یہ کہ خدائے تعالیٰ اول تو متشکل ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی انسانی شکل کو اپنی تجلی سے متجلی بھی فرمائے تو بباعث افضلیت جنس اناث کی شکل پر ذکور کو ہر طرح ترجیح حاصل ہے۔ اور ذکور میں بباعث معصومیت و سادگی و پاکیزگی امردی کی شکل مناسب ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ شکل بھی چشم ظاہر بیں کو نہیں دیکھ سکتی۔ عالم مثال یا خواب میں یہ صورت رو نما ہو سکتی ہے کیونکہ خداوند ذوالجلال کی جب کوئی شکل ہی نہیں ہے اور انسان محض اُسی شے کو خواب یا بیداری میں دیکھ سکتا ہے جو عالم مرئیات سے ہو تو اس صورت میں رویت کا ثابت ہونا محال ہو جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر روشنی نظر آئی۔ حالانکہ جب روشنی کی قید لگا دی گئی اور آنکھ دیکھ سکی پھر بھی عالم مرئیات سے تعلق ہو گیا۔ اصل یہ ہے کہ ان مواقع پر جس مرئی شئے تجلی خاص ہو اُسی کے دیدار کو دیدار الٰہی کہا جا سکتا ہے جب کہ ناظرین کا قلب سلیم اور الہام غیب بھی اس کی تائید کرے۔

آمدم بر سر مطلب۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امرد سے محبت داخلِ فطرت یا درجات تصوف کی ترقی کا آلہ ہے تو

قرنِ اولے میں اس کی مثال کیوں نہیں ملتی اور نیز یہ کہ ایران کے سوائے دوسرے ممالک عرب وغیرہ کی شاعری میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے؟ کہا جا سکتا ہے کہ قرنِ اولے میں شریعت ظاہر تھی اور طریقت باطن خود ذات بابرکات نبوی موجود تھی۔ عشقِ الٰہی کے ذرائع حصول تمام تر ذاتِ رسول (جو منظرِ عام کی جلوہ گاہِ شہود میں نظر افروز تھی) کی محبت و عشق پر منحصر تھے۔ بعد پردہ پوشی خود خلفا اور صحابہ موجود تھے۔ خانہ جنگیوں اور کفار کے مقابلوں ہی سے فرصت نہ تھی جب اسلام میں حکومت کے ساتھ تمول و تعیش کی ترقی ہوئی اور علمی مباحث کے جھگڑے اٹھے تو صدہا فرقے اختلاف عقاید و خیالات کی بنا پر قایم ہو گئے اور اپنے اپنے ناموں سے جداگانہ موسوم ہو گئے۔ گو ظاہری خوبیاں آئیں لیکن باطنی اخلاق و اوصاف روپوش ہوتے چلے گئے حتی کہ علمائے جلیل القدر بھی تکمیل اخلاق میں نہایت ناقص ثابت ہونے لگے (اس امر پر "الغزالی" مؤلفہ مولانا شبلی مرحوم سے کافی روشنی پڑ سکتی ہے) آخر دوسری صدی میں ابوالہاشم صوفی المتوفی ۱۵۰ھ نے تکمیل اخلاق کی طرف توجہ دلانے میں خاص شہرت حاصل کی اور صوفی کے نام سے مشہور ہوئے ان کی نسبت حضرت سفیان ثوری نے فرمایا ہے لولا ابوھاشم الصوفی ما عرفت دقیق الریاء ان سے پہلے کوئی شخص صوفی کے لقب سے ملقب نہیں ہوا۔ علماء کے طمطراق۔ جاہ پرستی۔ دولت و رعونت کی برائیوں سے مخلوق کو آگاہ کیا گیا اور اصل تعلیم نبوی یعنی تہذیب اخلاق کی اشاعت کی گئی آخر تصوف کی ایسی کثرت ہوئی کہ یہ فرقہ بھی دوسرے فرقوں کی طرح علحدہ نامزد ہوا۔ عرب کی شاعری بھی اسلام کے آتے ہی دوسرے رنگ میں بدل گئی اور حمد و نعت منقبت۔ تنفر از دنیا۔ خوفِ خدا وغیرہ کے بارے میں اشعار کہے گئے۔ عشقیہ شاعری اگر ہوئی بھی تو بہت کم۔ البتہ شاعرانہ اصطلاحات قومی کا تتبع زبان میں قایم رہا۔

جب اسلام نے تختِ ایران کو سرفراز کیا تو یہاں بھی بادشاہوں کی عربی زبان شاعری پر حاکم رہی۔ آخر تیسری صدی میں خاندان طاہریہ کے عہد میں فارسی شاعری وجود پزیر ہوئی اور عشقیہ نظم یعنی غزل رودکی کے زمانہ سے باقاعدہ شروع ہوئی۔ اور حضرت سعدیؒ کے زمانہ میں اوج کمال پر پہونچی۔ کیونکہ تصوف و عشق دونوں کی جامع تھی۔

اس ضروری و مختصر تبصرہ کے بعد وجہ اختصاص ایران عرض کی جاتی ہے یعنی اس وقت ملک کا مذاق عاشقانہ ہو چکا تھا اور زبان کی اصطلاحات میں بھی امرد کی محبوبیت مسلم ہو چکی تھی جس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔ لہذا صوفیائے کرام نے بھی نہ صرف تتبع زبان کو ناگزیر سمجھا بلکہ خود بھی جذبۂ عشق سے مغلوب تھے اس لئے اس پر عمل بھی ہوا یعنی چونکہ

عشق حقیقی کی جلا کے واسطے عشق مجازی کی قلعی کی ضرورت تھی اس لئے عورت کے خطرناک پہلو سے بچ کر امرد ہی کی صورت میں جذبِ طبیعت کو محدود رکھا۔ خیالات کلیتہً پاک ہے۔ لہٰذا اس مصنوع اتم میں جمال صانع حقیقی کے جلوے دیکھنے لگے۔ اس موقع پر حسن کی مختصر تعریف بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حسن کیا شے ہے اور وہ عورت ہی میں ہو سکتا ہے یا مرد میں بھی اور پھر اس کو پسند کرنے والا صرف بوالہوس ہی ہو سکتا ہے یا عاشق صادق بھی؟

یہ جہاں تک خیال ہے حسن کا کسی تعریف میں محدود کرنا اسی قدر دشوار ہے جس قدر اس کا احساس مشکل ہے مختلف ممالک کی آب و ہوا۔ وضع قطع رسم و رواج کے موافق حسن کی تعریفیں مختلف ہیں۔ بعض جگہ ملاحت۔ سیاہ پتلیاں سیاہ بال داخل حسن ہیں بعض جگہ صباحت۔ بھورے بال۔ نیلگوں آنکھیں اعلیٰ حسن میں داخل ہیں۔ بعض جگہ چمک دار سیاہی۔ موٹے ہونٹ۔ بھونڈے خال وخد اور گھونگر والے بال داخل حسن ہیں۔ غرض حسن سے ایک بہترین رنگ۔ اعلیٰ درجہ کا نقشہ اور تمکین جو ہر جگہ کی مختلف مذاق طبائع کے موافق ہو مراد ہے۔ عورت کے حسن میں نزاکت اور مرد کے حسن میں بمقابلہ عورت کے مردانگیت پسند کی جاتی ہے۔ معیار حسن مرد کا بھی مختلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مرد کا حسن اور عورت کا حسن دونوں بجائے خود قابل دل کش ہیں البتہ عورت کا حسن مردوں کو اور مرد کا حسن عورتوں کو زیادہ پسند ہوتا ہے۔ لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ایک عورت دوسری حسین عورت کے حسن کا احساس بھی کر سکتی ہے اور پھر اس سے محبت بھی کر سکتی ہے۔ اسی طرح مرد بھی مردوں کو حسین بھی سمجھتے ہیں اور انس و محبت بھی کر سکتے ہیں۔ جس طرح معمولی عورت کا کسی حسین و خوش رو عورت کو پسند کرنا کسی قسم کی آمیزش سے پاک ہے اسی طرح مرد کا کسی حسین مرد کو دیکھ کر محبت کرنا کیونکر آمیزش سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص بالقصد آمیزش پیدا کرنا چاہے تو اصول مندرجہ کے مطابق محب صادق پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ امرد کا حسن جو دونوں اقسام کے حسنوں کا جامع ہے قابل محبت قرار دیئے جاتے میں قابل اعتراض یا ناممکن متصور کیا جا سکے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ معصومیت و سادگی کا اس میں اضافہ مزید ہو۔

اب صرف یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ امرد سے محبت کا رواج عرب و یورپ وغیرہ میں کیوں نہیں پایا جاتا؟ واضح ہو کہ ہر ملک کا رسم و رواج جدا گانہ ہے۔ ایران میں بوجوہ چند جس کا ذکر نمبر ۳ میں ہوگا امرد کو فروغ ہوا اور محفل عشق کا ساقی قرار پایا۔ رفتہ رفتہ نشۂ شراب نے بدراہ کر دیا۔ شاعری کی ایک قسم نظم متعلق حسن و عشق یعنی غزل نے ترقی کی۔ عشق کی گفتگو لطرز جدید

دلوں کی تسخیر کا باعث ہوئی۔ صوفیا کے عشق حقیقی کا مظہر بھی ان کی صورت ثابت ہوئی اس لئے ایران ہی اس کے لئے مقام مختص ہوا۔

سطور بالا سے ثابت ہے کہ حسن کا وجود امرد میں بھی ہے اور ہر حسین محبت کئے جانے کا اہل ہے۔ اور بوالہوسوں کے علاوہ جو اصحاب محض عشق مجازی اور صورت پسندی کو منظرۃ الحقیقۃ سمجھتے ہیں ان کی محبت شائبہ ہوس سے پاک ہونے کا باعث جائز رہا ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ ایسے لوگوں کا مرکز عشق صورت ظاہری نہیں ہوتی بلکہ بذریعہ مصنوع صانع ازل کا عشق ہوتا ہے اور یہ صورتیں دلیل راہ بن کر قوت عشق میں جلد اور تیزی پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک صورت کے پابند نہ رہ کر جہاں پھول ملتا ہے اس کی خوشبو سے مستفید ہوتے اور اعماق روح میں نکہت کی پاک و صاف لہریں رواں پاکر ملاءِ اعلیٰ کی فضائے بسیط کے چکر لگاتے ہیں۔

چونکہ یورپ و ہند میں پردہ کا رواج نہ تھا۔ عورتوں کو آزادی تھی۔ اس لئے عشق عورتوں سے ہی ہوا اور ناجائز ہوا۔ کیونکہ غایت مقصود محض حظ نفس تھا۔ عرب میں جہالت و جنگ جوئی کی اسپرٹ عام تھی۔ اسلام سے پہلے پردہ کا رواج نہ تھا جب پردہ کا رواج ہوا تو ابتدا میں اسلام کو اپنی بقائے ہستی کی وجہ سے جنگی کارناموں میں مصروف ہونا پڑا۔ مذہب نے خیالات کو بالکل پاک کر دیا تھا اور اُن کے معیار خیالات کو بلند تر بنا دیا تھا۔ نہ عیش ہی تھا نہ فرصت ہی تھی۔ جب مرور زمان اور اختلاف طبائع سے دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں کے مالک ہو گئے تو تعیش نے قدم چومے لیکن دائرہ رواج و تمدن میں محدود رہے۔ ایران کے تمدن نے جو حملہ یونان سے شروع ہوا۔ رنگ پلٹا اور امردیت کو زور ہو گیا۔ قوم میں خیالات امردیت پیدا ہو چکے تھے۔ شاعری بھی اس رنگ سے رنگ چکی تھی۔ مسلمات شاعری سے کیوں کر اعراض ہو سکتا تھا۔ اُن کی طبیعتیں بھی جذبات سے پر تھیں۔ اس لئے اسی دائرہ میں جوہر کمال دکھایا۔ شائبہ ہوس نہ اُن میں تھا نہ اس کی تعلیم دی۔

(۳)

نمبر۲ سے امرد کے حُسن اور انجذاب الی الحسن بدون شائبہ ہوس پر روشنی پڑ چکی لہٰذا اب نمبر۳ ملاحظہ ہو۔

(۱) جہاں تک معلوم ہوا ہے امردیت کے خیالات یونانی اپنے حملہ کے بعد ایران میں پیدا کر گئے تھے۔

کیونکہ یونان[۱] میں یہ تحریک افلاطوس کے زمانہ میں ہی ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ وہ شہوت پرستی کے انتہائے مدارج تک پہنچ گئی تھی

[۱] از انتقید رب

پھر یونان سے حکومت کے ساتھ نیک چلنی رخصت ہوئی تو ایشیائے کوچک کے شہر بد چلنی کے مرکز ہو گئے۔ یونانی غلام حسن و جمال میں لاجواب ہوتے تھے اور اسکندریہ کے غلاموں کا تو خاص کمال یہ تھا کہ انھیں دیکھ کر شیخ فانی کے دل میں شہوت رانی کی امنگ پیدا ہو جاتی تھی۔ روم میں بھی یہ لوگ بکثرت پھیلے اور خود اہل روم کے بچے اور نوجوان بھی انھیں کی صحبت میں رات دن رہنے لگے مناکحت سے نفرت ہو گئی۔ امرد غلام بد چلنی کی روٹی کھاتے ہی تھے۔ ستم یہ ہوا کہ وبائے ساریہ کی طرح ان کا یہ مرض ہر طبقہ میں متعدی ہو گیا۔ اس زمانہ میں بداخلاقی کی یہ حالت تھی کہ کوئی صیغۂ عمل کوئی شعبۂ حیات ایسا نہ تھا جس میں بدکاری کی سمیت نہ سرایت کر گئی ہو۔ امرا نشۂ دولت میں مست ہر وقت خوشامدی مصاحبوں کے حلقہ میں محصور اپنے بہیمانہ جذبات کی سیری میں مشغول رہتے تھے اور غلاموں کی جو کثیر تعداد زیر فرمان رہتی تھی وہ غلام افعال شنیعہ کے ارتکاب کے لئے اپنے آقاؤں کے آلات عمل تھے۔" ظاہر ہے کہ جو اخلاق ذمیمہ اُن کے ساتھ تھے ممالک مفتوحہ پر بھی اُنھوں نے بغیر اثر ڈالے نہ چھوڑا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مصر و ایشیائے کوچک میں روم کے اثر سے اس کے اخلاق و رسم و رواج نے وسعت پائی ہوگی تو ایران میں بھی یہ وبا دوسرے مقامات کی طرح ضرور پہونچی ہوگی۔ بہرحال اس کا منبع یونان ہے۔

افسوس کسی جامع تاریخ کے دستیاب نہ ہونے سے اس امر کا پتہ چلانا دشوار ہے کہ کس کس عہد میں بقید سنین ملک کی کیا کیا حالتیں رہیں اور کس زمانہ سے امرد کے خیالات قوم کے دماغوں میں راسخ ہو کر شاعری پر چھا گئے۔ دو صدی ہجری تک تو ایرانی شاعری کا وجود ہی عرب بادشاہوں کی بدولت نہیں ہوا۔ فارسی تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب مختلف بیان کئے ہیں۔

"ظاہر است کہ اشعار قدیم شعرائے عجم بسبب غلبۂ عرب از میان رفتہ چناں کہ مشہور است کہ تمام کتب تواریخ عجمیان را عرب سوختند از کتب قدیمہ چیزے بر جا نگذاشتند الا قلیلے کہ نہاں داشتند چوں مردم را قدغن بلیغ نمودند قاعدہ سخن فارسی و شعر متروک شد تا مدتے گزشت و اوضاع بنوع دیگر گشت۔"

دولت شاہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن طاہر نے حکم دیا تھا کہ ایران کی تمام کتابیں برباد کر دی جائیں اس بنا پر آل سامان کے زمانہ تک فارسی شاعری نے ظہور نہیں کیا۔

تیسری صدی میں دولت عباسیہ کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا اور بڑے بڑے صوبے خود مختار ہو گئے، خا

حکومتیں قایم ہونے لگیں۔ اس قسم کی سب سے پہلی سلطنت خاندان طاہریہ تھا جو ۵۴ برس حکمراں رہا اور ۲۵۹ھ میں اس کا خاتمہ ہوا۔ اگرچہ خودمختاری کا مدعی نہ تھا لیکن خراسان میں بوجہ اقتدار تمام سامان خودمختاری موجود تھے۔ شعرا بھی لوازم دربار سے تھے اس لئے باوجود فارسی سے کم آشنا ہونے کے شعرا پیدا ہو گئے جن میں حنظلہ بادغیسی۔ محمود وراق اور فیروز مشرقی مشہور ہیں۔ اس کے بعد خاندان صفاریہ کا مورث یعقوب صفار خلافت عباسیہ کے زمانہ میں باغی ہو کر خراسان و فارس پر قابض ہو گیا۔ آخر طاہر بن محمد پر ۲۹۰ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہوا۔ شعرا میں ابو سلیک گرگانی ممتاز ہے۔ رباعی کی ایجاد بھی اس ہی کے زمانہ میں ہوئی۔ اس کے بعد خاندان سامانیہ پیدا ہوا جس میں شاعری نے بہت کافی ترقی کی رودکی جو فارسی شاعری کا ابوالآبا سمجھا جاتا ہے اس دربار کا دست پروردہ تھا۔ اس نے غزل کی مستقل حیثیت بنائی۔ پہلے قصائد کی تشبیب ہی غزل کہلاتی تھی گویا اب باقاعدہ عشقیہ نظم فارسی کی از سر نو بنیاد ڈالی سنہ وفات ۳۰۴ھ ہے۔ ۳۶۵ھ میں نوح بن منصور تخت نشین ہوا تو پایہ تخت بخارا میں بڑے بڑے شاعر موجود تھے۔ دقیقی پایہ تخت کا باشندہ تھا نوح نے اس کی شہرت کمال سن کر شاہنامہ کی خدمت سپرد کی لیکن یہ ایک خوبرو غلام کے ہاتھ سے ہوس آمیز محبت کی بدولت مارا گیا۔ ان واقعات سے امرد غلاموں کے حالات اور زمانہ پر قدرے روشنی پڑ سکتی ہے۔ سوال کی دوسری شق کا جواب بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) ایران میں دستور تھا کہ بادہ و جام کی صحبت عیش میں حسین امرد غلام ساقی ہوتا تھا اور اس نشہ کی حالت میں اس کا حسن۔ خال و خط اور بھی زیادہ دل فریبی کا باعث ہوتا تھا۔ اور یہی امر خال و خط کی تعریف کا سنگ بنیاد ہوا اور یہ ظاہر ہے کہ پاکیزہ شکل والا وجیہ خادم کسی حبشی سیاہ فام اور بدصورت کے مقابلہ میں زیادہ تر باعث انفراح خاطر و لطف دہ صحبت عیش ہو سکتا ہے۔

(۲)۔ بعض سلاطین کو غلاموں سے محبت ہوئی بدیں سبب کہ وہ حسین خوش مزاج۔ برجستہ گو۔ حاضر جواب تعلیم یافتہ قابل صحبت و خدمت سلاطین ہوتے تھے اور کل مجموعی محاسن محبت پر آمادہ کرتے تھے۔ شعرا نے بادشاہوں کی مسرت طبع کا خیال کر کے مدح و ستائش شروع کی چنانچہ عنصری کے اشعار ایاز کی تعریف میں بے شمار ہیں۔ متاخرین نے اس ہی پر شاعری کا سنگ بنیاد رکھا اور آخر یہ رنگ تیز ہوتا چلا گیا۔

(۳)۔ صوفیائے کرام نے کچھ تو باعث تتبع زبان اور کچھ ان وجوہ سے کہ ان کا عشق محض حقیقی تھا اور حسن مردیا

عورت بدوں امتیاز ان کے عشق حقیقی کا برانگیختہ کرنے والا تھا اس کا لزوم کیا اور عورت کے حسن سے بوجہ شائبہ غرض نفسانی کنارہ کیا۔

(۴) بعض صوفیا کا مقصود نہ شراب سے شراب تھا نہ معشوق طفل سے طفل۔ لیکن صوفیانہ نکات کو شراب و معشوق سے تشبیہ دے کر تمام کلام کو مرقع سحر بنا دیا۔ حالانکہ مقصود اصلی اور ہی تھا جیسے کہ عمر خیام جن کی ہر رباعی میں مے و معشوق کی کثرت ہے۔ مے سے اُن کی غرض کیفیت دبے خودی در ذات واجب تعالے ہے۔ معشوق سے مراد وہ ہر مصنوع ہے جو نتیجہ بہ صانع حقیقی ہو اور اس کے ساتھ خیال کو وابستہ کر دے۔ چنانچہ شراب کی تفصیل خود کرتے ہیں۔

اے دل مے و معشوق بکن در باقی — سالوس رہا کن و مکن زر راقی

گر پیر د احمدی خوری جام شراب — زاں حوض کہ مرتضاش باشد ساقی

(۵) شاہانِ اسلام کا دستور تھا کہ عورتوں کا ذکر مجالس میں خواہ بالتصریح ہو یا بالکنایہ غیرت قومی و سختی پردہ کے باعث قطعاً ناپسند تھا اور چونکہ مجالس عیش میں رقص و سرود کو نظم ہی سے واسطہ پڑتا ہے جس کا عشقیہ ہونا ضروری ہے اس لئے بجائے عورت کے امرد ہی رہا۔

(۴)

اب یہ دیکھنا ہے کہ قوم کی شاعری اور اخلاق و طبائع میں امردیت کے خیالات پوری طرح پھیل چکے تھے۔ ہم جن حضرات صوفیا کے متعلق لکھنا چاہتے ہیں وہ اسی فضا میں پیدا ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی آج تک اُن کی تحریر یا واقعات سے یہ ثابت نہ ہو سکا کہ اُن کی محبت میں شائبہ ہوس تھا یا کوئی فعل خلاف شریعت سرزد ہوا ہو۔ بجز اس کے کہ طبیعت عاشقانہ تھی کلام اس میں رنگا ہوا تھا لیکن مجاز میں پھنس نہ جانے کی سخت تاکید کرتے تھے۔ دنیا کے مکروہات اور ناپائداری کے اعلےٰ سبق دیتے تھے۔ ان کی زندگیاں قابل قدر تھیں۔ علوم میں دستگاہ کامل تھی۔ دنیا کے تجربوں نے پختہ کار بنا دیا تھا اور عالم پیری میں تصنیف کے کوچہ میں قدم رکھا تھا جہاں خواہشاتِ نفسانی کا وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ قوم کی زبان و مصطلحات میں اپنا جوہرِ سخن دکھایا۔ واقعات عمر شاہد ہیں کہ انتہا درجہ کے عابد و زاہد تھے ریاضات و عبادات میں عمریں صرف کی تھیں۔ چنانچہ حضرت سعدیؒ کی جس قدر غزل مشہور رہے اس سے زیادہ اُن کے نصائح ہیں حافظ شیرازیؒ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے سالک اور پابند شریعت تھے شراب و کباب کو چھوا تک نہ تھا۔

تنگیٔ زبان سے مجبور تھے بلکہ اس ہی شراب سے جس کا ذکر شاعری اور جلسہ ہائے عیش کا رکن اعظم تھا ہٹا کر نکات صوفیہ
کی طرف میلان طبع کا رُخ پھیرتے تھے اور ظاہر ہے کہ کسی شاعر کا کلام اس کے افعال ذاتی پر دلالت نہیں کرتا۔ فلسفیہ
مضامین انھی گوش آشنا درمعمولی باتوں میں سمجھاتے تھے تاکہ قوم کے مذاق کی چاشنی نکات واسرار، پند ونصائح کی
تلخی کو رفع کر کے خوشگوار بنا سکے۔

(۵)

گزشتہ چار نمبروں میں امرد سے پاک تعشق پر تفصیلی بحث ہو چکی۔ اب اجمالاً سرسری نظر بھی مناسب ہے۔
جہاں تک قیاس کیا جاتا ہے سکندر کے بعد یونان سے غلامی کی وبا آئی۔ بدقسمتی سے ایران میں اپنے متعدد وجوہ
پیدا ہوئے کہ امرد سخن شعر کا جولانگاہ بن گیا۔ اب اس بارہ میں مزید تحقیق پر بھی نظر ڈال لیجئے وہ یہ کہ فارسی و سنسکرت
واحد الاصل ہیں کوئی عجب نہیں کہ فارسی میں سنسکرت اور ہندی کی طرح مرد معشوق اور عورت عاشق ہو چونکہ فارسی میں
تذکیر و تانیث کا فرق نہیں ہے ضمائر۔ افعال وصفات مرد وعورت دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ غضب ہے کہ ضمائر مبہم ہونے
کی وجہ سے معشوق کا تعین مرد سے کر دیا ہوا اور چونکہ شاعر مرد ہی ہوتے تھے اس لئے انھیں کے کلام سے اظہار عشق
عاشق ومعشوق دونوں کے واسطے تعین مرد کا باعث ہوا ہو۔ جس طرح مرد کا ہمیشہ عاشق ہونا بمشکل ثابت ہو سکتا ہے
اسی طرح عورت کا ہمیشہ معشوق نہ ہونا بھی بمشکل پایۂ ثبوت تک پہونچ سکتا ہے۔ ضمائر کا ایک ہونا دلالت کرتا ہے کہ جو ضمائر عاشق
کو مرد ثابت کرتی ہیں وہ عورت کو بھی بخوبی ثابت کرتی ہیں اور جو مرد کو معشوق ثابت کرتی ہیں وہ بدرجۂ اولے عورت کو بھی
کرتی ہیں جس پر اعتراض کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ رہا شعرا کے ذاتی حالات سے بحث کرنا تو وہ شاعری کی حیثیت سے
خارج از بحث ہے اور اس بارہ میں دنیا کا کوئی خطہ بھی بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شاعر کیسا ہی زاہد خشک پارسا و متقی
ہو جذبات کو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ خود عاشق ہے۔ عرب ویورپ کا شاعر عورت کا عاشق ہوتا ہے گویا حسن لطیف اور قابل کشش
ہستی [illegible] عورت کی تسلیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے خلاف مرد بھی عورتوں کے معشوق ہوتے ہیں لیکن اصطلاح شاعری
عمومیت وکثرت کے اعتبار سے قرار دی جاتی ہے۔ ایران کا شاعر مرد کا عاشق ہوتا ہے اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ کلیتہً
مرد ہی عاشق اور مرد ہی معشوق ہوتے ہیں۔ عورت کو اس سے تعلق ہی نہیں تو یہ قطعاً محال ہے۔ اب رہا ہندی کا شاعر
وہ مرد ہو کر عاشقی کے واسطے عورت کا بھیس بدلتا ہے اور مرد کو معشوق قرار دیتا ہے جو فارسی شاعری کا سنگ بنیاد ہے۔

دراصل ہندی شاعری ایک حد تک قابل غور ہے جس میں تمام دنیا کے اصول فطرت و تمدن کے خلاف عورت نے مرد کو محبوب قرار دیا ہے۔ گویا تعشق اور شہوت رانی میں عورت مرد پر گوئے سبقت لے گئی ہے۔ اور اس نے اپنے قدرتی سرمایۂ حیا و شرم کو مرد کے حسن کی بھینٹ چڑھا کر جوہر نسائیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ نیز اس اصول سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ گویا مرد کے دل میں عشق ہوتا ہی نہیں ہے اور قطعاً خلاف فطرت ہے۔

میرا مقصود کسی زبان یا قوم پر اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہر زبان میں اصطلاحات و مفروضات شاعری کسی اخلاقی و رسمی تحریک پر مبنی ہوتے ہیں اور بعد رواج متاخرین کے واسطے دستور العمل قرار پاتے ہیں جس کو نفع و ضرر نتیجہ و غرض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہی اختلافات مسلمات شاعری ہی اس کے باعث ہیں کہ حضرت امیر خسرو کو بار بار تذکیر و تانیث کے لباس تبدیل کرنے پڑے ہیں۔

جذبات شاعری سے مقصود صرف تحریک عشق ہوتی ہے جس کا مادہ ہر مرد اور عورت کے دل میں قدرتی طور پر موجزن ہے۔ اور وہ اصطلاحات شاعری کا پابند نہیں۔ ایران کی شاعری کو جن مراحل سے سابقہ پڑا ہے اُس پر نظر کرتے ہوئے مورد طعن قرار نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ ضمائر تذکیر و تانیث کا ایک ہونا تعین میں مانع ہے۔ البتہ بجائے سنسکرت کے مرد کے امرد کا تعین ہونا قدرے قابل غور ہے۔ لیکن اس کے جواب مفصل عرض کر چکا ہوں اور ظاہر ہے کہ امرد بھی مرد ہی کی جنس ہے۔

اس نمبر میں اگرچہ عام شاعری پر بھی قدرے روشنی پڑ گئی لیکن مجھے صوفیائے کرام سے تعلق ہے۔ ان کے متعلق یہ بہت کافی ہے کہ اول تو کسی شاعر کے کلام سے اس کے اخلاق کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ ہزاروں متقی و پارسا بزم شاعری میں شراب و کباب کے ٹکڑے اڑاتے اور جام پر جام لنڈھاتے ہیں اور بے شمار پاکباز و دین دار شعر لکھتے وقت اعلیٰ درجہ کے شاہد باز بن جاتے ہیں۔ لیکن اصل میں ان امور سے قطعاً تعلق نہیں ہوتا وہ واردات قلب و جذبات عشق حقیقی کو ظاہر کرتے ہیں۔ زبان کی پابندی مصطلحات کی زنجیروں سے ایسا جکڑتے ہیں کہ ایک انچ آگے قدم نہیں بڑھا سکتے۔ مجبوراً عشق مجازی کے پیرایہ میں حقائق کو در پردہ پر لطف اور دل نشین طریقہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں جو اُن کا خاص جوہر ہے۔ اور کنایہ کا صراحت سے ابلغ ہونا مسلّم۔

اس لئے اُن کی شاعری سے امرد پرستی و شاہد بازی پر قطعاً استدلال نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس میں بھی شک نہیں

کہ بعض صوفیا کا میلان خاطر امردوں کی طرف ضرور پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت سعدیؒ کا حال گلستاں کے باب پنجم سے ظاہر ہے۔ لیکن یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ صوفیا کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے عیب ہو سالک کے لئے ایک زبردست ذریعۂ ترقی باطنی کا ہے اور وہ محض گرمی جذبات صادقہ کا باعث ہے۔ جہاں ہوا و ہوس کا کوئی خطرہ تک نہیں آسکتا۔ کیونکہ وہ ناپاک عشق بازی اور ہوا و ہوس کی سخت مذمت کرتے اور اپنی برأت ثابت کرتے ہیں۔ اور یہ منصب ہر شخص کو حاصل نہیں ہے۔ جن لوگوں کو نفس پر ایسی قدرتِ کاملہ حاصل ہو کہ حظِ نفس کا خیال و خطرہ تک دل میں نہ گزر سکے اور محض تحرک عشق اُن کی ترقی روحانی کا باعث ہو یہ اُن ہی کو مناسب ہو سکتا ہے نہ کہ ہر مقلد کو۔ غالب نے خوب کہا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کلامِ اصغر

غیر مطبوعہ

ذروں کا رقص مستی صہبائے عشق ہے
عالم رواں دواں بہ تقاضائے عشق ہے

ہر عشوۂ حجاب، طریق نمود حُسن
ہر حرف شوق پردۂ اخفائے عشق ہے

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محو بے خودی
کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام
سازِ خودی میں جوش نواہائے عشق ہے

اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے
کچھ یہ بھی طرفہ کاری سودائے عشق ہے

فِلوملا

دنیا کی ہر قوم کا مابہ الامتیاز کوئی نہ کوئی زبردست خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ سرسری نظر سے بھی ان خصوصیات کے خط و خال نہایت واضح اور نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ بطور مثال تدبر انگریزوں کے حصہ میں آیا۔ علم و حکمت کے خزانوں پر جرمنی نے قبضہ کیا، عمرانی زندگی (سوشل لائف) کے دعوے دار فرانسیسی سبنے اور احساس حسن کے لئے اطالوی ذکی الحس کہلائے گئے۔ اگر فرداً فرداً ان خصوصیات پر نظر تعمق ڈالی جائے تو ہمیں ان کے ماخذ کا پتہ چل جائے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس طرح ان خصوصیات کا نشو و نما ہوتا رہا ہے۔ اور کس طرح بعض خصوصیات ایک قوم سے دوسری قوم میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ صرف آخر الذکر پر غور کیجئے۔ یہ خصوصیت ان کی موروثی نہیں۔ بلکہ انھوں نے اس کو یونانیوں سے بطور غنیمت پایا ہے۔ حقیقی معنوں میں یونانی اور صرف قدیم یونانی ہی احساس حسن کے لئے نہایت ذکی اور سچے دعویدار تسلیم کئے گئے ہیں۔ قدرت نے اس قوم میں یہ خصوصیت ودیعت کی تھی۔ وہ دیکھتے تھے تو حُسن کو، سنتے تھے تو حُسن کو۔ اُن کا مطمح نظر اگر کوئی چیز تھی تو وہ صرف حسن تھا، اور تو اور اُن کا مذہب بھی حسن پرستی تھا۔ اُنھوں نے نہایت خوبصورت بت تراشے۔ اُن کی تعریفوں میں دلکش اور سامعہ نواز نغمے الاپے۔ اُنھوں نے اپنی ارد گرد کی کسی خوبصورت شے کو نظر انداز نہیں کیا، اُن کا ادب (لٹریچر) لطیف چیزوں، خیالی مگر نازک کاوشوں کا مجموعہ دلنواز ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا عنوان سے میاتھیو آرنلڈ نے ایک دلگداز اور جانسوز نظم لکھی ہے جس کا ماخذ ہی یونانی ادب ہے۔ قبل اس کے کہ نظم کو ترجمہ کا جامہ پہنایا جائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قصے کی نہایت مختصر طور پر تشریح کر دی جائے جس سے یہ واضح ہو کہ اس صنف میں یونانیوں کی سعی کس حد تک حسن کی منت کش ہے:-

"فلوملا، شاہ اٹیکا (پیانڈیم) کی خوبصورت لڑکی اور پراکنی کی بہن تھی۔ پراکنی شاہِ تھریس (ٹیریس) کے رشتۂ ازدواج

میں منسلک تھی، فلوملا کے حسن عالم سوز نے ٹیریس کے زہد کو ایک نظر میں خاکستر کو دیا۔ جذبات میں تموج اور خیالات میں ہیجان ہوا۔ پائے دل نے لغزش کھائی اور اپنے ناپاک جذبات کے سنگ لبستہ فرش پر اس فرشتۂ حسن وجمال کے درِ عصمت کو چورچور کیا۔ مگر اُف رے سنگ دلی کہ ظالم نے بدنامی کے خیال سے بیچاری کی زبان قطع کر دی تاکہ یہ سیاہ کاری طشت از بام نہ ہو جائے۔ لیکن مجبور اور دل شکستہ فلوملا نے اپنی شرمناک اور دردبھری کہانی کا اظہار کشیدہ کی صورت میں ایک پارچہ پر کیا اور اپنی بہن کو دکھایا، پراکنی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، پاؤں کے تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک برچھی تھی کہ دل کے پار ہو گئی۔ رگ حمیت جوش میں آئی اور عالم غیظ وغضب میں اپنی خاص لخت جگر اٹی لس کو جو دونوں کا ثمرۂ محبت تھا ذبح کر کے اپنے بدکردار شوہر کو اس کا گوشت کھلایا اور اس طرح دیوانہ وار اپنی بہن کا انتقام لینے کی کوشش کی۔ افشائے راز اور پھر اس کی سنگین سزا کے خیال سے یہ دونوں بدنصیب بہنیں فرار ہوئیں۔ لیکن ظالم ٹریس ان کے تعاقب سے کب چوکتا تھا آخر کار انھیں گرفتار کر ہی لیا۔ مگر کارخانۂ قدرت میں نظم ونسق کرنے والے دیوتاؤں نے اس شرمناک قصہ کا خاتمہ کرنے کے لئے ان تینوں کو پرندوں کی شکلوں میں مبدل کر دیا، ٹریس باز بنا، پراکنی ابابیل اور فلوملا بلبل"

ترجمہ نظم انگریزی

سنو! آہ، اُس بلبل، اُس نازک گردن والی بلبل کے نالہائے دل شکن کو!

سنو! اس درخت دیودار سے جس پر چاند نے اپنی نورانی چادر اُڑھائی ہے۔ کیسی روح فرسا! سنو۔ کیسی اندوہناک صدا آ رہی ہے۔

او سواحل یونان کے سیاح دلبیل، کیا اب تک بھی۔ اس قدر مدت مدید کے بعد، اس دور دراز سرزمین میں تو اپنے منتشر دماغ میں اُس وحشیانی، مواخذہ شدنی، گھرے جمے ہوئے غم کی پرورش کر رہا ہے۔ ہاں! تو کیا یہ زخم ناقابل مداومت ہے؟

کیا یہ عنبر بیز مرغزار اپنے ہرے بھرے درختوں کی روشوں سے؟ رات اپنے سکون سے، اور یہ پُرامن ٹیمز اپنی میٹھی لوریوں سے۔ چاند اپنے شفاف اور ملائم نور سے اور شبنم اپنی ٹھنڈک سے تیرے ٹھکرائے ہوئے دماغ اور تیر سے زخم خوردہ دل کو کوئی آرام کوئی تسکین نہیں پہونچا سکتی؟ کیا تو آج کی رات یہاں اس شفاف چاندنی میں

س انگلستانی سبزہ زار پر، اُس دشمنِ ناموس کے محل کو بیابان تھریس میں کھڑی ہوئی دیکھ رہی ہے۔

کیا تو پھر تمتمائے ہوئے گال اور سرخ آنکھوں سے اس صاف کشیدہ کی عبارت کا اور اپنی بے زبان بہن فلوملا، کی کتاب شرم کا مطالعہ کر رہی ہے ؟

او غریب خانماں برباد کیا تو پھر اپنے اس فرار ہونے کو یاد کر رہی ہے۔ کیا تو پھر اپنی تبدیلی ہیئت کو محسوس کر رہی ہے۔ کیا پھر سنسان ڈالیں اور سب ہسپین کی مرتفع وادی تیری محبت انگیز، نفرت آمیز، مسرت خیز اور دلدوز ناموں کی صدائے بازگشت سے گونج اُٹھے گی ؟

سُن، یوجینیا ـــــ اس درخت کے گنجان پتوں سے اس کی دردناک آواز کس طرح پھٹ پڑ رہی ہے۔

ہاں، پھر ـــــ تو سن رہی ہے۔

اُف! دائمی جذبۂ غم !

دائمی درد والم !

محمد ابراہیم متعلم ایم ایس سی

محسوساتِ کیف

از جناب متین الحق صاحب صدیقی کیفؔ مرادآبادی

جہاں بھی حسن جہاں سوز نے کی جلوہ گری — وہاں نہ گریۂ شب تھا نہ نالۂ سحری

ہجومِ شوق میں تکمیل عشق ممکن ہے — مگر جو ہوش میں رہنے دے فطرتِ بشری

وفا کا راز کسی نا تو اس سے چھپ نہ سکا — "جفائے خاص" نے کی اس طرح سے پردہ دری

نگاہِ ناز کہیں دھوکے میں نہ آجانا — کمالِ ہوش ہی میرا کمالِ بے خبری

بدل نہ دے کہیں اک دن نظامِ عالم کو — تری یہ ہوش ربائی مری یہ بے خبری

اُٹھا دے پردۂ مقصد کو بے خودیِ شوق — کہاں یہ جوشِ عمل اور کہاں یہ دردِ سری

فضائے حسن کا ہر ذرہ ہو گیا بے تاب — نکل گئی جو کبھی ایک آہ درد بھری

میں کھول دیتا تمناؤں کی حقیقت کو — جو چین لینے ذرا دیتی تیری فتنہ گری

دیارِ حسن میں اک ذرۂ خاک کا ہو گا

چلا ہے شعلہ بداماں جو نالۂ سحری

امرؤالقیس اور شاعری

مولوی عبدالباقی صاحب ام اے ال ال بی (علیگ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

کثیر عزہ نے اپنی معشوقہ کی تعریف میں کہا ہے۔

وماروضۃ بالحسن طیبۃ الثری　　یمج الندی جنجا نہا و عرارھا

بالطیب من اردان عزۃ موھنا　　اذا اوقدت بالجمر الان نارھا

ان ابیات کو ایک بوڑھیا نے سنا تو کثیر سے کہا کہ شاعر ہو مگر شعر کہنے کا ڈھنگ نہیں ہے۔ خوشبو کے لئے معشوقہ کی آستینیں جلاتے ہو۔ شعر ایسا کہو جیسا تمہارے پیش رو امرؤالقیس نے کہا ہے۔ بوڑھیا نے امرؤالقیس کا گزشتہ شعر پڑھا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ عرب کے بے شمار شعر و شعراء میں سے بوڑھیا کی زبان پر امرؤالقیس ہی کا نام آیا۔

۵۔ عورتوں کو ہرن اور انڈے کے ساتھ پہلے پہل امرؤالقیس نے تشبیہ دی ہے اور شعراء ما بعد نے اُس کی اقتدا کی ہے۔ امرؤالقیس کا شعر ہے۔

وبیضۃ خدر لا یرام خباؤہا　　تمتعت من لہو بہا غیر معجل

لیالی سلمی اذ تریک منصبا　　وجید اکجید الریم لیس بمعطال

طرفہ جو ایام جاہلیت کا ایک مشہور اور ممتاز شاعر ہے اسی مضمون کو ادا کرتا ہے اس کا شعر ہے۔

وفی الحی احوی ینفض المرد شادن　　مظاہر سمطی لولوء و زبرجد

خذول تراعی ربربا بالخمیلۃ　　تناول اطراف البریر و ترتدی

اس میں شبہ نہیں کہ طرفہ نے نہایت ہی غضب کا شعر کہا ہے۔ مگر سلاست اور لطافت خیال قطعاً طرفہ کے شعر میں نمایاں نہیں ہے جو امرء القیس کے شعر سے ٹپک رہی ہے۔ دونوں میں یہی فرق ہے کہ ایک سے حسرت مفارقت اور شوق دیدار اور تمنائے معاودت کی بو آ رہی ہے۔ اور طرفہ نے ایک تصویر پیش کر دی ہے جو بذات خود آراستہ۔ جو اظہار عشق اور شاعرانہ جذبہ امرء القیس کے سادے الفاظ میں ہے اس کا طرفہ کے شعر میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ الفاظ لہ ما لی ترینک منصبا۔ جسدا۔ و معطال میں عجب عمدہ جذبات کو امرء القیس نے ادا کیا ہے۔

(۶) یہ بھی امرء القیس کی ایجاد ہے۔ گھوڑے کو عقاب کے ساتھ اور عصا کے ساتھ ابتداءً امرء القیس نے تشبیہ دی ہے۔ شعراء مابعد نے امرء القیس کی اقتدا کی ہے اور امرؤ القیس کی بنیاد پر کم و بیش تصرف کر کے عمارت قائم کی ہے

امرء القیس کا قول ہے۔ کانی بفتخاء الجناحین لقوۃ

اور دوسرے مقام پر کہا ہے۔

بعجلزۃ قد اترز الجری لحمہا   کمیت کانہا ہراوۃ منوال

متنبی نے اس معنی کو یوں ادا کیا ہے۔

وھن مع المنیان فی الجرعوم   وھن مع العقبان حوّم

ایک مقام پر معلقہ میں گھوڑے کی تعریف میں قید الاوابد استعمال کیا ہے اور اس خیال کا امرؤ القیس ہی موجد ہے۔ شعراء سلف میں تلاش کیجئے تو اس کا پتہ کہیں نہیں چلتا۔ شعراء مابعد میں اس خیال کو اکثر شعراء نے باندھا ہے۔ اس لفظ کی لطافت کا یوں ہی پتہ چلتا ہے کہ امرؤ القیس نے اس لفظ کو اپنے مختلف قصیدوں میں دوہرایا ہے۔

(۷) امرؤ القیس نے قصیدہ کے دو حصے کئے۔ ایک تشبیب اور دوسرا وہ حصہ جس میں شاعر اپنے اصلی مقصود کو ادا کرتا ہے۔ امرؤ القیس کے پہلے یہ دونوں حصے جدا اور ممتاز نہیں تھے۔ امرؤ القیس نے دونوں کو جدا کر دیا اور یہ طرز ایسا مقبول ہوا کہ متاخرین نے بالاتفاق اس طرز قصیدہ کو اختیار کر لیا۔ یا یوں کہئے کہ امرؤ القیس نے موجودہ طرز قصیدہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ اور مضمون اور بندش کے لحاظ سے اسے کمال تک پہونچا دیا۔ خود امرؤ القیس کے معاصر شعراء ہی امرؤ القیس کی اقتدا پر مجبور ہو گئے۔ امرؤ القیس کے بڑے قصیدوں میں یہ صورت بہت ہی نمایاں ہے۔

(۸) ایک خاص بات امرؤ القیس سے بدیہی نمایاں ہے کہ جس چیز کے اوصاف کو اختیار کرتا ہے وہ واضح ترین وصف

ہوتا ہے۔کسی چیز کے محض اوصاف کو شعر میں ذکر کرنا جس سے جذبات یکایک متاثر نہوں شعر کے لئے مضر ہے۔ شعر کی بڑی خوبی ایک یہ بھی ہو کہ براہ راست اور فوراً وہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔ اگر شعر میں یہ بات نہ ہو تو وہ معیار فصاحت سے گر جائے گا۔ جس قدر سریع التاثیر اور واضح مضمون شعر کے اندر ہوگا اسی قدر شعر میں رونق اور لطافت پیدا ہوگی۔ اسی وجہ سے ناقدین نے امرؤالقیس کے اس شعر کو ناقص بتایا ہے۔

اذا اقبلت قلت دباءة   من الخضر مغموسة فی الغدر

وان ادبرت قلت اثفیتہ   ململمة لیس فیھا اثر

کیونکہ ان دو شعروں سے دباءۃ اور ململمة کا جو واضح پہلو ہے وہ نمایاں نہیں ہوتا تشبیہ نہایت روکی اور بے لطف ہو جاتی ہے بخلاف اس کے امرؤالقیس کا یہ شعر لیجئے۔

اقر حشا امرء القیس بن حجر   بنو تیم مصابیح الظلام

اس میں ہر چیز واضح اور ہر پہلو سریع الاثر ہے۔ امرؤالقیس کے کلام میں اگر کل بڑھ جائے تو یہ وصف بہت زیادہ غالب آپ کو ملے گا۔ اگر شعراء ما قبل کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امرؤالقیس سے کس قدر پیچھے یہ لوگ تھے۔ عموماً ٹھوس الفاظ اور بطئی الاثر مفہوم شعروں میں ادا ہوئے ہیں مگر امرؤالقیس کے وقت زیادہ شاعری میں پیدا ہو گیا اور سادگی بے لطفی کی جگہ پر ترکیب کی چستی الفاظ کی شوکت اور فرسات سے قرب شاعری میں پیدا ہو گیا۔ غرض شاعری کا جو جزو اعظم تھا وہ امرؤالقیس کے عہد میں مرتبۂ کمال کو پہونچ گیا۔

(۹) دنیا کا کوئی خطہ میدانِ شعر میں غالباً عربوں سے آگے نہ ہوگا۔ عربی زبان کی خصوصیت اور طرز معاشرت دونوں شاعری کے لئے معاون تھے اور جس کثرت سے عرب نے شعرا پیدا کئے شاید دنیا کی کسی قوم میں اس کا جواب نہیں ہے۔ ہر خاندان میں ضرور ایک مشہور شاعر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے شعرا ہوتے تھے عرب کا ہر حصہ اور ہر بستی اس سے معمور تھی۔ اور عربوں میں عموماً شعر بلا غور کے کہے جاتے تھے۔ ہر وقتی ضرورت پر کوئی شاعر مجمع میں کھڑا ہو جاتا اور فوراً حال کے موافق پورا قصیدہ کہہ جاتا۔ جو لوگ سیرت سے واقف ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ بنو تمیم کا جب وفد آیا تھا تو حضرت حسان بلائے گئے اور بغیر انتظار بنو تمیم کے شاعر کا ایک بڑے زور دار قصیدے میں جواب دیا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

بنو دارم لا تفخروا ان فخركم　　یعود وبالا عند ذکر المکارم

عربوں کی تاریخ میں اس قسم کے ہزاروں لطیف واقعہ ہیں۔ مگر یہ بھی واضح رہے کہ جو قصیدہ فی البدیہہ وقتی ضروریات کے لئے نکلے گا اس میں بعض رکیک بندشیں بھی آجائیں گی۔ اور جب تک کسی قصیدے میں بار ہا غور کرنے کی نوبت نہ آوے وہ بمشکل تمام بلاغت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ امرؤ القیس نے اسی وجہ سے ایک مقام پر یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح مضامین کی کثرت اور قوافی کا ورود اس پر ہوتا ہے مگر وہ ہر ایک مضمون کو نہیں لے لیتا بلکہ اُن میں سے جو مضمون مناسب پھڑکتا ہوا ہوتا ہے اُس کو منتخب کر لیتا ہے۔ اس سانحہ کو بھی خوب لفظوں میں ادا کیا ہے۔ لکھتا ہے۔

اذود القوافی عنی ذیادا　　ذیاد غلام جری جرادا

فلما کثرن وعنینہ　　تخیر منھن ستا جیادا

فاعزل مرجانہا جانبا　　واخذ من درھا المستجادا

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ امرؤ القیس فی البدیہہ شعر کہنے سے قاصر تھا۔ بلکہ اُس کے سوانح کو اٹھا کر غور سے پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ جہاں اس کو فوراً شعر کہنے کی ضرورت ہوئی ہے وہاں بھی لطافت اور نازک خیالی قائم رہی ہے۔ جب عامر آعور اجلی نے امرؤ القیس کو حجر کے قتل کی خبر دی ہے تو بلا تامل یہ اشعار اُس کی زبان پر آ گئے۔

تطاول اللیل علی دمون　　دمون انا معشر لیانون

وانا لاھلنا محبون

خلیلی لا فی الیوم مصحی لشارب　　ولا فی غد اذ ذاک ما کان یشرب

جب رات ہوئی تو ایک افق پر بدلی ظاہر ہوئی اور بجلی کی چمک پہاڑ کی چوٹی سے بار بار نظر آتی تھی امرؤ القیس پر اس کا اثر غالب تھا۔ اور دشمنوں سے بدلا لینے کے خیال میں غرق تھا تاہم بدلی کی چمک دیکھ کر اُسے صبر نہ آیا اور فی البدیہہ یہ اشعار کہے۔

ارقت لبرق بلیل اھلّ　　یضئ سناہ باعلی الجبل

انانی حدیث فکنا بتہ　　بامر تزعزع منہ القلل
لقتل بنی اسد ربھم　　الا کل شی سواہ جلل
فاین ربیعۃ عن ربھا　　واین تمیم واین الخول
الا یحضرون لدی بابہ　　کما یحضرون اذا ما اکل

ان تمام اشعار میں غضب کی لطافت اور چستی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ امرؤالقیس کس درجہ قادرالکلام

غزل

از مولوی محمد مظہر جمیل صاحب شوق

مے میں کیا رنگ نہ تھا مست میں کیا ہوش نہ تھا　　کل تو دیکھا تھا کہ یوں میکدہ خاموش نہ تھا
آپ فرماتے تھے کیا رات جناب واعظ　　میکدہ میں تو مجھے جاں کا بھی ہوش نہ تھا
شیخ میخانہ سے خالی پھرے قسمت اُن کی　　بزم ساقی نہ تھی یا بادہ سر جوش نہ تھا
واعظا کفر تھا برسات میں مے سے پرہیز　　ابر رحمت کو سمجھتا کہ خطا پوش نہ تھا
میرے ہی واسطے تھا نشۂ صہبائے الست　　ہاں وہاں مجھ سا کوئی اور بلا نوش نہ تھا
دیکھنے والے مجھے دیکھ کے حیراں کیوں ہیں　　محو نظارہ تھا میں بزم میں خاموش نہ تھا
تھا خطِ حسن پہ لکھا ہوا عنوانِ جمال　　ربطِ تحریر ہے کیا؟ اُس کا مجھے ہوش نہ تھا
چھیڑ کر مجھ کو لیا یادِ وطن کیا تو نے؟　　رخصتِ آوارگی کب میرا سرِ دوش نہ تھا
جلوۂ حسنِ بتاں رنگتِ گل۔ شام و سحر　　لاکھ پردوں میں بھی دیکھا تو وہ روپوش نہ تھا
دلِ صد داغ نے کھوئی مری تاریکی قبر　　شعلۂ عشق پسِ مرگ سیہ پوش نہ تھا
میرے اک جام پہ کیوں طعنۂ احباب ہے آج　　کونسا دن تھا کہ میں میکدہ بردوش نہ تھا

کیا تعجب ہے اگر کنجِ لحد ڈھونڈھ لیا
کیا دلِ شوق تصور سے ہم آغوش نہ تھا

حیات

شاہ سلیمان کے جواہرات کی کان کی تلاش

سر رائیڈر ہیگرڈ (Sir Ridder Haggard) نے مشہور ناول کنگ سالومن مائنز (King Solomon mines) میں ایک جگہ یہ سین دکھاتا ہے کہ سر ہنری (Sir Henry) اور اس کے دیگر ہمراہی جن میں افریقہ کے چند جنگلی آدمی بھی راہ بری کی غرض سے شامل تھے اور شاہ سلیمان کے گم شدہ خزانے کی تلاش میں نکلے تھے چلتے چلتے راستہ کی صعوبتوں۔ صحراؤں کی ناقابل برداشت دھوپ۔ شیبا زبرسٹ (Shebas breast) کی برفستانی چوٹیوں کی ٹھنڈک کہ جو خون کو رگوں میں منجمد کئے دیتی تھی۔ ان سب کو دو ایک راتیں جب کہ برف گر رہا تھا اور تمام تھرمامیٹر یخ ہو گئے تھے۔ ایک نیکرے پر رہ کر گزارنا پڑی تھیں۔ ایک ساتھی دوسرے سے لپٹ کر اس طرح لیٹا تھا کہ گویا سردی کو روئی سے نہیں بلکہ دوئی سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ غرض اس طرح خدا خدا کرکے ایک رات کاٹی گئی۔ صبح جس وقت آشیانۂ مشرق سے خورشید جہاں تاب نے منہ نکالا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ باریک و نازک کرنوں میں اک ایسا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا کہ خود قرصِ خورشید کو لرزہ چڑھ آیا۔ بے ساختہ اس بیان کو پڑھتے ہی میری زبان سے حالی کا یہ شعر نکل گیا۔

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

جب خود سورج کی یہ حالت تھی تو ظاہر ہے کہ اس کی تمازت کتنی ہوگی۔ دوپہر کے قریب جب گرمی کا کچھ اثر غالب آچلا اور رفتہ رفتہ کافی گرمی ہو گئی سوتے ہوئے برف کے پہاڑوں نے پگھل پگھل کر کروٹیں لینا شروع کیں کہیں برفستانی طیور نے نغمہ سرائی کی کسی پہاڑی کھوہ سے سفید ریچھ و جنگلی بھیڑیوں کے چیخنے و غرغرانے کی آواز آئی۔ تو معلوم ہوا کہ

بے شک اب صبح ہوئی۔ روشنی پھیلی تھی مگر سناٹے کی وجہ سے یہ تھکے ماندے مسافروں کے چڑھنے کا اندازہ نہ کر سکے تھے جلقوں میں یوں ہی کانٹے پڑے تھے۔ ہاتھ پیر اینٹھے۔ نتھنے بند۔ بمشکل سانس لے پاتے تھے۔ دو روز کے فاقہ کرنے سے جسم میں اتنی سکت تک باقی نہ تھی کہ آسانی سے ہل سکتے۔ چار ناچار ایک نے دوسرے کو آواز دی۔ گویا اس دنیا میں بیداری ہو گئی۔ اور ایک ایک کرکے چار ساتھی بولے مگر پانچواں نہ بولا۔ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس پر یہ لوگ بہت خوف زدہ ہوئے اور اس استعجابی حالت میں قوتِ ارادی سے پورا کام لے کر یکبارگی سب ساتھی کھڑے ہوئے۔ اب دیکھتے کیا ہیں کہ ان کا ایک رفیق راہ برمجسّم برف کا پتلا بنا رکھا ہے۔ اور تھوڑی دور اس سے ایک انگریز جو کبھی کا آیا ہوا تھا قدرتی پہاڑی ڈرائنگ روم کی سیمٹری قایم رکھنے کے لئے جوڑ پر اسٹیچو بنا ہوا تھا۔

ایسے خوفناک منظر کو دیکھ کر باقی ساتھی اپنی جان لے کر اس ٹیکرے سے بھاگے اور سیدھی سلیمان روڈ کی راہ لی۔ آٹھ دس میل نیچے اُترنے کے بعد سردی میں کمی ہوئی اور ان سب نے دم لیا۔ اس وقت سرہنری نے اپنے راہ بر زولو (Zulu) جس کا نام امیوپا (Umbopa) تھا دریافت کیا کہ اس کو یہ پتہ کس طرح سے چلا کہ وہ دوسرا مردہ جس کو اُس نے دیکھا تھا انگریز تھا امیوپا نے جواب دیا کہ اس مردہ کے چہرے کا نقشہ اس کی آنکھیں اور ڈاڑھی مثل تیرے تھیں ...... غالباً اس کا نام "جم" صاحب تھا۔ (Jim)

سرہنری :- بے شک اس میں کوئی شک نہیں ضرور وہ جم ہوگا .. میرا بھائی! میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ بخدا ایسا ہی آدمی تھا۔ جب کبھی وہ کسی بات کی اپنے دل میں ٹھان لیتا تو اس کو کر ہی کے چھوڑتا تھا بچپن ہی سے اس کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی۔ اگر اس نے سلیمان برگ کو پار کرنے کا ارادہ کیا ہوگا تو ضرور کر لیا ہوگا۔ بشرطیکہ کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ کم سے کم ہم کو اس کی تحقیق کرنی چاہیئے۔ اس لئے پہاڑ کی دوسری جانب ڈھونڈنا چاہیئے ممکن ہے کہ کوئی علامت آنے کی معلوم ہو۔

امیوپا :- انکیوبو (Incubu) (میرے بڑے قد و قامت کی رعایت سے اس نے دلار میں میرا یہ نام رکھ چھوڑا تھا) اس کا راستہ تو بہت دور و دشوار گزار ہے۔

سرہنری نے جواب دیا۔ "بے شک دور تو ہے۔ اور بے حد زحمت ہوگی۔ لیکن اس دنیا میں کوئی ایسا سفر

نہیں جو آدمی نہ کر سکے بشرطیکہ اس کے پورا کرنے کا وہ عزم کرلے۔ اے امبوپا! یقین مان کہ کوئی کام ایسا نہیں جو آدمی نہ کر سکتا ہو۔ کوئی پہاڑ ایسا نہیں جس پر وہ نہ چڑھ سکتا ہو۔ کوئی صحرا ایسا نہیں جس کو نہ طے کر سکے۔ سوائے اس ایک پہاڑ اور ریگستان کے جس کا علم انسان کو نہیں دیا گیا۔ تاہم اگر شوق اس کا شمع ہدایت بن جائے اور وہ اپنی جان کو ہتھیلی پر لئے پھرے کہ جس جگہ بھی جائے گا یا تو زندہ ہی رہے گا یا مر جائے گا۔ اور بس اس طرح سے اپنے آپ کو قسمت کے سپرد کرلے۔

امبوپا بولا۔ بڑی بات۔ باپ رے باپ۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بھلا میری کہاں مجال جو میں کچھ کہوں۔ انکیوبو فی الواقع تو جو کچھ کہتا ہے بہت ٹھیک ہے۔ مگر سن "حیات" یعنی زندگی کس کو کہتے ہیں۔ یہ ایک پر ہے۔ یہ اس گھاس کا تخم ہے جو ادھر سے ادھر ہوا کے ہر جھونکے میں ہلتی رہتی ہے۔ بعض وقت خود جمع ہوتے ہوتے اسی دریان میں فنا ہو جاتی ہے۔ اور بسا اوقات آسمان کی جانب اڑ کر غائب ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر یہ تخم اچھا اور وزنی ہوتا ہے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اتفاق سے تھوڑا سا راستہ منزل حیات میں اپنی مرضی کے مطابق بھی طے کرلے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کچھ دور اپنی بھی راہ چل لے اور قدرت سے مقابلہ کرلے۔

موت تو انسان کے لئے برحق ہے (كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ) زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ تھوڑا پہلے مرنا ہو گا۔ پس سن لے میں تیرے ساتھ صحرا نوردی کرنے پر تیار ہوں۔ اور ہر پہاڑ پر چڑھوں گا جب تک کہ خدانخواستہ میں دھوکے سے راہ میں کہیں پر پھسل کر نیچے غار میں نہ گر جاؤں۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے تھوڑا توقف کیا اور پھر اپنی پرجوش تقریر کا سلسلہ جاری کر دیا۔ جیسی عموماً زولو (سلسلہ) کی عادت تھی۔ اگرچہ اس میں وہ بہت کچھ بے معنی باتیں دہراتے جاتے۔ تاہم اس سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ جنگلی قوم بھی شاعرانہ جذبات و اعلیٰ ذہنی خیالات سے محروم نہیں۔

"زندگی کیا چیز ہے" اے سفید لوگو تم کہ جو دانشمند ہو۔ کہ جو دنیا کے رازہائے سربستہ سے۔ ستاروں بھری دنیا سے اور اس دنیا سے جو ستاروں سے اوپر اور ان کے اردگرد ہیں واقف ہو۔ تم کہ جو بلا چیخے دور سے اپنی باتیں ایک دوسرے سے کہتے ہو (اشارہ ٹیلیفون کی طرف ہے) مجھ کو بتاؤ۔ اے سفید انسانو! کہ ہماری زندگی

کا راز کیا ہے۔ وہ کہاں چلی جاتی ہے۔ اور وہ کہاں سے آتی ہے"!

(تھوڑا انتظار کرنے کے بعد)

نہیں تم میرے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ تم خود نہیں جانتے۔ سنو! میں جواب دیتا ہوں۔ ہم سب تاریکی سے یہاں آئے ہیں۔ تاریکی ہی میں ہم واپس جائیں گے۔ ہم مثل اس پرندے کے ہیں جو شب کو طوفان میں پریشان کیا گیا ہو "نیست سے ہست" کی طرف اُڑ کر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ہمارے بازو روشنی میں چمکتے دکھائی پڑتے ہیں۔ بس! پھر دفعتہً ہم نیست کی جانب لوٹ جاتے ہیں۔ زیست کچھ نہیں (زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہم کو نہیں معلوم کہ ہم کب تک زندہ رہیں گے کب مر جائیں گے۔ ایک لمحہ پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا) مگر پھر بھی تو قیامت بھی کوئی چیز ہے۔ یہی وہ زبردست ہاتھ ہے کہ جس سے ہم "موت" کو روکے رہتے ہیں!!

یہ ایک جگنو کے مانند ہے کہ جو شب کے وقت چمکتا ہے اور صبح کو صرف سیاہ کیڑا نظر آتا ہے۔

یہ مویشیوں کی وہ گرم سانس ہے کہ جو وہ سردیوں میں لیتے ہیں (جنگلی دماغوں کی تشبیہیں و استعارے قدرتی ہی اشیاء سے لئے جاتے ہیں مگر اس بھونڈے پن میں ان کی سچی و جذباتی شاعری مضمر ہے۔ جو انتہائی نیچرل شاعری کہی جا سکتی ہے)

یہ وہ ذرا سا سایہ ہے کہ جو باریک سی گھاس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور پھر آفتاب کے غروب ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتا ہے۔

سر نہری نے کہا۔ "تم عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو"۔

امبا پا ہنسا اور کہنے لگا۔ "آئیے ان کو تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں (جسم و قد و قامت میں برابر تھے ہی) اور اسی طرح پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی مثل بھلارے کسی بھائی (ہم خیال) کی تلاش میں ہوں"۔

مظہر علی علوی

بی اے (علیگ)

مصر کا مینارِ اعظم

ملکہ ہٹیفرس کا مقبرہ

از جناب حفیظ الدین صاحب ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ دہلی
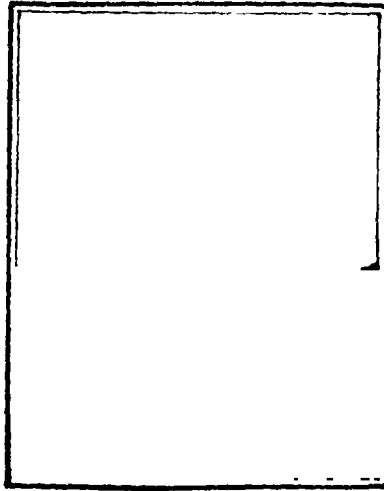
مصر کا مینارِ اعظم

مصر میں نمبر ۵ کا سب سے بڑا مینار اپنی قدامت اور عظمت کے لحاظ سے ایک ایسی عمارت ہی کہ اسے بجا طور پر ہفت عجائبات دنیا میں اول نمبر دیا گیا ہی۔ اس مینار کو آج سے پانچ ہزار سال قبل فرعون چیوپس نے تعمیر کرایا تھا۔ اور یقیناً اس سے زیادہ مضبوط مکمل اور عالی شان عمارت اب تک کوئی عہد پیش نہیں کر سکا۔ یہ مینار ۴۵۰ فٹ بلند اور قاعدے پر ۷۶۴ فٹ طویل ہی۔ اس کا کُل حجم اسی کروڑ نوے لاکھ (۸۰۹۰۰۰۰۰) مکعب فٹ سے زیادہ ہی۔ اور جو مصالحہ از قسم پتھر وغیرہ اس پر صرف ہوا اُس کے وزن کا تخمینہ ۶۸۴۰۰۰۰ ٹن کیا گیا ہے۔

سب چیزیں اندر سے بالکل کھوکھلی ہوگئی ہیں اور کھجوری ستون تو اس قدر خالی ہوگئے ہیں کہ اُن میں پھولوں کے برابر بھی
ن باقی نہیں رہا۔ ان کے علاوہ پچاس اوزار بھی ملے ہیں جن میں چھ تو ٹھوس سونے کے ہیں۔ پندرہ تانبے
، اور باقی چقماق کے بنے ہوئے ہیں۔ تانبے کے اوزاروں میں پانچ ایسے اوزار ہیں جو ٹھمر گھڑنے کے کام آتے
ں۔ ایک دروازے کے قریب کواڑوں کے مربع چوبی تختے بھی ہاتھ آئے جن پر سنہری چوکھٹے چڑھے ہیں۔ اُن پر
یب و غریب طلائی پھول بھی بنے ہوئے ہیں اور جڑاؤ کا کام ہوا ہے۔

ملکہ کی تابوت پر ایک وسیع شامیانہ بھی لگا ہوا ملا۔ یہ شامیانہ ایک چوبی ارگرٹے پر آویزاں تھا جو بجائے خود
عجیب چیز ہے۔ ارگرٹے کے تمام جوڑوں اور سوراخوں پر تانبا چڑھا ہے۔ گوشوں پر جو اوپر کو اُٹھے ہوئے حصے
ں اُن کو تانبے کی ایک سلاخ کے ذریعے ملا دیا گیا ہے جس میں لکڑی کی پٹیاں اور گھنڈی دار سوئیاں لگی ہیں۔
رگرٹے میں پردوں کے لٹکانے کے لئے تانبے کے قلابے بھی مہیا کئے گئے ہیں جن کو شہتیروں میں جڑ دیا گیا ہے۔

مزید براں۔ ایک بڑا پلنگ ایک کرسی دار پالکی۔ اور دو آرام کرسیاں بھی وہاں پائی گئیں۔ کرسیوں پر
روں کے نیچے خوشنما پھول بنے ہیں اور اوپر سر لگانے کے لئے ایک ایک سرہانہ بھی لگا ہے۔ ان سب چیزوں
سونے کے نہایت خوبصورت چوکھٹے جڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے عصا اور جواہرات رکھنے کی صندوقچیاں
، ہاتھ آئیں۔ جنوبی دیوار کے ساتھ سنی کے بنے ہوئے پانچ صندوق بھی رکھے ہوئے پائے گئے جن کی سنی
یب قریب بالکل ضائع ہو چکی تھی۔

علاوہ ازیں تانبے کا ایک ٹونٹی دار لوٹا۔ سونے کے تین گلاس سنگِ جراحت کے ۲۵ پیالے اور چند
ی کے برتن بھی برآمد ہوئے۔ ان سب اشیا میں نہایت ہی نایاب چیز جواہرات رکھنے کی ایک سنہری صندوقچی ہے
ں پر ملکہ ہیتیفرس کا نام کندہ ہے۔ اس صندوقچی میں چاندی کا ایک زیور رکھا ہوا ملا جس کی نسبت بتایا گیا ہے
ٹانگوں میں پہنا جاتا تھا۔ یہ زیور ۲۰ چوڑیوں پر مشتمل ہے۔ یعنی دس دس چوڑیاں ایک ایک ٹانگ کے لئے۔
ر جس طرح پنڈلی اوپر سے موٹی اور نیچے کی طرف پتلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ چوڑیاں بھی بتدریج تنگ
دی گئی ہیں تاکہ پنڈلی پر ٹھیک بیٹھ جائیں۔ ہر چوڑی پر چار بڑی بڑی مکھیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جن پر زمرد
جورد اور عقیق سے جڑاؤ کام ہوا ہے۔ مکھیوں کے درمیانی فاصلے پر سرخ عقیق کی ٹکیاں لگی ہوئی ہیں۔

تابوت ابھی تک کھولا نہیں گیا۔ گزشتہ دسمبر میں اعلان کیا گیا تھا کہ اسے عنقریب کھولا جائے گا۔ مگر تا حال کوئی مزید اطلاع موصول نہیں ہوئی اور نئے حالات اور انکشافات کا انتظار ہے۔

ضمناً یہ بیان کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرعون سنفرو۔ داشہر کے مینار میں مدفون کیا گیا تھا۔ یہ فرعون تیسرے خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اور ماہران آثار قدیمہ کے حساب کے مطابق آج سے ۵۵۰۴ سال قبل مصر پر حکمراں تھا۔ اس کے عہد کے دو واقعات خاص شہرت رکھتے ہیں۔ اول تو اس نے صحرائے لبنان سے دیودار کی لکڑی بکثرت بہم پہونچائی اور اسے جنگی جہازوں کے بنانے اور اپنے محلات کے کواڑوں کھڑکیوں وغیرہ کی تعمیر میں صرف کیا۔ دوسرا واقعہ حبشیوں پر اُس کی ایک کامیاب فوجکشی ہے۔ سنفرو نے حبشیوں کے ملک کو تاخت تاراج کر کے انھیں اپنا مطیع و منقاد بنایا۔ حاصل کلام یہ کہ تیسرے اور چھٹے خاندان کے عہد حکومت کا درمیانی حصہ مصر کی قدیم تاریخ میں انتہائی ترقی اور جاہ و جلال کا زمانہ گزرا ہے اور یہی وہ عرصہ تھا جس میں مصر کے قریب قریب سب میناروں کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس عرصہ میں ایک سالم پہاڑی کو تراش خراش کر وہ عجیب و غریب مجسمہ بھی بنایا گیا جو سفنکس کے نام سے موسوم ہے مصری علم الاصنام میں اسے ایک مہیب اور عجیب الخلقت ہستی بتایا گیا ہے جس کا سر عورت کا اور جسم شیرنی کا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی مسافر اُس کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ اس سے عجیب و غریب اور مشکل معمے پوچھتی ہے۔ اور جو شخص اُن کا کافی و شافی جواب نہیں دے سکتا اُس کو مار ڈالتی ہے۔

(افسانہ)

اظہارِ محبّت

ہمارے اس قصہ کا آغاز اُس وقت سے ہوتا ہے جب کہ کرنیل ڈارمن ایک دستہ فوج مقیم ہونسلو کا سردار اعلیٰ تھا۔ اُس کی ہمہ گیر سختی اور بدمزاجی نے اس کے خلاف بدنام کن نفرت پھیلا رکھی تھی۔ وہ صفات و محاسن جو ایک فرانسیسی افسر کا لازمہ سمجھی جاتی ہیں اُس میں قطعی مفقود تھیں۔ ماتحت اس کو خوف و نفرت کی نگاہ سے اور برابر والے افسر حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے۔

یہ اوائل عمری میں ہی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا اور اس کے باپ نے ہر ممکن العمل اثر و رسوخ سے کام لیکر ایسی کوشش کی کہ اٹھائیس سال کی عمر میں کرنیل ڈارمن کو وہ عہدہ مل گیا جس کے حصول میں بہتوں کے بال سفید ہو جاتے ہیں اور بعضوں کو انتظار کی گھڑیاں موت کے نزدیک پہونچا دیتی ہیں۔ ایسی کم عمری اور ناتجربہ کاری میں کرنیل کو کیا سمجھ کہ وہ مساویانہ انصاف سے کام لیتا یا نیک و بد میں تمیز کر سکتا۔ اسی اثناء میں کرنیل ڈارمن نے ایک خوبصورت و حسین خاتون سے شادی کر لی تھی جس کی عمر اس سے تین چار سال کم تھی۔ کرنیل کو اس سے دیوانہ وار محبت تھی مگر اس خاتون کی رعونت پسندی، ناقابل برداشت ضد، ذوق نمایش اور اپنے سے کم رتبہ والوں کو حقارت اور بُری نظر سے دیکھنا۔ ایسے عیوب تھے جنھوں نے اس کو ہر دل عزیز ہونے کے بجائے لوگوں کی نظروں میں بے وقعت کر دیا اور اس کے ملازم وغیرہ اس سے باطنی کدورت رکھنے لگے۔

یہ افواہ بھی بہت مشہور تھی کہ اس خاتون کو کرنیل ڈارمن کے ساتھ اس کی خلاف منشا رشادی پر مجبور کیا گیا۔ اس لئے کہ اس کی ابتدائی محبت ایک ایسے شخص سے وابستہ تھی جس سے شادی کرنے کی اجازت خاتون کے والدین نے نہیں دی۔ چنانچہ ان دونوں افواہوں اور فسانہ محبت کے ساتھ ساتھ ایک عام تذکرہ زباں زد تھا۔ کوئی کچھ

کہتا کوئی کچھ بکتا۔

ہیلن نے اپنے والد کے غیر متزلزل ارادہ کو بدلنے کی بے حد کوشش کی۔ اس کی خوشامدانہ اشک ریزی نزعی کیفیت پیدا کرنے والی مایوس کن آہیں۔ اس کے والد کے آہنی قلوب پر کوئی اثر نہ پیدا کر سکیں۔ اور ہیلن سترہ سال کی کم عمری ہی میں بغرض سیاحت فرانس روانہ کردی گئی۔ اس موقع پر صرف اس کی ماں اس کے ساتھ تھی۔ ہیلن کے وحشی عاشق کی نسبت یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ صدمۂ جدائی کی تاب نہ لاکر جان سے گزر گیا اور خودکشی کرلی۔ مگر یہ صرف خبر ہی خبر تھی۔ اصل حالات کا صحیح پتہ نہ معلوم ہوا۔ چنانچہ سیفورڈ کے اوراقِ زندگی کو ان خیالی باتوں سے پُر کردیا۔ ورنہ چاہیے تو یہ تھا۔ کہ اتنا حصہ سادہ چھوڑ دیا جاتا۔ غالباً ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ ہیلن کے غریب و مایوس عاشق کا نام سیفورڈ ہی تھا

جب ہیلن آٹھ ماہ بعد اس جبریہ سفر سے واپس ہوئی۔ تو پہلو میں دل دردمند تھا اور چہرہ پر حزن و ملال۔ زخم خوردہ دل ہر وقت کی تعریفوں اور خوشامدوں۔ پرستش کرنے والوں کی منتوں اور اظہار تمنا سے کچھ یوں ہی شاش ہونا شروع ہوا تھا کہ کرنیل ڈارمن کا معاملہ رونما ہوگیا۔ اس طرف رائے قرار پائی۔ ادھر جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بہرحال ہمارے قصہ کا آغاز اُسی وقت سے ہوتا ہے۔ جب کہ ہونسلو میں کرنیل ڈارمن کے قیام کو کئی ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک روز صبح کو اس کے سامنے ایک ایسا شخص پیش کیا گیا جس کے ظاہری شکل سے تنگ دستی و احتیاج عیاں تھی۔ مگر لباس صاف اور ستھرا تھا۔ اس شخص نے درخواست کی کہ اس کو بھی فوج میں بھرتی کرلیا جائے۔

رسمی کارروائی کے بعد ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ اور اُس کی بھی رائے حاصل کرنے کے بعد صرف آدھ گھنٹہ میں اس نئے رنگروٹ یا رٹ کو شاہی فوجی ملازمت میں داخل کرلیا گیا۔

رنگروٹ نے بہت جلد قواعد سیکھ کر اپنی ہوشیاری۔ محنت۔ نیک مزاجی و ادب شناسی سے بہت جلد چند افسروں کو اپنے اوپر مہربان بنالیا۔ اور اُس کے ساتھی سپاہی اس سے گہری محبت کرنے لگے۔ اس کے علاوہ کوئی مخفی رنج و محن۔ اس کی مسرتوں پر چھائے ہوئے غم کے بادل طبعی ملال کی جھلک۔ اس کے اخلاقانہ اطوار۔ مہذب گفتگو۔ اور بلند ہمتی کا اظہار۔ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے ہارٹ اپنے ساتھیوں میں تعجب و عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور سب اُس کی تعظیم کرتے۔

وقت گزرتا رہا ہیلن کے بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ ماہِ اپریل کا تازگی بخش موسم۔ جبکہ فطرت کی ہر چیز شباب و جاں فزا اثر سے مملو نظر آتی ہے اور موسمِ گرما کی تکلیف وہ خصوصیات موسم سرما کی خوشگوار و روح افزا طاقتوں سے مغلوب ہوکر روپوش ہونے لگتی ہیں۔ قدرت کا ذرہ ذرہ۔ شجر و حجر۔ وحوش وطیور۔ اور اجسام فلکی بھی اس شاندار تغیر موسم پر خوش آمدید کہہ اُٹھتے ہیں۔

اس نظر فریب تبدیل موسم کا لطف اٹھانے کے لئے ایک روز شام کو مسز ڈارمن یعنی ہیلن اپنے تنہا مکان سے باہر ہوا خوری کے لئے نکلی۔ ہم نے تنہا کا لفظ یہاں اس لئے استعمال کیا ہے کہ کرنیل ڈارمن کی رعونت نے اس بات کو گوارا نہ کیا تھا کہ وہ بارگوں میں رہنا پسند کرے۔ چنانچہ اس نے ایک علیحدہ مکان بستی سے ۲۰۰ گز فاصلہ پر کرایہ پر لے رکھا تھا۔ چنانچہ شام کے وقت اکثر بیاں تنہائی ہوتی۔ کرنیل ڈارمن اپنے ہمعصر افسروں کے ساتھ فوجی بارک میں بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ اور اکثر اوقات بہت رات گئے تک بیٹھا رہتا۔ اور اُسے اپنی بیوی کی تنہائی کا مطلق احساس نہ ہوتا

ہیلن اکثر شام کے وقت ہوا خوری کے لئے نکل جاتی۔ اور کچھ دیر چہل قدمی کرنے کے بعد گھر واپس چلی آتی۔ حسب معمول ایک روز شام کو ہیلن بلا کسی ہمراہی کے قریب کے کھیتوں اور مرغزاروں کی جاں بخش ہوا کا لطف اُٹھانے لگی۔ اور کسی گہرے خیال میں غرق جس طرف قدم اُٹھے چلنے لگی کہ یکایک اُسے سامنے والی وادی میں جو ایک پہاڑی کی آڑ میں واقع تھی۔ دھواں اٹھتا معلوم ہوا۔ اور چند مرد اور عورتوں کی مسرت خیز ہنسی کی آواز سنائی دی۔ اس چیخ اور پکار نے اُسے اپنی محویت سے چونکا دیا۔ اور پہلی مرتبہ اُس نے نظر اُٹھا کر معلوم کیا کہ وہ اپنے گھر سے اس قدر دور نکل آئی ہے کہ واپسی میں کم از کم ایک گھنٹہ صرف ہوگا۔ شام کی تاریکی ہر طرف پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ فوراً مڑی اور گھر کی طرف چلی۔ مگر عین اسی موقع پر اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے آہستہ سے اس کا دامن کھینچا۔ وہ چونک گئی۔ کہ ایک چھوٹے سے بچہ کے ہنسنے کی آواز اُسے سنائی دی جس نے اسے ڈرا دیا تھا۔

"کمبخت۔ شریر۔ یہ کیا حرکت تھی؟ کیا چاہتا ہے" ہیلن نے بہت ہی ترش روئی سے کہا۔ اُس طرف وہ چھ سالہ بچہ یہ ڈانٹ سُن کر رونے لگا۔

"مسے رم (میڈم) میں نے کیا کیا۔ آپ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔ مجھے ایک پیسہ دے دیجئے۔ ورنہ وہ لوگ مجھے ماریں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ لونڈا تو کسی مصرف کا نہیں۔"

"کون مارے گا؟" بچہ کے بھولے انداز سے متاثر ہوکر ہیلن نے سوال کیا۔

بچہ کا چہرہ۔ گندے ہاتھ پاؤں۔ اور میلے کچیلے کپڑے بتلا رہے تھے۔ کہ یہ غریب انتہائی غربت و افلاس کا مارا ہوا ہے۔ کہنے لگا۔

"اچھی بیگم صاحبہ۔ یہی نٹ لوگ" اور اُس نے انگلی کے اشارہ سے وہ سمت بتلائی۔ جہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

"اوہو تو گویا تم نٹوں کے ساتھ ہو۔ کیوں نا!" ہیلن نے پوچھا۔ اب اُس کا لہجہ ملائم اور گفتگو کی سختی دور ہو چکی تھی۔ "کیا وہ لوگ تم سے مہربانی کے ساتھ پیش نہیں آتے۔ کیا تمہیں مارتے ہیں اور کھانے کو نہیں دیتے اور تم سے بھیک مانگنے کو کہتے ہیں؟"

"تم تو اس قدر جلد باتیں کرتی ہو کہ میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔" بچہ نے کہا۔

"بیوقوف۔ ملیچھ۔ بدمعاش۔ چور۔ پاجی۔" ہیلن کی زبان سے نکلا۔ اور رفعت گنی اُس کے حوالہ کرکے وہ اُلٹے پیروں گھر کی طرف واپس ہوئی۔

غمگین تصوّرات۔ اور پریشان کن خیالات کا ایسا ہجوم تھا کہ وہ بالکل محو تھی۔ شام کی تاریکی سے بے خبر وہ نہایت تیزی سے واپس ہو رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے خیالات میں اس درجہ مستغرق تھی کہ گھر کے دروازہ تک اُس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

خادمہ نے دروازہ کھولتے ہی تعجب سے کہا۔" اے ہے بیگم صاحبہ۔ اتنی دیر! غضب ہوگیا۔"

"کیوں۔ کیوں انجلیا۔ خیر تو ہے۔ کیا بات ہوئی۔ کرنیل صاحب واپس آگئے۔" اس تعجبانہ خیر مقدم کی نوعیت سے متحیر ہوکر ہیلن نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کرنیل صاحب واپس تو آگئے۔ مگر"

"ہاں۔ مگر..... مگر..."

"مگر..." خادمہ کی زبان لکنت کرنے لگی۔

"بولو۔ بولو۔ کیا ہوا کیا بات ہے..."

"کرنیل صاحب ......" خادمہ پھر رک گئی۔

"انجلیا۔ ہوش میں آؤ۔ میں حکم دیتی ہوں۔ کہ بیان کرو۔ جلد کہو۔ کیا معاملہ ہے"

"سخت زخمی ہیں" خادمہ نے اپنا سابقہ جملہ پورا کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہائے زخمی!..." ہیلن کی زبان سے نکلا۔ اور پھر مزید کیفیت پوچھے بغیر وہ بجلی کی طرح تیزی سے زینہ کی جانب جھپٹی۔ اور جلد جلد سیڑھیاں طے کر کے اپنے شوہر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ چہرے سے تھکاوٹ۔ وحشت اور گھبراہٹ ٹپک رہی تھی۔

کرنیل ڈارمن بستر پر دراز تھا۔

اُس کے رخسارے زرد۔ آنکھیں بے نور ہو رہی تھیں۔ مگر اپنی بیوی کو نزدیک آتے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ اور نحیف آواز میں بولا۔ "عزیز از جان۔ کچھ تردد کا مقام نہیں۔ زخم معمولی ہے۔ چند روز میں اچھا ہو جائے گا"

ہیلن نے حقیقی خطرہ کا احساس کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم کو زخمی کیا گیا۔ افسوس میں گھر سے غیر حاضر۔ اور تم یہاں زخمی...."

"پیاری ہیلن۔ کچھ فکر نہیں۔ میں بہت جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ مگر ہاں میری خواہش تھی۔ کہ کاش تم اس وقت یہاں موجود ہوتیں۔ شاید میرا خون آلود ہوتا۔ اور لہو کا زمین پر گرنا۔ تمھارے دل پر اثر کرتا"

نٹ کے بچپے سے گفتگو۔ اس کی غربت زدہ حالت کا احساس۔ غمگین و پریشان کن خیالات کی الجھن۔ ایسی باتیں تھیں جس نے ہیلن کی آواز کو غمناک اور لہجہ کو پرحسرت بنا رکھا تھا۔ مگر اُس کے شوہر کو اس وقت یہی احساس ہوا کہ یہ سارا رنج و غم اُسی کے زخمی ہونے پر ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ اُس نے اپنی عدم موجودگی اور زخمی شوہر کو ہاتھوں ہاتھ نہ لینے پر سخت ندامت تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ اُسے شوہر کے حقوق کا احساس نہ ہو۔ اور شوہر بھی کیسا جس نے ہمیشہ اس کی دل جوئی مدنظر رکھی۔ دریافت حال سے یہ معلوم ہوا کہ کرنیل ایک معمولی تکرار میں زخمی ہو گیا تھا۔

یہ کیوں؟ مزید حالات سے پتہ چلا کہ کرنیل ڈارمن کو کسی نہ کسی وجہ سے (جس کی نوعیت وہ خود بھی نہیں سمجھتا تھا) نئے رنگروٹ ہارڈے سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ اور تازہ وارد سپاہی کی پھرتی۔ چالاکی۔ سواری اور قواعد کی

سرعت پذیر ترقی نے اس نفرت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ اس کی وقعت اور ہردل عزیزی ایسی ہمہ گیر تھی کہ صرف اُسی کمپنی کے لوگ نہیں بلکہ ساری رجمنٹ اس کی گرویدہ تھی۔

حاسد۔ مغرور۔ ظالم اور خود ستا شخص ہمیشہ دوسروں کی ترقی کو نفرت سے دیکھتا ہے۔ مگر عالی ہمت اشخاص جن کے مشاغل عالی ظرفی۔ تنگ دلی۔ اور ذلیل طبیعت کا احساس تک نہیں کر سکتے۔ جیسی کرنیل ڈارمن نے پائی تھی۔ یا اگر احساس بھی کرتے ہیں تو بڑی دقت سے۔

خیر بیان کرنا تو یہ مقصود تھا کہ تکرار کیوں واقع ہوئی۔

فوجی بارگوں میں کھانا ختم ہو چکا تھا۔ کرنیل ڈارمن رات کی فرحت کا لطف اٹھانے کے لئے۔ بارک کے صحن میں سگریٹ سلگا کر چہل قدمی کرنے لگا۔ کہ اتنے میں دو سپاہی اس کے نزدیک آتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اور اپنے افسر کا خیال کئے بغیر آگے بڑھ گئے۔ کرنیل نے انھیں آواز دے کر واپس بلایا۔ وہ دونوں چونک پڑے اور فوراً باقاعدہ فوجی طریق پر سلام کیا۔ کرنیل نے کہا۔

"اخاہ ہارڈے کیا وجہ ہے کہ میں تم کو غفلت اور عمداً بے ادبی کا مرتکب نہ سمجھوں"۔

ہارڈے نے کہا۔ "حضور میں اپنی غفلت پر نادم ہوں۔ اور معافی چاہتا ہوں میں نے واقعی دیکھا نہیں"۔

"میاں سپاہی۔ میں ایسے گول الفاظ سننے کا عادی نہیں۔ تم عقبی حصہ فوج کے ایک ادنیٰ سپاہی ہو۔ مگر گفتگو ایسی مسجع کرتے ہو کہ ماشاء اللہ۔ میں ان باتوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"۔

"حضور۔ میں نے کوئی مسجع گفتگو نہیں کی۔ بلکہ سادہ روزمرہ کی زبان میں آپ کے سوال کا جواب دیا میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جن کو کام میں لایا جائے۔ اب رہا یہ کہ میں اپنی طرز گفتگو ہی کو بدل ڈالوں۔ اس سے مجھے معذور سمجھیے"۔ ہارڈے نے بہت ہی مشتعل لہجہ میں جواب دیا۔

کرنیل نے اس جواب کو سُنا ان سنا کر کے کہا۔ "بہت خوب یہ موقعہ اچھا مل گیا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا بھی ہے اچھا اپنے ساتھی کو رخصت کر دو"۔

ہارڈے کا ساتھی رخصت ہو گیا۔ صرف وہ اور کرنیل تنہا رہ گئے۔ تو کرنیل نے کہنا شروع کیا۔

"ہارڈے۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ تمھارے اطوار میں کچھ عجیب بات ہے جو مجھے پسند نہیں آتی تمھیں بہت شہرت

حاصل ہوگئی ہے۔ تمہاری گفتگو میں بے حد لوچ اور سحر البیانی ہے۔ اور انداز فلسفیانہ۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک جادو بیان فلسفی عمدہ سپاہی بن سکے۔ اور نہ میں اسے گوارا کر سکتا ہوں کہ فوجی بارکوں میں کھانے کی میز پر افسروں کی گفتگو بھی اس انداز کی ہو۔"

ہارڈے کو سخت ناگوار گزرا۔ اور اُس نے اُسی خشک لہجہ میں حقارت آمیز طریق پر جواب دیا۔ "جناب کرنیل ڈارمن صاحب! آپ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے فلاں فلاں طریق پر شہرت حاصل ہے۔ میں اس کے لئے جناب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے مجھ پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ میں دوسروں کی زبان کا مالک نہیں۔ خدائی فوج دار نہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ جب تک میں اپنے فرض کو انجام دینے سے قاصر نہ رہوں۔ میرے افسران بالا کو کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہونی چاہیئے۔ اس سے اُنھیں کیا مطلب کہ میں لکھنا یا پڑھنا جانتا ہوں۔"

"آہا۔ تو گویا تم اپنے افسروں اور حکام بالا کے درمیان کوئی درجہ امتیاز نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ محض فوجی نقطۂ نظر سے تمہارے افسر ہیں۔ کیوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں۔ عقل کے اندھے۔ ایک معزز شخص کسی ذلیل مسخرے سے بہرحال افضل درجہ رکھتا ہے۔"

"ذرا جناب مجھے لفظ معزز کی صحیح تعریف تو بتلا دیں۔" ہارڈے نے ایسی ترش روئی سے جواب دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے اپنے مخاطب الیہ کی گفتگو پر سخت طیش آ رہا ہے۔

او ہو۔ تو کیا معافی خواہ ہونا اسی کا نام ہے۔ کیوں نا۔" کرنیل نے گرج کر کہا۔ "اچھا ہارڈے میں نہایت نرمی کے ساتھ تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میں کسی کا حکم سننے کا عادی نہیں۔ اور ایسے موقع پر میں ایک کمتر کی رائے ...."

"حضرت ذرا زبان سنبھال کر۔ ماتحت کہئے۔ ماتحت۔" ہارڈے نے فوراً قطع کلام کر کے کہا۔ اُس کے دل میں اس وقت کسی دوسرے موضوع پر خیالات کا تلاطم برپا تھا۔ اور گزشتہ زمانہ کے واقعات پیش نظر ہو رہے تھے۔

"نہیں کمتر۔ میں پھر اعادہ کرتا ہوں۔" کرنیل نے اور زیادہ بگڑ کر کہا۔ "اف۔ یہ جرات۔ کہ تم میری اصلاح کرتے ہو"

یہ کہتے ہوئے وہ نوجوان رنگروٹ کی طرف اس انداز سے بڑھا معلوم ہوتا تھا کہ ٹکّر مارے گا۔

یکایک ہارڈے اپنے خیالات سے چونکا۔ کرنیل کے آخری الفاظ اُس کے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔

اُس نے ایک بار اپنے چاروں طرف نظر ڈالی کوئی بھی نزدیک و قریب نظر نہ آتا تھا۔

اُس کی خود داری اور انسانیت کو جو صدمہ پہنچا تھا۔ وہ اُس کو برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ مگر ان الفاظ نے ایسا اثر کیا کہ اُس کا پیمانہ صبر یک بیک مادہ ملتہب کی طرح پھوٹ پڑا۔ اور اُس نے ہر ایک نیک و بد خیال سے لاپروا ہو کر اپنے ہتک کرنے والے کو جواب دیا۔

"کرنیل ڈارمن مجھے افسوس ہے کہ میری اور تمہاری ملاقات ایسے موقع سے ہوئی۔ اس فوج میں بھرتی ہونے کے بعد۔ میرا حتمی ارادہ تھا کہ میں اپنے حکام کی تعظیم کروں گا۔ مگر میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ گو تم فوجی نقطۂ نظر سے میرے افسر ہو۔ اور صرف وردی تمغے اور نشانات ہی سے برتری کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ مگر بلحاظ بنی نوع انسان میں اور تم ایک۔ میں تمہارا کمتر نہیں بلکہ ہمسر ہوں۔"

"انسان! ہا۔ ہا کرنیل نے چلا کر کہا۔ انسان! نہیں پاپوش سے کمتر... ذلیل۔"

"کرنیل ڈارمن ہوش میں آؤ۔ اور سمجھ لو۔ کہ اب تم نے میری ہتک کر کے حد سے زیادہ بدتہذیبی کا ثبوت دیا ہے۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ صرف میری بدقسمتی مجھے اس فوج میں ملازمت کے لئے لائی... ورنہ....."

یہ کہتے ہی کہتے ہارڈے کا انداز بغایت خشمگیں ہو گیا۔ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ رگیں تن گئیں۔ چونکہ یہ حسین و وجیہہ تھا۔ اس لئے اس دفور غصہ میں ایک عجیب شان و رعنائی پیدا ہو گئی۔

"گستاخ... بدمعاش... کرنیل کہنے لگا۔ ٹھہر جا۔ میں اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا۔"

غصہ کا آنا ہی غضب تھا۔ ہارڈے بے تاب ہو گیا۔ فوجی ضوابط و اصول تعظیم سب فراموش ہو گئے۔ اُس کی توہین بسخت توہین کی گئی۔ اور قبل اس کے کہ وہ ہوش میں آئے۔ اُس نے اپنے افسر پر حملہ کر کے دو تین تھپڑ جا دیئے کرنیل بھی آگ بھبوکا ہو گیا۔ اور تلوار کھینچ کر اپنے مقابل پر ایک بزدلانہ حملہ کیا۔

مگر چشم زدن میں وہ خود ہی زخمی ہو کر زمین پر لوٹتا نظر آیا۔ ہارڈے کی تلوار اُس کے سر پر چمک رہی تھی۔ اور وہ اُس کے سر پر تھا۔

کرنیل ڈارمن کے زخمی ہونے کا ماجرا یہ تھا۔

(۲)

اس واقعہ کو چند ہفتے گزر چکے تھے کہ ایک دن ہیلن ڈارمن اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں

زندگی کے واقعات ماسبق پر غور کر کے اندازہ لگا رہی تھی۔ کہ اُن کا کیا اثر آئندہ زندگی پر پڑنے والا ہے۔ اور گزشتہ و زندگی کی نوعیت کیا تھی؟ یہ اس کا دل ہی خوب جانتا تھا۔ جس نے رنج و غم ۔عیش و مسرت کا مشترکہ لطف اُٹھایا تھا یعنی محبت کا آغاز۔ ناکامی۔ اپنے محبوب سے جدائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ کرنیل ڈارمن اس سے محبت کرتا ہے۔ مگر وہ مجبور تھی کہ اُسے اپنے دل میں اُس کی محبت کا شائبہ نظر نہ آتا تھا۔ حالانکہ تعلقات زن و شوئی کے بعد جن میں وہ منسلک ہو چکی تھی۔ اور جن سے تادم مرگ مخلص ہونا محال و ناممکن تھا۔ یہ صورتِ حال قابل اعتراض تھی۔

وہ یہی سوچ رہی تھی۔ کہ یکایک نوکر نے آکر ایک خط پیش کیا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ خط لے کر لفافہ چاک کیا اور اُس کی عبارت بغور پڑھنے لگی۔

"ہیلن!

میرے لئے حکم قضا ہو چکا۔ صرف تم میرے لئے فرشتۂ رحمت بن سکتی ہو۔ تمہارا شوہر سچا پرستار اور تم پر جان دیتا ہے۔ اور وہ تمہاری کسی بات کو ٹال نہیں سکتا۔ تمہارا کہنا سر آنکھوں سے بجا لائے گا۔ مجھے نہایت دقتوں سے قلم دوات میسر آئی ہے۔ تاکہ میں تمہیں اپنی شوی قسمت سے آگاہ کر سکوں۔

آہ! اگر اب بھی تمہارے دل میں محبّتِ سابقہ کی کوئی رمق باقی ہے۔ اگر اب بھی تمہارے ساز روح میں الفتِ دیرینہ کا کوئی تار متحرک ہے۔ تو خدارا۔ اس وقت اُس حسرت نصیب کی جان بچاؤ۔ جس نے محض تمہارے قرب میں رہ کر دیدار جاناں کی خاطر ایک ذلیل ملازمت پسند کی۔ لہٰذا اس وقت اُس بے کس کی امداد کرو۔ جس نے تمہاری محبت میں ہر ایک احساس خودداری کو فنا کر دیا۔۔ اور جس کے دل نے ایک مرتبہ انتخاب کر لینے کے بعد پھر کسی دوسرے کو نگاہ بھر کر دیکھنا گناہ جانا۔

ہاروے کا فرضی نام اختیار کر کے میں نے فوج میں ملازمت کر لی تھی۔ مگر میں نے محض اس خوف سے تم سے کبھی ملاقات نہیں۔ مبادا میرا یہ فعل تمہارے سکون اور اطمینانِ قلب میں پھر ہیجان پیدا کر دے۔ یا اس ناعاقبت اندیشی سے خود میری اصلیت ظاہر ہو جائے۔

میں صرف اسی پر قانع تھا کہ تمہیں دور ہی سے دیکھ لیا کروں۔ اور تم جس وقت سبزہ زار میدانوں، یا گھاٹیوں

میں سرگرداں ہو۔ تو میں تمہاری قامت موزوں۔ قدِ زیبا۔ خوبصورت اور چاند سا چہرہ ہی فاصلے سے دیکھوں اُف! کیا یہ دیوانہ وار جوشِ الفت تمہاری توجہ۔ اک آہِ سرد اور پُرقلق یاد کا مستحق نہیں۔ یقیناً مجھ سرگشتہ و برباد کی محبت۔ صداقت۔ اور جاں نثاری تمہیں میری باتوں کا یقین دلا دے گی۔

کل میں نے سنا ہے۔۔ کل تمہارا قابلِ نفرت شوہر لندن جا رہا ہے۔ اُس کا ذرا سا اشارہ میری رہائی کے لئے کافی ہے۔ یا پھر جو ترکیب تم مناسب سمجھو عمل میں لاؤ۔ بہرحال موت کا حکم میرے لئے طے ہو چکا ہے۔ اور یقین جانو خدا شاہد اور عالم الغیب ہے۔ اس تنہا زنداں کی کوٹھری میں بھی ہیلن کی یاد باعثِ مسرت ہے۔ ایک وفادار اور مہجور دل کے لئے اور وہ بھی کس کا دل تمہارے جاں نثار کا

والٹر سیفورڈ کا "

ہیلن کے ہاتھ سے خط گر پڑا۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا امڈ آیا۔ گزشتہ واقعات محبت کی یاد اس تیزی سے دماغ میں جاگزیں ہوئی کہ اُس کا پریشان دل تاب نہ لا سکا اور آن کی آن میں اُس کا متلاطم سینہ نمونۂ حشر بن کر رہ گیا۔۔ اس نے پھر اس رقعہ کو اٹھایا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ صاف نظر سے نہ دیکھ سکی وہ نمناک آنکھوں کے عکس پُر اشکوں میں نظر آئی۔ اسی تحریر کے نیچے ایک ذرا سا جملہ بطور نوشتہ مابعد بھی تحریر تھا۔ اس کی آنکھوں نے بغور دیکھا۔ مگر یہ عبارت فرانسیسی زبان میں تھی لکھا تھا

"ہیلن! دہائی ہے ستمگر دل جلے فریاد کرتے ہیں"۔

چشم زدن میں خط پرزے پرزے تھا۔ اور ٹکڑے آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہے تھے۔

آہ! اس خط کی تحریر نے ہیلن کے قلب پر کیا اثر کیا۔ اس کا اندازہ اُس کی پریشان خاطری اور تشویش سے عیاں تھا۔۔ اس طرف کاغذ کے ٹکڑوں کا جل کر راکھ ہونا ایک پل کی بات تھی۔ اُس کی آنکھیں دروازہ کی جانب اٹھیں۔ یہاں کاغذ کا وجود باقی نہ رہا۔ یہ دیکھ کر اُس کے قلب حزیں کو ایک گونہ تسکین ہوئی۔

دن کے باقی ماندہ حصہ میں وہ برابر کرنیل ڈارمن سے ہارڈے ہی کے متعلق گفتگو کرتی رہی جس کا مقدمہ فوجی عدالت (کورٹ مارشل) میں بغرض فیصلہ پیش ہو چکا تھا۔ اور اُس پر اپنے حاکم بالا پر حملہ کرنے کے جرم میں سزائے موت کا فتوےٰ سنایا جا چکا تھا۔

وہ صبح بھی آن پہونچی۔ جس روز ہارڈے کو مجمع عام میں پھانسی دی جانے والی تھی۔ فوج کے بہادر سپاہی سویرے ہی سے مسلح ہو کر تیار ہو گئے تھے۔ اُن لوگوں کے قلب کی سیاہی نے جو اپنے ایک رفیق کی موت کا نظارہ دیکھنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ صبح صادق کو بھی سیاہ بنا رکھا تھا مگر بہت سے ایسے بھی تھے۔ جو ہارڈے کی فراست اور ذہنی قابلیت کی تعریف کر کے اظہارِ افسوس بھی کر رہے تھے۔

مگر یہ نیک طبع لوگ جو جوہرِ انسانیت سے مالا مال تھے۔ انصاف اور فوجی سختی کے معاملہ میں کیا کر سکتے تھے۔ محض مجبور و لاچار تھے۔ اس وقت مجمع پر جو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔ وہ کسی طرح شہرِ خموشاں سے کم نہ تھی۔

کہ اتنے میں ایک پہرہ دار جو مجرم کی حوالات کے قریب پہرہ پر تعینات تھا۔ دوڑتا ہوا افسر اعلیٰ کے پاس پہنچا اور چپکے سے کوئی بات اُس کے کان میں کہی۔ اور اس کے ذرا ہی دیر بعد خبر سارے مجمع میں پھیل گئی۔ وہ کیا؟۔۔ ہارڈے فرار ہو چکا تھا۔

سارجنٹ اور افسر اعلیٰ نے باہم نگاہ بازی کی۔ اور مسکرا کر رہ گئے۔ غالباً دونوں نے دل ہی دل میں سمجھ لیا۔ کہ انھوں نے کرنیل ڈارمن کے حکم کی سر مو تعمیل کر کے یقیناً اُس کی خوشنودی حاصل کر لی ہے۔

ہارڈے کے فرار ہونے کے ایک ہفتہ بعد پھر ایک شام کو ہیلن اُنھیں سبزہ زار میدانوں میں چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ وہ آج بھی مثل سابق اپنے خیالات میں محو تھی۔ مگر اس مرتبہ اس کا شوہر ہمراہ تھا۔ دونوں گھومتے پھرتے بلا کسی ارادہ کے اُسی سمت میں جا پہونچے۔ جہاں ہیلن اس سے قبل ایک مرتبہ آ چکی تھی۔ ایک خاص وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ یہ کہ راستہ اسی طرف تھا۔ مزید برآں شام کی تاریکی

ہیں نم گھاس پر چہل قدمی کرنا بھی غیر موزوں تھا۔
"میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ہارڈے اس وقت تک بڑی دور نکل گیا" کرنیل نے خاموشی کو ختم کرنے کے لئے گفتگو چھیڑی۔
"اے ہے سچ کہنا کیا تمھارا یہ خیال ہے۔" ہیلن نے جو زبردستی اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لئے چل رہی تھی یک بیک چونک کر کہا۔
"ہاں مجھے تو یہی امید ہے۔ جب سے تم نے یہ کہا کہ اس کی موت کا تعلق اشارتاً یا کنایتاً تمھاری جانب منسوب ہوگا۔ مجھے اُسی وقت سے اُس کے بچانے کا خیال پیدا ہوگیا۔ یہ میں ضرور کہوں گا کہ مجھے اُس کی صورت دیکھتے ہی نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ خدا معلوم کیوں۔"
"اگر یہ شخص مرجاتا تو خدا جانتا ہے مجھے بے حد صدمہ ہوتا۔ اور میں دائمی رنج میں مبتلا ہو جاتی۔" ہیلن کی زبان سے نکلا۔ اور وہ اس خوف سے یک بیک رُک گئی۔ مبادا دورانِ گفتگو میں اُس کا دلی اضطراب بھی ظاہر ہو جائے۔
"اے ہے تو یہ تمھارا دل کس درجہ نازک اور ضمیر کس درجہ پاک ہے۔" کرنیل نے اپنی بیوی کی گفتگو کا کچھ اور مطلب سمجھ کر جواب دیا۔
اب یہ دونوں پہاڑی کے دامن میں پہونچ چکے تھے۔ وہاں سے وادی مرغزار شروع ہوتی تھی ذرا ہی دور بعد انھیں مشترکہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان کے داہنی جانب نٹوں کا ایک خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف اسباب کا رواں یعنی وہ چھوٹے چھوٹے چھکڑے کھڑے ہوئے تھے جن میں بیٹھ کر اور سامان لاد کر نٹ لوگ ایک مقام سے دوسرے مقام کو سفر کیا کرتے ہیں۔ کچھ فاصلہ پر ایک ٹٹو بھی چرائی میں مصروف تھا۔
خیمہ کے دروازہ پر آگ سلگ رہی تھی۔ اور اس پر ایک بڑی پتیلی رکھی ہوئی سنسنا رہی تھی اسے دیکھتے ہی خدا معلوم ہیلن پر کیا اثر ہوا کہ وہ بیہوش سی ہونے لگی۔ کرنیل کو فوراً احساس ہوا اور وہ اپنی بیوی کو لے کر گھر کی طرف واپس ہی ہونا چاہتا تھا کہ اتنے میں خیمہ سے ایک بچہ نکلا۔ اور د...

ہیلن کے پاس پہنچکر بھولی آواز میں بھیک مانگنے لگا۔

یہ وہی بچہ تھا جسے ہیلن اس سے قبل ایک مرتبہ خیرات دے چکی تھی۔ مگر آج بچہ کی ظاہری حالت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے اور عمدہ تھے۔ اور مُنہ ہاتھ دھلنے سے چہرہ ایسا خوبصورت اور بھولا معلوم ہوتا تھا کہ بآسانی پہچاننا مشکل تھا۔

" لیے چل دور ہو" کرنیل نے اپنی چھڑی لڑکے کے سر پر گھماتے ہوئے ایسے درشت لہجہ میں کہا کہ وہ غریب سہم کر دوزانو ہوگیا اور رونے لگا۔

ہیلن نے ایک آہ بھر کر کہا " اوہ کہیں مار نہ دینا غریب بچہ ہے۔ یہ ناسمجھ بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ ورنہ وہ لوگ جن کے ساتھ یہ رہتا ہے اس کو مارتے ہیں۔ اُف خدایا۔ کتنی رنجیدہ اور المناک زندگی ہے "

" ہنری ۔ ہنری ۔۔ " خیمہ کے اندر سے کسی کی آواز آئی۔ " بیٹا ادھر آؤ۔ یہ کیا شرارت کر رہے ہو "

لڑکا اس آواز کو سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ خیمہ تک پہونچے۔ دروازہ کا پردہ ہٹا۔ اور ایک قدآور وجیہہ شخص باہر نکل آیا۔

" آخر یہ کیا شور وغل ہے " اس شخص نے پوچھا۔ اور اس مقام کی طرف بڑھ آیا۔ جہاں کرنیل اور ہیلن کھڑے ہوئے تھے۔

" ار ۔۔ ر ۔ ر ۔ ے ۔۔ ہارٹے ۔ تم یہاں کہاں ۔۔ " اس شخص کی صورت دیکھتے ہی کرنیل نے متحیر ہوکر پوچھا۔ " کیوں حضرت! یہ ناعاقبت اندیشی ۔۔ اسی قرب وجوار میں رہ کر میری بدنامی کرانا۔ یا اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا تم نے یہی وعدہ کیا تھا ۔۔ اور تعجب تو یہ ہے۔ کہ موتسلو سے اس قدر قریب رہنے کی جرأت تمھیں کیونکر ہوئی "

" جناب کیا عرض کروں محض اتفاق نے مجھے ان نٹوں کے ساتھ کر دیا " سیفورڈ نے کہا۔ (اس کا اصلی نام یہی تھا)

" اور وہاں " اُس نے خیمہ کی طرف اشارہ کرکے بتلایا۔ " مجھے ایک ایسا غریب بچہ مل گیا جس کو ایک بے درد و بے رحم ماں نے اپنی ضرورت۔ بدنامی ورسوائی کی خاطر دوسروں کے رحم پر چھوڑ دیا تھا "

" اور وہ بچہ غالباً یہ ہے " کرنیل نے اس چھوٹے بچے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ " لیکن کسی اجنبی بچہ کی آڑ میں

تم اپنے وعدہ کو بھلانے کا کیا مجاز رکھتے ہو۔ میں نے تمھارے وعدہ پر یقین کیا۔ اور اپنی بدنامی گوارا کی یہاں تک
مجھے اپنے دو ماتحت افسروں کو محض تمھارے بچانے کی غرض سے شریک راز بنانا پڑا۔ تاکہ تمھارے فرار کی روانی
میں کوئی شک وشبہ نہ رہے۔

"جی حضرت ابھی کیسے کہتے ہیں۔ ابھی بچہ کیسا ہے میرا بچہ ہے" سیفورڈ نے بگڑ کر جواب دیا۔
"سیفورڈ، سیفورڈ، ... بہت پیارا ... کیا ہمارا لخت جگر ہے" ہیلن نے یک بیک ہر قسم کے
تکلیف و فراست سے بے خبر ہو کر سینہ ... ہوتے ہوئے کہا۔ اور ... کے زیر اثر وارفتہ ہو کر اس نے اس بچہ کو اپنے
سینہ سے لگا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔
"سیفورڈ ... کرنل کی زبان سے یہ ... اور ... تمام معاملہ روشن ہو گیا۔ ہیلن بیان کرو
... میں حکم دیتا ہوں"
"رحم ... رحم ... میں ابھی سب کچھ کہے دیتی ہوں" ہیلن بے تاب ہو کر اپنے شوہر کے قدموں پر گر پڑی
اور اپنے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا دیے۔
"ہاں۔ ہاں وہ حال کیا ہے۔ ذرا میں بھی تو سنوں" کرنل نے اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے
طنزاً لہجہ میں پوچھا۔ "اچھا میں جواب دے دوں گی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ تم نے میری کشتی ساتھ ہونے سے قبل جو سفر فرانس کا
کیا تھا وہ محض ایک بہانہ تھا۔ اصل میں تم کو بھی تنہا اور علیحدہ مقام کی ضرورت تھی جہاں تم اپنے ناجائز..
سے بچہ کو بھی حاصل کر سکو۔"
کرنل کے ہونٹ فرطِ غضب سے تھرتھرانے لگے۔
"یہ سچ ہے۔ بالکل سچ ہے۔" دیوانہ وار لڑکھڑاتے ہوئے، ہیلن کی زبان سے نکلا "بس اب
طعن کا وقت نہیں"
"کم بخت.. بدنصیب.. بے وفا عورت۔ جا میں تجھ کو خیر باد کہتا ہوں.. تو اپنے عاشق۔ اپنے عصمت
دری کرنے والے.. اپنے والہ وشیدا، چاہنے والے کے ساتھ رہ کر اس ناجائز اولاد کی پرورش کر۔ چل دور
ہو...." یہ کہہ کر کرنل نے وہاں سے چلنے کی نیت سے اپنی پشت پھیر لی۔

ادھر ہیلن نے ایک آہ کی - اور لڑکھڑا کر فرش - مین پر گر پڑی - اور ذرا ہی دیر بعد بے حرکت ہوگئی -

یکایک مراجعانہ اثرات محبت نے عود کیا - کرنیل نے رُک کر ایک نظر کی .. اور بے تابانہ پاس آن کر اپنی بیوی کے پہلو میں دو زانو ہوگیا - اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں داب کر نمناک آنکھوں سے یہ کہنا شروع کیا -

"جان سے زیادہ عزیز ہیلن .. بول ... آنکھیں کھول - میں سچے دل سے تجھے معاف کرتا ہوں - اور سب باتیں یک لخت بھلائے دیتا ہوں - اُٹھ - راحتِ جان - آنکھیں کھول کر دیکھ .. تیرا پشیمان شوہر التجا کرتا ہے کہ تیرا صرف یہ وعدہ کہ تو اب کبھی سیفورڈ کی صورت نہ دیکھے گی - میرے لئے کافی ہے - میں پھر تجھے اپنی آنکھوں میں جگہ دینے کے لئے تیار ہوں - میں تیرے بچہ کو بھی ساتھ رکھوں گا - اور اس کی ہر طرح پرورش کروں گا - وہ میرا ہی لڑکا بن کر رہے گا ... اور عزیز از جان ہیلن ... تو .... تو .....؟"

"حضرت .. اب سب بے کار ہے - اب وہ آپ کی منتوں اور التجاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتی" سیفورڈ نے بادیدۂ گریاں جواب دیا - "وہ دل شکستہ ہو کر اس دنیا سے گزر گئی"

"آہ! خداوندا .. کیا یہ سچ ہے؟ کرنیل نے نزعی کیفیت سے چلا کر کہا - "کیا آج کے انکشاف اور میرے الفاظ کی تلخی نے اُسے ایسا شدید صدمہ پہنچایا .. مگر نہیں .. او بدنصیب سیفورڈ - تیری اور اس بچہ کی زندگی بھی اس آفت کی شریک کار ہے - آہ ہیلن ... کیا .. تو .... تو .... مر چکی"

کرنیل کی گلوگیر آواز اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی - آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر کر ہیلن کے مردہ اور زرد مگر بلا کے حسین رخساروں پر جلا کرنے لگے - جواب ثواب و عذاب سے بے نیاز کسی دوسرے عالم میں پہونچ چکی تھی ....

احقر

شمیم بہوری

ہلالِ عید

از جناب سردار صاحب انور بی اے (علیگ)

ماہِ صیام ختم ہے عالمِ شاد کام میں — قابلِ دید ہے فضا جشنِ گداز شام میں
مہر کے موئے زرفشاں ضبطِ نقاب ہو چکے — جامِ زمردین میں دورِ شراب ہو چکے
لرزشِ سطحِ نیلگوں سرخیٔ داستاں ہوئی — ساحلِ صد حجاب میں کشتیٔ خور نہاں ہوئی

مشک بسر ہوا چلی غرب شمیم زار سے — تازگیاں ٹپک پڑیں سبزۂ کیف بار سے
لے کے بہار نکہتیں۔ دامنِ مے فروش میں — نغمہ بدوش چل پڑیں محفلِ ناؤنوش میں
پھول چمن کے جھوم اُٹھے۔ محوِ نیاز۔ اذان پر — تہنیتیں پھڑک گئیں جوش میں آسمان پر
زمزمہ ریز طیر ہیں شکر بلند و پست میں — رقص۔ نوائے خرمی کرتی ہے سجعِ مست میں

نور کے تار اُبھر پڑے۔ چادرِ نجم سج گئی — دیدِ ہلال ہو گئی۔ نوبتِ عید بج گئی
شاہدِ خلد پوش نے رایتِ دیں دکھا دیا — اپنی حریمِ ناز سے پردہ کوئی اٹھا دیا

جلوہ گری حسن ہے ابرِ ردائے نوبہار سے — تیرگیاں ہیں شمع زا خنجرِ آبدار سے
خطِ لطیف اُبھر گیا مژدہ فضا جبین پر — چاندنی ہے کھلی ہوئی تا بہ نظر زمین پر
برق بجے ہیں فطرتیں عالمِ التفات میں — لب ہیں تبسم آزما گوشۂ کائنات میں
پرتوِ جلوۂ خفی چشم کشائے شوق ہے — کیجئے پیش بندگی وقت ہجومِ ذوق ہے

انورِ غم بدوش کے لب پہ یہی نوید ہے
ملئے خوشی کہ آج صبحِ بہارِ عید ہے

پسِ پردہ کا ایک صفحہ رنگیں

خورشید زمانی منھ ہاتھ دھو کے بیٹھی سر گندھوا رہی تھی۔ بالوں کے سرے سلجھا چکی تھی اور کنگھی میں سے بال نکال ان کی گُھمّی بنا گیسودانی میں رکھ کنگھی کو شانہ پیچ میں کہہ رہی تھی۔ شرف النساء چوٹی میں چار پانچ پیچ دے چکی تھی کہ اتنے میں بی خانم برقع کے سموسہ کو الٹے گھر کو سمیٹ اور پیچھے سے لے جا بائیں ہاتھ پر تہ پوشی کے پائینچے کی طرح ڈالے کھسر کھسر کرتی آئیں آداب کرکے بیٹھ گئیں۔ خورشید زمانی بیگم نے کہا۔ شرفن تو کچھ کل کی چوٹی گوندھتی تھیں۔ آدھی سے زیادہ گوندھ چکی ہو۔ میری جان بے چین ہوئی جاتی ہے۔ خانم سے کہنے لگیں۔ بی تم میری چوٹی گوندھ دو۔ اور اشرف النساء سے کہا کہ جاکے مغلانی جی سے کوئی بیسنے کا ٹکڑا لے آؤ۔ خانم بولیں بیگم اب تو تیل گیری جبکیٹ ہو گئی کل سے اس کو بھی جم ڈالا خورشید زمانی نے کہا کہ بی سر گندھواتے وقت اس سے کام پڑتا ہے میں روز کہتی ہوں لیکن کچھ عجیب ہیں کہ ذرا ان کو خیال نہیں ایک اتنا سا سر گوندھنے اور منھ دھلانے کا کام ان کے ذمہ ہے آپ چین دو لیا ہیں کیوں بیٹے جائیں زانو پوش میں بتلاؤں تو اٹھائیں۔ بیٹی پاک دریا پاک میں میلے بتاؤں تو انھیں نظر آئیں لیکن یہ چاہو کہ انھیں خود کو سمجھائی دے یہ ناممکن۔ آپ چین کل ہی بدلوایا ہے نگوڑا برتنوں کا صافی معلوم ہوتا ہے اور ایسی بری بو ہو گئی تھی جانے چھچھوند رھ گئی کہ میں نے جو منہ ہاتھ پونچھے تو سڑ گئی۔ برا بھلا کہتی گئی۔ اور دوبارہ منھ دھویا۔ ان سے پوچھو سارے دن تم کیا کرتی ہو۔ اب ذرا سے بیسنے کے ٹکڑے کو بھیجا جا کے مر گئیں۔ خدا جانے ان نوکروں نے تو میری عادت کا ناس کر دیا نگوڑے جتنے زیادہ رکھتی ہوں اتنے ہی اور اچھوتی کا ٹکا ہوئے جاتی ہیں۔ نامراد کہیں کے۔۔ اچھی شرفن آخر تم کو اور مغلانی جی کو کس نے توشہ خانہ میں پکڑ لیا کہ نگوڑا اتنا سا ٹکڑا اب تک نہیں لایا جاتا میری تو بیٹھے بیٹھے گردن دکھ گئی۔ خورشید زمانی کی ساس نے کہا۔ دلہن! آتی ہے نگوڑی تم تو ایک بولی میں تین کام چاہتی ہو۔ آخر یہ بھی تو اللہ ہی کے بندے ہیں۔ فرق یہی ہے تاکہ اللہ رکھو تم امیر ہو اور یہ غریب تو اس لئے تھوڑی کہ دل دل مارو۔ ان کی جان کو جان نہ سمجھو۔ . . . .

الحمد للہ کہ آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے مشہور نسوانی ادبِ اردو کے منتشر مضامین اربابِ ذوق کے لئے "پسِ پردہ" جیسی دیدہ زیب و جاذبِ نظر کتاب میں یکجا شائع ہو گئے ہیں۔ حجم ۱۹۰ صفحہ اور قیمت صرف ؏ ہے۔

عبد الباسط

Sawan Rut

Water colour by
M. A. Rahman Chughtai.

Bharatvarsha Ptg. Works,
Calcutta.

Sawan Rut

Water colour by
M. A. Rahman Chughtai

Bharatvarsha Ptg. Works,
Calcutta

تنقید و تبصرہ

تاریخ جدید عزیزی

اگر بنظر انصاف غور کیا جائے تو کسی تاریخ کا صحیح نصب العین واقعات کا من وعن بغیر کسی ذاتی رائے کے سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کر دینا ہی ہو سکتا ہے۔ انسانی تاریخ ایک مجموعہ ہے عیوب و محاسن کا۔ اور ہر تاریخ میں یہ دونوں پہلو کسی نہ کسی حد تک ضرور پائے جاوینگے اور کوئی قوم یا ملک ایسا نہیں جو اس اصول سے مستثنیٰ ہو سکے تاریخ انسانی کا مطمح نظر مستقبل ہوتا ہے نہ کہ ماضی۔ واقعات گذشتہ موجودہ نسلوں کے لیے سرمایہ بصیرت و تجربات ہو سکتے ہیں جو مشعل ہدایت کا کام دیسکتے ہیں۔ ہر تاریخ کا ماضی معایب و نقائص سے کم و بیش اتنا ہی پُر ہے جتنا کہ محاسن اور فضائل سے لیکن اکثر مورخین کسی تاریخ کی تصنیف کے وقت اپنے ذہنی اصول پر اس فطری اصول کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور بالعموم یا تو وہ فخر و مباہات کی داستان ہو جاتی ہے اور یا پھر لعن طعن کی ایک طویل کہانی جو بربنائے قومی و مذہبی تعصبات ہوتی ہے۔ کسی مورخ کو کسی قوم یا ملک کی نسبت اپنے ذاتی تعصب کی بنا پر واقعات کو ترتیب دیدینا موجودہ زمانہ میں مشکل ہی نہیں بلکہ ایک حد تک محال کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ مشرق اور ہندوستان کی کتب تواریخ جو اکثر کسی نہ کسی سیاسی پہلو کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ان عیوب سے پُر ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے مسلمان بادشاہ غیر مذہب مصنفوں کی قلم تعصب سے کسی زمانہ میں بھی نہیں بچ سکے ہیں۔ ہندو مسلمانوں میں منافرت اور مغائرت بڑھانے کے لیئے بالقصد مسلمان بادشاہوں کو ظلم و ستم کا

مجسمہ دکھایا جاتا ہے۔ ان کے محاسن پر تعصب کا پردہ ڈال کر معائب نہایت فصاحت و بلاغت سے دکھائے جاتے ہیں۔ کسی معمولی سے واقعہ کو مستقل ایک داستان کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے چنانچہ تمام تواریخ اپنے اس سیاسی کام میں تیر بہدف ثابت ہوتی ہیں اور ایک ہندو طالبعلم کے دل میں عالمگیر کی طرف سے بالخصوص اور مسلمانوں کی طرف سے بالعموم نفرت کا وہ تخم بو دیتی ہیں جو آیندہ چل کر ایک شجر بارآور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مغرب کی موجودہ مادی تمدنی و سیاسی حالات کو دیکھکر یہ مغالطہ ہر شخص کو ہو جاتا ہے کہ مغرب کا دور ہمیشہ سے مشرقی دور سے زیادہ ترقی یافتہ اور روشن رہا ہے۔ اور یہ دراصل مشرقی دور کے اصلی واقعات معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ کتاب الموسوم بہ تاریخ جدید عزیزی فی التحقیقات ایک صحیح موازنہ ہے مشرقی اور مغربی دور کے تمدنی سیاسی حالات کا۔ جناب سید عبدالعزیز صاحب رئیس چھپراوت ضلع بلندشہر نے نہایت جانفشانی کے ساتھ تمام شاہان یورپ کا ان کے ہمعصر شاہان ہندوستان سے مقابلہ کیا ہے۔ ان کی یہ کوشش علاوہ کامیاب ہونے کے سب سے زیادہ اس لیے قابل داد ہے کہ اس موضوع پر یہ غالباً پہلی کتاب ہے۔

کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حکمران اپنے ہمعصر شاہان یورپ سے اکثر امور میں فائق و برتر رہے ہیں اگر اُس زمانہ کی ہندوستان کی مالی حالت کو دیکھا جائے تو بھی نسبتاً یورپ سے زیادہ بہتر تھی۔ مذہبی امور میں بھی رواداری کہیں زیادہ برتی جاتی تھی۔ جناب مصنف نے اپنی اس تصنیف میں مختلف کثیر تواریخ سے مدد لی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو فن تاریخ میں کافی شغف و انہماک رہا ہے۔ تاریخ "انکیوزیشن" جس سے شاہان یورپ کے عجیب و غریب خوفناک واقعات لیے گئے ہیں مصنف کی سعی کا پتہ دیتی ہے یہ تاریخ بابر۔ ہمایوں۔ اور اکبر بادشاہ اور ان کے ہمعصر سلاطین یورپ کے متعلق ہے۔ شروع میں جناب سید حسن صاحب برنی۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل کی تمہید اور جناب رادھاکمود مکرجی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر تاریخ لکھنؤ یونیورسٹی کے ریویو سے مزین ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فن تاریخ سے ذوق رکھنے والوں کے لیے یہ تصنیف ضرور قابل قدر ہوگی۔

کتابت و طباعت معمولی ہے ۱۲۳ صفحات کا ہے بقیمت عہ/۔ سید عبدالعزیز صاحب رئیس محلہ شیخ سرائے بلندشہر سے مل سکتی ہے۔

الکحل اور زندگی

یہ کتاب جان۔ اے۔ ہنٹر ایم۔ بی۔ سی۔ ایم کی کتاب الموسوم بہ "الکحل اینڈ لائف" کا ترجمہ ہے۔ جناب مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی سابق ایڈیٹر اخبار مفید نے نہایت سلیس عبارت میں اس کتاب کو جو بزبان انگریزی تھی اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ جناب مترجم نے ترجمہ کرنے میں کامیاب کوشش فرمائی ہے جس میں ان کو ہمیشہ سے شغف ہے کتاب بذاتِ خود نہایت مفید اور دلچسپ ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہوتا ہے۔ اس میں شراب کے تباہ کن اثرات سے بحث کی گئی ہے شراب کے معائب اگرچہ اخلاقاً۔ رسماً اور مذہباً ہر قوم ملک اور مذہب میں یکساں خیال کئے جاتے ہیں لیکن ہر قوم ملک اور مذہب کے چند افراد اس مہلک اور متعدی مرض میں ہمیشہ سے مبتلا رہے ہیں اور مصلحان قوم کا ہمیشہ سے یہ فرض رہا ہے کہ وہ اس کے مہلک نتائج سے عوام کو بذریعہ کتاب و رسائل مطلع کرتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے شراب خوری کے مضر صحت اور خراب اثرات کو سائنٹفک اصول پر بیان کیا ہے تاکہ موجودہ زمانہ کے روشن دماغ جو مذہبی احکامات کی تعمیل کو اس وقت تک فرض نہیں سمجھتے جب تک کہ وہ ان کے عقل اور ذہن سے مطابق نہو جائیں۔ اُن سائنٹفک دلائل کو تسلیم کر کے شراب سے اجتناب کریں اور احکامات مذہبی کی اہمیت زیادہ ہو۔

اس کتاب میں عقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شراب دراصل عقل سلیم کے لئے سم قاتل ہے اور اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔

ہم جناب مترجم کو ان کی سعی کی داد دیتے ہیں امید ہے کہ ان کو اس ترجمہ سے دینی اور دنیوی دونوں فوائد حاصل ہونگے۔ کتاب چھوٹی تقطیع پر طبع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہے کاغذ اچھا استعمال کیا گیا ہے ضخامت ۱۴۰ صفحے ہیں۔ میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ بمبئی مدارس سے بقیمت ۱۲ ار مل سکتی ہے۔

سرورِعالم

یوں تو صدہا کتب سیر جناب سرورعالم پیغمبر صلعم کی شان میں لکھی جا چکی ہیں اور ہر زبان میں موجود ہیں لیکن موجودہ کتاب جناب سید عبدالمجید صاحب نے اس غرض سے تالیف کی ہے کہ وہ ایک مولود نامہ کا کام دے جیسا کہ اُنہوں نے اپنے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "اگر موجودہ مولود ناموں کے نقائص میری توجہ میں نہ آتے تو میں پیغمبرِ اسلام کے سوانح نگاروں میں آنے کے فخر سے محروم رہتا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب مؤلف صاحب کا مطمح نظر ایک میلاد نامہ تالیف کرنا ہے یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ محفل میلاد بہ ہیئت کذائی فعل جائز ہے یا ناجائز۔ بہر حال موجودہ تالیف میں اس امر کی سعی کی گئی ہے کہ سرورعالم کے تمام واقعات زندگی مستند اور صحیح تواریخ سے لیکر یکجا کر دیئے جائیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بہ حیثیت ایک پیغمبر اور نیز بحیثیت ایک بشر ہونے کے مختصر طریقہ پر یکجا ہو جائیں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیے بالخصوص ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو ان کے ہادی برحق کے واقعات زندگی پر پورے طور پر روشنی ڈالنے کے علاوہ زیادہ طویل نہو تاکہ ہر شخص بسہولت اسکو مطالعہ کر سکے اور وہ حالات اس کو آیندہ زندگی کے لیے مشعل ہدایت کا کام دیں۔ اور ان کو پڑھکر ہر مسلم کے دل میں اپنے نبی برحق کی سچی اور حقیقی محبت پیدا ہو دینی اور دنیوی معاملات میں استواری ہو اور یہ احساس ہو جائے کہ اسلام میں دراصل دین اور دنیا دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک نبی اور پیغمبر وقت اپنے انتہائی کمال معرفت کو پہنچکر دنیوی معاملات کو بھی تعلیم قرآنی کے مطابق اسی طرح انہماک اور شغف کے ساتھ انجام دے سکتا ہے جیسا کہ ایک پکا دنیا دار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ان تمام امور سے معمور ہیں۔ آپ نفس بنفس تمام امور خانہ داری انجام دیتے تھے۔ آپ کی سوانح کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انسان کو کس طرح خالق اور مخلوق کے ساتھ اپنا تعلق رکھنا چاہیئے۔ اور دنیا میں کس حد تک انہماک رکھنا چاہیے۔

ابتک جس قدر کتب سوانح لکھی گئی ہیں وہ یا تو بہت طویل ہیں یا ان میں روایات کے استنباط میں کافی احتیاط

برتی گئی۔

ورِعالم" میں جناب مؤلف نے اس امر کی کامیاب سعی کی ہے کہ تمام واقعات مختصر پیرایہ میں بیان ہوجائیں
بارت سلیس ہو کتاب کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک نقشہ بلادِ عرب کا دیا ہے اور ایک نہایت خوبصورت عکسی
رِ کوہ حرا کی دی گئی ہے تصویر بہت پاکیزہ ہے جس کے دیکھنے سے ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ اور غارِ حرا میں حضور اکرم صلعم
قیام کے واقعات کا خاکہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے بقول مؤلف اس کتاب کی غایت یہ ہے کہ مسلمان ایک طرف
ن مجید کو اپنے سامنے رکھیں اور دوسری طرف اس کی تعلیم کے نتائج او ثمرات کو سرورِ عالم کی ذاتِ اقدس میں
یں اور پھر غور کریں کہ وہ دن کس طرح قریب آسکتا ہے کہ ہم ان انعامات کے مستحق ہوسکیں جن کا قرآن مجید میں
رہ فرمایا گیا ہے"۔ کتاب عمدہ کاغذ پر اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی گئی ہے بڑے سائز پر ہے اور ۶۲
ہ کی ضخامت ہے۔ بقیمت ۱۲ ر ناظم دار التصنیف کپورتھلہ سے مل سکتی ہے۔

کلید فارسی

یہ ایک چھوٹی سی کتاب جناب سید محمد ولی الحسن صاحب نے بچوں کے لیے فارسی میں تصنیف کی ہے اس
ے مقصد یہ ہے کہ چونکہ موجودہ زمانہ میں باوجود انتہائی تعلیم فارسی بولنے کی استطاعت نہیں ہوتی اس لیے بچوں کو
روع سے ہی اسی طرح تعلیم دیجائے کہ وہ آیندہ چل کر فارسی بخوبی بول سکیں۔ اس کتاب میں گیارہ سبق ہیں۔
روع میں چھوٹے چھوٹے الفاظ ہیں اس کے بعد بتدریج بڑے بڑے جملہ دیئے گئے ہیں تاکہ تدریجاً بچوں کو فارسی بولنے میں
را ولت ہو۔ کتاب ۶۱ صفحہ کی ہے مطباعت و کتابت عمدہ ہے۔ بقیمت ۲ ر۔ جناب مولوی ولی الحسن صاحب نمبر ۵۰ بہ
تح گنج لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

اُردو رسائل

ہمایون | یہ رسالہ لاہور سے زیر ادارت جناب بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا و جائنٹ ایڈیٹر
جناب حامد علی خانصاحب۔ بی۔ اے ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ اس کی قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ، اور فی پرچہ

۸۰ رنمونہ ۹۰۰ہے سائز علیگڑھ میگزین کی برابر ہے۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے اس کا سالگرہ نمبر بابتہ ماہ جنوری ۲۷ء بغرض ریویو موجود ہے۔ ہمایون کا طرہ امتیاز اس کا موقت الشیوع ہونا ہے بالخصوص ہمارے تبادلہ میں سب سے زیادہ پابندی کے ساتھ آتا رہاہے اور ہم کو محجوب کرتا رہا ہے۔

اس کا حجم ۱۰۸ صفحہ ہے موجودہ نمبر میں نصف درجن تصاویر کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے جن میں سے بعض نہایت دلکش ہیں مثلاً "آبجو" اپنے قدرتی منظر کے لحاظ سے بہت موثر اور دلچسپ ہے اُسی کے متعلق ایک نظم بالمقابل صفحات ۳۷ و ۳۸ پر لکھی گئی ہے جس کو پڑھکر منظر کی خوبی دوبالا ہوجاتی ہے۔ جناب مُدیر کا مضمون بعنوان "دنیا کی مذہبی ومعاشرتی تاریخ پر ایک نظر" تقریباً ۲۰ صفحہ کا بیحد دلچسپ اور مفید مضمون ہے جس کو دیکھنے سے جناب مدیر کی وسعت نظری اور سنجیدہ خیالی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان بہت سنجیدہ ہے ہمیں مسرت ہے کہ یہ مضمون مسلسل طور پر مختلف اشاعتوں میں شائع ہوگا اور اپنی مفید علمی معلومات سے عوام کو فائدہ پہنچائیگا۔ ایک افسانہ جناب سید امتیاز علی صاحب تاج کا "جادو کی ٹوپی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ امتیاز صاحب افسانہ نویسی میں کافی شغف رکھتے ہیں اور موجودہ افسانہ ان کے فطری انہماک کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ افسانہ اس انداز سے شروع کیا گیا ہے کہ آخر تک اس میں پڑھنے والے کو یکساں انہماک اور ذوق رہتا ہے۔ اگرچہ دس گیارہ صفحات پر مکمل افسانہ ختم ہوگیا ہے لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک مکمل قصہ ہے۔

"اقوال وافعال" جناب سلطان حیدر صاحب جوش کے حسن تخیل کا نتیجہ ہے حیات انسانی کا تجربہ اقوال وافعال میں نہایت خوش اسلوبی سے دکھایا ہے اور تمام مضمون ایک دلچسپ لطیفہ ہے۔ اس قسم کے مضامین کی ہر رسالہ میں اس کی سنجیدگی اور حد سے زیادہ متانت کو رفع کرنے کے لیے بیحد ضرورت ہوتی ہے ہمیں امید ہے کہ مقالہ نگار "سہیل" کے لیے بھی کوئی مقالہ تیار فرماویں گے بشرطیکہ جناب مدیر کے معیار ظرافت پر پورا اترے۔

ہمایون ایک عرصہ سے ادب اُردو کی وسط پنجاب میں خدمت انجام دے رہا ہے اپنے مضامین کے معیار اور کتابت وطباعت کے اعتبار سے ہر لحاظ سے مسلمہ طور پر اُردو رسائل میں بہترین رسالوں میں خیال کیا جاسکتا ہے جس کے لیے جناب بشیر احمد صاحب مدیر اور ان کے معاون جناب حامد علی خاں صاحب مستحق مبارکباد ہیں۔

بہارستان | یہ رسالہ بھی ہمایوں کی طرح لاہور سے بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ ہر مہینہ بغیر کسی یاددہانی کے موجود ہوتا ہے۔ جناب ابوالمعانی حضرت اختر صاحب شیرانی اس کے مدیر مسئول ہیں اور رفیعی اجمیری صاحب مدیر معاون۔ رسالہ کی ترتیب مضامین کی فراہمی اور مدیر معاون کا انتخاب جناب مدیر کی حسنِ نظر کا پتہ دیتے ہیں چند نمبروں میں آثار عتیق پر جناب سید حفیظ الدین صاحب کے مضامین کا سلسلہ بجید دلچسپ اور پُر از معلومات شائع ہوا ہے۔ بہارستان بابتہ ماہ مارچ میں مصر کے چند قدیم یادگار مقامات کے عنوان سے ایک مضمون جناب حفیظ الدین صاحب کا شائع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چار عکسی تصاویر عمارتوں کی نہایت دبدبہ زیب درج کی گئی ہیں۔ مضمون کے پڑھنے سے وہاں کے قدیم حالات کا پتہ چلتا ہے عبارت بہت صاف اور شستہ ہے۔ جگہ جگہ تاریخی حوالہ دیا گیا ہے اس قسم کے مضامین علاوہ دلچسپ ہونے کے بجید مفید ہوتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جناب مدیر آیندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کی سعی فرمائینگے۔ دوسرا مضمون تحقیق قصہ پدمنی جناب مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ بھی بہارستان کی متعدد اشاعتوں میں شائع ہوا ہے۔ مقالہ نگار صاحب نے تاریخی واقعات کی روشنی میں غلط العوام روایات کے صحیح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مولانا موصوف کہنہ مشق بزرگ ہیں اور ان کا تاریخ سے ذوق ہمیشہ سے نمایاں رہا ہے۔

دارالعلوم علیگڑھ کے مشرقی کتب خانہ سے ایک عرصہ تک سیراب ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ موصوف اپنے علمی کارناموں سے اکثر یاد فرماتے رہینگے اور اگر بہارستان کی بہار سے فرصت ملے گی تو علیگڑھ میگزین کو بھی زیادہ دنوں تک فراموش نہ رکھیں گے۔

ادبستان | یہ رسالہ انجمن معین الادب کا ماہ بماہ بمبئی سے شائع ہوتا ہے اس کے مرتب رشید احمد صاحب صدیقی ہیں (لیکن ناظرین کرام ان کو مرتب ہمیں میں مدغم نفرمادیں) جنوری نمبر پیش نظر ہے قدیم رسالوں کے سائز پر معمولی کتابت وطباعت کے ساتھ تقریباً ۴ جز پر ہے۔ صفحہ اول پر اُردو کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کی تصویر ہے اور اس کی پُشت پر ترکی مشہور خاتون خالدہ خانم کی تصویر ہے اس کے نیچے صخرۃ اللہ المشرفہ اور مسجد الاقصیٰ کی دو تصویریں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً دو تصاویر اور بھی دی گئی ہیں شروع میں مضمون جناب مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا مضمون ہے جو فی الحقیقت حکیم میر ضامن علی صاحب جلال

لکھنوی کی سوانح عمری ہے اور ان کے کلام پر تبصرہ ہے جس میں حکیم جلال کی نمایاں خصوصیات اور ان کے تغزل کا رنگ دکھایا ہے آخر میں "اقتباسات" کے تحت میں، انگریزی جرائد و رسائل سے مفید معلومات اخذ کئے گئے ہیں اور معلومات کے عنوان سے بہت سی کار آمد باتیں درج کی گئی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کا یہ رسالہ ہمارے رشید احمد صاحب صدیقی کے رسالہ کی طرح ادبی دنیا میں وقعت کی نظر سے دیکھا جائیگا۔ خدا کرے کہ یہ ادبی رسالہ بمبئی کے آسمان پر ہمیں ہو کر چمکے۔ آمین

مخزن ایک عرصہ دراز کے بعد جناب شیخ عبدالقادر صاحب کے ادبی مخزن کا جو دبائے روزگار کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا تھا اور جس میں شیخ صاحب موصوف کے تبحر علمی و ادبی کے کارنامے مدفون تھے جناب ابوالاثر حضرت حفیظ صاحب جالندھری کی چشم بصیرت نے بالآخر سراغ لگالیا۔ مخزن جناب شیخ صاحب موصوف کی زیر ادارت اسی شان و شوکت کے ساتھ نکلتا تھا جس طرح آجکل "معارف" یا "شمع"۔ مخزن اس لحاظ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے اُردوئے ادب کی خدمت کا بار اٹھانے میں سبقت کی اور اس خدمت کو آخر دم تک نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا۔ جب شیخ صاحب کو ترم کے دیگر مفید کاموں کی طرف انہماک زیادہ ہوگیا تو مجبوراً مخزن کو بند کر دینا پڑا مخزن نے اُردو زبان میں دیگر رسالوں کے اجراء کے لیے ایک شاہراہ قائم کر دی۔ اور اسی مناسبت سے موجودہ نمبر ابابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء کا آغاز عنوان۔ "اُردو زبان کا اولین صفحہ" نہایت موزوں ہے۔ جناب حفیظ صاحب نے انتہائی جسارت سے کام لیا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ ادبی دنیا مخزنِ قدیم کی دنیا سے کہیں زیادہ آگے بڑھ گئی ہے اسی سرزمین لاہور میں اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس کا سائز وہی مقبول انام میگزین کا سائز ہے کتابت وطباعت اور کاغذ کی نفاست میں اپنے ہم وطن دیگر رسائل سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔

پہلا ہی صفحہ جناب چغتائی صاحب کے فن مصوری کا ایک دلکش منظر پیش کرتا ہے جس کا عنوان "سکوت" ہے۔ یہ تصویر دلفریبی اور دیدہ زیبی میں فن کا کمال دکھا رہی ہے۔ دوسری تصویر بانی مخزن یعنی جناب شیخ عبدالقادر صاحب کی ہے۔ شیخ صاحب کا ایک مضمون "مخزن کا نیا دور" درج ہے جس میں اُنھوں نے اس کے پہلے واقعات ارقام فرمائے ہیں۔ اور آئندہ کے لیے چند مفید مشورے دیئے ہیں جن پر ہر ادبی رسالہ کو کاربند

ہونا چاہیئے۔

مثلاً ان کا یہ فرمانا کہ ادبی رسالہ کو چاہیے کہ وہ سیاسی یا مذہبی جھگڑوں میں نہ اُلجھے اسی طرح شیخ صاحب موصوف نے علم سیاسیات یا پولٹیکل سائنس کے مضامین فراہم کرنا ضروری خیال کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جناب مدیر صاحب ان امور کا لحاظ فرمائینگے۔

ایک مضمون "مُدنیات" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون اپنی نوعیت میں مخصوص شان رکھتا ہے اس کی اہمیت کے لیے مقالہ نگار صاحب کا اسم گرامی و نام نامی کافی ضمانت ہے یعنی یہ مضمون جناب علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب۔ سی۔ بی۔ ای۔ ایل۔ ایل۔ ایم (کنٹب) پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے زور قلم کا نتیجہ ہے اس کے سلسلہ میں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہوگا۔ چونکہ اس کے مصنف صاحب کی علمی قابلیت کا زمانہ معترف ہے مخزن فراہمی مضامین کے اعتبار سے بھی اپنے ہمعصر جریدوں سے پیچھے نہیں رہا ہے ہمیں امید ہے کہ اُردو ئے ادب سے ذوق رکھنے والے اور مخزنِ قدیم کے دلدادہ اس کو اسی کا سچّا جانشین تصور کریں گے۔

شمع | یہ ادبی رسالہ قدیم مخزن کے سائز پر آگرہ سے زیرِ ادارت جناب محمد حبیب صاحب بار ایٹ لا۔ ایم آر۔ اے۔ ایس۔ ایم۔ ایل۔ سی۔ اور حسن عابد صاحب جعفری بی۔ اے (آکسن) بار ایٹ لا۔ شائع ہوتا ہے۔ علی گڑھ میگزین کی طرح اس کا موقت الشیوع ہونا بھی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بالخصوص تبادلہ میں بغیر یاددہانی بطور خود باوجود قرب بہت کم آتا ہے۔ اس میں خاص طور پر علمی اور سنجیدہ تاریخی مضامین کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے۔ جناب مدیران کے اسمائے گرامی کے بعد کے لاتعداد حروف ان کی علمی قابلیتوں پر دلالت کرتے ہیں۔ تاریخی مضامین کے علاوہ اس میں خاص اہتمام سے عکسی نفیس تصاویر جن کا تعلق اکثر تاریخ سے ہوتا ہے بالالتزام شائع ہوتی ہیں جنوری نمبر اس وقت سامنے ہے شروع میں جناب ہادی صاحب مچھلی شہری کی نظم ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

اے ضیا بخشِ نظر اے "شمع" اے درِ یتیم
اے نشانِ زندگی اے مایۂ ذوقِ سلیم

شیخ علی حزیں مرحوم کی نشست گاہ اور ان کے مقبرہ کی عکسی تصاویر قابل دید ہیں ایک افسانہ "تجارت" کے عنوان سے جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب مدیر رسالہ کا ہے۔ ہمیں تعجب ہے کہ حبیب صاحب نے میگزین نوازی

کے لیے ایک مرتبہ اپنی اُردو نویسی کے لیے معذرت پیش کی تھی جس کا یقین تو جب بھی نہ تھا اب اس یقین کے لیے نظیر مل گئی ہے۔ افسانہ اپنی طرز بیان اور انداز میں خاص نوعیت رکھتا ہے اور لکھنؤ کی اُردو کا ایک نمونہ ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ سرکار آصفیہ حیدرآباد نے اس علمی رسالہ کو اپنے مدارس میں جاری فرما دیا ہے۔

لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور کاغذ چکنا اور قیمتی ہوتا ہے سالانہ حجم ۴۰۰ صفحات اور کم از کم ۳۰ تصاویر سے مزین ہوتا ہے سالانہ چندہ صرف چھ روپیہ ہے۔

مرقع | "دارالادب لکھنؤ کا مقبول و جہان عزیز جریدہ" زیر ادارت جناب سید مقبول حسین صاحب وصل بلگرامی ماہانہ شائع ہوتا ہے جنوری نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ جس کا حجم ۹۶ صفحہ ہے فراہمی مضامین کا خاص اہتمام کیا گیا ہے معمولی کتابت و طباعت ہے۔ چونکہ سال کا پہلا پرچہ ہے اس لیے اس کو ظاہری و معنوی حیثیت سے کامیاب بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مرقع میں بالعموم بلّی تصاویر کی بجائے اساتذہ کا عکس تحریر ہوتا ہے۔ چنانچہ موجودہ نمبر میں حضرت داغ اور امیر مینائی مرحوم کے گرامی ناموں کا عکس موجود ہے اور مختلف المذاق مضامین درج کیے ہیں مثلاً جان کیٹس کے حالات جناب مجنوں گورکھپوری اور رنجیت سنگھ پر مرزا محمد عسکری صاحب بی۔ اے اور شیشہ سازی کے متعلق جناب روان کے مضامین قابل قدر ہیں اس کے علاوہ اس میں تین فسانے ہیں جن میں کا ایک جناب نیاز صاحب فتحپوری کا جان عالم اور ملکہ نگار ندرت جودت اور تخیل کے لحاظ سے قابل دید ہے "سیرت صحابہ کا ایک ورق" بیحد دلچسپ اور معلومات سے مملو ہے۔ ہم جناب مدیر کو اس نمبر کے لیے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

حرم | یہ خواتین کا ادبی رسالہ بیگم عبدالغفور کی لیڈی۔ ڈاکٹر ایل۔ ایم۔ پی۔ کی زیر ادارت بھیت کلتہ کھان پیلی سے ہر ماہ چھوٹی تقطیع پر معمولی لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہوتا ہے جس میں خواتین کے متعلق دلچسپ اور کارآمد مضامین درج ہوتے ہیں۔

جنوری نمبر ۲۷ء پیش نظر ہے اول مضمون بیگم مولانا محمد علی صاحب کا "کانفرنس اصلاح تعلیم نسواں" کا ہے۔ عبارت نہایت سلیس ہے انہوں نے اصلاح نسواں کی عمدہ تجاویز پیش کی ہیں۔ نہایت خوبی سے انہوں نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ پردہ کا سوال اور تعلیم نسواں کا سوال دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ ایک کو دوسرے پر ملتوی کرنا اور

کو ایسے ہنر۔ کام اور دستکاریاں سکھا دی جائیں جن سے وہ باعزت اور قابل گذران آمدنی پیدا کرسکیں۔ دوسرا کام یہ ہوگا کہ وہ مشتاق تعلیم اور مستحق خواتین کو قرض حسنہ کے طور پر وظائف دے کر اعلیٰ تعلیم دلائے خصوصاً بیوہ مطلقہ اور معلقہ خواتین اس ذریعہ سے نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام قوم کے لیے مفید اور کارآمد بن سکتی ہیں۔ تیسرا کام یہ ہوگا کہ اسکے ماتحت زنانہ و مردانہ لیٹریری بورڈس قائم کرکے ایسی کتابیں تصنیف تالیف اور ترجمہ کرائی جائیں جو نصاب نسواں میں شامل ہوسکنے کے قابل ہوں۔ چوتھا پروگرام جو سب سے زیادہ اہم ہوگا وہ یہ ہے کہ اس کے ماتحت تعلیم اطفال ہو یعنی نو سال کی عمر تک بچوں کو خانہ نسواں کی چار دیواری کے اندر ہی رکھکر ان کی تعلیم اور تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اور جب بچے نو سال سے زائد ہوجائیں تو اسی شعبہ سے ان کو وظائف دے کر اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسکیم بہت بڑی تجویز ہے لیکن جسقدر بڑی ہے اسیقدر مفید اور کارآمد بھی ہے ہمیں مسرت ہے کہ جناب میر عزیز الرحمن صاحب کی اس دماغی سعی میں معاونت کے لیے بہت سی روشن دماغ خواتین نے عملی حصہ لینے کا وعدہ کرلیا ہے اگر جناب بیگم صاحبہ بھوپال نے اس طرف نظر عنایت مبذول فرمائی تو ہمیں توقع ہے کہ یہ اسکیم بہت جلد کامیاب ہوگی۔ ہم جناب مجوز کے کامیابی کے لیے دست بدعا ہیں۔

خیاباں | یہ رسالہ زیر ادارت جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) لکھنؤ سے جاری ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ نومبر ۲۶ء میں معارف کے سائز پر عمدہ طباعت اور کتابت کے ساتھ شائع ہوا ہے سالانہ چندہ صہ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ ہے۔ اس کے حقیقی اغراض حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اُردو زبان و ادب کی تحقیق (۲) سلف الصالحین کے علمی کارناموں کا احیاء (۳) اُردو میں علوم مغربیہ اور مشرقیہ کی ترویج۔ (۴) باقیات الصالحات کے علمی تحقیقات کی اشاعت (۵) دوسری زبانوں کے علمی تراجم و اقتباسات (۶) مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ ہمیں امید ہے کہ جناب مدیر صاحب لکھنؤ کی ادبی فضا میں رہکر ان تمام مقاصد میں کامیاب ہونگے۔

عبدالباسط

ایڈیٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

مسٹر انیس الدین احمد رضوی ایم اے

(علیگ)

جلد (۶) بابت ماہ مارچ و اپریل ۱۹۲۸ء نمبر (۱ و ۲)

فہرست مضامین

اظہارِ تشکر

مسٹر محمود احسن صدیقی بی اے سابق اڈیٹر علی گڑھ میگزین شعبۂ اُردو نے حسب معمول ایک سال کی ادارت کے بعد ماہِ گزشتہ میں اپنی خدمات سے سبکدوشی حاصل کی اور مسٹر انیس الدین احمد رضوی ایم اے امروہی متعلم لا کلاس یونیورسٹی نے سال سنہ ۲۸-۲۹ء کے لئے عہدۂ مُدیری کا چارج لیا۔ مجھے شکریہ کے ساتھ یہ امر ظاہر کر دینا ہے کہ اس نمبر میں اکثر مضامین مسٹر محمود احسن بی اے کے فراہم کئے ہوئے ہیں جن کا سلسلہ اگلے نمبر میں بھی چلا گیا ہے جس تندہی، خلوص اور ادائے فرائض ادارت کے احساس ذمہ داری سے مسٹر موصوف نے کام کیا وہ لائق تحسین اور جو کچھ ملکہ ان کو میگزین کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انتخاب مضامین میں حاصل ہو گیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اُمید ہے کہ وہ فن صحافت میں ہمیشہ کامیاب ثابت ہوں گے۔

میں مسٹر مشیر احمد علوی بی اے متعلم لا کلاس کے رضاکارانہ خدمات کا دل سے اعتراف کرتا ہوں جو امداد پیہم اُن سے ملی وہ میگزین کے لئے بیش بہا سمجھی گئی۔ چنانچہ جناب پرو وائس چانسلر صاحب سابق نے میری درخواست پر موصوف کو معاون خصوصی پریسیڈنٹ میگزین منظور فرما لیا اور وہ اسٹاف ادارت میں شامل کئے گئے۔

قاضی جلال الدین پریسیڈنٹ میگزین کمیٹی

اُردو میگزین کی نئی منسٹری

پریسیڈنٹ کمیٹی :- پروفیسر قاضی جلال الدین - ایف آر جی ایس

سنسر انٹرمیڈیٹ کالج :- مسٹر عبدالشکور صاحب ایم اے

ایڈیٹر :- مسٹر انیس الدین احمد رضوی - ایم اے

اسسٹنٹ ایڈیٹر انٹرمیڈیٹ کالج :- مسٹر محمد حبیب اللہ خاں

معروضات

عالم متغیر ہے، کبھی ایک حال پر قایم نہیں رہتا، کبھی ایک صورت میں ساکن نہیں ہوتا۔ اس کی ہر شان میں تبدل اس کی ہر کیفیت میں تغیر اس کا بدیہی اصول ہے۔ یہی اصول بنائے عالم کے ہر جزو پر منطبق ہوتا ہے۔ کل کے ساتھ عناصر ترکیبی بھی گردش میں رہتے ہیں۔ علی گڑھ میگزین کا عملۂ ادارت اس کا بین ثبوت ہے۔ ہر نیا سال اپنی خوش آہنگ توقعات کے ساتھ آتا ہے اور میگزین کے صفحات پر ایک نئی مہر ثبت کرجاتا ہے۔ باسط صاحب کا دور ادارت ختم ہوا تو محمود صاحب کا زمانہ آیا۔ آج محمود صاحب اس بار سے سبکدوش ہوئے تو یہ صبر آزما خدمت خاکسار کو تفویض ہوئی۔

جس طرح عصر عتیق میں سلطنت روم کا ہر جدید مجسٹریٹ (ایڈیٹر) اپنے دورِ نظامت کی ابتدا میں اپنے مسلک اور لائحۂ عمل کے متعلق اعلان شائع کیا کرتا تھا، اسی طرح دنیائے ادبیات میں کسی مجلہ کا ہر جدید مدیر اس کو خوش گوار ترین فرض تصور کرتا ہے کہ رسالہ کے معیار اور ترتیب کے متعلق چند بلند بانگ دعادی کے ساتھ اپنے دورِ ادارت کی ابتدا کرے۔ یہی کیفیت میگزین کی بھی رہی ہے۔ لیکن آج اگر بنظر امعان دیکھا جائے تو یہ طریقہ ایک فرسودہ رسم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس قسم کے تمام دعادی عموماً بہت کم پایۂ تکمیل کو پہونچتے دیکھے گئے ہیں۔ ان اعلانات کے حرف حرف سے ہمارے کان آشنا ہی نہیں ہوگئے بلکہ تقریباً بالکل تھک چکے ہیں۔ لہٰذا ان کا اعادہ کرنا تقریباً تحصیل حاصل ہے۔

تاہم اس قدر عرض کردینا نہایت ضروری ہے کہ گزشتہ مدیران نے جس حسنِ انتظام اور قابلیت کے ساتھ میگزین کے قایم شدہ معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا نباہنا بھی آج سخت مشکل نظر آتا ہے میرے پیش رو جناب محمود حسن صاحب صدیقی نے جس طرح انتہائی کاوش اور جانفشانی کے ساتھ اپنے دورِ ادارت میں میگزین کی گزشتہ روایات کو قایم و برقرار رکھا ہے، وہ انھیں کا حصہ تھا۔ میگزین کی گزشتہ اشاعتیں ان کے ذوقِ ادب اور تبحرِ علمی کی شاہد ہیں۔ آج یہ کتنا عبث ہے کہ اگر محمود صاحب کو اپنی خانگی مصروفیات سے ذرا سی بھی فرصت مل جاتی، تو میگزین کا کانووکیشن نمبر جس کا اعلان ملک کے اکثر اخبارات و رسائل میں شائع ہوچکا ہے دنیائے ادب میں ایک نئی شان پیدا کردیتا۔ لیکن کانووکیشن کا اس سال کوئی خصوصیت نہ رکھنا۔ باہر سے اس نمبر کی صرف چند فرمائشوں کا آنا۔ مطبع کے پچھلے گراں قدر بلوں کا یک لخت ادا کیا جانا اور رسال تمام کے

بحث کا ختم ہونا۔ ایڈیٹر صاحب کا مستقل طور پر غیر حاضر ہو جانا، ایسے چند موانعات تھے جس نے کسی خاص باتصویر نمبر کی اجازت نہ دی۔

عالم کی تغیر پذیری اک ایسا کلیہ ہے، جس میں استثنار کی بہت کم گنجائش ہے۔ لیکن بہر نہج اُصول مسلّمہ کے مطابق ہر کلیہ کے ساتھ ایک نہ ایک مستثنیٰ ضرور ہوتا ہے۔ اس کی زبردست دلیل خود ہمارے پیش نظر ہے۔ ہر شے کو تغیر ہوتا ہے، ہر چیز ایک مدت معینہ کے اندر تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن علی گڑھ میگزین کی "باقاعدہ بے قاعدگی" ازل سے ہی کچھ اس قسم کا خمیر لیکر آئی تھی کہ اس میں تغیر و تبدل ہوتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے لئے کس کی ذات مورد الزام قرار دی جا سکتی ہے۔ صرف اس قدر ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم ان تمام الزامات کو اپنے سر لے لیں جس کے لئے ہم بطیب خاطر تیار ہیں۔ بہرحال حسب معمول بے قاعدگی ہوئی، اور اس حد تک ہوئی کہ ہمارے پاس معذرت لنگ کے سوا اس کا کوئی جواب نہیں۔

اعتراض کرنا بہت سہل ہے، لیکن جب انسان خود کسی ذمہ داری میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس پر حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہمارا روئے سخن خود طلبائے جامعہ کی طرف ہے۔ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ علی گڑھ میگزین ان کا اور صرف ان کا ہے۔ لیکن افسوس! اس اندازِ تغافل کا کیا علاج کہ غریب مدیر کی طرف سے مضامین کے لئے اعلان کیا جاتا ہے، اور اس کے جواب میں کامل ڈیڑھ مہینہ کے عرصہ میں صرف ایک غزل موصول ہوتی ہے، اور وہ بھی بعد از وقت۔ ان بے نیازیوں کو پیش نظر رکھئے اور خیال فرمائیے کہ میگزین کے اربابِ حلّ و عقد بیرونی مضامین شائع کرنے میں کس حد تک حق بجانب نہ تھے۔ آپ کو میگزین کی مجلسِ عاملہ کی ذمہ داریاں صاف نظر آتی ہیں، لیکن اس کے مقابلہ میں ذرا خود اپنی ذمہ داری بھی محسوس فرمائیے۔

یہ تعلیمی سال یونیورسٹی کے لئے جس قدر جگر گداز ثابت ہوا ہے، وہ آپ اپنی مثال ہے۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات کے انتظام و ترتیب کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا، مشاہیر ملت کی شہادتیں ہوئیں، اور بالآخر خاص عید الفطر کے دن اس کمیشن کی رپورٹ شائع بھی کر دی گئی۔ کمیشن نے اصلاح کی غرض سے جو سفارشات کی تھیں، اُن پر غور کرنے کے لئے یونیورسٹی کورٹ کا خاص اجلاس ۱۵ اپریل کو منعقد ہوا۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم واقعہ کمیشن کی رپورٹ کے ایما کے مطابق عالی جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای، ایم اے، پی ایچ ڈی کا استعفا دینا تھا جو منظور کر لیا گیا۔ قدرت کے معاملات میں ہم کچھ دخل نہیں رکھتے، لیکن مشاہدات کی تکذیب کس طرح کی جا سکتی ہے۔ سب نے دیکھا کہ ادھر یونیورسٹی کورٹ کے اجلاس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا استعفاء پیش ہوا، اور ادھر آسمان سے برف کی اینٹیں برسنے لگیں۔ اس قدر طویل اور خطرناک ژالہ باری! ممکن ہے کہ پرانے بزرگوں میں سے کسی کو اس کی مثال یاد آ جائے۔

بہرحال ڈاکٹر صاحب نے استعفا دیدیا۔ کامل ۳۳ برس جس مادرِ علمی کی خدمت انتہائی انہماک اور سرگرمی کے ساتھ انجام دیتے رہے، آخرکار آج اس سے الگ ہوجانے ہی میں جناب ممدوح نے مصلحت دیکھی۔ جس کے جوشِ محبت نے کل تک تمام اعزازات کو صرف ایک نظرِ استحقار سے دیکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ آج بدرجۂ مجبوری اس سے کنارہ کشی کرنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی اور انتظامی قابلیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے، اور ان کا حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق حریفوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہتا۔ بالخصوص طبقۂ متعلمین سے انہیں جو دلی ہمدردی اور انسیت تھی، اس کا ثبوت بارہا مختلف مواقع پر مل چکا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جب وہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ رہے ہیں، تو یونیورسٹی کے ہر گوشہ سے "الوداع" کی محبت آمیز آوازیں آرہی ہیں۔ تقریباً تمام مختلف سوسائٹیاں اور علمی انجمنیں وداعی اڈریس پیش کرکے اپنے جوشِ عقیدت کا اظہار کررہی ہیں۔ لیکن ان دلی حسیات وجذبات کا اظہار زبان وقلم سے ناممکن ہے۔ ان کیفیات کی تصویر کھینچنا الفاظ کی طاقت سے باہر ہے۔ البتہ

"ز چشمم آستیں بردار تا بینی تماشا کن"

"نورجہاں" امرتسر اور تحریکِ اُردو خواتین

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خطۂ پنجاب زبانِ اُردو کی ترقی وبہبود میں اپنی مساعی جمیلہ سے کافی حصہ لے رہا ہے لاہور اُردو کے اکثر وبیشتر اخبارات ورسائل کا مرکز ہے جس قدر رسالے اس شہر سے شائع ہوتے ہیں اس قدر شاید کسی دوسرے شہر سے نہیں نکلتے۔ لیکن اب لاہور کے ساتھ امرتسر نے بھی اسی طرف پیش قدمی شروع کردی ہے۔ اور چند علمی اور ادبی رسائل کے اجراء سے دنیائے ادب میں نام پیدا کرلیا ہے۔ ان رسائل میں خصوصیت کے ساتھ "نورجہاں" ممتاز نظر آتا ہے۔ یہ ایک زنانہ رسالہ ہے، جس کی ترتیب وتنظیم کلیتہً نسوانی ہاتھوں میں ہے۔ صرف اس کی نگرانی کا بار جناب میر عزیز الرحمن صاحب (علیگ) کے سر ہے، باقی تمام عملۂ کارکنان زنانہ ہے۔ "نورجہاں" کی جس قدر اشاعتیں نظر سے گزری ہیں اُن سے رسالہ کے معیارِ ادب اور اڈیٹر صاحبہ کے ذوقِ علمی کا پتہ چلتا ہے۔ رسالہ کا سالانہ نمبر حال ہی میں شائع ہوا ہے، اور ان تمام ادبی روایات کا حامل ہے، جو ایک رسالہ کے لیئے مایۂ ناز ہوسکتی ہیں۔ ادبیاتِ اُردو سے دلچسپی لینے والے حضرات سے پُر زور سفارش ہے کہ وہ اس رسالہ کی معاونت سے کوتاہی نہ کریں اور اپنی ہمدردی کا عملی ثبوت دیں۔

اسی کے ساتھ جناب میر صاحب موصوف ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے دار الخواتین قائم کر کے ملک کی نسائی آبادی پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ دار الخواتین کی تحریک میر صاحب کا ایک ایسا شاندار کارنامہ بن کر رہیگی کہ دوسرے اس کی تقلید کرنا فخر سمجھیں گے۔ ہم اس مفید اور کارآمد تحریک کی کامیابی کی دل سے متمنّی ہیں، اور اُمید کرتے ہیں کہ ہندوستان کی اس مظلوم جنس کے لیئے دار الخواتین ایک رحمت اور برکت ثابت ہوگا۔

انیس الدّین احمد رضوی ایم اے

غزل نعتیہ جلالی

گفتم مسلّط بر دلم گفت ایں سرو کارِ منست — گفتم کجا سر بر زنم گفتا درِ دارِ منست

گفتم بجاں تنگ آمدم گفتا نہ ایں کارِ منست — گفتم کہ قربانت شوم گفتا نہ انکارِ منست

از رنگِ رخ پرسیدمش گفتا کہ خارا زہرِ تو — چوں داغِ دل بنمودمش گفتا کہ گلزارِ منست

گفتم یکے دم درکشد گفتا کہ من غمخوارِ او — گفتم چو نالہ برکشد گفتا ستمگارے منست

گفتم کہ از حسن آفریں دیوانۂ جوید نشاں — در حسن از روے مہوشاں گفتا کہ او یارے منست

گفتم چہ نعت آں کز دلہاے عالم خستہ اند — گفتا نمی بینی کہ آں ابروے خمدارِ منست

گفتم منم دیوانۂ بہرِ جمالِ مصطفےٰ — از ناز اشارت کرد و گفت آں عکسِ رخسارِ منست

گفتم چہ طور آں نغمۂ دل دزد اوُدی بود — لحنے کہ در وجد آورد گفتا کہ گفتارِ منست

گفتم چہ فردوسِ بریں گفتا مآبِ امّتم — گفتم کہ جبریلِ امیں گفتا جلو دارِ منست

گفتم کرا از آسماں؟ گفت کہ جولاں گاہِ من — گفتم براقِ برق ماں؟ گفتا کہ رہوارے منست

گفتم گروہِ عاصیاں گفتا طلب گارِ دیم — گفتم خدائے مہرباں، گفتا خریدارِ منست

گفتم نجاتِ اُخروی۔ گفتا رہِ مقصودِ من — گفتم نشاطِ دنیوی۔ گفتا کہ ایں عارِ منست

گفتم جلالِ خستہ دل آمد بہ پیشت منفعل
گفتا مشو از مے خجل کو ربِ غفارِ منست

وکٹوریہ گیٹ سے

یادِ ایّام

۱۹۲۸ء کی پہلی سہ ماہی | خوشگوار موسم اور تعلیمی سال کی منزل اوسط ہونے کے سبب کبھی یہ سہ ماہی "کالج لائف" کا عہدِ شباب گنا جاتا تھا۔ نہ صرف گنا جاتا تھا بلکہ منایا جاتا تھا۔ اسپورٹس کے جلسے، کرتبوں کی نمائش، کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، ٹینس کے پر لطف نظارے کالج کے میدانوں کو بہار کے رنگ میں رنگ دیتے تھے۔ علی گڑھ کی شامِ بنارس کی صبح پر ہنسا کرتی اور شبِ ماہ کی گیڈیاں روز روشن کی جولاں گاہوں پر پھبتیاں اڑانے کی اہل بن جاتی تھیں آج پکنک کی پارٹی زیر قیادت جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب جلال پور کی طرف کوچ کر رہی ہے۔ ہر متنفس گویا ایک لام پر جا رہا ہے۔ نوکر چاکر کوئی ساتھ نہیں ڈیڑھ دو سو آدمیوں کا دستہ کیل کانٹے سے درست۔ اپنی اپنی ضروریات کا خود کفیل بن کر کسی فرضی رزم گاہ کا عازم ہے۔ پیدل سفر ہے چلتے چلتے ایک باغ میں پہنچتے ہیں۔ ہر متنفس کسی ہرے بھرے درخت کی چھاؤں تلاش کر کے اپنا ڈیرہ جماتا ہے۔ جنگل میں منگل کا صحیح نقشہ کھینچتا ہے۔ "اول طعام بعدہٗ کلام" کا خیال دماغ میں سمایا ہے اور سب سے پہلے کھانا پکانے کی فکر دامن گیر ہو کر ہر پیر و جواں کو پخت طعام کی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اینٹ پتھر، مٹی کے ڈھیلے جا بجا سے ڈھلنے لگتے ہیں اور آن کی آن میں دیکھو تو ہر درخت کے نیچے ایک گنواری چولھا طیار ہے۔ برتن اور رکابیاں البتہ ڈائننگ ہال کے صدقہ میں مل جاتی ہیں۔ کوئی آلو ابال رہا ہے کوئی روغنی روٹی چپٹ چپٹا کر اقلیدس کے ہر شکل کی نقل اتار رہا ہے۔ ہمارے بزرگ منش بر سر صاحب پلاؤ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اونکڑوں بیٹھ کر زمین دوز چولھے کی آگ جس جھک جھکاؤ اور ہاتھ اٹھاؤ سے پھونک رہے ہیں اس کا نقشہ بآسانی مصورِ خیال پیش کر سکتا ہے۔ یہی حال اور یہی چہل پہل ہر درخت کے نیچے باصرہ نوازی کرتی تھی۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر باسلیقہ جلسہ کا انعقاد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صدر ہیں۔ قاضی جلال صاحب نظم سے ابتدا فرماتے ہیں ان کے بعد باری باری ہر گوشہ سے سامعہ نوازی کا سلسلہ شروع ہو کر قریب بہ مغرب اجلاس ختم ہوتا ہے۔ شاداں و فرحاں کوئک مارچ کرتے ہوئے بورڈنگ واپس آتے ہیں۔ مارچ اور اپریل آجاتا ہے

آندھی کا ڈر نہ دہاندی کا خوف۔ نعرہ حیوا الی الغزو را بلند ہوتا ہے۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم رشک لالہ زار بن کر ٹکٹ کلکٹروں کو حیران کر دیتا ہے۔ تین چار گاڑیاں "قزلباشوں" سے لبریز ہیں۔ ہارمونیم کی زبان سے حدی خوانی شروع ہوتی ہے۔ درمیانی اسٹیشن کا ما سیجی کولن کی طرح گزرتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹہ میں لب دریائے گنگ فل اسٹاپ لگا دیتے ہیں۔ وہ آگیا۔ راجگھاٹ آگیا۔ پروفیسر ولایت احمد صاحب باہمہ ڈیل ڈول کھٹ سے پلیٹ فارم پر آ کر فال ان بول دیتے ہیں کھانے پکانے کا انگڑ کھنگڑ وہ مرد گاڑیوں میں لد کر نرورا کی طرف اور رکوئک مارچ کرتی ہوئی بجھیرا لپٹن گنگا کی طرف جہاں پہلے سے دو کشتیاں کرایہ لی ہوئی منتظر ہوتی ہیں دھاوا بول دیتی ہے۔ خوشدلے اور تفریح پسند ممبران اسٹاف قرینہ قرینہ سے اپنے اپنے دستوں کو لے جا رہے ہیں آن کے آن میں دونوں کشتیاں بھر جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب امیر البحری کا چارج لے لیتے ہیں اور ولایت احمد صاحب وائس ایڈمرل کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ کشتیاں منجدھار میں پڑیں دونوں پہلو بہ پہلو آہستہ آہستہ رینگ رہی ہیں۔ ہارمونیموں نے بلند آہنگی شروع کی پروفیسر ولایت احمد صاحب حکم دیتے ہیں۔ ہاں قاضی صاحب وقت کی رہے۔ یہیں تصنیف ہوتی جائے اور یہیں الاپی جاوے پرانی نہ سنیں گے۔ محکوم سپاہی اپنے کمانیر کی تعمیل کرتا ہے ؎

ہے گنگا ہے دیس کی ماتا ہندوستان کی جان ہے تو   دھن دولت کی دینے والی کھیل و گھر کی کان ہے تو۔ "ہے گنگا

ہے گنگا" پر کورس ہوتا ہے دو سو آوازیں سُر میں سُر ملاتی ہیں۔ ہندو ملاح مسلمانوں سے گنگا کا قصیدہ سُن کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔

آب رواں کا جامہ پہن کر غسل کریں اشنان کریں   پاپ کی کالک پُن سے بدلے۔ پاکی کا استھان ہے تو۔ "ہے گنگا" (کورس)

تیری پنہاریں گائیں ملاریں دیوے جھولیں موجوں پر   جل میں آگ لگانے والی دیپک راگ کی تان ہے تو۔ "ہے گنگا" !

اسی طرح سترہ اٹھارہ شعروں کی فی البدیہہ یا یوں کہئے کہ "فی الفلک" گیت نما غزل ہوتی چلی جاتی ہے۔

غرض ہنستے بولتے تفریح و خوش طبعی کا مرقع بنے ہوئے پل کے متصل لنگر انداز ہو کر ساحل پر اترتے ہیں اور فوراً دلچسپ مشغلوں میں منہمک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ واٹر پولو، تیراکی، آب بازی، مچھلی ماری، غوطہ زنی۔ اور جھٹ پٹے کے بعد مشاعرہ، شعر خوانی، نغمہ سرائی، بحث و مباحثہ، مذاکرہ علمیہ، قصہ گوئی، بذلہ سنجی اور ہاں بیچ بیچ میں "مائی لارڈ" ڈپٹی نثار حسین صاحب کی تقریر ہائے آبی و خاکی و نہری و دریائی نُقل محفل کا کام دیتی ہوئی گیارہ بارہ بجے شب کے کھانے کے بعد اس تاریخ کے پروگرام کو ختم کرتی ہے۔ دوسرے روز انھیں تفریحات کا مختلف نوعیت کے ساتھ اعادہ ہو کر بازگشت کا حکم ملتا ہے تاکہ روایات دیرینہ قائم رہیں مجلس اس کورس پر ختم کی جاتی ہے ؎

سال بھر میں اک نہ اک دن ایکسکرشن چاہیے | کرتہ افکارِ علمی کو روٹیشن چاہیے
طبعِ نازک پر جو ہو اوہامِ باطل کا خروج | سیرِ تفریحوں سے ان کا ایکسپلشن چاہیے
سختی یا پائے علمی سے کدر جب ہو طبع | جنگلوں میں مادرِ نیچر کا درشن چاہیے
پھیپھڑوں کو چاہیے میدان کی تازہ ہوا | خونِ صالح کا رگوں میں سرکولیشن چاہیے

چاہیے" کورس کی تان ہوتی تھی اور دو سو آوازیں یکلخت اسے ادا کر کے جو لطف بیزی کرتی تھیں اس کو نا نے قلم ادا نہیں کر سکتی لوٹتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا یکلخت راستہ کاٹ کر کھڑے ہو جانا طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنا اور طلبہ کا ہر رکاوٹ کو خوش آہنگی سے عبور کرتے ہوئے پار ہو جانا عجب لطف و سرور پیدا کرتا تھا۔

غرض لاتعداد تفریحی مصروفیتوں کی فہرست سے نمونتاً دو پیش کرتے ہوئے کہنا یہ ہے کہ جو سہ ماہی ایسی ہما ہمی اور چہا چہمی میں گزرتی تھی وہ کئی سال سے مفقود ہو گئی۔ کیا ڈاکٹر صاحب یک بیک بوڑھے ہو گئے یا ہندوستان سے خوش طبع اور ملنسار اساتذہ آنا بند ہو گئے یا طلبہ کسی دوسرے ملک سے آنے لگے۔ بابال پور نہ رہا یا زورا اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ نہیں نہیں سب بدستور۔ ڈاکٹر صاحب الآن کما کان۔ ولایت احمد صاحب وہی پہلے کی طرح مفرح القلوب۔ مائی لارڈ ویسے ہی ہر دل عزیز قاضی صاحب بدستور سابق فی البدیہہ۔ ہر بورڈنگ میں پہلے سے دو گنے طالب علم۔ ہر موسم پر ایک آدھ اور آلہ کا اضافہ۔ سب کچھ وہی۔ البتہ دل وہ نہیں رہے۔ پہلا سا اطمینان مفقود ہے۔ پہلا سا سکون قلب گم ہے۔ یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کا خدا بھلا کرے اس نے اس تعلیم گاہ کی روح دبوچ لی ہے۔ مرکزیت لاپتہ ہو گئی ہے۔ مطمح نظر نظر سے اوجھل ہے۔ نصب العین جو عین الیقین کا مرتبہ رکھتا تھا اس کی جھلک دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں۔ پہلے اگر ایک سکرٹری کالج خوش ہے تو سارا جہان خوش ہے۔ رگ رگ میں خوشی و سرور و اطمینان کی لہریں دوڑ رہی ہیں۔ پرنسپل راضی ہیں تو گویا نصیبا جاگا ہوا ہے تیسری تصویر ہی نظر نہ آتی تھی۔ ایک مطمح نظر تھا۔ دوسرے کی خوشنودی نصب العین اور نتیجہ اس کا تھا سکون امن اور چین۔ یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن پر تبصرہ میرا کام نہیں وہ میرے منصب سے بالاتر ہے لیکن عرضِ حقیقتِ حال جو کسی کی ذات پر نکتہ چینی سے بری ہو ہر انسان کا فرض ہے۔ یہ فطرتی امر ہے کہ انقلاب کے بعد یادِ ایامِ سابقہ لازم ہوتی ہے۔ مجھے بحیثیت ایک فردِ قوم کے یہ یاد دلانے کا حق ہے کہ اس امن و سکون کے ناپیدی کا کون ذمہ دار ہے جو علی گڑھ کی روایات کے قائم رکھنے کا ذمہ دار تھا اور جس کے بازگشت کا گورنمنٹ عالیہ کمیشن تحقیقات اور ہر مسلم خواہاں و جویاں ہے۔ اس کا جواب صرف ایک جملہ میں محفوظ ہے اور وہ یہ ہے کہ "نقدانِ مرکزیت علی گڑھ کے

سکون کی مانع ہے" اور جب تک اس کا اعادہ نہ ہوگا۔ یہاں کی فضائے ہوائی میں کوئی متنفس آزیری ہو یا پیڈ۔ افسر ہو یا ماتحت اطمینان کا لمبا سانس نہیں لے سکتا۔ ایک لائن پر اپنے کام اور طریق کار کا پروگرام نہیں بنا سکتا۔ نہ معلوم اس مہینہ کی فلاں کمیٹی کیا تجویز کرے۔ نہ معلوم اگلے مہینے کی کونسل میں کیا پاس ہو۔ خدا جانے وہ کس بات سے راضی ہوں۔ اللہ معلوم یہ کس رویہ سے خوش ہوں۔ فلاں کمیٹی کے ممبر کس مزاج کے ہیں۔ فلاں کونسل کے تیس ممبروں میں کوئی نیش زن تو نہیں ہے عزلت گزینی مفید ہے یا چابت پھرت۔ خاموشی بہتر ہے یا خامہ فرسائی۔ مولنا البشیر صاحب کی جولاں گاہ کہاں تک ہے۔ مولوی فلاں ابن فلاں صاحب کی تقریر اور تحریر کا جادو کس کس پر چل چکا ہے اور کس کس پر چل سکتا ہے۔ غرض ہجوم افکار مانع کار اور نظام جمہوریت ایک آزار ہے۔ پرانے دنوں کی یاد کیوں نہ ہو۔ اور ہر دل سے دعا کیوں نہ نکلے کہ الٰہی ؎

چلا دے پھر وہی پچھلے نسیم کے جھونکے
کہ جن سے ٹھرٹے ہوئے دل کی پھر کلی کھل جائے

اس وقت جیسا کہ ہمارے ذی علم پرنسپل مسٹر قریشی نے ایک ڈنر کے موقع پر فرمایا تھا کہ ہمارے نواب صاحب قبلہ کے کندھوں پر دو بوجھ آ گئے ہیں وہ صحیح تھا۔ اس دارالعلوم میں فی الحقیقت دو اصول پر کاربند ہونے کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی اول احکام و ضوابط کی پابندی دوسرے اس سے اہم تر شفقت پدری اور رحم مادری جو اس کو آل انڈیا انسٹی ٹیوشن بنائے رکھے۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس نے دارالعلوم کو اس کے شیر خوارگی سے عہد طفلی اور پھر شباب کے عالم میں دیکھا ہو جو بچوں اور ان کے دائی کھلائیوں کی عادات، اطوار، قابلیت اور اہلیت اور ان کی افتاد مزاج سے واقف ہو اور ظاہر ہے کہ بحالات موجودہ جناب نواب صاحب قبلہ سے زیادہ کون ان صفات کا مصداق ہو سکتا ہے۔ اللھم انزل علینا سکینۃ من السماء

غرض اس تمہید سے کیا ہے؟ یہ کہ حسب دستور سہ ماہی گزشتہ کے کارنامے عنوان "از وکٹوریہ گیٹ" کے تحت میں بالتفصیل لکھنے کی اس نمبر میں گنجائش نہ مل سکی اور ہفتہائے متصلہ کے واقعات جو یونیورسٹی کی چار دیواری میں پیش آئے وہ بھی اتنی صراحت سے قلمبند نہ کئے جا سکے جتنا ان کا حق تھا بلکہ یہ بدعت میگزین کمیٹیوں کے دونوں پریسیڈنٹوں نے گوارا کی کہ سلسلہ کلام کے منقطع یا منتشر ہو جانے کے خوف سے انگریزی کا حصہ بھی اسی ایڈیشن میں مدغم کر دیا گیا۔

کانوکیشن نمبر مسٹر محمود الحسن صدیقی سابق ایڈیٹر نے یہ افواہ سُن کر اس مرتبہ ہز ہائینس مہاراجہ بہادر الور بالقابہ اپنے قدوم میمنت لزوم سے کانوکیشن کی عزت افزائی فرماویں گے۔ مختلف اخباروں میں اس خاص نمبر کے لئے اشتہار بھی شائع کر دیا۔ ان کا ارمان تھا کہ یہ نمبر خاص آب و تاب سے باتصویر شائع ہو جیسا کہ آج کل اکثر رسالے خاص نمبر نکال رہے ہیں

اس عظیم المرتبت جلسے کا پروگرام بدل گیا اور صرف لوکل اہمیت کے ساتھ وہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا حسب معمول قرآن خوانی
آغاز ہوا ۔ مسٹر اوکڈن سابق کلکٹر ضلع علی گڑھ حال کمشنر نے ایڈریس پڑھا کمشنر صاحب آگرہ بھی ڈائس پر تشریف فرمائے
ب پرو وائس چانسلر نے سالانہ رپورٹ کا منتخب حصہ پڑھکر سنایا ۔ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر نے مناسب موقع
بتہ ۔ اہم اور پر معنی تقریر فرمائی ۔ اسناد تقسیم ہوئیں ۔ سند بردار گؤنوں میں ملفوف ہو کر پیش ہوتے گئے عطائے اسناد کے
ت وہی عربی کا فارمولا پڑھا جاتا رہا اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا ۔ اور دوسرے روز غالباً تعطیل رہی ۔

میگزین کی اشاعت موقتہ کا آیندہ انتظام

دوسری اصلاحات کے ساتھ میگزین کی اشاعت کے متعلق بھی تجویز پیش ہے ۔ مجھے اجازت مل گئی ہے کہ جناب وائس چانسلر صاحب بہادر کے حضور میں اپنی نئی اسکیم پیش کردوں
ں سے ادارت اور طباعت ٹھیک وقت پر ہو کر اس کی اشاعت کا بھی انتظام ہو گر وہ منظور ہو گئی تو انشاء اللہ یہ میگزین
ارالعلوم کی حیثیت کے موافق اپنا نمونہ خود آپ ہوگا اور پھر اس قابل ہوگا کہ غیر طلبہ خریداروں کی فرمائش خریداری کو قبول
یا جائے جو فی الحال نہیں کی جاتی ۔

یونیورسٹی سے زائرین بیت اللہ کی روانگی

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے دو پروفیسروں نے امسال سفر حج کا ارادہ پورا کر لیا ۔ جو دوسروں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوگا اور انشاء اللہ یہ سلسلہ ہر سال جاری رہیگا
جنی پروفیسر حمید الدین خاں صاحب ایم اے بریلوی اور مولانا سید سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات ۲۹ اپریل کے جہاز سے
بندرگاہ بمبئی سے روانہ ہو گئے ۔ ساتھ میں جناب سید زین الدین صاحب ایم اے کلکٹر جونپوری بھی تشریف لے گئے ہیں ۔ اللہ پاک
تمام مراحل سفر اور مناسک حج و سعادت زیارات سے فارغ کرکے مع الخیر واپس لائے ۔ مولانا ممدوح نے جانے سے
پیشتر ایک کتاب مفصل الحج نام ایک ماہ کے اندر تصنیف کرکے شائع کردی جو عازمان حج کے لئے از حد مفید و کارآمد ہے
ہمارے مکرم حمید الدین خاں صاحب پروفیسر فارسی نے جذبہ شوق زیارت روضہ مطہرہ میں بحالت قیام بمبئی ایک غزل
نعتیہ لکھی جو ان کے ایک دوست سے ہمیں دستیاب ہو گئی ۔ وھو ہذا ؎

اڑا کر لے چلا ہے جذب الفت کوئے جاناں کو — فرشتے ساتھ دھوتے جاتے ہیں دامان عصیاں کو
یہ ڈرتا تھا نہ ہوگا مجھ سے ترک الفت دنیا — عجب مشکل میں تھا سمجھا تھا مشکل کا آساں کو
محمد مصطفےٰ کی دل میں اب الفت سمائی ہے — بحمد اللہ پایا میں نے آخر تو یہ ایماں کو

سمٹا جاتا ہوں دل میں فکرِ عقبیٰ نفرتِ دنیا — ذرا دیکھو تو یارو میرے حج کے ساز و ساماں کو

تعالی اللہ شانِ نور جسم عازمانِ حج — کہ نزہت دیکھ کر ہو رشک جس کے عالمِ جاں کو

ترے روضہ کا جلوہ دیکھ کر میں محو ہو جاؤں — حریم پاک کا روزن بناؤں چشمِ حیراں کو

ترا جب نام آئے آنکھ فرشِ راہ بن جائے — سجائے موتیوں سے اشک کے دامانِ مژگاں کو

نکیرین اُس طرف کیا جائیں اور پرسش کریں کس سے — چھپا لیتی ہے رحمت نور میں گورِ غریباں کو

وہ زنجیرِ علائق سے بھلا کب رُکنے والا تھا — ترا وحشی چلا ہے توڑ کر دیوارِ زنداں کو

انجمن اصلاح المضافات کی کارگزاریاں

انجمن مذکور زیر اہتمام مولوی امام بخش صاحب بی اے اپنے فیض رساں کام میں مشغول ہے۔ ان کے انہماک اور سعی حسنہ کا نتیجہ ہے کہ دو سال کے اندر گیارہ بارہ اسکول جن میں دو مڈل اسکول بھی شامل ہیں اپنے پوری رفتار پر چل رہے ہیں۔ ابھی ۱۱ر مارچ گزشتہ کو موضع رٹھ گواں کے مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے انھوں نے جلسہ افتتاحی منعقد کیا اور یہ انھیں کا کام تھا کہ چار پانچ میل کے فاصلہ پر اچھے خاصے جلسہ کی تزئین کر ڈالی۔ سڑک کے ہر موڑ پر دیہاتی طالب علم جھنڈیوں کے ذریعہ سے موٹر اور سواریوں کو راستہ بتلا رہے تھے۔ حدودِ موضع پر تفنگ چیوں کا ایک چھوٹا دستہ متعین تھا جنھوں نے مہمانان عزیز کی سلامی اتاری۔ بچوں کی صفوں نے تکبیر سے خیر مقدم کیا اور ہم لوگ تقریباً تین سو دیہاتی حاضرین کے جلسہ میں جا پہنچے۔ کرسیوں اور قالینوں کی نشست تھی۔ لیکن حاضرین کے لحاظ سے جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے فرش کی نشست کو ترجیح دی۔ مہمانوں میں علاوہ اکثر ذی عزت اصحاب کے جناب حاجی محمد صالح خاں صاحب مربی انجمن اور حاکم پرگنہ جناب محمد نیاز محمد خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر اور مولانا محمد ابوبکر شیث صاحب ڈین یونیورسٹی اور چند پروفیسران بھی شامل تھے۔ حاجی صاحب ممدوح صدر جلسہ تھے اور انھیں کے دست حق پرست سے مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا۔ مولانا صاحب نے قرآن شریف سے ابتدا فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب نے طویل اور برمحل تقریر فرمائی اور یاد دلایا کہ حضور رسول مقبول صلعم سے جو پہلا خطاب درگاہ رب العزت سے ہوا وہ "اقرأ باسم ربك الذی خلق" تھا اور اسی سے تحصیل علم کی فرضیت پر ہر مسلمان کے لئے حکم کا پتہ ملتا ہے۔ جناب ڈپٹی صاحب نے گاؤں والوں کی اصطلاح میں نہایت عام فہم اسپیچ دی جس کا لب لباب یہ تھا کہ بوجہ ناخواندہ ہونے کے کاشتکاروں کو عدالتی معاملات میں سخت نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں اور وہ عدم تحصیل ہدایات عدالت اور پٹواریوں کی کارپردازیوں کا شکار رہتے ہیں۔ لہذا تعلیم اس طبقہ کے لئے سب سے زیادہ لازمی ہے۔ جناب حاجی صاحب نے جن کے دل میں اس تحریک کے ساتھ بھی ہمدردی اور خلوص ہے ایسی مسلسل، مفید اور

وقت و حاضرین کی نوعیت کا لحاظ رکھتے ہوئے تقریر فرمائی جو لفظ بہ لفظ نوٹ کئے جانے کی قابل تھی اور جس کا اثر اہل دیہات پر
ں پر محسوس ہو رہا تھا۔ آخر میں ہمارے مولانا محمد ابوبکر شیث صاحب مدظلہ نے بطور وعظ اپنے زریں الفاظ سے دیہاتیوں
نا ثر فرمایا۔ آپ نے کہا کہ تعلیم ضرور حاصل کرو لیکن نیت خدمت اسلام کی رکھو تاکہ وہ مقبول ہو اور مثالاً قصہ ایک دنیادار
ں کا جس نے نیا مکان تعمیر کرایا تھا اور ایک درویش کا بیان کیا کہ جس نے پشت دیوار میں روشندان دکھلا کر یہ کہا تھا کہ
ن کے ذریعہ ہوا اور روشنی خوب آوے گی۔ درویش کو اس کی اس نیت پر سخت صدمہ اور افسوس ہوا اور تنبیہ کی کہ اے
نصیب اگر تو ان سوراخوں کو اس نیت سے بنواتا کہ ان میں سے اذان کی آواز آوے گی ضرورت مند کی فریاد سنائی دے گی
اس میں للّٰہیت شامل ہو جاتی اور ہوا اور روشنی تو خود بخود آتی ہی رہتی۔ اسی طرح حاضرین کو تنبیہ کی کہ تم تعلیم خدمت دین
کے لئے حاصل کرو اور پڑھ لکھ جاؤ گے تو کاغذات عدالت کی تعمیل اور پٹواریوں کی فریب کاری سے تو خواہ مخواہ محفوظ ہی رہو گے
سب سے آخر احقر نے نظم پڑھی جو مسٹر امام بخش کی خواہش پر اس موقع کے لئے لکھی گئی تھی۔

نظم جلالی بمقام رٹھ گوان بہ تقریب جلسہ سنگ بنیاد مدرسہ اسلامیہ بتاریخ ۱۱ مارچ ۱۹۲۸ء

صد ہزاراں شکر رب النور ہے — ظلمت جہل اب یہاں کافور ہے
جہل و نادانی کا بادل پھٹ گیا — علم اور دانش کا پھیلا نور ہے
بندشیں پڑھنے پڑھانے کا نظام — شہر اور قصبات میں محصور ہے
ملک بھر میں فضا دیہات کی — بے پڑھوں سے سراسر معمور ہے
کاشتکاری سے نہیں خالی کسان — کھود پانی کرنے پر مجبور ہے
گاؤں کا بچہ ہے جو شہروں سے دور — مدرسوں میں جانے سے معذور ہے
کس طرح اسکول میں جائے غریب — خوش لباسی کا جہاں دستور ہے
پاسبانی ڈھور ڈنگر کی کرے — یا پڑھے اسکول میں جو دور ہے
کس طرح تعلیم دی جائے جہاں — بچہ بچہ کھیت پر مامور ہے
اس لئے جاہل رہے مسلم کسان — شیشۂ دل غم سے چکنا چور ہے
سو میں اسّی ہیں مسلماں کاشتکار — جن میں قوت قوم کی مستور ہے
قوت اسلام ہے غربا کے ہاتھ — اک حدیث اس امر میں مشہور ہے
لیڈروں کو کام کیا دیہات سے — ان کی دنیا دہلی و جے پور ہے
مدرسہ اَن پڑھ کسانوں کے لئے — جہل کے سینہ میں شمع طور ہے
مرحبا طلبائے کالج مرحبا — قوم جن کی سعی کی مشکور ہے
مستحق داد ہیں مسٹر امام — نام جن کا جابجا مذکور ہے
اپنے ہم مذہب کسانوں کے لئے — قلب جن کا درد سے بھرپور ہے
باوجود اشغال علم و ہم عمل — نشۂ تنظیم سے مخمور ہے
مدرسوں کا اس نے پھیلایا ہے جال — قریوں میں نزدیک ہے یا دور ہے
علم کا مردہ جلانے کے لئے — یہ نئی تحریک نفخ صور ہے
حوصلہ افزا ہوئے روسائے ضلع — جن کی ہمدردی یہاں مشہور ہے
حاجی صالح خاں بنے پشت و پناہ — مدح کا جن کے کسے مقدور ہے

بیشتہ بذل و سخا کا ہی وہ شیر | بخل جس کے دل سے کوسوں دور ہے
اس کے ارکان کمیٹی خوش رہیں | جن کی کوشش میں سیانے زور ہے

بے دھڑک ہی استعانت اس کا کام | بے جھجک امداد میں مشہور ہے
ہمت مردانہ رکھ آگے قدم | منزل مقصود ابھی کچھ دور ہے

مدرسہ کا وہ رکھیں سنگ بنا | جس سے ہر مسلم کا دل مسرور ہے
ہو نمونہ سرزمین ہند میں | ضلع یہ جو علم میں مشہور ہے

افتتاح مدرسہ ہو اس کے ہاتھ | جو علی گڑھ کا بڑا دکتور ہے
مدرسہ اسلام کا ہو گاؤں گاؤں | خواہ چھترا ہے کہ بھیکم پور ہے

اس طرح تعلیم دیہاتی بڑھے | گر مرے اللہ کو منظور ہے
اپنی ہو تنظیم اپنا انتظام | ہووے مکتب جس جگہ اب گھور ہے

پشت بان سب کے ہیں وائس چانسلر | لطف کا جن کے ہر اک مسحور ہے
لڑکیاں لڑکے اگر لکھ پڑھ گئے | بدلہ میں غلمان ہے یا حور ہے

نام ہر محسن کا لکھنے سے جلال | خوف سے تطویل کے معذور ہے
کیا عجب اس سعی منی کا جواب | دے خدا آمنا ہر بھی منظور ہے

جلسہ ہائے ڈنر و پارٹیہائے کثیر التعداد بموقع وداع عالی جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب سی آئی ای ڈی ایس سی پی ایچ ڈی پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب ممدوح ۳۳ سال کی خدمت کے بعد یونیورسٹی سے ۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء کی شب میں سبکدوش ہو گئے۔ غم و اندوہ کی لہر جو اس واقعہ عظیمہ سے ہندوستان کے اس بڑے علمی سمندر میں اٹھی وہ مختلف جماعتوں کے ایڈریسوں، ڈنر کی اسپیچوں، پارٹیوں کی تقریروں اور مختلف نظموں سے بدیہی طور پر واضح ہے۔ ان کا اعادہ ہمیں اپنے نوٹ میں بخوف تکرار لا حاصل معلوم ہوتا ہے ہمیں مسلمانان ہند کو صرف یہ مژدہ سنانا ہے کہ ابھی ان میں بزرگی کا لحاظ، حفظ مراتب، استاد کا ادب، محسن کی شکر گزاری، دوست دشمن کی پہچان کا خاصا مادہ موجود ہے۔ اس عظیم الشان شخصیت کی علیحدگی سے جس نے محض اس دار العلوم کی حمایت اور بہبودی کے خیال سے بآسانی اس کو وداع کہا اور ایک نئے تجربے کے لئے راستہ کھول دیا۔ یونیورسٹی کا ہر گوشہ متاثر ہے۔ اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کوئی متنفس اور کوئی جماعت ایسی نہ رہی جس نے خراج خلوص و عقیدت مندی ادا نہ کیا ہو اور ایک ایک دن میں تین تین جلسے نہ ہوئے ہوں۔ جن میں بالعموم اسٹاف کی اکثریت اور طلبہ کی ہمگی روز روشن کی طرح نمایاں تھی۔ عالی جناب نواب وائس چانسلر صاحب بہادر تینوں بڑے ڈنروں میں شریک ہو کر صدارت فرما ہوئے اور ہر ڈنر میں اپنی پر معنی اور طویل تقریروں سے حالات حاضرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ممدوح کی خدمات اور تبحر علمی کے برابر معترف رہے اور جو پراگندگی اس انقلاب سے فضائے یونیورسٹی میں جاری و ساری ہے اس کے دور کرنے میں اپنی مربیانہ سعی کا وعدہ فرمایا۔ اسپیچیں اور ایڈریس اور نظمیں انگریزی اردو جس قدر فراہم ہو سکیں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں۔

(جلال)

فہرست جلسہ ہائے الوداعی

- پارٹی منجانب کرکٹ کلب مع اڈریس ۲۴ اپریل ۱۹۲۸ء
- پارٹی منجانب ٹینس کلب مع اڈریس ۲۵ اپریل ۱۹۲۸ء
- ۱۔ عظیم الشان ڈنر منجانب طلبائے یونیورسٹی ۲۶ اپریل
- ۲۔ پارٹی منجانب فلوزافکل سوسائٹی ۲۶ اپریل
- ۵۔ اڈریس منجانب یونین کلب مع کاسکٹ ۲۰ اپریل
- پارٹی منجانب افسران و اہلکاران دفاتر یونیورسٹی ۲۰ اپریل
- پارٹی منجانب سوئمنگ باتھ کلب مع اڈریس ۲۰ اپریل
- ۔ پارٹی منجانب ہاکی کلب ۲۹ اپریل
- ۔ عظیم الشان ڈنر منجانب یونیورسٹی اسٹاف ۲۹ اپریل
- ۱۰۔ عظیم الشان ڈنر منجانب انٹرمیڈیٹ کالج ۳۰ اپریل
- ۱۱۔ گروپ منجانب سرسید کورٹ شرقی ۳۰ اپریل
- ۱۲۔ پارٹی منجانب سائنٹفک سوسائٹی مع اڈریس یکم مئی ۱۹۲۸ء
- ۱۳۔ اڈریس منجانب انٹرمیڈیٹ کالج یونین یکم مئی ۲۸ء
- ۱۴۔ عظیم الشان ڈنر منجانب یونیورسٹی اسکول یکم مئی ۲۸ء
- ۱۵۔ جلسہ فوٹو گروپ منجانب ہاکی کلب یکم مئی

(اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نینی تال تشریف لے گئے اس کے بعد واپسی پر تقریبات شروع ہوئیں)

- ۱۶۔ پارٹی منجانب سوسائٹی اقتصادیات مع اڈریس ۱۱ مئی ۲۸ء

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ ہوں)

انٹرمیڈیٹ کالج

(از اسسٹنٹ ایڈیٹر کالج)

الیکشن طلباء کی دلچسپی کا خاص مشغلہ رہا ہے امسال سابق وائس پریسیڈنٹ کے چلے جانے کی وجہ سے ایک خاص الیکشن کرنا پڑا۔ اس الیکشن میں تین امیدواران نے اس خدمت کے لئے خود کو پیش کیا تھا لیکن محمد خاں صاحب کو ممبران یونین نے کثرت رائے سے منتخب کیا افسوس کہ چند ممبرانِ یونین کو وائس پریسیڈنٹ اور لائبریرین سے کچھ شکایات پیدا ہوگئیں اور عبدالشہید صاحب قدوائی لائبریرین کے حق میں بے اعتمادی کا ووٹ پاس کرنے کے لئے ممبران یونین سے رائے لی گئی شکر ہے کہ عبدالشہید صاحب کو اپنی صفائی کا ثبوت دینے کا موقع مل گیا اور وہ کثرت رائے سے بری الذمہ قرار پائے۔ اس کے بعد ۲۲ جنوری کو سالانہ الیکشن ہوا جس میں حسب ذیل اصحاب مختلف عہدوں کے لئے منتخب ہوئے یعنی

وائس پریسیڈنٹ	سکرٹری	لائبریرین
مسٹر حسن علی چودھری	مرزا افسر علی بیگ	مسٹر لئیق احمد

اس سیشن میں مشہور ترکی سیاح حمدی بے نے ایک مفید اور پر مغز لکچر دیا۔ اسلامی دنیا میں مصطفیٰ کمال پاشا کے رویہ کی وجہ سے

ایک عام بے چینی کا اظہار ہو رہا ہے۔ دراصل اس لیکچر کا مقصد یہی تھا کہ ہر متنفس اپنے اپنے شکوک صاحب موصوف سے استفسار کے بعد رفع کرے۔ چنانچہ طلبا اور ممبران اسٹاف نے بہت سے سوالات کئے۔ خاص طور پر۔ پردہ اور تعدد ازدواج پر بحث رہی۔

۴ مارچ ۱۹۲۸ء کو نئے عہدہ داران یونین نے اپنے پیش رو عہدہ داران سے چارج لیا ہم منسٹری کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ پرانی منسٹری کے مشکور ہیں جس نے کمال محنت و جانفشانی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض کو انجام دیا اور امید کرتے ہیں کہ موجودہ منسٹری اپنے فرائض کا احساس کرکے پوری انہماک کے ساتھ کام کرے گی اور پرانی روایات کو قائم رکھے گی۔

حکیم اجمل خاں صاحب اور اہلیہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب کے انتقال سے جو روحانی صدمہ پہنچا تھا وہ کچھ کم نہ تھا لیکن افسوس کہ عبدالمجید صاحب قریشی پرنسپل انٹر کالج کی والدہ مرحومہ کے انتقال نے رنج و اندوہ میں اور اضافہ کردیا۔ ہم صاحب موصوف کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مرحومہ کو خدائے تعالیٰ جنت میں جگہ دے۔ دنیا کی ہر نعمت ضائع ہونے کے بعد پھر مل سکتی ہے مگر والدین کا ملنا ناممکن ہے۔ یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پرنسپل صاحب اپنی والدہ صاحبہ کی علالت کے زمانہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کی خدمت میں اس قدر مصروف رہے کہ وہ اپنی والدہ کو نہ دیکھ سکے اور نہ اُن کی تیمارداری کرسکے خدائے تعالیٰ ان کو اس ایثار کا اجر دے آمین۔

ہمارے یہاں کے ڈرامیٹک سوسائٹی گزشتہ سال سے کامیابی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ ہم اس کے لئے نہایت شاندار مستقبل کی امید کرتے ہیں۔ موسم گرما اور امتحانات کی مصروفیت کی وجہ سے اکثر و بیشتر مشاغل میں جمود پیدا ہوجاتا ہے۔ ڈرامیٹک سوسائٹی بھی اس کلیہ سے بری نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ گزشتہ موسم سرما میں کوئی ڈراما پیش نہ کیا جاسکا۔ اکتوبر میں کالج کھلا۔ یہ مہینہ نوواردگان کے داخلہ اور دیگر انتظامات میں گزر گیا۔ نومبر میں ہز اکسیلنسی سر ولیم میرس کی آمد آمد کی دھوم رہی۔ دسمبر کا بڑا حصہ حسب معمول تعطیلات میں گزر گیا بالآخر وقت آیا اور جنوری میں اس سوسائٹی نے اپنا کام شروع کیا۔ مسٹر عبدالشکور ایم اے صدر اور شیخ عبدالرشید ایم اے ایل ایل بی جنرل سکریٹری کے اسمار گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طلبا میں رانا بختیار محمد خاں اس زمرہ میں شریک ہیں جو اس سوسائٹی کے سکریٹری ہیں۔ ایک ڈراما مسٹر شیخ عبدالرشید ایم اے ایل ایل بی نے انتخاب کیا ہے۔ یہ ڈراما نہایت دلچسپ ہے اور صاحب موصوف کا انتخاب یقیناً قابل داد ہے۔ امید تھی کہ یہ ڈراما فروری کے دوسرے ہفتہ میں پیش کیا جائے گا مگر افسوس ہے کہ بعض وجوہات سے جلسہ تقسیم انعامات سالانہ ۲۷ مارچ کے لئے ملتوی ہوگیا۔ فی الحقیقت ڈراما تعلیم کا ایک لازمی جزو ہے یہی وجہ ہے کہ انٹر کالج کے پرنسپل جناب عبدالمجید صاحب قریشی نے اس کی طرف توجہ منعطف کی اور ڈرامیٹک کلب میں تازہ روح پھونک دی

ڈراما کی پیش مشق میں جو خدمات مسٹر سعید الزمان ایم اے، مسٹر ابن علی اور مسٹر معین الحق ایم اے نے کی ہیں اُن کے لئے وہ ہمارے باشکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے قیمتی وقت کے ایک معتدبہ حصہ کی قربانی کی ہے۔

فروری کا آخری ہفتہ اور مارچ کا کچھ حصہ تمام کھیلوں کے کپتانوں اور مانیٹروں کے تقرر کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ [illegible] ایر کے طلبا رکو فرسٹ ایر کے طلبا رنے تمام فرائض سے سبکدوش کر دیا۔ ذیل میں ان نئے عہدہ داروں کے نام درج کئے جاتے ہیں

کرکٹ کپتان - سعید محمد خاں صاحب
ہاکی ” - چودہری سلیمان صاحب
فٹ بال ” - حبیب عثمان صاحب
والی بال ” - وہاج الدین صاحب
باسکٹ بال کپتان - رانا عبد الحمید صاحب
کبڈی ” - رانا بختیار محمد خاں صاحب
اسپورٹس ” - ارجمند بیگ صاحب
ٹینس سکرٹری - احسن مجتبیٰ علوی صاحب

بقیہ تقریبات وداعی

۱۷ - پارٹی مع گروپ من جانب پراکٹوریل مانیٹرس ۱۴ ر مئی ۶ بجے شام
۱۸ پارٹی مع ایڈریس من جانب سوسائٹی ریاضیات ۱۶ ر مئی ۶ بجے شام
۱۹ - پارٹی مع ایڈریس من جانب انجمن الفرض ۱۷ ر مئی ۶ بجے شام
۲۰ - پارٹی من جانب انجمن ہائے عربی، فارسی، اردو معلیٰ حدیقۃ الشعر - مع ایڈریس و پیش کش کتب متفرقہ مع کتاب دان مرصع .. ۱۸ ر مئی جس میں ہر شعبہ کے صدر نے اپنا اپنا ہدیہ نہایت باموقعہ اور مختصر تمہید کے ساتھ پیش کیا۔
۲۱ - ڈنر من جانب انٹرمیڈیٹ کالج یونین ۱۸ ر مئی ۹ تا ۱۲ بجے شب جس میں پرنسپل صاحب و حاجی محمد صالح خاں صاحب کی سپیچ اور شکر [illegible]
۲۲ - لنچ من جانب پراکٹوریل مانیٹرس ۱۹ ر مئی - ۱۲ تا ۲ بجے دوپہر
۲۳ - پارٹی مع ایڈریس من جانب جاگرافیکل سوسائٹی ۱۹ ر مئی ۴ تا ۵ بجے سہپر - گروپ ۵½ بجے
۲۴ - عظیم الشان مظاہرہ وداعیہ بر اسٹیشن علی گڑھ ۱۹ ر مئی ۵ بجے شام

آخری سین

آخر پندرہ بیس روز کی لگاتار پارٹیوں ڈنروں پیشکشوں اور گرویوں کے جلسوں کے بعد شام وداع آ پہونچی۔ ۱۰ کی شام کو او رنٹیل سائڈ کے حیب۔ صیغوں اور شعبوں کی طرف سے متعدد پارٹی دی گئی جس میں قریب دو سو مہمانوں کے شامل ہوئے اور جس میں مسٹر ولیم ٹرحبیب شیر قونی نے بھی کرم فرمایا تھا کیک بیسکٹ دال موٹھ۔ چاپانی اور بمبئی کی سرخ پھلیاں۔ ناگپوری سنترے۔ بہاری لیچیاں جو اعلی پیمانہ پر فراہم کی گئی تھیں قابل لحاظ نہ تھیں بلکہ ہر صیغہ کے نمائندہ کا اپنی اپنی موزوں تشکر بصورت کتب کو مختصر مختصر جملوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے دست اخلاص پرست میں دینا اور عربی فارسی، اردو اور سنسکرت کی نمائندگی کرتے ہوئے اور دعا کی آمیزش سے اظہار جذبات کرنا بلا شبہ ڈراما کا سا لطف دے گیا۔ سب سے پہلے جناب مولانا ابوبکر محمد شیث صدر شعبۂ دینیات یونیورسٹی نے نسخہ قرآن پاک مطبوعہ مدینہ پریس پیش کیا جس کو ڈاکٹر صاحب نے سر سے لگایا اس کے بعد سیرت نبوی کی جلدیں دیں اور فرمایا کہ

" لوگ جب کوئی تحفہ پیش کرتے ہیں تو پیش کرتے وقت اُسے ناچیز اور محقر کہہ کر پیش کرتے ہیں مگر جو ہدیہ میں پیش کر رہا ہوں وہ ایسا عظیم الشان اور بیش بہا ہے جس کی بڑائی و عظمت میں کیا تمام دنیا کے لوگوں کے قیاس و وہم سے بلند ہے۔ یہ کلام پاک آپ کے لئے شمع ہدایت ہے اس کو آپ اپنا شمع راہ بنائیے۔ یہ آپ کی ہر مشکلات کا حل ہے۔ تبیانا لکل شئی وھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین "

اس کے بعد مولانا ہیمن صاحب۔ مسٹر رشید احمد صدیقی صاحب اور مسٹر محمد حاذق صاحب نے اپنے اپنے سبت نہایت اثر پیدا کرنے والے مختصر جملوں کے ساتھ پیش کئے جن کو ڈاکٹر صاحب نے کھڑے ہو ہو کر قبول فرمایا۔ پروفیسر رشید احمد صاحب نے اپنی جدت طرازی سے خوبصورت گلدستہ بنوایا تھا جس میں تمام ہدایا خوش سلیقگی سے سمائے ہوئے تھے آخر میں قاضی جلال الدین صاحب نے اپنی تصنیف کتاب انگریزی تاریخ عباسیہ اور پیام مشرق ڈاکٹر اقبال صاحب کا پیش کر کے ممدوح کے چند اشعار جو ذیل میں درج ہیں بطور میسیج پڑھے۔

بے تو از خواب عدم دیدہ کشودن نتواں	بے تو بودن نتواں بے تو نبودن نتواں
در جہان ست دل ما کہ جہاں در دل ماست	لب فرو بند کہ ایں عقدہ کشودن نتواں
دل یاراں ز نواہائے پریشانم سوخت	من از آں نغمہ تپیدم کہ سرودن نتواں
اے صبا از تنک افشانی شبنم چہ شود	تب و تاب از جگر لالہ ربودن نتواں

دل مجنوں نہ دو کشادے ز سلاطین مطلب
کہ جبیں بر در ایں میکدہ سودن نتواں

۱۱ کی دوپہر کو سوئمنگ باتھ میں پراکٹوریل مانیٹرس کی طرف سے لنچ ہوا۔ اور چار بجے کے بعد آخری پارٹی آسمان منزل میں جغرافی سوسائٹی کی طرف سے نہایت باسلیقہ اور کامیاب طور پر ہوئی جو ایڈرس نظم اور ڈاکٹر صاحب کے محبت اور اخلاص بھرے جواب پر ختم ہوئی۔ فوراً گروپ ہوا۔ پانچ بجے گاڑی پر سوار ہوئے کیوں کہ ان کی موٹر پر اور لوگ اسٹیشن روانہ ہو گئے تھے۔ طلبہ کے اصرار پر گھوڑے کھول دیئے گئے اور دو سو قدم تک انھوں نے گاڑی کھینچی۔ اسٹیشن پلیٹ فارم طلبہ اور اسٹاف سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ رخصتی سماں لائق دید تھا نہ قابل تحریر۔ ڈاکٹر صاحب کے گلے میں ہاروں کا انبار۔ سر پر سے پھولوں کی بارش، دستبو کے لئے کشمکش۔ پیام آخری کا پڑھا جانا (جو حصہ انگریزی میں درج ہے)، بابو کی وسل۔ انجن کی سیٹی، گاڑی کا رینگنا۔ چیرز کے نعرے۔ اور آن کی آن میں گاڑی نظروں سے غائب۔ سب نے آنکھوں میں رکھیں آہ وہ بدل عزیزو کہ رواں سے مثل یوسف یوں بچھڑ کر جائے ہائے

پیغامِ وداع

(از انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم اے علیگ)

(اس نظم کا پہلا بند ۲۶ راپریل ۱۹۲۰ء کو اسٹریچی ہال میں طلبائے یونیورسٹی کی طرف سے رخصتی دعوت کے موقع پر پڑھا گیا، اس کے بعد ۲۷ راپریل کو یونین کلب میں اڈریس پیش کیے جانے کے موقع پر پوری نظم پڑھی گئی)

سکوتِ شب کے پردے میں ابھی خورشید پنہاں تھا
فضائے دہر کا ہر ذرہ مفقودِ شبستاں تھا

ابھی نکھرا نہ تھا رنگِ تجلّیٔ رُخِ خاور
شعاعِ مہر کا پرتو حجابوں سے نمایاں تھا

مُسلّط عالمِ سکرات تھا پہنائے عالم پر
رہینِ خود فراموشی سرِ دنیائے امکاں تھا

بایں کیفِ دلی گزرا میں اِک صحنِ گلستاں سے
تباہیٔ خزاں سے جس کا شیرازہ پریشاں تھا

چمن کیا تھا، چمن کی عظمتِ ماضی کا قصّہ تھا
چمن کیا تھا، چمن کی رونقِ رفتہ کا روماں تھا

فضائے گلستاں سے آرہی تھی یہ صدا پیہم
کبھی اے نونہالو! یہ چمن رشکِ خیاباں تھا

کبھی تھی حکمرانی اس جگہ جوشِ مسرت کی
کبھی اس باغ کا ہر پھول صد گلشن بداماں تھا

ہویدا اس کے ہر ذرّے سے تھی دُنیائے کیفیت
نُمایاں اس کے ہر گوشے میں دربارِ سلیماں تھا

فروغِ حسن سے ہر برگ تھا صد جلوہ ہا در بر
"ضیاءِ دین" سے ہر ذرہ رشکِ ماہِ تاباں تھا

نشاطِ جاودانی تھی، بہارِ کامرانی تھی
مسرت تھی، خوشی تھی، عیش تھا، عشرت کا ساماں تھا

یہ سب کچھ تھا طفیلِ عندلیبِ والہ و شیدا
چمن کا گوشہ گوشہ جس کے دم سے باغِ رضواں تھا

مچا دی تھی نوا سنجی سے اُس نے دھوم گلشن میں
اُسی کے ارتعاشِ کیف سے ہر ذرّہ رقصاں تھا

چمن پر چھا گیا تھا وہ بہارِ رنگ و بو ہو کر
اُسی کا رنگ ہر پتّے میں ہر گُل میں نمایاں تھا

مگر اہلِ چمن کی خود پرستی سے یہ دن دیکھا
کہ ہر گُل خار ہو کر آخر اُس کا دشمنِ جاں تھا

اسی صورت سے ملتا ہے وفا و مہر کا بدلا ؟
یہی اہلِ چمن ! اصلِ اصولِ دین و ایماں تھا ؟

"بہ لوحِ تربتِ ما یافتند از غیب تحریرے
"کہ این مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے"

ضیاء الدین ! یہ دل کی نشانی دیکھتے جاؤ
دکھاتا ہے کوئی دردِ نہانی دیکھتے جاؤ

نظر آتا نہیں ساحل کوئی دل کی تسلّی کو
ہمارے بحرِ غم کی بیکرانی دیکھتے جاؤ

بہار آنے نہ پائی تھی، خزاں کا دور آ پہنچا
یہ شومیٔ نہالِ زندگانی دیکھتے جاؤ

ذرا دیکھو بہارِ بوستانِ دل کی بربادی
تباہیٔ نشاطِ جاودانی دیکھتے جاؤ

نظر ڈالو ذرا ویرانیٔ دُنیائے اُلفت پر
خرابیٔ جہانِ کامرانی دیکھتے جاؤ

جہاں جوشِ نشاطِ عیش کی کل تک حکومت تھی
وہاں یاس و الم کی حکمرانی دیکھتے جاؤ

ترنم ریزیاں تھیں کل چمن میں جن عنادل کی
وفورِ غم سے ان کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

منبّت کاریاں خونِ جگر نے کی ہیں پہلو میں
حریمِ قلب میں ارژنگِ مانی دیکھتے جاؤ

چمن میں رہ گئی ہیں پتّیاں دو چار مُرجھا کر
نہالِ آرزو کی یہ نشانی دیکھتے جاؤ

فشارِ نزع طاری ہے تمنّاؤں کی دُنیا پر
نگاہِ واپسیں کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

اگر جاتے ہو، جاؤ، ہاں فقط اتنی تمنّا ہے
ذرا کیفیتِ سوزِ نہانی دیکھتے جاؤ

بیا در خانۂ دل، عینِ جوہر را تماشا کن
"ز چشمم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن"

نظمِ الوداعی

(از قاضی نعمان جلالی صاحب متعلم بی اے سکریٹری کرزن جاگرفیکل سوسائٹی)

۲۶ اپریل ۱۹۲۸ء کو اسٹریچی ہال میں بہ تقریب ڈنر وداعیہ مسلم یونیورسٹی پڑھی گئی۔

مارچ میں بادِ خزاں چلنے لگی — دن نکلتے دھوپ کیوں ڈھلنے لگی

عہدِ طفلی میں بڑھاپا آگیا — دل کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا

بُلبُلانِ قوم میں ہے کھلبلی — ناشگفتہ رہ گئی دل کی کلی

اِن کے ارمانوں پہ پانی پڑ گیا — اُن کی اُمید دل کا ہے خاکہ مٹا

جس کے آغوشِ محبت میں پلے — بڑھتے بڑھتے بچے سے لڑکے ہوئے

جس کے دامن میں ملی ہم کو پناہ — جس نے ۲۴ سال کی یکساں نباہ

واقفِ اسرارِ مخفی و جلی — جس پہ آگاہی کی تھیں راہیں کھلی

جس سے قائم تھیں روایاتِ قدیم — جو بزرگانِ سلف کا تھا ندیم

جس کی شفقت نے بھلا ڈالا وطن — آج کرتا ہے جُدا پیرِ کہن

ہم سیاسات سے واقف نہیں — صدق دل سے پر دلاتے ہیں یقیں

ہم وہی خادم ہیں بچے آپ کے — مہرباں ہیں آپ مثل اک باپ کے

آپ کے ہوتے ہمارا تھا یہ گھر — انقلابِ دہر سے کچھ تھا نہ ڈر

فکرِ دنیا سے رہے ہم بے نیاز — آپ نے پیہم اُٹھائے سب کے ناز

آپ سے ملنے میں کچھ کھٹکا نہ تھا — گھر تھا یا اک فیض کا تھا در کھلا

آپ کو ہم پھر دلاتے ہیں یقیں — آپ کی عظمت ہے دل میں جاگزیں

عمر بھر مانیں گے احسانات کو — آپ کی شفقت کے احساسات کو

عمر اب جوں جوں گزرتی جائیگی — قدر نعمت کی سمجھ میں آئیگی

خدمتِ قومی کا گر کچھ ہو صلا — اس کا دینے والا ہو تنہا خدا

ہو اسی درگاہِ عالی میں دعا — شاد و خرم آپ کو رکھے سدا

نظمِ وداعی

(از قاضی نعمان جلالی صاحب متعلم بی اے سکرٹری جاگریفیکل سوسائٹی)

۱۹ رمئی ۱۹۲۸ء کو کرزن جاگریفیکل سوسائٹی پارٹی کے موقع پر نظام میوزیم میں پڑھی گئی

اے زمیں کیا تری گردش کے یہ سب ہیں آثار
یا تری چال ہی کچھ اے فلک کج رفتار

تو ہی بتلا رُخِ خاور کہ ہے کیا اس کا سبب
سرد مہری کا یہ کیوں گرم ہوا ہے بازار

مارچ، اپریل، مئی کے ہیں مہینے کیسے
کہتے ہیں ہوتی ان ایام میں تھی فصلِ بہار

چمنِ دہر پہ سو ناز سے چھاتا جوبن
ہوتا ہر منظرِ قدرت یہ عروسانہ سنگھار

پھر یہ کیا بات ہے اللہ نرالی امسال
فصلِ گل آئی مگر کچھ نہیں اس کے آثار

دل ٹھکانے ہو تو ہر شی میں ہے سامانِ سرور
زعفراں زار کا دے لطف خزاں خوردہ بہار

ڈاکٹر صاحب ذی جاہ کو رخصت کر کے
دلِ غمگیں پہ نہایت ہے ہجومِ افکار

میں خوشامد کو سمجھتا ہوں طریقِ مذموم
جھوٹی تعریف ہے ایک ہجو ذلیل و بیکار

آپ کے اتنے ہیں اوصاف کہ ممکن ہی نہیں
کہ ارتھمیٹکل اعداد کریں ان کا شمار

دائرہ ان کے محاسن کا ہے اس درجہ وسیع
گھیر سکتا نہیں جس کو کبھی دورِ پرکار

آدمیت کی جو ہو دیکھنی شکلِ مرئی
یا اگر خلقِ مجسم کا ہو کرنا دیدار

کچھ نہیں دور، نہ مشکل ہے، نہ ناممکن ہے
دیکھ لے آ کے وہ ممدوح کو میرے اکبار

بے ضرر، باہنر و بے بدل و با اقبال
نیک دل، نیک زباں، نیک سیر نیک اطوار

اپنے شاگردوں کا ہمدرد و شفیق و یاور
صدق و اخلاص سے احباب کا اپنے غمخوار

آپ کی یاد فراموش نہیں ہو سکتی
آپ کی ذات سے ہے ملک کا ایک عز و وقار

صدق دل سے ہے جلالی کی دعا آٹھ پہر
ہو خدا آپ کا نگران و معین و یاور

تحفۂ وداع

از

(قاضی سید بشیر الدین صاحب بی اے (علیگ))

۲۷ اپریل ۱۹۲۸ء کو یونین کلب میں اڈریس پیش کیے جانے کے موقع پر پڑھی گئی

مدام اے صبح کاں مہ رو در آغوشِ من ست امشب — کہ چرخِ فتنہ پرور را ملک پیرامن ست امشب

مئے گلرنگ نورِ ماہ و بادِ جاں فزا ہر دم — رقیباں را ز حسرت جائے اندر گلخن ست امشب

شکستہ مطرب و ساقی بہ مستی چنگ و مینا را — تو ہم جعدِ سیہ بشکن کہ بشکن بشکن ست امشب

برو اے مدعی از بزمِ ما در گوشۂ بنشیں — کہ دردِ دل مرا با دلبرِ خود گفتن ست امشب

بہ سودا تا بکے آشفتگی آشفتہ تر گردم
نہ آخر ہمچو گیسوئے پریشاں گردِ سر گردم

ہمی غلطم ز بیتابی بہ پہلوئے ز پہلوئے — خلد اندر رگِ جاں خارِ مژگانِ پری روئے

عجب می آیدم از سحرِ چشمِ ناتوانِ او — ز شوخی صیدِ مردم می کند ایں طرفہ آہوئے

بکاکل می زند شانہ پریشاں کردہ بر دوشے — بہ زخمِ سینۂ ما مشک می ریزد سیہ موئے

بیا نظارہ کن خونباری دیوانۂ خود را — خرابی می کند اکنوں بہر کوئے و ہر سوئے

سراغِ کاروانِ منزلِ جاناں ہوس دارم
دلِ پرشور و سرگرمِ فغاں مثلِ جرس دارم

چہ صدہا آرزو در دل کہ جز حسرت نمی آرد — چہ ابرِ مستہا بر سر گزد و ہیچت نمی بارد

فریبِ آرزو نقش دو عالم آرزو دلے — کہ پنہاں بندہائے یاس و صد حسرت ہمی دارد

نقوشِ تازہ می ریزد دمادم در تل و صحرا — نگاہِ نرگسِ شہلا کہ در حیرت ہمی دارد

دلِ خوں گشته‌ام گر قطره قطره از سرِ مژگاں   چکد هموارهٔ گر تو سم، فرا سیلی همی آرد

روی دمی بری ای جانِ جاں صبر و شکیب از من
دلِ سوزاں سپند آسا، بلا گرداں سبب از من

ترا چوں الوداع گویم زغم آشفته‌تر گردم   ز فرطِ نا امیدیها به حسرت چشم تر گردم
مکن وهم زوالِ اشتیاق و سرد بازاری   کشیدستم بدل نقشِ وفا مشتاق‌تر گردم
مداں کز دوریِ تو هم محبت کم شود حاشا   دل از تو بر نه گردد گرچه من مایوس‌تر گردم
نشاطِ دیده بازی کم نه گردد چشمِ نرگس را   همی خواهم که پیشِ تو ز سر تا پا نظر گردم

سرت گردم نظر بکشا، و حالِ زار دُر پر غم بیں
کنار از دردِ غم فاش اشک و آهِ سردم بیں

علی گڑه گر چمن می بد تو بودے جوئے بار ایں جا   گلستاں بود یونیورسٹی و تو هزار ایں جا
روی دمی ربائی رونقِ صحرا و گلشن را   ز تو ابرِ دُر افشاں بُد ز تو دورِ بهار ایں جا
علی گڑه چوں دلِ عاشق شود ویرانه ویرانه   مرو از دل بروں، کز داغها دارم بهار ایں جا
ز چشمم سیل افشانم رواں و آبشار ایں جا   فغانِ قمری و آهِ من و صوتِ هزار ایں جا

روی دمی رود صبر و شکیبِ دلاں با تو
دعائے نیم شب، آه سحر، اشکِ رواں با تو

هر جائے که باشی دُر اماں از جمله شر باشی   به نصر الله هر گم کرده ره را راهبر باشی
به گلزارِ اخوّت عطر بیزِ کار پردازی   جهانِ ملّتِ اسلام را بادِ سحر باشی
ضیا باری امید از تو باشد قومِ محزوں را   فروغِ محفلِ انجم و هم نورِ قمر باشی
فروغِ طالعِ اسلام باشد از عروجِ تو   جهانِ دردِ "ملّت" را به همت چاره گر باشی

سپارم با خدایت ای دلِ صد چاک را مرهم
روی دگریه می آید نمی‌دانم که چوں هر دم

نذرِ عقیدت

از

پروفیسر قاضی محمد جلال الدین صاحب ایف، آر، جی، ایس

۲۹ ر اپریل ۱۹۲۸ء کو سوئمنگ باتھ لان پر موقع مسلم یونیورسٹی اسٹاف ڈنر پڑھی گئی

اے گلشنِ ہندوستاں اے طرفہ گلستانے　　رنگیں چمنستانے بر وضعِ دبستانے

کیوں کاکلِ سنبل میں ابتر کسی اُلجھن سے　　کس غم میں خمیدہ ہیں سروانِ سہی تیرے

کیوں تحتِ شجر تیری چکّر میں ہیں سب بیڑیں　　کیوں بھرتے ہیں فوّارے پیہم ترے سرد آہیں

ہیں خون بدامن سارے گل آج کھلے جتنے　　ہر برگ پہ آنسو ہیں شبنم کے نہیں قطرے

ہر شاخ کو خدشہ ہے پت جھڑ کی ہواؤں کا　　ہر پھول کو کھٹکا ہے گلچیں کی جفاؤں کا

سوسن کی چنبیلی سے گفتار یہ ہے پیہم　　کس بادِ مخالف نے گلزار کیا برہم

اک سمت جماعت ہے صد لالۂ احمر کی　　سہمی ہوئی چالوں سے اس گنبدِ اخضر کی

گلہائے معنبر کو لاحق ہے یہی خطرہ　　حسنِ گلِ بے بو پر مائل ہے کچھ اب دنیا

گل چاک بداماں ہے اور داغ بدل لالہ　　شورے بدہن طوطی فریاد ہے اور نالہ

کل شورِ عنادل سے اک دھوم تھی گلشن میں　　کیا رنگ ہو گلشن میں جب روح نہ ہو تن میں

میں فکر میں مالی کے گلشن کی طرف لپکا　　اور بلبلِ نالاں سے اس طرح ہوا گویا

اے بلبل اگر نالی من با تو ہم آوازم
تو عشقِ گلے داری من عشقِ گل اندامے

تاریخ نے پھر آکر لوٹا ہے ورق اپنا　　دہرایا ہے فطرت نے پھر پچھلا سبق اپنا

انجام میں سب بے مہری فطرت کی نشانی ہے　　تصدیق ہے تاریخی قصہ نہ کہانی ہے

خدمت میں خلایق کے جو عمر گزارے گا
دُنیا کو بگاڑے گا عقبےٰ کو سنوارے گا

خالد کی سی سربازی عالم میں ہے لاثانی
مغلوب کیا یکسر کل عسکرِ یونانی

یرموک پہ چڑھ دوڑا البصرہ سے اُڑا گھوڑا
دو سال میں سر کرکے ایک ایک مکاں چھوڑا

انعام میں ملتا ہے معزول کیا جانا
عامل کے مدارج سے معمول کیا جانا

طارق نے جو ملت کی خدمت میں وطن چھوڑا
اسپین کے بدلے میں موسیٰ نے دیا کوڑا

موسیٰ نے ظفر پیکر افواج کو لے جا کر
پرچم تو خلیفہ کے لہرا یا جینیوا پر

تکبیر سے گونج اُٹھی گیرون کی ہر وادی
تہلیل سے کانپ اُٹھی یورپ کی ہر آبادی

اِس کارِ نمایاں کی موسیٰ نے جزا پائی
معزولی و مخذولی ناکامی و رسوائی

افسانہ بن قاسم پوچھے کوئی ملتان سے
اور اس کا صلہ پوچھے داروغۂ زنداں سے

سرتاج حنیفہ ہیں جو فقہی امامت کے
واقف ہے ہر اک احمد حنبل کی کرامت سے

جس دین کی خدمت میں عمر اپنی گنوا چھوڑی
اُس دیں کے خلیفوں نے کیا کیا نہ جفا توڑی

بغداد کی اینٹوں کو منصور نے گنوایا
مامون نے حنبل کو زنجیر میں کسوایا

عباسیوں نے پایا از سعیِ خراسانی
ابنائے اُمیہ کا اکلیل جہانبانی

خود جعفرِ عباسی سے اُس کا اثر آتا ہے
محسن کو صلہ دینا دُنیا کو سکھاتا ہے

آغاز کو لمبس کا اِک جلوۂ یورپ ہے
انجام اگر دیکھو اندھیر ہے اور گھپ ہے

ہوتا ہے جدا سایہ انسان سے راتوں میں
چھوٹا نہ ہمایوں پر اک خان سے راتوں میں

بھاگڑ میں رہا ساتھی ایراں کا سفر جھیلا
سو مرتبہ دن دن میں جان اپنی پہ وہ کھیلا

طفلی میں اثر دہ تھا تربیتِ بیرم کا
شہ بن کے لقب پایا ہے اکبرِ اعظم کا

ہوش آتے ہی اکبر کے تاریخ جتاتی ہے
معزولیِ بیرم کے قصہ کو سناتی ہے

القصہ مثالیں ہیں اک ایک سے بھی بڑھ کر
عظمت کی علامت ہے، جو موج گرے چڑھ کر

سعدی بلبِ دریا دُردانہ کجا یابی
درکام نہنگاں رو گر می طلبی کامے

اک جزر کا ہو جانا پھر مد کی علامت ہے ۔ حرکت میں سکوں آنا عالم میں قیامت ہے

پھر موسم گل آیا پت جھڑ یہ بتاتا ہے ۔ امید کے مستوں کو متوالا بناتا ہے

چھپ چھپ کے نکلتا ہے تب چاند سے الفت ہے ۔ سورج میں وگرنہ کیا کم نور و حرارت ہے

اسلام کی دنیا میں تو جوہر بکتا ہے ۔ کب ہند میں بکتا ہے جو گوہر یکتا ہے

چالیس ہزار اٹھیں جس لعل کی پرکھن میں ۔ مثل اس کا کہاں ڈھونڈیں کس دیس کی معدن میں

ایثار سے کالج میں کل عمر گنوائی ہے ۔ خوش باش کہ اک ہستی بے مثل بنائی ہے

دی بندش سرو سے اللہ نے آزادی ۔ کام آ گئی اب کھل کر گھر گھر تری استادی

ظاہر میں اگر دیکھیں اک قطع تعلق ہے ۔ باطن میں جو الفت ہے بے رنگ تملق ہے

زنجیر محبت کو ہم نے نہیں چھوڑا ہے ۔ امید کے رشتہ کو ہم نے نہیں توڑا ہے

گرچہ شب مشتاقاں کوتہ نہ بود اما
نومید نہ شاید بود از روشنی بامے

ہدیۂ حاذق

از پروفیسر محمد حاذق صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

۲۹ اپریل ۱۹۲۶ء کو مسلم یونیورسٹی اسٹاف ڈنر میں پڑھی گئی

اے محیطِ عقل و دانش اے حریمِ علم و فن
اے سپہرِ منزلت اے مرکزِ فہم و فطن

ہم کہ دامن میں ترے ہیں غنچہ و گل کی طرح
تو کہ نظروں میں ہماری، ہے ہم اندازِ چمن

ہم کہ ہیں بھولے ہوئے غربت میں آلامِ سفر
تو کہ دیتا ہے ہمیں آرام مانندِ وطن

ہم کہ تجھ کو مانتے ہیں واقعی دریائے فیض
تو کہ ہم کو جانتا ہے فی المثل دُرِّ عدن

ہم کہ ہیں سوزِ محبت سے فدا پروانہ وار
تو کہ ہے اپنی ضیا پاشی سے شمعِ انجمن

ہے اُسی سوزِ محبت کی یہ مجبوری کہ آج
سرد مہری پر تری ہوتا پڑا اگرمِ سخن

تیرے پروانوں کا جھرمٹ روز افزوں دیکھکر
حاسدانِ خوردہ بیں ہونے لگے ہیں طعنہ زن

کشمکش سے ٹوٹ جائے جب کہ قانونِ اصول
کیوں نہ دے سازِ انانیت صدائے ما و من

ہو گیا عنقا ثبات و پائداری کا وجود
ہیں زمانے کی طرح بدلے ہوئے اہلِ زمن

چھٹتی ہے دنیا میں شاخِ نخلِ رفعت کے لئے
ہم یہاں ہیں بیخ کن ذاتی خصومت کے لئے

وہ چمن بندِ اخوت جس کا پھل ہے اتحاد
وہ دبستانِ ادب جس کا سبق رشد و رشاد

وہ ریاضت گاہ جس میں جاگزیں حسنِ عمل
وہ محبت خواہ جس کے دل نشیں مہر و وداد

کارفرما جس جگہ تھا جذبۂ ربط و خلوص
جلوہ پیرا اب وہاں ہے صورتِ شک و عناد

تھی جو ایک قومی خصوصیت مسلّم دہر میں
اختلافوں نے مٹا دی اُس کی شانِ انفراد

اُٹھ گئی اس درس گہ سے دوست دشمن کی تمیز
کھُل گئی وہ راہ جس کا لازمی تھا انسداد

پیکرِ قومی کا ضامن ہے قوامِ اتفاق
تندرستی پھر کہاں جب ہو عناصر میں فساد

کیوں نہ جڑ ہل جائے اُس کی سنگِ لرزاں کی طرح
ہو ستونوں میں نہ جس ایواں کے قایم انجماد

ہاتھ آئے کیوں نہ ایسی منفعت میں منقصت
ہو مقدّم نفعِ قومی پر جہاں شخصی مفاد

اس جگہ سے کامیابی کیوں نہ روگرداں رہے
رونما ہو جس جگہ ایسی مخالف روئداد

دل سے مٹتی جا رہی ہیں سب روایاتِ کہُن
نقش بر دیوار ہیں گویا اب آیاتِ کہُن

تجکو اے دارالعلوم اس کی خبر ہے یا نہیں
چار دیواری میں تیری آج کیا ہے کیا نہیں

انتشارِ قلب گوشے گوشے میں موجود ہے
اور اطمینانِ خاطر کا پتہ ملتا نہیں

ادّعائے دوستی پر ہیں بہت رطب اللساں
جس میں ہو اخلاص ایسا کوئی دل والا نہیں

معنیِ ایثار کے پائے ہزاروں مُعترف
لیکن اُس پر ایک بھی سچّا عمل پیرا نہیں

یوں تو سب اچھے بُرے موجود ہیں تجھ میں مگر
جلوۂ روشن ضیاء الدین احمد کا نہیں

کیوں نہ استعجاب افزا ہو یہ دورِ انقلاب
کوئی ایسے جوہرِ قابل کو یوں کھوتا نہیں

عمر اپنی وقف کردی تیری خدمت کے لئے
کوئی پوچھے یا نہ پوچھے یہ انھیں پروا نہیں

رازِ پوشیدہ نہیں ہے اُن کا ایثار و خلوص
اُن کی ذات اور وصف میں حائل کوئی پردا نہیں

بن کے خادم جس کو ہے مخدوم بننے کی ہوس
دوست بھی نادان ہے دشمن بھی وہ دانا نہیں

اب چمن میں بلبلوں کا نغمۂ موزوں کہاں
عاشقِ لیلیٰ ہزاروں ہیں مگر مجنوں کہاں

آپ ہیں اے ڈاکٹر صاحب وہ ممدوحِ جہاں
دوستوں کا ذکر کیا ہو غیر بھی ہیں مدح خواں

ہے زمانے میں مسلّم قابلیت آپ کی
ہر قلمرو میں مثالِ روزِ روشن ہے عیاں

ہیں مجسّم آپ اک ٹکسال نقدِ علم کی
ہوتے ہیں دنیا میں جس کے سکّے ڈھل ڈھل کر رواں

آپ فرزندانِ کالج میں ہیں روشن اس طرح　　جس طرح سارے کواکب میں ہے مہرِ ضو فشاں
رہ کے جس کے سائے میں علم و عمل حاصل کیا　　آج تک چھوڑا نہ اس کا دامنِ عزت فشاں
جو تغیّر اب دکھایا گردشِ تقدیر نے　　تھا کسی دل میں نہ اُس کا نام کو وہم و گماں
آپ کے قدموں سے معراجِ ترقی تھی لگی　　لیکن اُن کو چھوڑ بیٹھیں آپ کی پامردیاں
یہ اولوالعزمی یہ ہمّت یہ قناعت یہ وفا　　جس نے کی ہو اُس کا بتلائے کوئی نام و نشاں
بات وہ ہے جس کا ہو اثبات بے چون و چرا　　ورنہ یوں کہنے کو سب ہیں "اپنے منہ مٹھو میاں"

ہر کہ رہ گیر است او ہر گز نہ مثلِ رہبر است
رہبری چیزے دگر آماس چیزے دیگر است

گو ہجومِ رنجِ فرقت سے ہے دل کو اضطراب　　پھر بھی تسکین و تسلّی کا نہیں ہے سدِّ باب
شاق ہے لیکن نہیں ہے یہ فراقِ دائمی　　اس سفر کو ہم سمجھتے ہیں مثالِ پا تراب
قوم کے افرادِ غالب میں یہ قوت اب بھی ہے　　وہ اگر چاہیں تو ہو سکتا نہیں یہ انقلاب
ذہنیت کو قوم کی لیکن بدلنا ہے ابھی　　اس لئے ہے تفرقہ اندازیوں سے اجتناب
آپ کے جانے میں بھی ایثار کے آثار ہیں　　جن کی آنکھیں ہیں نظر آتا ہے صاف ان کو یہ خواب
جلد کھل جائیں گے سب اسرار بے اصرار کے　　اس حقیقت کو ابھی کیجے نہ لیکن بے نقاب
اور کوئی خوف آوازِ مخالف کا نہیں　　بس یہ ڈر ہے یہ صدا ثابت نہ ہو بین الغراب
یہ دبستانِ ادب یارب یوں ہی قائم رہے　　یہ دعائیں مخلصانِ قوم کی ہوں مستجاب
آج کہتے ہیں تو کہنے دو یہ اشعارِ وداع　　کل کہیں گے "مرحبا، خوش آمدی عالیجناب"

برملا کہتا ہوں حاذق خفیہ و پنہاں نہیں
گوشت سے ناخن جدا ہونا کوئی مشکل نہیں

نذرِ عقیدت

من جانب قاضی عبدالرشید صاحب بی اے ٹیچر

جو یونیورسٹی اسکول کے عظیم الشان ڈنر کے موقع پر یکم مئی ۱۹۲۶ء کو پڑھی گئی

اے ضیاء دین و ملت باصفات عالیہ
رونق بزم جہانِ جامعہ اسلامیہ

عقل و حکمت میں فلاطوں افتخار کیمبرج
علم میں فخر گٹنجن نازش المانیہ

اے کہ تیرے آستانِ خلق و احساں پر مدام
تھا جبیں سائی کا طالب یاں ہر اک کا ناصیہ

اے کہ جس کے علم و فضلِ عام نے دنیا میں آج
روح تہذیب ان میں پھونکی جو تھے اہلِ بادیہ

اے کہ اک تیری ضیا سے تھا منور اب تلک
جامعہ کا گوشہ گوشہ اور اک اک زاویہ

اے کہ تیرے جوہرِ علم و ہنر کے سامنے
تنگ ہے اک اک سے بڑھ کر قابلوں کا قافیہ

چلتے تھے ساغر پیاپے بادۂ اکرام کے
تو اگر ساقی تھا یونیورسٹی تھی ساقیہ

نام کی تیرے کشش تھی جس سے از نزدیک و دور
نوجواں آئے یہاں ایرانیہ افغانیہ

قوم کی شیرازہ بندی اک ترے دم سے ہوئی
ورنہ کیا سندھی بنا تھا ہمدم آسامیہ

علم پاشی سے تری تھے فی الحقیقت بڑھ گئے
کیسے ہر نخلِ دبستاں میں قوائے نامیہ

کام دنیا کا چلا کرتا ہے ہر اک حال میں
ختم ہے پر وہ فضا جو تھی یہاں اسلامیہ

سر بسجدہ کون اب مسجد میں ہوگا اپنے ساتھ
زینت محراب ہائے معبدِ رحمانیہ

کیا کبھی رمضان میں تیرا کوئی قائم مقام
اپنے گھر روزہ کشائی کا کرے گا داعیہ

تیرا ہمسر تیرا ہمپایہ۔ ترا مثل و نظیر
تجھ سا مونس۔ تجھ سا مخلص باصفات عالیہ

دیکھنا ہے قوم اور سرکار یا سعیٔ تمام
لاتی ہے پیش نظر رکھ جامعہ کا مالیہ

ہاتھ میں تھی تیرے تحریک علیگڑھ کی زمام
جس کو قابو میں رکھا تا طاقت امکانیہ

آج وہ ذاتِ گرامی چھوٹتی ہے ہم سے آہ
اب علیگڑھ جان لینا ہو گیا ہے ہاویہ

اے خدا مہربان و اے کریم کارساز
عَلَّمَ الاسماء ہے تیری آیت قرآنیہ

ہوں طفیل سرورِ عالم شفیع المذنبیں
اس پہ نازل برکتیں تفصیلیہ اجمالیہ

نذرِ توفیق

سید توفیق الحسن متعلم بی اے کلاس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نہیں معلوم بلبل آج کیوں بے تاب ہوتی ہے — جُدائی ہے کسی گُل سے گلے مل مل کے روتی ہے

فلک تجھ سے گلا ہے تفرقہ ڈالا ہے آپس میں — یہ فرقت آج دل میں بیج مایوسی کا بوتی ہے

خدا نے اپنی رحمت سے دیا تھا ہم کو وہ گوہر — جو بحرِ حسن و خوبی کا عجب انمول موتی ہے

جدائی شاق ہے واللہ ہم کو ایسے محسن کی — کہ جس کے خُلق کی تعریف ہر محفل میں ہوتی ہے

مری بے صبریوں سے کہہ رہی ہے میری بدبختی — کہیں آہِ دلِ عشاق میں تاثیر ہوتی ہے

کرشمہ دیکھ لینا ایک دن برقِ تصوّر کا — کہیں آزادگی منت کشِ صیّاد ہوتی ہے

علی گڑھ میں اکیلا چھوڑ کر جاتے ہیں کس جانب — الٰہی کیا قیامت ہے یہ قسمت کیسی سوتی ہے

رہیں شاداں و فرحاں تا قیامت ڈاکٹر صاحب — بدرگاہِ الٰہی یہ تمنّا دل سے ہوتی ہے

رہیں گے حشر تک محفوظ طوفانِ حوادث سے — کہیں جھونکوں سے گُل شمعِ ضیاءِ دین ہوتی ہے

چمن بندِ خیاباں یاد کر لینا کبھی ہم کو — یہی اب التجائے غنچہ و گُل تجھ سے ہوتی ہے

جُدائی اُس سے ہے توفیقؔ جس پر دل تصدق ہے
تمناؤں کا خوں ہوتا ہے اور حسرت بھی روتی ہے

بخدمت اقدس جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، سی آئی ای

پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تلے ہوئے تھے طرب خیزیوں پہ لیل و نہار — عجیب شان دکھاتا تھا نور صبح بہار

خیال جام میں سرگرم لطف تھے مے کش — ہوئی تھی سرد ہواؤں کی گرمیٔ بازار

ہوائے باغ وہ پرکیف تھی کہ پھولوں سے — ہر ایک مرغ چمن کو تھا شوق بوس و کنار

سرود ریز تھی بزم جہاں کی کیفیت — جدھر بھی جاؤ بیا رو بنوش کی تھی پکار

نہیں سے تھے آپ میں رندانِ جام مے بر کف — کہاں کا وعظ کہاں کا تھا زاہدِ دیندار

غرض خوشی کی تھی چاروں طرف فراوانی — بہارِ عیش دکھاتا تھا طالعِ بیدار

کہ اک ہوائے قیامت چلی غریبوں پر — خزاں کے رنگ سے بدلا نمود صبح بہار

فضائے رنج ہر اک دل پہ چھا گئی ایسی — کہ جس سے ہو گئی ہم سب کی زندگی دشوار

ضیاءِ علم کی ترخیص ایک قیامت ہے — ہر ایک علم کا طالب ہے جان سے بیزار

ترا وجود تھا اک آفتاب علم و عمل — کہ جس سے سوئے ہوئے لوگ ہو گئے بیدار

ضیاءِ علم کا تیری یہ فیض تھا کہ ہوا — ہر ایک ذرہ علی گڑھ کا رونق ابصار

فروغ علم و عمل کے لئے زمانہ میں — جہان پا نہیں سکتا تری طرح غمخوار

ترا ہی فیض کرم تھا کہ آج لاکھوں میں — فلک سے آنکھ ملاتا ہے طالعِ بیدار

غرض ہمیں تھے ترے سطح نگاہِ کرم — ہماری فکر ترقی تھی اور ترے افکار

ہماری فکر میں یہ بڑھ گئی تھی محویت — نگاہ سوتی تھی اور قلب تھا ترا بیدار

فلک کی تفرقہ پردازیٔ ستم دیکھو — کہ آج ہم سے جدا ہو رہا ہے اک غمخوار

وہ جس کا لطف تھا ملک حیات کی بنیاد — نگاہ دیکھ کے چلتے تھے طالبِ یدار

وہ جس کی فکر سے قائم نظام علمیت — وہ جس کے ذہن پہ دنیا کی گردشوں کا مدار

نظر فروز تھے محراب دید کے زائر — وہ اُن کی چشم کرم تھی کہ رونقِ ابصار

ہر ایک چاہتا ہو اسی طرح فیضِ عام ترا — تری نگاہ سے جی جائیں طالبِ دیدار

جہاں رہے تو زمانہ میں نیک نام رہے

ترے عمل کا ہمیشہ جہاں میں نام رہے

خاکسار محمد فخر الحق فاروقی۔ طالب علم [illegible]

نظم

در مدحت جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

از منظور حسین صاحب شور (انٹرمیڈیٹ کالج)

سامنے آنکھوں کے میری اک نئی تصویر ہے
میں بحیرت ہوں کہ یہ کس خواب کی تعبیر ہے

ٹھیر جا تجھ کو قسم ہے گریۂ بے اختیار
ہے یہی تا حشر رنگ گردش لیل و نہار

ساقیا مانا کہ فصلِ گل کا وہ عالم نہیں
اضطرابِ دل مگر اک کیفیت سے کم نہیں

آخری صحبت ہے ساقی وہ مئے رنگیں پلا
حشر تک بھولیں نہ میکش جس کی تلخی کا مزا

اے ضیائے دینِ احمد اے ضیائے دینِ ما
سیدِ ثانی سپہرِ عظمت و تمکینِ ما

تو وہ ہے سایہ میں جس کے دخترِ کالج پلی
تو نے کس کس ناز سے کی پرورش اس طفل کی

گلشنِ کالج ترے ہی دم سے یوں پھولا پھلا
اپنے خوں سے تو نے سینچا اس چمن کو سالہا

مصحفِ معنی ہیں گر سید تو ہے تفسیر تو
خواب ہیں گر وہ تو ہے اس خواب کی تعبیر تو

کر دیا تو نے علی گڑھ کی زمیں کو آسماں
یاں کا ہر قطرہ ہوا چشمک زنِ بحرِ رواں

تم چھٹے ہم سے غریقِ بحرِ غم دل ہو گیا
قعرِ دریا سے مبدل اپنا ساحل ہو گیا

تیری رخصت نے وطن میں کر دیا ہم کو غریب
تھے جو کل تک کامراں ہیں آج وہ حسرت نصیب

شور مضطر کی دعا ہے تو جہاں جا کر رہے
تا قیامت تجھ پہ لطفِ داورِ محشر رہے

نظم وداعیہ

از مسٹر ریاض احمد بہ موقعہ انٹرمیڈیٹ کالج ڈنر واقع ۱۸ مئی ۱۹۲۶ء

یا الٰہی اس قدر اندوہگیں کیوں ہے سماں — سب کے چہروں سے اداسی کیسی ہوتی ہے عیاں

مہرِ خاموشی لبوں پر سب کے ہے مانندِ شمع — اور دل میں سوزشِ اندیشۂ فرقت نہاں

کس ضیا کو کھو رہا ہے آج یہ دار العلوم — ہیں در و دیوار پر چھائی جو یہ تاریکیاں

انقلابِ دہر سے اپنے دلوں میں دفعتہً — نقشِ حسرت بن گئے کس کی وفاؤں کے نشاں

آج رخصت کس کو کرنے کے لئے آئے ہیں ہم — ہے یہ کس کے غم میں سیلِ اشک آنکھوں سے رواں

آج کس کے غم میں یوں روتے ہیں سب دیوار و در — دل مخاطب کس کو کر کے کر رہا ہے یوں بیاں

تیرے غم سے کیوں ہمارا دل نہ ہو اندوہگیں
تو علی گڑھ میں تھا سید کا حقیقی جانشیں

غیر احسانوں کو تیرے بھول بھی جائیں تو کیا — دائمی ہے قوم کے دل پر ترا نقشِ وفا

جس نے کر دیں دور ہم سے جہل کی تاریکیاں — اے ضیاء الدین احمد تھی وہ تیری ہی ضیا

وہ علی گڑھ جس میں تھا اک ایم اے او کالج کبھی — وہ علی گڑھ جو کبھی ادنےٰ سا دار العلم تھا

اک زمانہ پر یہ روشن ہے کہ تیرے فیض نے — کر دیا ہے آج اس کو رشکِ مصر و قرطبا

یاد ہے وہ دن بھی جب پھیلا تھا آزادی کا جوش — جب علی گڑھ میں بپا طوفان محشر خیز تھا

پھنس چکا تھا جب بھنور میں اپنے کالج کا جہاز — تو ہی ایسے وقت میں تھا اس کا تنہا ناخدا

دیکھنا اک دن کہ اشکِ خوں رلائیں گی بہت
قوم کو تیری یہ باتیں یاد آئیں گی بہت

آئے تھے تفتیش کو ممبر کمیشن کے جو یاں — تیرے شاگردوں کی کرتے ہیں صفت وہ سب بیاں
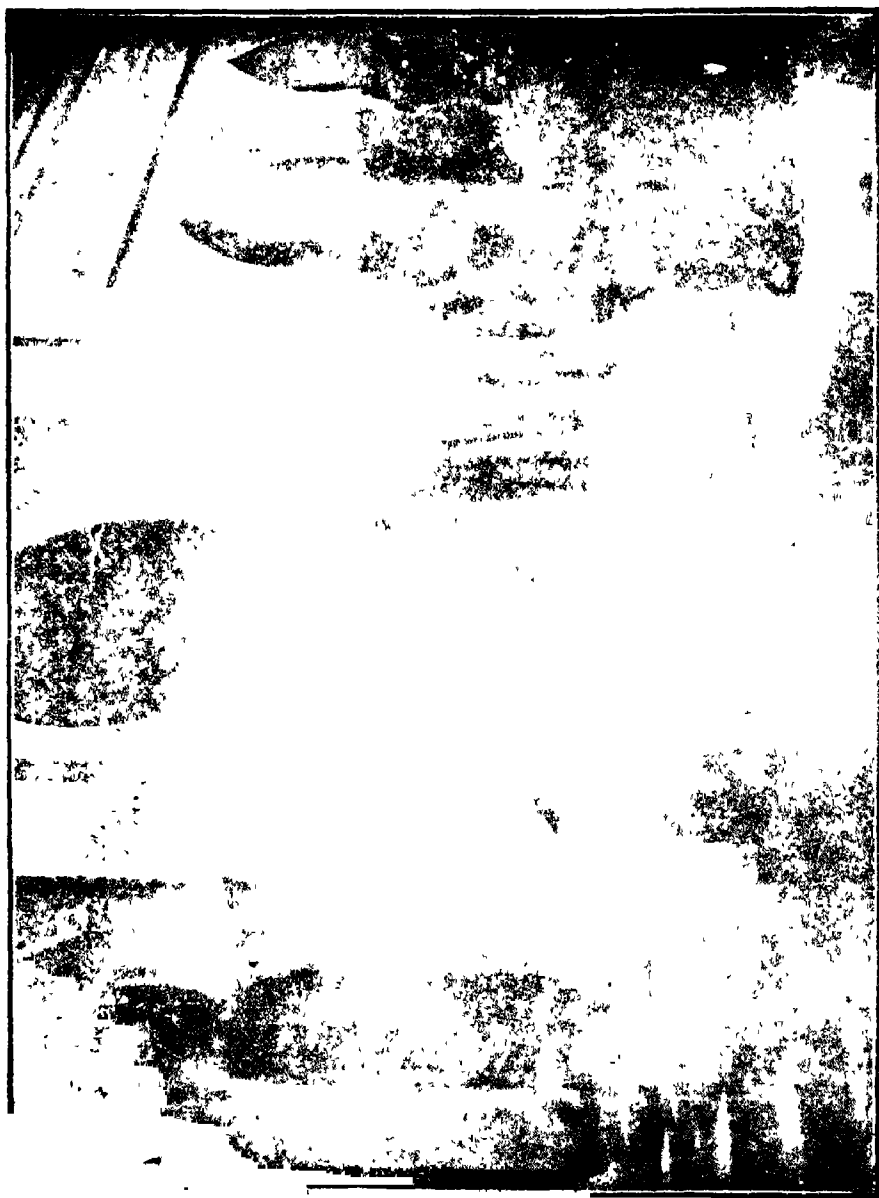
تکوینِ عالم و تخلیقِ ارض و سماء

(از قاضی جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس)

معتقداتِ قدیم باشندگانِ امریکہ

امریکہ اسی زمانہ سے صفحۂ عالم پر موجود تھا جب کہ خشکی سطح آب پر ظاہر ہوئی اور ایشیا و افریقہ ظہور میں آئے۔ البتہ اس کی دوری اور وش سمندروں میں لپٹے ہونے کے باعث پُرانی دنیا والوں کے علم اور نظروں سے اس وقت تک پوشیدہ رہا جب کولمبس اور دیگر سیاحانِ بحری کے حوصلہ اور ہمت کی کمند وہاں تک نہ پہونچی تھی۔ چنانچہ ۱۴۹۲ء میں اس دلہن ے چہرہ سے نقاب اُلٹ دی گئی اور ایک نئی دنیا کا سونے چاندی اور ہر قسم کے جواہر سے آراستہ اور پیراستہ جود امریکہ کے نام سے پُرانی دنیا والوں کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا۔ یہ عظیم الشان برِ اعظم قطب شمالی سے تقریباً ب جنوبی تک پھیلا ہوا ہے اور صرف آبنائے بیرنگ پر ایشیا سے جا ملا ہے۔ یہ آبنائے جو چھتیس (۳۶) میل سے یادہ چوڑی نہیں ہے ایام سرما میں یخ بستہ ہو کر دونوں بر اعظموں کو ملا دیتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس راستہ سے یشیا کے قدیم باشندے امریکہ جا پہونچے اور اُن کی ذریات شمالاً جنوباً ہزارہا میل میں پھیل گئی۔ یہ لوگ یورپی زبانوں ں امریکن انڈین کہلاتے ہیں اور ہر حصہ امریکہ میں مختلف ناموں سے ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ بعد دریافت امریکہ لوگ درندوں کی طرح وحشی، جنگ جو، مردم خوار نظر آئے اور اس لیئے نوآباد اہل یورپ نے جانوروں کی طرح ن کا شکار جائز سمجھا۔ لاکھوں کی تعداد میں نشانہ بندوق بنائے گئے۔ قدرتِ الٰہی سے جو بچ گئے اُن کی نسلیں آج تک جود ہیں۔ چوں کہ ان کے خیالات متعلق تخلیق عالم اچھوتے اور ایشیائی تخیل کے رنگ آمیزیوں سے پاک ہونے ہیں اس لیئے ہم انھیں سے ابتدا کرتے ہیں اور دکھلاتے ہیں کہ معلم فطرت نے تکوینِ جہان اور پیدائش انسان کے علق اُن کو کیا سبق سکھلائے ہیں۔

اعتقادات امریکیان خطۂ شمالی از خلیج ہڈسن تا ساحل بحر الکاہل

ان لوگوں کے اعتقاد میں تخلیق کائنات ایک سیاہ کلاغ یا کوّے سے ہے جس کی آنکھیں انگارے کی مانند درخشاں اور جس کی نگاہ مثال برق تاباں و شعلہ فشاں تھی اور جس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے مقابل بادل کی گرج شرمندہ و حیران ہو جاتی تھی (عالم بالا سے) یہ پرند اترا اور سمندر تک پہونچنے پایا تھا کہ تہ آب سے زمین اوپر اٹھ آئی اور سطح آب پر قایم ہو گئی۔ نام نامی اس کلاغ کا یٹل ([illegible]) تھا اسی سے اس قوم کے مورث اعلیٰ پیدا ہوئے اسی نے ان کی قوم کو طوفان سے پناہ دی اور وہی ان کے لیئے آسمان سے آگ لایا۔ شمالی امریکہ کی یہ شمالی قوم ایتھے پیسکن کہلاتی ہے اس کے شرقی شعبہ کے لوگ اپنی پیدائش ایک کتّے سے سمجھتے آئے ہیں۔

نوٹ:- ۱- پانی، زمین اور آسمان اور آگ کی موجودگی اُن کے عقیدے میں قدیم معلوم ہوتی ہے۔

۲- انسان سے پہلے حیوانات کی پیدائش اُن کے عقیدے سے ظاہر ہے۔

۳- طوفانِ نوح کی طرح کسی نہ کسی عالم گیر طوفان کا وقوع ان کے عقیدے سے ثابت ہوتا ہے۔

دریائے سینٹ لارنس اور شرقی ملحقہ بحر ظلمات کے عقائد

وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ماما حوّا آسمان سے گرائی گئیں۔ لیکن سوائے بحرِ محیط کے کوئی جگہ اس کے پاؤں رکھنے کو نہ تھی۔ لیکن جوں ہی کہ اس کے پاؤں پانی پر لگے ایک بُلبلا پیدا ہوا اور پھٹ کر آن کی آن میں سطح آب پر زمین کی شکل میں قایم ہو گیا۔ اِنھیں میں کا ایک فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ "ماما حوّا" کے گرتے ہی ۴ عنصری جانور مثلاً اود بلاؤ اور چھچھوندر و میمون آبی نے غوطہ لگایا اور نیچے سے اس قدر مٹی نکال لائے کہ اس انسان کی پہلی ماں کے رہنے بسنے کے لیئے ایک ٹاپو تیار ہو جاوے۔

نوٹ:- ۱- پانی کی موجودگی کا خیال ابتدائی ہے۔ حیوانات کی موجودگی اور آسمان کا وجود مانا گیا ہے۔

۲- یہ کہ پہلا انسان عورت نازل ہوئی نہ کہ مرد۔

نیوفاؤنڈلینڈ اور خطّہ ہائے ملحقہ کے باشندوں کے روایات

یہ لوگ باعثِ ایجاد عالم سورج کو سمجھتے تھے اور اس آسمانی دیوتا کا نام اُنھوں نے مشّے بو (Michabo) رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک روز بھیڑوں کو لے کر شکار میں مشغول تھا کہ یکایک وہ سب ایک

بڑی جھیل میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سنتے بو جھیل میں گھسا۔ قدم رکھتے ہی ساری جھیل اُبل ائی اور تمام زمین پانی سے روپوش ہو گئی۔ دیوتا نے کوتے کو تھوڑی سی مٹی لینے بھیجا تاکہ نئی زمین تعمیر کرے لیکن وہ ناکام واپس آیا تب اُس نے زمیوں دریائی کو حکم دیا ہر چند اس نے بھی تلاش کیا کہیں ایک ماشہ بھر بھی مٹی نہ ہاتھ آئی بالآخر اس نے موشک شکیں کو اس خدمت پر مامور کیا وہ تہ آب میں سے تھوڑی سی لے آئی جس کے ذریعہ منتے بونے دوبارہ ربع مسکوں کی بناڈالی جس طرح کہ آج تک موجود ہے۔ درخت بھی چونکہ طوفان کے صدمہ سے بے برگ و بار رہ گئے تھے اس لیئے دیوتا نے اُن کے تنوں میں تیر مارے جو ہرے ہو کر از سر نو سرسبز شاخیں بن گئے۔ شریروں کو سزا دی جن کے باعث طوفان برپا ہوا تھا۔ اور بی موشک شکیں سے شادی کی جن سے اولاد پیدا ہوئی اور انسان سے دنیا آباد ہوئی۔

وادی مسیسپی اور ساحل خلیج میکسکو کے رہنے والوں کا عقیدہ

ان قدیم باشندگان امریکہ کے عقیدہ میں یہ بیا ہوا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں سوائے پانی کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اس وقت سطح آب پر دو کبوتر اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھرتے تھے جنھوں نے اتفاقاً ایک جگہ ایک گھاس کا ہرا پتہ پانی سے اوپر نکلا ہوا دیکھا اس کے بعد ہی زمین اُبھر آئی اور برِ اعظم اور جزائر جیسے کہ اب موجود ہیں بصورتِ خشکی قایم ہو گئے اس خشکی میں ایک پہاڑ تھا اس میں مالک الانفاس کا قیام گاہ تھا جس کے گرد چکنی مٹی کے تودے لگے تھے۔ اس مالک الانفاس نے اس مٹی سے انسانی قالب تیار کیئے لیکن پانی تمام زمین کو اب بھی گھیرے ہوئے اور ڈبوئے ہوئے تھا۔ اور کہیں ان قالبوں اور مجسموں کو رکھنے اور سکھانے کے لیئے جگہ نہ میسر تھی چنانچہ اس کو ایک دیوار بنانی پڑی جن پر ان کالبدہائے خاکی کو خشک ہونے دیا۔ جب سوکھ کر ان کی ہیولا گوشت پوست اور ہڈی سے مکمل ہو کر انسان بن گیا تو مالک الانفاس یا ارواح نے حکم دیا کہ پانی اپنی اپنی مقررہ جگھوں پر ہٹ جاوے چنانچہ موجودہ سمندر سمٹ سمٹا کر اپنی اپنی مفوضہ مقام پر متمکن ہو گئے اور خشک زمین انسان کے لیئے عطا ہوئی۔

نوٹ:۔ انسان کا کالبد خاک سے بننا اور اس میں روح پھکنا۔ عیسائی اور اسلامی عقائد سے کس قدر ملتا جلتا معاملہ ہے

۲۔ پانی کا قبل از تخلیق عالم موجود ہونا پایا جاتا ہے۔

دریائے مسیسپی اور مسوری کے دائیں کنارے کے باشندوں کے عقائد

اِن کے فلسفہ کے مطابق تخلیق کی کہانی کسی قدر مذکورہ بالا عقائد سے زیادہ مکمل اور مسلسل ہے۔ اسی عقیدہ کا اشتراک دریائے امیزان اور ملک گیانا کے اصلی باشندوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کل بنی انسان تحت الارض طبقہ میں ایک بڑی جھیل کے گرد اگرد سکونت پذیر تھے۔ سطح زمین پر جو انگور کے درخت تھے اُن میں سے ایک کی جڑ بڑھتے بڑھتے اِن کی آبادی تک پہونچ گئی اس کو پکڑ کر چند دل چلے سطح زمین تک چڑھ آئے اور اس کھلی ہوئی فضا اور انگور اور بھینس کے مزہ دار گوشت سے اس قدر خوش ہوئے کہ بہت سے تحائف لے کر پھر تحت الثریٰ میں پہونچے۔ لوگ طبقہ بالائی کا حال سُن کر اور پھل اور گوشت کا مزہ چکھ کر ایسے وارفتہ ہوئے کہ اپنے وطن تاریک کو چھوڑنے لگے اور اسی جڑ کے ذریعہ فضائے ہوا میں آنے کا تانتا بندھ گیا۔ سوء اتفاق سے ابھی نصف سے زیادہ آبادی اوپر نہ چڑھنے پائی تھی کہ ایک نہایت فربہ عورت چڑھنے لگی اور زیادہ بلندی طے نہ کرنی پائی تھی کہ اپنے وزن کے باعث نہ ٹھیر سکی۔ جڑ ٹوٹ گئی اور وہ راستہ ہی میں اس تنگ نالی میں پھنس کر رہ گئی۔ اب آمد و شد مسدود ہوئی اور ما بقی آبادی جہاں کی تہاں رہ گئی۔ ان لوگوں سے نسلیں پھیلیں۔ جن کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنے بزرگوں سے اِسی اصلی پاتال دیس میں جا ملینگے۔ جو لوگ پرہیزگار اور نیک ہونگے وہ ہلکے پھلکے جھیل کو عبور کر جا وینگے اور گنہ گار اپنے گناہوں کی وجہ سے اسے پار نہ کر سکیں گے۔

اِن میں سے ایک فریق کا عقیدہ ہے کہ ان کا پہلا انسان جھیل میں سے برآمد ہوا جس کے ہاتھ میں جوار کا بھٹا تھا۔

نوٹ:- ۱۔ پانی کا وجود بطور قدیم شے کے ان کے تصور میں بھی ہے۔

۲۔ ایک آدم سے پیدایش کے قایل ہیں۔

۳۔ گناہ اور ثواب کا مسئلہ اور اُمید و بیم اور جزا و سزا کا عقیدہ اس پر مستزاد ہے۔

اہالیان کیلیفورنیا کا توہم بابت تخلیق کائنات

ان لوگوں نے ترقی کر کے دیوتا تصور کر لیئے اوّل کوڈو یانپی (Kodo-yampe) بمرتبہ خالق اور دوسرا کویوٹی (Koyote) بمرتبہ ہالک (جو اختیارات میں ہنود کی وشنو اور شب جی سے ملتے جلتے ہیں) دونوں نے دُنیا کو دریافت کر لیا اور اس کو بطریق احسن ترتیب دینا شروع کیا گویا وہ خالق کائنات نہیں بلکہ مرتب عالم

۔ ترتیب نے کہ انسان کے کالبد چوبی بنائے لیکن وہ آپس میں لڑنے لگے جس کی پاداش میں وہ جانوروں میں مسخ
دیئے گئے۔ دونوں دیوتاؤں میں سخت عداوت پیدا ہو گئی اور "خالق" نے کو یوٹی کے فنا کردینے کی فکر کی۔ ایک اور
دیوتا بطور "فاتح" کے موجود تھا جس نے "خالق" کے مدد کی اور تمام وہ عفریت اور شیاطین تباہ کر ڈالے گئے جو انسانوں کے لیئے بلائے عظیم ثابت ہوتے۔ بعدہ "خالق" کو کو یوٹی نے شکست دی اور قبل الذکر کو بجانب مشرق راہ فرار
اختیار کرنا پڑی۔ عقیدہ ہے کہ امریکی لوگ ہر اس قطعہ زمین سے پیدا ہو گئے جہاں جہاں ان کی چوبی مورتیں گاڑ دی
گئی تھیں دوسری امریکیوں کے عقائد سے اس میں یہ فرق ہے کہ انسان کی تکوین اوّل تک اُس کو پہونچایا گیا ہے نہ
مثل عقائد ماسبق تخلیق ثانی سے ابتدا کی گئی ہے۔ لیکن پانی کی موجودگی ہر جگہ فطرت انسانی کا مقتضا نظر آتی ہے اور
وکان عرشہ علی الماء" کی صداقت کی جھلک اسی طرح دکھلاتی ہے جیسا اقتضائے فطرت یہ ہے کہ انسان کسی
فوق البشریت طاقت کو اپنا معبود سمجھے بغیر نہیں رہا ہے۔ چنانچہ کیلیفورنیا والوں کے عقیدہ میں بھی یہ ہے کہ ابتدائے
آفرنیش میں سوائے پانی کے اور کچھ نہ تھا۔ اسی سطح آب پر کوڈ و پانی اور کو یوٹو ایک کشتی کے ذریعہ اوپر سے آگرے
اور تربیت عالم میں مصروف ہوئے قوم ماڈو بھی بجز بے کنار اور آسمان کے سوا کوئی شے تصور نہیں کرتی۔ اِس پانی
پر پھر ایک لکہ ابر نمودار ہوتا ہے اور بڑھنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ منجمد ہو جاتا ہے اس سے ایک چاندی کی طرح
جھلکتی ہوئی لومڑی بنتی ہے اور یہی ان کے عقیدہ میں خالق جہاں قرار دی گئی ہے جس کا نام اوپرندکو رہے۔ بارِدگر
ابر پیدا ہوتا ہے اور وہ انجماد پر پہونچ کر دوسرا دیوتا کو یوٹو بن جاتا ہے۔ پھر اک طوفان اُٹھتا ہے تمام مخلوق غارت ہو جاتی
ہے مگر پانی اُترنے پر جہاں جہاں خشکی ظاہر ہوتی ہے اُس پر کو یوٹو جا بجا پرندوں کے پر گاڑھ دیتا ہے۔ اس سے مخلوق
پیدا ہوتی ہے اور اقسام اقسام کے پرندوں کے پروں کے سبب لاتعداد فرقے اور قومیں بن جاتی ہیں (غالباً اسی خیال
سے امریکی لوگ اپنے سروں کو پروں سے ضرور آراستہ کرتے رہتے ہیں)۔

لیڈو قوم کا عقیدہ جو آرکنساس وغیرہ میں رہتے ہیں

یہ لوگ بھی تخلیق ثانی کے ماننے والے ہیں یعنی یہ کہ ان کے بزرگ طبقات زیریں کے رہنے والے تھے۔ پہلا شخص جو اس میں سے وہاں فضائے عالم میں آیا وہ ایک بوڑھا مرد تھا جس کے ایک ہاتھ میں
آگ اور پائپ (حقہ) اور دوسرے میں ایک ڈھول تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بیوی برآمد ہوئی جس کے ہاتھ میں

اناج اور کدو کے بیج تھے۔ اُنھوں نے دُنیا کے خالق کا نام سکھایا جو آٹیس ٹِراوا (Atius Tirawa) تھا اور بتلایا کہ وہ غیر محسوس اور قادرِ مطلق ہے جس کا مقام آسمانوں پر ہے اور جس کے پیغام بر عقاب اور شاہین ہیں اس نے آفتاب ماہتاب اور ستارے بنائے اور ان کے دَور اور گردشیں مقرر کیں۔

وادی کولوریڈو کے باشندے

کسی خالقِ حقیقی یا ذاتِ ارفع کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ سمجھتے ہیں کہ زمین ہمیشہ سے قایم ہے ازلی اور ابدی ہے۔ انسان اس کے نیچے کے طبقات سے بذریعہ ایک سوراخ کے اوپر آگیا ہے جس نشیب کا نمونہ دریائے کولوریڈو کے خوف ناک نہایت عمیق دراروں سے متصوّر ہوسکتا ہے۔ ان کے عقیدہ میں دھرتی ماتا اور آکاس پتا قیامِ عالم کے ذمہ دار ہیں۔ اور یہ کہ بعد مرنے کے انسان پھر زمین کے قلب میں جا پہونچیگا۔

میکسیکو کے قدیم باشندوں کے عقائد بابت تخلیق عالم

ان لوگوں کے عقائد سب سے بالاتر اور قریب صداقت پہونچے ہوئے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک ذات خالق اور محافظ عالم کی ہر مخلوق کی پیدائش سے پیشتر حتیٰ کہ وقت کی موجودگی سے پیشتر اور روشنی کے عالم وجود میں آنے سے پیشتر موجود تھی گویا روزِ ازل سے ماقبل بھی خالق کی ہستی کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بجز تاریکی اور ذات باری کے تمام مخلوقات پردۂ عدم میں پوشیدہ اور نہاں تھیں۔ ظلمت عدم کی ابتدا نہیں مانتے۔ خالق نے اپنے ارادہ تخلیق موجودات پر توجہ کی اور آمادہ آفرینش ہوکر فضائے تاریک میں مخلوق کی نقش بندیاں کیں اور اپنی قوتِ ارادی سے کہر نما بادل اُڑانے شروع ہوئے جن میں خلقتِ عالم کے خمیر کو شامل کردیا۔ بعد ازاں اس مالک و خالق حقیقی نے آفتاب کی شکل و صورت اختیار کی اور اپنی نور و نار کی تابش و حرارت سے اُن کہریلے بادلوں کو پھاڑ کر پانی کی شکل میں تبدیل کردیا جو ارتقائی اُصول پر سمندر کی صورت میں قایم ہوگیا۔ بعد ازاں اس نے اپنے جسم پر سے گوشت کا کچھ حصہ کھینچ کر جُدا کیا اور اس سے دو جہان کا تخم پیدا کیا اور سمندروں کو اس تخم سے حاملہ کردیا اور اپنی حیات بخش شعاؤں سے پانی کی سطح پر سبز رنگ کے جھاگ نمودار کیئے جن سے "مادر زمین" پیدا کی اور اس پر پدرانہ شفقت سے احاطہ کیئے ہوئے آسمان عالم وجود میں ظاہر ہوگیا۔ دونوں کی ہم آغوشی سے کائنات ارضی نے خلعتِ ہستی پایا اور زندگی کی لہریں

ہر طرف دوڑنے لگیں۔ تب وہ دونوں یعنی زمین اور آسمان از ہمدگر جدا ہو گئے۔ عقیدہ ہے کہ زمین اور آسمان کو ایک
دوسرے میں اور ہر قسم کی شکل اور ہیولے میں تحلیل اور تغیر کی طاقت باقی ہے اور ان کی اپنی مرضی اور فوری خیال پر
تغیر صورت کا امکان ممکن۔ فضائے کائنات میں چار عدد رحم بنائے گئے اُن میں سب سے زیریں رحم میں ادھ کچرا
انسان اور تمام جاندار مخلوق پیدا کر کے ان کو افزائش نسل کی قوت سے مسلح کر دیا۔ جب یہ رحم مخلوق کی کثرت
اور جانداروں کی بہتات سے مملو اور لبریز ہو گیا تو نیم تحت انسان اس دباؤ اور گھٹاؤ سے تنگ ہو کر رحم کے
باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا چنانچہ سب سے پہلا انسان جو اس قعر تاریک اور غار تیرہ و تار سے ایک نہایت تنگ راستہ
سے باہر آیا وہ مسمی بہ پوشئے یانکیا (Poshai-yankya) تھا۔ یہ عقلمند ترین اور پہلا انسان یا آدم البشر
سب سے نیچے کے سمندر سے ظہور پذیر ہوا اور یکہ و تنہا سمندر کی سطح پر جزیرہ کی طرح پڑتا پھرا حتیٰ کہ "سورج باپ" سے
ملاقات ہوئی اور اس سے عرض معروض کی کہ وہ از راہ کرم تمام مخلوقات اور ان انسانوں کو جو سمندر کے نیچے
تحت الثریٰ میں مقید ہیں برآمد کرے اور اس نے انھیں آزاد کیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک جادوگر مسمی بہ
جنولوہا (Janauluha) نے اپنے جادو کی چھڑی کو جو پروں سے منڈھی ہوئی تھی رہ نما بنا کر مقید مخلوق
کو نیچے سے اوپر کی طرف ہنکا لیا۔ بعد ازاں رنگ برنگ کے طیور پیدا کیے جن میں سے کوّے کو موسم سرما کی روح
اور میکا (Macaw) (طوطی نما دُم دراز امریکی پرند) کو موسم گرما کی جان قرار دیا اور مکمل انسان کو
ابتدائی دو قوموں کے مجسم ہیولے کو پیدا کیا۔

نوٹ:- ۱۔ ابتدائی حصہ اعتقادات ادیان صادقہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

۲۔ "مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ" کا اطلاق کسی نہ کسی صورت میں ہر وحشی انسان کے معتقدات
میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ مٹی سے انسان کے وجود کی تخلیق کے قائل بہت سی وحشی قومیں ہیں جیسا کہ متذکرہ بالا عنوانات کے
تحت میں بیان ہوا۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ پانی کے سبب گیلی مٹی سے خمیر انسانی بنایا جانا متصور ہوا
اور اسلام میں کھڑکھڑاتی مٹی مادۂ وجود بتلائی گئی ہے جو خشک ہونی چاہیئے۔

(ب) اقوامِ ایشیائی کے اعتقادات

۱۔ ارض بابل یعنی قدیم کلدانیوں کے اعتقادات

یہ خطۂ زمین خلیج فارس کے ایسے ساحل پر واقع ہے جہاں در
فرات اور دجلہ باہم دگر متصل ہوکر اپنی دھار کو ختم کرتے اور سمن
میں گم ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ہی بہت سی ریت اور مٹی سے جو ممالک
دامن کوہ ارارات۔ اناطولیا۔ میسوپوٹیمیا۔ اسیریا۔ اور عراق عرب وغیرہ سے بہا لاتے ہیں برابر اپنے دہانہ پر نئی زم
بناتے اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ اس منظر تعمیر و تجدید زمین کو دیکھ کر ان کے قدما اس مسئلہ کے قائل ہیں کہ تخ
ارض سمندر اور پانی سے ہوئی۔ خلیج فارس کو وہ بحر محیط تصور کرتے تھے اور اُن کی زبان میں اس کا نام نار ومرا
یعنی دریائے شور تھا۔ اِن دونوں دریاؤں کے سرچشمہ یعنی کوہ ارارات کو وہ سمجھتے تھے کہ دیوتاؤں کا مسکن ہے ا
بوجہ بلندی کے مانتے تھے کہ آسمان اسی پر قایم ہے۔ دہانہ فرات سے کچھ فاصلہ پر ایک جزیرہ کو اپنی بہشت جانتے
اور یقین رکھتے تھے کہ ان کا دالی نوح کلدانی اور دوسرے قابل پرستش ہستیاں اس ٹاپو پر اقامت گزیں ہیں۔
بندر ایری دو (Eridu) خلیج پر واقع تھا یہی ان کا صدر مقام اور تجارت گاہ تھا اور چونکہ زراعت اور دول
یا تو بہتے ہوئے فرات و دجلہ کی چشمہائے شیریں سے وابستہ تھی یا جہاز رانی پر منحصر تھی اس لیئے تہذیب و تمدن ک
دیوتا ایا (Ea) نام خلیج کے مشرقی ساحل کے قریب ایک جزیرہ میں متمکن مانا جاتا ہے۔ لیکن پانی کی تعمیری قوت
ساتھ ساتھ جب اُنھوں نے دیکھا کہ اس کی موجیں اس کی بارش اور اس کے ہمراہ طوفان رعد و برق ملک کو
کیسی جلد تباہ و برباد بھی کردیتا ہے تو وہ اس کی شان قہاری کے بھی قائل ہونے پر مجبور ہوئے۔ پس اس شان
کے لحاظ سے اس عنصر آب کو طیامات (Tiamat) کے نام سے پکارا جس کا مفہوم دشمن خدایان او
عالم اور معاند قانون دنیا ہے۔ شکل اس کی اژدر کی ہے۔ اس کا وجود ایا سے پہلے مانا گیا ہے زمانہ مابعد میں خدائے ارید
یعنی ایا کے جگہ خدائے بابل یعنی مرُدُاک (Merodach) نے لی اور اسی کی صفت و ثنا میں نظمیں گائی جانے
لگیں۔ اِک نظم میں اعتقادات اور توہمات یک جا تنظیم کردیئے گئے ہیں۔ و ہو ہذا

(ترجمہ از انگریزی)

نہ حرم نہ دیر و مسجد نہ کوئی مکاں بنا تھا ۔۔۔ نہ زمیں پہ گھاس تک کا تنکا کہیں جما تھا
نہ کہیں بھی خشت سازی نہ پکانے کا پڑاؤ ۔۔۔ نہ نشاں عمارتوں کا نہ وجود شہر و قریہ
نہ ظہورِ آدم اب تک نہ بنائے شہر اریرو ۔۔۔ تھا موج زن فقط اک نار و مرا تو ہر سو
اِک دھار اس کے نیچے بہتی تھی بے محابا ۔۔۔ آیا نے نئے کے گٹھوں سے بند اس میں باندھا
اِس نئے کے بند میں تب پیدا کی خاک اس نے ۔۔۔ پھر جا نور بنائے اور ارضِ پاک اس نے
فرشِ زمرّدیں پھر سطحِ زمیں بنائی ۔۔۔ اور گائے بیل بکری سب اس میں لا چرائی

(جلال)

مُبتدی حکمائے کلدانی کے اعتقادات میں مسئلہ ارتقا کا شائبہ موجود ہے کیونکہ وہ خلقت عالم کو یکے بعد دیگرے اَپسو (بحر محیط) اور طیامات (طوفانی حالت) یعنی قوائے تعمیری اور تخریبی کے باہم تصرّف کو سبب تخلیق موجودات سمجھتے تھے۔

اپسو اور طیامات کے بعد اور آسمانی دیوتا لَکھمو اور لَکھامو (Lakhmu and Lakhamu) پیدا ہوئے۔ اِک زمانہ گزر گیا تب اَنشارا اور کِشارا یعنی آسمان علوی اور دوسرا سفلی ظہور پذیر ہوئے۔ اِن کی اولاد میں آگے چل کر مَردواک کا وجود ہوا جو معمار عالم مانا جاتا ہے۔ مَردواک نے طیامت (حوادث بحری) کو دو ٹکڑے کر دیا اور دونوں پارچوں کے بیچوں بیچ آسمان لا کھڑا کیا۔ اس طرح کہ ایک حصّہ زمین کی تہ میں پہونچ جاوے۔ حصّہ بالائی سے جو طوفان واقع ہوں اُن کو آسمان روک لے اور حصّۂ زیریں کی رگیں اپنے اُچھلتے ہوئے پانی سے سطح زمین کو سوتوں اور چشموں کی شکل میں سرسبز و سیراب بنائے رکھیں۔ اجرام فلکی اس جنگ سے قبل موجود مانے جاتے ہیں۔ کیونکہ مَردواک خود آفتاب سماوی کا مظہر ہے۔ اِس کی ذات میں بنانے اور مٹانے کی دونوں قوتیں مانی گئی ہیں۔

(باقی بشرط بقا)۔

نِساءُ العرب

(گزشتہ سے پیوستہ)

از مولوی محمد عبد الرزاق صاحب منتظم تاریخ اسلام گورنمنٹ بھوپال

۱۱۔ عہد جاہلیت میں عورت کی ازدواجی زندگی اور اخلاقی و تمدنی حالت

۱۔ خاندانی تاریخ رشتۂ ازدواج سے دنیا کی کوئی قوم خالی نہیں ہے۔ اور بقائے انسانی کا ذریعہ صرف یہی ایک رشتہ ہے جس کی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے:۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا انسان آدم تھا جس کو اقوام عالم ایک مقدس ہستی جانتی ہیں اور مسلمان اُن کو ادباً آدم صفی اللہ کہتے ہیں۔ انھیں کی ذات سے خاندانی تاریخ کی بنیاد قایم ہوئی ہے اور انھیں کا لقب ابوالبشر ہے۔

حضرت آدم کی رفیق زندگی، اُن کی بی بی حوّا تھیں جو ام البشر ہیں۔ اور عالم کائنات میں یہ سب سے پہلا جوڑا تھا جس کے اختلاط سے نسل انسانی کا وجود ہوا۔ پھر توالد و تناسل کے سلسلے نے ایک حیرت انگیز مرقع دنیا کے سامنے پیش کیا۔

۲۔ رشتۂ ازدواج جب یہ مقدس جوڑا صفحۂ ہستی پر نمودار ہوا اور اولاد ہونی شروع ہوئی تو خدا نے حضرت آدم کی شریعت میں بھائی کا نکاح حقیقی بہن سے جائز کردیا۔ کیونکہ بغیر اس کے آدم کی نسل دنیا میں ترقی نہیں کرسکتی تھی۔ لیکن اس عہد میں بھی ابتدائے نکاح کے وقت ایک دلہن کا تعین کافی تھا یعنی اس قدر احتیاط تھی کہ جو لڑکی گویا آج پیدا ہوئی ہے وہ اس لڑکے سے منسوب کی جاتی تھی جو دوسرے دن پیدا ہوا تھا۔ لیکن جب نسل آدم دنیا میں ترقی کر گئی تو یہ قانون منسوخ ہوگیا۔ اور مختلف خاندانوں میں ازدواج کا قاعدہ جاری ہوا۔ چنانچہ قدیم عجم میں دو آدم کی شادی اِسی اُصول پر جائز سمجھی گئی تھی۔

۳۔ مسئلہ امومتہ خلاصہ[۱] یہ ہے کہ آدم اور حوا سے خاندانی تاریخ کی بنیاد قایم ہوئی اور دنیا میں باپ (اَب) اور

---

[۱] امومتہ سے خاندانی تاریخ مراد ہے۔ ۱۸۶۱ء میں سب سے پہلے ایک جرمنی عالم باکوفین . . . . . نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی اب تک یہ مسلّم تھا کہ خاندانی تاریخ ابوۃ سے قایم ہے۔ لیکن اس محقق نے امومتہ کو مقدم ثابت کیا۔ اور ماں نسلِ انسانی کی ماخذ قرار پائی

(اُمّ) کی ذات دو دَور دُور قایم ہوئی جس کا نام دورِ اُبوّۃ (رشتۂ پدری) اور دورِ اُمومۃ (رشتۂ مادری) ہے۔ اُنیسویں صدی
جو نئے علوم اور مسائل پیدا ہوئے ہیں، اُن میں ایک علم اُمومتہ بھی ہے۔ اور علمائے یورپ اس کے قائل ہیں کہ خدا نے تاریخ میں
کا درجہ باپ سے مقدم رکھا ہے اور وہی رب العائلہ ہے۔

یہ ایک عظیم الشان بحث ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاریخی حیثیت سے ہم کو صرف اس قدر دکھانا مقصود ہے کہ عہد جاہلیت
میں باپ کے مقابلہ میں ماں کا کیا درجہ تھا یا یہ کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی کیا قدر و قیمت تھی۔ اور ان میں باہمی کس قدر
تھا۔

تاریخ عرب سے ظاہر ہے کہ اسلام سے قبل جزیرۃ العرب میں عورت کا درجہ نہایت پست تھا۔ اور وہ ایک ادنیٰ سی جنس سمجھی جاتی
مثلاً شوہر کے انتقال پر سوتیلی مائیں بیٹوں پر مثل مال وراثت کے تقسیم ہو جاتی تھیں۔ اور بیٹا ماں کو بلا تکلف بی بی بنا لیتا تھا
ایک ہی وقت میں کئی مائیں اس کی بیبیاں ہو جاتی تھیں۔ اور ایک مرد بلا تعداد عورتیں رکھنے کا مجاز تھا جس کی تعداد بعض وقت
تک پہونچ جاتی تھی۔ اور ضرورت کے وقت عورت بطور جائداد منقولہ کے رہن بھی رکھ دی جاتی تھی۔ اور عرب کے یہودی اس قسم
معاملہ کر لیتے تھے۔

اور اس کا بھی کوئی قانون نہ تھا کہ مرد کو خاندان میں کن عورتوں سے نکاح کرنا چاہیئے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب عہد جاہلیت
اقسام نکاح لکھتے ہیں جس سے عورت کی اخلاقی اور تمدنی کیفیت معلوم ہوگی۔

نکاح مشارکت یا تعدد ازواج

حضرت آدم کی تاریخ سے تو یہی ثابت ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے نکاح فردی جاری ہوا یعنی ایک مرد
کا ایک خاص عورت سے نکاح ہوتا تھا اور یہ نکاح قانون فطرت کے مطابق تھا۔ لیکن ہزاروں سال
کے بعد جب شریعت کا عمل اُٹھ گیا، اور عورتوں کا شمار بھی مردوں سے بڑھ گیا تو نکاح مشارکت
ری ہوا۔

یہ نوٹ ص ۳۴) اس کے بعد جی ولکن ہالینڈی نے ایک رسالہ اسی موضوع پر لکھا جس کا ترجمہ جرمنی اور عربی میں ہو گیا ہے۔ اس سال
چار سال بعد ایک انگریز عالم میک لی نن نے دوسرا محققانہ رسالہ لکھا۔ چنانچہ ان رسالوں سے مسئلہ امومتہ ایک مستقل موضوع بن گیا۔ اور
ان کی بنیاد ماں پر منحصر ہوئی۔ عربی میں ماں کو اُمّ اور باپ کو اَب کہتے ہیں۔ چنانچہ لفظ امومتہ کا ماخذ بھی لفظ اُم ہے۔ جرجی
ان نے اپنی کتاب انساب العرب القدماء میں ان رسائل کے خلاصے لکھے ہیں۔

اس عہد[1] میں کسی خاص مرد اور عورت کا جوڑا معین نہیں ہوتا تھا اور نہ وقت و میعاد کا تعین تھا۔ بلکہ عورت اپنے ہی قبیلہ میں ہر روز ایک نئے شخص کے پہلو میں آرام کرتی تھی۔ اگر کسی دوسرے قبیلہ کے مرد سے اختلاط کرتی تھی تو جرم زنا کی مرتکب قرار پاتی اور اس جرم میں قتل کر دی جاتی۔

پھر ایک زمانہ دراز کے بعد (غالباً تحفظ نسب کی غرض سے) اس عمومیت میں تخصیص ہو گئی اور ایک ہی خاندان یا ایک ہی ماں کے چند بیٹوں سے ایک عورت منسوب ہونے لگی۔ چنانچہ اس قسم کے نکاح مشارکت عربوں میں جاری تھے۔ اور خلوت میں باری باری سے ایک بھائی جاتا تھا۔ اور دوسرے بھائیوں کی اطلاع کے لیئے حجرہ کے دروازے پر عصا رکھ دیا جاتا تھا۔ اور رات میں بی بی سے اختلاط کا حق صرف بڑے بھائی کو حاصل تھا۔ اور یہ وہی قانون تھا جو عہد قدیم میں جاری تھا۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ عرب میں تعدد ازدواج کا مسئلہ قانونی شکل میں موجود تھا۔ اور رشتۂ ازدواج ابتدا میں اپنے ہی قبیلہ تک محدود تھا۔ اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح تعدد الازواج اسلام سے کچھ زمانہ قبل تک جاری تھا۔ اور اس کی یہ صورت تھی کہ ایک جماعت (دس سے کم) کسی عورت کے پاس جاتی تھی اور سب باری باری سے ہم بستر ہوتے تھے۔ اور جب اُس کے بطن سے بیٹا پیدا ہوتا تو کچھ دنوں کے بعد وہ عورت اُن سب کو اپنے گھر بُلاتی۔ اور یہ بلا عذر حاضر ہوتے۔ اب وہ عورت کہتی کہ تم اپنے اعمال سے واقف ہو۔ میرے بیٹا پیدا ہوا ہے اور اے شخص (کسی ایک سے خطاب کر کے) تو اس بچہ کا باپ ہے۔ اس کے بعد وہ بچّہ اس مرد کی کفالت میں دیا جاتا۔ اور وہ بلا عذر قبول کرتا۔ اور اُسی کا متبنّٰی بیٹا کہلاتا۔ اور وہی نام تجویز کرتا۔ اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو عورت اس کی پرورش کی ذمّہ دار رہتی۔

نکاح مشارکت بازاری عورتوں[2] سے بھی ہوتا تھا۔ اُس زمانہ میں کسبیوں کے دروازہ پر امتیاز کے لیئے ایک جھنڈا (عَلَم) کھڑا ہوتا تھا۔ اور چند احباب ملکر ایک عورت کے پاس جاتے تھے، اور ایک ہی طرح میں قربت کرتے تھے۔ جب وہ حاملہ ہو کر صاحبِ اولاد ہوتی تو یہ سب اس کے پاس جاتے اور ایک قیافہ شناس بلایا جاتا۔ اور جس مرد سے بچہ مشابہ ہوتا وہ اُس کا باپ قرار پاتا۔ اور یہ اس کا بیٹا کہلاتا۔ لیکن بعض اوقات مرد انکار کر دیتا تھا کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے۔ چنانچہ اسی اولاد[3] کے لیئے عربوں میں یہ مثل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح باب ۳۶ صفحہ ۲۴۴ جلد ۳ مطبوعہ ہالینڈ و نہایۃ الایجاز رفاعہ بک طہاوی باب النکاح الجمع۔ دفعات قانون ہزار سالہ انگریزی۔ جغرافیہ اسٹرابوسیاح یونان ۵۴ء قام لغایۃ ۲۴ء [2] الملل والنحل شہرستانی حالات ذوات الرایات۔ ہشام ابن الکلبی کی روایت ہے کہ ایسی عورتیں دس سے زیادہ تھیں اور ان میں اُم مہزول بہت مشہور تھی۔ تفصیل کے لیئے دیکھو کتاب المثالب فی اسامی صواحبات الرایات۔ [3] ضیافۃ الطرب فی تقدمات العرب صفحہ ،،

لك ابن بوحلك يشرب من صبوحلك — یہ لڑکا تیرے ہی نطفہ سے ہے۔ جو تیرے ساتھ صبح کی شراب پیتا ہے۔

زیاد بن ابیہ اسی قسم کا ایک مشہور تاریخی ہے جس کو معاویہ نے اپنی نسبت میں ملا لیا تھا۔

دونوں صورتوں میں چونکہ باپ کا تشخیص کرنا دشوار تھا لہذا نسب کے لیے ماں کو مقدم سمجھا گیا اور یہی مسئلہ علم امومتہ ننگ بنیاد سمجھا گیا۔

عربوں میں قبائل کی اندرونی تقسیم کے لیئے جو الفاظ ہیں اُن میں ایک لفظ بطن بھی ہے وہ بھی امومتہ پر دلالت کرتا ہے۔ اور بقین کا دعویٰ ہے کہ نظام امومتہ ، ابوۃ سے پہلے قائم ہوا ہے۔ اور اسی خیال نے بعض اقوام میں حق وراثت کو عورتوں میں منحصر کر دیا ہے۔

یہ نکاح قدیم ہندوستان میں جاری تھا۔ اور فی زمانا ہندوستان کے ساحل ملابار کی قوم نائرا ور اہل تبین میں بھی جاری ہے۔ اور ہیروڈوٹس کے سفرنامے سے ساحل بحر احمر کی حبشیوں میں بھی اس نکاح کا ہونا ثابت ہے۔ اور جولیس قیصر کی کتاب سے بھی واضح ہے کہ قدیم اہل برطانیہ میں بھی نکاح مشارکت جاری تھا۔ اور دس بارہ مردوں میں ایک عورت مشترک ہوتی تھی۔ اور جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت انھیں مردوں میں سے ایک شخص کو اس کا باپ قرار دیتی اور یہ وہ شخص ہوتا تھا جو سب سے پہلے عورت سے قربت کرتا تھا۔

بعض قبائل عرب کا اپنے ماں کے نام سے منسوب ہونا بھی اس کی دلیل ہے جیسے بنی خندف اور بنی فزینہ (یہ دونوں عورتیں تھیں) اور بھانجہ میں ماموں کے صفات کا جمع ہونا بھی اسی بات پر اشارہ کرتا ہے جس کے متعلق عربوں میں متعدد امثال موجود ہیں۔ مثلاً

الاصل یخول وخیر الرجال من تخول۔ — اصل اپنے ماموں پر جاتا ہے۔ یا وہ آدمی اچھا ہے جو اپنے ماموں پر پڑے۔

اور شعرائے عرب کے کلام میں بھی اس کی متعدد نظائر موجود ہیں۔ اور عربوں کا یہ عام طور سے اعتقاد ہے کہ ہر لڑکے میں دو ثلث بداخلاقی وراثتہً ماموں کی جانب سے ہوتی ہے۔ اور ایک ثلث اُس کی ذاتی ، اور ماموں بھانجہ میں ایک قسم کا رشتۂ اتحاد ہوتا ہے۔ اور بھانجے جائداد کے وارث ہوتے تھے۔ یہ تمام استدلال نظام امومتہ پر ہے۔

۲۔ نکاح متعہ — محقق اُمی لس ، مارسی ، لی لس لاطینی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں وہ رقمطراز ہیں کہ عرب زمانہ جاہلیت میں ایسے دائمی نکاح کو جس میں عورت ایک خاص مرد سے زمانہ معین تک وابستہ رہے بالکل نہیں جانتے تھے۔ اور چونکہ مرد تلاش معاش میں بادیہ پیمائی کیا کرتے تھے اس لیئے اُن کی عورتیں ایک خاص وقت کے لیئے جس مرد سے چاہتی تھیں پہلے کرہم بستر ہوتی

تھیں اور اس خیال سے کہ یہ عارضی صحبت حدِ نکاح تک پہونچ جائے اپنی طرف سے مردوں کو بطور مہر کے ایک نیزہ اور ایک خبا، (راونی یا چھوٹا خیمہ) نذر کرتی تھیں۔ یہ اس امر کی دلیل تھی کہ اب عورت جب اس کا جی چاہے مرد کے خیمہ میں جا سکتی ہے۔

حقیقت میں نکاح کی یہ وہی شکل ہے جو قبل اسلام نکاح متعہ کے نام سے عربوں میں جاری تھی۔ اور جس کو دو مرتبہ غزوات کے زمانہ میں اسلام نے جائز رکھا تھا اور فتح مکہ (۸ھ) کے دن حرام کر دیا گیا۔ جس کی تفصیل تاریخ اور احادیث میں موجود ہے۔

نکاح کے متعلق سورۂ نساء میں جو احکام ہیں۔ اُن میں ایک آیت یہ بھی ہے۔

احل لکم ما وراء ذٰلکم۔الخ فریضۃ۔ سورۂ ن ، رکوع ۴۔

اس آیت سے نکاح شرعی اور متعہ دونوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ جو مفسرین نکاح شرعی کے قائل ہیں وہ لفظ اجور کا ترجمہ مہور (جمع مہر) کرتے ہیں۔ اور جو متعہ کے قائل ہیں وہ حضرت ابن عباس کی رائے کے مطابق یہ تفسیر کرتے ہیں کہ جن عورتوں سے تم نے ایک معین زمانہ تک فائدہ اُٹھایا ہے اُن کا اجر دیدو۔

نکاح متعہ خلافتِ صدیقی تک جاری تھا۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اعلان کیا کہ جو متعہ کرےگا وہ سنگسار کیا جائیگا تب متعہ کا انسداد ہوگیا۔ اس موقع پر ہم کو اختلافی مسائل سے غرض نہیں ہے کیونکہ ہم عہد جاہلیت کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

جس زمانہ میں متعہ جاری تھا۔ اُس وقت ایک معمولی چادر اور تھوڑے سے آٹے اور کھجوروں پر یہ نکاح ہوجاتا تھا۔ اور عرب اس کے عادی تھے کہ جب وہ کسی نئے شہر میں داخل ہوتے تھے تو فوراً نکاح متعہ کر لیتے تھے اور چلتے وقت عورت کو چھوڑ دیتے تھے۔ اور یہ نکاح مدت مقررہ کے ختم ہونے پر خود بخود ٹوٹ جاتا تھا۔ طلاق کی ضرورت نہ تھی۔ اور ایسی اولاد باپ کے ترکہ سے محروم رہتی تھی۔ عہد مامون الرشید میں اس مسئلہ پر جو مناظرے ہوئے ہیں وہ تاریخوں میں درج ہیں۔ یہ نکاح ہنوز جاری ہے۔

۳۔ نکاح ذواق صراحت مندرجۂ بالا سے ثابت ہے کہ عرب شرعی اور دوامی نکاح کو ایک وزنی بیڑی سمجھتے تھے اس لیے نکاح متعہ ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ اور اس قسم کا ایک دوسرا نکاح ذواق تھا۔ اس میں کسی ولی اور گواہ کی ضرورت نہ تھی۔ باہمی ایجاب و قبول کافی تھا۔

ذواق کا مادہ ذوق ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کسی شے کے مزہ سے واقف ہونا۔ یہ نکاح بغیر کسی شرط کے منعقد ہوتا تھا۔ اور اختلاط کے بعد فریقین الگ ہوجاتے تھے۔ ایک شب کے بعد اس نکاح کا فسخ کر دینا یا قائم رکھنا عورت کے اختیار میں تھا۔

---

[1] صحیح مسلم بروایت سیرۃ النبی و صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ثانی باب نھی رسول اللہ صلعم من نکاح المتعہ

اور اگر دوسری شب میں بھی عورت رہنا چاہتی تو صبح اٹھ کر ناشتہ پکاتی، ورنہ رخصت۔

اِس قسم کی عورتوں میں اُم خارجہ بنت سعد، ماریہ بنت الجعید، فاطمہ بنت مُرسلیہ، فاطمہ خرشب انماریہ، اور سوء عنیزیہ بیت
رہیں جن کے حالات اغانی وغیرہ میں موجود ہیں۔

اُم خارجہ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس عورت نے بیس قبائل کے پچاس مردوں سے نکاح کیا اور صاحب اولاد ہوئی۔
یلہ بجیلہ سے تھی۔ خارجہ اس کا ایک بیٹا تھا جس کے نام سے یہ اُم خارجہ مشہور ہوئی۔ یہ عورت راستہ چلتے نکاح کر لیتی تھی۔ جہاں
ہنے اس کو مخاطب کر کے کہا خِطبٌ یہ فوراً جواب دیتی نکحٌ (میں نکاح کرتی ہوں) اور جب چاہتی فسخ نکاح کر دیتی۔ چنانچہ
نی سے بڑھاپے تک اُم خارجہ کا یہی حال رہا۔ عرب میں ایک مثل ہے کہ :-

"اسرع من نکاح ام خارجه" (اُم خارجہ کے نکاح سے بھی جلد)

بازی کے موقع پر اس مثل کا استعمال ہوتا ہے۔

یہ نکاح عربوں کی وارستہ مزاجی پر دلالت کرتا ہے۔ مغیرہ بن ثابت کی نسبت مشہور ہے کہ اُنھوں نے ۸۰ عورتوں سے نکاح
تھا۔

نکاح الاستبضاع | عربوں کو جب[۲] یہ منظور ہوتا تھا کہ وہ کسی شریف، بہادر اور فیاض سردار قوم سے اولاد حاصل کریں
پنی بی بی کو حکم دیتے تھے کہ وہ طہارت ایام کے بعد فلاں شخص سے نطفہ حاصل کرے۔ چنانچہ جب تک حمل کے آثار نمایاں نہ ہوتے
ص اپنی بی بی سے الگ رہتا تھا۔ اور اس طرز عمل کو عیب نہ جانتا تھا۔

استبضاع کا مادّہ بُضع ہے جس کا ترجمہ ہے شرم گاہ اور بضعة ومباضعة جماع کے معنی میں بھی آتا ہے یہ طریقہ نکاح
سری اقوام میں بھی جاری ہے مگر اس حالت میں جب کہ شوہر سے اولاد نہ ہو۔ اور مایوسی ہو جائے۔ زمانہ قدیم میں ہندوستان
ی اور یونان میں بھی یہ نکاح جاری تھا۔ تاریخ اسپین سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب اندلس میں بھی یہ نکاح جاری تھا۔ مورخ ڈوزی
تاریخ اسلام میں ابو اسمٰعیل بصری (تاریخ فتوح الشام) کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ ایک بوڑھے بدوی نے ایک نوجوان سے
ملہ کیا کہ وہ اپنی بی بی کو اس شرط سے نوجوان کے پاس بھیج دیگا کہ وہ اس کی گلہ بانی کرے۔ لیکن جب امیرالمومنین کو اس واقعہ
اطلاع ہوئی تو فریقین طلب کیے گئے! اور فرمایا کیا تم کو یہ علم نہیں ہے کہ اسلام میں اس قسم کے نکاح کی ممانعت ہے۔ تو اُنھوں نے قسم کھا کر

---

۱ ضرب الامثال میدانی   ۲ صحیح بخاری کتاب النکاح

کیا کہ ہم حکم شرعی سے محض ناواقف ہیں۔

اِس قسم کا دوسرا واقعہ[1] یاقوت (متوفی ۶۲۳ھ) نے شہر مرباط (مابین حضرموت و عمان) کے حالات میں لکھا ہے۔

یاقوت جب یہاں پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ رات کے وقت نوجوان عورتیں۔ کھلی میدان میں، غیر مردوں سے اختلاط و ملاعبت کرتی ہیں تب اُس کو نہایت تعجب ہوا اور اُس نے لوگوں سے پوچھا، اُن لوگوں نے کہا خدا کی قسم یہ بُری رسم ہے لیکن مجبوری ہے جب سے پیدا ہوئے ہیں یہی دیکھا ہے اب ہم اس رسم کو چھوڑنا بھی چاہیں تو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ کیونکہ برسوں سے اس رسم کے عادی ہیں

اولاد[2] کے معاملہ میں عربوں کا خیال تھا کہ غیر خاندان میں نکاح کرنے سے اولاد قوی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ قبائل میں دستور تھا کہ مضری قبیلہ، ربیعہ میں نکاح کرتا تھا۔ اور کہلانی، حمیر میں نکاح کرتے تھے۔

عمرو بن کلثوم[3] اپنی اولاد کو نصیحت کرتا ہے۔

لا تتزوجوا فی حیّکم فانہ یودی الی قبیح البغض — اپنے قبیلہ میں نکاح نہ کرو۔ کیونکہ اس سے سخت دشمنی پیدا ہوتی ہے۔

اور شعرائے[4] عرب کے کلام اور امثال سے بھی یہی ثابت ہے۔

۱۔ فتی تلاہ بنت عم قریبة — جس کی عورت اس کے قریب کی چچازاد بہن ہو گی

فیضوی وقد یضوی ردید القرائب — عموماً اس کی اولاد کمزور ہو گی۔

۲۔ ان اردت الانجاب فانکح غریبًا — نجیب اولاد کی خواہش ہے تو غیر خاندانی عورتوں سے نکاح کرو

والی الاقربین لا تتوصّل — اور قریب کے عزیزوں سے رشتہ نہ کرو۔

فانتقاء الثمار طیبًا وحسنًا — کیونکہ بہترین پھل وہی ہوتا ہے جو دوسرے درخت کے پیوند کردہ

ثمر غصنة غریب موصل — شاخ سے حاصل ہوتا ہے

یہ شعر بھی بنت العم کی شادی کے خلاف ہے ؎

تجاوزت بنت العم وھی حبیبة
مخافة ان یضوی علیّ سلیلی

---

[1] معجم البلدان صفحہ ۱۰ جلد ۸ مطبوعہ مصر [2] مسعودی صفحہ ۳۰۱ جلد اوّل مطبوعہ پیرس [3] شعراء النصرانیہ صفحہ ۲۰۲ جلد ۲ مطبوعہ بیروت [4] ضیاۃ العرب صفحہ ۶۳ و بلوغ الادب جلد ۲ صفحہ ۹۔

بنت العم کے لیئے یہ ضروری نہیں ہو کہ ہمیشہ بی بی، چچا کی بیٹی ہی ہو بلکہ یہ عربوں کا ایک عام محاورہ ہو جو محبوبہ کے لیٔ مستعمل
تھا۔ اور اسی وجہ سے عرب خسر کو بھی عم تک کہتے ہیں۔ برٹن اور برک ہارڈ نے سفرنامہ عرب میں لکھا ہو کہ بدویوں میں ہنوز یہ دستور ہو کہ
بڑا بیٹا اپنی بنت عم سے نکاح کا مجاز ہو اور کابل مہر ادا کرنے کے بعد چچا کی یہ طاقت نہیں ہو کہ وہ نکاح سے انکار کرسکے۔ اس کا حق
غیر کے مقابلہ میں فایق ہو۔

۴۔ عربوں کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ اگر کسی عورت سے جبرًا ہم بستری کی جائے اور اس حال میں حمل رہ جائے یا عورت کا مزاج
ایسے موقع پر مشتعل ہو تو بچہ قوی پیدا ہوتا ہو۔

ابو کبیر ہذلی کہتا ہو۔

ممن حملن به وهن عواقد	وہ جوان اُن لوگوں میں ہو جس کی ماں کو اس وقت حمل رہا ہو
حبك النطاق فشب غير مهبل (حماسہ)	جب کہ وہ خلوت کے لیٔ رضامند نہ تھی اس لیئے وہ پھرتیلا جوان ہوا۔

حیوانات میں بلی (گربہ) میں یہ خاصہ ہو کہ جب تک وہ نر سے جنگ و جدال میں مغلوب نہ ہو جائے نر کے تابع نہیں ہوتی ہو
ور یہی اس کی دلیری کا راز ہو۔

اشعار کے علاوہ امثال سے بھی غیر کف کی شادی کو فوق ہو۔

۱۔ النزائع ولا القرائب	قرابت داروں کے مقابلہ میں اجنبی خاندانوں سے میل جول
الغرائب یا لا القرائب	مناسب ہو۔

اطبا بھی یہی کہتے ہیں۔ اور ایک حدیث نبوی سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہو۔

۲۔ اغتربوا لا تضووا	دُور کی رشتہ کی عورت سے نکاح کرو تاکہ اولاد کمزور نہ پیدا ہو۔

اور اسی حدیث کی بنا پر بعض فقہا نے اجانب سے نکاح کرنے کو مستحب قرار دیا ہو۔ حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا کہ قریش کے
وگ بدیں وجہ پست قامت ہوتے ہیں کہ وہ بنات عم سے شادی کرتے ہیں تو اُنھوں نے اس قسم کی شادیوں کو بند کیا۔ ان اسناد
سے ظاہر ہو کہ نکاح الاستبضاع عربوں کی ایک عادت تھی اور اس کا مقصد صرف قوی اور نجیب اولاد حاصل کرنا تھا۔

۵۔ نکاح الخدن | بعض لوگ کنیزوں سے مخفی نکاح کر لیا کرتے تھے۔ کیونکہ اس نکاح کی شہرت کو وہ خلافِ شان سمجھتے تھ

لہ بلوغ الادب جلد ۲

اور کنیزوں کی اولاد کو بھی اولاد سمجھنے میں شرماتے تھے۔ قرآن مجید میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

محصنٰت غیر مسٰفحٰت ولا متخذات اخدان

(سورۂ نساء رکوع ۴)

۶۔ نکاح البدل باہمی رضامندی سے عورتوں کو تبدیل کرنے کا نام نکاح البدل تھا۔

۷۔ نکاح الشغار ایک طریقہ نکاح کا یہ تھا کہ فریقین میں سے ایک شخص اپنی بیٹی یا بہن یا بھتیجی کو دوسرے سے منسوب کر دیتا تھا۔ اسی طرح دوسرا شخص بھی ایک لڑکی اس کے نکاح میں دیتا تھا اور مہر معاف کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اسلام نے یہ کہہ کر اس نکاح کو باطل کر دیا کہ لاشغار فی الاسلام یہ نکاح بھی اکثر دوسرے قبائل میں کیا جاتا تھا۔

۸۔ نکاح مقت جب کوئی مرتا تو اس کا بڑا بیٹا اپنی سوتیلی ماں پر ایک چادر ڈال دیتا تھا اور اس رسم کے ادا کرنے سے وہ نکاح کا مجاز ہو جاتا تھا۔ اور اگر خود نکاح کرنا منظور نہ ہوتا تو اپنے دوسرے بھائی سے نئے مہر پر نکاح کر دیتا تھا۔ اس بے حیائی کو اسلام نے حرام قرار دیا اور صاف حکم دیا۔

ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم من النساء الا
ما قد سلف انه کان فاحشة ومقتا
وساء سبیلا ۚ سورہ رکوع

اور سوتیلی ماؤں کے علاوہ لونڈیاں بھی مباح تھیں اور شرفا ان کی اولاد کو اپنی اولاد جانتے تھے۔ حقیقی ماں اس عہد میں بھی حرام تھی۔ یہ نکاح اسلام کے قریب زمانہ تک جاری رہا اور جو اولاد اس نکاح سے پیدا ہوتی تھی وہ مقتی یا مقیت کہلاتی تھی۔ اور جو شخص نکاح کرتا تھا وہ ضیزن کہلاتا تھا۔ لیکن مہذب عرب اس نکاح کو بھی معیوب جانتے تھے۔ تاریخ عرب میں متعدد ضیزنوں کے حالات موجود ہیں۔ تمام جزیرۃ العرب میں یہ نکاح جاری نہ تھا۔ بعض قبائل تک محدود تھا۔ اور آغاز اسلام کے قریب بیوہ عورتیں بہت آزادی سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جس کی تصدیق حضرت خدیجہ کے حالات سے ہوتی ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح باب الشغار صفحہ ۲۰۳ جلد ۲ مطبوعہ مصر۔

جن حضرات نے فسانہ 'نیلی چھتری' مرتبہ جناب ظفر عمر صاحب بی اے کا مطالعہ کیا ہے اُن کے لئے بہرام کا نام نیا نہیں ۔ اور نہ اس کے تعارف کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم ذیل کا قصہ پیش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کو اس سے پیشتر ایک فسانہ موسومہ 'بیوی کا انتخاب' کا حوالہ دیا جائے جو ماہ جون سنہ ۲۸ء کے "قوس قزح" لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔ اُس میں ہمارے دوست نیک نہاد جنٹلمین چو رمیاں بہرام نے اپنی نامنہاد بیوی شاہزادی زر بانو سے وعدہ کیا تھا کہ میں کانپور آ کر حصول دیدار کی خواہش کروں گا۔ چنانچہ اُسی کے ایفا میں حضرت کانپور تشریف لائے ہیں۔ مگر فطرتاً اُن سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ اس لئے یہاں بھی آن کر ایک معرکہ پیدا کر دیا جس کا مفصل حال ذیل کی سطور سے واضح ہوگا اور اس کی دلچسپی کا حال مطالعہ سے معلوم ہوگا ملاحظہ فرمائیے۔

شمیم بہوری

(۱)

واللہ مذاق نہیں۔ بات بھی یہی ہے۔ دیکھنے کو دہلی میں جامع مسجد کے نیچے والی۔ لکھنؤ کا نخاس۔ آگرہ، علی گڑھ اٹاوہ، فرخ آباد کی گدڑی۔ جبلپور اور ناگپور کی اتواری بازاریں دیکھیں۔ مگر سچ تو یوں ہے۔ کہ کانپور کی بازار پریڈ کے مقابلہ میں یہ سب ہیچ ہیں۔ اس بازار میں وہ قطار جو مال روڈ کی روش سے ملی ہوئی بیٹھتی ہے۔ اپنے اندر ایسی دلچسپیاں رکھتی ہے کہ کیا کہنے۔ یہاں انگریزی لیڈیاں۔ ہندوستانی رؤسا۔ طبقۂ اوسط کے خوش حال یا غریب غرضکہ ہر قسم کے لوگ مصروف خرید و فروخت نظر آتے ہیں۔ ان کباڑیوں کے یہاں واقعی بعض اوقات ایسی عمدہ و نادر چیزیں سستی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جو بازار میں دس گنی قیمت ادا کرنے پر بھی دستیاب نہوں۔ چنانچہ

بازار پریڈ کی ساری دلچسپی اس ایک قطار میں مضمر ہوتی ہے۔ اور اس جگہ وہ بھیڑ ہوتی ہے کہ راستہ چلنا دشوار ہوتا ہے۔ بانیوسے باز و چھلتا ہے۔ گھنٹوں آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔

۸ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کی شام تھی۔ پریڈ کی بازار پورے رنگ پر جمی ہوئی تھی کہ ہمارے ڈی۔ اے۔ وی کالج کے پروفیسر ریاضی مسٹر دل سکھ رائے ایم۔ ایس۔ سی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بازار میں گھومتے ہوئے ایک کباڑی کی دوکان پر رُک گئے۔ اور مختلف قسم کا پرانا سامان دیکھنے کے بعد ایک پُرانا ڈسک اس لئے پسند آیا۔ کہ اس میں بہت سے مختلف خانے بنے ہوئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے دل میں خیال کیا کہ بڑے دن میں لخت جگر بیٹی شانتی کے لئے یہ اچھا ثابت ہوگا۔

گو پروفیسر صاحب کے مالی وسائل محدود تھے۔ تاہم نئی روشنی کا اثر اسے ضروری قرار دیتا تھا۔ کہ بڑے دن میں بیٹی کے لئے ضرور کوئی تحفہ خرید اجائے۔ تاکہ اُس کی واحد لختِ جگر شفقت پدری سے خوش ہو۔ چنانچہ تھوڑی دیر ردوکد ہونے کے بعد کباڑی سے اس کا سودا پندرہ روپیہ میں ہو گیا۔ پروفیسر صاحب مزدور کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگے۔ تاکہ اسے لدوا کر گھر لے جائیں کہ اتنے میں ایک خوش پوش۔ خوش وضع۔ خوش رو نوجوان جو اب تک آگے کی دوکانوں میں دیکھ بھال کرتا ہوا آرہا تھا۔ اس کباڑی کی دوکان پر رُک کر اسی ڈسک کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔ "کیوں میاں دوکاندار اس کی کیا قیمت ہے ؟"

"حضور یہ تو بک گیا" کباڑی نے جواب دیا۔

"اوہ ..... کیا جناب کے ہاتھ"

پروفیسر دل سکھ رائے صاحب نے انداز تسلیم سے سر جھکا دیا۔ اور اب اُسے پہلی بار یہ جان کر بہت مسرت ہوئی کہ میری خریدی ہوئی چیز کو ایک اور شخص نے بھی پسند کیا۔ مزدور مل گیا۔ ڈسک اس کے سر پر رکھوا دہ بمشکل دس ہی قدم چلا ہوگا کہ یہی خوش پوش نوجوان پروفیسر صاحب کے قریب آن کر خواہ مخواہ کہنے لگا "حضرت معاف فرمایئے گا.. گو میرا رویہ کسی قدر عجیب نظر آئے مگر بات یہ ہے کہ میں آپ سے ایک ایسا سوال کرتا چاہتا ہوں جسے شاید آپ معیوب سمجھیں۔ کیا آپ ازراہ کرم یہ بتلائیں گے کہ آپ خصوصیت سے اسی ڈسک کو خریدنے کے لیئے بازار آئے تھے ؟"

"جی نہیں۔ بلکہ مجھے اپنے تجربات کے لئے کوئی عمدہ اور سستا ترازو خریدنے کی حاجت تھی۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو اس ڈسک کی چنداں ضرورت نہ تھی۔"

"نہیں۔ اب تو ضرورت ہے۔"

"اس لئے کہ پرانا ہے اور سستا مل گیا۔"

"نہیں۔ اس لئے کہ کارآمد اور مفید ہے۔"

"تو اس صورت میں کیا آپ اسی ڈسک کو کسی نئے اور بہتر ڈسک سے تبدیل کرنا پسند کریں گے۔"

"مگر یہ بھی تو کچھ خراب نہیں۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اسے تبدیل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تاہم ..."

پروفیسر صاحب ریاضی کا دماغ رکھنے والے غرور المزاج آدمی تھے۔ اتنی باتوں سے بگڑ گئے اور فرمانے لے۔ "اچھا۔ اب اس بحث کو ختم کیجئے۔"

مگر نوجوان ایسے پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑا تھا کہ بھائی کا مزاج درست ہو جائے۔ فوراً راستہ روک کر ا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ "اجی قبلہ! بگڑنے کی کونسی بات ہے۔ مجھے واللہ معلوم نہیں۔ کہ آپ نے اس ڈسک کیا قیمت ادا کی ہے۔ لیکن جو کچھ آپ نے اس کی قیمت دی ہو میں اُس سے دوچند دینے کو تیار ہوں۔"

"جی مجھے منظور نہیں۔"

"سہ چند۔"

"پھر وہی ضد۔" پروفیسر صاحب نے کہا۔ "آپ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ڈسک میرا ہے۔ میں نے یدا۔ اور میں اب اُسے نہیں بیچنا چاہتا پھر اس بحث کو طول دینے سے کیا حاصل۔"

نوجوان کچھ دیر تک پروفیسر دلسکہ رائے کی طرف اس انداز سے دیکھتا رہا جس کی یاد مرتے دم تک وفیسر صاحب کے دل سے محو نہ ہوئی ہوگی۔ اور اس کے بعد ایک لفظ زبان سے نکالے بغیر وہ پیچھے پھرا ر ایک طرف کو چلتا بنا۔

اس کے گھنٹہ بھر بعد ڈسک پروفیسر صاحب کے مکان واقع گوالٹولی میں پہنچ گیا۔ وہاں پہونچتے ہی پروفیسر

نے اپنی بیٹی کو آواز دی اور کہا۔ "بیٹی شانتی! دیکھو۔ میں یہ تمہارے لئے خرید کر لایا ہوں۔ اگر پسند ہو تو رکھ لو۔"

شانتی نہایت خوبصورت۔ بھولی اور پیاری لڑکی تھی اور ذرا سی بات پر خوش ہو جاتی تھی۔ جھٹ باپ کی گردن سے لپٹ گئی اور اس طرح اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے لگی۔ گویا باپ کے تحفہ نے اُسے ہفت اقلیم کی سلطنت بخشدی ہو۔

رات کے وقت اُس نے اپنی خادمہ رشیا ماکی مدد سے اس ڈسک کو اپنے کمرہ میں پہونچایا۔ درازیں صاف کیں اور خانوں میں کاغذات، قلم دوات، چٹھیاں۔ تصویر دار کارڈ اور اپنے چچا زاد بھائی ہرسکھ رائے کے دیئے ہوئے چند دیگر تحفے بھی رکھ دیئے۔

اگلے دن پروفیسر صاحب حسب معمول کالج گئے۔ چار بجے شانتی روزانہ عادت کے مطابق اپنے باپ کی واپسی کے انتظار میں دروازہ پر کھڑی تھی۔ باپ کو اپنی نورِ نظر بیٹی کی متبسم اور بشاش صورت دیکھ کر بے انداز خوشی ہوئی۔

باتوں ہی باتوں میں پروفیسر صاحب نے پوچھا "کیوں بیٹی۔ کیا وہ ڈسک پسند آیا؟"

"اباجی بڑا نفیس ہے۔ میں نے اور رشیا مانے مل کر اس کا برنجی سامان اتنا صاف کیا ہے کہ اب سونے کی طرح دمکتا ہے۔ چاہے صورت دیکھ لے۔"

"خیر۔ تو تم اُسے پسند کرتی ہو۔"

"پسند.... ضرورت سے زیادہ پسند کرتی ہوں۔ اور یہ سمجھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آج تک میرا بغیر اس کے کیوں کر گزارہ ہوا۔"

باپ بیٹی دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے پائیں باغ کو طے کر کے مکان میں داخل ہی ہونا چاہتے تھے کہ پروفیسر صاحب پھر ایک بار رُک گئے۔ اور کہنے لگے۔

"بیٹی چوں کہ یہ ڈسک تم کو پسند آیا اس لئے اس کو میری طرف سے آنے والے بڑے دن کا تحفہ سمجھو۔"

"اباجی: آپ کی شفقت نے میرے دل سے اماں کی یاد بھلادی۔ مجھے یہ تحفہ بے حد پسند آیا۔"
"بس یہی میری خواہش تھی۔ اچھا۔ شام کا کھانا کھانے سے قبل لاؤ۔ ذرا تمہارا ڈسک بھی دیکھ لوں۔ تم کہتی ہو
تم نے اور شیاما نے اُس کی صفائی میں بڑی محنت کی ہے۔ اب تو وہ بالکل نیا معلوم ہوتا ہوگا۔"
"اباجی۔ ضرور... دیکھئے گا۔ کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے۔"
وہ زینہ پر آگے ہولی۔ اور بڑھ کر اپنے کمرہ کے دروازہ پر پہونچی۔ مگر اندر نظر پڑتے ہی اُس کے منہ
سے پریشانی کے عالم میں دبی ہوئی چیخ سی نکلی.... "ہائے.... اباجی..."
"ہائیں بیٹی۔ کیا بات ہے؟" پروفیسر صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔
اور جواب کا انتظار کئے بغیر وہ لپک کر کمرہ کے قریب پہونچے اور بعجلت اندر داخل ہو گئے۔ کیا دیکھتے
ہیں۔ کہ ڈسک اس طرح سے غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ.....
جی اور کیا.....!

(۲)

جس معاملہ نے پولیس کو سب سے زیادہ حیرت میں ڈالا۔ وہ یہ تھا۔ کہ چرانے والوں نے اپنا کام نہایت
سادگی کے ساتھ انجام دیا تھا جس وقت شانتی مکان سے باہر تھی۔ اور شیاما خانگی ضروریات کا سامان خریدنے
بازار گئی تھی۔ کہ ایک مزدور ہاتھ سے چلانے کا چھوٹا ٹھیلا لئے مکان کے دروازہ پر رُکا اور دو تین بار
آواز دی۔ ہمسائے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر کسی کو اس کا کیا علم۔ کہ گھر میں کوئی نہیں۔ بس پھر کیا تھا۔
میدان صاف ہوتے ہی وہ شخص بڑی آسانی کے ساتھ ڈسک لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور کسی کو کانوں
کان خبر نہ ہوئی۔
لطف یہ کہ ڈسک کے سوا کوئی چیز غائب نہ تھی۔ کیا مجال کوئی الماری کھلی یا کواڑ کو توڑا گیا ہو۔ کلاک اپنی
جگہ پر قایم۔ شانتی کا بٹوہ ڈسک کی مرمریں سطح پر رکھا ہوا تھا۔ وہ بھی معہ تمام نقدی کے ایک پاس ہی کی میز پر
مل گیا۔ اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ چوری کرنے والے کا مقصد صرف ڈسک اُڑانا تھا۔ اور معاملہ کا یہی پہلو سب سے
زیادہ حیرت خیز تھا۔ اس لئے کہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ کون بے وقوف کاٹھ کا اُلو ہے۔ جس نے ڈسک ایسی حقیر

چیز کے لئے اتنے عظیم خطرات کا مقابلہ کیا۔

پروفیسر صاحب سے پوچھا گیا۔ کہ آپ کو کس پر شبہ ہے۔ مگر وہ کل شام کے واقعہ سے زیادہ کچھ بیان نہ کرسکا کہنے لگے۔ "کل بازار پریڈ میں اس نوجوان کو میرے انکار سے سخت رنج پہونچا اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ چلتے وقت اس کی قہر آلود نگاہوں کا مطلب خاموش دھمکی دینا تھا۔

یہ تفصیل نہایت مبہم تھی۔ دوکان دار سے دریافت کیا گیا۔ اُس نے کہا۔ میں دونوں حضرات میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔ ڈسک کی نسبت میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک متوفی انگریز کے مال و اسباب میں شامل تھا۔ جس کو مال روڈ پر سوہن لال اینڈ سنس کے یہاں نیلام کیا گیا۔ اور اسے میں نے پانچ روپیہ میں خرید لیا۔ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے اسے کافی منافع پر فروخت کیا۔ مزید تفتیش کی گئی۔ مگر عقدہ کسی طرح حل نہ ہوا۔

دل ہی دل میں خدا معلوم پروفیسر دلسکھ رائے کو یہ گمان ہو رہا تھا کہ اس ڈسک کی چوری سے مجھے نقصان عظیم پہونچا ہے۔ ضرور کوئی خزانہ اس کی کسی خفیہ دراز میں پوشیدہ ہوگا۔ غالباً اُس نوجوان کو اس کا علم تھا اس لئے وہ اصرار کر رہا تھا۔ اور اُسی نے یہ کارروائی کی۔

"اباجی۔ اگر وہ دولت ہمیں مل جاتی تو کیا کرتے۔" شانتی نے نہایت بھولے پن سے دریافت کیا۔

"بیٹا۔ میں اُسے تم پر نچھاور کر دیتا۔ اور تمھاری شادی اس دھوم دھام کی کرتا۔ کہ دنیا دنگ رہ جاتی"

غریب شانتی کو اپنے چچا زاد بھائی سے اُنس تھا جس کے پاس دولت کے نام سے ایک حبہ بھی نہ تھا۔ شانتی کو اس خیال سے سخت قلق ہوا۔ اور وہ ایک آہ سرد کھینچ کر رہ گئی۔ اس دن کے بعد گوالٹونی کے اس چھوٹے سے بنگلے میں باپ بیٹی کی زندگی بہ نسبت پہلے کے بہت کم اطمینان کے ساتھ گزرنے لگی۔ کیوں کہ دونوں کے دل میں رنج و افسوس جاگزیں تھا۔

دو ماہ گزر گئے اس کے بعد دفعتاً یکے بعد دیگرے چند ایسے حیرت خیز واقعات ظہور میں آئے جنھیں خوش نصیبی اور بدنصیبی کا معجون مرکب کہنا بجا ہوگا۔ یکم فروری ۱۹۲۰ء کو ساڑھے پانچ بجے پروفیسر صاحب کالج سے واپس آئے تو گھر میں اخبار سٹیٹ مین میز پر رکھا ہوا ملا۔ پروفیسر صاحب نے فوراً ناک پر چشمہ چڑھایا اور اُسے پڑھنے لگے۔ سیاسی خبریں زیادہ دلچسپ نہ تھیں۔ اس لئے ورق اُلٹ کر دوسرے صفحہ پر نظریں دوڑانے لگے

اگلے صفحہ پر ذیل کا عنوان بہت ہی جلی حرفوں میں درج تھا۔

"کلکتہ فرینڈس ایسوسی ایشن لاٹری کا تیسرا موقعہ"

پہلا انعام۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک لاکھ روپیہ

سلسلہ کتاب نمبر ۲۳ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹکٹ نمبر ۱۵۴

اخبار پروفیسر صاحب کے ہاتھ سے گر گیا۔ مکان کی دیواریں حرکت کرتی ہوئی نظر آنے لگیں
ج مسرت نے ذرا دیر کے لئے دل کی حرکت بند کر دی۔ اس لئے کہ کتاب نمبر ۲۳ کا ٹکٹ خود
ن کا نمبر تھا۔ یہ ٹکٹ انھوں نے محض چند احباب کے اصرار پر صرف اس لئے لے لیا تھا کہ اُن کی دل شکنی
و۔ ورنہ پروفیسر صاحب تو قسمت کے قائل تھے۔

انھوں نے جیب سے یادداشت کی کتاب نکالی۔ بلاشبہ اس پر وہی کتاب نمبر ۲۳ اور ٹکٹ نمبر ۱۵۴
تھا مگر۔۔۔ ٹکٹ۔۔۔ ٹکٹ کہاں تھا؟

وہ یک دم مطالعہ کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ کیوں کہ وہ اس ٹکٹ کو ہمیشہ اپنے نوشت کے بکس میں
کرتے تھے مگر کمرہ میں پہونچتے ہی وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ کیوں کہ وہ بکس بھی وہاں موجود نہ تھا اور اب
رکتے ہوئے دل کے ساتھ انھوں نے پہلی مرتبہ یہ بات محسوس کی کہ وہ بکس تو ہفتوں سے یہاں نہیں
۔ "شانتی۔۔۔۔ بیٹی شانتی!" انھوں نے گھبرا کر آواز دی۔

وہ ابھی ابھی بازار سے واپس ہوئی تھی۔ باپ کی آواز سنتے ہی دوڑتی ہوئی اوپر آئی۔ پروفیسر صاحب
ایسی آواز میں جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی اُن کا حلق دابے ہوئے ہے۔ کہنے لگے۔۔ "شانتی۔۔ وہ بکس
میرا مطلب یہ کہ وہ سامان نوشت کا صندوقچہ کہاں۔۔۔۔ کہاں ہے؟"

"اباجی۔۔ کون سا بکس۔۔۔ کونسا صندوقچہ۔۔۔"

"وہ ہی جو میں نے ایک دن جمعرات کی بازار پریڈ میں خرید کیا تھا۔ کیا تم بھول گئیں۔۔ یہیں میز کے
ے پر رکھا رہتا تھا۔"

"آپ خود بھول رہے ہیں۔ ہم دونوں نے مل کر اُسے یہاں سے اُٹھایا تھا۔"

"اوہو...... یہ کب"

"اسی رات کو.... آپ کو تو یاد ہوگا"

"مگر رکھا کہاں تھا۔ جلدی کہو۔ میں بے چین ہوں"

"جی۔ اُسی ڈسک میں رکھا تھا۔ جو آپ میرے لئے خرید کر لائے تھے"

"ارے.. اُس ڈسک میں جسے کوئی چرا کرلے گیا"

"جی ہاں۔"

"اُسی ڈسک میں جسے کوئی چرا کرلے گیا"

اسی جملہ کو اُس نے بدحواس شخص کی طرح کئی بار عالم بے خبری میں دہرایا اور پھر اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر بڑی آہستگی سے کہنے لگا۔ "بیٹی اُس بکس میں ایک لاکھ کی رقم تھی"

"اباجی.. یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا"

"ہائے ایک لاکھ" پروفیسر صاحب نے بڑی حسرت سے دوبارہ زور دے کر کہا۔ "بیٹا شانتی۔ اسی صندوقچہ میں لاٹری کا کامیاب ٹکٹ تھا"

دونوں کچھ دیر تک اس مصیبت کے بارِ الم کی تاب نہ لاسکے ایک دوسرے کا مُنھ تکتے رہے۔ دونوں چپ تھے۔ آخر کار شانتی نے کہا۔ "روپیہ تو پھر بھی آپ کو مل جائے گا۔

"واہ! یہ کیوں کر.... آخر کوئی شہادت"

"اوئی... تو کیا اس میں گواہ و شہادت کی بھی ضرورت ہے"

"ہاں"

"اور یہ آپ کے پاس موجود نہیں"

"تھی تو سہی..."

"کہاں"

"اسی بکس میں"

"جو گم ہو چکا.. چوری چلا گیا۔"

"ہاں . اور اب وہ دوسرا شخص اُس کا دعویدار بن جائے گا۔"

"یہ تو خاصا اندھیر ہے۔ اباجی۔ کیا آپ اُس روپیہ کی ادائیگی بھی نہیں رکوا سکتے۔"

"میں کہہ نہیں سکتا۔ کہ آیا یہ کارروائی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ مگر وہ دوسرا شخص بھی بلا کا چالاک ہے را دیکھو۔ کہ اُس کے وسائل کتنے زبردست ہیں۔ کس آسانی سے ڈسک اُٹھوا کر لے گیا.. گویا اُسی کے باپ کا ہو۔"

دفعتاً اس کی مایوسی نے مراجعانہ صورت اختیار کی۔ اُچھل کر اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور فرش زمین پر زور زور سے پاؤں مار کر کہنے لگا۔ "نہیں کبھی نہیں.... میں اُسے ایک لاکھ کا مالک نہ بننے دوں گا.. وہ لاکھ چاہے۔ پھر بھی اُسے حق کیا ہے.. وہ کیسے مالک بن سکتا ہے.. ہرگز نہیں.. وہ ہزار چالاک ہو. تو کیا.. میں اس کا را بند و بست کر دوں گا.. جس وقت وہ لاٹری کا روپیہ لینے جائے۔ اُسی وقت حراست میں کر لیا جائے گا س وقت آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا.. جی اور کیا.. کسی کی رقم اس آسانی سے ہضم کر لینا خالہ جی کا گھر نہیں.. دیکھوں تو. دوست کس طرح رقم وصول کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں.."

"اباجی.. تو کیا آپ نے کوئی تجویز سوچ لی۔"

پروفیسر صاحب نے بے حد جوش میں آ کر کہا۔ "نتیجہ خواہ کچھ ہو۔ میں اپنے حقوق کی پوری طرح حفاظت کروں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ بمصداق حق بحقدار رسید.. آخری کامیابی ہماری ہو گی.. ایک لاکھ کی رقم بڑی ہے.. میں اس کا جائز مالک ہوں.. اور میں انھیں وصول کئے بغیر چین نہ لوں گا۔"

چنانچہ اس گفتگو کے کچھ ہی دیر بعد اس نے حسب ذیل تار روانہ کیا۔

بنام سکرٹری صاحب

فرینڈس ایسوسی ایشن لاٹری

کلکتہ

کتاب نمبر ۲۳ کا ٹکٹ نمبر ۵۱ا میرا خرید کردہ اور ملکیت ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے روپیہ کا دعوے دار ہے تو اس کی ادائیگی

نہ کیجیۓ۔

دل سُکھ رائے کانپور

سکرٹری کے پاس جس وقت یہ تار پہونچا۔ عین اُسی وقت ایک دوسرا تار بھی موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

"جناب والا

سلسلہ کتاب نمبر ۲۲ کا ٹکٹ نمبرہ ۱۱ بندہ کے پاس موجود ہے۔

خاکسار بہرام"

(۳)

میں جب کبھی اُن بے شمار حیرت انگیز واقعات کو تحریر کرنے بیٹھتا ہوں۔ جو بہرام کے کارناموں سے تعلق رکھتے ہیں تو مجھے سخت دقت ہوتی ہے۔۔ کیوں کہ میں یہ جانتا ہوں کہ اُن میں سے ہر ایک تمام و کمال ناظرین کو معلوم ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے جنٹلمین چور۔۔ (اب بہرام کو یہ لقب حاصل ہو چکا ہے)۔۔۔ کی کوئی بھی حرکت ایسی نہیں جس سے ملک بے خبر ہو۔ اس کے ہر کارنامہ کو زمانہ ہر پہلو سے دیکھ چکا ہے اور اس پر اتنی تفصیل کے ساتھ رائے زنی ہو چکی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اپنے قصہ کو کس طرح دلچسپ بنانے کی کوشش کروں۔ اور کون سا مواد بہم پہونچاؤں۔

مثال کے طور پر اسی واقعہ کو لیجیۓ۔ پنجاب اور یوپی میں کون ایسا ہے جسے سنہری بالوں والی خاتون کا واقعہ یاد نہیں جس نے ملک میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا اور اخبارات کی سرخی۔ اس عنوان پر لوگوں کو دیوانہ بنائے ہوئے تھی۔ چنانچہ بہرام کی گرفتاری۔۔ بہرام کی رہائی۔۔ بیوی کا انتخاب وغیرہ۔ کون سا ایسا معاملہ ہے جس سے عوام واقف نہیں۔ ایک وہ معاملہ جس میں ہندوستان کے مایۂ ناز خفیہ انسپکٹر شاہد حسین اور بہرام کی کشمکش ہوئی۔ کسے یاد نہیں۔ لوگوں میں کتنا جوش پھیلا تھا۔ ان دو ماہرانِ فن یعنی شاہد حسین اور بہرام میں جس زور کی جد و جہد ہوئی۔ وہ کسے فراموش ہو سکتی ہے۔ یا وہ دن کون بھول سکتا ہے۔ جب بازاروں میں اخبار فروش لڑکے یہ آواز لگاتے پھرتے تھے کہ بہرام گرفتار ہو گیا۔

میری گزارش اس قصہ کو بیان کرنے سے محض یہ ہے کہ میں شاید چند نئی باتیں پیش کر سکوں گا۔ یا یوں سمجھئے کہ جن باتوں کو آج تک لوگ نہیں سمجھے ستھے۔ میں ان کا حل پیش کروں گا۔ بہرام کی زندگی کے واقعات لوگوں کے لئے بمنزلہ راز ہیں۔ میں اُن اسرار کو حل کرتا ہوں۔ واقعات وہی ہیں جنھیں کانپور کا بچہ بچہ جانتا ہے اور بیرونی مقامات میں لوگوں نے اخبارات میں پڑھ کر معلوم کر لئے ہیں۔۔ مگر میں اب انھیں ایسی ترتیب کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ کہ لوگ تہہ تک پہونچ سکیں۔ اس کام میں میرا معاون خود بہرام ہے۔ اور میں اس کی عنایت کا بے حد شکر گزار ہوں۔

ہاں تو ناظرین کو یاد ہوگا کہ ان دو تاروں کی اشاعت سے لوگوں میں کس قدر دلچسپی پھیلی تھی۔ بہرام کا نام بجائے خود اس امر کی ضمانت سمجھا جاتا ہے کہ لوگ اُس کی حرکت سے ضرور تیا لطف حاصل کریں گے۔ اور یہ بیان کرنا لاحاصل ہے کہ لوگوں سے مراد صرف باشندگان کانپور ہے۔ بلکہ تمام ملک کی آبادی سمجھئے لاٹری کے منتظمان نے اس پر میں تحقیقات شروع کی۔ اور معلوم ہوا کہ کتاب نمبر ۲۳ کا ٹکٹ نمبر ۵ الم لاٹری ل شاخ کانپور میں پنشنر میجر انندی پرشاد کے ہاتھ فروخت ہوا تھا۔ میجر مذکور اس کے دو ماہ بعد گھوڑے سے گر کر انتقال کر گئے۔۔ مزید دریافت سے معلوم ہوا کہ مرنے سے پہلے اُنھوں نے اپنے بعض خاص احباب سے یہ ظاہر کیا تھا کہ میں نے اپنا ٹکٹ ایک دوست کو دے دیا ہے۔

" اور وہ دوست میں ہوں" پروفیسر صاحب کا کہنا تھا۔

" اس کا ثبوت " لاٹری کے منتظم کا اعتراض تھا۔

" وہ ثبوت ذرا بھی مشکل نہیں۔ صدہا آدمی میرے بیان کی تصدیق کریں گے کہ میجر انندی پرشاد کے ساتھ میرے تعلقات نہایت گہرے ستھے۔ اور اُن کے گھر پر میری آٹھوں پہر کی نشست و برخاست تھی۔ اپنے ہی مکان پر ایک دن میجر نے بعض مالی مشکلات کا اظہار کیا۔ اور میں نے اُن کا ٹکٹ قیمت ادا کر کے خرید لیا۔"

" یہ سودا کسی اور شخص کی موجودگی میں ہوا تھا۔ کیا آپ اس معاملہ کا کوئی عینی گواہ پیش کر سکتے ہیں؟"

" وہ نہیں۔۔ ایسا گواہ تو کوئی نہیں ہے۔"

" تو پھر آپ کے اس دعوے کا ثبوت۔"

"میرے پاس میجر کا ایک رقعہ ہے۔ جو انھوں نے اسی بارہ میں لکھا تھا۔
"کون سی تحریر۔ کیسا رقعہ؟"
"اسی ٹکٹ کے ساتھ ایک رقعہ بھی تھا۔"
"خیر وہی دکھایئے"
"مگر وہ بھی اُسی ڈسک میں تھا جو چوری گیا۔"
"جو کچھ بھی ہو۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کو تلاش کرنا آپ کا فرض ہے۔"

ادھر تو یہ بحث جاری تھی اُدھر بہرام نے اُسی رقعہ کا مضمون اخبارات میں شائع کرا دیا۔ سب سے پہلے یہ مضمون کانپور کے مشہور اخبار "آزاد" میں شائع ہوا۔ اور لوگوں نے دہلی کے اخبار "مشیر ہند" کی طرح اس کو بھی بہرام کا خاص اخبار سمجھنا شروع کر دیا۔ سب کو معلوم ہے کہ "مشیر ہند" بہرام کا خاص اخبار ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ "مشیر ہند" کا بھی حصہ دار ہو۔ اُسے ہر شہر میں اپنے مطلب کے لئے کوئی نہ کوئی اخبار مل جاتا ہے۔ علیٰ ہذا۔ آزاد میں اس نے یہ اطلاع بھی درج کرائی کہ میجر انندی پرشاد نے یہ رقعہ دراصل میرے نام لکھا تھا۔ اور اب میں نے اُسے معہ ضروری ہدایات کے اپنے قانونی مشیر مسٹر عارف بیرسٹر کے حوالہ کر دیا ہے۔

یہ اطلاع پڑھ کر لوگوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ کہ بہرام ۔۔۔۔ اور وکیل کرے ۔۔۔ بہرام ملک کے قائم شدہ رواج کے مطابق بار ایسوسی ایشن کے ایک نامی ممبر کو اپنا قائم مقام بنائے .. واللہ کتنی عجیب بات تھی۔

اخبارات کے نمائندے یہ خبر دیکھتے ہی عارف صاحب کے بنگلہ پر پہونچے۔ بیرسٹر صاحب نہایت ذی اثر اور مشہور لوگوں میں سے تھے۔ اُن کی دیانت داری۔ نیک مزاجی کا تمام کانپور قائل ہے۔

بیرسٹر صاحب موصوف نے نمائندوں کے استفسار پر کہا۔ "ذاتی طور پر مجھے اپنے موکل بہرام سے ملنے کا آج تک اتفاق نہیں ہوا ہے۔ اُس نے ضروری ہدایات میرے پاس ضرور بھیج دی ہیں۔ اور میں اس کو موجب فخر سمجھتا ہوں کہ اُس نے مجھی کو قابل انتخاب سمجھا۔ اور اب میں اپنے آپ کو قابل اعتبار ثابت کرنے کے

لئے تاحدامکان اپنے موکل کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔"

اُنھوں نے نمائندوں کو میجر کا لکھا ہوا رقعہ بھی دکھلایا جس کے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹکٹ فروخت کیا گیا ہے۔۔ مگر کس کے نام یہ کچھ پتہ نہ لگتا تھا۔ القاب میں فقط اس قدر لکھا تھا " میرے عزیز دوست" جس سے مراد اسی خاکسار کی ذات ہے۔" بہرام نے اُس رقعہ میں لکھ دیا تھا۔ جس کے ساتھ میجر کی تحریر روانہ کی گئی تھی۔ "اور اس کا بہترین ثبوت یہ ہے۔ کہ یہ خط میرے قبضہ میں ہے۔"

وہاں سے ہٹ کر تمام نمائندے پروفیسر صاحب کے مکان پر پہونچے۔ مگر یہ بیچارے اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے کہ اُس القاب سے مجھی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور کم بخت بہرام لاٹری کے ٹکٹ کے ساتھ وہ رقعہ بھی چرا کرلے گیا۔"

"اس کا ثبوت مہیا کرو۔" یہ جملہ تھا۔ جو بہرام نے پروفیسر کے جواب میں اخبارات میں شائع کردیا۔

"لیکن یہ تو ثابت ہے۔ کہ بہرام نے میرا ڈسک چرایا۔" پروفیسر صاحب نے ان نمائندوں سے بیان کیا۔

"اس کا بھی آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟" یہ دوسرا جوابی جملہ تھا۔ جو بہرام نے اخبارات کی معرفت پروفیسر صاحب تک پہونچایا۔

غرض کہ اس طرح ٹکٹ نمبر ۱۵۱۴ کے دو مالکوں کے درمیان تکرار کی بدولت اخبارات کے نمائندوں کی خوب بن آئی۔ اس طرف بہرام کے سکون اور پروفیسر صاحب کے جوشِ غضب سے لوگوں کے لئے عجیب دل لگی کا سامان پیدا ہوگیا۔

پروفیسر صاحب کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ آئے دن اخبارات میں اس کی تحریریں شائع ہوتی تھیں جن سے بغایت کرب و اضطرار کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ ان میں اپنی مصیبت کا ذکر نہایت دردناک پیرایہ میں کرکے لکھتا۔" صاحبو! یہ میری بیٹی شانتی کا جہیز ہے جسے اس بدمعاش نے اڑالیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ مجھے اس واقعہ کی چنداں پروا نہ ہوتی۔ مگر شانتی۔۔۔ ہائے شانتی کی خاطر۔۔۔۔ ایک لاکھ کی رقم کتنی بڑی ہے۔۔۔۔ ایک لاکھ۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ اس ڈسک میں کوئی غیبی خزانہ موجود ہے۔"

لوگوں نے بہت سمجھایا کہ ڈسک چراتے وقت تمھارے دشمن کو اس کا کیا علم ہوسکتا تھا۔ کہ اس میں

کوئی لاٹری کا ٹکٹ بھی موجود ہے۔ اور اگر ہوتا بھی تو اُسے یہ کیوں کر علم ہوا کہ یہی ٹکٹ سب سے بڑا انعام حاصل کرے گا۔ پروفیسر صاحب ان اعتراضات کو سُن کر ذہنی اذیت سے کڑھتے۔ اور کہنے لگتے۔ "مجھ سے باتیں نہ کرو..... وہ بڑا پکا بدمعاش ہے۔ وہ یقیناً سب کچھ جانتا تھا۔۔ اگر اُسے علم نہ ہوتا۔ تو ڈسک کم بخت کیا رکھا تھا۔ کہ وہ اُسے چرانے آتا"

معترض حضرات جواب دیتے۔ "اس کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ بہرحال اُس نے اُسے اس پرزہ کاغذ کی خاطر نہیں چرایا۔ کیونکہ اس کی قیمت سرقہ کے وقت بہرحال ۱۵ روپیہ سے زائد نہ تھی"

"کیوں بکواس کرتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ اس کی قیمت ۱۵ روپیہ تھی۔ وہ کم بخت خوب جانتا تھا اس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہے.... وہ سب کچھ جانتا ہے۔۔ کیسے معلوم نہیں۔ کہ وہ بدمعاش کس قماش کا آدمی ہے۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے ایک لاکھ کا نقصان تمھیں تو پہونچایا نہیں۔ جو تمھیں معلوم ہو"

یہ بحث خدا معلوم کتنے عرصہ تک جاری رہتی کہ اس واقعہ کے بارہ دن بعد پروفیسر صاحب کے نام ایک خط موصول ہوا جس کے کونے پر پرائیویٹ اور پوشیدہ کا لفظ لکھا تھا۔ یہ خط غریب پروفیسر کے لئے اور زیادہ پریشانی کا موجب بن گیا۔۔ عبارت یہ تھی۔

جناب من تسلیم

ہم باہم جھگڑا کر رہے ہیں اور لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔۔ کیا آپ کی رائے میں ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم دونوں تو تو میں میں کو چھوڑ کر ذرا ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کریں۔۔ کم از کم میں نے تو یہی فیصلہ کرلیا ہے معاملہ بالکل سادہ اور نہایت صاف ہے۔ میرے پاس ایک ایسا ٹکٹ موجود ہے جس کے روپیہ کا میں حق دار نہیں۔ اور آپ روپیہ کی ایک ایسی رقم کے حق دار ہیں جس کا ٹکٹ آپ کے پاس موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ باہم ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ نہ آپ اپنے حقوق سے میرے لئے دست بردار ہونا منظور کریں گے۔ اور نہ میں اپنا ٹکٹ آپ کے حوالہ کروں گا۔۔۔ اب سوال یہ ہے کہ۔۔

پھر کیا کیا جائے۔

میری رائے میں اس شکل کو صرف ایک حل ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم دونوں انعام کی رقم کو نصفا نصف کرلیں۔ ۵۰ ہزار میرا ۵۰ ہزار آپ کا۔۔ نہ کہئے گا۔۔ کیا بات پیدا کی ہے۔۔ خود غور کیجئے۔ کتنا عمدہ بات ہے۔ یقیناً حضرت سلیمان بھی اس سے بہتر انصاف نہ کر سکتے۔

میں یہ حل فوری تصفیہ کے لئے پیش کرتا ہوں اور اب اس پر مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ آپ ہر حال میں ماننے پر مجبور ہیں۔ اس کے باوجود میں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ مناسب یہ ہوگا۔ کہ جمعہ کی صبح کو آزاد کے آخری کالموں میں جہاں اشتہارات وغیرہ شایع ہوتے ہیں۔ آپ ایک مختصر سا اشتہار میرے نام شائع کریں۔ اور اس میں مبہم الفاظ میں آپ کی رضامندی کا ذکر ہو۔ اگر ایسا ہوا تو ٹکٹ فوراً آپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ اور آپ اس شرط پر ایک لاکھ رقم کے مالک بن سکیں گے۔ کہ ۵۰ ہزار ر۔پ۔ طریق پر جس کی تفصیل میں آئندہ عرض کروں گا۔ مجھے پہنچا دیئے جائیں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو مجھے ایک انتظام کرنا ہوگا جو میں نے ابھی سے سوچ رکھا ہے۔ لیکن اس صورت میں نہ صرف آپ کی ذات کو کئی قسم کی زحمتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بلکہ یہ ضد بہت گراں ثابت ہوگی۔ کیوں کہ اس کے بعد مجھے آپ کے حصہ میں سے ۲ ہزار کی مزید رقم بد اخراجات وضع کرنا پڑے گی۔

آپ کا خادم۔ بہرام

پروفیسر صاحب بڑی جوشیلی طبیعت کے آدمی تھے۔ خط پاکر انھوں نے ایسی سخت غلطی کی کہ یہ پرائیویٹ خط ہر اخبار کے نمائندے کو دکھایا اور وہ اُسے نقل کرکے لے گئے۔ انسان غصہ کی حالت میں صدہا حماقتوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔

"میں ایک لاکھ میں اُسے ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا" اُس نے نمائندوں کی جماعت کے سامنے چلا کر کہا۔ "جب روپیہ میرا ہے تو اُسے نصف حصہ مانگنے کا کون سا حق حاصل ہے۔ میں ہرگز اس کی دھمکیوں کی پروا نہیں کر سکتا۔۔ بلا سے۔۔ وہ اگر چاہتا ہے تو ٹکٹ پھاڑ کر پھینک دے۔"

لوگوں نے سمجھایا "حضرت کچھ نہ ہونے سے تو پچاس ہزار ہی بہتر ہیں۔"

"مگر سوال پچاس ہزار یا ایک لاکھ کا نہیں۔ سوال تو حقوق کا ہے۔۔ اور میں اپنے حقوق کی حفاظت

بذریعہ عدالت کروں گا"

"یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر بہرام سے مقدمہ بازی کرنا.. لوگ اور زیادہ مذاق نہ اڑائیں گے۔"

"نہیں۔ مجھے بہرام سے مقدمہ بازی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا دعوےٰ تو لاٹری کے منتظمین کے خلاف ہوگا۔ اُن کا فرض ہے کہ وہ ایک لاکھ کی رقم میرے حوالہ کریں۔"

"حالاں کہ نہ آپ کے پاس ٹکٹ ہے۔ نہ کوئی اور ثبوت"

"ثبوت!.. کیسا ثبوت؟.. ثبوت خود بہرام کے بیان میں موجود ہے۔ جو ڈسک کی چوری کا اعتراف کرتا ہے۔"

"لیکن حضرت! وہ کون سا بیوقوف جج ہے جو بہرام کے بیان کو قابل اعتبار سمجھے گا۔"

"کچھ پروا نہیں میں بہرصورت چارہ جوئی کرونگا۔"

لوگوں کی دل چسپی دن بدن بڑھ رہی تھی اور اس کے متعلق شرطیں بدی جاتی تھیں کہ بہرام یقینی پروفیسر صاحب کو راہ راست پرلے آئے گا۔ یا صرف دھمکیوں پر اکتفا کرے گا۔ بعض لوگ اپنے دل میں ایک قسم کا خوف بھی محسوس کرتے تھے کیوں کہ مقابلہ غیر مساوی جوڑ کا تھا - ایک اپنے حملہ کے لئے دنیا میں مشہور رہا، دوسرے کی مثال اس خائف ہرن کی طرح تھی جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوئے ہوں۔

جمعہ کو 'آزاد' کے پرچے نعمت غیر مترقبہ کی طرح ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ ہر شخص دھڑکتے ہوئے دل سے آخری صفحات کے کالموں کو دیکھ رہا تھا۔ مگر بہرام کی بابت سطر تو سطر۔ ایک حرف بھی درج نہ تھا۔ پروفیسر صاحب نے بہرام کے مطالبات کا جواب خاموشی سے دے کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہر قسم کی جنگ کے لئے تیار رہے۔

مگر شام ہی کو یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں گشت کر گئی کہ پروفیسر صاحب کی جو روش دختر نیک اختر شانتی عدم پتہ ہے......

(باقی آئندہ)

(از جناب کیف مرادآبادی)

ہی جذباتِ مردہ میں میرے آج کچھ ارتعاش پیدا
وہ زندگی جو میں چاہتا ہوں اسی سے ہوجائے کاش پیدا

اں ہے وہ زندگی جو حاصل بنے مری سوزشِ دروں کا
کہاں ہے وہ زندگی جو انجام بن سکے جوششِ جنوں کا

درد تو میرے دل میں لیکن نہ وہ کہ جس کی دوا نہیں ہے
میں مضطرب ہوں مگر مرا اضطراب بے مدعا نہیں ہے

لون تو چاہتا ہوں لیکن نہیں ہوں طالب میں اس سکون کا
جو مقصدِ زندگی کو گم کر کے دل میں کر دے جمود پیدا

ں زندگی چاہتا ہوں تکمیلِ ذوقِ روحانیت ہو جس میں
مجھے ہے اس زندگی کی خواہش مکمل انسانیت ہو جس میں

مجھے تلاش ایسی زندگی کی ہے جس کا مقصود ارتقا ہو
وہ زندگی یعنی جس کا انجام روح کی دائمی بقا ہو

ں کیا کروں گر نگاہیں تاروں کی رفعتوں کو دکھا رہی ہیں
مری امنگیں تو میرا مقصد بلند ان سے بتا رہی ہیں

ری فراوانیِ تخیل مجھے وہاں لیکے جا رہی ہے
جہاں کی ہر شے ہے غیر فانی جہاں کا ہر رنگ دائمی ہے

جہاں کے معصوم رہنے والوں کو معصیت کا خطر نہیں ہے
جہاں کی تابندہ تر فضاؤں میں ظلمتوں کا گزر نہیں ہے

جہاں کا ہر ایک رہنے والا عمل کے میداں میں گام زن ہے
جہاں نہ آپس کے تفرقے ہیں نہ فکرِ اغیار طعنہ زن ہے

جہاں ہر اک دل میں دردمندی ہے جوشِ ملت ہے حوصلے ہیں
جہاں محبت کے شیریں نغمے فضا کے ذروں میں گونجتے ہیں

یں دیکھتا ہوں کہ دہر ناپائدار رہنے کی جا نہیں ہے
میں جانتا ہوں کہ زندگی کا یہاں کوئی مدعا نہیں ہے

بلندیوں پر مجھے جو لیجائیں ایسے جذبات چاہتا ہوں
حقیقتوں سے جو آشنا کر دیں ایسے نغمات چاہتا ہوں

الٰہی اس زندگی میں میری کچھ ایسا اک انقلاب کر دے
جو میری ہستی کے ذرے ذرے کو رشکِ صد آفتاب کر دے

انیسِ حیات

"کاش میری قیام گاہ ایک بیابان میں ہوتی اور صرف ایک پرکشش ہستی میری مونسِ تنہائی۔ اس کے بعد میں تمام کائنات کو فراموش کر دیتا۔ کسی سے نفرت تو نہ کرتا لیکن میری محبت کا مرکز صرف ایک ہستی ہوتی۔"

(بائرن)

"وہ صرف میری ہے۔ ایک لعل بے بہا ہے۔ اگر سمندروں کے ذرّات ایک موتی ہو جائیں اور اُن کا پانی آبِ حیات ہو جائے، اُن کے پتھر سونا بن جائیں تو اس کی قیمت نہ ادا کر سکیں۔"

(شیکسپیر)

"وہ اب تمہاری دُلہن ہے۔ فطرت کا پیارا اور نازک تحفہ تمہارے سپرد کیا گیا ہے اس کی لطافت اور عظمت کو محسوس کرو۔ اور وقفِ نفسانیت نہ ہو جاؤ۔ اس کی عصمت اور ناموس کی محافظت کرو۔ اس کے شباب کے لئے ایک سکون بخش رہبر ثابت ہو اور اس کے رفیق اور مُربّی بن جاؤ۔ تمہارے تجربے اور مشاہدے اس کے لئے بھی کارآمد ہوں۔ راحت اور مصیبت خوشی اور رنج۔ تلخی اور حلاوت، اِن سب حالتوں میں اس کے شریک رہو۔ نہ بالکل اُس کے مطیع ہو جاؤ نہ اُس کو مجبور بناؤ۔ نہ مظلوم کہلاسکو نہ ظالم۔ ان اُصول پر تمہاری ازدواجی زندگی برکت اور رحمت سے معمور ہوگی اور تمہاری انیس حیات اپنے شوہر کی صورت میں ایک محبت کرنے والا پائیگی۔"

"تیری پر لطف گفتگو میں مجھے وقت کے گزرنے اور موسم کے تبدیل ہونے کا بھی تو احساس نہیں ہوتا، میں ہر وقت یکساں مسرت حاصل کرتا رہتا ہوں۔

صبح کی لطافتیں نسیم کے ہلکے و خوش گوار جھونکے۔ چڑیوں کے ترنم ریز نغمے۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی زرد و زر شعاعیں اور اُن کے پرتو سے روشن فضائے بسیط۔ ہرے بھرے درخت۔ خوشنما پھول شبنم آلود پتے۔ اور ہاں موسمِ بہار کے سرسبز و شاداب مناظر۔ بارش کے موسم کی ہلکی ہلکی پھواریں معتدل موسم کی نرم و لطیف شام۔ شب کا سکون۔ چاند کی فرحت بخش تابناکی۔ ننھے ننھے تاروں کی جگمگاہٹ، غرض کائنات کی تمام دل فریبیاں میرے لیئے صرف تیری شرکت کے ساتھ مسرت آفریں ہیں۔

لیکن اگر تو نہ ہو تو نہ صبح میں کوئی دل کشی ہے نہ طلوعِ آفتاب میں کوئی رنگینی ہے۔ نہ چڑیوں کے نغمے سہانے معلوم ہوتے ہیں۔ نہ شبنم آلود پھول پتوں اور پیڑوں میں کچھ لطف ہے، نہ رات کی سکون بخش خاموشی کچھ تسکین دہ ہے۔ نہ چاند کی ٹھنڈی اور دل فریب روشنی کے نظارے میں کوئی کیف معلوم ہوتا ہے، نہ خوشنما ستاروں میں کوئی کشش ہے۔ اے شریکِ رنج و راحت، غم و مسرت، تیرے بغیر کائنات کی تمام رنگینیاں بے معنی ہیں"۔

(ملٹن)

"آہ۔ کبھی ایسے خفیف سی رنجش اُن دلوں میں رخنہ ڈال دیتی ہے۔ جن کو دُنیا کے تمام مصائب و آفات نے آزمایا لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ آزمائشوں نے اُن کے اتحاد کو اور مضبوط کیا۔ رنج و غم۔ تکلیف و پریشانی کے طوفانوں کا مقابلہ وہ کرتے رہے۔ لیکن جب کہ مطلع صاف تھا اور بحرِ زندگی سکون کے ساتھ بہ رہا تھا۔ وہ ایک ساکن سمندر میں، ڈوبنے والے جہاز کی طرح ڈوب گئے"۔

(مورس)

"محبت انتہائی نازک اور شیشے کی طرح ٹوٹ کر بکھر جانے والی شے ہے۔ بربط کے تار تم اُن کو خواہ کتنی ہی بے احتیاطی سے استعمال کرو درست رہ سکتے ہیں۔ لیکن محبت باہمی سرد مہری و کدورت کے بعد قایم نہیں رہتی"۔

"اوبری"

"حقیقی اور پائدار ازدواجی محبت رفتہ رفتہ حُسنِ سلوک اور اعتماد باہمی کے ساتھ ترقی کرتی ہے، شوہر اور بیوی ساتھ رہتے ہیں، ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں، محبت کرتے ہیں اور پھر ایک ہوجاتے ہیں"

کسی عورت کی تعریف ایک جملہ میں، اس سے زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔

"اُس کو دیکھنا گویا ایک مکمل درس تھا۔"

(اسٹیل)

اسی طرح ایک اور خاتون کی تعریف کی گئی ہے۔

" اس کا دیکھنا گویا اُس سے محبت کرنا تھا۔ اور اُس سے محبت کرنے کے معنی صرف اسی سے محبت کرنے اور ہمیشہ محبت کرنے کے تھے۔"

(ماخوذ)

غزل

خیرگیِ نگاہ را قوّهٔ امتیاز ده
حسِّ حیات را ز حُسن مایهٔ سوز و ساز ده

دل که هلاکِ شیوه‌ات گشت ز تو حیات یافت
جامِ نشاطِ زندگیش باز بدستِ ناز ده

حُسنِ جفاشعار را آتشِ طور کن عطا
عشقِ وفاسرشت را سوزِ جگرگداز ده

داخلِ سینه‌ام نگر چشم کشا به سوئے دل
آئینهٔ خیال را عکسِ نگاهِ ناز ده

برقِ طپاں ز آسماں هیچ خورد بخاکداں
حُسنِ غرورکیش را مشورهٔ نیاز ده

مهرِ جمالِ خویش را از تجلوّه و کشش
ذرّهٔ خاکسار را ره بسوئے فراز ده

برق زن از نگاهِ ناز در رگِ جانِ مدّعا
بے دلیِ مرام را حدّتِ کارساز ده

تاکه شود دو عالمے بستهٔ عشقِ زلفِ تو
طرّهٔ تابدار را سلسلهٔ دراز ده

خواهی اگر بکنهِ شوقِ هادیِ خسته‌جاں رسی
سر بته پائے یار نه دست بدستِ ناز ده

(هادی مچھلی شہری)

موسمی ترانہ

زبانِ اہلِ دل یہ داستانِ برشگال ہے　　زمانہ بہار ہے، زمانِ برشگال ہے

برس رہی ہے تازگی

اُڑا رہی ہے چٹکیوں میں لکہ ہائے ابر کو　　کہ یہ ہوا حریفِ بادبانِ برشگال ہے

یہ لطف بھی ہے دیدنی

دلوں کی کھیتیاں جو خشک تھیں ہری ہوئی ہیں آج　　غریب با غریب مدح خوانِ برشگال ہے

یہ دلکشی یہ خرمی

چمن کے غنچے اور پھول آج سب ہیں جوش میں　　یہ سبز و نرم نرم دوب جانِ برشگال ہے

عجب طرح کی ہے خوشی

پیامِ لطف و عیش ہے دلِ طپیدہ کے لئے　　گرج ہے بادلوں کی یا زبانِ برشگال ہے

کھلی ہے دل کی ہر کلی

کڑک رہی ہیں بجلیاں برس رہے ہیں ابر بھی　　کہ قطرہ قطرہ آب کا نشانِ برشگال ہے

اُمنگ پر ہے ہر کوئی

ابھی تو چشمِ تر نے چند اشک ہی گرائے ہیں　　ابھی سے اک جہان کو گمانِ برشگال ہے

مزے کی ہے یہ دل لگی

وہ قلب آج شاد ہے جو وقفِ رنج دوش تھا　　ہر اک پرند کی صدا زبانِ برشگال ہے

کلی کلی دلہن بنی

ہوائے سرد و تُند بھی عجب ہے کیف آفریں　　یہ بدلیاں چلیں کہ کاروانِ برشگال ہے
بجا ہے بے خودی مری

چمن میں تازگی کی روح پھونک دی تو کیا عجب　　کہ نغمۂ ہزار ترجمانِ برشگال ہے
بجا ہے بیخودی مری

زمیں سے آسماں تک عجب سماں ہے کیف کا　　یہی جہان آج تو جہانِ برشگال ہے
ہر اِک ہر شے ہری بھری

تھکے ہوئے دماغ میں کچھ اس نے جان ڈال دی　　ہوائے سرد سرّ رازدانِ برشگال ہے
خجل ہے سحرِ سامری

یہ آپ کیوں خموش ہیں، یہ آپ کیوں اداس ہیں　　کہ ہر شکستہ دل بھی نغمہ خوانِ برشگال ہے
یہی ہے شانِ زندگی

یہ کاش رات بھر تو میکدے پہ مہرباں رہے　　فلک پہ جو مقیم کاروانِ برشگال ہے
بڑھائے لطفِ مے کشی

جراحت آشنا جگر ہے غم رسیدہ دل مگر!　　یہ شاد ہے، وہ مست ہے، یہ شانِ برشگال ہے
نہ ٹیس ہے نہ خستگی

نظر فریب دونوں ہیں وہ برق ہو کہ ابر ہو　　یہ روحِ برشگال ہے، وہ جانِ برشگال ہے
ہیں شاد غم نژاد بھی

جو قصدِ سیرِ باغ ہے اسے بھی ساتھ لیجئے　　یہ صدرِ خستہ دل بھی قدردانِ برشگال ہے
کہ دور ہو فسردگی

(صدر الدین سرشار کمنڈوی)

عبدالقادر الجزائری

از

(انیس الدین احمد رضوی امروہوی ایم اے (علیگ)

(۱)

دنیا آج اس کی نگاہ میں تاریک نظر آتی تھی۔ اس کا پیارا وطن، اس کے قابلِ عظمت آباؤ اجداد کا مسکن
، ایک غیر قوم کے قبضہ میں تھا۔ وہ ملک جس نے صدیوں سے اس کے خاندان کی مہمانی کا فرض ادا کیا تھا،
ملک جس نے خود اس کو اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر پندرہ سال تک کھلایا تھا، وہ ملک جو پیدائش سے
ِ طفلی تک اس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار رہا تھا، غضب ہے کہ آج دشمنانِ دین کے قدموں میں پامال ہو رہا
ا۔ آہ! آٹھ سال کی غیر حاضری نے واقعات کا رُخ کس طرف کو پلٹ دیا۔ ایک آزاد ملک غلامی اور
جداری کی ذلت آمیز زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا، اور ایک خود مختار قوم نکبت و ادبار کے تاریک غار
ں ٹھوکریں کھانے کے لیئے ڈھکیل دی گئی تھی۔ ملک اس کا عزیز ملک، عروس الممالک الجزائر، اور قوم
ں کی پیاری جاں باز قوم بربر، اس عرصہ میں تقدیر کی کرشمہ سازیوں کا شکار ہو چکے تھے۔ گویا کہ یہ
ٹھ سال، جو عبدالقادر نے مصر اور مضافات کی تفریح میں بسر کیئے، اس کے عزیز وطن کے لیئے تباہی اور
بادی کا پیغام تھے۔ عبدالقادر، جس کے اسلاف ہمیشہ سے باشندگانِ الجزائر کے دینی پیشوا چلے آتے تھ
ران کے افعال و کردار کے ذمہ دار تھے، کیا اب خود اس پر اس غلامی کی ذمہ داری عائد نہ ہوتی تھی،
یا اب اس کا فرض نہ تھا کہ ان مصائبُ الآلام کے موقع پر اپنے وطن اور برادرانِ وطن کی مدد و قیادت سے
تباہی نہ کرے؟۔ اس کا ضمیر رہ رہ کر اس کو ملامت کر رہا تھا، اور بالآخر وہ اس مقدس و محترم فرض
ادائگی کے لیئے سرگرم ہو گیا۔

الجزائر، براعظم افریقیہ کا سرسبز و شاداب ترین علاقہ، عرصہ سے دولتِ علیہ عثمانیہ کے ماتحت تھا،

لیکن رفتہ رفتہ اندرونی خود مختاری حاصل کرکے آزاد ہوگیا تھا۔ آزادی کے بعد بحری قزاقی نے جو اس زمانہ میں عام طور پر رائج تھی، اس ملک میں بھی دخل جمالیا، اور اس قدر ترقی کی کہ "غارت گرانِ بربر" کا نام سن کر یورپ کے بڑے بڑے بہادر اور آزمودہ کار جنرل خوف و دہشت سے تھر تھرا جاتے تھے۔ اس غارت گری کا سدِ باب کرنے کے لیئے یورپ کی تمام طاقتیں وقتاً فوقتاً الجزائر کی حکومت سے برسرِ پیکار رہتی تھیں، لیکن ہمیشہ ان کو ناکامی اور ذلت کے ساتھ واپس جانا پڑتا تھا۔ بالآخر انگلستان اور امریکہ کے متحدہ حملوں نے الجزائر کی قوت کو بہت سخت نقصان پہونچایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۹ء میں فرانس کی امواج پیکر فوجوں نے آکر اس سرسبز علاقہ کی آزادی کو ہمیشہ کے لیئے ختم کردیا۔

عبدالقادر شہر مسقارا کے ایک قدیم اور شریف النسب خاندان کا فرد تھا۔ جو جو صفات کہ کسی قومی ہیرو کو تمام دیگر افراد سے متمیز کرتی ہیں، وہ سب اس میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ وہ علم فقہ کا ماہر، دین داری و راست بازی میں شہرۂ آفاق، مہمان نواز، فیاض منش، فراخ حوصلہ اور آزاد خیال تھا۔ فنِ سپہ گری میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، اعلیٰ درجہ کا شہ سوار، جری، شجاع اور دلیر معرکہ آرا ہونے کے علاوہ انتہائی وطن پرست اور جاں نثارِ ملک تھا۔ وہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ترکِ وطن کرکے مصر کی طرف چلا گیا تھا۔ آٹھ سال کے بعد اب چوبیس برس کی عمر میں اس نے پھر اسی سرزمین پر قدم رکھا، جو عہدِ طفلی میں اس کی آزاد شوخیوں اور شرارتوں کی آماجگاہ رہ چکی تھی۔ لیکن الجزائر اب وہ ملک نہ رہا تھا، جس کے در و دیوار کبھی حریت کے علم بردار تھے، جس کے ذرہ ذرہ سے کبھی قوم پرستی کے آثار نمایاں تھے، اور جس کی گلیوں میں کبھی چھوٹے چھوٹے بچے عبدالقادر کے ساتھ آزادی کے گیت گاتے پھرا کرتے تھے۔ آج وہاں ایک غیر قوم حکمران نظر آتی تھی، جس کے جور و استبداد نے اس کے برادرانِ ملک کو بالجبر غلامی اور ذلت کا حلقہ پہنا دیا تھا اور جنھوں نے دستِ تظلم دراز کرنے میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کو بلا لحاظ نشانہ بنا رکھا تھا۔ اپنی تمناؤں کی دنیا پر یہ عذابِ الیم ہوتا دیکھ کر عبدالقادر کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وطن و ملت کی اس تاریک حالت نے اس کی نگاہوں میں تمام عالم کو تاریک بنا دیا، اس کے وطن پرستانہ جذبات میں ایک ہیجان ایک عظیم تلاطم، برپا ہوگیا، اور وہ اپنے مال، اپنی جان، غرض کہ اپنی کل کائنات سے اپنے وطنِ مالوف اور

ی عزیز قوم کی خدمت کے لیئے آمادہ ہوگیا۔

تسخیرِ الجزائر کے بعد فرانسیسی حکومت نے خونریزی اور قتلِ عام کا جو مسلک اختیار کیا، اس نے عرب
رت کو مرعوب کرنے کے بجائے تمام ملک میں مخالفت اور عدمِ تعاون کی ایک برقی لہر دوڑا دی۔ ظلم
تم کے اس آہنی شکنجہ سے ملک کا گوشہ گوشہ بلبلا اٹھا، اور ہر طرف بغاوت و نافرمانی کی آگ بھڑکنے لگی
انسیسی فوجیں کثیر تعداد میں ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئیں، اور انتہائی بے دردی اور جفا شعاری
ے الجزائریوں کا قتلِ عام شروع کردیا۔ لیکن عربی قبائل کی شجاعت و جاں بازی ہر منصف مزاج سے
راج تحسین وصول کرلیتی ہے۔ جس ہمت اور استقلال کے ساتھ انھوں نے اپنے سے دس گنی قوت کا مقابلہ
یا اور جس طرح دادِ مردانگی دی، اس کی نظیر تاریخِ عالم میں بہت کم نظر آتی ہے۔ انھوں نے فرانس کے
ے بڑے آزمودہ کار جنرلوں کو، جن میں سے اکثر نپولین اعظم کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، اور زمانہ انقلا
کے حوادث کا تجربہ اٹھا چکے تھے، زبردست شکستوں پر شکستیں دیں، کئی شہر اور قلعے متواتر واپس لے لیئے،
ور اس قدر زچ کیا کہ ان کے چھکے چھڑا دیئے۔ لیکن قضا و قدر کے ساتھ معرکہ آرائی کرنا ان کے قابو سے
ہر تھا، قدرت کے اٹل قانون کی خلاف ورزی کرنا گویا خود کو لقمۂ نہنگِ اجل بنانا تھا۔ فرانس کی ٹڈی دل
وجوں کا مقابلہ مٹھی بھر عرب و بربر کب تک کرسکتے تھے۔ بالآخر گرے، پھر سنبھلے، اور پھر گرے، ان بیکسی
ور مایوسی کی حالت میں ان کی آنکھیں کسی عروج اور طرغود کو ڈھونڈھتی تھیں، دل کسی خیر الدین باربرو
ور مرادِ اعظم کے منتظر تھے، اور قلوب کسی پیالی پاشا اور علی پاشا کے لیئے بے چین تھے۔ اس حسرت و یاس
ئے عالم میں انھوں نے چاروں طرف نظر ڈالی، ہر طرف بے بسی اور حرماں نصیبی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی
ان کے دل امید و ہراس کی کشمکش سے ساکت تھے۔ دفعتاً دستِ قدرت کو حرکت ہوئی، چرخِ نیلی فام نے
کروٹ بدلی، مطلعِ امید تجلیات کی بہار سے پُر انوار نظر آنے لگا، اور شہسوارِ مردِ میدان غازی عبدالقادر
سامنے کھڑا تلوار ہلا رہا تھا۔

(۲)
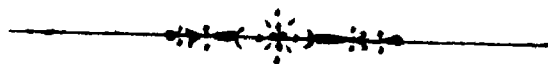
عبدالقادر کا خاندان الجزائر کے تمام علاقہ میں تقدس اور فضیلت کی وجہ سے ہر دل عزیز تھا۔ اس کے ہر فرد کے نام میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ چنانچہ اس حرماں نصیبی کی حالت میں عبدالقادر کے نام نے طلسمی اثر دکھایا، تمام قبائل عرب و بربر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں عبدالقادر کا نام برقی سرعت سے پھیل گیا، اور وطن پرست باشندوں کے سینہ میں اُمید کی لہر پیدا کر گیا۔ الجزائر کے در و دیوار، جو اب تک کیفیت حزن و اندوہ کے مظہر تھے، اب گویا زبانِ حال سے پکار پکار کر اعلان کر رہے تھے کہ :-

"الجزائر کا نجات دہندہ عبدالقادر آگیا!- اُٹھو! عبدالقادر آگیا!"

یہ آواز کیا تھی، گویا بجلی کا کڑکا تھی، جس نے الجزائر کے شرق و غرب کو ہلا ڈالا۔ ملک کا ہر فرد اس آواز پر صدائے لبیک بلند کر رہا تھا، آزادیٔ وطن و ملّت کی خاطر تمام قبائل آمادۂ پیکار ہو کر جوق جوق عبدالقادر کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے، عربی خون میں ایک جوش کی کیفیت پیدا تھی، اور ہر شخص "آزادی یا موت" کا متوالا نظر آتا تھا۔ تھوڑی مدت کے اندر ہی عبدالقادر کے پاس کافی جمعیت فراہم ہو گئی اور اُس نے فوراً فرانس پر اعلانِ جنگ کر دیا۔ لیکن قبائل کے جوش و خروش کی ابھی تک وہی حالت تھی، چاروں طرف سے دلیر اور نبرد آزما عرب جوانوں کے گروہ آ آ کر شامل ہوتے جاتے تھے، اور عبدالقادر کی طاقت روز افزوں غلبہ و اقتدار حاصل کرتی جاتی تھی۔ فرانس کے لیئے اب سوائے مصالحت کے کوئی چارہ کار نہ تھا، لڑتا تو ذلت و ناکامی کا بدنما دھبّہ دامن پر آتا۔ بالآخر اس نے ۱۸۳۴ء میں عبدالقادر کو مسکارا کا خودمختار حاکم تسلیم کر لیا۔

لیکن فرانس کی ہمانہ جو طبیعت اس کو کب گوارا کر سکتی تھی، اور نہ عبدالقادر الجزائر کے بجائے اس کے ایک چھوٹے سے علاقہ پر قانع ہو سکتا تھا۔ یہ صلح دفع الوقتی کے طور پر جانبین سے عمل میں آئی تھی، اور اس کا ہر طرف یقین تھا کہ عن قریب جنگ کے خوفناک شعلے بڑی تیزی سے بھڑکنے والے ہیں۔ دونوں

حریف پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف تھے، اور اپنی جنگی قوتوں کو برابر مستحکم کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۵ء میں فرانسیسیوں نے ایک نیا سیاسی حیلہ تراشا، اور مقارا پر حملہ کر دیا۔ عبدالقادر بھی تیار ہی تھا، اور فرانسیسیوں کے انتظار میں بیٹھا تھا، فوراً اپنے دلیر اور من چلے عربوں کی فوج لے کر مقابلہ پر آ ڈٹا۔ دریائے مقارا کے کنارے جنگِ عظیم کا منظر پیش ہو گیا۔ عربی فوج کا ہر سپاہی رستم و اسفندیار نظر آتا تھا۔ اس کے سامنے گزشتہ ہولناک مظالم کا خاکہ تھا، اور آنکھوں سے آتشِ انتقام کے شعلے نکل رہے تھے۔ عبدالقادر کا ہر حملہ فرانسیسیوں کے لیئے پیامِ موت تھا۔ ہر مرتبہ اُن کو پیچھے ہٹتے ہی بن پڑتا تھا، آخر کار سخت نقصان اُٹھا کر اُنھیں پسپا ہونا پڑا، اور میدان شیر دل عبدالقادر کے ہاتھ رہا۔ اس شکست نے فرانس کی آنکھیں کھول دیں، اور اچھی طرح ذہن نشین کر دیا کہ عبدالقادر لقمۂ تر نہیں ہے کہ جس وقت چاہا منہ میں ڈال لیا۔ اس مرتبہ بڑے پیمانہ پر تیاری کی گئی، اور ۱۸۳۶ء کو ایک ٹڈی دل میں ناکامی کا دھبہ مٹانے کے لیئے پھر مقارا کی طرف بڑھا۔ لیکن قدرت نے اس کے لیئے بھی ایسی ہی سخت ناکامی قسمت میں لکھ دی تھی۔ مطیجہ کا میدان فرانسیسیوں کے لیئے عرصۂ قیامت بن گیا۔ اور جو فوج مقارا کا قلع قمع کرنے کے لیئے آئی تھی، خود ہی پس کر رہ گئی۔

مطیجہ کی ہزیمت نے فرانسیسیوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ تمام فرانس میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ اور اس خطرۂ عظیم کا سدِّباب کرنے کے لیئے فوری تدابیر عمل میں لائی جانے لگیں۔ بیس ہزار کا ایک لشکر جرّار فی الفور تمام الجزائر کو تباہ و برباد کر دینے کے لیئے روانہ کیا گیا۔ بڑے بڑے نامی گرامی جنرل اس لشکر کے ساتھ تھے۔ صرف فرانس ہی نہیں، بلکہ تمام یورپ کی اُمیدیں اس کے ساتھ وابستہ تھیں۔ یقین کیا جاتا تھا کہ اس لشکرِ مور و ملخ کے سامنے عبدالقادر ایک منٹ کے لیئے بھی قدم نہیں جما سکتا۔ تمام یورپ، اور اسی کے ساتھ عالمِ اسلام، اُمید و بیم کی حالت میں اس غیر معروف شہر مقارا کی لڑائی کے نتیجہ کا منتظر تھا، جس کی قسمت کے فیصلہ پر مغرب الاقصیٰ کی حیات و ممات کا انحصار تھا۔ فرانسیسی فوجیں یلغار کرتی ہوئی بڑھیں اور اپنی رَو میں ہر چیز بہاتی لے چلیں، یہاں تک کہ مقارا کی دیواروں سے جا ٹکرائیں اور ایک فیصلہ کن لڑائی کی طرح ڈال دی۔ شیر دل عبدالقادر کی چھوٹی سی شیر دل جماعت بھی مقابلہ

پر آجمی اور لڑائی شروع ہو گئی۔ فرانسیسی حملوں کی مدافعت میں عربوں نے جس استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا، وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ فرانسیسی رہ رہ کر حملے کرتے تھے، اور کثرتِ تعداد کی بنا پر ہر مرتبہ کامیابی کا یقین کرتے تھے، مگر یہ یقین عربوں کی دلیرانہ مدافعت کے مقابلہ میں ہمیشہ مایوسی سے بدل جاتا تھا۔ لیکن آخر کب تک؟ کثرتِ تعداد نے قلت کو دبانا شروع کیا، اور عربوں کے دل یاس و ہراس سے لرزنے لگے۔ لڑائی کا پانسہ فرانسیسیوں کے حق میں پلٹتا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک غیرتِ حق کو جنبش ہوئی، ایک غیبی آواز نے عربوں کے کان میں پہنچایا کہ:- ''ہم نے اکثر قلیل جماعتوں کو بڑی زبردست فوجوں پر غالب کر دیا ہے۔''

چھوٹے سے گروہ نے پلٹ کر ایک جان کاہ حملہ کیا، اللہ اکبر کے زہرہ گداز نعروں سے دشت و جبل گونج اُٹھے، اور تھوڑی ہی دیر میں میدان فرانسیسی فوجوں سے صاف تھا۔

فرانس کی یہ تیسری ہزیمت گویا عبدالقادر کے انتہائی عروج کا پیش خیمہ تھی۔ عربوں نے اب اندازِ مدافعت کو بالائے طاق رکھا، اور جارحانہ پیش قدمی شروع کر دی۔ شکست خوردہ فرانسیسی ہر جگہ بھاگتے نظر آتے تھے، اور ان کے بجائے پھر عربوں کا تسلط ہوتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کا بے پناہ ہاتھ فرانسیسیوں سے اِن کے خوف ناک مظالم کا انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔ ہر شہر و قصبہ ان کی فوجوں سے خالی ہوتا جاتا تھا۔ تمام قلعے یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے، یہاں تک کہ چند ساحلی مقامات کے علاوہ الجزائر کے تمام علاقہ پر عبدالقادر کا قبضہ ہو گیا۔ آج اس کے دل میں اطمینان کی جھلک نظر آتی تھی، اِس کا قلب مسرت و بہجت کے بے پایاں جذبات سے معمور تھا، اس کی نگاہوں میں ملک کی آزادی اور خود مختاری دیکھ کر روشنی پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ دور، مسقارا سے بہت دُور، دو تین ساحلی مقامات سے مسیحی فوجیں ناکام و منہزم واپس جا رہی تھیں، تمام علاقہ آزادی کی خوشی میں مست و سرشار نظر آ رہا تھا، ملک کے گوشہ گوشہ سے حریت و وطن پرستی کے سُریلے سامعہ نواز نغمے بلند ہو رہے تھے، ہر شہر و قصبہ سے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کی پیہم صدائیں اُٹھ رہی تھیں، اور الجزائر کی بلندیوں سے ہلالی پرچم ایک شان کے ساتھ لہرا لہرا کر عبدالقادر کی عظمت و جبروت کا اعلان کر رہا تھا۔

---

(۳)

لیکن عبدالقادر کا انتہائی عروج الجزائر کے لئے نفسِ واپسیں کا مترادف تھا۔ قضا و قدر کے یہاں سے اس کا آخری فیصلہ صادر ہو چکا تھا، اور اب اس فیصلہ میں کسی ترمیم کی گنجائش نہ تھی۔ اتنی زبردست ہزیمتیں اٹھا کر فرانس کو بھی ہوش آگیا تھا کہ یہ مٹھی بھر عرب دس بیس ہزار کے بیچ کے نہیں۔ جب تک کہ انتہائی قوت سے کام نہ لیا جائیگا، ان کا مطیع کرنا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء کے اخیر میں حکومت فرانس نے مارشل بوگیڈ کو اسی ہزار سپاہ کے ٹڈی دل کے ساتھ الجزائر کو روانہ کر دیا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا نامور اور اولوالعزم جنرل بھی اتنی قلیل فوج سے اس کثیر تعداد کا مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔ پھر بے چارے عبدالقادر کی کیا حقیقت تھی؟ ایک ہی سال کے اندر بوگیڈ تمام شہر و قلعے فتح کرکے پامال کرتا، خون کے دریا بہاتا، تقیدمہ اور مستقار تک آ پہونچا، اور عربوں کی آخری امید کا سہارا بھی بالآخر مسخر ہوگیا۔ عبدالقادر پھر بھی اطاعت ماننے والا نہ تھا، وہ الجزائر سے نکل کر مراکش کی طرف چلا گیا، اور وہاں سے دو مرتبہ (۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں) فوجیں لے کر الجزائر پر تاخت کی۔ لیکن قسمت کا پانسہ اب قطعی طور پر پلٹ چکا تھا، پہلا عروج و کمال چراغ کا آخری سنبھالا تھا، جس کے بعد تاریکی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ دونوں مرتبہ ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اس عرصہ میں فرانسیسیوں نے ظلم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، کامل تین برس خوں ریزی، سفاکی اور قتل عام کا بازار پورے زور شور سے گرم رہا۔ صدہا گھرانے بے خانماں، اور ہزارہا مکانات خاک سیاہ ہوگئے۔ حرماں نصیب عبدالقادر مراکش میں بیٹھا یہ ستم آرائیاں دیکھ رہا تھا اور کچھ نہ کرسکتا تھا۔ بالآخر اس نے یہی سوچا کہ خود کو ظالم فرانسیسیوں کے حوالے کرکے ملک اور اہلِ ملک کو اس حشر انگیزی سے نجات دلائے۔ اس خیال سے ناچار ۱۸۴۷ء میں صلح کر لی اور جان و مال کی حفاظت کی شرط پر خود کو فرانسیسی گورنر کے سپرد کر دیا۔ لیکن فرانس کے قومی قانون میں عہد و معاہدہ ایک سادہ کاغذ سے زیادہ باوقعت نہیں سمجھا جاتا، چنانچہ عبدالقادر کو زبان دے دینے کے باوجود بھی فرانس میں قید کر دیا گیا جہاں اس نے پانچ برس سخت محنت و مشقت میں بسر کئے، اور صدہا تکلیفیں اور اذیتیں سہنا پڑیں۔ اس کے بعد اس کو زندانِ بلا سے نجات

ملی اور بروصہ چلا گیا۔ چند سال [illegible] بسر کرنے کے بعد اس نے دمشق میں سکونت اختیار کر لی، اور
۱۸۸۳ء میں اس غدار دنیا کو خیر باد کیا۔ یہ اسلام کی فراخ حوصلگی کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ جس مذہب کے
اس کو خانہ برباد کر کے اس کے برادرانِ ملت پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑ رہے تھے، اس نے اُ
مذہب والوں کی ۱۸۶۰ء کے فسادِ دمشق میں انتہائی مدد کی، اور ہزاروں کو موت اور تباہی سے بچایا
یہ ہے عبرت ناک انجام اس ہر دل عزیز ہستی کا، جس کے اشارہ پر ہزاروں عرب اپنی جان قربان
کرنے کو تیار رہتے تھے، جس کے سینہ پر سینکڑوں بربر اپنا خون بہا دینے کو آمادہ تھے۔ یہ ہے حسرت ناک
اختتام اس جاں باز شخصیت کا، جس کی شجاعت و بسالت نے فرانسیسیوں کو ناکوں چنے چبا رکھے تھے
جس کے اولوالعزمانہ کارناموں سے زمانہ انگشت بدنداں تھا۔ آج اس کا وطنِ عزیز، جس کی خاطر اس
اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ جس کے لیئے اس نے زر، مال، جسم، جاں، کسی چیز کی پرواہ نہ کی، انھیں دشمنانِ
ملک وملت کے قدموں میں پامال ہو رہا ہے۔ آج اس کے برادرانِ وطن، جن کے ناموس کی حفاظت کے لیے
اس نے صدہا مصائب و شدائد کا سامنا کیا، اسی طرح غلامی اور اطاعت کی قابلِ نفریں زنجیروں میں
جکڑے ہوئے ہیں، لیکن مطیجہ کا دلیر جواں مرد حفظِ ناموسِ وطن کے لیئے قربان ہو چکا ہے۔ آج افریقہ کا بطل
اعظم ایشیا کی خاک کا پیوند ہے، الجزائر کا قومی ہیرو سرزمینِ شام کے ایک گوشہ میں مدفون ہے، مسقارا
کا بہادر شہسوار دمشق کی آغوش میں میٹھی نیند سو رہا ہے، ابدی شہرت حزن و اندوہ کی لوریوں سے تھپک
تھپک کر اسے سلا رہی ہے، اور دائمی عزت حسرت و یاس کے پھول برسا کر اس کی قبر پر فاتحہ پڑھ
رہی ہے۔

کسی سے

کبھی ہے گرمِ نوازش، کبھی خفا ہے تو
فضائے حسن میں اک پیکرِ ادا ہے تو

میں اور منکرِ ایفائے وعدۂ تسلیم
یہ کیسی وہم پرستی میں مبتلا ہے تو

نظامِ دہر الٹ دے گی تیری غمناکی
کہ ایک ٹوٹے ہوئے دل کا مدعا ہے تو

دلِ حزیں کو نہ دی فرصتِ خیالِ مآل
مزاجِ عشق سے کس درجہ آشنا ہے تو

مری سمجھ میں نہیں آتا یہ فریبِ وجود
مجھے بتا دے کہ میں کیا ہوں اور کیا ہے تو

مقیمِ جادۂ یک رنگیِ وفا ہوں میں
فریب خوردۂ نیرنگیِ جفا ہے تو!

ہر ایک ذرہ کو کر دے گی محو تیری کشش
کہ میری عمرِ دو روزہ کا ماجرا ہے تو

سکونِ قلب کی شیرازہ بندیاں بے سود
اگر یہ سچ ہے کہ مجھ سے ابھی خفا ہے تو

نہ کس طرح ہو مجھے جان سے زیادہ عزیز
کہ میری زندگیِ غم کا ایک صلہ ہے تو

جماعت اور نفسیات

از

ڈاکٹر سعادت اللہ خاں صاحب طالب علم بی اے مسلم یونیورسٹی)

انسان کے تمام دماغی اور نفسانی حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نفس انسانی کے ہر ہر مظہر اور ہر ہر شعبے میں تغیر پذیر کیفیاتِ نفسیہ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ احساسات، خیالات، جذبات اور ارادہ یہ چار قسم کی کیفیتیں دماغی حیات کی کُل کائنات ہیں۔ اِن کے علاوہ جو قویٰ ہیں وہ یا تو ان کے پیدا کردہ ہیں یا ان سے مِل جُل کر بنے ہیں۔ لیکن ان کیفیات کا ظہور صرف اُس وقت ہوتا ہے جب مخصوص ماحول اور مخصوص علتوں کے ماتحت دماغی قویٰ اپنا کام کرتے ہیں۔ یا یُوں سمجھیے کہ انسان کی قوتِ وقوفی اور حالاتِ شعوری ایک خارجی ماحول اور مخصوص مہیجاتِ بیرونی کی محتاج ہے۔ اسی طرح جذبات اور خیالات بھی اپنے وجود کے لیئے مخصوص حالاتِ خارجی کے محتاج ہیں۔ انھیں کیفیات سے انسان کے خیالاتِ نفسیہ کی تشکیل ہوتی ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کیا یہ تغیرات جو انسان کی ذہنی دنیا میں پیدا ہوتے ہیں محض اتفاقی حادثات کا مجموعہ ہیں یا بکھرے ہوئے اجزائے علت و معلول کی زنجیر میں منسلک ہیں"۔ فکر و غور اس نتیجے پر پہونچاتا ہے کہ یہ تغیرات چند قوانینِ نفسیہ کے تابع ہیں۔ احساسات، جذبات، خیالات اور ارادہ کے لیئے علٰحدہ علٰحدہ قوانین ہیں اور جس علم میں ان قوانین سے بحث کی جاتی ہے وہ علم النفس کہلاتا ہے۔

دیگر ممتاز خصوصیتوں میں جن کا جلوہ انسان میں نظر آتا ہے ایک یہ بھی ہے کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ میری زندگی کا صرف میرے ساتھ ہی تعلق نہیں۔ میں خود ایک ذات ہوں اور میرا وجود اپنی نوع کے دیگر افراد سے وابستہ ہے۔ ہم قومی، ہم ملکی، ہم وطنی۔ غرض اس قسم کے جتنے مشترک الفاظ جو انسان کے حالاتِ اجتماعی یا رشتۂ قومی کو ظاہر کرتے ہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی پر دال ہیں۔ ان دو زندگیوں میں بڑا فرق؟

زندگی سے یہاں مراد حالت خارجی نہیں بلکہ حالت ذہنی یا کیفیت شعوری ہے۔ انفرادی زندگی میں انسان کے قوائے ذہنی بمقابلہ اجتماعی زندگی کے بالکل مختلف اصول پر کام کرتے ہیں۔ انفرادی حالت میں انسان اپنے شخصی مفاد کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھتا ہے اور کبھی کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہیں ہوتا جو اس کی ذات کے لئے مضر یا غیر مفید ہو۔ اور ہر وہ چیز جس کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کی شخصی حالت پر نہ پڑتا ہو اس میں وہ مطلق دلچسپی نہیں لیتا اور یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتا ہے کہ "عالم پس مرگ ما چہ دریا چہ سراب" مگر اجتماعی زندگی میں اس کے شعور کی بالکل کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور گرد و پیش کے اثرات سے متاثر ہو کر اس سے اکثر ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ جو نہ صرف اس کی ذات کے لئے ہی بلکہ اس کے متعلقین کے لئے بھی نہایت مہلک اور برباد کن ثابت ہوتے ہیں۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جذبات، احساسات، خیالات اور ارادہ انسانی دماغ کی کل کائنات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر اجتماعی اور انفرادی حالت کا اثر صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ آئیے دیکھیں۔

جذبات:۔ انفرادی حالت میں بلاشبہ جذبات کی راہ میں عقل کی قیود اور پابندیاں حائل ہوتی ہیں۔ یہ قوت تمام نفسانی کیفیات کو حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ لیکن جوں ہی فرد فرد مل کر ایک گروہ یا جماعت بنی ان کی ذہنی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے۔ کیفیات ذہنی میں آزادی کا جزو غالب آجاتا ہے جس کا نتیجہ کئی سیاسی تحریکوں کی صورت میں معرض ظہور میں آتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ انسان کی قوت مدرکہ کمزور پڑ جاتی ہے۔ قوت ممیزہ لاپتہ ہو جاتی ہے۔ ایک کا خیال قانون تعدیہ کے زیر اثر آناً فاناً تمام گروہ کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور تمام سے ایک وقت میں ایک ہی جیسے حرکات و افعال سرزد ہونے لگتے ہیں میں ایک مثال بالافادہ مثال سے اس نقطہ کو زیادہ روشن کرنا چاہتا ہوں مثال کے طور پر یونین کلب کو لیجئے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ کسی خاص بحث پر مباحثہ شروع ہے طاق مباحثہ طلبہ سے بھرا پڑا ہے ایک مقرر آکر سامعین سے مخاطب ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے کہ ایک عجیب قسم کی آواز اٹھتی ہے اور فوراً ہی اس قسم کی آوازوں کا ایک دریا امنڈ پڑتا ہے بڑے بڑے سنجیدہ اور زیرک طالب علم کھڑے ہو کر شور مچا رہے ہیں۔ نہ ہو کہ تمام کو برا بھلا کہے جا رہی ہے۔ حقیقت یوں ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں سمجھ رہا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اس کی قوت تمیز و مدرکہ گروہ میں آتے ہی اسے جواب دے چکی ہے۔ ذرا سے خارجی اثر سے ان کے جذبات میں فوری ہیجان پیدا ہو جاتا ہے ایک کا خیال دوسرے تک اصول تعدیہ کی برقی رو سے چشم زدن میں تمام تک پہنچ جاتا ہے۔ حالت نیم شعوری Sub-consciousness طاری ہو جاتی ہے اور انسان کچھ دیر کے لئے مجموعہ عقل و ادراک کے بجائے جذبات کا بندہ ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ اسے اپنا ہوش نہیں اس سے جو کچھ بھی سرزد ہو خارج از قیاس نہیں۔

(باقی آئندہ)

میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

از جناب بدر جلالی

اے شوخ حجاب آرا ... اے حسن حیا پرور
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

افلاک کی گردش میں ... شاعر کی نظر بن کر
آفاق کی جنبش میں ... مجبورِ قدر بن کر
اسباب کی بندش میں ... بوئے گل تر بن کر
احوال کی کاوش میں ... تاثیرِ شرر بن کر
ذرات کی تابش میں ... ظلمت کی سحر بن کر
اجسام کی سازش میں ... ہنگامۂ شر بن کر
اجرام کی کاہش میں ... تقدیرِ قمر بن کر
خود تیری نوازش میں ... پتھر کا جگر بن کر
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

اے رُخ نقاب آرا ... اے نازِ وفا پرور
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

معمور صنم خانے ... آذر کا جنم لے کر
پُرشور وہ مے خانے ... رندوں کی قسم لے کر
چلتے ہوئے پیمانے ... ساقی کا کرم لے کر
تاریک سے بت خانے ... اک شمعِ حرم لے کر
خاموش یہ ویرانے ... ہنگامۂ غم لے کر
پھر دیر کے کاشانے ... تصویرِ صنم لے کر
دیکھیں ہیں بہت چھانے ... ہمت کے قدم لے کر
اے شوخ خدا جانے ... وحشت کا علم لے کر
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

اے برق ازل تاباں ... اے نورِ ابد پرور
میں نے تجھے ڈھونڈا ہے

لال لمپ کی روشنی

آتش دان کے قریب ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا رکھی تھیں۔ آگ تاپنے کے لئے ہاتھ آگے کو بڑھا دیئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ بار بار خود ہی یک لخت اپنا قطع کلام کر لیتا ہلکے ہلکے کھنکتا ہا... ہا... "یہ معلوم ہوتا۔ گویا اس دوران میں اپنے منتشر خیالات کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور پرانی یادوں کی صحت کے متعلق اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہے پھر اپنی تقریر شروع کر دیتا۔

پاس ہی جو میز رکھی تھی۔ کاغذوں۔ کتابوں اور طرح طرح کی چھوٹی موٹی چیزوں سے لدی ہوئی تھی لیمپ کی بتی نیچی کر رکھی تھی۔ آگ کی روشنی میں مجھے اس کے پیلے چہرے اور منحنی ہاتھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

قالین پر ایک بلی لیٹی خُرخُر کر رہی تھی۔ آتش دان میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر اوکھی وضع کے شعلے نکال رہی تھیں اور بس یہی آوازیں تھیں جن سے خاموشی ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اس انداز سے بول رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز کہیں دور سے آ رہی ہے۔ جیسے کوئی نیند میں باتیں کر رہا ہے

"ہا... ہا... یہ میری بہت بڑی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاتا۔ صبر کر لیتا۔ میری صحت غارت ہو جاتی... کچھ اور رہا تا رہتا... سبھی کچھ جاتا رہتا۔ برداشت کر لیتا۔ پر یہ نہ ہوتا! جس عورت سے محبت بندگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہو۔ اس کے ساتھ دس سال تک زندگی بسر کرنا اور اُسے دم توڑتے ہوئے دیکھنا۔ اور پھر زندگی سے نپٹنے کے لئے اکیلے... بالکل اکیلے رہ جانا... یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ چھ مہینے ہوئے کہ وہ مر گئی... معلوم ہوتا ہے مدتیں گزر گئی ہیں! اور پہلے دن کس قدر مختصر ہوا کرتے تھے... میں کہتا ہوں۔ کچھ عرصہ علیل ہی رہتی۔ کسی طرح مجھے یہی معلوم ہو جاتا۔ کہ کسی قسم کا خطرہ ہے... یوں کہنا بھلا تو نہیں معلوم ہوتا لیکن پہلے سے علم ہو جاتا ہے تو انسان برداشت کے لئے آمادہ سا رہتا ہے۔ ہے نہ؟... جو کچھ پیش آنے والا ہوتا ہے۔ دل اسی کے مطابق اپنے آپ کو تیار کر لیتا ہے... اس خیال سے مانوس سا ہو جاتا ہے... لیکن یہاں تو..."

میں نے کہا "مگر مجھے تو کچھ ایسا خیال ہے۔ کہ تمھاری اہلیہ کچھ عرصہ بیمار رہی تھیں"۔

اس نے اپنا سر ہلایا۔

"نہیں نہیں بیمار کہاں رہی... سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ ڈاکٹر اتنا بھی نہ معلوم کر سکے۔ کہ شکایت کیا ہے۔ سب کچھ دو ہی روز میں ہو کر قصّہ تمام ہو گیا۔ اسی وقت سے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آخر کیوں اور کس طرح جی جا رہا ہوں۔ سارا دن گھر میں اِدھر سے اُدھر اس تلاش میں پھرتا رہتا ہوں کہ کوئی اس کی یادگار مل جائے جسے نہیں پا سکتا۔ یہ سمجھتا ہوں کہ وہ یکایک کسی پردے کے پیچھے سے نکل کر میرے پاس آ جائے گی۔ ویران کمرے میں اسی کی خوشبو کا ایک جھونکا میرے لئے آ نکلے گا..."

اس نے اپنا ہاتھ میز کی طرف بڑھایا۔

"کل مجھے یہ ملا... یہ نقاب میرے ایک کوٹ کی جیب میں تھا۔ ایک روز رات کو تھیٹر گئے تھے۔ وہاں اس نے اتار کر میرے پاس رکھوا دیا تھا۔ اب اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس میں اب تک اس کی خوشبو موجود ہے اس کے چہرے کے مس سے یہ اب تک گرم ہے... لیکن کہاں! کچھ نہیں رہا... بس ایک غم ہے... پر کچھ اور بھی ہے۔ اتنی بات ہے کہ... کہ...

"صدمہ کی پہلی یورش میں انسان کو طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں۔ تمہیں یقین نہ آئے گا کہ جب وہ بسترِ مرگ پر پڑی تھی تو میں نے اس کی تصویر اتاری تھی۔ میں سفید اور خاموش کمرے میں اپنا کیمرا لے گیا اور میگنیشیم کا تار روشن کر دیا۔ غم سے بے حد نڈھال تھا۔ پر میں نے بے انتہا احتیاط اور توجہ سے وہ باتیں کیں جن سے آج شاید میں احتراز کروں۔ ایسی باتیں جن سے طبیعت قطعی گریز کرے... تاہم اس خیال سے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ اس کے نقش موجود ہیں۔ آخری روز وہ جس طرح نظر آ رہی تھی۔ اسی طرح میں اسے پھر دیکھ تو سکتا ہوں"۔

میں نے پوچھا "وہ تصویر کہاں ہے؟"

آگے کو جھک کر اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میرے پاس نہیں ہے۔ یا یوں سمجھ لو کہ ہے... میرے پاس پلیٹ ہے۔ میں نے اسے ڈیولپ نہیں کیا۔ ابھی تک کیمرے ہی میں ہے... چھونے کا حوصلہ نہیں پڑا... لیکن اسے دیکھنے کو کتنا بے تاب ہو رہا ہوں"۔

اس نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا۔

"سنو... آج رات... تمھارا ملنے کو آنا... پھر جس طریقے سے میں اس کے متعلق گفتگو کرتا رہا... معلوم ہوتا ہے اس سے میری حالت بہتر ہو گئی ہے۔ جیسے مجھ میں پھر توانائی سی آ گئی ہے... اب تم میں نے کہا ڈارک روم میں چلو گے میرے ساتھ؟ پلیٹ ڈیویلپ کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے؟"

وہ ایسی پُر اشتیاق اور منتظر نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ جیسے بچہ ہے۔ اور اس امید و بیم میں ہو کہ جس چیز کو طلب کر رہا ہے کہیں اس کے دینے سے انکار نہ کر دیا جائے۔

میں نے کہا "ضرور شوق سے"۔

وہ جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں... تمھارا ساتھ ہونا کچھ اور بات ہوگی... تم ساتھ ہوگے تو میں سنبھلا رہوں گا... میرے لئے اچھا ہوگا۔ بہت زیادہ خوش ہوں گا... تم دیکھ لینا"

ہم ڈارک روم میں چلے گئے۔ ننھا سا کمرہ تھا۔ جس کی الماریوں میں بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ میز تھی شیشہ و آلات اور کتابوں سے لدی ہوئی تھی۔

ایک شمع نے کہ جس سے کانپتی ہوئی روشنی نکل رہی تھی وہ خاموشی کے عالم میں بوتلوں کی چٹوں پر سے ان کا نام پڑھتا رہا۔ اور بعض ظروف کو صاف کرنے میں مصروف رہا۔

"دروازہ بند کر دو"

یہ تاریکی جسے صرف لال روشنی زائل کر رہی تھی۔ ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے اہم واقعات کی خزینہ دار ہے۔ انوکھے عکس بوتلوں کے پہلوؤں پر اس کے مرجھائے ہوئے رخساروں پر۔ بیٹھی ہوئی کنپٹیوں پر پڑتے نظر آ رہے تھے۔

وہ بولا:

"دروازہ اچھی طرح بند ہے نہ؟ تو اب شروع کرتا ہوں"۔

اس نے ایک سیاہ سلائیڈ کھولی اور اس میں سے پلیٹ نکال لی۔ اسے انگوٹھے اور انگلیوں میں کونوں پر سے باحتیاط تھام کر دیر تک بڑے غور سے تکتا رہا۔ جیسے اس مخفی تصویر کو جو بہت جلد ظاہر ہونے والی تھی پہلے سے

ت بجتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مجھے سنائی دے رہا تھا کہ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ کچھ اس طرح دھڑک
ہے کہ کبھی اس کا جسم آگے کو اور کبھی پیچھے کو جھک جاتا ہے۔
میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خوفناک کرب کی کیا ممکن وجہ ہوسکتی ہے۔
نے دوبارہ چلاکر کہا:
"پر ہے کیا؟ بتاؤ تو۔ کیا بات ہے؟"
اس نے چہرہ میری طرف پھرایا۔ یوں لٹک سا گیا تھا کہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ انسانی چہرہ ہے۔ اس کی لال انگارہ
آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں۔ میری کلائی کو اس زور سے پکڑ لیا کہ ناخن میرے گوشت میں پیوست ہو گئے۔
تین بار منہ کھولا۔ کچھ بولنا چاہا۔ پھر تصویر کو اپنے سر پر گھمایا اور اس خوف آلود اندھیرے میں چیخ چیخ کر کہنے لگا:
"بات!... بات!... خداوندا... میں نے اسے مار ڈالا... وہ مری نہ تھی... آنکھیں ہل گئی ہیں..."

(موسیو لیول) سید امتیاز علی تاج

مقولات

(۱)۔ ہر شخص اپنے جی میں اپنے تئیں دنیا کا سب سے بڑا عقلمند اور سب سے بڑا مظلوم سمجھتا ہے۔
(۲)۔ احسان جو جتایا جائے وہ زائل ہو جاتا ہے۔ جو نہ جتایا جائے۔ اس کا بدلہ احسان سے بھی نہیں ا جا سکتا۔
(۳) نیکی میں سچا حسن اور سچی محبت دونوں بیک وقت جلوہ پاش ہوتے ہیں۔
(۴) محبت وہی ہے جو خیر و ایثار کا راستہ دکھائے۔

(ہمایوں، لاہور)

استعداد دل

(۱)

خاک میں یا تو خاک ہوتا ہے / تخم کے یا اور پاک ہوتا ہے
گر نہ پژمردہ ہو یہ غنچۂ دل / ایک دن سینہ چاک ہوتا ہے

(۲)

زیست ہے سلسلہ منازل کا / دور سمجھا ہے تو جسے گُل کا
ہفت خواں ایک کیا ہزاروں ہیں / اور بلا کا ہے حوصلہ دل کا

(۳)

دانہ جو پھوٹ کر شجر نہ ہوا / اپنی وسعت سے باخبر نہ ہوا
موجِ دریا نگل گئی جس کو / وہی قطرہ امیںؔ گہر نہ ہوا

(۴)

بیج بے جان ہو خدا نہ کرے / بیج ہی سے تو ہیں درخت ہرے
زندگی۔ دل کی زندگی ہے امیںؔ / دل کسی کا خدا کرے نہ مرے

(۵)

تو سمجھتا ہے ماء و طیں دل کو / ماء و طیں سے غرض نہیں دل کو
دل سے گر دل کا کام لینا ہے / چین لینے نہ دے امیںؔ دل کو

---

(۶)

گل نہیں دل یہ شمع محفل ہے　　مزرعِ زندگی کا حاصل ہے
جس نے انساں بنا دیا ہم کو　　وہ جنابِ امینؔ! یہی دل ہے

(۷)

جب یہ عشرت پرست ہوتا ہے　　حوصلہ دل کا پست ہوتا ہے
کام لے دل سے بے دریغ کہ دل　　کام سے چیرہ دست ہوتا ہے

(۸)

دل سے بیگانگی نہیں اچھی　　ایسی دیوانگی نہیں اچھی
جس سے مر جائے دل امینِؔ حزیں　　گو ہو فرزانگی نہیں اچھی

(۹)

تن بہ تقدیر دل جو ہوتے ہیں　　جاگتے کب ہیں؟ وہ تو سوتے ہیں
تم کو اتنا بھی کیا نہیں معلوم؟　　کاٹتے ہیں وہی جو بوتے ہیں

(۱۰)

کیوں مجھے ہو خیال پست پسند　　زندگی دل کے ہے خیال بلند
دل کو یزداں شکار کہتے ہیں　　ایسی ویسی امینؔ نہیں یہ کمند

امینؔ حزیں

سیدنا خضر علیہ السّلام

از جناب حکیم شبیر احمد صاحب صدیقی امروہوی

مسلمانوں میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس برگزیدہ ہستی سے وقوف نہ رکھتے ہوں۔ خواص کا تو ذکر کیا ہے۔ عوام بلکہ جہّال بھی کسی نہ کسی مرتبہ میں آپ کے نام نامی و اسم گرامی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ سب سے پہلے مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی بالقابہ صدر الصدور امور مذہبی گورنمنٹ نظام کے اس مضمون کا خلاصہ درج کرتا ہوں جو ممدوح نے بست سال قبل۔ رسالہ الندوہ جلد ۴ نمبر ۲ و ۴ مطبوعہ آسی پریس لکھنؤ بابت ماہ صفر و ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ میں شائع کیا تھا۔ آپ نے اپنی تحقیقات کا ماحصل یہ تحریر فرمایا ہے۔ کہ

(۱) ملاقات حضرت سیدنا موسیٰؑ و حضرت سیدنا خضرؑ کا واقعہ نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔

(۲) اُن کی نبوّت بقول اصح محقق ہے۔

(۳) ذوالقرنین کی وفات و آب حیات کا ذکر ضعیف روایتوں میں ہیں۔

(۴) درازی عمر میں بہت بحث ہے اس کی مؤید روایات اکثر ضعیف و مشکوک ہیں۔

محققین (جن کے سرگروہ حضرت امام علی رضا و امام بخاریؒ) ہیں ان کی وفات کے قائل ہیں۔ نیز ان کی حیات جاوید بقول ابن منادی خلاف نصِ قرآنی ہے۔

امام ابوالقاسم قشیریؒ نے ایک گروہ اہل باطن کا یہ قول لکھا ہے کہ "ہر زمانہ کے لئے ایک خضر ہوتے ہیں جب وہ وفات پا جاتے ہیں دوسرے اُن کی جگہ ہو جاتے ہیں۔" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممدوح نے اس مسئلہ میں کچھ تحقیقات فرمائی وہ بقول خود محققانہ تحقیق ہے۔ محدثانہ تحقیق کو جناب نے خشک و روکھا ہونا لازم قرار دیا ہے۔ مجھے ممدوح کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ نہ اُس طول طویل مضمون سے کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اگر تحقیقات محدثانہ تھی تو نتیجہ بھی اخذ فرما کر خواہ موافق ہوتا یا مخالف شائع فرما دیتے۔ ورنہ اس بحث کے اٹھانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ آپ کی تحقیقات کا ماخذ زیادہ تر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی تصانیف ہیں۔ اور

امام موصوف حیات خضر علیہ السلام کے قائلین میں سے ہیں۔ ایک مقام پر رقم فرماتے ہیں کہ بعض اکابر علماء کا قول ہے کہ زندگی کی بنیاد پر یہی چوٹ حضرت خضر علیہ السّلام کی نبوت کا اعتقاد ہے۔ کیوں کہ زنادقہ ان کی ولایت سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ولی پیغمبر سے افضل ہے۔ چنانچہ ایک قول نقل کیا ہے۔ وھو ھذا۔

مقام النبوّۃ فی برزخ

فوق الرسول ودون الولی

یعنی برزخ میں مقام نبوت رسالت سے اوپر اور ولایت سے نیچے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک قول میں بھی نقل کرتا ہوں "الولایت افضل مِن النبوت" یعنی ولایت نبوت سے افضل ہے۔ اس میں طویل بحث ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس ولایت کو نبوت سے افضل کہا گیا ہے وہ مخصوص با نبیاء علیہم السلام ہے۔ نہ کہ عام اولیاء کی ولایت۔ اور یہ ولایت بجز نبی کریم حضور احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صَلی اللہ عَلیہِ وسلم کسی دوسرے نبی کو حاصل نہ تھی پس ایسی صورت میں اس کے قائلین زندیق نہیں کہلائے جا سکتے۔ بلکہ زندیق کہنے والا خود بفحوائے "کل اناء یترشح بما فیہ وسباب المعلم فسوق وقتالہ کفر" کا مصداق ہوگا۔ اس باب میں اقوال علماء ومحدثین وشرح عقائد نسفی وفقہ اکبر سب کے سب راقم کے پیش نظر ہیں جیسا کہ ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں "فما نقل عن بعض الکرامیۃ من جواز کون الولی افضل من النبی کفر وضلالہ والحاد وجہالت وغیرہ وغیرہ

پس اس طویل بحث کو آئندہ کے لئے چھوڑتا ہوں۔ یہاں مجھے صرف اس مبحث پر عرض کرنا ہے۔

درازی عمر حضرت خضر علیہ السَّلام کے متعلق سات روایتیں نقل فرماتے ہوئے اس پر جرح وتعدیل کی گئی ہے اس کے بعد امام نوویؒ اور دیگر علماء کے اقوال نقل فرمائے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ عقیدۂ حیات یا ممات خضر (علیہ السلام) عقاید اسلامی میں داخل نہیں۔ اگر وہ زندہ ہیں یا موت واقع ہو چکی یا ہر زمانے کے خضر جدا ہوتے ہیں۔ ان سب امور سے اسلام یا عقائد اسلام پر کوئی موافق یا مخالف اثر نہیں پڑتا۔ آگے چل کر اٹھارہ روایات وہ نقل کی ہیں جن کو علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اس باب میں جمع کیا ہے۔ زاں بعد انتالیس روایتیں مزید درج نقشہ فرما کر مجموعی روایات کی تعداد ستاون تک پہنچا دی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق ابن جوزیؒ و دیگر علماء کی جرح نقل کی ہے۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ جس قدر

وایات حیات خضر اسرائیلی کے متعلق ہیں سب یا بعض یا اکثر ضعیف ہیں یا ان کے راوی مجہول۔ کذاب۔ متروک
ہر معلوم یا متہم ہیں۔

ایک موقعہ پر علمائے اہل حدیث کا یہ قول نقل کیا ہے کہ خضرؑ نے ہمارے نبی صلعم سے نہ خود ملاقات کی
بذریعہ ایلچی گفتگو کی۔ اگر زندہ ہوتے تو آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے الگ الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور
ہجرت ان پر واجب ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ ممدوح نے اس بارہ میں کوئی مستقل رائے ظاہر نہیں فرمائی بلکہ اقوال علماء و محدثین کو یکجا
مع کر دیا ہے۔ اور خود بھی اس کے ضعیف و مضحکہ خیز ہونے کا خیال نہیں فرمایا مثلاً فرماتے ہیں کہ " ان پر ہجرت واجب
ہوتی"۔ جو لوگ حیات خضر اسرائیلی کے قائل ہیں انھوں نے اس کو واضح کر دیا ہے کہ آپ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں کسی
جگہ مستقل قیام نہیں فرماتے۔ تبدیل ہیئت و حلیہ کی قدرت جناب باری نے انھیں عطا فرمائی ہے۔

چنانچہ ایک روایت سے " خواہ وہ کسی درجہ اور مرتبہ کی کیوں نہ ہو" یہ ثابت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا قیام مدینہ
منورہ میں رہا۔ اور بیمار ہوئے۔ جنگ (مار پیٹ) میں زخم بھی آیا۔

ایک دوسری روایت نقل فرماتے ہیں کہ " اگر ان کا وجود زمانہ نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم میں ہوتا تو فہرست صحابہؓ
میں ان کا نام بھی ضرور رہتا۔ عام جہادوں بالخصوص جنگ بدر میں ضرور شرکت فرماتے۔ نماز جمعہ اور جماعت میں
ضرور شریک ہوتے" وغیرہ۔

حقیقت میں اگر وہ نبی ہیں جیسا کہ مولانا نے بروئے نص قرآنی خود فیصلہ کر دیا ہے تو صحابہؓ کی فہرست میں کیونکر
داخل ہوتے۔ اُن کا شمار تو انبیاء علیہم السلام میں ہونا چاہئے۔ علیٰ ہذا القیاس جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کا ارشاد گرامی ہے کہ اگر حضرت (سیدنا) موسیٰ علیہ السلام میرے زمانہ میں ہوتے تو میرا اتباع کرتے۔ یا حضرت عیسےٰ
علی نبینا وعلیہ السلام اتباع محمدی فرمائیں گے۔ اس کے متعلق روایات موجود ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام متبع شریعت
محمدی ہیں۔ بلکہ بعض کا بیان تو یہ ہے کہ شافعی مذہب پر ہم نے انھیں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ ایک موقعہ پر جہاں
مولانا نے عنوان نبوت قایم فرمایا ہے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ " نبوت تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہہ سکتے ہیں کہ رسول اولوالعزم
حضرت موسیٰ، نبی کے تابع کس طرح ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ اولوالعزم رسول کا درجہ نبی سے افضل و فائق ہے

[illegible] کا درجہ غیر نبی سے افضل ہے"

یہاں میں یہ اضافہ کروں گا کہ ایسا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد رسالت عطا ہوئی ہو اور اُس [illegible]
دونوں زمرۂ انبیا میں شمار ہوتے ہوں۔

نیز جب یہ مسلم ہے کہ اولیاء تو کیا انبیاء علیہم السلام بھی عالم الغیب نہیں تو بہت ممکن ہے کہ اس خاص واقعہ کی حقیقت وکنہ کا علم حضرت خضر علیہ السلام کو عطا ہوا ہو۔ اور حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو عطا نہ ہوا ہو جس کی شہادت وتصدیق قرآن پاک کی ان آیۂ شریفہ سے ہوتی ہے جن کے تحت مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے وعظ فرمایا اُس وقت کسی نے سوال کیا کہ سب سے بڑا عالم کون ہے جس کے جواب میں فرمایا کہ "میں" چوں کہ آپ نبی اولوالعزم تھے اس لئے آپ کا فرمانا بالکل بجا تھا لیکن چوں کہ ظاہراً لفظ مطلق تھا اس لئے خداوند عالم کو منظور ہوا کہ آپ کو احتیاط فی العلم کی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ خضر علیہ السلام سے ملاقات کا حکم دیا گیا بسلسلہ ملاقات وگفتگو حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہو گیا کہ مجھ سے زاید علم والا انسان دوسرا بھی موجود ہے۔

ملاحظہ ہو سورہ کہف رکوع ۹ پارہ ۱۵ وَاِذْ قَالَ مُوسٰى لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ تا اخر سورت وَلَا یُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا۔

حضرت مولانائے رومؒ نے کیا اچھا فیصلہ فرمایا ہے۔ دفتر سوم قصہ دقوقی میں فرماتے ہیں۔

آہ سوئے ہست ایں جا لبس نہاں
کہ سوئے خضرے شود موسیٰ دواں

پس اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضرت خضر علیہ السلام کا تفوق ثابت نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ مولانا کی تحقیق کا ماحصل ہے جسے ممدوح نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ ۲۹ صفحات پر رقم فرمایا ہے اور یہ ۴۸ صفحات علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی عربی کتاب کا خلاصہ یا اقتباس ہے۔

[نا]م ونسب

علامہ کرمانیؒ شرح صحیح بخاری میں رقم فرماتے ہیں کہ خَضِر "بفتح خا وکسر ضاد وسکون را" جو عربی [میں م]ستعمل ہے۔ اور خِضْر بکسر خا وسکون ضاد ورا (جو فارسی میں زیادہ فصیح مانا گیا ہے) ان کا نام بلیا بن ملکان بن [فال]غ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن سام بن حضرت سیدنا نوح علیہ السلام ہے۔ اس کی تائید نہایت لا بن

اثیرالجزری سے بھی ہوتی ہے۔ امام نودیؒ شرح مسلم میں تحریر فرماتے ہیں کہ بلیا بفتح با وسکون لام یائے تحتیہ ان کے والد کا نام ملکان بفتح میم وسکون لام، تھا۔ اور بعض کلیان کہتے ہیں۔ معارف بن ابی قتیبہ بھی علامہ کرمانی کے موئد ہیں لیکن غلسم الجواہر میں آپ کا نام الیسع۔ الیاس۔ عامر۔ خضرون۔ ارمیا تحریر کرتے ہیں۔

حضرت شیخ الاکبر رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں منقول ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کا نام خضر ہی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کا نام ادریا بن حلفیا رتھا۔ قول اول کی تائید طبری بھی کرتے ہیں۔ بعض علمار نے بلیا بن ملکان تا آخر نسب مذکورۂ بالا رکھا ہے۔ علامہ میبذی فواتح میں جامع الاصول ابن اثیر سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آپ کا نام بلیا بن ملکان تھا بعض کلیان بن ملکان لکھتے ہیں۔ حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ اپنی کتاب عروۃ الوثقیٰ باب ششم فصل چہارم میں لکھتے ہیں کہ آپ کا نام ملکان بن ملیان بن طیبان بن سمعان بن سام بن حضرت نوح علیہ السلام ہے۔ تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔ اور یہ تواریخ سے ثابت ہے۔ اور نیز آں حضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے۔ کہ آپ کا نام بلیان بن ملکان ہے۔ بعض علمار اس طرف گئے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام کے دادا حضرت الیاس علیہ السلام کے چچا تھے۔ صاحب اقتباس الانوار نے جہاں آپ کا حال لکھا ہے۔ وہاں حضرت علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کو اختیار کیا ہے۔ مگر کثرت سے علما، صاحب معالم التنزیل کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آپ شاہزادے ہیں اور اُن بادشاہوں کی اولاد سے ہیں جنھوں نے دنیا میں زہد اختیار کیا تھا اور ان کا لقب خضر تھا۔

وجہ تسمیہ صاحب معالم التنزیل خضرؑ کی وجہ تسمیہ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ خضر کو اس لئے خضر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ سفید پتھر پر بیٹھے تو فوراً اس کے نیچے سبزہ اُگ آیا۔

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت خضرؑ جہاں نماز میں مشغول ہوتے تو سجدہ کی جگہ اور چٹائی کے کنارے سبزہ جم جاتا۔

مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی حدیث کا ترجمہ ان الفاظ میں بحوالۂ روایت مجن فرماتے ہیں "چٹیل زمین ان کی نشست کی برکت سے لہلہانے لگتی تھی۔" امام نودیؒ نے شرح مسلم شریف میں انہی دونوں

دیعنی المباہی اور روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ترجیح دی ہو۔ اور اسی کو صحیح بتلایا ہے۔ ملا علی قاری بھی اپنے رسالہ الکشف الحذر عن امر الخضر میں ان روایات کو نقل فرمایا ہی۔

حدیث شریف یہ ہی۔ "انما سمی خضر لانہ جلس علی فروۃ بیضاء فاذا ھی تھتز تحتہ خضراء رواہ البخاری" ملا علی قاری و امام نوویؒ نے فروہ کے معنی وجہ الارض کے لئے ہیں اور منتخب اللغات میں کہ فروہ علف خشک کو کہتے ہیں۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہی کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضرؑ کو د پرسبز بستر پر بیٹھے ہوئے پایا۔ مگر یہ اس لئے صحیح نہیں کہ قبل از ملاقات بھی آپ کا نام خضر تھا۔ لیکن کنیت بالا تفا تمام علماء و محدثین نے ابوالعباس لکھی ہی۔

وطن | جس طرح آپ کے نام میں اختلاف ہی۔ اسی طرح آپ کے وطن میں بھی اختلاف ہی۔ عبداللہ بن شوذ فرماتے ہیں کہ آپ کا وطن اور جائے پیدائش فارس ہی۔ حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانیؒ فرماتے ہیں کہ آپ کی پیدائش ایک گاؤں میں ہوئی جو شیراز سے دو یا تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ باقی آئندہ

مقولات

(۱) وہ قوم جو غیر قوموں کی حکومت کو اپنی دائمی ترقی کا ذمہ دار بنا لے دائمی غلامی کے لائق ہی۔

(۲) اصل دنیا وہ ہے جو انسان کے دل کے اندر آباد ہی۔ بیرونی دنیا کی سب رنگینیاں اور لطافتیں گویا اسی اندرونی دنیا کا عکس ہیں۔

(۳)۔ سچا کمال یہ نہیں ہے کہ انسان کبھی لغزش نہ کرے بلکہ یہ کہ ہر لغزش میں گر گر کر سنبھلے۔

(ہمایوں لاہور)

روحِ حیات

(محمد یوسف قیصر اڈیٹر رسالہ ظل السلطان بھوپال)

مبتلا ہے ظلمتِ امروز میں روحِ حیات — کیا شبِ دوشینہ کے پیشِ نظر ہوں واقعات

یاد ہے کچھ، جانتی تھی تجھکو دنیا بت شکن — آج ذرّہ ذرّہ تیرے دل کا ہے اک سومنات

ہوگئی خوابیدہ اب وہ بربطِ شیریں نوا — جس کے ہر اک تار کی لرزش سے پیدا تھی حیات

بجھ گئی وہ روشنی جو رہنما منزل کی تھی — "شاخِ آہو" پر تمناؤں کی ہے اب تو "برات"

سعیِ لاحاصل نے ناکامِ تمنا کر دیا — ہوگئیں مصروفِ باطل تیرے دل کی واردات

ہو رہی تھی ایک عالم پر مسلط خوابِ مرگ — تجھ سے چھینی جا رہی تھیں جب کہ تیری حسیات

منسلک اجزائے عالم ایک ہی رشتہ میں تھے — آج وہ شیرازہ ہے لشکستۂ ذات و صفات

لیکن اب بھی مرتعش ہے تار نغموں کے لئے — منتظر نورِ سحر کی اب بھی ہے ظلمت کی رات

دیدۂ ہستی ہے خواہاں اس فضا کا آج بھی — جس سے بیداری کی پیدا ہوں جہاں میں کیفیات

اب بھی دنیا زندگی کے واسطے تیار ہے — ہو مگر اس کے لئے پیدا نگاہِ التفات

تو کہ اک خورشیدِ تاباں ہے زمانہ کے لئے
اُٹھ! اور اپنے نور سے معمور کر دے کائنات

منیر شکوہ آبادی

(از جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے لکچرار اردو، انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ)

دہلی اُجڑ کر لکھنؤ اور لکھنؤ برباد ہو کر رام پور آباد ہوا اور اس شان سے آباد ہوا کہ حقیقۃً دیکھنے والوں کو رام پور صحیح معنوں میں دارالسرور نظر آنے لگا۔ رام پور کے عالی حوصلہ اور مردم شناس رئیس نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کی کشش نے دُور دُور سے ہر فن کے کاملین کو اپنی ریاست میں کھینچ بلایا اور اپنی قدردانی سے اُن کے زخموں پر مرہم رکھا۔ اللہ اکبر کیا زمانہ ہوگا جب کہ دہلی اور لکھنؤ کی خزاں کے بعد بلبلانِ خوش نوا نے گلزارِ بہارِ رام پور کو اپنا نشیمن بنایا ہوگا اور وہاں کی فضا میں اطمینان کے ساتھ نغمہ سنجیاں شروع کی ہوں گی۔ ایک طرف زمرہ علماء میں مولانا عبدالحق، مفتی سعد اللہ، مولوی مسیح الدین، مولوی سدید الدین، مولانا ریاض الدین، مولوی عبدالعلی، مولوی عالم علی، مولوی حسن شاہ، مولانا ظہورالحق جیسے اساطین فضل و کمال رشد و ہدایت کے دریا بہا رہے ہیں۔ دوسری طرف طبقۂ شعرا میں اسیر۔ امیر، بحر، منیر، عروج، داغ، جلال، حیا، تسلیم شاغل، صبا، خواجہ، بشیر، بدر، شادان، غمین، غنی، نثار شیرازی، منصور، جان صاحب جیسے اساتذہ شعر و سخن اپنی رنگین نوائیوں سے دلوں کو لبھا رہے ہیں۔ علما و شعرا ہی پر کیا موقوف ہے ہر فن کے ماہر دربار کی فیاضیوں اور قدرشناسیوں سے سمٹ سمٹا کر رام پور میں جمع ہو گئے تھے۔ طبیب، حافظ، خطاط، شاطر، مطرب غرض کون تھا جو اُس خوان کرم سے زلہ ربا نہ تھا۔ قصہ مختصر اُس عہد کے رام پور پر ماموں رشید کے بغداد یا شاہجہاں کی دہلی یا اکبر کے آگرہ کا دھوکا ہوتا تو بے جا نہ تھا۔ لیکن آسمان کی ایک ہی گردش میں نہ وہ محفل رہی نہ میر محفل ؎

تِلْكَ الْقُرُوْنُ مَضَتْ هِيَ وَاَهْلُهَا
فَكَاَنَّهَا وَكَاَنَّهُمْ اَحْلَامٗ

اب بھی اگرچہ ریاست کی قدردانیاں اُسی پیمانہ پر ہیں مگر اہل کمال کا وہ مجمع نظر نہیں آتا۔ ہماری خواہش ہے کہ ان

باکمالوں میں جو ہستیاں اپنے دور میں علم و ادب کے اوج پر آفتاب بن کر چمک رہی تھیں اور اب حضیض گمنامی میں پڑی ہیں
ان کو اور اُن کے کارناموں کو وقتاً فوقتاً ملک کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ خلف کو سلف کے معیار فضل و کمال کا اندازہ ہوسکے
آج کی صحبت میں ہم چاہتے ہیں کہ منیرؔ شکوہ آبادی اور اُن کے کلام کی نسبت اظہار خیال کریں۔

حالات منیر کے سوانح حیات جیسا کہ مختلف تذکروں اور رسالوں سے مستفاد ہوتا ہے مفصل نہیں ملتے۔ تاہم جس قدر ہم اخذ
کرسکے ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔ یہ امر البتہ اطمینان بخش ہے کہ خود منیر نے اپنے کلیات میں جستہ جستہ واقعات اور قطعات تاریخ
دیے ہیں جن سے اُن کے حیات پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ان سے بھی اس مختصر مضمون میں جا بجا مدد لی گئی ہے۔

اُن کا نام اسمٰعیل حسین تھا تخلص منیرؔ۔ والد سید احمد حسین شادؔ شاگرد سوداؔ۔ سلسلہ نسب حضرت امام علی نقی
سلام اللہ علیٰ آبائہ وعلیہ تک منتہی ہوتا ہے۔ انھوں نے مثنوی معراج المضامین میں جہاں باری تعالیٰ کے بہت سے احسانات
گنائے ہیں وہاں اپنے نام و نسب کا ذکر بھی کمال فخر و مسرت کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بڑھائی اور ذاتوں سے مری ذات — کیا مجھ کو شریک قوم سادات
مقدم پایۂ تفضیل رکھا — اسی سے نام اسمٰعیل رکھا

ان کا خاندان علمی فضیلت اور دنیوی وجاہت کو لیے ہوئے عرصہ سے شکوہ آباد ضلع مین پوری میں سکونت پذیر تھا کہ
سنہ ۱۲۳۳ھ میں منیرؔ کتم عدم سے عالم وجود میں آئے۔ دیکھنے والے بیان کرتے ہیں اور تذکروں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ
آدمی قبول صورت تھے۔ مثنوی میں خود بھی در پردہ اس امتیاز پر ناز کرتے ہیں ؎

بچایا زشتیٔ صورت سے مجکو — کیا آراستہ صحت سے مجکو

ابتدائی حالات کی تفصیل نہیں ملتی۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ نہ صرف عربی و فارسی کے منتہی تھے بلکہ سنسکرت اور بھاشا میں بھی
کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ منیرؔ نے درسیات کی تکمیل اپنے سوتیلے بھائی سے کی جو اپنے زمانہ کے زبردست
عالم تھے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ خاندان کے علمی ماحول کا اُن پر اچھا اثر پڑا۔ اُن کے والد بھی صاحب علم اور بڑے
استاد کے شاگرد تھے۔ اُس پر خود منیرؔ کی فطری ذکاوت اور جودت اور شاعری سے لگاؤ نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔
غرض یہ اسباب تھے جن سے اُن کے استعداد فطری کو بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ ادبی شوق نے آگرہ پہنچایا اور
وہاں سے لکھنؤ جانے کی تقریب نکل آئی۔ اُس زمانہ کا لکھنؤ آج کل کا سا لکھنؤ نہ تھا۔ ہر طرف خوش حالی اور فارغ البالی

کا دور دورہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر رعایا تک نشۂ عیش میں سرشار تھے۔ ہر گلی کوچے میں شعر و سخن کے چ
تھے۔ منیر نے شیخ امام بخش ناسخ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ ناسخ ان کے زور طبیعت کو دیکھکر بہت محظوظ ہوئے اور
ہے کہ وہ منیر کو اپنا مایہ ناز شاگرد سمجھتے تھے۔ جب ناسخ نے لکھنؤ چھوڑا تو منیر نے سید علی اوسط رشک شاگرد ناسخ کا
اختیار کیا اور جب تک وہ کربلائے معلیٰ کو ہجرت نہ کر گئے اُن کو اپنا کلام دکھاتے رہے اور وہ بھی ناسخ کی طرح اا
حال پر شفقت کرتے رہے۔ منیر کو اپنے اساتذہ کی خدمت میں جو عقیدت تھی اُس کا اظہار اپنے اشعار میں جا بجا کر
ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرط ارادت سے بے خود ہوئے جاتے ہیں ؎

اے منیر آج تک اُردو کے سخندانوں میں — شیخ ناسخ سے نہ بڑھکر کوئی اُستاد آیا

ناسخ و رشک کا یہ نور افادت ہے منیر — تا ابد نام زمانہ میں ہے روشن اُن کا

حضرت رشک کے بھی لینگے قدم چل کے منیر — کربلا میں کئی رتبے ہیں میسر ہونا

شاگرد حضرت علی اوسط ہوا ے منیر — خیر الامور اوسطہا پر نظر رہے

اُن کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ وہ سلام وغیرہ میں مرزا دبیر سے اصلاح لیتے تھے مگر میرے نزدیک یہ تحقیق
محل نظر ہے۔

زمانہ کی شکایت کرنا سنت الشعرا ہے۔ مگر یہ فال بد کچھ ایسے وقت زبان سے نکل کہ رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہو
کہ شعرا کو اکثر گردش زمانہ کے ہاتھوں پریشان ہی دیکھا۔ منیر اس کلیہ سے کیوں کر بچتے۔ اُن کا بیشتر حصہ عمر معاش کی طرا
سے بے اطمینانی ہی میں گزرا۔ اگرچہ مختلف روسا وقتاً فوقتاً اُن کی قدر دانی کرتے اور اعزاز و انعام تعظیم و اکرام سے
پیش آتے مگر تقدیر نے ایک جگہ جم کر بیٹھنے نہ دیا۔ آج لکھنؤ میں تو کل کان پور کبھی فرخ آباد میں کبھی باندہ۔ غرض ـــ

ہوا کم کسی تدبیر سے چکر میرا

باندہ میں کچھ دنوں چین سے بیٹھنا نصیب ہوا تھا کہ غدر ۱۸۵۷ء کا روح فرسا ہنگامہ پیش آیا۔ آخر نہ وہ رئیس رہے
نہ ریاست ؎

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

مالی مشکلات تو ایک طرف رہیں، سب پر ستم یہ کہ منیر پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا اور سزائے حبس دوام ہو گئی

قید کے مصائب۔ راہ کی تکالیف اور اندمان کی کیفیت منیر کے قلم نے اس جگر خراش انداز سے بیان کی ہے کہ بی لرز جاتا ہے (دیکھو ان کا قصیدہ نعت) ؎

سرخ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض پنہانی　　صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

اللہ اللہ کیا عالم ہوگا۔ حکومت مخالف۔ عزیز و دوست برگشتہ در و دیوار دشمن۔ غرض جس طرح ہو سکا چھ سال وہیں گزارے۔ آخر ۱۲۹۲ھ میں رہا کر دیے گئے۔ وہاں سے چھوٹ کر الہ آباد پہنچے۔ الہ آباد سے رام پور کی کشش نے کھینچ بلایا۔ نواب یوسف علی خاں کے زمانہ سے بلاوے آ رہے تھے۔ اب اگرچہ اُن کا انتقال ہو چکا تھا مگر اُن کے لائق جانشین نواب کلب علی خاں نے اُن سے بڑھکر ارباب کمال کی قدر کی۔ یہ بھی آخر عمر تک وہیں رہے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا کہ خزان مرگ کے جھونکے سے ۱۲۹۷ھ میں یہ چہکتا ہوا بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ "انتقالِ منیر عالی قدر" تاریخ ہوئی۔

کلام پر رائے | جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا منیر کو شاعری کا ذوق لڑکپن سے تھا۔ اُس پر ملی ناسخ و رشک جیسے استادوں کی تربیت جس قدر بھی ترقی کرتے تھوڑا تھا۔ اس سے قطع نظر اُن کی استعداد علمی بھی معقول تھی۔ ان وجوہ سے اُنھوں نے علاوہ مختلف اصناف سخن کے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں اُن کی مصنفات میں کتب ذیل مشہور ہیں: اعلان الحق۔ سراج المنیر۔ تنبیہ النشائین۔ بفضائل الثقلین۔ امان المومنین عن مکائد الشیاطین۔ مثنوی معراج المضامین۔ کلیات مشتمل بر کلام اُردو و فارسی۔ اس کلیات میں تین دیوان (منتخب العالم ۱۲۶۲ھ تنویر الاشعار ۱۲۶۹ھ۔ نظم منیر ۱۲۹۰ھ) اور ایک مثنوی "حجاب زنان" شامل ہیں۔ ہر دیوان میں متعدد قصائد، صدہا غزلیات اور ہزارہا قطعات و رباعیات اور دیگر اصناف شعر موجود ہیں۔

اسی استعداد علمی کا اثر تھا کہ وہ اپنے اکثر معاصرین کے برخلاف عربی اور فارسی ادب سے کافی مناسبت رکھتے تھے۔ شعرائے دہلی کو شروع سے فارسی سے مذاق رہا اور اُن میں سے اکثر اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی صاحب دیوان تھے۔ لکھنؤ میں ناسخ کے عہد سے یہ طریقہ متروک ہوگیا۔ مگر منیر نے لکھنؤ کی تقلید کے باوجود فارسی گوئی کے شغل کو جاری رکھا۔ منیر کی خصوصیات کلام بیان کرنے سے پیشتر بے محل نہ ہوگا اگر ہم اُن کے قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ کے بارہ میں علٰحدہ علٰحدہ کچھ اظہار رائے کریں۔

(۱) قصیدہ — قصیدہ کے لئے اہل فن نے جو شرائط قرار دی ہیں اُن کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مُنیرؔ قصیدہ سوداؔ اور ذوقؔ کے بعد سب سے بہتر ہے۔ اُن کے قصائد خواہ نعت و منقبت میں ہوں یا ملوک و امرا کی مدحت میں یہ امر سب میں مشترک ہے کہ شروع سے آخر تک خیالات کی رفعت، الفاظ کی شوکت، کلام کا زور، بندشوں کی پختگی دریا کے بہاؤ کی طرح بڑھی چلی آتی ہے۔ کہیں کہیں علمی اصطلاحات کو جو شکوہ بیان کا جوہر اور قصیدہ کا زیور سمجھی جاتی ہیں اس خوبی سے صرف کیا ہے کہ بے اختیار مُنھ سے تحسین نکلتی ہے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو ؎

نور خورشید جو ہو صاعقۂ طور حمل — موسیٰ روز کرے مصر دل شب میں عمل
نیم رخ پیکرِ جوزا ضررِ شب سے ہو — دیدۂ مہر نظر آنے لگے مستقبل
جلوۂ روز سے رنگِ شب یلدا بدلا — اپنی اقلیم کو نوروز سے بھولا ہے زحل
اب کی ہر مصحفِ گل جامعِ عباسی ہے — فقہا باغ میں کر لیتے ہیں ہر مسئلہ حل
نکتۂ علم جو فرمائے تو ہمراہِ نبی — شوق میں پیکرِ جوزا بنے عقل اول

علیٰ ہذا ؎

نئے ہوئے ہیں اصول و فروع گلشنِ دہر — زمانہ کو نہیں کہہ سکتے دہر یہ بھی قدیم
عراق ہے نہ حجاز ایک ہے تو نیشا پور — اُسی مقام مبارک میں ہر صدا ہے مقیم

اسی طرح موقع موقع سے آیات و احادیث و تلمیحات کا استعمال اُن کے زورِ کمال اور قدرتِ کلام کی حجۃ کاملہ ہے۔ مثلاً ؎

مصحف ناطق نہ کیوں کر اُس کو سمجھیں اہل دیں — حق نے فرمایا اُسے من عندہ ام الکتاب
ہوا حکم کونوا مع الصادقین کا — ہیں منصوص اُس کے یہ بارہ اطائب
ترے نکثِ بیعت سے کچھ پھل نہ پایا — فصاروا کمن کان فی اللیل حاطب
من استطاع سبیلا سے ہے مگر معذور — برنگ شخص زمیں گیر ہے مزاجِ سقیم

مُنیرؔ کے کلام کا یہ خاص وصف ہے کہ اُنھوں نے بے شمار تشبیہیں اور استعارے جن کا اردو میں وجود بھی نہ تھا ایجاد کئے۔ یہ رنگ غزل، قصیدہ، مثنوی سب میں ہے اور بعض مواقع پر بہت دل کش ہے۔ اگرچہ اکثر جگہ اغلاق و اشکال

شان آگئی ہے۔ بہرکیف اُن کی قوت ایجاد اور زور اجتہاد میں شبہ نہیں۔ ایک قصیدہ تو سرتاپا استعارات و کنایات
میں لکھا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اشک زلیخا ہوتے بحرِ صفت جوش زن غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن
آبلۂ روز پر تازہ حنا بندھ گئی ابروئے زال زری نعل کمیت کہن
بال شہِ نیمروز بس کہ ہوا کم بہا زنگیوں کے بالوں سے بدلی سنہری کرن
خندۂ دنداں نما زنگیِ شب نے کیا تختِ سلیماں ہوا تکیہ گہِ اہرمن
گنبدِ فیروزہ میں چھوڑ کے تابوت کو دخترِ کانِ یتیم پھرنے لگیں خندہ زن

غرض اسی طرح سورج کے ڈوبنے، رات کے آنے، تاروں کے نکلنے کے لئے نئے نئے اسالیب طبیعت سے
کئے ہیں اور قصیدہ کے آخر میں فرماتے ہیں کہ قید میں مولوی فضل حق میرے رفیق تھے اُنھوں نے ایک دن
رمایا کہ مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس ادا کرنے کی یا تو اُردو کے شعرا میں لیاقت نہیں یا زبان میں صلاحیت
۔ چنانچہ میں نے اس رنگ میں قصیدہ لکھا۔ جس میں بعض تراکیب خاص ایجاد طبع ہیں ؎

نصف قصیدہ کیا سامنے اُن کے رقم ختم ہوا جب وہ تھے ہمدم گور و کفن

اس کے علاوہ اکثر قصیدے اُنھوں نے مشکل زمینوں میں سخت پابندیوں کے کیا ساتھ لکھے اور کامیابی کے
تھ لکھے ہیں۔ مثلاً وہ قصیدہ جو اپنی محبوب افیون کے تلازمہ میں لکھا ہے اور آخر منقبت کی جانب گریز کیا ہے ؎

جب افیونِ شب سے ہوا چرخ تائب ہوئی تخم خشخاش انجم بھی غائب
یہ چُنی مرغِ زریں نے دانہ کی صورت زمرد کی ڈبیہ سے حبِّ کواکب
بنا کاسۂ شیرِ مہ جام خالی ہوئی تلخ نقلِ نجوم ثواقب
فلک پر کھنچا پوست زنگیِ شب کا ہوا خوف سے لالہ کا نشہ غائب

آخر میں فخریہ لکھتے ہیں ؎

کہاں ہیں جو فرماتے تھے طعن سے یہ کہ اُردو زباں ہے کثیر المعائب
نہیں شوکتِ لہجہ و لفظ اس میں نہ گنجائشِ نکتہ ہائے غرائب

زرا دیکھیں انصاف سے یہ قصیدہ   کہیں پھر جو کچھ حکم دے رائے صائب

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصداً نادر استعارات اور نئی زمینیں تلاش کرتے تھے تاکہ اُردو میں توسیع اور انداز بیان میں تنوع پیدا ہو۔

بعض قصیدوں کی ردیفیں اس قدر دشوار ہیں کہ اُن میں غزل کہنا بھی مشکل نظر آتا ہے چہ جائے کہ قصیدہ اور وہ بھی منیرکاسا قصیدہ۔ ملاحظہ ہو

(ہر قصیدہ کے پہلے مطلع پر اکتفا کی جاتی ہے)

قلزمِ فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر   اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر

—— (یا) ——

پڑی ہے مجھ سے عناصر کے دل میں یار گرہ   بساط عمر رواں کا ہے عرض چار گرہ

—— (یا) ——

اے گل جو تو حنا سے رنگے چندبار ہاتھ   گھٹ جائے غم سے خونِ وفا پانچ چار ہاتھ

—— (یا) ——

جس دن سے رام پور میں ہے آشکار چاند   ہردم شب مراد سے ہے ہمکنار چاند

ان باتوں کے باوجود بعض قصائد نہایت صاف اور رواں ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوثر کی دُھلی ہوئی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً ؎

رخِ احباب سے ظاہر ہوا ہے بعض پنہانی   صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی

—— (یا) ——

آجاتے تھے تم صبح کی ساعت کے برابر   پھیلاتے ہو اب پاؤں قیامت کی برابر

ہمارے اُردو شعرا ہندوستان کے جھونپڑے میں رہ کر ایران کے محلوں کے خواب دیکھا کرتے ہیں اور ان مناظر کی مدح کرتے ہیں جن کو کبھی نہیں دیکھا۔ گویا اُن کی شراب ایسی ہے کہ نہ خود پی سکیں نہ دوسرے کو پلا سکیں۔ مگر جھومینگے ضرور اور چاہینگے کہ دوسرے بھی اُن کے ساتھ سر ہلائینگے۔ منیر نے کہیں کہیں اس فرسودہ روش

سے انحراف کیا ہے اور ملکی و مقامی مناظر کا بیان کھینچا ہے۔ مثلاً نواب کلب علی خاں مرحوم کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے
جس میں اپنے تمام معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ اُس کے تمہید میں لکھتے ہیں ؎

رُت ہے برسات کی بہت پیاری — موج زن جھیلیں ندّیاں جاری
بدلیاں چھا رہی ہیں گردوں پر — زرد، اودی، سنہری، زنگاری
بجلیوں کی چمک میں ہے چہل بل — جیسے رقصاں بتانِ فرخاری
کیا ہری دوب جنگلوں میں ہے — سبز مخمل سے بھی سوا پیاری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں — روح پر ہوتی ہے خوشی طاری
کوکلا، بگلے، کوئلیں، طاؤس — اپنی تانیں سناتے ہیں پیاری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب — کر رہے ہیں نظر کی دل داری

امور بالا کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ سودا و ذوق کے بعد قصیدہ میں منیر سب کا سرتاج تو
شاید مبالغہ نہ ہوگا۔

ب) **غزل** | منیر لکھنؤ کے پیرو اور ناسخ و رشک کے شاگرد تھے۔ پھر غیر ممکن تھا کہ اُن کے کلام میں
لکھنویت کی شان نمایاں نہ ہوتی۔ مگر چوں کہ مقلد ہونے کے ساتھ ہی من وجہٍ مجتہد بھی تھے (گو مقید ہی کیوں نہ ہوں)
اس لئے کلام میں کچھ خصائص سب سے جدا تھے۔ اُن کی تلاش مضمون، ندرت استعارات اور قادر الکلامی کا کلمہ
کون ہے جو نہیں پڑھتا۔ تاہم اُن کی شاعری میں وہ تمام عیوب بھی تھے جو لکھنوی شاعری کا مابہ الامتیاز سمجھے جاتے
تھے۔ اب اُن کو سوسائٹی کے مذاق کی بنا پر ہنر کہہ لو یا ذوقِ سلیم کے فتوے کے مطابق عیب۔ مگر جیسا کہ ابھی عرض
کیا گیا کچھ ذاتی خصوصیات بھی تھیں جن کو دیکھ کر مبصر پہچان لے گا کہ یہ منیر کا رنگ ہے اور حق یہ ہے کہ وہ اُس رنگ کو
استواری اور کامیابی سے نباہتے تھے۔ یہاں اس عقدہ کو اسی طرح نیم وا چھوڑ کر ہم آگے چلتے ہیں۔ تھوڑی دور
چل کر اُن کی خصوصیات شاعری میں غزل پر ریویو ہو رہے گا۔

ج) **مثنوی** | کلیات میں ایک مثنوی ہے جس کا نام حجاب زنان ہے۔ مضمون اخلاقی ہے اور عورتوں کو استقلال، سلیقہ
اطاعت شوہر کا سبق دیا گیا ہے۔ دراصل ایک قصہ کے پیرایہ میں کچھ نصائح نظم کر دیتے ہیں۔ ورنہ مثنوی میں کوئی

ادبی خوبی نام کو نہیں۔ خود عذر کرتے ہیں ؎

اس میں اکثر نہیں ہیں وہ قیدیں	جو ہیں میرے قصیدے غزلوں میں
اپنے لہجہ میں یہ کلام نہیں	جب تو اس میں وہ التزام نہیں
سیدھی سیدھی زبان ہے اس میں	سادہ سادہ بیان ہے اس میں

یہ مثنوی اُنھوں نے کسی کی فرمائش سے تصنیف کی تھی۔

علاوہ بریں مثنوی کے طور پر کلیات میں چند عرائض و خطوط ہیں جو نظم کر کے بعض امرا و روسا کی خدمت میں بطور عرض حال روانہ کئے ہیں۔ ان عرائض میں البتہ حسن بیان، لطافت، تراکیب اور خوبی ادا نے جان ڈال دی ہے۔ جس سے شاعری کا پایہ کمال ظاہر ہوتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

خلیلِ کعبۂ جود و سخاوت	مسیحِ اوجِ اخلاق و سماحت
وفورِ عمر و دولت سے ہوں دلشاد	ترقی پر ہو اقبالِ خداداد
گزارش سید بے چارہ کی ہے	گزارش بندۂ آوارہ کی ہے
گزارش ہے فقیرِ ناتواں کی	گزارش ہے منیرِ نیم جاں کی
چمن سے خار و خس کی ہے گزارش	ہما سے اک مگس کی ہے گزارش
جلی کھیتی کی ابرِ تر سے فریاد	سرابِ خشک کی کوثر سے فریاد
رہائی سے اسیری نالشی ہے	سخاوت سے فقیری نالشی ہے
سحابِ رفتگاں دے پیاس کی داد	سُنے بحرِ کرم قطرہ کی فریاد

اس کے بعد عرض مطلب ہے۔ تقریباً تمام خطوط کا انداز یہی ہے۔

منیر نے ایک اور طویل مثنوی علیحدہ لکھی ہے جس کا نام ہے معراج المضامین اور یہ امر واقع ہے کہ وہ اسم بامسمی ہے اور منیر کا شاہکار کہے جانے کی مستحق ہے۔ یہ مختصر مقالہ اس کا متحمل نہیں کہ معراج المضامین پر مفصل بحث کی جائے اور اُس کے محاسن دکھائے جائیں۔ کیوں کہ یہ کام فرصت چاہتا ہے۔ تاہم "مالایدرک کلہ لا یترک کلہ" کے بموجب اس کے بارہ میں مختصراً کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

(باقی آئندہ)

غزل

(شفیق احمد غازی متعلم بی اے سینیر)

ہے وجہ صد فتادگی ہر گام زندگی ناکام زندگی نہیں ناکام زندگی

مست مئے شباب کی اُف چشم کیف ریز گویا ہیں دو چھلکتے ہوئے جام زندگی

اقرار میں بھی پہلوئے انکار چاہیئے اک صبح زندگی ہے تو اک شام زندگی

اک جستجو کے بعد ملا گوشۂ پناہ پھیلا نہ دیں عدم میں کہیں دام زندگی

تیری کمندِ زلف کے قربان جایئے آخر رسائی ہو گئی تا بام زندگی

اک اور موت مرنا پڑا بدگماں مجھے مجھ کشتۂ نگاہ پہ الزام زندگی!

مجھ ناتواں پہ شوق سے تو مشق ناز کر پڑ یوں کہ وار وار ہو پیغام زندگی

غازی کبھی تھا اپنے زبان زد اسی کا نام

اب نام کو بھی یاد نہیں نام زندگی

بیکس بھکارن

کشتۂ شمشیرِ ناداری، ہلاکِ نیشِ غم
آسماں کے واسطے ایک تختۂ مشقِ ستم

بے نوا، بے خانماں، جینے سے اکتائی ہوئی
غم نصیب و فاقہ کش، دنیا کی ٹھکرائی ہوئی

راہ میں خاکِ زمیں پر نیم بے ہوشی میں ہے
حسرتوں کی ایک دنیا ہے کہ خاموشی میں ہے

بن چکا ہے دشتِ غربت یاسمن زارِ شباب
اور نہیں جز بے کسی کوئی عزادارِ شباب

مضطرب، حیراں، گرفتارِ طلسمِ ہست و بود
اہلِ دنیا کے لئے بارِ گراں جس کا وجود

فرشِ سنگ و خشت ہے آرام تن کے واسطے
اور خاکِ رہ گزر ہے پیرہن کے واسطے

چہرہ کمھلایا ہوا، تغئیرِ تابِ زندگی
حلقے آنکھوں کے بیانِ انقلابِ زندگی

بڑھ گئی ہے لاغری اتنی کہ جنبش ہے محال
خشک ہے منہ میں زباں اٹھتا نہیں دستِ سوال

رو رہی ہے پاس اک بن باپ کی بچی کھڑی
نقشۂ بے چارگی و غم، سراپا بے کسی

ماں سے کہنے قصۂ دردِ یتیمی آئی ہے
تحفۂ رنج و مصیبت نذر دینے آئی ہے

ایک عبرت زا ترنّم درد کی آواز کا
یا کوئی بھولا ہوا نغمہ جہاں کے ساز کا

بھوک سے روتی ہے جب وہ کانپتا ہے آسماں
گویا ہے رنج و الم کی اک مجسّم داستاں

یاس میں حالِ دلِ مضطر سناتی ہے کبھی
ماں کے منہ پر رکھ کے منہ آنسو بہاتی ہے کبھی

کیسے اس کو دے تسلی بینوا، کچھ بھی نہیں
پاس اک ٹوٹے ہوئے دل کے سوا کچھ بھی نہیں

آہ اے تصویرِ عبرت! پیکرِ حرماں ہے تو
کس قدر مجبور، کتنی بے سر و ساماں ہے تو

محمد شبیہ الحسن

خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش خاں

(کے ایم مشیر احمد علوی بی اے علیگ)

میرا خیال ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے آگرہ کے مصاحبین میں جو نمایاں حیثیت شہنشاہ اکبر کے رضاعی بھائی
ز کو حاصل تھی وہ عدیم المثال کہی جا سکتی ہے۔ ابوالفضل کی تاریخ میں یہ واقعہ ایک خاص نمایاں حیثیت سے یاد کیا جاتا
ں وجہ سے نہیں کہ عزیز جملہ مصاحبین میں سب سے بہتر تھا یا اپنے عہد کا ایک عمدہ وفادار تھا۔ یقیناً وہ بدایونی یا راجہ
ل سے کسی طرح بھی بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ عزیز میں وہ جملہ عیوب موجود تھے جو ایک انسان کو سنجیدہ طبقہ کی نظروں سے
تے ہیں لیکن عزیز کی شخصیت عجیب و غریب قسم کی تھی۔ ہم جب عزیز کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں تو کہنے کے لئے
ہو جایا کرتے ہیں کہ وہ بدایونی سے بدرجہا بہتر تھا۔ بدایونی اور عزیز دونوں نہایت بے باک ایماندار تھے اور گو
فضل نے دونوں کو مختلف طریقوں سے ستایا لیکن یہ لوگ اپنے معتقدات پر سختی سے قائم رہے۔ مآثر الامرا کا مصنف
زیز کے متعلق بار بار "منافق" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ہم کو حیرت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُس نے بہت صفائی سے اپنے ایک
دوست کو اکبر کی نقائص اور کمزوریاں لکھی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا ہے کہ "اصلا زمانہ ساز نہ بود"
ہم نہیں سمجھ سکتے کہ منافق اور زمانہ ساز سے وہ کیا مفہوم مآثر الامرا کے مصنف نے لیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کے
الحاد کے عقائد کی اشاعت محض عزیز ہی کی وجہ سے عام نہیں ہو سکی۔ اس میں عزیز کو بہت مختلف النوع مصائب کا
سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اُس نے سب برداشت کیا اور اپنے معتقدات پر سختی سے قائم رہا یہی نہیں بلکہ اکبر کے سیاسی مذہب کے
ملانہ عقائد کی تردید بھی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ عزت و عہدہ سے بھی کنارہ کش ہو کر مکہ معظمہ چلا گیا۔ وہ دوبارہ ہندوستان میں
پس آیا اور عساکر اسلامیہ میں شامل ہو کر اپنی شمشیر کے جوہر دکھلائے۔ بدایونی نے اس موقع پر اس کے متعلق لکھا ہے کہ

"عزیز نے ابراہیم بن ادہم کی مثال زندہ کر دی لیکن اس نے اپنی ساری خوبیاں دوبارہ دین الٰہی
قبول کرنے سے برباد کر دیں۔"

میرا خیال ہے کہ بدایونی کا یہ خیال غلط ہے۔ دونوں رضاعی بھائیوں میں محبت اس حد تک تھی کہ جو بیان نہیں ہو سکتی اُس نے دین الٰہی قبول نہیں کیا تھا محض لڑائیوں میں شریک ہوا تھا۔ شہنشاہ اکبر اور عزیز تقریباً ہم عمر تھے۔ چند ہفتوں کی چھوٹائی بڑائی شمار قطار میں نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ عزیز کی اکبر سے چند ہفتوں کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ اُن دونوں کی پرورش ایک ہی محل میں ہوئی تھی اور عزیز کی ماں اکبر کی شفیق ترین دایہ کہی جاتی تھی اور یہ محبت اُس خط سے بھی ظاہر ہوتی ہے جو عزیز کوکا نے اکبر کو حج بیت اللہ کے لئے جاتے وقت لکھا تھا کہ :

"میں (ہندوستان میں) دو گوشت اور خون کے کعبے چھوڑ کر ایک سنگی کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ معظمہ جا رہا ہوں۔"

اس سے مطلب اُس کا یہ تھا کہ میں اپنی ماں اور رضاعی بھائی اکبر کو چھوڑ کر مکہ معظمہ جا رہا ہوں لیکن میرا دل نہیں کرتا۔ اکبر نے بھی عزیز کا ساتھ برابر دیا۔ چنانچہ گجرات کی لڑائی میں جب عزیز کو شکست ہونے لگی تو یہ خبر سنتے ہی شہنشاہ اکبر بیتاب ہو گیا اور حیرت ناک طریقے سے فتحپور سے احمد آباد (گجرات) نو دن میں پہنچا اور اپنی تازہ دم بہادر جری فوج سے گجرات شکست دی اور کسی حد تک اس شکست سے عزیز کی جان بچا لی۔

(۲)

تعجب ہے کہ آج تک یہ پتا نہ چلا کہ عزیز کی پیدائش کا مقام کہاں ہے۔ لیکن یہ امر مسلمہ طور پر طے شدہ یقیناً ہے کہ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا ہے اور ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اُس کی پیدائش امر کوٹ میں ہوئی ہے کیوں کہ ہمایوں کی بیوی حمیدہ بانو کی مصیبت میں عزیز کی ماں کا موجود ہونا پایۂ صداقت کو پہنچ چکا ہے جس کا خطاب مریم مکانی تھا۔ شہنشاہ اکبر کی پیدائش تو یقیناً بغیر کسی شک و شبہ کے امر کوٹ میں ہوئی تھی اور جیسے ہی اکبر پیدا ہوا کہا جاتا ہے کہ حمیدہ بانو نے جی جی انگا کو بلا کر اکبر کو اس کی گود میں دے دیا۔ جی جی انگا اور اس کے شوہر شمس الدین غزنوی سے یہ وعدہ ہو چکا تھا کہ جو شاہی اولاد ہوگی اُس کی پرورش کا انتظام شمس الدین اور اُس کی بیوی کرے گی۔ شمس الدین وہی شخص ہے، جس نے قنوج کی لڑائی کے بعد ہمایوں کو گنگا سے پار اُتار دیا تھا۔ لیکن جی جی انگا کے ابھی تک کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ دایہ گری کی خدمت انجام نہ دے سکتی تھی۔ شمس الدین کو انگا یا اتالیق اکبر کا خطاب عطا کیا گیا اور بعدہ وہ اکبر کا وزیر اعظم بھی ہوا اور اس عہدہ پر اُس وقت تک قائم رہا جب تک کہ ماہم انگا کے لڑکے ادہم خاں نے اُس کو قتل نہ کر دیا۔ اکبر نے اس قاتل کو غصہ

حالت میں محل کی چھت سے نیچے پھینک دیا۔ عزیز اور اکبر ساتھ ہی ساتھ نشو نما پاتے رہے۔ عزیز بہت ذہین اور قابل ہو گیا۔ اکبر نے تعلیم سے ظاہرا کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور جاہل مطلق ہی رہا۔ عزیز ایک نہایت ممتاز سپاہی کی حیثیت سے ہی تاریخ کے غیر فانی صفحات پر یاد کیا جاتا ہے اور گجرات و دکن کی بہت سی لڑائیوں میں شریک ہوا تھا عزیز کو اکبر سے نو حد درجے محبت تھی لیکن بسا اوقات وہ اکبر کے سیاسی لائحہ عمل کی تردید کیا کرتا تھا اور اکثر وہ ایسے امور کر بیٹھتا تھا جن پر پشیمان اس کو مدۃ العمر رہا کرتی تھی۔ ایک عامل ریاست کو ایک مرتبہ اس نے دوسرے عامل ریاست کی حراست میں دے دیا اتفاق سے دونوں میں سخت دشمنی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ بغض نکالنے کا موقع مل گیا اس معتوب عامل کو جلا کر مار ڈالا جب یہ خبر عزیز کو ملی وہ بہت برافروختہ ہوا اور اسی وقت اس نے اس عامل کو بھی قتل کر دیا۔ قصہ اسی حد تک ختم نہیں ہوا۔ اس واقعہ سے ریاست میں تہلکہ مچ گیا اور اس عامل کے باپ نے قصاص کی عرضی شہنشاہ کے دربار میں پیش کر دی جس کے تاوان میں بطور خوں بہا بہت کافی رقم عزیز کو اس عرضی دینے والے کی نذر کرنا پڑی۔

ایک مرتبہ شہنشاہ جہانگیر نے عزیز کے لڑکے بہاں قلی سے کہا کہ "ضامن پدرت شوی؟" لڑکے نے اسی وقت کہہ دیا کہ میں سر امر میں ضامن ہونے کے لئے تیار ہوں لیکن قبلہ و کعبہ کی زبان کا ضامن ہونا میرے امکان سے باہر ہے۔ زر در ہر امر گریزبان، نہایت افسوسناک امر ہے کہ عزیز کی کوئی مستند اور جامع تاریخ ہمارے پاس نہیں ہے شمس العلماء مولانا آزاد نے بھی دربار اکبری میں اس ممتاز درباری کا حال لکھنے میں بہت بخل سے کام لیا ہے۔ ایک خط اکبر کے نام لکھا ہے جو ہم دلچسپی سے نقل کرتے ہیں جس میں عزیز کے اپنے وجوہ دکھلائے ہیں کہ وہ کیوں ہندوستان میں مکہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔

"عرضداشت خان اعظم مرزا عزیز کوکلتاش درجواب فرمان اکبر بادشاہ کہ از مکہ معظمہ فرستادہ بود کہنہ فراشان آستان کیوان ملایک آشیان خاقان جمشید نشان فریدون شان کیخسرو دستگاہ کیومرث بارگاہ سکندر جاہ عالم پناہ انجم سپاہ آسمان خرگاہ ظل سبحانی کوکہ بعرض می رساند کہ رائے انور بر طلب این غلام کمینہ فائز وصادر گشتہ بود جان و دل را کہ خلاصہ آب وگل ست باجمع کثیر از وسائے اخلاص و استمال بخدمت حجاب درگاہ گیہان پناہ کہ مبدائے سخا و منشا عظمت و کبریات فرستادن چوں مفتی عقل و فتوی قاضی گمان بلکہ یقین بجل بحرمان مہجوری کرد دلیست بے درمان نوشتہ دادہ بود برتا قابلی

فرسوده ست ملالت در گردن کرده ماند چون دانست به یقین که احادیث تحریک اعدا موثر و کارگر افتاده مزاج اشرف
را به غیبت و تهمتے چند که مبانع جاه و جلال رسانیده از کمینه درگاه منحرف ساخته اند و بادی رائے عالم آرا ست
بساط بوسان آن درگاه به قتل و قمع این بے گناه راهنمون گشته به خاطر رسید که چشم خاکسار بے مقدار را که در عهد مبست
قابلان آن درگاه آسمان نشان پرورش یافته بمرتبهٔ اعظم خانی و عزیز کوکگی و حکومت گجرات سرفراز شده هم بواسطه
این تشریفات بخاک مکه معظمه مقدسه منوره رسانیده که با کافران هندوستان جسمے را که پرورده خوان الوان
انعام و احسان بادشاه جهان پناه باشد در یک خاک و در یک محل مدفون سازد محض گستاخی و غایت بے ادبی
است و لاجرم گجرات را که آنکه معمورهٔ دار السلطنت بود نه معتمدان سرده غبار ملال و اختلال خویش را از گوشه خاطر
خاک رویان آن آستان ملایک آشیان شسته دست از مطالبات آنجا و پاے ادب را کوتاه ساخته
که محض بسعی جان سپاری خود از معارک کفار جمع ساخته بود عدل بیرون آورده از حلال ترین چیزها دانسته
سفر گزیده آن قدر جمعیت از مکاسبات مذکور بدست آورد که اگر خواهند منصب اعظم خانی را در بارگاه بادشاهی
که اشرف مکان ربع مسکون تبصرف ایشانست می تواند خرید - اما خلاصه همت مصروف آنست که وظیفه بمردم
مستحق مصالح پاک دین آن ملک مقرر سازد و مدرسه بنام نامی حجاب بارگاه بنده پرور حضرت خاقانی با تمام
رساند که تا انقراض عالم و در زبان مورخان جهان باشد و خود در آن مدرسه نه بحث علوم دینی و فکر شعر که
عبارت از توحید و نعت و منقبت اصحاب بود باشد و دعاے دولت روز افزون اشتغال میداشته باشد
امید آنست که از رفتن این کمترین غلامان بر حاشیه ضمیر خاکروبان آستان غبارے نخواهد نشست بلکه
مطلب سخن چینان و عیب کنندگان که عدم بود این معدوم ست معلوم خواهد پیوست که منصب اعظم خانی و حکومت
گجرات و عشرت عزیز کوکگی را باین محروم نمی شمرند - بناچار جمع مذکورات را پیش کش مدعیان نموده که ایشان را
میسر نیست بدون بنده دستکش که این کمینه را میسر باشد - بدون ایشان چون آخر الامر نسیم لطف شامل حال
بوستان مطالب و مقاصد دیگران شد و نهال امید و حقوق خدمت بنده را بسموم محرومی خشک سال بخشیدند
بنده از فدوی کهنه و عاقبت اندیشی ها بسکان آن چند کلمه گستاخی نموده بعرض میرساند که جمعے خاطر اشرف را
از دین محمد صلعم بیگانه و مجتنب می سازد حاشا که دوست باشند و کمینه که نیک نامی دنیا و عقبی می طلبد

دشمن دو واجب الاخراج باشم والا کار دنیا بازیچه ایست ناپایدار بر حرف دو سه خوش آمدگوی آخرت بدنیا
فروش اعتماد نباید کرد۔ همه عالم را گوش هوش ست پیش ازیں سلاطین بوده اند که همه صاحب تمکین بودند۔ هیچ
بادشاهے را غدغه نشد که دعوی پیغمبری و نسخ دین محمدی نماید۔ بل ما دامے که چون مصحف اعجازی چو چهار پایه
چهار پسندیده باشد و ثبت تمر بمثال ایں چیز با واقع نبود مردم می کند یا رب دغدغه چهار یار بودن کدام
جماعت را می شده باشد۔ قلیج خاں که صفای ظاهر و باطن عصمت جبلّی دارد یا صادق خاں که شرف رکابداری
از بیرم خاں یافته یا ابوالفضل که شجاعت و حیایش بجاے علی و عثمان می تواند بود۔ بخداوند بخاک پاے
بادشاه که هر چیز غیر از سکه نیک نامی طالب اند نیست و همه مدار بر خوش آمد و روز گذرانیدن دارند و
تا نیک نامی طلبد بنده ست که تا بود جز حرف نیک نامی بر زبان نه آمد الحال هم در مکه مقدسه منوره کارے
نخواهد کرد که خلاف نیک نامی باشد ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید ⁂ که هرگز بمنزل نخواهد رسید

فرشته که میان اکابر مجلس بهشت آئین و بنده کمترین ست که ابوالغازی در فرمان بنده اضافه کرده دیگراں
کافراں را بر مسلماناں ترجیح دادند که بر صحف لیل و نهار خواهد ماند۔ آنچه بر بنده واجب ست دراں تقصیر
نه رفت والدعا۔

یہ خط تاریخی حیثیت سے بہت وقیع ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ آزاد کو یہ خط کہاں سے ملا؟ اور اگر آزاد کو یہ خط ملا ہے تو کیا اس کی اصلی نقل بھی کہیں کسی قدیم کرم خوردہ کتب خانہ میں محفوظ ہے؟ اس خط میں وہ فیضی اور ابوالفضل کا مذاق اُڑاتا ہے اور طنزیہ الفاظ میں اکبر سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا وہ ان دونوں بھائیوں کو خلیفہ سوم اور خلیفہ چہارم کے ہم پایہ تصور کرتا ہے۔ اسی خط میں وہ یہ بھی شکایت کرتا ہے کہ اب ہندوستان اس قابل نہیں ہے کہ اب وہاں کوئی دفن بھی کیا جا سکے کیوں کہ مسلمانوں کے متبرک مقامات میں اب کفار دفن کئے جاتے ہیں اس سے عزیز کا اشارہ مبارک کی جانب تھا جو دونوں بھائیوں کا باپ تھا اور اُن کی ماں لاہور کے ایک مشہور قبرستان میں سپرد خاک کی گئی تھی اور بعدہٗ اُس کی لاش آگرہ میں منتقل کر دی گئی تھی۔ اس خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ عزیز اس فکر میں ہے کہ اُس کو سلطان روم کے دو رِ حکومت میں کوئی ملازمت قسطنطنیہ یا مکہ میں مل جائے۔ مآثر الامرا اکبری دربار کے

امرا کے حالات میں بہت مستند اور وقیع کتاب ہے لیکن عزیز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً درست نہیں ہے۔ منافقہ الزام جو عزیز پر عائد کیا گیا ہے وہ اُس خط کی بنا پر ہے جو راجہ علی والی خاندیش کے نام عزیز نے لکھا ہے اُس خط کی کوئی اصلی نقل اب ہمارے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے۔ محض تزک جہانگیری میں تذکرہ آیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اکبر کے خلاف بہت خطرناک قسم کے الزامات لگائے ہیں لیکن ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ کہ اُس خط میں حسب عادت عزیز کے ملحدانہ عقائد پر اکبر کی صفائی سے بحث کی گئی ہے۔ ہم کو اس خط کے تاریخ کا کوئی پتا نہیں ہے معلوم نہیں کس سنہ میں یہ خط لکھا گیا ہے۔ اگر یہ خط اُس زمانہ میں لکھا گیا ہے جب عزیز اپنے عقائد کی بنا پر سختی سے مختلف النوع مصائب کا سامنا کر رہا تھا اور جن کی وجہ سے وہ آخر کار جلا وطن ہو گیا تھا تو یقیناً اُس زمانہ میں اُس خط کا لب لہجہ بہت سخت ہونا چاہیے۔ لیکن وہ کسی طرح بھی بدایونی کی دل خراش تنقیدوں سے زیادہ اہم ثابت نہ ہوگا جس کی بنا پر مجبوراً جہانگیر کو بدایونی کی کتاب کو ضبط کرنا پڑا تھا۔ بہر حال کچھ بھی ہو یہ جہانگیر کا منصب نہ تھا کیوں کہ وہ خود اس سے زیادہ سنگین جرم کا مرتکب رہ چکا تھا۔ اُس نے اپنے باپ کے محبوب ترین دوست کو دھوکے سے قتل کرا دیا تھا اور علاوہ بریں جہانگیر کا یہ بیان بھی یقیناً غلط ہے کہ عزیز نے ایک دشمن کو یہ منافقانہ خط لکھا تھا کیونکہ راجہ علی اکبر کا دشمن کسی حیثیت سے بھی نہ تھا۔ برخلاف اس کے بہادر راجہ اکبر کے لئے بارہا لڑا اور آخر کار راشتی کے مقام پر عساکر اکبری کی معیت میں جان بھی دے دی۔ بہر حال اکبر کے اخلاق کا بہترین حصہ یہ ہے کہ اُس نے عزیز کو معاف کر دیا اور جلا وطنی کی حالت میں اکبر نے عزیز کے بچوں کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا اور جب وہ بلاد بندر سے آگرہ واپس آیا تو نہایت محبت سے بغل گیر بھی ہوا۔

جہانگیر کے عزیز کو بُرا بھلا کہنے کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ خسرو کے تخت کا کوشاں تھا اور یہ بات جہانگیر کو فطرتاً ناگوار ہوئی۔

سنہ ۱۰۳۳ھ میں احمد آباد گجرات میں خان اعظم نے دنیا سے انتقال کیا۔ جنازہ دلی آیا سلطان مشائخ کے ہمسایہ میں انکہ خاں کے پہلو میں سپرد خاک کئے گئے۔

تنقید وتبصرہ

غذا و صحت مصنفہ جناب ممتاز احمد صاحب فاروقی بی اے (آنرز) بی، ایس، ای، ای (امریکہ) مطبوعہ کریمی پریس لاہور۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب، ضخامت ۱۲۰ صفحات تقطیع خرد
قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک ملنے کا پتہ: دار الکتب اسلامیہ احمدیہ بلڈنگس، لاہور

آج کل نوجوانوں کی طبیعت میں اپنی صحت اور جسمانی طاقت کی طرف سے عام بے نیازی برتی جا رہی ہے، جو ملک کی معاشرتی کیفیات کا لحاظ رکھتے ہوئے حد درجہ مضر ہے اسی خیال کی بنا پر جناب ممتاز صاحب نے ایک چھوٹی سی کتاب روزانہ کی ضروریات کے موافق تحریر فرمائی۔ جس میں غذاؤں کے اجزا، غذاؤں کی طاقت، پینے کی چیزیں موسم کی غذائیں، بچوں کی غذا، دانتوں اور منھ کی صفائی اور دیگر مختلف مفید عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب حقیقتاً اس قابل ہے کہ ہر شخص کے روزمرہ کے مطالعہ میں رہے

لمعات اختر مجموعۂ کلام جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی۔ مطبوعہ آگرہ اخبار پریس۔ کتابت طباعت خاصی ضخامت ۰۰ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ جو کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے
ملنے کا پتہ: مصنف صاحب اختر منزل جوناگڑھ (کاٹھیاوار)

جناب اختر صاحب جوناگڑھی زبان اردو کے مشہور ومعروف شعرا میں سے ہیں۔ آپ کا کلام بلاغت نظام اکثر مقتدر رسائل میں بالالتزام شائع ہوتا رہتا ہے۔ "لمعات اختر" ان تمام نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے بعض شیکسپیر، اڈیسن، ملٹن اور بائرن کی انگریزی نظموں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ باقی زیادہ تر خود جناب اختر صاحب کی ندرت طبع کے نتائج ہیں۔ چند غزلیات فارسی بھی ہیں۔ کلام بحیثیت مجموعی بلندیِ تخیل اور فکر رسا کا آئینہ دار ہے کتاب کے شروع میں مصنف صاحب کی ایک تصویر بھی دی گئی ہے۔ البتہ کتابت کی غلطیاں بہت کافی ہیں اور نہیں

آمید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں قاضی صاحب اس کا زیادہ خیال رکھیں گے۔

سیرۃ النبی جلد ثالث پر تنقیدی نظر

مصنفہ ڈاکٹر محمد عمر صاحب پی ایم ایس، متعینہ بجنور (یوپی) مطبوعہ مطبع حکیم برہم گورکھپور ضخامت ۷۶ صفحات

قیمت آٹھ آنے۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

سیرۃ النبی صلعم۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے، جس کے دو حصے مولانا موصوف کی زندگی ہی میں تیار ہوگئے تھے۔ لیکن تصنیف من حیث المجموع پھر بھی نامکمل تھی۔ مولانا مرحوم کے بعد ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور بقیہ جلدیں مرتب کیں۔ زیر تنقید کتاب اسی تصنیف کی تیسری جلد پر تنقید ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے جس سے کلیتاً جماعت احمدیہ (قادیان) کے اصول کی تبلیغ منظور ہے۔ تنقید کا اصل اصول یہ ہے کہ وہ ذاتیات سے مبرا ہوتی ہے، لیکن یہاں تمام تر مولانا موصوف پر نہایت مکروہ اور غیر پسندیدہ طرز میں حملے کئے گئے ہیں جس کے ضمن میں انبیائے کرام اور ملائکہ مقربین کی شان میں بھی اکثر ایسی باتیں درج کی گئیں ہیں جو اسلامی روایات کے قطعی منافی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے اکثر اعتراضات سراسر ناموزوں اور دور دراز کار ہیں۔ بعض میں صرف لفظی بحث ہے اور بعض میں معمولی میں روایات پر مضحکہ۔ بہرحال کتاب کے عیوب و محاسن کامل مطالعہ سے ہوسکتے ہیں۔

زمانہ کانپور جوبلی نمبر

مرتبہ جناب دیا نراین نگم۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب ضخامت ۲۱۶ صفحات قیمت آٹھ آنے۔ (۸؍)

زمانہ کا جوبلی نمبر جس کا ایک عرصہ سے انتظار تھا۔ بالآخر شائع ہوا اور بڑی آب و تاب سے شائع ہوا۔ اتک اردو رسائل میں دلگداز لکھنؤ کے علاوہ صرف زمانہ کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اپنی عمر کی پوری پچیس منزلیں طے کر چکا ہے۔ زمانہ اپنے اوائل اجرا سے ادب اردو کی جو قابل قدر خدمت انجام دیتا رہا ہے وہ مخفی نہیں۔ اب جوبلی نمبر ہمارے سامنے ہے اور بے اختیار خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ نظمیں شگفتہ اور پر اثر اور مضامین دلچسپ اور سبق آموز ہیں

جوبلی نمبر مرتب کرکے شائع کرنا جناب نگم صاحب کا غریب اُردو پر ایسا احسان ہے جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ مضامین کے علاوہ دو خوبصورت سہ رنگی تصاویر اور پچاس سے زیادہ سادہ تصاویر ہیں جن میں غالب حصہ زبان اُردو کے انشا اور موجودہ محسنین کی تصاویر کا ہے۔ مضامین نگار حضرات کی فہرست میں خان بہادر شیخ عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ، مسٹر جے آر۔ رائے جرنلسٹ، پنڈت منوہر لال زتشی، سید حامد حسین قادری، مولوی عبدالقادر سروری، جناب وصل بلگرامی، پنڈت امرناتھ ساحر، خواجہ عبدالرؤف عشرت، منشی پریم چند، جناب سدرشن اور حضرت خواجہ حسن نظامی جیسی زبردست شخصیتیں موجود ہیں۔ ادھر شعرا کی صف میں مولانا صفی لکھنوی، ریاض خیرآبادی، عزیز لکھنوی، جگر مرادآبادی، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، اصغر گونڈوی، ابوالاثر حفیظ جالندھری اور افسر میرٹھی جیسے باکمال اور ممتاز شاعر جلوہ آرا ہیں۔ لٹریچر، تاریخ، سیاسیات، شعر و شاعری، افسانہ نگاری غرض ہر صنف کے مضامین رسالہ کی زینت ہیں اور کمال تحقیق و جانفشانی سے لکھے گئے ہیں۔ ہم جناب نگم صاحب کو جوبلی نمبر کی تدوین و ترتیب پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ہمایوں لاہور، سالگرہ نمبر زیر ادارت میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) طباعت و کتابت بہترین سرورق خوبصورت ضخامت ۱۴۲ صفحات قیمت سالانہ پانچ روپیہ سال گرہ نمبر شاید ایک روپیہ۔

ہمایوں ادبیات اُردو کی جو گراں قدر خدمت بجا لا رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی سنجیدہ روش نے دنیائے صحافت میں اس کا اقتدار کافی بلند کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر نمبر خاص اہتمام سے شائع ہوتا ہے لیکن سال گرہ نمبر سب سے سبقت لے گیا ہے۔ نثر و نظم کے مضامین تمام تر مفید اور جاذب نظر ہیں۔ نظموں میں اڈیٹر صاحب کی نظم "تمنائے محبت"، جناب آزاد انصاری کا "قصیدہ نعتیہ"، ع پ کا "ہجوم جلوہ" اور جناب جوش کا "آفتاب" بالخصوص نہایت پاکیزہ ہیں۔ مضامین نثر میں ہر مضمون ایک دوسرے سے بہتر نظر آتا ہے۔ "تاریخ دنیا پر ایک نظر" اور "سودا کی ہجویہ نظمیں"، نہایت مفید اور کارآمد مضامین ہیں۔ فسانوں کا پلاٹ دلکش اور معیار بلند ہے اس کے علاوہ کئی خوبصورت تصاویر بھی رسالہ کی زینت ہیں۔ صوری و معنوی حیثیات سے رسالہ بہترین ہے۔

مخزن لاہور سالگرہ نمبر

زیر نظر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ طباعت و کتابت بہترین ۲۴۶ صفحات قیمت سالانہ چار روپئے، سالگرہ نمبر ۱۴ ار

جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری تعارف سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور اسی طرح ان کا رسالہ مخزن بھی دنیائے اد
کافی نام پیدا کر چکا ہے۔ اس وقت سال گرہ نمبر ہمارے سامنے ہے، جسے دیکھکر فاضل مدیر کی کوششوں کی داد دینا پڑتی
نمبر ہندوستان کے مشہور ادیبوں اور مصنفوں کے تازہ ترین مضامین کے علاوہ چار تصاویر سے مزین ہے۔ رسالہ میں
تاریخ، جغرافیہ، سائنس، ظرافت، فسانہ غرض کہ ہر صنف کے مضامین موجود ہیں۔ حفیظ صاحب کی نظم " پریت کا گیت
جو زمانہ کان پور کے جوبلی نمبر سے منقول سمجھی گئی ہے بہت موثر جذبات کی آئینہ دار ہے۔ " جنوب مشرقی یورپ میں اسلا
جناب محمود اسرائیلی کا مضمون بہت تدقیق و تفحص سے لکھا گیا ہے اور پُر از معلومات ہے۔ یادش بخیر جناب ملا رموزی کا
مضمون " پشاور تک مگر علی گڑھ تک " بہت پر لطف ہے اور علی گڑھ کے مشاعرہ منعقدہ نومبر ۱۹۲۷ء کے حالات
نہایت ظریفانہ تذکرہ ہے۔ لیکن ڈر ہے کہ کہیں اس کے حقوق " باہتمام مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی " محفو
نہ ہوں۔ جناب تپش کی نظم " حسن نظر " خوب ہے۔ غرض کہ ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے رسالہ سرتاپا بہترین

مرقع لکھنؤ فسانہ نمبر

بہ ادارت جناب وصل بلگرامی۔ کتابت و طباعت اچھی، ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ فسانہ نمبر ایک روپیہ

ہم عصر مرقع لکھنؤ کا فسانہ نمبر بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے اور سرتاپا " فسانہ " ہے۔ مشہور و معروف
فسانہ نگاروں کے شاہکار اس رسالہ کی زینت ہیں۔ سب سے اول فسانہ کی اہمیت اور ماہیت پر دو علمی مضامین
ہیں جو پُر از معلومات ہیں۔ فسانوں میں جناب پریم چند کا " مزارِ آتشیں " جناب سدرشن کا " ہنس کی چال " جناب
مجنون گورکھپوری کا " شکستِ بے صدا " جناب افسر میرٹھی کا " دوا کی قیمت " جناب جلیل قدوائی کا " نوشتۂ مظلوم
اور جناب برق کان پوری کا " میں اکیلا ہوں " قابل دید فسانے ہیں۔ اس قدر کامیاب فسانے شائع کرنا مرقع کی
کامیابی کا بین ثبوت ہے اور ہم جناب وصل بلگرامی کو اس پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ حسب معمول مرقع کی یہ خصوصیت
اس نمبر میں بھی نمایاں ہے کہ بجائے تصاویر کے وہ صاحب مضمون کے عکسِ خط سے ناظرین کو روشناس کراتا ہے اور
فسانہ نمبر تقریباً میں مختلف " عکسِ تحریر " کا حامل ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں مرقع کا فسانہ نمبر خاص وقعت حاصل کرے گا۔

جریدہ مہاجر دیوبند کا رمضان نمبر | مدیر: جناب عبدالوحید صدیقی۔ کتابت وطباعت اچھی سرورق رنگین بالتصویر تقطیع کلاں

حجم ۴۲ صفحات۔ قیمت چار آنے۔ ملنے کا پتہ۔ مہتمم اخبار مہاجر دیوبند

کارکنان مہاجر مستحق مبارک باد ہیں کہ رمضان نمبر اتنا شاندار شائع کیا ہے۔ مضامین نظم ونثر سبق آموز اور کارآمد ہیں۔ نظموں میں "ظہور محمدی" اور مضامین میں "سبل تقویٰ کا ہادی" اور "سفرنامہ غازی" بالخصوص قابل دید ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ خاص نمبر ہر طرح دلچسپ اور مفید ہے۔

اطلاع

زمانۂ تعطیلات میں میگزین کے تعطیلات نمبر اور آیندہ کانووکیشن نمبر کے لئے مضامین نظم ونثر

یکم ستمبر سنہ ۱۹۲۸ء تک حسب ذیل پتہ پر

پہنچ جانے چاہئیں۔ طلبا سے بالخصوص درخواست کی جاتی ہے کہ وہ تعطیلات میں میگزین کو فراموش نہ فرمائیں۔

انیس الدین احمد رضوی ایم اے
اڈیٹر علی گڑھ میگزین

علی جان منزل
امروہہ (یو۔پی)

ہر طالب علم کو

امتحان

کا فکر ہوتا ہے۔ آپ کا سالانہ امتحان بھی نزدیک آرہا ہے۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ آج ہی سے آپ دی ڈاکٹرس ہوم
کی مشہور و معروف دوا BRAINZA کا استعمال شروع کر دیں جس نے ہزاروں طالب علموں کو یقینی کامیابی سے ہم آغوش
کر دیا ہے۔ ٹکیوں کی شکل یہی ہے آسانی سے کھائی جاتی ہے۔

BRAINZA امتحان میں پاس ہوجانے کی ضمانت ہے۔

BRAINZA قوت حافظہ و یادداشت کو جلا کر دیتی ہے۔

BRAINZA دماغ کو چست چالاک بنا دیتی ہے۔

BRAINZA فہم و ادراک کی زبردست معاون ہے

BRAINZA ذہنی اعصاب کی بے ضرر اور کامل غذا ہے۔

BRAINZA عنقریب علمی دنیا میں ایک انقلاب عظیم پیدا کرنے والی ہے۔

کیوں کہ ہر طالب علم اس کے عجیب و غریب فوائد سے استفادہ حاصل کرنے پر مجبور ہوگا۔ قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ

دی ایپر انڈیا میڈیکل مارٹ۔ سہارنپور۔ انبالہ چھاونی۔ لدھیانہ (لکار سائنٹس آفس لدھیانہ)

سفوف منجن

یہ منجن لگانے سے درد دنداں، مسوڑوں کا خون، پیپ آنا، رطوبات دنداں دور ہوجائے گا۔

ملنے کا پتہ

احمد اللہ۔ ساکن لکھی پور۔ ڈاکخانہ دلال پور ضلع نواکھالی (بنگال)

٦"

بیداریٔ ہند

یعنی

ینگ انڈیا کا سلیس اردو ترجمہ

اور

تحریک عدم تعاون کی مکمل تاریخ

یہ اُس مایۂ ناز ہستی کا کارنامہ ہے جس نے ہزار ہا سال کے سوئے ہوئے بتیس کروڑ ہندوستانیوں کو ایک آواز میں بیدار کر دیا تھا اور اُن کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن کر دی تھی۔

جلد اوّل

چار سو صفحات پر مشتمل ہے کاغذ نفیس ۲۰×۲۶/۸ سائز لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجہ ہے
چونکہ مہاتما گاندھی کی تعلیم کی اشاعت اس کتاب کا مقصد ہے اس لئے اس کی قیمت اس کے اخراجات کے مطابق رکھی گئی ہے تاکہ عوام الناس اس کے مطالعہ سے روحانی فیض حاصل کریں اور ملک اور قوم کی بہتری کے لئے اس کتاب کو مشعل ہدایت بنائیں۔

قیمت دو روپیہ محصول ڈاک آٹھ آنہ۔ فہرست مضامین طلب کرنے پر مفت روانہ ہوگی۔

ملنے کا پتہ

ناظم دار الاشاعت بیداری ہند میرٹھ

تاریخ فلسفہ اسلام

از ڈاکٹر عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی ہالینڈ کے مشہور ... اور مستشرق ٹ۔ ج دی بوئر کی گرانقدر تصنیف ... براہ راست جرمن سے سلیس اردو ترجمہ جو ابھی حال ہی میں ... ہوئی ہو مگر نہایت تیزی سے نکل رہی ہے قیمت صرف ... روپیہ (عہ)

تاریخ الدولتین

خلافت بنی امیہ و بنی عباس کے حالات پر دلچسپ تبصرہ از علامہ جارج زیدان ... مہ مولانا نیاز فتحپوری قیمت عہ

تاریخ ہند قدیم

قدیم ہندوستان کی تاریخ کا یہ ایک مختصر خاکہ لیکن نہایت جامع خاکہ ہے اور قابل قدر ... مطالعہ از ایم پانیکار (اردو ترجمہ) قیمت عہ

قواعد عربی کتاب الصرف

اردو زبان میں عربی صرف پر نہایت مستند اور مکمل ... ہے از علامہ سورتی استاذ جامعہ قیمت عہ

مبادی معاشیات

علم المعیشت (اکنامکس) پر مبتدیوں کے لئے ... مفید و مستند کتاب از ایڈورڈ کینن مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ... اے پی ایچ ڈی قیمت عہ

انتخاب میر

حضرت میر تقی میر کے کلام کا دلکش انتخاب مع حالات و مقدمہ جس میں آپ کی خصوصیات و امتیازات شاعری پر دلچسپ بحث ہے۔ از مولانا نورالرحمن صاحب بی اے علیگ۔ خوبصورت و مضبوط جلد عمدہ طباعت۔ عہ

دنیا کے بسنے والے

جغرافیہ بچوں کے لئے نہایت عجیب مضمون ہے لیکن اس کتاب ... بشیر حسین صاحب زیدی بی اے کنٹب بار ایٹ لا ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علی گڑھ نے ایسے دلچسپ دلنشین انداز میں دنیا اور اس کے باشندوں کے حالات لکھے ہیں کہ شروع کرنے پر بغیر ختم کئے جی نہیں چاہتا۔ چھوٹا سائز تقریباً ۱۰۰ تصاویر نہایت اعلیٰ طباعت بہترین کاغذ و کتابت قیمت ۸؍

مقدمہ شعر و شاعری

خواجہ حالی مرحوم کے دیوان کا مقدمہ شاعری پر فلسفیانہ و محققانہ بحث اور اردو شاعری کی اصناف پر نہایت دلچسپ و لطیف تبصرہ مع فوٹو عمدہ طباعت خوبصورت جلد زیر تیاری عہ

بدائع سعدی

حضرت شیخ سعدی کی غزلیات کا نہایت مستند اور پاکیزہ نسخہ مطبوعہ جرمنی قیمت للعہ

ترکوں کی کہانیاں

بچوں کے لئے نہایت اچھی کتاب ہے۔ قیمت ۱۲؍

ہمارے نبی

سردار دو جہاں صلعم کی سیرۃ پر بچوں کے لئے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں قیمت ۴؍ رعایتی ۲؍

یہ اور دوسری عمدہ عمدہ کتابیں ملنے کا پتہ: **مکتبہ جامعہ دہلی قرول باغ**

"THE EVE OF DEPARTURE."

The closing scenes on the Eve of the Departure of the Doctor, were not only perfectly in harmony with the twenty two functions that had preceded but they were out-shone in splendour and brilliancy the activities that had been witnessed before. The evening of the 18th May, saw the classical gathering of the elderly members of the Oriental Department and the various literary societies of the University, a gathering of about two hundred persons including the Legal Adviser of the University. The conveners one by one made a short address at the time of presenting the gifts which consisted decent sets of books symbolic of the nature of each society :—

An Edition de luxe of the *Holy Quran*, a set of *Seerat-i-Nabvi* by Moulana Shibli, a set of finest edition of *Amir Khusroe's works*, *Poetical works* by Dr. Iqbal and Ghalib, *Arabic* literary books by Dr. Tritton and Moulana Abdul Aziz Mamon; *The Abbasides* by K. M. Jalaluddin, and translation of *Bhagwatgita* by Pt. Ram Sarup Shastri.

The Parting Scene – A memorable "send off"

Standing at the door of the saloon, the retiring chief with irresistible emotions on his face such as parents betray when parting from their dearest pets and fledges, handed over the draft of his farewell message to the Vice-President of the University Union who discharged his heavy task calling his manly courage to his aid, and the countless throng of listeners heard the message of their beloved master with tears in their eyes and heavings in their bosoms evident in spite of restraint.

The next minute was heard the shrill sound of the guard's whistle. The train moved slowly carrying its precious burden and like gods vanishing in the blaze of light the great Doctor, submerged under heaps of floral wreaths and beneath incessant showers of rosy petals and blossoms, disappeared under vociferous shouts of '*Khoda Hafiz*', farewell blessings, and reverbrations of hopes for re-union.

SPEECH

OF

Dr. L. K. Hyder Professor of Economics, Member of the Royal Agricultural Commission.

Proposing the toast of the health of Dr Ziauddin Ahmad at the Dinner given by the University Staff The dinner was very largely attended by the representatives of all phases of active life in the town and the University.

Mr Vice-Chancellor and Dr Ziauddin

We have assembled here to bid farewell to Dr Ziauddin who has been for such a long time the principal officer of the University He has had a long, honourable and useful association with Aligarh I say the running of this institution is a very difficult task In it is summed up the result of an assiduous labour of a generation and is not the result of one man Every one knows the outline of the activities of our principal guest who was yesterday our officer His activities are not only known to those who have been associated with him as colleauges and members of the staff but also to the Mussalmans of India I say when proper time has come Dr Ziauddin will occupy an important place in the roles of men who have built up the University Dr Ziauddin's work will then be appreciated and I do not feel that all men will then be in a hurry to foretell the proper appreciation of his useful and honourable activities in this work which is of a very large community of India. He is an educationist who has rendered brilliant services to the cause of Muslim education, we all know that he was a member of a very important Commission the recommendations of which have been perfectly and clearly before you Before long he was a teacher and exercised his influence on a large number of men many of whom are his admirers and pupils who have benefited from his work outside our community. He is a Mathematician and I do not think that the Muslim community has produced any other of his mark. I say, gentlemen, judge him from his attainments, by his scholarship and by the heavy work which he has done and he ultimately succeeded in getting the University six years ago from the Government and it is of course to his credit.

Mr. Vice-Chancellor, I have taken a considerable amount of time and I do not wish to take more. But I say that commissions come and commissions go and every body knows what their results are. Gentlemen, we have a number of defects here as elsewhere and we welcome criticism. We know the conditions in this University. But it is also necessary that criticsm which do not seem important have been dealt with constantly with party feelings and discussions The work of building and equipping the young minds which has been entrusted, requires peace and cannot be carried on along with such discussions I say I have to speak with considerable amount of restraint that to have our institution a flourishing institution and

and best of friends and sympathiser. And it is a friendship which is based on the bedrock of our love and affections, which neither time nor 'distance' can lessen.

> "Though boundless ocean roaring wild
> Lie vast twixt thee and me
> They never never can divide
> Our hearts and souls from thee"

But Sir, it is a moment when we should not give way to grief and sorrow although the period of your separation from us is not very long, appears now [illegible] our mind is fraught with happy recollections of the past, to be a crisis, which [illegible] and circumstances [illegible] will decide as to how we shall be able to endure it. Let us however [illegible] the hope that the period which now looks to us so dark and gloomy will become bright and cheerful when we will again hail you in our midst at Aligarh when you will return from England after having won your spurs [illegible] with [illegible], an ornament to your community and your [illegible] God grant that you may be able to vindicate [illegible] of this College and wipe out the slur to the fullest extent, that is often cast on the Musalmans that they have neither the aptitudes nor the brains for Mathematics. God grant that like the other sons of the soil who after crossing the barriers that nature and men have placed in their way have gone out to England and made their mark and carried palm of success though pitted against those whose early influence and education were far superior to theirs, have yet shown to the civilized world that Indian intellect if properly cultivated is in no way inferior to the English or for that matter to the European mind in vigour and capacity, you may also be able to prove that if the Musalmans have once carried the conquest of their arms from one end of the globe to the other, they can as well, now when they have sheathed their swords, extend their conquest on the more enduring empire of Literature and Science and equally capable of winning the highest triumphs in the cultivation of peaceful arts

In the end, Sir, we thank you from the bottom of our hearts, for the kindness and patience with which you have received our humble address, which we feel is not sufficiently expressive of our genuine love and sincere gratitude towards you.

We remain,
Sir,
Yours affectionate and loving pupils,
The Students
of the M. A.-O. College,
Aligarh,
N. W. P., India.

College of which you are so brilliant a product, and have placed you at the head of these so many distinguished Alumni, not only of this institution but of the University as well. And judging at so early a date as now, when you have not as yet set your sails on the vast expanse of waters that for three or four years to come shall separate you from us, judging from your bright past, we may confidently indulge in a hope that you have a brighter future looming before you, a future that shall reflect honor on yourself, your community and your country. You go out to England with an amount of Mathematical knowledge to drink more of the stream at its sourse, such as no Indian student has gone there before. And by this we may hope that your success would be unparalleled in England that you would succeed in carrying off with flying colours, the blue ribbon of English scholarship.

But, Sir, appreciating as we do to the fullest extent the high academic honours you have achieved in India, and entertaining confident hopes for the still higher honours you are bound to achieve in England in the direction, we think we are wanting in imagination did we place your forte in them alone and did not concieve of the many other noble qualities both of the head and the heart, of which the Providence has bestowed upon you so abundant a share . .. The example of self-sacrifice and devotion to the national institution which you have set, by throwing to the winds the many prospects of a career in the Provincial Civil Service which despite the expostulations of your friends and relations you declined to join and by disregarding the sweets of this world which follow in the train of a successful career in the worldly sense of the word, you have chosen to live and move in those high ideals which are the source of inspiration in the votaries of knowledge and to those in whom the love for doing good to their nation is strong above all other considerations... and we believe zeal for knowledge and devotion to the national cause, have been the springs of action and the ruling passions, of your life—is an example that has hardly a parallel among the educated members of our community. By becoming a model of self-sacrifice and devotion you have justified, we believe, the aims of the founders of this College and raised a hope that if some more of the gifted youths of our community were to tread upon your footsteps our educational backwardness will become a thing of the past.

Sir, we as students should not assume the province of judging your valuable services as a professor in the College staff. This much, however, allow us to say that the excellent result in the University Examinations in Mathematics, a glory which you share with your veteran senior Baboo J. C. Chakravarti to a considerable extent, are sufficient testimony of the excellence of your teaching, and that your place there can hardly be filled up. The patience with which your lectures have been received in the lecture-rooms, the interest they have created in us for that branch of the learning, and the success which they have helped to bring us in the University Examination, will we hope, amply prove to your satisfaction that your teaching has been well appreciated.

AN HUMBLE TRIBUTE OF DEVOTION AND REGARD PAID BY THE STUDENTS OF THE M. A.-O. COLLEGE, ALIGARH,

TO

Professor Ziauddin Ahmad, M. A., D. Sc. on the happy occasion of his going to England as a State Scholar

July 28th 1901

ADDRESS

to

PROF. ZIAUDDIN AHMAD M. A. D. Sc.,
MUHAMMADAN ANGLO-ORIENTAL COLLEGE
ALIGARH, INDIA

Sir,

We the students of the Mohammadan Anglo-Oriental College beg l[eave] to approach you with our humble address of farewell on the auspicious occas[ion] of your departure to England. And as we approach you in this capacity with hearts full of the conflicting emotions of joy and sorrow, each struggling to get [the] mastery over the other, we are painfully conscious of the fact that our hum[ble] address can be but an inadequate exponent of the various feelings and sentim[ents] by which we are animated on this memorable occasion. We rejoice to think th[at] your departure for that country which so to speak, is the Land of Promise, for ever[y] Indian student, who has a love of learning and thirst for knowledge in him, is [an] epoch-making event in the history of this College. We are sorrowful because [we are] losing the pleasure of your company and the benefit of your wholesome coun[sel] which you so readily gave to everyone of us at all times of and on matters of every description concerning our well being, we the students of this College are losi[ng] in you our best guide, philosopher and friend.

Sir, we have said that your departure marks an epoch in the history of this College. No other Alumnus of this College has gone out to complete his education in England with such a noble resolve as you do, the resolve we mean, which you have made to devote your life, after having completed your studies in England to the service of your Alma mater, which is proud today, of her such an illustrious son as yourself. The high distinctions which you have invariably acheived in the University Examinations your unexpected success in most difficult and highest examination of the Doctor of Science in the First class for which unique success you are awarded the State-Scholarship to prosecute your studies at one of the two oldest and greatest seats of learning in England, has considerably advanced the fame of this

ADDRESS

To,

DR. ZIAUDDIN AHMAD,

C. I. E., M. A., Ph. D., D. Sc.
Pro-Vice-Chancellor,
MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

Sir,

We the members of the Curzon Geographical Society have assembled here this afternoon with our humble tribute of sincere regard and veneration, to bid you a hearty farewell on the eve of your retirement from the Aligarh Muslim University.

Sir, you have devoted 33 long years of your precious life to the cause of education and to the service of this great national institution, and it is our honest conviction that all that you did was inspired by an earnest desire of promoting the good of the institution and elevating the educational status of the community. We [illegible] that every movement of yours was permeated with sincerity of purpose and the love of community. You have always remained true to the institution in spite of so many external temptations, your services have been unrivalled and invaluable.

Your connections with our Society though not very old, will always be remembered with gratitude. After the inauguration of the Department of Geography in 1924, when we came into existence, you gave a special attention to our needs by a substantial financial and official support, with the result that during the course of only a few years, we rank in the 1st grade societies of the University, with a well-equipped library and reading room. Our society is the first of its kind in India, and we strongly hope that when the difficulties which are at present hampering the full fledged progress of the Department are removed, we shall be able to do more service to the Community.

In the end we all wish you a happy, glorious and diginfied future.

WE BEG TO REMAIN,
Sir,
Yours Obediently,
Members of the Curzon Geographical Society.

19th May, 1928.

افق علی گڑھ آپ کی طاعت ریزوں سے منور رہا - آپ نے علم و فضل میں کمال پیدا کیا اور یہی سبب ہے کہ آپ ہمیشہ علم دوست اور علم پرور رہے آپ طالب علم تھے اسلئے طالب علموں کے سچے محسن اور ہمدرد رہے - ہندوستان کے اس کعبۂ علم و فن کے آپ علمبردار رہے - ریاضی ، ہندسہ کا شعبہ ہمیشہ آپ کے فضل و کمال کا معترف رہے گا البیرونی کی تصانیف ریاضی و ہندسہ کو آپ نے موجودہ زمانہ سے روشناس کرانے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ارباب فن کے نزدیک بہت مفید اور مہتم بالشان امور کی حامل ہیں - خسرو فہمی کے سلسلہ میں آپ نے امیر خسرو علیہ الرحمہ کے عالمانہ اور شاعرانہ کمال کا حسن انتخاب اور خلوص سے احیا کیا ہے وہ علمائے علم ادب سے خراج تحسین و شکر حاصل کر چکا ہے - آخر اخر میں آپ نے سبحان اللہ خاں لائبریری کے حصول میں جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ آپکی علم دوستی اور ہنر پروری کا عدیم المثال شاہکار ہے *

مخدوم و محترم ! یہ تو آپ کی عالمانہ حیثیت کا ایک نامکمل اور دھندلا سا مرقع تھا - لیکن جب ہم آپ کی اس مخصوص حیثیت پر نظر ڈالتے ہیں جو ملازمت اوقات میں باعتبار پروفیسر ، پرنسپل اور پرو وائس چانسلر آپ کو حاصل ہوئی تو فرط جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں — ہم میں کافی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے آپ کا نام اور آپ کے کارنامے اپنے اعزا اور والدین سے سنے ، اس سے زیادہ تعداد اُن کی ہے جن کو آپ کا تقرب حاصل ہوا اور جنہوں نے آپ سے استفادہ کیا لیکن ان لوگوں کی تعداد یقینا بہت زیادہ ہوگی جو آپ کے نام اور کارنامے آیندہ سنیں گے اور اُن کو دلیل راہ بنائیں گے - اس درسگاہ میں طلباء اور اسٹاف کو آپ نے ملک و قوم کے لئے معتبر اور مفید بنایا — ہم جب کبھی اس درسگاہ سے باہر گئے اور کسی طالب علم کو خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو بعض تعلیمی تکالیف یا موانع میں اسیر پایا اور اُس نے ہم سے رجوع کیا ہم نے بلاتامل اس کی امداد و اعانت کی ضمانت کرلی ، محض اس بنا پر کہ " ڈاکٹر صاحب " اس دقت کو رفع کرسکتے ہیں ، ہم خود جب کسی تکلیف یا دقت میں مبتلا ہوئے یا اس کا امکان ہوا معاً اس خیال سے تسکین ہوگئی کہ " ڈاکٹر صاحب " سے رجوع کیا جائے گا - کالج میں جب کوئی غیر معمولی پیچیدگی پیدا ہوئی اور ہم کو اس کی خبر لگی ہمارا پہلا سوال یہ ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں ، " حکایت لطیف " ہے اس لئے طوالت سخن کی معذرت کرتے ہوئے یہاں ہم ایک واقعہ کا ضرور تذکرہ کریں گے ، آج سے چند ہی سال قبل پولیس والوں سے جھگڑا ہوا - شام ہوچکی تھی اور تاریکی پھیل گئی تھی ، چند لوگ جن میں اسٹاف کے بعض ممبر ، چند طلبا اور دو ایک بیرونی اشخاص تھے وکٹوریہ گیٹ کے سامنے سے گذر رہے تھے یکایک ایک شور اُٹھا اور باغ کی سامنے والی روش سے طلبا کی ایک کثیر تعداد دوڑتی بھاگتی ہوئی وکٹوریہ گیٹ تک پہونچی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اراکین پولیس اور طلبائے کالج سے جھگڑا ہوگیا ہے ، موٹر اور گھوڑے

سپاس نامۂ وداع

بخدمت اقدس جناب محترم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب، سی آئی ای، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، سابق پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دام اقبالہ

جناب عالی،

ہم ممبران [illegible] آج آپ کو خدا حافظ کہنے کے لئے جمع ہوئے ہیں [illegible] علی [illegible] صف صدی کی حیات پرور اور [illegible] عمال کی [illegible] جو [illegible] اسلامیہ کے زوال [illegible] ہوا [illegible] صورت میں جلوہ گر ہوا ۔ فطرت انسانی [illegible] محسوسات پر ایمان [illegible]

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

یہ [illegible] جس کو ہم [illegible] ہیں، [illegible] ہمیشہ آمادہ [illegible] اس کے تصور و تصور نے [illegible]

[illegible] سے تھا

کے اصول پر [illegible] محسن الملک اور وقار الملک کا ۔ جناب کی ذات بھی [illegible] سلسلہ کی ([illegible]) آخری کڑی تھی آج وہ بھی ہم سے جدا ہورہی ہے ۔ حیف کہ [illegible]

جناب والا [illegible] علی گڑھ میں آنے کی دو باعث [illegible] ہمارا [illegible] ایک واصل اجل کی اور دوسرے طالب علموں کے صحیح اور سچے محسن کی، جناب کی ذات آج ہم سے جدا ہورہی ہے لیکن دونوں حیثیتیں آپ کی ذات سے کبھی جدا نہیں ہوسکتیں اور یہ ہمارے امتنان اور اطمینان کے لئے کافی ہے ۔ علوم ریاضی ۔ ہندسہ میں آپکا رتبہ جیسا بلند ہے اس سے زیادہ فیض بخش اور فیض رساں رہا ہے ۔ جہاں تک اس صنف علم کا تعلق ہے ہم فخر کے ساتھ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک میں بھی آپ کو صف اولیں میں جگہ مل چکی ہے، الہ آباد اور کلکتہ میں انتہائی اعزاز کے ساتھ آپ نے اپنی طالب علمانہ سعی و محنت کا ثمرہ حاصل کیا ۔ اس کے بعد جرمنی اور مصر کے آسمان علم و فضل پر شمس و قمر بن کر درخشاں رہے اور متعلقہ علوم و فنون کی تکمیل کے بعد آج تک

آخر میں ہم تمام خادمان انجمن الفرض جنابہم کو بصد ادب و عقیدت خدا حافظ کہتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خدا جناب کے عزائم نیک میں برکت دے اور اس آئندہ حیات میں جناب ہمیشہ مسرور و کامران رہیں — آمین ثم آمین *

ہم ہیں جناب کے عقیدت مند اور سپاس گذار
خادمان انجمن الفرض – مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۷ مئی سنہ ۱۹۲۸ ع

نہیں معلوم بلبل آج کیوں بے تاب ہوتی ہے * جدائی ہے کسی گل سے گلے مل مل کے روتی ہے
فلک تجھ سے گلا ہے تفرقہ ڈالا ہے آپس میں * یہ فرقت آج دل میں تخم مایوسی کا بوتی ہے
خدا نے اپنی رحمت سے دیا تھا ہم کو وہ گوہر * جو بحر حسن و خوبی کا عجب انمول موتی ہے
جدائی شاق ہے واللہ ہم کو ایسے محسن کی * کہ جسکے خلق کی تعریف ہر محفل میں ہوتی ہے
مری بے صبریوں سے کہہ رہی ہے مری بدبختی * کہیں آہ دل عشاق میں تاثیر ہوتی ہے
کرشمہ دیکھ لینا ایک دن برق تصور کا * کہیں آزادگی صید کش صیاد ہوتی ہے
علیگڈہ میں اکیلا چھوڑ کر جاتے ہیں کس جانب * الٰہی کیا قیامت ہے یہ قسمت کیسی سوتی ہے
رہیں شاداں و فرحاں تا قیامت ڈاکٹر صاحب * بدرگاہ الٰہی یہ دعا دل سے ہوتی ہے
رہیں گے حشر تک محفوظ طوفان حوادث سے * کہیں جھونکوں سے گل شمع صفاءالدین ہوتی ہے
چمن بعد جدایاں یاد کرلینا کبھی ہم کو * یہی اب التجائے عشق و دل تجھ سے ہوتی ہے

جدائی اُس سے ہے نوبیں حسن پر دل تصدق ہے
سناؤں کا جوں ہوتا ہے اور حسرت بھی روتی ہے

سپاس نامۂ وداعیہ

بجناب اقدس و اعلیٰ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب، سی آئی ای، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

جناب محترم!

ہم خادمان انجمن الغرض مسلم یونیورسٹی علی گڈھ انتہائی ادب و عقیدت کے ساتھ جناب کو خدا حافظ کہنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں — جو گوناگوں مصروفیت، دلچسپی اور ہمدردی آپ کو اس عظیم الشان درسگاہ کے مختلف شعبوں سے رہی ہے اس کا اندازہ لگانا تو

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

کا مصداق ہے — بہرحال ہم اپنی محدود سپاس گزاری سے بخوبی عہدہ برآ ہوسکے یا نہیں اس کو کیا کیا جائے اس سے عہدہ برآ ہونے کی ناکام کوشش ہی ہماری تسکین قلب کا باعث ہے — انسانی فطرت کی سعی و عمل کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقصود کے حصول سے زیادہ سعی حصول سے لطف اندوز ہوتی ہے پھر آپ سامنے ہیں اب احسان مندی قلب کا پیمانۂ شکر بہت جلد لبریز ہی نہیں ہوتا بلکہ جلد سے جلد چھلک بھی جاتا ہے — آپ جب تک ہمارے ساتھ رہے ہم مسرور و مطمئن رہے — اب جب کہ آپ ہم سے رخصت ہورہے ہیں، آپ کا احسان آپ کی ہمدردی اور دلسوزی اور ان سب کا مجموعہ آپ کی یاد عزیز ہمارے قلوب میں ہمیشہ تازہ رہے گی *

مخدوما! اگر مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کی تعلیمی بیداری کا تنہا مرکز ہے تو پھر بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اُس کے قبول عام اور مفید انام ہونے کا راز انجمن الغرض کے وجود سے وابستہ ہے — آج مدرسۃ العلوم نہ ہوتا تو ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی یا مذہبی بیداری کا نقشہ کچھ اور ہوتا — لیکن اس میں شک نہیں اگر انجمن الغرض کا وجود نہ ہوتا تو شاید مدرسۃ العلوم بھی نہ ہوتا، یا ہوتا تو اتنا مفید اور مقبول نہ ہوتا جتنا کہ ہم اسے اب پاتے ہیں — اس حقیقت کا اندازہ ہم سے زیادہ وہ لوگ کرسکتے ہیں جنہوں نے طالب علمانہ زندگی کی سختیوں کا مقابلہ انجمن الغرض کی سپر سے کیا اور بالآخر فاتح کہلائے *

جناب والا! جیسا کہ آپ پر روشن ہے انجمن الغرض کی بنیاد سنہ ۱۸۹۰ع میں پڑی اس کا مقصد خصوصی قوم کے نادار اور ہونہار طلباء کی مالی اعانت ہے اس مقصد کی کہاں تک تکمیل ہوئی اس کا اندازہ آپ اس سے فرما سکتے ہیں کہ اب تک اس سلسلہ میں انجمن نے چار لاکھ سے زائد روپیہ جمع اور تقسیم کئے اور اس وقت یونیورسٹی اور انٹر میڈیٹ کالج میں

this Institution which would remain in days to come, the home of Dr. Sahib as it had been in the past. He assured the students that he would never let the candidates go back disappointed and he would secure all possible means to grant admission to the largest possible number. He reassured them he would never yield to the Enquiry Committee's recommendations to limit the number of students.

The students expressed their wish that a full size oil painting of Dr. Ziauddin Ahmad be placed by the side of Sir Syed's portrait in the Strachey Hall.

In reply to the Address presented by the Economic Society.

Dr. Ziauddin said that there was an intimate relation between Mathematics and Economics. The recent German Mathematical Encyclopaedia devoted a volume to Economics. The simultaneous study of Economics and Mathematics was discouraged by the action of the Allahabad University in transferring Mechanics from Physics to Mathematics. Consequently the number of Arts students taking Mathematics had substantially diminished. He further said that Economics had a great future in India and its study should not be confined to book learning, but it should be extended to the real problems of life as discussed in Legislature.

The function was very imposing and was attended by the local members of the court, members of the staff of allied institutions and students. The address was presented in a silver casket.

9

REPLIES GIVEN AT DIFFERENT FUNCTIONS

BY Dr ZIAUDDIN AHMAD

In honour of Dr Ziauddin Ahmad the Cricket club presented an Address in a silver casket Captain Hamiduzzaman referred to the services of Dr Ziauddin and the great impetus given by him to this club during the last thirty three years of his service Replying Dr Ziauddin said that cricket club had [illegible] contributed to the reputation of the Institution and had [illegible] encouragement for new players Three other addresses in silver caskets were presented by the Tennis Swimming Bath and Football Clubs, reference being made to the [illegible] interest taken by the Dr Sahib in the advancement of these spheres of university [illegible] Captain [illegible] Hosain spoke of the [illegible] Dr Ziauddin's regime Dr Zafarul Hasan speaking on behalf of the Philosophical department referred to Dr. Ziauddin's greatness as one of the [illegible] and Philosophy, who had years ago [illegible] which very few others knew He felt proud of being a pupil of Dr Ziauddin to whom he owed a debt of heavy gratitude These functions were [illegible] and clubs of the city The dinner given this occasion by the University [illegible] was the most important among the reception [illegible] sight Student members of the various University [illegible] were present in large numbers cordial speeches [illegible] and Qasidas were recited in praise of Dr Sahib the principal speakers were Ali Maqsood and Qasim Rizvi, the latter said that he felt it [illegible] to utter the word farewell to the learned Dr, sharer for thirty years of the sorrows and joys of his students An embodiment of love and virtue, Dr Ziauddin was above formal expressions of praises He compared him with Sir Syed in view of Dr Ziauddin's courage in saving the Institution at the tumultuous period of Non-co-operation a calamity far more formidable than any the great Syed had to face Saviour of the Institution, the Dr. was great here and he would prove great wherever he would go His students could not possibly forget one so very very dear to them nor need they fear that he would even forget his children Dr Ziauddin replying said he has ever considered every single student at Aligarh as a precious asset of his community and as such he thought an individual student fully entitled to all manner of support and encouragement from him as the academic head In spite of official separation his personal solicitude for Aligarh boys would remain unimpaired

Nawab Sir Muzammilullah Khan expressed his great sorrow for the cessation of his official relations with Dr Ziauddin Ahmad But he felt sure that his admiration for Dr. Ziauddin's sterling qualities would never suffer any diminution Dr. Ziauddin in his future career would continue to further the cause of

8

ADDRESS

BY THE ECONOMIC SOCIETY

To

Dr. ZIAUDDIN AHMAD,

C. I. E., M. A., Ph. D., D. Sc.

We, the members of the Economic Society assembled here this after-noon come here to give expression to our feelings of sincere regard and gratitude which we feel in presenting this farewell address to you.

Your unfailing kindness, real sympathy and constant solicitude for our welfare have won a warm place in our hearts.

You have dedicated thirty three years of your life to the cause of education and to the service of our premier national institution. You served it when its existence was imperilled. Your knowledge and talents were at the disposal of the University when it came into being and ever since its inception you have laboured hard to place the young University on a sound and secure basis in all respects. We are also aware of the fact that you devoted what you could snatch of the Long Vacation not to enjoy a well-earned rest but to tour in the country, in furtherance of the aims and objects of our University. We of the present generation of students can hardly realize the magnitude of your task and the difficulties inseparable from a period of constructive activity. We appreciate, however, your selfless devotion to the cause of our *Alma Mater.*

Our Society owes its existence to you. You gave it its present habitation. You made it possible for the Society to acquire the nucleus of seminar Library and you supported the idea of visits to industrial places. Such encouragement could have come only from one who is pre-eminent in a subject closely allied to Economics, *viz.*, Mathematics. Economics and Mathematics as you, Sir, are well aware, go hand in hand. We earnestly hope that now with greater leisure, you will bestow on Economics a little portion of your great gifts which you have showered on Mathematics. The twin sister of Mathematics stands to gain by such attention.

We are sincerely sorry that your formal connection with the University has come to an end. We do not doubt, however, that in you we shall possess in the outside world in future one who is an old and tried friend of the institution, a zealous upholder of its ideals, a vigilant guardian of its rights, privileges and honour and a genuine wellwisher of its alumni.

In the end, Sir, we assure you once more of our sincere feelings of esteem and gratitude for all you have done for us and of our admiration of all the signal services you have rendered to our *Alma Mater.*

WE BEG TO REMAIN,
Sir,
Yours very Obediently,
The Members of the Economic Society.

11th May, 1928.

7

ADDRESS

PRESENTED BY SCIENTIFIC SOCIETY

To,

Dr. ZIAUDDIN AHMAD,

C. I. E., M. A., Ph. D., D. Sc.,

Senior Wrangler & Newton Scholar

Sir,

We have gathered here to bid you farewell not solely prompted by the fact that you were the Pro Vice Chancellor and the Academic Head of our University but because we always looked upon you as a distinguished Professor of Mathematics and a Patron of science.

We feel the departure from amongst us of the only Mathematician whom the 20th century has produced in the East and whose presence in the Institution always reminded us of the Great Muslim Mathematicians of the Past such as Musa Ibni Kazim, Omer Khayyam, Alhazen and [illegible] Rahim Moorani. There are other eminent Mathematicians in the East, but there is none like you who had been able to show his mathematical genius by winning the famous Newton scholarship.

Einstein is your contemporary and we are confident that you can out shine him if you give yourself to the pursuit of Science and Mathematics alone. You are an Indian Mathematician and every body knows that India was the cradle of Mathematics in the days of infancy of the Human Society. We hope that you will restore to India the exalted position it once had in the Mathematical world.

Sir, our feelings of sorrow at your departure become still greater when we see that the only living Newton Scholar in the world is leaving us. Not only that we are losing in you the premier Muslim educationist, a great Scientist, an Expert in Optics, an Economist and a Philosopher.

Sir, your retirement from the University is a cause of greater pain to those who have had the proud privilege of being your pupils in as much as your substitute as the Head of the University may be found but ours is an irreparable loss.

Now that you are leaving let us request you not to forget us and to occasionally inspire us by your learned company.

Sir, we feel justified in hoping that after the severance of your formal connection with this Institution and the consequent release from its multifereous activities you will now find time and opportunity to take a more active part in Mathemetical activities and Scientific work thus adding to the glory of Aligarh in particular and Musalmans in general.

At the end, Sir, we bid you farewell, and wish that success may attend you where ever you go.

WE BEG TO REMAIN,
Sir,
Your most obedient
STUDENTS OF SCIENCE.

[illegible] which rumour spreads in our University jurisdiction. But if I were roused [illegible] my sleep of a mid-night to be told that I had been found guilty of a strange behaviour — dancing naked on the cricket field and that the report had been made against me to Dr. Ziauddin, I should pull the sheet over again and sink once more into fast repose in the full conviction that Dr. Ziauddin would not think of me the worse for it. I would walk into his presence the following morning an applicant for promotion which he was bound to grant (cheers).

G. K. Chesterton says that the knave is one who can only shine by contrast to others whom he throws into obscurity while it is the truest index of heroism and sterling greatness that even little men are made to feel great in the presence of the great man. My learned friend Mr. Syed Sajjad Hyder said exactly the same on the other day when he was speaking as the mouthpiece of the Administrative [illegible]. I never felt embarrassed all my life in the presence of Dr. Ziauddin. I remember the words of one of my student speakers who said in the Strachey Hall that though Dr. Ziauddin ceased to be our official overlord, his kingship over our hearts has been firmly established. To borrow the language of physical science Dr. Ziauddin is an optical delusion. He stands too close to us to be seen in his real greatness and the future only will reveal to wondering posterity the greater qualities of the greatness of his head and heart.

I am sure I voice the sentiments of every body present here when I express the wish that God may grant Dr. Ziauddin many many years of life, health and glorious prosperity. (Prolonged applause).

(b) Speech of Mr. Inamullah Khan, M. A.

Believe me when I tell you that of all the occasions when I have had the honour of addressing you this is precisely the one on which I wish I should have been spared the cruel necessity of making a speech, for my heart is too full of grief and there is required at the present moment a good deal of harsh self-control of which one may not always be capable. 'Is this the end? is this the end?' said the soul of Tennyson as it hovered round and round the mortal remains of Arthur Hallam and though he had to recognize the sad catastrophe for an irrevocable fact, I can quite imagine that poor Lord Tennyson in his unconscious moments must have said the same thing over and over again as long as he continued to breathe. I know for certain that Dr. Ziauddin Ahmad is to go from our midst, but my spirit revolts and would rather not recognize the fact. Alas! Gentlemen, I would bribe anybody to convince me that all that is happening is but a night-mare—and I should rise the next morning rid of the troublesome dream and offer two *rakats* of prayer from a heart overflowing with gratitude.

الٰہی سب غم میں ایسا ہو کوئی خواب دیکھے سحر ہو گئی

'Tongue tied, my queen,' said Sicilia to his consort in Shakespeare, but the poor woman found her tongue stuck in the root of her palate, dismayed with the grim shadow of the coming tragedy, for, believe me, gentlemen, I cannot yet conceive what Aligarh will be without Dr. Ziauddin. It was comparatively an easy job if I were to repeat that which you already know and have heard a hundred times, and I should say it to you, Sir, for a hundred and the first time that Dr. Ziauddin Ahmad was the Senior Wrangler of his year, that he carried away the Newton Scholarship, and that he rose to be the Principal of the late Muhammadan Anglo-Oriental College and subsequently our Pro Vice-Chancellor in the University. But I should take advantage of the present opportunity to dwell on what seems to have been generally lost sight of, but what must be emphasised in fairness to Dr. Ziauddin Ahmad. At the same time I know that to describe Dr. Ziauddin Ahmad fully as he is, is a subject too big to be attempted in the course of the few minutes at my disposal. It would be absurd to attempt to analyse in all its aspects, on an occasion like this, the mighty and magnificent personality of the Doctor, though I do hope to get opportunities to publish and proclaim the worth of Dr. Ziauddin Ahmad as I have apprehended it in all its various aspects. When that opportunity will come is more than I can say but I trust Providence to send it as a boon.

My acquaintance with Dr. Ziauddin began at the time I joined the staff of the late Muhammadan Anglo-Oriental College, but his great personality began to unfold itself when in 1913 he came at the helm of the affairs of the college as its Principal. In carrying out the various duties of his exalted office, Dr. Ziauddin Ahmad had to confront difficulties whose magnitude and formidable character many of us have not duly appreciated, because due appreciation requires both labour

6

DINNER

(BY UNIVERSITY STAFF)

(a Speech by Maulana Abu Bakr Sahib, Dean

جناب صدر، وائس چانسلر اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ۔ دیگر شرکاء — میں ممنون ہوں منتظمین کا جنہوں نے مجھے موقع دیا کہ میں اس مبارک موقع پر کچھ اپنے خیالات ظاہر کروں - ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے اعزاز میں یہ پہلی وداعی دعوت نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے متعدد پارٹیاں اور دعوتیں ہو چکی ہیں جن میں ان کی خوبیاں بیان کی جاچکی ہیں لیکن ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکره
هو المسک ما کررته یتضوع

(ترجمہ) ہمارے سامنے نعمان کا بار بار ذکر کر کیونکہ اس کا ذکر مثل مشک کے ہے جتنی مرتبہ تکرار کروگے خوشبو ہی اڑے گی

اس لئے بے موقع نہ ہو گا اگر میں بھی انہیں باتوں کا اعادہ کروں - ڈاکٹر ضیاء الدین کا اور میرا ساتھ اس یونیورسٹی میں صرف دو سال سے ہے — میرا تعلق یونیورسٹی کے اندر محکمہ نظامت دینیہ سے ہے اس مادی دور میں مذہب کی طرف سے جو کراہت پیدا ہے جس کو اکبر مرحوم اپنے اس شعر میں ظاہر کر گئے ہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

آپ خود غور کرسکتے ہیں کہ میرے اس محکمہ کی طرف کیا توجہ ہو سکتی ہے — لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے جس طرح میرے محکمہ کی طرف توجہ کی ہے احسان ناشناسی اور حق پوشی ہوگی اگر میں اسکو نہ بیان کروں - ڈاکٹر ضیاء الدین جب جمعہ کے دن علی گڑھ میں رہے انہوں نے ہمیشہ جمعہ کی نماز مسجد یونیورسٹی میں ادا کی - اگر کبھی دیر کو بھی پہونچے ہیں تو انہوں نے ہمیشہ صف اول میں پہونچنے کی کوشش کی اور حضرت جامی کے مصرعہ کی تصدیق کردی

تا بدر آئی و اندر صف پیش اسمی رود

ایسی حالت میں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین سے بلند تا ہم مرتبہ اشخاص کا تو کیا ذکر ان سے کم شان کے حضرات کے پیشانی کے بوسہ سے بھی مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد کی جائے نمازیں محروم رہتی ہوں ان کا یہ طرز عمل قابل صد ستایش تھا اور اس کا بہت اچھا اثر طلبہ پر پڑتا تھا ۔

حضرات! جس جگہہ تین ہزار لڑکے ہوں کسی نہ کسی کا بیمار ہونا اور کوئی نہ کوئی موت ہوجانا ایک نا گزیر بات ہے۔ جب کبھی کوئی موت ہوئی ہے تو آپ یہہ معلوم کرکے تعجب کرینگے

(b) Speech by Mr. Ataullah Jan, B. A., Vice-President.

Sir,

On behalf of the members it is my duty to thank you for your kindly gra[illegible] the hall this evening and accepting the address and the casket which is a token [illegible] our regard for your long association with the Union and the University. Sir, [illegible] have been a student, a Professor, a Principal and a Pro-Vice-Chancellor here, [illegible] we naturally feel sad when you are leaving us. But I hope you will not se[illegible] your connection with us for ever and will frequently visit your old Alma-M[illegible] as one of its brilliant old boys.

Sir, in reply to our invitation to dinner yesterday a Europeon gentleman [illegible]marked that you were not deserving of any honour (cries of "shame!") It does [illegible] behove a member of the cultured Society to send such a discourteous reply to [illegible] hosts. We expect our teachers to set better examples before us. Sir, people may d[illegible] from you (and there are many present here who did differ from you) people may [illegible] hold the same views as you hold, but surely no one can say that you are not dese[illegible]ing of any honour at the hands of your students. The fact that you are an illustri[illegible] old boy and your long connection with Aligarh entitles you to every honour at [illegible] hands. In expressing our admiration for the many services you have rendered [illegible] your own and our Alma mater, we are only doing our duty. This is not [illegible] opinion, Sir. This is the opinion of all present here, the opinion of both your frie[illegible] and those who differ from you on principle. And this is the spirit at Aligarh, [illegible] spirit of sportsmanship, of broadmindedness, of sympathy and recognition [illegible] merit. You have referred to this Aligarh spirit in your speech. When you [illegible] going away it will be a matter of gratification for you to learn that the memb[illegible] of this Union are determined to keep this spirit alive, and live up to the traditi[illegible] which like every true Son of Aligarh, were so dearly cherished by you.

4

ADDRESS

BY THE MEMBERS OF THE UNIVERSITY UNION

(a) Address.

To,

Dr. ZIAUDDIN AHMAD,

C. I. E., M. A., Ph. D., D. Sc.,

President,

MUSLIM UNIVERSITY UNION

ALIGARH.

Sir,

We, the members of the Muslim University Union, beg to offer our respectful farewell to you on the eve of your retirement from the University and from the Presidentship of this Union. Your association with this Union dates back to the days of your residence in the M. A.-O. College, and ever since you joined the staff of that College you have uniformly evinced the keenest interest in its welfare and development. You came to us with your brilliant reord of academic distinctions gained at the European Universities and, with your love of this institution and knowledge of its traditions, you threw yourself enthusiasticallay into the work of the College and the Union. You carried on devotedly, the traditions which Mr. Beck and Sir Theodore Morison had carefully nurtured within its four walls. There is no one who during the last two decades, has had a greater share than you, in the shaping of the traditions of this institution. The impress of your personality has been felt not only in the larger traditions but even in the details of the work done by the Union.

As President, Sir, your relations with the Union have been most friendly and helpful. There have been differeces and difficalties now and then, but you were always willing to accommodate and smooth matters over, with sure tact and sympathy. We also recollect with gratitude your important announcement made on the occasion when the present ministry came into office, that you regarded the Union as the centre of students' life in the University, as a respository of their rights and a training ground for public life, rather than a mere debating society. And it has been in this spirit that you have discharged your duties as President, during your long term of ofice. This is the broader and the truer view of the fuctions of a University Union, which we trust, will always be cherished by the authorities of the University, and they would remember that the Union is the only central organisation which can focus all the activities of the students in the institution.

(c) Mr. Nawab Ahmad

جناب وائس چانسلر صاحب، ڈاکٹر صاحب و حاضرین — ڈنر ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے - مگر یہہ ڈنر اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل جدا ہے - اس ڈنر کے مدعا کے خیال سے دل بیٹھا جاتا ہے اور زبان بند ہوئی جاتی ہے - اور میں محسوس کرتا ہوں کہ اس وقت اظہار عقیدت سے خاموشی ہی ہزار درجہ بہتر ہوتی - آج کا ڈنر بتا رہا ہے کہ آیندہ ہم یہہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ کاش ڈاکٹر ضیاء الدین ہم میں ہوتے!

آج تک ڈاکٹر صاحب کی تعریف خوشامد خیال کی جاتی رہی مگر آج اور آج کے بعد یہہ عین شرافت، عین اخلاقی جرائت اور اظہار حقیقت تصور کی جائیگی - میں باقاعدہ رسم کی خاطر نہیں، تقاضہ زمانہ کی خاطر نہیں بلکہ محض ذاتی خواہش کی بنا پر یہہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی نظیر آپ ہی ہیں - طلباء میں عہدہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ مجھکو ڈاکٹر صاحب سے واسطہ پڑتا تھا اور جو کچھہ میں نے ان کو پایا اس کا اظہار میری قوت سے باہر ہے - ڈاکٹر صاحب کی قوت ادراک ہر شخص پر روشن ہے - میں نے دیکھا کہ بڑے سے بڑے معاملہ کو وہ پہلے حملہ ہی سے سمجھہ لیتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل واقعہ ان کو پہلے ہی سے معلوم تھا - بڑی بڑی مشکلات کو سلجھا دینا ان کے بائیں ہاتھہ کا کھیل تھا - حقیقت یہہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مشہور عیوب بھی ڈاکٹر صاحب کی عین صفات ہیں ●

طلباء کے ساتھہ رعایت ڈاکٹر صاحب کا عیب تھا، مصیبت زدوں کی مدد ڈاکٹر صاحب کا عیب تھا، علی گڈھ کہا جاتا تھا کہ امراء کے لئے ہے تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو غریبوں کے لئے بھی بنا دیا، یہہ ان کا عیب تھا - الغرض ڈاکٹر صاحب اپنے عیوب کے لحاظ ہی سے قابل پرستش تھے ●

ڈاکٹر صاحب کی سب سے زیادہ عنایات ہم پر تھیں، ڈاکٹر صاحب ہمارے حقیقی خیر اندیش، غمخوار اور ہمدرد تھے - ڈاکٹر صاحب نے مثل ماں باپ کے ہماری نازبرداری کی - ہر شخص ڈاکٹر صاحب کا ممنون منت و احسان ہے گو بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تعریف کئے چلا جاؤں مگر ۲۷ مارچ سے جو حسرت و یاس مسلم یونیورسٹی سے ٹپک رہی ہے خاموش کئے دیتی ہے لہذا مختصراً عرض ہے کہ گو بظاہر ڈاکٹر صاحب کی حکمرانی کل ختم ہورہی ہے مگر کل سے ڈاکٹر صاحب ہمارے دلوں کے بادشاہ ہوں گے اور یہہ حکم رانی کبھی ختم نہو گی ●

آخر میں وہ کہنے پر مجبور ہوں جس کے کہنے پر دل کسی طرح راضی نہیں ہوتا! زبان ساتھہ نہیں دیتی! مگر اس امید کے ساتھہ کہ عنقریب ہم "خوش آمدید" کہیں گے کہتا ہوں "ڈاکٹر صاحب الوداع" ●

Now my friends I shall add no more to this. Wherever he goes, our good-will goes with him, whenever he comes he shall find us ready to welcome him.

And now raise your glasses and drink long life, good luck and prosperity to Dr. Ziauddin Ahmad.

(b) Mr. S. M. Kasim Rizvi

Mr. President, Dr. Sahib, Ladies and Gentlemen,

I stand here to thank the guests and I do thank them. But I cannot restrain myself from saying something more — something which pains my heart! I weep! my soul weeps! my heart breaks! I shed tears, the tears of love, the tears of gratitude, the tears of sorrow! I stand up to bid farewell to Dr. Sahib but my strength fails me, I stammer! It is not unnatural. How on earth can I pronounce the simple yet cruel word 'farewell' to one who was our partner of thirty years' partner of sorrow and joy. How can I speak the word which severs us for ever. I cannot, yet I bid you farewell with a quivering heart, big with grief!

Dr. Sahib, it will be nothing but a mockery to attempt to praise you! Much has been said in your praises though you stand in no need of them. You are an embodiment of love and virtue, you are everything which we need!

It will not be an exaggeration if I compare you with Sir Syed Ahmad Khan. If Sir Syed was the founder of this institution you are beyond a question its saviour! It was really the greatest achievement of Sir Syed to found this institution in troubled times. But it was a far more difficult task of yours to save it in the tumultuous period of Non-Co-operation. The great Syed had to face only a limited few—the bigots of Muslim community. But your great self had to face all, one and all—Muslims and Hindus alike. The gloomy atmosphere surrounding Sir Syed was not absolutely without a ray of hope but the tempestuous weather encircling you, Dr. Sahib, was all and entirely dark, there indeed there was no hope, everything seemed to be in a state of suspense. No friends, all foes; you met no friends, you found everybody your foe. But now there was a hope and it was the true, sincere, and loving heart of the Dr. and his magnetic personality. There was one friend and that one in the person of Dr. Ziauddin. His love for Aligarh gave him his strength. His extraordinary tact defied the foes. None could withstand him. He came successful out of this crusade. It was not so much the success of Dr. Ziauddin as the success of the Muslims of India. Dr. Sahib, you are the champion of our cause and we are indebted to you. Our coming generations will cherish your memory with gratitude even as we cherish that of Sir Syed.

Dr. Sahib, you are great here and you will remain great wherever you go. Saviour of this institution, we bid you farewell; Well-wisher of Muslims, we bid you farewell; Lover of the students, we bid you farewell! We will never forget you, we cannot, and I hope you will not forget us as you cannot.

Farewell! and God be with you!

3
DINNER
BY THE STUDENTS OF THE UNIVERSITY

(a) Toast proposed by Mr. Ali Maqsood, B A.

Mr Ali Maqsood while proposing the toast of Dr Ziauddin said :—

Mr Vice Chancellor, Doctor Sahib and Gentlemen, I do not find myself fit enough for the duty that has been entrusted to me. It is a matter of no small pride for me to have been chosen from among so many of my friends to propose the health of Doctor Ziauddin Ahmad.

Gentlemen, it would be impertinent on my part and at the same time needless to narrate before you the sterling qualities of Doctor Sahib. He has been among us for the last 33 years, as a student, as a professor, and as Pro-Vice-Chancellor. He has to his credit the brilliant record of a whole life devoted to service, devotion and sacrifice. He lived for the cause that he espoused. In politics he has been advancing the cause of the Muslim community inspite of heavy odds. His love for Muslim education saved this institution many a time from disasters, disasters that would have proved fatal to the institution as well as to the community. It was the genius of Dr. Ziauddin that saved the institution from the storm of 1920 and it was his genius that re-established and restored the credit and the reputation of the students after the tide had turned and when discretion became the better part of valour.

Gentlemen the greatness of Dr. Ziauddin does not lie in his genius or talents or even in his capacities as a great administrator. His greatness lies in a spirit of good fellowship that is in him, in his wonderful qualities of forgetting and forgiving and above all in the abundant magnanimity of his soul.

He has won admiration from friend and foe alike and if you allow me a little latitude I would say that he has been magnanimous and considerate towards those who were with him as well as towards those who had reasons to oppose him.

He was dear to us as the head of this institution, but he was dearer to us as a great friend of the student community. His helping hand has always been forthcoming whenever his help was needed most.

Doctor Ziauddin is a true son of the alma mater and there is no aspect of Aligarh life which does not bear the mark of his distinguished personality. He is leaving behind brilliant traditions which shall remain as firm as the very foundations of this institution.

Gentlemen, I told you that I was not singing praises of Dr. Ziauddin. I shall only say that he has endeared himself to all of us by his unfailing kindness, hospitality and consideration as well as by his constant cheerfulness, goodfellowship and devotion. These are qualities which shall win him friends wherever he goes.

Although he is leaving us now, yet I am confident that neither he nor we shall soon forget our friendship, the good fellowship and intimacy of many years.

سپاس نامۂ وداع

بجناب محترم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ام اے، پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی، سی آئی ای پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دام اقبالہ

ڈاکٹر صاحب! آپ معاف فرمائیں اگر آج ہم رسمی تکلفات سے عمداً بے پروا ہوکر انہیں الفاظ اور اسی لب و لہجہ سے آپ کو مخاطب کریں جس کو دیرینہ مدت، رفاقت اور روابط نے محبوب و معمول بنا دیا ہے اور جن الفاظ میں وہ سب کچھ پوشیدہ ہے جس کے حصول میں قوت بازو سے زیادہ آپ کی مسلسل ہمدردی اور "خدائے بخشندہ" کے فضل و کرم کا دخل ہے – ایک وقت کسی ظریف انشاء پرداز نے آپ کے بارے میں لکھا تھا "ڈاکٹر ضیاءالدین المعروف بہ مسلم یونیورسٹی" اس وقت کسے معلوم تھا کہ ظرافت اور حقیقت کے حدود بسا اوقات کتنے موہوم اور ایک دوسرے سے مربوط و پیوست ہوتے ہیں – ہمارا خیال ہے اس وقت جتنے علی گڑھ والے موجود ہیں وہ اس کیفیت کو محسوس کرسکتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ میں موجزن ہے – اچھا تو فی الحال اسی مرحلہ غم کو پایاں منزل قرار دے دیجئے ٭

ڈاکٹر صاحب! ہم ممبران "یونیورسٹی ٹینس کلب" آج آپ کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئے ہیں – جس کے آپ اس وقت سے معین و مددگار رہے ہیں جب نہ یونیورسٹی تھی، نہ ٹینس اور نہ کلب! لیکن اب جبکہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں آپ کو یہ سن کر اطمینان و مسرت ہوگی کہ یونیورسٹی ٹینس کلب ترقی کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں قابل قدر شہرت حاصل کرچکا ہے – ابھی حال ہی میں کلب نے دو پختہ ٹینس کورٹ تعمیر کرائے ہیں اور ٹینس پویلین کے در و دیوار تین فٹ بلند ہوچکے ہیں – آپ یہ سن کر مسرور و مطمئن ہوں گے کہ اس پر کم و بیش تیس ہزار روپئے صرف ہوئے ہیں جس کی فراہمی میں آپ نے اور ہمارے "ٹینس نواز" نواب صاحب (عالیجناب آنریبل نواب محمد احمد سعید خاں صاحب سی آئی ای آف چھتاری) نے ایسے ایسے سخت اور نازک مواقع پر ہماری اعانت کی ہے کہ ہم اس کے اظہار پر قادر نہیں ہیں، صرف سپاس گزار ہیں – اس درس گاہ کے جتنے طلباء اس وقت تفریحی ورزشوں میں حصہ لیتے ہیں اس میں کم و بیش ۶۰ فی صدی طلبا ٹینس کھیلتے ہیں اور بقیہ اس وجہ سے شریک نہیں ہوسکتے کہ ہم چند در چند مجبوریوں کی بنا پر ان کے لئے ضروری سامان فراہم کرنے سے قاصر ہیں ٭

ڈاکٹر صاحب! آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں جس کا ہم کو دلی رنج ہے اور اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو بھی رنج ہوگا لیکن ہم دونوں کے اطمینان کے لئے یہ امر اکتفا کرتا ہے

1

ADDRESS

PRESENTED BY THE CRICKET CLUB

To

Dr. ZIAUDDIN AHMAD,

C I E, M A., Ph. D, D. Sc.,

Pro-Vice-Chancellor,

MUSLIM UNIVERSITY,

ALIGARH.

Sir,

We, the members of the Cricket Club, have assembled here this evening to bid farewell to you on the eve of your retirement form the Pro-Vice-Chancellorship of the University, after a long, distinguished and arduous career of over thirty years as teacher, as professor, and as the head of the institution This evening, we have gathered here to acknowledge, with gratitude the services which you, with your patronage and sympathy, rendered to our Club both during your term of office as President of the Club and as Pro-Vice-Chancellor You have always evinced a keen and lively interest in the games and sports which are such a characteristic feature of this institution There is no Sports Club which does not bear the impress of your work and helpful guidance But to Cricket, Sir—we might say so without arousing any unpleasant feelings in our colleagues belonging to other Clubs—you gave, as it undoubtedly deserves, the place of pride in all the games Although you have not within the memory of the present generation taken any actual part in any of the cricket matches, tradition has it that you once scored a hundred runs in your younger days We feel sure, Sir, that your love of Cricket dates from those more active days and it has remained undiminished to this day.

Sir, we had the privilege of offering you the Cricket Colours a few days ago, and we request you to accept this address today as an expression of thanks for your great services and sympathetic patronage of the Cricket Club.

We beg to remain,

Sir,

Yours Obediently,

April 24th, 1928.

The Members of the Cricket Club.

Dr. ZIAUDDIN AHMAD'S LETTER REFUSING FURLOUGH

D. O. No. 1305 30th March 1928

To,

THE VICE-CHANCELLOR,
MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH

My dear Nawab Sahib

I have already written to you in my resignation that my sole aim in serving the Institution has been the love of work and a sense of duty and I always considered the work here to be a personal one. I did not avail myself of any furlough during the thirty three years of my service nor did I avail myself of the College vacations and in the interest of the University I travelled during the long vacations at my own expense. The self-satisfaction that I did my duty is in itself a reward. I thank you for your kindness and the kindness of the Executive Council but I am sorry that I cannot accept any money in lieu of the leave due to me. I regret that I cannot accept after resignation what I considered incorrect during service.

Yours sincerely
Sd. ZIAUDDIN AHMAD
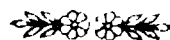
I wish better luck to my successor, but I feel that the crucial difficulty
inning the Institution is that the Pro Vice-Chancellor has got all the responsibilit
without power and the Vice-Chancellor has got the power without any responsibil

The Principals of the late M. A.-O. College rightly or wrongly consider
heir duties to secure employment for their old Alumni in order to avoid disco
nt. I performed this duty after the retirement of the late Nawab Viqarul Mu
as I honestly believed it to be the traditions of the late M. A.-O. College as establish
by the late Sir Syed Ahmed Khan, the late Nawab Mohsinul Mulk, the la
Sir Theodore Beck and Sir Theodore Morison, with whom I was intimately asso
ated and I had the honour to work. Rightly or wrongly, I always thought that to ke
up good relations with the Government is one of the fundamental objects of t
Institution and I made honest efforts, though not always with success, to keep
this tradition. My judgments in many cases may have been wrong and my decisio
may have been faulty, but I was always actuated with motives to make the best
the institution in my charge.

Ever since 19[illegible] I have been attempting to resign my post as Pro-Vi
Chancellor. On the 27th April, 1925, after completing thirty years service, I
quested the late Vice-Chancellor to relieve me of my duties as Pro-Vice-Chancel
from October, 1925, but he in his letter dated 1st May, 1925, induced me not
resign in the interest of the University. A year later in 1926, he proposed my
appointment in the following words :—

> "The University needs a Pro-Vice-Chancellor who knows the spec
> requirements of the community as well as the educational system wh
> is in vogue in the country and as the Pro Vice-Chancellor should also
> in direct touch with the parents of the students in different parts of t
> country, all these conditions are fully satisfied by the special qualificatio
> and attainments of Dr. Ziauddin."

After the retirement of Sahibzada Aftab Ahmad Khan, I requested you
May, 1927, to relieve me from my present duties. You verbally told me to w
till the Committee of Enquiry had submitted its report.

I may also add that during my stay in Aligarh I had offers of several po
in various Departments, but I declined them all in order to be true to the promi
which I had made at the time of my appointment.

I am now convinced that I can do better service to the Institution by wit
drawing my formal connection with the University, and I most readily do the se
vice by submitting my resignation which I request you to accept at an early da
in a manner that may be acceptable to you and to the Executive Council.

Your sincerely,
(Sd.) ZIAUDDIN AHMAD.

DR. ZIAUDDIN AHMAD'S RESIGNATION.

26th March, 192

To,

THE VICE-CHANCELLOR,
MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

My dear Nawab Sahib

After passing my B. A. Examination in 1895, the late Mr. Theodore Beck induced me to join the Staff as Assistant Professor in preference to the post of Deputy Collector to which I was then nominated. During my interview with Sir Syed at the time of my appointment I was asked to write a bond for a period of five years, but I replied that I intended to stay in the College for life, he tore off the bond which he himself had drafted. The Government of India awarded me a scholarship in the year 1901 after I obtained the D Sc. degree in the First Division. I obtained Research degree from the Trinity College Cambridge in 1903, and Sir Issac Newton Studentship in 1904. I obtained the degree of Ph D in 1906 from the Gottingen University in Germany. On my return, I was appointed Professor of Mathematics in the M. A.-O. College in the year 1907 and I declined the appointment of Inspector of Schools offered to me while I was in Europe. In 1910, I was appointed Senior Tutor under Mr. Towle and in 1911, Secretary of the Constitution Committee to prepare the first draft of the Constitution of the Muslim University, Aligarh. During the absence of Mr. Towle in England in the year 1914—15, I was appointed officiating Principal of the late M. A.-O. College. In response to the excitement of the Mussalmans of India due to the Tripoli and Balkan wars and Cawnpore Mosque affairs, the students were very much perturbed and there was no discipline in the Institution. During the time of my officiating appointment, I succeeded in creating a general feeling of loyalty among the students for the Institution inspite of adverse influences.

I was appointed member of the Calcutta University Commission in 1917 and while I was away in Calcutta, there arose some misunderstandings between the members of the European Staff and the then Honorary Secretary of the Trustees. The former ultimately resigned. In 1919 when I returned from the Commission, the number of the students was reduced to 180 in the College, the credit of the Institution was on the wane, and the Old Boys thinking that the old traditions of the College had gone ceased to take interest in the Institution. Taking the advantage of the visit of His Excellency Sir Harcourt Butler in November 1919, I invited about 500 Old Boys and on account of the special interest taken by His Excellency an interest in the Institution was again restored. In the following year, we had an attack of Non-Co-operation movement and I honestly believed that the Muslim Community would substantially suffer if the M. A.-O. College ceased to exist. During

and boundless energy and capacity for work and has steered the University safe through more than one crisis and further rendered very valuable service to the cause of education among the Musalmans generally, notably by his contributions to the memorable report at the Calcutta University Commission I am sure that better man, taking every thing into consideration cannot be found in our community to replace him and that new experiment at this stage would be too full of risk I am certain that if Dr. Ziauddin Ahmad can be induced to withdraw his resignation he will in co-operation with the others devote his undoubted abilities and resources to remedying the abuses and advancing the University more rapidly towards its goal (Vide the Aligarh Mail, 21-4-'28) Scarcely less remarkable is the enthusiasm characterising the encomium showered by the well known organ of the Jamia Millia of Delhi, the Piam-i-Talim in its issue of 7th May 1928 "It has doubtless enhanced the reputation and influence of Dr Ziauddin who chose to retire voluntarily when he had indisputably a powerful backing in the University councils and its court" Time will bring its own vindication to Dr Ziauddin And for this reason his confirmed opinion it is that the Enquiry Committee's recommendations should be given effect to each and all to enable the impartial observer to see for himself what good will come out of them Dr Ziauddin is emphatically not one among the panic-stricken With undaunted spirit he adheres to his accustomed optimism There is nothing seriously wrong with the affairs of the University he thinks What is really required is a psychological change As one of our brother students said the other day Dr Ziauddin's influence and authority remain unimpaired and whole As our predecessors remarked in their address of 1901 our union with Dr Ziauddin "is based on the bed-rock of our love and affections which neither time nor distance can lessen

> They never, never can divide
>
> Our hearts and souls from thee

(*Vide* "An Humble Tribute of Devotion and Regard paid by the students of the M A O College Aligarh to Professor Ziauddin Ahmad, M A, D Sc on the happy occasion of his going to England as a State Scholar, July 28, 1901")

As the Hon the Vice-Chancellor, Nawab Sir Md Muzzammilullah Khan Khan Bahadur, has testified in his presidential remarks, Dr Ziauddin goes from our midst laden with honour and glory and in possession of the universal assurance of our highest esteem No Aligarh man has cause for sorrow Dr Ziauddin will always strive to promote the cause of his co-religionists He will continue to utilise his great talents to endeavour to secure the advancement of the Muslim University.

EDITORIAL

By

Mr S Amanatullah Jafri, Editor English Section)

For it so falls out

That what we have we prize not to the worth
Whiles we enjoy it but being lack'd and lost
Why then we rack the value, then we find
The virtue that possession would not show us
Whilst it was ours

Shakespeare

We reproduce in the pages of our present number some of the speeches delivered on the occasion of Dr Ziauddin Ahmad's retirement from the Pro-Vice-Chancellorship of the Muslim University These addresses presented at the series of imposing functions given in his honour, together with the replies, as reported by the Associated Press will speak for themselves, and we do not add comments of our own on them Our readers, we presume, will have no difficulty in forming their own idea of the magnitude of the outburst of affection and sympathy in the students at the time of their separation from their beloved Pro-Vice-Chancellor The cordiality and warmth that marked the attitude of the staff and the members of the Court may also be as easily imagined The residents of the University were staggered at the prospect of the sudden retirement of Dr Ziauddin Ahmad after a glorious service of 33 long years But our consternation was dissipated on realising that the learned doctor was retiring, prompted by the self-same noble motive which had in his youth induced him to accept service in this Institution under the late Mr Theodore Beck in the life-time of Sir Syed Ahmad Khan As a young man Dr Ziauddin had been the recipient of several tempting offers from the Government, but he was ambitious to serve his own community, and he rightly judged that he could do it best by serving as professor in the M. A.-O. College. At this latest stage of his career (as is stated by himself in his letter of resignation) he felt that it was absolutely a sacred duty to vacate his high office, and with praise-worthy cheerfulness and alacrity he volunteered to go This spirit of self-sacrifice and loyalty to the Institution has not failed to extort universal admiration, and the letter written by Sir Abdur Rahim to the Hon the Vice-Chancellor is a glowing tribute to the worth and selfless spirit of our retired Pro-Vice-Chancellor. "It should never be forgotten that the learned doctor is a man of exceptional talent

شمارہ (۱۱و۱۲)
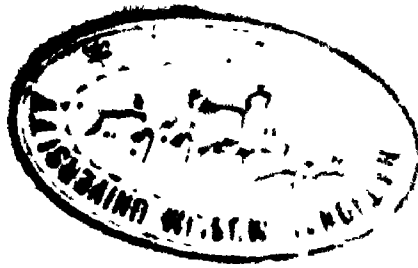
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی دوماہی رسالہ

مرتّب : انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

طابع وناشر : محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع ونشر: مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلس عاملہ علی گڑھ میگزین

سرپرست

خواجہ غلام السّیّدین صاحب بی اے (علیگ) ایم ای ڈی (لیڈز)

ایڈیٹر

انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

فہرست مضامین

مرتبہ: سیّد انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

سید انیس الدین احمد رضوی ایم اے (علیگ)

اشاعت ماہ جنوری و فروری ۱۹۲۹ء

شذرات

کوائف دار العلوم دسمبر، جنوری و فروری کے مہینے یونیورسٹی میں ہر حیثیت سے پُر از مشاغل اور انتہائی مصروفیت کے ہوتے ہیں شعبہ ایک حیات تازہ کا مظہر اور ہر محکمہ ایک روح عمل کا آئینہ دار ہوتا ہے جس طرف نظر جاتی ہے ایک عجیب دل خوش کن جوش کار بسر کار نظر آتا ہے۔ انسانی فطرت ؎

دمادم نقش ہائے تازہ ریزد — بہ یک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروز تو تصویر دوش است — بہ خاکِ تو شرار زندگی نیست

کی صحیح اور سچی ترجمان بن جاتی ہے۔

یونیورسٹی کے طلباء اس فرصت کو مغتنم سمجھکر زندگی کے ہر شعبے میں ایک نئی روح دوڑا دیتے ہیں، کیوں کہ اس عہد مسرت کے بعد وہ دور آتا ہے، جب امتحانات کا عفریت اپنے روح فرسا دہانے اور مہیب دست و بازو کے ساتھ ہر شخص کے دل و دماغ پر مسلط ہوتا ہے

گویا کہ یہ زمانہ "کالج لائف" کا عہد زریں کہلائے جانے کا بجا طور پر مستحق ہے

---

۸ و ۹ دسمبر کو انجمن خیابان اُردو انٹرمیڈیٹ کالج کی طرف سے سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا جس میں ملک کے مشاہیر شعرا شرکت فرمائی۔ مولانا حسرت موہانی، حضرت فانی بدایونی، حضرت مانی جائسی، حضرت جگر مرادآبادی، جناب جگت موہن لال صا اور دیگر معتدد اہل سخن نے اپنے کلام سے طلباء کو مستفیض فرمایا۔ مشاعرہ بہ ہر حیثیت کامیاب رہا۔ ہم اراکینِ انجمن اور بالخصوص مولانا احسن صاحب کی رہبری کی خدمت میں اس شاندار کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اس موقع پر ایک امر کا اظہار ضروری ہے۔ آج کل ملک کے دروبست میں مشاعروں کی قدیم لغو اور بے کار قیود کے ایک عام احتجاج پایا جاتا ہے۔ ترتیب نشست، مصرع طرح، مصرعوں کا اٹھانا اور اس قسم کی دیگر رسمیات کو ترک کرنے کی تحر ہو رہی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان میں سے اکثر قیود کی پابندی ان مشاعروں میں بالکل نہیں کی گئی اور بقیہ قدیم رسموں کے اتب میں بھی اس قدر سختی روا نہیں رکھی گئی جتنی کہ ملک کے عام مشاعروں میں ہمیشہ ہوتی جاتی ہے۔ علی گڑھ نے اپنی تحریک سے احیاءِ اُردو میں خاص حصہ لیا تھا، آج بھی علی گڑھ کو ہی منظرِ عام پر آکر ان زنجیروں کو توڑ دینا چاہیئے، جنھوں نے ملک کی ذہنیت کو حا معطل کر رکھا ہے۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ ۱۱ دسمبر کے مشاعرہ میں ہوا جس میں انجمن حدیقۃ الشعر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے پنجاب کے نا شاعر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری مدیر مخزن نے اپنا کلام سنا کر حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ قدیم الخیال اصحاب اس مجلس مشاعرہ کے نام سے شاید موسوم نہ کریں، کیوں کہ وہاں نہ کوئی مصرع طرح دیا گیا تھا، نہ عنوانِ نظم، نہ شعراء کا مجمع تھا، نہ مصر اٹھانے کی چیخ پکار۔ صرف حفیظ صاحب نے اپنی نئی تصنیف "شاہنامۂ اسلام" کے چند ابواب اور اس کے علاوہ دو ایک دیگر نظمیں سنائیں اور مشاعرہ ختم ہو گیا لیکن اہلِ ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ اس "مجلس" میں ہی بڑے سے بڑے مشاعروں سے زیاد حظ حاصل ہوا۔

بی اے پارٹ فرسٹ کے ممتحن کی حیثیت سے حفیظ صاحب علی گڑھ تشریف لائے تھے، ہماری خوش قسمتی کہ دو ایک دوستوں کی وساطت یا "رسوخیت" سے ہمیں بھی شرفِ نیاز حاصل ہو گیا اور ہم نے بلا تکلف انجمن حدیقۃ الشعر کا سکرٹری

ہونے کی حیثیت سے حفیظ صاحب کی خدمت میں استدعا پیش کردی، جو بحمداللہ کہ قبول کرلی گئی اور اسی کے ساتھ ملک کے معتقد رہنما قلم جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نے اس جلسہ کی صدارت بھی منظور فرمائی۔ سید صاحب موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں شاہنامۂ اسلام" اور حفیظ صاحب کے کلام پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کو "اردو کا بانسری بجیا" اور "اسلام کا شہنائی نواز" کہہ کر مخاطب کیا۔

---

۱۲ جنوری کو اسٹریچی ہال میں کانوکیشن کا جلسہ منعقد ہوا۔ یونیورسٹی کی ۱۹۲۸ء کی رپورٹ پیش کی گئی، کامیاب طلباء نے محنت اور کاوش کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے اور آخر میں حکومت ہند کے مشیر تعلیمی آنریبل مسٹر بیٹل بیلز نے اپنا فاضلانہ خطبہ پڑھا۔ ہم اس موقع پر جناب پرو وائس چانسلر صاحب کا ان حوصلہ افزا خیالات کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں جو آپ نے علی گڑھ میگزین کی بابت ظاہر فرمائے اور امید کرتے ہیں کہ میگزین بھی حتی الامکان ان توقعات کو پورا کر دکھائے گا جو اس کی جدید نظامت سے وابستہ ہیں۔

کانوکیشن کے فوراً بعد یونیورسٹی یونین کا الیکشن ۲۴ جنوری کو ہوا۔ اس سال ڈے اسکالرس کو شامل کرلینے کی وجہ سے رائے دہندگان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا۔ تاہم یونین کے وائس پریسیڈنٹ، مسٹر عطاء اللہ جان خاں صاحب اور ان کی منسٹری نے نہایت حسن انتظام اور اہلیت کا ثبوت دیا اور الیکشن بحسن وخوبی ختم ہوا۔ ہم کامیاب امیدواران یعنی قاضی غیاث الدین صاحب وائس پریسیڈنٹ، حفیظ الرحمن صاحب سکریٹری اور ذکی الدین احمد صاحب لائبریرین اور جملہ اراکین کابینہ کی خدمت میں ان کی اس کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اپنے دورِ کارکردگی میں اپنی تمام ذمہ داریوں کو محسوس کرکے یونین کی قدیم مایۂ ناز روایات کو قائم رکھیں گے۔

گزشتہ سال ہمیں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کو پیغام وداع دینا پڑا تھا، اس سال زمانہ کی رفتار نے ایک اور ہستی فیضانِ اثر سے ہمیں محروم کردیا۔ اردو زبان کا مایۂ ناز فرزند یلدرم آج علی گڑھ سے رخصت ہوچکا ہے اور علی گڑھ کی فضا اس کے وداع پر اشکبار ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم کا وجود علی گڑھ میں اردو کی بنیاد کو قائم کئے ہوئے تھا اور اس صحبت دوش

یاد تازہ کررہا تھا، جس کا خمار ابھی تک اردو کے متوالوں کو سرشار بنائے ہوئے ہے۔ ترکی زبان کے ماہر ہونے کی وجہ سے
آپ نے علی گڑھ میں ایک ایسی پُرکیف فضا قائم کردی تھی، جس میں ترکی اور اردو ادب کے شاہکار باہم دگر ہم آغوش
مسرت کی لہریں لے رہے تھے۔

بالآخر آج ہم اردو کے اس قابلِ صد نازش ادیب اور علی گڑھ کے اس موجبِ صد افتخار فرزند کو الوداع کہہ رہے
ہیں، جس نے اس مادرِ علمی کے آغوشِ محبت میں اپنی عمر کا عزیز ترین حصہ بسر کیا اور جس نے اپنی قوم اور اپنی زبان سے
طفلی اور شباب کے سنہری زمانوں کو قربان کردیا۔ اس امر کا اظہار بے سود ہے کہ علی گڑھ کی یاد یلدرم کے دل سے کبھی محو
نہ ہوسکے گی اور یہاں کے کیفِ محبت سے سرشار مناظر ان کے دل کو ہمیشہ بے چین رکھیں گے تاہم اتنا کہہ دینا بھی ضرو
کہ علی گڑھ کی فضا بھی اپنے عزیز ترین دوست کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی اور یلدرم کی آواز علی گڑھ کے گوشہ گوشہ
برابر گونجتی رہے گی۔

اس عرصہ کا اہم ترین واقعہ جو یونیورسٹی کے دورِ حیات میں شاید تاریخی اہمیت حاصل کرلے ۹ و ۱۰ فروری کو
یونیورسٹی کورٹ کا اجلاس ہے۔ قوم و ملت کی عظیم ترین ہستیاں اپنے واحد قومی ادارۂ تعلیمی کو بدنظمیوں سے بچانے اور رحمت
کمیٹی کی رپورٹ پر کامل غور و خوض کرنے کے لئے رامپور حامد ہال میں جمع ہوئیں۔ ہز ہائنس والدہ بیگم صاحبہ اور ہز ہائنس
نواب صاحب بھوپال نے بھی اپنی چند در چند مشغولیات کے باوجود یونیورسٹی کی بہتری کو مدنظر رکھا اور تشریف لانے کی
زحمت گوارا فرمائی۔

کامل دو دن مجلس مشاورت گرم رہی اور بالآخر قوم کے بہترین دماغوں نے یونیورسٹی کی مشکلات کا حل سوچ لیا۔
سید راس مسعود، جو سرسیدؒ کے پوتے ہونے کی وجہ سے ایک بڑی حد تک اس عہدہ کے مستحق اور حیدرآباد میں انتظامی امور کا
تجربہ حاصل کرلینے کی بنا پر سب سے زیادہ اہل تھے، وائس چانسلر مقرر کئے گئے۔ سید صاحب کے انگلستان سے واپس آنے تک
اس عہدہ کا عارضی چارج ڈاکٹر سلیمان، چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ کو دیا گیا۔ پرو وائس چانسلر کا تقرر فی الحال ملتوی کردیا گیا
لیکن اس کے لئے ایک کمیٹی بنادی گئی۔ اس کے علاوہ اگزیکیٹو کونسل کے نظام ترکیب میں بھی چند اصلاحات کی گئیں۔
مختصر طور پر یہ ہیں وہ تحریکات اور اصلاحات جو پیش ہوکر منظور کی گئیں۔ آج یہ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا کہ یونیورسٹی کے

تمام داخلی امور کا کما حقہ فیصلہ ہوگیا اور تمام مشکلات ایکدم رفع ہوگئیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس جدید نظامت سے قوم وملت کی
توقعات بہت کچھ وابستہ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ توقعات اگر حرف بہ حرف نہیں تو ایک بڑی حد تک ضرور پوری ہوکر رہینگی۔

ہم مندرجۂ بالا توقعات کا اظہار ہی کرنے پائے تھے کہ ایک عجیب وحشت اثر خبر نے تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔
اور یہ ساری توقعات قبل از وقت ہی پژمردہ ہوکر رہ گئیں یعنی یہ کہ سید راس مسعود صاحب نے ریاست حیدرآباد کی سیاسی
نظامت کا عہدہ قبول فرمالیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ سے آپ کو انکار کردینا پڑے گا۔
خلاف توقع خبر نے علی گڑھ کو پھر اسی حالت تذبذب میں مبتلا کردیا، جو کورٹ کے اجلاس سے قبل طاری تھی اور سکون اور
طمانیت کی وہ فضا جس نے اس قلیل عرصہ میں علی گڑھ کے در و بست پر تسلط جمالیا تھا، منتشر ہوکر رہ گئی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ
علی گڑھ کی قسمت کا تصفیہ کس طرح ہوتا ہے ہم تو آئندہ واقعات کے ظہور پذیر ہونے کے بے چینی کے ساتھ منتظر ہیں۔

ایک اہم تجویز | یونیورسٹی کی تاریخ صحافت پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ عرصہ میں حدود یونیورسٹی
سے علی گڑھ میگزین کے علاوہ متعدد رسالے اور جرنل برآمد ہوئے، کچھ مدت تک منصۂ شہود پر جلوہ فگن رہے اور پھر کتم عدم میں
روپوش ہوگئے۔ یونیورسٹی میں کئی سوسائٹیاں قائم ہیں اور آج کی تاریخ تک تقریباً ہر سوسائٹی اس عرصہ میں کبھی نہ کبھی ایک
رسالہ ضرور نکال چکی ہے۔ ڈی جاگرلیفر ہماری نظروں سے گذر چکا ہے۔ فلاسوفیکل جرنل کو ہم دیکھ چکے ہیں۔ تھیس اپنی نظر فریب آب و تاب سے
ہماری نگاہوں کو خیرہ کرچکا ہے۔ سائنٹفک جرنل اپنا جلوہ دکھا چکا ہے اور آج فضائے بسیط پر کیمیکل سوسائٹی کا ستارہ نیا نیا
نمودار ہوا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ تمام رسالے صرف چند روزہ حیات لے کر آتے ہیں تو ان کے اجراء سے کیا فائدہ متصور ہوتا
ہے۔ مانا کہ نوجوان ذہنیتیں جوشش فراواں کی علمبردار ہوتی ہیں اور سوسائٹی کو تقریباً ہر سال ایک جدید سکرٹری کے دور عمل سے
سابقہ پڑتا ہے، لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ہر جدید سکرٹری اور ہر نوجوان ذہنیت صرف اپنے زمانۂ نظامت سے سروکار رکھے اور
اپنے جانشینوں کے لئے مستقبل کا خوفناک غار چھوڑ جائے۔ کیا وہ کوششیں جو فرداً فرداً دنیائے صحافت میں اپنا نام پیدا
کرنے کے لئے کی جاتی ہیں، یکجا نہیں کی جاسکتیں؟ رسالہ نکلتا ہے، دو چار روز دوست احباب کے گروہ میں اڈیٹر صاحب کی
تعریفیں ہوتی ہیں، کہیں کہیں سے ایک آدھ غیر مانوس مخالف آواز بھی آجاتی ہے، غریب سوسائٹی کے اوپر کچھ بار ہوجاتا

اسی طرح ایک آدھ نمبر اور نکل جاتا ہے، پھر اڈیٹر صاحب علی گڑھ سے انتقال فرما جاتے ہیں اور اس کے بعد رسالہ کا کہیں نام بھی نہیں
سنائی دیتا۔ اجراء کے وقت لوگوں کے ذہن اس فریب تخیل میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اس سے علی گڑھ کا نام روشن ہوگا۔ ہر
سوسائٹی منظرِ عام پر آجائے گی، لیکن خیال تو فرمائیے کیا یونیورسٹی کا نام روشن کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے، کیا آپ کی سوسائٹی
صرف اسی طریقہ سے مشہور ہو سکتی ہے۔ غور کیجئے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ جس کام کو آپ شہرت کا ذریعہ سمجھ کر اٹھاتے ہیں، بالآخر
یہی یونیورسٹی کی رسوائی اور بدنامی کا باعث بن جاتا ہے اور اغیار کو انگشت نمائی کا موقع مل جاتا ہے کہ اس یونیورسٹی کے
طلباء کسی کام کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ اٹھاتے ہیں لیکن چلانے کی مقدرت اور اہلیت نہیں رکھتے کیا یہ آپ کی سوسائٹی
سے زیادہ آپ کی عزیز یونیورسٹی کے لئے باعث توہین نہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ عام قومی مفاد کو ذاتی اور شخصی مفاد پر بلا تکلف قربان
کر دیا جاتا ہے۔

اب تصویر کے دوسرے رخ پر نظر ڈالئے۔ اگر یہی کوششیں، جو ہر سکرٹری اپنا علیحدہ رسالہ نکالنے میں صرف کرتا ہے متحد
طور پر یونیورسٹی کے واحد علمی اور ادبی مجلہ یعنی علی گڑھ میگزین کے لئے استعمال کی جائیں تو بہت زیادہ مفید ثابت ہونگی۔ اُردو
سیکشن کا معیار بلند سے بلند تر ہو جائے گا، اس کے مضامین کا تنوع الگ جاذبِ نظر ہوگا اور اس کی ظاہری آب و تاب میں اور اضافہ
ہو جائے گا۔ انگریزی سیکشن کی حالت کہیں بہتر ہو جائے گی، اس میں طلباء کے دماغی جواہر پاروں کی افراط ہوگی اور اس کے
ذریعہ ہم ملک اور اہل ملک کے سامنے کوئی چیز پیش کرکے مفتخرانہ طور پر سربلند ہو سکیں گے۔

ان تمام رسائل میں اگر کسی رسالہ نے کچھ عرصہ ہنگامہ آفرینی کی ہے اور دنیائے ادب میں درخشاں ستارہ ہو کر چمکا ہے
صرف انجمن اُردوئے معلیٰ کا سہ ماہی علمی رسالہ سہیل، جو پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے کی ادارت میں ڈیڑھ سال تک
جاری رہ کر بالآخر اسی آب و ہوا کا شکار ہو گیا، جو منفرد مساعی کے لئے فطرت نے روزِ ازل ہی سے مقسوم کر دی تھی۔
معتبر حلقوں میں یہ افواہ بھی گرم ہے کہ اس کا ایک وداعی نمبر نکلنے والا ہے، جس کے بعد اسے "باقاعدہ طور پر" بند کر دیا جائیگا۔
خدا کرے کہ یہ وداعی نمبر ہماری علی گڑھ کی زندگی کے دوران میں ہی برآمد ہو جائے گا، تاکہ اس کا آخری دیدار جی بھر کے کر لیا جائے
لیکن ہماری غرض یہ ہے کہ بالآخر رشید صاحب کی مساعی کا بھی وہی انجام ہوا، اور اُردو دنیا اس اعلیٰ پایہ کے علمی رسالہ سے
ہمیشہ (؟) کے لئے محروم ہو گئی۔

ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اس کے بعد اس آئندہ ماحول پر توقعات قائم کرتے ہوئے جو انجمن ترقی اُردو کا

دفتر اورنگ آباد سے علی گڑھ منتقل ہونے اور اُردو کے قدیم "موروثی" محسن جناب سید راس مسعود صاحب کے وائس چانسلر مقرر ہونے سے لازمی وابستہ ہیں، کیا یہ ہماری تجویز قابلِ غور نہیں ہوسکتی کہ تہیں اور اس کے علاوہ تمام دیگر انفرادی رسائل کو علی گڑھ میگزین میں مدغم کرکے یونیورسٹی کے واحد مجلّہ کو بہتر سے بہتر بنانے کی ہر امکانی کوشش کی جائے۔ ہم یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد سے اور بالخصوص ان لوگوں سے جو ادبیات سے شغف رکھتے ہیں، درخواست کرتے ہیں کہ اپنے لمحاتِ فرصت میں اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں اور بشرطِ پسند اپنی امکانی کوششیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں صرف کردیں۔

کوائفِ افغانستان | نیا سال ہر ملک اور ہر قوم کے لئے نئی نئی توقعات لے کر آیا کرتا ہے اور انھیں توقعات کی بدولت ہر جگہ اس کا خیر مقدم دلی تپاک اور جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن ۱۹۲۹ء دولت افغانستان کے لئے توقعات کے بجائے توہمات کا انبار اور نامرادیوں کے خزانے لے کر آیا اور اپنے سبز قدموں کی "سعادت" سے اس کوہستانی علاقہ کو جہالت اور قدیم الخیالی کے تاریک غاروں میں ٹھوکریں کھانے کے لئے پھینک گیا۔ وہ ملک، جو آج سے دس سال پیشتر متمدن اور مہذب ممالک میں سب سے زیادہ جاہل، سب سے زیادہ غیر ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ وحشی گنا جاتا تھا، ایک اولوالعزم شہریار کی بدولت اس قلیل ترین مدت میں بامِ ترقی کی فلک بوس رفعتوں پر پرواز کرنے لگا تھا۔ لیکن فطرت کو ابھی یہ منظور نہ تھا۔ ابھی افغانستان نے خود غرض اور حریص ملاؤں کے دامِ تزویر کا تجربہ نہیں اُٹھایا تھا۔ ابھی اس کو جہالت اور روشن خیالی میں تمیز کرنے کی اہلیت نہیں پیدا ہوئی تھی، اور فطرت افغانیوں کو یہ سبق دینا ضروری سمجھتی تھی۔

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ اعلیٰ حضرت شہریارِ غازی امان اللہ خاں خلد اللہ ملکہٗ کے ساتھ ان کے ایامِ مصیبت اور دورِ ابتلاء میں ہمدردی کا اظہار کررہا ہے، صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی آزادی کی جد و جہد میں حصہ لینے کو تیار ہے۔ افغانستان میں حالات و واقعات اس قدر سرعت سے تغیر پزیر ہورہے ہیں کہ یقینی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی ہر طرف طوائف الملوکی کا دور دورہ ہے جو جرگہ ذرا قوت و اقتدار حاصل کرلیتا ہے، اس کا سردار بلا تامل تخت و تاج کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور اس طرح اُمیدواروں کی فہرست میں ایک کا اضافہ اور ہوجاتا ہے۔

بہرحال مستقبل کی بابت کوئی صحیح پیشین گوئی نہیں کی جاسکتی۔ واقعات کی رفتار دیکھئے اس اسلامی ملک کو کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی آنکھیں بے چینی کے ساتھ اپنے ہمسایہ کی کش مکشِ حیات کا نظارہ کررہی ہیں، کیوں کہ ہندوستان

ئندہ معاشرت اور رفتارِ ترقی کا انحصار بہت کچھ اسی ملک کی قسمت کے فیصلہ پر ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ
سے شہریار غازی ہی کو کابل کے تخت پر دیکھنا چاہتے ہیں۔

دیثِ ارتحال

حال ہی میں مسلمانانِ ہند کو اپنی دو باکمال ہستیوں کا ماتم کرنا پڑا یعنی سر محمد رفیق اور مسٹر ڈی جی اپسن۔ دونوں ہستیاں رفاہِ عام کے لئے اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو خدمات انجام دے رہی تھیں وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ سر محمد رفیق علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے اور ان شخصیتوں میں سے تھے جن پر علی گڑھ بجا طور پر فخر و ناز کرسکتا ہے۔ مسٹر اپسن ان انگریزوں میں سے تھے، جنھوں نے قومی تعصب اور تنگ نظری کو بالائے طاق رکھ کر اسلام کے پاکیزہ اصول کو قبول کرلیا تھا۔ اور دینِ برحق کے سچے پیرو بن گئے تھے۔ آپ "مسلم آؤٹ لک" کے اڈیٹر تھے اور اس حیثیت میں ہر موقع پر مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کرنا اور ان کی آواز حکومتِ ہند کے کانوں تک پہنچانا، اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ہم ان دو باکمال ہستیوں کی رحلت پر اپنے دلی رنج و الم کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں خداوندِ کریم ان کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔

اس کے بعد علی گڑھ کے ایک نوجوان فرزند کا ماتم کرنا ہے۔ سید حسن رضوی جو چار پانچ سال سے یہاں تعلیم پا رہے تھے اور گزشتہ سال ہی چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہوئے تھے، جنوری کے آخری ایام میں بعارضۂ طاعون حیدر آباد میں انتقال کرگئے۔ مرحوم نے دو سال بی ایس سی کا امتحان دیا، لیکن دونوں مرتبہ قسمت نے یاوری نہ کی۔ اس کے بعد طبیہ کالج میں داخلہ لیا، لیکن صرف چند ماہ تعلیم حاصل کرکے چھوڑ دینا پڑا۔ مرحوم نے اپنی عمر کی ۲۸ منزلیں بمشکل ختم کی ہونگی کہ داعیِ اجل کا پیغام آگیا۔ ہم اس حسرت ناک موت پر ان کے پس ماندگان، بالخصوص ان کے برادرِ خورد سید محسن رضوی ایم ایس سی (علیگ) سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوندِ کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

الوداع

علی گڑھ میگزین کا دورِ حیات، زمانہ کے تغیر و تبدل کا ہمیشہ سے آئینہ دار رہا ہے۔ جس طرح زمانہ کبھی ایک صورت پر قرار پذیر نہیں ہوتا
ی تی میگزین کے ادارۂ تحریر کو ایک حال پر قرار نہیں آتا ہر نیا سال نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے ساتھ ایک نئے مدیر کو دنیائے ادب کے
ا منے پیش کرتا ہے اور اپنے اختتام پر اس کو برطرف کر کے "مایۂ خویش" کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی کلیہ کے تحت آج
ں بھی اس بزم سے رخصت ہونا پڑ رہا ہے حالانکہ ابھی تک تیقن کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے بعد اس "مئے مرد افگن" کا حریف ہونے
ے لئے زمانہ کس کو برسرِ کار لائے گا۔

بہر حال ہمارا زمانۂ ادارت ختم ہو گیا اس ایک سال میں ہم نے جس بُری یا بھلی طرح میگزین کی خدمت کی اور میگزین کے ذریعے سے
. . . دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا اس کی بابت ہم خود کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ اس کا اندازہ ناظرین ہی کے حسنِ تخیل پر چھوڑتے ہیں۔
مبتہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ اپنے افتتاحی نمبر میں ہم نے جو مواعید کئے تھے، کم از کم اپنے نزدیک تو ان کو حرف بہ حرف پورا
رنے کی امکانی کوشش کی ہے۔ اور میگزین کی قدیم روایات کو اپنے معیار کے موافق قائم رکھنے میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔
ں لحاظ سے آج ہم سمجھتے ہیں کہ اپنے فرائضِ منصبی سے فخر و ناز کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔

لیکن میگزین کو اس کامیابی کے ساتھ چلانے کی ذمہ داری بہت حد تک ہمارے معاونین کے سر ہے، جن کا دلی شکریہ ادا کرنا
ہم س موقع پر اپنا فرضِ اولین خیال کرتے ہیں۔ اگر خدا کے فضل و کرم کے ساتھ ہمارے معاونین کی امداد ہمارے شاملِ حال نہ ہوتی،
تو ہم اپنی ذمہ داریوں سے اس قدر آسانی کے ساتھ کبھی سبکدوش نہ ہو سکتے تھے۔ سب سے پہلے ہم اپنے بزرگ مکرم جناب قاضی
جلال الدین صاحب ایف آر جی ایس اور ان کے جانشین جناب خواجہ غلام السیدین صاحب بی اے، ایم ای ڈی کا شکریہ ادا کرتے
ہیں جنھوں نے بہ حیثیت سنسر کسی طرح ہماری امداد و اعانت سے دریغ نہیں کیا اور میگزین کے ساتھ انتہائی شغف اور دلچسپی کا
اظہار کیا۔ اسی کے ساتھ انٹرمیڈیٹ کالج کے سنسر جناب محمد عبدالشکور صاحب ایم اے، بی ٹی (علیگ) کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے
کہ آپ نے برابر میگزین کا خیال رکھا اور بالخصوص تعطیلات نمبر کی ترتیب میں ہماری ہر طرح امداد فرمائی۔

اس کے بعد ان مضمون نگار حضرات کی خدمت میں ہدیۂ امتنان پیش کرنا ہے جنھوں نے اپنے رشحاتِ قلم اور نتائجِ افکار سے
میگزین کی قلمی معاونت فرمائی، بالخصوص مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کان پوری، جناب شمیم بلہوری، جناب میاں محمد اسلم صاحب لاہوری

حضرت ابوالنظر رضوی امروہوی، جناب کیفؔ مرادآبادی، جناب محمد علی خاں صاحب اثرؔ رامپوری اور دیگر اہل قلم حضرات نے ہماری درخواستوں کو کبھی "عرقِ مئے ناب" نہ بننے دیا۔ لیکن ان سب سے زیادہ ہمارے محترم دوست جناب ضیاء احمد صاحب ایم اے لیکچرار اردو انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ، ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس عرصہ میں ہمیں جب کبھی ان کی امداد کی ضرورت پیش آئی ہم نے بلا تکلف آپ کا دروازہ جا کھٹکھٹایا، اور آپ نے بھی کبھی ہماری مدد و اعانت سے دریغ نہیں کیا۔ ان تمام اصحاب قلم کی خدمت میں ہم دلی امتنان و تشکر کا ہدیہ پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ہمارے جانشین بھی ان حضرات سے اسی طرح مستفید ہونے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

میگزین کے دیگر امور کو سرانجام دینے میں ہمیں اپنے چند دوستوں سے بھی بہت زیادہ امداد ملی جن میں سب سے پہلے ہمارے سابق معاون جناب حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی کا شکریہ ضروری ہے۔ بہ حیثیت معاونِ مدیر جب تک آپ کا میگزین سے تعلق رہا، آپ ہر طرح اس کے کام میں نہایت دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے رہے اور ہمارا ہاتھ بٹانے میں ہر امکانی کوشش کرتے رہے۔ آپ کے علاوہ جناب شفیق احمد صاحب غازی بی اے (علیگ) اور جناب قاضی نعمان جلالی صاحب بھی نہایت خلوص اور دلچسپی کے ساتھ میگزین کے متفرق امور میں ہمارے شریک کار رہے۔ ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے۔

سب سے آخر میں جناب مولانا حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب منیجر مسلم یونیورسٹی پریس اور ان کے عملہ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ آپ نے اور پریس کے دیگر اصحاب نے ہمیشہ میگزین کے کام کو دوسرے کاموں پر مقدم رکھا اور ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ میگزین کی دیدہ زیبی اور ظاہری محاسن کا سہرا تمام تر پریس کے سر ہے۔

انیس رضوی

اڈیٹر

تصویر | اس اشاعت میں ٹیپو سلطان والیٔ میسور کی ایک اوریجنل تصویر کا چربہ شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تصویر مارکوس آف ولزلی کی خدمت میں ہدیۃً پیش کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ تصویر چھاپنے والے (کلکتہ آرٹس پرنٹنگ ورکس لاہور) کی غلطی سے اس پر خاکسار اڈیٹر کا نام بھی خواہ مخواہ چھپ گیا۔

(عہد جاہلیت)

جزیرۃ العرب ایک ریگستانی اور سنگلاخ ملک ہے جس میں چاروں طرف پہاڑوں کا زنجیرہ ہے۔ اس وجہ سے جاہلیت میں عرب فن زراعت میں ترقی نہ کر سکے اور چوں کہ یہ قانون قدرت ہے کہ ملک کی طبعی حالت انسان کی عام معاشرت پر اثر انداز ہوتی ہے اس لئے عرب مواشی پالنے پر مجبور ہوئے اور مواشی میں بھی گھوڑا اور اونٹ اُن کا خاص رفیق تھا اور بکریاں خوراک میں کام آتی تھیں۔

جب ان حیوانات کی ترقی ہوئی تو چراگاہوں میں ان کو اپنے اپنے مقام سے نکلنا پڑا اور یہی بدوی زندگی ان کا شعار ہو گئی۔ چوں کہ موجودہ ذریعۂ معاش (گلہ بانی) فارغ البالی کے لئے کافی نہ تھا اس لئے لُوٹ اور قتل و غارت کی ضرورت ہوئی اور اس میں بھی اس قدر انہماک ہوا کہ اقارب اور اغیار کا امتیاز اُٹھ گیا اور اس خانہ جنگی کی بدولت ان کو ایک جگہ جم کر رہنا دشوار تھا۔ قبائل کی اگرچہ یہ معمولی نقل و حرکت تھی، لیکن انھیں اسباب سے اُن میں علوم و فنون کی بنیاد پڑی۔ مثلاً گھوڑوں اور اونٹوں کی کثرت سے **تربیت الخیل** اور **بیطاری** کا فن ایجاد ہوا۔

اسی طرح روزمرہ کے کوچ و مقام اور طبعی حوادث نے **علم الانواء** (نچھتر) اور **علم ہبوب الریاح** (موسمی ہواؤں کا چلنا) کا راستہ دکھایا، کیوں کہ منزلوں کے طے کرنے میں اس وقت عربوں کے راہ نما صرف ستارے تھے اور عرب کا مطلع بھی دیگر ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ صاف تھا لہذا روز بروز جدید انکشاف ہونے لگے اور **فلکیات** کا علم ترقی کر گیا اور اسی قسم کے قدرتی اور طبعی اسباب نے **طبعیات** (طب وغیرہ) کی بنیاد ڈالی۔ بحر قلزم بحر ہند اور خلیج فارس کے قرب اور وسائل تجارت نے **علم الملاحۃ** (کشتی رانی) میں اُستاد بنا دیا۔ جنگ و جدال میں قبائل ایک دوسرے کی اعانت کے محتاج تھے اور اُن میں **عصبیت**، ارتباط اور اتحاد کی سخت ضرورت تھی لہذا

اس مقصد نے **علم الانساب** کو رواج دیا اور چوں کہ قتل و غارت کے بعد ہر ایک قبیلہ اپنے دشمن کے تعاقب میں جا
اس ضرورت سے **علم الاہتداء** (جنگل اور ریگستان میں صحیح راستہ پر چلنا) اور **علم القیافہ** (علم نقش قدم) ایجا

عرب میں کوئی دریا نہیں ہے اور ریگستان میں پانی نایاب ہوتا ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ آئے دن قحط کا سا
رہتا ہے۔ اس ضرورت سے **علم الریافہ** (زمین سونگھ کر دریافت کر لینا کہ پانی کس قدر گہرائی میں ہے) کی بنیاد پڑی
جنگ و جدال سے **علم الرمی بالسہام** (تیر بازی) پیدا ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ضرورت نے بہت سے مفید علوم پیدا کر دیئے۔ باقی رہے معارف علمیہ یہ اس ملک کا حصہ
جہاں ایک مہذب گورنمنٹ کی حکومت ہو اور رعایا فکر معاش سے مطمئن اور ہر فرد بشر کا جان و مال محفوظ ہو اس
اعتبار سے عہد جاہلیت میں جس قدر علوم ایجاد ہوئے وہ عربوں کی ذہانت اور فراست کی ایک بیّن دلیل ہیں کیوں
اُنھوں نے یہ علوم کسی مدرسہ میں حاصل نہیں کئے اور کیوں کر حاصل کرتے جب کہ اکتساب کے وسائل ہی مفقود تھے اس
اس کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے کہ عرب[1] البائدہ میں کس قسم کے علم و فن موجود تھے، کیوں کہ ان قبائل کا زمانہ عہد تا
سے بہت پہلے تھا۔ باقی رہے عرب العاربہ (بنو قحطان) یہ علوم و فنون، صنائع اور تمدن میں سیکڑوں برس پہلے تر
کر چکے تھے۔

عربوں کا تیسرا طبقہ عرب المستعربہ (بنی اسمٰعیل و عدنان) انتہائی ضلالت اور جہالت میں مبتلا تھا اور اسی بنا پر یہ
اُمت الامیہ (ان پڑھ قوم) کہلاتا تھا اور قرآن کریم نے بھی ان کو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ	وہی ہے کہ جس نے اَن پڑھوں میں انھی میں سے
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ	ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے
اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ	اور ان کو پاک کرتا اور ان کو علم کتاب و حکمت سکھاتا ہے
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	اور بے شک اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے
لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ	ہوئے تھے

---

[1] عرب البائدہ سے وہ قومیں مراد ہیں جو فنا ہو چکی ہیں۔ مثلاً قوم عاد (سنہ ۲۲۰۰ ق م لغایۃ سنہ ۱۵۰۰ ق م) و ثمود (سنہ ۱۸۰۰ ق م لغایت سنہ ۱۶۰۰ ق م) اور جن کا تذکرہ قرآن حکیم میں موجود ہے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اُمّیّین سے یہی جاہل عرب مراد ہیں اور ان کی انتہائی جہل کی تصدیق لفظ مبین سے
تی ہے اور اسی بنا پر ان کی ہدایت کے لئے ایک خاص رسول بھیجا گیا جس نے ان کی کایا پلٹ دی اور وہ علوم وفنون
ہو گئے جن کا تذکرہ عہد اسلام میں آئے گا۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ عربوں کا دورِ جاہلیت یونان کے عہد ظلمت سے
ابہ تھا اور دونوں کی تمدنی ترقی کی ایک ہی شان تھی۔ بلکہ ایک معنی کر کے عربوں کو فوقیت ہے کیوں کہ یونان کے مصلح
بڑے بڑے حکماء تھے اور عربوں کا راہ نما ایک رسول اُمّی تھا۔

قحطانیوں کے مقابلہ میں بنی اسمٰعیل کیوں جاہل اور غیر مہذب تھے؟ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ قبائل جنوبی عرب میں
تھے۔ جو جزیرۃ العرب کا ایک خشک اور غیر آباد حصہ ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے بلاد وممالک تمدنی ترقیوں سے ایک زمانہ در
از تک محروم رہتے ہیں۔ اگر ملکی فضا نہیں ہوتی تو اس خطہ کے عرب بھی اپنے کلدانی اور بابلی بھائیوں کی طرح معارف
کے عالم ہوتے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم علوم جاہلیت عرب لکھتے ہیں۔

علم الشعر

۱۔ شعر وشاعری | ہر قوم میں شاعری کا مادّہ کم وبیش قدرتی ہوتا ہے اور ملک کی طبعی حالت اس کو ترقی دیتی ہے اور مبدء فیاض کی طرف سے وحشی اقوام میں شاعری کی قابلیت متمدن اقوام کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی نظیر عرب کی شاعری ہے جو نہایت وسیع اور پر اثر جذبات سے لبریز ہے۔

عربوں کی شاعری دیگر اقوام کے مقابلہ میں حقیقی شاعری تھی کیوں کہ وہ جو آنکھوں سے دیکھتے تھے، وہی نظم کرتے تھے۔ اُن کی شاعری کی بنیاد مناظر قدرت اور فطری جذبات پر تھی چنانچہ عربوں کا تمام کلام اندرونی حسیات کا مرقع ہوتا تھا۔

عہد جاہلیت کی شاعری میں شجاعت، فیاضی، فخر ومباہات، غیرت، عزم واستقلال کا عنصر غالب تھا اور عشق ومحبت کا اظہار کرنا شاعری کا اصلی موضوع نہ تھا۔ بلکہ وہ ایک ضمنی مضمون تھا اور یہ قدرتی اسباب کے نتائج تھے، جو عبرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کو بہت زیادہ حاصل تھے ملکی فضا میں عربوں کے سامنے صاف ستھرا آسمان، ایک غیر متناہی سطح میدان کی طرح پیش نظر تھا۔ مختلف ثوابت اور سیارے ہر روز اپنا جلوہ دکھاتے تھے کبھی ڈوبتے اور کبھی اُچھلتے تھے۔ اسی طرح سطح زمین پر

چاروں طرف پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ صحرا میں نخلستان بھی تھے اور سبزہ زار بھی، ریگستان میں جا بجا آب رواں کے چشمے بھی تھے اور سراب بھی۔ مناظر قدرت کی نیرنگیوں اور دلچسپیوں کے ساتھ ہولناک جنگل بھی تھے اور مشاغل زندگی میں گلہ بانی اور قتل و غارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس مخصوص حالت نے عربوں میں حمایت اور شجاعت کا زبردست مادہ پیدا کر دیا تھا،[1] برخلاف اس کے عبرانیوں کے اشعار میں ذلت اور تواضع کا رنگ غالب ہے۔ علاوہ بریں عرب عبرانیوں کے مقابلہ میں بہت آزاد تھے اور اس آزادی کے سبب سے بدویوں کی طبیعت ہمیشہ جوالا مکھی پہاڑیوں کی طرح مشتعل رہتی تھی اور یہی عربوں کی فطری شاعری تھی، جس کی ایک یہ بھی دلیل ہے کہ متمدن حکومت کے آغاز سے قبل عرب میں اعلیٰ درجہ کے فصیح و بلیغ شاعر موجود تھے اور بقول پروفیسر نکلسن "عربوں کے یہ غیر مکتوب الفاظ (شعر) صحرائے عرب میں تیروں سے زیادہ تیز دوڑتے پھرتے تھے"۔[2]

یہ واقعہ ہے کہ نظم کی قوت نثر سے بہت زیادہ ہے اور نثر سے نظم زیادہ خوب صورت ہے۔ اس لئے مشہور ہے کہ "کل منظوم احسن من کل منثور" یعنی ہر نثر سے ہر نظم اچھی ہوتی ہے اور واقعات کے حفظ کے لئے بھی نظم نہایت موزوں ہے۔

عربوں کی یہ شاعری محض تفریح کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ اتحاد باہمی کا بھی سبب تھی اور انھی اشعار سے ان کے اخلاق و عادات کی شہرت ہوئی۔

نظم کی یہ قوت عرب کے تقریباً ہر مرد اور عورت میں تھی۔ اور یہ ایک فطری جوہر تھا جو قدرت نے ان کو عطا کیا تھا۔ عرب خود شاعر تھے اور دوسروں کے کلام پر تنقید کرتے تھے اور اُن کا ہر قول کم و بیش شعر ہوتا تھا و صنائع شعری (عروض و قافیہ، معانی، بیان اور بدیع) سے وہ واقف نہ تھے اور نہ ان کو ضرورت تھی۔ البتہ متاخرین میں جب شعر گوئی کی اصلی اور طبعی قوت جاتی رہی، تو اُن کو وسائط صناعیہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عروض کی بنیاد بھی شعرائے جاہلیت کے کلام سے پڑی اور مختلف اوزان اور بحریں اسی کلام سے اخذ کی گئیں۔

---

[1] رومیوں میں قیام سلطنت کے کئی صدی بعد شاعری کا عروج ہوا ہے۔ اسی طرح لاطینی شاعری کا دور ترقی قیام حکومت کے آٹھ صدی
یا ہے اور یہی حال یورپ کے دوسرے ممالک کا ہے۔

[2] لٹریری ہسٹری آف عرب صفحہ ۲۔

تاریخ عرب میں یہ امر بھی تعجب خیز ہے کہ ڈاکو اور رہزن بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے اور دیوانے بھی شعر کہتے تھے۔
کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ کوئی عورت شاعری میں مردوں سے بڑھ جاتی تھی اور شاعری کا آغاز عہد طفلی سے ہوتا تھا اور
جو شاعر نہ ہوتے تھے وہ شعرا کا کلام حفظ کرتے تھے اور لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ رُواۃ کہلاتے
تھے اور انھیں راویوں میں حماد الراویہ[۱] (ابوالقاسم بن میسرہ بن المبارک بن عبید الدیلمی متوفی ۱۵۶ھ) بھی ہے
جس کو ۲۰۰۰ شعر سے لے کر ۱۰۰۰ شعر تک کے قصائد ہر ردیف و قافیہ کے یاد تھے اور یہ لوگ اس عہد کے زندہ اخبار
میگزین اور رسالے تھے جن کے ذریعے سے کلام کی اشاعت ہوتی تھی۔ یہ رُواۃ لغات اور اشعار عرب اور
قصص وحکایات زبانی یاد کر لیتے تھے اور لوگوں کو سناتے پھرتے تھے۔

شاعری کی قدامت | عربوں کی شاعری نہایت قدیم ہے کیوں کہ اقوام سامیہ (سام بن نوح کی اولاد) میں عرب سب سے
زیادہ عام خیال سے دلچسپی رکھتے تھے اور اسی لئے اعتقاد توحید اور غیر محسوس اشیاء پر ایمان لانے والوں میں وہ
سب سے مقدم تھے اقوام سامیہ کا سب سے قدیم شاعرانہ اثر توراۃ کے متعدد ابواب سے ظاہر ہے۔

لامک نے اپنی بی بی عادہ اور ضلہ سے جو گفتگو کی تھی وہ بھی نظم کا ایک ٹکڑا ہے اور عبرانی شعر کی یہ نہایت قدیم
مثال ہے (تکوین ۴: ۲۳) سفر ایوب، سفر اشعیا اور مزامیر داؤد میں بھی تصور شعری کی مثالیں موجود ہیں۔

جس طرح دیگر اقوام کی قدیم تاریخ کا ذخیرہ نظم میں موجود ہے مثلاً ہندوؤں کی مہابھارت اور رامائن یونانیوں
کی الیڈ (Iliad) اور اوڈیسی (Odyssey) رومیوں کی انیڈ
زیادہ مصنفہ ورجل اور ملٹن کی پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) (گم شدہ بہشت) یہ سب کتابیں نظم میں
ہیں اسی طرح عربوں کا بھی ذخیرہ نظم میں تھا۔

دنیا کا سب سے بڑا شاعر کون ہے اس میں اختلاف ہے لیکن قدامت کے لحاظ سے ہومر (مصنف الیڈ) کا
بڑا درجہ ہے۔ اگر قومی عقیدت سے علیحدہ ہو کر فیصلہ کیا جائے تو دنیا میں سب سے بڑا شیخ الشعرا، ہومر ہے۔ مسلمان
بھی اس کے نام اور کمال سے بے خبر نہ تھے۔ ابوالعلاء معری کے کلام میں (کانی امیروس للدین محمد) سے

---

[۱] حماد عجرد کوفی اور حماد بن زبرقان نحوی اور حماد الراویہ ہم عصر ہیں اور ان میں بڑی دوستی تھی۔
(کتاب الشعر قتیبہ صفحہ ۴۹۰)

ہومر ہی مراد ہے جس کا نام عربی تاریخوں میں امیروس اور ہومیردس ہے[1]

ارسطو نے ہومر کے اشعار کی ویسی ہی شرح لکھی ہے جس طرح آج کل شیکسپیر کے کلام کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ فن شاعری اور بلاغت کے تمام اصول ارسطو نے ہومر ہی کے کلام سے اخذ کئے ہیں۔

ہومر کا تذکرہ محض اس لئے کیا گیا ہے کہ ہومر کے خیالات، شعراء جاہلیت عرب کے خیالات سے اکثر جگہ لڑ گئے ہیں[2]۔ حالانکہ قدیم عرب، ہومر اور اس کے کلام سے واقف نہ تھے۔ خصوصاً عنترہ کا کلام بہ آواز بلند کہتا ہے کہ وہ ہومر کے خیالات کا مترجم ہے۔ اس اتحاد خیال کا یہ سبب ہے کہ وحشی اقوام کی شاعرانہ تخئیل اپنے ماحول کے زیر اثر ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عبرانیوں اور یونانیوں کی طرح عربوں میں بھی شاعرانہ فطری قابلیت موجود تھی، لیکن بعد میں عرب، عبرانیوں سے بڑھ گئے اور اس کا یہ سبب تھا کہ عربی زبان میں متوارد اور مترادف الفاظ اور مادّے عبرانی سے بہت زیادہ تھے۔ اس لئے شعرائے عرب نے ایک ہی خیال کو متعدد اسلوب سے بیان کیا ہے اور ملک کی فضا بھی شاعری کی معین و مددگار تھی۔

۲-عربی شاعری کا آغاز علم الشعر کا عربی میں دوسرا نام قریض ہے اور قریض اونٹ کے گلے کی وہ ہلکی آواز ہے جو جُگالی کرتے وقت اُس کے مُنھ سے نکلتی ہے۔

ایک نکتہ سنج کہہ سکتا ہے کہ یہی آواز عربوں میں شعر کی ایجاد کا سبب ہوئی۔ کیوں کہ نظم عربی کی ابتدا نثر کے مقفیٰ جملوں سے ہوئی ہے جس میں وزن کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا اور اسی قسم کی عبارت سجع کہلاتی تھی۔

لغت عرب میں اونٹنی، کبوتر اور قمری کی نغمہ سرائی کا نام سجع ہے جس سے یہ اصطلاح وضع ہوئی ہے۔

عہد جاہلیت میں سجع کا استعمال صرف پیشین گوئی یا الہامی باتوں میں ہوا کرتا تھا[3] اور روزمرّہ کی گفتگو سادہ ہوتی تھی مثلاً:

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الیادہ (ترجمہ عربی ایلڈ) پروفیسر بستانی - مطبوعہ بیروت

[2] دیکھو مقدمہ کتاب الیادہ -

[3] بلوغ الارب جلد ۳ تذکرہ کہان وعرافین

(الف) سطیح بن مازن کاہن نوشیرواں کے خواب کی تعبیر ایک موبد کے سامنے بیان کرتا ہے جس میں نبی کریم کی بعثت کی طرف اشارہ ہے

" بغلك ملك ساسان لارتجاج الایوان وخمود النیران ورویاء الموبذان رای ابلاً صعابا تقود خیلاء اباقد اقتحمت فی الواد وانتشرت فی البلاد"

(ب) زبرا، کاہنہ پیشین گوئی کرتی ہے۔

واللیل الغاسق واللوح الخافق والصباح الشارق والنجم الطارق والمزن البوارق ان شجر الوادی لیادوا اختلاد ویحرق انیاباعصلا"

(ج) آلِ غسان کی فتح کی ایک کاہنہ پیشین گوئی کرتی ہے۔

والقمر الباھر والکوکب الزاھر والغمام الماطر وبالجو من طائر السیف الباتر بینکما دائر والغلبة للغسان ظاھر وانتظر ما یظھر فی الآخر"

چنانچہ اسی سجع سے وہ مختصر نظم پیدا ہوئی جس کا نام رجز ہے۔ سجع کی طرح رجز میں ہر مصرع کا قافیہ یکساں ہوتا تھا اور رجز کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فی البدیہہ ہوتی تھی جس میں ذاتی جذبات، تجارب، مشاہدات اور فخریہ امور کا اظہار کیا جاتا تھا۔ رجز حقیقت میں ایک عارضہ کا نام ہے جو اونٹ کے سُرین میں ہوتا ہے جس سے اس کی رانیں کانپتی رہتی ہیں اور قرآن میں " رِجزًا مِنَ السّمَاء " آیا ہے۔ یہاں رجز سے مطلق عذاب مراد ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جب انسان کی زبان سے یہ مسجع جملے نکلے اور ہوا کی گونج سے اس میں ایک قسم کی موسیقیت پیدا ہوئی تو یہی جملے رجز کہلائے۔ رجز کے نمونے بہت کم باقی ہیں تاہم کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ اور تذکرۂ محمد بن سلام وغیرہ میں چند رجز موجود ہیں

---

۵۱ بطور نمونہ اس مثال کا ترجمہ لکھا جاتا ہے:

" اور چمکنے والے چاند، روشن ستارے اور برسنے والی بدلی اور اڑنے والے طائر کی قسم۔ فریقین میں قاطع تلوار چکر کاٹ رہی ہے جس میں آلِ غسان کو غلبہ ہوگا اور منتظر رہو کہ اخیر میں کیا ظاہر ہوتا ہے۔"

۵۲ التوجیہ الوافی بمصطلحات العروض والقوافی۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم صفحہ ۲۶

۱۔ درید (دوید) بن زید بن نہد قضاعی مرتے وقت کہتا ہے[1]

اليوم يُبنىٰ لِدُرَيد بيته ... لو كان للدهر بِلىً ابليته

أو كانَ قِرني واحد كفيته ... يا ربَّ نهبٍ صالحٍ حويته

وربّ عبلٍ خشنٍ لويته

جن شعراء نے رجز لکھے ہیں اُن میں عجاج، روبۃ بن عجاج[2]، ابونخیلہ، ابوالنجم، دُکین، شماخ، [illegible] عمر بن لجأ اور ابوالزحف بہت مشہور ہیں اور یہ سب راجز کے لقب سے مشہور ہیں۔ خلیل نحوی بصری (۱۷۵ھ/۷۹۱ء) نے جب عروض ایجاد کیا تو من جملہ پندرہ بحروں کے ایک کا نام رجز رکھا جس کا وزن (عربی میں) مستفعلن [illegible] ہے۔ ایک زمانۂ دراز تک رجز خوانی کا نام شاعری رہا اور ضرب الامثال بھی رجز میں داخل ہیں اور شتربانوں کا [illegible] راگ جس کو حدیٰ کہتے ہیں یہی مسجع جملے تھے اور اسی سے عربی شاعری کی بنیاد قائم ہوئی اور رجز میں قصائد کے مضامین لکھے گئے۔ یہ حدیٰ، ہندوستان کے اہیر اور گوالوں کے برہا سے مشابہ تھی (برسات کے موسم میں جنگلوں میں برہا کی بہار رہوتی ہے) اگر رجز خوانی قائم رہتی تو عربی شاعری میں مثنوی کا رواج ہو جاتا جس کا ایک نمونہ کتاب السفینہ بن مالک ہے۔

عربوں کی ذہانت کا ہر موقع پر قائل ہونا پڑتا ہے کہ انھوں نے موسیقی کا پہلا تجربہ حیوانات پر کیا اور رجز کو [illegible] ایسی لَے سے گایا کہ اونٹوں کی رفتار دوچند ہو گئی اور چوں کہ راگ و نغمہ کو انسان سے بھی طبعی مناسبت ہے اس لئے رجز کو سند قبولیت حاصل ہوئی اور رجز تسکین قلب کا باعث ہوئے اور اشعار پڑھنے کا نام انشاد و نشید ہوا۔ جو سرود کے مرادف ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نظم کو موسیقی سے خاص نسبت ہے۔ بعد ازاں مخصوص قافیوں پر کبھی دو اور کبھی تین مصرعے لگائے گئے۔ اور مفاخرت، منافرت، سخاوت اور شجاعت کے جذبات نے روز بروز رجز میں ترقی کی اور عربی شاعری

---

[1] کتاب الشعراء ابن قتیبہ صفحہ ۳۶ و ۵، مطبوعہ ہالینڈ ۱۲

[2] عجاج اور روبہ صاحب دیوان تھے۔ جس میں رجز تھے۔ روبہ کا ۱۴۵ھ/۶۲ء میں انتقال ہوا۔ یہ لغت کا امام تھا اور رجز گوئی میں کوئی روبہ سے زائد نہیں ہوا۔ (مواسم الادب صفحہ ۱۲۹ حصہ اول وکتاب العمدہ رشیق قیروانی صفحہ ۵۶ مطبوعہ مصر ۱۲

ں نئے نئے اسلوب[1] پیدا ہو گئے اور قصیدہ کی ایجاد ہوتے ہی شاعری نے غیر معمولی ترقی کی۔ جس کا موجد اول مہلہل
ن ربیعہ تغلبی ہے۔ قصیدہ کی ابتدا سات شعروں سے ہوئی۔ پھر یہ تعداد دس تک بڑھ گئی اور بعد ازاں پچیس سے ترقی
ر کے سو ہو گئی اور متاخرین نے غیر معمولی اضافہ کر دیا۔ یہ پانچویں صدی عیسوی کے واقعات ہیں۔

محمد بن سلام اپنے تذکرۂ شعراء میں لکھتے ہیں

ولم يكن لاوائل العرب من الشعر الا ابيات	قدیم عربوں کی شاعری ابیات تک محدود تھی جب کوئی
يقولها الرجل في حادثة وانما قصدت القصائد	حادثہ ظہور پذیر ہوتا تو لوگ ابیات میں اظہار خیال کرتے
وطول الشعر على عهد عبد المطلب وهاشم	تھے اور قصائد و طویل اشعار کا رواج عہد عبد المطلب متوفی
بن عبد مناف وذلك يدل على اسقاط	ششتہ اور ہاشم بن عبد مناف میں ہوا اس سے ظاہر ہے
عاد وثمود وحمير وتبع	کہ عہد عاد و ثمود، حمیر اور تبابعہ میں شاعری کا وجود نہ تھا

عرب کی ابتدائی شاعری میں وزن کی رعایت نہ تھی، صرف قافیہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور یہی حال عبرانی شاعری کا تھا۔ لیکن بعد میں وزن اور قافیہ دونوں کا لحاظ رکھا گیا جس سے شعریت میں اضافہ ہو گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وزن اور قافیہ کو شعر کی تعریف میں کچھ دخل نہیں ہے جس کی بیّن مثال خطبات ہیں کہ ان میں وزن و قافیہ کی رعایت نہیں ہوتی ہے اور پھر بھی یہ خطبات دلکش اور موثر ہوتے ہیں۔

واقعات مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ سامی عربوں میں شاعری کا فطری مادّہ تھا جس کا سبب ان کی صحرا نوردی اور جوش حریت تھی اور بدویانہ زندگی میں تنازع، تفاخر اور تنافر کا پیدا ہونا لازمی تھا اور یہ وہ طبعی اسباب ہیں جن سے اذہان میں تیزی اور جدّت پیدا ہوئی۔ اس بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ عربوں کی قوم عاد و ثمود بھی شاعر ہونگی۔ لیکن چوں کہ یہ قومیں تباہ ہو گئیں اور ان میں فن کتابت کا بھی رواج نہ تھا، لہذا ان کا علمی سرمایہ بھی تلف ہو گیا۔ بعض تاریخوں میں عہد تبابعہ کے اشعار موجود ہیں لیکن الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ یہ نئی زبان ہے اور قدیم واقعات کو شعرائے مابعد نے اپنے عہد کی زبان میں نظم کر دیا ہے۔

---

[1] المزہر سیوطی صفحہ ۲۴۳ جلد ۲ مطبوعہ مصر

۴۔ اشعار کی کثرت | عہد جاہلیت کے اشعار کا جس قدر ذخیرہ موجود ہے وہ اسلام سے تقریباً دو صدی قبل کا ہے اور با فراط ہے اور تمام اقوام کی نظم سے عربوں کا مجموعۂ نظم زیادہ ہے جس کا اندازہ اس طرح پر ہو سکتا ہے کہ ایلیڈ میں ۳۰ ہزار، مہابھارت میں ۲۰ ہزار، رامائن میں ۴۸ ہزار اور شاہنامہ میں ۶۰ ہزار (ایک روایت میں ۳۰ ہزار) اشعار ہیں۔

اب عربوں کی حالت دیکھیے کہ حماد راویہ کو ۲ ہزار قصائد حفظ تھے۔ اور وہ بھی اس ترتیب سے کہ ہر حرف تہجی سے ایک ایک ہزار اور خلیفہ ولید بن یزید نے خاص طور پر حماد کا امتحان لیا تھا اور جب وہ امتحان میں کامیاب ہوا تو دس اس کو ایک لاکھ درہم انعام دئیے۔ ابو تمام صاحب حماسہ کو علاوہ مقاطیع اور قصائد کے چودہ ہزار جوزے رجزے قصیدے عہد جاہلیت کے یاد تھے جس کا مختلف مواقع پر امتحان لیا گیا۔

علامہ اصمعی کو سولہ ہزار جوزے حفظ تھے۔ ابو ضمضم[1] ۸۰ شاعروں کے اشعار روایت کرتا تھا جن کا نام عمرو تھا در پھر بھی ابو عمرو بن العلا کو شکایت ہے کہ عہد جاہلیت کا کلام بہت کم ملا ہے[2]۔ اشعار کے علاوہ ضرب الامثال کا ذخیرہ بھی محفوظ رہا اور کلام عرب میں امثال کو بڑا دخل ہے کیوں کہ یہ چھوٹے چھوٹے جملے نہایت لطیف اور سبق آموز تھے اور خاص صفت یہ ہے کہ امثال میں اوزان بھی موجود تھے جس کا زمانۂ مابعد کے شعرا کو خاص طور پر احساس ہوا۔

آج ان تاریخی روایات کو لوگ فسانہ سمجھیں گے۔ لیکن یہ واقعات ہیں جس سے عربوں کی قوت حافظہ کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اسی غرور نے ان کو کتابت سے بے نیاز کر دیا تھا۔ غزوات اسلام میں اکثر رواۃ قتل ہو گئے ورنہ نظم عربی کا ذخیرہ آج بہت وسیع ہوتا۔

۔ شعر کی تعریف | شعر کا مادۂ[3] اشتقاق شعور ہے۔ یعنی کسی شے کا علم اور اس سے واقفیت عامہ حاصل کرنا۔ حکماء کی نزدیک شعر کا مفہوم بہت وسیع ہے جس پر ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے اور یہ متفق علیہ ہے کہ شعر کا مقصد جذبات پر اثر ڈالنا ہے جس طرح طبائع انسانی پر مصوری اور موسیقی کا اثر ہوتا ہے۔

ملٹن اور ارسطو کی نزدیک پر از جذبات صداقت کا نام شاعری ہے اور شاعری انسان کے ان خیالات کا نام ہے جن کا خمیر حسیات اور جذبات سے ہوتا ہے اور انسان کا ہر خیال شاعری کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ لہذا شاعری ایک

---

[1] ابن خلکان صفحہ ۱۲۱ جلد اول [2] کتاب الشعر ابن قتیبہ صفحہ ۴ [3] مزہر سیوطی صفحہ ۲۲۳ جلد ۲

[4] کتاب العمدہ قیروانی تعریف شعر ۱۲

...ت نشین فلسفی کی تقریر ہی جس کا مخاطب اول اس کا نفس ہوتا ہی۔ بعدازاں انھیں خیالات سے دوسرے مستفید
...تے ہیں اور یہ ایک فطری شئے ہی جس کو اکتساب سے کوئی تعلق نہیں ہی اور محض کلام موزوں کو شعر کہنا جہالت ہی۔

...دارج شعراء | مضمون کی بلندی اور پستی کے اعتبار سے عربوں نے شاعروں کے درجے مقرر کئے ہیں اور وہ ان کو مختلف
...موں سے یاد کرتے ہیں جس کی یہ تفصیل ہی۔

(۱) خنذیذ — وسیع الخیال فصیح البیان نادرہ کار

(۲) شاعر — جس کا کلام متوسط درجہ کا ہو

(۳) شویعر۔ شعرور — قوت شعری کے بغیر جو زبردستی شاعر بن جائے یا صنائع شعریہ کے ذریعے سے

متشاعر — شعر کہے

جب صنعت کے ذریعے سے شاعری کا آغاز ہوا تو شعر کے واسطے چار چیزیں لازم قرار دی گئیں یعنی لفظ،
وزن، معنی اور قافیہ اور ترقی مدارج کے لئے معانی اور بیان کا فن ایجاد ہوا۔ لیکن شعرائے جاہلیت ان
قیود سے آزاد تھے۔

۷۔ شاعر کی عزت | قبائل عرب[۱] میں تین تقریبیں بڑی خوشی کی ہوتی ہیں جس میں شاندار دعوتیں ہوتی ہیں:—

(۱) جب کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہو کیوں کہ بیٹا ہر معرکہ میں باپ کا رفیق اور قوت بازو ہوتا ہی۔

(۲) جب کوئی اصیل گھوڑی بچہ جنے۔

(۳) کسی قبیلہ میں کوئی نامور شاعر ہو اور جب اس کی شہرت درجۂ کمال پہ پہنچ جائے تو دوسرے قبائل سے
مبارک باد کے وفد آتے تھے۔ اور اس جشن مسرت میں عورتیں بھی حصہ لیتی تھیں اور دف بجا کر گاتی اور ناچتی تھیں کیونکہ
شعرا عورتوں کے حقوق کے بھی محافظ ہوتے تھے۔

یہ واقعہ ہی کہ جن ناکتخدا لڑکیوں کی تعریف میں شعرا قصائد کہتے تھے اُن کی شادی اونچے گھرانوں میں بہت
جلد ہو جاتی تھی۔ یہ شاعر انساب کے بھی حافظ ہوتے تھے اور قومی فضائل بیان کرتے تھے جس سے قبیلہ کی عظمت
بڑھ جاتی تھی۔ عربوں میں شاعر کا وجود ایک ماہر فن پہلوان سے زیادہ قیمتی ہوتا تھا۔ شاہوں کے دربار میں بھی ش

---

[۱] کتاب العمدہ باب احتفاء القبائل لشعرا بہا۔ باب شفاعات الشعرا و بلوغ الارب ۱۲

ہوتے تھے اور ان کی سفارش سے بعض وقت بڑے کام نکل جاتے تھے

عوام کا یہ بھی خیال تھا کہ شاعروں کے قبضے میں ایک جن ہوتا ہے جو ان کو مضامین القاء کرتا ہے اور غیب کی خبریں
ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ بھی شاعر کی عزت کا سبب تھا۔

میدانِ کارزار میں شعراء کی قیادت سے جنگ ہوتی تھی اور وہی نقیب بھی ہوتے تھے۔ چراگاہوں کا انتخاب بھی
کے مشورہ سے ہوتا تھا۔ کوچ و مقام کی حالت میں شاعر کے حکم سے خیمے اکھاڑے اور لگائے جاتے تھے یہ مشہور واقعہ
جریر شاعر کی ایک ہجو نے قبیلۂ نمیر کو ہمیشہ کے لئے ذلیل و تباہ کر دیا اور اس ہجو کی شہرت کے بعد اس قبیلہ کے
ی اپنا نام و نسب بتاتے ہوئے شرماتے تھے اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے اقوام عالم کے شعرا محروم ہیں۔

شعرائے عرب بڑے دلیر اور آزاد خیال ہوتے تھے وہ بادشاہوں سے مطلق نہیں ڈرتے تھے اور ان کے
منے ہجو کے اشعار پڑھتے تھے جس کی نظیر عمرو بن کلثوم تغلبی کا واقعہ ہے۔ شعرا کا کلام شاہوں کو بقائے دوام کی سند
تھا اور یہ بھی ممدوح کی ذات سے حیات جاوید پاتے تھے۔

مجالس ادب | شعر و سخن کی ترقی کے لئے عربوں میں مجالس ادب بھی قائم تھیں، جہاں شعرا اپنی نظمیں سناتے تھے۔ یہ مجالس
ہ یا نادی کہلاتی تھیں (قریش کی مجلس شوریٰ ندوہ جداگانہ تھی) اس کے علاوہ جزیرۃ العرب کے مختلف مقامات میں
وسمی بازار اور میلے ہوا کرتے تھے وہاں بھی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان بازاروں میں سوق عکاظ سب سے زیادہ
ور ہے۔ اس قومی اکھاڑے کے کامیاب شعرا کے قصائد خانۂ کعبہ میں آویزاں کئے جاتے تھے جو سب سے بڑی قومی عزت
، اور اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوتا تھا کہ موجودہ شعرا میں اشعر الشعرا یا ملک الشعرا کون ہے۔ عورتیں بھی سوق عکاظ میں اپنا
م سناتی تھیں اور خراج تحسین حاصل کرتی تھیں اور اس مقام کے علاوہ ان کی جداگانہ مجلسیں بھی تھیں جہاں وہ
ا کلام سناتی تھیں اور مردوں کے کلام پر تنقید کرتی تھیں۔ عہد اسلام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے والیان صوبہ کے
جو تعلیمی احکام جاری کئے تھے اُن میں شعر کی تعلیم بھی شامل تھی، کیوں کہ اخلاق، اصابت رائے اور نسب کی تعلیم شعر سے
ی تھی۔ شعر کے متعلق حضرت عمرؓ کا یہ قول مشہور ہے۔

---

۵ تاریخ یعقوبی، کتاب الشعر ابن قتیبہ جلد اول۔ کتاب العمدہ

"نعلم ما تعلمته العرب الابیات من الشعر یقدمها الرجل فینزل بها الکریم و یستعطف بها اللئیم"۔
عربوں کا سب سے بہترین علم اشعار ہیں۔ جس کے ذریعے انسان ایک فیاض شخص سے انعام حاصل کرتا ہے اور بخیل کو اپنی جانب مائل کرلیتا ہے۔

قصائد کے انتخاب کے لئے سوق عکاظ میں ایک ملک الشعرا صدر جلسہ کیا جاتا تھا اور اس کا فیصلہ ناطق ہوتا تھا۔ سوق عکاظ میں دنگل بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ بھی اسی اکھاڑے کے ایک مشہور پہلوان ہیں۔ اور یہ واقعہ قبول اسلام سے پہلے کا ہے۔ مورخین یورپ نے بازار عکاظ کو ہائڈ پارک لندن سے تشبیہ دی ہے جہاں ہر قسم کے علمی مذاکرے ہوا کرتے ہیں لیکن ہماری رائے میں عکاظ کو مقدس مقام دلفی سے تشبیہ دینا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ دلفی کے سالانہ میلہ میں گھڑ دوڑ، کشتی، اور نے نوازی کے کمالات دکھائے جاتے تھے اور ان کرتبوں میں جو کامیاب ہوتا تھا اس کے سر پر پھولوں کا ایک طرہ باندھا جاتا تھا۔

زمانہ جاہلیت کے کلام سے متاخرین نے کیا فوائد حاصل کئے

۱۔ اس علم نے ہزاروں شاعر بنا دیئے۔ علم العروض کی تدوین ہے۔ اس کا موجد خلیل بن احمد بصری ہے جس نے کلام جاہلیت اور امثال عرب سے مختلف اوزان اور بحریں ایجاد کیں۔ حال آنکہ مہلہل اور امرؤ القیس وغیرہ اوزان و بحور سے ناواقف تھے لیکن ان کا کوئی قصیدہ اور نظم صنعت عروض سے خالی نہیں ہے۔

۲۔ عرب قدیم کی تاریخ کا اکثر حصہ اشعار جاہلیت سے مرتب کیا گیا ہے۔

۳۔ سجستانی کی کتاب المعمرین (عرب کے بوڑھے) اور کتاب البخلاء (عرب کے مشہور بخیل اور کنجوس) کا ماخذ بھی یہی اشعار ہیں۔

۴۔ ابن قتیبہ وغیرہ نے تذکرہ شعراء اشعار سے مرتب کئے ہیں۔

۵۔ جغرافیہ کے مبادی، مشہور دیہات، قصبات، پہاڑ، چشمے، نخلستان، ریگستان، قدیم راستے، جنگل اور وادیوں کے حالات بھی اشعار سے لکھے گئے ہیں۔

---

[1] البیان جاحظ ۱۲

[2] علم عروض کی بنیاد خلیل سے پہلے پڑی ہوگی جس کی تصدیق امثال وغیرہ کے اوزان سے ہوتی ہے لیکن جب تک تاریخ سے تصدیق نہ ہو خلیل ہی موجد سمجھا جائے گا۔

۶ - جاحظ کی کتاب الحیوان اور ابوحنیفہ دینوری کی کتاب النبات کا ماخذ بھی اشعار ہیں۔

۷ - انساب العرب کا اصل سرمایہ شعرائے جاہلیت کا کلام ہے۔

۸ - ادیان العرب، کہانت، عام معاشرت، رسم و رواج اور ایام العرب (قومی لڑائیاں) کی تاریخ اشعار سے مرتب ہوئی ہے۔

۹ - عہد اسلام میں مفسرین نے قرآن و حدیث کے محاورات اور خاص خاص الفاظ کی تشریح کلام جاہلیت سے کی جس کی نظیر حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر ہے اور حضرت کا یہ قول بھی مشہور ہے[1]:

اذا قرأتم شيئاً من كتاب الله فلم تعرفوه	جب تم قرآن پڑھو اور کوئی محاورہ نہ جان سکو تو اس کو
فاطلبوا فى اشعار العرب	اشعار عرب میں تلاش کرو

اور محض اسی خیال سے ابن قتیبہ نے شعرا کو بھی رواۃ حدیث و اخبار سے تشبیہ دی ہے۔

۱۰ - رزمیہ فسانے شہسواروں اور نامور پہلوانوں کے حالات بھی اشعار سے مرتب ہوئے ہیں۔

۱۰ - طبقات الشعرا | شعرائے عرب[2] چار طبقات پر تقسیم ہیں:

(۱) جاہلی وہ شاعر ہے جو عہد جاہلیت میں پیدا ہوا اور اسی زمانہ میں فوت ہوا یا یہ کہ اس نے اسلام کا زمانہ دیکھا مگر اسلام قبول نہیں کیا۔ مثلاً امرؤ القیس، امیہ بن ابی الصلت وغیرہ۔

(۲) مُخَضرَمی وہ شاعر ہے جس نے دونوں زمانے (کفر و اسلام) دیکھے ہوں۔ پھر ان میں جنھوں نے اُمیہ اور عباسیہ دونوں دورطے کئے وہ "مخضرم الدولتین" کہلاتے ہیں۔ مثلاً حسان بن ثابت، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ وغیرہ۔ یہ اصطلاح لفظ مخضرمہ سے نکلی ہے۔ مخضرمہ وہ اونٹنی ہے جس کا کان کٹا ہو۔ یعنی وہ شاعر جو جاہلیت سے قطع تعلق کرکے اسلام کی طرف آگیا ہو مخضرمی ہے۔

(۳) اسلامی وہ شاعر ہے جو خاص عہد اسلام میں پیدا ہوا ہو۔ چنانچہ عہد رسالت سے بنی اُمیّہ تک جس قدر شاعر ہوئے ہیں وہ اسلامی کہلاتے ہیں۔

---

[1] کتاب العمدہ صفحہ ۱۱ [2] کتاب العمدہ صفحہ ۲۰

۴ - مولدین یا محدثین

قدماء کے مقابلہ میں محدثین (نئے) کا لفظ ہے۔ دولت عباسیہ اور اس کے بعد جس قدر شعراء ہوئے ہیں وہ سب محدثین کہلاتے ہیں۔ مثلاً جریر، فرزدق، اخطل وغیرہ

بعض علماء کی نزدیک تیسری صدی کے بعد شعرا اسی طبقہ میں داخل ہیں۔ اور نیز وہ بھی جنہوں نے صنائع شعریہ کے وساطت سے شعر کہا ہو۔ گویا یہ حقیقی شاعر نہ تھے۔ اور خود عرب جاہلی [illegible] دوسرے [illegible] والوں پر فوق دیتے تھے اور یہی امام فن مانے جاتے تھے اور جب کسی [illegible] تعریف کرنی ہوتی تو کہتے تھے کہ اگر اس نے جاہلیت کا ایک دن بھی [illegible] ہوتا تو بڑا شاعر ہوتا۔

مختصر یہ کہ عرب میں جو سب سے بڑے شاعر ہوتے وہ جاہل مطلق تھے گویا علمی فضل و کمال شاعری کے منافی تھا۔ یہی نظری شاعری کی تعریف تھی، کیوں کہ تہذیب و تمدن کے دور میں تصنع بڑھ جاتا ہے اور حقیقی جذبات فنا ہو جاتے ہیں [illegible] وہ جہالت ہے جس پر خود عرب فخر کرتے تھے

الا لا یجهلن احد علینا — خبردار کوئی ہم سے جہالت نہ کرے

فنجهل فوق جهل الجاهلینا — ورنہ ہم سو جاہلوں سے بڑھکر ایک جاہل ہیں

شعراء کے القاب و خطاب

شعرائے عرب کے خطاب و القاب بھی ہیں یہ خطاب اوصاف کی بنیاد پر ہوتے تھے اور کبھی ان میں ہجو کا بھی پہلو ہوتا تھا۔ یہ القاب قصیدہ وغیرہ کے کسی شعر سے اخذ کئے جاتے تھے۔ مثلاً جریر بن المسیح متلمس مشہور تھا۔ جس کا ماخذ تلمس تھا اور یہ ایک شعر سے اخذ کیا گیا تھا۔ دیگر مشہور خطاب حسب ذیل ہیں:

۱- عوف بن سعد وائلی	مرقش
۲- زیاد بن معاویہ	نابغہ
۳- عمرو بن العبد بکری	طرفہ
۴- غیلان بن عقبہ	ذوالرمہ
۵- مسلم بن الولید	صریع الغوانی
۶- عامر بن مجنون	مدرج الریح

ئ لطائف المعارف و کتاب الشعراء ابن قتیبۃ و حماسہ ۱۲

۷۔ عامر بن حارث نمری	جران العود
۸۔ عبداللہ بن روبہ (راجز)	عجاج
۹۔ عتبہ بن سعد	اعصر
۱۰۔ صریم بن معشر تغلبی	افنون
۱۱۔ ثابت بن جابر	تابط الشراء
۱۲۔ جرول بن اوس	حُطَیّہ
۱۳۔ مغیرہ بن الاسود	الاقیشر
۱۴۔ زہیر بن علس	مُسَیّب
۱۵۔ تیرید بن ضرار	مُزَرِّد
۱۶۔ غیاث بن غوث	اخطل

یہ خطاب والقاب کس بنا پر دیئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیل تذکرۂ شعرا میں موجود ہے۔

۱۲۔ شعرائے مشہور قبائل

قبائل عرب میں شاعری کا آغاز قبیلہ ربیعہ سے ہوا جس میں مہلہل بن ربیعہ، مرقش اکبر، مرقش اصغر طرفہ، عمرو بن قمیئہ، حارث بن حلزہ، متلمس، اعشیٰ، مسیب، عدی اور سعید بن مالک مشہور ہیں۔

دوسرا قبیلہ قیس کا تھا، جس میں نابغہ ذبیانی، نابغہ جعدی، زہیر بن ابی سلمیٰ، کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ حطیہ، شماخ، مزرد اور خداش بن زہیر ہیں۔

تیسرا قبیلہ تمیم کا تھا جس میں جریر، فرزدق، اخطل، اوس بن حجر مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ قبیلہ حمیر اور قریش میں بھی شاعر تھے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عرب قریش کو جملہ اوصاف میں افضل جانتے تھے مگر ان کی شاعری کے قائل نہ تھے قریش متمدن اور تجارت پیشہ تھے۔ امصار و دیار میں جاتے تھے ان کی زبان میں دیگر اقوام کے الفاظ شامل ہو گئے تھے ممکن ہے کہ اس بنیاد پر ان کی شاعری مسلم نہ ہو۔ اسی طرح حجازی عرب، حمیر کی زبان کے قائل نہ تھے۔

تدوین کلام | عہد اسلام (دوسری صدی ہجری) میں بصرہ اور کوفہ کے علماء نے عہد جاہلیت کے کلام کو مختلف حیثیتوں
سے جمع کیا ہے۔ بعض نے صرف ایک شاعر کا دیوان مرتب کیا اور بعض نے کلیات ترتیب دیئے۔ جن شعرا کے دیوان مرتب
ہوئے وہ حسب ذیل ہیں۔

نابغہ، عنترہ، طرفہ، زہیر، علقمہ، لبید، عروہ، حاتم، اوس بن حجر، امرؤ القیس، حادرہ اور خنساء
(یہ دیوان مصر، بیروت اور یورپ میں چھپ گئے ہیں) ان کے علاوہ دیوان مختارات شعراء عرب (مرتبہ ابن الشجری)
...بنین کے مجموعے جداگانہ ہیں۔ مفضل ضبی (متوفی ۱۶۸ھ) نے شاہزادوں کی تعلیم کے لئے خلیفہ منصور عباسی کے حکم سے
نظموں کا مجموعہ مرتب کیا تھا جو مفضلیات کے نام سے یورپ نے شائع کیا ہے۔ اسی ذیل میں حماسہ (ابو تمام) اور حماسہ
بحتری کے کلیات ہیں۔ ایام العرب میں عرب واحس اور حرب بسوس کی رزمیہ نظمیں جداگانہ ہیں۔ بعض ادیبوں نے
...ات کے نام سے مختلف شعرا کا کلام جمع کیا ہے چنانچہ ان میں جمہرہ ابو زید انصاری بہت مشہور ہیں۔ ان کی علاوہ
ادب اور تاریخ کی کتابوں میں اشعار جاہلیت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

خلفائے امیہ اور عباسیہ نے عہد جاہلیت کی کلام کی بڑی قدر کی اور انعامات دے کر یہ کلیات مرتب کرائے
اور مفسرین نے اشعار جاہلیت کو مفتاح القرآن قرار دیا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: **الشعر دیوان العرب
فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانھا۔**

علماء و شعرا کے علاوہ تحفظ کلام جاہلیت میں رُواۃ بھی قابل تذکرہ ہیں۔ جن اصحاب نے اشعار جاہلیت کو
اپنے حافظہ میں محفوظ رکھا وہ رواۃ (جمع راوی) کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا زبان عربی پر بڑا احسان ہے جن کی بدولت
یہ ذخیرہ تلف ہونے سے محفوظ رہا۔ اور تحفظ کا یہ سبب ہے کہ اکثر نظمیں اپنے قبیلہ کی تعریف اور دشمنوں کی ہجو میں
ہوا کرتی تھیں جس کا یاد رکھنا بچہ بچہ پر فرض تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی باجہ کے ساتھ ان نظموں کو گاتی تھیں
یہ بھی دستور تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ اس کا ایک راوی ہوتا تھا جو اس کا کلام یاد کرلیتا تھا اور ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔
یہ رواۃ دوسرے قبائل میں جاکر اپنے شاعروں کا کلام فخریہ سنایا کرتے تھے۔ اور بعض راوی خود بھی شاعر ہوتے تھے مثلاً
زہیر اپنے سوتیلے باپ اوس بن حجر کا راوی تھا۔ اسی طرح حطیہ، زہیر کا اور فرزدق، امرؤ القیس کا راوی تھا۔
اس طریقہ سے رواۃ کی ایک بڑی جماعت بن گئی تھی۔ بعض رواۃ نے چالاکی سے دوسرے شعرا کا کلام اپنے نام سے

مشہور کر دیا تھا جیسا کہ حماد اور خلف الاحمر کی نسبت مشہور ہے۔

جس طریق سے کلام جاہلیت کی تدوین ہوئی ہے۔ اس سے بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پر بھی بعض مستشرقین (پروفیسر مارگولیتھ و طٰہٰ حسین نابینا مصری) کا خیال ہے کہ کلام جاہلیت کے مجموعے فرضی ہیں اور یہ کلام مصنوعی ہے۔ یہ رائے تاریخ اور اصول تنقید کے خلاف ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کسی قدر تغیر اور تبدیلی ہوئی ہے۔ اور کلام جاہلیت میں عہد اسلام کے قریب زمانہ کا کلام شامل ہو گیا ہے۔ لیکن جملہ امثال اپنی اصلی حالت پر قائم ہیں اور ان میں مطلق تغیر نہیں ہوا ہے۔ بعض الفاظ میں تحریف ہوئی ہے جس طرح اللاۃ کا لفظ اللہ ہو گیا ہے۔

۱۱۔ شعر کی تقسیم | کلام عرب دو حصّوں پر تقسیم ہے۔ ایک منظوم دوسرا منثور، پھر انھیں سے ہر ایک کے تین طبقات ہیں جید متوسط اور ردیہ (اعلیٰ، اوسط، ادنیٰ) لیکن نثر سے نظم کا درجہ بلند ہے اور نظم کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ اس مختصر مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا صرف قصیدہ کے مضامین پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ قصیدہ میں عموماً چار قسم کے مضمون ہوتے ہیں۔ مدح، ہجو، تشبیب اور مرثیہ۔ شعرائے عرب مدح و مناقب بہت کم لکھتے تھے اور قصیدہ میں ممدوح کے وہی اوصاف لکھے جاتے تھے جو اس میں موجود ہوتے تھے اور اشعار کی تعداد بھی کم ہوتی تھی جریر کا قول ہے " اذا مدحتم فلا تطیلوا " (مدح کو طول نہ دو)

عرب میں مدحیہ شاعری کا دائرہ پہلے محدود تھا اور خاص خاص احسانات کے صلہ میں بطور شکریہ مدح کے اشعار لکھے جاتے تھے۔

مثلاً ایک خانہ جنگی میں بنو تمیم نے امرؤالقیس کی مدد کی تھی تو امرؤالقیس نے بطور شکریہ یہ شعر لکھا ؎

اقرحشا امروالقیس بن حجر

بنو تمیم " مصابیح الظلام "

یعنی بنو تمیم اندھیری رات کے چراغ ہیں۔ یہ ایک سادہ مثال تھی اور معمولی تعریف لیکن جب ملک میں امارت کی اور تہذیب و تمدن کا دور آیا۔ تو مداحی کے اسلوب ترقی کر گئے اور مبالغہ بڑھ گیا۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ثلاثۃ تشرق الدنیا ببھجتھم
شمس الضحٰے وابو اسحٰق والقمر

دنیا کو تین چیزوں نے روشن کر رکھا ہے۔ ایک آفتاب[۱] دوسرا ابو اسحٰق[۲] (خلیفہ معتصم باللہ عباسی) اور تیسرا چاند[۳]

تحکی افاعله فی کل نایلة	اور یہ تینوں ابو اسحق کے کارناموں کی نقل اتارتے ہیں
الغیث واللیث والصمصامة الذکر	یعنی بادل، شیر اور تلوار

جاہلیت کی مدح کے نمونے حسب ذیل ہیں :-

(۱) اخی ثقة لا یهلك الخمر ماله	میرا بھائی قابل اعتماد ہے شراب اس کی دولت کو ضائع نہیں کر سکتی ہے
ولکنه قد یهلك المال نایله	(کثرت مے نوشی داخل امارت تھی) البتہ نیاضی اس کی دولت کو برباد کر دیتی ہے
۲) تراه اذا ما جئته متهللا	اس کے پاس کچھ مانگنے جاؤ تو اس کا چہرہ ایسا چمکنے لگتا ہے کہ گویا تم بھی
کانك تعطیه الذی انت سائله	اس کو وہ چیز دیتے ہو۔
۳) یغشون حتی ما تهر کلابهم	ممدوح کے کتے کسی کو دیکھ کر بھونکتے نہیں ہیں کیونکہ وہ تمام
لا یسألون عن السواد المقبل	آنے والوں سے مانوس ہو گئے ہیں۔

(حطیه)

اور یہی حال ہجو کا بھی تھا۔ اس عہد میں ہجو سے یہ مقصد نہ تھا کہ کسی کو گالیاں دی جائیں بلکہ اُن عیوب کا اظہار کیا جاتا تھا جس سے قوم کا کوئی سردار اپنے درجے گر کر خوار و ذلیل ہو جائے۔ مثلاً مہمان نوازی، انسانی ہمدردی، فیاضی اور شجاعت میں کوتاہی کی جائے یا نسب میں ہٹیا ہونا، کسی عورت سے قبل اختتام ایام عدۃ نکاح کر لینا یا کسی عورت کی عفت میں خلل ڈالنا۔

مدح کے بعد نسیب کا درجہ تھا، شعرائے عرب کی اصطلاح میں نسیب، تشبیب اور تغزل سب کے ایک ہی معنی ہیں اور یہ عشقیہ شاعری کے اجزا ہیں۔ لغت میں الفاظ ذیل کے یہ معنی ہیں

۱۔ نسیب — غزل گفتن

۲۔ تشبیب — صفتِ محبوب کردن وغزل گفتن در بیان عشق خود

۳۔ تغزل (غزل) — حدیث زناں وعشق ایشاں گفتہ آید

۴۔ مرثیہ (رثاء) — مردہ را ومحاسن اورا شمردن در شعر

قصائد میں مواعظ بھی ہوتے تھے اور افتخار بھی۔ اور اس مضمون میں بڑی بلند پروازیاں کی جاتی تھیں۔ مثلاً شاعر

اپنے قبیلہ کی وسعت دکھلاتا ہے ؎

۱۔ ما تطلع الشمس الّا عند اوّلنا	جب سورج نکلتا ہے تو اُس کی کرنیں اول سے
ولا تغیب الّا عند اخرانا	آخر تک ہمارے ہی قبیلہ پر پڑتی ہیں۔
۲۔ وانا نلھو بالحروب کما لھت	ہم لڑائیوں کو کھیل جانتے ہیں جس طرح ایک
فتاۃ بعقد او سخاب قرنفل	لڑکی لونگ کے ہار سے کھیلتی ہے

ان مضامین کے علاوہ قصیدہ میں عتاب، اعتذار، تہنیت، خمریات، رزم بزم، بہار و خزاں اور مناظر کی بھی تفصیل ہوتی تھی۔

۲۔ رزمیہ | عربوں میں اگر رزمیہ شاعری نہ ہوتی تو تعجب تھا کیوں کہ ایک ایک بچّہ بہادر تھا لہٰذا تلوار کے جوہر (جو ہاتھوں سے) دکھاتے تھے۔ زبان قلم اس کو بجنسہ ادا کر دیتی تھی اور اس مضمون میں وہ عجم سے بڑھے ہوئے کیوں کہ عرب کا سپاہی، عجم کی طرح، کسی شاعر کا ممنونِ احسان نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنے کارنامے خود ہی بیان تھا۔ یہ رزمیہ نظمیں حماسیات کہلاتی ہیں جس کا بہترین مجموعہ کتاب الحماسہ ہے۔

۳۔ مناظر قدرت | عرب کا ملک سنگ لاخ اور ریگ زار ہے۔ دریاؤں سے محروم ہے۔ بدیں وجہ اس کے اندر حما کی طرح باغات وغیرہ کی افراط نہیں ہے، نہ گلاب و نرگس کے تختے ہیں نہ بلبلوں کے چہچہے ہیں۔ جدہر دیکھو سیاہ سر اٹھائے کھڑے ہیں جنگل اور ریگستانوں میں کہیں کہیں چشمے اور نخلستان بھی ہیں لہٰذا عرب شاعر انھیں مناظ تصویر کھینچتا ہے۔

عربوں کا کبوترا ور فاختہ کا جوڑہ اپنی نغمہ سنجی میں ایران کی بلبل اور ہندوستان کے پپیہے سے کچھ کم نہ اور پیلو کا گھنا درخت، سرو و چنار کا قائم مقام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عرب شاعر مناظر کی تصویر کشی میں دوسرے ممالک کچھ مستعار نہیں لیتا۔ بلکہ جو اطراف و جوانب میں دیکھتا ہے وہی نظم کرتا ہے۔

۴۔ جذبات | انسانی جذبات سے مرثیہ کی بنیاد پڑی ہے اور مرثیہ گوئی میں عربوں کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ حتیٰ اُنھوں نے اپنے گھوڑوں اور اونٹ کے جو مرثیے لکھے ہیں وہ بھی جوش سے خالی نہیں ہیں۔

خنساء نے اپنے بھائی صخر کے جو مرثیے لکھے ہیں اس کے ہر ہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا آتش کدۂ نوبہار

ھواں اٹھ رہا ہے۔ اسی طرح جب غیظ وغضب میں آتا ہے تو نظر آتا ہے کہ کوہ آتش فشاں سے لاوہ ٹپک رہا ہے

۔ نسائیت | عاشقانہ شاعری میں عرب اور عجم کی تشبیہات میں بہت فرق ہے۔ ایک عجمی جب اپنے معشوق کے دہن کی تعریف کرتا ہے تو اس کو گوہر، غنچہ، چشمہ، شہد اور جوہر فرد سے تشبیہ دیتا ہے۔ لیکن عرب شاعر دہن کو انگوٹھی کا حلقہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

ایک عجمی محبوب کا سراپا ہے ؂

پستہ لب بادام چشم وسیب غبغب سرو قد
ہر دو ۔ ۔ چوں انار و چہرہ اللہ الصمد

ایک ظریف کہہ سکتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہے بلکہ کابل میوہ کی خورجی ہے۔ عرب کی تمام شاعری میں ایک شعر اس نمونہ کا نہیں مل سکتا ہے۔

۱۵۔ کلیات اشعار عرب

عرب میں ہزاروں شاعر تھے، اس لئے اشعار کی تعداد بھی خارج از شمار تھی۔ لہذا ارباب ذوق نے پہلے شعراء کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد ۴۹ شاعروں کے کلام سے ایک ایک قصیدہ لے کر ایک مجموعہ مرتب کیا۔ پھر خاص اوصاف کے لحاظ سے ہر حصہ کا ایک جداگانہ نام رکھا چنانچہ عہد جاہلیت کے وہ سات کلیات حسب ذیل ہیں:

(۱) معلّقات (۲) مجمہرات (۳) مُنتَقِیَات (۴) مذہبات (۵) مراثی
(۶) مثنویات (۷) ملحمات

یہ مجموعہ تقریباً ۳۹۱ھ / ۱۰۰۰ء میں ابو زید انصاری نے مرتب کیا اور اس کا نام "جمہرہ اشعار العرب" رکھا۔
محققین یورپ کی تحقیقات کے مطابق اس مجموعہ میں جس قدر کلام ہے وہ ۵۰۰ء سے ۶۲۲ء / ۱ ہجری (۱۲۲ سال) تک کا ہے اور اسی زمانہ کو وہ عہد جاہلیت کہتے ہیں۔ کیوں کہ ۶۲۲ء سے اسلام کا آغاز ہوا ہے اور زمانہ مابعد کا کلام کتب ادب تذکروں اور تاریخوں میں پھیلا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بنی امیہ کے عہد تک شعرائے جاہلیت کا وجود مانا گیا ہے اور عہد عباسیہ سے جدید اسلامی دور کا آغاز ہوا ہے۔ اب ہم ان کلیات سبعہ کے مختصر حالات لکھتے ہیں۔ تفصیل سے لکھنا اس شخص کا کام ہے جو اردو میں شعر العرب پر کوئی مستقل کتاب لکھے۔

۱۔ معلّقات

یہ مجموعہ سبعہ کے نام سے مشہور ہے جس میں نامور شعرائے جاہلیت کے سات قصائد ہیں۔ یہ معلقات فی زمانہ سات مشہور ہیں لیکن مورخین نے لکھا ہے کہ یہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ البتہ تدوین کے زمانہ تک گھٹتے گھٹتے ان کی تعداد صرف سات رہ گئی تھی اور بڑا حصہ ان کا تلف ہو چکا تھا اور قیاس عقل بھی یہی ہے کیوں کہ (۱۲۲) سال کی مدت میں کم از کم ۱۲۲ قصیدوں کو ضرور یہ عزت حاصل ہوئی ہوگی کہ وہ خانہ کعبہ میں آویزاں کئے گئے ہونگے (سالانہ ایک قصیدہ سوق عکاظ میں انتخاب کیا جاتا تھا)

یہ معلقات حماد راویہ نے ۱۵۶ھ (عہد عباسیہ) میں جمع کئے تھے اور چوں کہ یہ بہترین انتخاب تھا لہٰذا کل قصائد مقبول ہوئے۔

وجہ تسمیہ: عام مشہور روایت یہی ہے کہ یہ قصائد خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے۔ اس وجہ سے معلقات کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن زمانہ حال کے محققین کا خیال ہے کہ یہ وجہ تسمیہ سطحی اور معمولی ہے۔ ان کے نزدیک معلقہ کا مادہ اشتقاق عِلق ہے۔ جس کے معنی شئے نفیس اور قیمتی کے ہیں اور چوں کہ ان قصائد کے اشعار جواہرات کے ہم پایہ مانے جاتے تھے اس لئے معلقہ کہلائے۔ جس کی تائید دوسرے نام السموط (موتی کی لڑیاں) سے ہوتی ہے اور چوں کہ یہ قصائد بڑے ہیں اس لئے ان کو سبع الطوال بھی کہتے ہیں۔ ابن رشیق نے لکھا ہے کہ معلقات کو مذہبات بھی کہتے تھے کیوں کہ یہ قصائد قباطی (مصر کا ریشمی کپڑا) پر سونے کے پانی سے لکھ کر حرم کعبہ میں لٹکائے جاتے تھے۔ قصائد معلقہ کی شاعری کس درجہ کی ہے اس کی نسبت یہی کہنا کافی ہے کہ عرب اس کو الہامی جانتے تھے اور جس طرح عرب سیکڑوں خداؤں کو سجدہ کرتے تھے اسی طرح یہ معلقات بھی برسوں مسجود خلائق رہے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی۔ وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ (سورۂ ہود) تو یہ قصائد نظروں سے گر گئے اور ان کی عدیم المثالی میں فرق آگیا۔ جس میں امرؤ القیس کا مشہور قصیدہ قفا نبک بھی داخل ہے اور اسی دن سے سجدۂ زمین بوس بند ہوا۔

چوں کہ یہ مجموعہ داخل درس ہے لہٰذا کسی قدر تفصیل سے اس کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

اس میں حسب ذیل[1] سات شاعروں کے قصائد ہیں

(۱) امرؤالقیس کندی (۲) طرفہ بن العبد (۳) زہیر بن ابی سلمہ (۴) لبید بن ربیعہ (۵) عمرو بن کلثوم تغلبی

(۶) عنترہ بن شداد (۷) حارث بن حلزہ

بعض قدیم معلقات میں نابغہ ذبیانی اور اعشیٰ کے بھی قصائد شامل ہیں اور بعض نے حارث اور عنترہ کے قصائد اس مجموعہ سے خارج کر دیئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی اختلاف ہے کہ ان سبعہ سیاروں میں سب سے زیادہ روشن کون ہے یعنی اشعر الشعراء کے خطاب کا کون مستحق ہے؟

عرب کے سب سے بڑے ادیب ابوعبیدہ کی نزدیک بلحاظ فصاحت و بلاغت ان شعراء کی یہ ترتیب ہے۔ امرؤالقیس، زہیر، نابغہ، اعشیٰ، لبید، عمرو بن کلثوم اور طرفہ لیکن جب لبید سے سوال کیا گیا کہ اشعر الشعرا کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ ملک الضلیل (امرؤالقیس)

شاعرانہ نقطۂ نظر سے لبید کا فیصلہ قابل تسلیم ہے۔ کیوں کہ شاعروں کی رقابت اور ان کا غرور ضرب المثل ہے

اصحاب معلقہ کے مختصر حالات یہ ہیں:۔

۱۔ امرؤالقیس کندی

اس شہنشاہ اقلیم سخن کا نام جندح اور عام لقب امرؤالقیس اور تاریخی خطاب ملک الضلیل و ذوالقروح ہے۔ نسب نامہ یہ ہے۔[2]

جندح بن حُجر بن حارث بن عمرو بن حجر آکل المرار بن عمرو بن معاویہ بن حرث بن معاویہ
بن ثور بن کندہ بن مرتع بن عفیر بن عدی بن اطرث بن مُرّہ بن آدد بن زید بن کہلانؒ

امرؤالقیس کا باپ حجر، قبیلہ کندہ (علاقہ نجد) کا فرماں روا تھا۔ جو حکومت کے لحاظ سے شاہانِ حیرہ کا ہم پلہ

---

[1] کتاب العمدہ صفحہ ۶۱ و جمہرہ انصاری صفحہ ۴۳ مطبوعہ مصر ۱۳۰۸ھ

[2] یعقوبی باب الشعراء العرب جلد اول۔ جمہرہ انصاری بلوغ الارب امرؤالقیس و کتاب العمدہ صفحہ ۵۹ و کتاب الشعر محمد بن سلام صفحہ ۲۱

[illegible]

سمجھا جاتا تھا اور اس کی ماں (فاطمہ بنت ربیعہ) تغلبیہ تھی

کُلَیب (امرؤ القیس بن ربیعہ) اور مہلہل (عدی بن ربیعہ) اس کا ماموں ہے جن کی سیادت اور خاندانی عظمت مسلم تھی۔ عربوں میں مثل ہے کہ "اعزّ من کلیب وائل" کلیب نہایت نامور سردار تھا جس کے قتل پر حرب بکر و تغلب شروع ہوئی اور مہلہل کی نسبت مشہور ہے کہ اس نے اپنے بھائی کلیب کی موت پر سب سے پہلے قصیدہ لکھا۔ اس لحاظ سے امرؤ القیس خاندانی شاعر تھا اور راہبوں کی صحبت میں عیسائی ہوگیا تھا۔ لیکن خیالات بُت پرستوں کے سے تھے اور بتوں کو پوجتا بھی تھا۔ عربی شاعری کے جو چار رکن ہیں ان میں سے ایک امرؤ القیس (زہیر، نابغہ، اعشیٰ) بھی ہے۔

اصمعی کا قول ہے کہ "کان من فحول شعراء الطبقۃ الاولیٰ مقدماً علی سائر شعراء الجاہلیۃ یونس بن حبیب کے قول کے مطابق علمائے بصرہ امرؤ القیس کو، اہل کوفہ اعشیٰ کو اور اہل حجاز زہیر و نابغہ کو سب سے مقدم جانتے تھے۔"

حضرت عمرؓ اور علی مرتضیٰؓ بھی امرؤ القیس کے مدّاح تھے۔ لیکن جب نبی کریمؐ کے حضور میں امرؤ القیس کا کلام پڑھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

یجیئ یوم القیامۃ وبیدہٖ لواء الشعراء — قیامت کے دن امرؤ القیس کے ہاتھ میں شاعروں کا علم ہوگا

یقودہ الی النار — اور وہ ان کو دوزخ کی طرف لے جائے گا۔

اس کے کلام میں تغزل کا رنگ غالب تھا اس کی وجہ سے وہ ملک الضلیل (شاہ گمراہ) مشہور ہوا (عرب عاشقانہ جذبات کو بہادری کے خلاف سمجھتے تھے) امرؤ القیس شاعری میں مہلہل کا مقلد تھا لیکن اس نے نئے نئے اسلوب پیدا کئے اور چوں کہ خود شاہزادہ ہے لہٰذا خیالات بلند ہیں اور مضامین میں ندرت ہے۔ یہ صرف اپنے واقعات قصیدہ میں لکھتا ہے اور کسی کی مداحی نہیں کرتا۔

سبعہ معلقہ میں سب سے پہلے اس کا قصیدہ ہے جو شہرت میں بھی سب سے بالاتر ہے اور عربی میں ایک مثل ہے کہ "اشہر من قفا نبک" اس سے قصیدہ مذکور کا مطلع مراد ہے۔ پورا مطلع یہ ہے بس۔

قفانبك من ذكرى حبيب ومنزل
بسقط اللوىٰ بين الدخول فحومل

اے میرے دوستو! ذرا ٹھہر جاؤ کہ میں اپنے محبوب اور اُس کے مکان کی یاد میں دو آنسو بہالوں۔ یہ مکان ریت کے ٹیلہ کے سرے پر مابین موضع حومل اور دخول کے واقع ہی۔

اس قصیدہ میں وہ اپنی بنت العم، عنیزہ بنت شرحبیل سے تشبیب کرتا ہی جس کا نام بھی ایک شعر میں موجود ہی اور اس قصیدہ کی تمہید دیار محبوب کے آثار و کھنڈرات سے اٹھائی ہی اور یہ قانون قدرت ہی کہ یادِ ایام سے بھی قلب کو ایک خاص قسم کی مسرت ہوتی ہی اور عہد گزشتہ کے حالات یکایک پیش نظر ہو جاتے ہیں اور عرب کی ملکی فضا کے اعتبار سے بھی یہ اشعار نہایت دلکش ہیں اور دیگر شعراء (جاہلیت و اسلام) نے بھی امرؤالقیس کے تعلید میں قصیدہ کا مطلع اسی تمہید سے شروع کیا ہی۔ اور لطف یہ ہی کہ بعض شعرائے عجم بھی عربوں کے مقلد ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ساربان منزل مکن — جز در دیارِ یارِ من
تا یک زماں زاری کنم — بر ربع و اطلال و دمن
ربع از دلم پُر خوں کنم — اطلال را جیحوں کنم
خاکِ دمن گل گوں کنم — از آب چشم خویشتن
از روئے یار خرگہے — ایواں ہمی بینم تہی
وز قدِ آں سرو سہی — خالی ہمی بینم چمن

امیر معزی فرماتے ہیں ؎

آنجا کہ بود آں دلستاں — با دوستاں در بوستاں
شد کوف و کرکس را مکاں — شد گرگ و روبہ را وطن
(بوم)
در جائے رطل و جام مے — گوراں نہادستند پے
بر جائے چنگ و عود و نے — آواز زاغ ست و زغن

لیکن یہ واضح رہے کہ امرؤ القیس دیار بنی اسد کے کھنڈرات کا ماتم کرتا ہے ایرانی شعراء شیراز و اصفہان میں بیٹھکر صحرائے عرب کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اصل و نقل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

تغزل | امرؤ القیس کو بچپن سے عشق بازی کا سودا تھا لہذا اشعار میں بھی یہ رنگ غالب رہا اور چونکہ شاہان عرب شاعری کو اپنی ذات کے لئے سرمایۂ فخر نہیں جانتے تھے لہذا باپ نے بیٹے کو اکثر سمجھایا کہ جان پدر! شاعری عوام کے لئے قابل عزت ہے۔ تم شعر کہنا چھوڑ دو لیکن امرؤ القیس نے اس نصیحت پر عمل نہیں کیا اور جوانی تک شعر و شاعری میں منہمک رہا۔

امرؤ القیس کا عالم شباب تھا کہ دارہ جلجل کا واقعہ پیش آیا۔ اس بے حیائی کے واقعہ پر اس کے باپ نے ناراض ہو کر اپنے غلام ربیعہ کو حکم دیا کہ امرؤ القیس کو قتل کر کے اس کی آنکھیں نکال لا۔ ربیعہ نے امرؤ القیس کی جوانی پر ترس کھا کر زندہ چھوڑ دیا اور حجر کے سامنے ایک جنگلی گائے کے بچے کی آنکھیں لا کر رکھ دیں۔

ابن رشیق کا قول ہے کہ امرؤ القیس از حد بدکار اور شراب خوار تھا اور اپنے باپ کی عورتوں (سوتیلی ماؤں اور کنیزوں) سے قصائد میں تشبیب کرتا تھا۔ اس لئے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں وہ جنگلوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ پھرا کرتا تھا اور شعر و سخن سے دل بہلاتا تھا۔ جب اس کا باپ حجر قتل ہو گیا اس وقت گھر نصیب ہوا ہے۔

امرؤ القیس کے دیوان اور قصیدۂ مذکور میں متعدد اشعار ہیں جن سے تغزل کا رنگ نمایاں ہے۔ چنانچہ اشعار ذیل میں رات کی درازی اور ہجراں نصیب عشاق کی حالت زار کی تصویر کھینچتا ہے ؎

ولیلٍ کموج البحر ارخی سدولہ	اور جب رات نے (جو سمندر کی موج کی طرح خوفناک تھی)
علیَّ بانواع الهموم لیبتلی	مجھ پر رنج و غم کے پردے لٹکا دیئے۔ (آزمائش صبر کے لئے)
فقلت لہ لمّا تمطّی بصلبہ	تو میں نے رات سے کہا جب کہ اُس نے انگڑائی لی
واردف اعجازا و ناء بکلکل	(سُرین پشت کی جانب کئے اور سینہ ابھارا)
الا ایها اللیل الطویل الا انجلی	ہاں! اے لانبی رات، تو کیوں صبح نہیں ہو جاتی
بصبحٍ وما الاصباح منک بامثل	لیکن اے رات، صبح، تجھ سے بہتر نہیں ہو سکتی ہے

کیسا لطیف مضمون ہے پہلے درازئ شب سے بدحواس ہوکر صبح ہونے کی آرزو کرتا ہے لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ صبح کو پھر انہیں مصائب کا سامنا ہوگا تو عالم یاس میں رات کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ او ڈراؤنی رات! صبح تجھ سے بہ نہیں ہوسکتی ہے جو لذت تجھ میں ہے وہ صبح میں کہاں؟

۲ - فاطمہ عذریہ (بنت عبید بن ثعلبیہ بن عامر) کی کج ادائیوں سے جب پریشان ہو جاتا ہے تو خود اس کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

أفاطم مهلاً بعض هذا التدلّل	او فاطمہ! ان اداؤں کو چھوڑ دے
وان كنتِ قد أزمعت صرمی فاجملی	اور اگر مجھ سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہے تو سوچ سمجھ کر جدائی اختیار کر
أغرّكِ منّی ان حبّكِ قاتلی	کیا تجھ کو یہ غرور ہے کہ میں تیری محبت میں مرجاؤں گا
وانّكِ مهما تأمری القلب يفعل	اور تیری ہر حکم کی تعمیل کروں گا؟
وان تك قد ساءتكِ منی خليقة	اگر تجھ کو میری کوئی عادت بری معلوم ہوئی ہو تو میرے کپڑے سے
فسلّی ثيابی من ثيابكِ تنسل[1]	اپنا کپڑا الگ کرلے (یعنی بطیب خاطر مجھ سے الگ ہوجا)

عشاق کا دل بھی کس قدر کمزور ہوتا ہے پہلے تو شیخی میں آکر جو نہ کہنا تھا وہ کہہ گیا لیکن جب فاطمہ امرؤ القیس کی باتوں سے متاثر ہوگئی اور جدائی کا نام سن کر اشکبار ہوئی تو اب گھبرا کر اور بات کاٹ کر کہتا ہے ؎

وما ذرفت عيناكِ الا لتضربی	تیری آنکھوں سے آنسو نہیں بہے ہیں مگر محض اس لئے؟
بسهميكِ فی أعشار قلب مقتّل	کہ تو میرے دل کے دس حصوں میں دونوں تیر مارے

اس شعر میں قماربازی کے ایک کھیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہ وہ شعر ہے جس کی شعراء عرب نے بڑی داد دی ہے۔ کہتا ہے کہ تیری آنکھوں کے آنسو بمنزلہ معلی اور رقیب (تیروں کے نام ہیں) کے ہیں جنھوں نے میرے دل کے دسوں حصے جیت لئے ہیں۔

---

[1] عہد جاہلیت میں طلاق کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مرد اپنی عورت سے کپڑے مانگتا تھا اور جب وہ اتار کر حوالہ کردیتی تھی تو طلاق ہوجاتی تھی۔ لیکن شارحین کا خیال ہے کہ یہاں "خلص قلبی من قلبك" مراد ہے۔

(جمہرہ انصاری صفحہ ۱۴)

۳۔ گھوڑے کی تعریف میں جو اشعار لکھے ہیں وہ اسی کا حصہ ہے اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے

مِکَرٍّ مِفَرٍّ مُقبِلٍ مُدبِرٍ مَعاً	جب حملہ کرنا چاہو تو بڑا حملہ آور ہے اور جب پیچھے ہٹانا چاہو تو
کجُلمودِ صخرٍ حطّہ السیل من علِ	بکمال سرعت پیچھے ہٹتا ہے یعنی سب کرتبوں میں ہوشیار ہے۔ اس کی رفتار ایسی ہے گویا پہاڑ کے سیلاب سے پتھر ڈھلکتا آتا ہے
لہ ایطلا ظبیٍ وساقا نعامۃ	اس کی دونوں کوکھیں (کمر) مثل ہرن کی پتلی ہیں، ٹانگیں شتر مرغ کی طرح سیدھی ہیں اور سرعت رفتار بھیڑیے کی سی ہے اور چال لومڑی
وارخاء سرحانٍ وتقریبُ تتفل	بچّہ کی مانند ہے۔

ان اشعار کا نام "قلائد فاخرہ" ہے۔ کیوں کہ اس میں متعدد تشبیہات ہیں۔

۴۔ شاعرانہ تخیل کا اعلیٰ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

کان مکاکیّ الجواء غدیتہ	وادی کی فضا میں سفید رنگ کی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو
صُبِحن سلافا من رحیق مُفلفل	نور کے تڑکے لطیف شراب میں مرچ ڈال کر پلائی گئی ہے۔

شاعر کے خیال میں پانی برس کر کھل گیا ہے، سپیدۂ صبح نمودار ہونے پر جنگل کی چڑیاں ڈالیوں پر چوں چوں کرتی پھرتی ہیں اور سارا جنگل ان کی نغمہ سنجیوں سے گونج رہا ہے۔ اب شاعر عالم محویت میں غور کرتا ہے کہ کس چیز نے ان چڑیوں کو دیوانہ بنایا ہے۔ تو اس کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ ان کو شراب میں مرچ ملا کر پلائی گئی ہے جس کے سبب سے آواز میں ایک سُریلاپن پیدا ہو گیا ہے۔

امرؤ القیس چوں کہ خود شرابی ہے۔ لہٰذا اس کو مطلب کی سوجھتی ہے اور انھیں خیالات کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ امرؤ القیس تقریر میں مصوری کرتا ہے۔

۵۔ امرؤ القیس پہلا شاعر ہے جس نے عورتوں کو ہرنیوں، نیل گایوں اور شتر مرغ کے انڈے سے اور چہرۂ محبوب کو راہب کے چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ ابن قتیبہ نے اس مضمون کو کتاب الشعر میں تفصیل سے لکھا ہے۔

امرؤ القیس کے اس قصیدہ (قفانبک) میں وہ اشعار نہایت دل چسپ ہیں جس میں عنیزہ کی ملاقات کا تذکرہ ہے۔ عنیزہ کے علاوہ ام الحارث کلبیہ اور ام الرباب سے بھی تشبیب کرتا ہے۔

۔ امرؤالقیس کی موت | امرؤالقیس کا دادا حارث بن عمر شاہ کندہ گورنمنٹ ایران کا باج گزار تھا۔ جب قباد بن فیروز ساسانی نے مزدک کا دین قبول کر لیا تو منذر سوم شاہ حیرہ اور حارث کندی کو بھی مذہب مزدکیہ کی دعوت دی گئی منذر نے انکار کر دیا لیکن حارث نے اس جدید مذہب کو قبول کر لیا۔ اس عدول حکمی پر قباد نے منذر کو حکومت حیرہ سے معزول کر دیا اور حارث کو حیرہ کی بھی حکومت تفویض کر دی۔ انتزاع حکومت کے بعد منذر نے حکمت عملی سے حارث کو قتل کرا دیا۔ جب حارث قتل ہو گیا تو اس کی حکومت امرؤالقیس کے باپ حجر کی سپرد ہوئی لیکن علباء بن حارث اسدی نے بمقام دمون حجر کو قتل کر دیا۔ حجر نے عالم سکرات میں ایک وصیت نامہ لکھا اور قاصد کو دے کر ہدایت کی کہ پہلے میرے بیٹے نافع کے پاس جانا، اگر وہ وصیت نامہ پڑھکر اشکبار ہو تو اس کے ہاتھ سے چھین لینا اور میرے دوسرے بیٹے امرؤالقیس کو جا کر دینا۔ چنانچہ قاصد نے ایسا ہی کیا۔ امرؤالقیس کو جب باپ کا وصیت نامہ ملا، اس وقت وہ یاران جلسہ میں بیٹھا ہوا شراب پی رہا تھا۔ کا غذ لے کر بولا " الیوم خمرٌ و غداً امرٌ " آج بزم ہی کل رزم ہو گی۔ پھر یہ شعر پڑھا ؎

خلیلیّ ما فی الیوم مصحٍ لشارب
ولا فی غدٍ اذ کان ما کان مشرب

اور مسلسل سات یوم تک عیش و طرب میں مشغول رہا۔ جب خمار اترا تو ذوالخلیفہ (مشہور بت جو تبالہ میں نصب تھا) کے مندر میں گیا۔ اور نذر مانی کہ جب تک باپ کے خون کا قصاص نہ لے لوں گا نہ شراب پیوں گا نہ حرم میں جاؤں گا نہ گوشت کھاؤں گا، نہ غسل کروں گا (جاہلیت کی یہی نذر تھی) اور منذر کی قتل کی تدبیریں کرتا رہا۔ جب کسی طرح کامیاب نہ ہوا تو فوجی امداد کے لئے قبائل عرب میں صحرا نوردی شروع کی، لیکن منذر کے خوف سے کسی قبیلہ نے مدد نہ دی۔ تب سموال بن عادیا یہودی کے قلعہ میں گیا اور خاندانی زرہیں اس کے پاس امانت رکھ دیں اور جس ٹی نین اول قیصر روم (۵۲۰ء لغایۃ ۵۶۵ء) کے دربار میں پہنچا۔[1] قیصر نے اعزاز و احترام سے امرؤالقیس کا خیر مقدم کیا اور فوجی امداد کا بھی وعدہ کیا۔ درباریوں نے جب دیکھا کہ قیصر اس عرب سردار کا ہمدرد ہے تو انھوں نے

---

[1] تاریخ ادب عربی پر تھیر نکلسن و تاریخ علم الادب عند الافرنج والعرب و کٹر ہوگو مطبوعہ مصر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳۰ و کتاب الشعر ابن قتیبہ از صفحہ ۳۸ ۔

قیصر سے شکایت کی کہ امرؤ القیس شاہزادی پر عاشق ہوگیا ہے اور یہ بھی عرض کیا کہ اس عرب کو امداد دینا خلاف مصلحت ہے کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ اگر امرؤ القیس کو حکومت مل گئی تو وہ ہمارا مقابلہ کرے گا قیصر نے اس رائے کو تسلیم کرلیا اور ایک عرصہ تک مہمان رکھ کر رخصت کیا۔

جب امرؤ القیس روانہ ہوگیا تو قیصر نے طماح بن قیس اسدی (امرؤ القیس کا مشہور دشمن) کے ہاتھ اسکے لئے ایک گراں بہا خلعت بھیجا۔ جو زہر آلود تھا امرؤ القیس نے اس کو فخریہ پہنا اور اس کا زہر یلا اثر تمام جسم میں سرایت کرگیا اور انگورہ پہنچ کر ۵۴۰ء میں مرگیا۔[۱] یہ واقعہ ولادت رسول اللہ صلعم سے ۳۱ سال قبل کا ہے۔ زہر کے اثر سے امرؤ القیس کے تمام جسم پر آبلے پڑ گئے تھے اور ان زخموں کی وجہ سے اس کا لقب ذوالقروح ہوا۔ فرزدق کہتا ہے ؎

وھب القصائد بی النوابغ اذ مضوا
وابو یزید وذو القروح وجرول

وہ تمام شاعر جو نابغہ کے لقب سے مشہور تھے جب دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انھوں نے اور نیز ابو یزید مخبل سعدی مینی اور امرؤ القیس ذوالقروح اور حطیہ (جرول) نے قصائد سب ہبہ کردیئے

امرؤ القیس انگورہ میں ایک شاہزادی کے قریب دفن کیا گیا۔

معلقات کا ترجمہ | سبعہ معلقہ کا ترجمہ یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوچکا ہے اور اس کے عاشقانہ اشعار خاص طور پر پسند کئے گئے ہیں۔

۲۔ زہیر بن ابی سلمہ مزنی

سبعہ معلقہ کا یہ دوسرا[۲] رکن ہے۔ اس کا نسب نامہ یہ ہے:

زہیر بن ربیعہ (ابی سلمہ) بن رباح بن العوام بن قرط
بن الحارث بن مازن بن حلاوۃ بن ثعلبہ بن ثور بن ہرمۃ

---

[۱] موسیو سدیو نے لکھا ہے کہ امرؤ القیس ۵۰۰ء میں پیدا ہوا تھا تو اس حساب سے ۴۰ سال کی عمر میں فوت ہوا ۱۲

[۲] انتخاب از جمہرہ انصاری۔ تاریخ یعقوبی، صاحبۃ الطرب، کتاب العمدہ۔ بلوغ الارب۔ دول الاسلام، طبقات حرب۔ کتاب الشعراء۔ قتبیہ ۱۲

بن لاطم بن عثمان بن مزنیہ بن ادبن طابخہ"

اس کے قصیدہ کا مطلع ہے ؎

آمن ام اوفیٰ دمنۃ لم تکلم — کیا یہ ام اوفیٰ کے مکان کے نشانات ہیں جو سیاہ

بحومانۃ الدراج فالمتثلم — نظر آ رہے ہیں، یہ کیوں چپ ہیں؟

یہ آثار موضع دراج اور متثلم کی سخت زمین میں واقع ہیں

اس قصیدہ میں ۴۰ شعر ہیں۔

اس نامور شاعر کے حولیات مشہور ہیں۔ حولیات سے وہ قصائد مراد ہیں جو ایک سال کی محنت میں تیار ہوتے تھے۔ زہیر کا دستور تھا کہ چار مہینے میں صرف ایک قصیدہ لکھتا تھا اور چار مہینے تک اس میں کاٹ چھانٹ کرتا تھا اور چار مہینے تک دوستوں کو سنایا کرتا تھا چنانچہ اس طرح پورے ایک سال (حول) کی محنت میں قصیدہ مکمل ہوتا تھا۔ اصطلاح شعرا میں ایسا کلام مصنوع کہلاتا ہے جو مطبوع کی نقیض ہے۔

ام اوفیٰ زہیر کی پہلی بی بی ہے۔ اس کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہی۔ البتہ دوسری بی بی سے کعب اور بجیر پیدا ہوئے یہ دونوں شاعر تھے۔ حجاز میں زہیر کا کلام بہت مقبول ہے۔ امیرالمومنین حضرت عمر زہیر کو اشعرالشعراء جانتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ لا یمدح الرجل الا بما ھو فیہ یعنی زہیر ممدوح کے صرف وہی اوصاف لکھتا ہے جو اس میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی مضمون کو دوسرے الفاظ میں حسان بن ثابت نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

وان احسن بیت انت قائلہ

بیت یقال اذا انشد تہ صدقا

یعنی شعر کا مضمون سنتے ہی لوگ پکار اٹھیں کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ بالکل سچ ہے۔

اصمعی کے نزدیک بھی زہیر اشعرالشعراء ہے۔

زہیر خاندانی شاعر تھا۔ اس کا باپ، ماموں (بشامہ) اور خسر (اوس بن حجر) مشہور شاعر تھے۔ زہیر کی بہنیں سلمیٰ اور خنساء (مشہور مرثیہ گو) بھی شاعرہ تھیں۔ زہیر کے پوتے (عقبہ بن کعب) اور پروتے (عوام بن عقبہ) بھی شاعر تھے اور یہ سلسلہ اخیر تک قائم رہا۔

زہیر کا شمار حکمائے عرب میں تھا۔ اس کے کلام میں حکیمانہ اشعار موجود ہیں۔ چنانچہ یہ مشہور شعر ہے

لسان الفتیٰ نصف ونصف فوادہ — انسان دو حصوں پر تقسیم ہے یعنی نصف زبان ہے اور نصف دل ہے

فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم — اس کے بعد جو کچھ ہے وہ گوشت اور خون ہے۔

۲۔ دوسرا حکیمانہ شعر یہ ہے جس کو حضرت عمرؓ بہ نظر استعجاب پڑھا کرتے تھے

فان الحق مقطعہ ثلاث — مقدمہ کا فیصلہ تین باتوں پر منحصر۔ ایک قسم پر، دوسرے پنچایت

یمین او نفار او جلاء — (منافرۃ) پر اور تیسری جلاء وطنی پر (سیاست کی یہ آخر سزا ہے)

زہیر کو سرقہ، انتحال، نسخ، مسخ اور سلخ (چوری اور مختلف طریقوں سے دوسرے کلام کی قطع برید کرنا) سے نفرت تھی۔ مرثیہ اور مدح خوب لکھتا تھا۔ اور یہ پہلا شاعر ہے جس نے بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھا لیکن قصیدہ میں وہی اوصاف لکھے جو ممدوح میں موجود تھے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر جب فن شعر پر کتابیں لکھی گئیں تو ابن قدامہ نے مدح کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا۔

لما کانت فضائل الناس حیث انھم
ناس لا من طریق ما ھم مشترکون فیہ
مع سائر الحیوان، علی ما علیہ اھل الالباب
من الاتفاق فی ذلک انما ھی العقل
والشجاعۃ والعدل والعفۃ کان القاصد لمدح
الرجال لھذہ الاربع الخصال مصیبا والمادح بغیرھا مخطیا

عقلا کے نزدیک فضائل انسانی ایک انسان کی حیثیت سے (نہ بحیثیت ان صفات کے جن میں وہ حیوان سے مشترک ہے) بالاتفاق چار ہیں عقل، شجاعت، عدل اور عفت۔ چنانچہ جو شاعر اپنے ممدوح کی (جو مرد ہیں) ان اوصاف سے مداحی کرتا ہے وہ تو سیدھے راستہ پر ہے اور جو اس کے خلاف مدح کرتا ہے وہ غلطی پر ہے۔"

اور یہی اصول مرثیہ اور ہجو کے لئے بھی ہے۔

(باقی آئندہ)

محمد عبدالرزاق

شاہنامۂ اسلام کا ایک ورق

ولادت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ہماری درخواست پر جناب حفیظ صاحب نے شاہنامۂ اسلام کا ایک باب یعنی حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کا حال میگزین میں اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ شاہنامۂ اسلام کے موضوع سے ادبی دنیا بخوبی واقف ہو چکی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اردو میں یہ کتاب اپنے طرز کی پہلی کتاب ہوگی۔ اس نوازش کے لئے ہم حفیظ صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

یہ کس کی جستجو میں مہر عالمتاب پھرتا تھا — ازل کے روز سے بے تاب تھا بیخواب پھرتا تھا

یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں — زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں

یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی — زمیں کو تکتے تکتے آگئیں آنکھیں ستاروں کی

کروروں رنگتیں کس کے لئے ایام نے بدلیں — پیاپے کروٹیں کس دھن میں صبح و شام نے بدلیں

یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا — گوارا کر لیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا

یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی امید کی خاطر — یہ ساری کاہشیں تھیں ایک صبح عید کی خاطر

مشیت تھی۔ کہ یہ سب کچھ تہِ افلاک ہونا تھا
کہ سب کچھ ایک دن نذرِ شہِ لولاک ہونا تھا

خلیل اللہ نے جس کے لئے حق سے دعائیں کیں
ذبیح اللہؑ نے وقتِ ذبح جس کی التجائیں کیں

جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوبؑ میں آیا
جسے یوسفؑ نے اپنے حسن کے نیرنگ میں پایا

کلیم اللہؑ کا دل روشن ہوا جس ضوفشانی سے
وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لن ترانی سے

وہ جس کے نام سے داؤدؑ نے نغمہ سرائی کی
سلیمانؑ نے طلب میں جس کی شاہی میں گدائی کی

دلِ یحییٰؑ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لبِ عیسیٰؑ پہ آئے وعظ جس کی شانِ رحمت کے

وہ دن آیا کہ پورے ہو گئے تورات کے وعدے
خدا نے آج ایفا کر دیئے ہر بات کے وعدے

مرادیں بھر کے دامن میں مناجاتِ زبور آئی
امیدوں کی سحر پڑھتی ہوئی آیاتِ نور آئی

نظر آئی بالآخر معنئِ انجیل کی صورت
ودیعت ہو گئی انسان کو تکمیل کی صورت

اندھیری رات کے پردے سے کی حق نے سحر پیدا
ہوا بہرِ بصیرت کحلِ مَا زَاغَ الْبَصَرُ پیدا

ربیع الاول امیدوں کی دنیا ساتھ لے آیا
دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا

رامے ناخدائی کی خود انسانی سفینے کی
کہ رحمت بن کے چھائی بارھویں شب اس مہینے کی

ازل کے روز جس کی دھوم تھی وہ آج کی شب تھی
جو قسمت کے لئے مقسوم تھی وہ آج کی شب تھی

مشیت ہی کو جو معلوم تھی وہ آج کی شب تھی
ارادے ہی میں جو مرقوم تھی وہ آج کی شب تھی

نئے سر سے فلک نے آج بختِ نوجواں پایا — خزاں دیدہ زمیں پر دائمی رنگِ بہار آیا

ادھر سطحِ فلک پر چاند تارے رقص کرتے تھے — اُدھر روئے زمیں کے نقش بنتے تھے سنورتے تھے

سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے — جبل لعل و جواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے

زمرّد وادیوں میں سبزہ بن کر ہر طرف بکھرا — ہوئی بارانِ رحمت ہر شجر کا رنگِ رُخ نکھرا

ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں — کوئی مژدہ تھا جو ہر گوشِ گل میں کہہ سناتی تھیں

ہنسے جاتے تھے کھلتے جا رہے تھے پھول گلشن میں — گلے پھولوں سے ملتے جا رہے تھے پھول گلشن میں

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے — ترنّم ہی ترنّم تھے کنارے جوئباروں کے

یہاں میں جشنِ صبحِ عید کا ساماں ہوتا تھا — ادھر شیطان تنہا اپنی ناکامی پہ روتا تھا

نظر آئیں جو محکم فطرتِ کامل کی بنیادیں — دھڑک کر زلزلے سے ہل گئیں باطل کی بنیادیں

ستوں مکّے میں قایم ہو گئے جب دینِ بیضا کے — گرے غش کھا کے چودہ کنگرے ایوانِ کسریٰ کے

سرِ فاراں پہ لہرانے لگا جب نور کا جھنڈا — ہُوا اک آہ بھر کر فارس کا آتش کدہ ٹھنڈا

ندا آئی دریچے کھول دو ایوانِ قدرت کے — نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے

ہوئی فوجِ ملائک جمع زیرِ چرخِ مینائی — بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پُر کیف شہنائی

یکایک ہو گئی ساری فضا تمثالِ آئینہ — نظر آیا معلق عرش تک اک نور کا زینہ

خدا کی شان رحمت کے فرشتے صف بصف اُترے ۔ پرے باندھے ہوئے سب دین و دنیا کے شرف اُترے

ہوا عرشِ معلّٰی سے نزولِ رحمت باری ۔ تو استقبال کو اُٹھی حرم کی چار دیواری

سحابِ نور آ کر چھا گیا مکّے کی بستی پر ۔ ہوئی پھولوں کی بارش ہر بلندی اور پستی پر

صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی ۔ ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اجڑی ہوئی بستی

مبارکباد ہے اُن کے لئے جو ظلم سہتے ہیں ۔ کہیں جن کو اماں ملتی نہیں برباد رہتے ہیں

مبارکباد بیواؤں کی حسرت زا نگاہوں کو ۔ اثر بخشا گیا نالوں کو فریادوں کو آہوں کو

ضعیفوں، بیکسوں، آفت نصیبوں کو مبارک ہو ۔ یتیموں کو غلاموں کو غریبوں کو مبارک ہو

مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو ۔ مبارک دشتِ غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو

خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو ۔ زبردستی کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو

معین وقت آیا زورِ باطل گھٹ گیا آخر ۔ اندھیرا مٹ گیا ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر

مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آپہنچا ۔ نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آپہنچا

مبارک ہو کہ ختم المرسلیںؐ تشریف لے آئے ۔ جنابِ رحمۃ للعالمیںؐ تشریف لے آئے

بصد انداز رعنائی ۔ بغایت حسن و زیبائی

امیں بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

حفیظ جالندھری

مشرق اور عمر خیام

(۱) کسی شاعر کے کلام سے اُس کے "فلسفۂ زندگی" پر ایک گہری نظر اور درست انداز نظر ڈالنے کے لئے اس کی سوانح کو بھی ایک نظر خواہ سرسری ہی کیوں نہ ہو دیکھتے جانا ضروری ہے۔

(۲) یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ ہر ایک شخص اپنے فلسفۂ زندگی سے کسی نہ کسی وقت گریز ضرور کیا کرتا ہے۔ کیوں کہ یک رنگی مختلف عناصر سے پیدا کی ہوئی ہستی میں ہمیشہ کبھی نہیں رہ سکتی۔ اختلاف جو خمیر میں پڑا ہوا ہے کسی طرح اپنی سرشت کو بالکل نہیں بھول سکتا۔ اس لئے کسی شاعر کے ہر شعر کو کسی خاص فلسفہ ہی کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے اور خصوصاً فلسفۂ لذتیہ اور افادیہ کو جو ہر ایک کا مطمح نظر اور فطرتاً نقطۂ نظر ہے مگر ہم لوگ فلسفۂ لذتیہ سے جو ایک خاص مفہوم سمجھے ہوئے ہیں وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنے رنگ کو بدل دیا کرتا ہے لہذا جس کا فلسفۂ زندگی لذتیہ ہو اُس کے اشعار کو ایک ہی رنگ میں بیان کرنا تنگ نظری سے موسوم کیا جائے گا۔

(۳) فلسفۂ لذتیہ کے اپیکیورس (Epicureans) نے چار اصول بتائے ہیں مگر دوسروں کی انگوری بیلوں سے خوشہ چینی کے بجائے یہ بہتر ہوگا کہ اپنے ہی دفینہ سے جواہرات نکالیں۔ اس لئے عمر خیام کے فلسفۂ لذتیہ کو اپیکیورس کے فلسفہ میں نہ تو جذب کرنا چاہیئے نہ اس سے منطبق بلکہ ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر تساوی توازن یا تساقط پر غور کرنا چاہیئے۔

(۴) فلسفۂ لذتیہ کا یہ لازمی اثر ہے کہ اس پر عمل کرنے والا مادیات میں ڈوب کر اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے روحانیت کی ہتک پر اُتر آتا ہے یا کم از کم اس کی اہمیت اُس کی نظر میں بالکل گم، کم، یا مادیت کے برابر ہو جاتی ہے۔

(۵) فلسفۂ لذتیہ میں غرق ہونے والے کا دامنِ نگاہ وسیع خوش منظر بلکہ دل کش ہوتے ہوئے دوسروں کے لئے جاذبِ نظر ثابت ہوا کرتا ہے۔ وغیرہ تفصیل

(۶) فلسفۂ لذتیہ پر عمل کرنے والا کسی نہ کسی وقت ضرور موجودات کی طرف پرواز کرتا ہے کیوں کہ مادیت کی قید
اسے محسوس ہونے لگتی ہے اور دوسرے یہ کہ دنیا و مافیہا کی رنگینیاں چوں کہ نظروں کے سامنے سے بہت گزر چکی ہوتی
ہیں اس لئے ایک بڑی حد تک استغنائیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔

دنیا جب سے ترقی کرتے ہوئے ارتقاء کی کڑیاں کافی حد تک طے کر سکی۔ اس وقت سے لے کر آج تک
جن اسباق کو اُس نے پہلے دن یاد کیا تھا آج تک بعینہٖ انہی اسباق کو یا تو دہرا رہی ہے یا تفسیر کر رہی ہے اور تفسیر
کی شاخوں میں سے بعض شاخوں کو پھونگلوں کے امتیازی نشان سے نواز چکی ہے اور بعض کو نہ ختم ہونے والی شب فرقت
کی طرح دراز کرتی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک دنیا کا یہ کارخانہ موجود ہے کبھی اس کا سرا ہاتھ نہیں آسکتا
خیر ہمیں اس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم بعض انہی اسباق پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جن کی شاخیں
کسی آخری حد پر جا کر ختم ہو گئیں اور وہ دو شاخیں ہیں (بہت ممکن ہے اور بھی اس قسم کی شاخیں ہوں مگر ہمیں ان سے
مطلب نہیں) نبوتؑ کیوں کہ وہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ہمارے روحی فداہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی۔ فلسفۂ
افادیت کیوں کہ یہ عمر خیام پر اپنے تمام پہلوؤں کو نچھاور کر چکا۔ جہاں تک میری نظر گئی ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ دوسرے
محققین نے محض اصول پر فلسفیانہ بحث کرتے ہوئے وقت ضائع کیا ہے مگر عمر خیام ہی ایک ایسی ہستی تھی جس نے کسی پہلو
کو رباعیات سے باہر نہ رہنے دیا اور کمال یہ کہ ذوق شعریت کو ہاتھ سے نہ دیتے ہوئے۔ چنانچہ ہم خیال کرتے ہیں
کہ اس کے واسطے کسی ثبوت کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو خود رباعیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ آفتاب
آمد دلیل آفتاب۔ ہم مقصد کے عنوان میں صرف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالا کریں گے اس وقت تو ہم صرف دو یا تین
باتوں پر غور کرنا چاہتے ہیں:۔

(۱) یورپ نے اس کی کیوں قدر کی؟
(۲) یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟
(۳) مشرق نے اس کی رباعیات سے کیوں اعتنا نہیں کی؟
(۴) آج اس کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی؟

(۱) یہ سوال کہ یورپ نے مشرقی ذوقیات میں سب سے زیادہ اس ہی کو کیوں پسند کیا بالکل صاف بات ہے
بت کی گہرائیوں میں پوری قوت کے ساتھ ڈوب جانے کی وجہ سے اہل یورپ کے حسیات اور جذبات میں بھی مادیت
اسفلیت کے کثیر اجزا اس قدر شامل ہو گئے ہیں کہ دنیا کی تمام باتوں کو حتیٰ کہ خدا کو بھی اس ہی رنگ میں ڈبونا چاہتے
اور فلسفۂ لذتیہ بھی چوں کہ اس ہی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے فطرتاً انھیں اس فلسفہ پر تول کر جھک پڑنا چاہئے ہی تھا۔

گو اس میں شک نہیں کہ جس طرح لذت تین قسم کی ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ تین درجات رکھتی ہے
ہذالقیاس فلسفہ لذتیہ کے بھی تین ہی پہلو نکلنے چاہئیں تھے۔ ایک اور صرف ایک پہلو رکھنا واقعی دو پہلوؤں کا خون
نے کے معنی رکھتا ہے۔ مگر بات یہ ہے جن لوگوں نے یہ "افادیت" دنیا کے سامنے پیش کی اور جو لوگ اس کو دنیا
ل میں لانا چاہتے تھے (جیسے عمر خیام) یا چاہتے ہیں۔ وہ سب کے سب مادیت ہی کے شیدا تھے اس لئے اس
سفہ کے دونوں پہلو نظری اور عملی مادیت کی "میٹھی چھری" کے نیچے سے گردن نہ نکال سکے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے
پکورس (جس نے فلسفۂ نظری کی بنیاد عملی پہلو پر بھی کچھ دھندلی سی روشنی ڈالتے ہوئے ڈالی) سے لے کر عمر خیام (جس نے
فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے جتنی گھاٹیوں کا پیش آنا ضروری تھا بیان کر دیا) تک مادیت سے کوئی بھی بچ کر نہ جا سکا بلکہ
س سے بھی ترقی کرتے ہوئے میں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ آج اس پر عمل ہی وہ کرتا ہے جو کسی بڑی حد تک
ادیات میں پھنسا ہوا ہو۔ حالاں کہ اس کے اصول جس طرح مادی لذائذ میں تیر بہدف ثابت ہوا کرتے ہیں اس ہی طرح روحانیت
یں بھی بغیر نشانہ پر پہنچے نہیں رہ سکتے۔

بہر حال یورپ نے چوں کہ فلسفۂ لذتیہ کا اصل مطمحِ نظر مادیت سمجھا تھا اور عمر خیام نے بھی اس فلسفہ کو ان کی حیوانی
تمناؤں ہی کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا بڑا حصّہ "خیام کلب" کی طرف اپنی
تمام کوششوں کے ساتھ آگے بڑھا اور اُسے دنیا کے سامنے مادیت کے پر فضا باغ ارم کے اندر سبز پری اور
رقاصہ سبز پری کے سبز لباس میں پیش کیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عمر خیام کی رباعیات پر یورپ کی اعتبار اس کے علاوہ کوئی دوسری وجہ نہیں رکھتی اور اگر
ہے تو میں اب تک اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں۔

---

(۲)، یورپ اس کے فلسفہ کو سمجھنے کی کہاں تک قابلیت رکھتا ہے؟ اس کا جواب سننے سے پہلے آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی چیز یا کسی مضمون کو سمجھنے کی تین صورتیں ہوا کرتی ہیں:-

ا- عبارت یا کتاب کا نفس ترجمہ یا مطلب سمجھ لینا۔

ب- مضمون کے چند پہلو پیش نظر ہو جانا۔

ج کتاب کی تمام گہرائیوں میں ڈوب کر اس کے تمام دقائق اور تمام پہلوؤں کا روشن ہو جانا۔

(ا)، نفس مطلب یا فقط ترجمہ سمجھ لینا کوئی بات ہی نہیں گو اس ہی کے ساتھ حلوائے بے دود بھی نہیں کہا جا سکتا چنانچہ اپنے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے ایک رباعی[۱] کا لفظ "جرم" پیش کرتا ہوں، جرم کے عام معنی گناہ کے لئے جاتے ہیں مگر دقت یہ ہے کہ اگر ان ہی معنی میں اسے لیا جائے تو مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کے ایک اور معنی یعنی "کسب و عمل"[۲] لینے پڑے جس کے بعد مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

(ب)، میرے نزدیک صرف چند پہلوؤں کے پیش نظر ہونے کی وجہ اور وجوہات کے علاوہ ایک اور صرف ایک رنگ میں رنگا ہوا ہونا بھی ہے کیوں کہ قاعدہ ہے کہ جو جس رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اس کے ذہن میں ہر پیدا ہونے والا خیال اُسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوگا اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے کہ زیادہ غور کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اگر کوئی شخص مصنف ہی کے رنگ میں رنگا ہوا ہو یا کم از کم وہ اپنے رنگ کو علاوہ ضرورت کے کسی بات پر چڑھانے کی کوشش نہ کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے بہت سے پہلوؤں کو ان کے حقیقی رنگ و روغن کے لباس میں دیکھ سکے گا۔

(ج)، تمام یا اکثر دقائق کے معلوم ہو جانے کی صرف ایک صورت ہے جو ابھی آپ کو بتائی جا چکی ہے جب تک کوئی آدمی مصنف ہی کے رنگ میں نہ ہوگا کبھی تمام پہلوؤں کو نہیں سمجھ سکتا۔

یہ معلوم ہو جانے کے بعد اب ہمیں صرف دو باتیں دیکھنا رہ گئیں:-

(ا)- عمر خیام کا کیا رنگ تھا۔

---

[۱]- رباعی:
اے کردہ ز لطف و قہر تو صنع خدا — درعہد ازل بہشت و دوزخ بر پا
جرم تو بہشت است و مرا تحفہ نیست — خوبست کہ در بہشت رہ نیست مرا

[۲]- ملاحظہ ہو کشف اصطلاحات الفنون جلد اوّل۔

(ب) یورپ پر کون رنگ چڑھا ہوا ہے

(ل) عمر خیام ایک مشرقی اور مسلمان شخص تھا اس سے آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ خواہ فلسفۂ لذتیہ کا کسی قدر شیدا
ں نہ ہو مگر اس میں سے روحانیت کی جھلک بالکل غائب نہیں ہو سکتی تھی اور خصوصاً جب کہ خود بھی مذہبی علوم میں کامل
تے ہوئے اسلامی عروج کی گود میں کھیل رہا ہو اور جب روحانیت کی روشنی بالکل گل نہیں ہو سکتی تھی تو ہمیں یہ سمجھنے کا پورا
ہے کہ اس کا رنگ وہی رنگ تھا جو ایک روحانیت (خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو) رکھنے والے مسلمان اور اس مسلمان کا
سکتا ہے جو فلسفۂ لذتیہ کا قائل ہو نہ کہ اس "نیچرسٹ" کا جو روحانیت کے لفظ ہی کو بے کار سمجھ کر لغت کی کتابوں سے
الن مناسب خیال کرتا ہو۔

لہذا اگر کوئی دیکھنا چاہے کہ فلسفۂ لذتیہ نے اس پر کیا کیا اثرات ڈالے کس کس قسم کے خیالات اس کے دل میں
پیدا کئے تو ان باتوں کو اس کے رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے دیکھنا چاہیئے۔ ورنہ "اصول فلسفہ" کے علاوہ رباعیات
عمر خیام دیکھنے والے کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ خود عمر خیام پر اس نے کیا اثر ڈالا۔ اور اگر کسی کو یہ بھی معلوم ہو گیا تو اس کی حقیقی
اہمیت اور پوری اہمیت کبھی ذہن نشین نہیں ہو سکتی اور یہی ایک رباعیات پر غور کرنے والے کا نقص ہے۔

(ب) اس میں شک نہیں کہ یورپ نے اس پر بہت کچھ روپیہ کی بوچھار کی ہے[۵] مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی مشرقیت سے مجبور
ہو کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یورپ نے علاوہ جلد۔ سرورق۔ کاغذ، تصاویر تمدن قدیم، اور خاموش چڑیوں کے جو محض
رونق دوبالا کرنے کے واسطے ہر رباعی پر پر تولے ہوئے گر رہی ہیں اور کون سے دقائق کو حل کرنے کی کوشش کی
ہے۔ کیا یورپ نے فلسفۂ لذتیہ کے کچھ نئے اصول دریافت کئے؟ کیا یورپ نے عمر خیام کے خیالات کا کوئی جدید کتابی
فوٹو گراف پیش کیا؟ کیا یورپ رباعیات کے حقایق کو بے نقاب دیکھ سکا؟ کیا یورپ باوجود اس کد و کاوش کے
اہل مشرق جیسے جاہلوں (اپنے خیال میں) کی اس تحقیق تک پہنچ سکا جو انھوں نے "مثنوی مولانا روم" اور "دیوان حافظ
شیراز" ہی کے متعلق کی تھی اور کر رہے ہیں اور شاید کرتے رہیں گے جب ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں تو ہم نہیں
سمجھتے کہ خیام کلب نے جلد اور کاغذ سے دنیائے حقیقت شناس میں کس انقلاب کی بنیاد ڈال کر اہل مشرق کو شرم
سے اپنی گردنیں نیچی کر لینے پر مجبور کر دیا۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر مشرق نے تھوڑے سے غور سے کوشش بھی کی تو وہی

---

[۵] امریکن ایڈیشن ملاحظہ ہو

دن میں یورپ سے کہیں آگے نکل جائے گا۔ اس کے بعد میں یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ آخر یورپ کیوں نہ سمجھ سکا۔

یورپ آج مادی ترقی کرتے ہوئے اس "بلند مرتبہ پر" پہنچ چکا ہے کہ اس کے ایک نظر انداز نہ ہو سکنے والے گروہ یا دوسرے الفاظ میں وہاں کے محققین کے نزدیک خدا وہی خدا ہو سکتا ہے جو ہمیں ہماری ہی جیسی مادی اشکال میں نظر آسکے اس لئے آپ خیال فرماسکتے ہیں کہ اس میں روحانیت کس حد تک سرایت کئے ہوئے ہوگی اور وہ روحانیت کے صرف مفہوم ہی کو کہاں تک سمجھ سکا ہوگا۔

جب آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ یورپ روحانیت سے صرف اس قدر واقف ہے جیسے کہ ایک جاہل علم سے یا ایک بے وقوف عقل کے نام سے تو اب ظاہر ہے کہ جو چیز جس قدر بھی روح سے تعلق رکھتی ہوگی اس ہی قدر یورپ اس کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہوگا۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر یورپ روحانیت سے واقف نہ ہو یا ہو تو ایسی روحانیت سے واقف ہو جو تاریکیوں کے سات پردوں میں پوشیدہ ہو تو کم از کم نفسیات انفرادیہ سے تو اچھی طرح واقف ہے۔ چنانچہ سائیکالوجی اس ہی غرض سے مدون کی گئی ہے تو میں عرض کروں گا اور یقیناً بالکل درست کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" یورپ کی سائیکالوجی اور روحانیت میں کیا تعلق مگر افسوس ہے کہ میں ابھی ان دونوں کے فرقوں پر غور نہ کرنے پر مجبور ہوں۔ ہاں اگر کوئی صاحب اس کا یقین کرنا چاہیں تو "روحانیین" میں سے کسی کے سامنے نفسیات انفرادیہ کے نظریات پیش کرکے تصدیق کرسکتے ہیں بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ اس کی بھی ضرورت نہ ہوگی ہر شخص روح اور روحانیات کی عملی تحقیق کرنے پر بھی نہایت صاف طور پر سمجھ سکتا ہے کہ سائیکالوجی روحانیات سے شاید ایسی ہی نسبت رکھتی ہوگی جیسے کہ انسان کو تشریح اعضا یا وظائف الاعضاء سے اور ظاہر ہے کہ تشریح اعضا کا ماہر انسان کی حقیقت "جوہر فردہ" سے زائد نہیں جان سکتا تو پھر نفسیات مغرب عمر خیام جیسے روحانی (خواہ کیسی ہی خراب روحانیت کیوں نہ ہو) ہے تو روحانیت اور یونہ کے عقول سے بالاتر روحانیت، شخص کے "موثرات افادیت"، جو اس کی روح پر چوٹ لگا لگا کر کبھی کسی رنگ کی رباعی قوت متخیلہ کے سامنے پیش کرتے تھے اور کبھی کیسی رباعی۔ یورپ کس طرح اُن کی اصلیت و اہمیت کو سمجھ سکتا ہے۔

---

(۳) یہ سوال کہ مشرق نے رباعیات عمر خیام پر کیوں اعتناء نہیں کی ایک ایسا سوال ہے جس کو میرے نزدیک ہر اہل مشرق ذرا سے غور پر سمجھ سکتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں صرف وہی تصانیف اور افکار دماغی قبول عام کا

...ئے امتیازی حاصل کر سکتے ہیں جن کی ترکیب و تقویم میں روحانیت کا عنصر غالب ہو۔ کیوں کہ مشرق اور خصوصاً مسلمانوں
کے نزدیک حقائق اشیاء بسیط 'مجرد' اور روحانی ہیں' اس ہی لئے جس شئے پر جتنا ترکّب یا بالفاظ دیگر مادیت غالب
ہوگی اس ہی قدر اس کی حقیقت اور کنہ کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ
...ادیت' عین' حقیقت اور کنہ کی گہرائیوں کو تلاش کرتا ہے۔ بدیں غرض وہ کبھی ایسے نظریہ کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا
سطحیت سے ہم کنار ہوتے ہوئے حقیقی تدبّر اور معنی خیز قوت فکریہ کی زد سے باہر ہو چکا ہو۔

چنانچہ حال ہی میں ایک صاحب کا کتب خانہ دیکھتے ہوئے ایک کتاب تاج المدائح نظر پڑی جو سلطان مراد بخش
کے حضور میں پیش کرنے کی غرض سے تصنیف کی گئی تھی۔ اس میں ایک موقعہ پر مصنف نے چند مقتدر شعراء پر ناقدانہ نظر
ڈالتے ہوئے ہر ایک کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ عمر خیام پر بھی چند سطور سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چوں کہ اس کی
شاعرانہ زندگی کا خیمہ رشتہائے غور و فکر سے نہیں جکڑا گیا اس لئے نہ قابل اعتماد ہے اور نہ اس کو کبھی قبول شہرت عام کی
ڈگری حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ رباعیات عمر خیام کے مقبول نہ ہو سکنے کی اپنے ذہن کے اندر جو علت
قرار دیتے ہوئے تھا وہ کسی حد تک غلط نہیں کہی جا سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفۂ لذتیہ کے دقائق اور اس کے مختلف
پہلو پیش کرنے میں عمر خیام کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے مگر ایک مسلمان فلسفی کے نزدیک جب کائنات ہی کوئی ہستی اور
کائنات نہیں رکھتی، تو پھر اس کی لذت اور پھر وہ بھی محض ذہنی فلسفۂ لذت کیوں کر وقیع نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یورپ
...دہ پرست ہے کیوں کہ اس کا ماحول نظری' سوسائٹی' دل اور دماغ غرض کہ سب کچھ مادّی ہے۔ اس لئے اگر فلسفۂ لذتیہ
کی قدر کرتے ہوئے رباعیات پر کافی وقت اور توجہ صرف کرنے کی کوشش کرے تو بجا اور بالکل بجا ہے مگر مشرق اور
بلند نظر مشرق کو نہ رباعیات کی پرواہ اور نہ یورپ کے اعتناد سے سروکار، ہاں اگر کچھ سروکار ہے تو اتنا کہ اس کے
اضمحلالِ ذہنی اور نفس انفعالی کی کرشمہ سازیوں پر ایک متاسفانہ نظر ڈالے اور بس۔

مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آج اور کل دونوں کا مشرق ایک ہے تو پھر اس کی کیا وجہ کہ کل جس چیز کو مشرق
اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا آج وہی مشرق اس کو سر اور آنکھوں پر جگہ دینے کے واسطے تیار رہے۔ ہاں! بالکل درست۔ مگر
کیوں؟ اس لئے کہ مشرق اپنی فلسفیانہ ذہنیت کو فراموش کرتے ہوئے مغرب کی برق وش ذہنیت سے متاثر ہوتا جا رہا
ہے اور نہیں سمجھتا کہ میں کون تھا اور کیا ہوتا جا رہا ہوں۔ کاش وہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتا مگر نہیں انقلاب کبھی نچلا نہیں بیٹھتا

اس نے اگر ایک طرف دنیائے عمل میں کارگزاریوں سے قوائے اسلامیہ کو شل کر دیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ کم از کم دنیائے علم و نظر ہی میں اس کو اہل بصیرت کے دوش بدوش کھڑا رہنے دے نہیں بلکہ انقلاب کی مشین کو دانہ کا ہر پہلو پیس ڈالنا چاہیئے ورنہ اس کے کل پرزوں میں خرابی محسوس کی جائے گی۔ میرا اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں کہ مسلمانوں کو رباعیات عمر خیام کی طرف قطعاً توجہ ہی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر زر سرخ کو اپنے معیار ذہنیت پر پرکھ کر دیکھیں ممکن ہے کہ دوسرے کی کسوٹی فریب نظر ہو اور آپ اس کے دام میں آکر پیتل کو سونا سمجھتے ہوئے خسارہ میں رہ جائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ میرا اس قدر کہنا بھی قبل از وقت ہے کیوں کہ ہنوز مشرق اور خصوصاً ہندوستان نے یورپ کے تتبع میں بھی کہ ربائیت دماغی کا صرف نہیں کیا ہے بلکہ حضرت بوزنہ کی طرح بے سمجھے نقالی کی جا رہی ہے چنانچہ عمر خیام کی دو شروح جو آج تک ہماری نظروں کے سامنے پیش کی جا چکی ہیں ان کی حیثیت تراجم اور وہ بھی ناقص تراجم سے زائد نہیں ثابت کی جا سکتی۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ ہندوستان کے اہلِ قلم یا تو رباعیات عمر خیام پر قلم اٹھانے کی تکلیف گوارا ہی نہ کریں گے یا پھر ایسا کچھ لکھیں گے کہ اس کو دیکھ کر اگر انگلستان نہیں (کیوں کہ وہاں کی ذہنیت خالص مادی ہے) تو کم از کم جرمنی کے فلاسفر کو تو ہندوستان کی فلسفیانہ ذہنیت اور نکتہ سنج دماغ کی داد دینا فخر و مباہات محسوس کرنا پڑے۔ دیکھئے یہ امید بر آتی ہے یا نہیں امید تو نہیں ہے مگر ہاں خدا کرے!!!....

---

(۴) اخیر میں صرف ایک سوال رہ جاتا ہے کہ آج اُس ہی خیام کی کیوں قدر و قیمت تسلیم کی جانے لگی جس کو کل تک قابل اعتنا سمجھنا بھی غلط کاری محسوس کیا جاتا تھا مگر فراگری اور درست اندازہ نظر ڈالنے پر آپ محسوس کریں گے کہ پچھلے صفحات میں اس سوال کا جواب بھی لپٹا ہوا ہے۔ لیکن اس کی اجمال انگیزی دیکھتے ہوئے مستقل طور پر روشنی ڈالنا زیادہ بہتر تصور کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ کائنات کے تمام زر و جواہر بلکہ تمام اشیا کی قیمت محض اضافی ہے۔ خود اشیا کی ذات میں کوئی ایسی قوت مضمر نہیں جو اس کی قیمت کو ہر وقت اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر قایم رکھ سکے۔ اس لئے ہمیں کسی چیز کی قیمت معلوم کرنے کی غرض سے خود اس چیز کی جواہر تابی، خوش وضعی اور آب و رنگ کو دیکھنے کے بجائے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ موجودہ مادی احتیاجات، گرد و پیش کے حالات اور زمانہ کی ضرورتیں اس شے میں ہمارے لئے کس قدر جذب و کشش پیدا کر رہی ہیں۔ کیوں کہ قیمت طلب سے زیادہ ہوتی ہے نہ کہ طلب قیمت سے پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ

(اس چیز کی کیا قیمت ہے اور کیوں۔

چوں کہ یہ قانون دنیا کے ہر ذرہ پر جاری ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ رباعیات خیام کے جواہر پارے یا سنگ ریزے اس عام قانون کے تحت نہ آتے چنانچہ آئینِ فطرت کی کارفرما قوتیں برسرِ عمل آئیں اور ایک زمانہ کی کس مپرسی کے بعد رباعیات کو بیش بہا موتیوں میں شمار کیا جانے لگا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلے قدر و قیمت تسلیم نہ کرنے کا کیا سبب تھا اور آج کون سی نئی بات پیدا ہو گئی جس نے اس کی وقعت اور حیثیت میں چار چاند لگا دیئے حقیقت یہ ہے کہ دنیا ہمیشہ روحانیت و مادیت کی کشمکش میں غلطاں و پیچاں رہی ہے اور شاید جب تک نظام ملکی قائم ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا چنانچہ اس ہی قانون کے تحت جب کبھی دنیا پر روحانیت کا زریں دور زرفشاں ہوا تو صرف وہی علوم و مصنفات جو روحانیت کی گہرائیوں سے ایک گونہ مناسبت رکھتی تھیں قبول عام کی سند حاصل کر سکیں اور جب کبھی مادیت کی لعنت دنیا پر چھائی تو تمام وہ حقائق نظر انداز کر دیئے گئے جن میں حاسّہ مجردہ روحانیہ یا قوت فکریہ انسانیہ کی مضمر طاقتیں صرف کرنا ضروری ہوں اور محض وہی مخترعات و ایجاداتِ سائنس قابلِ قدر ٹھیریں جو مادّی تمدّن کو دوبالا اور سیم و زر یا بالفاظ عمومی دولت کا اضافہ کر سکیں۔ چنانچہ اگلے زمانہ میں روحانیت کا چرچا تھا اس بنا پر محض وہی حقیقت قابل لحاظ تصور کی جاتی تھی جو پورے غور و فکر کی مرہون ہوتے ہوتے کسی بہترین اور زبردست حقیقت کا پردہ فاش کر رہی ہو اور اس علم یا تصنیف کو قابل پذیرائی نہ سمجھا جاتا تھا جس کے حدود حقائق مادّیہ سے تجاوز نہ کر سکیں۔ اور چوں کہ رباعیات عمر خیام شراب ارغوانی اڑانے اور رنگ رلیاں منانے ہی کے ضوابط و قوانین کا مرقع یا لطیف مگر موالید ثلاثہ ہی کے راز ہائے سربستہ کا مجموعہ تھیں اس لئے ظاہر ہے کہ روحانیت کے اسرار مکنونہ حل کرنے والے محققین و فلاسفر اس طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہ کر سکتے تھے اور نہ ان جرعہ ہائے تلخ کو گوارا ہونا چاہیئے تھا۔ کیوں کہ اگر روحانیت نواز دماغ مادّہ کی پیچیدگیاں سلجھانے میں مصروف ہو جائیں تو حقیقت رسی کی قوت بہت کچھ کمزور پڑ جائے گی اور پھر روحانیت کے دقائق محسوس کرنا اُن کے قابو کا معاملہ نہ رہے گا۔ جو ایک فلاسفر کے واسطے انتہائی تکلیف دہ اعتراف حقیقت کے معنی رکھتا ہے۔

مگر آج روحانیت کی فضا مکدّر ہو چکی ہے اور اس کو ترقیات مادیہ میں نہ صرف غیر ضروری بلکہ بعض "خوش فہموں" کے نزدیک رکاوٹ تک خیال کیا جاتا ہے مجھے یہاں پر اس سے بحث نہیں کہ "نئی روشنی" کے زائیدہ حضرات کی یہ

خیال آرائیاں کہاں تک بجا یا بے جا ہیں کیوں کہ یہ مسئلہ خود ایک مستقل عنوان کا محتاج ہے اس لئے میں اتنی ہی بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ آج مغرب میں مخصوص طور پر اور مشرق میں اس کی غلامی اور زیر اثر و اقتدار ہونے کی بدولت شراب مادیت کا ساغر چھلک رہا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اُس کی نظر افروز گلابی بوندیں سرشار کرتی اور صدائے قلقل جذبات کی لہروں کو متموج اور برقی رَو کی طرح دل و دماغ میں دوڑاتی رہے گی۔ بہرحال ہمارے زمانہ میں بھی رنگ ہے اور یہی عمر خیام کی رباعیات کو شہرت عام کی عزت سے سرفراز کرنے کا ضامن ہے۔

لہٰذا موجودہ قبولیت عام کو دیکھتے ہوئے خیال قائم کر لینا چاہیئے کہ یہ پچھلے لوگوں کے قوائے دماغیہ کا اضمحلال تھا کہ وہ رباعیات کے محاسن و دقائق کو محسوس نہ کر سکے۔ غلط راہ روی ہے کیوں کہ ہر شخص اپنی ذہنیت کے معیار پر کسی حسن کو پرکھتا ہے نہ کہ دوسرے کی ذہنیت کے سانچے پر۔ وہ روحانیت پرست تھے اور رباعیات فلسفۂ لذتیہ کا خاکہ لہٰذا اُن کے دل و دماغ اس سے کس طرح متاثر ہو سکتے تھے۔ ہاں آج ذہنیت تبدیل ہو گئی اور اب دنیا رباعیات کے فلسفۂ لذتیہ جیسے معمولی فلسفہ کو بھی اپنی سنہری گود میں جگہ دے سکتی ہے۔ مگر اس قدر و قیمت سے خود اس فلسفہ کی حقیقت شرف و علو سے لذت آشنا نہیں ہو سکتی اس لئے کہ فطرت نے اضافیات کو ماہیت پر اثر اندازی کی قابلیت ہی ودیعت نہیں فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی فلاسفہ کبھی دنیا کی تحسین و نفریں پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ صرف حقیقت واقعیہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

لہٰذا ہم بھی اتباعاً صرف حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دینے کے مجاز ہیں کہ رباعیات عمر خیام مادّہ پرستوں کے لئے ایک عجیب اور قابل فخر کتاب ہے مگر ضمیریین یا بتعبیر صحیح تریں روحانیین کے نقطۂ نظر سے کسی خاص وقعت کے لائق نہیں خواہ آج دنیا اس کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے۔ مگر حقیقت ہمیشہ حقیقت ہی رہے گی۔ کسی رائے کا اُس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔

شاید بعض تصوف پرست حضرات رباعیات عمر خیام کو روحانیت کی "زر آلود کنجی" سمجھنے کی بنا پر میری توجیہہ کو درست خیال کرنے کے لئے تیار نہ ہوں مگر میں ان کو حسن ظن کے عوض غور و تدبر کی دعوت دوں گا۔ کیوں کہ فقط کسی کے چند اشعار سے اس کی اخلاقی اور نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کر لینا قابل اعتماد و استناد نہیں ہو سکتا۔ اول تو اُس کی رباعیات نوے فی صدی مے نوشی، آداب و قوانین مے نوشی اور اس ہی سے متاثرہ امور پر مشتمل ہیں اور پھر اس کی

ح حیات متصوفانہ خیالات کی ہم آہنگی نہیں کرتی۔ غالب یا ہمارے زمانہ کے بعض "ممتاز ترین" شعرا کے متصوفا
کو دیکھ کر اُن کو صوفی سمجھ لینا اور حالات سے واقفیت رکھتے ہوئے جس قدر نیک نیتی اور خوش اعتقادی کے
نیم سے برتر خیال کیا جانا چاہیے اتنا ہی خیام کے رندانہ سوانح حیات سے آنکھیں بند کرکے صرف چند رباعیات
بعد وسہ پر "حقیقت پرست صوفی" کہہ دینا بھی ممکن ہے۔ اگرچہ ادیبانہ طرز تحریر اور فلسفیانہ یا متصوفانہ ادائے خیالات
، انداز سے اخلاق و عادات پر بھی ایک گونہ روشنی پڑتی ہے مگر نہ اس قدر صاف و شفاف کہ ہر ذرہ چمک اُٹھے
یں شک نہیں کہ ہم تصنیف کے تمام حصص و اجزا پر جداگانہ بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ مصنف کی
دگی نے کیا رُخ اختیار کیا، کس چیز کی تلاش کی، کیا پایا اور کیا نہیں اور اگر غور کیا جاتا تو وہی حقیقت بے نقا
تی جو میرے سامنے آچکی ہے۔ چنانچہ میں یہی دعوے ثابت کرنے کی غرض سے شرح رباعیات کی بنیادوں کو
ستوار کر رہا ہوں جس کو یا تو بالکل عنوانات تفسیری سے معرا رکھا جائے گا یا خیامی ترتیب و سلسلہ کو ترک کرکے
ب جدید اسلوب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کا ہر رنگ جداگانہ
سوس کیا جا سکے۔ ابھی یہ خیال ابتدائی مراحل طے کرنے کی وجہ سے بہت دھندلا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک
س کے خد و خال واضح ہو سکیں گے۔

برہان احمد فاروقی
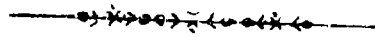
ٹیپو سلطان

زمین ہند سے اٹھا نہ کوئی ایسا [illegible]

ابد نظرت جو تھا کسی کو [illegible]

فلک نے زیست تو کی پائمال ٹیپو کی
مگر نہ کر سکا پیدا مثال ٹیپو کی

ٹیپو سلطان والی میسور

From an Original Painting

نہ ڈھونڈھ لطفِ سحر گاہ شامِ ماتم میں　　ہلالِ عید کو دیکھا کبھی محرم میں؟
دکھائے خاک بہار اپنی باغِ عالم میں　　وہ پھول جو کہ کھلا ہو خزاں کے موسم میں
کیئے خدا نے مقرر ہر ایک کام کے وقت
سحر کا کام ملا لیکن اس کو شام کے وقت

وہ بادہ جس کا تھا خمان شہید سا شیدا　　وہ جامِ تلخ جو تغلق نے نوش جان کیا
وہ نشہ جس نے کیا خلجیوں کو متوالا　　ازل کے روز سے اس شیر دل کا حصہ تھا
بہادرانہ، شجاعانہ، عاشقانہ موت
سپاہی کہتے ہیں جس کو سپاہیانہ موت

سپہرِ ہند کا وہ اک چمکتا اختر تھا　　دکن کی خاک کا اک آب دار گوہر تھا
نصیبِ ہند تھا، اقبال تھا، مقدر تھا　　نہ کیوں ہو ایسا کہ آخر کو ابنِ حیدر تھا
خیال اس نے کیا کچھ نہ اپنی زحمت کا
قدم قدم پہ رہا دھیان اس وصیت کا

فلک نگین ترا سازگار نام کند　　سپہر بادۂ نوشیں ترا بہ جام کند
خدائے پاک ترا فائز المرام کند　　اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند
ترا اگر زدر بہ بازوئے تیغ زن باقی است
بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقی است
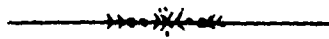
سید منور حسن

اُردو مشاعرے

مشاعرے اور وہ بھی چودھویں صدی کے ہندوستانی مشاعرے دہلی و لکھنؤ کے شاہی مشاعروں کے ناکمل مرقعے مرحوم پہلوانانِ سخن کے سنسان اکھاڑے جن میں روحِ شعر کی وفات کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ جہاں مشاعرۂ سلف کا ناقص ڈراماٹیک کرکے قومی بد مذاقی کا اعلان عام کیا جاتا ہے۔ کیوں کر کہوں کہ یہ مشاعرے کسی درد کی دوا۔ ایک مفلس و نادار قوم کی بامِ ترقی کا زینہ۔ قومی اخلاق کے پراگندہ اوراق کا شیرازہ یا ایک مفلوج زبان کے غسلِ صحت کا سرچشمہ ہیں۔

آپ نے رسالۂ اُردو میں ۱۲۶۱ھ کا ایک مشاعرہ پڑھا ہوگا۔ اگر نہیں پڑھا ہے تو کسی مشاعرہ میں جاکر عملی مشاہدہ کا لطف اُٹھائیے۔ اگر اصل نہیں تو ایک بگڑی ہوئی نقل سے دیرینہ بزمِ سخن کا دھندلا سا خاکہ درپیش نظر ہو جائے گا تقریباً وہی ترتیبِ نشست ہوگی وہی داد کا غلغلہ۔ وہی شمع کی پروانہ وار گردش۔ اگر بھری محفل میں شمع کی بے حجابی ناگوار تو حمیّ و گلوب کی چلمنوں سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی ہی رقصاں و گرداں نظر آئے گی۔ فرق اس قدر ہوگا کہ وہاں ایک غالب اور ایک مومن تھے یہاں ہر گوشہ میں ہزاروں غالب و مومنِ ثانی نظر آئیں گے۔ وہاں استادانِ فنِ شعر کے ایک ایک لفظ پر راتیں صرف کیا کرتے تھے۔ یہاں ایک ایک رات میں دو غزلہ و سہ غزلہ کے ہزاروں ٹھیکہ دار برسرِکار نظر آئیں گے۔ وہاں شمعِ عنبریں ہر کسی شاعر سے جُدا ہوتے وقت آٹھ آٹھ آنسو روتی اور اپنی بوئے دلاویز کو بطور یادگار چھوڑ جاتی تھی۔ یہاں لیمپ کی آہوں کا تاریک دھواں اور روغنِ گِل کا تعفّن مشام سوز ہی اس کا صحیح قائم مقام تصور کیجئے۔ وہاں صرف شاعر ہی اپنا کلام سُنا کر محظوظ کرتا تھا۔ یہاں تکرارِ مصرع کے نوبت خانہ میں کان پڑی آواز اُسننا مشکل نظر آئے گا۔ وہاں ترتیبِ نشست شہرتِ کمال پر موقوف تھی۔ یہاں خوش لباسی و ثروت تقدم کا معیار ہے وہاں صفِ اول شعراء کے لئے مخصوص تھی یہاں شاعر و سامع کا درجہ کُلُّ مُومِنٍ اِخوۃٌ کے تحت بالکل مساوی ہے۔

افسوس کہ عہدِ شاہ جہاں و عالمگیر کے مشاعروں کا کچھ حال معلوم نہیں لیکن کہا جاسکتا ہے کہ عہدِ بہادر شاہ ظفر مشاعرہ جو رسالۂ اُردو میں شائع ہوا ہے تقریباً سابقہ بزم ہائے سخن کا مکمل نمونہ تھا جس کی سنگین لیکن تنگ چار دیواری ہے نہ صرف ابتدائی عہد میں عدول کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس دورِ ترقی میں بھی سنتِ قدیمۂ شعراء کے کامل اتباع کو مذہب

شاعری کا رکن اعظم قرار دیا گیا۔ یوں تو دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں۔ اشعار پڑھنے اور جوہر سخن دکھانے کے طریقے بھی تمام ملکوں میں رائج ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستانی مشاعروں کی ہیئت کذائی دنیا کے کسی ملک کی رہین اتباع ہے یا اس ایجاد کی خود مالک ہے؟

یورپ کی شاعری اور اس کے اثرات سے دنیا روشناس ہے جہاں سولن کے درخشاں کارناموں سے جزیرہ سسلی کے تاریخی صفحات مزین ہیں۔ لارڈ بائرن کا نام بچہ بچہ کو نوک بر زبان ہے۔ پیرس اور مارسیلز کے قصیدے فرانس کی تاریخ حریت کا سنگ بنیاد ہیں۔ ہومر کا سب لوہا مانے ہوئے ہیں۔ لیکن وہاں کے مشاعرے۔ رسائل ڈرامے یا جلسے میں جہاں کسی باموقع نظم سے بجائے زبانی داد کے دلی جذبات کے طوفاں بلند ہوتے ہیں۔ مصرع طرح کی بجائے ضرورت کا اقتضا عنوان ہوتا ہے۔ غزل کی بجائے ہر وہ نظم جو کافی ترجمان جذبات ہو۔ تکرار مصرع کی بجائے ملک بھر کی زبانیں دلی جذبات کے ساتھ اس کے پڑھنے میں رطب اللسان ہوتی ہیں۔

عرب میں دیکھئے تو ظہور اسلام سے قبل مکہ کے بازار عکاظ میں ۱۸ ذی الحجہ کو شعرا اونٹوں پر سوار ہو کر اپنے اپنے قصائد پڑھتے تھے اور سال بھر میں ایک ہی موقع جوہر سخن دکھانے کا ملتا تھا۔ چنانچہ بہترین قصائد دیوار کعبہ پر آویزاں کئے جاتے اور جب تک ان سے بہتر قصائد پیش نہ ہوتے ان کا سکہ تمام قلوب پر جاری رہتا۔ شعراء کے راوی کلام یاد کرکے ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ فردوسی کا راوی ابو دلف اسی طریقہ کی یادگار تھا۔ اعشیٰ۔ عبداللہ بن معدیکرب ابو نواس۔ ابو تمیم متنبی۔ امرء القیس۔ وغیرہ کے نام سے کون واقف نہیں۔ شعر کے اثر کا وہ عالم تھا کہ شاعر کے پیدا ہونے پر تمام خاندان کو مبارک باد دی جاتی۔ کلام کو دیکھا جائے تو ہمیشہ غیر طرحی ہوتا تھا۔ مضامین بھی کثیر تھے۔ رزم۔ رجز۔ حمد و نعت۔ اخلاق۔ موعظت۔ ترس خدا۔ ترک دنیا۔ ناپائداری دنیا۔ عشق۔ مناظر قدرت کے مختلف مضامین میں جوہر سخن دکھاتے تھے۔

ایران جو شاعری میں اردو کا استاد اور سرپرست ہے جہاں رودکی۔ فردوسی۔ سعدی و حافظ نے دنیائے شاعری میں ہلچل ڈال دی ہے۔ جہاں ایک ایک شعر پر سزائے موت کے احکام منسوخ ہوئے ہیں۔ نقرئی اور طلائی سکوں سے شعرا کے جسم وزن ہوئے ہیں۔ جواہرات سے منہ بھرے گئے ہیں۔ نادری قتل عام کے فلک سوز شعلے ایک ہی فارسی شعر کے چھینٹوں سے بجھے ہیں وہاں اس قسم کے مشاعروں کا کہیں پتہ نہیں۔ البتہ شاہی دربار مشاعرہ گاہ

کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں قصائد کا زور تھا اور قافیہ و ردیف، بحر و وزن کی کوئی قید نہ تھی۔ اگر اتفاقاً یہ قید لگائی بھی جاتی تو محض شاعر کی جانچ کی بدولت۔ جیسا کہ فردوسی نے عنصری۔ فرخی و عسجدی کے مصرعوں پر اپنا مصرع "مانند خدنگ گیو در جنگ پشن" لگایا ہے لیکن اصلی جانچ مختلف کلاموں کے سُننے سے ہوتی تھی۔ داد دینے کے بھی یہ طریقے نہ یہ تھے نہ اب ہیں۔ وہاں کلام کے خاتمہ پر مناسب الفاظ میں تعریف کردی جاتی ہے۔

غرض بعد غور یہی نتیجہ نکلتا ہی کہ یہ طریقہ محض ہندوستان کی ایجاد ہے اور وہ اپنے وقت پر ابتدائی عہد ہونے کی وجہ سے نہایت ضروری و مناسب تھا۔ زبان کے کم زور بچّہ کو ایک طاقتور نوجوان بنانے کی بھی تدابیر ہوسکتی تھیں کہ فنِ شعر کی مشق و ترویج کے لئے عام دعوت سخن دی جائے اور بزم سخن قائم کر کے عوام کو رغبت اور شعرا کو طبع آزمائی کا موقع دیا جائے لیکن قابلِ بحث آج کل کے مشاعرے ہیں کیوں کہ دور اول میں جو کچھ کیا گیا وہ بجائے خود درست اور مناسب تھا۔ یہ دور حال کے شعرا کا فرض تھا کہ ان تنگ میدانوں کو وسیع کرتے اساس قدیم پر ایسے بلند اور مستحکم قصر تیار کرتے جن کے زریں و تاب دار کلس دنیا کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتے۔ جدّت اختراع سے کام لے کر متمدن ترین ممالک کے نقشوں کو دیکھتے اور موجودہ ضروریات کا لحاظ کر کے ایک بلند و دل کشا قدیم و جدید صنائع کا جامع ایسا قلعہ تیار کرتے جس کی صدائے بازگشت سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج اٹھتا۔

لیکن افسوس! کہ بجائے ترقی کے تنزل اور بجائے وسعت کے تنگیوں کی طرف پیش قدمی جاری ہے اور جلسہ کی تہذیب یہاں تک گر گئی ہے کہ اگر کسی غیر ملک کا اجنبی شخص مشاعرہ میں قدم رکھے تو داد کی چیخ پکار پر بے ساختہ کہہ اُٹھے گا کہ ان سب وارفتگان حواس کو کسی اچانک بیماری کا دورہ پڑا ہی جس نے جلسہ کی تہذیب و متانت کے احساس تک کو اُن کے دل و دماغ سے زائل کردیا ہی۔

اگر آپ مشاعرہ کی شرکت کے متمنّی ہیں تو بسم اللہ ایک فینسی کارڈ یا مطبوعہ پرچہ وصول کیجئے۔ اس میں تاریخ و وقت افتتاح مصرع طرح اور قافیہ وغیرہ لکھا ہوگا۔ آپ کارڈ وصول کرتے ہی دل میں خلش اور دماغ میں سوجنے کا تخم لیے اور دھن میں محو ہوجائیے۔ اگر آپ کہنہ مشق ہوں تو دیوانوں سے دل بہلائیے۔ قافیہ و ردیف ٹٹولئے مضمون کو الٹ پلٹ کر، یا ۹ شعر کی غزل کا تیار کرلینا کوئی بڑی بات نہیں اور اگر کسی استاد سے اصلاح لے کر پڑھنے کی ریہرسل بھی کرلی تب تو سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ بالآخر مفت کی واہ واہ کی چاٹ آپ کو بھی گرتا پڑتا مشاعرہ تک پہونچا ہی دے گی۔ وہاں جا

آپ اپنی طرح بہت سے شایق شعرا کو غزل کا پرچہ دل سے لگائے مرض اختلاج میں مبتلا پائیں گے۔ مسند صدارت پر کوئی مشہور بزرگ گاؤ تکیہ لگائے، موہنہ میں پیچوان کی نے لئے نیم دراز نظر آئیں گے۔ پانوں سے بھرا ہوا خاصدان پاس ہوگا۔ کبھی کبھی واہ واہ اور خوب کے پھول بھی منہ سے جھڑتے دکھائی دیں گے۔ آپ سمجھ لیں کہ جناب صدر یہی بزرگ ہیں۔ مشاعرہ ۹ یا ۱۰ بجے شب کے شروع ہو کر طلوع آفتاب تک ضرور جاری رہے گا اور اگر صبح تک ختم نہ ہو سکا تو پھر ایک یا دو راتیں اور بھی صرف کرنا پڑیں گی۔ آپ کو جمائی پر جمائی آئے۔ آنکھیں جاگنے سے۔ کان سننے سے۔ بدن کا جوڑ جوڑ ایک وضع پر بیٹھنے سے کتنی ہی فریاد کریں لیکن آپ ایک نہ مانیں اور بغیر غزل سنائے کسی طرح بے نیل مرام واپس نہ آئیں ہمت مرداں مدد خدا مشہور ہے اگر آپ جلد سنانے کے متمنی ہوں تو یہ بھی ممکن ہے وہاں نہ زیادہ روک ٹوک نہ صدر کی اجازت کی ضرورت۔ آپ جب ایک مصرع پڑھ دیں گے تو دس بیس شاعر آپ کا مصرع اٹھانے میں اخلاقی مدد سے کسی طرح دریغ نہ کریں گے۔ اس وقت آپ کو تھیٹر کے کورس کا لطف نہ آجائے تو ہمارا ذمہ جب آپ دوسرا مصرع ختم کریں گے تو معمولی شعر پر کیا خوب۔ خوب، اور اچھے شعر پر تو مکرر فرمائیے کی آوازوں کا ایسا شور و غوغا بپا ہوگا کہ آپ کو گھنٹے ٹیک ہر شاعر سے بامید داد آنکھیں لڑا لڑا کر تسلیم کے لئے داہنے ہاتھ کو علت رعشہ میں مبتلا ہی کرنا پڑے گا آخر میں جناب صدر غیر طرحی کلام سے بھی ضرور محظوظ فرمائیں گے اور بعد اختتام بشرط استطاعت تمام غزلیں ایک مجموعہ میں شایع ہو جائیں گی۔

ناظرین نے مشاعروں کی کیفیت تو ملاحظہ فرما ہی لی اب ارکان و شرائط مشاعرہ سے نمبروار بحث مناسب ہے جس کی خدا اٹھا تک پہونچتی ہے۔ یعنی مصرع طرح[۱] و پابندی غزل۔ شعرا کی ترتیب نشست[۲]۔ طرز شعر خوانی[۳]۔ تکرار مصرع[۴]۔ داد[۵]۔ گردش شمع[۶]۔ تعیین وقت[۷]۔ فرائض صدر۔

(۱) مصرع طرح و پابندی غزل

سب سے پہلے غزل کی تعیین قابل غور ہے۔ تذکرے شاہد ہیں کہ اردو شاعری کا سنگ بنیاد دکن کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوا جنھوں نے ایرانی خشت کا سانچہ ایک دیوان کی صورت میں پیش کیا۔ پھر زمانہ کے رنگ اور سوسائٹی کے مذاق نے غزل کے علاوہ قصائد اور ہجو و ہزل کو فروغ دیا لیکن ان کا وجود تابع سلطنت تھا اس کے مٹتے ہی قصائد کی جگہ

بھی رخصت ہوئے اور شاعری پر صرف غزل ہی حاکم رہی۔ وجہ یہ کہ ایران میں عشقیہ و صوفیانہ مضامین نے غزل ہی میں
جنم لیا تھا۔ سعدی و حافظ کی غزلوں نے تصوف ہی کی چاشنی سے دنیا کو شیریں کام بنایا تھا عشق کی گرم بازاری تھی
اس لئے شاعری کا وسیع میدان چاروں طرف سے سمٹ کر دیوان ہی کے تنگ گوشہ میں سما گیا۔ ہندوستان نے بھی
حق نقل ادا کیا اور غزل کو آسان اور رواج عام کو آلۂ تحسین سمجھ کر حسن و عشق کی نظم کو اپنا دائمی دستور العمل بنا لیا۔ ذکر
اس قدر رہا کہ متقدمین نے غزل کو اپنے صحیح واردات کا آلہ بنایا تھا۔ ان کی غزل بھی نیچرل تھی۔ متاخرین میں نہ وہ حال رہا
نہ اشعار اور واقعات میں اصلیت کی جھلک۔ اس لئے تمام امور فرضیت اور تصنع سے پُر ہو گئے۔ مضامین کثرت طبع آز
سے اس قدر مستعمل ہوئے کہ مقررہ باتوں میں لفظوں کے پس و پیش کے سوائے کچھ کامیابی نہ ہوئی آخر چبائے ہوئے
نوالے کب تک لطف دیتے کسی استاد کو اتفاقیہ کوئی مضمون ہاتھ لگ گیا تو مزے دے گیا۔ ورنہ لطف کی بھی کوئی انتہا ہے
آخر تا کے۔ شعرائے حال کے واسطے سب سے بڑی آسانی یہ ہوئی کہ سلف نے استعارات و تشبیہات کا اس قدر کافی
ذخیرہ چھوڑا تھا کہ ہر کس و ناکس کو فکر کر لینا چنداں دشوار معلوم نہ ہوا۔ دوسری نظموں کی دشواریوں نے خوف زدہ کر کے
اسی دائرہ میں چکر لگانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ عمر ختم ہو گئی لیکن مقصود شاعری و ضرورت زمانہ کی فضا کی طرف کبھی بھول کر بھی
رُخ نہ کیا۔ اور بالآخر وہی نتیجہ ہوا جس کی قدرت سے امید تھی کہ آج کل باستثنائے چند غزل گو شعراء کی تعداد حشرات الارض
سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ ایک شہر میں ایک تخلص کے متعدد شاعر موجود ہیں اور ہر ایک کو دعوئ استادیت ہے لیکن نہ ان
زبان ہی کو فائدہ پہونچ رہا ہے نہ کوئی مفید اخلاقی نتیجہ ہی نکل رہا ہے۔ اگر غزل کے شیدائی اپنی اصل یعنی فارسی شاعری کو
وسیع النظری سے دیکھتے تو عشقیہ غزل کے علاوہ نہ صرف تاریخ۔ فلسفہ۔ تصوف۔ عشق۔ اخلاق۔ مہماں نوازی۔ شجاعت
و جاں بازی۔ حریت و آزادی۔ پند و موعظت اور مناظر قدرت وغیرہ کے دوسرے مضامین بھی بکثرت پاتے بلکہ
غزل کے تنگ دائرہ میں بھی فلسفہ و تصوف کے وسیع مضامین کا نظارہ کرتے جس کا نمونہ غالب کی غزلوں میں موجود ہے
انیس و دبیر نے مرثیہ ہی میں اخلاق و موعظت حریت و شجاعت۔ فلسفہ و مناظر قدرت وغیرہ کے تمام مضامین میں جوہر سخن
دکھائے ہیں۔ اکبر مرحوم نے موعظت و اخلاق قومی کو ضرورت کے مطابق ایک انداز خاص کے ساتھ بیان کر کے
قطعات و رباعیات وغیرہ میں قابل رشک کامیابی حاصل کی ہے۔ مولانا حالی نے قومی شاعری اور علامہ اقبال نے
خودداری و تعلیم نفس۔ قومی احساسات اور فطری جذبات کا کما حقہٗ حق ادا کر دیا ہے۔ ان نمونوں کا وجود غزل گو شعراء کے

طے ایک شاہراہِ ہدایت ہے جس نے شاعری کے اصل مقصد کو نمایاں کر کے خدمت ملک و قوم کا بیڑا اُٹھایا ہے
ں، حالی کا مرتبہ حالی ہی کی زبانی سُن کر غور فرمائیے کہ ہماری حالت کیسی شاعری کی محتاج ہے۔ دیباچہ مسدس میں لکھتے ہیں

"شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی و
ڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ چشمِ دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اُٹھا۔ طعنوں
رسے آسمان چھلنی ہو گیا۔ کفر سے مانوس رہے۔ ایمان سے بیزار رہے۔ برہمنوں کے چیلے بنے۔ بُت
ے۔ زنار باندھا۔ قشقہ لگایا۔ زاہدوں پر پھبتیاں کہیں۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں۔ قصیدہ لکھا
اٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیئے۔ جس کے مداح بنے اس کو ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف
مزہ نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔ اور بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال
یلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں
ں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں .... زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری
ی سیر ہو گیا۔ اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی .... قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے
ت خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں
دہائی ہے۔ اخلاق بگڑ گئے۔ امراء غافل۔ علماء ضرورتِ زمانہ سے ناواقف اس لئے جو کچھ ہو سکے وہ بہتر ہے"

حالی کے کلام میں کس کو کلام ہے۔ پھر کیا قوم کی ایسی حالت نہیں جس کی طرف ادنیٰ توجہ بھی روا رکھی جائے۔ میرا
دعا یہ نہیں ہے کہ تمام شعرا قومی نظمیں لکھنا شروع کر دیں بلکہ غزل اور حسن و عشق کی سخت پابندیوں کے مقابلہ میں
ریات زمانہ کی شاعری پر بھی توجہ کریں۔ کیوں کہ شاعری صرف غزل میں چند محاورات و روزمرہ کے استعمال کا
ہیں ہے بلکہ عالم شعر اس سے بہت بلند ہے۔

بدقسمتی یہ کہ اس زمانہ میں شعرا کے تین گروہ ہیں جن میں کا ایک غزل کے تخیل بلند پروازی اور اشکال معانی پیمان
ہے۔ خواہ زبان کتنی ہی بھدّی کیوں نہ ہو۔ یہ غالبی کہلاتا ہے۔ دوسرا روزمرہ و محاورات کی نظم ہی کو خلاصہ شاعری
تا ہے۔ خواہ معانی کتنے ہی متبذل و رکیک کیوں نہ ہوں۔ یہ داغی ہے۔ تیسرا گروہ غزل کے شکنجہ سے نجات
ہر قسم کے جذبات و احساسات کی تصویر کا شیدا ہے جس میں زبان معانی کے اور محاسن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹیں۔

اس کے راہ بر حالی و اکبر و اقبال ہیں۔ اس لئے اس کو اقبالی کہا جائے تو مناسب ہے۔

میرے نزدیک غزل کی کثرت اور حسن و عشق کی تحدید نے واقعی مضامین کو اس قدر کم یاب کر دیا ہے کہ مشہور استاد بھی اپنی عمر بھر کے سرمایہ میں بمشکل چند شعر ایسے پیش کر سکتے ہیں جو سننے والے کو بے ساختہ تڑپا سکیں اور کوئی شبہ نہیں کہ آج کل کے مشاعرے صرف مشق غزل کی بدولت ناکامیاب شاعروں سے یاد کئے جانے کے قابل ہیں اول تو شاعری سائنس کی ٹکر سے خود پاش پاش ہو رہی ہے۔ تجارب و مشاہدۂ علوم یقینات کے مقابلہ میں ظنیات و توہمات کی کیوں کر قدر ہو سکتی ہے۔ جو شاعری اس زمانہ میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ متمدن ممالک کی شاعری کا مقابلہ کر سکتی ہے نئی روشنی والے حضرات کے دل میں دقیانوسی خیالات کی وقعت کو قایم کر کے ان کی زبان کی لاج رکھ سکتی ہے قومی و ملکی فوائد سے لبریز ہو کر مصائب کی سپر ہو سکتی ہے وہ بدون شک موخر الذکر طبقہ کا مذاق سخن ہے۔ اس کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں کہ نفیس تخیل یا اعلیٰ مضامین نہ پیدا کئے جائیں یا زبان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں جس کے بغیر فصاحت و بلاغت کا وجود ہی معدوم ہو جائے گا بلکہ ان دونوں خوبیوں کو اعتدال اور اصلیت پر رکھا جائے۔ مضامین کو وسیع کر کے نظم کو ہر قسم کے خیالات کا ارگن بنایا جائے۔ غزل کو بھی دل چاہے تو اس میں بھی وسعت اور تنوع پیدا کیا جائے تاکہ نام کی شاعری در اصل شاعری کہلائے ورنہ شعر کی اُس قوت اصلی سے ہاتھ دھونا پڑے گا جو قوموں کو زیر و زبر کر سکتی، جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی، قبائل میں آگ لگا سکتی، نوحہ سے در و دیوار کو رُلا سکتی اور ایک شعر سے روح کو بیدار اور جسم کے رونگٹے رونگٹے کو لبریز جذبات و حیات کر سکتی ہے۔

غزل گو شعراء کے عذرات

غزل گو شعراء کہہ سکتے ہیں کہ اب نہ شاعری کا کوئی سرپرست، نہ فکر معاش سے فارغ البالی۔ نہ کسی قسم کی مالی منفعت کی امید، نہ قدر و اعزاز کی چاٹ۔ پھر قوم کے مذاق قدیم کے مطابق ایک آسان نظم (غزل) کو چھوڑ کر دوسرے مضامین کی الجھنوں میں کیوں پھنسیں جس سے نہ دوسرے خوش ہوں نہ داد ہی کا صلہ ملے جو موجودہ شاعر نوازی کا منتہائے نظر ہے۔ اس کے علاوہ جمہوری حکومتوں کے شعراء کا نقطۂ نظر بھی شخصی حکومتوں کے شعرا سے متباین ہوتا ہے۔ وہاں جو کچھ کیا جاتا ہے قوم کو فائدہ پہونچانے یا اپنا کمال منوانے کے واسطے بدون طمع کیا جاتا ہے۔ یہاں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض ایک ممدوح کو خوش کرنے اور ذاتی منفعت کے واسطے ان سب کے قطع نظر زبان اُردو کی کم مائگی بھی غزل کے سوائے دوسرے مضامین کے لئے

الفاظ کا ذخیرہ پیش کرنے سے مجبور رہے۔ روزمرہ و محاورات کا استعمال بھی غزل ہی میں خوب نبھ سکتا ہے۔ مجالس کے گرمانے کے واسطے بھی غزل ہی مناسب ہے جس سے ادبی و معاشرتی خدمت بخوبی ادا ہو سکتی ہے۔ متقدمین نے غزل ہی کے ذریعہ سے دنیائے ادب کو مسحور کر رکھا ہے۔ اس لئے ان کی شاہراہ سے علیحدہ ہو کر دوسرے راستے ... ہونا قدما کی نسبت سوء ادبی و بدگمانی کا مرادف ہے۔

مندرجہ بالا وجوہ شعرا کو غزل کی زنجیر کھینچنے پر ثابت قدم کئے ہوئے ہیں جو کھنچتے کھنچتے اکثر جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر ... رہ ہو چکی ہے۔ لیکن مختلف گروہ ابھی زور آزمائی پر تلے ہوئے ہیں اور وہ دن قریب آ پہونچا ہے کہ وہ بالکل فرسودہ ... ریزہ ریزہ ہو کر اس قابل بھی نہ رہے گی کہ کوئی شخص اٹھا کر دیکھ سکے۔

جواب | حضرات! ذرا غور فرمائیے کہ یہ معذوریاں کہاں تک درست ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بادشاہ نے تمام شعرا کی سرپرستی کی یا کسی شاعر نے بغیر حمایت بادشاہ کے ترقی نہیں پائی۔ سلاطین نے معدودے چند شعرا کو اپنا آلۂ تفریح پا کر ... لیکن نتائج اکثر و بیشتر افسوسناک رہے۔ انشا کا حشر معلوم ہے۔ فردوسی کی شاعری محمود غزنوی کی سرپرستی کی رہین منت نہیں۔ غالب و میر فارغ البالی کو ترس ترس کر رخصت ہو گئے۔ بندگان انعام ممدوح کے ہاتھ اپنے جوہر حریت ... کو فروخت کر کے زبان کی کیوں کر خدمت کر سکتے ہیں اور نہ سال کے چند مقررہ مدحیہ قصائد ہی سے شاعری فروغ پا سکتی ہے۔ عرب و یورپ میں تو ملازمت سلاطین کا سلسلہ ہی نہ تھا۔ ہاں تو قوم کی پسند ہی بہترین صلہ تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے شعرا نے بادشاہوں کے دربار سے زندگی جاوید نہیں پائی بلکہ قوم کی پسند عام اس کے لئے چشمۂ حیات ثابت ہوئی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ شاعری کے واسطے طمع سے زیادہ کوئی شے بیخ کن ثابت نہیں ہوئی۔ سعدی و حافظ کی شاعری ... بادشاہ کی سرپرستی سے داغدار نہیں ہے۔ اصلی شاعر وہی ہے جو ہر طرح آزاد ہو اور اگر بغیر طمع کے شاعری ناممکن ... تو ثابت کرنا پڑے گا کہ آپ کے ملک میں حالی اکبر و اقبال کن بادشاہوں کے ظل حمایت کے پروردہ ہیں جنھوں نے اپنے ممتاز دماغ سے بچہ بچہ کو مسحور کر رکھا ہے۔ پھر اگر قوم کا بگڑا ہوا مذاق غزل ہی تک محدود ہو گیا ہے تو اس میں زیادہ تر عادت کو دخل ہے۔ آپ ہی حضرات نے خوگر تغزل بنا دیا ہے۔ ورنہ جس قسم کی نظم کو فروغ دیا جائے گا پبلک بہت جلد اس سے مستفید و خوگر ہو جائے گی۔ اور چونکہ جدت مطابق زمانہ ہوگی اس لئے داد کا نمبر بھی غزل کی داد سے کہیں زیادہ ہو جائے گا۔ کس قدر قابل افسوس ہے کہ آپ محض داد کی خاطر شاعری کی جان کاہ تکالیف برداشت کریں اور

ایک رکیک وخود غرضانہ جذبہ پر اپنی دماغ سوزی وحریت کو بھینٹ چڑھادیں۔ واہ واہ کے الفاظ سے آپ کی کیا عز
کشائی ہو سکتی ہے جب کہ قوم و زبان دونوں تشنہ کامی سے دم توڑ رہی ہوں۔

جمہوری سلطنت کا سوال بھی بے جا ہے کیوں کہ ہندوستان میں اس قسم کی کامل آزادی حاصل ہے۔ سعدی
نے تو شخصی حکومتوں میں رہ کر آزادی کا اس طرح ڈنکا بجایا کہ جمہوری حکومتوں کے شعرا بھی آج تک ناز کرتے ہیں آپ
شاعری کا مطمح نظر کسی ایک ممدوح کو بنانا کیوں ضروری خیال کرتے ہیں۔ کیا قوم آپ کے تخاطب کے شایاں نہیں

اُردو کی کم مائگی کا سوال بھی بے جا ہے۔ اب تو نیر البلاد **حیدرآباد** میں بفضلہ تعالےٰ **فخر ملک و ملت**
تاجدار اسلام ملجائے انام حضور نظام خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے عہد برکت مہد میں اردو یو
کے قیام اور گراں پایہ دارالتراجم و تصانیف کے اہتمام نے زبان میں وہ قوت لازوال پیدا کردی ہے کہ اس قسم
و گمان بھی حماقت سے کم نہیں۔ لغات کی ایجاد تازہ نے مغربی معدن سے ایسے جسم زیب زیورات تیار کئے
کہ عروس شاعری غزل کے تنگ و تاریک گوشہ میں اب کم مائگی کے دوامی خوف سے آزاد ہو کر کسی طرح روپوش نہ
رہ سکتی۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے قدیمی اصول اور سالقہ محاورات کی سخت پابندی سے زبان روز
بجائے ترقی کے ایک تنگ ترین غار میں گرتی چلی جارہی ہے۔ اور یہ عجیب تر ہے کہ اس وقت اُردو نثر نہایت
رفتاری سے منازل ترقی کو طے کر رہی ہے ایسی حالت میں کہ روح ادب یعنی شاعری رجعت القہقری کے مرض
میں مبتلا ہے جس سے شعرا کی غفلت ولاپرواہی کا دردناک منظر ایک ناظر کے دل کو بغیر تڑپائے نہ
چھوڑ سکتا۔

لہٰذا اگر آپ کو قوم اور زبان کی خدمت کا سچا ذوق ہے تو ضرورت کے مطابق مختلف اصناف سخن کی طر
توجہ کیجئے۔ کبھی کبھی غزل لکھئے تو اس میں بھی وسعت پیدا کیجئے۔ صنائع بدائع بے تکلف ہوں۔ قافیہ و ردیف کی قیود
آسانی ہو۔ بحر مطابق نظم اور محاورات کا سلیقہ سے استعمال ہو۔ استعارات ہوں تو قریب کے نیچرل شاعری ک
ڈالئے۔ مبالغوں کی بجائے سادہ اور پُرجذبات نظم کا رواج دیجئے۔ عشق کا دائرہ وسیع کیجئے اور شاہد بازی کی
جائز اور وسیع محبت کا اعلان کیجئے کیوں کہ اگر جذبات اصلی اور پُرجوش ہوں اور نظر میں سرمایۂ عبرت ہو تو ذ
میں سوز و گداز کا مصالحہ مل سکتا ہے۔ مے خواری اور زاہدوں پر تاڑ کا زمانہ نہیں ہے وہ صوفیا کے ساتھ مخصو

تھا۔ آپ کو اہل شرع سے کیا عداوت ہے جس کا انتقام لینا ضروری ہو۔ غرض حسب تحریر بالا مناسب ترمیم کی سخت ضرورت ہے۔

مصرع طرح | غزل کے بعد مصرع طرح کا تعین بھی قابل غور ہے جس سے قافیہ ردیف بحر و وزن کی قید سخت دقت پیدا کرتی ہے۔ میرے نزدیک کسی قدرتی منظر کا فوٹو یا واقعات تاریخی و اسلامی اور مختلف جذبات و ... ت کے عنوانات دیئے جائیں اور شاعر کو قافیہ و ردیف و بحر کا کامل اختیار دیا جائے کہ اپنی پسند کے مطابق انتخاب کرے۔

حضرات! میری یہ آواز نئی نہیں ہے بلکہ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما ... ولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اس ارادہ کی اشاعت کے خیال سے ایک مفید ترین مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی جو ہندوستان ... پنی نوعیت کا پہلا مشاعرہ تھا۔ اس مشاعرہ میں کسی مضمون کا عنوان شعرا کو دیا جاتا تھا اور یہ اختیار تھا کہ جس نظم ... میں لکھیں لیکن افسوس کہ اس تحریک کو موصوف کی عدالت و انتقال نے ایسا ناقابل تلافی نقصان پہونچایا کہ طوفان ... میں مخالفت شعرا کے سیلاب سے یہ نو تعمیر کشتی بغیر ڈگمگائے نہ رہ سکی۔ تاہم جن شعرا نے زمانہ کی ہوا کا رخ دیکھ کر پی ... تی کے لئے اس حقیر کشتی کو کشتی نوح سمجھا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ اب وہ بادبانی کشتی دخانی جہاز کی صورت میں کس طرح منتقل ہو کر ... موجودہ ترقی ادب کی عالمگیر دوڑ میں سب سے پیش پیش ہے جس کے ممتاز ناخدا علامہ سر اقبال اور ان کے کشتیبان ... ہیں۔

(۲) ترتیب نشست و قرأت

ترتیب کی شکایت بھی مشاعروں میں بہت عام ہو چکی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض معمولی شعرا ذاتی اثر اول وقت جگہ ... پر قابض ہونے کی وجہ سے صدر کی قربت پر کامیابی حاصل کرتے ہیں اور آخر میں غزل پڑھ کر استادوں کی صف میں شمار ہوتے ہیں بعض اعلیٰ درجہ کے شعرا افلاس یا کمی اثر کی بدولت مبتدیوں کی صف میں بمشکل باریاب ہو سکتے ہیں۔ پڑھنے کا کوئی نمبر نہیں ہوتا اس لئے اکثر شعرا صف اول کے پیچھے سامعین کی غیر مرتب صفوف میں منسلک ہو کر شمع سامنے آتے ہی افتاں و خیزاں پروانہ وار ٹوٹ پڑتے ہیں مصیبت یہ کہ شمع کی پیش قدمی کا خوف ہر شاعر کو سبقت قرأت پر مجبور کرتا ہے۔ اور ایسی حالت میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مقولہ صادق آ کر اس تنازع للقرأت کو خود بخود فیصل کر دیتا ہے۔

میرے نزدیک ہر شاعر کی شہرت سخن اور مختلف کلاموں سے قابلیت کا اندازہ لگاکر منجانب صدر نمبر قائم ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شخص باجازت صدر نمبروار پڑھ کر دوسروں کو شکایت کا موقع نہ دے نمبر قایم کرنے کے واسطے مشاعرہ سے قبل صدر کو کامل جانچ کے بعد ہر شاعر کا نمبر ایک فہرست میں درج کرلینا چاہیے تاکہ وقت پر سہولت ہو اور باری باری سے صدر یا نائب صدر شاعر کا نام لے کر پڑھنے کی اجازت دے۔ کوئی غیر مشہور نیا شاعر کسی ایک نظم کے عمدہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ نمبر ترتیب حاصل نہیں کرسکتا جب تک دوسری نظموں سے اُس کا تفوق ثابت نہ ہو کیوں کہ اس صورت میں اکثر ایسے مبتدی بھی قابل ترجیح ثابت ہوں گے جو اتفاقاً احباب کی امداد سے نظم کی تیاری میں کامیاب ہوکر اپنی مستعار قابلیت سے شہرت کا مستقل فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ نشست کی ترتیب بھی نمبر قرات کے ساتھ ہو تاکہ شمع کی گردش بخط مستقیم صحیح رفتار پر جاری رہے اور تمام تنازعات کا سد باب ہو جائے۔ چنانچہ شاہی مشاعروں میں ترتیب نشست و قرارت کا برابر انتظام تھا۔ تمام شعرا صف اول میں بالترتیب جگہ پاتے اور صدر کی اجازت پر نمبروار کلام سناتے تھے۔

(۳) طرزِ شعر خوانی

بالعموم مشاعروں میں شعر پڑھنے کی طرز تحت اللفظ کی تسلیم کر لی گئی ہے جو خیالات پر اس قدر حاوی ہے کہ کی اچانک ترقی بھی مورد لعن وطعن بننے سے باز نہ رہ سکی۔ میرے نزدیک ادنیٰ غور سے فریقین کا تنازع رفع ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں فریق اپنے اپنے کلاموں کو پُر تاثیر بنانے کے واسطے اپنی حسب پسند آلۂ اظہار سے کام لیتے ہیں جن میں کوئی حرج نہیں البتہ ترنم تحت اللفظ سے شعر کے لئے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ شعر کو موسیقی اور موسیقی کو شعر سے ایک رابطۂ خاص اور نسبت تامہ ہے۔ حتیٰ کہ بعض محققین نے موسیقی کو بھی تعریف شعر میں داخل کر دیا ہے۔ اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ تحت اللفظ کے ساتھ ہاتھ نچائیں۔ رانیں پیٹیں۔ ڈاڑھی نوچیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی غرائیں کبھی گھگیائیں۔ کہیں آواز تحت الثریٰ میں غائب کہیں چیخوں سے آسمان سر پر اُٹھائیں اور فن خطابت کا کمال ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے ایکٹ موشن کے جوہر دکھائے جائیں اور محض تاثر کی خاطر یہ سب جائز و مستحسن ہوں لیکن اگر کوئی شخص ترنم یا زمزمہ سے سامعین کو متاثر کرے اور ان تمام لغو حرکات سے کنارہ کشی کرے۔ تکرار مصرع کی مصیبت سے دوسروں

کو نجات دے تو ایک جدید شے ہونے کے الزام سے ناجائز قرار پائے۔ میرے نزدیک شعر کا اثر موسیقی سے بدرجہا زیادہ ہو جاتا ہے۔ تحت اللفظ پڑھنے والوں کا یہ اعتراض کسی طرح قابل التفات نہیں کہ ترنم کی وجہ سے معمولی اشعار کی داد بھی بخوبی مل جاتی ہے جو انھیں باوجود ایڑی چوٹی کے زور کے میسر نہیں ہوتی۔ حالاں کہ شعر کے موثر بنانے میں حضرات ان سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ یہ اپنی کڑک سے زمین و آسمان کو ملائیں۔ ایکٹ موشن سے پوری نقالی کریں لیکن کسی کو موقع دم زدن نہیں۔ حالاں کہ جب شعر کو محض سادہ طریقہ سے نہ پڑھا گیا تو موثر بنانے میں دونوں کی حالت یکساں ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ انیس و دبیر کے مرثیوں کا ورثہ قارئین نظم کے واسطے دو صورتوں میں منقسم ہوا۔ پردرد اور مختصر نظموں کا تعلق ترنم سے رکھا اور طویل نظموں کے واسطے تحت اللفظ کی طرز اختیار کی کیوں کہ طویل اور شجاعت آمیز نظموں کے واسطے یہی زیادہ مناسب تھی چوں کہ شاعری بھی چاروں طرف سے سمٹ کر لکھنؤ کی چار دیواری میں محدود ہوئی اس لئے شعرائے لکھنؤ نے تحت اللفظ کو آسان سمجھ کر رواج عام دے دیا۔ یہ امر بھی تعجب سے خالی نہیں کہ ترنم جدید طبقہ کی ایجاد ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں اشعار پڑھنے کی طرز ایک مخصوص لحن سے خالی نہیں ہے خواہ یورپ ہو یا ایران عرب ہو یا افغانستان۔ ابو الآباء شاعری رودکی جو موجد غزل ہے ہمیشہ ترنم سے سامعین کو مسحور کرتا تھا۔ فردوسی کا رازی ابو دلف ترنم ہی کے واسطے مخصوص تھا۔ شعرائے عرب کے نزدیک اور خود شعرا ترنم ہی کے دل دادہ تھے۔ حضرت امیر خسرو رح کی شاعری کا سکہ موسیقی ہی کے ہاتھوں جما تھا بہادر شاہ کی غزل ۱۲۶۱ھ کے مشاعرہ میں خواص سنے گا کر پڑھی تھی۔

اس تقریر سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب ترنم ہی سے پڑھیں بلکہ اعتراضات باہمی سے محترز رہ کر اپنی حسب پسند کسی ایک طریقہ کو اختیار کر لیں ورنہ اہل ترنم کہہ سکیں گے کہ اگر ہمارا طریقہ گا کر لبھاتا ہے تو یقیناً دوسرا طائفہ ناچ کر گرویدہ کرتا ہے۔

اس موقع پر میں اپنی ناچیز رائے بھی بغیر پیش کئے نہیں رہ سکتا کہ درد و سوز۔ رنج و فراق، مسرت و عیش۔ نوحہ و ماتم امید و یاس۔ شوق و انتظار وغیرہ کی نظموں میں ترنم زیادہ کارگر ہو سکتا ہے اور رزم۔ شجاعت و قصائد کے پڑھنے میں تحت اللفظ زیادہ موثر ہے۔ اس لئے میں ان دونوں صورتوں کو اپنی اپنی جگہ پر مندرجہ تقسیم کے موافق مستحسن سمجھتا ہوں۔

---

(۴) تکرار مصرع

عام رواج ہے کہ مشاعرہ کے ابتدائی دو تین گھنٹوں میں گرمئ بزم کی خاطر با آواز بلند تیس چالیس شاعر یک زبان
مصرع ادنے کی تکرار کرتے ہیں جس کو باصطلاح مشاعرہ "مصرع کا اُٹھانا" کہا جاتا ہے۔ وجوہ یہ کہ ہر شخص بآسانی سن کر
مصرع کے وزن اور صحت و سقم کا بخوبی اندازہ کرلے اور پڑھنے والے کو بھی قدرے وقفہ مل جائے۔ لیکن یہ صورت دو
گھنٹے جاری رہ کر تکان سے تمام جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دیتی ہے حتیٰ کہ آخر میں استادوں کے مصرعے بھی اُٹھ سکتے
نہیں اُٹھتے۔ تکرار مصرع کا رواج نہ ایران میں ہے نہ شاہی وقت کے کسی قدیمی مشاعرہ میں اس کا پتہ چلتا ہے اس
میں شک نہیں کہ آخر زمانہ کے ترقی شعر کی اصلاحی جدت ہے اور لطف یہ کہ غرض ایجاد بعد غور بھی سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ
تکرار میں معتد بہ وقت کے فضول ضائع ہونے کے علاوہ تمام حاضرین کے سُنانے کا اصول بھی غلط ہے۔ صرف ایک
مصرع کے سُنانے سے کیا فائدہ متصور ہو سکتا ہے جب کہ دوسرا مصرع خود شاعر ہی پڑھے۔ اگر تکرار مصرع کا وزن
چیخوں سے پورا کیا جاتا ہے اور نہ پڑھنے والے کو چند منٹ میں ایسی تکان ہی ہو جاتی ہے جس سے قدم قدم پر وقفہ کی ضرورت
محسوس ہو بلکہ پڑھنے والا خود اپنے ذوق کو اس دخل در معقولات سے کھو بیٹھتا ہے۔ اس کے ترک سے وقت بھی کم
صرف ہوگا جلسہ کی تہذیب اور شان بھی قائم رہے گی۔ کلام کا لطف بھی دوبالا ہوگا اور فعل عبث سے بھی نجات ملے گی
رہی اسقام کی جانچ، اس کا حق صدر مشاعرہ کو حاصل ہے عوام کو زیادہ گلا پھاڑنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) داد کلام

داد سے مراد کسی شعر کی جائز تعریف کا اظہار ہے تاکہ شعر کی خوبیوں کے اظہار سے دوسرے بھی مطلع ہو جائیں
اور شاعر کی جاں کاوی کا اعتراف ہو تاکہ ہمت افزائی کوشش مزید کا موقع دے۔ داد میں نہ صرف نعرہائے تحسین بلند
کئے جائیں بلکہ اس کے جوہر حسن کر ان خاص اوصاف کی طرف اشارہ کریں جو عوام کی نظروں سے مخفی ہوں اس کے ساتھ
ہی یہ لحاظ بھی رہے کہ غیر مستحقین کی بے جا تعریف نہ کی جائے تاکہ مستحقین کی دل شکنی اور کسرِ شان نہ ہو۔ اب مشاعروں
کی مروجہ داد پر بھی نظر ڈال لیجئے جس سے عجیب و غریب مناظر پیش نظر ہوں گے۔ یہاں حصول داد کی خاطر بسا اوقات کثیر

زحمتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں بعض حاتمۂ احباب کی وسعت اور بعض منصب و ثروت کے اثر سے کامیاب ہوتے ہیں۔
بعض ووٹ دہندوں کی طرح داد دہندوں کے توڑنے میں بہت سا وقت برباد کر دیتے ہیں کہیں ایک استاد کا اکھاڑا
دوسرے اکھاڑے کے مقابلہ میں اپنے ہر سورما کی واہ واہ کرتا ہے بعض شعرا "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"
عمل کر کے ہر شخص کے کلام کی داد دیتے ہیں اور اپنا کلام سنانے کے بعد ہر طرف نظریں چاٹ چاٹ کر دیکھتے ہیں تاکہ ہل جزائ
الاحسان اِلّا الاِحسَان" کے مطابق خراج تحسین وصول کریں۔ غرض داد کا چسکا بھی عجیب ہوتا ہے جو نئے نئے طریقۂ وصول
پہ مجبور کرتا ہے

داد کے الفاظ خوب! بہت خوب! کیا خوب!! واہ واہ۔ واہ واہ۔ بہت اچھا شعر ہے! کیا شعر ہے! قلم توڑ دیا!
بس ایک ہی شعر ہے! قافیہ ختم ہو گیا! کیا بات ہے؟ سبحان اللہ! پھر فرمائیے۔ مکرر فرمائیے۔ Once more کیا کلام
ہے۔ غضب کر دیا! وغیرہ ہیں۔ خواہ ان کو کلمات تحسین سمجھ لیجئے یا الفاظ داد۔ داد سے مراد تو محاسن کی تشریح تھی جو ہر ایک
کا حصہ نہیں لیکن اس دورِ انحطاط میں اسی کو داد سمجھ لیجئے کیوں کہ سخن فہمی سخن گوئی سے زیادہ مشکل ہے بعض موقعوں پر داد
کا وہ ہڑبونگ ہوتا ہے کہ بزم سخن مرغ کی پالی یا گزری سے کم نہیں ہوتی۔ جب کوئی شعر اچھا پڑھا جاتا ہے تو چاروں طرف
کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ لطف یہ کہ سخن حضرات بھی منھ سے روئی نکال کر ایسی چیخیں لگاتے ہیں کہ
یقیناً دیوانگی کا شبہ ہو کر اکثر مہذب حضرات کو خندۂ زیر لبی پر مجبور کر دیتا ہے بالخصوص کالجوں میں تو اس ہنگامۂ بے تمیزی
کے شور کی رہی سہی کمی کو سیٹیاں پورا کر دیتی ہیں۔ پڑھنے والا بھی خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور بیچارہ بدحواسی میں گھٹنے
ٹیک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور چاروں طرف نگاہیں اُٹھا اٹھا کر طوفانِ تسلیم کے مد و جزر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بعض شعرا کو داد
کی ایسی چاٹ ہوتی ہے کہ بیچارے اپنے مال کی خود تعریف کر کے شعر کی طرف متوجہ کرا دیتے ہیں اور یہ تو لازمی ہے کہ ہر معمولی
شعر کے ختم کرنے کے بعد بھی باُمید داد ہر شخص کو للچائی نظروں سے دیکھ دیکھ کر ملتجیٔ داد ہوتے ہیں۔ آخر کسی غریب کو رحم
آ ہی جاتا ہے اور کیا خوب کی آواز بھی زیر لب ہوتی ہے کہ احسان کا بدلہ جنبش لب سے پہلے ہی دو تین تسلیموں سے
پیش کر دیا جاتا ہے۔ بعض طرحی کلام سے اگر کامیاب داد نہیں ہوتے تو اپنی عمر بھر کے منتخب کلام کو غیر طرحی صورت میں
پڑھ کر داد کی کمی کو پوری کرا لیتے ہیں۔

میرے نزدیک اصلی داد ایک قابل صدر ہی کی ہو سکتی ہے جو ہر نظم کے آخر میں مختصراً مناسب ہو اور مفصل ریمارک

مطبوعہ رسالہ میں ہر غزل کے بعد کافی ہو سکتا ہے۔ نعرہ ہائے تحسین کا انسداد اگرچہ ناممکن ہے لیکن اگر سامعین جلسہ کی تہذیب کو قائم رکھنا چاہیں تو تناسب پر عمل ضروری ہے۔

(۶) گردشِ شمع

یہ مبارک شمع بھی قدامت کی قابلِ قدر یادگار ہے حتیٰ کہ اگر برقی روشنی کی افراط شمع کی روشنی کو ماند کر دے تب بھی شمع ضرور ہوگی۔ اور زمانہ کا تمدن شمع کی جگہ لیمپ کو دیدے تب بھی نام شمع ہی رہے گا۔ تتبع سلف کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کا تعین ہو جاتا ہے لیکن یہ بھی دو زحموں سے خالی نہیں۔ ایک یہ کہ شمع اٹھانے اور رکھنے کے واسطے ایک آدمی کو خاص کرنا پڑتا ہے دوسرے ایک ہی صف میں جہاں سامعین و قارئین پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں وہاں سامعین کے سامنے شمع آکر اُن کو عرق خجالت میں غرق کر دیتی ہے۔

میرے نزدیک اگر وسط میں صدر کے بالمقابل ایک خاص جگہ پڑھنے والے کے واسطے معین ہو جائے خواہ کرسی پر یا چھوٹے سے پلیٹ فارم پر جس پر روشنی بھی کافی ہو تو تمام دقتیں رفع ہو سکتی ہیں۔ نہ عدم سماعت کی شکایت ہوگی نہ ترتیب نشست کا نزاع باقی رہے گا نہ شمع کو گردش میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ نہ سامعین کی خفت کا موقع رہیگا اور صدر کی قربت کا نزاعی مسئلہ بھی خود بخود طے ہو جائے گا۔

(۷) وقتِ مشاعرہ

عموماً مشاعرہ کا افتتاحی وقت ۹ یا ۱۰ بجے شب ہے۔ انتہا تمام شب یا ایک دو شبانہ روز مزید۔ یہ ظاہر ہے کہ تمام رات آنکھوں میں کاٹنا اور شور و غوغا سے کانوں کا آزردہ ہونا سب کے لئے شاق ہے۔ اگر مشاعرہ اتفاق سے ایک ہی شب میں ختم ہو جائے تب بھی آخر شب میں ضرور بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اول شب میں ۸ بجے سے شروع ہو کر زیادہ سے زیادہ ۱۲ بجے تک ختم ہو جانا چاہیئے۔ جس قدر کلام باقی رہے سلسلہ وار شب کے ان ہی مقررہ اوقات یا دن کے فرصت کے حصوں میں جاری رہے تو مناسب ہے۔ مقامی شعرا روزانہ شرکت کر سکتے ہیں۔ غیر مقامی حضرات کو اگر بارِ صرف کا اندیشہ ہو یا قیام سے معذور ہوں تو اول شب میں موقع دینا چاہیئے کیوں کہ مشاہیر

ہو کلام ابتدا میں ناجائز نہیں ہے بلکہ شاہی مشاعروں میں تو صدر اور بہترین شعرا کا نمبر اول ہی رہا کرتا تھا۔ عوام کی دلچسپی کے لئے مقامی شعرا اور صدر کا کلام کافی ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مقامی شعرا کو ان کا نمبر مقرر کرنے کے بعد اسی دن مدعو کرنا چاہیے جس میں ان کے کلام کی باری ہو۔ میرے نزدیک اس تحدید وقت میں حاضرین بھی تکلیف ما لا یطاق سے نجات پا سکتے ہیں اور بزمِ سخن بھی سرگرمی سے خالی نہیں رہ سکتی۔

(۸) فرائضِ صدر

بالعموم جناب صدر کوئی مشہور شاعر ہوتے ہیں اور بعض موقعوں پر شاعری کی قید بھی اڑ جاتی ہے صرف کوئی اضافی شہرت اس خانہ پُری کے لئے بہت کافی خیال کر لی جاتی ہے۔ صدر صاحب مسندِ صدارت پر قدم رکھتے ہی کہنی تکیہ پر رکھ، ہاتھوں کو ستونِ زنخ بنا کر نیم دراز ہو جاتے ہیں۔ پانوں کی گلوریاں چبانے اور توے کے خوشبودار حقے کے شیریں کش لگانے کے واسطے مہیا رہتی ہیں۔ کسی شعر پر زیادہ ہڑ مچا تو انھوں نے بھی کیفیت استغراقی سے آنکھیں کھول کر واہ وا کر دی۔ کلام سنانے کا موقع آیا تو کبھی طرحی کلام پڑھ دیا اور داد کی کمی رہی تو غیر طرحی کلام جو تمام شاعری کا جوہر ہوا پڑھ کر سُنا دیا اور اس حکمت عملی سے فرائضِ صدارت کی لاج رکھ لی۔ جلسہ کا انتظام مہتمم کے سپرد ہوتا ہے اس لئے صدر مشاعرہ کو عضو معطل کی طرح رکھنا معنی صدارت کو شرمندہ کرنا ہے۔ اگر صدر اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کرے تو مسندِ صدارت کی رونق افروزی ہر کس و ناکس کو دشوار ہو جائے۔ میرے نزدیک صدر کے فرائض حسب ذیل ہو سکتے ہیں:-

فرائض صدر سے پہلے میں مسئلہ انتخاب پر بھی قدرے روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں۔ چوں کہ اس بارہ میں مہتمم جلسہ کی رائے کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کا انتخاب چند مشہور شعرا کی علٰحدہ انجمن میں مشاعرہ سے قبل طے کر لیا جائے اور انتخاب میں اس کا لحاظ رہے کہ وہ شخص صدر ہو باعتبار شاعری تمام حاضرین سے بہتر ہو۔ عروض سے کامل طور پر واقف ہو۔ ہر شخص کے کلام کے آخر میں ذاتیات سے برکنارہ ہو کر ایسی مناسب اور مفید تنقید کرے جس کی واقعیت سے بر نصف مزاج کو مخالفت کا موقع نہ ملے۔ اصلی داد اور تنقید بعد غور و خوض تحریری ہو سکتی ہے جس کا انطباع رسالہ میں ہر شخص کے کلام کے تحت میں ہو۔ افتتاح مشاعرہ سے قبل کلام دیکھ کر بر بنائے شہرت کلام نمبر قایم کرے اور بالترتیب ہر شاعر کو پڑھنے [illegible] ترتیب سے کہ جو شخص [illegible]

اس کا کلام نمبر اول پر دیج کرے۔ اسی طرح آخر تک لحاظ مرعی رہے۔ اگر کسی معمولی شعر پر کافی نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے ہوں تو اپنی رائے کے ساتھ درج کرے۔ مشاعرہ میں غیر مناسب اور ذاتی حملوں کے کلام کو روک دے۔ اور ہر طرح نظم کو قائم رکھے۔ جس کام میں امداد کی ضرورت ہو اپنے نائب سے لے نشست میں شعرا کی صف کو ممتاز رکھنا چاہیئے جس کا نمبر اول ہے اعلیٰ درجہ کی نظم پر بشرط استطاعت انعام مقرر کرے اور چند شعرا کی کمیٹی سے کلام منتخب کر کے انعامات کا اعلان کرے تاکہ عوام کو رغبت، انجماد میں حرکت، زبان میں وسعت اور بدنظمی میں قدرے ترتیب پیدا ہو۔

سب سے آخر میں اپنے بزرگوں سے باادب معافی چاہتے ہوئے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرا مقصود مشاعرہ کی مخالفت نہیں ہے۔ میں شعرا کی کثرت اور مشاعروں کے مفید ہونے کا معتقد ہوں لیکن اس قدر استدعا ضرور کروں گا کہ مشاعروں کی بدعنوانیوں پر نظرِ غور فرما کر بجائے مخالفت کے کام کی اہمیت پر توجہ فرمائیں اور ان کو ہر طرح مفید بنا کر زمانہ کی رفتار کے ساتھ تدریجی ترمیم کی ضرورت پر غور فرما کر مصروف عمل ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ میری حقیر آواز قابل توجہ ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

محمد علی خاں اثر

مقولات

(۱) خدا اپنے داہنے ہاتھ میں سچائی، اور بائیں ہاتھ میں ہمیشہ سچائی کی طرف بڑھنے والا دل لے کے لوگوں میں غلطی کا پتلا ہوں لیکن وہ اگر مجھ سے کہے مانگ لے، میں عاجزانہ اس کے بائیں ہاتھ کی طرف جھک کر کہوں "اے مالک مجھے یہ دیدے۔ سچائی صرف تیری ذات کے لئے ہے۔" (جی ای لینگ)

(۲) وہ انسان عقلمند نہیں جو اپنی قابلیت سے زیادہ کام کرنے کی ہمت نہ کرے۔ (سر ہمفری ڈیوی)

عبدالواحد رشاد

باقیاتِ فانی

دل وقفِ تپش ہے، ہائے مگر وجہِ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں، مگر کیوں بسمل ہوں، فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

کس زعم میں ہیں اے رہروِ غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے، اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ واہمہ تھا یا مشکل تھی، کیوں میں نے کہا کیا نادم ہوں
وہ پوچھتے ہیں کیا مشکل ہے، کیا کہیے کہ مشکل کوئی نہیں

بس اُن پہ نہ اُن کی یاد پہ ہے، تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں
تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں، تدبیر سے غافل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے، یوں نام کا ساحل کوئی نہیں

کیا شیشہ و ساغر، بادہ و ساقی، گل اور شمع سے قطعِ نظر
محفل میں یہ رونق کس کی ہے، جب صاحبِ محفل کوئی نہیں

خود حسن کمالِ حسن ہے، یعنی حسن جہاں ہے کامل ہے
اور عشق تمامِ عشق ہے، یعنی عشق میں کامل کوئی نہیں

جلوہ غیب شہود ہے، پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے، نظارہ میں شامل کوئی نہیں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو، پھر فرقِ مجاز و حقیقت کیا
یہ عرضِ حقیقت ہے وہ حقیقت، ہستیِ باطل کوئی نہیں

فانیؔ ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

فانی
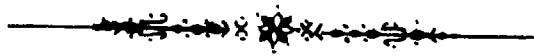
جذبات

ترے جلوے نے بے خود کردیا ہے روبرو ہوکر
پھریں میرے لئے اب ہوش گرمِ جستجو ہوکر

وہ نازک بات جو حاصل نہ تھی بارِ تکلّم کی
تری آنکھوں نے کہہ دی بے نیازِ گفتگو ہوکر

مرا خونِ تمنّا رنگ لایا بھی تو کیا لایا
رُخِ قاتل میں جھلکا ہے خجالت کا لہو ہوکر

مری مردہ تمنّاؤں میں محشر کر گیا برپا
وہ ناوک جو جگر سے پار نکلا سُرخ رو ہوکر

کبھی مانندِ موج اک جزوِ دریائے حقیقت تھا
میں ڈوبا خود، اسیرِ امتیازِ ما و تو ہوکر

پسِ مردن بھی میں نے تجھ کو کس کس رنگ میں ڈھونڈا
کسی جا رنگ و بو ہوکر کہیں جام و سبو ہوکر

مرے قاتل ترے ہاتھوں کے صدقے، چھوڑ دے قبضہ
کہ شعلہ بن گیا خنجر ہم آغوشِ گلو ہوکر

مرا خونِ تمنا حاصلِ کشتِ تمنا ہے
یہ وہ حاصل ہے جو حاصل ہوا دل کا لہو ہوکر

وفورِ ناتوانی سے یہ اپنا حال ہے غازیؔ
کہ رہ جاتی ہے عرضِ آرزو بھی آرزو ہوکر

شفیق احمد غازیؔ

حسیات

جذبۂ غم اور اس کی عدم معنویت

نپولین نے اپنی قوت عزم وارادہ یا کامرانیوں کے تحت "ناممکن" کے لفظ کو "لغات" سے خارج کر دینے کا مشورہ دیا تھا مگر چونکہ قوت ارادیہ اور تجربات زندگی کے نتائج ناقابل تغیر نہیں ہوا کرتے اس لئے خود نپولین جیسے شخص کو بھی دنیائے عمل کے سامنے اپنے الفاظ واپس لینے پڑے۔ اسی طرح آج میں بھی ایک لفظ کو "بے معنی" کہنے کی جرأت کرتا ہوں مگر چونکہ وہ ذہنی کاوشوں کا زائیدہ ہے اس لئے جب تک ذہنی احساسات کی اہمیت اور واقفیت دنیا کی نظروں سے فنا نہیں ہوتی میرے نظریہ سے بھی گریز نہیں کیا جاسکتا۔

جذبۂ حزن وملال کی گہرائیوں میں کیا کوئی فلسفیانہ واقعیت، صداقت اور حقیقت مضمر ہے؟ میری نزدیک اس کا جواب نفی کے سوا کبھی اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ غم محض اضمحلال ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ کی ذہنیت معنویت پذیر ہے آپ کے قوائے عمل جوش وولولہ سے معمور اور آپ کی پاک روح تنویراتِ سماویہ سے جگمگا رہی ہے تو تمام مؤثرات کونیہ آپ کے اندر کوئی معمولی تاثر بھی پیدا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ انسانی فطرت غم کے نام سے بھی آشنا نہیں ورنہ مذہبی ذہنیت کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "امانت سرمدیہ" کو دیوانہ وار نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔

غم ہماری کمزوریوں کا دوسرا نام ہے اور اس کو بعض نظریات کے زیر اثر نشو ونما دینا دنیائے انسانیت کو موت کے دروازہ پر ایستادہ کر دینا ہے۔

مگر باوجود اس کے شاید یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غم کو دور کرسکنے کی قابلیت بھی غم ہی سے پیدا ہوسکتی ہے ہم اپنے اضمحلالات کا اس وقت تک صحیح احساس جذب نہیں کرسکتے جب تک کہ اُن کی تاریکیاں دل ودماغ کو ظلمتِ شب سے دوچار نہ کر دیں۔ کیونکہ یہ نہ صرف انسانی فطرت بلکہ قانون قدرت ہے کہ اثبات نفی سے وجود پذیر ہو

اور زندگی موت سے ۔ نظریہ تقدیر کی غرض وغایت ان ہی تاریکیوں اور ظلمات کو نورانی کیف میں تبدیل کرسکتا تھا
تاکہ انسانی ترقیات کو غیر محدود فضا میں پرواز کرنے کا موقع مل سکے ۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا کی ناپاک ذہنیت تصو
رنگین رخ دیکھنے کی "زحمت" گوارا نہ کرسکی ۔

منفیت کی تعلیم بھی "نفیٔ غم" یا بالفاظ دیگر اُن تمام موثرات مادیہ سے منفعل نہ ہوسکنے کے لئے جاری کی
گئی تھی جو ہماری روح کو غم کی آلودگیوں سے ملوث کرنے کی استعداد رکھتے ہوں ۔ تاکہ پھر ہم اپنے قوت
کے اہتزازات کو باختیار خود جس مسرت اور فردوسی مسرت کے نقطہ پر چاہیں مرتکز کرسکیں ۔ لیکن علامہ اقبال کی
پرجوش طبیعت اور پُرشور ذہنیت اس نکتہ تک نہ پہونچ سکی اور متصوفانہ منفیت کو "افیون خوردگی" سے منسو
کردیا ۔ الحذر ثم الحذر

غالب کے دو شعر

(۱)

تنگیٔ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

میرے نزدیک اس شعر کی نفسیاتی تحلیل بھی کی جاسکتی ہے اور فلسفیانہ بھی ۔ جن میں سے ہر ایک
جگہہ پر درست ہے ۔

(۱) محبت انبساطی اور انقباضی دونوں قسم کی کیفیات رکھتی ہے ۔ کیوں کہ اس کا "امتیاز جامعیت" اس
لمحہ تک قائم رہ سکتا ہے کہ تمام صفات خواہ وہ باہم دیگر تضاد ہی کی نسبت کیوں نہ رکھتی ہوں اس کے اند
موجود رہیں ۔ لیکن کسی شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ حقائق کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر پہلو کو روشنی میں لائے
اس کے لئے صرف کسی ایک ہی رُخ کی مصوری کافی ہے ۔ چنانچہ غالب مرحوم نے اس ہی "انداز شعریت" کو اختیار
کرتے ہوئے "جذبۂ لطیف" کی محض انقباضی کیفیت یا بالفاظ دیگر "تنگیٔ دل" پر نقد کرتے ہوئے یہ حقیقت
کی ہے ۔ کہ اگر انقباض جو محبت کا اٹل قانون ہے نافذ نہ بھی رہے اور "مشق ستم" کا "خوگر" ہونے کے بعد غیر محسو
بھی ہوسکے تو آخر اس سے کیا فائدہ ؟ کیوں کہ یہ کم بخت تو وہ "کافر" ہے کہ اگر ایک پہلو سے اس کو طمانینت
وسکون بھی نصیب ہوجائے تو دوسرے پہلو سے ضرور مضطرب اور بے چین رہیگا ۔ اگر اس کی ایک کروٹ

۔ بریں ہی رکھ دی جائے تو دوسری کروٹ سے دوزخ کے آتشیں شرارے بھڑک اُٹھیں گے ۔ محبت
انقباضات جو انبساطات ہی کی دوسری شکل ہیں اگر مٹ بھی جائیں تو ناپاک دنیا کی "ظلمت بدوش" پریشانی
رہے گی ۔ اس بنا پر تنگیٔ دل کا گلہ نہیں کرنا چاہیے کہ یہ محبت یا حسنِ دل نواز کا کرشمہ نہیں بلکہ خود انسانی فطرت
ہو رہی ۔ لہٰذا جذبۂ محبت کا شکوہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا ۔ یہ قسمت کا فیصلہ ہے محبت کا نتیجہ نہیں ۔

۲ ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے روزمرّہ اور زبان زد محاورات سے صرف نظر کر سکیں تو لازم و ملزوم ہونے
ہیئت سے تنگی اور محدودیت کو مترادف تسلیم کرنا ہوگا اس ہی معنی کے اعتبار سے غالب انسان کی تنگ نظری
تعبیر بلکہ تحدید وجدانیت یا عارفانہ احساسات کی قلت کو اچھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تنگیٔ دل یا حقائق
سے عدم واقفیت اور انسانی ذمہ داریوں کا احساس کم ہونے پر ہمیں ماتم نہیں کرنا چاہیے ۔ اس واسطے کہ اگر
دنیا اور خود اپنے گرد و پیش، ماضی و مستقبل، ترقی و تنزل، موت و حیات کا اجتماعی اور انفرادی طور پر زیادہ سے زیادہ
درجے سے صحیح علم رکھتے تو زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ۔ انسان کی لاعلمی ہی تو زندگی کی ضامن ہے ۔ جو لوگ جس قدر
کم تر او احساس رکھتے ہیں اتنے ہی وہ خوش ہیں اور جن لوگوں کو جتنا زیادہ علم اور احساس ہے اتنا ہی آپ اُن
کی زندگی کو غم آشنا پائیں گے ۔

بچّہ موت سے واقف نہیں ہوتا اس لئے موت اس کے لیے کوئی ہیبت ناک یا المناک حقیقت نہیں ۔
جو جاہل جنت اور دوزخ کا نام بھی نہیں جانتے ان کو عذاب جہنم کا کیا خوف ؟ جو شخص عالم اسلامی کی مشکلات
ہندوستان میں مسلمانوں کی اندوہناک پوزیشن سے آگاہ نہ ہو وہ حیات اسلامی کے مراحل کی خطرناکیاں
محسوس نہیں کر سکتا ۔ میں نے چند سال پیشتر اس ہی نظریہ پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ

"انسانی اضمحلال تصور ہی اس کی ترقیات اور افعال حیاتیہ کا ضامن ہے"

بس یہی مفہوم ہے جسے غالب نے شعر کے سانچے میں ڈھال دیا ۔ یہ حقیقت اُس وقت زیادہ روشن ہو جاتی ہے
جب کہ تصورات ذہنی اور تأثرات وجدانی کی یگانگت کو پیش نظر رکھا جائے ۔ کیوں کہ کوئی کیفیت ایسی نہیں ہوتی
کہ اس سے دل و دماغ یکساں طور پر اثر پذیر نہ ہوتے ہوں چنانچہ نفسیات عضویاتی کے جدید نظریہ نے اس مسئلہ
کو حقیقت ثابتہ کے درجہ تک پہونچا دیا ہے ۔

یہاں پر اتنا اور عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ تنگیٔ دل کو افلاس کی دل تنگی سے بھی منسوب کیا جا سکتا ہے یعنی
اگر میں فقر و حاجت کی ناہمواریوں سے دوچار نہ بھی ہوتا تو زراندوزی کی تمام وہ خوبصورت بلائیں مجھے چمٹ
جاتیں جو پہلی مشکلات سے زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہیں۔ بنابریں قانون قدرت کا ہمیں رہینِ منت ہونا چاہئے
کہ جس حالت میں اُس نے ہمیں رکھا ہے وہی بہتر اور کہیں بہتر تھا۔

(۲)

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب کے نزدیک قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں حقیقت میں ایک ہیں اور یوں ہی ایک دوسرے سے جدا نہیں
ہو سکتے۔ لیکن اگر عملی دنیا یا بالفاظ دیگر سطحیت کو نظر انداز کیا جا سکے تو فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے کبھی دونوں کی اصل
اور ماہیت کو متحد خیال نہیں کیا جا سکتا۔ حیات حقیقت وجودیہ ہے اور غم حقیقتِ عدمیہ۔ حیات ارتقا و تربیت کی
ضامن ہے اور غم فنائیت و اعدام کا باعث۔ حیات اور اس کے مظاہر کائنات کی دل کشی اور نظر فریبی کے
اجارہ دار ہیں اور غم اضافت کی پذیرائی کا دوسرا نام ہونے کی بنا پر احساس ذہنی اور حقیقت تصوریہ کے سوا کچھ نہیں
بدیں غرض اصل میں دونوں ہم معنی ہونے کی حیثیت سے کبھی ایک سطح پر نہیں لائے جا سکتے۔ حیات کی فطرت
میں ایک ایسی لطیف اور پاکیزہ ترین لذت و شیرینی مضمر ہے جسے کوئی طاقت اور کوئی کوشش حرفِ غلط کی مانند
نہیں مٹا سکتی۔ حالاں کہ غم مؤثراتِ خارجیہ کی اضافت کا نتیجہ ہوتے ہوئے اپنے انداز فنائیت و تعدیم کا امکان
رکھتا ہے۔ اگر ہمارے تصورات اور احساسات غم کی موہوم نسبت کا تأثر لینے سے انکار کر دیں تو غم ایک لمحہ بھی
زندہ نہیں رہ سکتا اور دنیا غم کے ناپاک وجود اور اس کی تاریکیوں سے یکسر خالی ہو جائے گی۔ جن فلاسفہ نے رہبانیت
اور ترک دنیا کا سبق دیا اس کی غرض و غایت بھی افنائے غم اور ابدی سکون و طمانیت تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس
تعلیم کے فلسفیانہ ہونے میں شک کرنا دنیائے علم و ادراک پر بدترین ظلم ہوگا۔ اسلام "رہبانیت" کے خلاف ہے اور
قطعاً خلاف لیکن کیا اس بنیاد پر کہ "ترک ماسوٰی" کا "نظریہ حیات اور اس کی نورانی شعاعوں کو سلب کر دیتا ہے۔
ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اس نظریہ کی صداقت سے انکار نہ کرتے ہوئے دنیائے انسانیت کو ایک ایسی علویت اور

...ت سے دوچار کرانا چاہتا تھا جو بغیر رہبانیت کو ٹھکرائے حاصل نہیں ہو سکتی۔ موثرات کی زد سے محفوظ
ہو کر یقیناً مسرت و ابتہاج کی جنت تیار کر لینا ممکن ہے مگر یہ اعترافِ شکست اور ذلیل انفعال انسانیت
کے شرف و علو کو ہمیشہ کے لئے خاک میں ملا دیتا جسے اسلامی تعلیمات کی سماویت گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے
...س نے کائنات کی ہر مختلف طاقت کے جواب دینے کے لئے "صبرِ جمیل" کا سبق پڑھایا۔ صبر جیسا کہ عام لوگوں
کا عقاد ہے مجبوری کا نام نہیں نہ عجز و پسپائی کا اعلان۔ بلکہ موثراتِ خارجیہ کی بے پناہ تلواروں کو زنگ آلود
اور کند کر دینے والی سپر کا نام ہے اور ایسی سپر کا جو زہر آلود خنجر سے بھی زیادہ خوفناک ہو۔ دنیائے آب و خاک
کی کوئی قوت صبر کا جواب نہ آج تک پیدا کر سکی نہ قیامت تک ممکن۔ صبر ہمارے جوشِ مبارزت کو بجائے
مدہم کرنے کے "بہتر قوت" اور شعلہ آتشی کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ کائناتِ مادی کے ہر قوی ترین دشمن اور حریف
کا بہتر سے بہتر طریقہ پر مقابلہ کیا جا سکے۔

کیوں کہ صبر اور کسی تکلیف کو سہنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ نے مخالف اثر نہ قبول کرنے کے لئے اپنے تمام
قوائے نفسیہ اور روحانیہ کی بہترین استعانت حاصل کر لی ہے۔ جس کے بعد اذیت خواہ کسی نوعیت کے ساتھ کیوں
نہ ہو آپ کے قوائے عمل کو مضمحل اور آلاتِ کارکردگی کو بیکار نہیں کر سکتی۔ اور جب آپ کی قوتیں شل نہ ہو سکنے
کے مرتبہ تک فائز ہو گئیں تو کیا قیدِ حیات سے بندِ غم کے سلاسل قطع نہیں کئے جا سکتے؟ غلط اور کس قدر
غلط۔ لہذا غالب کے نظریہ کو فلسفہ کے حدود میں داخل ہو سکنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ غم کے نظری اہم اور حقیقت ثابتہ ہونے کے مغالطہ نے دنیا کی منفعل ذہنیت
کو بالکل تباہ کر دیا۔ ورنہ اگر دنیا اس کا احساس پیدا کر سکتی کہ غم نہ فطری خاصہ ہے نہ سماوی طاقت اور
نہ ہی اس میں کائنات کے دیگر حقائق و مکونات پر اثر انداز ہونے کی قابلیت تو شاید آج غالب مرحوم کو یہ نظریہ
پیش کر کے عام ذہنیات کی غیر فلسفیانہ روش کا راز فاش نہ کرنا پڑتا۔ مگر نہیں دنیائے عمل ہمیشہ غالب کے نظریہ کی
پرستش کرتی رہے گی چاہے کتنا ہی غلط اور کتنا ہی معنویت سے بیگانہ کیوں نہ ہو۔ یہاں اتنا اشارہ کر دینا ضروری
ہو گا کہ جذبۂ غم سے میرا مقصد وہ غم نہیں جو حیاتِ نو جذب کرنے کی استعداد اور اہلیت رکھتا ہو کیوں کہ وہ
وجودی حقیقت ہونے کی بنا پر حیات اور اس کی حلاوتوں سے قریبی نسبت رکھتے ہوئے "بندِ غم" کا

بیب سے ادا نہیں ہو سکتا۔

متصوفین اسلام نے جس منفیت کی تعلیم دنیا میں پھیلائی وہ یہی ایجابی غم تھا۔ نہ کہ وہ سلبی غم جسے اکبر، اقبال جیسا "شاعر فلسفی" ٹھکرانے اور پائمال کرنے کی جرأت کر سکے، یا جسے میں بھی غیر فطری اور انسانی لمت و برتری کے منافی خیال کر رہا ہوں۔

ابوالنظر رضوی

محسوسات

مضراب آرزو سے ذرا دل کو اور چھیڑ
کیوں مطرب اس رباب کو خاموش کر دیا
رگ ہائے ماہتاب نے ٹپکا کے خون ناب
آسودہ موجِ بادہ کو سر جوش کر دیا
آیا جو نیم ہوش میں مخمور چشم مست
پھر جرعۂ نگاہ سے مدہوش کر دیا
وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کر دیا

لطیفی

وہ !!

دریائے حسن کا ہر قطرہ خود حسن کی شعاعوں کے ذریعہ قطرہ سے دریا اور دریا سے قطرہ بن کر حسن کی تمام رنگینیوں کو پیدا اور پنہاں کرتا ہے ... اگر شاعر کے دل پر حسن کی کیفیات لطیفہ طاری ہو کر ترجمان تنوعاتِ حسن ہو سکتی ہیں تو ایک صبح چمن کے چھوٹے سے ٹکڑے میں گلگشت کرتے ہوئے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بھی شاید کرشمہ آفرینی پہ "ہائے" کے ساتھ نکلے ہوئے چند بول ہوں گے۔

(کیفؔ مرادآبادی)

شرابِ ذوقِ خود بینی سے مخمور   سر محفل کبھی جلوہ نما ہیں
کبھی سو سو حجابوں میں ہیں مستور   خدا جانے وہ ان پردوں میں کیا ہیں

کبھی رونق دہِ بزمِ محبت   بہارِ انجمن ہیں انجمن میں
کبھی عشرت فزائے بزمِ عشرت   کہ جیسے پھول ہو کوئی چمن میں

وہ حسن جلوہ گستر کے کرشمے   فضائیں تھرتھرا اٹھتی ہیں جن سے
وہ جلوے آہ وہ رنگین جلوے   نگاہیں جگمگا اٹھتی ہیں جن سے

رخ پر نور ہے مہرِ درخشاں   جبین ناز اک ٹکڑا ہے جس کا
وہ رخ پر ان کے گیسوئے پریشاں   غضب کی مستیاں جن سے ہویدا

وہ نازِ حسن سے مخمور آنکھیں   فضا میں بجلیاں کوندا رہی ہیں

وہ کیف دلبری میں چور آنکھیں شراب بیخودی برسا رہی ہیں

تبسم ہے کہ ہے اک برق تصاں لب لعلیں پہ موجیں نور کی ہیں
تکلم ہے کہ ہے اک سحر لرزاں فضا میں مستیاں چھائی ہوئی ہیں

کبھی سو ناز سے جانوں کی جان ہیں کبھی خود ناز سے اپنے ہیں برہم
کبھی وہ بے نیاز دو جہاں ہیں عجب ہے اُن کی سرمستی کا عالم

جہاں چاہا وہاں پردہ اٹھا کر جدھر چاہا ادھر بجلی گرادی
جسے چاہا اُسے جلوہ دکھا کر مئے ذوق غم الفت پلادی

انھیں جلوہ طرازی کی قسم ہے مجھے اس خواب غفلت سے جگا دیں
انھیں اپنی تجلی کی قسم ہے مرے دل پر بھی اک بجلی گرا دیں

(کیفؔ مرادآبادی)

شاعری

شاعری تمام فنون لطیفہ میں علویت اور روحانی کیف و سرور کے اعتبار سے بہترین اور لطیف ترین فن ہے اور حقیقی شاعری کا معیار صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ شعر کے پڑھنے سے طبیعت پر ایک چوٹ لگے اور جذبات برانگیختہ ہوں۔ جو شعر اس اصول پر موزوں نہیں کیا گیا وہ واقعتاً شعر نہیں صنائع لفظیہ ہیں جن کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم شعر کو موسیقیا نہ تخیل سے تعبیر کریں تو کسی طرح ناروا نہیں اس میں شک نہیں کہ صحیح ترین معنی کے تحت موسیقی کا اطلاق نہایت خوش گوار تناسب کے ساتھ آواز کے زیر و بم کی اس ترتیب و ترکیب پر ہو سکتا ہے جس سے جذبات میں کبھی پستی اور کبھی بلندی کبھی سکون اور کبھی تلاطم، کبھی مسرت اور کبھی الم کے جذبات رونما ہوتے ہیں۔ شعر چوں کہ ایک تخیل ہے جو کسی تاثر، جذبہ یا کیف کی ترجمانی کرنے کے لئے اس کے ختم ہو چکنے کے بعد مناسب اور موزوں الفاظ میں ادا کیا گیا ہو اور چوں کہ یہ تخیل جذبات کو موسیقی ہی کی طرح متلاطم کر دینے کے قابل ہوتا ہے اس لئے ہم تخیل کو موسیقیت کے مفہوم سے ہم آہنگ دیکھنے کے لئے اپنے آپ کو قطعاً مجبور اور بالکل بجا طور پر مجبور پاتے ہیں۔

جو تعریف ہم شعر کی کر چکے ہیں اس کے لحاظ سے شعر کی علاوہ دیگر اقسام کے دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) جذبات

(۲) نازک خیالی

(۱) جذبات کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ جذبات نفسیہ یا ذاتیہ

ب۔ جذبات فطریہ یا کونیہ

ا۔ جذبات فطریہ یا کونیہ وہ جذبات ہیں جو مناظر قدرت یا نیچر کی گل کاریوں کے دیکھنے سے پیدا

ہوتے ہیں۔ حیات اجتماعی سے کوئی تعلق نہیں بلکہ فضا کی ترنم ریزی انھیں پیدا کرتی ہے۔

ایک حسین اور دلکش پھول جو فضائے صحرائی میں اپنی شیرینیت پراگندہ کر دینے کے لئے کھلایا گیا کھلا جاتا ہے ایک عامی کے لئے ممکن ہے چند لمحات کی اس نمایش سے زیادہ باوقعت نہ ہو جو اس شمہ ... کو محظوظ کرتی ہے لیکن شاعر کے لئے وہی پھول اس کی نفسی دنیا کو اسرار محبت اور حقائق معرفت میں کم ... کے لئے کافی ہوتا ہے۔ رنگین بدلیاں، روشن اور تاریک راتیں، چاند اور سورج، صبح شام گن گنا تے چشمے، آسمان کے جھلملاتے تارے، نسیم سحر، خاموشی کا سناٹا، اور سمندر کا طوفان خیز شور اور اس ہی ... کے دوسرے مناظر فطرت کے دیکھنے سے شاعر کے دل پر مختلف تاثرات جذبات اور کیفیات طاری ہو... اس کی روح کو محظوظ کر دیتے ہیں۔ کبھی وہ ان مناظر سے اسباق حاصل کرتا ہے اور کبھی اُن سے پیدا ہو... والے تاثرات و جذبات کو الفاظ میں ادا کرتا ہے جو وہ جذبات انسانی کو برانگیختہ کرتے ہیں۔

چنانچہ جوش ستاروں کے کانپنے اور شعلہ کے تھرتھرانے سے یہ نتیجہ نکالتے ہوئے کہ باطن کے ... ہو جانے کا راز بیتابی اور اضطراب میں مضمر ہے یوں کہتا ہے ؎

تڑپ لے دل تڑپنے ہی سے باطن جگمگاتا ہے
ستارے کانپتے رہتے ہیں شعلہ تھرتھراتا ہے

ایک اور جگہہ گل و خار کی بہم روئیدگی اور پھولوں کی نرمی سے سبق حاصل کرنے کے لئے کہتا ہے ؎

سبق نرمی کا لے گلشن سے، کیا تو نے نہیں دیکھا
حکومت کر رہا ہے پھول کس عزت سے خاروں پر

بعض اوقات ان ہی مناظر سے ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کو الفاظ میں ادا نہیں کیا جاسکتا جن کے تحت جوش ایک اور جگہہ یہ کہہ اٹھتا ہے ؎

نہیں معلوم کیا کیا دل میں نقشے کھینچ دیتا ہے
چمکنا سادگی سے چاند کا شفاف راتوں میں

دوسری جگہہ بہار میں قوت نامیہ کی گلکاریوں کو دیکھ کر اپنی حیرت اور کوتاہی ادراک کا یوں اعتراف

ا ہے ؎

تری قوت پہ اے جوش نمو ادراک حیراں ہے
کہ ہر کانٹے پہ تونے روح دوڑا دی گلستاں کی

یہی منقلب مناظر چاند اور ستارے اس کے ذہن کی رہنمائی صانعِ عالم کی طرف کرتے ہیں۔ اور اس کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں تو منکرین کو بھی ایقان توحید پر مجبور کر دیں گی اور ایسی حالت میں اپنے خیالات کو ان الفاظ کا جامہ پہناتا ہے: ؎

یہ نور یہ دھندلکا یہ چاند یہ ستارے
کافر بھی ہو جو کوئی اللہ کو پکارے

مسرت اور مناظر فطرت کی مسرت انگیزی ایک اضافی چیز ہے جب کبھی انسان کی طبیعت افسردہ اور غمگین ہوتی ہے تو وہ چیز جو اس کے لئے دل کشی رکھتی اور سامان مسرت بہم پہونچاتی تھی بھیانک بے رونق اور بجائے مسرت کے غم میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے اس حقیقت کو واشگاف کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

ہر چیز کائنات کی لبریز یاس ہے
دل کیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے

شام کے آنے سے جو دن کی چہل پہل اور دنیا کے چرچے سکون میں تبدیل ہو کر ہماری توجہات کو اپنی طرف کھینچتے اور مختلف قسم کے احساسات کو بیدار کرنے سے باز آکر سکون سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیتے ہیں تو ایک طرف تو کائنات کے تمام تو ارحملیہ دن بھر کی مصروفیتوں کے بعد سکون کا ل چاہتے ہیں جسے شام مہیّا کرتی ہے اور ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سکون کے ساتھ ہمارے جذبات پر بھی غم کی حلاوت سے ملا ہوا ایک سکون طاری ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ پوری طرح رات ہو پرند شام کے انتظار میں چیخ چیخ کر اس کی آمد کے انتظار میں اپنی بیتابی کا اظہار کر کے شور قیامت برپا کر دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز سکون حاصل کرنے کے لئے تیار ہے۔

تیری آمد دشت میں اے شام راحت خیز ہے　　　　تیرے سناٹے میں اک تسکین غم آمیز ہے

ذرّہ ذرّہ سے نمایاں ہے تمنائے سکون　　پتّہ پتّہ تشنگیٔ خواب سے لبریز ہے

گورِ غریباں کی رات کے بے شمع و گل بسر ہونے کے باعث قبروں پر جو یاس و حسرت برستی ہے اس سے متاثر ہو کر نسیم صبح کے ٹھنڈے خوش گوار جھونکوں کو ہی روشنی میں دیکھ کر اس اداسی پر سرد آہیں بھرنے سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

نسیم صبح ٹھنڈی سانس بھرتی ہے مزاروں پر
اندھیرے مُنہ اداسی دیکھئے گورِ غریباں کی

زمانہ کی بے ثباتی اور دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات ہماری زندگی پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔آبادی اور رونق، بربادی، ویرانی اور بے رونقی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات اتنے جلد کہ دیکھتے دیکھتے نظارے بدل جاتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تبدیلیاں کیوں کر واقع ہوئی ہیں اور جو چیزیں ابھی ہماری نظروں کے سامنے پھرتی تھیں انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا ایسے ایسے انقلابات دنیائے سبزہ و گل میں بھی بہت پیش آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی کا نتیجہ اخذ کرنے کے لئے کافی ہیں جیسے :۔

صبح کو جن پر رشک تھا سب کو جن کے ساتھ اک عالم تھا
شام کو جا کر دیکھتے کیا ہیں اُن کے گھر میں ماتم تھا
سبزہ پہ سحر کو شبنم تھی مصروف تھی بلبل نالوں میں
پھولوں پہ غضب کی نرمی تھی غنچوں پہ عجب اک عالم تھا

دنیا میں ہر پھول مرجھانے کے لئے کھلتا ہے اور ہر چاند ہلال ہو جانے کے لئے بدر ہوتا ہے ہر کمال زوال پذیر ہونے کے لئے بلند ہوتا ہے اور ہر پیدائش فنا کا پیش خیمہ ہے۔ ہر زندگی موت در کنار اور غور سے دیکھا جائے تو ہر مسرت غم در آغوش ہے جو اس ہی غم کے ہاتھوں تاراج کی جائے گی۔ہر وہ سر جو سہرۂ عروسی سے آج مزیّن نظر آتا ہے ایک دن ضرور موت کے طفیل قبر میں پہنچ کر زمین کی شوریت سے کاسۂ استخواں اور پھر ذرات میں تبدیل ہو کر رہیگا۔ دنیا کی خوشیوں میں بجائے جانے والے شادیانے یہ پتا دیتے ہیں کہ یہی مسرت ہے لبریز نغمات سے گونجنے والی فضا ایک دن ضرور شور آہ و بکا سے مسوخ نظر آئے گی ان ہی محسوسات کو جوش

ں ادا کرتا ہے۔

ساز شادی سن کے ہوتی ہے پریشانی مجھے
ان سے آتی ہے صدائے مرثیہ خوانی مجھے

مناظر فطرت کے دیکھنے سے پیدا ہونے والے سرور کو تنہا جذب کرنا کچھ لطف نہیں دیتا انسان تمنا کرتا ہے جس سے میں بہت زیادہ محبت کرتا ہوں وہ بھی اس لطف میں آکر شامل ہو جاتا تو کیا اچھا ہوتا کہ یہ لطف میرے لئے اور بھی زیادہ شیریں ہو جاتا۔ محبوب کے وہاں موجود ہونے کی تمنا کو یوں ظاہر کرتا ہے۔

جنگل میں چاندنی ہے ہر پھول ہنس رہا ہے
اس وقت تم بھی ہوتے کیوں کر تمہیں بلائیں

ایک دوسرے موقعہ پر اس ہی تمنا کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے۔

چاندنی رات ہے سمندر ہے
ہائے اس وقت آپ بھی ہوتے

دنیا کی یہ بے ثباتی کہ وہ حسین جن کا کل ایک عالم دل دادہ تھا اور چاند سی صورت رکھتے تھے اپنی تمام رعنائی اور دل کشی کے باوجود موت کی خوں خواری سے نہ بچ سکے ان کا حسن بھی ان کو فنا کی بے روک مشین سے پس کر ریزہ ریزہ ہونے سے نہ بچا سکا۔ آج ان کے ذرات اس درجہ منتشر ہیں کہ ان کا خاک سے علیحدہ تصور تک نہیں کیا جا سکتا گویا جزو زمین ہو گئے ہیں لیکن یہ تمام باتیں انسان کو اُس بے نیاز خالقِ موت وحیات کا پتہ دینے کے لئے ناکافی ہیں۔ جس کی قدرت کے کرشموں سے یہ تمام باتیں عمل میں آ رہی ہیں نہیں نہیں یہ غفلت ہے جو ہمیں اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ جس کو جوشؔ اس طرح ادا کرتا ہے۔

چاند کے ٹکڑے جنھیں کہتے تھے لوگ
خاک کے پیوند ہیں وہ مہ لقا
پھر بھی میں تجھ کو نہیں پہچانتا

کوئی اور شاعر گورستان کی بیکسی کا نقشہ کچھ ایسے انداز سے کھینچتا ہے کہ واقعی آنکھوں کے سامنے

تصویر پھر جاتی ہے ؎

خشک گُل پژمردہ سبزہ شمع چپ بالیں اداس
دل بھر آیا حالتِ گورِ غریباں دیکھ کر

مست صفی پوری کا یہ شعر بھی جس میں دل دردناک کی تصویر کھنچی گئی ہے یہ بتاتا ہے کہ کیوں کر بعض مناسبات کے تسلسل خیال کی بنا پر ایک چیز کے دیکھنے سے کسی واقعہ یا چیز کی یاد تازہ ہوتی ہے ؎

وہ دل صد پارہ جو تھا مدفنِ صد آرزو
آج پھر یاد آگیا گورِ غریباں دیکھ کر

(ب) جذبات نفسیہ یا ذاتیہ وہ جذبات رنج والم اور مسرت و بہجت ہیں جو روزانہ زندگی میں پیش آتے ہیں اور حیات اجتماعی انھیں بیدار کرتی ہے۔

قومی یا سیاسی شاعری بھی جذبات نفسیہ کی شاعری کے تحت آجاتی ہے کیوں کہ یہ بھی اُن ہی جذبات کو اُبھارتی ہے جو حیات اجتماعیہ انسانیہ کی بنا پر لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتے ہیں اس کی مثال پیش کرنے کے لیے ہم اپنی یاد سے اقبال کے دو تین شعر لکھتے ہیں۔

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیر امتیاز ما و تو رہنا

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شراب روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

ایک انسان کی ہم نشینی سے پیدا ہونے والی مسرّت تو کیا غم پر بھی بزم فطرت سے عمر بھر جذب کی جانے والی مسرتوں کو ان کے ہزار گنے سرور کے باوجود بلا تامل قربان کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ جذبات جو انسان کی محبت سے نتیجتاً پیدا ہوتے ہیں مناظر فطرت سے پیدا ہونے والے جذبات کی صد ہزار گنی شیرینیت کے مقابلہ میں بھی زیادہ مائل علویت اور جاذب فطرت انسانیہ ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو جوش کا یہ شعر واشگاف کرتا ہے :۔

رخ مہر درخشاں میں نہ مہ میں مسکراتی ہے

خوشی بہتے ہوئے اشکوں کی تہ میں مسکراتی ہے

محبت فطرت انسانی میں ازل سے ودیعت کی گئی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس حسن کو جو اس کے جاذب نظر ہو سکے اپنے جذبات کا مرکز قرار دے کر تمام زندگی اس کی پرستش میں بسر کر دینے کو مقصد حیات بنا لے جس کے بغیر اگر مادیت نے جذبات کی پاکیزگی اور لطافت کو کثافت میں تبدیل نہ کر دیا ہو تو کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے محبت ہی انسان کا مقصد حیات ہے جس کے حاصل ہو جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف پہلو جو اس قدر دلکش اور پرکیف ہیں اس کی وجہ محبت ہی ہے گویا محبت کرنے کا نام زندگی ہے۔ امیں رضوی کا یہ شعر ان ہی محسوسات کا حامل ہے ؎

زندگی نام ہے محبت کا

اپنے مقصد میں کامیاب ہوں میں

جب محبت میں شغف پیدا ہو جاتا ہے تو ہر وقت محبوب ہی کے خیال میں محو رہنے کو دل چاہتا ہے اور خیال کسی مرکز پر قائم ہو جائے پھر محبوب کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ چاند میں ایک کشش ہے اور تسلسل خیال کے نفسیاتی اصول کے تحت چاند کے دیکھنے سے محبوب کے حسین چہرہ کا عکس پیش نظر ہو جاتا ہے چوں کہ عاشق کی تمام رات محبوب کے نام کی تسبیح کرتے بسر ہو جاتی ہے اس ہی روشنی میں وہ آسمان کے ستاروں کے جھلملانے کو دیکھ کر اس بات سے تعبیر کرتا ہے کہ یہ ستارے بھی اس کے ساتھ اس کے محبوب کا نام ساری رات لیتے رہے ؎

سحر تک چاند میرے سامنے رکھتا ہے عکس ان کا

ستارے شب کو میرے ساتھ ان کا نام لیتے ہیں

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان بہت زیادہ مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اکثر خاموش رہتا ہے لیکن جب کوئی ہمدردی سے اس کا حال دریافت کرتا ہے تو اس کی ہمدردی کو دیکھ کر اس کا دل بھر آتا ہے اور بے اختیار ہو کر رونے کو جی چاہتا ہے اس جذبہ کو جوش نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

آتا ہے مجھ کو کیا کیا بے اختیار رونا
جب کوئی پوچھتا ہے کیا تجھ کو ہو گیا ہے

محبت میں محبوب کی ذات سے وابستہ تمنائیں پوری نہ ہونے پر انتہائی تکلیف کو اس و
سے پہلے پہلے مقصود ضمنی کی حیثیت دی جاتی ہے کہ ممکن ہے اس احساس تکلیف سے محبوب کے دل پر اثر
اور وہ گوشۂ چشمِ التفات مبذول کرے لیکن کچھ عرصہ گذرنے پر یہ فریب آرزو بھی آشکارا ہو جاتا ہے اور
کی اس خود رس پیہم خلش میں لطف آنے لگتا ہے اور یہ احساس تکلیف مقصود اصلی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عاشق
اس کے اثر یا بے اثری سے بے نیاز ہو جاتا ہے گویا محبت اور محبت سے پیدا ہونے والی احساس تکلیف ۔
محبت ہو جاتی ہے ۔ اس کو جگر ان الفاظ میں ادا کرتا ہے :-

مسرور ہوں کیفیت دردِ جگری سے
اب کام اثر سے ہے نہ اب بے اثری سے

جذباتی اشعار کے بعد ان اشعار کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے جن میں کوئی نازک خیالی ہو کیوں کہ اس
بھی طبیعت پر اثرات مرتب ہوتے ہیں مثلاً :-

بہ میزانِ نظر حسن ترا با ماہ سنجیدم میان این و آن فرق از زمیں تا آسماں دیدم

لیکن چوں کہ نازک خیالی کے اشعار خاص طور پر نتائج خیز ثابت نہیں ہوتے اس لئے ان کو نظر انداز کرتے

سید مختار

ٹوٹا ہوا دل

ستارے ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جلوے میری عظمت کے
جبیں کہکشاں کرتی ہے سجدے میری عظمت کے
فرشتے عرش پہ گاتے ہیں نغمے میری عظمت کے
وفاداری کی موجیں جس کو بوسے دیں وہ ساحل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۲)

حقیقت اور محبت کی حقیقت ہیں مرے نغمے
بشارت اور محبت کی بشارت ہیں مرے نغمے
محبت ــــــ اور تقدیس محبت ہیں مرے نغمے
زبورِ حق ہوں پیغامِ شکستِ سازِ باطل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۳)

مری تمکین میں ہیں عشق کی گہرائیاں ــــــ پنہاں
مری تخئیل میں ہیں حسن کی شادابیاں ــــــ پنہاں
مرے ہر خواب میں ہیں خلد کی رنگینیاں ــــــ پنہاں
ہے جس کی لیلیٰ فطرت بھی سودائی وہ محمل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۴)

بہارستاں ــــــ مرے اک قطرۂ خونی کے بھوکے ہیں
سرودستاں ــــــ مرے اک نغمۂ رنگیں کے بھوکے ہیں

یہ نظارے مرے اک جلوۂ زریں کے بھوکے ہیں!
حبیب رنگ و بوئے گل ہوں محبوب عنادل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۵)

یہ مستِ جلوہ فطرت --- ایک رنگیں ساقیہ میری!
ستارے زمزمے ہیں کہکشاں ہے مطربہ میری!
یہ بزم نور اک جلوہ گر آراستہ --- میری!
یہ سب آرائشیں میری ہیں میں خود اصل محفل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۶)

مری بیتابیاں ——— ہیں انتشار محفل ہستی
مری تسکین ——— پیغام بہار محفل ہستی
مرا ہر ذرّہ ہے آئینہ دار محفل ہستی
میں ہر پردے میں پنہاں ہوں میں ہر منظر میں شامل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

(۷)

میں وہ چشمہ ہوں جس سے "پریت" کی نہریں ہوئیں پیدا
میں وہ شعلہ ہوں جس سے "پریم" کی لپٹیں ہوئیں پیدا
میں وہ دنیا ہوں جس سے حُسن کی کرنیں ہوئیں پیدا
کہیں آغاز منزل ہوں کہیں انجام منزل ہوں
میں اک ٹوٹا ہوا دل ہوں

روشن صدیقی (فطرت نگار)

علی گڈھ سے شاندار پسپائی

واپسی کی بے شمار اقسام سے ایک قسم "پسپائی" بھی ہے پھر پسپائی کی بھی بے اندازہ قسمیں ہیں۔ ایک قسم "شاندار پسپائی" ہے اور اسی کو "انگریزی پسپائی" بھی کہتے ہیں۔ اور کہتے ہی نہیں۔ بلکہ جنگ یورپ میں لوگوں نے اس پسپائی کو اخبارات میں بھی دیکھا ہے اور سمجھ بھی لیا ہے۔ اپنے یہاں کے لوگ اس پسپائی کو "واپسی" "پشت دکھانا" "منہ پھیر جانا" "بھاگ جانا" "بھاگ کھڑا ہونا" "چلدینا" "چمپت ہونا" اور "فرار" بھی کہتے ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ علی گڑھ سے گھر تک واپس آنے میں ہمارے اندر کونسی قسم پائی جاتی ہے؟

۸ر دسمبر ۱۹۴۲ء کو علی گڑھ کالج کے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کو گئے تھے کل شب کو کالج میں وہ مشاعرہ ہے جس میں ہندوستان کے نامور شعراء دادبار جمع ہونے والے ہیں۔ ہمیں بھی "لکچر تیار کرنا ہے"۔ علی گڈھ کی کوتوالی تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے کہ "ملا رموزی صاحب کا لکچر بھی ہوگا" اس لیے پولیس بھی تیاری میں مصروف ہے۔ دھلی سے توپخانہ بلائے جانے اور "مارشل لا" کی اجازت بھی طلب ہوگئی ہے۔ کارخانوں کے مزدور بھی "ہڑتال" پر آمادہ ہوچکے ہیں۔ شعراء ہیں کہ اپنی اپنی غزلیں اصلاح و مشورہ کے لیے لیے پھر رہے ہیں۔ شعراء کی حجامت بھی بن رہی ہے۔ پوڈر اور تیل سے سر کے بال سنوارے جارہے ہیں۔ آنکھوں کے چشمے صاف ہورہے ہیں۔ پروفیسر لوگ ایک سوٹ اٹھاتے ہیں ایک رکھتے ہیں "مشاعرہ گاہ" اور نہیں تو "یونین جیک" ہی سے سجائی جارہی ہے۔ غرض پورا علی گڑھ تیار ہورہا ہے اس لیے ہم بھی دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر "لکچر لکھنے میں مصروف ہوگئے"۔ دوست تو "سو ساگئے"۔ مگر ہم نے کوئی نصف لکچر تیار کرلیا جس میں رات کا کوئی ایک بج گیا۔ تو نواب زادہ کپتان محمد رشید الظفر خاں صاحب (بھوپال) کا خادم آیا اور کہا "کیا کھانا بالکل ہی نہ کھائیے گا" ہم نے کہا "ہاں احتیاطاً آج ناغہ کریں گے۔ اگر دودھ ہو تو پلا دو"۔ غریب نے ایک گلاس دودھ دیا۔ پیا۔ اور سو گئے کوئی ایک ہی گھنٹہ گذرا تھا کہ پیٹ میں درد محسوس ہوا اس کی اذیت سے خدا دشمن کو بھی محفوظ

رکھے۔ یہ جب تک رہتا ہے "ارے ہائے رے مارڈالا" کے نعرے لگانا پڑتے ہیں۔ اور اچھا ہو جانے کے بعد آٹھ دن تک فاقے کرائے جاتے ہیں۔ گویا ہمارے لئے ڈاکٹروں اور طب یونانی نے بس اسی قدر ترقی کی ہے کہ یہ مرض نہیں جا سکا۔ اُٹھے اور صندوق سے دوائیں نکال کر کھائیں مگر کچھ نہ ہوا۔ لگے ٹہلنے پھر نصف گھنٹے کے بعد دوا کھائی مگر کچھ نہوا۔ تو پھر نصف گھنٹے تک ٹہلتے رہے۔ مگر کچھ نہ ہوا تو اب دوا سے بھی مایوس ہو گئے۔ گھڑی بھی پاس نہ تھی کہ وقت معلوم کرتے پاس ہی نواب زادے صاحب کے بھائی میاں منصور علی خاں صاحب سو رہے تھے اس لیے اُن کی گراں خوابی کے ڈر سے "ارے ہائے رے" کا نعرہ بھی نہ لگا سکے۔ اس لیے دو بجے شب سے صبح کے سات بجے تک جس طرح ضبط و خموشی سے کام لیا خدا ہی جانتا ہے یا ہم۔ بس ہر لحظہ وہ یاد آ رہی تھیں۔ اب جو صبح ہوئی تو احباب بیدار ہوئے اور علاج سے پہلے سوالات شروع ہوئے جن میں سے ہر ایک کا تفصیلی جواب دینا درد کی حالت میں بھی ہمارا فرض قرار دیا گیا۔ "ایک بولے"

ارے کیوں ملا صاحب ؟

دوسرے بولے۔ افوہ تو کب سے شروع ہوا؟

تیسرے بولے۔ تو کیا اس سے پہلے بھی ہوا تھا ؟

چوتھے بولے۔ اماں تم بھی اتنے سے درد سے مرے جا رہے ہو!

پانچویں بولے۔ تو کیا ہوا۔ اب حضور نواب زادے کے لیے ڈاکٹر آئے گا تو تمہیں بھی دکھا دیں گے۔

گویا براہ راست ہمارے لیے ڈاکٹر کا بلانا تو ضروری تھا ہی نہیں۔

چھٹے بولے۔ کیوں کیا ہوا ؟

ساتویں بولے۔ ارے لاحول ولا تو تم نے مجھے کیوں نہیں اُٹھا دیا۔

آٹھویں بولے۔ تو کیا دوا لائیں ؟

نویں بولے۔ تو کس طرف ہے دیکھوں ؟

اشارہ سے بتانے پر انھیں تسکین نہوئی تو تمام لحاف اٹھا کر انھیں درد کا موقع دکھایا گیا۔ علاج صرف یہ کہ "افسوس" کہکر خموش بیٹھ گئے۔

دسویں بولے۔ لاؤ بھائی ہاتھ پاؤں دبا دوں!

دل تو یہی چاہتا تھا مگر غیروں پر حکومت کرنے سے فطرت روکتی ہے۔ اس لیے کہدیا "جی نہیں آپ کی مہربانی ہے بس دعا کیجئے"

اس کے بعد سخت لرزہ شروع ہوا تو عزیزم حامد صاحب نے بکمال ہمدردی اور شفقت ہمیں دبائے رکھا۔ اور بیچارے پاؤں دبانے لگے۔ مگر انھیں بھی شکریہ کے ساتھ روکنا پڑا۔ اب پورے جسم کو درد ہی نے گیا ہزاروں دردوں نے جکڑ لیا لرزہ کی وہ شدت تھی کہ "موٹر سائیکل کا انجن چل رہا تھا" جس سے جسم کا ہر حصہ کانپ رہا تھا۔ برادر گرامی میاں منصور علی خاں کی شفقت کے قربان جائیے۔ آپ پر ہماری تکلیف کا سب سے زیادہ اثر تھا۔ ہر فکر اور ہر تدبیر کے لئے تیار اور بے چین سے ہو رہے تھے۔ مگر یہی وہ موقع تھا جب "خدائے رحیم و رحمان اور انسان ضعیف" کی قوتوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ اور انسانی تدبیر کی ہر بلند سے بلند قوت خدائی قوت سے شکست کھا رہی تھی۔ اور ہمیں ایک پل کو چین نہ آتا تھا۔ اس وقت ہمارے اوپر دو قسم کی تکلیف تھی۔ ایک درد کی دوسرے اُس تصور کی کہ "یہ سب کچھ نتیجہ ہے خدا سے سرتابی اور سرکشی اور اُس کے احکام و فرائض سے بے خبری و بے اعتنائی کا" اس لیے کس قدر مبارک و مسعود ہیں وہ جو خدائے عرش و فرش کی غلامی کی ہر شرط بجا لانے میں تیار و مستعد رہتے ہیں۔ اور ایسے ہی ہوا کرتے ہیں جن کا دل و دماغ گناہ کی ملامت آفریں اذیت سے محفوظ رہتا ہے اور اسی اندیشہ سے اس وقت ہم "بڑی فرمانبرداری" سے "ارے اللہ" "ارے اللہ" کے سوا کچھ منہ سے نہیں کہہ رہے تھے۔ کہ

گیارھویں بولے۔ اماں تم تو دم ہی چھوڑے دیتے ہو آخر ڈاکٹر صاحب آتو رہے ہیں۔

بارہویں بولے۔ لاؤ لاؤ ہم سر دبائے دیتے ہیں۔

تیرہویں بولے۔ اچھا کچھ کھاتے ہو؟ چائے تو پی لو۔

چودھویں بولے۔ یہ درد تو میرے بھی ہوا تھا واقعی بڑا موذی درد ہوتا ہے سنو تو ملا تم تو ایک پیٹی بنوالو اُسے ہر وقت کمر سے باندھے رہا کرو۔ یہ درد اکثر پاؤں کے اونچا نیچا پڑ جانے سے ہوتا ہے۔

پندرھویں بولے۔ کیوں بھائی کیا ہوا؟ اچھا درد ہے۔ اماں نہیں یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو واللہ درد ہی۔ ارے

توبہ واللہ میں تو سمجھا مذاق کر رہے ہو اسی لیے تو میں نہ آیا اچھا اچھا بھیا تو لیٹے رہو۔

سولھویں بولے۔ افسوس بیچارے ملا پر اور مصیبتیں کیا کم ہیں جو یہ درد بھی کمبخت پیدا ہوگیا۔

سترھویں بولے (اور بڑی مہربانی سے بولے) لو یہ گرم پانی کی تھیلی ہے اس سے سینک لو ابھی درد جاتا رہے گا۔

اٹھارھویں بولے۔ آگ لاؤں۔

انیسویں بولے۔ اچھا۔ اچھا رات کو جو دودھ پیا تھا اسی سے ہوا ہے۔

بیسویں بولے۔ یار آج تو تمہارا لیکچر تھا۔ تو کیا اب لیکچر نہ دوگے۔

اکیسویں بولے۔ ماشاء اللہ کیا اندھے ہوگئے ہو۔ وہ تو غریب جان سے جا رہا ہے آپ کو لیکچر ہی کی فکر ہے۔

بائیسویں بولے۔ بھائی ملا تم تو دس بارہ ڈنڈ کر لو ابھی جاتا رہے گا۔

تیئیسویں بولے۔ گھبراتے کیوں ہو۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔

تو گویا آدمی کسی تندرستی کی حالت میں گھبراتا ہے۔

غرض احباب تو تھے کل دس بارہ مگر بولنے میں یہ سب کے سب کوئی سوا سو آدمیوں کا کام دے رہے تھے۔ مگر ان تمام ہمدردیوں پر ہمیں اگر کوئی یاد آتا تھا۔ تو وہ قبلۂ دو جہاں والدۂ محترمہ مدظلہا اور پھر اپنے "ننھے میاں کی والدہ" کہ ایسے اوقات میں یہی دو ہستیاں قلبی اطمینان اور روحانی تسکین کا سبب ہوتی ہیں اس لیے ہم جب بولتے تھے تو صرف یہ کہ

"وطن جانے دو"

مگر ہمارا یہی مطالبہ احباب کو بیحد و بے نہایت ناگوار تھا۔ اس پر ہزاروں ڈاکٹری مشورے دیئے جاتے تھے کوئی راستہ کی تکالیف سے ڈراتا تھا، کوئی سردی کے جلے سے۔ کوئی نمونیہ سے تو کوئی فالج سے کوئی بخار میں ہوا لگ جانے سے تو کوئی درد میں اضافے سے۔ خدا خدا کرکے کوئی سوا آٹھ بجے حضور نواب زادہ بہادر کے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور موصوف نے ازراہ نوازش انھیں پہلے ہمارے ہی پاس بھیجا۔ ڈاکٹروں کے عام خصلت کے خلاف ڈاکٹر صاحب نے بڑی مہربانی اور توجہ سے ہمارے درد کو ٹٹولا۔ کیونکہ درد نظر نہیں آتا ہے پھر نسخہ تجویز فرمایا۔ اور اپنی دوا کے اطمینان پر یا محض "ڈاکٹری ضابطے سے" فرمایا ابھی ابھی جاتا ہے۔ اور دیر تک تشفی فرماتے رہے

ڈاکٹر صاحب کی دوا آنے سے پہلے ہی الحمدللہ درد تو چلا گیا مگر بخار رہ گیا جس نے دن بھر چارپائی سے
اُٹھنے کی اجازت نہیں دی۔ بس یوں پڑے رہے۔ گویا کسی لاوارث کا صندوق کسی ریلوے پلیٹ فارم پر ڈال دیا
گیا ہو۔ کبھی آواز دیتے تو حضور نواب زادے بہادر کے ایک چھوڑ چار خادم خصوصاً میاں سعادت جلد حاضر ہوجاتے
۔ کبھی آواز دیتے تو کوئی پاس ہی نہ پھٹکتا اس عرصہ میں ہم برابر کوشش کرتے رہے کہ ہمیں وطن جانے کی
اجازت ہوئے۔ مگر احباب یہ سنکر فوراً اپنی "ڈاکٹری" شروع کر دیتے تھے اور ہمیں چار و ناچار خموش ہونا پڑتا
تھا۔ اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ چپ رہو اور جب موقع پاؤ تو چلدو۔ شام ہی سے مشاعرہ کی تیاریاں شروع
ہونے لگیں کوئی سوٹ بدلتا تھا۔ تو کوئی غسل فرماتا۔ کوئی شیو کرتا تو کوئی چسٹر پہنتا۔ موٹر پر موٹر آنے لگا۔ تو ہم
نے بھی آہستہ سے کہا کہ ہم بھی مشاعرہ میں جائیں گے۔ الحمدللہ طبیعت اچھی ہے۔ سب کے سب ہی تو بول پڑے کہ
"ضرور ضرور"

یہ ضرور ضرور اس توقع پر تھا کہ ملا صاحب کا لیکچر سننے میں آئے گا۔

میاں منصور علی خاں نے فرمایا۔ ملّا صاحب آپ تو میری موٹر میں چلئے۔ میں بہت آہستہ آہستہ لیچلوں گا،
ہم حضور نواب زادہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مع لحاف کے حاضر ہوئے تو ممدوح نے ازراہ عنایت
ہمدردی فرمایا

"آپ مشاعرہ میں نہ جایئے گا کیونکہ آپ کی طبیعت اچھی نہیں اور سردی بہت ہے"

مگر ہم نے فائدہ اسی میں دیکھا تھا۔ کہ مشاعرہ سے فرار آسان ہے۔ اس لئے مشاعرہ میں گئے۔ یہاں سے
مشاعرہ کی روداد معلوم کرنا ہو تو یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے ۲۰ء کے مشاعرہ کی روداد یوں طلب فرمایئے کہ
بخدمت شریف مولینا باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ"

مشاعرہ میں کوئی دو گھنٹہ بیٹھکر ہم اُس بہانے سے اُٹھے۔ جس بہانے سے بڑے بڑے مہذب لوگ جلسہ سے اٹھکر
باہر جاکر جمائیاں لے آتے ہیں یا سگریٹ پی آتے ہیں۔ باہر آتے ہی دیکھا تو موٹر کا ڈرائیور خود "مشاعرہ" بنا ہوا
تھا۔ اُس کی غیر حاضری کو غنیمت ہی جانا اور فوراً تانگہ والے کو آواز دی اور تانگہ آگیا۔

تا چالیس منٹ میں پہنچا۔ راستہ میں تنہائی اور ضعف سے جو وحشت پیدا ہوئی۔ تو اکے والے سے گفتگو کا سلسلہ شروع
کرتے مگر سردی کی شدت سے اُس کا یہ حال کہ ایک جواب بھی صحیح نہیں دیتا۔ لطیفہ یہ کہ اس اکے میں روشنی بھی
تھی۔ راستہ میں ہندوستانی پولیس سارجنٹ ملے تو پورے غصہ سے اکے کو روکا تو سرچ لائٹ ڈالی تو انھیں "قفس
در قفس" نظر آیا یعنی اس پنجرے کے اندر ہم لحاف اوڑھے یوں بیٹھے تھے گویا ہم خود ایک مستقل اکا ہیں۔ اس
کے والے کے لباس سے صاف ظاہر تھا۔ کہ علی گڑھ میں افلاس خاصا ہے۔ اور حضرت مولوی طفیل احمد صاحب
کی موجودگی سے بھی یہ دور نہیں ہوتا۔ علی گڈھ کی سردی اور اس اکے والے کی صرف ایک عدد کھدری چادر کو
دیکھ کر ضبط نہ ہوا تو اُس سے کہدیا کہ

"اگر افلاس دور کرنا چاہتے ہو تو کبھی کالج اور یونیورسٹی کی طرف اکا نہ لیجانا۔ کیونکہ اصل افلاس
یہ طلبہ ہیں جنھوں نے غیر ملکیوں کی دو وقتہ چائے، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، کرکٹ، ٹورنامنٹ
اور غیر ملکی لباس کو اختیار کرکے ہماری آمدنی اور دولت کے مصارف کو دادا جان کے
زمانہ سے آٹھ گونہ زیادہ کر دیا ہے۔"

بڑی خموشی سے کوٹھی میں داخل ہوئے۔ اور بستر لیکر اسٹیشن اس تہذیب سے چلدیئے جس طرح اپنے "رمن
یشن صاحب" ہڑتالیوں اور گوبیک" کی وجہ سے کسی طرف سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ ایک جلیل القدر نواب زادے
مہمانی سے بھاگے تھے اس لیے الحمدللہ روپیہ تھا کافی اس لئے خیال آیا کہ آج تو "تھرڈ کلاس" ہی میں سفر
یں۔ اس لیے ٹکٹ بابو سے آگرہ تک کا ٹکٹ طلب کیا تو اُس نے غلطی سے "سیکنڈ کلاس" کا ٹکٹ دیدیا
ماضدی اس لیے ٹکٹ کے نرخ میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ آگرہ تک کا جو کرایہ پہلے اُس نے بتایا۔ اُسی پر جما
ہا۔ ایک روپیہ بھی کم نہ کیا۔ حالانکہ اپنے ہندوستانی سوداسلف کا عام قاعدہ یہ ہے کہ چیز کے دام جو پہلے
ماتے ہیں گاہک کے اصرار پر پھر وہی چیز آدھے داموں پر دیدی جاتی ہے۔ اُمید ہے کہ سوراج کے ملجانے
ریلوے ٹکٹ اور ڈاکخانوں کے لفافوں اور کارڈوں کی قیمت بھی گھٹتی بڑھتی رہا کرے گی۔ آج کل ایسی
انگریزی" تو ہوگی کہ جو دام مانگے جائیں وہی دو۔ ورنہ "جائیے نہیں دیتے" کی دھمکی موجود ملتی ہے۔
اسٹیشن پر بمقدار ٹکٹ قلی نے ایک ایسی کوٹھری میں بستر رکھدیا جسے "ویٹنگ روم" کہکر عزت بڑھا دی جاتی

ہے یہ کوٹھری انگریزوں کی ہوتی ہے اور سنا ہے انگریز بڑے باوقار بڑے دولتمند، اور بڑے فاتحانہ ٹھاٹ کے لوگ ہوتے ہیں
لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیئے کہ یہ لوگ ریلوے اسٹیشنوں کے ہر ویٹنگ روم میں اُس کی حیثیت کے موافق چراغ جلاتے
ہیں۔ چنانچہ ہمارے سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں "کھانس لیٹ" کا وہی دیا جل رہا تھا جو عام ہندوستانیوں کے جھونپڑوں
میں جلتا رہتا ہے۔ لیکن فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بجلی کی روشنی تھی۔ اب بتایئے اگر انگریز دولت مند اور فاتحانہ وقار
کے لوگ ہوتے تو یہ کنجوس۔ یہ بخیل اور یہ گداگرانہ دیا کیوں جلاتے۔ انہیں ہر جگہ اپنی شان دکھانا چاہیئے تھی! ور کوئی
ہندوستانی راجہ مہاراجہ اگر ریلوے کا مالک ہوتا تو وہ ہر اسٹیشن پر گھی کے چراغ ہی جلوا کر چھوڑتا۔ چاہے رعایا بھوکی
مرجاتی مگر وہ اپنی شان دکھانے میں کمی نہ کرتا۔ یہاں علی گڑھ کی طرف سے مشاعرہ کی "استقبالیہ" کمیٹی کے ارکان مہمانوں
کے استقبال کو موجود تھے۔ ہمیں خیال بھی نہ تھا مگر ان معزز بھائیوں نے ہمیں پہچان لیا۔ اور فوراً ہی ہمارے پاس آکر دریافت
کیا کہ "کیا آپ مشاعرہ میں تشریف لائے ہیں"
ہم نے اپنی بیماری اور مشاعرہ سے واپسی کا ذکر کیا تو بیچارے ہماری امداد کے لیے وقف ہوگئے۔ ہمیں گلاس لاکر
دوا پلائی پاس بیٹھ گئے، ہاتھ پاؤں دبانے کو کہا۔ غرض ان عزیز طلبہ نے علی گڑھ کالج کے اُن قابل صد عظمت اخلاق کی یاد
تازہ کردی جن کا دعوٰی کبھی سر سید علیہ الرحمۃ نے کیا تھا۔ اور جو اب اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کے طلبہ میں کیا خود
علی گڈھ کالج کے جملہ طلبہ میں موجود نہیں۔ ممکن ہے یہ اثر ہو نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بہادر کی مصروفیت کا ان
عزیز طلبہ میں برادرم عزیز الرحمن خاں اور برادرم لطافت علی خاں گاڑی کے روانہ ہونے تک ہمارے ہمراہ رہے۔ ریل آنے
پر ہمارے لیے جگہ تلاش کی۔ بستر لگایا۔ اور چلتے وقت الٹی ہم سے معافی چاہی کہ خدمت نہ کرسکے۔ ان میں برادر عزیز
عبدالحبیب خاں صاحب بریلوی سب سے پیش پیش تھے اور مزاج اور اخلاق سے وہ پیارا اسلامی اخلاق ٹپک
رہا تھا جو دلوں کو مسخر کرکے بغیر "گھوڑا پولیس"، کے حکومت کرتا ہے۔ خدا ان پیارے اسلامی بھائیوں کو خیریت
سے ایم اے، پی ایچ ڈی، کرے آمین۔
اب یہاں سے ہم ریلوے کی اُس لنکا میں داخل ہوگئے جہاں کا ہر ہندوستانی ملازم باون گز ہی کا ہوا کرتا ہے۔ ریلوے
ملازمین میں اخلاق، قومی ہمدردی، ملکی جانب داری، رحم وعفو، اور خوش خلقی کا جو کوسوں پتہ نہیں چلتا اُس کا سبب یہ نہیں کہ اس
طبقہ میں تمام ملازمین قوم و خاندان کے جلاہے، دھوبی، حجام، یا کونجڑے ہوا کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کی بداخلاقی بدتہذیبی اور رعونیت
کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ سب کے سب اسکولوں کی پانچویں یا چھٹی جماعت کے بھاگے ہوئے طلبہ ہوتے ہیں۔ پھر اُن سے "قوم یا
قومیت" یا خوش اخلاقی ہمدردی اور تواضع کی امید ایسی ہی ہے جیسی انگلستان کے مزدوروں سے ہندوستانی سوراج کی

توقع اس لیے ہم ریلوی ملازم کے لیے اپنی آبائی عرف افغانی عادات سے کام لیتے ہیں۔ تو آرام سے سفر پورا ہو جاتا ہے۔

آگرہ کے اسٹیشن پر شب کے ساڑھے چار بجے اترے یہاں سے گھر تک کا ٹکٹ بدلوانا تھا۔ دروازہ پر دیکھا تو ایک قحط زدہ صورت کے ہندوستانی ٹکٹ کلکٹر آگرہ کے محلہ "نائی کی منڈی سے خریدا ہوا ٹوپ" یوں اوڑھے ہوئے تھے جیسے کوئی ایکٹر کسی تھیٹر میں مردے کا پاٹ کر رہا ہو۔ ہم نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ٹکٹ گھر کدھر ہے؟ تو ترنکھنڈی لہجہ میں بولے

"پہلے اپنے آنے کا ٹکٹ دکھاؤ"

اس فقرہ پر ہماری تمام بھولی ہوئی منطق ابھر آئی۔ اور ہم نے انھیں جرحی اور منطقی سوالات پر دھر لیا تو مزاج سرخ و سفید قارورہ ہو گیا مگر کرتے کیا ایک پولیس ہیڈ کانسٹبل نے جب دیکھا کہ ٹکٹ کلکٹر صاحب کی کلکٹری قبا کے تمام بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں تو درمیان میں پڑ کر معاملہ یوں طے کر دیا کہ ہمیں لیجا کر ویٹنگ روم میں آرام سے بٹھا دیا۔ قلی سے بستر لدا دیا اور بیچارہ خود ٹکٹ لینے چلا گیا۔ دیر جو ہوئی تو ہم سمجھے کہ اس کانسٹبل نے اپنے ٹکٹ کلکٹر کی شکست کا ہم سے یوں بدلہ لیا ہو کہ ہمارے ٹکٹ کے دام لیکر آگرہ میں "گم شدہ عزیز" کی تلاش بنکر رہ گیا۔ اس لیے خود ٹکٹ گھر کی طرف گئے تو ہمارے وطن کے ایک حافظ جی نظر آئے جو علی گڑھ جا رہے تھے۔ اور ریل کے انتظار میں یہاں مارے جاڑے کے "استغفر اللہ" بنے کھڑے تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ اور انھیں کو پولیس والے کے پیچھے لگا دیا۔ بارے ٹکٹ آگیا ادھر ریل آگئی۔ یہاں سے ضعف اس درجہ بڑھا کہ ہم ریل میں سوار ہوتے ہی بیہوش ہو گئے اور پتہ بھی نہ چلا کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں۔ کہیں کہیں آنکھ کھل جاتی تھی مگر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کیونکہ اس وقت پانچواں علاجی فاقہ تھا۔ اور قدرے بخار اس وقت خیال آیا کہ اگر ہم آج کو "یورپ کی زندہ قوموں کے" اتنے بڑے ادیب ہوتے تو اس حالت میں ہمارے لیے علی گڑھ سے گھر تک پہنچانے کے لیے ایک اسپشل ٹرین چھوڑی جاتی اور ہر اسٹیشن پر ڈاکٹر اور خدام اور عوام ہمارے استقبال اور مزاج پرسی کو حاضر رہنے میں اپنی سعادتمندی سمجھتے مگر یہاں یہ حال کہ اب بھی ایسے ایسے موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ

"ملا رموزی چیز ہی کیا ہیں"

بارے خدائے رحیم و کارساز اور شفیق و مہربان کی رحمتوں کے سہارے گھر پہونچے والدہ محترمہ مدظلہا نے تو بے ساختہ گلے لگا لیا وہ بھی پریشان سی ہو گئیں مگر ذرا سا فاقہ ہوتے ہی بولیں

"اور جاؤ سفر میں"

معلوم نہیں اس فقرہ میں کرایہ کے روپیہ کا غم تھا یا جوش محبت سے ہمارے اوپر طعن؟ اپنے اللہ میاں کا بڑا احسان کہ ہمیں بغیر ٹری سے اترے ریل میں گھر تک پہونچا دیا اور کسی ٹکٹ کلکٹر نے نہ دیکھا۔ فقط

ملا رموزی

وجدانیات

جوانی کو کتابِ دردوغم کی ابتدا کہیے
جو دل آئے کسی پر تو تقاضائے قضا کہیے

نگاہِ نازِ جاناں کیا ہے اک تیرِ قضا کہیے
پھر اُس پر سامنا دل کا بلا کا سامنا کہیے

محبت کو تو کہتے ہو کہ فطرت کا تقاضا ہے
مگر بدنام ہو جائے کوئی اس میں تو کیا کہیے؟

مرے دل میں بھی جلوے وادیٔ ایمن کے رہتے ہیں
تجلیاتِ برقِ حسن کو رنگ آشنا کہیے

کسی کا قصۂ غم ہو مگر میں سُن کے روتا ہوں
وہ دل پہلو میں رکھتا ہوں حبیبِ غم آشنا کہیے

نگاہِ گرم بھی ہے مجھ پہ اور اندازِ الفت بھی
کسے اب آشنا کہیے کسے ناآشنا کہیے

اگر تم میرے ہو جاؤ تو دنیا میری ہو جائے
تمہارے ہر اشارے کو زمانے کی ہوا کہیے

فنا ہو جائے ہستی وسعتِ آبادِ تمنا میں
یہ دنیا ہے اسی کو زندگی کا مدعا کہیے

یہی دو چار تنکے یادگارِ عیشِ رفتہ ہیں
قفس میں ان کو اپنی زندگی کا آسرا کہیے

نگاہِ مہر و الفت اور مجھ برگشتہ قسمت پر
یہ کب تم سے توقع تھی مگر شانِ خدا کہیے

کبھی محوِ عبادت ہوں کبھی مشغولِ مے نوشی
اسے جوہر دورنگیٔ زمانہ کی ہوا کہیے

جوہر عظیم آبادی

تجلّیات

سیماب بھر دیا ہے دلِ بیقرار میں — کیا سحر ہے تری نگہِ فتنہ کار میں

وہ رشکِ صد بہار ہی میرے کنار میں — اللہ کیا بہار ہے اب کی بہار میں

ذرّے چمک اُٹھے ہیں تری رہگذار کے — جلوے ہیں بیقرار تری رہگذار میں

حیراں ہوں میں، خموش ہوں میں، دم بخود ہوں میں — کھویا گیا ہوں آکے ترے جلوہ زار میں

مانا کہ صبر چارۂ اندوہِ عشق ہے — لیکن نہیں ہے صبر مرے اختیار میں

اللہ بچائے دل کو بلاؤں سے عشق کی — دامن اُلجھ گیا ہے مرا خارزار میں

دل بے نیازِ گردشِ لیل و نہار ہو — یا فرق آئے گردشِ لیل و نہار میں

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں — دیوانہ ہو گیا ہوں ترے انتظار میں

اکبر وہ دورِ عشق و محبت گذر گیا
باقی ہے یاد سی دلِ حسرت شعار میں

جلال الدین اکبر

شخصیت کا اثر

یہ فسانہ بلغاریہ کے ایک مشہور مصنف کے فسانہ کا ترجمہ ہے۔ اس میں نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے کہ ایک نیک شخصیت کے اثر سے کس طرح قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ بلغاریہ کی زندگی اور ہماری ہندوستانی زندگی میں بہت کچھ مشابہت ہے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ ناظرین اس فسانہ کو دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ کریں گے۔

اڈیٹر

میرے مکان سے تھوڑے فاصلہ پر متھیس کا مکان ہے۔ اس کے دروازہ کے سامنے برانڈی سے بھری ہوئی ایک صراحی ہر وقت لٹکی رہتی ہے۔ متھیس کو یہ بات بہت پسند ہے۔ اگر کبھی تم اس طرف سے گزرو تو اس کا تمام خاندان تمھیں اپنے گھر بلائے گا اور تمھاری اتنی ہی خاطر کرے گا جتنی کہ ایک لارڈ کی کی جاسکتی ہے۔ اگر رات کا وقت ہے تو ایک لڑکی اپنے ہاتھ میں مشعل لئے ہوگی۔ ورنہ ایک لڑکی تمھارے استقبال کے لئے دروازہ پر ہوگی۔ ایک باغ میں تمھارا انتظار کرتی ہوگی۔ ایک لڑکی تمھیں اصطبل میں ملے گی اور ایک لڑکی باورچی خانہ میں تمھاری منتظر ہوگی۔ اور جب تم یہ تمام منازل طے کرلو گے تو ایک لڑکی تمھیں بیٹھنے والے کمرہ میں لے جائے گی جہاں تمھیں باقاعدہ دعوت دی جائے گی۔ تمھارا استقبال کیا ہوگا شادی کی دھوم ہوگی۔ اس کے خاندان کے تمام لوگ بامذاق اور معقول ہیں۔ یہ لوگ سپاہی بھی ہیں۔ خدا کرے تم کسی سے لڑ بیٹھو پھر دیکھنا وہ کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ یہ لوگ سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ خود ہی بوتے ہیں خود ہی کاٹتے ہیں۔ سور بت پالتے ہیں۔ اس خاندان میں کل اسّی افراد ہیں جن میں مرد۔ عورتیں۔ بچے اور بوڑھے سب شامل ہیں۔ خاندان کے تین ممبر بطور سردارِ خاندان کے تصور ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا سردار خود متھیس ہے۔ دوسرا سردار اُس کی بھاوج راڈو کا ہے اُمور خانہ داری کے شعبے اس کے سپرد ہیں۔ تیسرا سردار متھیس کا پوتا ارسن ہے جو اس قصہ کا ہیرو ہے۔

متمیس کے مکان کے قریب ایک شخص برماس رہتا تھا۔ اس کے کئی ایک بچّے تھے۔ لیکن سب طاعون میں ضائع ہو گئے صرف ایک لڑکی انوکا نامی باقی بچی۔ برماس اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ خوبصورتی میں یہ لڑکی اپنا مثل نہ رکھتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی شہر کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ لے تو وہ فوراً جل کر خاک ہو جاوے گا۔ باپ کے ناز و نعمت نے انوکا کو نہایت بدمزاج اور ضدی بنا دیا تھا۔ فضول خرچی اس کا معمولی شیوہ تھا۔ اَرسن اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا۔ وہ اکثر اس کے مکان کے سامنے بیٹھ کر بانسری بجایا کرتا تھا۔ ایک روز جب انوکا اپنے دروازہ پر کھڑی تھی، ارسن اس کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔

ارسن ۔ انوکا! تمھیں معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ اگر مجھے اپنے باپ یا دادا کا خوف نہ ہوتا تو میں تم سے شادی کرنے کی درخواست کرتا۔ اور اگر تم میرے ساتھ شادی کرنے کا پورا یقین دلا دو تو میں اُس کی بھی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

انوکا ۔ (نہایت شوخ نگاہوں سے ارسن کی طرف دیکھ کر) ارسن! تم اس جنجال میں نہ پڑو۔ میں تمھارے ساتھ شادی کیوں کرنے لگی۔ مجھے تو فلپ ہی بہت پسند ہے۔ میں تو اُس کے ساتھ شادی کرونگی۔

ارسن ۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمھیں فلپ کے ساتھ شادی کرنے کی بخوشی اجازت دیدوں گا۔ بھلا کوئی تمھیں ہاتھ تو لگا دیکھے پھر دیکھنا یا تو میں نہیں یا وہ نہیں۔

انوکا ۔ (غصّہ کے لہجہ میں) تو کیا تمھارا یہ منشا ہے کہ میں کبھی شادی ہی نہ کروں۔ بس اب تم اس معاملہ میں مجھ سے گفتگو ہی نہ کرو۔

ارسن نے ان الفاظ کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے انوکا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے پاس گھسیٹ کر اپنے دونوں ہاتھ انوکا کی گردن میں ڈالدئے۔ انوکا ڈری اور ٹھٹکی اس کے بدن میں حس و حرکت بالکل نہ تھی۔ تھوڑی دیر خاموش رہکر اس نے ارسن سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ ارسن نے کچھ تو بہ مصلحتِ وقت اور کچھ اس کی درخواست پر اُسے چھوڑ دیا۔

گھر پہونچکر ارسن کو انوکا کی یاد نے آگھیرا۔ وہ کچھ تو انوکا کے شادی نہ کرنے سے ملول تھا اور کچھ اس کی اتنی جلد مفارقت کا اثر اس کے قلب پر زیادہ تھا۔ اس نے ان تکالیف کو دور کرنے اور تھوڑی دیر انوکا کی یاد کو

بھلانے کے لئے شراب کا ایک جام پیا اور صحن میں ایک تختہ پر آکر بیٹھ گیا۔ رات آگئی۔ چاروں طرف تاریکی بڑھنے لگی۔ ارسن کے سینہ میں طپش محسوس ہوئی بجائے اس کے کہ اُسے انوکا کی یاد تھوڑی دیر کی لئے بھول جاتی وہ اور بھی راسخ ہوگئی۔ جب نشہ زیادہ ہوا اس وقت اُس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ مختلف شکلیں سے نظر آنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ کتے صحن سے گزر رہے ہیں۔ مویشی چراگاہوں سے واپس آرہے ہیں۔ گھوڑے اصطبل میں ہنہنا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے دیکھا کہ ایک مرغی درخت سے کودی اور دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر درخت پر جا بیٹھی۔ اسے سستی محسوس ہوئی۔ اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ وہ پہلے ڈرا۔ ٹھٹھرا اور پھر ہنسنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ انوکا اس کے سامنے کھڑی ہے۔ پھر یہ سمجھ کر کہ وہ قریب المرگ ہے۔ ایک تختہ پر لیٹ گیا۔ اُس نے دیکھا کہ انوکا اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ اور وہ خود ایک گھوڑے پر سوار ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ تمام باتیں صرف اس لئے تھیں کہ اس نے پہلی مرتبہ شراب پی تھی اور بہت کثرت سے پی تھی۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ ولنکا کو کسی چیز کی تلاش میں باہر آنا پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ اَرسن شراب کی صُراحی ہاتھ میں لئے لت پت پڑے ہیں۔ اسے بہت حیرت ہوئی وہ اَرسن کے قریب آگئی اور شانہ ہلا کر کہنے لگی۔

ولنکا ۔ ارسن! ارسن! (ارسن نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں) تم نے شراب پی ہے؟۔

ارسن ۔ ہاں۔

ولنکا ۔ کیوں؟

ارسن ۔ صرف اس لئے کہ میں فلپ کو قتل کردوں۔

ولنکا ۔ پیارے ارسن! فلپ نے تمہارا کیا قصور کیا؟

ارسن ۔ وہ انوکا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

ولنکا ۔ تو پھر تمہیں کیا، کرلینے دو۔

ارسن ۔ لیکن میں تو نہ کرنے دوں گا۔

ولنکا نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور پوچھا

کیا تم انوکا کے ساتھ شادی کروگے؟

ارسن ۔ ہاں۔ (یہ کہکر وہ زار زار رونے لگا) بھائی نے ..... کیوں شادی کی

..... میں ..... ایں ..... ایں ..... ایں ..... میں بھی شادی کروں گا۔

ولنکا نے پھر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور کہا۔

ولنکا ۔ میرے بچے! تم گھبراؤ مت۔ میں اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ تمھارے باپ یا دادا سے کہکر اس کا کوئی بندوبست کرا دوں گی۔ اب آؤ۔ چلو آرام سے سو رہو ورنہ اگر تمھارے داداجان کو کچھ خبر ہوگئی تو وہ تم پر بہت ناراض ہوں گے۔

ارسن ۔ خدا کی قسم مجھے تو اسی کی فکر ہے۔ یہ کہکر وہ ولنکا کے ساتھ ہولیا۔

ولنکا نے اسے ایک کمرہ میں لیجا کر لٹا دیا۔ اور چادر اُڑھا دی۔ اور پھر باورچی خانہ میں دوڑی گئی کہ سب عورتوں سے یہ قصہ بیان کرے۔ عورتیں یہ سُن کر بہت رنجیدہ ہوئیں اور اُنھوں نے کہا کہ اگر انوکا ہمارے گھر آگئی تو بہت بُرا ہوگا۔

اُن میں ایک عورت ۔ ہاں وہ بڑی نخرے باز ہے۔

دوسری ۔ محض یہی نہیں بلکہ وہ آوارہ بھی ہے۔

تیسری ۔ ارے وہ بڑی مکارہ ہے۔ خدا ہماری مدد کرے۔

تھوڑی دیر یہ گفتگو جاری رہی اس کے بعد سب سو گئے۔

صبح کے وقت بلوگی (ارسن کا باپ) راڈوکا کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے سُنا ہے کہ ارسن انوکا پر عاشق ہوا ہے۔ ولنکا کا بیان ہے کہ رات کو اُس کی حالت بہت خراب تھی۔

راڈوکا ۔ کیوں اُس نے کیا کیا؟

بلوگی ۔ اس نے رات کو خوب شراب پی اور کہتا تھا کہ میں توفلپ کو مار ڈالوں گا۔

راڈوکا ۔ دیکھو میں تمھیں سے جاکر کہتی ہوں۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔

یلوگی - مگر شراب پینے کا تذکرہ نہ کرنا۔
راڈوکا - (ٹھنڈی سانس بھر کر) خدا ہمیں معاف کرے۔

راڈوکا نے متھیس سے تمام قصہ بیان کر دیا۔ اسے پہلے تو بہت حیرت ہوئی لیکن اُس نے تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد اس واقعہ کے انجام پر غور کرتے ہوئے راڈوکا سے کہا کہ اگر ارسن کی یہی خواہش ہے تو اُسے بیاہ دینا چاہیئے کیونکہ بزرگوں کا قول ہے کہ نوجوانوں کی خواہشات کو کبھی نہ مارنا چاہیئے اس لئے کہ یہ ان کے لئے بہت مضر ہے۔

راڈوکا - خدا تمھیں سلامت رکھے تم نے خوب بات کہی۔

انوکا کی شادی ارسن کے ساتھ ہو گئی۔ اُس نے اپنی فطرت کے مطابق گھر والوں کو پریشان کرنا شروع کیا۔ چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ وہ گھر دوزخ سے بدتر ہو گیا۔ وہ اچھے اچھے کپڑے پہنتی اور نہایت بناؤ سنگار کے ساتھ رہا کرتی۔ اس کی فضول خرچی پر ارسن نے اُسے ایک دن بہت سمجھایا لیکن اُس نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور یہ کہکر ٹال دیا کہ اگر تم مجھے اس طرح خرچ نہ کرنے دو گے تو میں اپنے باپ سے کہکر تمام سامان مہیا کر لوں گی۔ غرض ارسن کا تو اُس نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

ایک دن وہ کہیں باہر گئی ہوئی تھی کہ تمام لڑکیوں نے ایک کمیٹی کی اور یہ طے پایا کہ متھیس سے یہ واقعات بیان کئے جاویں، ممکن ہے کہ وہ کوئی تدارک کر دے۔ متھیس سے انوکا کی تمام شرارتیں اور بیہودگیاں بیان کر دی گئیں ارسن نے بھی بہت برا بھلا کہا کہ جس پر متھیس بہت ناراض ہوا اور کہنے لگا کہ یہ سب مصیبتیں آج تمھاری ہی بدولت پیش آئیں۔ تمھیں نے میرے گھر کا ستیاناس کیا، اور تم ہی نے میری آزادی میں خلل ڈالا۔ ارسن دل میں تو بہت پچھتایا کہ میں نے کیوں اس وقت اس کا تذکرہ کیا لیکن بعد میں کچھ سوچا اور کہنے لگا۔ دادا جان! مجھ سے خطا ہوئی۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ متھیس نے اسے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا اور جب انوکا واپس ہوئی تو اُسے اپنے پاس بلا کر اس طرح مخاطب ہوا۔

متھیس - بیٹی! میں نے سُنا ہے کہ تم نے گھر والوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ دیکھو یہ باتیں اچھی نہیں ہوتیں۔ اب تک تو جو کچھ تم نے کیا وہ معاف ہے مگر خبردار اب میرے گھر میں اس طرح کے قصے نہ ہوں

میں یہ روز روز کے جھگڑے نہیں پسند کرتا رہا اگر تمھیں کوئی شکایت ہے تو میں اس کا تدارک کرنے کو تیار رہوں۔
یہ کہہ کر اُس نے گھر کی تمام عورتوں کو جمع کیا اور اس طرح مخاطب ہوا۔
متھیس ۔ دیکھو میں آج سے تم لوگوں پر اس فرض کو واجب گردانتا ہوں کہ تم میں سے ہر عورت انوکا کے ہر حکم کی تعمیل کرے۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھنا کہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ سب عورتوں نے اس کا اقرار کیا لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ چاہتے تھے کچھ اور ہو گیا کچھ۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اب متھیس کی منشا کے خلاف کرے۔ انوکا تو دل ہی دل میں خوش تھی۔ وہ ایک مرتبہ باورچی خانہ میں دوڑی گئی اور ہر عورت پر مختلف احکام صادر کرنا شروع کر دیئے۔ دیکھو فلاں! تم جاؤ اُس درخت کے نیچے میرا پلنگ بچھاؤ۔ اور فلاں! تم راڈوکا کا چھوٹا تکیہ میرے سرہانے رکھ دینا۔ اور سپٹریا جب میں سو جاؤں تو تم ایک چھڑی لے کر چڑیوں کو ہنکاتی رہنا تاکہ میری نیند میں کوئی خلل نہ پڑے۔ جاؤ اور سب کچھ ابھی کرو۔ تمام عورتیں دوڑی گئیں کسی نے پلنگ لیا۔ کسی نے تکیہ اور کسی نے گدّا غرض بات کی بات میں تمام سامان لیس تھا۔

رات آگئی اور انوکا اپنے بستر پر جا لیٹی۔ سپٹریا بیچاری چھڑی لے کر اس کے سرہانے کھڑی ہوگئی تاکہ چڑیوں کو ہنکاتی رہے۔ انوکا تھوڑی دیر سوئی ہوگی کہ پٹریا کی آنکھ بھی لگ گئی چڑیوں کی چاؤں چاؤں سے انوکا جاگ اُٹھی اُس نے دیکھا کہ پٹریا سو رہی ہے۔ اُسے بہت غصہ آیا۔ اُس نے ایک لات مار کر اُسے اُٹھایا اور کہا کہ خبردار! اگر اب سوئی تو تجھے مار ہی ڈالوں گی۔ پٹریا مصیبت کی ماری اُٹھی اور پھر چڑیاں ہنکانے لگی۔ انوکا پھر سوگئی۔
وہ تھوڑی دیر سوئی ہوگی کہ اُس کی آنکھ پھر کھل گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور چہرہ پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اُس نے دیکھا کہ پٹریا اس کے سرہانے کھڑی ہے۔ وہ اپنے پلنگ پر سے اُٹھی اور دوڑ کر پٹریا سے لپٹ گئی اور خوشامد کے لہجہ میں کہنے لگی۔
انوکا ۔ پیاری پٹریا اب تم جا کر سو رہو۔
پٹریا نے اسے عین خدا کی رحمت تصور کیا اور اپنے دل میں اُسے بُرا کہتی ہوئی چلدی۔ وہ تھوڑی

رہی تھی کہ انوکا نے آواز دی پڑیا! پڑیا!

پڑیا ڈر گئی کہ دیکھئے اب کیا آفت نازل ہوتی ہے۔ وہ کانپتی ہوئی انوکا کے قریب آئی اور کہنے لگی اب کیا حکم ہے؟

انوکا ۔ پیاری پڑیا تم مجھے معاف کر دو۔

پڑیا ۔ پیاری انوکا۔ خدا تمھیں معاف کرے۔

انوکا ۔ پڑیا۔ میری پیاری بہن ... یہ کہ کر وہ پڑیا سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پڑیا، انوکا کو اس طرح روتا دیکھ کر تمام رنجشیں بھول گئی اور دونوں بچوں کی طرح زار و قطار رونے لگے

انوکا ۔ پڑیا۔ میری پیاری پڑیا۔ اب میں تم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہوتی ہوں۔ اب میں اس دنیا میں زیادہ رہنا پسند نہیں کرتی۔ میں تم سے ایک دو وصیتیں کرتی ہوں جب میں مرجاؤں تو تم مجھے غسل دینا۔ کفن پہنانا۔ اور میرے کفن میں ایک سیب کاٹ کر رکھ دینا۔ یہ سب میں تم سے اس لئے کہتی ہوں کہ تمام عورتوں میں تم ہی مجھ سے دلی محبت رکھتی ہو۔

پڑیا ۔ میری پیاری! تم سے ہر شخص محبت کرتا ہے۔

انوکا ۔ نہیں! مجھے معلوم ہے۔

پڑیا ۔ تم نے یہ کیونکر جان لیا کہ کوئی تم سے محبت نہیں کرتا۔ تم نے تو آج تک کسی سے بات بھی نہیں کی۔

انوکا ۔ اچھا پڑیا اب میں دادا جان سے رخصت ہونے جاتی ہوں۔ خدا حافظ!

پڑیا نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے مُنھ پر رکھ لئے۔ انوکا نے دونوں ہاتھ ہٹا کر اپنی گردن میں ڈال دیئے اور کہنے لگی۔

انوکا ۔ دیکھو پڑیا۔ اگر میں مرجاؤں تو تم میری برائی نہ کرنا۔ لو جاؤ خدا حافظ! بس مجھے یہی کہنا تھا۔

پڑیا ۔ انوکا۔ تم خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔

انوکا۔ میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی کہ کیجا سکتی ہے۔

پٹریا۔ اب تم کہاں جاتی ہو۔

انوکا۔ خدا کے واسطے اب تم میرے پاس سے چلی جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔

پٹریا انوکا سے رخصت ہو کر مکان کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ انوکا اب کیا کرے گی۔ تمام گفتگو اس کے دماغ میں گونج رہی تھی لیکن وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکی۔ اُس نے دیکھا کہ انوکا متھیس کے دروازہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

متھیس کو آج تمام رات نیند نہ آئی تھی۔ گزشتہ واقعات اس کے دماغ کو پریشان کئے ہوئے تھے وہ سوچ رہا تھا کہ انوکا کے بارہ میں اُسے کیا روش اختیار کرنی چاہیئے۔ کہ اتنے میں مرغوں کے اذان کی آواز اس کے کان میں پہونچی۔ وہ اپنے بستر سے اُٹھا اور غسل کی نیت سے کوئیں کو جانا چاہا۔ دروازہ پر پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ عورت بیٹھی ہوئی ہے چونکہ اندھیرا ابھی موجود تھا اس لئے وہ نہ پہچان سکا کہ کون ہے۔ اُس نے آواز دی۔ تم کون ہو؟۔

انوکا۔ دادا جان میں ہوں انوکا۔ میں تم سے ہمیشہ کے واسطے رخصت ہونے آئی ہوں۔ خدا کے لئے تم مجھے معاف کر دو۔

متھیس۔ میری پیاری تو نے کیا کہا۔ یہ تو بہت بڑا گناہ ہے۔

انوکا بڑھی۔ اس نے متھیس کے دامن کو اُٹھا کر بوسہ دیا اور کہنے لگی۔

انوکا۔ دادا جان۔ میں نے تمھارے بڑے قصور کئے ہیں۔ میں نے تمھارے گھر کو تباہ کیا اور تمھاری راحت میں خلل ڈالا۔

متھیس رونے لگا۔ اس نے انوکا کو اپنے سے لپٹا لیا اور پیار کر کے کہنے لگا۔

متھیس۔ آؤ چلو اندر چل کر بیٹھیں۔ دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔

تھوڑی دیر کے بعد متھیس نے انوکا سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ۔ دونوں اُٹھے۔ متھیس انوکا کو کنوئیں پر لے گیا اور کہنے لگا۔ انوکا اس میں سے تھوڑا سا پانی کھینچو۔ انوکا نے حکم کی تعمیل کی۔

متھیس - تھوڑا سا پانی پھینک دو۔ انوکا نے پانی کم کر دیا۔ متھیس نے اس سے غسل کیا اور انوکا سے کہا کہ میرے بال خشک کر دو۔

انوکا تولیہ سے اس کے بال خشک کرنے لگی۔ متھیس زار و قطار رو رہا تھا۔ چونکہ دن چڑھ آیا تھا اس لئے تمام لوگ جاگ اُٹھے تھے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ متھیس رو رہا ہے اور انوکا اس کے بال خشک کر رہی ہے تو اُنھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اُن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے۔ وہ لوگ صحن میں خاموش کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ متھیس نے ان سب کو اپنے پاس بلایا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو انوکا اس وقت میرے ہر حکم کی بخوشی تعمیل کر رہی ہے تم لوگ اس سے خواہ مخواہ بدظن ہو۔ وہ تم سب کو اس وقت نہلائے گی۔

سب کنوئیں پر جمع ہوئے اور انوکا نے باری باری سب کو پانی پہونچایا۔ جب سب فارغ ہو چکے تو انھوں نے انوکا کا نہایت زوروں کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔

متھیس اس وقت بہت خوش تھا وہ دوڑا ہوا اپنے کمرہ میں گیا۔ ایک صندوق کھولا اور اس میں سے موتیوں کی ایک مالا نکال کر رومال میں بحفاظت رکھ دی۔ وہ اس رومال کو کرتے کے ایک دامن میں چھپا کر کنوئیں پر واپس آیا دیکھا کہ سب غسل سے فارغ ہو چکے تھے۔ اُس نے سب کو مخاطب کیا اور کہا کہ انوکا نے سب کو اس وقت نہلایا ہے دیکھیں اُسے کون نہلاتا ہے۔ سب عورتیں دوڑیں لیکن اُس نے انھیں روک دیا اور کہا کہ پیاری انوکا کو میں خود نہلاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ انوکا کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ آ۔ میری پیاری بچی۔ آ میں تجھے خود نہلاؤں گا۔ انوکا کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئی متھیس پانی ڈالتا رہا۔ جب وہ نہانے سے فارغ ہوئی تو متھیس نے اُس کے سر کے بال خشک کئے اور موتیوں کی مالا اس کی گردن میں ڈال دی۔ اُس نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں پھر تم لوگوں کو تنبیہ کرتا ہوں۔ جو شخص اس کی عدول حکمی کرے گا خدا اُس سے بدلا لے گا۔ سب نے اُس کے حکم بجا لانے کا اقرار کیا اور ہنسی خوشی واپس گئے۔

سیّد مہدی علی خاں

ترانۂ دل

میرے جوہر کا اضطراب ہے زیست — میرے گوہر کی آب و تاب ہے زیست
میرے احساس کی نمود ہے جان — میرے جذبات کا شباب ہے زیست

(۲)

یونہی مسحورِ ہست و بود کا ہے — تو کرشمہ مری نمود کا ہے
میری بالیدگی کی پوجا کر — تیرا مقصد اگر صعود کا ہے

(۳)

دہر بھی میں ہوں اور زمانہ بھی — میں حقیقت بھی ہوں فسانہ بھی
تو ہے گلشن نمود سے میری — میں شجر بھی ہوں اور دانہ بھی

(۴)

چاند سورج مرے غلاموں میں — مئے انجم ہے میرے جاموں میں
سُن انھیں اور گوشِ ہوش سے سُن — زندگی ہے مرے پیاموں میں

امینِ حزیں

خواب گاہ فطرت

... فطرت کی خوابگہ میں یہ کون ہر سمت چھا رہی ہے
لطیف نغمے سُنا سُنا کر نظر کو بے خود بنا رہی ہے

...میں شوخی چمک رہی ہے نظر میں سُرخی جھلک رہی ہے
سیاہ زلفوں کی تیرگی میں شگفتگی مسکرا رہی ہے

...وں میں شعلے دہک دہک کر دلوں کو بیتاب کر رہے ہیں
نظر میں بجلی تڑپ تڑپ کر جہاں کو خیرہ بنا رہی ہے

...لیٔ حسن و بہشتی ہے وہ مرکز ناز و بے خودی ہے
نگاہ میں میکدے بھرے ہیں ہر اک کو جن سے پلا رہی ہے

...میں خاموش ہو رہی ہیں ہوائیں بے ہوش ہو رہی ہیں
نگاہ بجلی بنی ہوئی ہے جو ہر طرف جگمگا رہی ہے

...ی تو وہ نیند کی پری ہے ہوا ہے ہر اک پہ جس کا سایہ
ہر اک سے آنکھیں لڑا لڑا کر جہاں کو بیخود بنا رہی ہے

عجیب منظر نگاہ میں ہیں عجیب نقشے خیال میں ہیں
یہ اس کی فطری لطافتیں ہیں کہ ہر نظر میں سما رہی ہے

...ی کی آنکھوں میں اس کی آمد سکون و فرحت کی ایک ساعت
کسی کو کرتی ہے مست راحت کسی کو غمگیں بنا رہی ہے

ہر ایک شے پر غنودگی ہے ہر ایک مے نوش بے خودی ہے
مجھے بھی مدہوشِ خواب کر کے عجیب منظر دکھا رہی ہے

کوئی ہے مصروف سیرِ گلشن کوئی ہے فردوسِ آرزو میں
کسی کو محروم خواب کر کے کسی کے غم میں رُلا رہی ہے

...ہیں نسیم سحر کے جھونکے کسی کو جا جا کے چھیڑتے ہیں
کہیں ادائے نظر فریبی کسی پہ بجلی گرا رہی ہے

کہیں کوئی وقفِ ناز ہو کر نوازشِ آرزو کا خواہاں
کہیں کوئی بے نیاز ہو کر دلوں کی دنیا ہلا رہی ہے

کہیں فضائیں ہیں وقفِ نغمہ ہر ایک نغمہ ہے سازِ اُلفت
کہیں نوائے خموشِ فطرت جہاں کی مستی بڑھا رہی ہے

ہر ایک سرشارِ بے خودی ہے تمام عالم ہے مستِ راحت
جہاں کو مدہوشِ خواب کر کے تمام دنیا پہ چھا رہی ہے

...سی کی نظروں میں رنج و حسرت کسی کی آنکھوں میں خوابِ راحت
کسی کو نیرنگیٔ جہاں کے حسین منظر دکھا رہی ہے

...ی کو مست شباب کرتی کسی کو وقفِ حجاب کرتی
کسی کو مدہوشِ خواب کرتی ہر اک نظر میں سما رہی ہے

خلیلؔ یہ نیند کی پری ہے جہانِ افکار سے بری ہے
”جوانیوں کو اُمنگ دینے جوان بن بن کے آرہی ہے“

خلیلؔ شاہجہانپوری

دیوانہ

تم کہتے ہو میں دیوانہ ہوں، فرطِ غم نے میرے دماغ کو مختل کر دیا ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں۔

دیوانہ .... اُف! کس قدر خوفناک لفظ ہے، کتنا تکلیف دہ۔ جب تم کہتے ہو "دیوانہ ہے" تمہارے منہ سے آگ نکلنے لگتی ہے، تمہاری آواز ایک زہریلے سانپ کے پھنکاروں سے کہیں زیادہ دہشت ناک ہو جاتی ہے اور ایک زہر، ایک مہلک زہر میرے دل و دماغ، حتیٰ کہ رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جا رہا ہے جس کی تکلیف کی تاب نہ لا کر میں کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہوں، اور بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بچے میری طرف پتھر پھینکتے ہیں، ہنستے ہیں اور مسرور نظر آتے ہیں۔ میں اُن کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں اور مسکرا دیتا ہوں، کیونکہ میں دنیا کی معصوم ترین ہستیوں کے لیے باعثِ تفریح بن جاتا ہوں۔ بیشک وہ معصوم ہستیاں ہیں، مقدس روحیں ہیں، جن کا پروازِ تخیل مسرت کی فضا سے زیادہ بلند نہیں ہوتا، اور جن کی رسائی عقل انبساط کی اُس حد تک پہنچ کر رک جاتی ہے جس سے آگے رنج و تکلیف، کلفت و آلام کا گہرا اور تاریک غار ہے، وہ اُس غار سے نا آشنا ہوتے ہیں، قطعاً بے خبر۔ لیکن جب تم میری حرکات پر ہنستے ہو تو مجھ کو تمہاری کج فہمی پر ہنسی آ جاتی ہے اور میں بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھتا ہوں۔ تم پھر مسکراتے ہو، تمہارے ہونٹوں کو جنبش ہوتی ہے اور تم ہنس پڑتے ہو۔ شاید تم کہتے ہو "دیوانہ ہے"۔ میں کانوں میں انگلیاں دے بھاگا چلا جاتا ہوں۔ بچے میرا تعاقب کرتے ہیں اور پتھر بھی پھینکتے جاتے ہیں، حتیٰ کہ میں اُن حدود میں داخل ہو جاتا ہوں، جن سے آگے بڑھنے میں بچے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے وہ مایوس ہو کر کہتے ہیں "بس۔ اب وہ قبرستان میں جا گھسا"

مگر یہ غلط ہے، سر بسر غلط۔ میں دیوانہ نہیں ہوں، میرا دماغ صحیح ہے، میرے حواس بجا ہیں۔ مجھے اپنے گرد و پیش، اپنے ماحول کا احساس ہے، وہ احساس جس سے دیوانہ بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کی قوت تمیز سلب ہو جاتی ہے"

ں کے قوائے ذہنی میں فتور آجاتا ہے۔ اُس کے دماغ میں غیر مسلسل خیالات کا سلسلہ بندھا رہتا ہے، وہ بغیر کسی کوشش
ے عالم تصور میں نرالے اور غیر متعلق مناظر دیکھتا ہے، جن سے متاثر ہو کر عجیب و غریب حرکات کرنے لگتا ہے۔ کبھی روتے
وتے اچانک ہنس پڑتا ہے کبھی ہنستے ہنستے فوراً خاموش ہوجاتا ہے اور نہایت سنجیدہ اور متین نظر آنے لگتا ہے۔
ی بے معنی جملوں اور مہمل الفاظ کا تار باندھ دیتا ہے جنھیں وہ خود بھی نہیں سمجھتا۔ بلاشبہ وہ کوشش کے باوجود بھی
ے آسان بات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ لیکن میں   میں دیوانہ نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں کہاں ہوں۔
وہ آبادی ہے جہاں ہر سمت کلی سکوت ہے، موت کا سا سناٹا یہ خطہ شور و غل سے ناآشنا ہے اور ہنگامہ سے قطعاً پاک
ہو لوگ ہنگامۂ ہستی سے اکتا جاتے ہیں وہ اسی آبادی میں آکر پناہ لیتے ہیں اور مادی آنکھوں سے ہمیشہ کے
لیے روپوش ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر اُن کو وہ سکون حاصل ہوتا ہے، جس کے لیے وہ اس سے قبل بےچین
تے۔ وہ یہاں سے لوٹنا نہیں چاہتے، شاید وہ ایسا کر بھی نہ سکتے ہوں، یہاں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ آبادی
سومات سے یکسر معرا ہے مگر ایک رسم۔ مساوات، اس پر کاربند ہونا ضروری ہے جس سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں۔

جدھر نگاہ اٹھاتا ہوں، سکوت ہی سکوت نظر آتا ہے۔ مجھے اس جگہ ایک گونہ اطمینان حاصل ہے، کیونکہ یہاں
دیوانہ، یا آتشیں لفظ سننے میں نہیں آتا، جو مجھ پر بجلی گرا دیتا ہے۔ وہ بجلی جو میری روح تک کو خاکستر کر جاتی ہے، شاید
یہ لوگ غلط بیانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ میں اپنے چاروں طرف مٹی کے ڈھیر دیکھتا ہوں جو قریباً یکساں جگہ گھیرے
ہیں، ان کی نوعیت میں بھی چنداں تفاوت نہیں، کیونکہ یہ مساوات کے اصول پر بنائے ہوئے مکانات ہیں جن
میں لوگ نہایت راحت و سکون سے بسر کرتے ہیں۔ ہر ڈھیر کے سرہانے ایک پتھر کھڑا ہے۔ جن پر مختلف تحریریں کندہ
ہیں . .. . . یہ قبرستان ہے۔

جس قبر کے نزدیک میں بیٹھا ہوں اس کے پتھر پر جلی حروف میں تحریر ہے..... ہاں میں بخوبی پڑھ سکتا ہوں۔

معصوم ارمانوں کا مدفن

کتنا مناسب جملہ ہے اور اہل قبر کی تاریخ حیات کا کس قدر صحیح اور مختصر مرقع ہے۔ لیکن یہ نامکمل تھا اور محض ایک
رخ پر روشنی ڈالتا تھا۔ میں نے اس کے نیچے دوسرا جملہ بڑھا کر مکمل کر دیا ہے۔

ضمیر کی کائنات کا دفینہ

یہ جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ میں اُس ایک حرف تک کے سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا
جو جھوٹ ہو۔ کیا یہ جھوٹ نہیں کہ میں دیوانہ ہوں جبکہ میں صحیح الدماغ انسانوں کی طرح سوچ سکتا ہوں
ہوں، تصور کر سکتا ہوں۔ عام انسانوں کی طرح میرا حافظہ صحیح و سالم ہے۔ مجھے بچپن سے اب تک کے سب
معمولی سے معمولی واقعات حرف بحرف یاد ہیں۔ میں عالمِ تصور میں اُن کا مکمل نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ ایسے
سے معلوم ہونے لگے کہ تمام واقعات میرے روبرو وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ کیا ایک دیوانہ ایسا کر سکتا ہے

مجھے اپنی زندگی کا وہ زمانہ یاد ہے جو صحیح معنی میں حاصلِ زندگی کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں اطمینان
و سکون کے گہواروں میں جھولتا تھا، راحت و مسرت میری تابع فرمان تھیں، اس لئے تمام کائنات پر میری حکومت
تھی۔ لیکن میں اس حکومت کا تنہا مالک نہ تھا۔ اس میں میری شریک ایک اور ہستی تھی، ایک مقدس روح۔ یہ زہرہ
تھی، میری خالہ زاد بہن زہرہ۔ کیا وہ زمانہ، وہ عہدِ طفلی جو اُس کی معیت میں بسر ہوا، فراموش ہو سکتا ہے۔ کیا
اُس زمانہ کا ایک ایک لمحہ میرے حافظہ میں محفوظ نہیں ہے، بے شک مجھے اپنے حافظہ پر ناز ہے، یہی ایک چیز ہے
جو میرے لئے باعثِ سکون ہے، یہی ایک میری زندگی کا سہارا ہے۔ میں وہ وقت نہیں بھول سکتا، کوشش کے باوجود
بھی نہیں، جب میں اور زہرہ اُس خوبصورت اور مختصر باغیچہ میں، جو اُن کے مکان سے ملحق تھا، اپنے فرصت کے
لمحات گذارا کرتے تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانہ تمام تر فرصت تھا، سوائے اُس مختصر وقت کے جو پڑھنے لکھنے میں صرف
ہوتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں سادگی تھی، سنجیدگی تھی اور جدت بھی۔ اُس کو مجھ سے محبت تھی، ایک بے لوث محبت۔ مجھے
اُس سے الفت تھی، ایک بے غرضانہ الفت۔ جب ہم باغیچہ کی روشوں پر ٹہلا کرتے، تو باغیچہ کی دنیا تقدیس محبت کے
نشہ میں سرشار ہو جاتی، ہر شجر، ہر پتہ، ہر پھول مستانہ وار جھومنے لگتا، بلبل مسرور ہو کر راگ الاپ اٹھتی، طیور نغمہ
ریزیاں کرتے اور تمام فضا ہماری محکوم نظر آتی۔ ہم شاہانہ وار خرام کرتے رہتے، حتیٰ کہ تھک کر کسی سایہ دار شجر کے
بیٹھ جاتے اور زہرہ اپنے نرالے اور معصوم مشاغل میں مصروف ہو جاتی۔ وہ گلاب کا پھول توڑ کر چنبیلی کی ٹہنی پر
اٹکا دیتی اور دور ہٹ کر اُس کی خوبصورتی کا جائزہ لیتی۔ کبھی چنبیلی کی کلیاں سبزہ پر بکھیر دیتی اور کہتی۔

"ظہیر! دیکھو کیسی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے اندھیری رات میں ستارے"

میں مسکرا دیتا، وہ خوش ہو جاتی اور باغیچہ کی مخلوق معلوم ہونے لگتی ...... ایک مہکتا ہوا پھول، ایک ادھ کھلا غنچہ جس کی تخلیق، حسن، سادگی، معصومیت اور محبت کے عناصر سے ہوئی ہو کبھی تتلی کو پکڑنے کی کوشش میں وہ تعاقب کرتی اور خود بھی ایک حسین و سادہ تتلی بن جاتی جو پرواز میں مصروف ہو۔ میں اُس واقعہ کو کبھی نہیں بھول سکتا جب زہرہ نے مجھے گلاب کا خوبصورت بڑا پھول توڑنے کے لیے کہا جو پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر لگا ہوا تھا اور اُس کی دسترس سے باہر تھا۔ اس پھول کے توڑنے میں مجھے بھی کوشش کرنا پڑی اور میرے ہاتھ پر کانٹے سے ایک معمولی خراش آ گئی جس کی وجہ سے ایک لہو کا قطرہ جلد پر نمایاں ہو گیا۔ وہ میرے نزدیک کھڑی تھی، اور اُس نے خراش کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے پھول اس کی طرف بڑھا دیا، اُس نے ہاتھ میں لے لیا۔ مگر اُس کے چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی، غصہ کی سرخی۔ اُس نے پھول کو مسل کر پتی پتی کر دیا اور سبزہ پر بکھیر دیا۔ میں نے حیرت سے زہرہ کی جانب دیکھا۔ وہ نہایت بھولے پن سے بولی "یہ تو کچھ اچھا نہ تھا" .... اُف! انتقام لینے کا کس قدر معصوم اور سادہ طریقہ تھا۔

کون جان سکتا ہے کہ میں اُس زمانہ کے تصور میں کس قدر فرحت و سکون پاتا ہوں۔ میں خود کو ہلکا محسوس ہونے لگتا ہوں، ایک پھول سے زیادہ ہلکا۔ میری رگ رگ میں وہ گرم اور پاک خون دوڑنے لگتا ہے، میرا دل انھیں معصوم اور مقدس جذبات سے مملو ہو جاتا ہے، مجھے وہی اطمینانِ قلب نصیب ہو جاتا ہے جو بزرگوں کی شفقت اور زہرہ کی صحبت میں نصیب تھا اور میں ایک بار پھر اُسی عہدِ طفلی میں پہنچ جاتا ہوں۔ زہرہ، حسن، سادگی اور محبت کی پتلی تھی۔ میں اُس کی صحبت میں کس قدر مسرور نظر آتا تھا۔ اور اُس کی محبت سے علیحدہ ہو کر کتنی تکلیف ہوتی تھی۔ میری عدم موجودگی میں وہ ہر کام میں پوری سرگرمی دکھانے سے معذور رہتی اور میری شرکت کے بغیر کسی کھیل یا تفریح میں حصہ لینے کو تیار نہ ہوتی۔ میں بھی اُس سے الگ ہو کر مضمحل ہو جاتا، سخت مضطرب۔ ہم اکٹھا رہنا چاہتے تھے اور ہمیں ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ مجھے وہ راتیں پوری طرح یاد ہیں، میں اُن کا ہو بہو تصور کر سکتا ہوں جب میں اسکول کا کام کیا کرتا تھا اور زہرہ میرے پاس بیٹھی ہوئی اپنا سبق یاد کیا کرتی تھی۔ اُس کی ننھی ننھی معصوم آنکھوں میں نیند کا خمار بھر جاتا، خالہ کہتیں "زہرہ! تمہاری آنکھیں نیند کی وجہ سے بند ہوئی جا رہی ہیں۔ بس، اب

سو رہو"۔ وہ جواب دیتی "امی جان! تھوڑا سا سبق اور رہ گیا ہے"، لیکن وہ سبق اُس وقت تک ختم نہ ہوتا جب تک میں اپنے کام سے فارغ ہو کر اُٹھ نہ جاتا۔

زہرہ میری تقلید کرنے میں فرحت محسوس کرتی اور اُس پر فخر کیا کرتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا اور اُس چارپائی پر لیٹا ہوا تھا جو ہمارے مطالعہ کے کمرہ سے ملحق ایک کمرہ میں بچھی ہوئی تھی۔ زہرہ کے پڑھنے لکھنے کا وقت تھا مجھے شدت کا تپ چڑھا ہوا تھا۔ زہرہ بار بار آ کر پوچھ رہی تھی "ظہیر! تم اب کیسے ہو"۔ میں ہر بار کہہ دیتا "اچھا ہوں"، لیکن اُس کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں سے پریشانی برس رہی تھی۔ خالہ نے جبکہ مجھے دوا پلانے کے لئے آئی تھیں کہا "زہرہ! تم کیوں وقت ضائع کر رہی ہو، جا کر سبق یاد کرو"

زہرہ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا "امی جان! ہمارے سر میں درد ہو رہا ہے ہمیں بھی دوا پلا دو"۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑیں اور زہرہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"میری بچی! تم کس قدر بھولی ہو"

فی الحقیقت اُس نے نرالے انداز میں اظہار ہمدردی کیا تھا۔

مسرت و شادمانی کا زمانہ کتنی جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اس عہد کے سال بھی لمحات بن کر گذر جاتے ہیں اور انسان کے لوحِ دل پر نقوش چھوڑ جاتے ہیں، وہ دل آویز نقوش جو مصیبت کے زمانہ میں بھی اس کا دل بہلاتے رہتے ہیں۔ وہ اُس زمانہ کے تصور میں اپنی مصیبت کو بھول جاتا ہے اور کچھ عرصے کے لئے مطمئن و مسرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس تصور سے وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جو سلیم الطبع ہو، جس کے قوائے ذہنی سالم ہوں نہ کہ ایک دیوانہ جس کی قوت تخیل مسلوب ہوتی ہے اور جس کے دماغ سے ماضی کی یاد یکسر محو۔

اب ہم اُس زمانہ کو خیرباد کہنے والے تھے جو سرور و انبساط کے زریں خزانوں کی وجہ سے شاہی زمانہ کہلاتا ہے اور اُس عہد سے ہم آغوش ہونے کو تھے جو صدہا نیرنگیوں کا حامل ہوتا ہے۔ اب ہماری عقل میں پختگی آ چلی تھی ہماری قوتِ تمیز روبہ ترقی تھی، ہم میں آغاز و انجام کے تعلق کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو چلی تھی، غرضیکہ ہمارے جملہ قوائے ذہنی تکمیل کی طرف مائل تھے۔ ہماری عادات و اطوار، نشست و برخاست، گفت و شنید، الغرض تمام حرکات و سکنات

ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ لیکن میں زہرہ کو اپنے سے زیادہ متغیر پاتا تھا۔ اب وہ سنجیدگی، خاموشی اور ایک حسین مجسمہ تھی۔ اس غیر معمولی انقلاب نے زہرہ کو میرے لیے پراسرار بنا دیا تھا۔ وہ محبت کے جراثیم جو بچپن سے ہمارے سینوں میں پرورش پا رہے تھے اب اُس میں بالکل مفقود معلوم ہوتے تھے اور اُس کا ساغرِ دل اُس مے سے بالکل خالی نظر آتا تھا جو اکثر چھلک کر اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آجایا کرتی تھی۔

اب میری رہائش ہمارے اپنے مکان میں تھی جو اس مکان سے قریباً نصف میل پر شہر کے دوسرے حصہ میں واقع تھا۔ وہ سایۂ رحمت جس کو والدہ کے مقدس نام سے موسوم کرتے ہیں، میرے سر سے اُس وقت ہی اُٹھ گیا تھا جبکہ میری عمر صرف ۲ سال تھی۔ میں خالہ سے بہت مانوس تھا اور یہی وجہ تھی کہ میری پرورش کا بار انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ یہ نقلِ مکانی کسی نامعلوم مصالح کی بنا پر ہوا تھا، جن کو سمجھنے سے میں آج تک قاصر رہا۔ لیکن کیا میں اُس جگہ کو جہاں میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ گذارا تھا یک قلم فراموش کرسکتا تھا؟ مجھے ہر روز آنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اور فی الحقیقت میں فرصت کا بیشتر وقت وہیں گذارا کرتا تھا۔ لیکن کیا یہ اس لئے تھا کہ مجھے اپنی محسنہ خالہ کے ارشاد کی تعمیل مدنظر تھی۔ شاید مجھے اس کا خیال بھی نہ آتا ہوگا۔ بلکہ یہ اُسی جذبہ کی کارفرمائیاں تھیں جو مجھے بچپن میں ہمیشہ زہرہ کے قریب رہنے پر مجبور کرتا تھا۔ مجھے اب بھی اس سے علیحدہ ہوکر آتنی ہی، بلکہ اُس سے کہیں زیادہ تکلیف پہنچتی تھی جتنی کہ اُس وقت۔ لیکن کیا زہرہ کے دل و دماغ سے پرانے اثرات بالکل محو ہوگئے تھے، کیا اُس کو عہدِ طفلی کی بھول کر بھی یاد نہ آتی تھی، کیا اب اُس کو مجھ سے قطعاً محبت نہ تھی؟ یہ تھا وہ عقدہ جس نے مجھ کو سخت الجھن میں ڈال رکھا تھا۔

وقت گذرتا جا رہا تھا۔ میرے قلب میں شرارِ محبت بھڑک رہا تھا اور شعلہ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ شعلہ میرے دل و دماغ حتیٰ کہ روح تک پر مسلط ہو چلا تھا جس کی حرارت سے میں پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ زہرہ اب زیادہ پراسرار تھی۔ وہ میرے سامنے بہت کم آتی تھی اور میں اب اُس نگاہِ غلط انداز سے بھی محروم کر دیا گیا تھا جو اس سے قبل کبھی کبھی مجھ پر پڑ جاتی تھی۔ جس قدر یہ معمہ زیادہ دشوار و لاینحل ہوتا جاتا تھا اتنا ہی میں اس کے حل کے لیے زیادہ سرگرم و بے تاب نظر آتا تھا۔ قطع نظر اس کے کہ وہ میرے روبرو ہوتی یا نہیں میں اِس مکان میں ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا تھا، کیونکہ میں حتی المقدور زہرہ کے قریب ہوتا تھا۔ تاہم مجھے تنہائی کی تلاش تھی، صرف

دولمحہ کی تنہائی۔ میں اُس سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا جس کا جواب آسانی سے اس معمہ کو حل کر دیتا۔

"کیا تم وہی زہرہ ہو؟"

لیکن اُس نے کبھی اتنا موقعہ نہ دیا۔ حتیٰ کہ مشیتِ ایزدی نے میری مدد کی اور میں نے وہ گوہر مقصود پالیا جس کے لیے میں ایک طویل مدت سے مضطرب تھا۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ قمری مہینہ کا آغاز تھا۔ چاندنی ہر سمت چھٹکی ہوئی تھی، اور میں اُس باغیچہ میں سے گذر رہا تھا جو اُن کے مکان سے ملحق ہے۔ میں شاید اُس روز بے حد مصروف رہا تھا، اس لئے خلاف معمول دن میں پہنچنے سے قاصر رہا۔ ایک سرو کی آڑ میں روش سے اُس طرف زہرہ بیٹھی تھی۔ میں اُس کو دیکھکر ٹھٹک گیا۔ میں نے اُس کو پہچان لیا تھا میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور امید و بیم کے جذبات سے لبریز ہوگیا۔ قدرت نے قسمت آزمائی کے لیے نہایت مناسب موقع دیا تھا جس کے لئے میں ایک مدت سے پریشان تھا۔ لیکن اب میں خود میں زہرہ کے قریب پہنچنے کی ہمت نہ پاتا تھا۔ میرا دماغ مختلف و متضاد خیالات کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اگر اُس کا جواب مایوس کن ہوا جس کا ایسے حالات کی موجودگی میں زیادہ امکان تھا تو میرا کیا انجام ہوگا۔ لیکن فوراً ہی امید سے میری رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یہ کیفیت تذبذب مجھ پر زیادہ دیر تک مسلط نہ رہ سکی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا اور ہمت کر کے اُس سرو کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا جس کی دوسری جانب زہرہ بیٹھی تھی۔ چاندنی نے اُس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اور وہ نور کا مرمریں مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ میں سرو کے پاس جا کر رک گیا کیونکہ میں نے زہرہ کو عجیب کام میں مشغول پایا۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کی پتیاں تھیں جن کو وہ سبزہ پر ترتیب دے رہی تھی۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تاکہ پوری طرح دیکھ سکوں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اف! میں نے ایک نرالا نقشہ دیکھا ایک ناقابل اعتبار منظر مجھے اپنی آنکھوں، اپنے دماغ حتیٰ کہ موجودگی تک کا اعتبار نہ رہا۔ میں اُس کو ایک خواب، ایک دل خوش کن خواب سمجھنے لگا۔ لیکن یہ خواب نہ تھا بلکہ حقیقت میں سبزہ پر گلاب کی پتیوں سے

"ظہیر"

لکھا ہوا تھا۔ یہ نقش میری لوح دماغ پر آج تک ایسے ہی کندہ ہے جیسے قبر کے سرہانے پتھر پر تحریر —— میں

دیوانہ وار زہرہ کی جانب بڑھا، وہ میری آہٹ پاکر چونک پڑی مڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا اور تب
پتیوں کو سبزہ پر منتشر کر کے کھڑی ہوگئی۔ میں چاہتا تھا کہ اُس کے معصوم قدموں پہ گر کر اتنے اشک ندامت بہاؤں
کہ میرا یہ گمان قلب پانی ہوکر بہ نکلے اور زہرہ میری اس غلطی، اس خطرناک تقصیر کو معاف کر دے۔ لیکن میری مایوسی
و ناامیدی کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ وہ مکان میں داخل ہو چکی ہے۔

اف! میں نے اُس کو سمجھنے میں کس قدر دھوکا کھایا تھا۔ کتنا زبردست فریب۔ میں حیرت و ندامت کی تصویر
بنا کھڑا تھا۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیالات آتے تھے اور شرمندگی و پشیمانی کا احساس چھوڑ جاتے تھے میں
نے زہرہ کے بارے میں کتنی غلط رائے قائم کی تھی۔ کاش مجھے اس سے قبل معلوم ہوتا کہ:

عورت کی فطرت سمندر سے زیادہ عمیق، پہاڑ سے زیادہ مستقل اور صحرا سے زیادہ خاموش ہوتی ہے۔

حصول تعلیم کے بعد مجھکو ملازمت مل گئی۔ اس لیے میرا آنا پڑا۔ یہ ساری عمر میں پہلا موقع تھا کہ میں وطن سے
باہر نکلا۔ اُن شفیق ہستیوں کا جنھوں نے اپنے بچوں کی طرح میری پرورش کی تھی یہ حکم تھا کہ میں ہفتہ میں کم از کم
دو بار اپنی خیر و عافیت کی اطلاع بھیجا کروں، تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ اور انھوں نے بھی ایسا کرنے کا وعدہ کیا تھا،
کون کہہ سکتا ہے کہ میں یہاں کس قدر تکلیف میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ میری زندگی
بعینہٖ اُس طائر کی سی تھی جو اُس کے آشیانے ہمصفیروں اور آزاد فضا سے جُدا کر کے ابھی مقید کیا گیا ہو اور قفس
میں تنہا بھی ہو اور جو دفور غم کی وجہ سے، گانے، کھانے، پینے، غرضیکہ اپنی زندگی تک میں کوئی دلچسپی نہ پاتا ہو۔
اس مایوسی کے زمانہ میں میرے دو رفیق تھے، ایک مہربان خالو صاحب کا خط، جس میں بالتفصیل سب کی خیریت مذکور
ہوتی تھی اور دوسرے زہرہ کا تصور۔ یہی ایک حد تک میری تسلی اور اطمینان کا باعث تھے اور ایسی حالت میں
مجھے زندہ رکھنے کے ذمہ دار۔

یہ بے بنیاد وہم کہ زہرہ میں فقدان جذبات ہے کبھی کا مٹ چکا تھا۔ اب مجھے اس کا خیال بھی تکلیف دیتا تھا،
وہ تکلیف جو پشیمانی سے پہنچتی ہے۔ یہ اعتقاد ہی نہیں بلکہ میرا ایمان تھا کہ زہرہ کی خلقت میں محبت کا عنصر بدرجۂ اتم
موجود ہے۔ اور وہ اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ محبت کی جائے اور کرے۔ لیکن چونکہ وہ فطرت سے مجبور تھی، اس لیے

اظہارِ محبت سے معذور۔ برخلاف اس کے میں چاہتا تھا کہ میرے جذبات کی پذیرائی ظاہرا طور پر کی جائے۔
اس خیال میں ایک لذت، ایک دل کش کیفیت محسوس ہوتی تھی اور میں ہر اُس کوشش میں ایک لطف حاصل
تھا جو اس مقصد کے حصول کے لیے کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مسلسل دو ہفتہ تک کوئی خط نہ بھیجا۔ اس
مجھ کو بجز اس کے اور کچھ منظور نہ تھا کہ میں اپنی محبت کا عملی جواب چاہتا تھا...... شاید میں بھی فطرت سے مجبور تھا
آخر کار اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ مجھے خط ملا جو مختصر ہونے کے باوجود مرسل کے جذبات کی پوری
داری کر رہا تھا۔ لکھا تھا:۔

"ظہیر! کیا تم نہیں سمجھتے کہ تمہاری خیر و عافیت کی خبر نہ پاکر وہ لوگ کس قدر
پریشان ہو جاتے ہونگے جو تم سے اس قدر محبت کرتے ہیں۔

زہرہ"

ضمیر مجکو ملامت کر رہا تھا۔ میں افسوس اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ خود پر اور اُس طفلانہ
پر جس کے زیر اثر میں نے ایسا کیا تھا ناراض ہو رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنی فطرت، اپنی ہستی کے
خلاف ہو جاؤں گا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ زہرہ کو میری اس خاموشی سے تکلیف پہنچی ہے۔ ایسی تکلیف جس نے اس کے
صبر کو چھلکا دیا اور وہ پُراسرار آواز تھی جو بار بار میرے کانوں میں آرہی تھی۔
وہ جو دوسروں کے جذبات کی قدر نہیں کرتے، ہرگز مستحق نہیں کہ اُن کے جذبات کی قدر کی جائے۔

مجھ میں پچھلے دنوں کی نسبت اب نمایاں تبدیلی نظر آتی تھی۔ میں ہر کام میں، ہر شغل میں، ہر تفریح میں
سے حصہ لیتا تھا۔ وہ دفتر کا کام جو کبھی بار معلوم ہوتا تھا، اب نہایت دلچسپی اور عمدگی سے انجام پا رہا تھا۔
فرحت محسوس کرتا تھا، وہ فرحت جو آنے والی مکمل مسرت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اب مجھے تنہائی خوش آتی
میں دلکش تصورات کے بے پایاں سمندر میں غرق ہو جاتا تھا، جس میں مستقبل کے دلچسپ اور فرحت بخش منا
نظر آتے اور میں ہر شب خواب میں آنے والی مسرتوں کا بیش بہا خزانہ پا لیتا تھا۔
کیا یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ میں اس طرز زندگی کا عادی ہوگیا تھا۔ شاید یہ بھی ہو لیکن اس

بڑی اور حقیقی علت یہ تھی کہ — اب زہرہ میری منسوبہ تھی۔

زمانہ بہت گراں فروش ہے۔ اس کے ایک لمحۂ مسرّت کی قیمت مصیبت و آلام کا وہ طویل زمانہ ہے، جس کی تاب نہ لا کر انسان خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور یہ خوشی کے ایک تبسم کی عوض وہ بے شمار خوں ناب آنسو وصول کرتا ہے جو اُس بے چارے قلب گداختہ ہوتے ہیں جس کو آتشِ غم نے پگھلا کر آنکھوں سے بہا دیا ہو۔ اُس نے مجھ سے بھی رعایت نہ کی اور میرے چند روزہ مسرور زمانہ کی اس قدر قیمت ٹھہرائی، جس کو میں اس وقت تک ادا نہ کر سکا۔

میں اُس واقعہ کو نہیں بھول سکتا جس نے میری زندگی میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا اور جو مجھے دیوانہ کہہ دینے کا باعث ہوا، درست ہے جب کہ میں حقیقت میں دیوانہ نہیں ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ میں دفتر میں تھا اور اپنے کارِ منصبی میں نہایت سرگرمی سے مشغول تھا۔ میرا دل مسرت آمیز امید سے ایسا بھرا تھا کہ میں ہر معمولی سے معمولی بات، ہر ادنےٰ سے ادنےٰ چیز میں دل چسپی اور دل لگی کا سامان پاتا تھا اور خواہ مخواہ مسکرا دیتا تھا گویا میں ایک ساغر تھا جو مے گل گوں سے اس قدر لبریز کر دیا گیا ہو کہ ذرا سی حرکت سے چھلک پڑے۔ اُسی وقت مجھے ایک خط ملا۔ میں نے لفافہ کی تحریر سے پہچان لیا کہ یہ زہرہ کا خط ہے۔ خلافِ معمول زہرہ کا خط پا کر میں فرطِ شادمانی سے نیم دیوانہ سا ہو گیا اور میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا، لیکن ..... اُس کے اندر برق تھی، وہ برق سوزاں جس نے میرے خرمنِ مسرت کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

خط کا مضمون تھا:—

"ظہیر! خدا حافظ

تمھاری زہرہ" 'تمھاری' قلم زدہ

میرا دماغ چند لمحوں کے لئے معطل ہو گیا، میرے ہاتھ سے خط چھوٹ گیا اور میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر میز پر جھک گیا۔

اب میں اس مبہم اور غیر واضح مضمون کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں سینکڑوں خیالات پیدا ہوتے تھے اور مٹ جاتے تھے جس طرح سطحِ آب پر حباب بن بن کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور میں کوئی مستقل رائے قایم نہ کر سکا۔ لیکن وہ لکیر جو 'تمھاری' کے اوپر کھینچ دی گئی تھی ایک تیر کی طرح میرے قلب میں پیوست ہو گئی تھی جس نے سینہ میں

محشر برپا کر دیا تھا، وہ ایک آہنی سلاخ معلوم ہوتی تھی جو میرے دل پر داغ دینے کے لیے گرم کی گئی ہو۔ میں اس لکیر سے خوف کھا رہا تھا۔ اور اُس کی طرف دیکھنے کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ گویا وہ ایک سانپ تھی، ایسا خوفناک زہریلا سانپ جس کی طرف دیکھنے ہی سے میرے تمام جسم میں زہر دوڑ جائے گا۔

آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے، ایسا جانکاہ حادثہ جس کے خیال سے میں کانپ اٹھتا تھا ورنہ زہرہ کی سی سنجیدہ اور خاموش ہستی کبھی خط لکھنے کی جسارت نہ کرتی اور خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ایسا کرنا رسماً ممنوع بھی سمجھا جاتا ہو۔ اب مجھکو نامعلوم واقعہ کی اہمیت کا پورا یقین تھا بلکہ میں ایک حد تک واقعہ کی نوعیت بھی سمجھ گیا تھا، جس کی صراحت خط کا مختصر مضمون کن یہ" کر رہا تھا خصوصاً قلم کشیدہ "تمہاری"۔ تاہم میں کچھ وقوف حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

بڑی مشکل سے مجھکو دو دن کی رخصت ملی اور میں فوراً وطن روانہ ہوگیا۔ مجھے یہاں پہنچکر وہی واقعہ پوری طرح معلوم ہوگیا جس کو بڑی حد تک میں نے خط کے مضمون سے سمجھ لیا تھا۔ اور اُس چراغ اُمید کو جو ابھی تک ٹمٹما رہا تھا اس اندوہناک خبر نے بالکل گل کر دیا۔ اُف! کس قدر تکلیف دہ حادثہ تھا، کتنا روح فرسا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ چند خانگی مناقشات کی بنا پر نسبت منسوخ ہوگئی ہے اور مصالحت کی ظاہرا کوئی امید نہیں۔

اس جانکاہ حادثہ سے مجھکو کتنا صدمہ پہنچا، اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی تمام امیدیں منقطع ہوگئی ہوں، جس کو آسمانوں کے نیچے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہو اور ایک اجنبی کی طرح تمام انسان ناآشنا اور بیگانہ معلوم ہوتے ہوں، جو کثرتِ ہجوم سے گھبرا گیا ہو اور اس بے کیف زندگی سے تنگ آکر موت کا آرزومند ہو۔ میں یاس و حرماں کے جاں گُسل بھنور میں گھر گیا تھا۔ مجھے زندگی میں کوئی دلچسپی نظر نہ آتی تھی اور میں دنیا کے اس غیر مستقل ہنگامہ سے جو سراب کی طرح نظر فریب ہے الگ رہنا چاہتا تھا۔ قسمت نے میرے اور زہرہ کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی تھی جس کا عبور کرنا دشوار نظر آتا تھا.......... مگر کاش میں کوشش کر دیکھتا۔

میں نے بڑی جد و جہد کے بعد مدرسہ کی تبدیلی کرا لی۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کے قدرتی مناظر میرا غم غلط کرنے میں معین ثابت ہونگے، اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس حادثہ کی جائے وقوع سے حتی المقدور دور رہنا چاہتا تھا۔ لیکن

خیال خام ثابت ہوا اور یہاں میری حالت زیادہ خراب ہو گئی۔

شروع میں آفس کے بعد کا وقت میں محض اس لئے سیر میں گذار دیتا تھا کہ ساحل کی فرحت بخش ہوا، پانی کی بے وسعت، بحر و بر کے اتصال کا دل آویز منظر شاید میرے مجروح دل کے لیے باعثِ راحت و سکون ہو سکیں مگر ناکام رہا۔ آخر میں نے اس رویہ کو بھی ترک کر دیا اور اب میں تھا اور وہی تنہائی۔ اب میرے لیے میرٹھ و بمبئی یکساں تھے بلکہ مجھکو یہاں زیادہ تکلیف پہنچ رہی تھی کیونکہ جس اُمید پر میں یہاں آیا تھا وہ نقش بر آب ثابت ہوا اور یہ خیال کہ دوری باعثِ تسکین ہو سکے گی موہوم نکلا۔

میرے پاس وطن سے کبھی کبھی خطوط آتے رہتے تھے اور کسی کسی میں کنایتہً اُس گھر کا تذکرہ بھی ہوتا تھا جس کو ابھی تک اپنا گھر سمجھتا تھا۔ لیکن ایک خبر نے میری مایوسی کو مکمل کر دیا۔ وہ خلیج جو میرے اور زہرہ کے درمیان ہو گئی تھی اور جس کو پار کرنا صرف دشوار تھا، بڑھکر ایک ناپیدا کنار سمندر ہو گئی جس کو عبور کرنا میرے امکان قطعی باہر تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ زہرہ کا نکاح اُس کے پھوپھی زاد بھائی سے ہو گیا ہے اور رخصتی آغاز سرما ہو گی جس میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔ بد قسمت نے ایک اور ضرب لگائی تھی لیکن وہ شخص جو زندگی سے بیزار ہو گیا ہو سخت سے سخت صدمہ بھی آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

مجھکو زہرہ سے اب وہ محبت تھی جو صحیح معنیٰ میں حقیقی محبت کہلا سکتی ہے۔ میں اُس کی مادی ہستی سے بالکل بے نیاز تھا۔ مجھے اُس کی روح سے محبت تھی اور میں محبت کے لیے محبت کرتا تھا۔

اب میں اُس شخص کی سی زندگی بسر کر رہا تھا جو دنیاوی تعلقات کے باوجود بھی تارک الدنیا ہو——— تارک الدنیا۔

مجھکو زہرہ کی علالت کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں اور میں ہر بار پریشان ہو جاتا تھا۔ لیکن اب میں بالکل بدل گیا تھا اور سیماب کے مانند نہ رہا تھا جو ذرا سی حرارت سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ میں ہر صدمہ کو نہایت صبر سے برداشت کرنے کا عادی ہو گیا تھا اور سخت سے سخت تکلیف کا آسانی سے متحمل ہو سکتا تھا۔

مجھکو یہاں آئے ہوئے پانچ ماہ ہوئے تھے، موسم گرما اختتام پر تھا کہ خلاف توقع زہرہ کا آخری خط ملا میں فرطِ حیرت سے مبہوت سا ہو گیا۔ آخر ایسی کیا وجہ ہو سکتی تھی جس نے زہرہ کو ان حالات کی موجودگی میں خط لکھنے پر مجبور کیا۔ لیکن مضمون نے میری حیرت دور کر دی۔ وہ مضمون مجھے لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ میں اُس کو ہرگز نہیں

بھول سکتا اور شاید وہ میرے حافظہ سے مر کر بھی محو نہ ہو سکے گا۔ اُس نے لکھا تھا:-

ظہیر! خلاف توقع میرا خط پا کر تم حیران ہو گے واقعی میں بہت جرأت کر رہی ہوں، انتہائی دلیری، لیکن حیران نہ ہو۔ میں نے جب کہ چند روز کی مہمان ہوں یہ مناسب سمجھا کہ تم کو ان واقعات سے آگاہ کر دوں جن کی بنا پر تم میرے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکو۔ تمھیں معلوم ہو جائے کہ میں اس سخت امتحان میں کس حد تک کامیاب رہی اور تم میری مغفرت کے لئے خلوص دل سے دعا کر سکو۔

" شاید تم نہیں جانتے کہ عورت کے جذبات میں کس قدر استقلال ہوتا ہے، اس کا انتخاب کتنا سنجیدہ ہوتا ہے اور اُس کا فیصلہ کس قدر قطعی۔ وہ جو فیصلہ کر لیتی ہے، اس پر مستقل مزاجی سے قائم رہتی ہے اور کوئی ناکامی یا مصیبت اُس کے قدموں کو ڈگمگا نہیں سکتی عورت کی فطرت کی نمایاں خصوصیت محبت ہے جس کے لئے وہ ایک کو منتخب کر لیتی ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس انتخاب کو باطل نہیں کر سکتی وہ ایک کی ہو کر کسی حالت میں بھی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ وہ محبت میں شرکت کو گناہ سمجھتی ہے۔ عورت مایوسی کی حالت میں ضبط تحمل اور خاموشی شعار بنا لیتی ہے اور اکثر اوقات یہ ضبط غم اس کو گھلا گھلا کر نابود کر دیتا ہے۔ برخلاف اس کے تم ذرا سی ناکامی سے اس قدر مایوس ہو جاتے ہو کہ حصولِ مقصد کے لئے دوبارہ کوشش کرنا تحصیل حاصل سمجھتے ہو تم اُس ہستی کو جسے تم محبوبہ کے مقدس نام سے یاد کرتے ہو، جو تمھاری آرزوؤں کا مرکز ہوتی ہے۔ دوسرے کی شریک حیات دیکھنا ٹھنڈے دل سے گوارا کر لیتے ہو اور غم مایوسی کو مختلف مشاغل میں محو کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ کاش وہ صنف قوی جو خود کو عقل کل کا حامل سمجھتی ہے عورت کی حقیقت کو سمجھتی تاکہ سینکڑوں معصوم ہستیوں کا خون اپنی گردن پر لینے سے محفوظ رہ سکتی۔

" ظہیر! میں نے یہ خط مجبور ہو کر لکھا ہے، اور یہ میری پہلی اور آخری بے باکی ہے، جس کو امید ہے کہ تم معاف کر دو گے۔ میں اب لکھنے کے لئے مجبور تھی تاکہ تم اصلیت سے آگاہ ہو کر مجھ کو اپنی محبت کے نا اہل ہونے کا الزام نہ دو اور میری روح کو پسِ مرگ اطمینان و سکون

نصیب ہو سکے میری آخری تمنا ہے کہ تم کو ایک بار ....

"میں یہ خط ناتوانی کی وجہ سے تین دن میں پورا کر رہی ہوں مجھے تمہارا پتہ صرف اس قدر معلوم ہے کہ تم مدراس میں اسی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو جس میں کہ پہلے تھے۔ خدا کرے کہ یہ خط تم کو وقت پر مل جائے۔

"ز"

وہ لائحۂ زندگی جو میں نے ایک کوشش کے بعد مرتب کیا تھا۔ اس مضمون سے منتشر ہو گیا۔ اور وہ ضبط جواب میری زندگی کی نمایاں خصوصیت تھا، مفقود ہو گیا میں چاہتا تھا کہ مجھ میں تخیل کی سی تیز پروازی آجائے اور میں جلد سے جلد وطن پہنچ سکوں تاکہ زہرہ کی آخری آرزو جو حقیقت میں میری اپنی آرزو تھی پوری ہو سکے۔ لیکن وطن پہنچ کر جب مجھے معلوم ہوا کہ زہرہ کا دیدار اس دنیا میں ناممکن ہے تو

سورج غروب ہو چکا ہے۔ ہر سمت تاریکی چھا رہی ہے۔ ہر شے ماتمی لباس میں ملبوس نظر آتی ہے۔ قبروں پر غلاف چڑھ گئے ہیں، کیسے دھندلے دھندلے نظر آتے ہیں۔ سکوت زیادہ خوفناک ہو گیا ہے۔
اب تم مجھے دیوانہ نہ کہو گے۔ بے شک تم دروغ بیانی سے پرہیز کرتے ہو۔ تم نے میری تاریخ حیات کا ایک ایک لفظ سُن لیا ہے۔ دیکھا؟ میں کس قدر صراحت سے بیان کر سکتا ہوں۔ دیکھو تم پھر مسکرا رہے ہو۔ للہ مذاق نہ کرو کیا تم کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہے۔ مگر تم ... تم کون ہو؟ اف یہ تو قبر کا تکیہ ہے میں کب سے باتیں کر رہا ہوں کس سے باتیں کر رہا ہوں۔ کیا پتھر سُن سکتا ہے سمجھ سکتا ہے۔ لیکن ...... یہ تو قبر کو جنبش ہو رہی ہے.......... ..
اف! سارا قبرستان گھوم رہا ہے.. وہ... آسمان نیچے آ رہا ہے ..... یا خدا! یہ کیا ہو رہا ہے.... .. آہ .. کیا میں واقعی ..... د ... یو...... ا...... نہ ...... ہوں؟

شفیق احمد غازی

بی اے (علیگ)

افکارِ پریشاں

دیوانہ کر دیا ہے غمِ انتظار نے
ابتک خبر نہ لی مری غفلت شعار نے

اوروں کی کیا خود اپنی بھی سُدھ بدھ نہیں رہی
دنیا سے کھو دیا ہمیں ظالم کے پیار نے

پھولوں سے ہیں لدی ہوئی سرسبز ڈالیاں
کیا چھاؤنی سی چھائی ہے فصلِ بہار نے

دنیا کے فکر، دین کی باتیں، خدا کی یاد
سب کچھ بھلا دیا ترے دو دن کے پیار نے

توبہ، بھلائے دیتی تھی پیرِ مغاں کا گھر
اُٹھ کر بتا دیا ہمیں ابرِ بہار نے!

بیمارِ شامِ ہجر کے آنسو نکل پڑے
کیا کہہ دیا ستارۂ شب زندہ دار نے

دنیا تمام نشّے سے لبریز ہو گئی
برسائی ہے شراب سی ابرِ بہار نے

نور و سرور و نکہت و مستی سے بھر دیا
گلشن کو اُن کی لغزشِ مستانہ وار نے

لو! دیکھو! وہ نقاب کسی کا الٹ گیا
کیا چھیڑ کی ہے موجِ نسیمِ بہار نے

مخمورِ خواب، بسترِ گل سے اُٹھے ہیں وہ
انگڑائی لی ہے باغ میں صبحِ بہار نے!

مسحور کر لیے ہیں بتانِ حرم کے دل
اختر ہمارے خامۂ رنگیں نگار نے!

اختر شیرانی

بعض ادب دوست خواتین نے دادِ کلام دی تھی۔ مقطع میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

سیکری

گلستانِ سیکری میں کل ہوا میرا گذر
جس کا ہر پتہ ہے صدیوں سے خزاں کا نوحہ گر

دل تڑپ اُٹھا وہ حسرت خیز منظر دیکھ کر
نقشِ حیرت بن گیا دیوار اور در دیکھ کر

کچھ کھنڈر پائے قضا کے ہاتھ سے ٹوٹے ہوئے
جیسے صحرا میں پڑے ہوں کارواں لوٹے ہوئے

سیکری تو بھی کبھی فخر بلادِ ہند تھی
تیری شہرت بھی کبھی بنگال سے تا سندھ تھی

اکبر ذی جاہ کی آنکھوں کا گویا تارا تھی
اور جہانگیر ابنِ اکبر کا تو ہی گہوارا تھی

اکبر اعظم کہا کرتا تھا تجھکو فتح پور
آج قسمت کی شکستوں سے ہوئی تو چور چور

گردشِ افلاک نے کیوں زیر تجھکو کر دیا
زندگانی سے بتا کیوں سیر تجھکو کر دیا ؟

آہ تجھ میں پادشاہوں کے تھے وہ عالی محل
جن کی رفعت ہر طرف دنیا میں تھی ضرب المثل

سرنگوں شاہانِ عالم تھے اسی دربار میں
تھا زحل اک پاسبان ادنیٰ سا اس سرکار میں

اب نہ وہ میخانۂ عبرت نہ مے کا دور ہے
محفلِ دوشین ہی برہم کچھ نرالا طور ہے

تاجداروں کو جہاں دشوار کل تک بار تھا
آج واں جاکر جو دیکھا خاک کا انبار تھا

ہر فضا میں کس بلا کی خامشی چھائی ہوئی
کیسی نابود آہ اگلی محفل آرائی ہوئی

اللہ اللہ کیا تھا اور کیا ہو گیا اس دور میں
منقلب عالم کا نقشہ ہو گیا اس دور میں

کانپتی تھی جن سے خلقت اب نشاں انکا نہیں
جبہہ جھکتا تھا فلک وہ آستاں ان کا نہیں

ہو گئے معدوم کچھ ایسے پتا ملتا نہیں
گم ہوئے ایسے سراغِ نقشِ پا ملتا نہیں

تھی جہاں گردن کشوں کو سر ہٹانیکی نہ تاب
اب وحوش و طیر واں پھرتے ہیں بیحد و حساب

رکھتے تھے جس خاک پر شاہانِ عالم اپنے سر
وارد و صادر وہاں رکھتے ہیں جوتے بیخطر

دیکھ کر غمناک منظر محفلِ برباد کا
حسب موقع شعر آیا لب پہ اک استاد کا

"پردہ داری میکند بر قصرِ کسریٰ عنکبوت
چغد نوبت می زند بر گنبد افراسیاب"

دوسری جانب نگہ اُٹھی تو یہ آیا نظر　　خاک میں آسودہ ہے مقبولِ حق کوئی بشر

صولتِ شاہانہ اس تربت کی پہرہ دار ہے　　آسماں سے تا زمیں اک بارشِ انوار ہے

اس فقیری میں بھی ہے وہ دبدبہ درگاہ میں　　جیسے درباروں کی کیفیت حضورِ شاہ میں

بادشاہوں کی جو شوکت تھی کبھی کی چل بسی　　حکمرانی ہے دلوں پر آج تک درویش کی

دل پکارا نشۂ حیرت میں کیوں سرشار ہے　　با ادب ہو! حضرت چشتی کی یہ سرکار ہے

کھول آنکھیں دیکھ اے غافل یہی ہے وہ حریم　　جس پہ آنکھیں فرش کرتے تھے اکابر و رحیم

یہ تفاوت دیکھ کر گورِ فقیر و شاہ کا　　پھر گیا آنکھوں میں منظر قدرتِ اللہ کا

ناگہاں گونجی مرے کانوں میں یہ غیبی ندا　　ہم بتاتے ہیں تجھے مختار سارا ماجرا

مل گئی سب مادّی رفعت بسیطِ خاک میں
گونجتی ہے روح کی عظمت ابھی افلاک میں

مختار جمیل

غزل

صد فتنہ خوش خرامیِ دلبر لئے ہوئے　　یک حشر آرزو دلِ مضطر لئے ہوئے

عالم ہے جس سے مست کہاں ہے وہ مے فروش　　پھرتی ہے تشنگی مجھے گھر گھر لئے ہوئے

مصروف پردہ داریِ رازِ نہاں ہوں میں　　کل اپنی کائنات کو اندر لئے ہوئے

سرگرم جستجو ہیں کسی بے نشاں کے ہم　　پائے شکستہ و دلِ مضطر لئے ہوئے

دل اک عجب طلسم ہے ذات و صفات کا　　کوزہ میں کوزہ گر ہے سمندر لئے ہوئے

قدرت کی شانِ حسن کا جلوہ نظر میں ہے　　آئینہ دیکھتا ہوں میں پتھر لئے ہوئے

اے مست مے کشی کو دلِ تشنہ چاہیئے
یوں تو ہزار بیٹھے ہیں ساغر لئے ہوئے

مست صفی پوری

(روسی معجز نگار الگزنڈر کوپرین کے ایک شاہکار کا آزاد ترجمہ)

اگر کوئی خاص واقعہ پیش آجاتا ہی تو آپ اکثر کہہ اُٹھتے ہیں کہ "اتفاق تھا محض اتفاق" لیکن حقیقت یہ ہی کہ ہر حقیر
سے حقیر معاملہ پر بھی اس سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جاسکتا ہی۔

میری عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب ہی اور یہ وہ عمر ہی جب ہر شخص اپنی تمام سرگردانیاں، جذبات اور
تعصبات سے منھ موڑ کر اپنے مستقبل کے لئے صرف تین راستے پاتا ہی ـــــ لالچ، اولوالعزمی اور فلسفہ۔
ـ یا صرف دو سمجھ لیجئے، کیوں کہ غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اولوالعزمی بھی دینی اور دنیاوی ترقیات کو
حاصل کرنے کی لالچ کا نام ہی۔

حقیقتاً میں خود کو فلسفی کہنے کی جرأت تو نہیں کرسکتا۔ شاید یہ دعویٰ میرے لئے وبال ثابت ہو اور ہر نوع
کسی طرح زیبا بھی نہیں۔ علاوہ بریں آپ ہمیشہ مجھ سے اس کا مطالبہ کرسکتے ہیں کہ اپنے دلائل اور سندات پیش کرو۔
لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟ تاہم اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اپنی عمر میں زندگی کے تمام مختلف مراحل مختلف اور وسیع
راستوں سے طے کئے ہیں۔ میں مفلسی اور تونگری سے واقف ہوں، صحت اور بیماری کی کیفیات جانتا ہوں، وصل و فراق،
صلح و جنگ، قید و آزادی، محبت و نفرت، عروج و پستی، وفاشعاری اور بے وفائی، غرض ان سب سے لذت آشنا
رہ چکا ہوں اور ـــــ خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں ـــــ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں انسان کی حقیقت سے آگاہ
رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہونگے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن میرے محترم! یہ ضرور تعجب کی بات ہی۔ دوسرے شخص کو
جاننے اور سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہی کہ سب سے پہلے آپ اپنی شخصیت کو بالکل فراموش کرنے کے قابل ہوجائیں،
اپنے گرد و پیش جو سراب آسا اثر آپ نے قائم کرلیا ہی اسے بھول جائیں اور قدرت کی وسیع سرزمین پر آپ کی جو بلند

حیثیت ہے اسے دل و دماغ سے محو کردیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بہت کم لوگ اس کو سرانجام دے سکتے ہیں۔

اور اب اپنی عمر کے آخری ایام میں میں ایک غریب گنہگار "زندگی" پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میں تنہا ہوں،
لبِ گور۔ میری راتیں —— آہ! آپ کو کیا خبر کہ ایک بوڑھے آدمی کی راتیں کتنی طویل ہوا کرتی ہیں! میرے دل
دماغ میں میری گزشتہ زندگی کے اور دوسروں کی زندگی کے، ہزارہا واقعات بالکل محفوظ ہیں۔ ان واقعات کو
یونہی سرسری طور پر دُہرا دینا گائے بھینس کے جگالی کرنے کے مترادف ہوگا، لیکن ان پر سوچ سمجھ کر خیال آرائی کرنا
دوسری بات ہے اور اسی کو میں فلسفہ کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

ہم نے اتفاق اور قسمت کے سوال کو اٹھایا ہے۔ میں آپ کے ساتھ اس امر کو تسلیم کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں
کہ اتفاق مہمل، تغیر پزیر، بے نتیجہ اور بالکل بے معنی ہے۔ لیکن مجھے اس کا بھی پورا یقین ہے کہ اس کے اندر ایک قانون
ایک ناقابلِ تغیر قانون مضمر ہے، جو حیاتِ انسانی کو محصور کئے ہوئے ہے —— میری مراد ان گروروں واقعات
ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ ہر شے اپنے وقت پر گزر جاتی ہے اور پھر نمودار ہوتی ہے۔ وہ عدم سے پیدا ہوتی ہے
سراپا آتش زار بنتی ہے، دوسروں کو جلاتی ہے، خود مسرور ہوتی ہے، اپنا انتہائی زور حاصل کر لیتی ہے، پھر غائب ہو جاتی
ہے اور وقت کی پرواز کے گرد کسی پیچ کش کے چکروں کی طرح پھر نمودار ہوتی ہے، دوسری مرتبہ، پھر تیسری مرتبہ
ختم لاتعداد برسوں کے بعد اپنا دورہ پورا کرکے پھر واپس آتے ہیں، اسی مقام سے گزرتے ہیں اور پیچ در پیچ چکر کھاتے
رہتے ہیں اور اسی طرح بغیر ختم ہوئے چلتے رہتے ہیں، ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

اس کے جواب میں آپ فرمائیں گے کہ اگر واقعی ایسا کوئی قانون موجود ہوتا، تو مدتوں پیشتر ہی لوگ اس
دریافت کر چکے ہوتے اور اسی نقشے کے مطابق اپنے مستقبل کے صفحات کو پڑھ لیا کرتے۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ہم
جانتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے باشندے جولاہوں کی طرح ہیں، جو بے انتہا طویل و عریض کارگہ کے قریب بیٹھے ہوں
مختلف رنگ ہمارے سامنے ہیں —— گلابی، آسمانی، کاسنی، سبز —— لیکن یہ کارگہ بھاگتا جاتا ہے، بھاگتا
اور غائب ہوتا جاتا ہے اور انتہائی قربت کی وجہ سے ہم تانے بانے کی تمیز نہیں کرسکتے۔ صرف وہ لوگ جو انسانی زندگی
بالاتر، ہمارے سروں سے اونچے ایستادہ ہیں یعنی پیغمبر، اولیاء، مجذوب، معصومین، سائنس داں اور شعراء، صرف
انھیں کی تیز اور دوررس نگاہوں میں قدرت نے یہ طاقت ودیعت کر دی ہے کہ حیاتِ انسانی کے شور و شغب ۔

میں ان سے اس یک رنگ تانے کے آغاز کی جھلک دیکھ کر اس کے انجام کے متعلق پیشین گوئیاں کردیا کریں۔

آپ خیال کرتے ہونگے کہ میں نے صرف موٹے موٹے جملے استعمال کئے ہیں، کیا نہیں؟ ذرا توقف فرمائیے گے پیل کر یہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوجائے گا بشرطے کہ آپ پریشان نہ ہوجائیں . . لیکن ایک شخص ریل کے ڈبے میں سوائے باتیں کرنے کے اور کیا کرسکتا ہے؟

میں ان قوانین کو ماننے کے لئے بالکل تیار ہوں، جو مساویانہ عقل وتمیز سے ایک طرف تو ستاروں کی گردش کو منظم کرتے ہیں اور دوسری طرف قوائے حیاتیہ کو۔ میں ان پر اعتقاد رکھتا ہوں اور انہیں دعا دیتا ہوں لیکن انہیں کے ذریعہ کوئی ہستی، یا "کوئی شے" ایسی ضرور ہے، جو قسمت اور کائنات سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اگر وہ "کوئی شے" ہے تو میں اس کو منطقیانہ لغویت کا قانون یا لغو منطق، جو آپ پسند کریں، اس کے نام سے موسوم کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ آپ اسے کیا کہنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ "کوئی ہستی" ہے، تو ایک ایسی زبردست روح ہوگی، جس کے سامنے صحف سماوی کا شیطان اور ہمارے فسانوں کے بھوت پریت حقیر مسخروں اور بے عقل دغا بازوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے

ایک ایسی طاقت کا خیال کیجئے جو کائنات پر حکمراں ہے ـــــ ایک الٰہی طاقت اور اس کے علاوہ ایک، مفلانہ، ناعاقبت اندیش، شریر، تغافل پسند نیکی اور بدی کی قوت، جو ہمیشہ بے رحم، ظالم، چالاک، لیکن (اس کو شیطان کا حوالہ) بہر نوع حیرت انگیز طریقے سے انصاف پسند واقع ہوئی ہے۔ شاید آپ پورے طور سے میرا مطلب نہیں سمجھے لہٰذا اجازت دیجئے کہ چند مثالیں دے کر اس کو اور واضح کردوں۔

نپولین کو لیجئے ـــــ ایک قابلِ رشک زندگی، ایک ناقابلِ یقین بڑی ہستی، ایک ختم نہ ہونے والی طاقت ـــ لیکن انجام پر نظر ڈالئے: ایک چھوٹا سا جزیرہ، ایک مہلک مرض، غذا اور معالج کی بابت شکایات کا ایک دفتر، تنہائی اور بے کسی میں ایک بوڑھے آدمی کی ہذیان آمیز گفتگو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حسرت ناک انجام صرف میرے پُراسرار "کوئی" کا ایک خندۂ استہزا، ایک مضحکہ آمیز تبسم تھا۔ تاہم اگر آپ ٹھیک طریقے سے اس کی پُردرد سوانح حیات پر نظر ڈالیں اور علماء کی توضیحات کو نظرانداز کرتے جائیں (کیوں کہ وہ ہر چیز کی نہایت سادہ طور پر اور ایک کلیہ کے تحت تشریح کرتے ہیں) ـــــ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کس نتیجے پر پہنچیں گے، لیکن مجھے تو اس میں لغویت اور منطق کی

سازش صاف نظر آتی ہے، گو میں اس کی صراحت نہیں کرسکتا۔

اس کے بعد جنرل آسکوبلاف کو لیجئے —— ایک دلیر اور خوب صورت پیکر، تال کار کی نسبت مبالغہ آمیز عقیدہ ہلاکت آفریں آتش باری میں جرأت مردانہ، موت کے منہ میں گھسنے کی نہ بجھنے والی پیاس —— لیکن انجام موت وہ بھی معمولی بستر پر، ہوٹل کے ایک گندے کمرے میں، ایک زنِ بازاری کے سامنے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ لغویت ہی سہی ظلم ہے، لیکن یا للعجب! کہ منطقیانہ ضرور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حسرت ناک موتیں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چکر لگاتی رہیں اپنا انعکاس ڈالا اور ان دو عظیم المرتبت ہستیوں کی تصاویر کو مکمل کر گئیں۔

قدیم زمانہ کے لوگ اس "پُراسرار" "کوئی" سے واقف تھے اور اس سے خوف کھاتے تھے، لیکن غلطی کی بنا پر اس کے مذاق اور تفریحات کو قسمت کے رشک و حسد سے تعبیر کرتے رہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں —— میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو یقین نہیں دلاتا، بلکہ خود اسی خیال پر پختگی سے قائم ہوں —— کہ کسی آئندہ زمانہ میں، شاید تین ہزار برس کے بعد، اس دنیا میں زندگی نہایت ہی دل خوش کن ہو جائیگی جا بجا عالی شان محل ہوں گے، خوب صورت باغ ہوں گے، فوارے چھوٹ رہے ہوں گے ... قید و بند، مال و دولت دروغ بیانی اور جبر و تشدد، نوعِ انسانی پر مصائب و آلام کے پہاڑ نہ توڑا کریں گے ... بیماری، بدصورتی اور موت کا خاتمہ ہو جائے گا ... رشک و حسد نہ ہوگا، برائیاں نہ ہوں گی، قرب و بُعد کا امتیاز مٹ جائے گا —— سب بھائی بھائی ہوں گے اور اس وقت وہ "کوئی" (خیال فرمائیے کہ میں ہر موقعے پر اس کو واوین کے درمیان استعمال کرتا ہوں) ایک دن فضائے کائنات میں پرواز کرے گا، ایک عیارانہ اور تمسخرانہ نگاہ زمین پر ڈالے گا، مسکرائے گا اور سانس لے گا —— اور پھر یہ قدیم اور حسین خطۂ ارض تباہ ہو جائے گا۔ کیا اس حسین کرہ کے لئے یہ افسوس کی بات نہ ہوگی؟ فرمائیے ذرا خیال تو کیجئے کہ یہ عالم حسن و خوبی بالآخر کن مہیب، خونیں اور تباہ کن اثرات کا مصدر ہوگی، جس وقت کہ عامۃ الناس اس زندگی کے عادی ہو جائیں گے۔

لیکن زمین یا نپولین یا ایسی ہی بڑی ہستیوں کی مثالیں کیوں پیش کی جائیں؟ خود میں نے کئی مرتبہ اس خوف اور ناقابلِ علم قانون کے مشاہدات بالکل معمولی معاملات میں دیکھے ہیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ایک واقعہ عرض کروں جبکہ اس "کوئی" کے استہزایانہ تنفس کو میں نے صاف طور پر محسوس کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ طومسک سے ریل میں سفر کر رہا تھا۔ میرے درجہ میں اور مسافروں کے علاوہ ایک نوجوان ریلوے انجینیر بھی تھا، جو نوعمر، خوب صورت، تندرست اور خوش اخلاق شخص تھا۔ اس کا چہرہ عام روسیوں کی طرح گول اور صاف تھا، سر پر چھوٹے چھوٹے ملائم بال تھے، جن کے درمیان سر کی گلابی جلد صاف نظر آتی تھی۔ وہ اصول کا پابند، مہربان اور نیک اطوار تھا اور اس کی آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں۔

اس نے خود کو ایک اچھا اور قابل قدر ہم سفر ثابت کیا۔ میں نے آج تک ایسا منکسر المزاج اور متواضع شخص نہیں دیکھا۔ جب میں درجہ میں داخل ہوا تو اس نے فوراً نیچے کی سیٹ میرے لئے خالی کر دی، خود ہی اٹھا کر میرا صندوق اوپر رکھدیا اور اس قدر عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا کہ میں گھبرانے لگا۔ ہر بڑے اسٹیشن پر وہ کچھ کھانے پینے کی چیز خرید لیتا اور نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ تمام مسافروں کی تواضع کرتا۔

میں نے دیکھتے ہی یہ محسوس کیا تھا، کہ اس کے دل میں کوئی اندرونی مسرت جوش مار رہی ہے، سطح سے نکل پڑنے کی جدوجہد کر رہی ہے اور وہ اپنے گردوپیش ہر شخص کو اپنی ہی طرح متبسم و مسرور دیکھنا چاہتا ہے۔

ایسا ہی ہوا بھی۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ میرے پاس آیا اور اپنی سرگزشت بیان کرکے اپنی روح کو ہلکا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے شروع کرتے ہی آس پاس کے مسافر کسمسانے لگے اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنی تمام تر توجہ اس سرزمین کی طرف منعطف کر دی، جس پر سے ہم گزر رہے تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک اس قصہ کو کم از کم دس مرتبہ سن چکا تھا، پھر میں اس قسمت سے کس طرح محروم رہ سکتا تھا؟۔

یہ انجینیر اپنے وطن جانے کے لئے مشرقِ بعید سے واپس آرہا تھا، جہاں اس نے پانچ سال بسر کئے تھے اور اس عرصہ میں اپنے گھر والوں سے بالکل جدا رہا، جو پیٹروگراڈ ہی میں رہتے تھے۔ مشرقِ بعید میں درصل اس کا صرف ایک سال قیام کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اول تو سرکاری کام نے، جس کے لئے وہ بھیجا گیا تھا اس کو زیادہ عرصہ تک روک رکھا اور پھر ایک نفع بخش ذاتی کام مل گیا۔ اس کے بعد اُسے معلوم ہوا کہ وہ کام کو ختم کئے بغیر چھوڑ کر نہیں جا سکتا، کیوں کہ طویل ہو جانے کے باوجود بھی اس میں بے انتہا نفع کی اُمید تھی۔ اب پانچ سال کے بعد اس کو نبٹا کر وہ اپنے وطن کو واپس ہو رہا تھا۔ پھر ایسی حالت میں اس کو باتونی ہونے کا الزام کس طرح دیا جاسکتا تھا؟ وہ پانچ برس تک اپنے عزیز وطن سے دُور رہا اور اب نوجوانی، تندرستی اور کامرانی کی اُمنگوں کے ساتھ، پیار و محبت کے ضرج

نے والے خزانے لئے ہوئے گھر واپس جا رہا تھا۔ کون ہو سکتا تھا جو اس حالت میں خاموش رہ سکے، اضطراب
ی کی اس خطرناک خارش کو دبا سکے، جو ہر گھنٹے کے ساتھ، ہر میل کا سواں حصہ گزرنے کے ساتھ تیز تر ہوتی جاتی د

تھوڑی ہی دیر میں اس کے تمام خاندانی رازوں سے میں واقف ہو گیا۔ اس کی بیوی کا نام سوسن خاتون
سنوچکہ تھا اور اس کی لڑکی یوروچکہ کے عجیب نام سے موسوم تھی جس وقت انجنیر گھر سے روانہ ہوا تھا تو یوروچکہ
ت تین برس کی بچی تھی۔ "میں سوچتا ہوں" وہ چلاّ کر کہنے لگا "میں سوچتا ہوں کہ اب تو وہ اچھی خاصی نوجوان لڑکی
گی، تقریباً شادی کے قابل"۔ مجھے اس کی بیوی کا شادی سے قبل کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب
کی شادی ہوئی تھی اور انجنیر اس وقت تک اپنی تعلیم میں مشغول تھا، تو کس قدر مشکلات کا سامنا ہوا تھا، یہاں تک
س غریب کے پاس دو پاجامے تک نہ تھے۔ لیکن اس وقت صرف اس کی بیوی ہی ایک غمخوار ساتھی ہونے کے
وہ دایہ، ماں اور بہن سب کی قائم مقامی کر رہی تھی، سب کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

اس نے مفتخرانہ انداز میں اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر مارا، فخر و ناز کی سرخی نے اس کے چہرہ کو گلرنگ بنا دیا۔ آنکھیں
ملنے لگیں اور چلاّ کر کہنے لگا۔

"کاش، آپ اس سے واقف ہوتے! حسنِ مجسم ہے! اگر آپ پٹروگراڈ تشریف لائیں تو میں تعارف کراؤں گا
پ کو تشریف لانا پڑے گا۔ ضرور بالضرور۔ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں، دیکھئے انکار نہ کیجئے۔ نمبر ۱۵۷ کروچنایہ۔ میں
پ سے ملاقات کراؤں گا، تب آپ میری بیوی سے واقف ہوں گے۔ ملکہ ہے! ہماری یعنی ریلوے انجنیروں کی بزمِ
نشاط میں وہی رونقِ محفل ہوتی ہے۔ اس کے بغیر محفل پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا! اگر آپ واقعی تشریف نہ لائے
یرے دل کو سخت صدمہ پہنچائیں گے"۔

اس نے ہم سب کو اپنا ملاقاتی کارڈ دیا، جس پر اس نے منچوریہ کا پتا چھیل کر پنسل سے پٹروگراڈ کا پتا تحریر کر دیا
تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ پٹروگراڈ کا یہ عالی شان مکان اس کی ہدایات کے مطابق سنوچکہ نے گزشتہ سال
ہی کرایہ پر لیا تھا، جب اس کے کام میں معتدبہ نفع ہو رہا تھا۔

دن بھر میں تین چار مرتبہ ہر بڑے اسٹیشن سے وہ اپنی بیوی کو جوابی تار دیتا، تاکہ اس کا جواب اگلے بڑے
اسٹیشن پر مل جائے یا صرف ٹرین نمبر فلاں میں پہلے درجہ کے فلاں مسافر کو ملے۔ اس وقت آپ اس کی

حالت دیکھتے جب گارڈ کوئی تار لے کر آتا اور کہتا کہ فرسٹ کلاس کے فلاں مسافر کے نام ایک تار ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے چہرہ پر ایسی روشنی نمودار ہوتی، جیسی کہ عموماً اولیاء کے چہروں پر ضوفگن ہوتی ہے۔ وہ شاہانہ طریقے سے گارڈ کو انعام دیتا اور نہ صرف گارڈ کو، بلکہ اس کے دل میں یہ ناقابل تسخیر خواہش پیدا ہو جاتی کہ ہر شخص کو مطمئن کر دے، ہر کسی کو مسرور بنا دے اور ہر ایک کو تحائف پیش کرے۔

اس نے ہمیں بھی سائبیریا اور یورال کے پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیزیں، مثلاً جڑاؤ چھلے، کانٹے، ٹین کی انگوٹھیاں، آلپین، مورتیں اور مختلف چھوٹے چھوٹے کھلونے، اپنی یادگار کے طور پر زبردستی پیش کر دیں، جن میں بعض تو اپنی نایابی اور نفیس صنعت کا نمونہ ہونے کی وجہ سے نہایت بیش قیمت تھیں۔ حالانکہ ایسے موقع پر تحائف کا قبول کرنا سراسر ناموزوں تھا، لیکن خیال فرمائیے کہ وہ اتنی خوشامدوں سے اس قدر اصرار کے ساتھ ان کو پیش کرتا تھا کہ اس سے انکار کر دینا محال ہو جاتا تھا۔ ایک بچہ اگر اصرار کے ساتھ اپنی مٹھائی آپ کے سامنے پیش کرے، تو زیادہ آسانی سے انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس کے تحائف سے گریز کرنا امکان سے باہر تھا۔

اس کے ساتھ اسباب کے درجہ میں بھی اور خود اسی گاڑی میں بھی، اسی قسم کی بے شمار اشیاء تھیں، جو سب چکہ اور یورو چکہ کے تحفہ کے طور پر تھیں۔ خوب صورت کھلونے، ریشم کی کڑھی ہوئی بے بہا ساڑھیاں، ہاتھی دانت اور سونے کی چھوٹی چھوٹی تصویریں، جو سیپ کی تختیوں پر بنی ہوئی تھیں، سمور کے کوٹ، رنگین پنکھے، روغنی صندوقچے، تصویروں کے البم اور ایسی ہی دیگر اشیاء کا ایک غیر محدود ذخیرہ تھا۔ جس وقت وہ ان تمام چیزوں کو ہمیں دکھلا رہا تھا، تو آپ اس کی حالت دیکھتے اور اس کی باتیں سنتے، کہ کس محبت اور جوش کے نشہ میں جھوم جھوم کر وہ اپنے پیاروں کا تذکرہ کرتا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ اس کی محبت اندھی تھی، بہت زیادہ پرجوش تھی اور بے حد انانیت پسند تھی، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ وہ بہت کچھ جنون کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، تاہم میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس فرسودہ اور معمولی پردے کے اندر اس کی پاکیزہ صادق محبت، اس کی گہری اور مستقل محبت، جھلکیاں مارتی ہوئی مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔

مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک اسٹیشن پر، جہاں چند ڈبے لگائے جا رہے تھے، ایک خلاصی کا پاؤں کٹ گیا۔ تمام مسافر ——— جو میرے نزدیک دنیا بھر میں سب سے زیادہ کاہل، وحشی اور ظالم مخلوق ہے ——— خون کا تماشا دیکھنے کے لئے گاڑی سے نیچے اتر پڑے۔ انجینئر اس ہجوم کے ساتھ نہ رہا، بلکہ سب کی نظر بچا کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچا، اس سے چند

فاظ کہے اور اپنی پاکٹ بک میں سے نکال کر کچھ روپیہ اس کے ہاتھ میں دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی حقیر رقم نہ تھی کیونکہ سٹیشن ماسٹر نے تعظیم کے ساتھ اپنی سرخ ٹوپی اتار کر سلام کیا۔ انجینئر نے یہ کام اتنی سرعت سے انجام دیا کہ شاید میرے سوا ن کو کوئی اور نہ دیکھ سکا، لیکن ایسے معاملات کے لئے میری نگاہ بہت تیز ہے۔ بہرحال میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ٹرین کے تاخیر سے کے رہنے سے فائدہ اٹھا کر وہ سیدھا ٹیلی گراف آفس میں جا پہنچا۔

مجھے اس طرح یاد ہے جیسے کل کی ہی بات ہو کہ کس انداز سے وہ پلیٹ فارم پر ادھر سے ادھر گھوم رہا تھا۔ سفید ٹوپی سر کے پیچھے کو جھکی ہوئی تھی، بدن پر ایک ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا تھا، بس کے بٹن بازو کی طرف لگے ہوئے تھے۔ چشمہ کالر کے ساتھ ایک دھاگے سے اٹکا ہوا اس کے کندھے پر جھول رہا تھا اور ایک چھوٹا سا منی بیگ دوسرے کندھے سے سینہ کو عبور کرتا ہوا کمر کے پاس لٹک رہا تھا۔ اس انداز میں وہ ٹیلیگراف آفس سے باہر نکلا اور اپنے گرد و پیش دنیا کو یوں دیکھنے لگا، جیسے کہ ایک موٹا تازہ، خوبصورت اور سیدھا سادہ دہقانی لڑکا دیکھتا ہے۔

ہر بڑے اسٹیشن پر اس کے نام ایک نہ ایک تار ضرور ہوتا۔ اس نے گارڈوں کی عادت اس قدر بگاڑ دی تھی کہ وہ خود بخود ٹیلیگراف آفس پہنچ جاتے اور دریافت کر لیتے کہ اس کے نام کوئی تار تو نہیں بیچارہ لڑکا! وہ اپنی دلی مسرت کو چھپانے سے قاصر تھا اور ہر تار ہم سب کو زور سے پڑھ کر سناتا۔ گویا کہ ہمیں اس کے خاندان کی خوشی کے سوا اور کوئی فکریں ہی نہ تھیں۔

"خوش رہو، ہم اپنے پیار و محبت بھیجتے ہیں اور سخت بیتاب ہیں۔"

سنو چکہ، یورو چکہ۔

"گھڑی ہاتھ میں ہے اور ٹائم ٹیبل کے ذریعے سے تمہارے سفر کا اندازہ کر رہی ہیں ایک اسٹیشن سے دوسرے تک جذبات و تخیلات میں تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔"

اور تقریباً تمام تار اسی انداز میں تھے لیکن ایک کا مضمون شاید یہ تھا:۔

"اپنی گھڑی کو سٹر و گراڈ کے وقت کے مطابق ٹھیک گیارہ بجے کر لو، دب الاکبر کے پہلے ستارے کو دیکھو میں بھی ایسا ہی کر رہی ہوں۔"

ہماری گاڑی میں ایک اور مسافر تھا، جو شاید کسی سونے کی کان کا مالک، محاسب یا منتظم تھا۔ خاص سائبیریا کا

رہنے والا تھا۔ خشک لمبا چہرہ، گھنی سیاہ اور خوف ناک بھویں، ایک بہت گھنی لمبی اور اُلجھی ہوئی داڑھی یہ اس کے چہرہ کی خصوصیات تھیں۔ اگر آپ اسے دیکھتے تو شاید اندازہ کرلیتے کہ زندگی کے تلخ تجربات نے اسے بہت کچھ پریشان رکھا ہوگا۔ اس نے بہت نرمی کے لہجہ میں انجینیر سے کہا :

" میاں صاحبزادے ! آپ اس محکمۂ تار سے اس قدر ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیے "

" کیا مطلب ؟ میں ناجائز فائدہ کیا اُٹھاتا ہوں ؟ "

" کیوں ! یہی جو آپ کا طریقہ ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ اپنی نوجوان بیوی کو اس قدر مشتعل اور انتہائی اضطرابی حالت میں نہ رکھیں۔ آپ کو دوسروں کے جذبات کا بھی احترام کرنا چاہیئے "

لیکن وہ صرف ہنسنے لگا اور اس عقل مند شخص کے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا :

" ہاں بڑے میاں ! میں آپ جیسے قدیم الخیال لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ آپ حضرات کسی سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو چپکے سے اور یہ چاہتے ہیں کہ خلافِ توقع ایک دم پہنچ جائیں اور دل میں سوچتے جاتے ہیں کہ ہمارے مکان میں سب کام مرضی کے موافق ہو رہے ہیں یا نہیں۔ ایں ؟ "

لیکن اس شخص نے صرف اپنی بھویں اوپر کو اُٹھائیں اور مسکرانے لگا :

" اچھا ! اچھا !! تو پھر بات کیا ہوئی ؟ اس میں ہی تو کوئی بُرائی نہیں، کوئی غلطی نہیں "

کشتی سے کچھ اور مسافر ہمارے درجہ میں سوار ہوئے اور ماسکو سے اور۔ میرے انجینیر کی آتشِ شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی ——— افسوس ! اس کا کیا علاج تھا ؟ وہ ہر شخص سے بہت جلد بے تکلف ہو جاتا تھا۔ شادی شدہ آدمیوں سے وہ ازدواجی زندگی کے تقدس اور پاکیزگی پر گفتگو کرتا، غیر شادی شدوں کو تجرد کی تنہائی اور بیکسی پر ملامت کرتا، کمسن لڑکیوں سے آخری اور ابدی محبت کا تذکرہ کرتا، اور شادی شدہ عورتوں سے بچوں کی بابت بات چیت کرتا۔ بہرحال خواہ کسی موضوع پر بحث ہوتی سنوچکہ اور یوروچکہ کا ذکر اس میں ضرور آجاتا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کی کس طرح نقل اُتاری تھی۔ " ہمائے پاث جلد جوتے ہیں "۔ (ہمارے پاس زرد جوتے ہیں) " ہمائے ثامنے ڈاٹٹل ٹی ڈودٹان ہے " (ہمارے سامنے ڈاکٹر کی دوکان ہے)۔ ایک مرتبہ وہ بلی کو بھینچ کر پیار کر رہی تھی اور بلی تکلیف میں میاؤں میاؤں کر رہی تھی کہ اس کی ماں نے کہا : " یوروچکہ، چھوڑ دو بلی کو، اسے تکلیف ہو رہی ہے "

لیکن اس نے جواب دیا "نہیں، امی جان، اٹے گھشی ہوئی ہے" (اسے خوشی ہو رہی ہے) ایک مرتبہ اس نے
سڑک پر کچھ زرد رنگ کے غبارے دیکھ کر اپنی ماں سے کہا تھا "امی یہ کتنے بادُلے ہیں" (یہ کتنے باؤلے ہیں)
یہ تمام باتیں پُرمحبت اور موثر ضرور تھیں، لیکن میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ کسی حد تک پریشان کن تھیں۔

جب ہم پٹروگراڈ کے قریب پہنچے ہیں، تو صبح ہو رہی تھی۔ دن ابر آلود ہونے کی وجہ سے خراب اور کثیف
تھا، چاروں طرف بلوط کے گھنے اور رتنا اور درختوں پر اور گرد و پیش کی نم آلود پہاڑیوں پر گہرا کہر چھایا ہوا تھا
جسے کہر کی بہ نسبت ایک کثیف دھند کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس دھندلی فضا میں پہاڑیاں جو ریلوے لائن کے
دونوں طرف دور تک پھیلی چلی گئی تھیں، ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا کہ زمین کے چہرہ پر ناہموار مہاسے ابھر آئے ہیں
میں ذرا سویرے ہی اُٹھ بیٹھا، تاکہ غسل کرنے کے لئے کافی وقت مل جائے۔ راستہ میں انجنیئر سے ملاقات ہوگئی وہ
کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا، کبھی باہر گردن نکال کر دیکھنے لگتا، اور کبھی گھڑی پر نظر ڈال لیتا تھا۔

"آداب عرض ہے" میں نے کہا "آپ یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہیں؟"

"اہا! تسلیمات! فراج شریف! میں صرف ٹرین کی رفتار کا اندازہ کر رہا ہوں۔ اس وقت ہم ساٹھ میل
فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہے ہیں۔"

"کیا اس کا اندازہ آپ اپنی گھڑی کے ذریعے سے کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ بہت آسان قاعدہ ہے۔ ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک ۸۸ گز کا فاصلہ ہے یعنی ایک میل کا
بیسواں حصہ۔ لہذا اگر ہم ان ۸۸ گزوں کو ۴ سکنڈ میں طے کر لیں، تو رفتار ۴۵ میل فی گھنٹہ ہوگی، اگر تین سکنڈ
میں، تو ۶۰ میل اور اگر دو سکنڈ میں تو ۹۰ میل اور بغیر گھڑی کے بھی آپ رفتار معلوم کر سکتے ہیں، صرف اتنا معلوم
ہونا چاہیئے کہ سکنڈ کس طرح گنے جاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ جس قدر جلد لیکن صاف صاف، چھ تک گن سکتے ہوں
گننے۔ اس طرح: ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ —— ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ ——
یہ سلطنت آسٹریا کے جنرل اسٹاف کا قاعدہ ہے۔"

وہ اسی انداز سے اکھڑی اکھڑی باتیں کرتا رہا، گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور برابر اپنی جگہ
بدلتا جاتا تھا۔ لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ آسٹرین جنرل اسٹاف کے یہ تمام طریقے صرف ایک پردہ کے طور پر تھے،

کے پیچھے انجنیر اپنی بیتابی اور بے صبری کو فریب دینے کی بے سود کوشش کر رہا تھا۔

جب ہم لیوبان پہنچے تو اس کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ وہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے زرد رو، منحنی اور بوڑھا معلوم ہونے لگا۔ اس نے بات چیت کرنا بھی چھوڑ دی اور اخبار پڑھنے کا بہانہ کرنے لگا لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ شغل بھی اس کو ناگوار معلوم ہو رہا تھا، کیونکہ کبھی کبھی اکتا کر وہ اخبار کو اُلٹا ہی دیکھنے لگتا تھا۔ اس کی تمام حرکات دلی بے چینی اور ...کا پتا دے رہی تھیں۔ وہ بمشکل پانچ منٹ تک خاموش بیٹھا رہتا، پھر اٹھ کر دروازہ کی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوتا ...بیٹھ جاتا اور اضطراری کیفیت میں پہلو بدلتا رہتا، گویا کہ ٹرین کو اور زیادہ تیز چلنے کے لئے ڈھکیلنا چاہتا ہے، پھر ...وازہ کی کھڑکی کے پاس پہنچتا، گھڑی کے ذریعہ سے رفتار کا اندازہ کرتا اور سر ہلاتا رہتا۔ آہ! میں خوب جانتا ہوں — ...کون نہیں جانتا؟ — کہ انتظار کے دن اور ہفتے بھی ان آخری گھنٹوں کے، اس آخری پاؤ گھنٹہ کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

بالآخر ہم سنگل تک پہنچ گئے، پھر قینچیوں اور ریلوں کے جال کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد اسٹیشن کا ...چوڑا پلیٹ فارم اور زرد زرد وردیاں پہنے ہوئے قلی نظر آئے ... — انجنیر نے یونیفارم کا کوٹ پہنا، ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور دروازہ کھول کر تختہ پر کھڑا ہوگیا۔ میں بھی ایک کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا، تاکہ گاڑی کے ٹھیرتے ہی قلی کو آواز دے سکوں۔ میں نے انجنیر کو دیکھا، وہ دروازہ میں کھڑا ہوا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا، اپنا سر ہلایا اور مسکرانے لگا ...میں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ دیکھا کہ وہ اس وقت غیر معمولی طور پر بے انتہا زرد معلوم ہو رہا تھا۔

ایک لمبے قد کی خاتون، نقرئی رنگ کی جاکٹ پہنے، سر پر مخمل کی بڑی سی ٹوپی رکھے اور چہرہ پر نیلے رنگ کا برقعہ ڈالے ہوئے، ہماری گاڑی کے سامنے گزر گئی۔ اس کے ہمراہ ایک چھوٹی لڑکی تھی، جو اونچا کوٹ اور سفید پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ دونوں کی نگاہیں ٹرین کا تعاقب کر رہی تھیں اور ہر کھڑکی کو نہایت اضطراب کے ساتھ دیکھتی جاتی تھیں۔ لیکن ...ن کی نظریں چوک گئیں۔ اس کے بعد میں نے انجنیر کو ایک عجیب بیٹھی ہوئی اور لرزتی ہوئی آواز میں پکارتے سنا "سنو چکہ" میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے مڑ کر دیکھا ... اس کے بعد یکایک درد و تکلیف کی ایک مختصر، خوف ناک چیخ سنائی دی ... میں اس کو نہیں بھول سکتا، عمر بھر نہیں بھول سکتا ... وہ دوسری تمام چیخوں سے مختلف ایک ایسی چیخ تھی جس میں پریشانی، خوف، تکلیف اور مایوسی شامل تھیں۔

ایک لمحہ کے لئے، صرف ایک لمحہ کے لئے، مجھے انجنیر کا سر نظر آیا، کہیں پلیٹ فارم اور گاڑی کے پہیوں کے

درمیان ..... ٹوپی ندارد ہو چکی .... اس کا چہرہ میں بالکل نہ دیکھ سکا، صرف سر کی گلابی جلد نظر آئی جس پر
چھوٹے چھوٹے بال کھڑے تھے۔ سر بھی بس ایک لمحہ کے لئے نمودار ہوا .... اور پھر میں کچھ نہ دیکھ سکا۔

اس کے بعد مجھ سے بطور گواہ کے سوالات کئے گئے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کی بیوی کو تسلی اور تشفی دینی چاہی
لیکن ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ میں نے انجینئر کو بھی دیکھا، کچلے ہوئے اور کٹے ہوئے گوشت
ایک لوتھڑا معلوم ہوتا تھا۔ جب اسے گاڑی کے نیچے سے نکالا گیا ہے، تو وہ دم توڑ چکا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے صدمے
اس کی ٹانگ کٹی تھی، لیکن فطرتی طور پر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی اور مڑا۔ مڑنے کے ساتھ ہی پہیہ اس کے سینہ دبتے ہوئے گ

اب میں اس سرگزشت کے سب سے زیادہ دردناک حصہ پر آتا ہوں۔ ان مہیب اور ناقابلِ فراموش لمحات میں یہ
عجیب خیال متواتر میرے دماغ میں چکر لگاتا رہا۔ میں نے دل میں کہا "احمقانہ موت، بیہودہ موت، ظالم، غیر منصفانہ
لیکن بہر نوع اس کی چیخ کے بعد پہلے ہی لمحہ میں مجھے صاف نظر آنے لگا تھا کہ انجام کار لازمی طور پر یہی ہونا تھا او
یہ لغویت منطقیانہ اور قدرتی تھی لیکن ایسا کیوں تھا؟ تشریح کیجئے؟ .... کیا یہ میرے "کوئی" کا و
تغافل نہیں تھا، جسے اس حد تک محسوس کیا گیا؟

بعد کو میں انجینئر کی بیوہ سے ملنے گیا۔ وہ اُس کے متعلق مجھ سے سوالات دریافت کرتی رہی اور آخر میں صاف
اقرار کر لیا کہ ہم دونوں نے اپنی محبت کی بیتابی، ملاقات کے تیقن، اور خوش آئند مستقبل کے یقین سے قسمت کو فریب دینا چاہا
تھا۔ ... لیکن پھر اس کے بعد کیا؟ ممکن ہے کچھ ہو، مگر میں کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا ..... مشرق میں (اور
ہم قدیم عقل و دانائی کے پاک و صاف چشمہ کو لہریں مارتے دیکھتے ہیں) کوئی شخص اپنا ارادہ "انشاء اللہ" کا جملہ
کہے بغیر ظاہر نہیں کرتا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اگر خدا نے چاہا" یا "اگر اس کو منظور ہوا"

بہرحال میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں قسمت کے فریب کو دخل نہ تھا، بلکہ یہ صرف میرے "پُراسرار" کوئی
کی وہی لغو منطق تھی حقیقتاً اس سے زیادہ خوشی، اس سے بڑھکر مسرت، انھیں عمر بھر حاصل نہ ہو سکتی، جب وہ بعد و فصل
کی درازیوں کو طے کرنے کے بعد ایک دوسرے سے ملتے۔ لیکن خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس آزمائش میں کامیاب
اُترنے کے بعد ان کی قسمتوں میں آیندہ کیا لکھا ہوتا، ان کی مشتعل محبت کا کیا انجام ہوتا۔ بدمزگی؟ دل سیری؟ تغافل
اور ممکن ہے کہ نفرت؟

انیس الدین احمد رضوی

غیر کے اعتماد پہ زعمِ حیات تا کجا
وہمِ تسلیات پر سعیِ حیات تا کجا

قوتِ ماسوا پہ یہ بارِ نجات تا کجا
مطلعِ فکر پر محیط جہل کی رات تا کجا

اپنی ہی روشنی بنا خود ہی زمانہ تاب بن
ذرۂ عافیت گزیں بیر کر آفتاب بن

خاص ہیں تیری قوتیں اور تجھے خبر نہیں
تجھ پہ ہیں حق کی رحمتیں اور تجھے خبر نہیں

تجھ میں نہاں ہیں عظمتیں اور تجھے خبر نہیں
ہیں ترے دل میں ہمتیں اور تجھے خبر نہیں

غیر کے اعتماد پر کس قدر اعتبار رہے
عزتِ نفس کے لئے غیر کا انتظار رہے

غیر کریں ترا وقار تجھکو یہی ہوس رہی
غیر کی تھی وہ آرزو جو تری ہم نفس رہی

دوسروں کی گراں سری تیری نظر میں بس رہی
طوطیٔ روح دائماً قیدیٔ صد قفس رہی

کچھ بھی نیاز کے سوا اور نہ تجھ سے ہو سکا
اپنی حقیقتوں پہ کیوں غور نہ تجھ سے ہو سکا

گلشنِ کائنات میں طائرِ خوش نوا ہی تو
باغِ تجلیات میں بلبلِ نغمہ زا ہی تو

مہرِ کمال ہی مگر جہل میں گھر گیا ہی تو
ذات کے اعتراف سے دور چمک رہا ہی تو

مرکزِ فطرتی پہ آ، جلووں کو اذنِ تاب دے
طبعِ فسردہ رنگ کو فطرتِ آفتاب دے

خود ہی بہار تازہ بن سیرِ بہار خود ہی کر
اپنے ہی ذوق کو سنوار اپنا سنگھار خود ہی کر

اپنے کمالِ ذات پر دل کو نثار خود ہی کر
عزتِ نفس کو سمجھ، اپنا وقار خود ہی کر

نور ہی فطرت آشنا، عظمتِ نفس ہی یہی
اپنی ہو معرفت تجھے عزتِ نفس ہی یہی

ابوالحسن حسن بدایونی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اقوالِ زرّیں

(۱) کسی مسئلہ کو لاینحل کہنے کے یہ معنی ہیں کہ آپ اُسے سمجھے نہیں۔ (لارڈ ڈیلوس)

(۲) علم کو ناز ہے کہ میرے معمول نے اس قدر حاصل کرلیا' عقل معترف ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔

(۳) جہالت کے علاوہ کوئی تاریکی نہیں۔ (شکسپیر)

(۴) سچائی چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی بڑے بڑے معاملات میں۔ ... سے مترتب ہوتے ہیں زیادہ اہم نہیں۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ تمھارا دل جھوٹ سے آلودہ نہ ہو

(۵) بہترین مشروب وہ ہے جسے انسان اس وقت منہ میں لے جب وہ کوئی خراب بات کہنے والا ہو کیونکہ یہ چیز اُسے اس کلمۂ بد کے تلفظ سے روک دے گی اور اس کے فرد کرنے میں معاون ہوگی۔

"حُسن"

اک آپ ہی نہیں ہیں فقط تاجدارِ حُسن
ہر پیکرِ حیات ہے صد جلوہ زارِ حُسن

آخر سکون اس کی فنا کا سبب ہوا
رہتا ہمیشہ کاش یہ دل بے قرارِ حُسن

سُرمہ تھا طور عشق میں جنابِ کلیم تھے
چمکا کچھ اس طرح سرِ سینا شرارِ حُسن

دونوں کے نام لوحِ ابد پہ رہیں گے نقش
میں یادگارِ عشق ہوں وہ یادگارِ حُسن

کچھ بے سبب نہیں مری مخموریاں مجید
آنکھوں سے پی رہا ہوں مئے خوشگوارِ حُسن

مہدی اجنالوی

تاریخ اخلاق یورپ، جلد اوّل | لیکی کی مشہور کتاب "ہسٹری آف یورپین مارلس" کا ملخص ترجمہ، از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، بی اے۔ کتابت و طباعت بہترین، ضخامت ۲۹۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ (۱) دارالاشاعت انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن، یا (۲) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

زیر تنقید کتاب مطبوعات انجمن ترقی اُردو کے سلسلہ کی انیسویں کتاب ہے اور آج سے پیشتر اُردو دنیا میں کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے مکرم مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی کے اہتمام سے مسلم یونیورسٹی پریس میں طبع ہوا ہے۔ اور یہی نام کتاب کی ظاہری خوبیوں کے لئے کافی سے زیادہ ضمانت ہے۔

کتاب کے باطنی محاسن پر تبصرہ یا رائے زنی کرنا تحصیل حاصل بھی ہے اور بعد از وقت بھی۔ مولانا عبدالماجد صاحب اس صنف کی تالیفات کے سلسلہ میں تمام تعریف و توصیف سے بالاتر ہو چکے ہیں، اور اسی طرح "تاریخ اخلاق یورپ" علمی طبقہ میں کافی نام پیدا کر چکی ہے۔ جو علم دوست حضرات تاریخ اور فلسفہ سے شغف رکھتے ہوں، اُنھیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

بقائے دوام | مصنفہ جناب میاں محمد اسلم صاحب، کاغذ کتابت اور طباعت بہترین، سرورق نہایت خوبصورت ضخامت ۷۲ صفحات قیمت مجلد عہ، بلا جلد عمر۔ ملنے کا پتہ: بسنیم بک ڈپو، بازار باردوخانہ، لاہور

ہمارے محترم دوست اور "نادیدہ کرم فرما" جناب میاں محمد اسلم صاحب، ادبیات اردو کی جس قدر گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں وہ غریب اردو کے لئے ایک احسانِ عظیم سے کم نہیں۔ حال ہی میں آپ نے اپنی تصانیف میں ایک اور کتاب کا اضافہ فرمایا ہے، جس کی بابت بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے، اور میاں صاحب نے اس طرف قدم اُٹھا کر ملک کے دماغوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا ہے۔

"روح" کی ماہیت اور حقیقت کے متعلق مغربی زبانوں میں بیسیوں تصانیف نظر آتی ہیں۔ یورپ کے مشاہیر اہل قلم نے اپنے اپنے تجربوں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دادِ تحقیق دی ہے۔ سر آرتھر کانن ڈائل اور سر الیور لاج ماہیت روح کے متعلق مختلف تجربات کر چکے ہیں، اور آج یورپ میں یہ عقیدہ انھیں تجربات و تحقیقات کا مرہونِ منت ہے کہ روح انسان کے جسم سے علیحدہ ہو کر ہمیشہ کے لئے مادی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہو جاتی۔

میاں صاحب نے یورپ کی اس تمام تحقیقات کا خلاصہ "بقائے دوام" میں پیش کیا ہے اور مختلف مثالیں دے کر اس نظریہ کو واضح کرنے کی ایک بڑی حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ "بقائے دوام" کا کچھ حصہ علی گڑھ میگزین کے تعطیلات نمبر میں شائع ہو چکا ہے اور اسی سے اس مضمون کی ندرت اور دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب اس قدر دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل گوارا نہیں کرتا اور اس کے باوجود بھی مفصل تحقیقات کے حالات معلوم کرنے کے لئے پھر تکتا رہ جاتا ہے۔

اس تصنیف کی اصل محرک، میاں صاحب کی خورد سال بچی اصغری کی موت ہوئی اور اس معصوم کے نام سے یہ کتاب معنون کی گئی ہے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کیوں کہ میاں صاحب کی کتابیں کاغذ، کتابت اور طباعت کے لئے مشہور ہو چکی ہیں۔ شروع میں میاں صاحب کا ایک فوٹو بھی کتاب کی زینت ہے۔ اسی سلسلہ میں ان پُرخلوص اور پُرمحبت الفاظ کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جو میاں صاحب موصوف نے کتاب کے دیباچہ میں ناچیز مدیر کی بابت تحریر فرمائے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تصنیف جس مقبولیت کی مستحق ہے، حاصل کرکے رہے گی اور اُردو داں اصحاب اس نئے موضوع کو انتہائی دل چسپی سے مطالعہ کریں گے۔

انشائے جدید مرتبۂ جناب محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری ایچ پی۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ۱ر۔ مؤلف موصوف سے خسرو باغ روڈ رام پور اسٹیٹ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں فاضل مؤلف نے فارسی جدید کے چند مفید خطوط اور دیگر قسم کے کاغذات کو فراہم کیا ہے۔ اثر صاحب نے فارسی جدید کے پہلو بہ پہلو ہندوستانی فارسی کے نمونے بھی دیئے ہیں اور اس سے طلباء کے لئے یہ کتاب بہت مفید اور کارآمد بن گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس کتاب کو مسلم یونیورسٹی نے اپنے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کے لئے بھی منظور فرمالیا ہے اور فارسی کے نصاب میں داخل کرلی گئی ہے۔

اثر صاحب نے زمرۂ طلباء پر ایسی کارآمد کتاب لکھ کر بہت بڑا احسان کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ لوگ جو فارسی جدید سے شغف رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کے متمنی ہیں اس رسالہ کا خاص طور سے مطالعہ فرمائیں گے۔

مضامینِ چکبست یعنی پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی آں جہانی کے چند ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ کتابت و طباعت بہت خوب ضخامت ۲۴۴ صفحات قیمت صرف عہ، جو کتاب کے محاسن پر نظر ڈالتے ہوئے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ: انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد

جناب چکبست کا نام ادبی دنیا میں آج کسی تعارف کا محتاج نہیں ملک کے اُن چند اہلِ ہنود حضرات میں آپ کی ذات ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی جنھوں نے اُردو کو بجا طور پر اپنی متفقہ مادری زبان سمجھا اور آخر عمر تک اس کی خدمت سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اہل زبان ہونے کے علاوہ آپ کا اردو کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور نثر اور نظم دونوں میں ید طولےٰ رکھتے تھے۔ مقام شکر ہے کہ آپ کے مضامین کا یہ مجموعہ انڈین پریس نے شائع کرکے غریب اُردو کو ایک ناقابل تلافی

نقصان سے بچالیا اور ان نوادرِ ادبی کو محفوظ کرکے اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

اس مجموعہ میں تین مضامین کے علاوہ باقی تمام مضامین ایسے ہیں جو ادبیات اردو کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور ان میں بھی کچھ حصہ ایسے تنقیدی مضامین کا ہے، جن میں بعض ہندو شعرا کے کلام پر نظر ڈالی گئی ہے۔ ان کے علاوہ داغ دہلوی، مثنوی گلزارِ نسیم، اودھ پنچ، منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد اور دیگر عنوانات پر بھی مضامین ہیں۔

چکبست مرحوم کی تحریر اور طرزِ انشا پردازی میں سلاست اور روانی بہت پائی جاتی ہے اور اکثر مقامات پر عبارت اور الفاظ میں ایسی دل کشی اور رنگینی پیدا ہوگئی ہے کہ بار بار اُسے پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے کا آپ کو خاص ملکہ تھا۔ اور اس مجموعہ میں جس قدر تنقیدی مضامین ہیں، اُن سے پتہ چلتا ہے کہ کلام کے انتخاب میں آپ کی نظر نکتہ رس تھی اور چوں کہ خود بھی اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ لہٰذا شعرا کے عیوب اور محاسن آپ کی نظر سے نہیں چھپ سکتے تھے۔ اکثر مضامین ایسے بھی معلوم ہوتے ہیں جو مولانا شرر مرحوم کے جواب میں کسی ادبی مبحث پر لکھے گئے ہیں۔

بہرحال یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے اہلِ ملک کو اس سے سب سے بڑا یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ اُردو کسی ایک فرقہ یا ایک جماعت کی زبان نہیں بلکہ ہندوستان کی متفقہ اور مسلّمہ زبان ہے۔ ایسی زبان جس نے ہر قوم و ملت سے اپنے سچے اور حقیقی محسن پائے، اور انھیں محسنوں کے طفیل آج اس شاہراہِ ترقی پر گامزن نظر آتی ہے۔

ارنسٹ آسکر وائیلڈ کے ایک ایک ڈرامہ "دی امپارٹینس آف بینگ ارنسٹ" (The Importance of Being Earnest) کا اردو ترجمہ از مولوی سید تمکین کاظمی صاحب، منشی فاضل، ایم آر اے ایس و مولوی محمد عبدالمنعم سعیدی، بی اے دعلیگ، ایم آر اے ایس۔ کتابت و طباعت معمولی، ضخامت ۱۱۰ صفحات، قیمت عمر ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

"دی امپارٹینس آف بینگ ارنسٹ" انگلستان کے شہرۂ آفاق ڈرامانگار آسکر وائیلڈ (Oscar Wilde) کے شاہکاروں میں گنا جاتا ہے، اس کے دیگر ڈراموں کی طرح اس میں ندرتِ تخیل اور اسلوب بیان کی لطیف مثالیں ہر جگہ نظر آتی ہیں

ڈرامہ کے پلاٹ کا جہاں تک تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انتہائی دلچسپ اور شگفتہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ترجمہ کی اصل خوبی کو مترجمین قائم نہ رکھ سکے۔ حقیقت میں ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہو سکے بلکہ بذات خود اپنی تصنیف معلوم ہو۔" ارنسٹ" میں یہ خوبی تقریباً ہر جگہ مفقود نظر آتی ہے۔ اکثر مقامات پر مغربی انداز بیان کی لفظ بلفظ پیروی کرنے کی وجہ سے عبارت بالکل بے ربط ہو گئی ہے۔ اور ادائے خیال میں اس قدر گنجلک پیدا ہو گئی ہے کہ کوئی انگریزی نہ جاننے والا شخص اس کو مشکل سمجھ سکے گا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ ایڈیشن میں مترجمین صاحبان زبان کو عام فہم، سلیس اور شستہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس کے بعد یہ کتاب ادبیات اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہو گی۔

قوم پرست طالب علم

بچوں کے لئے ایک ڈراما، از جناب محمد عبدالغفار صاحب مدہولوی، مدرس جامعہ ملیہ دہلی کتابت و طباعت اچھی، حجم ۴۸ صفحات قیمت ۲/ ملنے کا پتہ (۱) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ دہلی۔ (۲) اجمل بک ڈپو پرنس بلڈنگ بمبئی (۳) قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ، لاہور (۴) اورنٹیل بک ڈپو، دکان نمبر ۵۔ مکان نمبر ۸۵۔ ۸۶، فریزر اسٹریٹ، رنگون۔ (۵) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

یہ ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس میں چھوٹے بچوں کو حب وطن، راست بازی اور ایمانداری کی ایک دلچسپ پیرایہ میں تعلیم دی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک آج کل ملک کو ایسی تصانیف کی زیادہ ضرورت ہے جو لطیف اور دلکش قصوں کے ذریعہ سے بچوں کے دماغ میں شریفانہ خوبیوں کو اچھی طرح جما دیں، اور شروع ہی سے ان کے عادات و خصائل کی اصلاح کر دیں۔ ہم مولوی عبدالغفار صاحب کی اس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ بے تکی اور لغو کہانیوں کے مقابلہ میں اس قسم کے سبق آموز قصے بچوں کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

روحِ رواں

یعنی کلیات جناب جگت موہن لال صاحب رواں ایم اے وکیل اناؤ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب حجم ۴۴ + ۲۲۲ صفحات، قیمت درج نہیں۔ مصنف صاحب سے مل سکتی ہے۔

رواںؔ صاحب سے علی گڑھ کی فضا خوب واقف ہو چکی ہے۔ انجمن خیابانِ اُردو انٹرمیڈیٹ کالج کا جو سالانہ مشاعرہ ۹۰۸ دسمبر کو منعقد ہوا تھا، اس میں رواں صاحب نے اپنے کلام سے حاضرین کو مسحور کر لیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب کلیات کے طور پر شائع ہوئی ہے جس میں کلام کی تقریباً تمام اصناف، یعنی منظوم، غزلیات، قطعات، رباعیات، وغیرہ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ شروع میں جناب عزیز لکھنوی کا ایک نہایت فاضلانہ مقدمہ شامل ہے جو تقریباً ۶۰ صفحات پر حاوی ہے۔

رواں صاحب کو شاعری میں جو یدطولیٰ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کے اشعار سلاست بیان ندرتِ تخیل، اور زورِ طبع کی صحیح مثالیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر صنفِ کلام پر آپ کو یکساں قدرت حاصل ہے۔ نظموں میں "سرودِ عشق" جس کا پہلا شعر ہے۔

جب صبح گلابی ہونٹوں سے پیغام نورِ سناتی ہے ۔۔۔ جب شب کی اندھیری دن کی ضیا سے آکے گلے مل جاتی ہے

اور "لاوارث بچہ" "آنسو" "معجزۂ انتظار" جس کا ایک شعر ہے۔

شب تھی، وہ مستِ بادۂ الفت و جامِ آرزو ۔۔۔ اب تھی، فریب خوردۂ سحر پیامِ آرزو

اور "دو آئینے" یعنی "ایک ہندو بیوہ سے پیام شادی اور بیوہ کا جواب" بہترین نظمیں ہیں۔ ان میں رواں صاحب نے انسانی جذبات کی جس طرح ترجمانی کی ہے وہ آپ ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح "غبارہ" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ لطیف استعارات اور تشبیہات سے مملو ہے۔ چند اشعار ہیں۔

حسیں پری کوئی مستِ مئے صبوح چلی ۔۔۔ نکل کے قالب خاکی سے جیسے روح چلی

پڑا ہے یا کسی مے کش کا صبر رندانہ ۔۔۔ اُلٹ گیا ہے مئے آتشیں کا پیمانہ

ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشکِ نیاز ۔۔۔ چلا ہے ہونے کو دامانِ عفو پر ممتاز

غزلیات میں کہیں کہیں "آورد" کی کیفیت بھی نظر آجاتی ہے، تاہم اس صنف میں بھی رواں صاحب کی وہی قادرالکلامی صاف جھلکتی ہے۔ جو آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہماری آخری ہچکی پہ وہ ارشاد کرتے ہیں ۔۔۔ انھیں کو ضبط کا دعویٰ ہے جو فریاد کرتے ہیں

اُداسی ہے ہر اک چہرہ پہ، ہر پہلو میں سناٹا ۔۔۔ خدا جانے کوئی کیا اُٹھ گیا ہے کے محفل سے

چھینٹیں جو خوں کی دامنِ قاتل میں رہ گئیں ۔۔۔ محشر میں میرے قلب کی تفسیر ہو گئیں

میں یک جا ہی کرتا تھا اپنے ہوش | کہ اُن سے مرا سامنا ہو گیا

کعبۂ وفا ہے یہ، خانۂ خدا ہے یہ | اُف یہ کیا کیا تم نے دل کی کوئی ہستی نہ

گلہ فضول ہے طولِ شبِ جدائی کا | بہت سی راتیں ہوئیں ایک کی سحر نہ سہی

رواں صاحب کے کلام میں رباعیات کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اور بالخصوص رباعیات نے ہی آپ کا درجہ مشاہیر شعراء میں اس قدر بلند کر دیا ہے۔ مثالاً صرف چند رباعیات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حرص و ہوسِ حیات فانی نہ گئی | اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی

ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں | مر کر بھی امید زندگانی نہ گئی

کیا تم سے بتائیں عمرِ فانی کیا تھی | بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی

یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا | اک موجِ فنا تھی زندگانی کیا تھی

گناہ کے نظریہ کو کس قدر لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

گر پھر کبھی زندگی عنایت کرنا | مالک میرے خود ہی عنایت کرنا

سمجھتے ہیں گناہ وجہِ تکمیلِ حیات | پھر ذوقِ گنہ ہی عنایت کرنا

پھر فرماتے ہیں

مدہوش کو لذتِ گنہ کیا معلوم | مسرور کو حسرتِ گنہ کیا معلوم

ہے اس سے خودی خودی ہے سیرِ نشاط | ناصح تجھے عظمتِ گنہ کیا معلوم

اس مختصر اور سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ شعر و سخن سے ذوق رکھنے والے اصحاب رواں صاحب کے کلام کی کما حقہٗ قدر کریں گے۔

واقعاتِ عالم | جناب قادر بادشاہ صاحب مرحوم رئیس وانمباڑی کے چند قطعات تاریخ کا مجموعہ، مرتبہ خطیب محمد عبدالرشید صاحب۔ کتابت و طباعت بہت خوب، حجم ۴۴ صفحات۔ قیمت ۴؍۔ ملنے کا پتہ خطیب محمد عبدالرشید نمبر ۶۹ گوڈون اسٹریٹ، مدراس۔

زیر نظر کتاب میں چند تاریخی قطعات یک جا کر دیئے گئے ہیں، جو بادشاہ صاحب مرحوم نے مختلف مواقع پر لکھے تھے کتاب کا نام دیکھ کر ہمیں یہ شبہ پیدا ہوا تھا کہ شاید تاریخ عالم کے کسی پہلو پر محققانہ نظر ڈالی گئی ہو لیکن فوراً ہی اس شبہ کا ازالہ ہو گیا تاہم یہ سرگردانی اب تک باقی ہے کہ ایسے تاریخی قطعات کو جن میں سے بعض شاید مقامی حیثیت بھی نہ رکھتے ہوں گے۔ واقعات عالم سے موسوم کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ مرتب صاحب دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ ''...... دنیا کا ایک تاریخی مجموعہ بن جائے گا جو کتب تواریخ میں شامل کر دیا جا سکتا ہے۔''

بہر حال یہ قطعات ادبی نقطۂ نگاہ سے خاصے ہیں۔ لیکن ایسی غلطیاں اکثر ہیں جو دکن اور مدراس کی زبان میں عموماً پائی جاتی ہیں۔ مثلاً '' کر دیا اس کو غلط ربِ قدیر'' یا '' بیڑہ نہ کسی کا پایا ایسا نقصان، جو کچھ پایا ہے بالٹک کا بیڑہ ''

اس کے علاوہ فن شعر اور زبان کی بھی غلطیاں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ملکۂ وکٹوریہ کی تاریخ وفات کے قطعہ میں جب کا پہلا مصرع ہے'' ملکۂ ذی عزو شاں امپرس وکٹوریہ'' ظاہر ہے کہ اس میں ''امپرس'' کا میں گرتا ہے، اور یہ کسی طرح جائز نہیں۔ یا ''بحری بیڑہ دول یورپ کا گیا'' اور '' دول اور سلطان میں باہم تصفیہ'' ان دونوں مصرعوں میں لفظ '' دَوَل'' کا تلفظ غلط اور قابل اعتراض ہے۔

بہر کیف ان چند غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے، کہا جا سکتا ہے کہ کتاب من حیث المجموع خاصی ہے، اور تاریخی قطعات سے دل چسپی والوں کے لئے اچھا مواد جمع کیا گیا ہے۔

پردہ | آج کل پردہ کی بحث ملک کے طول و عرض میں ہر طرف چھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ مختلف اوقات میں ہمارے پاس حسب ذیل رسالے پردہ کے متعلق موصول ہوئے۔

(الف) مروجہ پردہ کی تائید میں:۔

(۱) حقیقت پردہ، از تصنیف مولوی محمد محمود صاحب تھانوی۔ ۴۴ صفحات

(۲) حجاب اسلامی " " " " ۔ ۴۰ "

(۳) ناموسِ ملت، از خادم علی خاں صاحب اخضرؔ، ڈلیشوڈ روڈ آگرہ۔ ۴۰ صفحات

(۴) مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے مضمون ''پردہ کے حدود'' کا مفصل و مدلل جواب،

ایک حق پرست مسلمان کے قلم سے۔ ۳۲ صفحات۔ دو پیسہ کا ٹکٹ بھیج کر ماسٹر محمد اسحاق صاحب، محلہ مردہی ٹولہ، سیتاپور سے مفت مل سکتا ہے۔

مذکورۂ بالا رسائل اس پردہ کی تائید میں تحریر کئے گئے ہیں جو ہندوستان میں آج کل عام طور سے رائج ہے۔ تمام رسائل میں قرآنِ کریم و احادیث شریف سے پردہ کو "مذہب اسلام کا ایک جزو" ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(ب) پردہ کی مخالفت میں:۔

(۵) قرآن اور پردہ۔ مصنفہ جناب محمد عظیم بیگ صاحب چغتائی بی اے۔

یہ رسالہ ہی نہیں، بلکہ اچھی خاصی کتاب ہے اور چغتائی صاحب کی اصل کتاب "اسلام اور پردہ" کی پہلی جلد ہے۔ مصنف نے اس میں بدلائل و براہین ثابت کیا ہے کہ اس پردہ کا حکم قرآنِ کریم میں کہیں نہیں ملتا جو آج کل ہندوستان میں رائج ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف ہمیں ضرور کرنا ہے کہ چغتائی صاحب نے اپنے نفس مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے، اور قرآنِ کریم سے قرار واقعی طور پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہندوستانی پردہ اسلام کا شعار نہیں بلکہ قدیم عربی تمدن اور معاشرت کے سراسر منافی ہے۔ ہم چغتائی صاحب کی کوششوں کی داد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اس مختلف فیہ مسئلہ پر رائے قایم کرتے وقت چغتائی صاحب کی کتاب "قرآن اور پردہ" کو ضرور نظر کے سامنے رکھا جائیگا۔

(۲) رسائل

سفینہ مدراس

اڈیٹر جناب محمد عبد الجبار صاحب بی اے۔ چندہ سالانہ ساڑھے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:
منیجر سفینہ، گورنمنٹ محمڈن کالج مونٹ روڈ، مدراس

گورنمنٹ محمڈن کالج مدراس کی اردو سوسائٹی کا سہ ماہی علمی و ادبی رسالہ ہے جو جولائی گزشتہ سے عالم وجود میں آیا ہے۔ دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں اور انھیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مدراس کی سرزمین اس معیار کا رسالہ نکال سکتی ہے۔ کالج کے طلباء کی کوششیں واقعی لائق داد ہیں، کہ اس قدر حوصلہ شکن ماحول کے باوجود بھی صحافت اُردو کی صف میں اس قدر شاندار

علمی پرچہ کا اضافہ کیا ہے۔ مضامین کا انتخاب، اور اُن کا بلند معیار مرتب کے ذوقِ علمی کا شاہد ہے۔
ہمیں امید ہے کہ سفینہ عنقریب موقت الشیوع اُردو رسائل میں اچھی حیثیت حاصل کرے گا۔

نورجہاں، گوجرانوالہ سالگرہ نمبر

زنانہ رسالوں میں "نورجہاں" طبقۂ خواتین کی جس قدر خدمت کر رہا ہے، وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ ہر سال تین یا چار خاص نمبر نکالتا ہے اور اپنے خریداروں کو اسی سالانہ چندہ میں پیش کرتا ہے۔ نورجہاں کا اس قدر زبردست ایثار اور جذبۂ خدمت واقعی قابلِ داد ہے، اور ملک کو ایسے رسالوں کی کماحقہٗ قدر کرنی چاہیئے۔

زیرِ نظر نمبر اس کا سالگرہ نمبر ہے، اور دو سو صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا ہے۔ مضامین کا تنوع اس بات کا ضامن ہے کہ نسوانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے یہ خاص نمبر یکساں طور پر مفید ہے۔ تصاویر کی جاذبیت مدیرانِ رسالہ کے ذوقِ نظر کی شاہد ہے۔

زنانہ رسائل میں شاید یہ خصوصیت صرف نورجہاں کو ہی حاصل ہے کہ اس کا عملہ ادارت تمام تر خواتین پر مشتمل ہے، ورنہ ملک میں زیادہ تر زنانہ رسائل صنفِ قوی کی نگرانی میں نکل رہے ہیں۔ اس حیثیت سے نورجہاں کی فاضلہ مدیرہ اپنی اس شاندار کامیابی پر مستحق مبارکباد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ادبیات نواز اصحاب اور خواتین اس کی قدر افزائی کریں گے۔

چمن، امرتسر، سالگرہ نمبر

ادارۂ تحریر: جناب محمد افضل خاں صاحب، جناب چمن لال سیوک صاحب وجناب عمر نظامی صاحب چندہ سالانہ صرف ؏، قیمت سالگرہ نمبر ۸؍

"شعروادب کا باتصویر ماہوار رسالہ" چمن گزشتہ سال سے جاری ہے اور نئے سال کا پہلا نمبر سالگرہ نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے جو سو صفحات سے زائد پر پھیلا ہوا ہے۔ گیارہ بارہ کے قریب رنگین اور سادہ تصاویر ہیں جن میں سے اکثر اس سے قبل دیگر رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔

مضامین میں فسانوں کا عنصر بہت زیادہ غالب ہے۔ اور اکثر فسانے معیار سے گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ منظومات

کے سلسلہ میں اڈیٹر صاحب نے "پوری سربلندی اور فخر" کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ "تمام مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور خاص نمبر کے لئے لکھے گئے ہیں" حالاں کہ چند فسانے ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہم اراکین ادارت سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ واقعی ادبیات اُردو کی خدمت کرنا اتنا ہی ضروری خیال کرتے ہیں، اور جن کو اچھے رسائل کی صف میں جگہ دینا چاہتے ہیں تو انھیں اپنا معیار اور زیادہ بلند کرنا چاہیئے۔ بہر نہج ان کی کاوشیں ضرور قابل داد ہیں۔

انٹرمیڈیٹ کالج میگزین علی گڑھ

مرتبہ جناب محمد حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی چندہ سالانہ معلوم نہیں۔

گزشتہ اشاعت میں ہم نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج میں ایسے طلبا ہیں جن میں علمی اور ادبی ذوق کی صلاحیت موجود ہے، اور جو اچھے طریقہ سے میگزین نکال سکتے ہیں ہمیں خوشی ہے کہ انٹرمیڈیٹ کالج میگزین کا پہلا نمبر دیکھ کر ہمارا یہ خیال یقین سے بدل گیا۔

اس نمبر میں مضامین کا معیار کافی بلند ہے اور بعض بعض مضامین مفید کار آمد اور سبق آموز ہیں "ترا سی سوال" بہت دلچسپ مضمون ہے نظمیں اچھی، پاکیزہ اور بلند پایہ ہیں۔ ہم اپنے مکرم دوست اور گزشتہ معاون جناب حبیب اللہ خاں صاحب غلزئی کی خدمت میں افتتاحی نمبر کی اس شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مبصّر لکھنو

مدیر جناب ابو العلاء الناطق، معاون جناب حکیم آشفتہ چندہ سالانہ للعہ، ششماہی عہ

ادبی رسائل کی صف میں جنوری سے اس نئے رسالہ کا بھی اضافہ ہوا ہے اور اس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے رسالہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس کا پتہ چل جاتا ہے کہ مبصّر کا معیار معمولی رسائل سے بہت کافی بلند ہے۔ اس نمبر میں مشاہیر ادبا اور شعرا کے رشحات قلم نظر آتے ہیں۔ مضامین مفید اور سبق آموز ہیں۔ غزلیں شستہ اور پاکیزہ ہیں۔ جناب مولانا عبد الباری صاحب آسی نے اپنے مضمون "مصرع طرح" میں اردو مشاعروں کے ایک خاص پہلو پر جو اعتراض

کیا ہے ہم اس سے لفظ بلفظ متفق ہیں۔ اسی قسم کا ایک مضمون میگزین کی اس اشاعت میں شائع ہو رہا ہے حقیقتاً اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ اردو شاعری کی ان لایعنی اور لغو قیود کو ایک دم اٹھا دیا جائے جنھوں نے ملک کی ذہنیت اور قوت شاعری کو دبا کر بے کار کر رکھا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ادبی دنیا اس جدید رسالہ کا خیر مقدم کرے گی

مونس، گجرانوالہ

زیر ادارت جناب حفیظ اللہ صاحب دانش و حسن عابد صاحب زبیدی قیمت سالانہ ؎ ۔ شش ماہی عـ ۔

اس نام سے حال ہی میں سرزمین پنجاب سے ایک اور رسالہ کا اجرا ہوا ہے جس کے فی الحال دو نمبر ہمارے سامنے ہیں۔ رسالہ کا مقصدِ اصلی فسانوں اور ڈراموں کے ذریعہ سے "ملک و قوم کی ذہنی، اخلاقی و معاشرتی ترقی کے وسائل بہم پہنچانا ہے"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فسانوں سے افرادِ ملت کے دماغوں اور ذہنیتوں پر زیادہ اثر پڑتا ہے دراں حالے کہ خشک و وعظانہ مضامین اس کا عشر عشیر بھی نہیں ڈال سکتے لیکن سوال یہ ہے کہ فسانے بھی تو کسی مقصد کو مدنظر رکھ کر لکھے جانے چاہئیں۔ ان کا کچھ معیار ہونا چاہئے، ملک و قوم کے سامنے ان کے ذریعہ سے کچھ مواد پیش کرنا چاہتے ہیں رسالہ کے مقاصد اجرا سے حقیقی ہمدردی ہے، اور ہم اسے بلند اور اعلیٰ پایہ پر دیکھنے کے دل سے متمنی ہیں۔ لیکن افتتاحی دو نمبر جس حیثیت اور معیار کو لئے ہوئے منظر عام پر آئے ہیں، اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ افراد کی ذہنیت کو ان غزلوں اور فسانوں سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان پہنچ جائے گا۔ زیر نظر دونوں نمبروں میں کئی فسانے اور ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فسانہ یا ڈراما اس معیار کا حامل نہیں، جو ایک اعلیٰ پایہ کے رسالہ کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اور ایسے رسالوں کو جن کا مقصدِ اجرا اس قدر بلند ہو، لازمی طور پر "اعلیٰ پایہ" کا ہونا چاہئے۔ حصۂ نظم میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ عام طور پر ایسی غزلیں شائع کر دی جاتی ہیں جو معمولی اور گھِسے پِٹے خیالات اور اس سے زیادہ معمولی اور گھِسے پِٹے طرزِ ادا اور بندش کا نمونہ ہوتی ہیں۔

بہرحال ہمارے نزدیک "مونس" کی سب سے اچھی چیز صرف اس کا ٹائٹل پیج ہے۔ اس کے علاوہ

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ البتہ ہماری دلی دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ مدیران کو
دنیائے صحافت کا تجربہ عطا فرمائے اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ کسی ادبی رسالہ کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھ سکیں
اسی کے ساتھ ہم اس رسالہ کے مقاصد اجرا سے ہمدردی کا ضرور اظہار کریں گے۔

شاعر، امروہہ

مرتبہ مولانا افق امروہوی، چندہ سالانہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

شاعر گزشتہ سال سے جاری ہوا ہے، اور زیر نظر نمبر دوسرے سال کا پہلا نمبر ہے رسالہ جیسا کہ
اس کے نام ہی سے ظاہر ہے، زیادہ تر شعر و شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ نثر کے بھی چند مضامین نظر
آتے ہیں۔ لیکن حصۂ نظم غالب ہے۔ مضامین نظم و نثر کا معیار خاصا بلند معلوم ہوتا ہے۔ نثر کے چند ا[illegible] مضامین
خوب ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق مطلب میں کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ نظموں کا زیادہ حصہ بلند پایہ ہے
چند غزلیات ایسی بھی ضرور ہیں، جو بہتر تو یہی تھا کہ شائع نہ کی جاتیں اور اگر ان کی اشاعت ضروری تھی تو مدیر صاحب
کو اصلاح کر دینی چاہئے تھی۔

اس کے باوجود ایک خرابی کسی حد تک قابلِ اعتنا ضرور ہے اور وہ رسالہ کی ظاہری شکل وصورت ہے
طباعت، کتابت اور کاغذ بہت معمولی ہے۔ فی زمانہ اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ رسالہ باطنی محاسن
کے ساتھ ظاہری خوبیوں سے بھی آراستہ ہونا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے گی۔

ہفتہ وار تاج آگرہ

اڈیٹر جناب مولانا سیماب صاحب اکبرآبادی۔ چندہ سالانہ للعہ ر

مولانا سیماب اکبرآبادی ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے، اور اب کسی تعارف کے محتاج نہیں
آپ نے شروع سال سے ایک ہفتہ وار اخبار "تاج" آگرہ سے نکالنا شروع کیا ہے۔ جس کے اب تک چند

نمبر ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ تاج کا ہر چوتھا نمبر ماہوار اڈیشن کے طور پر شائع ہوتا ہے، اور علمی ادبی مضامین کا گنجینہ ہوتا ہے۔ تاج کی ایک خصوصیت "میرا پیغام" کا مستقل عنوان ہے جس کے ذریعہ سے مختلف واقعات پر سیماب صاحب قطعات کی صورت میں اپنا پیغام پہونچاتے ہیں۔

تاج کے ہر نمبر میں ایک فسانہ بھی شایع ہوتا ہے، لیکن اب تک جس قدر فسانے ہماری نظر سے گزرے ان کا کوئی خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فسانوں کے ذریعہ سے عام اخلاقی اور معاشرتی امور کا پروپیگنڈا کیا جائے، لیکن تاج کے افسانے زیادہ تر صرف عبارت آرائی کے حامل ہوئے ہیں جن میں افراد ملک کے لئے نہ کوئی فائدہ متصور ہوتا ہے نہ دلچسپی۔

بہر حال تاج بہ حیثیت مجموعی ہفتہ وار اخبارات کے زمرہ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور امید ہے کہ سیماب صاحب اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

جون تا ستمبر ۱۹۲۹

مَا مَاتَ مَنْ اَحْیَا عِلْمًا

(خلیفہ ابن المعتز)

علی گڑھ میگزین

مُدیر

زکریّا فیّاضی ایم اے (علیگ)

جلد (۷) شمارہ (۴ تا ۷)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مدیر :- زکریا فیاضی ایم اے (علیگ)

طابع و ناشر :- محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر :- مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلسِ عاملہ علی گڑھ میگزین

سنسر چیرمین

خواجہ غلام السّیّدین صاحب بی اے (علیگ) ایم ای ڈی (لیڈز)

مُدیر

زکریا فیّاضی ایم اے (علیگ)

فہرستِ مضامین

تصاویر۔ جناب خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) بی اے (آکسن) ۔ (۲) گلِ منزل (کچی بارک)

نوٹ:- پیش نظر نمبر میں چند فاش غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں جن کی اصلاح ضروری ہے:

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۸	۱۷	جگر مراد آبادی	حضرت رواں (اناؤ) } بہ سلسلۂ رباعیات
۶۷	۱۹	جگر مراد آبادی	حضرت رواں (اناؤ) } بہ سلسلۂ رباعیات
۶۷	۱۶	میں تجھ سے جدا نہیں ہو سکتا	میں تجھ سے مگر جدا نہیں ہو سکتا
۹۰	۲	ملنے والا	چاہنے والا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

زکریا فیاضی، ایم اے (علیگ)

جلد ۷	اشاعت جون تا ستمبر ۱۹۲۹ء	نمبر ۴ تا ۷

شذرات

موسمِ گرما کی جان سوز خاک و باد کی طغیانیوں اور مسموم فضاؤں سے بالآخر چھٹکارا مل ہی گیا اور امتحان کی
کش سے لوگوں کو نجات ملی۔ یونیورسٹی نے اپنے تعلیمی سال کو ختم کر دیا اور گزشتہ کارروائیوں پر مہرِ سکوت ثبت کردی
ائج امتحان کا انتظار طالبانِ علم کو بے قرار کئے ہوئے تھا اور وہ اس کے خوش آیند نتائج کے لئے چشم براہ تھے کہ کسی
ں کام کو شروع کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہمارے ملک کے طریقۂ تعلیم نے امتحانات کو وہ اہمیت بخشی ہے کہ بغیر ان میں
یابی حاصل کئے لوگ دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کم از کم روٹی کمانا تو اس کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمارے معاشرتی اور
تصادی ماحول نے ہم کو ایسا بے دست و پا کر دیا ہے کہ ہم اپنی کم ہمتی و ناسمجھی سے ان امتحانات کو ذریعۂ سعادتِ دارین

تصور کرنے لگے ہیں۔ بہر حال جو نظریہ بھی قبول کیا جائے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ دو سال کی جاں گداز و متواتر محنت کے بعد منزل پر پہنچ جانے کی فطرتی خواہش انسان کے دل میں مضمر ہوتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے نتائج امسال بھی بہت اچھے رہے۔ گو امتحانِ قانون کے نتائج کے متعلق لوگوں کو شکایت بھی رہی بہر حال بہت سی خوش کن ہستیاں اپنے مقصد میں کامیاب نظر آئیں۔ ہم اُن کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اُن کی آئندہ ترقی کے لئے دست بدعا ہیں۔ ہمیں اُمید واثق ہے کہ مادرِ تعلیم کے یہ ہونہار اور برومند جوان اپنی مالی و مجلسی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے اس "کفِ گل فروش" کو فراموش نہ کریں گے بلکہ اس کی اور اپنے برادرانِ ملت کی ترقی کے لئے ہر وقت کوشاں رہیں گے۔

یونیورسٹی اپنی ہماہمی اور چہل پہل کے بعد کامل ۳ ماہ کے لئے بند کردی گئی اور یہ باغ پُر لطف ایک عرصہ تک بے نغمۂ بلبل و گلچیں رہا لیکن اس کی رونق و بہارِ موسمِ تعطیلات میں کچھ اور ہی لطف دکھاتی ہے اور حقیقت تو یوں ہے چشمِ بینا اور دلِ مستمند کے لئے اس میں بھی ہزاروں نغمہ ہائے پوشیدہ پنہاں ہوتے ہیں۔ ایامِ برشگال میں کمروں کی غیر آبادی صحنِ بورڈنگ میں لمبی لمبی گھاس کی موجودگی۔ مینڈک، مچھر اور مکھی کی کثرت کالج کے طلباء کے شور و غوغا سے کم وقعت نہیں رکھتی۔ یہ زمانہ عیش و فرصت کا تصور کیا جاتا ہے لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ دنیائے جامعہ کی مشغول زندگی کے بعد اس قسم کی بے کیف لطف سوہانِ روح بن کر رہ جاتا ہے اور طبیعتیں اسی زندگی کی متلاشی ہوتی ہیں۔

یونیورسٹی ۲۳ ستمبر کو کھلی۔ اُمید و بیم، حسرت و یاس، آمد و رفت کے دل خوش کن اور رجاں فرما نظارے بیک وقت نگاہوں کے سامنے تھے۔ اس زمانہ کی مشغولیت الاماں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر طالب علم نادر خاں افواج کا سپہ سالار ہے اور کسی خاص مہم پر جانے کی فکروں میں منہمک ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ داخلہ یونیورسٹی کی ہمت شکن منازل بہت جلد طے ہو گئیں اور طلباء کا ایک ہفتہ کے اندر قیام و رہائش کا معقول انتظام صبر و سکون کے ساتھ ہو گیا۔ ہم اُن طلباء کو جو اس باغ میں نو گرفتاروں کی حیثیت سے چہچہ زن ہوئے ہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہماری حقیر نصیحت اُن کو شاید ناگوار نہ ہو گی کہ وہ یونیورسٹی کے اُن حسیات و جذبات کی کما حقہ قدردانی کریں جن کے باعث یہ تعلیم گاہ موجبِ صد افتخار ہے اور ملک کی دیگر تعلیم گاہوں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

داخلہ کے اس حسنِ انتظام کی زیادہ تر ذمہ داری پرو وائس چانسلر اور ان کے انتظامات پر ہے اور د

ست یہ کے مستحق ہیں کہ بغیر کسی رد وکد کے تمام معاملات طے پا گئے۔

یونیورسٹی کے کھلنے پر جن نئی تبدیلیوں کا باب شروع ہوا ہے وہ یونیورسٹی کے احیار کے لئے نہایت ضروری
یاں کی جا رہی ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق نئے صاحبان یونیورسٹی کے اربابِ بست وکشاد مقرر کئے گئے ہیں
ن کے مفصل حالات کے لئے یونیورسٹی میگزین کا سلیمان و مسعود نمبر ملاحظہ ہو۔

ہم ان تمام حضرات کی موجودگی کو جو نہ صرف زیورِ علم سے آراستہ ہیں بلکہ تعلیمی معاملات میں نمایاں حیثیت اور
ربہ رکھتے ہیں یونیورسٹی کے لئے فالِ نیک متصور کرتے ہیں ہم انھیں اس اعزاز پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور
ہیں امید ہے کہ اس یونیورسٹی سے جو امیدیں جملہ مسلمانانِ ہند کو وابستہ ہیں اور جن کی تکمیل کی غرض سے ان کا انتخاب
ل میں آیا ہے وہ اس کو پورا کریں گے اور مسلمانوں کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے اُن کو میدانِ علم میں
گے بڑھنے کے سامان بہم پہنچائیں گے

ان حضرات میں سب سے پہلے شخص جنھوں نے یونیورسٹی میں آکر کام شروع کیا ہے مسٹر فخرالدین احمد ایم اے رجسٹرار
ہیں جو علی گڑھ کے پرانے طالب علم کی حیثیت سے بھی یونیورسٹی کی خدمت کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اُنھوں نے
تعطیلاتِ گرما میں دفتر کے نظام میں جو تغیر و تبدل کیا وہ ان کے دفتری کام سے واقفیت پر دلالت کرتا ہے اور ہمیں
اُمید ہے کہ اسی انہماک و دلچسپی کے ساتھ وہ یونیورسٹی کے فرائضِ مفوضہ کو انجام دیتے رہیں گے

ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ یونیورسٹی کے اصحابِ حل وعقد نے طلبار کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے
اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج کے حساب کتاب کے کام کو اُن کی متعلقہ عمارت میں منتقل کر دیا اور اس طرح ایک گونہ
مصائب کا سدباب ہو گیا ہے

داخلۂ یونیورسٹی

گزشتہ سالوں کے مقابلہ میں امسال داخلہ کم ہوا جس کی اغلب وجہ تعین تاریخ داخلہ ہے بہت سے
طلبار جو وقت پر حاضر نہ ہو سکے یا اُن شرائط کو پورا نہ کر سکے جن کے بغیر داخلہ ناممکن تھا
روک دیئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے بہت سے غریب طلبار کو علاوہ مالی نقصان کے روحی صدمہ ہوا
لیکن یونیورسٹی میں ایک قانون کی پابندی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس پر پورے طور سے عملدرآمد کیا جائے اور

اس لئے ہم ان تعمیری اصولوں کی حمایت کرتے ہیں طلباء کی مختلف تعداد نقشۂ ذیل سے ظاہر ہے جنھوں نے یونیورسٹی کی کسی نہ کسی جماعت میں داخلہ لیا ہے۔ ان میں وہ طلباء بھی شامل ہیں جو پہلے پہل علی گڑھ میں رونق افروز ہوئے ہیں

ایم اے، ایم ایس سی (اول درجہ)	۷۴	بی ٹی	۴۲
ایم اے، ایم ایس سی (آخر درجہ)	۱۶	سی ٹی	۱۶
قانون (اول درجہ)	۱۰۶	بی ٹی ایچ (بیچلر آف تھیالوجی)[1]	۳
" (آخر درجہ)	۸۵	ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر)	۱
بی اے بی ایس سی (اول درجہ)	۱۵۴	طبیہ کالج	۵
" " (آخر درجہ)	۵۹		

میزان ۵۶۲

ہم خود تعطیلِ گرما میں یونیورسٹی کے بند رہنے کے باعث کوئی اشاعت میگزین کی ممکن نہیں۔ میگزین طلباء یونیورسٹی میں ادبی ذوق پیدا کرنے، اُن کی نہاں قوتوں کو بیدار کرنے اور اُن کو منظرِ عام پر لانے اور ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کی ادارت کا کام تمام تر طلباء کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس کا مقصد دیگر رسائل کی طرح روپیہ کمانا یا تجارت کرنا نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ مدیر رسالہ اپنی سہولت اور طلباء کی امداد کے بغیر میگزین کی اشاعت سے مجبور رہتا ہے۔ اُس کا اہم فرض یہ بھی ہے کہ مستفسرین کے خطوط کے جواب وقت پر دے اُن کے طلبیدہ میگزین اُن کی خدمت میں ارسال کرے۔ حساب کتاب کا ذمہ دار رہے اور سب پر مستزاد یہ کہ مضامین کی بھیک مانگے، لوگوں کی منت سماجت کرے اُن سے مضمون لکھوائے، مضمونوں کو بغور دیکھے پھر مطبع والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے وہ اس کو حسبِ منشاء بنا بگاڑ کر چھاپ دیں اور غریب مدیر تمام الزامات، نقائص حسن و قبح کی لمبی لمبی سندیں مہربانی کی بوچھاڑیں اپنے نازک سر پر اوڑھ لے اور اپنی کوتاہی اور کم مائگی کا گلہ دل ہی دل میں کرے اور خاموش رہ جائے ہماری مشکلات کا اندازہ وہ حضرات اچھی طرح کر سکتے ہیں جو خود اس بارِ عظیم کو دنیا کے مختلف حصص میں برداشت کر رہے ہیں

[1] بی ٹی ایچ اور ڈی لٹ کے دو نئے درجے اس سال یونیورسٹی میں ایزاد کئے گئے ہیں۔ اول الذکر میں دینیات کی تعلیم دی جائیگی اور وہ طلباء داخلہ کے مستحق ہونگے جنھوں نے بی اے میں عربی کی تعلیم حاصل کی ہو اُن کو ۵۰ روپیہ وظیفہ بھی ملے گا

اس لئے ناظرین سے استدعا ہے کہ کوتاہیوں اور خامیوں پر نکتہ چینی کے ساتھ غریب مدیر کے صبر و استقلال
اور الزام اٹھانے کی صلاحیت کی داد دیجئے اور آنے والے حضرات کی ہمت افزائی کیجئے ۔

ہمیں انتہائی ندامت ہے کہ باوجود انتہائی کوشش کے ہم میگزین کو وقت پر شائع نہ کر سکے۔ اس کی زیادہ تر
ذمہ داری تو ہمارے طلباء ہی پر ہے مگر ہم بھی اس تاخیر کے الزام سے قطعی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ چند ایسے
قدرتی موانعات پیش آ گئے کہ ہمیں لامحالہ تاخیر کرنی پڑی۔ اول تو ایک ساتھ دو دو نمبروں کا التزام ہی زیادہ
تکلیف دہ تھا۔ اس پر اضافہ یہ کہ چند ضروری نظمیں وقت پر نہ مل سکیں۔ بلاک تیار کرنے والوں نے بھی حد سے زیادہ
پریشان کیا۔ لیکن شکر ہے اس خدائے کریم و کارساز کا کہ ہم دو نمبر نکالنے میں کامیاب ہو گئے

یہ تعطیلات نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اس میں جن حضرات کے مضامین شامل ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا ہمارا
عین فرض ہے۔ ہم جناب قاضی جلال الدین صاحب کے نہایت احسان مند ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست کو بالکل
مسترد نہیں کیا اور اپنے مشغولیت کی ساعتوں میں میگزین کے لئے کئی مضامین بہم پہنچائے۔ ان کی نظم "یادِ گل منزل"
جو ایک لاجواب نظم ہے، کچی بارک کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے لکھی گئی ہے۔

طبیہ کالج

یونیورسٹی کے ماتحت کالج میں رفتہ رفتہ ضروری اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ایک کثیر تعداد طلباء کی حکیم
صاحبان کے مشوروں سے استفادہ کر رہی ہے۔ طبیہ کالج کی نئی عمارت بھی جس کا سنگ بنیاد تعطیل
رما سے پہلے نصب کیا گیا تھا بن رہی ہے اور جلد استعمال کے قابل ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ طلباء کو دوائیں
فت نہیں دی جاتیں ان سے قیمت وصول کر لی جاتی ہے۔ طلبائے کالج ایک روپیہ ماہوار طبی مدد کے لئے یونیورسٹی کو
یتے ہیں کیا اس روپیہ کا بہترین مصرف یہ نہ ہوگا کہ بقدر مناسبت ایک حصہ طبیہ کالج کی نذر کر دیا جائے اور اس طرح
لباء کو مزید بار سے محفوظ کیا جائے۔

پکچر گیلری

پچھلے نمبر میں ہم پکچر گیلری یا نگار خانہ کا تعارف پبلک سے کرا چکے ہیں۔ یہ نگار خانہ اب عوام کے لئے
صبح سے شام تک کھلا رہتا ہے۔ مولوی محمد وحید اللہ صاحب احراری جو ایک ہوشیار اور باکمال
اع ہیں اس کے نگران و محافظ ہیں۔ وہ ایک شریف، معقول اور با اخلاق انسان ہیں اور ڈرائنگ، نقاشی
وری وغیرہ میں سند یافتہ۔ طلباء کو ڈرائنگ وغیرہ کے کام میں مدد بھی دیتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے

تصاویر اپنے ہاتھ سے بنا کر نگارخانہ میں رکھی ہیں

باوجود ان تمام خوبیوں کے ہنوز یہ نگارخانہ کسی مشاطۂ فن کی دستِ نازک کی قدردانی کا محتاج ہے کیا مسلمانوں کا اور علی گڑھ یونیورسٹی کے خیرخواہوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ اس مفید ادارے کی ترقی و توسیع کے لئے کوشاں ہوں اور اپنے تصاویر کے ذخیرے یہاں بھیجکر اس کی رونق کو دوبالا کریں۔ پروفیسر معین صاحب نے (جن کی زندگی کے مخصوص حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں) اس کی بنیاد ڈال دی اپنے تمام عمر کے سرمایہ کو اس کی نذر کر دیا اور مثال قائم کر دی ہے اب دوسروں کا فرض ہے کہ وہ اس نگارخانہ کو ہندوستان کا بہترین نگارخانہ او عجائب خانہ بنائیں۔ اس کے لئے روپیہ پیسہ اور سب سے زیادہ ہماری متفقہ سعی کی ضرورت ہے

پروفیسر معین الدین صاحب کی زندگی کے مختصر حالات

ممدوح کا وطن قصبہ کوتانہ ضلع میرٹھ ہے۔ عرصہ سے آپ ولسن کالج بمبئی میں بحیثیت فارسی پروفیسر ممتاز ہیں۔ گو آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں لیکن آپ کو دارالعلوم اسلامیہ علی گڑھ سے ہمیشہ ایک خاص محبت اور غیر معمولی تعلق رہا ہے یہی وجہ ہے کہ جوشِ عقیدت نے آپ کو اپنا کل سرمایہ اور تصاویر کا پورا ذخیرہ جس کی مالیت کا اندازہ ایک لاکھ سے یقیناً زیادہ ہے یونیورسٹی کی نذر کر دینے پر آمادہ کر دیا۔ محض عمارت ۲۶ ہزار میں تیار ہوئی ہے اور مبلغ ۳۰ ہزار روپیہ بطور محفوظ سرمایہ جمع ہے

آپ کے محاسنِ اعمال اور اخلاقی خوبیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ آپ بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہمدردی اور رحمدلی آپ کا خاص حصّہ ہے۔ آپ حد درجہ جفاکش ہیں۔ آپ بے حد سخی ہیں اور کفایت شعاری میں بھی آپ کو کمال ہے۔ آپ حق گو اور حق پسند ہیں۔

آپ کی پوشاک سادہ اور تمام ظاہری تکلّفات سے پاک ہے۔ آپ زیادہ تر اس قسم کے انگریزی لباس میں رہتے ہیں جو تمام جدید فیشن اور ساخت سے بے نیاز ہے۔ آپ کے بستر پر جو چادر رہتی ہے اس میں بے شمار پیوند لگے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ آپ بغیر تکیہ کے سوتے ہیں۔ کپڑا اپنے ہاتھ سے دھوتے ہیں۔ کھانا خود پکاتے ہیں۔ آپ کی مجموعی خوراک ایک ہفتہ میں ایک پونڈ سے زیادہ نہیں ہے۔ دن اور رات کے مختلف اوقات میں آپ اوول ٹن اور مالٹیڈ ملک استعمال کرتے ہیں۔ آپ نے پندرہ برس سے کوئی ملازم نہیں رکھا ہے اور اپنا کل کام خود انجام دیتے ہیں

باوجودیکہ پیرانہ سالی سے آپ کے تمام قوی مضمحل معلوم ہوتے ہیں لیکن ہردم مستعد اور ہر لحظہ کمر بستہ رہتے ہیں۔ آپ رات میں بمشکل تین گھنٹے سوتے ہیں۔ دن میں آپ کو کبھی آرام فرماتے نہیں دیکھا

مذکورۂ بالا خصوصیات کے علاوہ آپ ایک زبردست ہفت زبان عالم ہیں۔ آپ کو سنسکرت زبان پر پورا عبور ہے آپ نے کریما کا ترجمہ سنسکرت میں نظم کیا ہے اور ایک تصنیف میں آپ نے آریوں کے عقائد اور ان کے قدیم رسم و رواج کی حقیقت نہایت محققانہ طور سے ظاہر کی ہے

آپ کو پچھلے چند سال سے دستکاری کا شوق ہوا بہت قلیل عرصہ کی مشق کے بعد دنیائے مصوری میں آپ نے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ اب آپ ایک زبردست آرٹسٹ ہیں۔ من جملہ (۲۹۹) نایاب تصاویر کے محض آپ کے تیار کردہ مناظر کی تعداد (۹۴) ہے۔ آپ کی ہر دستکاری خود پکار کر اپنے آرٹسٹ کا پتا دیتی ہے پہاڑ، آبشار، دریا، کشتی، درخت، جھاڑیاں، میدان، ابر، افق، آسمان۔ الغرض عام خصوصیاتِ قدرت کا منظر ہیں پورے زورِ قلم کے ساتھ اظہار ہے

آپ کا مصمم ارادہ ہے کہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ایک بار پھر یورپ اور افریقہ کا سفر کریں۔ سفر سے واپسی پر علی گڑھ میں قیام فرمائیں گے اور اپنی بقیہ زندگی پکچر گیلری میں اپنے عزیز اور محبوب ترین مشغلہ کو جاری رکھتے ہوئے بسر کرینگے

آپ کو یونیورسٹی کے قابلِ فخر وائس چانسلر ڈاکٹر مسعود صاحب اور اُن کے رفیق جناب مسٹر ای لے بارن پرو وائس چانسلر سے پوری توقع ہے کہ ان کی سرپرستی میں پکچر گیلری کو روزافزوں فروغ ہوگا

شمشاد بلڈنگ

یونیورسٹی کی حدود کے اندر امسال ایک نئی عمارت کا اضافہ ہوا۔ یہ عمارت شمشاد بلڈنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا بازار قائم کیا گیا ہے جس میں ضرورت کی تمام اشیاء دستیاب ہوسکتی ہیں۔ مکھن، مٹھائی اور کھانا، پان، سگریٹ وغیرہ۔ شام کے وقت طلبا، یونیورسٹی کا ایک ہجوم یہاں ہوتا ہے اور علی گڑھ نمائش کا سماں بندھ جاتا ہے۔ ان عمارات کے بیچ میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کی گئی ہے جسے مالی و اقتصادی لحاظ سے اس بازار سے بہت سے فوائد ہونے کی امید ہے۔ لیکن ان فوائد میں بجائے اضافہ ہونے کے

کمی واقع ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ کیوں کہ سینما کا مستقل قیام سخت خطرناک ہے۔ ہفتہ میں چار دفعہ تماشا دکھایا جاتا ہے اور طلبارِ یونیورسٹی کی ایک کثیر تعداد تماشا دیکھنے جاتی ہے۔ مسلمانوں کی قوم افلاس زدہ اور فضول خرچ مشہور ہے اب سینما کی موجودگی سے اُن کی جیبوں پر مزید بار پڑ رہا ہے۔ عاملانِ یونیورسٹی کو اس کی روک تھام کرنی چاہیے تاکہ زیادہ تعداد طلبار کی اس اسراف سے محفوظ رہ سکے

خوش آمدید یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سُنی جائے گی کہ ہماری یونیورسٹی کے دو ہونہار فرد اپنی تعلیم انگلستان میں پوری کرکے اب ہندوستان واپس تشریف لے آئے ہیں۔ ہم اُن کو اُن کی کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ وہ قوم اور یونیورسٹی کے لئے زیادہ مفید ثابت ہوں۔ ان میں سے اوّل تو ہمارے محترم پروفیسر سید ہادی حسن صاحب ہیں جو اب سے دو سال پیشتر یونیورسٹی میں فارسی اور نباتات کے پروفیسر تھے اور اب کامل دو سال تک لندن میں رہ کر تحقیقات فارسی ادب میں کرکے ڈاکٹر آف لٹریچر کی سند لے کر فارسی ادب کے پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ آپ نے انگلستان میں فلکی شیرازی کی نظم پر تبصرہ کیا تھا۔ آپ کی دیگر تصانیف "فارسی جہازرانی" اور "تاریخ ادب ایران" ہیں۔

دوسرے ہمارے مکرم پیشرو جناب خواجہ منظور حسین صاحب بی اے آنرز ہیں جنھوں نے حال ہی میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے آنرز کی ڈگری انگریزی ادب میں حاصل کی ہے۔ آپ اب سے کئی سال پیشتر یعنی محترم رشید احمد صدیقی صاحب کے بعد یونیورسٹی میگزین کی ادارت کے فرائض نہایت دل سوزی، جاں فشانی، خلوص اور محنت سے انجام دے چکے ہیں۔ آپ کا پاکیزہ مذاقِ ادب اور خوش فکری، آپ کا وسیع تجربہ اور آپ کی دقتِ نظر ایک عرصہ تک میگزین کی خدمت کے لئے وقف رہ چکے ہیں

خواجہ منظور حسین صاحب نہ صرف علی گڑھ کے اول درجہ کے انگریزی ادیب ہیں جنھوں نے یہاں سے بی اے آنرز، اور ایم اے پاس کیا ہے بلکہ ولایت کی بہترین تعلیم گاہ سے بھی اعزازی سند حاصل کر چکے ہیں۔ دراصل خواجہ صاحب اُن لوگوں میں ہیں جو انگریزی کی تحصیل علم اپنی مادری زبان کے احیا، اصلاح و ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم اُن کی اس کامیابی پر اُن کی خدمت میں تہِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اُن کی واپسی پر اُن کا دلی

خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم میگزین کے اس نمبر میں میگزین کے اس بڑے محسن اور اپنے قابل پیشرو کی تصویر شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ خواجہ صاحب کا علی گڑھ سے عشق اور علی گڑھ میگزین اور اردو ادب سے شغف انہیں ہم سے بے تعلق نہ رہنے دے گا۔ ہم ان کے ارشادات کے لئے ہمہ تن چشم براہ ہیں

حادثۂ ارتحال

افسوس ہماری قوم کے مائۂ ناز فرزند اور علم و ادب کے درخشندہ گوہر مولوی عبدالودود صاحب ورد بریلوی اس دارِ فانی سے عالم بقا کو عرصہ کے طویل علالت کے بعد کوچ کر گئے۔ اناللہ۔ مولانائے مرحوم روہیلکھنڈ کے مشہور قصبہ سہسوان کے باشندے تھے اور عرصہ سے بریلی میں مقیم تھے۔ علوم فارسیہ عربیہ اور اردو کے ماہرِ فن ہونے کے علاوہ انگریزی ادب کے نکات سے بھی بہرہ ور تھے۔ سیاسی دماغی سے بریلی کی پبلک میں ایک نمایاں حصہ لیتے تھے۔ اُن کے مختلف النوع کارنمایاں پر تبصرہ کرنا قریباً ناممکن ہے۔ یہاں ہم اُن کو ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ادبیت اور شعریت کے میدان کے تو وہ مرد تھے آمد تو ان کی طبیعت میں بے انتہا تھی۔ ہزاروں مواقع پر بہترین قسم کے برجستہ شعر اُن کی زبان سے نکلے۔ نیز لکھنے کا یہ عالم تھا کہ قلم ہاتھ میں اُٹھایا اور صفحات کے صفحات رنگتے چلے گئے۔ اُن کی قادر الکلامی اور سخن سنجی مسلم الثبوت ہے۔ اُن کی لاتعداد نظمیں مختلف رسالوں اور اخباروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ افسوس ہے کہ ایسا قابل اور فہیم انسان بھی فلکِ ستمگار ہمارے ہاتھوں سے چھین لے اور کوئی نعم البدل نہ دے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہمیں اُن کے پس ماندگان سے انتہائی ہمدردی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اُن کے اعزا و احبا اُن کے کلام کو جلد کتابی صورت میں مدوّن کرکے ملک و قوم کی منفعت کے لئے شائع کریں گے

ذیل میں ایک نظم درج کی جاتی ہے جو اُنھوں نے فی البدیہہ کہی تھی۔ آپ منصوری پہاڑ پر ایک ہوٹل میں فروکش تھے پاس والے کمرہ میں ایک نہایت خوش آواز کاشمیری صاحب مقیم تھے۔ صبح کا سہانا وقت تھا اور یہ صاحب اپنے لحنِ داؤدی سے اپنے نادیدہ سامعین کو مسحور کر رہے تھے۔ اُن کی سریلی آواز کا اتنا اثر ہوا کہ مولانا نے فوراً نظم لکھکر اُن کی خدمت میں بھیجدی۔ وہ بہت حیرت میں ہوئے اور فوراً مولانائے مرحوم سے ملاقی ہوئے۔

سرودِ خانۂ ہمسایہ

کوئی ساحر یا مسیحا عاشقِ جاں باز ہی ۔۔۔ کیوں سرودِ خانۂ ہمسایہ میں اعجاز ہی
آہ کیا نغمہ ہی کیا درد آفریں آواز ہی ۔۔۔ یا دلِ ایذا طلب کی یہ صدائے راز ہی
ولولہ خیزی ہی دل کی یا کہ سحرِ سامری ۔۔۔ ارغنونِ عشق ہی یا کوئی زندہ ساز ہی
یا کہ دردِ ہجر کی ہیں یہ ترنم ریزیاں ۔۔۔ یا کہ میرے سوزِ پنہاں کا کوئی ہمراز ہی

وادیِ پُرخارِ اُلفت میں بھٹک کر راستہ
دے رہا کوئی مسافر خضر کو آواز ہی

دعوتِ صیادِ تیر افگن ہی یا نخچیر کو ۔۔۔ یا کہ زنداں میں ہلاتا ہی کوئی زنجیر کو
ہو مبارک یہ تفنن بلبلِ کشمیر کو ۔۔۔ عینِ راحت جس سے حاصل ہی دلِ دلگیر کو

معجزہ ہی لحنِ داؤدی کا یا فردوسِ گوش
یا نوائے بیخودی غارت گرِ ایمان و ہوش

بین باجا اس کو سمجھوں یا صدائے جلترنگ ۔۔۔ یا کہ چھیڑا مطربِ کشمیر نے گلشن میں چنگ
یا کوئی کافر ادا جو خود ہوا ہے مبتلا ۔۔۔ بھول کر اپنی جفا اوروں کا کرتا ہی گلا
یا سُریلی صوت نکلی ہی گلوئے حور سے ۔۔۔ یا انا الحق کی صدا ہی قطرۂ منصور سے

یا نوا سنجِ مقدر عندلیبِ زار ہے
یا کسی قاتل کو اپنے جرم کا اقرار ہے

ضروری تصحیح | ہمیں نہایت افسوس ہی کہ میگزین کے جنوری و فروری نمبر میں ہمارے کرم فرما مولانا محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری کی مصنفہ کتاب "انشائے جدید" کی قیمت بہ سلسلۂ تنقید و تبصرہ غلطی سے ۶ر درج ہوگئی ہی۔ حالانکہ اصل قیمت مبلغ ۳ روپیہ ہی۔ ناظرین اس کی تصحیح فرمالیں۔

خواجہ منظور حسین صاحب بی۔ اے آنرز (علیگ و آکسن) سابق مدیر میگزین۔

تم کون ہو کیا ہو؟

(از پروفیسر قاضی جلال الدین صاحب)

الا اے قوم تبلاؤں تجھے تو کون ہے کیا ہے
تو وہ مخلوق ہے اللہ کی جو نام لیوا ہے

جہاں بانی کا جوہر تیری فطرت میں چمکتا ہے
اولوالعزمی کا گوہر تیرے چہرہ پر دمکتا ہے

تو صدیوں سے رہی ہے مصلحِ اقوام عالم میں
نمایاں اب بھی ہیں پچھلے ترے ایام عالم میں

ترے سطوت کی ہیبت سے جہاں اب بھی نہیں خالی
تو اب بھی اک چہارم ارض کی کرتی ہے رکھوالی

ترے کلمہ کا سکّہ ڈھالتے ہیں اب بھی ٹکسالی
جہاں میں اب بھی ہے تو ہی مئے وحدت سے متوالی

اذاں کی گونج تیری اٹھتی ہے جو بحر کاہل سے
وہ ٹکراتی ہے اقیانوس و قلزم کے سواحل سے

یہی الحمد و قل پیکن میں چینی کی زباں پر ہے
یہی قرآن غالب ایشیا میں ہر مکاں پر ہے

اسی کا وِرد طنجہ میں ہر اک کام و دہاں پر ہے
یہی اعوذ و تسمیہ زبان ترکماں پر ہے

تمام افریقہ اب بھی نغمۂ توحید گاتا ہے
منار صوفیہ تکبیر یورپ کو سناتا ہے

ترقی اور تنزل کے ہوئے ہیں سینکڑوں چکر
مگر قوم مسلماں ایک دن بیٹھی نہیں تھک کر

اگر ہندی مسلماں بے بسی سے رہ گئے تھک کر
تو دی ایرانیوں نے دشمنانِ دین کو ٹکّر

گیا گر اندلس بدلے میں بلقاں ہاتھ آیا ہے
مٹے اموی تو ترکوں نے وہی نقشہ جمایا ہے

کیانی سلطنت ابتک ترے قبضہ میں باقی ہے
قیاصر کے وطن سے تجھکو ابتک خوش مذاقی ہے

ترا اک کلمہ گو بزم خدیویہ کا ساقی ہے
تری ہمقوم سے کابل میں ابتک طمطراقی ہے

ابھی باغِ جہاں میں پھول تیرے لہلہاتے ہیں
ابھی دنیا میں تیرے ہمنوا پرچم اڑاتے ہیں

کہاں ہیں ترک و تاجیک و عرب اقوامِ عالم میں
کہاں ہیں ازبک و کرد و مغل ابنائے آدم میں

سنوسی و دروزی چرکسی شامل ہیں سب ہم میں
نہیں نجدی و ریفی کم کسی سے اپنے دم خم میں

نہ محتاجِ تعارف سرحدِ افغانیہ والے
نہ جتلانے کی حاجت کون ہیں البانیہ والے

ریاسہائے ہندی نقش ہیں تیری حکومت کے
ابھی جاوا میں چشمے بہہ رہے ہیں خیر و برکت کے
قیادت تجھ میں باقی ہے سیادت تجھ میں باقی ہے

فلپائن میں صوبو اب بھی شاہد تیری وسعت کے
سبق ہندوستان میں لے رہے ہیں علم و حکمت کے
ابھی تک رنگِ خدا رنگ حکومت تجھ میں باقی ہے

سلاطین و ملوک و شاہ و شاہنشاہ ہیں تجھ میں
سپہر راج و نوابی کے مہر و ماہ ہیں تجھ میں
تری خاتون بھی باقی ہے گر مسند حکومت کی

خوانین و ملک اور جتنے ذی جاہ ہیں تجھ میں
خداوندانِ نعمت مثلِ آصف جاہ ہیں تجھ میں
تو مچتی دھوم ہے اس کی سیاسی قابلیت کی

تجارت اور فلاحت ایک مدت تک تجھ میں جاری ہے
کوئی پیشہ نہیں ہے جس میں تو اوروں سے ہاری ہے
ڈرانے سے کسی کے دل میں ڈر تیری بلا کو ہو

مشینوں کے عمل سے گرچہ تو تا حال عاری ہے
کروروں کی تری ہر ملک میں مردم شماری ہے
کمی سے مال اور زر کی خطر تیری بلا کو ہو

ڈریں وہ جن کے صندوقوں میں توڑے ہوں بھرے زر کے
ڈریں وہ جن کی دولت کھینچتی ہو سود ہر گھر سے
مسلمانوں کو خطرہ ہے تو ہے ایمان کا خطرہ

ڈریں وہ بیبیاں جن کی مکلل ہوں جواہر سے
ڈریں جن کے علاقوں سے گھروں پر اُن کے ہُن برسے
نہ ان کو مال کا ڈر ہے نہ اُن کو جان کا خطرہ

مجاہد تم میں لاکھوں ہیں ہزاروں عالم و فاضل
ہیں صدہا حاکمانِ مملکت اور ناظم و عامل
ترے جاہل کو عالم سے زیادہ پاس ہے دیں کا

شمار اُن کی نہیں ہے کیں جنھوں نے ڈگریاں حاصل
بہت ہیں عابد و زاہد۔ خدا رس عارف و کامل
ترے ہر پیادہ کو ہمت کہ گھر ہاتھ آئے فرزیں کا

علی گڑھ اس طرف عثمانیہ ہے اُس طرف جاری
یہی ہیں تعلیم کے مرکز نشانِ رحمتِ باری
تصور میں بھی۔ اسے تو بہ حذف کر دیکھے اُن کو

یہ دو ہیں مہر و ماہِ علم جن سے ہے ضیا باری
انھیں سے قصرِ ملت کے ستونوں پر ہے گلکاری
فضائے ہند پر اندھیر چھا جائے ابھی دن کو

تو اب بھی مردی و مردانگی کی آن رکھتی ہے
ہدایت کے لیے پیشِ نظر قرآن رکھتی ہے
تو عالی ظرف ہے با حوصلہ ہے با مروت ہے

تو ہے خیر الامم اور قوتِ ایمان رکھتی ہے
نکوکاری کا اپنے دل میں اک ارمان رکھتی ہے
فقط جوشِ ذرا کم ہو گئی ہے وہ حمیت ہے

غزل

از

(سید سجاد حیدر، یلدرم بی اے)

رفتم اے دل من ازیں بزم شتاباں رفتم — شکوہ سنجِ کرم و لطفِ کریماں رفتم

داشتم سینہ و دل پُر ز ہزاراں ارماں — کس نہ گوید کہ تہی کیسہ و داماں رفتم

دل گرفتہ نہ روم پیش کسے غنچہ مثال — نکہت افشاں چو دمِ بادِ بہاراں رفتم

ہمہ شوق و ہمہ ارمان و سراپا حسرت — من چہ گویم کہ چساں کوچۂ جاناں رفتم

در جبینم چہ نوشت ست مگو نجم شناس — بختِ من ہرچہ دہد خرّم و شاداں رفتم

اے اسیراں بہ شما ہم شود ایں روز نصیب — من پریدم ز قفس سوئے گلستاں رفتم

چوں نہ دیدم ز عزیزاں کرم و مہر و وفا

بہ درِ خانۂ اغیار غزل خواں رفتم

جہانگیر تُوزکِ جہانگیری میں

تمہید | سلاطین تیموریہ میں جہانگیر ایک نہایت عجیب الخلقت بادشاہ گزرا ہے جس کی گوناگوں خصوصیات اور متضاد اطوار و خصائل ہر طبقہ کے انسانوں کی دلچسپی کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حسن اتفاق سے اس کی دلچسپ زندگی کے سوانح خود اس کے قلم کے لکھے ہوئے یا لکھوائے ہوئے موجود ہیں اور اس زمانہ کے سب سے زیادہ دولت مند اور ذی شوکت بادشاہ کی صحیح طرز معاشرت اور اخلاق و عادات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ سوانح "جہانگیر نامہ" یا "واقعاتِ جہانگیری" یا "تُوزکِ جہانگیری" کے نام سے مشہورِ آفاق ہیں۔

خود نوشت سوانح عمری کا دستور مشرق میں بہت قدیم ہے۔ تیمور، بابر، مرزا حیدر، شاہ طہماسپ وغیرہم نے اپنے اپنے حالاتِ حیات خود قلمبند کئے ہیں۔ جہانگیر نے بھی ان کی تقلید میں اپنے واقعات خود لکھے۔ ایسا کرنے سے ان لوگوں نے علم تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ کیوں کہ تملق و خوشامد ایشیا کا خاصہ ہے اور یہ خاص درباری مورخوں کی تمام تالیفات میں کم و بیش نمایاں طور پر پایا جاتا ہے اور اکثر غیر سرکاری کتابیں بھی اس عیب سے پاک نہیں نظر آتیں جس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بعض بادشاہوں کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم کرنا نہایت دشوار ہوگیا ہے۔ مثلاً ابوالفضل کی تحریروں میں اکبر ایک ملکوتی صفات انسان اور مقدس صاحب کرامات ولی کی حیثیت رکھتا ہے اور اکثر مورخین مابعد نے ابوالفضل پر اعتبار کرکے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ اسی طرح شاہجہاں کی نسبت جو حسنِ ظن بہت سے طبقوں میں پھیلا ہوا ہے وہ اسی وضع و قماش کے مورخوں کی کتابوں پر مبنی ہے۔

لیکن جہانگیر کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کی سیرت معلوم کرنے کے لئے ہم کو اس کے درباریوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ تُوزکِ جہانگیری ہماری اس ضرورت کو بطریقِ احسن پورا کرتی ہے۔ جہانگیر نے

اپنے عہد دولت کے ابتدائی ساڑھے سترہ سال کے واقعات بلا کم و کاست خود رقم کئے۔ مگر ضعف و علالت کے سبب سے سلسلہ جاری نہیں رکھ سکا۔ اس کے بعد معتمد خاں مولف "اقبال نامۂ جہانگیری" کو یہ کام سپرد کیا۔ اس نے انیسویں سال کے آغاز تک اس کو پہونچایا۔ بعد ازاں اس کو چھوڑ دیا اور اقبال نامہ میں جہانگیر کی موت تک کے حالات اپنی طرف سے لکھے۔

طرز و آئینِ سلطنت

جہانگیر نے سلطنت کے لئے کوئی جدید اصول اختراع نہیں کئے بلکہ اکبر کے نقش قدم پر عمل کیا۔ اکبر کے تمام آئین حکومت اس کے عہد میں بدستور مروج رہے۔ جلوس کے بعد اس نے حسب ذیل بارہ احکام صادر کئے:

(۱) مختلف صوبوں اور ضلعوں کے جاگیردار جو محصول اپنے ذاتی نفع کے لئے وصول کرتے تھے ان کی ممانعت کی گئی۔

(۲) تنہا راستوں پر جہاں چوریاں ہوتی ہوں جاگیرداروں کو چاہیئے کہ مسافر خانے۔ کنویں اور مسجدیں تعمیر کریں تاکہ لوگوں کو وہاں آباد ہونے کا موقع حاصل ہو۔

(۳) سوداگروں کا اسباب ان کی اجازت کے بغیر راستہ میں کھول کر نہ دیکھا جائے۔

(۴) اگر کوئی ہندو یا مسلمان مرجائے تو اس کا مال بجنسہٖ اس کے وارثوں کے حوالہ کردیا جائے۔ اگر وارث نہ ہوں تو اس کی حفاظت کی جائے اور رفاہیتِ عامہ میں صرف کیا جائے۔

(۵) شراب اور جملہ مسکرات منہیہ نہ بنائی جائیں اور نہ فروخت کی جائیں۔

(۶) کسی کے مکان پر زبردستی قبضہ نہ کیا جائے۔

(۷) کسی کو ناک یا کان کاٹنے کی سزا نہ دی جائے۔

(۸) متصدی اور جاگیردار رعیت کی زمین چھین کر خود کاشت نہ کریں۔

(۹) کوئی عامل یا جاگیردار بے اجازت اپنے پرگنہ کے باشندوں کے ساتھ رشتہ داری نہ کرے۔

(۱۰) بڑے شہروں میں شفاخانے کھولے جائیں اور معالج مقرر کئے جائیں جن کی تنخواہیں سرکاری خزانہ سے

ادا کی جائیں۔

(۱۱) ہر سال میری سالگرہ سے لیکر میری عمر کے برابر دنوں تک اور جمعرات کو جو میرے جلوس کا روز ہے اور اتوار کو جو میرے والد بزرگوار کا یوم ولادت ہے جانور نہ ذبح کئے جائیں۔

(۱۲) میرے والد کے ملازموں کی جاگیریں اور منصب بحال رکھے جائیں اور تمام مجرم جو عرصۂ دراز سے قید خانوں میں مقید ہیں رہا کر دیئے جائیں۔

(توزک جہانگیری مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ ص۵)

ان میں سے اکثر ضوابط اصولاً پرانے تھے اور جہانگیر نے محض رعایا کی فوری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کے ازسرِ نو اجرا کا اعلان کیا تھا۔ جو نئے تھے ان پر بھی بجز چند کے پورا پورا عمل نہیں کیا گیا۔ تاہم ان سے اس کے احساسِ فرض منصبی کا پتا چلتا ہے۔

رفاہیت عامہ: جہانگیر صدق دل اور خلوص نیت سے رعایا کی ترقی و بہبودی کا آرزومند تھا اور اس نے تا حدِ امکان اس آرزو کے پورا کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے:-

"ہر کس کہ فیلے یا اسپے مرحمت شد رسم شدہ بود کہ نقیبان و میر آخوران ازان کس جلوانہ گویاں مبلغے می گرفتند فرمودم کہ آں زر را از سرکار بدہند تا مردم از طلب و خواستِ ایں گروہ خلاص باشند (ص۲۲)

"چوں زکوٰۃ ممالکِ محروسہ را کہ حاصل آں از کرورہا میگزشت معاف نمودہ بودم سایر جہاتِ کابل را نیز کہ از بلاد مقرر راہ ہندوستان ست و یک کرور و بست و سہ لک دام جمع آں می شد بخشیدم ازیں دو ولایت کہ یکے کابل و دیگرے قندھار باشد ہر سال مبلغہائے کلی بہ علت زکوٰۃ گرفتہ می شد بلکہ عمدہ حاصل آنجا ہمیں زکوٰۃ بود ایں رسم قدیم را ازیں دو محل برداشتم و ازیں ممر نفع کلی در رفاہیت تمام باہل ایران و توران عائد گشت (ص۲۳)

"در ایام پدرم دریں هفته شده روز مقرر بود که ہر روز یکے از امرائے کلاں مجلس آراسته پیش کش ہائے نادر از اقسام جواہر و مرصع آلات و اقمشۂ نفیسه و فیلان و اسپان سامان نموده آں حضرت را تکلیف آمدن به مجالس خود می نمودند و ایشاں بنا بر سرفرازی بندگانِ خود بداں مجلس قدم رنجه داشته حاضر می شدند و پیش کش ہا را ملاحظه فرموده آنچه خوش می آمد بر داشته تتمه را بصاحب مجلس می بخشیدند چوں خاطر مائل رفاہیت و آسودگی سپاہی و رعیت بود دریں سال پیش کشہا را معاف فرمودم مگر قلیلے از چندے نزدیکاں بنا بر رعایتِ خاطر آنہا درجۂ قبول یافت"

(ص ۲۳-۲۴)

"در تمام ممالکِ محروسه خواه در محال خالصه و خواه جاگیردار حکم فرمودم که بلغور خانہا ترتیب داده بجہت فقرا فراخور گنجائش آں محل طعام درویشانه طبخ می نموده باشند تا مجاور و مسافراں به فیض رسند"

(ص ۳۶)

"به دوازده کس از معتمدانِ درگاه فرمودم که یک ہزار روپیه در ہر روز پنجشنبه تا در شہر کابل باشم بفقرا و مساکین و ارباب احتیاج برسانند و حکم فرمودم که درمیان دو چنارے که بر کنار جوے وسطۂ باغ واقع ست که یکے را فرح بخش و دیگرے را سایه بخش نام کرده ام بر پارچه سنگ سفید که طول آں یک گز و عرض آں سه ربع گز بوده باشد نصب کردند و نام ما را با صاحبقرانی ترتیب یافته در آنجا نقش کردند و بطرفِ دیگر نگاشته شد که زکات و اخراجات با تمام بخشیدم ہرکس از اولاد و اعقاب ما بخلاف ایں عمل نماید به غضب و سخط الٰہی گرفتار آید تا زمان جلوس ایں اخراجات معمول و مستمر بود ہر سال مبلغہائے کلی بدیں علت از بندہائے خدا می گرفتند رفع ایں بدعت در زمان سلطنت من شد دریں آمدن به کابل تخفیف و رفاہیت تمام در احوال رعایا و مردم آنجا واقع شد و نیکاں و رئیسان غزنیں و نواحی آں به خلعتہا و نوازشہا سرفراز گشتند و مطالب و مقاصدے که داشتند باحسن وجوه فیصل پذیرفت ۔"

(ص ۵۲-۵۳)

"دریں ولا بجہت رفاہیت احوال رعایا و سپاہی مرسوم فوجداری را برطرف ساختہ فرمان شد کہ در کل ممالکِ محروسہ بعلت فوجداری فراحمت نہ رسانند"

(ص ۳۵۱)

بعض ظالمانہ اور وحشیانہ رسموں کا انسداد نہایت خوبی سے کیا گیا:

"در ہندوستان خصوصاً در ولایت سلہٹ کہ از توابع بنگالہ ہست از قدیم رسم شدہ بود کہ رعایا و مردم آنجا بعضے از فرزندانِ خود را خواجہ سرا نمودہ در عوض مال واجبی بہ حکام میدادند و ایں رسم رفتہ رفتہ بہ دیگر ولایت نیز سرایت کردہ ہر سال چندیں اطفال ضائع می شدند و ایں عمل رواج تمام یافتہ بود۔ دریں ولا حکم نمودم کہ من بعد ہیچکس بایں امر قبیح قیام و اقدام نہ نماید و خرید و فروخت خواجہ سرایانِ خرد سال بالکل برطرف باشد۔ باسلام خاں و سائر حکام صوبہ بنگالہ فرمانہا صادر گشت کہ ہر کس کہ مرتکب ایں امر شود تنبیہ و سیاست نمایند و خواجہ سرائے خردسال نزد ہر کس کہ باشد بگیرند تا غایت ہیچ یک از سلاطین سابق ایں توفیق نیافتند۔ انشاء اللہ تعالیٰ در اندک فرصتے چناں خواہد شد کہ ایں رسم مردود بالکلیہ برطرف شود و ہرگاہ خرید و فروخت خواجہ سرا منع شد ہیچ کس بایں فعل ناخوش بے فائدہ اقدام نہ خواہد نمود"

(ص ۷۳)

"در ابتدائے جلوس مکرر حکم کردہ بودم کہ من بعد ہیچ کس خواجہ سرا نہ کند و خرید و فروخت نہ شود و ہر کس کہ مرتکب ایں عمل گردد گنہگار باشد۔ دریں ولا افضل خاں چند از اں بدکاراں را بدرگاہ از صوبۂ بہار فرستاد کہ بدیں عمل شنیع قیام نمودہ اند۔ آں بے عاقبتاں را فرمودم کہ در حبس موبد نگاہ دارند" (ص ۸۲)

"چوں فصل ربیع رسیدہ بود بملاحظہ آنکہ مبادا از عبور لشکر نقصانے بمزروعات رعایا برسد و باوجود آنکہ تورلیساول را با جمعے از احدیاں بجہت ضبط زراعات تعین نمودہ بودم و

چندے را حکم کردم کہ منزل بہ منزل ملاحظہ پا یمانے نمودہ عوض نقصانے کہ بزراعتہا برسد رعایا را میدادہ باشند و دہ ہزار روپیہ بہ دختر خانخاناں کوچ دانیاں و ہزار روپیہ بہ عبدالرحیم خر مدد خرچ گویا و ہزار روپیہ بہ قاچاے دکھنی مرحمت نمودم (ص ۶۹)

(یہ عبدالرحیم وہی ہے جس کو خسرو کی حمایت کے جرم میں گدھے کی کھال میں سیا گیا تھا۔ اسی لئے اس کے نام کے ساتھ "خر" لگایا ہے)

"در ہمیں روز کہ غرۂ فروردین سنہ دوازدہ است عرضداشت شاہ خرم رسید مضمون آنکہ جشن نوروزی بدستور سالہاے گزشتہ ترتیب یافت اما چوں ایام سفر و یساق در میان ست پیش کش ہمہ سالہ بندہا معاف شود ایں معنی بغایت مستحسن افتاد ...... و حکم کردم کہ دریں نوروز ہیچکس پیش کش نہ گزراند"

(ص ۱۸۴)

"بواسطہ افساد تنباکو کہ در اکثر مزاجہا و طبیعتہا مضرت فرمودہ بودم کہ ہیچکس متوجہ بہ کشیدن آں نہ شود و برادرم شاہ عباس نیز بضرر آں مطلع گشتہ در ایران می فرمایند کہ ہیچکس مرتکب کشیدن آں نہ گردد"

(۱۸۴)

"حکم فرمودم کہ بنگ و بوزہ کہ منشاء کلی ست در بازارہا نہ فروشند و قمار خانہا را برطرف سازند دریں باب تاکید تمام نمودم"

(ص ۷۶)

امرا کو ہدایات "چوں مکرر بمسامع جلال رسید کہ امراے سرحد بعضے معقدمات کہ بایشاں مناسبتے ندارد از قوۃ بہ فعل می آورند و ملاحظہ تورہ و ضوابط آں نمی کنند بہ بخشیاں فرمودم کہ فرامین مطاع بامراے سرحدہا در گردانند کہ من بعد مرتکب ایں امور کہ خاصۂ بادشاہان ست نہ گردند۔ اول آں کہ در جھروکہ نہ نشینند و بامرا و سرداراں کمکی خود تکلیف چوکی و تسلیم نہ کنند و فیل بہ جنگ نیندازند

در سیاستها کور نکنند و گوش و بینی نہ برند و بزور تکلیف مسلمانی بر کسے نکنند و خطاب بہ ملازمانِ
خود نہ دہند و نوکران بادشاہی را کورنش و تسلیم نفرمایند و اہل نغمہ را بر وسے کہ در دربار معمول ست
تکلیف چوکی دادن نکنند و وقت برآمدن نقارہ نہ نوازند و اسپ و فیل کہ بہ مردم دہند خواہ
بہ ملازمان بادشاہی و خواہ بنوکرانِ خود جلو و کجک بر دوش آنہا دادہ تسلیم نہ فرمایند در سواری
ملازمان بادشاہی را در جلو خود پیادہ نبرند و اگر چیزے بآنہا بنویسند مہر برو نہ کنند۔ ایں ضوابطہ کہ
بہ آئینِ جہانگیری اشتہار یافتہ الحال معمول ست ''

(ص۱۰۱)

ان آئین و قوانین سے مقامی حکام کی سرکشی، چیرہ دستی اور جبر و ظلم میں ایک حد تک کمی واقع ہوگئی ہوگی

'' حکم کردم کہ در شہرہائے کلاں ممالک محروسہ مثل احمد آباد و الہ آباد و لاہور و آگرہ و دہلی وغیرہ
غلور خانہا بجہت فقرا ترتیب دہند تا سی محل نوشتہ شد ازاں جملہ شش محل سابق دائر بود و بست و چہار
محل دیگر الحال حکم شد کہ دائر سازند ''

(ص۱۰۰)

جاگیروں کا قاعدہ

'' چوں ارادۂ خاطر آں بود کہ اکثر بندہائے اکبری و جہانگیری بہ منتہائے مطلب خود کامیاب گردند
بہ بخشیاں حکم نمودم کہ ہر کس وطن خود را بجاگیر خود می خواستہ باشد بعرض رسانند تا مطابق تورہ
و قانون چنگیزی آں محال بموجب آل تمغا بجاگیر او مقرر گردد و از تغیر و تبدیل ایمن ماند ''

(ص۱۱)

تعزیرات

اس زمانہ کے دستور کے مطابق سزائیں نہایت سخت اور وحشیانہ تھیں مثلاً دُرّے مارنا، اعضا کاٹنا
درندوں سے پھڑوانا، پیٹ کے بل نوک دار کھمبوں پر لٹکانا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ علاوہ ازیں تعزیرات مقرر
نہیں تھیں اور حاکم اپنی اپنی طبیعتوں کے موافق نہایت ظالمانہ اور ہولناک جسمانی عذاب دے سکتے تھے۔
سنہ ۱۶۰۶ء میں خسرو پر غلبہ پانے کے بعد جہانگیر نے اس کے ہمراہیوں کو نوک دار کھونٹوں پر پیٹ کے
بل لٹکوایا جس سے وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اس کے دو خاص مصاحبوں حسین بیگ اور عبدالرحیم کو بالترتیب

یل اور گدھے کی کھالوں میں لپٹواکر اور گدھوں پر الٹا سوار کراکر تمام شہر میں تشہیر کرایا۔ چوں کہ بیل کی کھال
دھے کی بہ نسبت جلد خشک ہو گئی اس لئے حسین بیگ چار گھڑی بعد ہی گھٹ کر مرگیا۔ لیکن عبدالرحیم خوش قسمتی سے
ندہ نکل آیا۔ (ص۲۳)

کلیان نام ایک شخص کو جو نہایت سنگین جرائم کا مرتکب ہوا تھا زبان نکلوا کر قید کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کو
لمبانوں اور حلال خوروں کے ساتھ کھانا کھلایا جائے (ص۵۱)

عبداللطیف نام ایک مجرم کو جہانگیر نے اپنے سامنے ایک سو کوڑے لگوائے (ص۹۳)

شیخ بنارسی اور غیاث زین خانی کو دشمن کے مقابلہ میں بے پروائی کرنے پر سر اور داڑھی کے بال منڈوا کر
ور زنانہ لباس پہنا کر اور گدھوں پر سوار کر کے بازاروں میں پھرایا (ص۸۵)

ایک دفعہ باغبان نے شکایت کی کہ مقرب خاں کے نوکر نے شاہی باغ میں گل چنپا کے چند درخت
ٹ ڈالے۔ جہانگیر نے اس کی تفتیش کی اور ثبوت پاکر اس کی انگلیاں کٹوا دیں۔"

(ص۲۱۶)

بعض جدید مورخ جہانگیر پر ایسی سزاؤں کی بنا پر بے رحمی اور وحشت کا الزام لگاتے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ
ہ اکبر کو رقیق القلب اور رحمدل بتاتے ہیں حالانکہ اس کے وقت میں بھی اسی نوع کی سزائیں رائج تھیں۔
صحیح ہے کہ اکبر کھال کھچوانے کی سزا کو ناپسند کرتا تھا لیکن جہانگیر نے بھی اپنے عہد حکومت میں یہ سزا کبھی کسی کو نہیں
ی۔ اس کے علاوہ اس نے اندھا کرنے اور کان اور ناک کاٹنے کی سزائیں ترک کر دیں۔ شاہجہاں کے زمانہ میں
زائیں جہانگیر سے بھی سخت تر تھیں۔

عدل گستری

بادشاہ کا سب سے بڑا جوہر عدل ہے جس حاکم میں یہ صفت مفقود ہے وہ حکومت کے لئے باعث ننگ ہے۔
انگیر کی شہرت ہندوستان میں اس کے انصاف پر قائم ہے اور فی الحقیقت یہ شہرت بے اصل نہیں ہے۔ جہانگیر کو
دل وانصاف کی اہمیت کا احساس تھا اور وہ تا حد مقدور اس احساس کو عمل کا جامہ پہنانے کی سعی کرتا تھا۔ چنانچہ

تخت پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے زنجیرِ عدل کے باندھنے کا حکم صادر کیا تاکہ اگر عدالتوں میں حکام مظلوموں کی داد خواہی میں کوتاہی کریں تو وہ مظلوم اس کو حرکت دے کر بادشاہ تک اپنی فریاد پہونچا سکیں۔ یہ زنجیر خالص سونے کی اور تیس گز لانبی تھی اور اس میں ساٹھ گھنٹیاں تھیں۔ (ص۵)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ زنجیر کبھی بجائی نہیں گئی اور اس کا مقصد بھی ایک حد تک نام و نمود تھا۔ مگر اس سے بادشاہ کی انصاف دوستی پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ توزک جہانگیری میں اس کے بعد اس کا مطلق ذکر نہیں ہے۔

اگرچہ جہانگیر کو باعتبار عدل و انصاف شیر شاہ سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی تاہم وہ اس معاملہ میں کسی کی ناجائز رعایت روا نہیں رکھتا تھا اور بڑے چھوٹے کو بلا امتیاز سزا دیتا تھا۔

گجرات کے صوبہ دار مرتضیٰ خاں کے بھائیوں اور ملازموں نے احمد آباد کی رعیت پر بہت سختیاں کیں لیکن مرتضیٰ خاں نے ان کی حرکتوں پر چشم پوشی کی۔ جب جہانگیر کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے مرتضیٰ خاں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور اس کو معزول کر کے اعظم خاں کو اس کی جگہ مقرر کیا۔ (ص۴۲)

ایک عورت نے شکایت کی کہ مقرب خاں میری لڑکی کو اغوا کر کے کھنبایت لے گیا اور کچھ عرصہ بعد جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ اپنی اجل طبعی سے مرگئی۔ جہانگیر نے اس کی تحقیقات کرائی بہت جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ مقرب خاں کے ملازم نے یہ حرکت کی تھی۔ چنانچہ اس ملازم کو موت کی سزا دی گئی اور مقرب خاں کا منصب نصف کر دیا گیا۔ عورت کو حرجانہ ادا کیا گیا۔ (ص۸۴)

"چوں بعرض رسید کہ ہوشنگ برادر زادہ خان عالم خون ناحق کردہ در حضور طلب داشتہ باز پرس کردم و بعد از ثبوت حکم بہ قصاص او شد حاشا کہ دریں امور رعایت خاطر شہزادہ نہ کردہ تا بامراء و سائر بندہا چہ رسد۔

(ص۲۳۹)

یہ محض زبانی دعویٰ نہیں تھا بلکہ دلی تمنا کا اظہار تھا اور وہ تا حدِ امکان اس پر قائم رہا۔ چنانچہ اس کی عدل گستری کا اندازہ حسب ذیل حالات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے:

اپنے جلوس کے تیرہویں سال جہانگیر احمد آباد گیا جہاں کی آب و ہوا اس کو اس درجہ ناموافق آئی کہ بیمار ہو گیا احمد آباد کے باشندے جیساکہ وہ لکھتا ہے نہایت بزدل اور کمزور طبیعت واقع ہوئے تھے۔ اس لئے اس خیال سے کہ مبادا شاہی لشکر کے آدمی ان پر جبر و ظلم کریں اور ان کے مکانوں میں گھس کر ان کو لوٹ لیں اور اگر کوئی مقابلہ کرے تو اس کو قتل کر دیں اور مزید برآں یہ کہ قاضی اور میر عدل اپنے آدمیوں کا لحاظ کرکے ان کو جور و ستم سے نہ روکیں، بادشاہ خود ہر روز دوپہر کو باوجود انتہائی سخت گرمی کے جھروکہ میں اجلاس کرتا تھا اور دو تین گھڑی وہاں بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنتا اور ظالموں کو سزا دیتا تھا۔ اس وقت اس کی صحت جواب دے چکی تھی اور حد سے زیادہ ضعف پیدا ہو گیا تھا لیکن اس نے تن آسانی کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور وقت مقررہ پر جھروکہ میں بیٹھنا ترک نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ یہ اشعار درج کرتا ہے ؎

بہرِ نگہبانیٔ خلقِ خدا — شب نہ کنم دیدہ بخواب آشنا

از پئے آسودگیٔ جملہ تن — رنج پسندم بہ تنِ خویشتن

پھر یہ عبارت سپردِ قلم کرتا ہے:-

"بکرمِ الٰہی عادت چناں شدہ کہ درمیان شباں روزی بیش از دو سہ ساعت نجومی نقد وقت بتاراج خواب نمی رود۔ دریں ضمن دو فائدہ منظور ست یکے آگاہی از ملک دوم بیدار دلی بیادِ حق وحیف باشد کہ ایں عمر چند روزہ بہ غفلت بگزرد۔ چوں خواب گرانی در پیش ست ایں بیداری را کہ دیگر در خواب نخواہم دید غنیمت شمردہ یک چشم زدن از یادِ حق غافل نباید بود ع

باش بیدار کہ خوابے عجبے در پیش ست

(ص ۲۳۲)

حقیقتاً خاندانِ مغلیہ میں ایسا منصف بادشاہ کوئی نہیں ہوا۔

علم و فضل

بخلاف اپنے باپ کے جہانگیر ایک تعلیم یافتہ شخص تھا۔ چنانچہ ایامِ طفولیت میں اس نے شیخ عبدالنبی سے

چہل حدیث کا درس حاصل کیا۔ (ص۱)

فارسی نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ توزک جہانگیری اس کی تحریری لیاقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ فارسی اور ہندوستانی کے علاوہ ترکی زبان سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اور بے تکلف بول سکتا تھا۔ کابل میں اس کو "توزک بابری" کا نامکمل مسودہ ملا جس میں چار جزو کی کمی تھی۔ اس نے یہ چار جزو اپنے قلم سے لکھ کر کمی پوری کر دی اور آخر میں اپنی طرف سے ترکی میں کچھ عبارت بھی لکھ دی تاکہ ظاہر ہو کہ یہ چار جزو اس کے لکھے ہوئے ہیں۔

باوجود آنکہ در ہندوستان کلاں شدہ ام در گفتن و نوشتن بہ ترکی عاری نیستم"۔
(ص۵۳)

جہانگیر کی شاعری

جہانگیر جس طرح عدل و انصاف میں تمام شاہانِ مغلیہ سے افضل تھا اسی طرح سخن فہمی۔ نکتہ دانی اور شاعری کے لحاظ سے سب پر سبقت لے گیا تھا۔ وہ خود لکھتا ہے:

" چوں طبع من موزوں ست گاہے باختیار گاہے بے اختیار مصراعے درباعے یا بیتے درخاطرم سر می زند"۔
(ص۱۱۲)

ایک مرتبہ امیر الامرا کی یہ بیت پڑھی گئی: ؎

بگذر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق ⁂ یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابرست

جہانگیر نے برجستہ کہا: ؎

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس ⁂ یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابرست

اس پر ہر شاعر نے اسی زمین میں ایک ایک بیت کہی۔ جہانگیر نے ملا علی احمد مہرکن کی یہ بیت اپنی توزک میں نقل کی ہے: ؎

اے محتسب ز گریۂ پیرِ مغاں بترس ⁂ یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابرست (ص۱۱۲)

ایک روز دفعتہً ایک مضمون جہانگیر کے دل میں پیدا ہوا اور اس غزل کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہوا:۔

من چوں کنم کہ تیر غمت بر جگر رسد ‏ تا چشم نارسیدہ دگر بر دگر رسد

مستانہ می خرامی و مستِ تو عالمے ‏ اسپند می کنم کہ مبادا نظر رسد

در وصل دوست مستم و در ہجر بے قرار ‏ داد از چنیں غمے کہ مرا سر بسر رسد

مدہوش گشتہ ام کہ بپویم رہِ وصال ‏ فریاد ازاں زماں کہ مرا ایں خبر رسد

وقت نیاز و عجز جہانگیر ہر سحر ‏ اُمید آنکہ شعلۂ نور از اثر رسد

(ص۴۴)

ایک رات شکار سے بخیر و عافیت واپس آیا تو یک بیک یہ بیت سرزد ہوئی ؎

بود بر آسماں تا مہر را نور ‏ ؎ ‏ مبادا عکس او از چتر شہ دور

(ص۱۰۰)

ماوراالنہر سے خواجہ ہاشم نام ایک درویش نے اپنے سلسلہ کے ایک مرید کے ہاتھ ایک خط جہانگیر کو بھیجا جس میں اس نے بابر سے اپنے قدیم خاندانی تعلقات بیان کئے اور ایک نظم بھی نقل کی جو بابر نے خواجگی نام ایک بزرگ کی شان میں جو اسی سلسلہ میں شامل تھے لکھی تھی۔ اس کا آخری مصرعہ یہ تھا ؎

خواجگی را بندہ ایم و خواجگی را بندہ ایم

جہانگیر نے فی البدیہ اپنے قلم خاص سے ایک رباعی لکھکر ایک ہزار اشرفیوں کے ساتھ خواجۂ مذکور کے پاس بھیجی۔ وہ رباعی یہ تھی ؎

اے آنکہ مرا مہرِ تو بیش از بیش است ‏ از دولت یاد بود ت اے درویش است

چنداں کہ ز فرزدہ ات دلم شاد شود ‏ شادیم ازاں کہ لطفت از حد بیش است

اس کے بعد حکم دیا کہ جو چاہے اس پر طبع آزمائی کرے۔ حکیم مسیح الزماں نے فوراً یہ رباعی پڑھی ؎

داریم اگرچہ شغل شاہی در پیش ‏ ہر لحظہ کنیم یادِ درویشاں پیش

گر شاد شود ز ما دلِ یک درویش ‏ آں را شمریم حاصلِ شاہی خویش

(ص۱۵)

سپہ سالار اتالیق خان خانان نے اس مشہور مصرع کے تتبع میں ؎

بہر یک گل زحمتِ صد خار می باید کشید

ایک غزل کہی۔ مرزا رستم صفوی اور اس کے بیٹے مرزا مراد نے بھی طبع آزمائی کی۔ جہانگیر نے فی البدیہہ یہ
مطلع کہا ؎

ساغرِ مے بر رخِ گلزار می باید کشید ؛ ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

دربار کے ہر شاعر نے اس وزن پر ایک ایک غزل کہہ کر بادشاہ کو دکھائی۔ معلوم ہوا کہ مصرعِ مذکور مولانا
عبدالرحمٰن جامی کا ہے۔ اس پر جہانگیر نے ان کی پوری غزل ملاحظہ کی مگر اس مصرع کے سوا کوئی بات پسند نہیں کی

(۲۳۵)

ایک دن باغ میں سیر کرتے ہوئے ایک بیت بے اختیار زبان پر جاری ہو گئی۔ سنگتراشوں کو حکم دیا کہ
ایک لوح پر اس کو نقش کریں تا کہ یادگار رہے ؎

نشیمن گاہ شاہِ ہفت کشور
جہانگیر ابن شاہنشاہِ اکبر

(۲۴۳)

ایک بار رمضان میں شہر کے علما و مشائخ کو مسلسل تین روز افطار کے لئے اپنے دسترخوان پر دعوت دی
ہر شب کو مجلس کے اختتام پر خود کھڑا ہو کر بہت جوش کے ساتھ یہ اشعار پڑھتا تھا ؎

خداوندگارا تونگر توئی — توانا و درویش پرور توئی
نہ کشور کشایم نہ فرماں دہم — یکے از گدایانِ ایں درگہم
تو بر خیر و نیکی دہم دسترس — وگرنہ چہ خیر آید از من بکس
منم بندگاں را خداوندگار — خداوند را بندۂ حق گزار

(۲۴۳)

اپنے جلوس کے تیرھویں سال جہانگیر مانڈو (مالوہ) کی سیر کے لئے گیا۔ وہاں ایک تالاب میں پتھر کی عمارت
تھی۔ اس کے ایک ستون پر یہ رباعی پڑھ کر وجد میں آگیا ؎

یاران موافق ہمہ از دست شدند — در دستِ اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنگ شراب در مجلسِ عمر — یک لحظہ زما پیشتر ک مست شدند

جہانگیر اسی طرز کی ایک اور رباعی درج کرتا ہے ؎

افسوس کہ اہلِ خرد و ہوش شدند — از خاطرِ ہمدماں فراموش شدند
آنانکہ بصد زباں سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

(ص ۲۹۰)

جہانگیر نے عادل خاں کی کارگزاری کے اعتراف میں اس کے نام ایک فرمان صادر کیا اور اپنے قلم سے یہ بیت رقم کی ؎

شدی از التماسِ شاہ خرم ٭ بفرزندیِ ما مشہورِ عالم

(ص ۱۹۳)

اس کے بعد عادل خاں کو اس کی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں دکن کا حاکم بنا کر بھیجا اور اس موقع پر خاص اپنے ہاتھ سے یہ رباعی لکھی ؎

اے سوئے تو دایم نظرِ رحمتِ ما — آسودہ نشیں بہ سایۂ دولتِ ما
سوئے تو شبیہِ خویش کردیم رواں — تا معنئ ما بہ بینی از صورتِ ما

(ص ۴۴۶)

عنایت خاں کثرت شراب نوشی و افیوں خواری کے باعث اس قدر ضعیف و نحیف ہو گیا تھا کہ اس پر یہ مثل صادق آتی تھی ؎

کشیدہ پوستے بر استخوانے

بالآخر اسی مرض میں گھل گھل کر مر گیا۔ جہانگیر نے مرنے سے پہلے اس کو دیکھا اور اس کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا اور یہ شعر پڑھے ؎

سایۂ من گرم نہ گیرد پائے — تا قیامت ندارم بر جائے

نالہ از بسکہ ضعفِ دل بینہ • تا بلب چند جائے بنشیند

(۲۵)

ایک دن جمنا کے کنارے باغ گل افشاں کی سیر کے لئے گیا۔ بارش زور سے ہو رہی تھی۔ تمام پھل اور پھول تر و تازہ تھے جس طرف نظر جاتی تھی سبزہ اور آبِ رواں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بادشاہ نے اس دل کش نظارہ کی مناسبت سے انوری کے یہ اشعار پڑھے ؎

روزِ عیش و طرب بستان ست | روزِ بازارِ گل و ریحان ست
تودۂ خاک عبیر آمیز ست | دامنِ باد گلاب افشان ست
از ملاقات صبا روئے غدیر | راست چوں آزدہ سوہان ست

(۲۶)

جب دربار میں خان عالم کی آمد کی خبر مشہور ہوئی تو جہانگیر نے ہر روز اس کے استقبال کے لئے آدمی بھیجے اور اپنے رقعوں اور فرمانوں کو مناسب حال اشعار سے مزین کیا۔ ایک دن کچھ عطرِ جہانگیری ارسال کیا اور ساتھ ہی یہ بیت لکھی ؎

بسویت فرستادہ ام بوئے خویش • کہ آرم ترا زود تر سوئے خویش

(۲۸)

ارباب علم و ہنر کی تربیت

جہانگیر کے شاہانہ انعام و اکرام اور حوصلہ افزائی نے ہر قسم کے ارباب علوم و فنون کو اس کے دربار میں جمع کر دیا تھا۔ ان میں اگرچہ شاعر، عالم، مفسّر، محدث، فلسفی، مصوّر، نقاش اور ہر نوع کے باکمال اساتذہ شامل تھے مگر شاعروں کو ایک امتیاز خصوصی حاصل تھا۔

بزمِ سخن | اس کے دربار میں سربرآوردہ اور چیدہ شعراء یہ تھے :- آصف خاں - شریف خاں المخاطب بہ امیر الامرا - مکتوب خاں - مرزا غازی وقاری - نظیری نیشاپوری - ملا علی احمد - حکیم مسیح الزماں - خان عالم - سعیدا - طالب آملی - حسینی - معتمد خاں - بے بدل خاں وغیرہم -

آصف خاں کا یہ شعر مہروں پر کندہ کرایا گیا ؎

بخطِ نور بر زر کلک تقدیر

رقم زد شاہ نورالدین جہانگیر

سکۂ نورجہانی پر شریف خاں کا یہ بیت قرار پایا ؎

روئے زر را ساخت نورانی برنگ مہر و ماہ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ (ص۶)

آصف خاں اکبر کے زمانہ میں امارت کے درجہ کو پہنچا تھا۔ اس نے "خسرو شیریں" کو نظم کرکے جہانگیر کے نام سے معنون کیا اور اس کے نام کی نسبت سے اس نظم کا نام "نورنامہ" رکھا۔ جہانگیر نے اس کی تعریف و تحسین ان الفاظ میں کی ہے :۔

"فہم و استعدادش بغایت خوب بود غایتاً چست دستگی بر طبعش غالب بود۔"

(ص۱۰۹)

مکتوب خاں جہانگیر کا قدیم ملازم اور کتب خانہ اور نقاش خانہ کا داروغہ تھا۔ جہانگیر کے جلوس کی تاریخیں بہت سے شاعروں نے کہیں لیکن مکتوب خاں کی تاریخ سب سے زیادہ پسند کی گئی ؎

صاحبقرانِ ثانی شاہنشۂ جہاں گیر ... با عدل و داد بنشست بر تختِ کامرانی

اقبال و بخت و دولت فتح و شکوہ و نصرت ... پیشش کمر بخدمت بستہ بہ شادمانی

سالِ جلوس شاہی تاریخ شہ چو بنہاد ... اقبال سر بپائے صاحبقرانِ ثانی

(ص۲)

مرزا غازی المتخلص بہ وقاری ایک باکمال آدمی تھا۔ شعر خوب کہتا تھا۔ جہانگیر نے کل صوبۂ ٹھٹھ اور صوبۂ ملتان کا ایک حصہ اس کو بطور جاگیر عنایت کیا اور منصب پنجہزاری ذات و سوار پر سرفراز کیا۔ اس کی یہ بیت بادشاہ نے نقل کی ہے : ؎

گریہ ام گر سببِ خندۂ او شد چہ عجب ٭ ابر ہر چند کہ گرید رخِ گلشن خندد (ص۲۴۳)

نظیری نیشاپوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اکبر کے عہد میں وہ اپنے ہنگامہ خیز کلام کی بدولت لازوال شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اور اس وقت تجارت کے سلسلہ میں گجرات میں رہتا تھا۔ جہانگیر نے اس کو بہ احترام سے دربار میں بلایا۔ نظیری نے انوری کے اس قصیدہ ؎

بازایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را

کے تتبع میں ایک قصیدہ جہانگیر کی مدح میں لکھکر پیش کیا۔ جہانگیر نے ایک ہزار روپیہ مع اسپ و خلعت بطور صلہ اس کو مرحمت کیا۔ (ص ۹۲)

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جہانگیر نے شاہ عباس کی طرح تنباکو پینے کی ممانعت کر دی تھی۔ خان عالم تنباکو نوشی کا سخت عادی تھا۔ جہانگیر نے اس کو اپنا ایلچی بنا کر ایران بھیجا۔ ایرانی سفیر یادگار علی سلطان نے شاہ عباس کو اطلاع دی کہ خان عالم تنباکو کے بغیر ایک لحظہ نہیں رہ سکتا۔ شاہ عباس نے جواب میں یہ بیت لکھی ؎

رسولِ یار می خواہد کند اظہارِ تنباکو
من از شمع وفا روشن کنم بازارِ تنباکو

خان عالم نے بھی اس کے جواب میں یہ شعر لکھکر روانہ کیا ؎

منِ بیچارہ عاجز بودم از اظہارِ تنباکو
ز لطفِ شاہ عادل گرم شد بازارِ تنباکو (ص ۱۸۴)

ایک دفعہ دربار میں سلطان سنجر کے مداح اور ملک الشعرا معزی کے اس قصیدہ پر بحث ہوئی ؎

اے آسمان مسخرِ حکم روانِ تو
کیوانِ پیر بندۂ بختِ جوانِ تو

سعیدا اس بزم میں موجود تھا۔ اس نے فی الفور قصیدۂ محولۂ فوق کے طرز پر قصیدہ لکھکر بادشاہ کے سامنے پڑھکر سنایا۔ بادشاہ نے اپنی توزک میں اس کے چند اشعار درج کئے ہیں ؎

اے نہ فلک نمونۂ از آستانِ تو | دورانِ پیر گشتہ جوان در زمانِ تو
بخشندہ دلِ توفیض وجود سبب چو مہر | جانہا ہمہ فدائے دلِ مہربانِ تو

از باغِ قدرت ست فلک یک ترنج سبز ——— انداختہ بروے ہوا باغبانِ تو
یارب چہ گوہری تو کہ افروخت در ازل ——— جاں ہائے قدسیاں ہمہ از نورِ جانِ تو
بادا جہاں بکامِ تو اے بادشاہِ عہد ——— در سایۂ تو خرمِ شاہِ جہانِ تو
اے سایۂ خدا ز تو پرنور شد جہاں ——— بادا ہمیشہ نورِ خدا سائبانِ تو
(ص ۲۴۲)

عہد جہانگیری کا مایۂ ناز شاعر طالب آملی تھا جس کے سر پر جہانگیر نے اپنے چودھویں سالِ جلوس میں ملک الشعرائی کا تاج رکھا۔ بادشاہ نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"دریں تاریخ طالب آملی بہ خطاب ملک الشعرا خلعت امتیاز پوشیدہ۔ اصل او از آمل است یک چندے با عتماد الدولہ می بود چوں رتبۂ سخنش از ہمگناں درگزشت در سلک شعرائے پائے تخت منتظم گشت ایں چند بیت از وست ؎

ز غارتِ چمنت بر بہار منتہاست ——— کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی ——— دہاں بر چہرہ زخمے بود بہ شد

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق ست و سماع ——— ایں شرابے ست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش ست

گر من بجائے جوہرِ آئینہ بودمے ——— بے رونما ترا بتو کے می نمودمے

دو لب دارم یکے در مے پرستی ——— یکے در عذر خواہی ہائے مستی
(ص ۲۸۹)

حسینی بن سلطان قوام کی یہ رباعی قابل داد ہے؎

گردے کہ تما زطرفِ داماں ریزد — آب از رخِ سرمۂ سلیماں ریزد
گر خاکِ درت با متحاں بفشارند — از وے عرقِ جبینِ شاہاں ریزد

(۲۸۹)

معتمد خاں نے بھی ایک رباعی کہی جس کو جہانگیر نے اس قدر پسند کیا کہ اپنی بیاض میں اس کو جگہ دی؎

دیہرم بفراقِ خود جبینانی کہ چہ شد — خوں ریزی و آستیں فشانی کہ چہ شد
اے غافل ازاں کہ تیغِ ہجر تو چہ کرد — خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد

(۲۸۹)

۱۶۲۱ء میں جالندھر کے قریب ایک گاؤں میں صبح کے وقت ایسا سخت غوغا ہوا کہ تمام باشندے خوف زدہ ہو گئے۔ اس کے بعد اوپر سے بجلی گرتی ہوئی دکھائی دی۔ تھوڑی دیر میں جب سکون ہو گیا تو پرگنہ کا عامل محمد سعید اس مقام پر آیا لیکن کچھ نہیں پایا۔ البتہ دس بارہ گز مربع زمین شدتِ حرارت سے سیاہ ہو گئی تھی اس کو کھودا گیا تو اس میں سے ایک گرم لوہے کا ٹکڑا برآمد ہوا جو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کا وزن کیا گیا تو ایک سو نوے تولہ نکلا۔ جہانگیر نے اس میں سے دو تلواریں ایک خنجر اور ایک چاقو بنوائے۔ ایک تلوار کا نام "شمشیرِ قاطع" اور دوسری کا "برق سرشت" رکھا۔ بے بدل خاں نے ان حالات کو ایک رباعی کے پیرایہ میں بیان کیا؎

از شاہ جہانگیر جہاں یافت نظام — افتادہ بر عہدِ او ز برق آہنِ خام
زاں آہن شد بحکمِ عالمگیرش — یک خنجر و کارد با دو شمشیر تمام

(۳۳۵)

بے بدل خاں فی الواقع اسم با مسمیٰ تھا اور جہانگیر نے اس کی جو قدر و منزلت کی وہ اس کا مستحق تھا۔
اسی سال جہانگیر نے قلعۂ کانگڑہ فتح کیا اور اس میں ایک مسجد تعمیر کرائی۔ بے بدل خاں نے فتح کانگڑہ کی تاریخ کہی؎

شہنشاہِ زماں شاہِ جہانگیر ابنِ شاہ اکبر — کہ شد بر ہفت کشور بادشاہ از حکم تقدیری

جہانگیر و جہاں بخش و جہاں دار و جہاں دارا | کہ از بختِ جوانِ او جہاں ایمن شد از پیری
بہ شمشیرِ غزا ایں قلعہ را بکشود تاریخش | خرد گفتا کشود ایں قلعہ اقبالِ جہانگیری

مسجد کی بنیاد کی تاریخ یوں کہی ؎

نورِ دیں شاہ جہانگیر بن شاہ اکبر | بادشاہے ست کہ در دہر ندارد ثانی
قلعۂ کانگڑا بگرفت بہ تائیدِ الٰہ | ابرِ تیغش کہ کند قطرۂ او طوفانی
شد چو از حکمِ وے ایں مسجدِ پر نور بنا | کہ منور شود از سجدۂ او پیشانی
ہاتف از غیب بگفت از پئے تاریخ بناش | مسجدِ شاہ جہانگیر بود نورانی

(ص ۳۴۹)

جلوس کے دوسرے سال جب جہانگیر کابل گیا تو غزنین کے ایک شاعر نے اس کی آمد کی تاریخ ان الفاظ سے نکالی ع

بادشاہِ بلادِ ہفت اقلیم

(ص ۵۳)

جہانگیر نے اس کو خلعت و انعام دیا۔

اس کی یہ قدردانی اور ہمت افزائی محض فارسی شاعری تک محدود نہیں تھی۔ چنانچہ راجہ سورج سنگھ نے ایک شاعر کو دربار میں حاضر کیا جو ہندی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اس نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ تصنیف کیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر سورج کا کوئی بیٹا ہوتا تو ہمیشہ دن ہی رہتا اور رات کبھی نہ ہوتی۔ کیوں کہ اس کے غروب ہونے کے بعد اس کا بیٹا اس کی جگہ بیٹھتا اور دنیا کو روشن کرتا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے جہاں پناہ کے والد کو ایسا بیٹا دیا کہ ان کی وفات کے بعد لوگوں کو ماتم کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ آفتاب کو یہ رشک ہے کہ کاش میرا بھی کوئی بیٹا ہوتا جو میرا جانشین ہوتا اور رات کو دنیا میں نہ آنے دیتا۔ پس جہاں پناہ کے اقبال کی روشنی اور عدل کے نور سے دنیا ایسی منور ہے کہ گویا رات کا نام و نشان نہیں رہا۔

جہانگیر اس مدح سرائی سے ازحد خوش ہوا اور اس کے صلہ میں شاعر کو ایک ہاتھی مرحمت کیا۔ ایک درباری شاعر نے اس مضمون کو فارسی کا جامہ پہنایا ؎

گر پسر داشتے جہاں افروز • شب نگشتے ہمیشہ بودے روز
زانکہ چوں او نہفتہ افسر زر • بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر
شکر کز بعد آنچناں پدرے • جانشیں گشت ایں چنیں پسرے
کہ ز شنقار گشتنِ آں شاہ • کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

(صـ ۶۸)

ملا علی احمد اور حکیم مسیح الزماں کا ذکر جہانگیر کی شاعری کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اشاعت علم | شاعری کے علاوہ جہانگیر نے جملہ علوم و فنون مروجہ کی ترقی و اشاعت کی طرف توجہ کی اور اہل علم کو اپنے کرم سے فیضیاب کیا۔

شیخ سکندر (صاحب مرأت سکندری) گجرات کا باشندہ تھا اور قریباً ۱۶۱۰ء میں دربار میں ملازم ہوا جہانگیر نے اپنی توزک میں اس کی دانائی اور معلومات کا اعتراف کیا ہے۔ (صـ ۲۱۳)

سید محمد ایک عالم فاضل خوش اخلاق نیک اطوار بزرگ تھے۔ جہانگیر نے ان سے قرآن مجید کا سلیس بے تکلف و تصنع تحت اللفظ ترجمہ فارسی میں کرایا۔ (صـ ۲۴۵)

جب جہانگیر اپنے عہد کے بارہ سال کے حالات قلمبند کر چکا تو اس نے اس کو ایک جلد قرار دیا اور اس کی متعدد نقلیں کرا کر تقسیم کیں اور بعض غیر ممالک کو بھیجیں۔ ایک نقل اعتماد الدولہ کو اور ایک آصف خاں کو ملی۔

(صـ ۲۲۴ و ۲۴۶)

شیخ عبدالحق دہلویؒ ایک مقدس، دیندار اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ انھوں نے ہند کے مشائخ کے حالات میں ایک کتاب "اخبار الاخیار" تصنیف کی اور جہانگیر کو دکھائی۔ بادشاہ ان کی ملاقات سے بہت محظوظ ہوا اور ان کے ساتھ خلق سے پیش آیا۔ (صـ ۲۸۵)

سنگتراشی | ایک کاریگر نے جو بادشاہ کا غلام تھا اپنا کارنامہ پیش کیا جس کو دیکھ کر بادشاہ از حد مسرور ہوا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ میں نے اپنی تمام عمر میں ایسی عجیب شے کبھی نہیں دیکھی تھی اور اسی سبب سے اس نے اپنی توزک میں اس کو بہ تفصیل بیان کیا ہے:۔

پوست فندق میں ہاتھی دانت کے چار خانے بنے ہوئے تھے۔ پہلے خانہ میں دو آدمی کشتی لڑ رہے تھے تیسرا آدمی ہاتھ میں نیزہ لئے کھڑا تھا اور چوتھا آدمی پتھر لئے ہوئے۔ ایک اور شخص زمین پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک لکڑی کا ٹکڑا، ایک کمان اور ایک برتن یہ تین چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

دوسرے خانہ میں ایک شامیانہ کے نیچے تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک دولت مند آدمی تکیہ لگائے اور ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے گرداگرد پانچ خدمتگار تھے اور درخت کی شاخیں تخت پر سایہ کئے ہوئے تھیں۔

تیسرے خانہ میں متعدد آدمی رقص کر رہے تھے۔ ایک شخص ڈھول بجا رہا تھا۔ ان کے علاوہ پانچ آدمی اور کھڑے ہوئے تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں لاٹھی تھی

چوتھے خانہ میں ایک درخت کے نیچے حضرت عیسیٰ کا مجسمہ تھا۔ ایک شخص اپنا سر ان کے قدموں پر رکھے ہوئے تھا۔ ایک بوڑھا آدمی ان سے گفتگو کر رہا تھا اور چار آدمی نزدیک کھڑے ہوئے تھے

جہانگیر نے اس کے بنانے والے کو بہت انعام دیا اور اس کی آمدنی میں اضافہ کیا ص (۹۹)

۱۶۱۴ء میں سقوط میواڑ کے بعد جہانگیر نے اجمیر کے سنگتراشوں کو رانا امر سنگھ اور اس کے بیٹے کرن سنگھ کے قدآدم اور ہو بہو سنگ مرمر کے مجسمے بنانے کی فرمائش کی۔ اس حکم کی جلد از جلد تعمیل کی گئی اور وہ مجسمے آگرہ کو منتقل کر دیئے گئے اور شاہی باغ میں جھروکہ کے نیچے نصب کئے گئے۔ ص (۱۶۳)

افسوس ہے کہ سنگتراشی کے یہ گراں بہا نمونے اب ضائع ہو گئے

ایک دفعہ جلال آباد کے نزدیک اس کو ایک بڑا سفید پتھر ملا۔ جس سے اس نے ہاتھی کا مجسمہ ترشوالیا اور اس مصنوعی ہاتھی کے سینہ پر یہ مصرع جس سے اس واقعہ کی تاریخِ ہجری بھی نکلتی ہے نقش کرایا ؎

سنگِ سفید فیلِ جہانگیر بادشاہ

ص (۵۱)

موسیقی | بابر اور اکبر کی طرح جہانگیر کو بھی موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں شوقی نام ایک باکمال مغنی اور نغمہ پرداز تھا جس کے ہنر کی داد جہانگیر ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"شوقی طنبورہ نواز را کہ از نادرہائے روزگار ست و نغمات ہندی و پارسی را بر وے شے می نوازد کہ زنگ از دلہا می زداید بخطاب آنند خانی دل خوش و مسرور ساختم۔ آنند بزبان ہندی خوشی و راحت را می گویند۔

(ص ۱۶۳)

استاد محمد نائی (ماخوذ از "نے") جیسا کہ اس کے لقب سے ظاہر ہوتا ہے ایک صاحبِ کمال مطرب تھا جس کی نسبت جہانگیر لکھتا ہے کہ:

"در فن خود از بے نظیراں بود"

وہ بادشاہ کو ترانے اور غزلیں سنایا کرتا تھا۔ جہانگیر نے اس کی بے انتہا قدر اور عزت افزائی کی اور ۱۶۱۷ء میں اس کو روپیوں سے تلوایا اور چھ ہزار تین سو روپیہ جو اس کا وزن تھا مع ایک حوضہ دار ہاتھی کے اس کو عنایت کیا (ص ۱۸۷)

ملا اسد ایک شیریں بیان اور خوش آواز قصہ خواں تھا۔ جہانگیر نے اس کو محظوظ خاں کا خطاب دیا اور اپنی نوازشوں سے مالا مال کر دیا۔ چنانچہ استاد محمد نائی کی طرح اس کو بھی روپیوں کے ساتھ تولا گیا اور چار ہزار چار سو روپیہ جو اس کا وزن تھا اسی کو مرحمت کر دیا گیا۔ مزید برآں بادشاہ نے اس کو ایک ہزار روپیہ اور خلعت، ایک گھوڑا، ایک ہاتھی اور ایک پالکی بھی بخشی۔ اس کے بعد اس کو ایک معزز منصب یعنی دو صدی ذات اور بیس سوار پر مامور کیا گیا اور گپ کی مجلسوں میں ہر وقت حاضر رہنے کا حکم دیا گیا۔ (ص ۱۸۷)

ایک اور قصہ خواں نظام شیرازی تھا جس کو جہانگیر نے ایک دفعہ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔ (ص ۳۴)

مصوری اور نقاشی

یوں تو اکثر شاہانِ مغلیہ کے عہد میں مصوری اور نقاشی کو بہت ترقی ہوئی مگر جہانگیر کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ وہ خود اس فن کا پورا ماہر تھا۔ چنانچہ اس فن میں اپنے تبحر کا اظہار وہ خود کرتا ہے۔

"مرا ذوق تصویر و مہارت تمیز او بجائے رسید کہ از اوستادان گزشتہ و حال کارِ ہر کس بہ نظر در می آید بے آنکہ نامش مذکور شود بدیہہ در یابم کہ کار فلان ست بلکہ اگر مجلسے باشد مشتمل بر چند چہرہ و ہر چہرہ کار یکے از اوستاداں باشد می توانم یافت کہ ہر چہرہ کارِ کیست و اگر در یک صورت

چشم وابرو را دیگرے کشیدہ باشد دراں صورت می فہم کہ اصل چہرہ کار کیست وچشم وابرو راکہ ساخت۔"

(۲۳)

اس کے دربار میں دو مصور ابوالحسن اور استاد منصور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھے۔ اول الذکر کو "نادرالزمان" اور ثانی الذکر کو "نادرالعصر" کا خطاب ملا ہوا تھا۔ ان کی ہنرمندی اور دستگاہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جہانگیر جیسا صاحب کمال اور نکتہ چیں شخص ان کی توصیف وتحسین میں رطب اللسان ہے:۔

"دریں تاریخ ابوالحسن مصور بہ خطاب نادرالزمانی سرفراز گشت مجلس جلوس مرا در دیباچہ جہانگیر نامہ کشیدہ بہ نظر درآورد چوں سزاوار تحسین وآفریں بود مورد الطاف بیکراں گشت کارش بہ عیار کامل رسیدہ وتصویر او از کارنامہ ہائے روزگار است دریں عصر نظیر وعدیل خود ندارد واگر دریں روز اوستاد عبدالحی واوستاد بہزاد درصفحۂ روزگار می بودند انصاف کار او می دادند .... از صغرسن تا حال خاطر ہمیشہ متوجہ تربیت او بودہ تا کارش بدیں درجہ رسیدہ۔ الحق نادرۂ زمان خود بودہ وہمچنیں اوستاد منصور نقاش کہ بہ خطاب نادرالعصری ممتاز است در فن نقاشی یگانۂ عصر خود است در عہد دولت پدر من ومن ایں دو تن ثالث خود ندارند۔

(۲۳)

شاہ ایران نے جہانگیر کے پاس ایک خوب صورت شنقار بھیجا جو مر گیا۔ اس سے جہانگیر کو بہت رنج ہوا اور اس نے استاد منصور سے اس کی شبیہ کھچوا کر اپنے پاس یادگار کے طور پر محفوظ رکھی۔ (۲۸)

جہانگیر کشمیر کے پھولوں کا دلدادہ تھا۔ اس نے ایک سو سے زیادہ پھولوں کی تصویریں منصور سے بنوائیں۔

(۳۰)

ایک روز جہانگیر نے چند عجیب وغریب دریائی چڑیوں کو گرفتار کیا۔ ان میں سے ایک اسی وقت مر گئی اور باقی صرف ایک دن زندہ رہیں۔ استاد منصور کو ان کی تصویر بنانے کا حکم ہوا۔ (۳۱)

جہانگیر کو تصویروں کا بے حد شوق تھا اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس نے شاہی باغ میں ایک شاندار تصویر خانہ تعمیر کرایا اور اس کو رنگ برنگ کی خوشنما اور دلکش تصاویر سے آراستہ کرایا۔ سب سے اوپر

مایوں۔ اکبر۔ شاہ عباس اور خود اپنی تصویریں تھیں۔ اس کے بعد مرزا کامران، مرزا محمد حکیم، شاہ مراد اور
سلطان دانیال کی اور سب سے نیچے امیروں اور خاص ملازموں کی شبیہیں تھیں۔ بیرونی حصہ میں کشمیر جانے کا
راستہ دکھایا گیا تھا۔ ایک شاعر نے اس مصرع سے تاریخ نکالی ؎

مجلسِ شاہانِ سلیمان حشم

(ص ۳۱۳)

عمارات | شاہانِ مغلیہ نے رفاہیت عامہؒ کے لئے بہت کم عمارتیں بنوائیں۔ اس مد کا تمام روپیہ محلوں اور مسجدوں اور
قلعوں اور مقبروں پر صرف کیا جاتا تھا۔ جہانگیر نے بھی اپنے اسلاف کی روایات کے مطابق مقبرے بنائے اور اس فن
میں بھی اپنی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ وہ اکبر کے مقبرہ کو بے نظیر دیکھنا چاہتا تھا لیکن سوءِ اتفاق سے اس
زمانہ میں کہ مقبرہ زیرتعمیر تھا خسرو باغی ہوگیا اور جہانگیر اس کے تعاقب میں لاہور چلا گیا۔ اس کی غیبت میں معماروں نے
اپنے سلیقہ کے موافق کام کیا۔ جب جہانگیر نے واپس آکر اس کا معائنہ کیا تو اس کو اپنی توقع کے خلاف پایا اور
از سرنو اس کی بنیاد رکھوائی۔ اکبر کا عظیم الشان مقبرہ جو سکندرہ میں اب تک قائم ہے جہانگیر کے اعلیٰ ذوق کا رہین
منت ہے۔ (ص ۷۳)

اعتمادالدولہ کا مقبرہ بھی جو آگرہ میں تاج محل کے بعد سب سے خوب صورت عمارت ہے جہانگیر کے عہد کی ایک
عدیم المثال یادگار ہے۔

مزید برآں اس نے تین لاکھ روپیہ صرف کرکے مانڈو میں سابق سلاطین مالوہ کی بنائی ہوئی عمارتوں کی
مرمت کرائی۔ (ص ۱۸۰)

جہانگیر کا مذہب

جہانگیر کے مذہب کی نسبت مورخین نے مختلف آرا کا اظہار کیا ہے۔ بعض مورخ شاہجہان کے باطل تقدس اور
اورنگزیب عالمگیر کی فرضی ولایت سے مرعوب ہوکر اس کو بے دین اور بدعقیدہ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر وی اے اسمتھ نے
یورپی سیاحوں کی تحریروں کی بنا پر اس کو ڈھلمل یقین اور لامذہب قرار دیا ہے۔ لیکن یہ دونوں خیال غلط ہیں

...زک جہانگیری نہایت بلند آہنگی سے اپنے مصنف کے راسخ العقیدہ سنی مسلمان ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور
...ارے پاس اس کو باور نہ کرنے کے لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

ذیل کے اقتباسات اس کے پابند صوم و صلوۃ ہونے کے گواہ ہیں :-

"ہر روز بعد از فراغ عبادت دو پہر بجھروکہ بر آمدہ"

(ص ۲۳۴)

"حکم کردم کہ جمیع مشائخ و ارباب سعادت را کہ دریں شہر توطن دارند حاضر سازند کہ در ملازمت افطار نمایند"

(ص ۲۴۳)

وہ نہ صرف خود نماز کا پابند تھا بلکہ دوسروں کی نماز کا بھی خیال رکھتا تھا :

"پوستہائے آہو شکار خاصہ را فرمودم کہ جا نماز ہا ترتیب دادہ در ایوان خاص و عام نگاہدارند کہ مردم براں نماز می گزاردہ باشند"

(ص ۱۰۰)

خلاف شرع افعال کا انسداد سختی کے ساتھ کرتا تھا :

"... تادیب و تنبیہ آں را لازم دانستہ کوکب و شریف را بعد از شلاق مقید و محبوس ساختم و عبداللطیف را یک صد درّہ حد فرمودم کہ در حضور زدند ایں تنبیہ خاص بجہت حفظ شریعت بودہ تا دیگر جاہلاں امثال ایں امور ہوس نہ کنند"

(ص ۸۳)

حضرت شیخ احمد سرہندی کے متعلق رقمطراز ہے :-

"در مکتوبے نوشتہ کہ در اثنائے سلوک گزارم بمقام ذی النورین افتاد مقامے دیدم بغایت عالی و خوش بعضا از انجا درگزشتم بمقام فاروق پیوستم و از مقام فاروق بمقام صدیق عبور کردم و ہر کدام را تعریفے درخور آں نوشتہ و از انجا بمقام محبوبیت واصل مشدہ مقامے مشاہدہ افتاد

بغایت منور و ملوّن خود را بانواع انوار و الوان منعکس یافتم یعنی استغفر اللہ از مقام خلفا درگزشتہ بعالی مرتبت رجوع نمودم و دیگر گستاخیہا کردہ کہ نوشتن آں طولے دارد و از ادب دور ست۔ بنا بریں حکم فرمودم کہ بدرگاہ عدالت آئین حاضر سازند حسب الحکم بملازمت پیوست و از ہرچہ پرسیدم جواب معقول نتوانست ساماں نمود و باعدم خرد و دانش بغایت مغرور و خود پسند ظاہر شد صلاح حال او منحصر دریں دیدم کہ روزے چند در زندانِ ادب محبوس باشد تا شوریدگی مزاج و آشفتگی دماغش قدرے تسکین پزیرد و شورشِ عوام نیز فرونشیند۔ لاجرم بانے رائے سنگدلن حوالہ شد کہ در قلعۂ گوالیار مقید دارد۔"

(ص ۲۷۵)

مندرجہ بالا عبارت کو پڑھئے اور ڈاکٹر دی لے اسمتھ کے اس بیان کی داد دیجئے کہ "جہانگیر دل میں مسلمان نہیں تھا۔ اس کا کوئی خاص مذہب نہیں تھا۔ وہ عیسائیوں کی زبان سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین سن کر خوش ہوتا تھا"

جو شخص ایک مسلمان کی طرف سے خلفاء راشدینؓ کی معمولی اہانت نہیں برداشت کرسکتا وہ عیسائیوں کی زبان سے رسول اللہ صلعم کی توہین سننا کیوں کر گوارا کرسکتا ہے۔

جہانگیر امورِ شرعی کا احترام حد سے زیادہ کرتا تھا۔

"میرِ عدل و قاضی را کہ مدار امورِ شرعیہ برایشان ست بجہت خاص حرمت شرع فرمودم کہ زمین بوس کہ بصورت سجدہ است نہ کنند۔"

(ص ۱۰۰)

"پیش از بادشاہ شدن بیک سال بخود قرار دادہ بودم کہ در شب جمعہ مرتکب خوردن شراب نہ شوم از درگاہ الٰہی امیدوارم کہ تا حیات باقی باشد مرا بریں قرارداد استقامت بخشد۔"

نماز و روزہ کے علاوہ یادِ الٰہی سے غافل نہیں تھا۔

(ص ۱۰)

"بعلما و دانایانِ اسلامیہ فرمودم کہ مفردات اسمائے الٰہی را کہ دریادگرفتن آسان باشد جمع نمایند تا آں را وردِ خود سازم و در شبہائے جمعہ با علما و صلحا و درویشاں و گوشہ نشیناں صحبت میدارم" (ص ۱۰)

"ساختم فرمانے بمرتضیٰ خاں حاکم گجرات کہ چوں از صلاح و فضیلت و پرہیزگاری پسر میاں وجیہ الدین بمن رسیدہ است مبلغے از جانب ما باو گزرانیدہ از اسمائے الٰہی اسمے چند کہ مجرب بودہ باشد نویسانیدہ بفرستند اگر توفیق ایزدی رفیق شود بداں مداومت نمایم" (۶۲)

ذیل کا واقعہ اس کی کمال خوش عقیدگی اور توکل کو ظاہر کرتا ہے۔
ایک مرتبہ مالوہ میں سخت خشک سالی ہوئی اور خوف ناک قحط کے آثار نمودار ہوئے۔ اس سے لوگوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی۔ یہ حال دیکھکر بادشاہ نے خدا کی جناب میں دعا کی جو مقبول ہوئی اور اس قدر بارش ہوئی چوبیں گھنٹے کے اندر اندر تمام نالے تالاب اور دریا بھر گئے اور سب آدمی خوش و خرم نظر آنے لگے (۱۸۸)

تعصبی | اگرچہ جہانگیر ایک پکا مسلمان تھا مگر تعصب سے قطعاً پاک تھا۔ اس کے عہد میں ہر گروہ کو کامل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے امراء و حکام کو سخت حکم دیا تھا کہ کسی کو جبراً مسلمان نہ کیا جائے۔ (۱۰۱)
اس نے ہنود کے رسم و رواج اور تہواروں میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی۔ بلکہ ایک دفعہ ہولی کے موقع پر برہمنوں نے اس کے بازو پر پندھن باندھا تو اس نے خوشی سے قبول کیا (۱۲۱) تاہم وہ ہندو مذہب کی نسبت اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور اس کو "عقیدۂ ناقص" کہتا تھا۔ (۱۲۵)
یہ صحیح ہے کہ اس نے سیوڑوں یعنی جینیوں پر بہت سختی کی مگر اس کا سبب سیاسی تھا نہ کہ مذہبی جیسا کہ اس کی تحریر سے عیاں ہوتا ہے۔ مان سنگھ سیوڑہ اس کا مخالف اور خسرو کا حامی اور اس لئے باغی تھا۔ (۲۱۹)

عام خصائل و اخلاق

دانائی، فراست، عقل و حکمت، تدبر و سیاست کے اعتبار سے جہانگیر اپنے باپ سے کوئی نسبت نہیں رکھتا لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے اپنے باپ اور بیٹے دونوں سے بہتر تھا

درعفو | یہ جہانگیر کی بدقسمتی تھی کہ اس کو ابوالفضل جیسا خوشامدی مورخ نہیں ملا اور اس محرومی کی وجہ سے اس کے اکثر عمدہ خصائل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ عام خیال ہے کہ اکبر جیسا رحمدل تھا ویسا ہی معاف کرنے والا بھی تھا

مگر جہانگیر کی نسبت یہ بدگمانی پھیلی ہوئی ہے کہ وہ جور پیشہ اور کینہ ور تھا اور اپنے مخالف کو ہرگز معاف نہیں کرتا
میں بلا خوفِ تردید دعویٰ کرتا ہوں کہ وہ ان صفات میں اکبر سے افضل تھا۔

تخت نشین ہوتے ہی جہانگیر نے نہایت فیاضی اور فراخ دلی سے اپنے تمام مخالفوں یعنی خسرو کے حا
معاف کر دیا۔ مخالفوں کے سرغنہ مان سنگھ کو بنگال کی صوبہ داری پر بحال رکھا اور خلعت بھی بخشا۔ اس کا یہ ط
سب لوگوں کی توقع کے بالکل خلاف تھا اور وہ سخت سزا کی امید کر رہے تھے۔ (ص ۸)

آصف خاں مصنف "نور نامہ" اکبر کے وزیروں میں شامل تھا اور جہانگیر کا سخت مخالف تھا۔ جب جہانگ
خسرو کے مقابلہ میں کامیاب ہوا اور بادشاہ ہو گیا تو تمام اہلِ دربار اس خیال میں تھے کہ آصف خاں کی خیر
لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ جہانگیر نے اس کے ساتھ بہت مہربانی کا سلوک کیا او
پنجہزاری کے جلیل القدر منصب پر مقرر کیا اور اس کے مرنے پر اس کے بیٹوں کو بھی عہدہ عطا کیا۔ (ص ۹)

جب خسرو کو شکست ہوئی تو جہانگیر نے اس کے خاص مصاحب عبد الرحیم کو گدھے کی کھال میں بند کرا
تھا مگر محافظوں کی چالاکی سے وہ زندہ رہا اور صحیح سلامت نکل آیا۔ جہانگیر نے جس کے دل میں کوئی کینہ با
نہیں رہا تھا اس کو غیر مشروط معافی دی۔ (ص ۸۰)

شاہانِ مغلیہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے نہایت خائف رہتے تھے اور ان کو اکثر زندہ نہیں چھوڑ
تھے لیکن جہانگیر نے اپنے بھتیجوں یعنی مرزا دانیال کے بیٹوں طہمورث، بایسنغر اور ہوشنگ کے ساتھ ا
مرحمت اور شفقت کا برتاؤ کیا کہ کسی کو اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ (ص ۳۷)

شہزادگی کے ایام میں اس نے عہد کیا تھا کہ پچاس سال کی عمر کے بعد شکار ترک کر دوں گا اور کسی جاندا
اپنے ہاتھ سے آزار نہیں پہنچاؤں گا۔ زمانہ نے یہ عہد اس کے دل سے محو کر دیا لیکن اچانک اس کو اپنا پرانا وعد
یاد آ گیا۔ اس جگہ وہ یہ اشعار نقل کرتا ہے

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد — کہ رحمت بر آں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش ست — کہ جان دارد و جانِ شیریں خوش ست (ص ۲۴۵)

بھینس کی طرح ہاتھی کو بھی پانی بہت مرغوب ہے۔ کیسا ہی سرد موسم ہو ہاتھی نہانا نہیں چھوڑتا۔ جہانگیر نے اس خیال سے کہ جاڑے میں ٹھنڈے پانی سے ہاتھیوں کو تکلیف محسوس ہوتی ہوگی فیل خانہ کے مہتموں کو حکم دیا کہ آیندہ جاڑے کے موسم میں ہاتھیوں کو نہلانے کے لئے نیم گرم پانی تیار رکھا جائے۔ یہ جہانگیر کی جدت تھی۔
ص(۲۰۵)

توزک جہانگیری میں بہت سے واقعات درج ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جہانگیر رحمدلی اور معافی کے اوصاف سے معرا نہیں تھا۔

سخاوت| توزک جہانگیری میں جہانگیر کی داد و دہش کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں سے چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

تخت پر بیٹھتے ہی اس نے میران صدر جہاں کو یہ خدمت سپرد کی کہ روزانہ مستحق لوگوں کو دربار میں پیش کیا کرے۔ ص(۶)

بیس ہزار روپیہ مرزا محمد رضا سبزواری کو دہلی کے فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کرنے کے لئے دیا۔ ص(۱۰)
ماہ رجب میں ایک لاکھ روپیہ ہندوستان کے مختلف مقامات میں خیرات کیا۔ ص(۶۲)
۱۶۰۷ء میں چار ہزار سے زائد روپیہ سکندرہ کے فقیروں اور درویشوں کو بخشا۔ ص(۷۲)
احمد آباد میں جمعہ کے روز ایک ہزار روپیہ کی بکھیر کی ص(۲۱۶) اور جب تک وہاں مقیم رہا رات دن اسی فکر میں تھا کہ کوئی مستحق آدمی نظر آئے تو میں اس کو زر اور زمین سے مالا مال کردوں۔ اسی مقصد کے پیش نظر اس نے شیخ احمد صدر اور کئی مزاج داں اشخاص کو اس کام کے لئے متعین کیا کہ جو محتاج اور مستحق نظر آئے اس کو میرے سامنے لاؤ۔ شیخ محمد غوث کے فرزندوں اور متعدد مشائخ کو بھی حکم دیا کہ جس شخص کی نسبت افلاس کا گمان ہو اس کو میرے سامنے حاضر کرو۔ اسی طرح ضعیف عورتوں کی امداد کے لئے کئی عورتوں کو مقرر کیا۔ الغرض اس کی خواہش جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے یہ تھی کہ اس کے فیض سے

"ہیچ احدے محروم نماند"

ص(۲۲۰)

جب وہ دریائے مہی کے کنارے خیمہ زن تھا تو اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ قرب و جوار کے دیہات۔
بیوہ اور اپاہجوں کو جمع کرکے لاؤ تاکہ میں اپنے ہاتھ سے خیرات کروں۔ اس موقع پر وہ لکھتا ہے:

"کدام مشغولے بہ ازیں خواہد بود"

صـ (۲۳۱)

مشائخ سے عقیدت

اکبر کی طرح جہانگیر بھی ہر طبقہ کے مشائخ اور اولیا سے خلوص و عقیدت رکھتا تھا۔ تزک جہانگیری میں درویشوں کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ میں بخوف طوالت ان کے تفصیلی حالات یہاں لکھنے سے قاصر ہوں۔
جلوس کے تھوڑے عرصہ بعد اس نے پانچ ہزار روپیہ شیخ محمد حسین جامی کو بھیجا اور پچاس ہزار دام روپے درویشوں کو تقسیم کرنے کا وعدہ کیا۔ صـ (۲۲)

شاہ پیر صاحب نے اپنے وطن میرٹھ میں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی اور جہانگیر سے اس کی تعمیر میں امداد کی درخواست کی۔ بادشاہ نے ان کو چار ہزار روپیہ مع خلعت کے دیا۔ صـ (۱۱۸)

یہ مسجد تا حال برقرار ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کا حد سے زیادہ معتقد تھا۔ کئی مرتبہ ان کے روضہ کی زیارت کے لئے گیا اور درگاہ کے لئے ایک بڑا دیگ بنوایا۔ صـ (۱۲۶)

ایک دفعہ اس نے متعدد درویشوں کو اپنے ہاتھ سے اور اپنے سامنے پچپن ہزار روپیہ اور ایک لاکھ نوے ہزار بیگھے زمین جس میں چودہ سالم گاؤں اور چھبیس قلبہ زراعت شامل تھے اور گیارہ ہزار چاول کے خروار مرحمت کئے۔

صـ (۱۳۸)

۱۶۱۷ء میں جب وہ احمد آباد گیا تو شیخ وجیہ الدین کی خانقاہ کی بھی زیارت کی۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے فقیروں کو جو وہاں موجود تھے تقسیم کیا اور ڈیڑھ ہزار روپیہ شیخ مذکور کے عرس کے خرچ کے لئے دیا۔
اور پانسو روپیہ ان کے بھائی کو عنایت کیا۔ خانقاہ سے نکل کر ڈیڑھ ہزار روپیہ کی بکھیر کی۔ صـ (۲۱۳)
پھر شیخ احمد کھٹو کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھی اور پندرہ سو روپیہ اور نثار کیا۔ صـ (۲۱۴)
بعد ازاں شیخ اسماعیل بن شیخ غوث کو خلعت اور پانسو روپیہ دیا۔ گجرات کے بہت سے مشائخ ملاقات

کے لئے آئے۔ ان سب کو خلعتیں اور جاگیریں دیں اور شاہی کتب خانہ سے کئی قیمتی کتابیں مرحمت کیں مثلاً؛ تفسیر کشاف، تفسیر حسینی اور روضۃ الاحباب وغیرہ۔ ہر کتاب کی پشت پر اپنے گجرات میں وارد ہونے کا دن اور کتاب عطا کرنے کی تاریخ بھی لکھدی ص (۲۲)

حضرت شیخ سلیم چشتی سے قدرتی طور پر بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا اور اکثر ان کے مقبرہ پر فاتحہ پڑھتا تھا۔ ص (۲۶۳)

لاہور میں ایک بزرگ میاں میر رہتے تھے جہانگیر نے ان کو نہایت تعظیم و تکریم سے اپنے پاس بلایا اور بہت دیر تک ان سے گفتگو کی۔ انھوں نے روپیہ قبول نہیں کیا اس لئے بادشاہ نے انھیں ایک جائے نماز دیدی ص (۲۹)

جہانگیر اکثر قوالی بھی کراتا تھا ص (۸۲) ایک مرتبہ شیخ حسین سرہندی اور شیخ مصطفٰے کو بلا کر مجلس سماع منعقد کرائی۔ ان دونوں شیخوں کی صحبت کے اثر سے تمام مجمع وجد کرنے لگا۔ مجلس کے ختم ہونے پر بادشاہ نے دونوں کو معقول رقمیں دے کر رخصت کیا ص (۸۳)

وہ جس طرح مسلمان مشائخ سے خلوص و عقیدت رکھتا تھا اسی طرح ہندو جوگیوں اور سناسیوں کی بھی عزت و توقیر کرتا تھا۔ چنانچہ گسائیں جد روپ اور موتی سنیاسی کا تہ دل سے احترام کرتا تھا۔ اول الذکر کی مدح و ستائش میں اس نے جو زور قلم صرف کیا ہے اس سے اس کی حد سے زیادہ عقیدت ٹپکتی ہے (ص ۲۵۴ و ۲۸۲ و ۲۸۴ و ۳۴۸)

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جہانگیر سادہ لوح تھا اور ہر شخص تقدس و ولایت کا دعوی دار بن کر اس کو فریب دے سکتا تھا۔ وہ ریاکار اور خود غرض درویشوں کو سزا دینے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ چنانچہ اس کے الفاظ میں شیخ ابراہیم بابا افغانی نے لاہور کے ایک پرگنہ میں درویشی اور مریدی کی دُکان کھولی اور اوباشوں کی ایک جماعت اس کی معتقد ہوگئی۔ جب جہانگیر کو ان حالات کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ مذکور کو چنار میں قید کردیا اور یہ فتنہ فرو ہوگیا۔ ص (۳۷)

اس واقعہ سے جہانگیر کی مردم شناسی اور ہوشمندی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

توہم پرستی | اکبر کی توہم پرستی مشہور ہے۔ مگر اس کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ وہ جاہل تھا۔ جہانگیر باوجود تعلیم یافتہ او

روشن خیال ہونے کے سخت اوہام پرستی میں مبتلا تھا جیسا کہ اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے۔

اپنے سہ سالہ لڑکے جہاندار کی بابت اس کا خیال تھا کہ وہ مادرزاد مجذوب ہے (ص۷۵)

۱۶۰۹ء میں ایک مرتبہ چاند گہن ہوا تو جہانگیر نے "اس کی نحوست دفع کرنے کی غرض سے" اپنے آپ سونے چاندی، غلہ اور کپڑے سے تلوایا اور ان اشیا کے علاوہ ہر قسم کے جانور مثلاً ہاتھی گھوڑے جن کی مجموعی قیمت پندرہ ہزار روپیہ تھی خیرات کئے (ص۷۸)

کچھ دنوں بعد "قِران نحسین" (منحوس ستاروں کی یکجائی) واقع ہوا۔ بادشاہ نے اپنی سلطنت میں جا بجا سونا چاندی اور مویشی فقیروں اور محتاجوں کو تقسیم کرائے۔ (ص۸۲)

۱۶۱۵ء میں سورج گہن واقع ہوا جس سے "حضرت نیر اعظم کے پانچ حصوں میں سے چار حصے بالکل تاریک ہو گئے"۔ مختلف اقسام کی دھاتیں۔ مویشی اور ترکاریاں غریبوں۔ مسکینوں اور ناداروں کو دی گئیں (ص۱۳۹)

۲۹ جمادی الاول ۱۰۲۵ھ مطابق ۵ جون ۱۶۱۶ء کو بروز چہارشنبہ (بدھ) خرم کی خرد سال لڑکی چند دن کی علالت کے بعد فوت ہو گئی۔ جہانگیر کو بہت رنج ہوا اور اس دن کو منحوس خیال کر کے حکم دیا کہ چہارشنبہ کو آئندہ "کم شنبہ" کہا جائے۔ (ص۱۶۱) چنانچہ اس کے بعد جہانگیر اپنی کتاب میں چہارشنبہ کو ہمیشہ کم شنبہ لکھتا ہے۔

جہانگیر پنج شنبہ (جمعرات) کو تخت نشین ہوا تھا۔ اتفاق سے ۱۶۱۶ء میں شب برات (۱۴ شعبان المعظم) جمعرات کو ہوئی اور ہندوؤں کا تہوار راکھی بھی اسی دن تھا۔ اس بنا پر بادشاہ نے پنج شنبہ کو مبارک سمجھ کر حکم دیا کہ آئندہ اس کو "مبارک شنبہ" کہا جائے۔ بعد ازاں اس نے اپنی توزک میں "مبارک شنبہ" کا لفظ استعمال کیا ہے (ص۱۹۲)

۱۶۱۸ء میں خرم کے لڑکے اورنگ زیب کی ولادت ہوئی۔ خرم نے بادشاہ سے بچہ کا نام تجویز کرنے کی درخواست کی بادشاہ نے جواب دیا کہ اس کا نام کسی نیک ساعت میں رکھا جائے گا۔ (ص۲۵۳)

معتمد خاں کے پے در پے مصائب کا ذکر کرنے کے بعد جہانگیر سعادت و نحوست کا دارومدار چار چیزوں کو قرار دیتا ہے۔ (۱) بیوی (۲) غلام (۳) مکان (۴) گھوڑا۔ آگے چل کر ان کی تشریح کرتا ہے۔ (ص۱۲۶)

۱۶۱۴ء میں جب جہانگیر بیمار ہوا تو اس نے نیت کی کہ میں جس طرح باطن میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا

حلقہ بگوش اور معتقد ہوں اسی طرح اپنے کانوں میں سوراخ کرواکر ظاہر میں بھی ان کا حلقہ بگوش ہو جاؤں گا۔ چنانچہ صحت کے بعد اس نے اپنے کانوں میں سوراخ کرواکر موتی پہن لئے۔ اس کی تقلید میں اکثر امراء اور اہلِ دربار نے بھی اپنے اپنے کانوں میں سوراخ کروائے۔ ص (۱۳۲)

فال اور شگون کو بہت مانتا تھا۔ عثمان خاں نے جب بنگال میں عَلَمِ بغاوت بلند کیا تو جہانگیر نے اس کی سرکوبی کے لئے فوج بھیجی۔ عثمان خاں اس مہم میں مارا گیا۔ جب اس کے قتل کی خبر پایۂ تخت میں پہونچی تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ جہانگیر نے دیوان حافظ سے تفاول کیا اور اس غزل کو مناسب حال پاکر بہت خوش ہوا ؎

دیدہ دریا کنم و صبر بہ صحرا فگنم اندریں کار دلِ خویش بدریا فگنم
خوردہ ام تیر فلک بادہ بدہ تا سرِ مست عقدہ در بندِ کمر ترکش جوزا فگنم

کچھ عرصہ بعد اس افواہ کی تصدیق ہو گئی۔ ص (۱۰۵)

شہزادہ خرم کو ملک عنبر سے لڑنے کے لئے احمد نگر بھیجا۔ تو جہانگیر نے اس جد و جہد کا نتیجہ دریافت کرنے کے لئے ایک رات دیوانِ حافظ سے فال نکالی۔ یہ غزل برآمد ہوئی ؎

روزِ ہجراں و شبِ فرقتِ یار آخر شد زدم ایں فال گزشت اختر و کار آخر شد

اس سے جہانگیر کو اپنی کامیابی کی قوی امید ہو گئی پچیس روز بعد فتح کی خوشخبری آگئی۔ اس کا معمول تھا کہ اکثر مطالب میں دیوان حافظ سے رائے لیتا تھا۔ ص (۱۶۹)

مطلق العنانی | جہانگیر کی حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی سلطنت کے کاروبار میں کسی دوسرے کو مطلق دخل نہیں تھا۔ بادشاہ اپنی مرضی سے جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ جہانگیر خود لکھتا ہے کہ امورِ سلطنت و ملکداری میں میں اپنی رائے اور عقل کے مطابق عمل کرتا ہوں اور دوسروں کے مشورہ پر اپنے مشورہ کو ترجیح دیتا ہوں اور اسی وجہ سے کامیاب ہوا ہوں۔ ص (۳۳)

تمام قدیم بادشاہوں کی طرح جہانگیر بھی بادشاہ کو عام انسانوں سے بالاتر خیال کرتا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے "نگاہبان جمیع بندہا اللہ تعالیٰ ست خصوصاً بادشاہاں را کہ وجودِ ایشان باعثِ رفاہیت عالم ست" ص (۵)

وہ اپنی مخالفت کو بدترین گناہ اور اپنے مخالف کو سخت ترین عذاب کا سزاوار تصور کرتا تھا۔ شیر افگن کا ذکر اس طرح کرتا ہے :۔

"... مردم ہجوم آوردہ اورا پارہ پارہ ساختند و بہ جہنم فرستادند اُمید کہ ہمیشہ در جہنم جائے آں بدبخت رو سیاہ بودہ باشد "

(ص ۵٦)

عثمان خاں افغان بنگالی کی ہلاکت کو اس پیرایہ میں بیان کرتا ہے :

" دو پہر از شب گزشتہ عثمان بہ جہنم واصل می گردد "

(ص ۱۰۴)

سفاکی | مطلق العنان بادشاہوں پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوتی۔ اخلاقی اصول پر کاربند ہونا اور انصاف کرنا یا نہ کرنا قطعاً ان کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر وہ جادۂ عدل سے تجاوز کریں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ تمام با اختیار حاکموں سے کبھی نہ کبھی ظالمانہ افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ

جہانگیر بھی اپنی خاندانی خصوصیت کے موافق اپنی خلاف منشا حرکات پر سخت تندخو اور غضبناک ہو جاتا اور غصہ کی حالت میں نہایت وحشیانہ مظالم کا مرتکب ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ وہ شکار کر رہا تھا۔ اور ایک نیل گائے کو گولی مارنا چاہتا تھا کہ دفعتہً ایک جلو دار اور دو کہار ادھر آنکلے اور نیل گائے بدک کر بھاگ گئی۔ یہ دیکھ کر بادشاہ غصہ سے بیتاب ہو گیا اور حکم دیا کہ جلو دار کو ابھی قتل کر دیا جائے اور کہاروں کے کونچے کاٹ کر اور ان کو گدھوں پر سوار کر کے لشکر کے گرد اگرد پھرایا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔ (ص ۷۹)

محولۂ فوق واقعہ جہانگیر کی سیرت پر قیامت تک کے لئے ایک بدنما داغ ہے اور کوئی اخلاقی یا قانونی دلیل اس کی معذرت میں نہیں پیش کی جا سکتی۔

شہزادگی کے ایام میں اس نے ابوالفضل کو جس طریقہ سے قتل کرایا وہ بھی شرافت اور مردانگی سے بعید تھا

(ص ۱۱)

جہانگیر کو ہاتھیوں اور درندوں کی لڑائیاں دیکھنے سے خاص شغف تھا اور ان میں انسانی جانوں کا نقصان ضرور ہوتا ہوگا۔

مے خواری | اکبر کی مانند جہانگیر شراب اور افیون دونوں کا سخت عادی تھا اور یہ اس کی خاص غذائیں تھیں۔ انہی کی وجہ سے وہ قبل از وقت ضعیف ہوگیا اور اس کی عمر بہت مختصر ہوئی۔

پندرہ برس کی عمر تک اس نے شراب نہیں پی البتہ بچپن میں اس کی والدہ اور دائی نے کبھی کبھی ایک تولہ شراب پانی یا عرق گلاب میں ملا کر دوا کے طور پر پلائی۔ جب اس کا سن پندرہ کا ہوا تو اس کے چچا مرزا محمد حکیم کے بندوقچی اُستاد شاہ قلی نے سستی اور افسردگی رفع کرنے کے لئے شراب تجویز کی۔ سلیم نے ایک پیالہ پیا تو مزہ دار معلوم ہوا اور اس کا عادی ہوگیا۔ رفتہ رفتہ وہ دو آتشہ کے بیس پیالے چودہ دن میں اور چھ رات کے وقت جن کا وزن چھ ہندوستانی سیر ہوتا تھا روزانہ پینے لگا۔ جب اس کا اثر صحت پر برا ہوا تو اس نے بتدریج کمی کرنی شروع کی اور رات دن میں چھ پیالے پینے لگا۔ جمعرات اور جمعہ کی راتوں کو بالکل نہیں پیتا تھا۔ اخیر عمر میں شراب کے ساتھ افیون بھی کھانے لگا تھا۔ (ص۱۵۲)

بعد میں نورجہاں نے بھی اپنی کوشش سے شراب نوشی میں بہت تخفیف کرا دی تھی۔ (ص۳۴۰)

جمعرات اور اتوار کے روز اپنی تخت نشینی اور اکبر کی پیدائش کی حرمت کے سبب سے گوشت نہیں کھاتا تھا۔ (ص۱۵۲)

سیر و شکار | تمام بادشاہوں کی طرح سیر و شکار جہانگیر کا خاص مشغلہ تھا۔ سال کا زیادہ حصہ اسی میں صرف کرتا تھا۔ وہ اس فن میں اپنے آپ کو اکبر کا شاگرد رشید کہتا تھا اور اس کی طرح بندوق سے شکار کرنے کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنی بندوق سے اٹھارہ ہرن شکار کئے (ص۲۱)

۱۶۰۶ء میں اس نے مسلسل تین ماہ اور چھ روز شکار میں گزارے۔ اس اثنا میں کل پانسو اکیاسی جانور مارے گئے جن میں سے ایک سو اٹھاون بادشاہ نے اپنی بندوق سے ہلاک کئے۔ (ص۴۱)

اپنی تزک میں جہانگیر نے جا بجا شکار کردہ چرندوں اور درندوں اور پرندوں کی فہرست تشریح کے ساتھ درج کی ہے جن کو میں طوالت کے خوف سے قلم انداز کرتا ہوں۔

(ص۱۵۳)

سیاسی کمزوری — جہانگیر میں اپنے باپ کی سی اولوالعزمی، دلیری، استقلال، حوصلہ، جاہ طلبی، بلند ہمتی، جہانکشی اور دور اندیشی سرے سے مفقود تھیں۔ میدان جنگ میں اس نے کبھی حصہ نہیں لیا۔ نہ توسیع سلطنت جو اکبر کا سب سے اہم مقصد تھا کوئی نمایاں کوشش کی۔ توسیع تو درکنار اس کے عہد میں سلطنت پہلے سے کم ہوگئی۔ احمد نگر میں مغلوں کے رہے سہے اثر کا خاتمہ ہوگیا۔ دوسری جانب شاہِ ایران نے قندھار فتح کرلیا۔ اور جہانگیر اس پر دوبارہ قبضہ نہیں کرسکا۔ (۳۵۵)

اپنے اصولوں کی خلاف ورزی — جہانگیر میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس نے اپنے مقرر کردہ اصول اور نافذ کردہ احکام کی خلاف ورزی کی۔ دیگر شاہانِ مغلیہ کی طرح اس نے شریعت اسلامیہ کی حمایت کا مدعی ہوتے ہوئے اکثر رسم ورواج کو شرعی مسائل پر ترجیح دی اور شریعت کو اپنی خواہشات میں کبھی خلل انداز نہیں ہونے دیا۔

جلوس کے بعد اس نے جملہ مسکرات و منہیات کے استعمال و فروخت کی ممانعت کردی تھی۔ تاہم اس نے نہ صرف خود شراب پی بلکہ اپنے احباب اور اہل دربار کو اصرار کے ساتھ پلائی۔ نوروز کے پہلے جشن پر اس نے مجلسِ رقص و سرود گرم کی اور عام حکم صادر کیا کہ کسی کو شراب نوشی سے نہ روکا جائے۔ اس جگہ وہ یہ شعر نقل کرتا ہے ؎

ساقی بنورِ بادہ برفروز جامِ ما — مطرب بگو کہ کارِ جہاں شد بکامِ ما

(۲۳)

دوسرے سال اس نے اپنے درباریوں کو شراب کی دعوت دی (۵۲) اس کے بعد کابل میں اس نے دو چھوٹی حوضیں شراب سے بھروائیں اور حاضرین کو پینے کی فرمائش کی۔ (۵۳)

شہزادہ خرم شراب مطلق نہیں پیتا تھا لیکن ۱۶۱۵ء میں جہانگیر نے مجلس وزن میں اس کو بلا کر کہا کہ "بابا! تم کئی بچوں کے باپ ہوگئے ہو۔ بادشاہوں اور بادشاہوں کے بیٹوں نے شراب پی ہے۔ میں آج تم کو شراب پلاتا ہوں لیکن اعتدال کو ملحوظ رکھ کر صرف اس قدر پینی چاہیئے جس سے عقل نہ زائل ہو اور کچھ فائدہ حاصل ہوجائے۔ حکیم بوعلی نے کیا خوب کہا ہے ؎

مے دشمنِ مست و دوستِ ہشیار ست — اندک تریاق و بیش زہرِ مار ست

در بسیارش مضرت اندک نیست　　در اندک او منفعت بسیار ست

"بالآخر بہ مبالغہ بسیار شراب باو دادہ شد"

(ص ۱۵۱)

اپنے بارھویں سنہ جلوس میں اس نے ایک شاندار ضیافت کی جس میں شراب کا دور چلا اور شرکا مجلس نے طاقت سے زیادہ شراب پی ــ ہ

دل افروز بزمے شد آراستہ　　بخوبی بہ انساں کہ دل خواستہ
فگندند در پیش ایں سبز کاخ　　بساطے چو میدانِ ہمت فراخ
زبس نکہتِ بزم می رفت دور　　فلک نامۂ مشک بود از بخور
شدہ جلوہ گر نازنینانِ باغ　　رُخ افروختہ ہر یکے چوں چراغ

(ص ۱۹۱)

[illegible] قدرت سے محبت

جہانگیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ قدرتی نظاروں مثلاً چشمہ، کوہسار، سبزہ زار، آبشار وغیرہ کا بے حد دلدادہ تھا۔ اور ان سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کو پھولوں اور پھلوں کا [illegible]ت شوق تھا اور تقریباً نصف تزک جہانگیری ان کے حالات سے پُر ہے۔ جن کو یہاں مفصل لکھنا غیر ممکن ہے [illegible]ں کے نزدیک سرخ گل پلاس (ڈھاک) اس قدر خوب صورت تھا کہ:

"چشم ازیں نمی تواں برداشت"

(ص ۴۸)

اس کا یہ جملہ ایک مشہور و مقبول ضرب المثل بن گیا ہے

وہ ترکستان، ایران اور افغانستان سے بھی میوے منگاتا تھا۔ چونکہ اکبر کو میوے مرغوب تھے اس لئے [illegible]نگیر کو افسوس تھا کہ اس کے زمانہ میں یہ میوے ایران سے ہندوستان نہیں آسکے۔ (ص ۱۳۳) تمام میووں [illegible] جہانگیر کو آم سب سے زیادہ پسند تھا۔ (ص ۱۴ و ۲۵۶)

وہ موسم گرما قریباً ہر سال کشمیر میں گزارتا تھا۔ اس دل کش خطہ کے چرند، پرند، کوہسار، مرغزار، باغات

اور عمارات کے جو تفصیلی حالات اس نے اپنی توزک میں تحریر کئے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُ
سلسلہ میں ایک جگہ یہ نظم درج کی ہے ؎

شدہ جلوہ گر نازنینانِ باغ — رُخ آراستہ ہر یکے چوں چراغ
شدہ مشک بو غنچہ در زیر پوست — چو تعویذ مشکیں بہ بازوئے دوست
غزل خوانیٔ بلبلِ صبح خیز — تمنائے مے خوارگاں کردہ تیز
بہر چشمہ منقارِ بط آب گیر — چو مقراضِ زریں بہ قطعِ حریر
بساطِ گل و سبزہ گلشن شدہ — چراغِ گل از باد روشن شدہ
بنفشہ سرِ زلف را خم زدہ — گرہ در دلِ غنچہ محکم زدہ

(ص ۳۰۳)

منشی احمد

غزل

بھول کر جب وہ کبھی خواب میں آجاتے ہیں — میری بگڑی ہوئی تقدیر بنا جاتے ہیں
بعد مرنے کے وفا کا جو خیال آتا ہے — قبرِ عاشق کی مٹا کر وہ بنا جاتے ہیں
غم جو دیتے ہیں تو اُس میں یہ ادا ہوتی ہے — ساتھ ہی صبر بھی کرنا وہ سکھا جاتے ہیں

جان پڑ جاتی ہے نامی دلِ پژمردہ میں
ہے یہ کہنے کو ذرا سا کبھی آجاتے ہیں

حمید الحق نامی نگرامی

ارشادات

خون سے صفحۂ گردوں پہ رقم ہوتا ہے
عبرتِ کون و مکاں قصۂ غم ہوتا ہے

کاروانِ دلِ بیتاب کو لوٹا کس نے
دیر سے شور و فغاں تا بہ حرم ہوتا ہے

چرخ نے سیکھ لیے آپ سے اندازِ جفا
کہ مرا نام شہیدوں میں رقم ہوتا ہے

غیر کے ہنسنے کی آتی نہیں کانوں میں صدا
شاید اب ذکر مرا بزم میں کم ہوتا ہے

دلِ آوارہ کو اللہ سنبھالے رکھے
بیٹھ جاتا ہے جہاں ذکرِ صنم ہوتا ہے

عشق کی کوفت میں نیرنگِ جہاں دیکھ لیے
اس کا توڑا ہوا دل ساغرِ جم ہوتا ہے

چوم لوں پائے صنم نام وفا کا لے کر
دیر سے کوچ مرا سوئے حرم ہوتا ہے

یوں زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے
سنگِ راہِ طلب ایک ایک قدم ہوتا ہے

سیکڑوں وادیٔ ایمن ہیں ترے کوچے میں
لو نکلتی ہے جہاں نقشِ قدم ہوتا ہے

ناصری مطلعِ انوار نہ کیوں ہو دنیا
جلوہ گر ماہِ عرب مہرِ عجم ہوتا ہے

مہدی حسین ناصری

جذباتِ سالک

نہیں آتا اگر بیمارِ ہجراں کو شفا دینا
تو برقِ ناز کا ممکن تو ہے تم سے گرا دینا

فنا کیا ہے کثافت سے لطافت کو اڑا دینا
بقا کیا ہے انہیں دونوں کو آپس میں ملا دینا

حریفِ آسماں برقِ تبسم بختِ برگشتہ
مشیت کو ہی کچھ محبوب تھا میرا مٹا دینا

طلسمِ پُرخطر ہے خوابگاہِ منزلِ ہستی
گراں گذری تو گذری خوابِ غفلت سے جگا دینا

خیال آتا رہے مدت سے مے آشام پیاسے ہیں
تکلف کو نہ اذنِ صحبتِ مے ساقیا دینا

وفورِ سوزِ غم ہے باعثِ صد انبساطِ دل
سمجھ میں آ گیا ہے بحر کو صحرا بنا دینا

معاذ اللہ تسلیم و رضائے بندگانِ عشق
عبادت جانتے ہیں پیشِ خنجر سر جھکا دینا

پرستارانِ الفت کو تہِ تیغِ جفا کرنا
یہ دامانِ وفا پر صاف ہے دھبہ لگا دینا

شناسانِ مزاجِ علم ہیں وجہ نشاطِ دل
برنگِ پردہ ہائے ساز ہے میرا صدا دینا

زبس ترکِ جفا تھا موجبِ آزادیٔ ہستی
ترے کام آ گیا صیاد کو میرا دعا دینا

کہاں ہوتا وجودِ امتیازِ نیک و بد سالک
نہیں جز حکمتِ قدرت بشر کو عقل کا دینا

عناصر کی دنیا

[illegible]

[illegible]

[illegible] عناصر کی [illegible] دنیا کی جانب بھی توجہ کی ہے جس کا ہر ارغوانی ذرہ قدرت کاملہ [illegible] صناع ازل کی [illegible] کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے [illegible] دنیا یہ بحر [illegible] بر اعظم یا عجیب غریب ملک [illegible] ملکوں [illegible] ہیں دریا بھی ہیں صحرا بھی ہیں اور دار السلطنت [illegible] دنیا پر اُن کا نمونہ نظر نہیں آتا - مگر ہاں اس [illegible] نظر نہیں آتا بلکہ اہل حرفہ کی کوئی انتہا [illegible] حرفتوں کے مرکز ہیں - پھر یہ معاملہ حیرت انگیز ہے کہ اس ملک کے صناع [illegible] کام کرتے ہیں جو ہمیشہ اُنھوں نے اختیار کیا ہے اُس کے فروغ میں ہر وقت مصروف [illegible] قیامت تو یہ ہے کہ ناسازیٔ مزاج کی شکایت پر بھی کام کئے جاتے ہیں

غرض یہ کہ اُن کی خدمات کا سلسلہ کوئی روک سکتا ہے تو وہ صرف موت ہے - ملک نہایت متمدن اور ترقی یافتہ ہے - جابجا صاف ستھری سڑکیں پھیلی ہوئی ہیں ریلیں دوڑ رہی ہیں تار کا سلسلہ ہر طرف چلا گیا ہے شہر پناہ ایسی مستحکم ہے کہ غنیم سے کوئی خطرہ نہیں لاسلکی طریق پیام رسانی نے اس قدر ترقی کی ہے کہ ملک کے کسی حصہ میں کوئی حادثہ وقوع پذیر ہوا کہ فوراً دار السلطنت میں خبر ہو گئی - رعایا کی حالت قابلِ اطمینان ہے - سیاسیات سے انھیں کوئی تعلق نہیں - بادشاہ خود مختار رہے جو چاہے سو کرے - ہر فرد اطاعت وانقیاد کے لئے آمادہ ہے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ خواہ جان پر آ بنے لیکن تعمیل احکام میں عذر نہیں - اتنی بات ضرور ہے کہ عمال شاہی نے اشیاء خوردنی کی بہم رسانی میں کوتاہی کی اور فاقہ کشی کی نوبت پہونچی تو رعایا قابو میں نہیں رہتی اور سارے ملک میں خوفناک ایجی ٹیشن پھیل جاتا ہے - اور پھر وہی افراد جو فرمانِ شاہی پر جاں نثاری کو تیار تھے کسی بات پر کان نہیں دھرتے

اس ملک کی بادشاہت عموماً دو خاندانوں میں سے کسی ایک میں رہتی ہے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ
بادشاہوں کا طریقہ جہاں بانی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ایک خاندان کا بادشاہ جب حکمراں
ہوتا ہے تو رعیت شاد ملک آباد خزانہ معمور اور ہر شخص مسرور رہتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے خاندان
کے بادشاہ کا یہ حال ہے کہ اُس کے عہد حکومت میں رعایا ناشاد، ملک برباد، خزانہ خالی اور ہر طرف پریشانی
نظر آتی ہے۔ بہرکیف ان ہر دو خاندانوں میں سے ایک کا نام عقل اور دوسرے کا نام نفس ہے۔ غالباً ان
فرمانرواؤں کا نام آتے ہی ہماری طلسم بندیوں کا پردہ اُٹھ گیا ہوگا۔ اور آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مذکورہ ملک
سے مقصود جسم انسانی ہے اور دارالسلطنت سے ہماری مراد دماغ ہے اور بڑے بڑے شہر دل و جگر وغیرہ وغیرہ
گئے ہیں۔ لیکن ہم زیبایش بیان کے لئے اس تشبیہ و استعارات کو کچھ دیر اور قایم رکھنا چاہتے ہیں

عقل کے کارنامے تو ہم کسی آیندہ موقع کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں اور اس وقت صرف نفس کے طریق حکومت کے
چند رُخ دکھانا چاہتے ہیں۔ اس موقع پر یہ بتانا ضروری ہے کہ اس ملک میں ایک کتاب آئین بھی ہے جس کی پابندی
ہر بادشاہ کے لئے ضروری ہے اور اُس کی ہدایتوں پر عمل کرنے سے ایک بادشاہ نہ صرف اپنی مملکت عرصہ دراز
تک قائم رکھ سکتا ہے بلکہ اس طرح کی کئی مملکتیں اور بھی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن نفس کی حالت یہ ہے کہ ان مقررہ
کی خلاف ورزی اُس کی آب و گل میں ہے۔ جب اُسے اقتدار حاصل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اُس کتاب آئین
کو جلا ڈالتا ہے حرص و طمع اس بادشاہ کی طینت میں ہے اور اس وجہ سے مملکت کو سخت نقصان پہونچتا ہے
مثلاً سامان خور و نوش کو لیجئے کتابِ آئین کا منشا یہ ہے کہ ضرورت سے زائد ایک دانہ اور ایک قطرہ ذخیرہ نہ کیا
جائے۔ لیکن نفس ہمیشہ اس کے خلاف کرتا ہے اور سامانِ خور و نوش کی اتنی مقدار فراہم کئے جانے کا حکم
دیتا ہے کہ سرکاری گوداموں میں گنجایش نہیں ہوتی پھر ان چیزوں کے سڑنے گلنے سے طرح طرح کے عوارض ملک
میں پھیل جاتے ہیں اور اس خوبصورت دنیا کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں

اس بادشاہ میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ انتہا درجہ کا ناعاقبت اندیش ہے۔ دور اندیشی و انجام بینی کی
ذرا عادت نہیں اس وجہ سے بعض اوقات ایسی باتوں پر آمادہ ہو جاتا ہے جو نہ صرف اُس کی بلکہ ساری سلطنت
کی بربادی و تباہی کا باعث ہوتی ہیں۔ اپنی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے یہ فوری لذتوں کا گرویدہ ہے اور جو اُمور

... کے لئے خوش گوار لیکن سالہا سال کے لئے باعث اندوہ و کلفت ہیں اُن کے اختیار کرنے میں اُسے ذرا
... نہیں ہوتا - اس موقع پر اُس کی لذت پرستیوں کا ایک نمونہ دکھانا دلچسپی و عبرت سے خالی نہ ہوگا اس سے
... جا سکے گا کہ اس کی نا عاقبت بینی سے ادنیٰ اشـ ...ـوں پر ملک میں کیسا تہلکہ برپا ہوتا ہے اور ایک سرسبز
... آبادی کس طرح پامال و ویران ہو جاتی ہے

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں نفس نہایت حریص و نا عاقبت اندیش واقع ہوا ہے چنانچہ اُس سے لذت پرستیوں
... یہ دونوں صفات مذموم بدرجۂ کمال رونما ہوتی ہیں - ... کا جاسوس اسباب عیش و تفریح کی رپورٹ پیش
... ہے جب اُس کی اطلاع پر بادشاہ آمادگی ظاہر کرتا ہے تو نظامِ عصبی کی معرفت ایک لاسلکی لہر ساری مملکت میں دوڑ
... ہے اور ہر حصہ ملک کی آبادی ایک خاص کیفیت سے متاثر ہو کر صدورِ احکام شاہی کی منتظر رہتی ہے - خزانہ عامرہ
کے عہدہ دار زرِ خالص العیار کی وہ مقدار علٰحدہ کرتے جاتے ہیں جو اس موقع پر شاہی لذتوں میں صرف ہونی ضروری ہے
... بتا دینا چاہئے کہ اس ملک میں زرِ سرخ و سفید کی قیمتوں میں وہ تناسب نہیں ہے جو بیرونی دنیا میں پایا جاتا
ہے یہاں زرِ سفید زرِ سرخ سے چالیس گنا اور بقول بعض اسی گنا زیادہ قیمتی ہے

ہر کیف جب شہنشاہ موصوف آمادۂ عیش و التذاذ ہوتا ہے اس وقت عصبی دنیا میں ایک خاص ہیجان - دارالسلطنت
میں حیرت انگیز وارفتگی - پائیگاہ دل میں زلزلہ کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے - دریا کا تموج زور پر ہوتا ہے اور سارے
ملک پر ایک غیر معمولی سماں چھا جاتا ہے - شہنشاہ کو اپنی لذت کشی کے لئے زرِ سفید کے کئی سربمہر توڑے فوراً خزانۂ
عامرہ سے صرف کرنے پڑتے ہیں - اگر اس قسم کی مصارف کتابِ آئین کے مطابق کبھی کبھی واقع ہوں تو ملک میں کوئی
اختلال و اضطراب پیدا نہیں ہوتا لیکن نفس کی نا عاقبت اندیشانہ بوالہوسی اسی پر اکتفا نہیں کرتی اور اس سے
پہلے کہ ملک کی پیداوار صرف شدہ مقدار کی تلافی کر سکے وہ مزید مصارف کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے آخرکار
نوبت یہاں تک پہونچتی ہے کہ یہ گنجینۂ گوہر اور خزینۂ زر جس کا اصطلاحی نام "وعا منّی" ہے اور جو پرویز و قارون
کے خزانوں سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے بالکل خالی ہو جاتا ہے - اس پر بھی جب متوالے بادشاہ کی مانگ بدستور
جاری رہتی ہے تو خزانہ کے عہدہ دار ناچار ہو کر اُنثیین کی مشہور دارالضرب کی طرف ہرکارے دوڑاتے ہیں اور
وہاں سے نہ صرف سکہ ہائے نو ساخت بلکہ سیم خام و غیر مسکوک تک طلب کر کے شاہی خواہشوں پر قربان کر دیتے ہیں۔

نفس کو خبر نہیں کہ اس ناعاقبت اندیشی سے نظام ہستی میں کیا قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ جب غذا سے ...
انثیین کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے تو انثیین گردوں کے روبرو صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اپنی غذا کا مطالبہ کرتے
ہیں۔ گردے جگر سے مطالبہ کرتے ہیں در حقیقت جگر ان کے مطالبات کو پورا کر کے فوراً معدہ سے اس کی تلافی چاہتا ہے۔ معدہ
ناچار ہو کر غذائے غیر منہضم جگر کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ جگر اس کیلوس خام سے جو خون تیار کرتا ہے وہ ظاہر ہے
کہ ناقص و خام ہوتا ہے۔ اب یہ ہی ناقص خون اعضا کو بطور غذا کے بہم ہوتا ہے اور جہاں پہنچتا ہے وہاں ایک نئی
مصیبت رونما ہوتی ہے۔ مثلاً جگر میں سدّہ پڑ جاتا ہے ورم پیدا ہوتا ہے اور یرقان و استسقا کی نوبت آتی
ہے۔ جب یہ خون خام دماغ کی طرف جاتا ہے تو درد سر پیدا ہوتا ہے صرع و سکتہ کی خوفناک شکایتیں پیدا
ہوتی ہیں۔ نسیان۔ فالج۔ رعشہ۔ لقوہ۔ اور ضعف اعصاب اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ دل کی طرف جب یہ جاتا
ہے تو اس کے غلاف میں رطوبات فاسدہ پیدا ہو کر اختلاج و خفقان رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح مفاصل میں
وجع مفاصل۔ نقرس اور عرق النسا جیسے مکلّف امراض کا باعث ہوتا ہے۔ پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے تو
دمہ اور سل کی جانکاہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ طحال کی طرف جاتا ہے تو سدہ و ورم کی شکایت پیدا ہو
آتی ہے۔ الغرض تمام نظام درہم و برہم ہو جاتا ہے۔ اگر فی الفور نفس کی سلطنت معزول ہو گئی اور عقل کو
موقع مل گیا اور اس کے ساتھ ہی حاذق اطبا کی تدبیر و مشورت بھی میسر آ گئی تو ممکن ہے کہ کسی حد تک
مافات ہو جائے ورنہ بحر فنا کی تلاطم خیز موجیں اٹھ اٹھ کر اس پُرامید ہستی اور ولولوں سے لبریز دل کو غرق
کر دیتی ہیں۔ فالحذر ثم الحذر

(حکیم محمد عبد اللطیف (فلسفی) لکھنوی

کلامِ بے نظیر

حضرت مولانا سید بے نظیر شاہ صاحب وارثی مدظلہ (کڑا مانکپوری)

چھپی ہے حیا اُن کی چتون میں کیسی
لگاوٹ ہے بے ساختہ پن میں کیسی

جو پونچھے نہیں اشک خونیں کسی کے
یہ سرخی ہے پھر اُن کے دامن میں کیسی

عجب کیا جو اعجازِ سوزِ جنوں ہو
یہ نرمی ہے زنجیرِ آہن میں کیسی

کوم خزاں سے جو پر جل رہے ہیں
تڑپتی ہے بلبل نشیمن میں کیسی

ترے کاروانِ محبت کی خاطر
عداوت پڑی خضر و رہزن میں کیسی

گر چلدیا پھر کوئی بت حرم کو
یہ ہلچل ہے دیرِ برہمن میں کیسی

یہ رہ رہ کے کون اس طرف جھانکتا ہے
یہ بجلی چمکتی ہے چلمن میں کیسی

نظر آئی ہے جب سے دیوار اُن کی
گڑی ہے نظر جا کے روزن میں کیسی

کہاں ہے تو لے ابرِ رحمت کہاں ہے
اُداسی ہے آج گلشن میں کیسی

مکدر ہیں وہ اور میں رو رہا ہوں
یہ خاک اُڑتی ہے اب کے ساون میں کیسی

مہ و مہر ہیں جس کے پرتو سے روشن
تجلّی ہے اُس روئے روشن میں کیسی

الٰہی کبھی پھر نہ اس کو خزاں ہو
بہار آئی ہے اب کے گلشن میں کیسی

تری تیغِ عریاں میں جب دیکھتا ہوں
تو شہ رگ پھڑکتی ہے گردن میں کیسی

کھلے کیا مجازی میں رازِ حقیقت
پھنسی ہے نظر رنگ و روغن میں کیسی

ذرا کھول کر بعد دو دن کے دیکھو
کہ زینت ہے شاہوں کے کفن میں کیسی

اُنھیں دیر و کعبہ سے بس یہ غرض ہے
کہ ٹھنتی ہے شیخ و برہمن میں کیسی

ہوئے بینظیر اشک بھی خشک آخر
صفائی ہے اب میرے خرمن میں کیسی

لمعاتِ انور

فرطِ امکاں سے کوئی محوِ خود آرائی ہے
کیا تماشا ہے کہ پھر خود ہی تماشائی ہے

کثرتِ جلوہ بھی اک حسن کی رعنائی ہے
خلوتِ دید میں کیا وسعتِ بینائی ہے

شبنمی بسط پہ دو ڈوب رہے ہیں تارے
میں ہوں بیچارہ نظر اور شبِ تنہائی ہے

محشرآثارِ "انا الحق" سے ہیں سو نازنیاز
ہر مرے ذرّہ سے پیدا غمِ رسوائی ہے

ڈوبنے والے دکھا سب کو نہ تو بازوئے شل
جو کھڑا ہے لبِ ساحل وہ تماشائی ہے

غیر کے شکوۂ بے قید پہ ہوتا ہے کرم
اور مرا شکر بھی ناکامِ جبیں سائی ہے

تیلیاں خون کے چھینٹوں سے چمن زار ہوئیں
اب مجھے لینے قفس ہی میں بہار آئی ہے

مجھ سے پوچھے کوئی صد لذتِ جورِ بیجا
یک رَوی سے تری واقف ترا شیدائی ہے

انتہاؤں سے ہوا یاس کی مقصد حاصل
ہمتِ زیست بڑھانے کو قضا آئی ہے

خواہشِ دل ہے کہ بیتاب ہوں دونوں عالم
جو مجھے چاہیئے وہ دردِ شکیبائی ہے

وحشت آزار ہے ہنگامۂ عالم انورؔ
حسرت آرام مرا گوشۂ تنہائی ہے

(سردار انور خاں)

زمانۂ اسلام میں فارسی کا اوّلین شاعر

مورخین اور ارباب تذکرہ کی ایک اہم جماعت نے اس امر پر بحث کرتے ہوئے کہ ایران میں اشاعت اسلام کے بعد سب سے پہلا شاعر کون ہوا ہے ابوحفص حکیم احوص سغدی کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ زمانۂ اسلام میں فارسی کا سب سے پہلا شاعر ہوا ہے۔

ابونصر فارابی (متوفی ۳۳۹ھ) نے ابوحفص کے متعلق اس امر کی بھی تصریح کی ہے کہ وہ فن موسیقی میں بھی کامل دستگاہ رکھتا ہے۔ ابونصر فارابی کی تحقیق کے مطابق وہ ۳۰۰ھ میں گذرا ہے ذیل کا فارسی شعر اسی سے منسوب ہے:

آہوئے کوہی در دشت چگونہ دوذا   چونداردیار بے یار چگونہ روذا

کتاب المعجم میں بھی صفحہ ۱۸۰ پر اس امر کی تائید کی گئی ہے کہ یہ شعر ابوحفص ہی کا ہے۔

لباب الالباب کے مولف نے خواجہ زادہ عباس نامی شخص کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ فارسی کا اولین شاعر ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

جس زمانہ میں خلیفہ عباسی ماموں جس کی حکومت کا پرچم اسلامی ممالک کی بلندیوں پر لہرا رہا تھا اور اپنے پاکیزہ اور اعلیٰ اوصاف حلم وحیا۔ جود وسخا۔ وقار و وفا کی بدولت لوگوں کے قلوب کو مسخر کر رہا تھا مرو میں عباس نامی ایک شخص تھا جو علم شعر کی بے انتہا دولت سے مالا مال تھا۔ فارسی اور عربی زبان میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ جب ۱۹۳ھ میں خلیفہ مامون وارد مرو ہوا تو اس شخص نے ایک قصیدہ فارسی زبان میں لکھکر پیش کیا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ تھا:

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین   گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را — دینِ یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین

اسی قصیدہ کے ضمن میں آگے چلکر لکھتا ہے:

کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت — مر زبانِ پارسی راہست تا ایں نوع بین

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت — گیرد از حمد و ثنائے حضرتِ تو زیب و زین

جب یہ قصیدہ بارگاہِ خلافت میں پڑھا گیا تو خلیفہ نے اپنے جود و عطا کے ہاتھ کو کھولدیا اور ایک ہزار دینا عطا کئے اور اس کے بعد اسی رقم کو مستقل وظیفہ کی صورت میں جاری کر دیا۔

مجمع الفصحا کے مصنف نے لکھا ہے کہ خواجہ زادہ عباس کی وفات ۲۰۰ھ میں ہوئی۔ اور لباب الالباب کے مصنف کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مامون ۱۹۳ھ میں مرو آیا اور یہ قصیدہ اس کو پیش کیا گیا۔

یہاں پر اس قصیدہ کے جو آخری دو شعر پیش کئے گئے ہیں ان میں شاعر اس امر کا اظہار کرتا ہے فارسی زبان میں بھی اس سے پہلے اس طرح شعر نہیں کہے گئے۔

بعض مستشرقین نے لباب الالباب کے مؤلف کی اس حکایت کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اس کو واقفیت پر محمول کرنے کے لیے تیار نہیں لیکن اگر ہم غور کریں تو موخر الذکر جماعت کو ہم حق بجانب قرار دے سکتے ہیں۔ اس کی وجوہات حسب ذیل ہو سکتی ہیں:

(۱) اس قصیدہ کا اسلوبِ سخن بتا رہا ہے کہ یہ دوسری یا تیسری صدی کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ چوتھی صدی کا کلام بھی نہیں ہو سکتا بلکہ اگر ہو سکتا ہے تو یہ پانچویں صدی کا کلام ہوگا۔

اس کے علاوہ الفاظ کی مطابقت جیسے شائستہ و بائستہ اور یہ ترکیب جو اس کلام میں موجود ہیں تیسری صدی میں موجود نہ تھی اس لیے بھی اس کی تائید نہیں کیجا سکتی یہ کلام ۱۹۳ھ میں کہا گیا۔

(۲) مامون جمادی الاول ۱۹۳ھ میں واردِ مرو ہوا اور جب امین ذوالیمین کے ہاتوں قتل ہوا اور مامون کی بعیت کی گئی یعنی ۱۹۸ھ تک مامون مرو میں رہا مامون کو زمانہ امین تک خلیفہ نہیں کہا جاتا تھا بلکہ اس کو امام کے لفظ سے پکارا جاتا تھا اس لیئے شعر میں "مر خلافت را تو شائستہ" کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں قصہ مصنوعی ہے

(۳) قصیدہ کا یہ شعر "کس بریں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت"، یقیناً مصنوعی ہے۔ کیونکہ "زمانہ"

اسلام میں پہلے شاعر'' کا موضوع نہایت اہمیت رکھتا تھا اور واقعی طور پر یہ کہنا کہ فلاں شخص فارسی کا پہلا شاعر ہے بہت مشکل تھا اس لیے کسی داستاں طراز نے اس کو عباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ غالباً ان لوگوں کا مقصد یہ ہوگا کہ اس کا سہرا ابو العباس مروزی اور ماموں کے سر باندھیں۔

ایسی شخصی اختراعات ایران کی اسلامی تاریخ میں کافی مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

مجمع الفصحا کے مصنف نے بایزید بسطامی کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے فارسی میں سب سے پہلے شعر لکھا ہے اس کا سبب چند رباعیاں ہیں جن کے متعلق یہ صحیح علم نہیں کہ وہ کس کی لکھی ہوئی ہیں لیکن مجمع الفصحا کا مصنف ان کو بایزید بسطامی کی طرف منسوب کرتا ہے۔

حالانکہ ان رباعیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چوتھی صدی کی لکھی ہوئی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کہنا ایک امر مشکل ہے کہ زمانۂ اسلام میں فارسی کا پہلا شاعر کون شخص ہے کیونکہ ایرانی دہقان اور مزارعین جن کے کشتِ دل میں ذوق نغمہ سنجی کا بیج بویا ہوا تھا کاشتکاری کے وقت زمزمہ سنجی اور نغمہ پیرائی میں مصروف رہتے تھے۔

اس لیے صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ زمانۂ اسلام میں جس شخص کی زباں سے پہلا شعر نکلا وہ کون شخص تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایران کی موجود شاعری اور موسیقی کی بنیاد ساسانی شاعری اور موسیقی پر ہے جو زمانہ کے تغیرات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی۔

(کاوہ برلن) حامد الانصاری غازی

غزل

(نتیجۂ فکر حضرت رضیؔ بدایونی)

نکلے ہیں اشک جوشِ تمنّا لیے ہوئے
ہر قطرہ ہے تلاطمِ دریا لیے ہوئے

ہے ترجمانِ شوق ہر اک جنبشِ نظر
صدہا زبان عرضِ تمنا لیے ہوئے

اللہ رے وقت دید مرا جوشِ محویت
ہے ہر نگاہ شوق کی دنیا لیے ہوئے

اک نقش ناتمام ہے وہ عشق جو نہ ہو
رنگِ مذاقِ شورشِ سودا لیے ہوئے

امید التفات سے تاب آزمائے صبر
رنگِ فریبِ وعدۂ فردا لیے ہوئے

تو مہرِ حسن اور تجلّی تہِ نقاب
میں ذرہ اور شوق کی دنیا لیے ہوئے

دنیا فریب دیتی ہے اُس غمزدہ کو کیا
جیتا ہے جو اجل کا سہارا لیے ہوئے

صد جلوہ در کنار ہے ہر اشک آرزو
ہر جلوہ ایک حسن کی دنیا لیے ہوئے

کہتے ہیں جس کو زیست طلسم امید ہے
ہر سانس ہے فریب تمنا لیے ہوئے

آئے حریم ناز سے باہر تو کس طرح
منہ پر نقابِ برقِ تجلا لیے ہوئے

کر غور سے مطالعۂ درسِ کائنات
ہے ذرہ ذرہ حسن کی دنیا لیے ہوئے

اُس مستِ ناز سے ہے اُسی کی طلب رضیؔ
پہلو نیا ہے عرضِ تمنا لیے ہوئے

خدائے محبّت کے حضور میں

یں اب دنیا میں اس طرح رہتا ہوں جس طرح کوئی ایک تاریک کوٹھری میں مدہوش پڑا ہو ـــــــ
نوس کرتا ہوں۔ قوتوں کے کام کرنے کا احساس ہے مگر نظر کچھ نہیں آتا ـــــــ اے آفتابِ حقیقت
ے جلوے کی ہلکی سی کرن میری روح کو اجاگر اور میری قوتوں کو بیدار کردینے کے لیے کافی ہے!

جس طرح گرمیوں میں آندھی ہر اس چیز کو جس سے وہ چھو جاتی ہے گرد آلود کردیتی ہے اسی طرح تیری
ا کے جوش میں میری طوفان بدوش تمنائیں میرے دل کے گوشہ گوشہ کو ایک غیر مرئی غبار میں پنہاں
دیتی ہیں۔ کاش! تو مجھے اپنی محبت میں اسی قدر بے خبر کردیتا کہ "لطافت"، اس "کثافت"، سے
ا رہ سکتی۔

تیری تجلیات پنہاں نمایاں ہونے کے لیے میرے ذوقِ نظر کی التجا کا انتظار کررہی ہیں اور آہ میرا
، نظر التجا کرنا بھی نہیں جانتا۔ کیا ہوگا اے میری نگاہوں کے واحد مقصود! اگر تو نے کبھی میری نگاہوں کو
ا حقیقی سے آشنا سمجھ کر پردا اٹھا دیا۔ میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری نگاہوں
، مانگی تیری نگاہوں کو مجھ سے پھیر دے۔

کاش! میں تجھ سے اس طرح محبت کرسکتا جس طرح تو مجھ سے محبت کرتا ہے تو کیسا عجیب محبت کرنے
ہے کہ محبت کرتا ہے مگر محسوس نہیں ہونے دیتا ہے کہ تجھے مجھ سے محبت ہے ـــــــ اور میں۔ آہ میں
یح معنوں میں تجھ سے محبت بھی نہیں کرتا مگر محسوس کرا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔

تمنّا سے زیادہ لطیف کیفیت قریبِ تمنّا ہے ——— میں تجھ سے ملنے کی آرزو کو اس قدر پُرکیف نہیں پاتا جس قدر تجھ سے ملنے کی امید کو!

غفلت کی وہ نیندیں جن سے بیداری کی قدر و قیمت محسوس ہو سینکڑوں بیداریوں سے بہتر ہیں ——— میں ایک دفعہ عالمِ مدہوشی میں تجھ سے غافل ہو گیا تھا۔ آہ اُس وقت کی کیفیت جب میں نے ہوش میں آکر پھر تجھے یاد کیا۔

جس طرح زمین کو منور کرنے کے لیے سورج کی کرنیں ہوا کی ہزاروں چادروں کو چیرتی ہوئی اُس تک پہنچ جاتی ہیں اسی طرح اے میرے مہرِ درخشاں مجھے اُجاگر کرنے کے لیے تیری محبت کی نورانی موجیں میری سینکڑوں مادّی کثافتوں کے پردوں کو چھلنی کرتی ہوئی میری روح تک آگئی ہیں۔

اظہارِ محبت کیفیاتِ محبت کو فنا کرنے کی ایک غیر محسوس کوشش ہے ——— میں تجھے سجدہ کرتے ہوئے کانپتا ہوں کہ کہیں تو میرے جوشِ نیاز سے نہ آگاہ ہو جائے۔

میں تیری محبت کے صحیح جذبات انہیں سمجھتا ہوں جن کا اظہار نگاہیں بھی نہیں کر سکتیں۔

لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں راتوں کو جاگتا رہتا ہوں ——— آہ انہیں نہیں معلوم کہ تو رات کی خاموشی میں محبت کرنے والوں سے کس قدر قریب ہو جاتا ہے۔

کس قدر پُرکیف رات ہے۔ چاند چھوٹے چھوٹے سیم پارے سطحِ دریا پر جمع کر کے اک فرشِ سیمیں تیار کرنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا کے جھونکے پانی کی چادر سے لپٹ لپٹ کر موجوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں! اور چاندی کے اُس فرش پر لوٹتے

چلے جاتے ہیں ــــــ چادر وہ لطیف و نازک چادر اس صدمے سے پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور سیم پارے
ہر سطح دریا پر بکھرے ہوئے نظر آنے لگتے ہیں ــــــ بالکل اسی طرح اے
مرے ماہ تاباں تو میرے دل صد چاک کے ٹکڑوں کو جمع کر کے دریائے محبت میں ایک زریں یادگار قایم کرنا چاہتا
ہے مگر آہ میرے خواہشات کی موجیں بنا بنایا کام بگاڑ دیتی ہیں۔

میں راہ محبت میں انتہائی مدہوشی کا طالب ہوں مگر جادۂ تسلیم و رضا میں انتہائی ہوش کا ــــــ کیونکہ
ــــــ تیری مرضی کو ایک دفعہ نظر انداز کر دینا تیرے حسن کی سینکڑوں مرتبہ پرستش کرنے کو بیکار کر دیتا ہے

کاش! میں تجھ سے اس طرح اظہار محبت کرتا جس طرح وہ انسان کرے جو گونگا بھی ہو اور اندھا بھی۔

مجھے تیری محبت دیدی جائے اور حوادثات زمانہ کے سپرد کر دیا جائے۔
مجھے تیری محبت دیدی جائے۔ اور ہزار ہا روح فرسا واقعات سے دوچار کر دیا جائے۔
مجھے تیری محبت دیدی جائے۔ اور مصائب کے طوفان میں پھینکدیا جائے ــــــ میں ذرا دیر
کیلئے آنکھیں بند کر کے تمام پریشانیوں کو مسرتوں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔ میں دل پر صرف ایک دفعہ اپنا کانپتا
ہاتھ رکھ کر مشاہدات کے تمام خوفناک اثرات کو فراموش کر سکتا ہوں۔ کر سکتا ہوں اور کر لونگا۔

میں سوچتا ہوں کہ میں اگر تجھ سے محبت نہ کرتا تو زندہ کیونکر رہتا۔ زندگی اگر تیری محبت کے ہاتھوں نوازی
گئی تو میرے خیال میں ایک مسلسل افسردگی۔ ایک نہ ٹوٹنے والی بے کیفی کا سلسلہ ہی ہو سکتی تھی۔

میرے سینہ کو تلوار کی تیز دھار سے چاک کر کے اس میں سے تمام چیزیں نکال لی جائیں اور ہر چیز کی بجائے
تمنائیں بھر دی جائیں۔ میں اپنی ان چیزوں کو کبھی واپس لینے کی خواہش نہ کرونگا ــــــ میری رگ رگ

کو نوکِ نشتر سے کھول کر اس میں سے تمام خون نکال لیا جائے اور اس کی بجائے تیری شراب محبت بھر دی جائیں۔ میں لہو کی ایک بوند بھی کبھی کسی سے نہیں مانگونگا ـــــــــ میری آنکھوں کے پردوں پر سلائیاں کھینچ کر قایم کر دی جائیں۔ میری زبان کے ہر حصہ پر تیرا نام کھدوا دیا جائے میں پھر دنیا کے رنگیں مناظر کو بھی دیکھنے کی تمنا نہ کروں گا۔ میں پھر دنیا کے شیریں سے شیریں گفتگو کرنے والے سے بھی بولنے کا روادار نہ ہونگا۔

آہ تیری محبت اور اس کے مسحور کر دینے والی تجلیات یہ وہ عالم ہیں جو تمام عالموں کی جان ہیں۔

زندگی کو تیری محبت اور صرف تیری محبت میں صرف ہونا چاہیئے جس طرح گلاب کا پودا عرصۂ شہود میں آتا ہے کہ رنگیں پھول کھلا کھلا کر نگاہوں کے سامنے فردوس رنگ و بو پیش کرتا رہے ورنہ کیا نہیں کہ اس میں سوائے کانٹوں اور چند پتوں کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

پرستار

کیف مراد آبادی

رباعیات

واللہ سرفراز بھی ہوں خوار بھی ہوں
ننگ مذہب بھی اور دیندار بھی ہوں
میں اپنا ہی خواہ بھی ہوں دشمن بھی
تیرا بندہ بھی تجھ سے بیزار بھی ہوں

میرا غم مجھ پہ منحصر رہنے دے
اب منتظروں کو منتظر رہنے دے
تجھ پر رحمت ترے کرم پر رحمت
میرا الزام میرے سر رہنے دے

جگر مراد آبادی

محاکاتِ عزیز

پہلا سا مرے حال پر اکرام نہیں ہے — یعنی وہ مری صبح نہیں شام نہیں ہے
کیوں اے دلِ مشتاق تو آزردہ ہوا ہے — انکارِ ملاقات تو دشنام نہیں ہے
اے دستِ جنوں اور بڑھے ذوقِ جنوں کا — دامن ہے مرا جامۂ احرام نہیں ہے
اک بار مجھے دیکھ کے بدمست بنا دو — اس جام سے تند اور کوئی جام نہیں ہے
کس بات پہ برہم ہوئے اے جانِ تمنّا — اظہارِ محبت کوئی دشنام نہیں ہے
بڑھتی ہے اسی چیز سے بیتابیٔ الفت — ناکام ہے جو عشق میں ناکام نہیں ہے
رسوا ہے وہی جو نہیں رسوائے محبت — بدنام ہے جو عشق میں بدنام نہیں ہے
بیتابیٔ دل نے کئے الفاظ تو مبہم — لیکن نگہِ شوق میں ابہام نہیں ہے

جب دیکھو عزیز اس کے ہی کوچے میں ہو بیٹھے
کیا اس کے سوا کوئی تمہیں کام نہیں ہے

مغربی لباس اور اسلام

قرآن کریم۔ تفاسیر و حدیث اور کتب سیر و فقہ کے دیکھنے سے کسی طرح یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ لباس کے بار
شارع عم نے کسی خاص وضع کی ہدایت فرمائی ہو جس کے خلاف میں گناہ کبیرہ و صغیرہ کے ارتکاب کا اندیشہ ہو۔
صالحین کے نزدیک اسلام مجموعۂ عقائد و اعمال صالحہ کا نام تھا اور انھوں نے ہمیشہ انہی دونوں امور کی بقا
طرف توجہ کی لباس ضرورت زمانہ اور معاشرت ملکی کے تغیر کے ساتھ ہمیشہ بدلتا رہا یہی وجہ ہے کہ

لباسِ نبوی خود حضور سرور کائنات (ارواحنا فداہ) کسی ایک وضع کے لباس کے التزام پر عامل نہ
چادر قمیص اور تہمد کا استعمال فرماتے تھے۔ پاجامہ کے متعلق امام احمدؒ اور اصحاب سنن ا
روایت کی ہے کہ حضور نے منا کے بازار سے پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم کا قیاس ہے کہ استعمال بھی فرمایا۔
لیکن بعہد فاروقی ۲۱ھ میں جب مصریوں پر جزیہ مقرر ہوا تو فوج کے کپڑے بھی اس میں شامل تھے جن میں اون
بلی ٹوپی یا عمامہ اور موزوں کے علاوہ پاجامہ بھی تھا حالانکہ ابتدا میں پاجامے اور موزے کو حضرت فاروق اعظ
نے بتصریح منع فرمادیا تھا۔

اگرچہ حضور موزوں کے عادی نہ تھے لیکن بخاشی کے پیش کردہ چرمی موزے استعمال فرمائے ہیں۔ عمامہ
شملہ کبھی تا دوش کبھی دونوں شانوں کے درمیان رہتا۔ عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی (لاطیہ) استعمال فرما
ارشاد تھا کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان میں یہی وجہ امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں اونچی ٹوپی
ناشرہ کبھی استعمال نہیں فرمائی لیکن حضرت عمرؓ برنس ایک قسم کی عیسائی درویشوں کی ٹوپی کبھی کبھی استعمال فرماتے
کیونکہ اس عہد میں مدینہ میں رائج ہو گئی تھی۔ وقت انتقال حضرت عائشہ صدیقہؓ نے پیوند لگا ہوا کمل اور گاڑھے کا
تہمد نکال کر دکھائی کہ انہی کپڑوں میں حضور نے وفات پائی۔ آپ چاندی کی انگوٹھی بھی جس کی تین سطروں میں محمدؐ رسول
اللہ لکھا تھا داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔ جوتے کی شکل چپل کی طرح تھی۔

غیر ملکی لباس بعض اوقات شامی (یہودی) عبا بھی استعمال فرمائی ہے جو فتوضأ وعليه جبة شامية ـــ

ثابت ہے اور یہ جبہ اب تک علمائے یہود کا لباس ہے۔ نوشیروانی (آتش پرستوں کی) قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر ریشم کی گوٹ تھی زیب تن فرمائی ہے جیسا کہ حدیث عبداللہ مولےٰ اسماء بنت ابوبکر میں ہے فاخرجت الی طیالسنة کسروانیة رومن کیتھلک عیسائیوں کا لباس بھی پہنا ہے مشکوٰۃ شریف میں بخاری و مسلم سے روایت ہے اِنّ النبیؐ لبس جبہ رومیه ضیقتہ الکمین حتیٰ کہ وضو کے وقت تنگی کی وجہ سے آستین نہ چڑھ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا۔ بعض امراء و سلاطین نے حضور کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ میں بھیجے ہیں اور حضور نے قبول فرما کر کبھی کبھی استعمال بھی فرمائے ہیں۔

رنگ عمامہ اکثر سیاہ ہوتا تھا۔ حلۂ حمراء ایک قسم کی سرخ دھاریوں والی لمبی چادر بھی استعمال فرمائی ہے۔ مختلف روایتوں سے ثابت ہے کہ حضور نے سیاہ۔ سرخ۔ سبز و زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں۔ لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا۔ فرماتے کہ سفید رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے۔ اور سبز رنگ بینائی کو قوت دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے کہ سفید کپڑے پہننا لازم کرو تاکہ تم میں سے زندہ لوگ اس کو پہنیں اور اپنے مُردوں کو اس میں کفن دیں۔ آپ نے سبز چادر بھی پہنی ہے زرد رنگ بھی مرغوب تھا۔ کبھی آپ تمام کپڑے حتّٰی کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر زیب تن فرماتے تھے۔

خوش لباسی کبھی کبھی حضور نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بن کر گئے تو وہ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس! یہ کیا لباس ہے؟ بولے تم اس پر معترض ہو میں نے تو حضور کو بہتر سے بہتر لباس میں ملبوس دیکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے ایک مرتبہ بازار سے ایک شامی حلّہ خریدا۔ گھر آکر دیکھا تو اس میں سُرخ دھاریاں تھیں۔ جا کر واپس کر آئے۔ کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ سے کہا انھوں نے حضور کا جبہ منگوا کر لوگوں کو دکھایا اس کی جیبوں آستینوں اور دامن میں دیبا کی سنجاف تھی۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو خراب کپڑے پہنے ہوئے دیکھا دریافت فرمایا کہ تم کو کچھ مقدور ہے۔ بولا۔ ہاں! فرمایا کہ خدائے تعالیٰ نے نعمت عطا فرمائی ہے تو اس کا اظہار صورت سے بھی ہونا چاہیئے۔

متنوعات حضور چونکہ ہر بات میں صفت اعتدال کو پسند فرما کر افراط و تفریط کے رذائل سے پرہیز فرماتے تھے اس

لیسے اُن لباسوں کو حرام فرمایا جن کا بیجا انہماک اور کثرتِ شوق دارِ آخرت کو بھلانے والا اور لذائذ دنیوی میں مبتلا
والا ہے اور اسی شوق کی خاطر امرا نشۂ فخر وغرور میں چور ہو کر اخلاق ذمیمہ میں گرفتار اور غربا اسراف کے ہاتھو
و برباد ہوتے ہیں اس لیے جہاں ایک مالدار کو نہایت معمولی اور حیثیت سے گرے ہوئے لباس سے منع فرما کر بخل
صفتِ مذموم سے روکا ہے اور فرمایا کہ انّ اللہ یحب ان یریٰ اثر نعمتہ علی عبدہ یعنی خدائے تعالیٰ کو یہ با
پسند ہے کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے پر نظر آئے وہاں غربا کو بھی پاکیزگی وصفائی کی طرف ان کی حیثیت سے
موافق توجہ دلائی چنانچہ ایک شخص کے بال منتشر دیکھے تو فرمایا کہ اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے بالوں کو درست کرے
اسی طرح ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا اس کو ایسی چیز نہیں ملتی جس سے کپڑے دھو ڈالے ان امور سے
شارع؈ کا مقصود تکلفاتِ بیجا اور اسراف سے بچانا تھا تاکہ مسلمانوں کی معاشرت کفایت شعاری کے ماتحت رہ کر افلا
و تباہی سے محفوظ رہے یہ ایک علیحدہ امر ہے کہ اسراف کے مدارج باہم مختلف ہیں ایک ہی شے جو امرا کے نزدیک بخل میں
داخل ہے وہ غربا کے لحاظ سے داخلِ اسراف ہوتی ہے اور اس بارہ میں مالی حالت کے مختلف مدارج میں اعتدال
رعایت ضروری ہے جس طرح یہ امر نامناسب تھا کہ امرا کی تشویق بیجا اسراف پر ختم ہو اسی طرح فقرا کی بے جا تقد
کو بھی ناجائز قرار دے کر خستگی و ملحق بالبہائم عادات کے ترک اور صفائی و پاکیزگی کی رغبت پر توجہ دلائی۔ غرض
کو افراط سے اور غربا کو تفریط سے علیحدہ فرما کر صفت اعتدال کو پسند فرمایا اور اس کے ساتھ ہی جہاں امرا کو اظ
نعمت کے واسطے اچھے لباس کی تاکید فرمائی وہاں اُس کے لوازمات فخر وغرور اور تذلیل فقرا کی عادت ر
سے کافی طور پر متنبہ فرما کر ایسے لباس ہی کو ناجائز قرار دے دیا "من لبس ثوب شہرۃ فی الدنیا البسہ اللہ ثوب
مذلۃ یوم القیٰمۃ جس نے شہرت کے لئے دنیا میں لباس پہنا قیامت کے دن خدائے تعالیٰ اس
ذلت کے کپڑے پہنائے گا" سے ثابت ہے کہ عمدہ کپڑے کا ترک مقصود نہیں بلکہ غربا کی تحقیر اور خیالاتِ تکبر کی
مطلوب ہے۔ اسی کے تحت میں آزار کا زیادہ نیچے کرنا ہے کیونکہ اس سے ستر اور زیبائش جو لباس کا مقصو
اصلی ہے مدنظر نہیں ہوتے بلکہ محض فخر و اظہار تونگری مطلوب ہوتا ہے۔ زیبائش اسی حد تک ہے کہ لباس جسم کی بر
ہو ایسے شخص کے لئے ارشاد ہے کہ لا ینظر اللہ یوم القیمۃ الی من جر ازارہ بطرا ۔ جو شخص اترانے کی
غرض سے اپنے ازار کو کھینچتا چلے قیامت کے دن خدائے تعالیٰ اس کی طرف نظر نہ فرمائیگا۔ اس کی تحدید اس طرح

فرمایا کہ ازار المومن الی انصاف ساقیہ لا جناح علیہ فیما بینہ وبین الکعبین وما
اسفل من ذلک ففی النار مومن کی ازار اس کی پنڈلیوں کے نصف تک ہوتی ہے اور نصف ساق اور ٹخنوں کے
درمیان بھی کوئی مضائقہ نہیں جو اس سے نیچے ہے وہ آگ میں ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہے کہ فخر وغرور باعث حرمت
ہے ورنہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اجازت تھی کیونکہ ان کی ازار کولھوں سے ڈھلک کر ٹخنوں کو اکثر چھپا لیتی تھی۔ مردوں
کے واسطے خالص ریشم کو بھی حرام فرمایا۔ کیونکہ سامان شہرت وغرور کے علاوہ اس کی باریکی۔ چمک اور غایت
نزاکت مردوں کے واسطے مناسب نہ تھی فرمایا کہ من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبس یوم القیمۃ
جس نے دنیا میں حریر پہن لیا وہ قیامت کے دن نہ پہنے گا۔ حضرت ابو درداءؓ نے حضرت علیؓ سے روایت کی
ہے کہ حضور نے داہنے ہاتھ میں سونا لیا اور بائیں میں حریر اور فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر
حرام ہیں۔ لیکن بقدر چار انگشت اجازت دیدی کیونکہ اس قدر استعمال پہننے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے
علاوہ جہاں شان وشوکت وغرور کا خیال نہ تھا وہاں ریشم کی بھی اجازت مرحمت فرمادی چنانچہ جنگ میں بالعموم
اجازت تھی اور حضرت زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بوجہ خارش خاص طور پر اجازت فرمائی تھی۔ رنگوں میں
مردوں کے سرخ رنگ والے کپڑے سے بھی نہی فرمائی ہے اور کسم کے رنگے ہوئے کپڑے اور زعفرانی سے بھی۔ فرمایا کہ
یہ عورتوں کا سا لباس ہے البتہ زرد اور سرخ دھاریوں والے کپڑے کو جائز فرمایا سرخ لباس ناپسند تھا ایک
مرتبہ عبداللہ بن عمرؓ سرخ لباس پہنکر آئے تو فرمایا کہ کیا لباس ہے۔ حضرت عبداللہ نے جاکر آگ میں ڈالدیا۔ آپ نے
سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا۔ عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ
کہتے ہیں یہ رنگنے کے کام آتی ہے یہ رنگ آپ کو نہایت ناپسند تھا۔ ایک مرتبہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی
تھیں آپ گھر میں آئے اور دیکھ کر واپس تشریف لے گئے حضرت زینبؓ سمجھ گئیں اور کپڑے دھو ڈالے۔ آپ دوبارہ
تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا۔ ایک دن ایک شخص سرخ لباس
پہنکر آیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔ ایک مرتبہ صحابہ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں
ڈال دی تھیں آپ نے فرمایا میں دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے۔ فوراً صحابہؓ نے نہایت پھرتی سے چادریں
اتار کر پھینکدیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو یمن کا عامل مقرر فرمایا وہ آپ سے ملنے کو اس شان سے آیا کہ

لباسِ فاخرہ زیب تن تھا اور بالوں میں خوب تیل پڑا ہوا تھا آپ ناراض ہوئے اور وہ لباس اتروا کر موٹا لباس پہنا یہی شخص دوسری مرتبہ آیا تو پریشان مو اور پھٹے پرانے کپڑے پہنکر۔ فرمایا کہ یہ بھی مقصود نہیں آدمی کو نہ پراگندہ چاہیئے نہ پٹیاں جمانے کی ضرورت ہے۔ جب آپ فتح بیت المقدس کے موقع پر روانہ ہوئے تو حسب ہدایت یزید بن ابی سفیان اور خالد بن ولید وغیرہم نے جابیہ میں استقبال کیا۔ شام میں رہ کر ان افسران میں عرب کی سادگی نہیں رہی تھی جب آپ کے روبرو یہ لوگ آئے تو اس حیثیت سے کہ بدن پر ریشمی حلے اور قبائیں تھیں۔ اور زرق برق پوشاکوں اور ظاہری شان و شوکت سے عجمی معلوم ہوتے تھے حضرت کو سخت غصہ آیا۔ گھوڑے سے اتر پڑے اور ان کی طرف سنگ ریزے پھینک کر فرمایا کہ تم نے اس قدر جلد عجمیوں کی عادات اختیار کر لیں اعرض کیا کہ قباؤں کے نیچے ہتیار ہیں۔ یعنی سپہ گری کا جوہر ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے فرمایا "تو کچھ مضائقہ نہیں" خلاصہ یہ کہ عمدہ لباس اظہار شکر ونعمتِ الہی اور شوکت علم و دین کے لیے جائز ہے بشرطیکہ رعونت و تکبر۔ شوکتِ نفس۔ دلشکنی فقرا اور اسراف سے خالی ہو۔ پاجامہ ٹخنوں سے نیچا نہو۔ لباس خالص ریشم کا نہو بجائے سرخ اور زرد کے دہا ریدار ہو تو بہتر ہے ۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا ملکی اور غیر ملکی لباس پہننا جائز ہے۔ کسی وضع خاص کی پابندی ضروری نہیں۔ جو لوگ اتباع سنت نبوی یا غلبۂ محبت کی وجہ سے عربی لباس پہنیں تو ثواب سے خالی نہیں۔ لیکن ملکی لباس بھی جو موانع شرعیہ سے پاک ہو کسی طرح ناجائز نہیں۔ ہندوستان کے جو بزرگ ترک اور افغانوں کے کوٹ پتلون اور ہیٹ پر معترض ہو کر اس کو شعار بے دینی قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں وہ اپنے انگرکھے کے چاک میں مونھ ڈالکر دیکھیں کہ جس لباس میں وہ مدعی دینداری ہیں وہ مشرکین کا لباس ہے اور جو شعار بے دینی ہو وہ اہل کتاب کا اس مسئلہ کو قدرے تفصیلی نظر سے ملاحظہ کیجیے۔

یوروپین لباس

سب سے پہلے آقائے نامدار کے لباس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حضور کا لباس خود بت پرستوں اور کفارِ عرب کا لباس تھا۔ ملکی ہونے کی وجہ سے حضور نے بھی وہی استعمال فرمایا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اگر حضور رسالت مآبؐ لندن یا جرمنی و ہندوستان میں پیدا ہوتے تو ان کا لباس بھی ویسا ہی ہوتا جیسا ان ممالک کا ہے اس کلیہ کے ماتحت اگر ہندوستانی مسلمانوں کو ملکی انگرکھا پہننا جائز ہے تو ترکوں کو کوٹ پتلون اور ہیٹ بدرجہ اولے جائز ہے۔ اس کے بعد افغانی یا ہندوستانی و مصری مسلمانوں کے کوٹ پتلون اور

بحث کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جس کا جواب سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ حضور نے رومن کیتھلک عیسائیوں۔ شامی یہودیوں اور آتش پرستوں کے غیر ملکی لباس زیب تن فرمائے ہیں حضرت عمرؓ نے عیسائی درویشوں کی ٹوپی اوڑھی ہے۔ سردارانِ اسلام کو عجمی لباس میں حضرت فاروقؓ نے دیکھا اور جنگی جوہر موجود ہونے کی وجہ سے اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ پھر بخاری کو دیکھا جاتا ہے تو کتاب اللباس میں ملتا ہے قول اللہ من حرم زینت اللہ التی اخرج لعبادہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلوا واشربوا والبسوا (الی ما طاب لکم) وتصدقوا فی غیر اسراف ولا مخیلۃ وقال ابن عباس کل ما شئت والبس ما شئت ما اخطائک اثنان سرف ومخیلۃ۔ ارشاد باری ہے کون ہے جس نے خدا کے بندوں کے لیے پیدا کی ہوئی زینت کو حرام کیا۔ حضور فرماتے ہیں۔ کھاؤ۔ پیو اور پہنو (جس طرح تم چاہو) اور خرچ کرو لیکن اسراف اور غرورسے بچو۔ ابن عباس کہتے ہیں جس طرح چاہو کھاؤ اور پہنو۔ صرف دو چیزیں یعنی اسراف اور تکبر برے ہیں۔ ہم ان روایتوں سے کسی قسم کی پوشاک پہننے سے ممنوع معلوم نہیں ہوتے۔ پھر جبکہ فی زمانہ تمدن کی ضروریات میں عبا و قبا پہنے ہوئے کوئی شخص نہ کسی مشین کے کارخانہ اور ریل وجہاز کے محکموں ہی میں کام کر سکتا ہے نہ فوجی خدمات ہی انجام دے سکتا ہے تو ایک مختصر اور چست لباس کوٹ اور پتلون کا پہننا کیونکر قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے جو تمام متمدن ممالک میں یکساں رائج اور کسی قسم کا آلۂ امتیاز نہیں سوائے ٹوپی کے کہ وہ ہر قوم نے اپنے اپنے ملک کے جغرافیائی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے امتیازی ذوق کے ساتھ اختیار کی ہے اور اس کے استعمال میں بظاہر کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ حدیث۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے جس کی صحت و عدم صحت کے مسئلہ کو نظرانداز کر کے باعتقادِ صحت کچھ عرض کرنا مناسب ہے۔ اگر تشابہ قوم صرف لباس میں ہے تو خود حضور اور مسلمانوں کا لباس بھی مشرکین عرب کا لباس تھا۔ پھر جبکہ حضور نے غیر ملکی مشرکین کا لباس بھی استعمال فرمایا تو تشابہ کے کیا معنے رہے یا اگر ہندوستانی یا افغانی نے ایرانی یا انگریزی و روسی لباس پہن کر اپنی ذات کو اس قوم کے مشابہ بنایا اور لوگوں نے بھی اس کو اسی قوم کا خیال کیا تو نتیجۂ شرعی کیا نکلا کیونکہ ظاہر ہے کوئی مسلمان مادہ

اقرار توحید و رسالت مشابہت لباس سے کافر نہیں ہو سکتا چنانچہ اکثر علما نے مشابہت سے مراد مشابہت خصوص
فی الدین لی ہے۔ مثلاً زنار پہننا۔ صلیب لٹکانا۔ ٹیکا لگانا یا اعیادِ کفار کو بطور عید خیال کرنا۔ یہ مشابہت ضرور
ہے۔ حدیث میں فھو منھم بھی ایک تنبیہی فقرہ ہے جس طرح من حلق فلیس منی اور من ترک الصلوۃ ف
کفر۔ یہ بات قابل تشریح نہیں کہ زمانہ موجودہ میں تمدنی و قومی ضروریات کے ماتحت لباس فرنگ کی کس قدر
ضرورت ہے اس لیئے شرعی موانع کے نہ ہونے کی حالت میں اگر کوئی فرد یا قوم استعمال کو مناسب
تو ایک قسم کی خوبی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ مذہب کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر اہل مذہب اپنے مذہب کے سوا
دوسرے کے مذہب کو گمراہی خیال کرتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر مذہب والے کی دنیوی باتیں
بُری قرار دی جائیں۔ یا جو امور اپنے حق میں بھی مفید ہوں وہ محض کفار کے اختیار کرنے کی وجہ سے ترک کر
جائیں۔ اگر ایسا ہے تو سلطنت۔ طریق جنگ۔ جدید آلاتِ حرب سب سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ درحقیقت ایک دانا
کا کام یہی ہے کہ جہاں سے کوئی عمدہ بات ہاتھ لگے اختیار کرے خواہ وہ کسی کا قول یا فعل ہو اور اس کو مسلمان
گم شدہ حکمت سمجھے۔ اور انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال پر عمل کرے خود حضور نے جنگ احزاب
کے موقع پر ایرانیوں کے طریق جنگ خندق سے فائدہ اُٹھایا ہمارے متقدمین نے غیر ملت کے لوگوں سے
منطق کو مفید سمجھکر اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کے رواج کو اس قدر ضروری سمجھا کہ حضرت امام غزالیؒ نے
منطق کو علم کی پختگی کا آلہ قرار دے دیا۔ کتاب سنن المھتدین میں شیخ المراق المالکی نے صاف لکھا ہے کہ غیر
کے ساتھ جن باتوں میں مشابہت ممنوع ہے وہ صرف وہی باتیں ہیں جو ہماری شریعت کے برخلاف ہیں
حاشیۂ دُرمختار میں علامہ شیخ محمد بن عابدین الحنفی نے تو یہاں تک تصریح کر دی کہ جن باتوں میں خلق خدا
بہتری اور ترقی ہو اگر ان کے کرنے میں ہم کسی غیر ملت قوم کے ساتھ مشابہ بھی ہو جائیں تو کچھ خرابی نہیں ہے
تعجب ہے کہ وضعِ لباس پر تشابہ اہل فرنگ کا اعتراض ہو اور خود کپڑا اور گھر کا تمام سامان اہل فرنگ ہی سے
خریدیں اور انہی کے ہاتھ کا بنا ہوا استعمال کریں۔ کیا ترقی کے قومی حل کی یہی صورت ہے جواز کی دوسری صورت
یہ بھی ہے کہ وہ شے رائج عام ہو کر خصوصیت کو مٹا دے۔ جب کہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کی ٹوپی کو اس لیے استعمال

فرمایا کہ مدینہ میں اس کا رواج عام ہوگیا تھا۔ اسی طرح حضرت امام ابوحنیفہؒ نے سیاہ کپڑے کو ناجائز قرار دیا کیونکہ ان کے زمانہ میں معیوب تھا لیکن صاحبین کے زمانہ میں رائج ہوگیا تھا اس لیئے انہوں نے جائز کر دیا۔ اب کوٹ پتلون کے رواجِ عام کو بھی دیکھ لیجئے کہ وہ کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہ رہا ہیٹ کی وضع بھی ہر قوم کی علیٰحدہ ہے اور وہ بھی عام ہے۔ اگر کوئی شخص فخر و غرور کا لباس سمجھے تو وہ کپڑے کے اعلیٰ و ادنےٰ ہونے پر موقوف ہونے کے علاوہ ہر وضع کے لباس میں یکساں صورت رکھتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسئلہ وضع لباس میرے نزدیک مسئلہ شرعی نہیں ہر شخص اپنی پسند و مصلحت کے مطابق جو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ حضرت سعدیؒ نے بھی اس کا معقول فیصلہ کر دیا ہے

حاجت بہ کلاہِ برکی داشتنت نیست

درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار

محمد علیخاں۔ اثرؔ

(رامپوری)

رباعیات

خاموشی کی داستاں سنانے والے
اے طور پہ بجلیاں گرانے والے
دل دیکھتا ہے جگر نوازی تیری
اے بندہ بنا کے بھول جانے والے

دل مائلِ التجا نہیں ہو سکتا
یہ نقشِ وفا، فنا نہیں ہو سکتا
تو مجھسے جدا ہوا یہ قسمت میری
میں تجھ سے جدا نہیں ہو سکتا

صد شکر کہ پہلو میں مرے دل نہ رہا
وہ کشتۂ صد فریب منزل نہ رہا
یہ کیا کم ہے کہ تیرا بندہ ہے جگر
اس کا کیا غم کہ تیرے قابل نہ رہا

جگر مرادآبادی

غزل

نیش ہر جا کہ بدیدم، برگِ جاں کردم
عشق بُد منزلِ نارفتہ بپایاں کردم

ہمتم بیں کہ بایں تاختِ تیغہائے بتاں
کسبِ صد فیض ازیں کعبۂ ویراں کردم

ایں ہمہ از اثرِ جذب و فنائم بودست
بلبلاں را کہ نوا سنجِ گلستاں کردم

دلِ من معتقدِ خرقۂ سالوس بنود
بُردم او را بہ برِ شیخ و مسلماں کردم

رندی و مستی بہ پیرانہ سری ورزیدم
حیف! کاں عہدِ جوانی ہمہ نقصاں کردم

طاعتم از سرِ اخلاص بود؟ نتواں گفت
طوفِ بتخانہ مگر از سرِ ایماں کردم

ملتِ کہنۂ زہّاد بکارم افتاد
بکنم منع ازاں شیوہ کہ پنہاں کردم

سلفِ از دولتِ قرآں رسید بجائے
من ہماں صرفۂ تکفیرِ مسلماں کردم

من از و گشتم و او گشت زما، باید دید
طرحِ آغازِ محبت بچہ عنواں کردم

او بہ حیرانئ ما خیلے تعجب میکرد
پیشِ او آئنہ بنہادم و حیراں کردم

کیفِ چشمش بدل و حلقۂ گیسوش بدوش
من جنوں کردم و الحق کہ بساماں کردم

خود فراموشی و دلسوزی و ہمت طلبی
ہرچہ کردم ہمہ از صحبتِ رنداں کردم

نایدم شرم کہ خود ماں، نہ مسلماں گشتم
دیگراں را مگر اے ولے، مسلماں کردم

یافتم در لبِ لعلِ تو حیاتِ جاوید
من بکوہے، طلبِ چشمۂ حیواں کردم

ہیچ ناید بنظر محرمِ اسرار مرا
از جنوں نیست کہ من عزمِ بیاباں کردم

می سزد، شیخ اگر از رہِ تمکیں میگفت
ایں ریا کالبدے بود منش جاں کردم

در جنوں خلوت و سودائے تو خوش جاں افزاست
از ہمیں رشکِ ارم کلبۂ احزاں کردم

دل و جاں باختم و طاعت و دیں بسپردم
حبذا ماہر ہم ایں کردم و ہم آں کردم

سید عبدالمجید

سنہری بال

(جملہ حقوق محفوظ)

کسی سرائے میں پانچ سات مسافر بیٹھے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ برفانی ہواؤں سے ہاتھ پاؤں
ل ہو رہے تھے۔ جس کمرے میں یہ جہانیان جہاں گشت فروکش تھے اس کے دروازے اور روشندان سب
د تھے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ سماوار گرم تھا۔ قہوہ کا دور چل رہا تھا لیکن سردی کا یہ عالم تھا
سب اپنی اپنی پوستینوں میں سکڑے جاتے تھے

ایک مسافر جو نوعمر تھا کوئی قصہ کہہ رہا تھا۔ باقی ماندہ ٹانگوں پر ٹانگیں رکھے قہوہ کی پیالیاں ہاتھوں
ں لیے بڑے مزے سے داستان سن رہے تھے۔ جب یہ نوجوان کہہ چکا تو بولا:-

"لو صاحبو یہ قصہ تو ختم ہوا۔ اب آپ میں سے کوئی صاحب کچھ کہیں"

یک مسافر "ہاں رات تو یوں ہی کٹے گی۔ ورنہ اس جاڑے میں نیند کہاں"

وسرا مسافر "(اپنے ساتھ کے سپید ریش آدمی کی طرف دیکھکر) "آپ کچھ فرمائیں"

یہ سپید ریش مسافر جو اس پیری میں خاصہ مضبوط آدمی معلوم ہوتا تھا ایک ہاتھ میں پیالی پکڑے دوسرا
پوستین میں ڈالے خاموش بیٹھا تھا بولا:-

"کیا عرض کروں؟ آپ بیتی کہوں یا جگ بیتی"

پہلا مسافر "جگ بیتی کیا سنیں گے۔ کچھ اپنی کہئے"

بوڑھا "میری سنتے ہو۔ میں اسی ترکستان کا باشندہ ہوں۔ کبھی گھر والا تھا۔ آج بے گھر ہوں...... بے وطن"

ایک مسافر۔ یہ فلکِ ناہنجار کب چین سے بیٹھنے دیتا ہے۔ زمانہ کب کسی کا ساتھ دیتا ہے"

بوڑھا۔ فلک کو کیوں کوستے ہو۔ یہ چکّی تو یونہی چلا کریگی۔ قسمت کی شکایت اور فلک سے شکوہ۔ سب عبث ہے۔
انسان اپنے مصائب کا آپ ہی ذمہ دار ہے

جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

کواڑوں کے بار بار ہلنے سے معلوم ہوتا تھا کہ جھکڑ چل رہا ہے۔ بوڑھا ایک دو بار کھانس کر بولا:۔

"میں آپ لوگوں کو اپنی سرگذشت سنا کر بے مزہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اپنی زندگی کا ایک طرفہ تر واقعہ عرض کرتا ہوں۔"
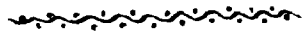
"میں عمر کی ساٹھ کڑی منزلیں طے کر چکا ہوں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ فوجی ملازمت میں بسر ہوا ہے اُن دنوں میں چالیس سال کا تھا اور رسالہ میں ایک افسر تھا...... اب میں پیرانہ سال ہوں۔ اس وقت لوگ مجھے ڈرپوک۔ بزدل یا وہی جو کچھ چاہیں سمجھیں۔ لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میدانِ کارزار میں گولے گولیوں کے دھماکوں اور تلواروں کی جھنکار سے میرا خون اُبلنے لگتا تھا۔ اور دشمنوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے لیے تلوار نیام میں سے تڑپ تڑپ کر باہر نکلتی تھی۔ لیکن اس وقت جو واقعہ میں عرض کیا چاہتا ہوں اِس کے تو خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔

جن دنوں کا یہ واقعہ ہے اُس وقت میرا رسالہ سرحد کی ایک دور افتادہ چھاونی میں متعین تھا۔ یہ فوجی مقام روس اور ایران کی سرحد پر واقع تھا۔ کچھ عرصہ سے قزّاقوں نے تمام راستوں میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ اور آس پاس کے رہنے والوں کو زندگی دوبھر ہو گئی تھی۔

ہماری چھاونی کے قریب ہی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ لیکن بہت بارونق جگہ تھی وہاں چند قہوہ خانے اور ایک دو ہوٹل بھی تھے۔ علاقہ کوہستانی تھا۔ انگور بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ اور پھل پھلواری بھی مل جاتی تھی میں نے ایک ہوٹل میں فرصت کا وقت کاٹنے کے لیے ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔"
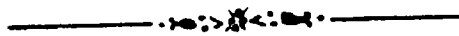
"ایک روز بامِ فلک پر جب کہ نیلے نیلے بادلوں میں ستارے ڈوبے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں ایک قہوہ خانہ میں بیٹھا ایک ایرانی طائفہ کا ناچ دیکھ رہا تھا۔ یوں تو پانچ سات آدمی اور بھی موجود تھے۔ لیکن ان میں میرا کوئی شناسا نہ تھا۔ ہم لوگ چوکیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں طائفہ کے لئے جگہ چھوڑ رکھی

تھی ۔کوئی گیارہ بارہ برس کی دو خوبصورت لڑکیاں تھیں ۔ان کی کمر میں سرخ رنگ کے پٹکے بندھے تھے پٹکوں کے دونوں سرے لڑکیوں کے گھٹنوں تک لٹکتے تھے ۔ اسی طرح شانوں کے اوپر مختلف رنگوں کے خوبصورت فیتے جو آستینوں پر آکر گرتے تھے بندھے ہوئے تھے ۔ ہلکے سیاہ رنگ کے بال شانوں پر پریشان ہو رہے تھے ۔ لیکن پیشانی مختلف رنگوں کے پھولوں سے مزین تھی ۔نصف آستین اور چاکِ گریبان گورے بدن کی عریانی کر رہا تھا ۔یہ دونوں لڑکیاں ہاتھوں میں ڈفلی پکڑے ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں ۔گھٹنوں کے گرد ا ردبیتں کے چھوٹے چھوٹے گھونگرو بندھے ہوئے تھے ۔

رقص کا انداز یہ تھا ۔ دونوں پہلے اپنا دایاں پاؤں اُٹھاتیں ۔اور پھر ہاتھوں کو آگے بڑھا کر اور ایک خاص انداز سے جھک کر بطِ آبی کی طرح دھیرے دھیرے پاؤں فرش پر رکھتی ہوئی مستانہ وار رقص کرتی ہوئیں ایک دوسری کی طرف بڑھتیں اور گاہے گاہے پاؤں کو کچھ انداز سے لرزش دیتیں کہ گھونگروں کی جھنکار سے ایک دلفریب آواز پیدا ہونے لگتی اور جب ایک دوسری کے پاس پہنچ جاتیں تو ڈفلی پر ہاتھ مار کر تن کر کھڑی ہو جاتیں اور پھر سینہ اُبھار کر صراحی دار گردنوں کو ادھر اُدھر ہلا ہلا کر رم جھم کرتیں پیچھے ہٹنے لگتیں اور اس انداز سے رقص کرتی ہوئی ایک دوسری کے گرد گھومتیں ۔ رقص کے انداز سے دونوں موسم بہار کی تیتریاں معلوم ہوتی تھیں ۔ڈھولک اور طنبورہ کی گت پر جو دو بھاری بھرکم آدمی ایک طرف ادب سے بیٹھے بجا رہے تھے ہم آہنگ ہو کر بڑی سریلی آواز سے فارسی اشعار بھی پڑھتیں ؎

ایں رقصِ مہ خوباں	ایں شیشہ و پیمانہ
ایں عشرتِ بے پایاں	ایں رونقِ میخانہ
قربانِ نگاہت را	اے رہزنِ عقل و دیں
دل بُرد بہ یک افسوں	اے نرگسِ مستانہ
سرمستم و مدہوشم	گم کردۂ منزل ام
دل رفت بہ دلدارم	جاں رفت بہ جانانہ

فوجی لوگوں کے لیے اس قسم کے کھیل تماشے اپنے اندر ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اگر سچ پوچھ
قہوہ خانوں کی رونق بھی ان دور دراز مقامات میں انہی لوگوں کے دم سے ہے جہاں ڈھولک اور طنبورہ
آواز آئی بے فکرے پروانوں کی طرح جھوم جھوم کر گرنے لگے۔

محفل میں روسی۔ ایرانی۔ ترکی اور ترکستانی سبھی قسم کے آدمی موجود تھے۔ جو لوگ یہ اشعار خود نہ
سمجھ سکتے تھے وہ دوسروں کو سر ہلاتے دیکھکر خود بھی سر ہلانے لگتے۔ جب ایک کے منہ سے صدائے آفرین
تو پھر واہ واہ کا شور مختلف زبانوں میں ایک ہی وقت میں بلند ہو کر ایک طوفانِ بے تمیزی برپا کر دیتا۔ او
معلوم ہوتا گویا کوے کائیں کائیں کر رہے ہیں۔
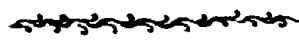
اچانک ایک طویل قامت نوجوان اندر آیا۔ اور سب سے پہلے جو جگہ خالی نظر آئی وہاں بیٹھ گیا۔ وہ با
میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں ضرور دیکھا ہے۔ نو وارد نے ایک بار میر
طرف غور سے دیکھا۔ لیکن ایک بار دیکھ چکنے کے بعد اب وہ بار بار دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھا اور طائف
انعام دیکر کمرے سے باہر آیا۔ ابھی میں نے بازار میں قدم رکھا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے شانہ پر ہاتھ
پلٹ کر جو دیکھتا ہوں تو وہی نوجوان ہے۔ اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے مخاطب کرکے کہا

"آخر پندرہ برس بعد میں نے تم کو پا ہی لیا!"

میں نے اس کی آواز سے اسے پہچان لیا یہ طارق تھا۔ اور اسی گرد و نواح کا رہنے والا تھا۔ میں
ہنسکر کہا۔

"طارق! تم کہاں؟ میں تو سمجھتا تھا کہ حکومت نے تمہیں کہیں جلا وطن کر دیا ہوگا!"

طارق بولا۔

"قسمت، میرے دوست قسمت!"

طارق میرا بچپن کا دوست تھا۔ بڑا زندہ دل اور با مذاق آدمی تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد میں فوج میں بھ
ہو گیا اور طارق کاروبار کرنے لگا۔ اس کے بعد خدا جانے میں کہاں کہاں اپنے رسالے کے ساتھ گیا۔ آج پور

پندرہ برس کے بعد میں نے پھر ایک بار اپنے دوست کو دیکھا لیکن اس وقت کا طارق اُس طارق سے بالکل جدا تھا جس کی طبیعت میں قدرت نے ظرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ آج ظرافت کی بجائے اس کی باتوں سے آزردگی اور غم مترشح ہو رہا تھا۔

"تم یہاں کہاں"؟ طارق نے حیران ہو کر پوچھا

"ہمارا رسالہ کچھ دنوں سے یہاں آیا ہوا ہے"! میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "آؤ ہوٹل میں چل کر باتیں کریں گے۔ میں نے ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے"!

ہوٹل پہنچکر میں نے کھانا منگوایا۔

"طارق! میں تم میں بڑا تغیر پاتا ہوں"؟ میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کہو بیوی بچے کیسے ہیں؟"

"بیوی بچے"! اُس نے میری طرف ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اور پھر زانو پر ہاتھ مار کر بولا

"بیوی بچوں کا حال پوچھتے ہو تم؟۔ نہ گھر نہ گھاٹ"!

"تو کیا اب تک شادی کی ہی نہیں؟"

"کی تو تھی۔ لیکن ۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟۔ کچھ میں بھی تو سنوں"

"کیا سنو گے تم" طارق ایک آہ بھر کر بولا

"رگ رگ میں نیشِ غم ہے کہئے کہاں کہاں کی"

کمرے کے مغربی کونے میں تانبے کا ایک شمعدان رکھا تھا۔ اس میں کئی بتیاں جل رہی تھیں۔ اُن کی جھلملاتی ہوئی روشنی طارق کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اُس کے چہرے سے افسردگی نمایاں تھی۔ اس کے ہونٹ حرکت کرتے تھے۔ لیکن زبان پر مہرِ سکوت ثبت تھی۔

"تم بہت پریشان خاطر معلوم ہوتے ہو" میں نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"پریشان؟۔ خانہ برباد کہو"

"طارق!" میں نے اس کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا: "یہ کیا معمہ ہے؟"
"معمہ؟ معمہ نہیں۔ بلکہ قسمت"
"لیکن کچھ میں بھی تو سنوں میں اجنبی تو ہوں نہیں جو مجھ سے پردہ داری کی ضرورت ہو"
"کافر ہو جو تمہیں اجنبی سمجھتا ہو"
"تو پھر پردہ داری کیسی؟"
"کوئی بات ہو تو کہوں بھی" طارق کچھ مسکرا کر بولا۔ لیکن میں جانتا تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ اس مسکرا
میں بھی ہزاروں حسرتیں مضمر تھیں۔ میں بھی ظاہرداری کے طور پر مسکرا کر بولا۔
ع "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"
"کہہ تو چکا نہ گھر نہ گھاٹ"
"میں ان استعاروں کو کیا سمجھوں۔ ایک اجڈ سیا ہی ہوں"
"ارے یار! کیسے استعارے" طارق شمعدان کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
"میں ایک سیاہ بخت ہوں .... میں نے ایک ایسی عورت سے شادی کی جو حسن وجمال
اس دیار میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ بس لالۂ صحرا سمجھو۔ وہ شمع تھی اور میں پروانہ۔ لیکن راحت اور مسرت کا
ہوا کے ایک جھونکے کی طرح گذر گیا.... صرف ایک سال...... سنتے ہو یا سوتے ہو؟"
میں آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے یہ داستان سن رہا تھا۔ طارق کی طرف دیکھکر بولا
"نہیں نہیں میں سوتا نہیں سنتا ہوں۔ کہے جاؤ"
"تو ہاں پورے ایک سال کے بعد میں نے اسے لحد میں سلا دیا۔ صنوبر کے سایہ دار پیڑوں کے
الفت اور محبت کی دیوی کو میں نے ان منحوس ہاتھوں سے فرشِ خاک پر لٹا دیا....... آہ قسمت
... جنازے کے وقت بہت سے لوگ موجود تھے۔ لیکن ان کے رخصت ہوتے ہی میں اکیلا رہ گیا۔ وہ گھر
تھوڑی دیر پہلے میری تمناؤں اور آرزوؤں کا گہوارہ تھا چرخ نیلی فام کی ایک گردش سے ایک خوفناک
کی طرح بھیانک نظر آنے لگا۔ اس گھر کی ہر چیز اب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی..... میں دیوانہ

کمروں میں گھومنے لگا۔ لیکن افسوس جس کی مجھے جستجو تھی وہ وہاں موجود نہ تھی۔ اور وہ موجود ہوتی بھی کیسے؟ . . .
. . . میں نے خود تو اسے قبر کی تاریکی اور تنہائی میں سلا دیا تھا۔ شام سے پیشتر میں اس گھر سے نکلا . . . نکلا نہیں بلکہ بھاگا۔ اور آجتک واپس نہیں گیا . . . . . . اور شاید عمر بھر واپس نہ جاؤں "۔
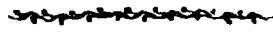
سامنے کے دروازے سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ سب بتیاں گل ہو گئیں۔

" خدا کے لئے روشنی کرو "۔ طارق بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے دیا سلائی جلا کر بتیاں جلا دیں۔ جب کمرے میں روشنی ہوئی تو طارق پھر بولا۔

" میرے احباب تو شاید مجھے مردہ سمجھکر رو چکے ہونگے . . . . . . افسوس نہ گھر نہ گھاٹ۔

" نہ مونس نہ غمخوار "

میں ہمدردی کے طور پر بولا۔

" بیچاری بیمار رہی ہو گی "۔

" تمہیں میرے سر کی قسم ہے اب اس کے متعلق مزید گفتگو نہ کیجیو . . . . ہاں اگر ایک کام کر دو تو تادمِ زیست ممنونِ منّت رہوں گا "۔

" بسر و چشم "۔

" جس گاؤں میں میرا مکان ہے۔ یہاں سے کوئی آٹھ سات میل ہو گا۔ مکان سڑک کے کنارے پر ہی ہے۔ میں تم کو ایک خط لکھ دوں گا۔ چوکیدار دروازہ کھول دیگا۔ سیڑھیاں چڑھکر دوسری منزل پر داہنی جانب کا پہلا کمرہ ہے جو کبھی میرا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں تین کھڑکیوں والی دیوار کے پاس آبنوس کی ایک خوبصورت میز رکھی ہے۔ اس میز کے داہنی جانب کے پہلے دراز میں بہت سے کاغذ پڑے ہونگے۔ ان کاغذوں میں خطوں کے تین بنڈل ایسے ہیں جو سرخ دھاگے سے بندھے ہوئے ہونگے۔ اگر یہ تینوں بنڈل مجھے مل جائیں تو انشاء اللہ تمام عمر تمہارا . . . . . . "

" تو لاؤ خط لکھ دو نا " میں بات کاٹ کر بولا۔

"لیکن کمرے میں اندھیرا ہوگا" طارق جیسے اپنے آپ سے کوئی باتیں کرتا ہو کہنے لگا۔

"کچھ وحشت سی برستی ہوگی۔ کھڑکیاں بھی ایک مدت سے بند پڑی ہیں۔ نیلے رنگ کے پردے دروازوں کے آگے آویزاں ہونگے..... لیکن تم تو ایک سپاہی ہو"

"تو اٹھو خط لکھدو نا..... طارق اب سوچتے کیا ہو"

"ایک بات کہوں" میری طرف حجاب آمیز نگاہوں سے دیکھکر "بشرطیکہ تم برا نہ مانو"

"میں برا کیوں ماننے لگا۔ کہدو"

"مجھے امید ہے کہ تم یہ خطوط کھول کر نہ دیکھوگے۔ کل میرا آدمی تمہیں خط پہنچا دیگا۔ لو اب خدا حافظ"

اگلے روز صبح صبح طارق کا خادم مجھے ایک سربہ مُہر لفافہ دے گیا۔

اُس دن کی میں نے اپنے کمان افسر سے رخصت لے لی۔ اور دس گیارہ بجے کے قریب اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر طارق کے مکان کی طرف چلدیا۔ سڑک جنگل کے بیچوں بیچ جاتی تھی۔ لیکن اب کوئی خطرہ نہ تھا بہت سے قزاق گرفتار ہوکر کیفر کردار کو پہنچ چکے تھے مشتبہ آدمیوں کی ایک بہت بڑی تعداد زنداں میں تھی۔ گردو نواح کے دیہات میں فوجی چوکیاں قائم کردی گئی تھیں۔

طارق کا مکان سڑک سے بیس پچیس گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ سنگِ سرخ کی ایک خوبصورت عمارت تھی جو چاروں طرف سے ایک قدآدم پتھر کی دیوار سے محیط تھی۔ چاردیواری کا آہنی پھاٹک بند تھا۔ میرے بار بار آواز دینے پر ایک بوڑھا چوکیدار جریب ٹیکتا ہوا آیا۔ اور دروازے کی سلاخوں کے ساتھ کھڑے ہوکر میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اور ناک بھوں چڑھا کر بولا۔

"تم اتنا شور وغل کیوں کررہے تھے۔ اب تو یہ نواح قزاقوں سے محفوظ ہے۔ تمہیں کون لوٹ رہا تھا"

میں نے جیب سے طارق کا خط نکال کر چوکیدار کو دکھلایا اور کہا۔

"دیکھتے ہو۔ یہ تمہارے آقا کا خط ہے۔ دروازہ جلدی کھولو"

"کیا کہا" چوکیدار حیران ہوکر بولا۔ "طارق کا خط ہے" اور پھر سلاخوں سے اپنا مرجھایا ہوا ہاتھ باہر نکال کر

"تو لائیے دیدیجئے"

"تم پہلے پھاٹک تو کھولو۔ پھر خط بھی لے لینا"

"ہاں ہاں کھولتا ہوں"۔ بوڑھے چوکیدار نے چابیوں کا ایک گچھا جو اس کے سرخ رنگ کے کمر بند میں ایک زنگ آلود زنجیر کے ساتھ لٹک رہا تھا دکھلا کر کہا۔

"میں پہلے خط تو دیکھ لوں"

بڑبڑاہٹ کا پتّا معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر ابر چھا رہے تھے۔ مجھے شام سے پہلے واپس بھی جانا تھا۔ میں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر چوکیدار کو خط دیدیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا۔ اور آنکھوں کے قریب کر کے بغور پڑھنے لگا۔ اور پھر حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"اب پھاٹک کھولو گے بھی۔ یا یونہی بُت کی طرح دیکھتے رہو گے"، میں نے ذرا کرخت آواز سے کہا۔ دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔ . . . سنتے ہو"

"ہاں ہاں سنتا ہوں" اس نے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی منتخب کر کے آہنی سلاخوں والا پھاٹک کھولدیا۔ احاطہ میں داخل ہو کر میں نے گھوڑے کو درخت کی ایک شاخ سے باندھ دیا۔ اور پھر چوکیدار سے کہا۔

"مجھے اوپر جانے کی سیڑھیاں دکھلا دو"

"تو کیا آپ اوپر بھی جائیں گے؟"

"اور خط میں پھر لکھا کیا ہے؟۔ چلو سیڑھیاں دکھلاؤ"

"آپ طارق کا کمرہ دیکھیں گے؟ . . . . . لیکن وہ تو ایک مدت سے بند پڑا ہے"

"ہاں ہاں یہ مجھے بھی معلوم ہے کہ ایک مدت سے خالی پڑا ہے"

"خالی پڑا ہے؟" بوڑھا چوکیدار میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

"خالی ہے بھی . . . . اور نہیں بھی"

"یہ تم نے کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ دیکھتے نہیں بارش کے سامان ہو رہے ہیں اور مجھے بہت دور

واپس جانا ہے"

"ایک بات پوچھوں؟ آپ بُرا تو نہ مانیں گے؟" چوکیدار اچانک میرے شانہ پر ہاتھ رکھکر بولا۔
"طارق ہیں کہاں؟ کبھی ادہر کا رخ بھی کریں گے؟"

"میں کیا جانوں۔ خط میں سب کچھ لکھا ہو گا۔۔۔۔ اچھا اب راستہ بھی دکھلاؤ گے؟"
چوکیدار:" اس کا تو انھوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔۔۔ لیکن آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا کمرہ کب سے بند پڑا ہے؟"
میں:" مجھے صرف اسقدر معلوم ہے کہ تم ایک باتونی آدمی ہو"
چوکیدار:" اوہو آپ تو ناراض ہونے لگے۔۔۔۔ طارق میری گود میں کھیل کر جوان ہوئے ہیں۔ خیر آئیے میں راستہ دکھلائے دیتا ہوں"

اور پھر آپ ہی آپ

"خالی ہے بھی اور نہیں بھی۔۔۔۔ خود ہی دیکھ لیں گے۔۔۔ مجھے کیا"

بوڑھا مجھے نیچے کی منزل کے ایک کمرہ میں لے گیا۔ یہاں سے خاصی کشادہ چوبی سیڑھیاں اوپر کی منزل کو جاتی تھیں۔ سیڑھیاں تعداد میں نو یا دس ہونگی۔ ان پر ہلکے رنگ کی بانات پڑی ہوئی تھی۔ لیکن گرد و غبار سے اس قدر اَٹی پڑی تھیں کہ بانات کا اصلی رنگ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

آخری سیڑھی پر پہنچکر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بوڑھا چوکیدار ابھی تک اسی جگہ کھڑا تھا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب دیکھ رہا تھا۔ داہنی جانب میرے سامنے طارق کا کمرہ تھا۔ میں اس کمرے کے دروازے پر جاکر کھڑا ہو گیا۔

دروازوں کے پٹ اور قبضے زنگ آلود تھے۔ میں نے ڈھکیل کر دروازہ کھولا۔ اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر دھندلی سی روشنی تھی۔ روشندان اور کھڑکیاں سب بند تھیں۔ مغرب کی جانب ایک اور بغلی کمرہ تھا۔ اس کا ایک کواڑ صرف اس قدر کھلا تھا کہ اس میں سے ایک آدمی بمشکل گذر سکے۔

میں نے ہر چند چاہا کہ ایک آدھ کھڑکی یا روشندان کھولدوں۔ لیکن یہ اپنی جگہ پر اس سختی سے جمے ہوئے تھے

ن کا کھولنا آسان کام نہ تھا طارق کے کمرے میں دیوار کے پاس ایک خوبصورت پلنگ بھی بچھا ہوا تھا۔ بستر جو بہت
معلوم ہوتا تھا گرد و غبار سے بالکل خراب ہو رہا تھا۔ ایک سپید رنگ کا بہت اعلیٰ قسم کا کمبل تھا جو آدھا تو
پر پڑا تھا اور آدھا نیچے لٹک رہا تھا پلنگ کے پاس صرف ایک ہی مردانہ جوتا پڑا تھا۔ دوسرا جوتا کہیں
د نہ تھا۔

سرہانے کی جانب ایک خوبصورت ہشت پہلو میز رکھی تھی۔ اس میز کے پاس ہی ایک گلاس اور ایک
ی کنٹر گرا پڑا تھا۔

دیواروں پر نہایت خوبصورت اور دل آویز تصاویر آویزاں تھیں۔ اکثر قدرتی مناظر کی تصویریں تھیں۔
یوں کے پاس ہی وہ میز رکھی تھی جس میں طارق کے خطوط وغیرہ تھے۔ کھڑکیوں کے اوپر دیوار پر چاندی
ایک نہایت خوبصورت فریم میں ایک نوجوان عورت کی تصویر تھی۔ دوستو! میں نے بھی ملک ملک کی سیر
ہے لیکن سچ جانیئے ایسی حسین عورت میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ غالباً یہی طارق کی بیوی ہوگی۔
جس دروازے سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا اس کے پاس ہی مخمل کے گدیلوں والی دو کرسیاں اُلٹی
ی تھیں۔ ان تمام چیزوں کے اس طرح بے ترتیب پڑے ہونے سے گمان ہوتا تھا کہ کوئی شخص سراسیمگی
حالت میں یہاں سے نکل بھاگا ہوگا۔ اس کمرے کا تمام سامان بہت قیمتی تھا۔

میں ایک کرسی کھینچ کر میز کے قریب بیٹھ گیا اور داہنی جانب کا پہلا دراز کھولا۔ اور سرخ دھاگے والے
لاش کرنے لگا۔ دراز کاغذوں سے اَٹی پڑی تھی میں دو دو چار چار کاغذ یا خط نکال کر باہر رکھتا جاتا
س بیس خطوط اوپر سے اٹھا لینے کے بعد مجھے سرخ دھاگے والے خطوں کا ایک بنڈل مل گیا۔ یہ میں نے
ب میں ڈال لیا اور پھر باقی دو کی تلاش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے اپنی پشت کی جانب سے کچھ "فرو فرو" کی
ت سی آواز جو ریشمی لباس پہن کر چلنے سے پیدا ہوا کرتی ہے سنائی دی لیکن میں نے کچھ توجہ نہ کی۔ تھوڑی سی جستجو
عد مجھے ایک اور سرخ دھاگے والا بنڈل مل گیا۔ اس وقت پھر ایک بار وہی پہلی سی آواز سنائی دی میرا
ل ہے کہ اب کے یہ پہلے سے کچھ زیادہ نمایاں تھی۔ کمرے کی دھندلی فضا اور تنہائی کے باعث میرے دل میں

کچھ وحشت سی تو ضرور پیدا ہوئی۔ لیکن میں اپنے وہم پر مسکراتا ہوا تیسرا بنڈل تلاش کرنے لگا۔ تیسرا بنڈل مجھے زیادہ جستجو کئے بغیر ہی مل گیا۔ لیکن میں نے اس دراز میں سے نکالا ہی تھا کہ اچانک مجھے پشت کی جانب گرد کے پاس کسی متنفس کے گرم گرم سانس کا ہلکا سا احساس ہوا۔ میں تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ گھوم کر جو دیکھا تو نہایت حسین عورت میری کرسی کی پشت پر دو نازک ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

میں اس کے حسن کی رعنائی دیکھکر مبہوت سا ہو گیا۔ دوستو! میں اس کے حسن اور سج دھج کی تصویر میں نہیں کھینچ سکتا۔ بس سمجھ لیجئے کہ وہ موتی کی طرح خوبصورت تھی گلاب کی طرح شگفتہ تھی اور راج ہنس کی طرح بانکی۔ وہ قوس قزح کے رنگ کا ایک نہایت خوشنما لباس پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں جواہر نگار آویزے اور مروارید کی ایک بہت خوبصورت مالا زیبِ گلو تھی۔ سر کے بال سونے کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چشم آہو کی طرح مست تھیں اور ہیرے کی کنی کی طرح درخشاں۔ حسنِ قدرت کا یہ نادر نمونہ خاموش کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا اور ایک ایسے پھول کی طرح نظر آتا تھا جسے خزاں کے گرم نفس نے ابھی ابھی چھوا ہو اور میری یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں تعجب اور کسی قدر خوف سے اس پیکرِ نور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ کچھ میری بھی مدد کریں گے؟" یہ الفاظ اس حسینہ کے منہ سے آہستہ آہستہ نکلے۔ اندازِ تکلم بہت یاس انگیز تھا۔

لیکن یہاں تو زبان سوکھ کر حلق میں کانٹا ہو رہی تھی۔ جواب کون دیتا۔

وہ پھر بولی

"آپ خاموش کیوں ہیں ..... میں تو ایک بدنصیب عورت ہوں۔"

اپنے جیسے ایک انسان کو جسم اور پوست میں اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اور دوبارہ اس کی آواز سن کر میری پریشانی اور وحشت بھی کچھ کم ہوئی۔ میں نے سر ہلا کر آمادگی کا اظہار کیا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور اپنے الجھے ہوئے بالوں میں سے ایک کنگھی نکال کر میری طرف بڑھائی

لی۔

"آپ دیکھتے ہیں میرے بال کسقدر اُلجھے ہوئے ہیں۔ لیجئے ذرا ان کو کنگھی کر دیجئے ...... مجھے
رنے بہت پریشان کر رکھا ہے"۔

میں نے کنگھی اس کے ہاتھ سے لی۔ اور وہ اُسی کرسی پر جس پر میں بیٹھا تھا میری طرف پشت کرکے
، میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا اور وہ اپنے نازک ہاتھوں سے مجھے مدد
ہی۔ جب میں اپنا کام ختم کر چکا تو وہ کرسی سے اٹھی اور میری طرف دیکھکر مسکراتے ہوئے سر کو تھوڑا سا
یا۔ اور پھر کبک دری کی طرح قدم اٹھاتی ہوئی اُسی بغلی کمرے میں جس کا ایک دروازہ کسی قدر کھلا تھا
ہو گئی۔

اس عورت کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی میری وحشت پھر عود کر آئی۔ میں بغلی کمرے کی طرف بھاگا۔
سے اندر داخل ہوا تو اُسے خالی پایا۔ اس دروازے کے علاوہ اس کمرے میں اور کوئی کھڑکی یا روشندان
ور باہر نکلنے کا دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔

میں بھاگ کر کمرے سے باہر نکلا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترتا ہوا مکان سے باہر نکل کر اپنے گھوڑے
ں آکھڑا ہوا۔ بوڑھا چوکیدار ایک پتھر پر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھکر بولا۔

"کیوں خیر گذری۔ بہت گھبرائے ہوئے ہو؟"

لیکن میں کچھ جواب دیئے بغیر گھوڑے پر سوار ہوا اور احاطہ سے باہر نکل کر اسے سڑک پر سرپٹ ڈالدیا۔

جب میں بستی میں آیا۔ تو اس وقت چراغ جل چکے تھے ۔ میرا خادم اندر آیا۔ اور حسب دستور میری کمرسے
ل کر میز پر رکھدی پھر میرے فوجی بوٹ اتار کر ایک کونے میں رکھدیئے اور میرے کوٹ کے سنہری بٹن جو
روشنی میں چمک رہے تھے جھک کر کھولنے لگا۔ جب اس کام سے فارغ ہو چکا تو چند نہایت خوبصورت سنہری
برے کوٹ کے بٹنوں میں اُلجھ کر رہ گئے تھے اکٹھے کرکے میز پر میرے سامنے رکھدیئے۔

دوستو! سچ جانئیے یہ بال اسی حسینہ کے سر کے تھے"۔

یہ کہکر قصہ گو نے گلے سے ایک لاکٹ اتار کر کھولا اور چند نہایت خوبصورت سنہری بال جو اس میں احتیاط سے رکھے تھے نکال کر سب کو دکھلائے۔ مسافر بڑے تعجب سے ان بالوں کو دیکھنے لگے۔ بوڑھا پھر بولا۔

"میں نے اپنے خادم کے ہاتھ سرخ دھاگے والے بنڈل طارق کو بھجوا دیئے۔ تمام رات ایک نامعلوم وحشت اور خوف کے باعث مجھے نیند نہ آئی اگلے روز جب میں اس جگہ جہاں طارق ٹھہرا ہوا تھا گیا تو صاحب خانہ سے معلوم ہوا کہ وہ رات ہی سے غائب ہے۔

میں سات آٹھ روز تک اپنے دوست کا انتظار کرتا رہا۔ اور پھر ایک روز علی الصباح اس کے مکان کی طرف چلدیا۔ تاکہ بوڑھے چوکیدار سے مل کر کچھ حالات دریافت کروں۔ جب میں وہاں پہنچا تو آج احاطہ کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور درختوں کے جھنڈ میں پانچ دس آدمی ادھر ادھر کھڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ان کے پاس جا کر گھوڑے سے اترا۔ یہ لوگ ابھی ابھی بوڑھے چوکیدار کو دفن کر کے فارغ ہوئے تھے۔ میں نے بھی ادھر اُدھر سے دو چار پھول اکٹھے کر کے تربت پر ڈالدیئے۔ اور پھر واپس لوٹ آیا۔

اس واقعہ کو بہت عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن آج تک مجھے طارق کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اور نہ مجھے دوبارہ اس مکان میں جا کر اس پُراسرار حسینہ کو دیکھنے کی جرأت ہوئی ہے۔"

درختوں کی سائیں سائیں اور کواڑوں کے کھڑکنے سے ظاہر ہوتا تھا کہ جھکڑ ابھی تک چل رہا ہے۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ کوئلوں پر سپید سپید راکھ نمودار ہو رہی تھی۔ مسافر جو یہ طرفہ تر داستان سنکر محو حیرت تھے۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگنے لگے۔

ایم۔ اسلم۔ (لاہور)

ترانۂ دِل

۱

غنچۂ ہست میں ہے بوئے حیات　　اور صبا تیری آرزوئے حیات
جس سے سیراب ہے چمن لیکن　　میں ہوں تنہا وہ آبجوئے حیات

۲

مُشکلیں ہیں نقابِ روئے حیات　　دستِ بیباک آرزوئے حیات
شوقِ دیدار ہوں مگر میں ہی　　مجھ سے بڑھتا ہی ہاتھ سوئے حیات

۳

ہے اگر تجھکو آرزوئے حیات　　دیکھنا گر ہے تجکو روئے حیات
اے کفِ خاک! میری بعیت کر　　میں سمجھتا ہوں خوب خوئے حیات

۴

بسملِ تیرا آرزوئے حیات　　بیدھڑک دوڑتا ہے سوئے حیات
اِس کو سینے سے تو لگا کر دیکھ　　گو بظاہر ہے تند خوئے حیات

آمین حزیں

نواب وقار الملک مرحوم

دنیا کے بڑے لوگوں کے سوانح حیات کا مطالعہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ اُن کے حالاتِ زندگی سے سبق حاصل کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کونسی خصوصیات خدا کی طرف سے اُن کی ذات میں مجمع کردی گئیں تھیں. جن کے باعث وہ دنیا کے اسٹیج پر جلوہ گر ہو کر سب کی نظروں کو خیرہ کر گئے ۔ بایں غرض ہم نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم کے حالات گوش گذار کرنا چاہتے ہیں آپ کے مکارم اخلاق و محاسن ۔ فیاضی. انکساری ۔ غم خواری ۔ راست بازی ۔ ہمدردی خلائق ۔ اور اصول کی پابندی ایسی باتیں ہیں جو ہمیشہ چراغِ ہدایت کا کام دیں گی ۔

نواب وقار الملک مرحوم کا سلسلۂ جدی عبدالمومن خاں "کنبوہ" سنبھلی دیوان شاہجہاں بادشاہ تک پہونچتا ہے ۔ جو دیوانِ تن کے منصبِ جلیلہ پر فائز تھے نواب سعد اللہ خاں وزیر شاہجہاں بادشاہ آغاز حال میں ان کے بچوں کے اتالیق تھے ۔ نواب صاحب مرحوم کا سلسلۂ مادری نواب محمد بہادر خاں "کنبوہ" میرٹھی پر منتہی ہوتا ہے ۔ کتاب بادشاہ نامہ، مصنفہ عبدالحمید لاہوری صفحہ ۲۲۳ پر تحریر ہے کہ "نواب محمد بہادر خاں کنبوہ کا بعہد شاہ جہاں منصب ۔ پانصدی ذات و چار سو سوار تھا اور صفحہ ۴۳۵ پر ہے کہ "بسالِ یازدہم جلوس عنایت اللہ خاں والد قایم خاں و نواب محمد بہادر خاں "کنبوہ" بتقبیل عتبہ ملک رتبہ سر برافراختہ ۔ عنایت اللہ خاں دو فیل و نواب بہادر خاں سہ فیل پیش کش گذرانید"۔

نواب محمد بہادر خاں کے بیٹے محمد عاقل خاں بھی بعہد عالمگیر بادشاہ صاحب منصب جاہ تھے ۔ نواب صاحب مرحوم کے آباؤ اجداد سلطنتِ مغلیہ کے دورِ آخر میں دہلی سے نقلِ وطن کر کے سنبھل آرہے تھے ۔ ان کے باپ کی شادی امروہہ میں ہوئی اور یہی توطنِ امروہہ کا سبب ہوا ۔

۱۸۴۱ء میں آپ پیدا ہوئے ۔ ابھی عمر کے چھ ماہ بھی ختم نہیں ہوئے تھے کہ باپ کی شفقت اور سایہ

ں سے محروم ہوگئے۔ اور آپ کی تعلیم و تربیت کا بار آپ کی والدہ صاحبہ کو اُٹھانا پڑا۔ یہ قدرت کا ایک عجیب و
کرشمہ ہے کہ چھ ماہ کا بچہ اپنی ماں کی گود میں دُرِ یتیم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور قدرت پھر اپنی نوازش سے
و سریر امارت پر متمکن کر دیتی ہے

آپ کی ملازمت کا سلسلہ ادنیٰ خدمات سے شروع ہوا اور آپ ترقی کر کے سررشتہ دار کلکٹری ضلع علی گڑھ
ے۔ سرسید احمد خاں مرحوم اس وقت علی گڑھ کے سب جج تھے۔ دونوں میں چند ہی ملاقاتوں کے بعد سلسلۂ
قائم ہوگیا۔ اور آخر دم تک قائم رہا۔ سرسید مرحوم ان کے تقویٰ۔ طہارت۔ جفاکشی۔ اور راست بازی کو
اُن سے بہت محبت کرنے لگے۔ نواب صاحب مرحوم بھی سرسید مرحوم کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔
رہی خیالات میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ تھے۔ لیکن قومی۔ ملکی۔ تمدنی۔ معاشرتی اور سیاسی معاملات
ونوں ایک جان اور دو قالب بن گئے تھے۔

جب سرسید مرحوم پر کفر کے فتوے لگائے جا رہے تھے تو آٹے کے ساتھ گھن کی مثال نواب صاحب مرحوم
بت کچھ لے دے سرسید کی رفاقت کی وجہ سے ہوئی۔ چنانچہ سرسید نے جواب دیتے ہوئے نواب صاحب مرحوم
ت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ سرسید کی مردم شناسی کی بیّن دلیل ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے
ں نواب صاحب مرحوم کی کس درجہ قدر و منزلت تھی چنانچہ فرماتے ہیں۔ کہ ”مولوی مشتاق حسین کی ذاتی
ور نہایت سخت دیانت داری۔ بے ریا عبادت سچی خدا پرستی۔ غایت تشدد سے نماز و روزہ اور احکام شریعت
ری جو درحقیقت بے مثل ہے اس لائق تھی کہ اگر ہماری قوم پر خدا کی خفگی نہ ہوتی تو اس کو مسلمانی کے لیے
ی۔“

اوائلِ عمر سے لیکر آخر دم تک فریضۂ نماز کے علاوہ تہجد و اشراق تک کی نماز بھی آپ سے نہیں چھوٹی۔ انتہائی پابندی
ہ ہے کہ جس زمانہ میں آپ علی گڑھ کے سررشتہ دار کلکٹری تھے جب نماز کا وقت آتا۔ فوراً دنیاوی کاموں
کر اپنے معبودِ حقیقی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ لیکن جب کابون صاحب کلکٹر ضلع ہو کر آئے اُن کو ان کا نماز کے
ناگوار ہوا۔ اور کہا کہ تمہارے چلے جانے سے سرکاری کاموں میں حرج واقع ہوتا ہے عرض کیا نماز میں
ں لگتی۔ چند منٹ میں فارغ ہو کر آجاتا ہوں۔ صاحب بہادر ہٹ پر قائم رہے۔ انھوں نے جواب میں

کہا کہ میں نماز نہیں چھوڑ سکتا۔ اور جھٹ استعفا پیش کر دیا
لیکن انکا یہ ایثار کچھ ایسا مقبولِ بارگاہ رب العزت ہوا کہ وہ چند ہی دنوں میں معراجِ ترقی پر پہونچ گئے۔ سر سید مرحوم نے سر سالار جنگ بہادر کو لکھا کہ "مجھکو ان کی دیانت داری پر اپنی دیانت داری سے بھی زیادہ بھروسہ ہے" چنانچہ وہ پانچ سو روپیہ ماہوار پر حیدر آباد میں "معتمدی دیوانی" پر فائز ہو کر برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار پر ترقی پا کر نائب وزیر۔ پیش دست مدار المہام و مشیر سلطنت بن گئے۔ نواب سر آسمان جاہ کے عہد وزارت میں آپ حیدر آباد کے افق پر آفتاب بنکر چمکے۔
۱۸۹۰ء میں نواب وقار الدولہ۔ وقار الملک مولوی مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ کے معزز خطاب سے سرفراز فرمائے گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ نے ایک طویل ملازمت کے بعد حیدر آباد کو خیر باد کہدیا۔ ان کی غایت درجہ حزم و احتیاط کی وجہ سے حیدر آباد میں لوگ ان کے بہت دشمن ہو گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اس کی کبھی پروا نہیں کی اور جو کچھ ملک کے لیے بہتر سمجھا وہی کیا کسی سے مرعوب ہونا تو ان کے ضمیر ہی میں نہ تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ امروہہ میں ان کے ایک عزیز ان کے ساتھ مصروف طعام نوشی تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ آپ کو حیدر آباد میں لوگ بری طرح یاد کرتے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم نے چند منٹ کی خاموشی کے بعد فرمایا کہ "اگر مجھکو کوئی بُرائی سے یاد کرتا ہے تو میں ذرہ برابر پروا نہیں کرتا۔ کیونکہ میں نے جو کام بھی کیا ہے وہ خدا کو حاضر و ناظر جانکر اپنے ضمیر کے موافق اور ملک کی بہتری کو ملحوظ رکھکر کیا ہے۔ اگر کوئی مجھکو اس پر بُرا کہتا ہے تو خدا اُس کو نیک سمجھ دے۔"
اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی جوہر تھا جس نے مشتاق حسین کو نواب وقار الملک بنا دیا وہ اپنے ضمیر کی پاسداری یہاں تک کرتے تھے کہ جب ایم۔ اے۔ او کالج کے زمانہ میں انگریز پروفیسروں کا معاملہ درپیش تھا اور سر جان ہیویٹ پروفیسروں کی طرف جھک گئے تھے۔ اُس وقت بھی نواب صاحب نے وہی فرمایا جو ان کے ضمیر اور مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق تھا یہی وجہ تھی کہ احراری و ابراری گروہ میں اُن کی عظیم الشان شخصیت نمایاں رہتی تھی اور ہر شخص اُن کی تعظیم و تکریم کو اپنے لیے باعث عزت سمجھتا تھا۔ وہ نہ صرف کالج کے سکرٹری تھے بلکہ سات کروڑ مسلمانانِ ہند کے واحد لیڈر اور بے تاج کے بادشاہ تھے

۱۸۸۹ء میں جب سرسید مرحوم اپنے بعد سید محمود کو لائف سکرٹری مقرر کرنا چاہتے تھے۔ اور اُن کے احباب
ں وجہ سے اُن سے کشیدہ خاطر ہو گئے تھے۔ اُس وقت نواب صاحب عجب گو مگو میں تھے۔ ایک طرف سفید ریش
ل کی شفقتیں اور عنایتیں تھیں اور دوسری طرف ضمیر اور قوم کا پاس تھا۔ آخر کار حریتِ ضمیر کام آئی اور ان کو
سید مرحوم کے خلاف نعرۂ حق بلند کرنا پڑا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

"میری خود کبھی ہمت نہ پڑتی کہ میں اس آزادی سے اپنی رائے دے سکتا۔ اگر مجھکو یہ خوف نہو تا کہ ایک دن
ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب بھی دینا ہے۔ اگر ایک خدا کا گناہ ہو جائے تو ممکن ہے کہ اس سے
زاریں اور وہ اپنی رحیمی سے بخش دے انسانوں کے متعلق اگر ایک دو سے خطا ہو جائے تو ان سے معذرت
ے صفائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم و ملک کا گناہ گار کس کس سے اور کہاں کہاں اپنا گناہ بخشواتا پھرے گا۔
ِ عمر بھی اگر صرف ہو جائے تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتا"۔

ان مندرجہ بالا سطور کے بعد کون شخص ہے جو اُن کی ایمانداری۔ سچائی اور کمال آزادی سے انکار کر سکتا ہے۔
سہ یہاں پھر ہی ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک سبق کے بعد دوسرا سبق ملتا ہے

اگرچہ وہ سرسید کے اس انتخاب کے سخت مخالف تھے۔ مگر جب کثرت رائے نے سید محمود کو لائف سکرٹری
رکر دیا تو مخالفین میں سے سب سے اول نواب صاحب نے کثرت رائے کے آگے سر جھکا دیا۔ کیونکہ ان کو جو کچھ
تلاف تھا مخلصانہ تھا مخاصمانہ نہ تھا۔ حالاں کہ جن لوگوں نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا سے کالج کی ممبری سے
عفا دے دیا تھا! ور بعض تو اس قدر خفا ہوئے کہ مرتے مر گئے مگر کالج کی طرف رخ نہیں کیا

آج ہمارے یہاں کے جلسے۔ سوسائٹیاں اور انجمنیں ان ہی مخاصمانہ کشمکش کی شکار بنی ہوئی ہیں۔ کاش
نواب صاحب کی اس تعلیم سے سبق حاصل کر کے نجات کا راستہ دیکھیں

ضبط و تحمل کے لحاظ سے بھی وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ ان کا جوان اور قابل بیٹا محمد احمد بیرسٹر بنگلور میں
ن عالم جوانی میں دنیا سے رخصت ہو گیا مگر انھوں نے بڑے صبر سے کام لیا اُن کے اخلاق ہر کہ ومہ کے ساتھ
ساں تھے۔ اور اُن کا برتاؤ محبت آمیز تھا۔ بیواؤں۔ فقیروں۔ اندھوں۔ یتیموں اور طالب علموں کی
بشر مدد فرماتے تھے۔ حفظ مراتب کا بھی انکو بڑا خیال رہتا اور جب کبھی اپنے چھوٹوں کو نصیحت کرنے کا

موقع ملتا۔ تو آپ اس پیرایہ میں نصیحت فرماتے کہ آپ کا فرمانا نقش ہو کر رہ جاتا

ان کی محنت و مشقت بھی قابلِ داد ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو کس طرح وہ ادنی خدمات سے اعلی مدارج پر پہونچ سکتے جب تک زندہ رہے جو کام بھی کیا اس کو انجام تک پہونچایا۔ کام سے کبھی نہیں گھبراتے تھے۔ پچھتر برس اس عالم میں رہے لیکن دماغی اور جسمانی قوتوں سے برابر کام لیتے رہے۔ آپ کی ذہنی و دماغی انہماک استقلال حریت و مساوات اور آزادیٔ رائے کو دیکھ کر نہ صرف ٹرسٹیوں نے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی متفقہ رائے نے آپ کو اپنے محبوب کالج کا سکرٹری منتخب کیا اور جو بھروسہ آپ پر قوم نے کیا اس کو آپ نے آخر تک نبھایا۔ اور کوئی موقع ایسا نہیں دیا کہ جس سے معتقد ہستیاں آپ کی رائے پر نکتہ چینی کرتیں

آپ کی صداقت شعاری و سلامت روی ہمیشہ ضرب المثل رہے گی جس کی ایک دو نہیں بلکہ صدہا مثالیں موجود ہیں۔

درحقیقت یہ ایک عجیب بات ہے کہ جن خیالات کا اظہار نواب صاحب نے نواب محسن الملک مرحوم کے لیے کیا تھا وہ خود اُن کی اپنی ذات کے لیے بھی مناسب معلوم ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہوا تھا کہ "وہ اپنے بعد قوم میں کوئی اپنی سی قابلیت کا شخص نہیں چھوڑ گئے آسمان بہت چکر کھاتا ہے تب کہیں اس طبیعت کے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور آیندہ تو اس فیشن کے لوگوں کا پیدا ہونا محال معلوم ہوتا ہے لیکچرار ہونگے۔ اسپیکر ہونگے۔ فلاسفر ہونگے۔ قوم کے ہمدرد بھی ہونگے۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن افسوس . . . . ایسی خوبیوں کا بشر دیکھنے میں نہ آویگا"

اگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو یہ قوم کی خوش نصیبی تھی کہ محسن الملک مرحوم کے بعد وقار الملک مرحوم جیسا شخص ان کی قومی کشتی کا کھیون ہار رہا۔ لیکن وقار الملک مرحوم کے بعد ان جیسی خوبیوں کا بشر دیکھنے میں نہیں آتا

نواب صاحب مرحوم نے آخر عمر تک قوم کی خدمت کی وہ ۲۷ر جنوری ۱۹۱۷ء کو اس دنیا سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ جس زندگی کا آپ نے نمونہ چھوڑا ہے وہ ہمیشہ یادگار زمانہ رہے گی اور آپ کے اخلاقی کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دیں گے

امداد احمد خاں زبیری

ترانۂ دل

۱

جس کو محبوب میری ذات نہیں — اس کی دلدادہ کائنات نہیں
نطقِ فطرت ہوں اے امینؔ بخدا — رجم بالغیب میری بات نہیں

۲

کون کہتا ہے مشکلات نہیں ؟ — دن ہی دن ہے حیات رات نہیں ؟
ہاں مگر جن کی میں نہیں مشعل — انکی شب ہی شبِ برات نہیں

۳

میں اگر ہوں تو کوئی بات نہیں — اتنی مشکل امینؔ حیات نہیں
مجھ کو رہبر بنا لیا جس نے — مشکلات اس کی مشکلات نہیں

۴

میں نہیں ہوں کہ تیری ذات نہیں ؟ — تو نہیں ہے کہ کائنات نہیں ؟
کام لے غزنوی کی غیرت سے — ہے یہ سودا کہ سومنات نہیں

امینؔ حزیں

کلامِ جلیل

مکرمی -

آپ کی عنایات اور شکایات سے مجبور ہو کر چند اشعار حاضر کرتا ہوں ؎

مجبور ہو کے رسم و رہِ عشق سے جلیل
کم بخت دل نے راہِ وفا اختیار کی

والسلام - میگزین کا ملنے والا
جلیل قدوائی

اہل دل کا نہیں اس دور میں پرساں کوئی
لئے بیٹھا ہے متاعِ غمِ پنہاں کوئی

فکرِ پوشیدگیٔ راز میں ہیں دیوانے
سی رہا ہے کوئی دامن تو گریباں کوئی

دیکھ اے مطربِ غم چھیڑ نہ یوں سازِ جنوں
ٹوٹ جائے نہ کہیں تارِ رگِ جاں کوئی

حالِ دل سن کے مرا کوئی پشیماں کیوں ہے؟
حالِ دل سن کے مرا ہو نہ پشیماں کوئی

تابِ نظارگیٔ جلوۂ جاناں کے لئے
لائے ہر بار نیا دیدۂ حیراں کوئی

چاکِ دل ہی نہیں اب چاکِ گریباں کیسا؟
ہائے اتنا بھی نہ ہو بے سر و ساماں کوئی

دل میں اک قطرۂ خوں ہے جو جما رہتا ہے
اس سمندر میں اب اٹھتا نہیں طوفاں کوئی

وقت پر منتِ اغیار گوارا کر لے
ہو نہ شرمندۂ الطافِ عزیزاں کوئی

محفلِ شعر میں اس طرح غزل خواں ہے جلیل
جیسے ہو نغمہ سرا مرغِ خوش الحاں کوئی

جنگلی بط

اشخاص ڈراما

منیر عالم	مالدار سوداگر
بلند اختر	اس کا بیٹا
نظیر خاں	بڈھا سردار
محبوب خاں	اس کا بیٹا مصوّر
جمیلہ خاتون	محبوب خاں کی بیوی
رئیسہ	″ ″ بیٹی
آمنہ بیگم	مہر عالم کی داروغہ مکان

حکیم مرزا عباس	محبوب خاں کے دوست
مولوی صاحب	محبوب خاں کے دوست
منیم جی	منیر عالم کے ملازم
کلن	منیر عالم کے ملازم
عبدل	منیر عالم کے ملازم
اور ملازم	منیر عالم کے ملازم

چاندمیاں - موٹومیاں - مہربان شاہ، ودیگر مہمان

(جائے وقوع - پہلا ایکٹ - مہر عالم کی کوٹھی میں باقی چار محبوب خاں کے گھر)

پہلا ایکٹ

(سین - مطالعہ کا کمرہ نہایت سلیقہ اور
ش اسلوبی سے آراستہ ہے - کتابوں کی الماریاں
ور دیگر سامان موجود ہے - ایک میز کاغذات
ے لدی کمرے کے وسط میں رکھی ہے لیمپ روشن
ادر ہلکی ہری ہری روشنی ہر سمت پھیل رہی ہے
یچھے کی جانب دروازے کے کواڑ کھلے
ہوئے ہیں اور ایک بڑا خوشنما کمرہ دکھائی دیرہا
ہے جس میں جھاڑ فانوس روشن ہیں مطالعہ کے کمرے
کی داہنی سمت ایک چھوٹا کمرہ ہے جو دفتر میں کھلتا
ہے - بائیں طرف ایک آتش دان ہے جس میں آگ
روشن ہے - اس کے پیچھے کھانے کا کمرہ ہے
مہر عالم کا ملازم کلّن وردی پہنے اور عبدل ایک دوسر

ملازم مطالعہ کا کمرہ صاف کر رہے ہیں۔ پشت کے بڑے کمرے میں دو تین اور ملازم صفائی میں مصروف ہیں اور موم بتیاں روشن کر رہے ہیں۔ کھانے کے کمرے سے مہمانوں کے ہنسنے اور بات چیت کرنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک صاحب چاقو سے گلاس کو کھنکھناتے ہیں۔ خاموشی طاری ہو جاتی ہے جام محبت نوش کرتے ہیں۔ تعریف شروع ہوتی ہے اور گفتگو کا بازار پھر گرم ہو جاتا ہے)

کلن (لیمپ کو روشن کرتے اور اس پر گلوب رکھتے ہوئے) عبدل۔ وہ تو بڑے میاں اٹھے۔ اور آمنہ بیگم کی صحت کا جام نوش کرنے کے لئے تقریر کرنے لگے۔

عبدل (کرسی کو آگے بڑھاتے ہوئے) تمھیں معلوم ہے کہ لوگ ان دونوں کے بارے میں کیا چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ یہ سب سچ ہے؟ کچھ ضرور دال میں کالا ہے

کلن۔ اللہ بہتر جانتا ہے

عبدل۔ وہ اپنے زمانہ میں بہت بن سنور کے رہتا تھا

کلن۔ ممکن ہے

عبدل کوئی کہتا تھا کہ آج کی دعوت اپنے بیٹے کے اعزاز میں دی ہے

کلن۔ ہاں! وہ کل ہی تو گھر آیا ہے۔

عبدل۔ اچھا مجھے معلوم نہیں تھا کہ اُس کے کوئی بیٹا بھی ہے۔

کلن۔ کیوں نہیں خدا رکھے اُس کا ایک بیٹا ہے لیکن وہ اپنی ملازمت پر لاہور رہتا ہے۔ بڑا عرصہ ملازمت میں گزر گیا۔ میری یاد میں تو وہ گھر پر آیا نہیں

چپراسی (دوسرے کمرے کے دروازہ سے) کلن! دیکھو ان بڑے میاں کو تمھاری تلاش ہے جو۔ . . . . . .

کلن (بڑبڑاتے ہوئے) لاحول و لا قوۃ۔ اس وقت کیا کام ہے؟

(نظیر خاں اندرونی کمرہ میں آگے آتا ہے۔ پرانا فرغل زیب تن ہے۔ ہاتھ میں ایک عصا اور اونی ٹوپی ہے اور بغل میں کاغذوں کا پلندہ ہوئے لب ترا شیدہ اور پٹے الجھے ہوئے)

کلن (آگے بڑھ کر) حضور سلام۔ کہئے کیا ارشاد ہے؟

نظیر خاں۔ (دروازہ سے) میاں کلن! مجھے دفتر میں ایک ضروری کام ہے۔

کلن۔ دفتر تو ایک گھنٹہ ہوا بند ہو گیا۔ اور....

نظیر خاں - یہ تو مجھے صدر دروازہ پر ہی معلوم ہو گیا تھا۔ لیکن منیم جی ابھی وہاں ہیں۔ کلّن میاں کرم کرو اور ذرا مجھے اُس طرف جانے دو -
(چور دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
میں پہلے بھی اس طرف گیا ہوں -

کلّن (دروازہ کھولتے ہوئے) اچھا تو اجازت ہے لیکن جو کچھ آپ کریں۔ دیکھ بھال کر کریں۔ کیوں کہ یہاں مہمانوں کا جھمگٹ ہے۔

نظیر خاں - اچھا اچھا۔ میں سمجھا۔ جزاک اللہ شاباش تیکرہ یہ (منہ میں) اسے بدمعاش! (دفتر میں جاتا ہے۔ کلّن دروازہ بند کر دیتا ہے)

عبدل - کیا یہ کوئی منشی ہیں ؟

کلّن - نہیں تو۔ یہ نقل نویسی کرتے ہیں اور ضرورت کے وقت آتے ہیں۔ ان کے بھی کبھی خوب عیش کے دن تھے۔

عبدل - ہاں معلوم تو ہوتا ہے کہ زندگی کی بہار کا لطف اُٹھایا ہے -

کلّن - بے شک۔ بالکل درست۔ وہ فوج کا سردار تھا۔

عبدل - کیا واقعی سردار۔ اور یہ صورت ؟

کلّن - ہاں اپنی جان کی قسم۔ لیکن پھر اس نے لکڑی وغیرہ کی تجارت شروع کر دی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اس نے میاں منیر عالم کو نہایت مکّاری سے دغا دی۔ اس وقت دونوں لاہور میں شریکِ کار تھے۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ اس کے سب کرتوتوں سے خوب واقف ہوں۔ گلابو کے ہاں مجرے میں صحبت رہا کرتی تھی -

عبدل - مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسی خوبیوں کے حضرت ہیں

کلّن ! خدا کی پناہ! میاں یہ تو میری لسانی ہے اور دوسرے میرا خیال ہے کہ ہمیں انسانیت سے شریفوں کے ساتھ پیش آنا چاہیئے -

عبدل - تو کیا یہ دیوالیہ ہو گیا؟

کلّن - نہیں اس سے بھی زیادہ قبیح بات ہوئی۔ اس کو قید ہو گئی -

عبدل - قید !

کلّن - جیل نہیں تو حوالات ! (کچھ سنتا ہے) دیکھو دستر خوان سے اُٹھنے لگے -
(کھانے کے کمرے کے کواڑ دوچپراسی کھول دیتے ہیں۔ آمنہ بیگم دو مہمانوں سے گفتگو کرتی ہوئی باہر

آئی ہو۔ اور سب اُس کے پیچھے آتے ہیں منیر عالم صاحب بھی ہمراہ ہیں۔ محبوب خاں اور بلند اختر سب سے آخر میں نکلتے ہیں)

آمنہ بیگم۔ (ملازم سے) کلن دیکھو ہم قہوہ نوشی نشاط منزل میں کریں گے۔

کلن۔ بہت اچھا سرکار!

(آمنہ بیگم اور دونوں مہمان اندر کے کمرہ سے ہو کر دائیں طرف چلے جاتے ہیں۔ عبداللہ اور کلن پیچھے پیچھے جاتے ہیں)

موٹو میاں (چاند میاں سے) بھائی ایسی دعوت میں کھانا کھانا کار سے دارد

چاند میاں۔ ہاں ذرا ہمت درکار ہو۔ کیسی حیرت ہے کہ تین گھنٹے میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

موٹو میاں۔ بیشک حضرت! مگر بعد میں۔ بعد میں

تیسرا مہماں۔ قہوہ اور چائے کا دور شاید نشاط منزل میں چلے۔

موٹو میاں۔ ٹھیک ٹھیک! شاید آمنہ بیگم کچھ گائیں بھی ہیں

چاند میاں (دھیمی آواز میں) جب تک سرور حاصل نہ ہو۔ دعوت میں شرکت بے کار اور فضول ہے

موٹو میاں۔ بس خاموش۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا (ہنستے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

منیر عالم (پست آواز میں) اختر! میرا خیال ہے ہمیں کسی نے نہیں دیکھا۔

بلند اختر (آنکھیں اُٹھا کر) کیا؟

منیر عالم۔ کیا تم بھی مخمور ہے؟

بلند اختر۔ آخر میں کیا دیکھتا؟

منیر عالم۔ ہم دستر خوان پر تیرہ آدمی تھے۔

بلند اختر۔ واقعی؟

منیر عالم (محبوب خاں کی طرف دیکھتے ہوئے) ہم اپنے معمول کے مطابق بارہ موجود رہتے تھے (دوسرے مہمانوں کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) آیئے حضرات۔ تشریف لایئے (اندرونی کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ بلند اختر اور محبوب خاں رہ جاتے ہیں)

محبوب خاں (جس نے ان کی گفتگو کو سن لیا تھا بلند اختر سے) آپ نے مجھ کو نہ بلایا ہوتا۔

بلند اختر۔ کیا؟ یہ دعوت میرے اعزاز میں دی گئی ہو۔ تو پھر میں اپنے پیارے اور عزیز دوست کو کیوں نہ بلاؤں۔

محبوب خاں۔ لیکن آپ کے والد صاحب

شاید پسند نہ کرتے ہوں۔ میں کبھی یہاں نہیں آیا۔

بلند اختر۔ ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن میں آپ سے ملاقات اور بات چیت کرنی چاہتا تھا۔ کیوں کہ میں عنقریب واپس جانے والا ہوں۔ ہم دونوں پیارے ہم مکتب اور آج تک جدا رہے۔ غضب ہے۔ ۱۶-۱۷ سال سے ملاقات ترک۔ حیرت ہے۔

محبوب خاں۔ کیا واقعی اتنا عرصہ ہوا؟

بلند اختر۔ بے شک۔ ماشاءاللہ چہرے پر رونق ہے۔ موٹاپا بڑھ گیا ہے۔

محبوب خاں۔ نہیں فربہی تو نہیں۔ بلکہ بہ نسبت پہلے کے اب میں جوان ہو گیا ہوں۔

بلند اختر۔ ہاں ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ جوانی چہرے سے عیاں ہے

محبوب خاں (افسردگی سے)۔ اندرونی حالت آہ! زمین و آسمان کا فرق ہے یقین مانو کہ پچھلی ملاقات کے وقت سے اب تک نہایت مہلک خطرات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

بلند اختر (دھیمی آواز سے)۔ والد صاحب کے کیا حال ہیں؟

محبوب خاں۔ اچھا اب اس کے متعلق کچھ نہ کہو میرے غریب بدقسمت باپ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ان کا دنیا میں کوئی دوسرا سہارا نہیں۔ لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کے بیان کرنے سے میری روح کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ بتلایئے آپ کا کام وہاں کیسا چل رہا ہے؟

بلند اختر۔ بالکل تنہا اور راکھل کھورا۔ تمام قسم کی باتوں کے جاننے کا موقعہ تو بے شک ملا۔ ذرا ادھر کو آؤ اور ہم خوب اطمینان سے باتیں کریں گے۔

(وہ آگ کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور محبوب کا ہاتھ کھینچ کر دوسری پر بٹھا دیتا ہے)

محبوب خاں (سوچتے ہوئے) جزاک اللہ! شکریہ! آپ نے یاد تو کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مجھ سے نفرت نہیں ہے۔

بلند اختر۔ (متعجب ہو کر) ایں! کیسے معلوم ہوا کہ میں نفرت کرتا ہوں۔

محبوب خاں۔ پہلے پہل بیشک آپ متنفر تھے۔

بلند اختر۔ کب؟

محبوب خاں۔ اُس افسوسناک حادثہ کے بعد۔ اور یہ دراصل تقاضائے فطرت ہے۔ کیوں کہ جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے والد صاحب مصیبت میں پھنس جانے والے ہیں

بلند اختر- تو کیا یہی وجہِ نفرت تھی۔ آپ کو کس نے یہ بات سجھائی!

محبوب خاں- مجھے معلوم ہے اختر! آپ کے والد صاحب نے خود مجھ سے ایسا کہا۔

بلند اختر (چونک کر) میرے والد صاحب نے واقعی؟ اور یہی سبب ہے کہ آپ ہمیشہ مجھ سے چھپاتے رہے۔

محبوب خاں- بے شک۔

بلند اختر- آپ نے اُس وقت بھی نہیں لکھا جب آپ مصوری میں مشغول تھے۔

محبوب خاں- آپ کے والد صاحب نے مجھے خط لکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔

بلند اختر (اُس کے مُنہ کو تکتے ہوئے) شاید وہ راستی پر تھے۔ لیکن محبوب خاں صاحب اب مجھے بتلایئے کہ آپ اپنی موجودہ حالت میں خوش ہیں۔

محبوب خاں- (ٹھنڈی آہ بھر کر) جی ہاں! میں ایسا کہہ تو سکتا ہی ہوں۔ پہلے البتہ ذرا مشکل تھا۔ بالکل نئی زندگی اختیار کرنی تھی۔ کیوں کہ پُرانی زندگی اپنی رفتار پر نہیں رہ سکتی تھی۔ میرے باپ کی تباہی و بربادی۔ بے عزتی و بیوقوفی۔ آہ اختر!

بلند اختر (سوچتے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ بیشک۔

محبوب خاں- تعلیم کو جاری رکھنا ناممکن تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہ رہی تھی۔ اس پر مستزادیہ کہ اُدھار جان کھائے جاتا تھا۔ اور وہ بھی زیادہ آپ کے والد صاحب کا۔

بلند اختر- اوہو!

محبوب خاں- پس میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ پرانے طرز زندگی کو بالکل بدل دوں۔ اور یہ آپ کے والد صاحب کی نصیحت کا اثر ہے۔ اُنھوں نے میری مدد کی۔

بلند اختر- میرے والد صاحب!

محبوب خاں- آپ اس کو خوب جانتے ہیں ورنہ مجھے روپیہ کہاں سے ملتا کہ مصوری سیکھتا اور دکان رکھتا۔

بلند اختر- تو کیا اس کے اخراجات والد صاحب نے ادا کیے۔

محبوب خاں- ہاں اختر۔ کیا آپ کو معلوم نہیں میرا خیال تھا کہ آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا

بلند اختر- حاشا و کلا۔ وہ ایک حرف بھی زبان پر نہیں لائے۔ شاید بھول گئے ہوں۔ ہم نے سوائے کاروباری معمولی خطوں کے اور کچھ نہیں لکھا اور یہی والد صاحب بھی کرتے تھے

محبوب خاں - ہاں بے شک! وہ نہیں چاہتے
تھے کہ کسی کو اس کا علم ہو اور یہ بھی اُن کا طفیل ہے کہ
میری شادی ہو گئی لیکن شاید آپ کو اس کا بھی علم نہو

بلند اختر - واللہ! مجھے بالکل معلوم نہیں (اس کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) محبوب یقین جانو اس
سے مجھے بہت خوشی ہے - لیکن ساتھ ہی ساتھ رنج
بھی کیوں کہ میں نے خود اپنے والد صاحب کو دھوکا
دیا - اس سے پتہ لگتا ہے کہ اُن کے سینہ میں دل
ہے اور ایک حساس ضمیر -

محبوب خاں - ضمیر!

بلند اختر - ہاں ہاں آپ اور کچھ نام لے سکتے
ہیں - لیکن سچ مانیئے میری خوشی کی انتہا یہ سن کر
نہیں رہی - اب تو آپ شادی شدہ اور متاہل
آدمی ہیں - مجھے تو ابھی زمانہ چاہیئے کہ اس حالت
میں آسکوں - اور ہاں معلوم ہوتا ہے کہ شادی
خانہ آبادی ہوئی

محبوب خاں - شکرِ خدا - بہت خوش ہوں -
میری بیوی نہایت حسین اور قابل ہے وہ تعلیم یافتہ
بھی ہے

بلند اختر - (ذرا متعجب سا) تو حیرت کیا ہے؟

محبوب خاں - آپ کو معلوم ہو کہ زندگی خود
تعلیم ہے - اُس کا ہر گھڑی کا ساتھ اور دنیا سے استغنا
میں یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ اُس کو دیکھ کر ہرگز نہیں
پہچان سکتے کہ وہ جمیلہ خاتون ہے

بلند اختر - جمیلہ!

محبوب خاں - کیا آپ بھول گئے اس کا نام
جمیلہ خاتون تھا

بلند اختر - کون خاتون؟ میں نہیں سمجھا

محبوب خاں - کیا آپ کو یاد نہیں کہ وہ کبھی
اسی مکان میں رہتی تھیں -

بلند اختر - (اس کی طرف دیکھ کر) تو کیا یہ وہی
جمیلہ خاتون ہے؟

محبوب خاں - بے شک -

بلند اختر - وہی نا جو والدہ کے ایامِ علالت
میں ہمارے گھر کی داروغہ تھی

محبوب خاں - ہاں - ہاں - لیکن میں تو سمجھا
تھا کہ آپ کے والد صاحب نے اس شادی کی خبر
کر دی ہوگی

بلند اختر - (اُٹھتے ہوئے) ہاں کہی تھی - لیکن
یہ نہیں کہ (ٹہلنے لگتا ہے) ذرا رکو مجھے خیال ہے
کہ انھوں نے خبر دی - ہاں مجھے اب یاد آیا - والد
صاحب کے خط ہمیشہ مختصر ہوتے ہیں - اچھا یہ تو بتلائیے

کہ جمیلہ سے آپ کی ملاقات کیسے ہوئی۔
بالکل معمولی طور پر آپ کی والدہ کی بیماری
سے تمام گھر میں ابتری پھیل گئی۔ جمیلہ اس کو گوارا
نہ کر سکی۔ وہ یہاں سے چلی گئی۔ یہ واقعہ آپ کی
ماں کے انتقال سے پہلے کا ہے۔ یا ممکن ہے
اُسی سال کا ہو۔

بلند اختر۔ ہاں وہی سال تھا۔ میں اُس وقت
کام میں مشغول تھا۔ اچھا پھر بعد میں کیا ہوا؟

محبوب خاں۔ جمیلہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی
جو بہت جفاکش اور ہوشیار عورت تھی۔ اُس کے
ایک عمدہ مکان تھا اور چند آرام دہ کمرے
کرائے کے لئے

بلند اختر۔ اور مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو
ایک کمرہ مل گیا۔

محبوب خاں ہاں دراصل یہ بھی آپ کے
والد صاحب کا ہی فیض ہے کہ انھوں نے یہ بات مجھ کو
سمجھائی اور میں جمیلہ کو جان گیا۔

بلند اختر۔ اور یہ تعارف محبت سے بدل گیا۔

محبوب خاں۔ یقینی۔ آپ کو خوب معلوم ہے
کہ نوجوان آدمیوں میں محبت سریع الوجود ہوتی ہے

بلند اختر (پھر ٹہلنے لگتا ہے) اب بتلائیے کہ آپ کی
منگنی کے بعد ہی والد صاحب نے آپ سے
کے لئے کہا؟

محبوب خاں بے شک۔ میں کسی معقو
کے اختیار کرنے کے لئے مضطرب تھا۔ او
کے والد صاحب اور میری رائے کا اتفاق اس
ہوا کہ مصوری سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ جمیلہ کا
یہی خیال تھا۔ ہاں ایک دوسرا سبب یہ بھی تھا
خوش قسمتی سے جمیلہ مصوری کی بابت کچھ سیکھ چکی

بلند اختر۔ تب تو نہایت خوشی کی بات ہے؟

محبوب خاں (مطمئن لہجہ میں کھڑا ہوتے ہوئے)
ہاں کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کس طرح ہر چیز میرے
لئے خود بخود درست ہوتی گئی۔

بلند اختر۔ کیوں نہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے باپ آپ
حق میں خدا کی رحمت تھے۔

محبوب خاں۔ اُنھوں نے اپنے پُرانے دوست
بیٹے کا مصیبت میں ساتھ دیا۔ اُن کے پہلو میں نرم
دل ہے۔

آمنہ بیگم (منیر عالم کے پاس آکر اور ہاتھ پکڑ کر)
جناب منیر عالم صاحب! بس ضد کو ترک کر دو
غصہ کو تھوک دو۔ یہاں روشنی کو تکتے رہنے
کیا فائدہ! اس سے آنکھوں کو نقصان ہوتا ہے۔

منیر عالم (ہاتھ چھڑا کر اور آنکھوں پہ پھیر کر) ایں - واقعی تم ٹھیک کہتی ہو -

آمنہ بیگم (مہمانوں سے جو دوسرے کمرہ میں ہیں) حضرات! اگر آپ کو شربت کی خواہش ہو تو یہاں تشریف لائیے -

موٹو میاں - (آتے ہیں) کیا در اصل آپ ہمیں حقہ کی متبرک نعمت سے محروم رکھنا چاہتی ہیں؟

آمنہ بیگم - اوہو منیر عالم صاحب کے کونسلِ مقدس میں اس کی گنجائش کہاں سمائی؟

چاند میاں - بیگم صاحبہ! یہ ظالم قانون تمباکو کے حق میں آخر کب سے نافذ ہوا

آمنہ بیگم - پچھلی دعوت کے بعد سے جب چند مہمانوں نے حد سے تجاوز کیا -

چاند میاں - تو کیا ہم بھی متجاوز ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں؟

آمنہ بیگم - کسی طرح نہیں - ہرگز نہیں - (اب تقریباً سب مہمان اندر آجاتے ہیں - ملازم شربت پیش کرتا ہے)

منیر عالم (محبوب خاں سے جو الگ میز کے پاس کھڑا ہے) محبوب خاں تم کس سوچ میں ہو؟

محبوب خاں - جناب میں تصویروں کو دیکھ رہا ہوں

چاند میاں (جو کمرے میں ٹہل رہے ہیں -) تصویریں! خوب! یہ تو آپ کی دلچسپی کی چیزیں ہیں ما

موٹو میاں (آرام کرسی پہ بیٹھ کر) کیا آپ خود اپنی تصویریں نہیں لائے؟

محبوب خاں - نہیں جناب -

موٹو میاں - آپ کو لانی چاہیئے تھیں - کمال تخیل کرنے کا یہ بہترین ذریعہ ہے -

چاند میاں - ہاں اس سے لطفِ صحبت دوچند ہو جاتا ہے -

مہربان شاہ - اور تمام لطف سے طبیعت کو حظ ہوتا ہے -

آمنہ بیگم - محبوب خاں دیکھتے ہو - ان کا خیال ہے کہ دعوت میں شرکت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو حلال بنایا جائے -

موٹو میاں - اگر ایسا ہو جائے تو کھانے سے اصلی مسرت حاصل ہو جاتی ہے

چاند میاں - اور جب کھانا بقائے حیات کا باعث ہو -

آمنہ بیگم - ماشاءاللہ - خوب فرمایا - (قہقہہ)

بلند اختر - (محبوب سے الگ کو) محبوب صاحب آپ کو بھی شرکت کرنی چاہیئے -

محبوب خاں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟

موٹو میاں (منیر عالم سے) شربت روح افزا کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

منیر عالم (آگ کے پاس کھڑے ہوئے) آپ کے سر کی قسم نہایت عمدہ چیز ہے۔ آپ کو خود اندازہ ہوا ہوگا

موٹو میاں۔ بے شک ذائقہ نہایت لذیذ تھا۔

محبوب خاں (گھبرائے ہوئے) تو کیا یہ شربت نہایت قیمتی ہے؟

موٹو میاں۔ بے شک۔

منیر عالم (مسکراتے ہوئے) ان کو شربت پلانا روپیہ کی بے قدری کرنا ہے

چاند میاں۔ حضرت اس شربت کا بنانا مصوری کے کام سے کم نہیں۔ کیوں بھئی یہی بات ہے نا؟

محبوب خاں۔ بیشک بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

آمنہ بیگم۔ ہاں حضرات! آپ سب بڑے مرتبہ کے لوگ ٹھہرے۔ آپ کے لئے سب چیزیں ایک سی ہیں

چاند میاں۔ آہاہ! بڑی پرانی بات چھیڑی۔ اوفوہ!

مہربان شاہ۔ بیگم صاحبہ کھل رہی ہیں۔

موٹو میاں۔ اور آپ کے باعث۔ اونہہ اونہہ (انگلی بجاتے ہوئے۔)

آمنہ بیگم۔ دوسری بات جو آپ کے اوپر بھی صادق آتی ہے یہ ہے کہ مختلف سالوں کے پھل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پرانے انگور اچھے ہوتے ہیں

مہربان شاہ۔ تو کیا آپ مجھے بڈھے طوطوں میں شمار کرتی ہیں۔ ماشاء اللہ!

آمنہ بیگم۔ حضرت اس سے بھی زائد کچھ اور

چاند میاں۔ سنو سنو! لیکن بیگم صاحبہ میری بابت بھی کچھ ارشاد ہو۔

موٹو میاں۔ ہاں اور میرے لئے بھی۔ میرا کس میں شمار ہے؟

آمنہ بیگم۔ آپ دونوں خدا کے فضل سے بڑے خوش قسمت ہیں۔ (شربت کا گلاس اٹھا لیتی ہے مہمان ہنستے اور مذاق کرتے ہیں)

منیر عالم بیگم صاحبہ ہمیشہ مذاق سے صاف نکل جاتی ہیں۔ گلاس کو نیچے نہ رکھئے۔ کلن! دیکھو اور شربت دو۔ اختر! لو۔ شربت پیو (اختر نہیں لیتا) محبوب خاں کیا تم بھی نہ آؤ گے؟ میں نے کبھی دعوت میں تمہارے ساتھ شرکت نہیں کی۔

(منیم جی کمرے میں کتابوں کی الماریوں میں سے جھانکتے ہیں)

منیم۔ معاف کیجئے۔ میں باہر نہیں نکل سکتا

منیر عالم کیا تمہیں پھر کسی نے مقفل کر دیا؟

منیم۔ جی ہاں اور مہتمم صاحب کنجی لے کر چلے گئے

منیر عالم۔ اچھا تو ادھر سے نکل جاؤ۔

منیم۔ لیکن میرے ہمراہ ایک اور صاحب بھی ہیں۔

منیر عالم آؤ آؤ! دونوں آؤ! کچھ ہرج نہیں۔

(منیم جی اور نظیر خاں دفتر سے نکلتے ہیں۔
منیر عالم پریشان ہو جاتا ہے۔ ہنسی مذاق ختم ہو جاتی
ہے۔ محبوب باپ کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ گلاس
گرا دیتا ہے اور آگ کی طرف رخ کر لیتا ہے)

نظیر خاں (نگاہ نیچی کئے سلام کرتا ہے اور بڑبڑا
تا جاتا ہے) معاف کیجئے غلطی ہوئی۔ دروازہ
رہے۔ معاف کیجئے۔ (منیم جی کے ہمراہ
پیچھے سے باہر نکل جاتا ہے۔)

منیر عالم (دانتوں کو پیستے ہوئے) بدبخت
منحوس منیم۔

بلند اختر (منہ کھلا ہوا اور محبوب کو گھورتے
ہوئے) یقیناً وہ نہیں تھا . . . . .

مولو میاں۔ کیا ہوا۔ کون تھا؟

بلند اختر۔ کچھ نہیں۔ صرف منیم جی اور کوئی اور۔

چاند میاں (محبوب خاں سے) کیا وہ آپ کا
دوست تھا؟

محبوب خاں۔ مجھے نہیں معلوم۔ میں نے
نہیں دیکھا۔

مولو میاں (اٹھتے ہوئے) یہ کیسا مذاق ہے؟

آمنہ بیگم (ملازم سے آہستگی) اس کو کچھ چیز
کوئی عمدہ چیز اپنے ساتھ لے جانے کے لئے دے دو۔

کلن۔ بہت اچھا (چلا جاتا ہے)

بلند اختر۔ (دبی اور گھبرائی آواز میں محبوب خاں
سے) کیا دراصل وہ صاحب تھے؟

محبوب۔ ہاں

بلند اختر۔ پھر بھی آپ خاموش رہے اور
مہمانوں سے انکار کر دیا۔

محبوب خاں۔ بھلا یہاں کیسے . . . .

بلند اختر۔ اپنے باپ کو بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔۔

محبوب خاں (پژمردگی سے) اگر آپ میری جگہ
ہوتے تو . . .

(مہمان جو چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اب
زور سے بولتے ہیں)

چاند میاں (محبوب خاں کے پاس جا کر نرمی
سے) میں سمجھتا ہوں تم اپنی تعلیم کے زمانہ کی
یاد تازہ کر رہے ہو۔
محبوب خاں کیا حقہ سے شوق نہ کرو گے۔ لو۔
آہ بھولا۔ حقہ کی تو سخت ممانعت ہے۔

محبوب خاں - شکریہ - مجھے حاجت نہیں -

مولوٹمیاں - محبوب خاں - اسے بھائی کوئی غزل ہی سناؤ - آپ کو تو خوب یاد ہیں -

محبوب خاں - افسوس جناب مجھے کچھ یاد نہیں -

مولوٹمیاں - افسوس صد افسوس !

(دونوں مہمان دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں)

محبوب خاں (رنجیدگی سے) اختر - اچھا رخصت - بدقسمتی کی ضرب جیسی مجھے لگی ہے اگر کسی کو لگے تو معلوم ہو - اپنے والد صاحب کی خدمت میں سلام عرض کر دینا -

بلند اختر - ٹھیک ! تو کیا سیدھے مکان کو چلے ؟

محبوب خاں - ہاں کیوں ؟

بلند اختر - شاید میں بھی تھوڑی دیر بعد حاضر ہوں -

محبوب خاں - نہیں آپ نہ آئیے گا - میرے گھر نہ آئیے گا - وہ کنج حزن ہے - اور بالخصوص اس شاندار دعوت کے لطف کے بعد معاذ اللہ -

میں خود شہر میں حاضر خدمت ہو سکتا ہوں -

آمنہ بیگم - (اس کے پاس آکر آہستہ سے) محبوب خاں کیا چلے ؟

محبوب خاں - جی ہاں -

آمنہ بیگم - اچھا تو جمیلہ خاتون سے سلام کہہ دینا -

محبوب خاں - شکریہ -

آمنہ بیگم - اور یہ بھی کہہ دینا کہ میری طبیعت اُ[illegible] دیکھنے کو چاہتی ہے - انشاءاللہ جلد آؤں گی -

محبوب خاں - دوبارہ شکریہ (بلند اختر [illegible] ٹھہرو میں خاموشی سے نکل جانا چاہتا ہوں

(دوسرے کمرہ سے نکل جاتا ہے)

آمنہ بیگم (ملازم سے جو واپس آگیا) کیا تم نے کچھ دیدیا -

کلن - جی - شربت کی ایک بوتل دیدی ہے -

آمنہ بیگم - اوفوہ - کیا اور کوئی بہتر چیز نہ تھی

کلن - بیگم صاحبہ نہیں تو وہ اس کو پسند کرتے ہیں

مولٹومیاں - بیگم صاحبہ کیا میں کوئی نغمہ چھیڑ دل

آمنہ بیگم - ضرور بالضرور

سب مہمان - خوب - ضرور - ضرور (وہ سب کمر[illegible] کے باہر جاتے ہیں) بلند اختر رہ جاتا ہے - اُس کا با[illegible] مطالعہ کی میز پر کچھ ڈھونڈھ رہا ہے اور منتظر ہے کہ لڑ[illegible] چلا آئے - وہ حرکت نہیں کرتا منیر عالم خود درواز[illegible] کے پاس جاتا ہے)

منیر عالم - کیا ہے ؟

بلند اختر - کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں -

منیر عالم۔ تو پھر تنہائی میں کہنا۔
بلند اختر۔ نہیں بہت ضروری ہے۔ شاید موقع نہ ملے۔
منیر عالم۔ (اس کے پاس آکر) کیا مطلب ہے؟
(ذیل کی گفتگو کے دوران میں گانے بجانے کی دھیمی آواز دوسرے کمرہ سے آتی ہے)
بلند اختر۔ آپ نے کس طرح اُس گھرانے کو تباہ ہونے دیا؟
منیر عالم۔ تمھارا مطلب محبوب خاں وغیرہ سے تو نہیں؟
بلند اختر۔ جی بے شک۔ سردار نظیر خاں اور آپ کی کبھی گاڑھی چھنتی تھی۔
منیر عالم۔ بے شک۔ بہت گہری دوستی تھی جس کا اب تک خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ یہ ان کی بدولت ہے کہ میری دولت و عزت کو بٹّہ لگا۔
بلند اختر (دھیمی آواز سے) کیا وہ تنہا اس کے ذمّہ دار ہیں؟
منیر عالم۔ اور کون؟
بلند اختر۔ لکڑی کی تجارت میں تو وہ آپ کے شریک تھے۔
منیر عالم۔ لیکن تمھیں معلوم ہے کہ سردار صاحب نے نقشہ تیار کیا تھا۔ ہائے وہ غلط نقشہ۔ دراصل وہ سرکاری لکڑی کے کاٹے جانے کے ذمہ دار ہیں فی الحقیقت اس کی تمام ذمّہ داری اُنھیں پر عائد ہوتی ہے۔ میرے تو فرشتوں کو بھی اُن کے کرتوتوں کا علم نہ تھا۔
بلند اختر۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود سردار صاحب بے چارے کو بھی اپنے کام کا علم نہ تھا
منیر عالم۔ لیکن واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مجرم قرار دیئے گئے۔ اور مجھے رہائی ملی۔
بلند اختر۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ کوئی ثبوت اور تنقیح نہیں گزری۔
منیر عالم۔ بریّت بریّت ہے۔ تم ان خوفناک بھولی بسری ہڈیوں کو کیوں اُکھاڑتے ہو۔ اُنھوں نے میرے دل و دماغ کو وقت سے پہلے مضمحل کر دیا ہے۔ کیا یہی ثمرہ ہے تمھاری اس مدت مدید کی تعلیم کا؟ خوب! اختر یقین مانو کہ جہاں تک میرا تعلق اس معاملہ سے ہے شہر میں سب لوگ اس کو بھول چکے ہیں۔
بلند اختر۔ اُس بدقسمت گھرانے کا کیا حشر ہوا؟
منیر عالم۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ جب سردار صاحب رہا ہوئے تو وہ دیوالیہ ہو چکے تھے۔ اُن کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دنیا میں ایسے انسان ہمیشہ ہوتے رہے

جو قسمت کے ذرا سے جھکولے سے ابدالآباد کے لئے قعر گمنامی میں گر پڑے اور پھر نہ نکلے۔ میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا جو اب چپکے چپکے کر رہا ہوں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

بلند اختر۔ یہ کیسے؟

منیر عالم۔ میں نے سردار صاحب کو اس دفتر میں محرری کے کام پر رکھ لیا ہے اور اُن کی لیاقت سے زیادہ اُن کو تنخواہ دے رہا ہوں۔

بلند اختر (بغور اوپر دیکھتے ہوئے مسکرا کر) کچھ شک نہیں۔

منیر عالم۔ ہنسی کی کیا وجہ؟ شاید اس کی صداقت پر شبہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ حساب کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ میں ایسے اخراجات کی رقم کو درج نہیں کرتا۔

بلند اختر۔ (کھسیانی ہنسی سے) جی میں خوب جانتا ہوں کہ کچھ اخراجات کا نہ لکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

منیر عالم (چونک کر) کیا کہا؟

بلند اختر۔ (استقلال سے) کیا آپ نے کتاب میں درج کیا ہے کہ محبوب کو مصوری سکھلانے میں کتنا خرچ ہوا؟

منیر عالم۔ میں! آخر میں اس کا اندراج کیونکر کرتا؟

بلند اختر۔ مجھے اب علم ہو گیا ہے کہ آپ ہی نے تمام مصارف برداشت کئے اور مجھے یہ بھی معلوم کہ آپ ہی نے محبوب کی زندگی کارآمد بنائی۔

منیر عالم۔ اور پھر بھی تم کہتے ہو کہ میں نے ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کی امداد میں مجھے بہت خرچ کرنا پڑا ہے۔

بلند اختر۔ کیا حساب کتاب میں ان کا کہیں ذکر ہے؟

منیر عالم۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟

بلند اختر۔ اس کی یہی وجہ ہے۔ مجھے یہ بتلائیے کہ کیا آپ کی نظر عنایت اُس پر اُس وقت نہیں ہوئی جب وہ شادی کی فکر میں مبتلا تھا؟

منیر عالم۔ سبحان اللہ۔ اتنی مدت کی بات کیسے یاد رہ سکتی ہے؟

بلند اختر۔ آپ نے اُس وقت ایک کاروباری خط مجھے تحریر کیا تھا اور مکرر تحریر میں چند گول مول الفاظ میں یہ بھی ارشاد تھا کہ محبوب میاں نے خاتون سے شادی کر لی ہے۔

منیر عالم۔ بالکل صحیح۔ خاتون اُس کا نام تھا۔

بلند اختر۔ لیکن آپ نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہ خاتون۔ جمیلہ خاتون ہماری داروغہ تھیں

منیر عالم (بناوٹی ہنسی سے) نہیں۔ مجھے معلوم تھا
کہ تمھیں جمیلہ سے اس قدر اُنسیت ہے
بلند اختر۔ نہیں کچھ بھی نہیں۔ لیکن (آواز کو نیچا کرکے)
ہمارے گھر میں کوئی اور بھی تھا جو اس میں خاص طور
سے دلچسپی لیتا تھا۔
منیر عالم۔ کیا مطلب ہے؟ (غصہ سے) کیا
تمہارا مطلب اپنے باپ سے ہے؟
بلند اختر (دھیمی لیکن مستقل آواز سے) جی۔
یہی مطلب ہے۔
منیر عالم۔ اور تم ____ تم کو یہ جرأت۔ یہ ہمت
اور وہ احسان فراموش ناشکرا مصوّر۔ ذ
ہاں کیسے آیا۔ اور یہ الزام میرے سر پر تھوپا؟
بلند اختر۔ محبوب خاں نے تو ایک بات بھی ہرگز
ایسی نہیں کہی۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ اس کو کبھی
آپ کی طرف سے ایسا شبہ ہوا ہو
منیر عالم۔ تو پھر تم کو کیسے علم ہوا۔ کیا فرشتے کہہ گئے؟
بلند اختر۔ مرحومہ اماں نے مجھے بتایا۔
منیر عالم۔ ماں نے! بیشک میرا بھی یہی خیال ہے
اس کی اور تمھاری دونوں کی خوب ملی بھگت تھی۔
یہ اُس کی ترکیب تھی کہ تم کو مجھ سے شروع سے
جدا رکھا۔

بلند اختر۔ نہیں بلکہ یہ مصیبتیں تھیں جن کے باعث
وہ بیمار پڑ گئیں اور ختم ہو گئیں۔
منیر عالم۔ ذرا بھی تو تکلیف و پریشانی نہ تھی۔ غلط
بالکل غلط۔ بیمار اور مدقوق آدمی کا کوئی کیا کر سکتا ہے؟
میں سچ کہتا ہوں اور کیا تم ایسے ہی خیالات میں غوطہ
زن ہو؟ اور اپنے باپ کے متعلق تمام قسم کی پرانی
فراموش شدہ افترا پردازیوں اور بہتانوں کی
کرید کر رہے ہو۔ شاباش بیٹا شاباش۔ میاں
ان حرکتوں سے باز آؤ۔ اور مفید کام کرو۔
بلند اختر۔ جی مناسب۔
منیر عالم۔ کام کی مشغولیت تم کو ان بیہودہ افکار
سے نجات دے دے گی۔ کیا وجہ ہے کہ اتنی مدت
سے کام میں لگے ہو۔ اور ایک کوڑی کی ترقی نہیں
ہوئی؟ یہ محض حماقت ہے۔ بے وقوفی ہے۔
بلند اختر۔ کاش مجھے اس حقیقت کا علم ہوتا!
منیر عالم۔ اوہ۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم آزاد ہونا
چاہتے ہو۔ اور مجھ سے جدا اچھا۔ اور یہ موقع
آزادی کے حاصل کرنے کا ڈھونڈا ہے۔ خوب بہتر
بلند اختر۔ فی الحقیقت۔ اور نہیں تو مجھے کیا پڑی
تھی۔
منیر عالم۔ جب میں نے تمھیں لکھا کہ کار ضروری

ہے جلد آؤ۔ ضرورت ہے تو۔۔۔۔۔

بلند اختر۔ میں سمجھا نہیں کیا ارشاد ہے؟ میں ہمیشہ انتظار میں رہا کاش آپ مفصل لکھتے!

منیر عالم۔ میں کارخانہ میں تم کو حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔

بلند اختر۔ میں اور حصہ دار!

منیر عالم۔ ہاں۔ہاں۔ یہ ضرور نہیں کہ تم ہمیشہ موجود رہو۔ تم یہاں شہر میں انتظام کرو۔ میں جنگلات میں دیکھ بھال کرونگا۔

بلند اختر۔ آپ؟

منیر عالم۔ ہاں میں۔ میں کام کے قابل نہیں رہا میری بینائی کمزور ہو چلی ہے۔ اب مجھے احتیاط لازم ہے۔

بلند اختر۔ آنکھیں تو سدا کی بیمار تھیں۔

منیر عالم۔ نہیں ایسی کمزور نہیں تھیں علاوہ بریں ماحول کا بھی اقتضا ہے کہ میں کچھ عرصہ کے لئے وہاں چلا جاؤں۔

بلند اختر۔ ایسا خیال تو میرے دماغ میں بھی کبھی بھی نہیں گزرا۔

منیر عالم۔ اختر سنو! ہم دونوں کے طریق زندگی بالکل مختلف ہیں۔ لیکن پھر بھی باپ بیٹے ہیں۔ یہ مناسب ہے کہ ہم میں مصالحت ہو جائے۔

بلند اختر۔ میں سمجھتا ہوں ظاہری مصالحت۔

منیر عالم۔ بہر حال وہ بھی خالی از مصلحت نہیں۔ اختر اس پر غور کرو کیا یہ ممکن نہیں ہے؟

بلند اختر۔ (خاموشی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے) ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟

منیر عالم۔ کیا مطلب؟

بلند اختر۔ مجھے آپ کسی معاملہ میں آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔

منیر عالم۔ میرا اور تمھارا تعلق اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔

بلند اختر۔ ممکن ہے!

منیر عالم۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصہ میرے ساتھ رہو۔ اختر میں تنہا ہوں۔ میں خود کو ہمیشہ تنہا خیال کرتا رہا ہوں۔ اور اب جب کہ پیری کا عالم ہے مجھے تنہائی کا خیال مارے ڈالتا ہے۔ مجھے کسی رفیق کی ضرورت ہے۔

بلند اختر۔ آمنہ بیگم کیسی ہیں؟

منیر عالم۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُس کی صحبت ناگزیر ہے۔ وہ ہوشیار اور تجربہ کار ہے۔ گھر کو بنائے ہوئے ہے۔ اور مجھے ایسی ہی چیز درکار ہے۔

بلند اختر۔ بجا ارشاد۔ میری سمجھ میں تو یہ آپ کے حسب منشا چیز مل گئی

منیر عالم۔ ہاں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس کو قیام نہیں۔ دنیا کی نگاہ میں ایسے حالات کے ماتحت ایک عورت کی ذات پر حرف آتا ہے۔ اور فی الحقیقت زبان کو کون روک سکتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ضرور کچھ بھید ہے

بلند اختر۔ جی اور بالخصوص جب ایسی شان دار دعوتیں لوگوں کو دی جائیں تو شکوک کی بہت گنجائش ہوتی ہے

منیر عالم ہاں۔ لیکن کیا تم نے اس کی بابتہ کچھ سُنا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اس کو زیادہ عرصہ گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اگر کیا .... اگر میری محبت کے باعث اُس نے دنیا کی باتوں اور طعن و تشنیع کی پرواہ نہ کی ؟ .... اختر تم میں عدل و انصاف کا جذبہ کس قدر صحیح ہے ؟ کیا تم کو محسوس نہیں ہوتا ؟

بلند اختر (دخل دیتے ہوئے) یہ بتلائیے۔ زوائد کو چھوڑ دیجئے۔ کیا آپ کی منشا شادی کی ہے ؟

منیر عالم۔ اگر بالفرض ایسا ہو تو کیا ؟

بلند اختر۔ کچھ نہیں۔ ہاں کچھ۔ ....

منیر عالم۔ تو کیا تمھارے خیال میں یہ امر ناقابلِ برداشت ہو گا ؟

بلند اختر۔ بالکل بھی نہیں۔ کسی طرح بھی نہیں۔

منیر عالم۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اپنی ماں کی یاد کے باعث تم ....

بلند اختر۔ میں کوئی پاگل نہیں۔ سڑی نہیں۔

منیر عالم۔ تم ہو یا نہیں۔ بہر حال تم نے ایک بھاری بوجھ میرے سر سے الگ کر دیا۔ مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ اس معاملہ میں تم کو مجھ سے ہمدردی ہے

بلند اختر (غور سے دیکھ کر) او نہ اب میں سمجھا کہ کس طرح آپ مجھے آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں۔

منیر عالم آلۂ کار! کیا مطلب ؟

بلند اختر۔ خیر لفظوں میں کیا رکھا ہے (ہنستے ہوئے) جب ہم دونوں تنہا ہوں .... اب مجھے معلوم ہوا یہی سبب تھا کہ میرا آنا ضروری تھا۔ آمنہ بیگم صاحبہ کی تسلّی طبع کے لئے۔ گھر بنانے کے بہانے میں آپ کی مدد کروں۔ .... کمال ہے کمال۔ باپ اور بیٹا۔ بہت پُر لطف مذاق

منیر عالم۔ تم کو ایسا کہنے کی کیسے جرأت ہوتی ہے

بلند اختر۔ بھلا گھریلو زندگی یہاں کبھی تھی۔ مجھے جہاں تک یاد ہے کبھی بھی نہیں۔ لیکن اب اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ بلاشبہ اگر شادی

ہو گئی تو اس کا لاجواب اثر ہو گا کہ بیٹا محبتِ پدری
کے جوش میں اپنے بوڑھے باپ کی شادی میں شرکت
کے لئے بھاگا آیا۔ آہ اُس غریب مرحومہ ماں کی
تمام مصائب و تکالیف کی افواہوں کا کیا ہو گا؟
وہ بالکل بھولی بسری ہوں گی۔ اُس کے بیٹے کے
عمل سے قطعی فراموش

منیر عالم اختر! مجھ سے زیادہ بدبخت انسان
کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ جس سے تم اس قدر آزردہ
و متنفر ہو

بلند اختر۔ (دھیمی آواز میں) آپ کا بھی تو
یہی رویہ ہے

منیر عالم۔ (قدرے آواز کو ہلکا کر کے) تم کو اپنی
ماں کی آنکھوں سے یہ انکشاف ہوا ہوگا۔ لیکن تم کو
جاننا چاہیئے کہ اُس کی آنکھیں کبھی غلط نما
بھی تھیں

بلند اختر (کانپنے لگتا ہے) میں آپ کا مطلب سمجھا
لیکن اُس کی اس افسوسناک کمزوری کا کون ذمہ دار
ہے؟ آپ اور آپ کی ...... اللہ ہاں وہ
عورت بھی جس سے بعد میں آپ عاجز آ گئے اور وہ
محبوب خاں کے سر منڈھ دی گئی۔

منیر عالم ۔ (کندھوں کو مٹکاتے ہوئے) تمھاری
ماں بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھی۔

بلند اختر۔ (لاپروائی سے) اور اب وہ
مثل ایک سادہ لوح اور صاف دل بچے کے ان
دھوکہ بازیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اور ایک ہی
اس قسم کی عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کو مطلق
خیال نہیں کہ اس کے تمام گھر کی بنا دروغ و کذب پر
ہے۔ (باپ کی طرف ایک قدم بڑھ کر) جب
آپ کے گزشتہ واقعاتِ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں
ایک میدانِ جنگ کی تصویر نگاہوں کے سا[منے]
پھر جاتی ہے جو کچھ تباہ شدہ زندگیوں سے

منیر عالم۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان
اختلاف زیادہ گہری ہے۔ اس کو کم نہیں کیا جا سکتا

بلند اختر (اپنے کو روک کر سلام کرتا ہے) میرا بھی
یہی خیال ہے۔ لہذا مجھے رخصت ہونا چاہیئے۔

منیر عالم۔ کہاں جاؤ گے۔ گھر کے باہر؟

بلند اختر۔ جی ہاں۔ میں اپنی زندگی کی فکر کروں گا

منیر عالم۔ کیا مطلب؟ کیا منشا؟

بلند اختر۔ اگر میں بتلاؤں تو آپ ہنسیں گے۔

منیر عالم۔ ایک تنہا آدمی اس قدر جلدی نہیں ہنستا

بلند اختر۔ (کمرے کی پشت کی طرف اشارہ کر کے)
ابا جان۔ دیکھئے۔ بیگم صاحبہ مہمانوں کے ساتھ

غریب میں مشغول ہیں - سلام - خدا حافظ -
(چلا جاتا ہے)
(مہمان دوسرے کمرے میں ہنستے
ہوئے داخل ہوتے ہیں)

منیر عالم - (حقارت سے گنگناتے ہوئے)
آہ - آہ - مجبور اور پھر کہتا ہے کہ
حسّاس نہیں!

دوسرا ایکٹ

(سین - محبوب کے مکان کا ایک بڑا
کمرہ اس میں آئینہ دار کھڑکیاں جن پر نیلے پردے پڑے
ہوئے ہیں - کمرہ کا دروازہ داہنے گوشہ میں ہے اور کچھ
دور ہٹ کر اُسی طرف بیٹھک کا دروازہ ہے - بائیں
دیوار میں دو دروازے ہیں - اُن کے درمیان ایک
آتش دان ہے نیز پشت کی دیوار میں دو بڑے در ہیں
مصوری خانہ سادہ لیکن آرام دہ ہے - دروازوں
کے درمیان دائیں جانب دیوار کے پاس ایک
صوفہ - ایک میز اور چند کرسیاں ہیں - میز پر گلوب والا
لیمپ روشن ہے - آتش دان کے پاس ایک
پرانی آرام کرسی رکھی ہے - آلاتِ مصوری اِدھر
اُدھر کمرے میں پڑے ہیں - پشت کی دیوار کے
مقابل دوسرے دروازہ کی بائیں طرف کتابوں
کی الماری - صندوق - دواؤں کی بوتلیں اور مختلف
قسم کے اوزار و آلات رکھے ہیں - میز پر تصویریں
برش - کاغذ وغیرہ ہیں - جمیلہ خاتون میز کے پاس ایک
کرسی پر بیٹھی کچھ سی رہی ہے - رئیسہ صوفہ پر بیٹھی کتاب
پڑھ رہی ہے - ایک ہاتھ آنکھوں کے سامنے ہے)

جمیلہ خاتون (متعدد بار رئیسہ کی طرف دیکھ کر متوحش
ہو کر اُس کو پکارتی ہے) رئیسہ! (رئیسہ کچھ نہیں سنتی
(زور سے) رئیسہ!

رئیسہ - (ہاتھ نیچے کر لیتی اور اوپر دیکھتی ہے) ہاں ہاں!

جمیلہ - بیٹی دیکھو زیادہ دیر تک نہ پڑھو

رئیسہ - اچھا - ذرا تو اور پڑھ لوں - کیا نہیں؟

جمیلہ - نہیں بیٹی ہرگز نہیں - تمھارے باپ پسند نہیں
کرتے - کتاب کو رکھ دو - وہ خود بھی رات کے وقت
نہیں پڑھتے

رئیسہ (کتاب بند کرتے ہوئے) ابا جان پڑھائی
کی زیادہ فکر نہیں کرتے

جمیلہ (سینا بند کر دیتی ہے اور ایک پنسل اور ایک
نوٹ بک اُٹھا لیتی ہے) تمھیں یاد ہے کہ آج مکھن
کتنے کا صرف ہوا؟

رئیسہ - پونے دو آنہ کا -

جمیلہ - اونہہ - ٹھیک - (لکھتی ہے) معاذ اللہ -
بڑا مکھن اس گھر میں صرف ہوتا ہے - اور اس پر دودھ
اور جلیبی - دیکھوں (لکھتی ہے) اور پیالی (جمع کرتی)

سب مل کر ....

رئیسہ - ابھی تو مٹھائی رہ گئی

جمیلہ - ہاں بے شک (لکھتی ہے) خرچ تو بڑھتا
جاتا ہے - مگر مجبوری کچھ علاج نہیں -

رئیسہ کھانے کے وقت تو ہمیں کسی خاص چیز کی ضرورت
نہیں ہوئی - کیوں کہ ابا جان باہر تھے -

جمیلہ - یہ بھی اچھا ہوا - اور سنو چار آنے تصویروں
کے ہوئے -

رئیسہ - او ہو اتنا -

جمیلہ - ہاں چار آنے -

(خاموش رہتی ہے - جمیلہ سینا شروع کر دیتی
ہے - رئیسہ ایک کاغذ کا ٹکڑا اور پنسل اُٹھاتی ہے -
اور پھول بنانے لگتی ہے - اور بایاں ہاتھ آنکھوں
کے سامنے کر لیتی ہے)

رئیسہ - سُنا ہے آج منیر عالم صاحب کے یہاں بڑے
دھوم دھام کی دعوت ہے - ابا جان وہاں تشریف
لے گئے ہیں - یہ خیال کر کے مجھے تو ہنسی آتی ہے

جمیلہ - دراصل وہ منیر عالم صاحب کے مہمان ہو کر
نہیں گئے - بلکہ صاحبزادے کی عنایت ہے -

رئیسہ - مجھے تو اندیشہ ہے - خدا کرے ابا جان جلد
آجائیں - انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئینہ بیگم سے
کوئی عمدہ تحفہ میرے لئے لائیں گے

جمیلہ - مجھے خوب معلوم ہے کہ اُس گھر میں بہت سی عمدہ
باتیں ہو رہی ہیں

رئیسہ (پھول بناتے ہوئے) اور مجھے بھوک
معلوم ہو رہی ہے

(نظیر خاں اندر آتا ہے - کاغذوں کا پلندہ بغل میں
اور ایک پارسل جیب میں ہے)

جمیلہ - خالو ابا - آج آپ کو بہت دیر ہو گئی ؟

نظیر خاں - ہاں ! دفتر کو کسی نے بند کر دیا تھا اور
مجھے منیم جی کا انتظار کرنا تھا - پھر مجھے مکان کے
اندر سے ہو کر آنا پڑا

رئیسہ - دادا ابا - کیا اُنھوں نے اور نقل کا کام دیا -

نظیر خاں - ہاں بیٹی - دیکھو یہ ہے - (پلندہ دکھاتا ہے)

جمیلہ - بہت خوشی کی بات ہے -

رئیسہ - اور آپ کی جیب میں بھی تو ایک پارسل ہے

نظیر خاں - واقعی ؟ وہ کچھ نہیں - کچھ نہیں - (اپنی
چھڑی کمرے کے ایک گوشہ میں کھڑی کر دیتا ہے)
دُلہن ! دیکھو یہ کام زیادہ عرصہ تک جاری رہے گا
(پشت کی طرف کا ایک کواڑ قدرے کھولتا ہے
اور تھوڑی دیر تک دروازے میں دیکھتا ہے اور
پھر ہوشیاری سے بند کر دیتا ہے) آہا ! آہا !

وہ خود اپنی مرضی سے ٹوکری میں چلی گئی۔ آہا! آہا!

رئیسہ۔ دادا میاں! کیا آپ کو یقین ہے کہ اس کو ٹوکری میں جاڑا نہیں لگے گا؟

نظیر خاں۔ ماشاءاللہ یہ خوش۔ جاڑا! اور اس بیال میں (بائیں طرف کے آخری دروازے پر جاکر) دیا سلائی لاؤ دیا سلائی۔

جمیلہ۔ ارے دیکھنا میز کے پاس کوئی معلوم ہوتا ہے۔

(نظیر خاں اپنے کمرہ میں جاتا ہے)

رئیسہ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ دادا میاں کو نیا کام مل گیا

جمیلہ۔ ہاں بیچارے بڑے میاں کا جیب خرچ تو نکل آئے گا

رئیسہ۔ اور ہوٹل میں جانے کا موقع نہ ملے گا؟

جمیلہ۔ ہاں وہ اور بات ہے

رئیسہ (تھوڑے توقف سے) کیا وہ ابھی تک دعوت سے نہیں نمٹے؟

جمیلہ۔ خدا معلوم۔ غالباً نہیں۔

رئیسہ۔ ابا جان تو آج بڑے مزے کے کھانے کھائیں گے اور جب وہ گھر آئیں گے تو بہت خندہ مزاج ہوں گے۔ اماں! کیا خیال ہے؟

جمیلہ۔ ہاں لیکن غور تو کرو کہ کیا لطف کی بات ہوگی جب ان کو معلوم ہوگا کہ کمرہ کرایہ پر دیدیا گیا ہے۔

رئیسہ۔ لیکن اس کے بتلانے کی ابھی ضرورت نہیں

جمیلہ۔ ہاں ذرا ذرا سی شے کا فکر ہے۔ اور کمرہ خالی پڑا ہے

رئیسہ۔ میرا یہ مطلب تھا کہ ہمیں یہ خبر آج ہی سنا دینی چاہیئے۔ وہ خود ہی ہشاش بشاش ہونگے اور اس لیئے کمرہ کی خوش خبری کسی دوسرے موقعہ کے لیئے مناسب ہے

جمیلہ۔ (اس کی طرف دیکھ کر) کیا تم پسند کرتی ہو کہ اپنے باپ کو جب وہ شام کے وقت گھر پر آئیں کوئی مژدہ سنایا کرو

رئیسہ۔ جی۔ کیونکہ اس وقت ان کی خوشی بڑھ جائے گی

جمیلہ (غور کرتے ہوئے) بیشک یہ صحیح ہے

(نظیر خاں پھر اندر آتا ہے اور بائیں طرف کے پاس والے دروازے سے جاتا ہے)

جمیلہ (اپنی کرسی میں گھوم کر اپنے خسر سے) خالو جان! کیا باورچی خانے میں کسی چیز کی ضرورت ہے؟

نظیر خاں۔ ہاں بیٹی۔ تم تکلیف نہ کرو۔

(چلا جاتا ہے)

جمیلہ۔ کہیں وہ آگ تو نہیں کر رہے ہیں۔

(تھوڑی دیر کے بعد) رضیہ! دیکھو تو وہ کیا
کر رہے ہیں؟
(نظر خاں ایک پیالہ میں تھوڑا گرم پانی لاتا ہے)
رضیہ - دادا جان! گرم پانی لائے؟
نظر خاں - ہاں بیٹی! مجھے ضرور نہانا ہے۔ کچھ
تھکا ہے۔ روشنائی خشک ہو کر جم گئی ہے
جمیلہ - لیکن پہلے کھانا تو کھا لیجئے۔ ورنہ ٹھنڈا
ٹھنڈا ہو رہا ہے۔
نظر خاں - مجھے بہت کام کرنا ہے۔ کھانا تو دو چار
پینے کی مہلت نہیں۔ دیکھو کسی کو کر سکتے ہیں نہ
لے دنیا۔
(نظر خاں دوسرے کمرہ میں جاتا ہے۔ جمیلہ اور رضیہ ایک دوسرے کو
تکتی ہیں)
جمیلہ - (دبی زبان سے) کیا بتلا سکتی ہو کہ ان کو
روپیہ کہاں سے ملا ہوگا
رضیہ - منیم جی سے ملا ہوگا
جمیلہ - ایک کوڑی بھی نہیں۔ منیم جی تو تنخواہ
میرے پاس بھیج دیتے ہیں
رضیہ - تو شربت کی بوتل ادھار لائے ہوں گے۔
جمیلہ - افسوس! بدقسمتی سے ان کو ادھار بھی
نہیں مل سکتا

(محبوب خاں اندر داخل ہوتا ہے سر پر ٹوپی ہے اور
بدن پر کوٹ)
جمیلہ (سینا چھوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے) کیوں!
واپس آ گئے!
رضیہ (دوڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے) ابا جان
ہم آپ کی راہ تک ہی رہے تھے
محبوب خاں (ٹوپی اتار لیتا ہے) ہاں
مہمان چلنے لگے تو میں بھی آ گیا
رضیہ - اس قدر جلدی،
محبوب خاں ہاں آخر دعوت ہی تو تھی
(اپنا کوٹ اتارنے لگتا ہے)
جمیلہ - ٹھہریئے - میں اتارتی ہوں
رضیہ - اور میں بھی - (کوٹ اتارتی ہیں
اور اسے کھونٹی پر ٹانگ دیتی ہے) ابا جان
کیا بہت ہنگامہ تھا؟
محبوب خاں - نہیں - بہت زیادہ مہمان نہ
تھے - کوئی بارہ - چودہ مہمان
جمیلہ - اور آپ نے سب سے باتیں کیں؟
محبوب خاں - ہاں قدرے - لیکن اختر میاں
نے زیادہ دیر تک روکا
جمیلہ - کیا وہ اب بھی ویسا بدنما اور بدشکل ہے؟

محبوب خاں ۔ ہاں وہ کوئی حسین آدمی نہیں ۔
کیا ابا جان آگئے ؟

رئیسہ ۔ ہاں دادا ابا کچھ لکھ رہے ہیں

محبوب خاں ۔ کیا وہ کچھ کہتے تھے ؟

جمیلہ ۔ نہیں ۔ خیر تو ہے ؟

محبوب خاں ۔ کیا کچھ تذکرہ نہیں کیا ؟ میرا
خیال ہے کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ وہ منیم جی کے
ہاں گئے تھے ۔ ذرا میں اندر جا کر تو دیکھوں ؟

جمیلہ ۔ نہیں اندر جانا مناسب نہیں ۔

محبوب خاں ۔ کیوں نہیں ۔ کیا اُنھوں نے
اندر جانے کی ممانعت کر دی ہے ؟

جمیلہ ۔ وہ نہیں چاہتے کہ آج رات کوئی اندر جائے ۔

رئیسہ (اپنی ماں کی طرف اشارہ کرکے) اونہہ اونہہ

جمیلہ (لاپروائی سے) وہ اندر آئے اور
کچھ گرم پانی لے گئے

محبوب خاں ۔ تب میں خیال کرتا ہوں کہ وہ ؟

جمیلہ ۔ ہاں ۔ بالکل ٹھیک ۔

محبوب خاں ۔ اللہ اکبر ! یہ بڑھاپا اور یہ
کرتوت !

(نظیر خاں کمرے سے باہر آتا ہے ۔ وہ کوٹ
پہنے ہوئے ہے اور سگریٹ پی رہا ہے)

نظیر خاں ۔ تم آگئے ۔ میں نے تمھاری آوا

محبوب خاں ۔ ابھی آیا ہوں ۔

نظیر خاں ۔ تم نے اُس وقت مجھے نہیں دیکھا

محبوب خاں ۔ نہیں لیکن اُنھوں نے بتایا
وہاں سے گزرے اور لہذا میں نے خیال
میں آپ سے بعد میں پہونچوں گا

نظیر خاں ۔ بہت مناسب ۔ محبوب ! وہ سب کو
لوگ تھے ؟

محبوب خاں ۔ ہر نداق کے نسیم ۔ فارد
اور حامد ۔ اور اُن کا کیا نام ؟ مجھے یاد نہیں
یہ سب کچہری دربار کے آدمی ہیں

نظیر خاں (سر کو ہلاتے ہوئے) جمیلہ تم نے سُ
کچہری دربار کے آدمی !

جمیلہ ۔ بے شک وہ گھرانے کے مرتبہ کے لحاظ
سے مناسب ہی ۔

رئیسہ ۔ کیا گانے اور شعر بازی کا بھی مشغلہ تھا ؟

محبوب خاں ۔ نہیں ۔ صرف گپ بازی ۔ اُنھوں
نے مجھ سے غزل خوانی کی فرمائش کی تھی مگر میں
تیار نہ تھا

نظیر خاں ۔ اونہہ ۔ تم تیار نہ تھے ؟

جمیلہ ۔ کیا ہوا .. کچھ کلام سُنا دیا ہوتا

محبوب خاں ۔نہیں میرا خیال ہے کہ آدمی کو ہر جائی
نہ ہونا چاہیئے (ٹہلتے ہوئے) اور بالخصوص میں
ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ۔

نظیر خاں ۔نہیں ۔نہیں ۔محبوب موم کا کھلونا نہیں ہے ۔

محبوب خاں ۔میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیوں
میں دوسروں کا آلۂ تفریح بنوں ۔جب میں خود تفریح
طبع کی تلاش میں جاتا ہوں ۔انھیں خود کوشش کرنی
چاہیئے ۔ان کی تو عادت میں داخل ہو گیا ہے کہ تمام
عمر گھر کھاتے پیتے پھریں ۔انھیں خود بھی کبھی ان
لطیف کھانوں کا بدل دینا چاہیئے ۔

جمیلہ ۔لیکن تم نے اُن پر یہ بات ظاہر نہیں کی ۔

محبوب خاں (گنگناتے ہوئے) اونہہ اونہہ
بس اتنا جانتا ہوں کہ اُنھوں نے کوئی ایسی بات سُنی
جس سے وہ حیرت میں رہ گئے ۔

نظیر خاں ۔اور وہ سب کچہری دربار کے آدمی تھے؟

محبوب خاں ۔اس سے کیا ہوتا ہے اور پھر ہم
شربت کی بابت گفتگو کرنے لگے ۔

نظیر خاں ۔روح افزا! کیا کہا؟ وہ تو نہایت عمدہ
شربت ہوتا ہے ۔

محبوب خاں ۔بے شک نہایت عمدہ ۔لیکن آپ کو
معلوم ہے سب شربت ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے ۔
یہ سب قوام پر منحصر ہے ۔

جمیلہ ۔آپ تو سب ہی باتیں جانتے ہیں ۔

نظیر خاں ۔اور کیا وہ اس کی بابت بحث کر رہے تھے؟

محبوب خاں ۔انھوں نے بحث شروع کی
لیکن اُن کو معلوم ہوا کہ درباری لوگوں کی یہی عادتیں
ہوتی ہیں ۔تو خاموش ہو گئے ۔

جمیلہ ۔میری سمجھ میں تو خاک نہیں آتا کہ کیوں کر تم کو ان
باتوں کے لئے وقت مل جاتا ہے؟

محبوب خاں ۔لیکن اب اس قصہ کو چھوڑ دو ۔
تمام وقت چپکے چپکے خاموشی سے گزر گیا ۔وہ سب
بہت خوش مذاق اور پُر لطف آدمی تھے ۔مجھے
اُن کے جذبات کو ٹھیس نہیں لگانی چاہیئے ۔

رئیسہ ۔(باپ کو لپٹ کر) ابا جان! یہ اچکن
آپ پر بہت اچھی معلوم ہوتی ہے ۔بہت پیاری ۔

محبوب خاں ۔کیا تم ایسا خیال نہیں کرتی ہو ۔یہ بہت
اچھی اور عمدہ اچکن ہے ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا
خاص طور سے میرے لئے تیار کی گئی ہے ۔البتہ آستین
کسی قدر تنگ ہیں ۔رئیسہ ۔ذرا ان کو کھینچو تو اچکن
اُتارتا ہے) میں اپنی صدری پہنوں گا ۔بیگم! بھلا
صدری کہاں ہے؟

جمیلہ ۔یہ رہی ۔(صدری لاتی ہے اور پہنا دیتی ہے

محبوب خاں - یہ ٹھیک ہے۔ دیکھو بیگم بھول نہ جانا مسعود کو صبح سویرے اچکن دینی ہے۔

جمیلہ - (ٹہلتے ہوئے) نہیں نہیں -

محبوب خاں (انگڑائی لیتے ہوئے) یہ بہت آرام دہ ہے اور میرا خیال ہے کہ ایسا ڈھیلا اور آرام دہ کپڑا میرے مذاق کے مطابق ہے - رئیسہ! تمھارا کیا خیال ہے؟

رئیسہ - بالکل ٹھیک ابا جان!

محبوب خاں - اور اگر میں مفلر کو گلے میں اس طرح ڈالوں تو کیسا رہے گا -

رئیسہ - یہ تو ماشاءاللہ اور بھی اچھا معلوم ہوتا ہے (تھوڑے وقفہ کے بعد) ابا جان!

محبوب خاں - کیا بیٹیا؟

رئیسہ - آپ کو معلوم نہیں؟

محبوب خاں - نہیں - تمھارے سر کی قسم -

رئیسہ (رونی صورت بنا کر) ابا جان آپ مجھے زیادہ دق نہ کریں -

محبوب خاں - لیکن کیا؟

رئیسہ (جھپٹ کر) بس بہکائیے نہیں - وہ عمدہ چیزیں نکالئے جن کے لانے کا وعدہ کیا تھا -

محبوب خاں - اوہو - یقین مانو مجھے قطعی خیال نہیں رہا -

رئیسہ - نہیں ابا جان - آپ ہنسی کر رہے ہیں - یہ اچھی بات نہیں - جلدی بتلایئے آپ نے کہاں چھپا دی ہیں -

محبوب خاں - خدا کی قسم - میں بالکل بھول گیا لیکن ٹھہرو میں تمھارے واسطے اور چیز لایا ہوں (اٹھتا ہے اور اچکن کی جیب ٹٹولتا ہے)

رئیسہ - (کودتی ہے اور تالیاں بجاتی ہے) اماں جان! اماں جان!

جمیلہ - ٹھہرو - ذرا صبر سے کام لو

محبوب خاں - (ایک پرچہ نکال کر) دیکھو - یہ کیا ہے؟

رئیسہ - یہ تو محض کاغذ کا ٹکڑا ہے -

محبوب خاں - یہ کرایہ کا رقعہ ہے - کل کرایہ کا حساب - دیکھو یہ درج ہے -

رئیسہ - کیا یہی وہ چیز ہے؟

محبوب خاں - میں نے تم سے کہا کہ تمھارے لئے کچھ لانا بھول گیا - لیکن میں تم کو تمام بڑی چیزوں کی بابت بتاؤں گا - یہاں کرسی پر بیٹھو - اور اس فہرست کو پڑھو - میں تمھیں ان کے ذائقے اور مزے بتاؤں گا - دیکھو - رئیسہ - - - -

رئیسہ - (آنکھوں میں آنسو بھر لا کر) شکریہ -

(بیٹھ جاتی ہے لیکن پڑھتی نہیں۔ جمیلہ اشارہ کرتی ہے اور محبوب خاں اس کو دیکھ لیتا ہے)

محبوب خاں (ٹہلنے لگتا ہے) یہ امر غور کے قابل ہے کہ ایک کنبے والے باپ کو کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اگر وہ ایک ذراسی چیز کو بھی بھول جاتا ہے تو بس قیامت آجاتی ہے۔ لوگوں کے منہ سوجھ جاتے ہیں لیکن ان باتوں کے برداشت کرنے کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔ (آتش دان کے پاس اپنے باپ کے نزدیک کھڑا ہو جاتا ہے) ابّا جان کیا آپ نے وہاں آج شام کو کچھ دیکھا؟

نظیر خاں - بے شک۔ وہ لوٹکری میں سو رہی ہے۔

محبوب خاں - واقعی؟ تو اُس کو عادت ہو جائیگی۔

نظیر خاں - میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا لیکن پھر بھی تم چاہتے ہو کچھ نہ کچھ قباحت .....

محبوب خاں - کچھ نہ کچھ درستی؟ آخاہ!

نظیر خاں - ہاں۔ لیکن ہمیں ہوشیار رہنا چاہیئے۔

محبوب خاں - اچھا تو ہمیں اُن اصلاحات کی بابت گفتگو کرنی چاہیئے۔ آیئے صوفے پر بیٹھیں۔

نظیر خاں - اچھا۔ لیکن پہلے میں حقّہ کا ایک کش لگالوں (کمرہ میں جاتا ہے)

جمیلہ (محبوب کی طرف مسکراہٹ سے) حقہ کا کش!

محبوب خاں - ہاں۔ ہاں بیگم۔ حقہ کا کش۔ غریب نادار وخستہ بوڑھا باپ۔ آہ! ہاں یہ اصلاحات وایجادات! کاش! ہمیں ان سے آج چھٹکارا ہو جاتا۔

جمیلہ - تمھیں تو کل بھی وقت نہ ملے گا۔

رئیسہ - (بات کاٹ کر) نہیں امّاں۔ ان کو فرصت ہے۔

جمیلہ - کیا یاد نہیں کہ کل کتنی تصویریں درست کرنی ہیں۔ باربار تقاضا ہو چکا ہے۔

محبوب خاں - سبحان اللہ۔ وہ تصویریں۔ میں اُنھیں چشم زدن میں ٹھیک کر دوں گا۔ کیا کوئی نیا کام بھی ہے۔

جمیلہ - افسوس۔ نہیں۔ صرف کل دو جگہ جانا ہے۔

محبوب خاں - بس۔ اچھا تو اگر لوگ خود یہاں نہ آئے۔

جمیلہ - لیکن میں کیا کروں؟ میں تو بہت کوشش کرتی ہوں۔

محبوب خاں - جی ہاں ٹھیک کہا۔ اور اس کا نتیجہ معلوم۔ میرا خیال ہے کہ کسی نے ادھر کو آکر جھانکا بھی نہیں۔

جمیلہ - بے شک۔ ابھی نہیں۔

محبوب خاں - اور امید بھی کیا ہو سکتی تھی۔ جب لوگوں کو اپنے ہوش و حواس کی ہی خبر نہ ہو تو۔ . . . . . . بیگم در اصل تم سستی کرتی ہو۔ جیست بنو جیست۔

رئیسہ (آگے بڑھ کر) ابا جان آپ کا الغوزہ لاؤں۔

محبوب خاں - نہیں نہیں۔ میری زندگی میں بھلا یہ عیش کہاں (ٹہلنے لگتا ہے) کام۔ کام۔ میں کل دکھلا دوں گا کہ کام کا کیا مطلب ہے۔ خوب سمجھ لو میں تمام عمر کام میں گھلا دوں گا۔

جمیلہ - واللہ۔ میرا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔

رئیسہ - ابا جان۔ شربت لاؤں؟

محبوب خاں - نہیں مجھے کچھ درکار نہیں۔ (رُک جاتا ہے) شربت! کیا تم نے شربت کا نام لیا؟

رئیسہ - (جلدی سے) ہاں ابا۔ اچھا ٹھنڈا شربت

محبوب خاں - اگر تمھارا یہی منشا ہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

جمیلہ - رئیسہ! جلدی کرو۔ شاید طبیعت درست ہو جائے۔

(رئیسہ باورچی خانے کی طرف دوڑتی ہے

محبوب جو آتش دان کے نزدیک کھڑا ہے اس کو روک لیتا ہے۔ اُس کے چہرے کو دیکھتا ہے اور اُسے اپنے بدن سے چمٹا لیتا ہے)

محبوب خاں - میری پیاری رئیسہ!

رئیسہ (خوشی کے آنسو آنکھوں میں بھر لا کر) پیارے ابا!

محبوب خاں - نہیں تم مجھے اس نام سے نہ پکارو۔ میں وہاں مال دار آدمیوں کے ہمراہ خاصہ پر موجود تھا۔ مزے اُڑا رہا تھا اور اپنے دوزخ شکم کو اناپ شناپ بھر رہا تھا۔ . . . کاش مجھے تمھارا خیال ہی آتا۔

جمیلہ (کرسی پر بیٹھ کر) جانیے ان فضولیات میں نہ پڑیئے۔

محبوب خاں - یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن تمھیں اس کا بہت خیال نہ کرنا چاہیئے۔ تم کو بہر حال معلوم ہے کہ میرے دل میں تمھاری کس قدر محبت ہے۔

رئیسہ - (گلے میں ہاتھ حمائل کر کے) اور ہم بھی ابا جان آپ کو بہت ہی پیار کرتے ہیں۔

محبوب خاں - اگر میں بعض اوقات نامعقولیت سے کام لوں تو تمھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ زیادتی

انکار کا سبب ہی کیا نہیں ؟ ہاں ہاں (اپنے آنسو پونچھتا ہی) ایسے موقعہ پر شربت کی کیا ضرورت ہے مجھے الغوزہ لا دو (رئیسہ الماری کے پاس دوڑتی ہے اور الغوزہ لاتی ہی) جزاک اللہ۔ یہ خوب ہے الغوزہ میرے ہاتھ میں اور تم میرے پاس (رئیسہ جمیلہ کے پاس کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ محبوب ٹہلنے لگتا ہے۔ اور پھر استقلال سے کچھ گانے بجانے لگتا ہے۔ لیکن آواز اتر میں ڈوبی ہوئی ہی۔ وہ رک جاتا ہے۔ اپنا بایاں ہاتھ جمیلہ کی طرف دراز کرتا ہی اور رقت آمیز آواز میں کہتا ہے) کچھ پرواہ نہیں۔ اگر ہم تنگ دستی و افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں ... یہ ہمارا گھر ہے ...... اور میں تو یہ ہی کہتا ہوں کہ اپنے گھر پر ہونا ہی ہزار نعمت ہے (وہ پھر بجانے لگتا ہے فوراً ہی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

جمیلہ (کھڑی ہو جاتی ہے) دیکھئے دروازہ پر کوئی ہی

محبوب خاں (اپنی بانسری رکھ دیتا ہے) فرور

(جمیلہ جاتی ہے اور دروازہ کھولتی ہی)

بلند اختر (دروازہ کے باہر ہی سے) معاف کیجئے۔

جمیلہ (پیچھے ہٹ کر) آپ ہیں!

بلند اختر۔ (باہر سے) کیا یہ محبوب خاں صاحب کا مکان ہی؟

جمیلہ۔ جی ہاں۔

محبوب خاں (دروازہ پر جاکر) اختر صاحب۔ آخاّہ آپ ہیں۔ آئیے آئیے۔ تشریف لائیے۔

بلند اختر (اندر آتا ہے) میں نے آپ سے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

محبوب خاں۔ لیکن آج رات ہی؟ کیا سب مہمان چلے گئے؟

بلند اختر۔ میں نے مہمان اور مکان سب کو خیر باد کہہ دیا۔ بیگم صاحبہ تسلیم۔ غالباً آپ مجھے پہچانتی ہوں گی؟

جمیلہ۔ بے شک۔ اختر صاحب! آپ کو پہچاننا کون مشکل کام ہی؟

بلند اختر۔ جی ہاں۔ میں اپنے باپ کی ہم شکل ہوں اور آپ اُن کو ضرور جانتی ہوں گی۔

محبوب خاں۔ آپ نے یہ کیا کہا کہ گھر کو خیر باد کہہ دیا۔

بلند اختر۔ جی ہاں! میں ہوٹل میں چلا گیا ہوں۔

محبوب خاں۔ واقعی؟ ذرا آرام سے بیٹھئے تکلّف برطرف۔

بلند اختر۔ جزاک اللہ (اچکن اُتارتا ہی۔ اس نے اپنی پوشاک بدل دی ہی۔ اور سادہ کپڑے زیب تن کیا

محبوب خاں۔ صاحب یہاں صوفہ پر تشریف رکھئے۔ یہ گھر آپ ہی کا ہے۔

(اختر صوفہ پر دراز ہو جاتا ہے۔ اور محبوب میز کے پاس والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بلند اختر۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر) یہ آپ کا مکان ہے؟ کیا آپ کام بھی یہیں کرتے ہیں؟

محبوب خاں۔ جی ہاں۔ یہ دوکان بھی ہے۔ دیکھئے نا۔

جمیلہ۔ یہ سب سے بڑا کمرہ ہے اور ہم سب یہیں بیٹھتے ہیں

محبوب خاں۔ کبھی ہم بھی عمدہ مکان کے مکیں تھے۔ لیکن یہاں ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جگہ اور گنجائش کافی ہے۔

جمیلہ۔ اور سڑک کے دوسری طرف ایک دوسرا کمرہ ہے جس کو کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔

بلند اختر۔ کیا کوئی ایسا کمرہ بھی ہے؟

محبوب خاں۔ نہیں ابھی نہیں۔ ذرا مشکل کام ہے۔ اس کو حاصل کرنے میں تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔

(رئیسہ سے) کچئے شربت کی بابت (رئیسہ سر ہلاتی ہے اور مطبخ میں دوڑی جاتی ہے)

بلند اختر۔ کیا یہ صاحبزادی ہو

محبوب خاں۔ اللہ کی دین ہی رئیسہ نام

بلند اختر۔ اکلوتی بیٹی ہے نا؟

محبوب خاں۔ جی ہاں۔ اکلوتی۔ یہ ہما خوشیوں اور مسرتوں کا مخزن اور ذریعہ

(آواز دھیمی کر کے) اور رنج و مصائب کا

بلند اختر۔ کیا مطلب؟

محبوب خاں۔ اُس کی آنکھوں کو روگ ہے اور نگاہ خراب ہو جانے کا خطرہ ہے

بلند اختر۔ نگاہ میں خرابی؟

محبوب خاں۔ جی ہاں۔ ابھی تو ابتدائی ہیں اور شاید ایک عرصہ تک کچھ معلوم نہ ہو ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔

بلند اختر۔ ہائے ہائے بدنصیبی۔ آخر کیا

محبوب خاں۔ خاندانی اثر ... د

بلند اختر (چونک کر) خاندانی؟

جمیلہ۔ ہماری ساس کی بھی اللہ بخشے نگاہ کمزو

محبوب خاں۔ مجھے تو یاد نہیں لیکن ابا جان تھے۔

بلند اختر۔ بدقسمت لڑکی۔ غریب کیا سوچتی

محبوب خاں۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں ہم تو سکت نہیں کہ اس کو تبلاتے اور اس کو کچھ مع

بھی نہیں ۔ وہ بلبل کی طرح لاپرواہ ہے اور ہمیشہ خوش رہتی ہے ۔ گھر میں ہر وقت چہکتی رہتی ہے ۔ اور آہ ! اپنی زندگی کی اُن تاریک خوفناک منزلوں میں تیزی سے گامزن ہے (آہ بھر کر) اختر صاحب! یہ امر نا قابلِ برداشت ہے ۔

(رئیسہ ایک کشتی میں گلاس اور شربت لے کر داخل ہوتی ہے اور میز پر رکھ دیتی ہے)

محبوب خاں (سر پر ہاتھ پھیر کر) خوش رہو بیٹی خوش ۔

(رئیسہ اُس کے گلے سے چمٹ جاتی ہے اور کان میں چپکے چپکے کہتی ہے ۔ روٹی اور مکھن تو ہے ہی نہیں ۔ جناب اگر آپ کو ضرورت ہو تو...

بلند اختر (سر ہلا کر) نہیں شکریہ ....

محبوب خاں (دردبھری آواز میں) کیا مضائقہ تھوڑی سی لے آؤ ۔ اگر کچھ ہو تو اچھی بات ہے اور ہاں ذرا مکھن خوب لگانا ۔ (رئیسہ خوش خوش پھر مطبخ میں دوڑی جاتی ہے)

بلند اختر (جو اس کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا) یوں تو ماشاء اللہ تندرست اور چالاک معلوم ہوتی ہے ۔

محبوب خاں ۔ جی خدا کا شکر ہے وہ ہر طرح چاک چوبند ہے ۔

بلند اختر ۔ بیگم صاحبہ وہ جوانی میں بالکل آپ سی ہو جائے گی ۔ کیا عمر ہے ؟

جمیلہ ۔ خدا کے فضل سے چودھواں سال ختم ہوا ہے پرسوں سالگرہ ہے ۔

بلند اختر ۔ عمر کے لحاظ سے تو زیادہ بڑی اور جواں معلوم ہوتی ہے ۔

جمیلہ ۔ ماشاء اللہ بالیدگی کا اثر ہے ۔

بلند اختر ۔ ان کی عمر کی ترقی ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کی یاد دلاتی ہے ۔ اور آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ؟

جمیلہ (شرما کر) کوئی پندرہ برس ۔

بلند اختر ۔ پندرہ برس ۔ اللہ اللہ ۔

جمیلہ (غور سے اُس کی طرف دیکھتی ہے) جی ہاں ۔

محبوب خاں ۔ بیشک اتنا ہی عرصہ ۔ کچھ کم پندرہ برس ۔ (مضمون کو بدل کر) شاید کام میں لگے لگے آپ کو وقت زیادہ معلوم ہوا ۔

بلند اختر ۔ بے شک جب میں وہاں کام پر تھا تو وقت بڑی مشکل سے گزرتا معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن اب اُس گزشتہ زمانہ پر نگاہ ڈالنے سے میں مشکل

یقین کر سکتا ہوں کہ اتنا زمانہ ہو گیا۔

(نظیر خاں پرانی قسم کی فوجی ٹوپی اوڑھے اپنے کمرہ سے باہر آتا ہے اور تشویش میں معلوم ہوتا ہے)

نظیر خاں- ہاں محبوب! اب ہم بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔ اور نہ تم کیا کہنا چاہتے تھے۔

محبوب خاں (پاس جا کر) اباجان۔ ایک ملاقاتی آئے ہیں۔ بلند اختر صاحب! مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو وہ یاد ہیں یا نہیں۔

نظیر خاں (اختر کو دیکھتے ہوئے جو کھڑا ہو جاتا ہے) اختر؟ بیٹا۔ آخر اُس کا مجھ سے کیا کام ہے؟

بلند اختر- السّلام علیکم۔ بندہ ملاقات کی نیت سے حاضر ہوا ہے

نظیر خاں- وعلیکم السّلام۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

محبوب خاں- بے شک بے شک۔

نظیر خاں- (ہاتھوں کو گھماتے ہوئے) کچھ پرواہ نہیں۔ کچھ فکر نہیں۔ لیکن۔

بلند اختر (پاس جا کر) جناب میں صرف آپ کے پرانے دوست منیر عالم صاحب کی طرف سے سلام عرض کرنے آیا تھا۔

نظیر خاں- میرے پرانے . . . . دوست

بلند اختر- جی ہاں ٹھیکیداری کے زمانے کے۔

نظیر خاں- اوہو۔ اوہو۔ خوب۔ خوب

بلند اختر- آپ کی تو خوب گاڑھی چھنتی تھی۔

نظیر خاں- خوب یاد آیا۔ بے شک۔ تم میری ٹوپی کو دیکھ رہے ہو۔ میں گھر پر اس کو ہی اوڑھا کرتا ہوں۔ لیکن باہر کبھی اس کو استعمال نہیں کرتا

(رئیسہ ایک طشتری میں روغنی ٹکیاں اور مکھن لاتی ہے اور میز پر رکھ دیتی ہے)

محبوب خاں- اباجان تشریف رکھئے۔ شربت حاضر ہے۔ اختر صاحب آپ بھی نوش فرمائیے۔

(نظیر خاں گنگناتا ہوا صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے اور اختر ایک کرسی پر۔ محبوب اختر کے مقابل دوسری پر۔ جمیلہ میز سے ذرا فاصلہ پر بیٹھتی ہے اور سینے لگتی ہے۔ رئیسہ اپنے باپ کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے)

بلند اختر- خاں صاحب! آپ کو یاد ہو گا کہ میں محبوب کے ہمراہ بڑے دن کی یا گرمیوں کی تعطیل میں آپ سے ملاقات کرنے آیا کرتا تھا۔

نظیر خاں- تم آتے تھے۔ واقعی؟ نہیں نہیں مجھے یاد نہیں۔ لیکن میں تم کو بتلا سکتا ہوں کہ اُس وقت میں ایک بڑا اچھا شکاری تھا۔ میں نے شیر کا شکار بھی کھیلا اور نو شیر مارے۔

بلند اختر (ترحمانہ انداز سے) اور کیا اب شکار نہیں ہوتا؟

نظیر خاں۔ شکار کیسا اب تو اس کی یاد بھی نہیں۔
کبھی کبھار اتفاق ہوتا ہے لیکن شیر کے شکار کا
نہیں .... بن میں تمھیں معلوم ہے
بن ... جنگل! (پیتا ہے) کیا جنگل اب بھی
جوبن پر ہے؟

بلند اختر۔ وہ حسن اور جوبن بھلا اب کہاں؟
ہزاروں درخت کاٹ ڈالے گئے۔

نظیر خاں (آواز کو یکایک دھیما کر کے گویا
خوف زدہ ہے) درختوں کو کاٹنا۔ معاذ اللہ
بڑا خطرناک کام ہے۔ بلا نازل ہو جاتی ہے۔
درخت خود اپنا انتقام لے لیتے ہیں۔

محبوب خاں (اپنے باپ کے لئے گلاس
بھر کر) اباجان اور شربت نوش کیجئے۔

بلند اختر۔ آپ جیسی طبعیت کا انسان جو ہمیشہ
کھلے میدان میں رہنے کا عادی ہو کس طرح ایسے
گندہ اور گنجان شہر میں مکان کی چہار دیواری کے
اندر رہ سکتا ہے۔

نظیر خاں (اختر کو خاموش انداز سے دیکھ کر)
نہیں اتنا خراب نہیں۔ اس قدر برا نہیں۔

بلند اختر۔ لیکن ذرا غور تو کیجئے کہ آپ کیسی زندگی
کے عادی تھے۔ ٹھنڈی آرام دہ اور مسرت بخش
ہوا جنگل اور میدان کی آزادانہ زندگی۔ درندوں
اور پرندوں جیسی بے فکری کی زندگی۔
سبحان اللہ۔

نظیر خاں (مسکرا کر) محبوب کیا میں اس کی
بابت ان کو بتاؤں؟

محبوب خاں (جلدی اور کچھ پریشانی سے)
نہیں اباجان۔ آج رات نہیں۔

بلند اختر۔ آپ کیا دکھانا چاہتے ہیں؟

محبوب خاں۔ کچھ نہیں ایک قسم کی .....
آپ کسی اور وقت دیکھ سکتے ہیں۔

بلند اختر (نظیر خاں سے پھر باتیں کرنے لگتا ہے)
سردار صاحب! میرے کہنے کا ماحصل صرف
اتنا ہے کہ آپ پھر میرے ہمراہ بن میں کام پر چلیں
میں عنقریب وہاں جانے والا ہوں۔ آپ کو
وہاں پر بھی نقل وغیرہ کا کام مل جائے گا۔ اور
یہاں اتنا بھی تو نہیں کہ کسی طرح آپ کو خوشی حاصل
ہو یا اطمینان نصیب ہو۔

نظیر خاں (تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر)
ایک متنفس بھی تو مجھے ....

بلند اختر۔ بے شک۔ محبوب صاحب ہیں۔
مگر خود ان کے پیروں میں گھر کی بیڑی ہے۔

لیکن آپ جیسا آدمی جس کو ہمیشہ ایک آزاد اور غیر پابند زندگی کے جذبہ نے متاثر کیا ہو۔

نظیر خاں (میز ٹھوک کر) محبوب میں وہ چیز ان کو دکھائے دیتا ہوں۔

محبوب خاں ۔لیکن ابا جان کیا وہ اس قابل ہے؟ اب تو رات کا وقت ہے۔

نظیر خاں ۔احمق۔ چاندنی چھٹکی ہوئی نہیں؟ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) میں کہتا ہوں کہ اب وہ اُس کو دیکھیں گے۔ محبوب مجھے جانے دو۔ آؤ اور میری مدد کرو۔

رئیسہ ۔ ہاں ابا میاں جائیے۔

محبوب خاں (کھڑا ہو کر) بہت اچھا۔

بلند اختر (جمیلہ سے) وہ مجھے کیا دکھانا چاہتے ہیں؟

جمیلہ ۔ آپ اطمینان رکھیں کوئی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز چیز نہ ہوگی۔

(نظیر خاں اور محبوب اندر جاتے ہیں اور کواڑوں کو بند کر لیتے ہیں۔ رئیسہ اپنے دادا کی مدد کرتی ہے۔ بلند اختر صوفہ کے پاس کھڑا رہتا ہے۔ جمیلہ خاموش سیتی رہتی ہے۔ چھت کی طرف ہوا دار سے روشنی فرش پر پھیل رہی ہے۔ قدرے اندھیرا بھی ہے)

نظیر خاں (بلند اختر سے) یہاں آیئے اور دیکھیے

بلند اختر ۔بجا۔ کیا ارشاد ہے؟

نظیر خاں ۔ آیئے اور خوب دیکھیے

محبوب خاں (گھبراہٹ سے) یہ سب ابا کے مشاغل ہیں۔

بلند اختر (دروازے کے پاس آتا ہے اور کھڑکی سے دیکھتا ہے) تو سردار صاحب یہ مرغی خانہ ہے؟

نظیر خاں ۔خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ اب رات کا ہے کبھی دن میں دیکھنا۔

رئیسہ ۔ اور ہمارے ہاں ......

نظیر خاں ۔ہش ہش۔ ابھی کچھ نہ کہو۔

بلند اختر ۔ اور آپ کے ہاں کبوتر بھی ہیں؟!

نظیر خاں ۔کوئی تعجب نہیں اگر ہمارے ہاں کبوتر ہیں .... وہ دیکھو چھجّے کے نیچے کابک ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کبوتر زمین ہی خوب سوتے ہیں۔

بلند اختر ۔ مگر یہ معمولی کبوتر تو معلوم نہیں ہوتے

نظیر خاں ۔ معمولی کبوتر! نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے ہاں لقا کبوتر اور سبزے کے جوڑے ہیں۔ لیکن

اور ذرا یہ بھی دیکھو۔ کیا تم کو دیوار کے پاس کچھ
ائی دیتا ہے؟
ند اختر۔ ہاں ہاں کیا ہے ؟
ظیر خاں۔ وہ خرگوش کے سونے کی جگہ ہے۔
ند اختر۔ تو کیا خرگوش بھی پال رکھے ہیں ؟
یر خاں۔ ہاں۔ تم کہتے ہو کہ ہمارے ہاں
گوش بھی ہیں۔ محبوب دیکھتے ہو۔ یہ پوچھتے ہیں
ہمارے ہاں خرگوش بھی ہیں ؟ اونہہ . . . .
ن اب میں تم کو ایک بڑا اچھا نظارہ دکھاؤں گا
تم اُس کو دیکھو گے ! رئیسہ! راستہ سے ہٹ
ؤ۔ یہاں کھڑے ہو اور اندر کو دیکھو۔
کیا تم کو ایک ٹوکری گھاس سے بھری نہیں
ائی دیتی ؟
ند اختر۔ جی ہاں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی
ندہ بھی اُس میں سو رہا ہے۔
ظیر خاں۔ پرندہ ؟ اونہہ !
ند اختر۔ تو کیا وہ بط نہیں ؟
ظیر خاں۔ لیکن کس قسم کی؟ بتلایئے تو سہی ؟
رئیسہ۔ صاحب ! یہ کوئی معمولی بط نہیں ہے۔
ظیر خاں۔ ہش !
ند اختر۔ تو یہ اجنبی چڑیا بھی نہیں۔

نظیر خاں۔ نہیں اختر صاحب ! اجنبی چڑیا نہیں بلکہ
ایک جنگلی بط ہے۔
بلند اختر۔ نہیں ! کیا واقعی ؟ ایک جنگلی بط ؟
نظیر خاں۔ ہاں۔ جنگلی بط۔ یہ جانور جیسا کہ تم
کہتے ہو ایک جنگلی بط ہے۔ وہ ہماری جنگلی بط ہے۔
رئیسہ۔ میری جنگلی بط . . . . یہ میری ہی ہے۔
بلند اختر۔ کیا ممکن ہے کہ وہ وہاں بالاخانہ پر
زندہ رہ سکے ؟ کیا بالاخانہ اُسے پسند ہے ؟
نظیر خاں۔ ہاں وہاں پانی کی ایک ناند ہے
جس میں وہ نہایا کرتی ہے۔
محبوب خاں۔ اور ہر دوسرے دن تازہ
پانی بھرا جاتا ہے۔
جمیلہ (محبوب کی طرف مخاطب ہو کر) خدا کی پناہ!
دیکھئے کیسی چلّے کی سردی ہو رہی ہے اور آپ
کھلے میدان میں کھڑے ہیں !
نظیر خاں۔ اچھا۔ اچھا ہم بند کئے دیتے ہیں
اُن کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہئے۔ رئیسہ!
ہٹو ۔ (رئیسہ اور محبوب کواڑوں کو ملا کر دروازہ
بند کر دیتے ہیں) کسی دوسرے وقت اچھی طرح
دیکھ لینا (آتش دان کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ
جاتا ہے) یہ جنگلی بط ہیں سچ کہتا ہوں

قابلِ تعریف جانور ہے۔

بلند اختر۔ لیکن آپ نے اس کو کس طرح پکڑا ؟

نظیر خاں۔ میں نے نہیں پکڑا۔ ایک صاحب یہاں شہر میں رہتے ہیں یہ اُن کی عنایت کردہ ہے۔

بلند اختر (چونک کر) وہ صاحب کہیں ابا جان ہی تو نہیں؟

نظیر خاں۔ خوب پہچانا۔ ٹھیک آپ کے باپ اور کوئی نہیں۔

محبوب خاں۔ آپ کا یہ خیال کس قدر پُر لطف ہے؟

بلند اختر۔ آپ نے ہی تو مجھے بتلایا تھا کہ میرے باپ کے کس قدر احسانات ہیں۔ پس میں نے خیال کیا کہ ضرور وہی.......

جمیلہ۔ لیکن بط تو براہِ راست اُن سے نہیں ملی۔

نظیر خاں۔ ہاں دلہن یہ سب حقّان کی نوازش ہے (بلند اختر سے) ایک دن وہ کشتی میں بیٹھ کر شکار کو گئے اور اُس کو مارا لیکن چونکہ تمھارے باپ کی نگاہ کمزور ہے وہ سمجھے کہ یہ بالکل مردہ ہو گئی حالانکہ یہ صرف زخمی ہوئی تھی۔

بلند اختر۔ ٹھیک! قدرے زخمی!

محبوب خاں۔ صرف دو تین جگہ زخم آئے۔

رضیہ۔ بازو میں جس کے باعث یہ اُڑ نہ سکی۔

بلند اختر۔ پھر یہ تہ میں غوطہ لگا گئی۔

نظیر خاں (بھاری آواز میں)، بے شک جنگلی بطیں ہمیشہ ایسا کرتی ہیں۔ وہ تہ میں بیٹھ جاتی ہیں اور گھاس پات کو نوچ نوچ کر کھانے لگتی ہیں۔ پھر اوپر سطح پر نہیں آتیں۔

بلند اختر۔ لیکن سردار صاحب۔ آپ کی بط تو اوپر آگئی.......

نظیر خاں۔ جی ہاں۔ ایک نہایت ہوشیار چالاک کتّا اس کے تعاقب میں تھا۔ یعنی تمھارا باپ۔ اُس نے خود غوطہ لگایا اور اس کو نکال لیا۔

بلند اختر (محبوب سے مخاطب ہو کر)، اور یہ آپ کو مل گئی؟

محبوب خاں۔ براہ راست نہیں پہلے یہ آپ کے گھر لائی گئی۔ لیکن وہاں صحت کی صورت نظر نہ آئی تو کلّن نے ذبح کرنے کا ارادہ کیا۔

نظیر خاں (حالتِ غنودگی میں) اونہہ۔ کلّن۔ برا نام

محبوب خاں۔ (آواز کو دھیما کر کے)، اور اس طرح یہ ہمارے ہاں آگئی۔ ابا جان کلّن کو جانتے ہیں انھوں نے یہ تمام وقوعہ سنا اور اس بط کو لے لیا۔

بلند اختر۔ اور اب یہ بالاخانے پر خوب خوش اور تندرست ہے؟

محبوب خاں - ہاں خوب خوش - یہ موٹی بھی ہو گئی ہے - اس کو یہاں رہتے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ یہ اپنی آزادانہ جنگلی زندگی کو بھول گئی اور یہاں رہنے کے لئے یہ امر نہایت ضروری تھا -

بلند اختر - محبوب صاحب ٹھیک فرمایا - مگر اس کو کبھی پانی اور آسمان نہ دیکھنے دینا .... لیکن اب مجھے زیادہ نہ ٹھہرنا چاہیئے - میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب سونا چاہتے ہیں -

محبوب خاں - کچھ پرواہ نہ کرو -

بلند اختر - آپ کا کلام بالا ہوتا ہے - آپ نے کہا تھا کہ ایک کمرہ کرایہ کے لئے خالی ہے جو آپ کے استعمال میں نہیں ہے -

محبوب خاں - ہاں کیوں ؟ کیا آپ کو کسی کمرہ کے متعلق معلوم ہے ؟

بلند اختر - کیا مجھے کمرہ مل سکتا ہے ؟

محبوب خاں - آپ کو ؟

جمیلہ - کیا آپ کو اختر صاحب ؟

بلند اختر - کیا مجھے کمرہ مل سکتا ہے ؟ اگر ممکن ہوا تو میں کل صبح آؤں گا -

محبوب خاں - شوق سے ضرور تشریف لائیے -

جمیلہ - لیکن اختر صاحب آپ کے مذاق کا تو وہ کمرہ نہیں ہے -

محبوب خاں - تم نے کیسے جانا ؟

جمیلہ - نہ تو بڑا ہی ہے اور نہ کافی روشن - اور...

بلند اختر - بیگم صاحبہ کچھ مضائقہ نہیں -

محبوب خاں - میں اس کو بہت عمدہ کمرہ تصور کرتا ہوں - وہ ساز و سامان سے بھی آراستہ ہے -

جمیلہ - لیکن اُن صاحب کا کیا ہوگا جو اس کے نیچے والے کمرے میں رہتے ہیں -

بلند اختر - کون صاحب ؟

جمیلہ - ایک تو مولوی صاحب اور دوسرے صاحب ایک حکیم ہیں جن کا نام مرزا عباس ہے -

بلند اختر - مرزا عباس ! میری بھی اُن سے شناسائی ہے - ایک زمانہ میں وہ آگرہ میں مطب کرتے تھے -

جمیلہ - وہ دونوں بے کار محض ہیں اور عام طور پر رات کو دیر تک غائب رہتے ہیں - رات کو بہت دیر میں آتے ہیں اور کبھی نہیں بھی آتے -

بلند اختر - بہت جلد عادی ہو جاؤں گا - میں امید کرتا ہوں کہ مثل جنگلی بط کے میں بھی آرام سے رہنے لگوں گا -

جمیلہ - تو پہلے آپ کو وہاں سونا چاہیئے -

بلند اختر - بیگم صاحبہ آپ میری موجودگی کو پسند نہیں کرتیں -

جمیلہ۔ استغفراللہ یہ آپ نے کیسے جانا؟
محبوب خاں۔ بیگم یہ نہایت زیادتی ہے۔
(بلند اختر سے) کیا واقعی آپ کا یہاں شہر میں رہنے کا ارادہ ہے؟
بلند اختر (اپنا کوٹ پہن کر) ہاں اب میرا مستقل ارادہ ہے۔
محبوب خاں۔ لیکن گھر پر والد صاحب کے ہمراہ نہیں۔ تو خود تنہا کیا کرو گے؟
بلند اختر۔ کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا تو بہت آسان کام ہوتا۔ لیکن جب ایک شخص بد قسمتی سے بلند اختر پیدا ہوا ہو اور تباہی اُس کے تعاقب میں ہو۔ کیا کبھی آپ نے ایسے منحوس واقعہ کی بابت سُنا ہے؟
محبوب خاں۔ مجھے تو کچھ نحوست معلوم نہیں ہوتی۔
بلند اختر (کانپ کر) میں تو بلند اختر نام ہی کے آدمی پر تھوکنے کے لئے تیار ہوں۔ ایک مرتبہ بد قسمتی سے میری طرح ایک آدمی کے سر پر بلند اختری کا بوجھ لاد دیا گیا تھا۔۔۔
محبوب خاں (قہقہہ لگا کر) آہا آہا۔ اچھا اگر آپ اختر نہیں ہوتے تو کیا بننا پسند کرتے۔
بلند اختر۔ اگر مجھے انتخاب کا اختیار ہوتا تو میں ایک ہوشیار کتّا بننا پسند کرتا۔
جمیلہ۔ ایک کتّا!
رئیسہ (بے تحاشا ہنس کر) ہرگز نہیں۔
بلند اختر۔ ہاں ایک غیر معمولی ذہین کتا۔ ایسا کتّا جو جنگلی بط کے پیچھے تہ تک غوطہ لگائے اور اُس کو نکال لائے۔ **محبوب خاں**۔ اچھا یہ بات ہے
بلند اختر۔ نہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے۔ اچھا تو پھر میں کل سویرے یہاں منتقل ہو جاؤں گا (جمیلہ سے) میں آپ کو کوئی تکلیف نہ دوں گا۔ میں اپنا کام خود کر لیتا ہوں (محبوب سے) ہم اپنی گفتگو کو کل پر رکھیں۔ سلام علیکم بیگم صاحبہ۔
(رئیسہ سے سر جھکا کر) سلام بیٹی۔
جمیلہ۔ وعلیکم السلام۔ اختر صاحب
رئیسہ۔ وعلیکم السّلام۔ جناب۔
محبوب خاں (شمع روشن کر کے) ذرا ٹھہریئے میں روشنی دکھا دوں۔ زینے میں اندھیرا ہوگا۔
(محبوب اور اختر دوسرے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں)
جمیلہ (سامنے کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔ سلائی

کا کام اس کی گود میں پڑا ہے) ایک پُر مذاق تخیّل ! کتاب بننے کی تمنّا - اوہ -

رئیسہ - امّاں جان کیا آپ سمجھیں ؟ میں خیال کرتی ہوں کہ اس سے اُن کا منشا کچھ اور ہی تھا -

جمیلہ - اور کیا مطلب ہو سکتا تھا ؟

رئیسہ - میں نہیں جانتی - لیکن میں نے خیال کیا کہ ان کا مفہوم بالکل مختلف تھا -

جمیلہ - کیا تم ایسا خیال کرتی ہو ؟ بلا شبہ عجیب تخیّل تھا -

محبوب خاں (واپس آکر ، شمع جو ابھی تک روشن تھی بجھا دیتا ہے اور الماری پر رکھ دیتا ہے) - چلو اب ہمیں کھانے پینے کی طرف سے تو اطمینان ہوا - (روغنی روٹی کھانے لگتا ہے ، بیگم دیکھتی ہو اگر تم اپنی زبان قابو میں رکھو -

جمیلہ - کیسے کہتے ہو کہ زبان قابو میں رکھو ؟

محبوب خاں - بہر حال اب قسمت جاگی - اور ہم کو مکان کرایہ پر دینے میں کامیابی ہوئی - علاوہ ازیں اختر جیسے شخص کو دینے میں جو پُرانا دوست ہے -

جمیلہ - لیکن میں نہیں سمجھتی کہ اس معاملہ میں کیا کہوں ؟

رئیسہ - امّاں جان ! آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ اچھی بات ہے -

محبوب خاں - تم عجیب قماش کی عورت ہو - ذرا دیر پہلے تو کمرہ کو کرایہ پر دینے پر اس قدر مصر تھیں اور اب ناپسند کرتی ہو -

جمیلہ - بے شک - لیکن اگر کسی غیر شخص کو دیا جاتا آپ کو ہوش بھی ہے کہ اس کا باپ کیا خیال کرے گا ؟

محبوب خاں - بڈھا باپ ! اس کو کیا غرض ؟

جمیلہ - یقین مانو کہ دونوں میں جھگڑا ہو گیا ہے کیوں کہ اختر اپنے باپ کے گھر کو الوداع کہہ رہا ہے - آپ کو معلوم ہی ہے کہ دونوں میں کیسی چلتی ہے -

محبوب خاں - یہ سب ٹھیک ہے تاہم

جمیلہ - اور یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اس کے والد آپ کو ان تمام فسادات کا بانی مبانی خیال کریں گے -

محبوب خاں - وہ جو چاہیں خیال کیا کریں - منیر عالم صاحب نے میرے ساتھ ہزاروں احسان کئے ہیں اور میں اُن سے منکر نہیں - لیکن یہ کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنے ہر کام میں اُن کے صلاح و مشورے پر عمل کروں -

جمیلہ - لیکن پیارے محبوب اس کا نتیجہ خالو ابا پر مصیبت کا بُلانا ہے - یہ جو ذرا سا وسیلہ ہے وہ

بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا

محبوب خاں۔ میری عین تمنا ہے کہ ایسا واقع ہو جائے۔ کیا تم خیال نہیں کرتیں کہ مجھ جیسے آدمی کے لئے یہ امر کتنا ناگوار اور باعثِ توہین ہے کہ میرے بوڑھے باپ کو برادری سے خارج شدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کا وقت آگیا ہے۔ (دوسری ٹکیہ اُٹھا لیتا ہے) مجھے زندگی میں کام کرنا ہے اور میں اس کو پورا کروں گا۔

رضیہ۔ ہاں ابّا جان ضرور۔

جمیلہ۔ ہش دادا ابا کو مت جگاؤ۔

محبوب خاں۔ میں اس کو پورا کروں گا میں کہتا ہوں وہ دن قریب ہے۔ جب . . . جب . . . اور یہی وجہ ہے کہ کمرہ کرایہ پر دے دینا ایک نیک فال ہے۔ اس سے میری حالت زیادہ آزاد اور عمدہ ہو جائے اور ایک انسان جس کو زندگی میں کچھ کرنا ہے کیوں دوسروں کا محتاج اور دست نگر رہے (اپنے باپ کی کرسی کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اور جوش میں بولنے لگتا ہے) غریب بوڑھا آپ اپنے بیٹے پر یقین رکھئے۔ اس کے ہاتھ میں قوت ہے اور ارادوں میں استقلال۔ عمدہ گھڑی میں آپ کا نصیبہ جاگنے والا ہے (جمیلہ سے) کیا تم یقین نہیں کرتیں؟

جمیلہ (کھڑی ہو کر) بے شک میں یقین کرتی ہوں۔ لیکن پہلے ان کو بستر پر تو لٹا دینا چاہئے

محبوب خاں۔ ہاں۔ اچھا آؤ (دونوں نظیر خاں کو ہوشیاری سے اُٹھاتے ہیں)

تیسرا ایکٹ

(سین وہی کمرہ - دوسرے دن صبح کا وقت
بڑی کھڑکی میں سے سورج کی کرنیں آ رہی ہیں
ڑکی پر پردہ پڑا ہوا ہے - محبوب کرسی پر بیٹھا
ب تصویر ٹھیک کر رہا ہے اس کے سامنے
رہت سی تصویریں رکھی ہیں - تھوڑی دیر
ے بعد جمیلہ بیرونی دروازہ سے اندر داخل ہوتی
۔ اُس کے ہاتھ میں چیزوں سے بھری ہوئی
ب ٹوکری ہے -

ہبوب خاں - بیگم! تم اس قدر جلد واپس
ئیں -

یلہ - بیشک میرے پاس بیکار وقت نہیں -
ٹوکری کو ایک کرسی پر رکھ دیتی ہے اور چیزیں
ہر نکالنے لگتی ہے)

ہبوب خاں - کیا بلند اختر صاحب کی طرف بھی
ئی تھیں ؟ -

یلہ - جی ہاں - پُرلطف منظر دیکھا - اُنھوں نے
رہ کو ذرا سی دیر میں خوب سجا لیا ہے -

ہبوب خاں - کیسے ؟

جمیلہ - یاد ہوگا - اُنھوں نے کہا تھا کہ وہ ہر کام
خود کر لیتے ہیں - اُنھوں نے آتش دان میں آگ
جلائی لیکن دریچہ بند کر دیا - اور تمام کمرہ میں دھوئیں
کے غٹ کے غٹ جمع ہو گئے - اُونہ اُونہ بڑی
بدبو پھیلی -

محبوب خاں - واقعی ؟

جمیلہ - صرف یہی نہیں - وہ آگ بجھانا چاہتے
تھے - پانی انگیٹھی پر چھڑک دیا - اور تمام فرش پر
کوئلے اور راکھ پھیل گئی -

محبوب خاں - لاحول ولا قوۃ - کیا بدمذاقی ہے -

جمیلہ - میں نے نوکرانی سے کہا ہے کہ جب وہ
چلے جائیں تو کمرہ کو صاف کر دینا - لیکن کمرہ کل
تک رہائش کے قابل نہ ہو سکے گا -

محبوب خاں - اور وہ خود کیا کرتے رہے ؟

جمیلہ - کہتے تھے کہ باہر چلا جاؤں گا -

محبوب خاں - جب تم چلی گئی تھیں تو میں بھی ذرا
کی ذرا اُن کو دیکھنے گیا تھا -

جمیلہ - اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے اُن کو

کھانے پر بُلایا ہے

محبوب خاں۔ ہاں ذرا تفریح ہی رہے گی۔ یہ
ان کا پہلا دن ہے اور ہم اس سے کم کیا کر سکتے
مجھے یقین ہے کہ تم سب انتظام کر لوگی۔

جمیلہ۔ دیکھوں گی کیا بن پڑتا ہے؛

محبوب خاں۔ ایسی کنجوسی نہ برتو۔ میرا خیال ہے
کہ مولوی صاحب اور حکیم صاحب بھی آئیں گے
میں حکیم صاحب سے زینہ پر ملا تھا۔ اور اُن کو بھی
مدعو کرنا پڑا۔

جمیلہ۔ تو کیا وہ دونوں آئیں گے؛

محبوب خاں۔ اللہ برکت دے گا۔ تھوڑے بہت
سے زیادہ فرق نہیں پڑتا۔

(نظیر خاں کمرہ کھولتا ہے اور دیکھتا ہے)

نظیر خاں۔ محبوب! یہاں آؤ (جمیلہ کو دیکھکر) اوہ

جمیلہ۔ کیا آپ کو کچھ درکار ہے؛

نظیر خاں۔ نہیں نہیں۔ مضائقہ نہیں۔ ہوں!
(اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے)۔

جمیلہ۔ (ٹوکری اُٹھاکر) اُن کو دیکھتے رہنا۔
کہیں باہر نہ چلے جائیں؛

محبوب خاں۔ ہاں ہاں۔ میں دیکھوں گا۔ بیگم
دیکھو اگر مچھلی ہو تو بہت خوب ہوگا۔ مجھے خیال پڑتا
ہے کہ مولوی صاحب اور حکیم صاحب کل رات اس کا
تذکرہ بھی کرتے تھے۔

جمیلہ۔ تو جب تک نہ ہو جائے اُن کو نہ بلائیے گا۔

محبوب خاں۔ تم اپنا کام کرو۔ وہ پہلے نہیں آئیں گے

جمیلہ۔ بہت خوب۔ اور آپ بھی تو کچھ مدد دے
سکتے ہیں؛

محبوب خاں۔ دیکھتی نہیں کہ کام میں مشغول ہوں
میں بہت محنت سے کام کر رہا ہوں۔

جمیلہ۔ یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ (ٹوکری
باورچی خانہ میں لیجاتی ہے۔ محبوب بناچاری اپنے
کام میں مصروف ہو جاتا ہے)۔

نظیر خاں۔ (جھانکتا ہے اور چاروں طرف دیکھکر
دبی آواز میں کہتا ہے) کیا تم نے وہ کام ختم کر دیا؛

محبوب خاں۔ میں ان تصویروں کو درست
کر رہا ہوں۔

نظیر خاں۔ اچھا۔ اچھا کچھ حرج نہیں۔ اگر تم اس قدر
مشغول ہو...... ...... (پھر اندر چلا جاتا ہے لیکن
دروازہ کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ محبوب تھوڑی دیر تک
خاموش کام کرتا رہتا ہے پھر برش کو رکھ دیتا ہے
اور دروازہ تک جاتا ہے)

محبوب خاں۔ ابا جان! کیا آپ کچھ کر رہے ہیں؛

ظیر خاں - (اندر سے بھرائی ہوئی آواز میں)
ب تمھیں فرصت نہیں تو میں بھی خالی نہیں۔
بوب خاں - بالکل ٹھیک - بجا ارشاد! (واپس
کام کرنے لگتا ہے۔ چند لمحہ بعد نظیر خاں خود
ں کے پاس آتا ہے)۔
ظیر خاں - اونہ - محبوب - دیکھو میں اس قدر
فول نہیں جتنے کہ تم ہو۔
بوب خاں - میں سمجھا کہ آپ لکھ رہے ہیں۔
ظیر خاں - منیم جی سے شیطان سمجھے - کیا وہ دو
ب دن توقف نہیں کر سکتے؟ یہ حیات و ممات
مسئلہ تو ہے نہیں کہ ....
بوب خاں - نہیں - اور آپ بھی کسی طرح اس کے
بند نہیں -
ظیر خاں - دوسرے یہ بات بھی تو ہے کہ......
بوب خاں - بجا! کیا آپ وہاں جانا چاہتے
ں؟ میں دروازہ کھولوں؟
ظیر خاں - میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کچھ
احت ہے۔
بوب خاں - (کھڑا ہو کر) اور وہ آپ کے
بیعہ تیار ہو سکتی ہے۔
ظیر خاں - ہاں بالکل ٹھیک - کل صبح تک ضرور
تیار ہو جانی چاہئیے - ہم نے کل کہا تھا - کیا نہیں؟
او ہو -
محبوب خاں - جی ہاں - کل -
(محبوب اور نظیر خاں دروازے کو
کھولتے ہیں - بالا خانہ پر دھوپ پھیلی ہوئی ہے -
کچھ کبوتر اُڑ رہے ہیں کچھ اڈے پر بیٹھے غٹر غوں
کر رہے ہیں - کبھی کبھی مرغیوں کی کڑکڑوں کوں کی
آواز بھی سنائی دیتی ہے)۔
محبوب خاں - ابا جان لیجئے اب آپ جا سکتے ہیں -
نظیر خاں - (اندر جا کر) کیا تم نہ آؤ گے؟
محبوب خاں - میں نہیں کہہ سکتا - میں سمجھتا ہوں
کہ ...... (جمیلہ کو باورچی خانہ کے در پر دیکھ کر)۔
نہیں میرے پاس وقت نہیں - مجھے کام کرنا ہے -
لیکن ہمیں اپنا نظام درست کر لینا چاہئیے (وہ ڈوری
کھینچتا ہے - اور پردہ گر جاتا ہے - پردے کے گرنے
سے اندھیرا ہو جاتا ہے - اور کچھ دکھائی نہیں دیتا)
ہاں اب میں تھوڑی دیر اطمینان اور سکون سے
بیٹھ سکوں گا -
جمیلہ - (آ کر) کیا خالو ابا پھر وہاں جا گھسے؟
محبوب خاں - کیا تمہارا منشا ہے کہ وہ سیدھے
شراب کی بھٹی پر جائیں (بیٹھ کر)، تم کسی چیز کی

تلاش میں ہو؟

جمیلہ - میں صرف اتنا دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اگر یہاں کھانا کھایا جائے تو نامناسب تو نہ ہوگا؟

محبوب خاں - ہاں - لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس قدر سویرے کوئی آئے گا۔

جمیلہ - میں خود بھی یہی خیال کرتی ہوں کہ سوائے بلائے ہوئے آدمیوں کے اور کوئی نہ آئے گا۔

محبوب خاں - یا اللہ! کیا وہ دونوں پھر کسی دن نہیں آسکتے۔

جمیلہ - بہت مناسب - میرا خیال تھا کہ اُن کو اُس وقت بلاؤں جب آپ آرام کرتے ہوں۔

محبوب خاں - بہت خوب - اچھا تو کھانا یہاں ہی کھائیں گے۔

جمیلہ - بجا - لیکن ابھی کوئی جلدی نہیں ہے - میز کو دیر تک استعمال میں رکھ سکتے ہیں۔

محبوب خاں - دیکھتی ہو میری انتہائی کوشش ہے کہ میں کام میں لگا رہوں۔

جمیلہ - بے فکر اور مطمئن بھی تو آپ ہی ہوں گے۔

(پھر باورچی خانہ میں چلی جاتی ہے)۔

نظیر خاں - (بالاخانہ پر جالی کے پیچھے کھڑا ہوا)۔ محبوب؟

محبوب خاں - جی!

نظیر خاں - میں سمجھتا ہوں کہ پانی کی نالی کو ہٹانا پڑے گا۔

محبوب خاں - میں تو پہلے ہی دن سے کہہ رہا ہوں۔

نظیر خاں - ہوں - ہوں - (دروازہ سے چلا جاتا ہے)۔

(محبوب پھر تھوڑی دیر تک کام کرتا ہے اور باورچی خانہ کی طرف دیکھتا ہے - رئیسہ باورچی خانہ سے آتی ہے وہ فوراً کام میں مشغول ہو جاتا ہے)

محبوب خاں - کیا چاہیئے؟

رئیسہ - ابا جان میں صرف آپ تک آئی ہوں

محبوب خاں - (ایک لمحہ توقف کے بعد) تم کسی کی کھوج میں معلوم ہوتی ہو - کیا تم میری نگرانی کے لئے آئی ہو؟

رئیسہ - نہیں تو۔

محبوب خاں - تمھاری ماں وہاں کیا کر رہی ہے؟

رئیسہ - مچھلی کے کباب تل رہی ہیں (میز کے پاس جاتی ہے) ابا جان میرے لایق کچھ کام نہیں کہ میں بھی آپ کی مدد کر سکوں؟

محبوب خاں - نہیں - نہیں - میں اکیلا ہی

کرسکتا ہوں ۔ رئیسہ ! جب تک میرے ہاتھوں
میں قوّت ہی اور بدن میں طاقت ۔ مجھے مدد
کی ضرورت نہیں ۔

رئیسہ ۔ ابّا جان ۔ ایسے خوفناک الفاظ تو خدا
کے لئے نہ کہیئے (کمرہ میں گھومنے لگتی ہے پھر
بالاخانہ کے دروازہ میں کھڑے ہوکر دیکھنے
لگتی ہے ۔

محبوب خاں ۔ بھلا دادا میاں کیا کر رہے ہیں ؟

رئیسہ ۔ میں سمجھتی ہوں کہ پانی کے نکاس کے
لئے راستہ بنا رہے ہیں ۔

محبوب خاں ۔ وہ تنہا اُس کو نہیں بنا سکتے
کیسا ظلم ہے کہ میں یہاں بیٹھا رہوں اور وہ
وہاں ......

رئیسہ ۔ (محبوب کے پاس جاکر) ابّا جان برش
مجھے دیجئے ۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس کام
کو کرسکتی ہوں ۔

محبوب خاں ۔ بیوقوف ! کیا آنکھیں کھونا
مقصود ہے ۔

رئیسہ ۔ نہیں تو ۔ لائیے برش دیجئے ۔

محبوب خاں ۔ (کھڑا ہوکر) ہاں مجھے اُس کام
کے کرنے میں دو ایک منٹ سے زیادہ نہ
لگیں گے ۔

رئیسہ ۔ اونہہ ۔ بھلا اس سے مجھے کیا نقصان
ہو سکتا ہے ؟ ۔ (برش چھین لیتی ہے) ۔ ہاں اب
(بیٹھ جاتی ہے) یہ تصویر نمونہ کا کام دے گی ۔
دیکھئے ....

محبوب خاں ۔ سنتی ہو ۔ اپنی آنکھوں کو خراب
نہ کرو ۔

رئیسہ ۔ (کام کرتے ہوئے) جی نہیں ۔

محبوب خاں ۔ ننھی پیاری ! ایک دو منٹ
کے لئے ۔ سُن لو ۔ (بالاخانہ پر جالی کے پاس جاتا ہی ۔
رئیسہ کام کرتی رہتی ہے ۔ محبوب خاں اور نظیر خاں
میں بحث چھڑ جاتی ہے) ۔

محبوب خاں ۔ (جالی کے پاس آکر) رئیسہ ذرا
مجھے بسولا تو اُٹھا دو ۔ الماری میں ہے اور برما
بھی (پھر بالاخانہ کی طرف دیکھنے لگتا ہے) اب
آپ کو معلوم ہوگا ۔ پہلے میں اپنا مفہوم سمجھا دوں ۔
(رئیسہ اشیائے مطلوبہ لاکر دیتی ہے) ۔ شکریہ
میں خیال کرتا ہوں کہ میرا آنا اچھا ہوا ۔ (اندر
جاتا ہے ۔ وہاں سے چھیلنے اور بنانے کی آواز
آتی ہے ۔ رئیسہ پیچھے کھڑی دیکھتی رہتی ہے ۔
ایک لمحہ بعد بیرونی دروازے پر دستک سنائی

دیتی ہے۔ لیکن وہ نہیں سنتی)

بلند اختر۔ (ننگے سر اور بغیر کوٹ کے اندر آتا ہے اور تھوڑی دیر تک دروازہ میں کھڑا رہتا ہے)۔ آہا۔

رئیسہ۔ (اس کی طرف دیکھتی ہے اور جاتی ہے)۔ سلام علیکم۔ آئیے۔ اندر تشریف لائیے۔

بلند اختر۔ جزاک اللہ۔ (بالاخانہ کی طرف دیکھ کر) کیا اوپر مزدور کام کر رہے ہیں؟

رئیسہ۔ نہیں صرف دادا میاں اور ابا جان ہیں۔ میں جاکر اطلاع کرتی ہوں۔

بلند اختر۔ نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہ کرو۔ میں انتظار کروں گا۔ (صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے)۔

رئیسہ۔ اُف۔ کیسی گڑبڑ ہے۔ (تصویروں کو اکٹھا کرنے لگتی ہے)۔

بلند اختر۔ کچھ پرواہ نہیں۔ رہنے دو۔ کیا یہ نامکمل اور ناقص تصویریں ہیں؟۔

رئیسہ۔ جی ہاں۔ ذرا سا کام۔ میں بھی ابا جان کو مدد دے رہی تھی۔

بلند اختر۔ تو میں آپ کو کیوں پریشان کروں!

رئیسہ۔ نہیں آپ ہرگز بار نہیں ہیں (تصویر کو پھر اُٹھا لیتی ہے اور کام کرنے لگتی ہے۔ بلند اختر تھوڑی دیر تک خاموش اُس کو دیکھتا رہتا ہے)۔

بلند اختر۔ کیا جنگلی بطا اچھی طرح سوئی؟

رئیسہ۔ جی ہاں۔ خوب گہری نیند۔

بلند اختر۔ (بالاخانہ کی طرف رُخ کر کے) دن بہ نسبت چاندنی رات کے اس جگہ کا منظر بالکل

رئیسہ۔ جی ہاں مختلف اوقات میں اس کے مختلف منظر ہوتے ہیں۔ شام کو بخلاف صبح کے بالکل دو سماں ہوتا ہے۔ اور بارش کے عالم میں تو او کیفیت ہوتی ہے۔

بلند اختر۔ ہاں۔ کیا اِن کو بغور دیکھا ہے؟

رئیسہ۔ ایسا دیکھنا لازمی تھا۔

بلند اختر۔ کیا تم بھی جنگلی بط کے ساتھ رہنا پسند کر

رئیسہ۔ جی ہاں فرصت کے وقت۔

بلند اختر۔ لیکن تمہارے پاس زیادہ وقت تو معلوم ہوتا۔ کیا تم اسکول بھی جایا کرتی ہو؟

رئیسہ۔ نہیں۔ مجھے اب مدرسہ جانے کی حاجت نہ ابا جان میری نگاہ کی کمزوری سے ڈرتے رہتے ہیں

بلند اختر۔ اچھا! تو کیا وہ خود تم کو پڑھایا کرتے ہیں

رئیسہ۔ اُنھوں نے وعدہ تو ضرور کیا تھا۔ لیکن اب تک فرصت ہی نہیں ملی۔

بلند اختر۔ کیا کوئی اور شخص تمہاری مدد نہیں کر سکتا

رئیسہ - جی ہاں ایک مولوی صاحب ہیں لیکن وہ ہر وقت
مصروف .... بالکل .... یعنی -

بلند اختر - ہوش میں نہیں رہتے -

رئیسہ - بالکل ٹھیک -

بلند اختر - پھر تو بہت وقت ملتا ہوگا ؟

رئیسہ - جی بالکل بجا - وہاں پر اور بھی بہت سی
عجیب عجیب چیزیں موجود ہیں -

بلند اختر - کیا واقعی ؟

رئیسہ - جی ہاں - الماری کتابوں سے پُر ہے اور
کتابوں میں تصویریں ہیں -

بلند اختر - اچھا !

رئیسہ - اور ایک پرانی میز ہے جس میں دراز ہیں ایک
بڑی گھڑی بھی ہے جس میں گھنٹہ بجتا تھا - لیکن وہ اب
بگڑ گئی ہے -

بلند اختر - ہاں تو اُس نے وقت بتانا بند کر دیا ہے
اور یہ سب جنگلی بطخ کے علاوہ ہے -

رئیسہ - جی بیشک - ایک پُرانا رنگوں کا ڈبہ دیگر اشیاء
اور کتابیں -

بلند اختر - اور تم کتابیں پڑھنا پسند کرتی ہو ؟

رئیسہ - بیشک - جب ممکن ہوتا ہے - لیکن کتابیں
زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں اور میں اُن کو نہیں
پڑھ سکتی - لہٰذا میں تصویریں دیکھا کرتی ہوں - ایک
بڑی ضخیم کتاب ہے جس کا نام تاریخ شہر لندن ہے جو
ہیری سن صاحب کی تصنیف - یہ تقریباً سو برس پرانی
ہے - اس میں سینکڑوں تصویریں ہیں - ابتدا ہی میں
موت کی تصویر ایک کھوپڑی اور ایک لڑکی سمیت ہے -
مجھے وہ پسند نہیں - لیکن بقیہ سب گرجاؤں، قلعوں -
سڑکوں اور سمندر میں چلنے والے بڑے جہازوں
کی تصویریں ہیں -

بلند اختر - لیکن ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ یہ عمدہ عمدہ چیزیں
تمہارے ہاں کہاں سے آئیں ؟

رئیسہ - جی کبھی ایک بڈھا ملاح یہاں رہا کرتا تھا - وہ
اپنے ہمراہ بہت سامان لایا کرتا تھا - لوگ اُسے پنجابی
کہتے تھے - لیکن ایسا کہنا غلطی پر مبنی تھا -

بلند اختر - کیا وہ پنجابی نہ تھا ؟

رئیسہ - نہیں - لیکن ایک دفعہ وہ ایسا گیا کہ پھر نہ لوٹا
اور یہ تمام اشیاء یہاں رہ گئیں -

بلند اختر - اُونہہ - اچھا یہ تو بتلاؤ جب تم بیٹھی تصویروں
کو دیکھا کرتی ہو تو تمہاری طبیعت نہیں چاہتی کہ خود
جا کر دنیا کو دیکھو ؟

رئیسہ - نہیں تو - میں ہمیشہ گھر ہی پر رہنا چاہتی ہوں
تاکہ اماں اور ابا کو مدد دے سکوں

بلند اختر- کیا تصویریں بنانے میں ؟
رئیسہ- نہیں صرف یہی نہیں- بلکہ میں چاہتی ہوں
کہ انگریزی کتاب جیسی تصویریں بنانا سیکھ جاؤں-
بلند اختر- ہاں، تمھارے باپ کی کیا رائے ہے؟
رئیسہ- میں نہیں سمجھتی کہ ابا جان اس رائے سے
متفق ہیں- وہ تو اس کو مذاق خیال کرتے ہیں-
ذرا خیال کیجئے، وہ چاہتے ہیں کہ میں ایسے فضول کام
جیسے ٹوکری بنانا یا نلوے کی چیزیں تیار کرنا سیکھوں
مجھے اس میں کوئی نفع نظر نہیں آتا-
بلند اختر- اور نہ مجھے-
رئیسہ- لیکن اس حد تک تو ابا جان ٹھیک کہتے
ہیں کہ اگر میں نے ٹوکری بنانا سیکھ لیا ہوتا تو بط کے
لئے نئی ٹوکری بنا سکتی-
بلند اختر- بیشک ضرور بنا لیتی- اور تم کو یہ بھی
اندازہ ہو جاتا کہ آیا وہ اس میں آرام سے رہے گی
یا نہیں- کیا نہیں ؟
رئیسہ- جی ہاں- کیوں کہ وہ میری پیاری جنگلی بط ہے
بلند اختر- بیشک وہ ہے-
رئیسہ- جی وہ میری ہی تو ہے- لیکن میں نے
دادا میاں اور ابا جان کو عاریتاً دیدی ہے-
بلند اختر- لیکن وہ اس کا کیا کریں گے ؟

رئیسہ- وہ اس کی خبرگیری کرتے- اس کے لئے گھر
بناتے اور سب سامانِ آسائش بہم پہونچاتے ہیں-
بلند اختر- خوب- تو بط قابلِ رشک ہے-
رئیسہ- بیشک- کیونکہ وہ وفادار اصلی جنگلی بط ہے.
غریب جانور- اس کا یہاں پر کوئی ساتھی بھی تو نہیں
کیا رحم کے قابل اس کی حالت نہیں-
بلند اختر- اس کے کوئی بھائی بہن نہیں جیسا کہ خرگوش
کے ؟
رئیسہ- جی نہیں- مرغیوں کے بھی بہت سے دوست
ہیں- لیکن یہ غریب تو تمام ساتھیوں کو چھوڑ یہاں آئی
اس بط کی تمام حقیقت صیغۂ راز میں ہے- اس کے
کوئی دوست نہیں- اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ یہ
کہاں سے آئی ؟
بلند اختر- اور یہ سمندر کی تہ تک غوطہ کھا گئی تھی-
رئیسہ- تیزی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے
اور کچھ مسکراتی ہوئی اس سے دریافت کرتی ہے، آپ نے
کیوں کہا کہ "سمندر کی تہ تک" ؟
بلند اختر- مجھے اور کیا کہنا چاہئے ؟
رئیسہ- آپ کو قعرِ دریا کہنا چاہئے تھا-
بلند اختر- کیا یہ وہی بات نہیں ہے اگر میں "سمندر
کی تہ" کہوں-

رئیسہ ۔ اگر کوئی دوسرا "سمندر کی تہ" کہتا ہے تو
مجھ کو ہنسی آجاتی ہے ۔
بلند اختر ۔ کیوں ؟ کیوں ؟ مجھے بھی تو بتلاؤ ۔
رئیسہ ۔ نہیں ۔ میں نہیں ۔ محض میری حماقت ۔
بلند اختر ۔ نہیں حماقت نہیں ۔ اچھا تم ہنستی
کیوں ہو ؟
رئیسہ ۔ جب کبھی میں یکایک خیال کرنے اور سوچنے
لگتی ہوں کہ وہاں کیا ہے ؟ تو تمام گھر اور اُس کی
چیزیں مجھے سمندر کی تہ کی یاد دلاتی ہیں ۔ لیکن یہ
سب محض حماقت ہے ۔
بلند اختر ۔ نہیں ایسا نہ کہو ۔
رئیسہ ۔ وہ صرف بالاخانہ ہی تو ہے ۔
بلند اختر ۔ (غور سے اُس کی طرف دیکھ کر) تم کو
اس کا بالکل یقین ہے ؟
رئیسہ ۔ (متعجب ہو کر) یقین ؟ کیا یہ بالاخانہ
نہیں ہے ؟
بلند اختر ۔ ہاں ۔ کیا تمھیں پختہ یقین ہی ؟
(رئیسہ خاموش ہو جاتی ہے اور مُنہ کھلے
اُس کی طرف دیکھتی ہے ۔ جمیلہ میز پر کھانا چُننے
کے لئے باورچی خانہ سے آتی ہے ۔)
بلند اختر ۔ (اٹھ کر) مجھے افسوس ہے کہ میں بہت
سویرے آگیا ۔
جمیلہ ۔ آقاہ ۔ آپ کو کہیں اور تو جانا نہیں ہم بہت
جلد تیار ہوتے ہیں ۔ رئیسہ میز تو چھوڑ دو (رئیسہ چیزوں
کو سمیٹتی ہے ۔ وہ اور جمیلہ میز کو ٹھیک کرتی ہیں ۔
بلند اختر ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے ۔ اور تصویروں
کی کتاب دیکھنے لگتا ہے)
بلند اختر ۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بھی تصویریں
بنالیتی ہیں ۔
جمیلہ ۔ (اُس کی طرف دیکھ کر) اونہ ۔ جی ہاں ۔
بلند اختر ۔ کچھ یونہی سا کام آتا ہوگا ؟
جمیلہ ۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں ؟
بلند اختر ۔ چونکہ محبوب صاحب خود کام کرتے ہیں ۔
رئیسہ ۔ اماں جان بھی تصویریں بنالیتی ہیں ۔
جمیلہ ۔ جی ہاں ۔ میں نے بھی فنِ مصوری حاصل
کیا ہے ۔
بلند اختر ۔ تو میں خیال کرتا ہوں کہ دوکانداری کا
تمام کاروبار آپ کے سر ہے ؟
جمیلہ ۔ ہاں جب "اُن" کو فرصت نہیں ہوتی ۔
بلند اختر ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا زیادہ وقت آپ
کی خدمت میں گزرتا ہے ۔
جمیلہ ۔ جی ۔ اور "اُن" جیسے شخص کے لئے تمام دن

واہیات قسم کی تصویریں بنانا مناسب بھی نہیں ہے۔

بلند اختر۔ بالکل صحیح۔ لیکن تاہم جب وہ ایک مرتبہ
کسی چیز کی فکر میں ہوں تو.........

جمیلہ۔ اختر صاحب۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ
کوئی معمولی فوٹو گرافر نہیں ہیں۔

بلند اختر۔ بالکل ٹھیک۔ بالکل درست۔ لیکن
.... (بالاخانہ سے گولی چلنے کی آواز آتی ہے)
کیا ہوا!

جمیلہ۔ آہا۔ وہ پھر نشانہ بازی میں مصروف
ہو گئے۔

بلند اختر۔ کیا یہاں بھی بندوق کا استعمال کیا جاتا ہے؟

رئیسہ۔ شکار کو جایا کرتے ہیں۔

بلند اختر۔ کیا زمین پر— ؟ (بالاخانہ کے
در تک جاکر) محبوب صاحب کیا آپ شکار کو
گئے تھے؟

محبوب خاں۔ (جالی کے پیچھے سے) آغاہ۔ آپ
ہیں۔ معاف فرمائیے معلوم نہ تھا۔ میں بہت مشغول
تھا۔ (رئیسہ سے) تم نے ہمیں مطلع بھی نہیں کیا۔
(اندر آتا ہے)۔

بلند اختر۔ کیا بالاخانہ پر شکار بھی کھیلا جاتا ہے؟

محبوب خاں۔ (دونالی پستول دکھاکر) ہاں اس
پرانے کھڑاگ سے۔

جمیلہ۔ ہاں۔ آپ اور خالو جان۔ مجھے اندیشہ
کہ اس بندوق سے کسی دن کچھ گڑبڑ نہ کر بیٹھیں

محبوب خاں۔ (غصہ سے) مجھے یاد ہے کہ کئی مرتبہ
بتلایا گیا ہے کہ اس قسم کے ہتھیار کو پستول کہا کرتے ہیں

جمیلہ۔ کیا ہوا۔ پستول بجانے سے یہ زیادہ
تھوڑے ہی ہو سکتا ہے۔

بلند اختر۔ تو آپ شکاری بھی بن گئے۔

محبوب خاں۔ ہاں کبھی کبھی ایک آدھ خرگوش کا شکار
کرلیا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی محض ابا جان کو خوش
کرنے کے لئے۔

جمیلہ۔ انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔ انھیں ہر وقت
کوئی نہ کوئی چیز بیوقوف بنانے کے لئے چاہیئے۔

محبوب خاں۔ (جھنجھلاکر) ہاں۔ ہاں۔ مردوں کو
ضرور دلچسپی اور تفریح کی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

جمیلہ۔ میں نے بھی تو یہی کہا تھا۔

محبوب خاں۔ اچھا (بلند اختر سے) آپ کو معلوم ہے
خوش قسمتی سے بالاخانہ اس طرح واقع ہوا ہے کہ کوئی
ہمیں بندوق چلاتے نہیں دیکھ سکتا۔ (کتابوں کی
الماری کے اوپر پستول رکھ دیتا ہے) رئیسہ! پستول
کو نہ چھوؤ۔ دیکھو ابھی ایک نال بھری ہوئی ہے۔

بلند اختر۔ (جالی سے دیکھ کر) مجھے معلوم ہوتا ہے کہ
ایک بندوق بھی آپ کے پاس ہے۔
محبوب خاں۔ ہاں وہ بڑے میاں کی بہت پرانی رفیق
ذرا سے بیکار ہے۔ گھوڑے میں خرابی آگئی ہے۔
لیکن اس کا وہاں رکھنا بھی لطف سے خالی نہیں۔ ہم
کبھی کبھی اس کے ٹکڑے کر ڈالتے صاف کرتے اور
پھر جوڑ دیتے ہیں۔ دراصل یہ ابا جان کا ایک کھلونا ہے۔
رئیسہ۔ (بلند اختر کے پاس جاکر) اب آپ جنگلی بط
کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔
بلند اختر۔ میں اسی کو دیکھ رہا ہوں اس کا ایک بازو
کسی قدر لٹکا ہوا ہے۔
محبوب خاں۔ ہاں کیا تعجب ہے یہی تو زخمی ہو گیا تھا
بلند اختر۔ اور ایک ٹانگ بھی کسی قدر لنگ کرتی ہے۔
محبوب خاں۔ یونہی سی۔
رئیسہ۔ جی ہاں۔ اسی ٹانگ میں تو کتے نے دانت
مارے تھے۔
محبوب خاں۔ لیکن اس کے علاوہ ذرا بھی تو نقص
نہیں۔ اور جب آپ خیال کریں کہ اس کے بازو میں
گولی لگی اور ایک ٹانگ کتے کے منہ میں بھی چلی گئی تو
حیرت ہوتی ہے۔
بلند اختر۔ (رئیسہ کی طرف دیکھ کر) اور ایک عرصہ تک
سمندر کی تہ میں بھی رہی۔
رئیسہ۔ (مسکرا کر) جی ہاں
جمیلہ۔ (میز کے پاس کھڑی ہوکر) خوش قسمت
جنگلی بط! ہر لحہ ہر گھڑی اسی کا تذکرہ!
محبوب خاں۔ اونہہ۔ کیا آپ جلدی سے کھانا
چن لیں گی!
جمیلہ۔ ہاں بہت جلد۔ رئیسہ آؤ اور مدد کرو۔ (وہ
اور رئیسہ باورچی خانہ میں جاتی ہیں)
محبوب خاں۔ (دبی آواز میں) میں خیال کرتا ہوں
اور یہی مناسب ہے کہ یہاں کھڑے رہ کر ابا جان
کو نہ دیکھیں وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ (بلند اختر
دروازے سے ہٹ جاتا ہے)۔ اور اس سے پیشتر
کہ اور مہمان آئیں کواڑوں کو بند کر دینا چاہیئے۔ (وہ
جالی ہٹاتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے) یہ جالی میری
ہی ایجاد ہے۔ دراصل چیزوں کی ایجاد اور ان کے
نقائص دور کرنے میں بھی مسرت حاصل ہوتی ہے۔
علاوہ ازیں آپ کو معلوم ہونا چاہئے۔ کہ میرے لئے
ایسا کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ بیگم پسند نہیں کرتی
کہ مرغی بچے اور خرگوش گھر میں ادھر ادھر پھرا کریں۔
بلند اختر۔ بیشک نہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کارخانہ
بیگم صاحبہ کی ملکیت ہے

محبوب خاں - جہاں تک ممکن ہوتا ہے - معمولی کام
اُن کے سپرد کیا جاتا ہے اس سے مجھے وقت مل جاتا
ہے - اور میں الگ بیٹھ کر زیادہ ضروری کاموں
کے پورا کرنے پر غور کیا کرتا ہوں -

بلند اختر - محبوب صاحب وہ کون سے کام ہیں -

محبوب خاں - مجھے تعجب ہے کہ آپ نے پہلے کیوں
نہ دریافت کیا - لیکن شاید کسی سے آپ نے میری
اختراعات و ایجادات کے متعلق نہیں سنا -

بلند اختر - ایجادات ؟ نہیں تو

محبوب خاں - واقعی آپ نے نہیں سُنا - ہاں
بیشک - اوپر باہر کی طرف -

بلند اختر - کیا وہاں کوئی جدت دکھائی ہے -

محبوب خاں - ابھی پورے طور پر نہیں - لیکن میں
بہت محنت سے کام کر رہا ہوں اور آپ کو یقین کرنا
چاہیئے کہ جب میں نے مصوّری کے پیشے کو اختیار
کرنے کا تہیہ کیا تو محض معمولی تصویروں کے خیال
سے نہیں -

بلند اختر - نہیں - یہی بات تو بیگم صاحبہ بھی کہہ رہی تھیں

محبوب خاں - میں نے قسم کھائی کہ اگر میں اپنے قوائے
عقلیہ کو اس پیشہ میں صرف کروں گا تو اس معیار تک
پہنچا دوں گا جہاں یہ ادب و علم بن جائے گا - اور -

لہذا میں نے اُس عجیب ایجاد کے بنانے کا ارادہ کیا -

بلند اختر - اور ایجاد کی صورت اور اُس کا تخیل
کیا ہے ؟

محبوب خاں - میرے پیارے دوست تفصیل
نہ پوچھو - اس کے لئے وقت چاہیئے - اور آپ کو
یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیئے کہ غرور و نخوت کے باعث
میں بتانے سے محترز ہوں - میں آپ کو یقین دلاتا
ہوں کہ میں اپنی ذاتی بہبودی و فلاح کے لئے
کچھ نہیں کر رہا - نہیں نہیں - یہ میری زندگی کا مقصد
اولین نہیں ہے - جو شبانہ روز میرے دماغ میں موجود
رہتا ہے -

بلند اختر - وہ نصب العین کیا ہے ؟

محبوب خاں - کیا آپ میرے غریب بوڑھے باپ
کو بھول گئے -

بلند اختر - آپ کے باپ غریب ! - ہاں لیکن آپ
اُن کے لئے کیا کر سکتے ہیں ؟

محبوب خاں - میں اُن کی گئی گزری عزت کو از سرِ نو
زندہ کر سکتا ہوں - اگر میں اپنے خاندان کا نام احترام
و عزت کے حلقہ میں روشن کر دوں -

بلند اختر - تو یہ آپ کا مقصدِ حیات ہے -

محبوب خاں - جی ہاں میرا مطلب اُس تباہ شدہ

ہستی کو نجات اور آسودگی دلانے کا ہی جس کا سفینۂ
حیات طوفان بلا نازل ہونے سے پہلے معرضِ خطر
میں آچکا تھا - اور جب وہ خوفناک تفتیش شروع ہوئی
وہ اپنی حقیقت کو گم کر گیا - یہ پستول ! یہ جس سے
خرگوشوں کا شکار کیا جایا کرتا تھا - ہمارے خاندان کی
تباہی میں بہت بڑا کام کر چکا ہے -

بلند اختر - یہ پستول - اوہ !

محبوب خاں - جب قید کا حکم سنایا گیا تو اُن کے
ہاتھ میں بھی پستول تھا . . .

بلند اختر - تو کیا اُن کا ارادہ خدانخواستہ ؟

محبوب خاں - ہاں لیکن ہمت نے ساتھ نہ دیا - وہ
بزدل نکلے - وہ اس وقت بہت شکستہ دل اور پریشاں
خاطر تھے - کیا آپ خیال کر سکتے ہیں ! ایک سپاہی
ایک جری انسان جس نے تو شیر شکار کئے ہوں اور جو
دو بڑے بہادر سرداروں کی اولاد ہو - کیا آپ اندازہ
لگا سکتے ہیں - اختر صاحب !

بلند اختر - ہاں میں اچھی طرح سمجھتا ہوں -

محبوب خاں - کم از کم میں نہیں - اور آپ کو بتلاؤں
کہ کس طرح دوسرے وقت اس پستول نے ہمارے
گھر میں کارِ نمایاں انجام دیا - جب سپاہیوں نے
ان کو قیدیوں کے کپڑے پہنا دیئے اور ہاتھوں میں
ہتھکڑیاں لگا دیں - میرے دوست ! وہ وقت کیسا
قیامت انگیز و زہرہ گداز تھا - میں نے دو کھڑکیوں
پر پردے ڈال دیئے تھے جب میں باہر جھانکتا تھا تو
سورج کو حسبِ معمول درخشاں و تاباں پاتا - میں
اس کے معنی نہ سمجھ سکا - میں نے آدمیوں کو سڑکوں
پر چلتے پھرتے دیکھا - روزمرہ واقعاتِ زندگی کی
بابت بات چیت کرتے اور ہنستے پایا - میں اس کو
بھی نہ سمجھ سکا - مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا تمام
کائنات پر مُردنی چھاگئی ہی اور دنیا تاریک ہی

بلند اختر - جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا تو مجھ کو بھی
یہی واقعہ پیش آیا تھا

محبوب خاں - اور یہ اُسی وقت پیش آیا جب محبوب نے
پستول کو اپنے سینہ پر رکھا..... .

بلند اختر - تو کیا آپ کا منشا بھی .....

محبوب خاں - ہاں -

بلند اختر - لیکن پستول چلایا نہیں -

محبوب خاں - اس نازک موقعہ پر میں نے اپنے
حسیات پر فتح پائی - میں زندہ رہا - لیکن میں آپ کو
بتلانا چاہتا ہوں کہ ضرورتِ وقتی کا تقاضا ہمتِ مردانہ
پر یہی ہے کہ ایسے ماحول میں زندگی بسر کرے -

بلند اختر - اس کا فیصلہ تو زندگی و ماحول کے صحیح معنی

و مفہوم پر ہے

محبوب خاں۔ نہیں - یہ سوال نہیں - لیکن اُس وقت یہی انسب تھا - کیونکہ اب میں بہت جلد اپنی ایجاد کو ختم کر دوں گا اور حکیم صاحب کو یقین ہے اور میں بھی اُن کا ہم خیال ہوں کہ ابا جان کو وردی پہننے کی اجازت مل جائے گی - اور میں اپنی تمام محنتوں کا صلہ اسی کو تصور کر دوں گا -

بلند اختر۔ تو کیا یہ تمام درد سری محض وردی کے لئے ؟

محبوب خاں۔ یہی تو وہ چیز ہے جس کی تمنا اُن کے دل میں جاگزیں ہے - آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس سے میرے دل پر کیسے آرے چلتے ہیں - ہر موقعہ پر جب ہمارے یہاں کوئی نام نہاد تقریب ہوتی ہے - مثلاً شادی اور سالگرہ تو بوڑھے باپ اُسی وردی کو جو ایام عشرت و فارغ البالی میں استعمال کرتے تھے پہنتے ہیں - لیکن اگر وہ دروازہ پر کسی قسم کی دستک یا آہٹ سُن پاتے ہیں تو جلدی سے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں - آپ جان سکتے ہیں کہ وہ اجنبیوں کے سامنے اُس پوشاک میں آنے کی جرارت نہیں کر سکتے - میں سچ سچ کہتا ہوں کہ یہی بات ایک بیٹے کی دل شکستگی کے لئے کافی ہے۔

بلند اختر۔ اور کب تک آپ کے خیال میں وہ ایجاد تکمیل کو پہنچ جائے گی ؟

محبوب خاں۔ اوہو - سبحان اللہ - میں وقت معین نہیں کر سکتا - ایک انسان جس میں ایجاد کا مادہ ہو اپنی فہم کو اپنے حسب منشا کام میں نہیں لا سکتا - کام کی تکمیل زیادہ تر جذبۂ الہام پر موقوف ہے - یا وقتی سوجھ بوجھ پر - اور یہ بتلانا قطعی ناممکن ہے کہ کس وقت اِس الہام کا نزول ہو گا -

بلند اختر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کافی ترقی ہو رہی ہو گی ؟

محبوب خاں۔ بیشک ترقی ہو رہی ہے - ایک دن بھی تو ایسا نہیں گزرتا جب میں اُس کے متعلق غور نہیں کرتا - میں اس کے خیال میں ہمہ تن مستغرق ہو جاتا ہوں - دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں ٹھیک میں چلا جاتا ہوں - دروازہ کو بند کر لیتا اور اطمینان اور سکون سے غور کیا کرتا ہوں - لیکن مجھے جلدی کسی بات کی نہیں - اس سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا - حکیم صاحب کی بھی یہی رائے ہے -

بلند اختر۔ لیکن کیا بالاخانہ کے مشاغل آپ کے کام میں حارج نہیں ہوتے اور توجہ کو نہیں ہٹاتے -

محبوب خاں۔ ذرا نہیں - قطعی نہیں - آپ ایسا نہ کہیں - میرے لئے یہ بالکل ناممکن ہے کہ

ہر وقت اُس جاں گداز سلسلۂ خیالات پر غور و فکر کرتا رہوں۔ تفریحِ طبع کے لئے بھی تو کسی دوسری چیز کی ضرورت ہے تاکہ وہ اُن لمحوں میں جب میں ان سے انتظار میں ہوتا ہوں میری توجہ کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ اور کوئی چیز یا کام جس کو میں کرتا ہوں مجھ کو اس خیال کے قبول کرنے سے جب اس کا نزول ہوتا ہے نہیں روک سکتا۔

بلند اختر۔ میرے پیارے محبوب! مجھے خیال ہو چلا ہے کہ خود تم میں جنگلی بط کے جراثیم اثر کر گئے ہیں۔

محبوب خاں۔ جنگلی بط کے جراثیم! معاذ اللہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

بلند اختر۔ تم تہ تک پہنچ گئے ہو اور جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گئے ہو۔

محبوب خاں۔ تمھارا مطلب اُس مہلک افتاد سے تو نہیں جس نے مجھے اور والد صاحب کو قریب قریب اپاہج اور ناکارہ کر دیا ہے؟

بلند اختر۔ نہیں۔ اُس سے نہیں۔ میرا یہ کہنے کا ہرگز منشا نہیں کہ تم جنگلی بط کی طرح زخمی ہو گئے لیکن محبوب ایک زہریلی دلدل میں پھنس گئے ہو۔ ایک مہلک مرض چمٹ گیا ہے اور پورے طور پر اس میں ملوث ہو چکے ہو۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم اسی طرح گمنامی و کس مپرسی میں تباہ ہو جاؤ گے

محبوب خاں۔ میں! گمنامی کی موت! اختر۔ دیکھو اِس قسم کی بیہودہ اور پریشان کن گفتگو بند کرو۔

بلند اختر۔ اپنے دماغ کو ٹھیک کرو۔ میں تمھیں سطح پر نکال لانے کی کوشش کروں گا۔ میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے اور اس کا انکشاف مجھے کل ہی ہوا۔

محبوب خاں۔ ممکن ہے۔ لیکن خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔ میں تمھیں یقین دلا سکتا ہوں کہ علاوہ اپنی جبلی افسردگی اور طبعی رنجوری کے میں بھی دوسرے لوگوں کی مانند زندگی بسر کرتا ہوں۔

بلند اختر۔ یہ خیال ہی اُس زہر کے اثر کو ظاہر کرتا ہے

محبوب خاں۔ اچھا تو اب برائے مہربانی بیماری اور زہر کے ذکر کو چھوڑیئے۔ میں اس قسم کی گفتگو کا عادی نہیں ہوں۔ میرے اپنے گھر میں کوئی ان مکروہ چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتا۔

بلند اختر۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

محبوب خاں۔ ہاں۔ اس قسم کی باتیں مجھے قطعی پسند نہیں۔ اور یہاں پر کوئی زہریلی دلدل نہیں ہے۔ مصوّر کا گھر غریب ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اور میرے ذرائع محدود ہیں۔ لیکن میں ایک صنّاع

موجد ہوں اور گھر کا روزی دھندہ - اور اس خیال سے میں اپنے کو اس ناچیز ماحول سے بالاتر سمجھتا ہوں دیکھئے اب کھانا آرہا ہے - (جمیلہ اور رئیسہ شربت کی بوتل - گلاس وغیرہ لاتی ہیں - اُسی وقت حکیم و مولوی صاحبان ٹوپی اور کوٹ پہنے بغیر اندر آتے ہیں - مولوی صاحب سیاہ ریشمین قمیص زیبِ تن کئے ہوئے ہیں) -

جمیلہ - (میز پر کھانا چُن کر) آخاہ بالکل ٹھیک وقت پر تشریف لائے -

حکیم جی - مولوی صاحب نے کہا کہ ان کو کبابوں کے تلے جانے کی خوشبو آرہی ہے - ان کی اشتہا زور پکڑ گئی - سلام علیک - محبوب صاحب - اختر صاحب - مولوی صاحب اور حکیم جی سے تعارف کرا دوں - ہاں حکیم جی کو تو آپ جانتے ہی ہیں -

بلند اختر - ہاں قدرے -

حکیم جی - منیر عالم صاحب کے صاحبزادے نا - ہاں لاہور میں ایک آدھ دفعہ ملاقات ہوئی تھی - کیا آپ یہاں آج ہی فروکش ہوئے ؟ -

بلند اختر - جی آج صبح -

حکیم جی - مولوی صاحب اور میں آپکے بالکل پیچھے والے کمرے میں رہتے ہیں - اگر کبھی آپ کو کسی حکیم کی حاجت ہو تو دور جانے کی ضرورت نہیں -

بلند اختر - شکریہ - ممکن ہے ضرورت ہو - کیونکہ ہم کھانے پر ١٣ تیرہ آدمی تھے -

محبوب خاں - اختر صاحب جانے بھی دیجئے - پھر وہی حرکت -

حکیم جی - محبوب صاحب آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں - ان کا اشارہ آپ کی طرف تھوڑا ہی ہے -

محبوب خاں - خدا کے لئے میرے گھر کا تو خیال کیجئے لیکن اب ہمیں بیٹھنا چاہیئے اور خوشی خوشی کھانا کھانا شروع کر دینا چاہیئے -

بلند اختر - کیا آپکے والد صاحب نہ آئیں گے ؟

محبوب خاں - نہیں - وہ تنہا کھانا پسند کرتے ہیں - آیئے بسم اللہ - (سب کھانے اور پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں - جمیلہ اور رئیسہ اُن کی ضروریات کو دیکھتی ہیں) -

حکیم جی - بیگم صاحبہ - مولوی صاحب کو کل پھر دورہ آرہا تھا -

جمیلہ - کیا واقعی ؟

حکیم جی - کیا آپنے اُن کی آواز نہ سُنی تھی - جب ہم کل رات واپس لوٹے -

جمیلہ - نہیں - مجھے یاد نہیں پڑتا -

حکیم جی - کل پھر وہی بدمستی اور بیخودی کی حالت تھی -

حمیدہ۔ کیوں مولوی صاحب یہ ٹھیک کہتے ہیں؟

مولوی صاحب۔ رات کی حرکتوں پر پردہ پڑا رہنا ہی بہتر ہے۔ ایسی باتوں کا تذکرہ فضول۔ ہوش کی حالت سے ان کا کیا تعلق!

حکیم جی۔ بلند اختر سے یہ حالت اُن پر جادو کی طرح طاری ہوتی ہے اور میں ان کی دیکھ بھال کیا کرتا ہوں مولوی صاحب قوالیوں کے دلدادہ ہیں

بلند اختر۔ قوالیوں کے دلدادہ؟

حکیم جی۔ جی ہاں مولوی صاحب قوالی سننے کے شائق ہیں

بلند اختر۔ اوہ!

حکیم جی۔ اور ایسے حضرات کبھی زندگی میں ایک راہ پر قائم نہیں رہتے۔ کبھی کبھی صراطِ مستقیم سے ان کا پاؤں ڈگمگا جاتا ہے

بلند اختر۔ بیشک بیشک۔

حکیم جی۔ اور کیا آپ کی وہ طلب وہ ضرورت جس کی تلاش میں آپ گھر جایا کرتے تھے پوری ہو گئی؟

بلند اختر۔ میری ضرورت؟ (سوچکر) آہا۔ اب سمجھا۔

محبوب خاں۔ بلند اختر۔ کیا ضرورت تھی؟

بلند اختر۔ یہ بیہودہ بک رہے ہیں

حکیم جی۔ نہیں۔ بالکل واقعہ ہے۔ یہ حضرت ہر شخص کے گھر جایا کرتے تھے اور وہاں اپنے نصب العین کو تلاتے تھے

بلند اختر۔ وہ عالمِ طفلی و نادانی تھا

حکیم جی۔ بالکل ٹھیک۔ آپ اُس وقت بچے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے دورانِ قیام میں تو کوئی ہستی آپکے نصب العین معیار کے مطابق نہ ملی

بلند اختر۔ اب تک نہیں

حکیم جی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کی ضرورتوں میں کمی واقع ہو گئی ہے

بلند اختر۔ نہیں۔ جب میں کسی شخص سے جو صحیح معنی میں انسان ہو بات کرتا ہوں

محبوب خاں۔ بالکل معقول بات ہے۔ بیگم تھوڑا سا کھن

حکیم جی۔ اور قدرے گوشت بھی مولوی صاحب کے لئے

مولوی صاحب۔ نہیں نہیں (بالاخانہ کے دروازہ پر دستک)

محبوب خاں۔ رئیسہ! کواڑ کھولدو۔ ابا جان آنا چاہتے ہیں۔ (رئیسہ کواڑ کھولدیتی ہے نظیر خاں اندر آتا ہے اور ہاتھ میں خرگوش ہے۔ دروازہ بند کر دیتا ہے)

نظیر خاں۔ السلام علیکم۔ حضرات۔ خوب شکار ہوا ایک بڑا خرگوش ملا

محبوب خاں۔ اور میرے بغیر آپ نے اس کو بنا بھی لیا

نظیر خاں ہاں اور بھون بھی لیا - عمدہ نرم اور لذیذ گوشت - خرگوش کا گوشت سبحان اللہ - حضرات اپنا کام کرتے رہیئے - (اپنے کمرہ میں چلا جاتا ہے) -

مولوی صاحب - (کھڑے ہوکر) معاف کیجئے - میں نہیں...... مجھے فوراً زینہ سے نیچے جانا چاہیئے

حکیم جی - اُونہ - میاں تھوڑا سوڈے کا پانی پی لو -

مولوی صاحب - (جلدی سے جاتے ہوئے) - آہ - آہ - (بیرونی دروازے سے باہر نکل جاتا ہے) -

حکیم جی - (محبوب خاں سے) ہمیں بڑے میاں کا جامِ صحت نوش کرنا چاہیئے

محبوب خاں - (جامِ صحت پیتے ہوئے) بڑے میاں کا جامِ صحت! ہاں - جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں

حکیم جی - (بڑے میاں کا (پیتا ہے) ذرا یہ بتلاؤ کہ سفید بال ہیں یا کھچڑی -

محبوب خاں - نہ سفید نہ کھچڑی - بلکہ درمیانی لیکن جہاں تک بالوں کا تعلق ہے اب سب گر چکے ہیں

حکیم جی - اونہہ - محبوب خاں! درحقیقت آپ بہت خوش قسمت ہیں - آپ کے پیش نظر ایک مقصد ہے اور اُس کے لئے کوشاں ......

محبوب خاں - اور آپ یقین مانیئے میں بہت کوشش کرتا ہوں -

حکیم جی - اور آپ کی بیگم صاحبہ بھی ماشاءاللہ ہوشیار اور دوربین ہیں - ہر وقت کام میں لگی ہیں ہر ایک چیز کی نگاہ داشت کرنا - بنانا اور سنوارنا کتنا مشکل کام ہے

جمیلہ - خدا کے لئے مذاق نہ کیجئے

حکیم جی - اور آپ کی چھوٹی بچی رئیسہ!

محبوب خاں - (جوش میں آکر، میری بچی! میری پہلی اکلوتی اور ذی فہم بچی - رئیسہ! یہاں آ بیٹی - (سر پر ہاتھ پھیر کر) بھلا کل کیا دن ہے؟

رئیسہ - (جھپٹ کر) ابا جان اس کا ذکر نہ کیجئے

محبوب خاں - اس خیال سے میرے خون میں جوش آنے لگتا ہے کہ کل کیا حماقت ہوگی! ایک معمولی تقریب بالا خانے پر

رئیسہ - لیکن وہ بہت پُرلطف ہوگی ابا جان -

حکیم جی - رئیسہ توقف کرو کہ ایجاد تکمیل کو پہنچ جائے

محبوب خاں - ہاں بیشک - رئیسہ میں نے تمہاری آیندہ زندگی کو خوش بنانے کا عہد کرلیا ہے - تم تمام عمر آرام سے رہو گی - میں تمہارے لیئے - ہاں تمہارے لئے - کچھ سامانِ بے فکری مہیا کر جاؤں گا - اور یہ غریب موجد کا انعام ہوگا

رئیسہ۔ (گلے میں باہیں ڈال کر) پیارے۔

پیارے ابا۔

حکیم جی۔ (بلند اختر سے) کیا آپ کو اس میں مسرت نہیں معلوم ہوتی کہ ایک عمدہ خوش و خرم گھر میں بیٹھ کر نعیس ولذیذ کھانے نوش کئے جائیں؟

بلند اختر۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں مسموم فضا ہرگز پسند نہیں کرتا

حکیم جی۔ مسموم فضا؟

محبوب خاں۔ خدا کے لئے یہ بیہودہ بات پھر شروع نہ کرو

جمیلہ۔ اختر صاحب! اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہاں ذرا بھی زہریلی فضا نہیں ہے میں ہر صبح تمام گھر کو صاف کر دیتی ہوں

بلند اختر۔ (کھانے پر سے اُٹھ کر) جس سمیت کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اُس کو کوئی صفائی دور نہیں کر سکتی

محبوب خاں۔ سمیت؟

جمیلہ۔ آپ کیا سمجھے؟

حکیم جی۔ معاف کیجئے۔ کہیں آپ ہی تو آگرہ سے اس سمیت کو اپنے ساتھ نہیں لائے۔

بلند اختر۔ تو کیا آپ کا یہ منشا ہے کہ جب میں کسی کے گھر جاتا ہوں تو جراثیم سمیت اپنے ساتھ لیجاتا ہوں۔

حکیم جی۔ (اُس کے پاس جا کر) اختر صاحب۔ میری سنو۔ مجھے کافی شبہ ہے کہ آپ ابھی تک اپنے اسی خیال اور نصب العین کو جیب میں لیئے پھرتے ہیں

بلند اختر۔ نہیں بلکہ دل میں لئے ہوئے۔

حکیم جی۔ اِس منحوس خیال کو جہاں چاہیئے لیجایئے لیکن آپ کو میرا مشورہ ہے کہ اپنے تخیل کا اظہار جب تک میں یہاں موجود ہوں ہرگز نہ کیجیئے

بلند اختر۔ اگر بالفرض میں کروں؟

حکیم جی۔ تو پہلے تو آپ دھڑام سے سر کے بل نیچے جائیں گے۔ سمجھے؟

محبوب خاں۔ کیا ہی حکیم صاحب!

بلند اختر۔ تو پہلے مجھ کو نیچے گرا ہی دیجئے۔

جمیلہ۔ (مداخلت کرتے ہوئے) حکیم جی آپ کو یہاں ایسا نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اختر صاحب آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ امر آپ کے شایان شان نہیں۔ خود آپ نے دودکش سے تمام کمرے کو گندہ کر دیا اور اب یہاں آکر گندگی کا ذکر چھیڑ دیا۔

(بیرونی دروازہ پر دستک سُنائی دیتی ہے)۔

رئیسہ۔ اماں جان! کوئی دستک دے رہا ہے

محبوب خاں۔ غالباً کوئی صاحب آئے ہیں۔

جمیلہ۔ میں جاتی ہوں اور دریافت کرتی ہوں۔

(دروازہ پر جاکر کواڑ کھولتی ہے۔ لیکن ڈر کر گھبراجاتی اوہٹ آتی ہے) خدا خیر کرے!

(منیر عالم کوٹ ڈاٹے دہلیز میں آجاتے ہیں۔

منیر عالم۔ معاف کیجئے۔ میرا خیال تھا کہ میرا بیٹا اس مکان میں مقیم ہے۔

جمیلہ۔ (سانس روکے ہوئے) جی بیشک۔

محبوب خاں۔ (اُس کے پاس جاکر) منیر عالم صاحب کیا آپ براے مہربانی۔

منیر عالم۔ شکریہ۔ میں صرف اپنے بیٹے سے گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔

بلند اختر۔ کہیئے۔ کیا ارشاد ہی؛ بندہ حاضر ہی۔

منیر عالم۔ میں تم سے تمہارے کمرے میں گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔

بلند اختر۔ میرے کمرے میں ...... اچھی بات ہی۔ (چلنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے)۔

جمیلہ۔ نہیں۔ بخدا ایسی حالت میں آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔

منیر عالم۔ اچھا تو پھر برآمدہ میں۔ میں تم سے تخلیہ میں بات کرنی چاہتا ہوں۔

محبوب خاں۔ منیر عالم صاحب۔ تخلیہ تو یہاں [illegible] ہے۔ حکیم جی چلیئے بیٹھک میں چلیں۔

(محبوب خاں اور حکیم جی داہنی طرف چلے جا[illegible] جمیلہ رئیسہ کے ساتھ باورچی خانہ میں چلی جا[illegible]

بلند اختر۔ (کچھ توقف کے بعد) اچھا تو [illegible]

منیر عالم۔ تم نے کل رات کچھ باتیں کہی تھیں اور اب یہ دیکھ کر کہ تم نے نظیر نماں وغیرہ [illegible] رہنا شروع کر دیا ہے۔ میں یہ خیال کرنے پر [illegible] ہو جاتا ہوں کہ تم میرے خلاف کوئی سازش کرنے والے ہو۔

بلند اختر۔ جی میں محبوب خاں کی آنکھیں کھو[illegible] کی فکر میں ہوں۔ وہ اپنی اصلی اور واقعی [illegible] اندازہ اُسی وقت کر سکے گا اور بس۔

منیر عالم۔ تو کیا یہ وہی نصب العین اور [illegible] حیات ہے جس کا تذکرہ کل تم نے مجھ سے [illegible]

بلند اختر۔ جی ہاں۔ آپ نے کوئی راہ کھلی [illegible] ہی نہیں۔

منیر عالم۔ تو کیا میں نے تمہارے دماغ کو مختل کر دیا ہے؟

بلند اختر۔ آپ نے تو در اصل میری زندگی کو [illegible] بالا کر دیا ہے۔ مجھے اُن باتوں کا خیال نہیں [illegible]

ان کی بابت کہی گئیں۔ لیکن صرف آپ کی ذات
تاں مبارکباد وشکریہ یہی کہ میں ایک پرانے معاصی
ضمیر سے ہر وقت خوف میں رہتا ہوں۔
منیر عالم۔ افوہ۔ تو یہ تمہارا ضمیر ہے جس سے
اس قدر پریشانی ہے۔ کیا واقعی ؟
بلند اختر۔ میں تو مدت عرصہ پیشتر آپ کے خلاف
ہو گیا ہوتا جب غریب نظیر خاں کے لئے جال
پھیلایا گیا تھا۔ مجھے اُن کو اسی وقت مطلع کر دینا
چاہئے تھا۔ کیونکہ مجھے اسی وقت اندیشہ تھا کہ
[illegible] یہ ہوگا
منیر عالم۔ ہاں تو تم نے تذکرہ کر دیا ہوتا
بلند اختر۔ مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں آپ سے بہت
ڈرتا تھا۔ میں نہیں بتلا سکتا کہ کتنا ڈرتا تھا۔ اُس وقت
بھی اور اُس کے بعد بھی۔
منیر عالم۔ تو کیا اب تم مجھ سے خائف نہیں ؟
بلند اختر۔ خوش قسمتی سے نہیں۔ وہ زیادتیاں جو
آپ نے اور .... دوسروں نے غریب
نظیر خاں کے ساتھ کی ہیں اس کا کچھ ازالہ نہیں
ہو سکتا۔
منیر عالم۔ کیا تم سمجھتے ہو اس سے کچھ فائدہ
ہو سکے گا ؟

بلند اختر۔ مجھے کامل یقین ہے
منیر عالم۔ تو کیا تم خیال کرتے ہو کہ محبوب اس
قماش کا آدمی ہے کہ وہ اِس خدمت کے بدلے
تمہارا شکرگزار ہوگا ؟۔
بلند اختر۔ بیشک۔
منیر عالم۔ اُونہہ دیکھا جائے گا۔
بلند اختر۔ اور علاوہ ازیں اگر میں زندہ رہا تو مجھے
اپنے بیمار دل کی اصلاح کے لئے بھی کچھ کرنا ہوگا
منیر عالم۔ تم کبھی مداوا نہ کر سکو گے۔ تمہارا دل
تو بچپن سے بیمار ہے یہ تمہاری ماں کا عطیہ ہے۔ وہ
تنہا چیز جو تم کو میراث میں ملی ہے۔
بلند اختر۔ (کھسیانی ہنسی سے) کیا آپ ابھی تک
اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہ اُس کے ساتھ
شادی ہونے سے دولت ہاتھ آ جائے گی ؟
منیر عالم۔ ان بے تعلق اور بے ربط باتوں کا ذکر نہ
نہ کرو۔ کیا تم نے اِس لائحۂ عمل پر چلنے کا مستقل ارادہ
کر لیا ہے ؟ یعنی تم محبوب کو صراطِ مستقیم پر ڈال دینا
چاہتے ہو ؟۔
بلند اختر۔ ہاں بالکل تیار۔ قطعی مستعد۔
منیر عالم۔ تو اس صورت میں میرا یہاں آنا بالکل
فضول ہوا۔ کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم سے گھروالے

جاننے کے لیئے کہنا قطعی بیکار اور لا حاصل ہے۔

بلند اختر۔ جی ہاں۔ کچھ فائدہ نہیں۔

منیر عالم۔ اور تم تجارت میں بھی شرکت نہ کروگے؟

بلند اختر۔ جی نہیں۔

منیر عالم۔ بالکل ٹھیک۔ اب چونکہ میرا ارادہ دوسری شادی کرنے کا ہے جائداد تقسیم ہو جائے گی۔

بلند اختر۔ (جلدی سے) نہیں۔ مجھے جائداد بھی نہیں چاہیئے۔

منیر عالم۔ تو جائداد بھی نہ لوگے؟

بلند اختر۔ نہیں۔ مجھے درکار نہیں۔ میرا ضمیر اس کی گواہی نہیں دیتا۔

منیر عالم۔ (ایک لمحہ توقف کے بعد) کیا تم کام پر لاہور بھی نہ جاؤگے؟

بلند اختر۔ نہیں۔ میں آپ کی ملازمت سے دست بردار ہو چکا۔

منیر عالم۔ لیکن کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

بلند اختر۔ کچھ نہیں صرف اپنے مقصدِ حیات کو حاصل کرنا اور بس۔

منیر عالم۔ ہاں۔ لیکن پھر بعد میں ...... تم کس طرح زندہ رہوگے؟۔ گزر اوقات کیسے ہوگی؟۔

بلند اختر۔ میں نے اپنی آمدنی سے کچھ پس انداز کرلیا ہے۔

منیر عالم۔ لیکن وہ سرمایہ زیادہ مدت تک نہ رہ سکے گا۔

بلند اختر۔ میں خیال کرتا ہوں میری زندگی کے لیئے کافی ہے۔

منیر عالم۔ تمہارا کیا منشا ہے؟

بلند اختر۔ اب میں کسی سوال کا جواب نہ دوں گا۔

منیر عالم۔ خدا حافظ اختر!

بلند اختر۔ خدا حافظ۔ (منیر عالم چلا جاتا ہے)

محبوب خاں۔ (جھانک کر) کیا چلے گئے؟

بلند اختر۔ ہاں۔ (محبوب خاں اور حکیم جی اندر آتے ہیں۔ اُسی وقت جمیلہ اور رئیسہ بھی باورچی خانے سے آتی ہیں)۔

حکیم جی۔ آج کی دعوت ناکام رہی۔

بلند اختر۔ محبوب صاحب ذرا کپڑے پہن کر میرے ساتھ چلو۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

محبوب خاں۔ شوق سے۔ آپ کے والد صاحب کیا چاہتے تھے؟ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟

بلند اختر۔ آیئے باہر چلیں۔ مجھے کچھ کہنا ہے۔
میں جا کر اپنا کوٹ لے آؤں۔ (چلا جاتا ہے)

جمیلہ۔ بابو صاحب۔ آپ کو اختر صاحب کے
ہمراہ اس وقت نہ جانا چاہیئے۔

حکیم جی۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ یہیں رہیے۔

محبوب خاں۔ (اپنی ٹوپی اور کوٹ پہن کر)
کیا مطلب ہے؟ جب ایک پُرانا دوست تخلیہ
میں اپنی داستانِ دل مجھ سے بیان کرنا چاہے
تو۔۔۔

حکیم جی۔ لیکن اُسے شیطان سمجھیئے۔ کیا آپ
خود نہیں دیکھتے کہ وہ پاگل ہے۔ خبطی۔ ہوش و
حواس سب گُم۔

جمیلہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کی ماں کو بھی کبھی
کبھی اسی قسم کے دَورے ہوتے تھے۔

محبوب خاں۔ تب تو اُس کو اپنے دوست کی
اور بھی زیادہ مدد درکار ہے۔ (جمیلہ سے) دیکھو
خوب سُن لو۔ رات کو کھانا ٹھیک وقت پر تیار
ملے (بیرونی دروازے سے باہر
چلا جاتا ہے)

حکیم جی۔ بڑا افسوس ہے کہ یہ کم بخت کیوں
نمک کی کان میں نہ ڈوب گیا۔

جمیلہ۔ معاذاللہ۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟

حکیم جی۔ (گنگناتے ہوئے) ہاں اس کی بھی
وجہ ہے۔

جمیلہ۔ کیا دراصل وہ پاگل ہے؟

حکیم جی۔ نہیں بدقسمتی سے۔ دوسرے آدمیوں
کی مانند پاگل نہیں ہے۔ لیکن ہاں اُس کے جسم
کو روگ لگ گیا ہے۔

جمیلہ۔ وہ کیا بیماری ہے؟

حکیم جی۔ ہاں ایک بیماری۔ وہ قومی بیماری ہے
لیکن شدہ شدہ پھیلتی ہے۔ (جمیلہ کی طرف اشارہ
کرکے)۔ دعوت کا شکریہ۔ (باہر جاتا ہے)۔

جمیلہ۔ (بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے) آہ!
یہ مُوا بلند اختر تو سدا کا روگی ہے۔

رئیسہ۔ (میز کے پاس کھڑی ہوئی غور سے اپنی ماں کو
دیکھتی ہے) مجھے یہ تمام باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔

(باقی دارد)

(ہیرک اِبسن)

(مترجمہ مدیر)

کاشانۂ ویراں

اے وطن ہیں یاد وہ دن بھی تجھے اب یا نہیں
شانِ قدرت کی تماشاگاہ تھی تیری زمیں

روح پرور تھی ہوا تیرے بیاباں کی کبھی
تیرا پانی آبِ حیواں سے سوا جاں آفریں

لہلہاتا تھا چمن میں تیرے بھی سبزہ کبھی
ایک دن تو بھی تو تھا محسودِ فردوسِ بریں

مسکراتی تھی لبِ گل سے سدا فصلِ بہار
جب تری آغوش میں آکر وہ ہوتی تھی مکیں

شاق تھی فرقت تری اس درجہ اس مہجور کو
اشکِ شبنم سے بنا دیتی تھی تر تیری زمیں

وہ چراگاہیں تری اور وہ ترے سرسبز کھیت
وہ ہرن کا رقص کرنا اور گانا بھیرویں

آبِ جمنا کا تری جانب بڑھانا دستِ شوق
اور ترا ناز و ادا سے کھینچ لینا آستیں

سربلندی وہ تری مسجد کی میناروں میں تھی
دیکھتا تھا آسماں خود رشک سے سوئے زمیں

تیرے میلوں کا تصور ہے مرے پیشِ نظر
بھول جاؤں تا ابد بھی مجھ سے یہ ممکن نہیں

تھا بپا ہنگامہ اک جا بازیٔ اطفال کا
اور سرگرمِ نوا تھا اک طرف کوئی حسیں

آج کیوں بدلا ہوا ہے رنگ محفل کا تری
آج وہ آرائشیں کیوں تیری مجلس میں نہیں

جلوہ گر تھیں تجھ میں رنگارنگ بزم آرائیاں
آج کیوں "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" ہو گئیں

ہو گیا کیسا ترا گلزار تاراجِ خزاں
اک گلِ پژمردہ بھی تیرے گلستاں میں نہیں

ہے زبانِ بے زبانی پر تری "حالم مپرس"
دیدۂ عبرت اگر داری بیا صورت ببیں

ہے یہی دستور اس دنیائے فانی کا عزیز
ایک تیرے ہی وطن پر گردشِ دوراں نہیں

جن کے ہنگاموں سے تھے آباد ویرانے کبھی
شہر ان کے مٹ گئے آبادیاں بن ہو گئیں

اقبال

عزیز الحق - عزیز - کیرانوی - (علیگ)

یادِ گِلِ منزل

(نہ رہا - نہ رہی - نہ رہے - نہ رہو)

قصرِ غمداں[1] نہ رہا کعبۂ نجراں[2] نہ رہا | کیا ہوا تو بھی گرا اے خاکِ بداماں نہ رہا

جامِ جم چھن گیا، پرچمِ اقبال درفش | تاجِ خسرو نہ رہا، تختِ سلیماں نہ رہا

لاپتہ سد نا سند ہے - یہی سدِّ[3] عرم | اُر[4] کے کھنڈرات میں نمرود کا ایواں نہ رہا

ہے کہاں خطۂ تمثالِ گلستانِ ارم | آن کی آن میں شداد کا ارماں نہ رہا

عاد والوں کے فلک بوس عمارات و محل | اڑ گئے ایک بھی ان میں کا نمایاں نہ رہا

قصرِ اعظم بنا آماجگہِ تیرِ فلک | اور خورنق بھی جو تھا نازشِ گیہاں نہ رہا

طاقِ کسریٰ ہے بہ رفعت و اوج و عظمت | تھا کبھی رشکِ دہِ طارمِ کیواں نہ رہا

تو تو تھا عنصرِ خاکی سے بنا بارگ تمام" | وہ مدائن کہ تو سنگیں کوئی ایواں نہ رہا

مٹ گئے کتنے صنادیدِ عرب اور عجم | کیا ہر اک ان میں تھا بازیچۂ طفلاں نہ رہا

رشک افزا تری حالت ہے مگر ایم کورٹ | تیرا کیا بگڑا اگر خاک میں غلطاں نہ رہا

پوچھئے سچ تو ہی واللہ وہی تیری مثل | کہ خدا خانہ بنا جو صنمستاں نہ رہا

کبھی بارگ تھے ہے عثمانیہ اب تیرا نام | اوجِ رفعت کا تجھے اب کوئی ارماں نہ رہا

یاد کر دل میں ذرا اصطبلیت[5] اپنی | گرچہ تو مسکنِ کس غیرِ زناں نہ رہا

نیچی سی کرسی تری اور وہ پایوں کی قطار | گرد نہ تک بھی تلیچہ میں نمایاں نہ رہا

کھروسے فرش سے تیرے نہ ملا رہا کون | اور تری سقفِ سفالیں سے پریشاں نہ رہا

کڑیاں تانتی تھیں جالی کے پردے کچھ میں | کونسا تختۂ در چاکِ گریباں نہ رہا

---

[1] قصرِ غمداں اور قصرِ عقار قدیم حمیری سلاطینِ یمن کے مشہور ایوان [2] کعبہ نجراں خطۂ نجراں ملکِ یمن کا قدیم عیسائی کلیسا [3] شہر مارب کی وادی کا عظیم الشان ند۔ [4] قدیم سلطنتِ کلدانی کا صدر بابل کے جنوب میں جہاں سے واقعۂ آتش افروزی کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے ترکِ وطن کر کے شام کی راہ لی۔

[5] علاوہ اصطبل کی شکل ہونے کے نواب محسن الملک بہادر مرحوم نے ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں شاہِ کابل سے یہی کہا تھا کہ یہ کالج کا اصطبل ہے رض غالباً یہ ہوگی کہ اسے بشکلِ بورڈنگ پختہ بنوا دیجیے

دہل و اٹرنگ و سرِ دل ہوئے دیمک کے شکار — فرنیچر کونسا اُس کے ہتھے دنداں نہ رہا

رات کی رات میں بک کیس پہ دھاوا جو کیا — کہیں پٹھا کہیں پشتہ۔ کہیں جزداں نہ رہا

گرد بادِ مئی و جون عیاذاً باللہ — ایک جھونکے میں کوئی کاربساماں نہ رہا

بستر و شال و پلنگ پوش اُڑے مثلِ پتنگ — اُن کے دنبال میں تھا کون جو پویاں نہ رہا

ایک دن موسمِ گرما کا نہ آیا جس میں — خاک و خاشاک کے اندھیر کا طوفاں نہ رہا

کوئی بی ایسا نہ تھا مردِ نفیس الحرکات — صبح تک فرشِ غباری پہ جو غلطاں نہ رہا

لیک وارفتۂ لیلائے عجم گل منزلؒ — ریزی و بیزی و باتھی سے پریشاں نہ رہا

پھر جو لی بادِ سحر سوز نے اک دن کروٹ
طپشِ نیم شب و صرصرِ سوزاں نہ رہی

صبحدم ابر سیہ لے کے بڑھی بادِ شمال — حدّت و تابشِ خورشیدِ درخشاں نہ رہی

گویا تھا عطر فشاں صندلِ بھیجِ نوروز — گرمیٔ قہر سے مخلوق پریشاں نہ رہی

خندہ زن برق ہوئی رعد ہوا گریہ کناں — تشنگی جا اب تو تقاطر میں بس اک آں نہ رہی

تہنیت بوندوں کے پڑنے کی جو کھپریل نے دی — ضبطِ ہیجان کی طاقت کسی عنواں نہ رہی

لطفِ نظارہ کو کمروں سے نکل آیا ہر ایک — کسی برآمدہ میں تنگیٔ داماں نہ رہی

اولتی سقفِ سفالیں کی بنی چادرِ آب — صحن کو حاجتِ رشکِ لبِ عماں نہ رہی

کھڑکیاں کھول رکھیں تازہ ہوا کی خاطر — اِس سے ظاہر ہے کہ کچھ بندشِ باراں نہ رہی

لوٹ کر بارشِ جاں بخش کے دیکھے کرتوت — جس سے اک دم خبرِ جیب و گریباں نہ رہی

کاپیاں میز پہ پھیلی ہوئیں کائی کی طرح — جن کی جلدوں میں درستی کے لیے جاں نہ رہی

چار پوچی، سگریٹ۔ کوئلے بھیگے یکسر — عاریت کے لیے گنجائشِ احساں نہ رہی

بوٹ ڈاسن کے شرابور تھے سب پانی میں — شکلِ جرّاب کم از موشِ بیاباں نہ رہی

سرکیاں چھت کی مشبک تھیں جو گرم آہوں سے — روزِ باراں نہ تھی اک ان میں جو گریاں نہ رہی

بعد ازاں جب ہوا ہنگامۂ کیچڑ بازی — ایسے لتھڑے کہ کوئی صورتِ انساں نہ رہی

بندشِ در کے لیے تھا کہیں کافی سرِ دست — اسی سگنل سے کبھی حاجتِ درباں نہ رہی

رہتے تھے انجمن الفرض کے ممبر اکثر — عیش والوں کے لیے تو کبھی شایاں نہ رہی

یہ تو ہے ہو کوئی پابندیٔ ارکاں میں سست — کہہ تو دے کوئی کبھی جوششِ ایماں نہ رہی

دل سے بھائی نہ کبھی رسمِ قصیدہ خوانی — بے محل اپنی زباں گاہ ثنا خواں نہ رہی

کبھی ژولیدگیٔ کاکلِ پیچاں نہ ہوئی — خمِ ابرو پہ کبھی طبع غزلخواں نہ رہی

لیک عیب پوشی کا شیوہ بھی نہیں مستحسن — مرتکب اس کی بھی طبعِ گہر افشاں نہ رہی

منزلِ خام میں وابا رہے نادان نہ رہے
پختہ کاراں رہے ۔ ایامِ گذاراں نہ رہے

فلکِ قوم کے جتنے ہیں چمکتے تارے — کیا وہ کالج کے سما پر مہ تاباں نہ رہی

کتنے ہو گذرے ہیں جادو نظر و سحر نگاہ — کیا کئی ان میں کے محسودِ غزالاں نہ رہی

سبزۂ رخ پہ تھا کس کس کے نہ قرد قرباں — غیرتِ سنبلِ تر کاکلِ پیچاں نہ رہے؟

لب پان خوردہ پہ سو جان سے مرجاں صدقے — کیا وہ لب غیرتِ صد لعلِ بدخشاں نہ رہی

بجلیاں جن کے تبسم سے گرا کرتی تھیں — کیا وہ شرمندہ کنِ گوہرِ عماں نہ رہی

کتنے ان میں سے تھے شوریدہ سری میں یکتا — ان سے کچھ عہدہ برآ غولِ بیاباں نہ رہی

دل جلے ناک چڑھے سر کے جبیں نفتہ جگر — کٹ کئی چڑچڑے پا سوختہ ساماں نہ رہی

احمدی پوستی ۔ آخر تو انکجیب کوئی — پھانکڑے ۔ بت بنے اور خوگرِ نسیاں نہ رہی؟

من چلے ۔ دل کے کڑے ۔ سرشکن و دیدہ دلیر — اپنے ایام کے کیا رستمِ دوراں نہ رہی

واعظ و لیکچرر و فلسفہ داں مردِ شریف — ناظم بے بدل و شاعرِ غرّاں نہ رہے؟

بھائی پیشہ کہیں مبوق مجسم کوئی قوم — حاجی بغلول بھی غائب پس کوہاں نہ رہی

کچھی بہ رنگ ہی فقط ایک ہتی گہوارۂ قوم — جو رہے اس میں کبھی بے سر و ساماں نہ رہی

قرضِ حسنہ بھی ۔ وظیفہ بھی ۔ دہر فیس معاف — اس کے سکان کبھی شاکیٔ دوراں نہ رہی

نکتہ چیں، نکتہ ور و نکتہ گر و نکتہ شناس — نکتہ سنجی سے کبھی اپنی پشیماں نہ رہے

شوکتِ دینِ محمدؐ ہوئی جن کے دم سے — اسی بارگ میں وہ کیا طفلِ دبستاں نہ رہی

مایۂ نازش و سقراطِ جہانِ تعلیم — فخرِ اقلیدس و ریحان ۔ وہ کیا یاں نہ رہی

کتنے اعجازِ علی، کتنے زماں کے مہدی — ذاکرِ سحر بیاں جن سے نگہباں نہ رہے

کتنے اخلاقِ رشید اور با اخلاقِ حمید — اس کے ہمراہ ہیں شب و روز سبق خواں نہ رہے

کتنے چغتائی و آفاقی و منظورِ نظر — کتنے داؤد صفت نغمہ سرایاں نہ رہے

عبدِ حق، مظہرِ حق کیسے کچھ اللہ کے حبیب — قوم کے سوز سے کباب دلِ بریاں نہ رہے

نوبت قوم کی جس ظلِ ہمایوں سے مٹی — اس کے اوصاف تو مرنے کے بعد بھی پنہاں نہ رہے

ابھی باقی کئی آثار ہیں گل منت ... — جن کی ... کاری میں جو نا حال جوانا نہ رہے

رہے گمنام اندھیرے کے تینگوں کی طرح — قوم کی شمعِ شبستاں پہ جو قرباں نہ رہے

بج گئی ہند تو کیا انکی ولایت تک دھوم — دردمندی میں جو اک ... تن آسانی رہے

حل ہوا مسئلہ سود و زیاں ان کے طفیل — کبھی بارِ گراں ... باطبعِ حکیماں نہ رہے

سر کیاں سر پہ ابھی سب کے تھیں میدانِ مصاف — جو سرے کٹ ... رو رہے ہم دست و گریباں نہ رہے

الغرض اہلِ خرد اہلِ نظر اہلِ کمال — اہلِ دل اہلِ سخن کون ہیں جو یاں نہ رہے

وہ رہے یا نہ رہے تم کو ابھی رہنا ہے
سرخ روئی میں کم از لعلِ بدخشاں نہ رہو

علم کی صف میں کم از رستمِ دستاں نہ رہو — اور کبھی بزمِ ادب میں پسِ سحباں نہ رہو

کبھی بار گہی کہتی ہے بآوازِ دہل — گردشِ گنبدِ دوّار سے لرزاں نہ رہو

یوں بنا کرتے ہیں آخر کو بگڑنے والے — کسی افتاد سے اک لمحہ ہراساں نہ رہو

صادق العہد رہ و رسمِ وفا کے پکّے — خشت و آہک کے مکاں پر کبھی نازاں نہ رہو

طوسی و رازی و سینا کو رکھو پیشِ نظر — تم کبھی حلِ دقائق سے گریزاں نہ رہو

علَمِ دیں کے فرازندہ ہوئے تم پیدا — حیف اس کیف سے گر صاحبِ وجداں نہ رہو

بارور طالعِ مسعود میں ہے شاخِ امید — اب کسی فکر و تردّد سے گراں جاں نہ رہو

جو کرو قوتِ بازو سے کرو تم اپنی — اور کسی غیر کے شرمندۂ احساں نہ رہو

خلق و تہذیب و مروّت ہے شعارِ اسلام — ان کمالات کے یوروپ میں جویاں نہ رہو

تن دہی ایسی دکھاؤ کہ تہمتن بھی ہو دنگ — ہے جلالی کی دعا تم تنِ بے جاں نہ رہو

(قاضی محمد جلال الدین)

تنقید و تبصرہ

کتب

مخزنِ نکات | مُصنفہ شیخ محمد قیام الدین قائم، مرتبہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)، کتابت و طباعت خوب، تقطیع کتابی، ضخامت ۲۵ + ۹۷ صفحات، قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

شیخ قیام الدین قائم چاند پور ضلع بجنور (یو۔پی) کے رہنے والے تھے، اور شعرائے متقدمین میں اچھا پایہ رکھتے تھے، لیکن افسوس کہ شہرت نہ پا سکے۔ زیرِ نظر کتاب اُن کی تصنیف ہے، جس میں اُردو زبان کے شاعروں کا تذکرہ ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تذکرہ اُردو میں سب سے پہلا تذکرہ ہے، اور دوسرے تذکرے اس کے بعد تصنیف ہوئے

قائم کا یہ تذکرہ تقریباً نابود ہو چکا تھا، لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی مساعی نے دوبارہ اس کو پبلک کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اُردو طبقہ کو مولوی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے۔ شروع میں ۲۵ صفحات کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے جس میں قائم کی مختصر سوانح عمری اور اُن کی شاعری پر محققانہ تبصرہ ہے۔ یہ مقدمہ مولوی عبدالحق صاحب کا تحریر کردہ ہے، لہٰذا کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اصل تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اور مقدمہ اُردو میں۔ بہتر ہوتا کہ فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی ساتھ ہی شائع کر دیا جاتا، تاکہ فارسی سے بے بہرہ اصحاب بھی متمتع ہو سکتے

محاوراتِ اُردو | مرتبہ جناب اندرجیت صاحب شرما، کتابت و طباعت معمولی، تقطیع چھوٹی، حجم ۸۰ صفحات قیمت صرف ۸/ ملنے کا پتہ:۔ منیجر اسکول بک ڈپو، ماچھرہ ضلع میرٹھ

شرما صاحب نے اسکول کے طلبا پر احسان کیا ہے کہ اُردو زبان کے تقریباً ایک ہزار محاورے ایک جگہ جمع ہیں۔ ہر محاورے کے ساتھ اس کے معانی اور مطالب کے علاوہ اُردو کے کسی مستند شاعر کا ایک شعر بھی دیا گیا ہے۔ عام بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

نکاتِ رموزی حصہ دوم جناب ضیاء الملک ملّا رموزی صاحب کے ظریفانہ مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ کتابت طباعت اچھی، حجم ۲۵۶ صفحات، تقطیع چھوٹی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

یا دش بخیر ملّا رموزی صاحب سے کون واقف نہیں۔ جنوری فروری کی گزشتہ اشاعت میں مُلّا صاحب علی گڑھ میگزین میں بھی پہلی مرتبہ رونق افروز ہو چکے ہیں۔ اور مدیر کی درخواست پر (جس کے ساتھ حضرت حفیظ جالندھری کی سفارش بھی شامل تھی) آپ نے بہ کمال مہربانی اپنا ایک پرلطف مضمون میگزین کے لئے عنایت فرمایا تھا۔ اس عنایت فرمائی کا انتہائی صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرنا ہمارا فرض ہے

زیر نظر کتاب موصوف کے ایسے ہی ظریفانہ مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، جو ۱۹۱۸ء تک کے مضامین پر مشتمل ہے، اور دارالاشاعت پنجاب کی طرف سے نفاست کے ساتھ شائع ہوا ہے یہ تمام مضامین تقریباً ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ شروع میں "ملّا رموزی اور ظرافت نگاری" کے عنوان سے جناب پروفیسر عبدالقادر سروری، ایم۔ اے، مدیر مجلّہ مکتبہ کا تحریر کردہ ایک دلچسپ مقدمہ ہے، اور اس کے بعد خود جناب ملّا صاحب کا "دہانی دیباچہ" ہے، جو گلابی اُردو میں تحریر کیا گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے مخاطب صرف "محترم قلی مزدور" ہیں معلوم نہیں دوسرے لوگوں کو بھی اسکے پڑھنے کی اجازت ہوگی؟

---

(۲) رسائل

ادبی دُنیا، لاہور زیر نگرانی سر شیخ عبدالقادر، زیر ادارت علامہ تاجور نجیب آبادی چندہ سالانہ صرف للعہ معہ محصول ڈاک، جو رسالہ کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے بہت ہی کم ہے

"ادبی دُنیا" دُنیائے ادب میں مئی سے رونق افروز ہوا ہے۔ اور اس سائز پر جس پر دوسرے رسائل اپنے خاص نمبر شائع کیا کرتے ہیں، ابتک اسکے سات نمبر نکل چکے ہیں ہم اس موقع پر اپنے انتہائی تعجب کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ صرف للعہ سالانہ میں (۱۲ ار محصول ڈاک کے جاتے ہیں) اتنے بڑے سائز پر ہر مہینہ تقریباً ۲۰۰ صفحات اور ساتھ آٹھ رنگین وسادہ تصاویر "ادبی دُنیا" والے کس طرح دیتے ہیں۔ مولانا تاجور کی یہ ادبی کوشش واقعی قابلِ داد ہے، اور ہم مولانا نیاز فتحپوری، مدیر نگار کے اس قول کی تائید کرینگے کہ شاید تاجور صاحب کسی زبردست روحانی قوت کے مالک ہیں

جن مقاصد کو پیش نظر رکھکر تاجور صاحب نے "ادبی دُنیا" کا اجرا کیا ہے، وہ حالات وواقعات کی روشنی میں ذرا مشکل ضرور نظر آتے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ بعض سہل پسند طبائع کے نزدیک مضحکہ خیز بھی ہوں لیکن ہمیں سر عبدالقادر اور علامہ تاجور جیسی ہستیوں سے امید ہے کہ وہ ان تمام موانعات کو دور کر کے "ادبی دنیا" کو ایک مستقل اور مضبوط بنیاد پر کھڑا کر دیں گے۔

آخر میں ہم رسالہ کی ظاہری شان وشوکت اور باطنی خوبیوں پر مدیران منتظمانِ رسالہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

انیس رضوی

تبصرے

(از مدیر رسالہ)

۱۔ کتب

کتاب الصلوٰۃ | مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔ ۱۳۰ + ۱۰ صفحے

یہ کتاب جناب امام المحدثین فخرالاسلام والمسلمین حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تصنیف کا اردو ترجمہ جسکو ہمارے کرم فرما جناب شیخ علی جواد صاحب بی اے لیکچرار انٹرمیڈیٹ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے فرمایا ہے۔ شیخ صاحب ہمیشہ سے مذہبی اور ملی تحریکوں میں نہایت جوش وخروش سے حصّہ لیتے رہے ہیں اور انھوں نے تحریراً و تقریراً مسلمانوں کے موجودہ اطوار و عادات کی درستی کے لئے کوشش کی ہے۔ یہ کتاب بھی اُسی جذبہ کی مظہر ہے جس کو شیخ صاحب نے مسلمانوں میں نماز کے اصول اور قواعد کو دلچسپ بنانے کے لئے شائع کیا ہے شروع کے پچاس صفحے پر حضرت امام موصوف کی پُر فاضلانہ تبصرہ ہے جس سے کتاب کی قدر دوبالا ہوجاتی ہے۔ لکھائی چھپائی کے لئے مسلم یونیورسٹی پریس کا نام کافی ہے کتاب درسی کتابوں کے سائز پر شائع ہوئی ہے۔ طلباء کو امتحانِ دینیات میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ امید ہے کہ کتاب کو داخلِ نصابِ یونیورسٹی کر دیا جائے گا۔

شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔ اے، ال، ال، بی، جنرل سکرٹری مجلس ادب انٹرمیڈیٹ کالج علیگڑھ سے ملسکتی ہے قیمت درج نہیں ہے

اسرار شریانیہ | مصنفہ جناب مولانا حکیم حافظ محمد عبدالوہاب صاحب انصاری۔ ناشر حکیم محمد عبدالحیٔ صاحب انصاری۔ جامع مسجد دہلی صفحے ۳۰۸ + ۱۶ قیمت مبلغ ۳؎ ر

مولانا حکیم عبدالوہاب صاحب انصاری کی اعلیٰ شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ ہندوستان کے نامور طبیب ہیں۔ اور اپنے فیضِ مسیحی سے ہزارہا بیماروں کو شفاء دے چکے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے نبّاض ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو تشخیص مرض میں بھی یدِطولیٰ حاصل ہے۔ متذکرہ بالا کتاب آپ کی چالیس سالہ کاوشوں اور قابل قدر تحریروں کا لب لباب ہے اس میں انھوں نے نبض کے متعلق اپنی معلومات کو جمع کر دیا ہے۔ حکیم صاحب موصوف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اپنے مجربات خاص بھی افادۂ عام کے لئے پیش کر دیئے ہیں۔ اور اس طرح طب یونانی پر احسانِ عظیم فرمایا ہے ہمیں امید

ہے کہ پبلک حکیم صاحب موصوف کی اس گرانپایہ تصنیف سے ضرور مستفید ہوگی اور اُن کے تبحّر علمی اور ذہنیت کا اندازہ کر سکے گی

نغمہ اور اسلام

من تصنیف جناب محمد علی شاہ صاحب مسکین اکبرآبادی۔ مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ ۴۷ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ قیمت موازی ۱۲/ ہے۔ اور مصنف سے "میوہ کٹرہ آگرہ" سے دستیاب ہوسکتی ہے۔

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قابل مصنف نے جو ایک ہونہار اور نوجوان شخص ہیں اور جن کی پہلی کتاب ہے جو اُنھوں نے دُنیائے ادب کے سامنے پیش کی ہے۔ راگ اور سماع کی حرمت وحلّت پر فاضلانہ بحث کی ہے اور نقل قرآنی احادیث اور علمائے اسلام کے اقوال وافعال سے ثابت کیا ہے کہ سماع اور ساز مذہباً حرام نہیں ہے اور جو لوگ فی زمانہ اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اُن کو تحقیق اور کاوش سے کام لیکر کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہئے اور تعصب کو خیرباد کہکر انصاف کرنا چاہئے

ہمیں امید ہے کہ مخالفین سماع اس ضروری مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے اور موسیقی سے شوق رکھنے والی حضرات اس کتاب کا مطالعہ کرینگے۔ طباعت اور کتابت عمدہ ہے

فغانِ درد

مطبوعہ کریسنٹ اسٹیم پریس گجرات۔ پنجاب۔ ضخامت صفحے ۴+۰۰ اقیمت ۸/ خود مصنف یا شیخ الٰہی بخش رحیم بخش تاجران کتب گجرات سے ملسکتی ہے۔

یہ چھوٹا سا دیوان جناب سردار عطا محمد خانصاحب۔ "درد" درانی قندھاری ساکن حال گجرات پنجاب کے افکار کا نتیجہ ہے مصنف نے بجائے فارسی کے اُردو میں شعر کہے ہیں۔ اور اُن کا مطلب شعر میں بجائے رنج وغم کے خیالات کے ہنسی اور خوشی کی باتوں کو ظاہر کرنا ہے۔ لیکن زبان اکثر سوقیانہ اور مبتذل ہے اور فصاحت سے گری ہوئی ہے۔ اس قسم کی نظموں سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی۔ کاش کہ مصنفین کی جماعت اس اصول کو ملحوظ رکھے اور اپنے جذبات کو ظاہر کرتے وقت بالکل عریاں نکر دے۔

غالب چھوٹی تقطیع پر شائع ہونیوالا ۴۰ صفحے کا ماہوار رسالہ ہے جو جناب مقبول حسین صاحب قابل اکبرآبادی کی ادارت میں کشمیری بازار آگرہ سے شائع ہوتا ہے چندہ صرف عہ سالانہ ہے ٹائیٹل پیج نہایت پسندیدہ اور لکھائی چھپائی بھی عمدہ ہے۔

رسالہ کا مقصد غالب مرحوم کی یاد تازہ کرنا۔ اور اُن کی شاعری کو ملک و قوم سے روشناس کرانا ہے۔ ملک کے چند مشہور اہل قلم کے مضامین نظم و نثر کا عمدہ مجموعہ ہے۔ غالب کے شیدائیوں کا فرض ہے کہ رسالہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لیں۔ اور اُس کے مالکان کی ہمت افزائی کریں۔

آزاد یہ بھی آگرہ ہی سے حضرت خواجہ امیر احمد صاحب صبا اکبرآبادی کی اڈیٹری میں ہر ماہ چھپتا ہے ضخامت ۴۰ صفحے ہوتی ہے اور قیمت صرف موازی ۵ رسالانہ۔ کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے لیکن اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے لحاظ سے خوب ہے۔ ہندوستان کے مشاہیر شعرا اور ادبا کی غزلیں اور مضامین آزاد میں شائع ہوتے ہیں۔ ادب سے ذوق رکھنے والے حضرات کو ایسے سستے رسالوں کی سرپرستی کرنی چاہیے جو مالی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے زبان کی خدمت کرتے ہیں۔

کامیابی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی کے زیر اہتمام ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے ضخامت ۶۰ یا ۷۰ صفحے تک ہوتی ہے۔ اور قیمت معہ محصول ڈاک سالانہ عہ رہے۔

رسالہ کی اڈیٹری کے فرائض جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی انجام دے رہے ہیں۔ رسالہ کا مقصد مسلمانوں کی عملی اور اجتہادی قوتوں کو بیدار کرنا اور ترقی و کامیابی کے طریقے بتانا ہے۔ مذہب۔ علم۔ فلسفہ۔ اقتصادیات۔ معاشرت اور اصول تجارت پر اچھے مضامین شائع ہوتے ہیں۔

اِس قسم کے رسالہ کی ایک مدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ جو مسلمانوں کو اُن کی پست حالت سے اُٹھائے اور ترقی کی راہیں بتائے حسن نظامی کمپنی کی کوششیں اس امر میں قابل شکریہ ہیں۔ ہم ناظرین میگزین سے بزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کو ضرور دیکھیں اور اسکے مفید مشوروں سے مستفید ہوکر ملک و قوم کی حالت درست کریں۔

دین و دنیا | دھلی کا باتصویر ماہوار رسالہ شوکت علی صاحب فہمی کی ادارت میں خواجہ بک ڈپو دہلی سے شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ دو روپیہ ہے۔ رسالہ کامیابی جیسا تجسم اور رسائز ہے دین اور دنیا کے متعلق بہترین شوروں کا خلاصہ اس میں موجود ہوتا ہے۔ مثنوی معنوی۔ حافظ اور سعدی شیراز کے کلام کی مستقل شرحیں دلکش افسانے اور عمدہ نظمیں اس کا خاص جوہر ہیں۔ دنیا میں کامیابی اور ترقی کی راہیں مرد و عورت کے لئے بتانا اس کا نصب العین ہے۔ اس کا مطالعہ بیحد منفعت بخش ہے۔

تبصرہ | یہ انجمن معراج الادب لکھنؤ کا صحیفہ ہے جو ہر ماہ جناب ابوالعلا صاحب ناطق اور جناب حکیم آشفتہ صاحب کی زیر نگرانی وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم کم از کم چار جز اور قیمت چار روپیہ سالانہ ہے ادبی۔ اخلاقی۔ تنقیدی۔ علمی اور تاریخی مضامین کا ایک عمدہ مجموعہ ہے۔ زبان کو اغلاط و عیوب سے پاک کر کے ملک کے سامنے پیش کرنا اور تنقیدی و تبصرہ کا صحیح معیار قائم کرنا اس کی خصوصیات ہیں۔ لکھائی چھپائی دونوں اطمینان بخش ہیں

خضر راہ | یہ رسالہ بھی لکھنؤ میں نیا گاؤں سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ضخامت ۶۰ - ۷۰ صفحے ہوتی ہے اور چندہ سالانہ صرف للعہ روپیہ ہے۔ حامد علی ندوی صاحب اس کے مرتب ہیں اور ملک کے مشہور انشاپرداز جناب نیاز فتحپوری غالباً اس کے ہادی و راہنما ہیں۔ ندوہ کے بہت سے قابل افراد اس کے مضامین نگاروں میں ہیں۔ جو اپنی نظم و نثر کے ذریعے سے اس کی امداد کے دل سے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔ کتابت اور طباعت دونوں خوب ہیں اور ہمیں امید ہے کہ رسالہ ترقی کرے گا۔ اور زبان اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے گا۔

گلستان | چوک بجلی امرتسر سے یہ ماہوار مصور رسالہ محمد افضل خاں اور سید ظفر ہاشمی صاحبان کی کوشش سے جاری ہوا ہے۔ اس کی قیمت دو روپیہ سالانہ ہے۔ ضخامت چالیس صفحے سے کم نہیں ہوتی۔ مضامین نظم و نثر کا عمدہ انتخاب ادارہ تحریر کی کاوش اور سعی کا شاہد ہے۔ ہم اس نئے رسالہ کی بقا و حیات کیلئے دست بدعا ہیں۔

آواز | قصبہ مُلانہ ضلع انبالہ سے جناب حاجی سر رحیم بخش صاحب رئیس کرنال کی سرپرستی میں ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔ اس کے مُدیر حضرت نما ضف ملانوی اور نائب مُدیر مبارک حسین صاحب ہیں۔ رسالے کے مقاصد مسلمانوں کی معاشرت کی اصلاح۔ زمیندار طبقے کی اصلاحی خدمات اور امداد باہمی کی حمایت و اشاعت ہیں۔

زراعت کے متعلق مفید خبریں اور مشورے بہم پہنچانا۔ ممالک غیر کے زراعتی تجربات کی اشاعت کرنا اور معاشرت کی برائیوں کو دور کرنا اس کی چند خصوصیات ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ ہر طبقہ کے لئے مفید ہے۔ قیمت سالانہ صرف عگر ہے اور ضخامت ۴۰+۴۵ صفحے ہے۔
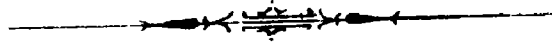
اعلان

یہ امر مسلمہ ہے کہ فی زمانناً اشتہارات ہی تجارت کے فروغ کا باعث بن سکتے ہیں علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی کا تنہا اُردو رسالہ ہے اس کے مطالعہ کرنے والوں کی تعداد نہایت کثیر ہے ملک کے بہترین اور تعلیم یافتہ طبقہ کی نظروں سے گزرتا ہے۔ اس لئے اشتہارات کی اشاعت کا بہترین وسیلہ بن سکتا ہے امید ہے کہ تجارت پیشہ حضرات اس سے خاص طور پر مستفیض ہونے کی کوشش کریں گے۔

نرخنامہ اشتہارات

مقدار جگہہ	ایک مرتبہ	تین مرتبہ	چھ مرتبہ
پورا صفحہ	صہ/	للعہ/	للعہ
نصف صفحہ	۱۲ آ	مہ/	ہے
چوتھائی صفحہ	۱۲ آ	للعہ/	سے/

(**نوٹ**) تقسیم کرائی ضمیمہ ایک روپیہ سیکڑہ

(۲) پیشگی اجرت وصول ہوئے بغیر کوئی اشتہار شائع نہیں کیا جائیگا

(۳) معینہ مدت کے اندر اشتہار بند کرانے پر بقیہ اجرت واپس کی جائیگی۔

(۴) اشتہار دہندگان کو مدت معینہ کے اندر اشتہار تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے

(۵) مختصر اشتہارات بشرح ۲ر فی سطر درج کئے جائینگے۔

(۶) اشتہارات کی عبارت ایسی ہو جو مذاق سلیم پر بار نہ ہو۔

مدیر

علی گڑھ میگزین (اردو)

جس عورت سے آپ کو محبت ہے

اسے مفت میں خوش کرنے کے لئے

باتصویر

نسوانی دنیا

ایک کارڈ لکھکر بالکل مفت منگا لیجیے۔ عورتوں اور لڑکیوں کیلئے اس سے زیادہ شاندار

مفید، دلچسپ، ارزاں، بڑی تقطیع کا مصور رسالہ آج تک آپ نے نہ دیکھا ہوگا

آپ کی بیوی بیٹی اور بہن کے لئے

اور آپ کے خاندان کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کے لئے یہ جسقدر مفید ہے اگر اس کا صحیح اندازہ آپکو ہو جائے تو آپ ان کے لئے چاہے زیور اور کپڑا نہ خریدیں لیکن اس رسالہ کو ضرور منگائیں کیونکہ اس رسالہ میں گھروں کی سچی خوشیوں کے راز پوشیدہ ہیں عورتیں اسے جان سے زیادہ عزیز خیال کرتی ہیں۔

نسوانی دنیا بڑی تقطیع کا باتصویر رنگین اعلیٰ قسم کا نہایت شاندار ماہوار رسالہ ہے

نسوانی دنیا میں ہر مہینے متعدد بلاک کی تصاویر کے علاوہ کتابی سو صفحے کے مضامین ہوتے ہیں

نسوانی دنیا کا ہر پرچہ مذہبی اخلاقی اصلاحی اور کارآمد مضامین سے آراستہ کیا جاتا ہے

نسوانی دنیا عورتوں کیلئے بہترین دلچسپ فسانے اور نہایت شوخ ادبی مضامین پیش کرتا ہے

اس کے علاوہ میاں بیوی کے تعلقات پر اس میں روشنی ڈالی جاتی ہے حسن و صحت کی تدابیر خانہ داری اور سلیقہ شعاری کے اصول، اولاد کی پرورش اور زنانہ صنعتیں سکھانے والے مضامین ہوتے ہیں۔

جس عورت سے بھی آپکو محبت ہے اسکی دلداری کے لئے ایک کارڈ لکھکر یہ رسالہ مفت منگائیے

پتہ: مینیجر نسوانی دنیا خواجہ بک ڈپو دہلی

ایک پیسہ خرچ کئے بغیر

باتصویر

دین و دنیا

جو مفت منگانا چاہتے ہیں ایک کارڈ لکھکر منگا لیں

بڑی تقطیع کا مصور اور اعلیٰ درجہ کا ماہوار رسالہ ہے
ایک سال میں کتابی ایک ہزار صفحہ کی برابر مضامین پیش کرتا ہے
[illegible] سیاسی، مذہبی، اخلاقی مضامین ہر مہینہ شائع کرتا ہے
[illegible]
میں [illegible] عورتوں کے مطلب کے مضامین [illegible]
[illegible] سالانہ [illegible]
جو [illegible] دین و دنیا [illegible] سے محروم [illegible]
مینیجر دین و دنیا خواجہ بک ڈپو دہلی

رعایتی اعلان

ہم نے تبلیغی اغراض و مقاصد کے لئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مسلمان کا ایک ہزار پرچہ جمعیۃ قومی اسلامی و تبلیغی انجمنوں اور لائبریریوں امام مسجدوں کے نام نصف قیمت پر جاری کر دیا جائے۔ بس آپ آج ہی اپنی اپنی انجمنوں اور لائبریریوں کے ناظموں اور اپنے اپنے علاقہ کے تمام امام مسجدوں کو مطلع کر دیں کہ وہ فوراً ہمارے دفتر میں بھیجکر مسلمان جیسا علمی دینی اصلاحی اور تبلیغی پرچہ جو چالیس صفحات کا ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے اپنے نام جاری کرالیں اور اس رعایت سے محروم نہ رہیں۔

المشتہر: مینیجر مسلمان لاہور

جلد (۷)

شمارہ (۱۱ و ۱۲)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مدیر:۔ زکریا فیاضی ایم اے (علیگ)

طابع وناشر:۔ محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع ونشر:۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلسِ عاملہ علی گڑھ میگزین

سنسر چیرمین

خواجہ غلام السّیّدین صاحب بی اے (علیگ) ایم ای ڈی (لیڈز)

مُدیر

زکرّیا فیّاضی ایم اے (علیگ)

حادثۂ جاں کاہ

بھی صاحبزادہ صاحب مرحوم کے غم میں
خشک نہ ہونے پائے تھے کہ ایک اور تازہ
مصیبت سر پر نازل ہوگئی۔ یہ مسلمانوں کی
بدقسمتی ہے کہ ہمارے لائق و فائق اور ہر دل عزیز
ٹر علی منصوری صاحب ایم اے، ایم ایس
(کینٹب) پی ایچ ڈی (کیمبرج انگلینڈ) ایف
ممبر رائل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ہیلتھ
(لندن) اور ممبر انسٹی ٹیوٹ آف میٹلز (لندن)
ن ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری مسلم یونیورسٹی
صبح یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے اس
فانی سے رحلت فرما گئے۔ انا للہ الخ مرحوم دس دن سے
ڈاکٹری علاج ہو رہا تھا لیکن حالت اطمینان بخش
صبح ۱½ بجے دورہ پڑا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔
وفات سے یونیورسٹی کو ناقابلِ بیان نقصان پہنچا ہے
ہے کہ خدا وند کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں
اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین)
خدا بخشے بہت سے خوبیاں تھیں مرنے والے میں
۱۰ مارچ (م)

اب احمد خاں صاحب مرحوم!

ر اگر کوئی ہمدرد و غمگسارِ قوم ہستی ہماری رہنمائی کے لئے
ے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے۔ اس ظالم جفاکار کو
ی کو چلا سکے۔ اس کی فریب کاریوں سے کوئی گوشۂ دل محفوظ
ہزار بار محسوس کر چکے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں اس نے ہمارے
ے جو ناقابلِ تلافی نقصان قوم کو پہونچا ہے اُس کا اندازہ
و دردمند ہستی کو ہم سے چھین لیا اور ہم کفِ افسوس ملتے
صاحب مرحوم کی تھی۔ جن کی وفات حسرت آیات ۱۹ جنوری
وم کی صحت عرصہ دو سال سے خراب ہو چلی تھی۔ اور
ب نے نہایت تندہی و کاوش کے ساتھ علاج کرایا لیکن
ے آخری حملہ سے جانبر نہ ہو سکے ع کیا اعتبار ہستیِ ناپائدار کا

ر یونیورسٹی کے محبّ و خیر خواہ تھے۔ اُنھوں نے تعلیم
کے ایام سے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کا
نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے علی گڑھ میں وہ مادرِ تعلیمی
ٹی کا چپہ چپہ اُن کے خلوصِ نیت و ایثار کا شاہد ہے۔
وش نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے اپنی تمام عمر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی

مجلسِ عامل

نشسر حد

خواجہ غلام السیّدین صاحب

زکریّا فیاّ

آہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم!

ہماری قوم میں اوّل تو ویسے ہی قحط الرجال ہے۔ اور اگر کوئی ہمدرد و غم گسارِ قوم ہستی ہماری رہنمائی کے لئے اس دنیا میں جلوہ گر ہوتی بھی ہے تو یہ فلکِ ستم شعار اُسے ہمارے ہاتھوں سے چھین لیتا ہے۔ اس ظالم جفا کار کو یہ امر گوارا نہیں کہ کوئی معقول شخصیت مسلمانوں کی قومی کشتی کو چلا سکے۔ اس کی فریب کاریوں سے کوئی گوشۂ دل مصئون نہیں۔ اس کی کرشمہ سازیاں ہمارے دل و دماغ کو ہزار بار مختل کر چکی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں اس نے ہمارے اوپر جو ظلم کیا ہے اس سے ہمارا سینہ فگار ہے۔ اور اس سے جو ناقابلِ تلافی نقصان قوم کو پہونچا ہے اُس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے ہماری قوم کے ایک ہی خواہ و دردمند ہستی کو ہم سے چھین لیا اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ وہ ذاتِ گرامی جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کی تھی جن کی وفات حسرت آیات سے جو ۱۲ جنوری کی سہ پہر کو ہوئی ہماری قوم کو بہت بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ مرحوم کی صحت عرصہ دو سال سے خراب ہو چلی تھی۔ اور دو مرتبہ اُن پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ اُن کے عزیز و اقارب نے نہایت تندہی و کاوش کے ساتھ علاج کرایا لیکن افسوس کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور وہ مرض کے آخری حملہ سے جانبر نہ ہو سکے ع کیا اعتبار ہستیِ ناپائدار کا

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

مرحوم علی گڑھ کے ایک قابلِ فخر اولڈ بوائے اور یونیورسٹی کے محب و خیر خواہ تھے۔ اُنھوں نے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد سر سید علیہ الرحمۃ کے ایما سے علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کا وطنِ مالوف کنجپورہ ضلع کرنال تھا اور وہ وہاں کے نوابی خاندان سے تعلق رکھتے تھے علی گڑھ میں وہ مادرِ تعلیمی کی خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ہماری یونیورسٹی کا چپّہ چپّہ اُن کے خلوصِ نیت و ایثار کا شاہد ہے۔ اور ہماری قوم اُن کے احسانِ گراں بار سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اُنھوں نے اپنی تمام عمر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی

میں صرف کردی۔ وہ انجمن الفرض کے بانی تھے اور عرصہ دراز تک مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے معتمد اعزازی کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور سوائے اس مختصر زمانہ کی غیر حاضری کے جب کہ وہ انگلستان میں انڈیا آفس کے ممبر بن گئے تھے۔ تمام عمر وہ علی گڑھ کالج کی ترقی کی کوششوں میں مصروف رہے۔ اور آج سے تین چار سال قبل وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

وہ ایک صاف گو۔ سنجیدہ مزاج۔ معاملہ فہم اور جفاکش انسان تھے۔ اور گو ایک عرصہ سے اُن کی صحت ناقابل اطمینان تھی لیکن تاہم آخر دم تک وہ یونیورسٹی کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچتے رہے۔ وہ ایک لائق اور کامیاب بیرسٹر تھے۔ لیکن وکالت کو انھوں نے اپنا مستقل پیشہ نہیں بنایا۔ اس پیشہ سے جو آمدنی اُن کو ہوئی وہ انھوں نے قومی کاموں میں صرف کی۔ انھوں نے کچھ عرصہ تک بغیر کسی معاوضہ کے یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم بھی دی۔

۱۹ر جنوری کو دس بجے دن کے اُن کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور مرحوم اپنے بنا کردہ مدرسہ نابینان کے ایک گوشہ میں دفن کئے گئے۔ نماز جنازہ میں یونیورسٹی کے طلبا۔ پروفیسر اور شہر کے بہت سے لوگ شریک تھے۔ مسٹر مارش کلکٹر ضلع بھی جنازے کے ہمراہ تھے۔ یونیورسٹی میں ۱۱ بجے جلسۂ تعزیت ہوا جس میں جناب ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب نے مرحوم کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کیا اور اُن کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کی تجویز پاس کی گئی۔ ازاں بعد خان بہادر شیخ عبداللہ صاحب وکیل نے ایک تقریر میں مرحوم کی زندگی کے شاندار کارناموں پر روشنی ڈالی۔ تمام مجمع حسرت و یاس کی ایک تصویر بنا ہوا تھا۔ ہم بھی مرحوم کے لواحقین کے ساتھ غم واندوہ میں شرکت کرتے ہوئے ادارۂ میگزین کی طرف سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خداوند کریم صاحبزادہ صاحب مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کی کامیاب زندگی سے سبق آموز ہونے کی ہدایت بخشے۔ آمین

۱۵ر فروری ۱۹۳۰ء

مدیر

فہرستِ مضامین

تصاویر:

(۱) ہز ایکسیلینسی سر مالکم ہیلی - گورنر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ

(۲) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم سابق وائس چانسلر یونیورسٹی

(۳) سالانہ انتخابات یونین کا ایک پر لطف منظر - (۴) ڈاکٹر ایف کرنکاؤ (ریڈر شعبۂ اسلامیات)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

زکریا فیاضی ایم اے (علیگ)

نمبر ۱۱ و ۱۲	اشاعت جنوری و فروری سنہ ۱۹۳۰ء	جلد ۷

شذرات

سنہ ۱۹۲۹ء ختم ہوگیا اور نئے سال کو شروع ہوئے بھی دو ماہ سے زائد ہوگئے سالِ گزشتہ میں جو انقلاب ہماری دنیائے جامعہ میں رونما ہوئے اُن کی دھندلی تصویر ہدیۂ ناظرین کی جاچکی ہے۔ اب نئے سال کا آغاز ہے اور اس لئے نئی اُمیدوں کا پیدا ہونا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ یونیورسٹی کی زندگی میں ایک نئی روح کارفرما ہے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارے "شیخ و شاب" سب

اپنی اپنی کوششوں سے یونیورسٹی کے سال کو اور زیادہ کامیاب بنانے میں ساعی رہیں گے۔ خدا کا شکر ہے کہ سال کا پہلا ہی مہینہ نہایت مبارک اور مشغولیت کا زمانہ ہوا جس نے تمام فراموش شدہ تعلقات کو از سرِ نو زندہ کر دیا اور "علی گڑھ" سے منحرف ہستیوں کو اب پھر اس کے آغوش میں لا بٹھایا یا کم از کم اُن کا رجحان اس کی طرف ہو گیا ہے اور وہ اس کو اب "طفلِ سعید" متصور کر کے اس کی خدمت و پرورش پر مائل ہو گئے ہیں۔ ہماری استدعا ہے کہ یہ حضرات اپنی رفتار کو اور تیز کریں تاکہ پچھلے تین چار سال کی کوتاہیوں اور خامیوں کا بزود ازالہ ہو سکے۔

سالانہ مباحثہ

حسبِ معمول سالانہ مقابلہ مباحثہ ۱۲ جنوری کو زیرِ نگرانی اراکینِ یونین قرار پایا۔ ہندوستان کے کئی کالجوں کے طلباء نے مباحثہ میں حصہ لیا۔ مضمون زیرِ بحث یہ تھا کہ "آیا حزبِ العمال کی مصری اور ہندوستانی پالیسی قابلِ تحسین ہے یا نہیں"۔ مقابلہ انگریزی زبان میں تھا۔ نوجوان طلباء نے خوب دادِ خطابت دی۔ یونین کی عمارت میں سامعین کا ایک ازدحام تھا۔ کوئی تین گھنٹے تک یہ مجلس گرم رہی۔ خاتمہ پر مسٹر مارٹن کلکٹر ضلع مسٹر ہارن پرو وائس چانسلر اور مسٹر حلیم پروفیسر تاریخ نے ججوں کی حیثیت سے اپنا متفقہ فیصلہ وائس پریسیڈنٹ کے حوالہ کر دیا اور وائس پریسیڈنٹ نے حاضرین کی کشمکشِ انتظار کا لطف اُٹھانے کے بعد ججوں کا فیصلہ سنایا۔ اس کو سن کر طلباء نے تالیوں کی گونج سے عمارت کو سر پر اُٹھا لیا۔ سناتن دھرم کالج کانپور کے نمایندگان کو اوّل اور دوسرا انعام ملا اور ٹرافی بھی اُن کے حصے میں آئی۔ تیسرا انعام سینٹ زیویر کالج بمبئی کے نمایندہ کو ایک اور خاص انعام بنارس ہندو یونیورسٹی کے نمایندہ کو دیا گیا۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ ہم انعامات کے محصّلین کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ انتظام کی شکایت البتہ لوگوں کو رہی اور یہ شکایت ایسی عام ہو گئی ہے کہ "عاملینِ انجمن" اب اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ بعض مرتبہ بے اعتنائی بھی برتتے ہیں۔

کانووکیشن اور سر مالکم ہیلی کی تشریف آوری

۲۵ تاریخ کو یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں جلسہ تقسیم اسناد کی سالانہ رسم ادا کی گئی۔ اس موقعہ کے لئے پیشتر سے بہت عمدہ پیمانے پر انتظامات کئے گئے تھے۔ سڑکوں کی صفائی، عمارتوں کی درستی، اسٹریچی ہال اور لٹن لائبریری کی زیبائش، باب الرحمۃ سے لائبریری تک سڑک کے دو طرفہ گملوں اور پودھوں کی قطاریں۔ یونیورسٹی کے حسن کو دوبالا کر رہی تھیں نواب مسعود جنگ اور اُن کے حلیف مسٹر ہارن اور دونوں پرو وسٹ صاحبان کے حسنِ انتظام کے باعث جلسہ

نہایت کامیاب رہا۔ کثیر تعداد میں باہر سے معزز مہمان تشریف لاکر شریک جلسہ ہوئے۔ جن میں قابل ذکر نواب صاحب
بھاری، نواب صاحب بھیکم پور، مولوی محمد یعقوب، سر رحیم بخش، جسٹس سلیمان اور مسٹر میکنزی ہیں۔ اسٹریچی ہال میں
طلباء و معزز مہمان ۲½ بجے تک جمع ہو گئے تھے۔ تین بجے کے قریب ہز ایکسیلنسی سر مالکم ہیلی۔ ریکٹر یونیورسٹی تشریف لائے
نواب مسعود جنگ نے اُن کا استقبال کیا اور اُن کو مسجد کی زیارت کرائی۔ دس منٹ کے بعد وہ موٹر میں سوار ہو کر
لائبریری کی طرف آئے۔ یہاں اُن کو یو ٹی سی نے سلامی دی۔ موصوف نے یو ٹی سی کی بہت تعریف کی۔ بعد میں
لائبریری سے ۴۴ پروفیسر ممتاز حضرات جلوس کی صورت میں اسٹریچی ہال میں داخل ہوئے۔ وائس چانسلر اور
پرو وائس چانسلر اپنی اپنی "خلعت" میں ملبوس تھے اور سر مالکم ہیلی سبز مخمل کا نہایت قیمتی لبس دار چغہ زیب تن کئے ہوئے
تھے۔ اس حالت میں جلوس کے کئی فوٹو بھی لئے گئے۔ اسٹریچی ہال میں داخلہ پر تمام حضرات کھڑے ہو گئے۔ اور یونیورسٹی کے
پروفیسر مختلف الالوان خلعتِ تعلیمی یعنی گون میں نظر آتے تھے اور طلباء ٹرکش کوٹ اور ٹرکش کیپ میں۔
تلاوتِ کلام پاک سے جلسہ کا افتتاح ہوا۔ پرو وائس چانسلر صاحب نے اپنی رپورٹ پڑھکر سنائی۔ پھر طلباء کو سندیں
دی گئیں۔ طلباء گروہ در گروہ پنڈال کے نزدیک جاتے تھے اور وائس چانسلر اُن کو عربی زبان میں نصیحت کرتے
ہوئے اسناد عطا فرماتے۔ آخر میں سر مالکم ہیلی نے اپنا بصیرت افروز خطبہ ارشاد فرمایا[1] اور جلسہ کا اختتام ہوا۔
شام کے وقت یونین کی عمارت میں گورنر صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔ وہاں پر طلباء کا مجمعِ خطیر جمع ہو گیا تھا اور
تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تھی۔ مالکم ہیلی صاحب وقتِ معینہ پر وارد ہوئے۔ اُن کی خدمت میں طلباء کی طرف سے
سپاس نامہ پیش ہوا۔ جس کا اُنھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا[2] اور مسلمان طلباء اور اُن کی قوم سے اظہار
ہمدردی کیا۔ جلسہ بہ کامیابی ختم ہوا۔
یہ تمام کارروائی اور انتظام نہایت عمدہ طریقہ سے ہوا۔ اس کی کامیابی کا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ
مسٹر میکنزی افسرِ اعلیٰ محکمۂ تعلیم صوبہ جات متحدہ نے جو اس موقع پر شریک بزم تھے اپنے ایک مراسلہ میں اس طرح
اظہارِ خیال کیا ہے :۔

"آپ کا جلسہ تقسیم اسناد اُن تمام جلسوں سے فوقیت لے گیا جس میں مجھے شرکت کا موقع ملا ہے"

---

[1] ملاحظہ ہو ضمیمہ (ا) [2] دیکھئے ضمیمہ (ب)

ہم بھی ادارۂ میگزین کی طرف سے جناب اسد مسعود صاحب ورائٹ ٹسٹر کائے کار کی خدمت میں اس کامیاب انتظام پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

کورٹ کا خاص جلسہ

۲۶ جنوری کو کورٹ کا خاص جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں زیادہ تعداد میں ممبران کورٹ شریک ہوئے۔ نواب صاحب والئی بھوپال بھی تشریف فرما تھے۔ کورٹ نے خزانچی کے تقرر کے لئے ایک کمیٹی بنادی تھی جس نے خان بہادر سید زین الدین صاحب ایم اے (علیگ) ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ کو جناب شیخ عبداللہ صاحب کے بجائے خزانچی مقرر کیا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ شیخ موصوف اپنی سالہاسال کی مخلصانہ اور قابلِ قدر خدمات سے بخوشی مستعفی ہوئے ہیں۔ خدا ان کی مساعی کو مشکور کرے۔ سید صاحب نے اپنے اعزازی عہدے کا چارج لے لیا ہے اور یونیورسٹی میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ موصوف ایک جہاندیدہ، تجربہ کار اور سن رسیدہ بزرگ ہیں کالج کے اولڈ بوائے ہیں اور یونیورسٹی کے معاملات میں خاص دلچسپی کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کا یہ عہد بھی کامیاب رہے گا اور وہ یونیورسٹی کے مفید مطلب کام انجام دینے میں اپنے حتی الوسع دریغ نہ فرمائیں گے۔

اجلاس نے وائس چانسلر صاحب کے ذاتی اخراجات کے لئے بھی ۱۵۰۰ روپئے ماہوار منظور فرمائے ہیں اور اس طرح گویا نواب مسعود جنگ کو مالی مشکلات کی جانب سے قدرے سکون حاصل ہو گیا ہے۔

سالانہ انتخابات یونین

۲۰ جنوری کی صبح ہی سے طلباء کو بیم و رجا کا نظارہ دکھائی دینے لگا۔ جن لوگوں نے علی گڑھ میں تعلیم پائی ہے اور اس کی زندگی سے لطف اندوز ہوئے ہیں وہ بخوبی واقف ہیں کہ یونین کے انتخابات طلبہ کے دلوں میں کیا اہمیت و وقعت رکھتے ہیں۔ غالباً سال بھر میں یہی ایسا موقعہ پیش آتا ہو جب طلباء کو اپنی عقلوں اور سیاسی چالوں کا بہترین مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ تاریخ انتخاب سے تین چار دن پہلے تمام بورڈنگ ہاؤسوں میں امیدواروں کے لئے رائے حاصل کرنے کے واسطے سخت جدوجہد کرنی ہوتی ہے اور یہیں سے وہ عملی طور سے انتخاب کا کام کرنے کا سبق سیکھتے ہیں۔ امسال گو سالہائے گزشتہ کی طرح انتخاب کا زور و شور نہ تھا لیکن پھر بھی اشتہار بازی کی نوبت آ گئی۔ صبح سے شام تک طلباء ایک ایک رائے کے لئے خوشامدیں کرتے نظر آتے تھے اور اپنی چالاکیوں اور ہوشیاریوں سے ووٹ حاصل کر لیتے تھے۔ کچھ ایسے لڑکے بھی تھے جو غریب امیدوار کو دھوکا دیتے اور ان کی تضحیک کرتے تھے اور باصطلاح علی گڑھ " ان کو بناتے تھے"۔ خیر۔ خدا خدا کر کے یہ ہنگامہ

ہوا ۔ دس ممبران کابینہ منتخب ہوئے اور مولنا عبدالقادر ایم اے نائب صدر، اور سید سبط نبی نقوی بی ایس سی آنرز
خزانہ داری اور سید ذوالفقار حسنین لائبریرین منتخب ہوئے ۔ ہم ان صاحبان کو کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں
اور امید کرتے ہیں کہ اُن کے دور میں اُن شکایات کا انسداد ہو جائے گا جو سابق عہدہ داران کے زمانۂ وزارت میں
پیدا ہو گئی تھیں ۔ نیز ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ یونین کے آئین میں بھی ضروری و مناسب ترمیمات عمل میں لائی جائیں گی اگر
ہماری یادِ غلطی نہیں کرتی تو شاید قوانین کی ترمیم ۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی اب رد و بدل کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے

سالانہ کھیل

۲۹ جنوری کو سالانہ کھیلوں کی آخری نمائش ہوئی ۔ کثیر تعداد تماشائیوں کی جمع تھی ۔ دوڑ، گھوڑ دوڑ (ٹنٹ پگنگ) سقہ دوڑ، بائک بوٹ کی نمائش قابل ذکر ہے جس میں ناظرین نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا کامیاب طلباء کو انعامات دیئے گئے ۔ مسٹر ہارن کی جانب سے مہمانوں کو پارٹی پر بھی مدعو کیا گیا تھا اور انھیں نے انعامات بھی تقسیم کئے ۔

سب سے زیادہ پُرلطف منظر وہ تھا جب میر ولایت حسین اور مسٹر ہارن خود انعام لینے کے لئے میم صاحبہ کے سامنے حاضر ہوئے ان حضرات کو اسٹاف دوڑ میں انعام ملے ۔ انتظام معقول تھا اور انعامات کے دینے میں فراخدلی سے کام لیا گیا تھا ۔

نئی عمارتوں کا اضافہ

طبیہ کالج کا examination ہال بن کر تیار ہو گیا ہے ۔
کچی بارک کے چند کمروں کو کیمیا کی تعلیم کے کمروں میں بدل دیا گیا ہے اور کل عمارت پختہ ہو کر استعمال میں آ رہی ہے ۔ ان کے علاوہ کئی کوٹھیاں بھی بن چکی ہیں ۔ دو مزید کوٹھیاں زیر تعمیر ہیں ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تعمیر کا کام کس سرعت سے جاری ہے ۔

یو ٹی سی یعنی یونیورسٹی فوج

ہماری یونیورسٹی بمقابلہ دیگر یونیورسٹیوں کے دیر میں کھلتی ہے اس لئے فوجی قواعد حسب معمول بہت دیر میں شروع ہوئی ۔ دوسرے بہت سے پرانے طالب علم امتحان دے کر چلے گئے اور از سر نو کام کرانا پڑا ۔ تاہم سالانہ کیمپ کے موقعہ پر یونیورسٹی فوج نے نمایاں ترقی کا ثبوت دیا اور انعامات حاصل کئے ۔

---

۵ ملاحظہ ہو رپورٹ بوٹ کلب " ضمیمہ (د)

نشانہ بازی میں دو نقرئی جام اور ایک جام ضابطہ کی پابندی کے لئے ملا۔ ان کے علاوہ "مکا بازی" اور کم
میں انعامات ملے۔

اس کامیابی کا سہرا جناب لفٹننٹ حیدر خاں اور لفٹننٹ حمید الدین خاں صاحب کے سر ہی جن کی کوشش اور محنت
طلبا فوجی ضابطہ کی پابندی کرنا سیکھ گئے۔ ہم ہر دو حضرات کو اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

نئے تقرر

ڈاکٹر ایف کرنکاؤ۔ موجودہ "مغربی زبانوں" اور "اسلامیات" کے "ریڈر" مقرر کئے گئے
یعنی موصوف اسلامیات کی تعلیم کے علاوہ جرمنی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم بھی دینگے[1] آپ
اسلامیات میں اچھی شہرت رکھتے ہیں۔

(۲) ڈاکٹر آندرے وائل شعبۂ ریاضی کے صدر بنائے گئے ہیں۔ آپ ایک ہنس مکھ نوجوان فرانسیسی ہیں
پیرس، روم اور برلن کی درسگاہوں میں ریاضی کی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ انگریزی زبان بھی بخوبی بول سکتے ہیں کہ
ہی کہ اُنھوں نے اپنے مضمون میں بہت عمدہ کام کیا ہی۔

(۳) مسٹر نوپن مکرجی بی ایس سی۔ بی ای ڈرائنگ کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔

(۴) مسٹر شیخ عطاء اللہ ایم اے معاشیات میں لیکچرر ہوئے۔

(۵) ڈاکٹر لکشمن راؤ ایم ایس سی پی ایچ ڈی "نباتات" میں لیکچرر

(۶) ڈاکٹر محمد بابر مرزا (فل ناٹ) بی ایس سی ایف آر ایم ایس۔ زولوجی میں ریڈر مقرر ہوئے۔

(۷) شعبۂ تعلیمات میں مسٹر بخشی اگم پرشاد سنہا ایم ایس سی ڈپلومہ ان ایجوکیشن کا تقرر ہوا۔

ان کے علاوہ مسٹر عبد الحمید انجینیر، مسٹر عبد المعز۔ سینٹری انسپکٹر مقرر ہوئے۔

ہمیں اُمید ہی کہ یہ حضرات اپنے فرائض کو نیک نامی کے ساتھ انجام دینگے اور یونیورسٹی کے لئے مفید ثابت

معزز مہمان

ہماری خوش قسمتی سے اس عرصہ میں دو اور معزز مہمان یونیورسٹی میں تشریف فرما ہوئے
اپنے خیالات سے ہمیں بہرہ اندوز ہونے کا موقع دیا۔ ان میں ایک مسٹر پانیکار ہیں جو ہمارے
یونیورسٹی میں پروفیسر تاریخ رہ چکے ہیں۔ انھوں نے "انگریزی ہندوستان اور دیسی ریاستوں کے تعلقات" پر

---

[1] جرمنی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم شروع ہوگئی ہی اور طلبا و اساتذہ جامعہ کی ایک معقول تعداد اس میں شریک ہوتی ہی۔ دیکھئے ضمیمہ

مباحثہ میں حصہ لیا۔ دوسرے صاحب مسٹر محمد علی جناح مشہور قومی رہنما تھے۔ جو یونیورسٹی میں ۱۵ فروری کو دہلی سے
تشریف لائے اور وائسرائے بہادر کی دعوت دربارۂ گول میز کانفرنس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ مباحثہ نہایت
کامیاب رہا۔ موافق و مخالف فریقین نے خوب زور سے اپنے دعوے کے اثبات میں دلائل پیش کئے۔ جناح صاحب
کانفرنس کے طرفدار ہیں وہ اس کو ہندوستان کی موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کے لئے نیک فال خیال کرتے ہیں اُن کا
خیال ہے کہ اس سے کارآمد نتائج برآمد ہوسکیں گے اور اس لئے ہمیں شرکت کرنی چاہیئے اور جو لوگ اس کانفرنس کے مخالف
ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ حاضرین سے جب رائے لی گئی تو اُنھوں نے کانفرنس کی موافقت کی۔

محسن الملک ہال محسن الملک ہال کے بورڈنگ ہاؤس ایک دوسرے فاصلہ پر واقع ہوئے ہیں، اور اس لئے
یہاں کے طلباء کو باہمی مودت و اختلاط کے مواقع کم پیش آتے ہیں، تاہم جب سے
ییلڈانل ہاؤس میں جو اس ہال کا ایک بورڈنگ ہاؤس ہے ریڈنگ روم کھلا ہے اور وہاں اخبارات و رسائل کے
علاوہ کھیلوں کا بھی معقول انتظام ہے۔ وہاں طلباء کی ایک کثیر جماعت صبح سے لے کر شام کے نو بجے تک جمع رہتی ہے
اور ریڈنگ روم کی شہرت ہوتی جا رہی ہے۔ وہاں "پنگ پانگ" "کیرم" "لوڈو" "ڈرافٹ" اور شطرنج وغیرہ کے
کھیل میں طلباء حصہ لیتے ہیں اور اس طرح گویا علی گڑھ لائف از سر نو زندگی پا رہی ہے۔ اس ریڈنگ روم کے سکریٹری
مسٹر حشرت علی خاں بی اے کے طالب علم ہیں جو تندہی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں لیکن یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے
کہ یونین میں کھیلوں کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ "یونین" دونوں ہال کی مشترک چیز ہے اور اس لئے وہاں تو اور بہت زیادہ بندوبست
ہونا چاہیئے تھا۔ وائس پریسیڈنٹ صاحب کو اس شکایت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ نیز ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ
اُس پریسیڈنٹ صاحب اور سکرٹری صاحب نے میگزین میں اشاعت کے لئے یونین کے جلسوں کی روداد آج تک
روانہ نہیں کی۔ حالانکہ ہم نے زبانی اور تحریری دونوں طریقوں سے اُن کو اس امر کی جانب توجہ دلائی۔ مسٹر مالکم ہیلی
صاحب کی وہ تقریر جو اُنھوں نے ۲۵ جنوری کی شام کو یونین میں فرمائی۔ لیڈر اخبار سے لی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے
کہ ناکافی ہے۔ اخبار مذکور نے محض اقتباس پر اکتفا کی۔ ادھر یونین کے سکرٹری صاحب کی بے اعتنائی سے پوری تقریر ہم تک نہ پہنچ سکی۔
یونین میں تقریروں کو ضابطۂ تحریر میں لانے کے لئے کبھی کبھی انتظام کیا جاتا ہے لیکن شاید کبھی اُن کو شائع نہیں کرایا گیا
پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ" محض برائے نام زندہ ہے۔ اس کی خاموشی اور عدم توجہی سے یونیورسٹی کے مفاد کو بہت نقصان پہنچا ہے

کم از کم یہ یقینی ہے کہ اس ڈیپارٹمنٹ نے آج تک اس غلط پروپیگنڈا کے انسداد کی کوشش نہیں کی جس نے ہمار
یونیورسٹی کو تمام ملک میں بدنام کر دیا ہمیں امید ہے کہ جناب پرو وائس چانسلر صاحب اس طرف خاص توجہ دیں گے

قابل توجہ ضروری
انجمن حدیقۃ الشعراء اور انجمن اُردوئے معلیٰ کو جو قریب قریب مردہ ہو چکی ہیں از سر نو زندہ کرنا چاہیئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ امسال ان انجمنوں نے کوئی جلسہ نہیں کیا حتیٰ کہ یہ بھی نہیں جاسکتا کہ اُن کے معتمد اعزازی کون حضرات ہیں۔

شفاخانہ میں روشنی کا انتظام معقول ہونا چاہیئے۔ برآمدے میں رات کو بالکل اندھیرا ہوتا ہے اور زینہ میں تو کی قدرت یاد آتی ہے۔ سخت تعجب ہے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب نے اس طرف خیال نہیں کیا۔

بجلی کے انجن نے بھی ان دو ماہ میں طلباء کو بہت پریشان کیا اور کئی دن تک روشنی نہیں مل سکی۔ ہماری میں اس انتظام کو جو نسبتاً گراں بھی ہے جلد تبدیل کر دینا چاہیئے اور شہر سے یا گورنمنٹ سے براہِ راست روشنی لینی چاہیئے

شادی خانہ آبادی
یہ خبر باعثِ مسرت ہے کہ گزشتہ جنوری میں ہمارے رسالہ کے ناخدا خواجہ غلام السیدین اور کیمیکل سوسائٹی کے روحِ رواں جناب ڈاکٹر قاسم علی منصوری صاحبان سلکِ ازدواج منسلک ہو گئے۔ سیدین صاحب کی شادی علی گڑھ ہی میں صاحبزادہ ساجد علی صاحب کی ہمشیرہ سے ہوئی اور ڈاکٹر صاحب موصوف لکھنؤ سے اپنی رفیقِ حیات تلاش کر لائے۔ ہم دونوں حضرات کو محلّہ کی طرف سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں خداوند کریم اس اتحاد کو مبارک کرے اور یہ حضرات ثمراتِ خیر سے فیض یاب ہوں اور ہمیں دو دو دعوتیں ملیں تاکہ خوشی مزید ہو۔ گو اب تک اس سنت سے محروم ہی رہے ہیں۔

رمضان المبارک
کی آمد سے یونیورسٹی مسجد اور نیز تمام دارالاقاموں میں خوب چہل پہل رہتی ہے۔ افطار کی پرائیوٹ قسم کی پارٹیاں جاری ہیں۔ گو گزشتہ کی طرح عام افطاری اس مرتبہ کوئی نہیں ہوئی سحر کے وقت بھی خوب رونق ہو جاتی ہے۔ طلباء کی ایک کثیر تعداد روزے رکھتی اور نماز تراویح میں شرکت کرتی ہے۔ یہ مہینہ یمن و برکت کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس میں جس قدر ثواب کمایا جاسکے کما لینا چاہیئے۔ اس مہینے میں اسلام کی شان اور مسلمانوں اخوّتِ باہمی کا بہترین نظارہ نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ امیر و غریب و خرد و کلاں سب ایک قانون کے ماتحت ہو جاتے ہیں اپنے آقا اور مولا صلعم کے عمل کو زندہ کرتے اور خدائے پاک و برتر کے احکامات کی پابندی کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے رحمان و رحیم اپنے فضل سے اس ماہِ مبارک کے طفیل میں ہمارے معاصی کو معاف کرے اسلام و مسلمین کا بول بالا کرے اور ہمیں ارکانِ مذہب کی پیروی میں استقامت بخشے۔ (آمین)

کتب خانہ لٹن لائبریری میں پہلے اخبارات وغیرہ پڑھنے کے لئے بھی ایک طرف میزیں بچھی ہوئی تھیں جگہ کی کمی کی وجہ سے طلبا سکون و اطمینان سے مطالعہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس وقت کو ایک مدت سے محسوس کیا جارہا تھا۔ لیکن گنجائش نہ ہونے کے باعث وسعت کتب خانہ عمل میں نہیں آسکتی تھی اور نہ اتنا کافی روپیہ ہی پاس تھا کہ دوسری عمارت کتب خانہ کے لئے بنائی جائے لیکن اب اخبارات و رسائل کے مطالعہ کے لئے لٹن لائبریری سے ملحق ایک کمرے میں انتظام کردیا گیا ہے اور اس طرح اب نہ صرف قدیم شکایت کا ازالہ ہوگیا ہے بلکہ خود لائبریری میں کافی گنجائش نکل آئی ہے۔ کتابیں بھی اب ازسرِنو ترتیب دی گئی ہیں اور اب طلبا بہ سہولت کتابوں کو خود الماری سے نکال سکتے ہیں۔ کتابوں کی تقسیم مضمون وار کی گئی ہے۔

سبحان اللہ خاں اورینٹل لائبریری سبحان اللہ خاں لائبریری کو اب سرسید کورٹ کے جنوبی و مغربی سمت کے کمروں میں منتقل کردیا گیا ہے۔ اس لائبریری کا انتظام مولوی سید کاظم حسین صاحب ایم اے کے ہاتھ میں ہے جو گزشتہ دو سال سے اس کی ترتیب و تنظیم میں مشغول ہیں اور اب انھوں نے کتابوں کی جلد بندی کراکر ترتیب سے الماریوں میں آراستہ کردیا ہے۔ اس کام کی کیفیت کا اندازہ اس فہرست سے ہوسکتا ہے جو اُن کی نگرانی میں مسلم یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی ہے اور جس کی قیمت عمر ہے۔ فہرست فوس کیپ کاغذ کے ۱۳۶ صفحات پر طبع ہوئی ہے جس میں اردو، فارسی اور عربی کے قلمی نسخوں کا مجمل حال درج ہے اور ان کی تعداد ۱۸۳۲ ہے۔ بقیہ ۲۸۷ قلمی نسخوں کی فہرست زیر ترتیب ہے جو بعد میں بطور ضمیمہ شائع کی جائے گی۔

ہم ناظرین کرام کی ضیافت طبع کے لئے چند منتخب نادر مخطوطات کا حال اس فہرست سے اخذ کرکے درج مجلہ کرتے ہیں اور امید ہے کہ سید صاحب دیگر نسخہ جات کو بھی بہت جلد ترتیب دے لیں گے اور مشتاقانِ علم و ادب کو موقع دیں گے کہ وہ اس گنجینۂ بے بہا سے بہرہ اندوز ہوسکیں۔ سید صاحب اس سعی بلیغ کے لئے ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں

عید مبارک بحمداللہ رمضان شریف ختم ہوگئے اور سوموار کے دن بڑی چہل پہل سے عید منائی گئی۔ محسن الملک ہال میں شام کے وقت تمام طلبائے ہال کو دعوت دی گئی اور سرسید ہال میں رات کے وقت وسیع پیمانہ پر ڈنر دیا گیا۔ کھانے کے بعد پان سے حاضرین کی طبیعت محظوظ کی گئی۔ ڈنر کامیاب رہا۔ اس کامیابی پر ہم جناب پروفیسر ایم ایم شریف پرووسٹ ہال اور عبدالرب سینیر فوڈ مانیٹر کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اظہار افسوس فروگزاشت ہمیں افسوس ہے کہ باوجود کوشش بلیغ کے میگزین میں کتابت کی معمولی غلطیوں کے علاوہ چند فاش غلطیاں سرزد ہوگئیں جن کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	کیفیت
۶۸	۲۰	ماہر	یاس	ملاحظہ ہو میگزین بابت ماہ جون تا ستمبر
ابتدا	۱۴	نہ بینی	بہ بینی	"درآہنگ عمل" مسعود و سلیمان نمبر
۱۵۵	سیرت حضرت امام احمدؒ	..	..	یہ مضمون کتاب الصلوٰۃ مولفہ شیخ علی [illegible] ماخوذ ہے جو [illegible] میں مصنف سے [illegible]
۱۶۹	۲۰	درہجر	بہ ہجر	سلیمان و مسعود نمبر
۲۴۹	۹	مجریہ بابت ماہ اگست	بابت ماہ اگست	
۲۵۵	۱۰	بہریک ..... نکریں	بہریک جرعہ غم ہستی اشیا نہ کریں	
۲۸۰	غزل	..	..	نوٹ ہمیں افسوس ہے کہ یہ غزل غلطی سے درج رسالہ ہو گئی
و (تنقید و تبصرہ)	۱۳	کتب	..	یہ سرخی دراصل صفحہ ج پر ہونی چاہئے جہاں سے کتابوں پر تبصرہ شروع ہوتا ہے

هز اکسلنسي سر مالکم هيلي گورنر صوبهٔ متحده

آپ نے ٢٥ جنوري سنه ١٩٣٠ع کو يونيورسٹي کا کانووکيشن کا اڈريس پڑھا

ضمیمہ (۱)

خطبہ

جو ہز ایکسیلینسی سر میلکم ہیلی جی سی آئی ای۔ کے سی ایس آئی۔ آئی سی ایس گورنر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ اور رکٹر یونیورسٹی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد منعقدہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۳ء کے موقع پر فرمایا۔

جناب وائس چانسلر۔ ممبران یونیورسٹی خواتین وحضرات اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہوں میں ضروری خیال
ں کہ مسلمانانِ صوبۂ ہذا سے بالعموم اور آپ صاحبان سے جو علی گڑھ میں رہتے ہیں بالخصوص جناب صاحبزاد
ب احمد خاں صاحب کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ ہمدردی کروں میری نظروں میں ان کی وقعت ایک
اور قابلِ عزت دوست ایسی تھی۔ مرحوم کا کوئی دوست اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں
ں کی دُھن ان کے دماغ میں بوجہ اتم تھی۔ اور اس لیے انھوں نے اپنی تمام زندگی علی گڑھ کے لیے
ردی۔ اب ان کی روح کو ایک طویل اور شدید مرض کے حملوں سے جس کو انھوں نے نہایت صبر و استقلال
ت کے ساتھ برداشت کیا۔ اطمینان نصیب ہو گیا ہے۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین!

ہر اس شخص کے سامنے جس کو کسی یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھنے کی دعوت دیجاتی ہ
ات کا ایک طویل سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ جن پر وہ کچھ کہہ سکتا ہے۔ تاریخ۔ فلسفہ اور علم و ادب کا وسیع
اس کی طبع آزمائی کا منتظر ہوتا ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں اور میرے لیے یہی مناسب ہے کہ میں
ن تمام وقیع مضامین سے پرہیز کروں اور آپ کے مفید مطلب و کارآمد باتوں کا تذکرہ کروں۔ اور
ا میرا خیال ہے کہ اتنا پریشان کن کوئی دوسرا مضمون نہیں ہوسکتا جتنا کہ آپ کا فوری مستقبل ہے
سنہ ۱۹۲ء میں لارڈ ریڈنگ نے آپ صاحبان کے سامنے تقریر کی تھی تو انھوں نے ان تمام نازک اوقات
گڑھ یونیورسٹی کی زندگی پر گذرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ انھوں نے بتایا تھا کہ کس طرح کالج کے

ابتدائی زمانے میں بانئ دارالعلوم کی اُن تھک کوششوں اور سرگرمیوں کے باوجود وہ لوگ جو اس درسگاہ سے خاص طور سے متمتع ہوسکتے تھے۔ غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے تھے۔

یہ محض سر سیّد علیہ الرحمۃ کی زبردست شخصیت اور ان کی مقناطیسی قوت کا طفیل تھا کہ کالج اُس نازک اور کٹھن منزل کو کامیابی کے ساتھ پار کرسکا۔ لارڈ موصوف نے یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح ۱۹۱۱ء میں جب اس کالج کو مسلم یونیورسٹی بنانے کی تحریک زوروں پر تھی تو تجویز کی تفصیلات کے بارے میں ناگوار اور موزون بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ جو ایک غیر معین مدت کے لیے اعلیٰ اقتدار و وسیع دائرۂ عمل کے حصول کی برسوں کی امید کو التوا میں ڈالنا چاہتی تھیں اگرچہ علی گڑھ کے خیر خواہوں نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس تجویز کو کامیاب بنانے کی کوشش کی لیکن ۱۹۲۰ء سے پیشتر صورتِ موجودہ کا عمل میں آنا ممکن نہ ہوسکا۔ مگر عین اُس وقت جبکہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دور میں قدم رکھا اس کو ایک مہلک حملہ کے صدمہ کا مقابلہ کرنا پڑا جو تحریک ترکِ موالات کے قابلِ نفرت اثر کے ماتحت اس پر کیا گیا اور جس کا مقصد مسلمانوں کی نصف صدی سے زائد متحدہ کوششوں کے نتیجے کو ضائع کرنا تھا جو انھوں نے اس تعلیمی مرکز کو قائم کرنے کے لیے کی تھیں۔ لیکن ایک مرتبہ پھر اس درسگاہ کے خیر خواہوں کی خیر خواہی کام آئی اور بقول لارڈ موصوف اس نے طوفان کا مقابلہ کیا اور تمام مصائب سے گزر کر دوبارہ تقویت پکڑی۔

اس واقعہ کو ابھی دس سال گزرے ہیں مگر اس قلیل مدت ہی میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جنھوں نے یونیورسٹی کی زندگی کو متلاطم کردیا اور بلاشبہ اس کے خیر خواہوں کو سخت ہیجان میں ڈالدیا۔ میری تمنّا ہے کہ یونیورسٹی کی تاریخ کے اس باب کا جس کا خاتمہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پر ہوتا ہے نہایت حزم و احتیاط کے ساتھ تذکرہ کروں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تمام وہ حضرات جنھوں نے اس رپورٹ کو اور اس کے بعد اُس بیان کو جو افسرانِ یونیورسٹی نے اس رپورٹ کی سفارشات پر عملی طور سے عمل پیرا ہوتے ہوئے شائع کیا ہے۔ پڑھا ہے وہ میری طرح اُس کی اہمیت کو سمجھتے ہونگے۔ ان کو لازمی طور سے افسوس ہوتا ہوگا کہ تحقیقات ضروری خیال کی گئی لیکن یہ محض سرسری خیال ہے لیکن ان کے دلوں میں ایک اطمینان بخش بلکہ قابلِ فخر خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ ان حضرات نے جو یونیورسٹی کی رہبری کے ذمّہ دار ہیں۔ نہایت ہمت اور ارادے

اس عمل کی ضرورت کو محسوس کیا۔ اور چارہ گری کی۔ آپ زندگی کی کسی حالت کو لیجئے یا انسانی کارگذاریوں
کی میدان کو جانچئے آپ محسوس کریں گے کہ بعض اوقات معیار گر جاتا ہے۔ لائحہ عمل متزلزل ہو جاتا ہے اور
ھں گھر کر لیتے ہیں لیکن زیادہ کامیابی ان کو نہیں ہوتی جو غلطیوں سے بچتے ہیں بلکہ ان لوگوں کو حاصل ہوتی
جو غلطیوں کو سمجھتے ہیں اور اپنی اخلاقی جرات سے ان کو درست کرتے ہیں۔ اب اس باب کو ختم شدہ سمجھ لینا
ہے۔ ہمارے لیے یہ امر تسلی بخش ہے کہ ایک مرتبہ پھر اپنے دوستوں کی خیر خواہی کی بدولت علی گڑھ نے
مصائب کو زیر کر لیا ہے۔ اور اب اس کی رگوں میں وہی پہلی سی روح دوڑ رہی ہے اور میں یقین کرتا
ں کہ آنے والی نسلیں جب اس باب کا مطالعہ کریں گی تو وہ آپ کی چانسلر صاحبہ کا اس سعی اور جدوجہد
لیے جو انھوں نے فرمائی شکریہ ادا کئے بغیر نہ رہ سکیں گی اور ساتھ ہی ساتھ کورٹ کی جملہ کارروائیوں
بزآپ کے قائم مقام وائس چانسلر سر شاہ محمد سلیمان صاحب کی ان قومی خدمات کو جو انھوں نے ایسے
۔ وقت اور ایسے مشکل واقعات کی موجودگی میں یونیورسٹی میں انجام دیں بنظرِ استحسان دیکھیں گی۔
مجھے یہ بھی امید ہے کہ مستقبل کا علی گڑھ بجا طور سے اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوگا کہ اس نے اپنی خدمت
لیے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب ایسے وسیع تجربہ اور جہاندیدہ شخص کو اپنی طرف
لیا۔ ان میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ان کے قابل فخر جدِ امجد میں تھیں۔ ان کے ممد و معاون آپ کے
وائس چانسلر مسٹر ہارن بڑی قابلیت اور شہرت کے آدمی ہیں۔ ایسے بزرگوں کی موجودگی اور طلباء و
ذہ کی اطاعت شعارانہ استمداد آپ کی بہتری کے لیے نیک فال ہیں اور اس لیے آپ کامل یقین کے
نہایت مبارک اور قابلِ اطمینان مستقبل بنا سکتے ہیں اور جب ارادوں اور امیدوں کی جھلک میں
چیز کا اختتام ہوتا ہے تو طبیعت کو یک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے لیکن اس پُر آشوب اور مصائب آمیز
ئے روز مرّہ میں نیتِ عمل ہی سے کام نہیں چلتا بلکہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے پورے طور سے کامیابی
لیے حسنِ انتظام و جملہ لوازمات نہایت ضروری ہیں۔ اب مجھے مختصراً آپ کی اشد ضروریات کا ذکر
چاہیئے۔

تمام اصلاحات کی غرض و غایت واحد ہے اور وہ یہ ہے کہ بانیٔ دارالعلوم کے نصب العین پر عمل پیرا

ہوں" سر سید علیہ الرحمتہ یونیورسٹی کی بابت یہ خواب دیکھا کرتے تھے کہ علما کی ایک ہمدرد و غمخوار جماعت
بنائی جائے جو اپنی قومی حمیت کے جذبے کے ماتحت کام میں مشغول ہو اور اُن کے ساتھ طلبا کا ایک ایسا
گروہ ہو جنھیں دنیا کی ذمہ دارانہ اور امانت کی جگہوں کو عزت کے ساتھ پُر کرنے کا اہل بنایا گیا ہو اور میں خیال
کرتا ہوں کہ آپ صاحبان اس مقصد کو اُس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ موجودہ شعبہ جات تعلیم
کو درست اور مستقل نہ بنائیں گے۔ کسی تدریسی (Teaching) یونیورسٹی کی کامیابی کا راز اس کے
طریق تعلیمی امداد (Tutorial System) کے صحیح معنوں میں درست ہونے میں مضمر ہوتا ہے اس
لیے اہم ضرورت ماہر تعلیم و با اخلاق استادوں کی ہے۔ جو سیڈلر کمیشن کے منشا کے مطابق اس قسم کی تعلیم
دیں جس کی تعریف صحیح طور سے ہونا ممکن نہیں ہے اور یہ اس لیے نہیں کہ وہ خیالات جن پر اس کا انحصار ہے مبہم
ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ مستغنی عن التعریف ہیں۔ اور الفاظ کے ذریعے اس کی تعریف ناممکن ہے اس قسم
کی رہبری سے اس امر کی صداقت کا پتہ لگتا ہے جو طلبا کے مختلف الاقسام و متنوع عادات و حالات اور متفرق
اوضاع و اطوار و رجحانِ طبیعت کو مدِ نظر رکھ کر دی جاتی ہے۔ عمدہ اور قابل استادوں کو جمع کر لینے اور ان کے
قیام کے معنے قطعی مالی امداد کے نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ تشویق و خلوص نیت کی ضرورت ہے اور اسی
میں کامیابی ہے لیکن آہستہ آہستہ آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ اس روحِ اخلاص کو قائم رکھیں
اور اپنے پیشہ میں بھی دلجمعی سے منہمک رہیں! ور یہی شاگردوں پر اصل اثر کا باعث ہے تو آپ انھیں مادی ضروریات
سے بوجہ معقول بے نیاز کر دیں نیز ان کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے کافی انتظامات کیے جائیں۔

علاوہ ازیں اخلاق و عادات کی ساخت کی اسکیم جو بانیؒ کا مقصد تھا بہت حد تک یونیورسٹی میں طلبا
کے طور و طریق رہائش پر منحصر ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک تہائی کے قریب طلبا یونیورسٹی سے باہر رہتے
ہیں اس لیے ضروری ہے کہ چند نئے دارالاقامہ کا اضافہ کیا جاوے اور یہ نہایت اہم ضروریات ہیں لیکن ان سے
بھی بڑھ کر معملوں Laboratories تعلیمی کمروں اور استادوں کے لیے مکانوں کتب خانے
کی عمارت برقی روشنی اور انتظامات صفائی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے حکومتِ ہند نے سالانہ امداد
استمراری کو ۱½ لاکھ کی بجائے ۳ لاکھ کر دینے اور ۱۵ لاکھ روپیہ کی غیر استمراری امداد بالاقساط دینے کا شرط

عدہ کیا ہے اس کے علاوہ مقامی حکومت بھی اس بات پر سختی کے ساتھ مصر نہیں ہے کہ آپ کی یونیورسٹی
آل انڈیا یونیورسٹی" ہے بلکہ وہ مختلف طریقوں سے ۱/۲ ۱ لاکھ روپے سالانہ یونیورسٹی کو اور تین ہزار روپے
زیادہ اس کی ملحقہ درسگاہوں کو دیتی ہے گو صوبجاتی حکومت علی گڑھ سے خاص دلچسپی رکھتی ہے اور اس کی
قی کی دل سے خواہشمند ہے تاہم مالی امداد کے لیے محض تنہا آپ کی یونیورسٹی نہیں جو اس امداد کی خواستگار
بلکہ اور بھی تعلیمی مرکز ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہم اپنے صوبے کی یونیورسٹیوں کو سب صوبوں سے زیادہ امداد
یتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اگر آپ اپنی امیدوں کو بار آور دیکھنا چاہتے ہیں تو فیاضی اور ایثار سے کام
یونیورسٹی کی مدد کیجیے۔ آپ کے خزانچی نے ۱۹۲۶ء میں فرمایا تھا کہ دس بارہ سال سے روپیہ جمع کرنے
تمام کوششیں بند ہو گئی ہیں لیکن اس دوران میں دوسری اقوام نے جن کی حالت آپ ایسی ہی مالی
استعانت حاصل کرنے کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب علیگڑھ کو
بھی محض ایک تعلیمی مرکز ہی نہیں سمجھا تھا بلکہ یہ مسلمانوں کی یکجہتی اور ان کے مستقبل اور تہذیب و شائستگی
پختہ یقینی کا ایک بین ثبوت سمجھا جاتا تھا اور جیسا کہ بارہا بیان کیا گیا ہے یہ مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کا پیش خیمہ
کیا جاتا تھا۔ میں آپ لوگوں سے یہ دریافت کرنا نہیں چاہتا کہ آیا عہدِ حاضرہ کے مسلمان اس نصب العین
برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ علی گڑھ کے ہر خیر خواہ کے دل میں یہی امر جاگزیں ہونا
ئے اور مسلمانوں کو اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے اپنے بیان کو صرف ایک مخصوص مسئلہ تک جس کو میں آپ لوگوں کی عین دلچسپی کا موجب سمجھتا ہوں
در رکھا ہے اگرچہ بہت سے حضرات اس کو پیش پیش رکھنے کی کوشش کریں لیکن میرے نزدیک علی گڑھ بجائے
اس بڑی تصویر کا ایک حصہ ہے جو اُن لوگوں کے سامنے موجود رہتی ہے جو ہندوستان میں اسلام کی حالت
واقف ہیں اس لیئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی مطالبہ جو آپ قوم کے سامنے پیش کریں وہ معقول ہو اور
سے مفید نتائج بھی برآمد ہو سکیں تو اُن تمام حضرات کو جن سے مطالبہ کیا جاتا ہے یقین ہو جانا چاہیئے کہ علی گڑھ
رد ہندوستان میں اسلام کی زندگی کا ایک زندہ اور اہم جزو ہے۔ آجکل ہر شخص کے خیالات اُن سیاسی
یوں کی طرف لگے ہوئے ہیں جو مستقبل قریب میں وقوع پذیر ہونگی اور اُن کا اثر مسلمانوں کی قومیت پر

مترتب ہوگا۔ بہت سے ایسے اصحاب بھی ہیں جن کی نظریں قطع نظر دیگر تمام امور کے معاملات کے ایک نازک پہلو یعنی مرکزی و مقامی مجالسِ مقننہ و انتظامیہ میں مسلمانوں کی نمایندگی پر لگی ہوئی ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جن کا زاویۂ نگاہ زیادہ وسیع ہے اور وہ اپنے آئینی حقوق کی بہترین محافظت کے حامی ہیں جس کا حصول اداراتِ ملکی سے متعلق معاملات کی جمہوری تشکیل اور اقلیت کے علٰحدہ و نمایاں تہذیب و شائستگی میں ہے ہندوستانی قومیت کی نشو و نما میں اسلام نے جو حصّہ لیا ہے اس پر اور نیز میدانِ سیاست میں مختلف فرقوں کے تعلقات کے پریشان کُن پہلو پر بہت کچھ تبصرہ کیا جا سکتا ہے

میرے خیال میں ان امور پر معقولیت کے ساتھ بحث کرنے کے لیے کانووکیشن ہال کے پنڈال سے بہتر اور مناسب دوسری جگہ نہیں ہو سکتی لیکن شاید یہ وقت اس مقصد کے لیے موزوں نہیں ہے قومی اختلافات ترقی پر ہیں اور مستقبل کا خواب قدرے تاریک ہے اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اُس وقت کی ناموزونیت کو خوب سمجھتا ہوں جب قومی کارکُن عملیات سے بڑھکر لسانی پر اتر آنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں اور ملازمانِ سرکار بھی مجبور ہیں کہ اپنے مافی الضمیر کو پورے طور سے ظاہر نہ کر سکیں لیکن بہرحال اب معاملہ زیر بحث دوسرا ہی ہے۔

آپ لوگوں کے خیالات ان سیاسی عقدوں کے فوری حل تک ہی محدود نہیں ہونے چاہئیں در اصل یہ عقدے نہایت پیچیدہ اور پریشان کُن ہیں تاہم ان کے خیال سے ہم اس حقیقت کی طرف سے کورنظری نہیں برت سکتے کہ ان کے علاوہ بھی کچھ زیادہ سنجیدہ معاملات ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تاریخ میں کبھی بھی ایسا زمانہ نہیں گذرا جب ایسے عناصر جو مختلف ملل کی معاشرتی زندگی و تمدّن کو جداگانہ حیثیت میں پیش کرتے ہیں اس قدر شدّ و مد کے ساتھ نئی قوتوں کے اثرات میں آئے ہوں بلاشبہ ایشیا کی تاریخ میں ایسا کوئی زمانہ نہیں ملتا جب یہاں کی تہذیب نے دوسروں کی تہذیب کا اسقدر اثر قبول کیا ہو۔

جو لوگ آج ہندوستان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کو علاوہ دیگر مشکلات کے ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ تمام ملک ان کو خیالات کے دو متضاد یعنی مشرقی و مغربی عالم میں سوچتا اور کام کرتا نظر آتا ہے۔ یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہمارے دوستوں میں دو قسم کی شخصیتوں کا اثر جلوہ نما ہوتا ہے اور اکثر بار وہ وقتی معاملات

کے دو متصادم تخیلات کی رگ رگ میں پس جاتے ہیں اور یہ اُن اہم تغیرات کی علامت ہیں جو مشرقی دنیا پر رونما ہو رہے ہیں اور جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ طاقت پکڑتے جائیں گے۔

جتنا اہم مسلمانوں کے لیے اپنے سیاسی مطالبات کا تسلی بخش حل ہے اُس سے کہیں زیادہ ضروری یہ مر ہے کہ وہ اپنے کو اُن انقلابات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کریں۔ جو نئی قوتوں کے باعث (جو ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہیں) مسلمانوں کی معاشرت و تمدن پر آنیوالے ہیں آپ کی مذہبی زندگی آپ کے تمدن کی روح ہے اور یہ حقیقت آپ کے حالات میں بہ نسبت دیگر اقوامِ عالم کے زیادہ واضح ہوجاتی ہے کیونکہ اکثر قوموں میں مذہب بجائے تخلیقی قوت کے جو جداگانہ ممتاز خصائص کی باعث ہوتی ہے محض مادی و جسمانی ماحول کے مظاہر کا نام ہے۔

اِن جدید و بسرعت ترقی پذیر تحریکات کا آپ کے مذہب پر کیا اثر ہوگا؟ اور یہ کس طرح اُن معاشرتی داروں پر جو مذہب سے اس قدر وابستہ ہیں اثر پذیر ہونگی؟ آپ کا اپنا فلسفہ اور ادب ہے۔ جو آپ کی قومی زندگی اایک جزو ہے۔ اور جو بعض کے نزدیک تو اُس زندگی کی روح ہے یہ اپنے ماحول کے باعث نئے انداز اور نئی شکل میں لوہ نما ہوگا لیکن کیا یہ اتنا اثر پیدا کرسکے گا کہ اس کے مخصوص رنگ سے اس کو محروم کردے گا۔ یہ باتیں اُس سم کے واہمہ و تخیلات نہیں ہیں جو آجکل کی زبان میں نجومیوں کی پیشینگوئیوں سے منسوب کی جاتی ہیں یہ وہ حالات ہیں جن کا آپ کی قوم کے مستقبل پر بہت گہرا اثر ہوگا۔ میں اس موضوع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتا ونکہ میں آپ لوگوں کے سامنے ایک عملی بات پیش کرنی چاہتا ہوں اور میں یہ بات آپ سے بہ حیثیت ایک دوست ور خیرخواہ کے جسنے حالات کا مشاہدہ کیا ہے کہتا ہوں۔ "کہ وہ چیز جس کی ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے اور جس کے وہ آج باصرار طالب ہیں۔ وہ "قیادت" ہے تمام مسائل میں جو مسلمانوں کو حل کرنا ہیں چاہے ہ سیاسی ہوں یا عقلی اس کی کمی سختی کے ساتھ محسوس کیجارہی ہے آپ کی تاریخی روایات اور آپ کے شرقِ قریب سے تعلقات ایسے امور ہیں جنھوں نے آپ کو خاص طور سے مشرق و مغرب کے خیالات کی جمانی کے لیے موزوں کیا ہے آپ کی مذہبی و معاشرتی یک جہتی نے جو بجائے خود بے نظیر ہے۔ آپ کو اُن وضع ائع کا مالک بنادیا ہے جن سے دوسری اقوام محروم ہیں لیکن کیا آپ میں ایسے رہنما موجود ہیں جو فوراً ان تمام

فوائد کو سمجھکر ان سے منتفع ہونے کی کوشش کریں۔ میں جملہ احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے عرض کرونگا کہ علمار کی جماعت میں تو ایسے رہنما کا ملنا ممکن نہیں ہے اور دوبارہ مؤدبانہ عرض ہے کہ مجھے اس میں بھی شک ہے کہ ایسا رہنما آپ کو اُس گروہ سے دستیاب ہو سکے جس کے تجربے سیاست کی شاہراہِ عام تک محدود ہیں اور اس لیے میں سرسید علیہ الرحمۃ اور اُن کے نصب العین دربارۂ علی گڑھ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اُنھوں نے فرمایا تھا کہ "بعضوں کا خیال ہے کہ قومی ترقی تعلیم کے عام ہو جانے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس خیال کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن اُن کا جداگانہ نظریہ تھا انھوں نے کہا تھا کہ "میری خواہش ہے کہ میں اپنی قوم کو اتنا بلند دیکھوں جتنا بلند کہ شب میں آسمان نظر آتا ہے جب میں رات کو آسمان کی طرف دیکھتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کو نہیں دیکھتا جو تاریک اور خوفناک ہوتا ہے بلکہ اُن ستاروں پر اپنی تمامتر توجہ وقف کر دیتا ہوں جو روشن ہوتے ہیں اور اپنی تابناکی سے چہرۂ آسمان کو حیرت انگیز طور سے خوشنما بنا دیتے ہیں۔ کیا ہم اپنی قوم کو اُبھار سکتے ہیں؟ اور کیا ہم بغیر اُن لوگوں کے جو آسمان پر ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ دوسری قوموں کی نظروں میں معزز بن سکتے ہیں؟"

اُن کو قوی اُمید تھی کہ علی گڑھ ہندوستان میں قائد و رہنما پیدا کرے گا۔ اور یہ تھا وہ اعلیٰ جذبہ جو ہر وقت اُن کے پیشِ نظر تھا اور اگر آپ کی یونیورسٹی اُن کے ایثار و پیش بینی کی قدر کرتی ہے تو آپ کو اِس مقصد کی تکمیل کے لئے آج ہی کمربستہ ہو جانا چاہیئے۔ ایسا کوئی مسلمان نہیں ہوگا جو اس سعی کارِ خیر میں دل سے آپ کی مدد نہیں کریگا۔ اور کوئی شخص مسلمانوں کا محبِ صادق نہیں ہو سکتا جو خدائے کارساز سے اس کے بار آور ہونے کی دعا نہ کرے۔ (آمین)

(مترجمۂ قاضی عبدالسلام بی اے کلاس
ومُدیرِ رسالہ)

(ضمیمہ ب)

ارشاد

بجوابِ سپاسنامہ پیش کردۂ طلبائے جامعہ علی گڑھ

بجناب نواب معلی القاب سر مالکم ہیلی صاحب گورنر صوبہ جات متحدہ

بتاریخ ۲۵ر فروری سنہ ۱۹۳۰ء بوقت شام

حضراتِ سامعین۔ یقین مانئے میں نے نہایت مسرت وطمانیت کے ساتھ آپ کی یونین کا ڈنر بنجانیکی دعوت بول کی (چیرز) میں نے آپ سے ان معزز مہمانوں کے نام سنے جن کو آپ نے زمانۂ گزشتہ میں معزز رکن بنایا ہے در واقعی یہ بہت بڑی عزت ہے کہ اُس امتیاز کو حاصل کیا جائے جو حضور ملکِ معظم قیصرِ ہند کو بخشا گیا۔ (چیرز)

میرے مشہور پیشرو سر ولیم میرس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ علی گڑھ میں بسر کیا اور قدرتاً وہ آپ کی علیم گاہ کے مسئلہ میں نہایت گہری دلچسپی لیتے تھے (جیساکہ ہر ایک کلکٹر ضلع علی گڑھ کا فرض ہے) اور اُن کے ب سے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ میں خود بھی علی گڑھ سے واسطہ وتعلق رکھتا ہوں میں مسٹر لیک ن بہانی سے بخوبی واقف ہوں میں اُن کی قابلِ افسوس موت سے چند گھنٹہ پیشتر اُن کے پاس موجود تھا ور سر تھیوڈر مارلین اور سر ٹامس آرنلڈ صاحبان سے بھی میرے مراسم مخلصانہ رہے ہیں۔

سلمانوں کا اثر پنجاب میں

جیساکہ آپ صاحبان کو علم ہے میری زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں صرف ہوا ہے اور گو مدت کی بات ہے لیکن مجھے خوب یاد ہے اور اسے اتنا عرصہ ہوا کہ اُس وقت نایدآپ میں سے انڈر گریجویٹ طلبار کی پیدائش بھی نہوئی ہوگی کہ میں مسٹر تھابرن کی ماتحتی میں کام کررہا تھا جنھوں نے صوبۂ پنجاب میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُن نا اس حکمتِ عملی کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور اُن کی مخالفت شروع ہوگئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ن کو اُنھوں نے پنجاب کے ایک ضلع کی بابت رپورٹ بھیجی جس میں انھوں نے بتایا تھا کہ آبادی کا ۹۰ فیصدی

عنصر مسلمانوں پر مشتمل تھا لیکن صرف ½ فیصدی مسلمان اعلیٰ عہدہ دار تھے یہ اُن کی ذات تھی کہ وہ برابر صد
احتجاج بلند کرتے رہے کہ کس طرح زمین مسلمان کاشتکاروں کے قبضہ سے نکلکر غیر مسلمانوں کے ہاتھوں میں
ہے۔ اس واقعہ کو پیش آئے عرصہ ہوگیا اور میں نے بہ چشم خود اس حیرت انگیز تبدیلی کو وقوع پذیر ہوتے د
نہروں کے ذریعہ آبپاشی کی ترقی سے مسلمانوں کی زمینوں کے بڑے بڑے خطے جو پیشتر محض جنگلات
اب زرخیز کھیت بنگئے ہیں اور اُن کے مالک خوش گذران زندگی بسر کرتے ہیں پنجاب میں مسلمانوں کی اکژ
ہے اور ان کا اثر و اقتدار روزانہ ترقی پذیر ہے اور مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے۔

علی گڑہ کی پیداوار

اپنے دورِ ملازمت میں میں بکثرت اصحاب سے جو علی گڑہ کے تعلیم یافتہ تھے ملاقی ہوا ہوں۔ مجھے ا
حال میں بتایا گیا ہے (اور یہ سنکر مجھے سخت افسوس ہوا) کہ اِس صوبہ میں لوگوں کا یہ خیال ہوچلا ہی کہ علیؒ
کے فارغ التحصیل طلبا، سرکاری ملازمتوں کے اہل نہیں ہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں اور صاف صاف بتا تا
کہ آپ حضرات کو ثابت کردینا چاہیئے کہ یہ بات حقیقت سے کہیں دور ہے اور جہاں تک میرے بس کی بات ہ
مجھے معلوم ہوا کہ کسی محکمہ میں یہ خیال قایم ہی تو میں اپنے اختیارات کلّی سے کام لیکر اس محکمہ کے افسرِ اعلیٰ کو اس خ
کی جلد از جلد تبدیلی پر مجبور کرونگا۔ (ہیر ہیر) (نعرۂ مسرت)

خاتمہ پر میں آپ کے لیے کامیابی و مرفۃ حالی کی دعا کرتا ہوں۔ دنیا میں زندگی گذارنا کبھی بھی آسان نہیں
ہوا میں اپنے طالبِ علمی کے زمانے کو یاد کرتا ہوں جب مجھے حیرت ہوا کرتی تھی کہ میں زمانہ مستقبل میں کیا کر
کھاؤنگا۔ ہر انسان آپ سے ہمدردی کرے گا کیونکہ آپ کو زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہی۔ لیکن۔
اُمید ہے کہ آپ کی روایاتِ قدیم جو یہاں پر قایم ہیں آپ کی مددگار ہونگی۔ آپ کی تعلیم گاہ ہی ہندوستا
کی واحد تعلیم گاہ ہی جو انگلستان کی سی زندگی کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اور آپ کے اغراض و مقاصد بھی
بالکل وہی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ہماری طرح اپنے کالج کے ایام کو فخر کے ساتھ یاد کریں گے اور جب یہاں ۔

(ش)

جائیں گے تو یہ پیارا جذبہ لیکر جائیں گے کہ آپ ایک اعلیٰ تعلیم گاہ سے متعلق رہے ہیں۔ مجھے یہ امید ہی کہ آپ
ہیہ کریں گے کہ آیندہ زندگی میں اس کی شہرت کو قایم رکھیں اور عہدِ واثق کریں گے تاکہ بیرون عالم
کو معلوم ہو جائے کہ "علی گڈھی نشان" کے کیا معنیٰ ہیں۔

(مترجمۂ مدیر)

(ضمیمہ ج)

ایک جرمن مستشرق

(مشہور مستشرق ڈاکٹر فریٹس کرنکاؤ F. Karankow کے خودنوشت حالات)

ڈاکٹر کرنکاؤ ایک مشہور مستشرق ہیں اور "المجمع العلمی" کے جسے شام کا دارالمصنفین کہنا چاہیے رکن ہیں۔ میں عبدالعزیز راجکوٹی پروفیسر مسلم یونیورسٹی اس کے رکن ہیں رسالہ "المجمع العلمی" کے ایک نمبر میں ڈاکٹر موصوف نے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ اس وقت موصوف ہماری یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز "اسلامیات" کے صدر ہیں۔

"میں ۲۰ اگست ۱۸۷۲ء کو شونبرگ (Shoenberg) شمالی جرمنی کے چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا، میرے والد حکومت جرمنی کے خدمات پر معمور تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں بھی اپنے ایک چچا کی طرح جرمنی فوج میں شامل ہو جاؤں، قبل اس کے کہ میری چھٹی سالگرہ ہو میرے والد نے داعئ اجل کو لبیک کہا میری والدہ مجھے اور میری چھوٹی بہن کو لیکر اپنے والد کے یہاں چلی گئی، میری تربیت انھیں کے یہاں ہوئی اور میں ایک ثانوی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے لگا۔

جب میں سولہ سال کا ہوا تو میری یہ خواہش ہوئی کہ میں علوم ریاضیہ کا طالب علم بن جاؤں لیکن میرے اعزہ و اقربا کا خیال تھا کہ تجارت میرے لیے زیادہ "سودمند" ثابت ہوگی۔

میں شہر لوبک (Luebeck) کے "تجارتی" مکتب میں داخل ہوا اُس وقت میں دو جدید زبانیں یعنی انگریزی اور فرانسیسی، لاطینی اور یونانی کے علاوہ جانتا تھا جو کتابیں میرے پاس تھیں فرصت کے اوقات میں اُن کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔

پھر میں نے فارسی اور دیگر یورپی زبانوں کو پڑھنا شروع کیا، اس شان سے کہ کتاب کے سوا میرا کوئی معلم نہ تھا اس زمانہ میں میں نے جرمنی زبان میں چند اشعار لکھے جو اوسط درجہ کے تھے اور گو میں انھیں فراموش کر چکا

ڈاکٹر ایف کرنکاؤ — مشہور جرمن مستشرق

ریڈر شعبۂ اسلامیات — مسلم یونیورسٹی

ں لیکن میرے بعض کرمفرماؤں کو ابتک یاد ہیں ۱۹۰۲ء میں برلن گیا وہاں میں نے پہلی مرتبہ پروفیسر ساخوکی
مشرقی لغات کے ماہر ہیں زیارت کی موصوف نے نصیحت فرمائی کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں کیونکہ اس میں
ت وانہماک اس شخص کو زیب دیتا ہے جس کے پاس وقت بھی کافی ہو اور روپیہ بھی بہت ہو۔

میں نے ان کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا، بلکہ پڑھنے میں اور زیادہ کوشش سے کام کرنے لگا دو سال
بعد میں نے انگلستان کا سفر کیا اور ایک تاجر کے ہاں ملازم ہو گیا۔ جہاں میں نے کئی سال بسر کئے اور
معقول رقم جمع کرلی۔ میں نے لسٹر میں کپڑوں کا ایک کارخانہ قایم کردیا جس میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ
کار تھے اور باوجود کثرتِ مشاغل کے فرصت کا اگر ایک گھنٹہ بھی مجھے مل جاتا تھا تو میں علمی کتابوں کے مطالعہ
صرف کرتا تھا۔

مجھے عربی زبان اور اسلامی تمدن کا خاص شوق پیدا ہوا بالخصوص قرونِ اولی اور اوائلِ اسلام
حالات کا اور جب جنگِ عظیم سے تمام عالم زیر و زبر ہو گیا تو مجھکو بھی اس کے آخر زمانہ میں مصائب و نوائب
دوچار ہونا پڑا اور سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ترکِ مشاغل کرنا پڑا اور
لیے ضروری ہوا کہ میں اسٹریلیا کا سفر کروں، اس میں ایک سال گذر گیا۔

سفر سے واپسی پر ۱۹۲۲ء کے اواخر میں دوبارہ تجارت کی ٹھہرائی اور میری اس تگ و دو کا سلسلہ اگست ۱۹۲۳ء
جاری رہا لیکن مجھے نفع کچھ بھی نہ ہوا تب میں نے اس سلسلہ کو ترک کردیا اور اپنے کو علم کے لیے وقف کردیا۔

میں نے جو کتابیں نقل کی ہیں اور دوسرے نسخوں سے مقابلہ کے بعد ان کو شائع کیا ہے وہ بہت ہیں منجملہ
کے طفیل غنوی کا قصیدۂ یائیہ مع انگریزی ترجمہ کے شائع ہوا ہے۔

ب بن زہیر کا قصیدہ بانت سعاد مع جرمنی مقدمہ کے۔

رابی وہیل تجمی، روایۃ الزبیری مع زیادات وغیرہ۔

بکر زبیری کی "طبقات النحاۃ" مع مقدمہ و شرح اطالوی زبان میں۔

ان مزاحم عقلی مع ترجمہ انگریزی ۱۹۲۰ء میں لندن سے شائع ہوا۔

بکر بن درید کی "کتاب المنجنی" جو دائرۃ المعارف حیدرآباد کی عنایت سے شائع ہوئی۔

دیوان نعمان بن بشیر انصاری اور اس کی ذیل میں دیوان بکر بن عبدالعزیز العجلی لیکن عبداللہ سورتی نے اسے شائع کر دیا اور اس کے ٹپہ پر لکھدیا کہ وہی اس کا ناشر ہے حالانکہ وہ ۱۳۲۴ھ میں میرے محترم دوست نواب عماد الملک بہادر مرحوم کی فرمائش سے دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

ہبۃ اللہ ابن الشجری کا حماسہ یہ بھی ۱۳۴۵ھ میں حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔

طفیل غنوی اور طرماح بن حکیم کے دواوین ایک ہی جلد میں مع مقدمہ و ترجمہ و شروح اور طویل فہرستوں کے انگریزی زبان میں ۱۹۲۸ء میں لندن میں چھپ گئے ہیں۔

ابو عمیثل کی "الکتاب الماثور" مع جرمن مقدمہ ایک بہت پرانے نسخے سے جو ۳۰۳ھ کا لکھا ہوا ہے ۱۹۲۰ء میں بیروت سے شائع ہوئی ہے۔

میں نے ابن درید کی کتاب "الجمہرہ" کی ترتیب و تہذیب بھی کی ہے جو تین بڑے مجلدات میں ابھی حال میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہے۔ سرِدست میں اس کتاب کی ایک مفصل فہرست کی ترتیب میں مشغول ہوں کمال الدین شیرازی کی کتاب "تنقیح المناظر"، کو جو ابو ہیثم کی کتاب المناظر کی شرح ہے دائرۃ المعارف کی حسب منشا ترتیب دیا ہے جو حیدرآباد میں طبع ہو رہی ہے۔

عبدالملک ابن ہشام کی کتاب التیجان فی تواریخ ملوک حمیر کو تین یمنی نسخے سامنے رکھکر نقل کیا ہے اور اس کی ذیل میں امم بائدہ کے متعلق زید بن شریہ کے ماتبقی روایات ہیں ایک طویل مقالہ میں نے اسلامک کلچر Islamic Culture میں لکھا ہے جس میں اس امر کی توضیح کی گئی ہے کہ یہ دونوں کتابیں لغت عربیہ کے اقدم آثار مدونہ سے ہیں آج کل میں ابن حجر عسقلانی کی کتاب "الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ"، کی تہذیب میں مصروف ہوں میں نے اسے چند نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے ایک نسخہ تو میرا ذاتی ہے اور سخاوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جلد اول کی تہذیب سے میں فارغ ہو چکا ہوں۔

میں نے بہت سے علمی و ادبی مضامین انگریزی اور جرمنی زبانوں میں لکھے ہیں اور جو کم و بیش تمام علمی رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس وقت میرے ہاتھ میں ابن قتیبہ کی کتاب "معانی الشعر الکبیر" کا ایک نسخہ ہے اس کو میں نے دو نسخوں سے نقل کیا ہے ایک تو قسطنطنیہ میں ہے اور دوسرا لندن میں یہ کتاب ایک ہزار صفحہ کی ضخامت کی ہے لیکن کثرتِ اغلاط کیوجہ سے

ماص توجہ کے قابل ہے۔

میں اس وقت اپنی مادری زبان جرمنی کے علاوہ یورپ کی تمام زبانیں جانتا ہوں اور فارسی حمیری ترکی
ہری آرامی بھی کچھ نہ کچھ جانتا ہوں۔

خدائے برترسے میری دعا ہے کہ وہ اپنے فضلِ بیکراں سے مجھے توفیق دے کہ میں نشر "آداب اسلامیہ" میں
نی بقیہ عمر صرف کر دوں۔ فقط

(خدا نے موصوف کی دعا قبول فرمائی اور آپ کی اُمید برآئی آپ آدابِ اسلامیہ کی خدمت کے لیے مسلم یونیورسٹی
ں تشریف لائے ہیں۔)

حبیب احمدؐ (ندوی)

(ضمیمہ د)

رپورٹ بوٹ کلب

(از سید طفیل احمد بی۔ اے۔ سکرٹری بوٹ کلب)

موجودہ بوٹ کلب کی بنیاد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم طاب ثراہ سابق وائس چانسلر نے
ل سے قبل ڈالی تھی۔ ایک ماہرِ فن استاد سید اشرف علی صاحب اس کے سکھانے پر مامور کئے گئے تھے ابتداء میں طالب علموں
، نہایت دلچسپی کا اظہار کیا مگر دوسرے سال استاد موصوف کے انتقال کی وجہ سے یہ کلب چند ماہ کے لیے بند ہو گیا۔

اس کے بعد ہمارے موجودہ استاد سید فضل علی صاحب کا تقرر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب
رمہ نے بیس پچیس استادوں کے امتحان کے بعد کیا استاد موصوف بہت عمدہ کام جانتے ہیں ان کے کام کی
گی کی باعث کلب جس کا بند رہنے کی وجہ سے تمام نظام منتشر ہو گیا تھا پھر بہت جلد اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔
اب اس کا تعلق اسپورٹ کلب سے کر دیا گیا ہے ادہر تو کلب کے بند رہنے کی وجہ سے طالب علموں
وجہ اس طرف سے بالکل ہٹ گئی اوہر اسپورٹ کلب نے خود بجائے اس شعبہ کی سرپرستی کرنے کے بعض
فہمیوں کی بنا پر اس کو ہمیشہ کے لیے یونیورسٹی سے نکال دینے کا تہیہ کر لیا مگر عین اس وقت جبکہ اسپورٹ
نے کاری زخم لگا کر فنِ بوٹ کا جنازہ یونیورسٹی سے نکالنے کا بندوبست کر لیا تھا جناب سر شاہ محمد سلیمان

(ص)

ایکٹنگ وائس چانسلر کی مسیحا نفسی آڑے آئی، فن بنوٹ کے دمِ واپسیں کو بنوٹ کلب کے جسد میں منتقل فرما کر
ایک نئے کلب یعنی ہمارے موجودہ کلب کا ہیولیٰ تیار کیا لیکن قبل اس کے کہ یہ کلب کوئی مستقل شکل اختیار کرتا
موصوف کلب کو نازک حالت میں چھوڑ کر تشریف لے گئے۔ اب اس کے صدر ہمارے قابلِ فخر وائس چانسلر جناب
نواب مسعود یار جنگ بہادر ڈاکٹر سید راس مسعود صاحب ہیں جنھوں نے بکمال تلطف اس قدیم ایشیائی فن کو زندہ
کرنے کے لیے ہر ممکن امداد کا وعدہ فرمایا ہے اور باوجود مشغولیت کے اُمید سے زیادہ شفقت فرمائی۔ پرو وائس
چانسلر صاحب نے ایک جدید سکرٹری کا انتخاب فرما کر کلب کو مستقل حیثیت سے حیاتِ جاوید عطا فرمائی۔ اور وائس چانسلر صاحب
نے مبلغ دو سو روپیہ کا عطیہ اپنے ایک دوست سے جو اپنی اس امداد کو مخفی رکھنا چاہتے ہیں کلب کے لیے حاصل فرمایا۔
اپنے اُن محترم سرپرست کا شکریہ تہِ دل سے ادا کرتے ہیں جن کی غیبی امداد نے ہمارے کلب کے لیے آبِ حیات کا کام
آجکل ہمارا کلب سومنگ باتھ کے شمالی حصہ میں واقع ہے اور جہاں حال ہی میں ہمیں جناب وائس چانسلر
اور پرو وائس چانسلر صاحبان کی مزید عنایات کی وجہ سے اپنے کام کرنے کی اجازت ملی ہے اس سے پہلے یہ کلب
اولڈ اسکول بلڈنگ میں تھا اس کے ٹوٹ جانے کے بعد کوئی معقول جگہ ہمارے لیے نہیں تھی۔

اب کلب کی حالت خدا کے فضل سے قابلِ اطمینان ہو چلی ہے۔ چنانچہ امسال اسپورٹس کے موقع پر
جو بتاریخ ۲۹ جنوری جوبلی گراؤنڈ پر ہوئے ہمارے بنوٹ کلب کا اکھاڑہ بہت کامیاب رہا اور ناظرین اس کے کام
سے بہت محظوظ ہوئے وائس چانسلر صاحب نے آئندہ سال اس کلب کو ایک کپ عنایت کرنے کا وعدہ بھی فرمایا۔
ان ارتقائی منازل کو طے کرنے کے بعد اب یہ کلب اس قابل ہوا ہے کہ وہ اپنے وجود کا اقرار کر سکے اور یہ سب
ہمارے محترم دوست شیخ مجتبیٰ احمد صاحب طالب علم بی ایس سی کلاس کی محنتوں کا نتیجہ ہے جنکو اس کلب کے آنر
سکرٹری ہونے کا فخر حاصل ہے انھوں نے اس کلب کو کامیاب بنانے کی بہت کوشش کی ہے اُن کی یہ محنت قابلِ
شکریہ ہے۔

مجھے قوی اُمید ہے کہ برادرانِ جامعہ اس کلب کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے اور اپنی دلچسپی
سے اس قدیم ایشیائی فن کو زندہ رکھنے میں اس کلب کی پورے طور پر مدد کریں گے۔

چند مخطوطات سبحان اللہ کتب خانہ

نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
تفسیر حسینی (مکمل) یعنی مواہب العلیہ	حسین واعظ کاشفی (مرتب کا نام معلوم نہیں)	×	سنہ ۹۹۱ھ	۶۲۰	مصنفہ سنہ ۸۹۹ھ۔ انیسویں صدی عیسوی سے قبل کا نسخہ ہندوستان کے دوسرے کتبخانوں میں نہیں ہے۔
تفسیر حسینی از سورۂ نحل تا آخر	حسین واعظ کاشفی	×	سنہ ۱۰۶۶ھ	۳۷۵	یہ نسخہ سلطان شجاع کے کتبخانہ کا ہے۔ آخر میں بہار الدین راجو خوند میر الحسنی کی تحریر ہے۔
روح الجنان (تفسیر شیخ ابو الفتوح رازی جزو ثانی	علامہ ابو الفتوح رازی	×	×	۷۰۸	کمیاب
الفرع النابت من اصل الثابت	میر محمد یوسف بلگرامی	×	سنہ ۱۱۶۲ھ	۷۰	بخط مصنف
شرح التعرف	×	عبد الباقی بن فضل اللہ	سنہ ۹۹۵ھ	۳۶۲	
انتخاب از اختیارات بدیعی	علی بن الحسین الانصاری المعروف بحاجی زین الدین عطار	حسن علی المشہو بصبوری	سنہ ۸۸۸ھ	۲۴۷	ایک سالہ لغات طب شامل جلد ہے۔
دیوان خواجہ حسن دہلوی (ایک ورق اول و آخر غائب)	خواجہ امیر نجم الدین حسن دہلوی بن خواجہ علاء الدین سیستانی المتوفی سنہ ۷۲۷ھ	×	×	۱۹۲	
دیوان ظہوری	ملا نور الدین ظہوری ترشیزی	۔	۔	۱۹۴	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
۹	دیوان حالی	حالی سبزواری	×	سنہ ۱۰۹۰ھ	۸۷	کمیاب غیر مطبوعہ
۱۰	دیوان صائب	مرزا محمد علی صائب صفہانی	×	×	۳۶۶	نسخہ زمانہ مصنف
۱۱	دیوان فلکی شروانی	فلکی شروانی	شیخ ہارون	×	۶	
۱۲	دیوان خاجو	خاجو کرمانی	×	×		
۱۳	دیوان شاہ نعمت اللہ المتوفی سنہ ۸۳۴ھ بعض کتب میں سنہ ۸۲۷ھ درج ہے	امیر نورالدین سید نعمت اللہ ولی بن سید عبداللہ بن محمد الکرمانی	×	×	۳۷۰	اصل دیوان کے صفحہ اول پر شاہی کتابداروں کے جائزے درج ہیں۔
۱۴	دیوان قاسم	سید معین الدین علی معروف بقاسم انوار تبریزی المتوفی سنہ ۸۳۷ھ	×	×	۲۰۴	
۱۵	دیوان صائب	مرزا صائب اصفہانی	بخط مصنف	سنہ ۱۰۸۳ھ	۱۸۱	بخط شفائی یہ نسخہ ہذا میں سن کتابت سنہ ... درج ہے۔ خزانہ عامرہ میں سن وفات سنہ ... درج ہے
۱۶	دیوان امیر شاہی (آخر ناقص)	آقا ملک بن جمال الدین امیر شاہی السبزواری المتوفی سنہ ۸۵۷ھ خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی			۵۰	
۱۷	دیوان عمادی	عمادی (شہریاری غالباً)	شیخ ہارون	×	۸	
۱۸	قصائد کمال اسمٰعیل اصفہانی	کمال اصفہانی		سنہ ۹۹۲ھ	۱۵	آخر میں "فضل اللہ بندہ شاہجہان" کی مہر ہے۔ اس میں دو اوراق ترجیع بند بھی شامل ہیں۔ جس کے ابتدا میں جواہر سنگھ سنہ ۱۱۶۹ھ کی مہر ہے۔
۱۹	خمسۂ نظامی بالتصویر	مولانا نظامیؒ	حسین عبداللہ	سنہ ۸۷۳ھ	۱۴۴	نسخہ نادر الوجود و جلیل القدر۔ نہایت قدیم

شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
۲	مثنوی مولانا روم مکمل	مولانا جلال الدین رومی علیہ الرحمۃ المتوفی سنہ	×	سنہ ۱۰۰۹	۳۹۸	خوش خط ـ بعنوانات وجداول مطلا ـ
۲	" " " " "	"	×	سنہ ۹۰۰ھ	۳۲۵	
۲	نسخہ ناسخہ مثنویات سقیمہ	مرتبہ عبداللطیف بن عبداللہ العباسی المتوفی سنہ ۱۰۴۹ھ	×	سنہ ۱۰۶۲	۵۶۴	نہایت اہم و نادر نسخہ ـ مدت تک سفر کیا اور مثنوی کو جمع کرکے شایع کیا ـ
۲	چہل رسائل جامی	مولانا جامیؒ	×	سنہ ۹۰۳۰۶۴	۶۰۳	
۱	نسخہ گلستان	شیخ سعدی شیرازی	×	سنہ ۶۶۲ھ	۶۴	آخر میں لکھا ہوا ہے "نسخہ اولی بخط مصنف"
۱	شرح مثنوی معنوی	مولوی شکر اللہ	×	سنہ ۱۲۱۷ھ	۲۲۰	
۱	لطایف الحدائق من نفائس الدقائق یعنی شرح حدیقہ حکیم سنائی مصنفہ سنہ ۱۰۴۲م	سید عبداللطیف بن عبداللہ مرتب و مصحح و شارح مثنوی معنوی المتوفی سنہ ۱۰۴۸ھ	محمد فاضل	×	۲۵۷	سنہ ۱۲۸۲ء میں طبع ہو چکا ہے ـ انگلستان اور انڈیا آفس میں اس کے نسخے بطور نوادر محفوظ رکھے گئے ہیں ـ
	شرح مثنوی معنوی ـ جزو اول	مولانا عبد العلی بحر العلوم	×	×	۲۲۷	
	شرح مثنوی معنوی دفتر اول	مولانا بحر العلوم	×	×	۱۸۰	
	" " دفتر دوم	"	×	سنہ ۱۲۶۴ھ	۱۲۰	
	" " دفتر سوم	"	×	×	۱۵۰	
	" " دفتر چہارم	"	×	×	۱۳۵	
	" " دفتر پنجم	"	×	×	۸۲	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
۳۳	شرح مثنوی معنوی دفتر ششم	مولانا بحر العلوم	×	×	۷۲	
۳۴	ترجمان القرآن	میر سید شریف	×	سنہ ۹۰۲ھ	۸۹	سنِ کتابت مشتبہ ہے۔ غالباً سنہ ۹۲۰ھ تھا اور ہندسہ کو صفر بنا دیا گیا ہے تاکہ یقینی ہو کہ جامی کے ہاتھ کی نقل ہے جیسا کہ آخر کتاب پر کسی نے دعوی کیا ہے۔
۳۵	لطایف اللغات (فرہنگ لغات مثنوی شریف)	سید عبد اللطیف۔ مرتب و مصحح مثنوی معنوی	×	سنہ ۱۲۲۵ھ یا سنہ ۱۲۳۰ھ	۲۸۸	
۳۶	روضۃ الاحباب جلد اول	عطاء اللہ بن فضل اللہ الملقب بہ جمال الحسینی المتوفی سنہ ۱۰۰۰ھ	×	سنہ ۹۹۹ھ	۳۵۴	نسخہ زمانۂ مصنف
۳۷	انتخاب روضۃ الاحباب (مقصد دویم)	×	×	سنہ ۱۰۰۰ھ	۱۹۶	مولف روضۃ الاحباب یعنی عطاء اللہ حسینی کے زمانہ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ اور غالباً اسی نسخہ کا بھی مرتب ہے۔
۳۸	تاریخ سلاطین آل سلجوق (مختصر راحت الصدور)	×	×	سنہ ۹۹۸ھ	۳۳	خوشخط۔ ورق آخر کے دوسرے صفحہ پر شاہی کتاب خانہ کے جائزے ثبت ہیں اور عہد عالمگیری کی ایک مہر بھی ڈال صفحہ کے دائیں حاشیہ پر دو مہریں اور بھی ہیں لیکن صاف نہیں
۳۹	تاریخ جہاں کشا جزو اول و دویم و سویم	محمد الجوینی المتوفی سنہ ۶۸۳ھ	×	سنہ ۹۹۸ھ	۱۶۴	
۴۰	کتاب صحیح الاخبار	محمد عاقل ابن سید خان جہانی	×	×	۲۰۶	عہد فرخ سیر بادشاہ کی تصنیف ہے اور یہ نسخہ اسی بادشاہ کا ہے صفحہ اوّل پر شاہی کتاب خانہ کا جائزہ درج ہے جو سنہ [illegible] ہجری کا ہے آخر میں یہ تحریر ہے "[illegible] سنہ فرخ سیر بادشاہ صحیح شدہ"

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
۴	...ج النبوت (مکمل)	معین ابن الحاج محمد الفواتی	×	×	۲۹۴	
۴۰	تذکرۃ المبارکۃ - ابتدائی دو ورق نہیں ہیں)	علائی (اصل نام نہیں معلوم ہوا)	×	×	۲۰۱	نایاب ورق ۱۱۱ کے دوسرے صفحہ پر ایک مہر جو لطف اللہ بن یعقوب کی ہے یعقوب ایک حاکم امیر علی شیر کے زمانے میں تھے۔ مؤلفہ ۹۰۲ھ بعہد امیر علی شیر۔
۴۱	ترجمہ سیرت ابن اسحاق مشہور بہ سیرۃ النبی - ج۔ اول	×	×	×	۲۳۰	نایاب ۹۸۵ھ کے نسخہ کی نقل ہے
	ج ثانی	×	×	×	۹۱	
	ج ثالث	×	×	×	۱۱۷	
۱	دیوان ولی	ولی دکنی	چیت سنگھ	۱۱۸۵ھ	۷۰	ابتدائی چند اوراق نہیں ہیں۔
۱	دیوانِ ناسخ	شیخ امام بخش ناسخ	×	۱۲۳۴ھ	۶۶	
۱	دیوان داغ	نواب مرزا المتخلص بہ داغ	محمد کرامت اللہ خاں	۱۲۷۴ھ	۱۴۹	
	نظم امیر شاہی	×	×	×	۴۷	خوشخط۔ بیک عنوان مطلا۔ عطیہ مسٹر بلی ریذیڈنٹ لکھنؤ بہ نواب اقبال الدولہ تصنیف ۱۲۱۶ھ
	مثنوی بوستانِ خیال	سید شاہ سراج الدین حسینی دکنی سراج	×	×	۴۳	نایاب مصنفہ سنہ ۱۱۲۶ھ
	الحمرا (بزبان انگریزی مصور تصویریں میں عمارات کے اصلی رنگ دکھائے گئے ہیں)	البرٹ۔ ایف۔ کارلوٹ	×	×	×	نایاب۔ مطبوعہ سنہ ۱۹۰۳ء
	شفا (مکمل)	شیخ الرئیس بو علی سینا	محمد حسین مشہدی	۱۰۷۱ھ	۵۹۱	بعنوان و جداول مطلا۔ ورق اول کے صفحہ اول پر محمد شاہ غازی کے زمانہ کی مہریں ہیں اور شاہی کتابت اور ان کے دو عائدے ثبت ہیں صفحہ آخر کے آخر میں بھی دو مہریں ہیں ایک رضا محمد خاں کی ۱۲۲۳ھ اور ایک مسخ شدہ۔ نسخہ نادر الوجود۔ خط نستعلیق۔ نہایت پاکیزہ
	تلخیص الشفا	علامہ فضل امام خیرآبادی	بخط مولف	۱۲۱۷ھ	۲۱۹	نستعلیق شکست

نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
قرآن شریف	•	•	•	•	نجط ثلث۔ یہ قرآن مجید سنہ ۱۰۹ میں ہرات سے اورنگ زیب عالمگیر کے لئے ہدیۃً بھیجا گیا تھا
حمائل شریف	•	•	•	•	جدول وعلامات آیۃ مطلا۔ بکیریں بین السطور زریں حاشیہ پر ابین سیاہ خطوط بنقوش زریں۔ ہر سورۃ عنوان مطلا۔ نام سورہ برنگ سفید۔ خوشخط بخط ایرانی عنوان اور ساتوں منزلوں پر نہایت عمدہ بیسیت ہے۔ بخط نسخ نہایت اعلیٰ نسخہ۔
حمائل شریف	•	•	سنہ ۱۰۹۲ھ	•	بہت خوشخط باریک خط۔ خط نسخ شروع میں دو عنوانات مطلا ومنقش۔ سورتوں کے نام زریں۔ جدول زریں۔ علامت آیہ زریں کاغذ مثل بھوج پتر۔ کاتب مہر محمد ولد میر علی اکبر دستجردی برخواری تقطیع مختصر۔
جزو قرآن شریف (سورۂ فاتحہ وسورۂ بقر)	•	•	•	•	بخط کوفی بر چرم آہو۔
اسئلۃ القرآن واجوبتہا	محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الرازی المتوفی سنہ ۶۶۰ھ	•	•	۱۸۶	نسخۂ قدیم۔ کمیاب۔ نستعلیق
رسالہ متعلق برموز القرآن	علامہ صدر الدین شیرازی	ابن اسمعیل	سنہ ۱۲۲۴ھ	۱۱۲	بخط ایران نسخۂ نادرہ نستعلیق
تفسیر در منثور جلد ثانی	علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ	محمد احمدی	سنہ ۱۲۳	۴۲۲	نسخہ نادر الوجود نستعلیق۔

نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
درمنثور۔ جلد ثالث	علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ	محمد احمدی ابن قاضی سعدی بکری	سنہ ۹۸۸ھ	۲۹۶	قدیم ترین نسخہ۔ نادرالوجود۔ نسخ
درمنثور جلد رابع	″	•	سنہ ۱۰۳۸ھ تقریباً	۵۲۵	نسخہ نادرالوجود نستعلیق۔
تنزیل (تفسیر بیضاوی) شیہ	قاضی ناصرالدین ابوسعید عبداللہ بن عمر البیضاوی والشافعی المتوفی سنہ ٦۸۵ھ	محمد علی بن محمد الصراف	سنہ ۱۱ھ	۲۷۳	حرم شریف نبوی میں کتابت ہوئی۔ آیاتِ قرآنی سرخ۔ نسخ
لبیان لعلوم القرآن اوّل تا جزو سادس	رضی الدین ابوعلی الفضل الطبرسی	عزت اللہ عباسی	سنہ ٦ھ لغایۃ سنہ ۱ھ	۳۲۷	نسخہ قدیم۔ خوشخط۔ ہر جزو کا عنوان مطلا و منقش۔ جدول زریں۔ نسخ
کشاف۔ نصف اوّل	جاراللہ محمود زمخشری	عوض محمد ابن الیاس بخاری	سنہ ۱۰۰٦ھ	۴۷۱	نسخ خوشخط۔ جدول زریں۔ صفحۂ اول و صفحہ دوم پر ایک ایک مہر ہے۔ عبارتِ مہر صفحۂ اوّل "بر اعدائے دین شد مظفر حسین"۔ آخر میں بھی دو مہریں ہیں اور محمد عسکری ابن عبدالہادی کی تحریر ہے۔ مورخہ سنہ ۱۱۸٦ھ۔ شروع میں دو عنوانات زریں منقش۔
ہدی از آخر سورۂ بنی اسرائیل تا ناس (بزبان عربی و فارسی)	علامہ زاہد ہروی	×	۵۲۲		نایاب۔ بخط نسخ۔ اللہ کا لفظ ہر جگہ مطلا۔ علامات آیہ مطلا۔ آیات قرآنی بخط جلی بطرز خط بہار۔ آخر کے چند اوراق بعد کے لکھے ہوئے ہیں۔ ان جدید اوراق کے کاتب نے نسخہ ہذا کو تفسیر زاہدی کی جلد ثانی لکھا ہے۔ جدول حوض و حاشیہ سرخ و فیروزی۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نام کاتب	سن کتابت	تعداد اوراق	کیفیت
۶۵	تفسیر بیضاوی محشی	قاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر البیضاوی الشافعی	۰	۰	۵۰۵	خوشخط و مطلا۔ نہایت اعلیٰ نسخہ۔ بیک عنوان مطلا و منقش۔ شروع کے دو صفحے مطلا۔ سورتوں کے نام زریں۔ جدول حوض حاشیہ زریں خط نسخ خفی بہت پختہ کاتب تقی بن ابی بکر بن محمد المشہور بمیر حاج الفرد ہی
۶۶	تفسیر بیضاوی	"	۔	۔	۵۱۵	خوشخط مطلا۔ نہایت اعلیٰ نسخہ بیک عنوان مطلا و منقش اول دو صفحے مطلا۔ جدول حوض حاشیہ زریں آیات قرآنی سرخ نستعلیق۔

اسی طرح علمِ حدیث، اصول حدیث، رجال، فقہ، فتاویٰ، اصول فقہ، کلام، خلافیات، مواعظ و خطب، تصوف، ادعیہ، اعمال، حساب، فلکیات، طب، لغات، تشریح الابدان، علم الامراض و معالجات، نظم، دواوین، قصاید، نثر، صرف، نحو، معانی و بیان، تقصص، انشا، تاریخ، سیرت وغیرہ کی صدہا نادر الوجود کتب ہیں۔ اس کے علاوہ خوشنویسوں کے بہترین کتبہ جات، دستی تصاویر اور شاہانِ مغلیہ کے فرامین ہیں۔

فرامین (۱) اصل فرمان جلال الدین اکبر بادشاہ بنام حبیب اللہ کمال صاحب مورخہ ۲۲ شعبان ۹۷۹ھ

(۲) اصل فرمان (محمد شاہ بادشاہ) اعلان تقرر مولوی فقیہ اللہ ولد مولوی اللہدیہ بمنصب افتا، بلدہ سرکار لکھنو مورخہ ۱۲ شعبان سنہ جلوس

(۳) اصل فرمان جلال الدین اکبر بادشاہ

(۴) اصل فرمان شاہجہاں بادشاہ بنام شاہ بیگ مورخہ ۲۰ ربیع الثانی سنہ ۲۶ جلوس مطابق سنہ ۱۰۶۳ھ

کتبہ جات ۔ ۴۳ نادر کتبہ جات ہیں (ایک ناخن سے لکھا ہوا ابھرے ہوئے حروف) نہایت خوشخط اور نوشتہ آغا مرزا، نوشتہ محمد امیر، نوشتہ عطارد رقم، نوشتہ جواہر رقم، نوشتہ یاقوت رقم، نوشتہ امام یزدی مخصوص ہیں۔

تصاویر ۔ تصاویر دستی ۔ چھ عدد

رُباعیات

افزوں تپشِ قلب و جگر ہوتی ہے ہاں! کوچ کی اب گرم خبر ہوتی ہے
ظاہر ہوئے سر پہ ناصری موئے سفید بس سو چکے جاگو کہ سحر ہوتی ہے

ایضاً

دنیا میں رہے تو بس یہ توقیر ملی پیری آئی۔ سحر کی جاگیر ملی
وہ زورِ شباب اور یہ ضعفِ پیری اللہ! وہ خواب! اور یہ تعبیر ملی!

ایضاً

کثرت عصیاں کی دل کو تڑپاتی ہے اور باغِ شباب میں خزاں آتی ہے
توبہ کرلو کہ رات ہوتی ہے ختم پچھلے کی دعا قبول ہو جاتی ہے

ایضاً

رشتے جو شباب سے ہمارے ٹوٹے ٹانکے دلِ مجروح کے سارے ٹوٹے
گرنے لگے دانت۔ لو! قیامت آئی ہاں صبح قریب ہے کہ تارے ٹوٹے

مہدی حسین ناصری

علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی

(تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے۔ مدیر)

یہ نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا
جوبلی میں وہ ماجرا دیکھا

قوم سے جس نے کردیا بیزار
بن گئے ہم تو نقش بر دیوار

اتنے بہروپیے نظر آئے
اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے

چال انگریزی ڈھال انگریزی
جسم کا بال بال انگریزی

جسم ہندی میں جان انگریزی
منہ کے اندر زبان انگریزی

گفتگو میں بنی ہوئی آواز
بات کرنے کا مغربی انداز

اپنے لہجوں سے ہاتھا پائی تھی
حلق کی ساخت سے لڑائی تھی

چھل رہا ہے گلہ تو چھل جائے
لہجہ "صاحب" سے اپنا مل جائے

پوششیں مغربی اماموں کی
صورتیں مشرقی غلاموں کی

جوشؔ پنجاہ سالہ جوبلی کا
آپ سمجھے کہ ماجرا کیا تھا

یہ دکھانا تھا دیکھو بڑھ گئے ہم
سوئے نصرانیت پچاس قدم

جوشؔ ملیح آبادی

بالشویزم

یورپ کے اربابِ حل و عقد جس گتھی کو سلجھانا چاہتے ہیں وہ اور اُلجھ جاتی ہے کہیں وہ موجودہ تمدن سے
ر جنگلوں میں بستے ہیں. کہیں لامذہبی کو عین ترقی اور روشنی کا آلہ خیال کرتے ہیں! ور کہیں مزدور پیشہ
عت اور مفلوک الحال عوام کی بہبودی کے لیے کمیونزم اور بالشویزم کے زیرِ عنوان اصول مرتب کرتے ہیں
مادّیت کے اصول اُن کی ایک نہیں چلنے دیتے اور اُن کو اپنی بے بسی اور لاچاری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے
ہب سے بیگانگی کی وجہ سے وہ قانونِ قدرت کے رمز شناس نہیں ہونے پاتے۔ کمیونزم اور بالشویزم
ہم نظامِ اشتراکی کہہ سکتے ہیں۔ جس کا مطلب سرمایہ داری کی بیخ کنی اور جمہوریت و اشتراکیت کی نشوونما
ہے۔ اس کے اصول کے مطابق زمین املاک اور اسباب معاشیت کو چند افراد و اشخاص کے انتظام و ملکیت
ں نہیں چھوڑا جائے گا۔ بلکہ کم و بیش ہر شخص کو اُس سے مستفید ہونے کے مواقع بہم پہونچائے جائیں گے۔ اور
تی ملکیت کو عام کر دیا جائیگا۔ اس کا نام اشتراکیت رکھا گیا ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ ہر شخص آزاد رہے

زمانۂ وسطیٰ میں یورپ تاریکی، ظلمت اور قعرِ مذلّت میں پڑا ہوا تھا۔ وہاں استبدادیت کا دور دورہ تھا
راہ چین کرتے تھے۔ غربا اور عام لوگ مزدوری اور کاشتکاری کرتے کرتے تھکے جاتے تھے اُن کا کام تھا کہ
ن اور رات محنت مشقت کر کے امرا اور دولت مندوں کی دولت میں اضافہ کریں۔ اور جو ظلم امرا کی طرف
سے اُن پر کئے جائیں اُن کو ٹھنڈے دل سے برداشت کریں نہ اُن کو اپنی محنتوں کا صلہ مانگنے کی اجازت تھا ور
ی کام سے انکار کرنے کا حق حاصل تھا۔ وہ غلاموں کی طرح زندگی بسر کرتے اور امیر لوگوں کے احکام کے
مد بنے ہوئے تھے۔ الغرض غریب مصیبتیں جھیلتے جھیلتے تنگ آ گئے تھے۔ آئے دن کی لڑائیوں سے یورپ کی زمین
لہ زار بنی ہوئی تھی۔ کوئی دن چین اور آرام سے نہیں کٹتا تھا۔ خدا خدا کر کے احساسِ خود داری لوگوں میں پیدا
دا۔ اور جوں ہی ۱۷۹۳ء میں ہنگامۂ فرانس ختم ہوا مصلحین کی ایک جماعت اس ظلم و ستم کی روک تھا

طرف متوجہ ہوئی۔ ان ہی میں ایک "کرل مارکس" تھا جس نے خرابیوں کو دور کرنے کے لیئے دو اصول مرتب کئے

(۱) موجودہ نظام کو برباد کرکے تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنا

(۲) ذاتی ملکیت کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ حکومت خود دولت کی پیدائش و تقسیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور ہر شخص کو کام کے لیے مجبور کیا جائے

کرل مارکس کی اس جدوجہد کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ جرمن میں دارالامرا کی طاقت منتقل ہو کر دارالعوام میں آگئی۔ اور آخرالذکر ایوانِ عوام کی نیابت کا مرکز بن گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہی واقعات انگلستان۔ امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی پیش آئے۔

لیکن روس کی حالت ان سب سے جدا تھی وہاں زارِ روس کی مطلق العنانی اور نمرودیت کا دور دورہ تھا۔ اس کے قلم کی جنبش قہرِ الٰہی سمجھی جاتی تھی۔ مال و جائداد کو ضبط کر لینا، قتل کرا دینا اور سزا پانے والوں کو سائبریا کے لق و دق بے برگ و بار حصّوں میں بطور مجرم کے بھیج دینا ایک عام بات تھی۔ زار کا ظلم و ستم نہ تھمنے والی رَو کی طرح دن بدن بڑھ رہا تھا۔ وہ طاقت و حکومت کے زعمِ باطل میں انسانوں کی گردنوں کو گاجر، مولی سے زیادہ وقعت نہ دیتا تھا۔ اس بیجا ظلم و ستم اور تشدد کو برداشت کرتے کرتے لوگ عاجز آ گئے تھے۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا عاجزا اور اطاعت شعار باشندے استبدادیت کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ مگر اس کے ساتھ روسیوں میں آزادی کا جذبہ پوری طرح راسخ ہوتا جاتا تھا۔ سائبریا میں جلاوطن ہونے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچ گئی تھی گرفتاریوں اور قتل و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا تھا کہ جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اور آزادی کی تحریک نے غلبہ پا لیا۔ زار کی حکومت کے ٹکڑے ہو گئے۔ لینن اور ٹراٹسکی کے رہنمائی میں کام شروع کر دیا گیا اور بالشیو کی حکومت قایم ہو گئی۔ یہ حکومت پیدائش و تقسیم کا انتظام خود کرتی ہے۔ یہی وہ حالات ہیں جن کی وجہ سے اشتراکیت کا جذبۂ عام پیدا ہوا

مگر دیکھنا یہ ہے کہ دنیا ان اصولوں پر چل بھی سکتی ہی یا نہیں اور آیا یہ اصول فطرتِ انسان سے کچھ مناسبت بھی رکھتے ہیں؟ پہلے تو اس پر نظر کرنی چاہیئے کہ انسان اپنی محنتوں سے پیدا کیا ہوا مال و اسباب، دولت و جائداد دوسروں کو کیوں دے سکتا ہے۔ مثلاً دو شخص ہیں ایک تعلیم حاصل کرتا ہی، محنت و مشقت کرتا ہی، اپنے

ماغ کو نئی نئی ایجادات کی طرف لگاتا ہے اس سے کام لیتا ہے جس کی وجہ سے دولت حاصل کرتا ہے۔ ایک
وسرا شخص ہے جس کی ذہنی اور دماغی حالت ٹھیک نہیں، اگر ہے بھی تو وہ اس سے کام نہیں لیتا۔ وہ تعلیم حاصل
نہیں کرتا یا محنت مزدوری سے جی چراتا ہے اور اس نے وہ اہلیت پیدا نہیں کی جو اوّل الذکر نے حاصل کی ہے
پہلا اگر بہت بڑا سائنس داں، انجینیر، ڈاکٹر، مدبر یا مذہبی آدمی ہے اور دوسرا ان خواص کے بالکل برخلاف ایک
معمولی دستکار، دوکاندار، یا احدی ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں کے ذرائع آمدنی میں کس قدر فرق ہوگا۔ اوّل الذکر
کی ماہوار آمدنی ہزار دو ہزار یا چار ہزار اور آخر الذکر کی سو دو سو یا چار سو اگر ہو تو زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا
ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فطرتِ انسانی اس بات کو گوارہ کر سکتی ہے کہ اوّل الذکر آخر الذکر کو اپنی گاڑھی پسینہ
کی کمائی دے دے گا۔ یہ اصول تو فطرتِ انسانی کے بالکل خلاف آکر پڑتا ہے اگر اس کے معنی اشتراکیت کی لغت
میں مساوات ہیں تو یہ مساوات ایک انقلاب کا پیش خیمہ ہوگی یہ مساوات نہیں ہے بلکہ ایک جذبۂ انتقامی
ہے جو سرداروں سے لیا جانے والا ہے اور یہ ان کے ظلم و ستم کی پاداش میں ہوگا۔ مگر اس کو تمام دنیا کے
سامنے بطور اصول کے پیش کرنا ایک خطرناک راستہ کی طرف گامزن ہونا ہے

ہندوستان میں اشتراکیت کا ایک نمونہ

اس اصول کو فطرتِ انسانی کے برخلاف ہوتے ہوئے بھی ہم مانیں گے
کہ ایک چھوٹی اور محدود جماعت اس پر کاربند ہو سکتی ہے جس طرح کہ ناگپور
کے مشہور ہندی باغ میں بوہروں کی نو آبادی کی حالت ہے۔ بادیال باغ
رہ میں پیروانِ رادھا سوامی کی ۲۶ر دسمبر ۲۳ء کی اخبار "البشیر" میں ایچ ایم ملک صاحب بوہروں کے خاص فرقہ کے پیشوا
کے خبر انتقال کی ذیل میں لکھتے ہیں کہ

ہندی باغ کے رہنے والے تجارت بھی کرتے ہیں اور ملازمت بھی۔ تجارت ممالک متوسط سے باہر بھی کی
جاتی ہے۔ لیکن جو کچھ ہندی باغ کے رہنے والے پیدا کرتے ہیں وہ سب اپنے مذہبی پیشوا کے پاس جمع کر دیتے ہیں
کسی کی آمدنی کم ہو یا زیادہ ہندی باغ کے رہنے والوں کو اور ان کے بال بچّوں کو یکساں کھانا دیا جاتا ہے
اور سب ایک سا کپڑا پہنتے ہیں۔ شادی و غم، پیدائش، بیماری اور موت غرض جملہ مصارفِ زندگی مذہبی پیشوا
کے متعلق ہیں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول ہے جہاں دونوں ساتھ پڑھتے ہیں۔ ایک مسجد ہے

ایک ریڈنگ روم ہے، لائبریری ہے، شفاخانہ ہے اور قبرستان ہے، غرض جملہ سامانِ زندگی موجود ہے۔ قومی یا سرکاری کاموں میں جو چندہ دیا جاتا ہے وہ مذہبی پیشوا کے نام سے مشترکہ فنڈ سے ادا ہوتا ہے مذہبی و دنیاوی معاملات میں مذہبی پیشوا کا حکم ہر شخص دل سے مانتا ہے

یہاں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک محدود اور مختصر گروہ کے حالات ہیں جہاں افراد بطور ایک خاندان کے رہتے ہیں اور مذہبی پیشوا کو گھر کا سب سے بڑا ممبر جانتے ہیں مگر یہ رشتہ دنیاوی نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق روحانیت سے ہے۔ وہ اس کو اپنا مذہبی پیشوا جان کر ایسا کرتے ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنا تن، من دھن سب اس پر نثار کر دیتے ہیں اور اس کے احکام کو احکام خدا و رسول جانتے ہیں اور اس کے احکام کے ماتحت ایک نظام میں منسلک ہیں

چند آدمی ایک بات پر ہم رائے ہو سکتے ہیں مگر کروڑوں انسان اگر چاہو کہ اختلاف نہ رکھیں تو یہ ناممکن ہے کیونکہ انسان جس طرح شکل شمائل، عادات و اطوار میں مختلف ہیں۔ اس طرح اپنے خیالات میں بھی مختلف ہیں

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایک چیز ایک ملک کے رہنے والوں کو مرغوب ہے تو یہ ضروری نہیں کہ دوسرے ملک کے رہنے والوں کو بھی وہ ضرور ہی اچھی معلوم ہو گی۔ اس طرح اگر روس میں اس وقت اشتراکیت ہے تو یہ ضرور نہیں کہ ہر خطۂ زمین پر اس کے نتائج ایسے ہی اچھے ہوں گے جس قدر کہ روس میں برآمد ہوئے ہیں شروع شروع میں ہر نئی چیز اور نئی تحریک اچھی معلوم ہوا کرتی ہے مگر تھوڑے عرصے میں جوش و خروش کم ہو جاتا ہے اور اس تحریک یا چیز کے معلوم ہونے پر انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے اور اس طرح کیا عجب ہے کہ اس اشتراکیت کے خلاف روس میں اور کوئی نیا انقلاب برپا ہو جاوے

بہر حال یہ مسلمہ امر ہے کہ یورپ کی اور تحریکوں کی طرح اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی

اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ آج سے تیرہ سو برس پہلے اسلام نے بتا دیا تھا اور جس نے ان شر انگیز خیالات کا سدِباب کر دیا تھا۔ سرمایہ دار تاجر اور غریب سب ایک سی محبت کی زنجیر میں بندھے ہوئے تھے ایک زکوٰۃ ہی اس قسم کی تمام مہلک بیماریوں کا علاج ہے جن کے متعلق خداوند کریم نے کھلے کھلے الفاظ میں متعدد جگہ قرآن شریف میں حکم دیا ہے اور اس کے مصارف کے متعلق بھی سب احکام دیئے ہیں

تبارک الذی ۲۹ سورۃ الدہر - ارشاد ہوتا ہے۔ يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّأَسِيرًا إِنَّمَا
نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا ○

اور خدا کا حُب کر کے محتاج و یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں اور ان کو جتلا بھی دیتے ہیں کہ ہم تو تم کو صرف خدا کا
رکے کھلاتے ہیں۔ ہم کو تم سے نہ کچھ بدلہ درکار ہے اور نہ شکرگزاری۔ غرض زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ خیرات صدقات
بے انتہا ترغیب دی گئی ہے اور اکثر جگہ اس کو ایمان کا عنوان اور ہدایت کی دلیل کہا گیا ہے۔ اس نے
فقر و فاقہ کے دلوں کو حسد و کینہ سے پاک و صاف کر دیا جو ان کو تونگروں اور دولت مندوں سے تھا۔ اور
عداوت کے ان کے دلوں میں محبت کی روح پھونک دی۔ دولت مندوں کو غریبوں اور محتاجوں پر رحم
قت کی تعلیم دی اور اس تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں نے غلاموں تک سے ایسے اچھے برتاؤ کئے ہیں کہ ان
لیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دی جا سکتی ہیں۔ حضرت بلالؓ۔ حضرت حارث۔ غلام بادشاہان ہند ملک عنبر وغیرہ
ت بلالؓ اور حضرت حارثؓ کی جو عظمت مسلمانوں کے دلوں میں ہے کیا وہ کسی آزادی سے کم ہے۔ مسلمانوں
غلاموں کو غلام نہیں سمجھا بلکہ ان کو اپنی اولاد جانا ان کی تعلیم و تربیت اپنے فرزندوں کے ساتھ اپنی نگاہوں
روبرو کی۔ غرض انھوں نے ان کے ساتھ وہ کیا جو وہ اپنے جگر گوشوں کے لئے کر سکتے تھے۔ مگر آج تمدن
ادی کے دور میں امریکہ جیسے مہذب ملک میں قانون "لنچنگ" رائج ہے جس کی رو سے امریکہ کے مہذب
م یافتہ لوگ آزادی کی روشنی میں وہاں کے غلام حبشیوں کو سر بازار پکڑ کر زندہ جلا دیتے ہیں سنگسار
تے ہیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کہاں سکون و اطمینان کی کیفیت پیدا ہوگی اور کہاں بے چینی
کیا امراض تمدن اور اشتراکیت کے لیے اس سے زیادہ مفید اور کوئی دوا ہو سکتی ہے۔ اگر اشتراکیت
ولی طور سے ترقی کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اسلام کے اصول فطرت پر عمل پیرا ہو کر ترقی کر سکتی ہے کیونکہ کوئی
ب یا کوئی شے فطرت کے خلاف ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی

اسد غفور الحق بی۔ اے

غزل

جہانِ ہوش میں ہنگامہ اک بپا کرکے — کدھر گئے مجھے تم صورت آشنا کرکے

نہ پھیر بابِ اجابت سے مجکو تو خالی — تری جناب میں آیا ہوں آسرا کرکے

ہزار ہوش تصدّق کہاں یہ بیہوشی — کہ لائیں ہوش میں دامن سے وہ ہوا کرکے

فراقِ کاوشِ غم میں تڑپ رہا ہوں اب — یہ درد مول لیا درد کی دوا کرکے

ترے خیال نے بجلی کی لہر دوڑا دی — ترے جمال نے نظروں کو آشنا کرکے

یہی تو ہوگا کہ بڑھ جائیگی تڑپ دلکی — ملے گا آپ کو کیا خونِ مدّعا کرکے

فضائے قرب میں پہونچا دی اے اجل مجکو — دکھا دے روح سے قالب مرا جدا کرکے

تڑپ تڑپ کے مرے دل نے کی سحر پیدا — تمام رات گذاری خدا خدا کرکے

کمالِ عجز کا مختار کو کیا مختار

یہ اختیار دیا جبر آشنا کرکے

مختار بدایونی

تعلیم و تربیت کا صحیح مفہوم

انسان نے نباتات وجمادات کی ابتدائی حالت کی طرف بمقابلہ انسانی بچّے کے زیادہ توجہ کی ہے لیکن
کے باوجود اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عام طور پر کثرت رائے اس طرف ہے کہ زندگی کے شروع کے
چھ سال ہی انسانی بچہ کی زندگی کے سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہوتے ہیں کیونکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے
اس کے دماغ میں قبول کرنے کی صلاحیت بدرجہ اولیٰ ہوتی ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "عہدِ طفولیت
وّل چھ سال کسی بچہ کی عمر اِن سے مجھکو دیدو باقیماندہ حصہ جس کا دل چاہے لیلو"

ہر شخص اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اخلاقی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے اور کیریکٹر کا بن جانا بہت
بات ہے۔ صغر سنی میں یہ خیال کرنا کہ بچہ کی ہستی محض جسمانی ہے اور خصوصاً اس وقت جبکہ اس میں
طور پر اثر قبول کرنے کا بیحد مادہ موجود ہوتا ہے۔ انتہائی غلطی ہے! اگر یہ امر بھی بطورِ کلیہ تسلیم کر لیا جائے
آدم و نیز اقوامِ عالم کی ترقی کا انحصار "انسان" کی شخصیت پر ہی ہوتا ہے۔ اور اسی طرح سے انسان
یت کا دارومدار اس کی تربیت پر ہوتا ہے جو اس کو عہدِ طفولیت میں دیجاتی ہے تو ایسی حالت میں
قدر لازمی ولابدی معلوم ہوتا ہے کہ بچہ کو ایسے ماحول میں پرورش پانا چاہئے کہ جو بہتر سے بہتر ہو۔
اعلیٰ وارفع ہو! نہیں معلوم کہ ہم میں سے کس مرد و کس زن کی کونسی زبردست مخفی قوت بچپن کی بے توجہی
پرداخت کی بنا پر زائل ہو گئی ہو! اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایک غیر مکمل بچہ کی ذات میں کون کون سی قوتیں پنہاں
خواہ ایک انسان اپنے خواہشات کا غلام بن جائے یا اپنے نفس پر قابو حاصل کرے اس کا بہت بڑا
مار اس بنیاد پر قایم ہوتا ہے کہ جو اوائلِ عمر میں رکھی جاتی ہے

"بچہ میں جراثیم کی صورت میں وہ تمام مادہ موجود ہوتا ہے جو جوانی میں نمودار ہوتا ہے"۔ لہذا یہ ہمارا کام ہے
دیکھیں کہ یہ قیمتی اجزا جو اس انسانی پودے میں موجود ہیں معقول پرداخت و پرورش نہ ہونے کی وجہ سے

کمھلا نہ جائیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ہم کس طرح سے ان کی نگہداشت کریں؟ فرابل کا طرز تعلیم اس کا تشفی بخش
جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے "ہر انسانی ہستی اپنی روحانی اصلیت میں خدائے جل شانہ کا ایک مخصوص بچہ
بچہ میں الوہیت و انسانیت دونوں صفات موجود ہوتے ہیں لہذا تعلیم کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں
جب تک کہ اس کی روحانیت کی تکمیل نہ ہو جائے

ہربرٹ سپنسر تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے" یہ طیاری ہوتی ہے مکمل اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کی"
ایک دوسری مقالہ نویس "بیرنس وان میرن ہالٹز بولو" کہتی ہے تعلیم کے معنی آزادی ہیں ——
"یعنی یہ کہ ان قوتوں کو توڑ دینا کہ جو جسم اور روح کو پابند کئے ہوں۔ اُس کا خاص مقصد کیرکٹر کا بنانا ہے"

فرابل کی رائے ہے کہ حیاتِ انسانی کا اعلیٰ ترین مقصد اس جز کی تکمیل ہے جس سے انسان میں خدا کی شان
پائی جاتی ہے اور بنا بریں روح کی پرورش کرنا چاہئے کیونکہ یہ ممکن ہے بعینہ اسی طرح سے کہ جیسے جسم و دماغ
کی ساتھ ساتھ نمو ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی ناگزیر تکالیف و گوناگوں مصائب کا اصل سبب یہ ہے کہ روحانی
جسمانی و دماغی ترقی تینوں ایک ساتھ نہیں ہو پاتیں

زمانہ حال کو دیکھتے ہوئے تعلیم دماغی کے لیے وہ سہولتیں پیدا کر دی گئی ہیں کہ جو اس سے پیشتر کبھی نہ
تھیں۔ جسمانی نشو و نما موجودہ نصابِ تعلیم کا ایک لازمی جز قرار دیدیا گیا ہے لیکن جب تک کہ ان کے دوش بدوش
روحانی و اخلاقی تعلیم نہ چلائی گئی تو اس وقت تک یہ انسانی بچہ تکمیلِ حیات کے لیے نہ طیار ہوگا"

فرابل کا قول ہے "انسان خدا کے پرتو سے بنا ہے۔ اس لیے ایک دن اسکا مثلِ خدا ہو جانا یقینی ہے
انسان قدرت کا بچہ ہے۔ ساتھ ہی اس کے اولادِ آدم ہے اور پھر خدا کا بندہ ہے۔ یہ تینوں باتیں اس کے لیے ایک
وقت میں لازمی ہیں۔ اور تعلیم کا مقصد یہی ہے کہ حالتِ طفلی میں ہی اس کو ان تینوں کے باہم رشتہ سے آشنا
کر دیا جائے"۔ زندگی کا ہر جز ایک دوسرے سے پوری طرح منسلک ہونا چاہئے کیونکہ بچپن کی زندگی کا مبارک
مقصد صرف اتحاد و اتفاق ہوتا ہے

فرابل کی ساری تعلیم قانونِ قدرت پر مبنی ہے۔ اس کا یہ کامل عقیدہ تھا کہ جس طرح جسمانی و ذہنی قویٰ

ن قدرت کے مطابق بالیدگی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح روح کو بھی بڑھنا چاہیئے۔ چنانچہ طفولیت کا مطالعہ
ہوئے اس کو اس کا اندازہ ہوا کہ بچہ کو عمل و حرکت کا کسقدر شوق ہوتا ہے۔ کس طرح بچہ اشیاء کو چھو کر
قوتِ ادراک کو کام میں لاتا ہے۔ کس طرح وہ دیکھتا چلا اور سنتا ہے اور اپنی قوتوں سے کام لیتے ہوئے
خوش ہوتا ہے۔ ان باتوں کو دیکھکر فرابل نے یہ رائے قائم کی کہ بچہ کی ان طبعی رجوعات کو راہِ راست
نانے سے کس طرح ان کا معلم ان کو امداد دیو پہنچا سکتا ہے اور ان کی ذات میں متذکرۂ بالا صفات پیدا
نے کی کوشش کر سکتا ہے ایک بچہ کی کوئی نقل و حرکت بے محل و بے مقصد نہ جانے دینا چاہیئے بلکہ بیرنس وان
ن ہالٹ بولو کے قول کے مطابق جانچنا چاہیئے۔ وہ کہتی ہے ہر چیز جو محرک خوشی ہو بچہ کی روح کو اس کی جکڑ
بند سے آزاد کرنے کے لیئے استعمال کرنا چاہیے۔ اس کو اس کی روحانی غذا بنانا چاہیئے اور اس کے ذریعہ
اس کے سامنے ان د[illegible] کو کھول دینا [illegible] اس کو حسن و خوبی و جمال نظر آنے لگے جبتک
ن کا ذ[illegible] تعلیم نہ درست ہوگا اس وقت تک اس کی روح بیدار نہیں ہو سکتی

بچہ کی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب سے کہ اس کو اپنے آس پاس کی اشیاء کی طرف
ہونے لگتی ہے اور وہ ان سے دلچسپی حاصل کرنے لگتا ہے۔ اور فرابل اپنی "مادر پلے و نرسری سانگ" میں
ہر کرتا ہے کہ ماں کس طرح اپنے بچہ کی ترقی میں حصہ لے سکتی ہے عین اس وقت سے جب سے کہ بچہ کو تمیز اور سمجھ
شروع ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچہ کو اس کے طبعی رجحان و ذاتی میلان کے مطابق تعلیم دینا
ہیے اور اوائلِ عمر میں بچوں کے مشاغل صرف ایک طرح ظاہر ہوتے ہیں اور وہ بذریعہ کھیل کے۔ یا دوسرے
ظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ کام کو بچوں کے واسطے دلچسپ بنا دینا چاہیئے کہ وہ اس کو خود پسند کرنے لگیں اور اس
کرنے میں ان کو اتنا ہی لطف آئے جتنا کہ کھیل میں۔ فرابل کو اگر کوئی الہام ہوا تھا تو یہی کہ ایسے طریقے کھیل کے
یاد کرے کہ جو ذریعہ تعلیم بنجائیں اور اسی میں اس نے اپنی ذہنیت کا ثبوت دیا۔ اس نے دیکھا کہ "بچوں کو
وں کی طرح رٹانا اور بڈھوں کے خیالات ان کے دماغوں میں ٹھوسنا دراصل ان کی فطرتی ترقی کو روکنا
" اور اس وجہ سے سب سے زیادہ بہتر طریقہ تعلیم یہ ہے کہ بچوں کے گرد و نواح میں ایسے معقول حالات پیدا

سکئے جائیں اور اُس کے پاس کی فضا ایسی کر دی جائے کہ جن سے ان کے فطرتی جذبات کو مدد ملے
فرابل بجائے سبق کے رٹانے کے اس کی جگہ "عمل" کو دیتا ہے اور کنڈر گارٹن کے طریقۂ تعلیم
مطابق بچہ کو شروع ہی سے ایک چھوٹی سی عملی دنیا میں بٹھا دینا چاہتا ہے کہ جہاں وہ خود بخود سیکھنے لگے۔ بچہ کو
کرنے کی کوشش کرو کیونکہ "نیکی خوشی کے نام سے پیدا ہوتی ہے" ایسا کرو کہ اچھائی کرنے میں بچہ کو لطف
فرابل اس کا منکر نہیں کہ بدخصلت طبیعتیں ہوتی ہی نہیں لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم بچہ کو اس طرح تعلیم دیں او
کی طرف لگائیں کہ اس کو نیکی کی جانب رغبت ہوتی جائے اور اس کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ نیک ہ
جبکہ نیکی کرنے سے اس کو حظ حاصل ہونے لگے۔ ایسی حالت میں بچہ کو انتہائی انبساط حاصل ہونے لگتا
اور خصوصاً اس وقت جبکہ وہ اپنی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ وہ بھی ایسے کام
کہ وہ بچپن کے لحاظ سے تو کھیل ہی ہوتا ہے مگر منضبط اصول کے تحت میں۔

"بچپن کے کھیل آیندہ زندگی کی جان ہوتے ہیں" انھیں سے بچہ کے دل کے اندر کی حالت اور فط
کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ بچہ جو خوب دل لگا کر کھیلتا ہے وہی بڑھ کر ویسے ہی دل لگا کر زندگی میں کام کر
ہے" دنیا کی تمام نیکیوں کا خزانہ تفریح ہی میں چھپا ہوا ہے"۔ اب دیکھنا چاہیے کہ فرابل نے کھیل کو کس ط
تعلیم کا آلہ بنا لیا؟ اس نے غور کیا کہ بچوں کو مٹی سے کھیلنے کا کتنا شوق ہوتا ہے اس لیے اس نے ان کو کلی مادہ
بنانے کو دی۔

اس نے دیکھا کہ وہ کس قدر غور سے اپنے کھلونوں کو دیکھتے ہیں اس کی تحقیق و تجسس میں رہتے ہیں کہ کسی ط
سے ان کو توڑ پھوڑ کر یہ معلوم کریں کہ ان کے اندر کیا ہوتا ہے۔ اور اسی اصول کی بنا پر اُس نے ڈیوائیڈیڈ کیو
کا اختراع کیا۔

بچوں کو گھر بنانے اور عمارتیں طیار کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لیے اس نے ان کی ساخت کے لیے سامان
مہیا کیا۔ ان کو رنگوں سے دلچسپی ہوتی ہے اس لیے اس نے مثل اور خواہشات کے اس کو بھی پورا کیا۔ ان کو لکیریں
کھینچنے اور شکلیں بنانے کا شوق ہوتا ہے اس لیے کنڈر گارٹن طرز تعلیم میں نقشہ کشی یا ڈرائنگ کے اصول بھی داخل

کرتے اور چونکہ بچوں کو باجوں کی آوازیں اورگیت بہت بھاتے ہیں اس لیے یہ بھی فرابل کے کھیلوں کی فہرست میں داخل کئے گئے۔ پھر ان سے یہ بھی دیکھا کہ بچوں کو گھر کے باہر رہنے کی کتنی دُھن رہتی ہے اس لیے وہ اپنے کنڈرگارٹن کے بچوں کو کھیتوں اور جنگلوں میں بھی گھمانے کے لیے لیجاتا اور اس طرح سے ان میں بچپن ہی سے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے کا مادہ پیدا کرا دیتا۔ فرابل کا قول تھا کہ "کائنات کی ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آسکتا ہے"۔

فرابل نے ایک بار مشاہدہ کیا کہ ایک یک سالہ بچہ کی نظر ایک گھومتے ہوئے گیند کو دیکھتے دیکھتے گیند میں بندھے ہوئے دھاگے پر جا پڑی اور وہاں سے رفتہ رفتہ ہٹکر اس ہاتھ تک پہونچ گئی جو اس کو گھما رہا تھا۔ بالکل اسی طرح سے قدرت کے تماشے ہیں جن کو کہ بچہ دیکھتا ہے اور ان کے اسباب وعلل معلوم کرنے کی فکر کرتا ہے

وہ سوال کرتا ہے کہ "آخر ان خوشنما پھولوں میں کس نے رنگ بھرا ہے"؟

یہ آب وتاب والا چمکتا سورج کس نے بنایا ہے" ہاں اے پیارے بچہ ان سب کا خالق وہی ہے جس نے تجھ کو بنایا اور جس طرح یہ پھول اور سورج کی جھلکتی ہوئی روشنی اس خیال کو ظاہر کرتے رہتے ہیں کہ جس کے لیے وہ پیدا کئے گئے ہیں اسی طرح سے تجھکو بھی چاہئے کہ اس منشائے عظیم کو توضیح کرے جس کے لیے تیری تخلیق کی گئی ہے ہم کو معلوم ہے کہ بچہ کا دل کسقدر جلد باتیں ماننے کے لیے طیار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک بادل کی گرج خدا کی آواز ہے۔ سورج کی روشنی اس کی مسکراہٹ ہے۔ غرضکہ قدرت کی ہر شے میں اس کی خوبیوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بچہ ہر چیز میں اپنے رب کے کرشمے دیکھکر اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ بچہ کو موسیقی کا سب سے پہلا سبق قدرتی آوازوں سے ملسکتا ہے۔ اس کو کسی دریا کے دہارے پر بٹھالدو کہ جہاں پانی کی قلقل بہتوں کی سرسراہٹ بیلوں اور جھاڑیوں کے ہلنے اور آپس میں ٹکرانے کی جھنکار اور مختلف قسم کی سُریلی آوازیں سنائی دیں پھر دیکھو کہ اس پر کیسا وجد طاری ہوتا ہے اور اس کی روح کس طرح ان سب سے ہم آہنگ ہونا چاہتی ہے۔

فرابل کے اصولِ تعلیم میں باغ یا کسی قطعہ زمین کا ہونا لازمی ہے۔ وہ تو ہر کنڈرگارٹن سے ملحق ایک باغ کا رکھنا تجویز کرتا ہے۔ چائلڈ نیچر کی مصنفہ ایک واقعہ بیان کرتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ باغ کی موجودگی

کس قدر کارآمد ثابت ہوتی ہے۔" دو بچوں نے کہ جن کی عمریں پانچ و چھ برس کی تھیں شل دیگر بچوں کے اپنے قطعہ زمین میں کچھ مٹر او چنے بودئے تھے۔ اور آئے دن ان کو کھود کھود کر دیکھتے کہ بیج کیوں نہیں نکلتے۔ پھر ان کو یہ سمجھایا گیا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ بیجوں کو پھوٹتے دیکھیں تو ان کو صبر سے کام لینا چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے تاکہ وہ بڑھیں اور اس وقت تک ان کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ چنانچہ ان بچوں نے انتظار کرنا شروع کیا یہاں تک کہ ایک روز استانی نے کیا دیکھا کہ وہ بچے پھولوں کی کیاریوں پہ جھکے ہوئے بڑے غور و خوض سے خوش ہو کر چت ہرے ہرے انکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ تب اس نے ان سے سوال کیا "کہ ان بیجوں کو کس نے پیدا کیا" بچوں نے جواب دیا "اللہ نے" استانی نے کہا "ٹھیک ہے"۔ "خدا نے سورج کی روشنی کو بھیجا کہ وہ زمین کو گرم کرے اور پانی برسایا کہ وہ زمین کو تر کرے تاکہ پُرنم زمین بیجوں کو نرم کر دے کہ وہ اُگ سکیں۔ اور یہ سب کچھ خدا نے تم کو خوش کرنے کے لیے کیا۔ اب بتاؤ تم اس کو خوش کرنے کے واسطے کیا کرو گے؟ بچوں نے کہا "ہم بہت اچھے بننے کی کوشش کریں گے"، اور سب سے چھوٹا بچہ بول اٹھا میں تو اللہ میاں کو خوش کرنے کے لیے پڑھوں گا تھوڑی دیر بعد دوپہر کے قریب جب وہ سب بیٹھے کاغذ کی رنگین پٹیوں سے چٹائیاں بُن رہے تھے تو استانی نے ان میں سے ہر ایک سے سوال کیا وہ یہ چیزیں کس کے واسطے بنا رہے ہیں تو وہی سب سے چھوٹا بچہ بول اٹھا، میں تو اپنی بنائی ہوئی چیزیں اپنے اللہ میاں کو دونگا۔" اس ادنیٰ سے واقعہ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسقدر آسانی سے ان میں خدا کی محبت۔ اعلیٰ ہمتی و بلند خیالی پیدا ہو سکتی ہے اور کس درجہ خوشی سے بچہ کی طبیعت ان باتوں کو قبول کر سکتی ہے

مظہر علی علوی ایم۔اے

غدرِ شکستِ توبہ

اُن مست انکھڑیوں کی قسم کھا کے پی گیا
جب لہر آگئی کوئی لہرا کے پی گیا

ساقی کی ہر نگاہ پہ بَل کھا کے پی گیا
لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرّا کے پی گیا

اِک شاہدِ خیال کو لپٹا کے پی گیا
باہوں میں باہیں ڈال کے اٹھلا کے پی گیا

میں مست توبہ کرتے ہی پچھتا کے پی گیا
ساغر اُچھال اچھال کے لہرا کے پی گیا

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

سرمستیٔ ازل مجھے جب یاد آگئی
دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

آزردگیٔ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر
مجھکو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

اِس میں مرا قصور نہ ساقی کی کچھ خطا
میں حسنِ اتفاق سے گھبرا کے پی گیا

میں اور شکستِ توبہ بس اب اور کیا کہوں
کیا جانے کس خیال میں گھبرا کے پی گیا

اُس جانِ میکدہ کی قسم بار ہا جگرؔ
کُل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

جگر مرادآبادی

(از مخزن)

غزل

عالم وہ ہی کہ ہوش اب اسے چارہ گر نہیں
کیا پوچھتا ہی درد کدھر ہے کدھر نہیں

ہر جلوۂ مجاز حقیقت بدوش ہی
لیکن ہر آنکھ چشمِ حقیقت نگر نہیں

دل کیا گیا کہ جاتی رہی ساری دل لگی
اب لطفِ نالۂ شب و آہِ سحر نہیں

بجلی سی ایک کوند گئی جلوہ گاہ میں
پھر اس کے بعد کیا ہوا مجھ کو خبر نہیں

آئی بھی وقتِ مرگ جو یادِ خدا تو کیا
جاگے ہم اب کہ وقتِ نمازِ سحر نہیں

سجدے ہیں بیقرار جبینِ نیاز میں
یا سنگِ آستاں نہیں یا آج سر نہیں

اے حُسنِ دوست اور ذرا بے حجاب ہو
جلوے بقدرِ وسعتِ ذوقِ نظر نہیں

ایمن درازیٔ شبِ ہجراں نے کر دیا
اب مجھ کو طولِ روزِ قیامت کا ڈر نہیں

سنتے ہیں دوست ہی رگِ جاں سے قریب تر
اللہ رے بیخودی کہ ہمیں کچھ خبر نہیں

وہ بیخودِ شباب ہیں مستِ شرابِ عشق
میری خبر اُنھیں مجھے اُن کی خبر نہیں

کہتی ہیں چارہ ساز کی ناکامیاں ظفر
آساں سعیٔ بخیۂ زخمِ جگر نہیں

محمد ظفر احمد صدیقی

جنگلی بط

(گزشتہ سے پیوستہ)

چوتھا ایکٹ

(وہی منظر۔ ایک فوٹو لیا گیا ہے، ایک کیمرہ، ایک تپائی دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز کمرے میں رکھی ہے
سورج غروب ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اندھیرا شروع ہو جاتا ہے۔ جمیلہ کھلے ہوئے دروازے
میں کھڑی ہے ایک صندوقچی اور تصویر کا آئینہ ہاتھ میں ہے اور باہر کسی سے باتیں کر رہی ہے)

جمیلہ۔ ہاں اگر میں بھول نہ جاؤں جب میں کسی سے وعدہ کر لیتی ہوں تو اس کو پورا کرتی ہوں ایک درجن تصویریں تو تیرہ روز میں تیار ہو جائیں گی خدا حافظ (نیچے اترنے والے آدمی کے پیروں کی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ جمیلہ کواڑ بند کر لیتی ہے۔ آئینہ کو کیمرہ میں رکھکر صندوقچی میں بند کر دیتی ہے۔ رئیسہ باورچی خانے سے آتی ہے)

رئیسہ۔ کیا وہ چلے گئے؟

جمیلہ۔ ہاں خدا کا شکر ہے کہ نجات ملی۔

رئیسہ۔ اماں جان! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ کیوں ابّا جان ابھی تک گھر نہیں آئے؟

جمیلہ۔ کیا وہ نیچے حکیم جی سے باتیں نہیں کر رہے؟

رئیسہ۔ نہیں وہاں تو نہیں ہیں۔ میں پچھلے دروازے سے ابھی نیچے گئی تھی۔

جمیلہ۔ اور کھانا رکھا ہوا ٹھنڈا اور بدمزہ ہو رہا ہے

رئیسہ۔ ابا جان کو اس قدر دیر! کھانے کے وقت تو وہ ہمیشہ گھر آنے میں بہت محتاط تھے۔

جمیلہ۔ ہاں آتے ہی ہونگے۔

رئیسہ - خدا کرے جلد آجائیں۔ بہت بُرا
معلوم ہوتا ہے۔

جمیلہ (پکارتی ہے) دیکھو آگئے (محبوب اوپر
آتا ہے)

رئیسہ (اُس کے پاس جاکر) ابّا جان ہم مدت
سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں

جمیلہ (اُس کی طرف مُنہ کرکے) آپ کو اتنی
دیر ہوگئی

محبوب خاں (اُس کی طرف دیکھے بغیر)
ہاں زیادہ دیر ہوگئی (وہ کوٹ اُتارتا ہے جمیلہ و رئیسہ
مدد کو آتی ہیں لیکن وہ ہٹا دیتا ہے)

جمیلہ - شاید اختر صاحب کے ساتھ آپ نے
کھانا تناول کرلیا؟

محبوب خاں (اپنا کوٹ ٹانگتے ہوئے) نہیں

جمیلہ (باورچی خانہ کی طرف جاتی ہوئی) تو
کیا میں کھانا لاؤں۔

محبوب خاں - نہیں رہنے دو۔ میں اب
کچھ نہیں کھانا چاہتا۔

رئیسہ (اُس کے پاس جاکر) ابّا جان!
خدانخواستہ آپ کی طبیعت ناساز ہے؟

محبوب خاں - طبیعت ناساز؟ نہیں تو

خدا کا شکر ہے۔ اختر میں اور مجھ میں سخت گفتگو
جمیلہ - آپ کو الگ ہوجانا چاہیئے تھا
خصلت کے خلاف ہے۔

محبوب خاں - آہ بہت سی خلاف
اور نامناسب باتوں کو بھی اس دنیا میں سہنا پڑتا
(ٹہلنے لگتا ہے) کیا میری غیبت میں یہاں کوئی آیا

جمیلہ - سوائے اُن چند آدمیوں کے
کوئی نہیں آیا۔

محبوب خاں - کوئی نیا آدمی نہیں؟

جمیلہ - نہیں۔ آج تو نہیں

رئیسہ - ابّا جان! آپ دیکھیں گے کہ کل
کوئی آئے گا۔

محبوب خاں - ہاں۔ اُمید رکھنی چاہیئے
کل سے میں بہت جاں فشانی سے کام شروع کروں گا

رئیسہ - کل سے؟ کیا آپ بھول گئے
کل کیا دن ہے؟

محبوب خاں - اوہو۔ بالکل ٹھیک
پھر پرسوں۔ آئندہ سے ہر کام میں خود ہی کیا کروں گا
میں نہیں چاہتا کہ کوئی ذرا بھی میری مدد کرے۔

جمیلہ - لیکن اس سے کیا فائدہ؟ اس
آپ کی زندگی اور تلخ ہوجائے گی۔ میں فوٹوگرافی

نام بخوبی کرلیتی ہوں اور آپ اپنے وقت کو ایجاد
یں صرف کرسکتے ہیں
رئیسہ ۔ اور جنگلی بط کے لئے بھی ابا جان
در مرغیوں اور خرگوشوں میں بھی ۔
مجبوب خاں ۔ ایسی بیہودہ باتیں نہ کہو
ل سے میں بالاخانہ پر جا کر جھانکوں گا بھی نہیں ۔
رئیسہ ۔ لیکن ابا جان! بھول گئے آپ نے
مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کل کچھ تقریب ہوگی ۔
مجبوب خاں ۔ یہ ٹھیک ہے تو پھر پرسوں
سے ۔ اور رہا اس منحوس جنگلی بط کی بابت ۔ مجھے
اس کی گردن مروڑ دینے میں بے حد خوشی ہوگی ۔
رئیسہ (چیخ مار کر) جنگلی بط کی !
جمیلہ ۔ کیا تم نے کبھی ایسی بات سنی ؟
رئیسہ (باپ کا ہاتھ کھینچ کر) لیکن ابا جان!
یہ تو میری بط ہے ۔
مجبوب خاں ۔ جبھی تو میں اس کو کچھ
نہ کہوں گا ۔ میرے دل میں طاقت نہیں، قوت نہیں
تمہاری خاطر منظور ہے ۔ لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ
مجھے گردن مروڑ دینی چاہیئے ۔ میں اپنے مکان میں
کسی ایک چیز کا قیام جو اس شخص کے ہاتھ میں رہی ہو
ہرگز گوارا نہیں کرسکتا ۔

جمیلہ ۔ لیکن خدا سمجھ دے یہ تو کل سنا دی تھی
مجبوب خاں (ٹہلتے ہوئے) لیکن پھر بھی کچھ
حق ہوتا ہے ۔ میں بھولا ۔ ہاں یوں سمجھو کہ تقاضائے انسانیت یا
چند مجبوریاں جن سے وہ بغیر اپنی روح پر ظلم کئے عہدہ برآ
نہیں ہو سکتا ۔
رئیسہ (اس کے پیچھے جاتی ہے) لیکن ابا جان
ذرا سوچیئے تو کہ جنگلی بط ۔ غریب جنگلی بط ... !
مجبوب خاں (خاموش رہ کر) میں اس کو
تمہاری خاطر سے زندہ رہنے دوں گا ۔ اس کا بال
بیکا بھی نہ ہوگا ۔ ہاں میں نے کہا کہ میں اس کو
رہنے دوں گا ۔ اس سے بھی زیادہ مصائب کا مقابلہ
کرنا ہے ۔ ... رئیسہ ذرا باہر تو چلی جاؤ ۔ اب کافی
اندھیرا ہوگیا ہے ۔
رئیسہ ۔ نہیں میں تو اب باہر جانا نہیں چاہتی ۔
مجبوب خاں ۔ ہاں تم باہر چلی جاؤ ۔ تمہاری
آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے ۔ یہاں کی ہوا تمہارے لئے
اب مفید نہیں ۔ بہت خراب فضا ہے ۔
رئیسہ ۔ بہت اچھا میں جاتی ہوں اور
تھوڑی دیر ٹہلوں گی ۔ میرا دوپٹہ اور جوتیاں ؟
ہاں وہ تو میرے کمرہ میں ہیں ۔ ابا جان وعدہ کرو
کہ جنگلی بط کو میرے پیچھے کچھ نہ کہوگے ۔

محبوب خاں ۔ اس کا ایک پیسہ بھی نہ گرے گا (اس کو اپنے پاس بلا کر) تم اور میں ۔ رئیسہ ہم دونوں؟ پیاری اچھا اب دوڑ جاؤ (رئیسہ سرہلاتی ہے اور باورچی خانے سے باہر چلی جاتی ہے ۔ محبوب آنکھیں نیچے کیے ٹہلنے لگتا ہے) بیگم!

جمیلہ ۔ ہاں ۔

محبوب خاں ۔ کل سے یا بہتر ہے پرسوں سے میں گھر کا حساب کتاب خود ہی دیکھا کروں گا۔

جمیلہ ۔ تو کیا روزنامچہ بھی اپنے پاس رکھیں گے؟

محبوب خاں ۔ ہاں کم از کم اپنی آمدنی کا حساب ۔

جمیلہ ۔ خدا رحم کرے یہ تو معمولی سی بات ہے ۔

محبوب خاں ۔ مجھے یقین نہیں ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ میں تم کو دیتا ہوں تم اُسے حیرت انگیز طریقے سے خرچ کر دیتی ہو (خاموش کھڑا ہو جاتا ہے اور اُس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) تم کس طرح انتظام کرتی ہو؟

جمیلہ ۔ رئیسہ کو اور مجھے بہت ہی کم درکار ہے

محبوب خاں ۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اباجان نقلوں سے معقول آمدنی ہو جاتی ہے؟

جمیلہ ۔ معقولیت کی بابت تو مجھے کچھ اندازہ نہیں ۔ مجھے معلوم نہیں کہ عام طور پر نقل کرنے پر کیا مل سکتا ہے؟

محبوب خاں ۔ اچھا تو اندازہ سے بتلاؤ کہ کتنا مل جاتا ہوگا؟

جمیلہ ۔ مختلف رقم ۔ اندازہ سے میرا خیال ہے کہ اُن کا ضروری خرچ اور گھر کا خرچ ہوتا ہوگا

محبوب خاں ۔ گھر کا خرچ؟ اور تم نے پہلے کبھی اس کا تذکرہ مجھ سے نہیں کیا

جمیلہ ۔ مجھے خیال نہیں رہا ۔ تو کیا آپ کو یہ خیال تھا کہ ان کا خرچ ہمارے ہی ذمہ ہے؟

محبوب خاں ۔ اور در اصل وہ خرچ اُن کو منیر عالم سے ملتا رہا؟

جمیلہ ۔ جی ہاں ۔ خدا کے فضل سے اُن کے گھر بہت کچھ ہے

محبوب خاں ۔ ذرا لیمپ تو روشن کرو

جمیلہ (روشن کر کے) علاوہ ازیں مجھے خود معلوم نہیں کہ آیا خود منیر عالم صاحب دیتے ہیں یا منیم جی

محبوب خاں ۔ منیم جی کو کیوں بیچ میں لاتی ہو؟

جمیلہ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں محض ایک گمان تھا۔

محبوب خاں۔ اونہہ!

جمیلہ۔ خالو ابا کو نقل کا کام میرے ذریعے نہیں ملا۔ یہ ذرا خیال رہے۔ یہ آمنہ بیگم کا طفیل ہے جب وہ اس گھر میں داخل ہوئی۔

محبوب خاں۔ تمھاری آواز میں استقلال نہیں رہا؟

جمیلہ (لیمپ پر ڈھکّن رکھکر) کیا واقعی؟

محبوب خاں۔ اور تمھارے ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ کیا نہیں؟

جمیلہ (کڑا دل کرکے) مجھے صاف صاف بتا دو کہ اختر نے میرے متعلق کیا اول فول بکا ہے؟

محبوب خاں۔ کیا یہ صحیح ہے۔ کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ منیر عالم میں اور تم میں جب تم اُن کے ہاں ملازم تھیں کچھ تعلق تھا؟

جمیلہ۔ یہ سچ نہیں۔ اُس وقت نہیں۔ یہ درست ہے کہ منیر عالم صاحب میرے پیچھے پڑے رہے اور اُن کی بیگم نے سمجھا کہ ضرور کچھ معاملہ ہے اور ان کے سر پر شیطان سوار ہوا۔ اس مرحومہ نے مجھے ایک منٹ کی بھی مہلت نہ دی۔ وہ عورت ... اور لہذا میں نے ملازمت ترک کر دی۔

محبوب خاں۔ لیکن بعد میں؟

جمیلہ۔ بعد میں میں اپنے گھر چلی گئی اور میری ماں! وہ ایسی عورت نہ تھی جیسا کہ آپ خیال کرتے ہیں۔ اُس نے بہت کچھ مجھ سے اس معاملہ کی کرید کی۔ منیر عالم صاحب اس وقت رنڈوے ہو چکے تھے جیسا آپ کو علم ہے

محبوب خاں۔ پھر کیا؟

جمیلہ۔ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ دریافت کریں؟ اُس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس کی مراد بر آئی

محبوب خاں (ہاتھوں کو بھینچکر) اور یہ میری بچی کی ماں ہے! کس طرح تم اس واقعہ کو مجھ سے چھپا سکیں؟

جمیلہ۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں محسوس کرتی ہوں مجھے بہت پہلے آپ کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا

محبوب خاں۔ تم کو پہلے ہی دن بتا دینا چاہیے تھا۔ تاکہ مجھکو معلوم ہو جاتا کہ تم کس ڈھنگ کی عورت ہو

جمیلہ۔ تو کیا آپ مجھ سے شادی کر لیتے؟

محبوب خاں۔ تم کس طرح خیال کرسکتی ہو کہ شادی ہو جاتی

جمیلہ - نہیں - اور یہی وجہ ہے کہ میں نے اُس وقت بتانے کی جرأت نہیں کی - میں آپ سے بے حد محبت کرنے لگی تھی آپ کو معلوم ہی ہے اور میں یہ اپنے کو بالکل تباہ و ہلاک نہیں کر سکتی تھی -

محبوب خاں (ٹہلتے ہوئے) اور یہ میری بچی رئیسہ کی ماں ہے! اور یہ جاننا کہ اس گھر کی ہر چیز کے لئے میں اُس کا رہینِ منّت ہوں! (ایک کرسی کو ٹھوکر مار کر) میرا کل گھر - ایک بدمعاش آہ! ایک نمک حرام کا عطیہ ہے!

جمیلہ - تو کیا ان چودہ پندرہ برس کی زندگی پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟

محبوب خاں (اُس کے سامنے کھڑا ہو کر) مجھے یہ بتاؤ - کیا تمھیں ہر روز ہر ساعت اس مصیبت پر افسوس نہیں آتا جس میں تم نے مجھکو پھانس دیا ہے؟ مجھے اس کا جواب دو؟ کیا تم کو دراصل حسرت و افسوس کی تکلیف نہیں اُٹھانا پڑی؟

جمیلہ - میرے پیارے محبوب! مجھے گھر کے کاروبار اور روزمرہ کے مشاغل سے فرصت ہی نہ ملتی تھی -

محبوب خاں - تو تم نے ایک لمحہ بھی اپنی گزشتہ زندگی کی یاد میں نہیں گزارا؟

جمیلہ - نہیں - خدا شاہد ہے کہ میں ا
بھول چکی تھی -

محبوب خاں - اللہ اللہ! یہ بے خ
مدہوشی کی قناعت - ذرا خیال کرو ایک لمحہ کا
نہیں - میرا تو دل پھٹا جاتا ہے -

جمیلہ - لیکن یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہ
غور کیجئے کہ اگر میں آپ سے شادی نہ کرتی تو آپ
حشر ہوتا -

محبوب خاں - تم جیسی بیوی ماشاء ا

جمیلہ - ہاں - میں ہمیشہ آپ سے زیا
کفایت شعار و کم خرچ بیوی رہی ہوں - یہ ٹھیک
ہے عمر میں ایک دو برس بڑی ہوں لیکن اس -

محبوب خاں - میرا کیا حشر ہوتا؟ اور

جمیلہ - ہاں - جب پہلے پہل تمھاری مجھ
ملاقات ہوئی تو تم دنیا بھر کی بدمعاشیوں میں ملوّ
تھے - تم اس سے منکر نہیں ہو سکتے

محبوب خاں - تم بُرے طریقوں کا ذکر کر
ہو - تم سمجھ نہیں سکتیں کہ جب ایک انسان پر رنج والم ا
یاس و ناامیدی کا پہاڑ ٹوٹتا ہے تو اس کی کیا حالت
ہو جاتی ہے - اور خاص کر مجھ جیسے دل و دماغ وا
آدمی کی -

جمیلہ۔ نہیں۔ ضروری نہیں۔ اچھا۔ اس کے
ملں میں کچھ اور کہنا نہیں چاہتی۔ کیوں کہ جب تمھارا
رس گیا تو تم اچھے خاصے شوہر بن گئے اور ہمارا گھر
یرا اور خوشگوار معلوم ہونے لگا۔ اور رئیسہ اور
ں اپنے کھانے کپڑے پر قدرے خرچ زیادہ کرنے لگے۔

محبوب خاں۔ ہاں فریب کاریوں اور
بے وفائیوں کے ماحول میں۔

جمیلہ۔ اگر وہ منحوس اپنی ٹانگ نہ اڑاتا!

محبوب خاں۔ میں بھی خیال کیا کرتا تھا کہ
را گھر بہت خوشگوار ہے۔ لیکن یہ دھوکا تھا محض
ھوکا۔ اب میں ضروریاتِ زندگی کے لئے کہاں
ہروں گا تاکہ اپنی ایجاد کو مکمل کرسکوں۔ شاید یہ میرے
اتھ ہی فنا ہوجائے گی اور ہاں بیگم تمھاری گزشتہ
ندگی اس موت کا باعث ہوگی۔

جمیلہ (رونے کے قریب) خدا کے لئے ایسی
تیں نہ کرو۔ میں جو ہمیشہ تمھارے لئے بہتر چیزوں کی
اشش میں لگی رہی ہوں ... ...

محبوب خاں۔ مجھے یہ بتا دو کہ تمھارے
وزی دہندہ کے منصوبوں کا اب کیا حشر ہوگا؟ جب
ں صوفے پر لیٹ کر اپنی ایجادات پر غور کرتا تھا۔ تو
مجھے خیال ہوتا تھا کہ اُس میں میرے تمام قوائے دماغی
جسمانی صرف ہوجائیں گے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ ایک
وہ خوش نصیب دن آنے والا ہے جب میرے ہاتھ میں
حق ایجاد محفوظ ہوگا اور وہ دن میرے انتقال کا
دن ہوگا اور یہ محض میرا خواب تھا کہ تم ایک خوشحال
بیوہ۔ ایک کامیاب مردہ موجد کی بیوہ ہوگی۔

جمیلہ (آنسوؤں کو پونچھ کر) محبوب بیہودہ باتیں
نہ بکو۔ میری خدا سے التجا ہے کہ وہ منحوس دن نہ آئے
جب میں بیوگی کا منہ دیکھوں۔

محبوب خاں۔ لیکن اس سے اب کیا
حاصل؟ معاملہ ختم ہوچکا۔ بالکل ختم۔

(بلند اختر چپکے سے بیرونی دروازہ کھولتا ہے اور
اندر جھانکتا ہے)

بلند اختر۔ کیا اندر آسکتا ہوں؟

محبوب خاں۔ ہاں آئیے۔

بلند اختر (اُس کے چہرہ پر خوشی کے آثار
نمایاں ہیں اور اشتیاق سے ہاتھ پھیلاتا ہے)
میرے پیارے دوست! (یکے بعد دیگرے اُن کے
چہروں پر دیکھتا ہے اور محبوب سے چپکے سے کہتا ہے)
کیا ابھی تک معاملہ صاف نہیں کیا؟

محبوب خاں (زور سے) ہوگیا۔

بلند اختر۔ واقعی؟

محبوب خاں - میں اپنی زندگی کی نہایت
تلخ گھڑیوں میں سے گزرتا ہوں۔

بلند اختر - لیکن ساتھ ہی ساتھ روح افزا بھی!

محبوب خاں - بہر حال اب تو ہو ہی گیا۔

جمیلہ - خدا آپ کو سمجھے بلند اختر صاحب

بلند اختر (تعجب میں) میں نہیں سمجھا۔

محبوب خاں - کیا تم نہیں سمجھے ؟

بلند اختر - ایسے ضروری انکشاف کے
بعد - جو پیش خیمہ ہے ایک بالکل نئی زندگی کا - اصلی محبت
اور سچی اخوت کا جس کی بنا صداقت وحقیقت پر مبنی ہے۔

محبوب خاں - ہاں مجھے معلوم ہے -
مجھے معلوم ہے -

بلند اختر - جب میں اندر آیا تو مجھے امید تھی
کہ میں تم دونوں کے چہروں میں طمانیت و روحانیت
کی اصلی روشنی دیکھوں گا لیکن مجھے سوائے
غم وغصہ، رنج وافسردگی اور حزن وملال کے کچھ
نظر نہیں آیا۔

جمیلہ (لیمپ کا گلوب اتار کر) بالکل درست۔

بلند اختر - بیگم صاحبہ میں یقین سے کہہ سکتا
ہوں کہ آپ سمجھی ہی نہیں - ہاں ہاں وقت آنے دو
اور آپ کو معلوم ہو جائے گا - لیکن تم محبوب! تم تو
اس انکشافِ حقیقت کے بعد بہت زیادہ جلال وا
سے پُر ہو جاتے۔

محبوب خاں - ہاں میں محسوس کر
یہ سچ ہے۔

بلند اختر - کیوں کہ دنیا میں یقیناً کوئی
چیز نہیں جو عفو و درگزر کی مسرت اور ایک ترا
گناہگار کو آغوشِ محبت میں اٹھا لینے کا مقابلہ کر

محبوب خاں - کیا آپ خیال کر سکتے
ایسا تلخ پیالہ پینا جیسا کہ میں نے ابھی پیا ہے ایک
فانی کے لئے آسان کام ہے ؟

بلند اختر - نہیں - میں یقین کے ساتھ ک
ہوں ایک معمولی آدمی کا کام نہیں - لیکن تم جیسے آ

محبوب خاں - خدا شاہد ہے - میں خو
واقف ہوں - لیکن اختر زیادہ مت چھیڑو - آپ
معلوم ہے کہ اس کے لئے وقت چاہیئے ...

بلند اختر - محبوب! تم میں بہت زیادہ
بط کا اثر موجود ہے۔

(حکیم صاحب بیرونی دروازہ سے داخل ہو

حکیم جی - آہاہ - آپ پھر جنگلی بط کا تذکرہ کر

محبوب خاں - ہاں منیر عالم صاحب
جیسی بازو والی بط کا !

حکیم جی ۔ منیر عالم ... کیا آپ اُن کے متعلق
...ر رہے ہیں
محبوب خاں ۔ ہاں اُن کے اور اپنے۔
حکیم جی (اختر سے) خدا کرے شیطان آپ کو
...بھا گے
محبوب خاں ۔حکیم جی! کیا کہا ؟
حکیم جی ۔میں تو خالص دعا مانگ رہا ہوں
...اکرے یہ بڑے حکیم صاحب یہاں سے ٹلیں۔
...یہاں قیام کرتے ہیں تو تم دونوں کی موت آگئی ہے
بلند اختر۔حکیم صاحب! ان دونوں کو تو
...نقصان نہیں پہنچ رہا ۔ رہا محبوب کی بابت میں
...میں کہہ سکتا ۔میں ان سے خوب واقف ہوں
...جہاں تک بیگم صاحبہ کا تعلق ہے۔ مجھے کچھ شبہ نہیں
...میں وفا اور ایمانداری کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
جمیلہ (قریب قریب چلا کر) اللہ ۔میرے
...پر رحم کیجیے
حکیم جی (اختر سے) کیا یہ دریافت کرنا غیر مناسب
...کہ آپ یہاں رہ کر کیا کرنے والے ہیں ؟
بلند اختر ۔ میں ایک سچی شادی اصلی
...واج کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں ہوں
حکیم جی ۔ تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ محبوب کی

شادی کو اصلی شادی نہیں سمجھتے۔
بلند اختر ۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں
کہ یہ بھی مثل دوسری شادیوں کے عمدہ شادی ہے۔
لیکن ایک سچی شادی یہ ہرگز نہیں ہوئی۔
محبوب خاں ۔ حکیم جی! معلوم ہوتا ہے
آپ نے انسانی نصب العین کی طرف کبھی غور نہیں کیا۔
حکیم جی ۔ بے کار محض ۔فضول بکواس۔
میرے عزیز، لیکن معاف کیجیے اختر صاحب کتنی اصلی
شادیاں آپ نے اپنی زندگی میں دیکھی ہیں۔
بلند اختر ۔ غالباً ایک بھی نہیں۔
حکیم جی ۔ میں نے بھی نہیں۔
بلند اختر ۔لیکن میں نے دوسری قسم کی
ہزاروں شادیاں دیکھی ہیں اور بہ غور مطالعہ کیا ہے
کہ ایسی شادیوں سے زوج و زوجہ کو کس قدر نقصان
اٹھانا پڑتا ہے۔
محبوب خاں ۔ آدمی کی اخلاقی جرأت
اور اخلاقی ارتقا اس سے بالکل فنا اور زائل ہو جاتی
ہیں ۔ اس کا یہی خوف ناک اثر ہے۔
حکیم جی ۔ میری خود کی شادی نہیں ہوئی اس لیے
میں اس مسئلہ پر کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے
قاصر ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ بچہ شادی ہی کا

ایک نتیجہ ہوتا ہے اور تمہیں بچے کو تباہ نہ کرنا چاہیئے۔

محبوب خاں۔ آہ۔ رئیسہ! میری
پیاری بچی رئیسہ!

حکیم جی۔ ہاں برائے مہربانی اس بچی کو
اس کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھیئے۔ آپ
دونوں تو ہوش مند جوان ہیں۔ اپنی نفسانی خواہشات
اور خوش طبعی کے لئے جو چاہیں کریں کچھ پروا نہیں۔
لیکن یقین مانیئے رئیسہ کو ہوا نہ لگنے پائے۔ ورنہ اس کا
انجام اچھا نہ ہوگا۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔

محبوب خاں۔ عظیم نقصان! زندگی تباہ!

حکیم جی۔ ہاں یا اس کا انجام یہ ہوگا کہ
وہ خود اپنے کو ہلاکت میں ڈال دے گی اور شاید
دوسروں کو بھی۔

جمیلہ۔ لیکن آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟

محبوب خاں۔ اُس کی نظر کو تو کوئی ظاہرا
خطرہ ہے نہیں یا کوئی ہے؟

حکیم جی۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز اس کی
بینائی نہیں ہے۔ لیکن رئیسہ کی عمر کا یہ حصہ بہت
نازک ہے۔ وہ طرح طرح کے عجیب عجیب خیالات دماغ
میں جمع کرے گی۔

جمیلہ۔ ہاں۔ یقین مانیئے وہ ایسا کر ہی
رہی ہے۔ وہ باورچی خانے میں کھانے پکانے میں بہت
دلچسپی لینے لگی ہے۔ وہ اس کو آگ میں کھیلنے سے
تعبیر کرتی ہے اکثر مجھے خوف ہوا ہے کہ کہیں گھر کو آگ
نہ لگا دے۔

حکیم جی۔ ٹھیک کہا۔ میں تو جانتا ہی تھا

بلند اختر (حکیم صاحب سے) لیکن اس کی کچھ
تشریح کر سکتے ہو؟

حکیم جی (غصہ سے) میاں وہ عورت بن رہی ہے

محبوب خاں۔ جب تک میں اس کے پاس
ہوں ... جب تک میرے دم میں دم ہے۔

(دروازہ پر دستک سنائی دیتی ہے)

جمیلہ۔ محبوب صاحب! کیا غضب ہے
خوف خدا کرو۔ کوئی باہر معلوم ہوتا ہے پکارتی ہے
اندر آؤ۔

(آمنہ بیگم برقعہ اوڑھے داخل ہوتی ہے)

آمنہ بیگم۔ سلام علیکم۔

جمیلہ (پاس جاکر) آ خاہ۔ آپ ہیں بیگم صاحبہ!

آمنہ بیگم۔ آپ کی خادمہ۔ میں غیر وقت
آئی ہوں۔ معاف کرو۔

محبوب خاں۔ کچھ حرج نہیں۔ کیا اُس
گھر سے کوئی پیغام لائیں۔

آمنہ بیگم (جمیلہ سے) سچ تو یہ ہے میں خیال
...ھی کہ بابو صاحب گھر پر نہ ہونگے ۔ اسی لئے
...جلدی سے آئی کہ دو چار باتیں کرلوں اور رخصت ہو...

جمیلہ ۔ تو کہیں جارہی ہو ؟

آمنہ بیگم ۔ لاہور کو کل سویرے منیر عالم صاحب
...ج سہ پہر کو چلے گئے (بلند اختر سے کنایۃً) انھوں نے
...دی تھی ۔

جمیلہ ۔ ذرا ٹھیرو ۔

محبوب خاں ۔ کیا منیر عالم صاحب چلے گئے؟
...ب بھی وہاں جارہی ہیں ؟

آمنہ بیگم ۔ ہاں محبوب صاحب. آپ کی
...رائے ہے ؟

محبوب خاں ۔ ہوشیار رہو جو کام کرو ۔

بلند اختر ۔ مجھے معلوم ہے ۔ ابا جان اور
...ماجہ کی شادی ہونے والی ہے ۔

محبوب خاں ۔ شادی ؟

جمیلہ ۔ بیگم صاحبہ ! یہ بات ؟

حکیم جی (لڑکھڑاتی آواز میں) کیا واقعی درست؟

آمنہ بیگم ۔ ہاں حکیم صاحب ۔ بالکل صحیح ۔

حکیم جی ۔ تو کیا پھر شادی رچانے کا
...ق ہوا ۔

آمنہ بیگم ۔ ہاں کیا حرج ہے منیر عالم صاحب کے
منظور ہے اور ہم لاہور میں چپ چپاتے شادی کرلیں گے ۔

بلند اختر ۔ تو بحیثیت ایک سوتیلے بیٹے کے
میرا فرض ہے کہ اس کامیابی پر مبارکباد دوں ۔

آمنہ بیگم ۔ جزاک اللہ ۔ اگر سچ کہتے ہو اور
مجھے اُمید ہے کہ ہم دونوں کے لئے خوشی اور مسرت
چاہتے ہو ۔

حکیم جی ۔ آپ بلاشبہ اس پر یقین رکھیں جہاں تک
مجھے معلوم ہے منیر عالم صاحب نہایت معقول آدمی ہیں
اور مجھے خیال نہیں پڑتا کہ کبھی اُنھوں نے اپنی بیوی
کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا ہو ۔ جیسا کہ آپ کا پہلا شوہر ڈاکٹر
کرتا تھا ۔

آمنہ بیگم ۔ ڈاکٹر بیچارہ تو گل سڑ گیا ۔ اب
اس کا تذکرہ کیا ۔ ہاں اُس میں بھی چند محاسن تھے ۔

حکیم جی ۔ لیکن منیر عالم صاحب کہیں بڑھ کر
مجموعۂ صفاتِ حسنہ ہیں ۔

آمنہ بیگم ۔ ہاں ۔ اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے
اپنی عمدہ خوبیوں کو خراب نہیں کیا اور جو ایسا کرتا ہے
خمیازہ بھگتا ہے ۔

حکیم جی ۔ آج رات کو میں مولوی صاحب کے
ہمراہ باہر جاؤں گا ۔

آمنہ بیگم۔ یہ ٹھیک نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔

حکیم جی۔ کوئی چارہ نہیں (محبوب خاں سے) اگر پسند کریں تو آپ بھی چلئے۔

جمیلہ۔ نہیں شکریہ۔ محبوب صاحب ایسی جگہ آپ کے ساتھ نہ جائیں گے۔

محبوب خاں (جھلا کر) اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔

حکیم جی۔ خدا حافظ۔ بیگم صاحبہ (چلا جاتا ہے)

بلند اختر (آمنہ بیگم سے) معلوم ہوتا ہے کہ حکیم جی اور آپ میں کافی شناسائی ہے؟

آمنہ بیگم۔ ہاں، مدت سے جانتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ ہماری دوستی۔ دوستی سے بڑھکر اور کچھ ہو جانے والی تھی۔

بلند اختر۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا

آمنہ بیگم۔ ہاں ممکن ہے ٹھیک ہو لیکن میں محض جذبات و لحسیات سے متاثر نہیں ہوتی اور ایک عورت کو کبھی بھی اس طرح مردوں پر نہ ریجھنا چاہیئے۔

بلند اختر۔ کیا آپ کو اندیشہ نہیں کہ اگر میں باپ سے اس ملاقات کا تذکرہ کردوں؟

آمنہ بیگم۔ میں نے خود اس کا تذکرہ کر دیا ہے

بلند اختر۔ واقعی؟

آمنہ بیگم۔ تمہارے باپ کو ذرا ذرہ بات بالتفصیل میرے متعلق معلوم ہے میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے اور جب انھوں نے اپنے ارادے مجھ سے ظاہر کیا۔ تو میرا پہلا کام ان امور کی وضاحت کر دینا تھا اور میں نے تمام وکمال بتلا دیا

بلند اختر۔ پھر تو آپ نے غیر معمولی جسارت سے کام لیا۔

آمنہ بیگم۔ میں ہمیشہ صاف دل اور بیباک رہی ہوں اور عورتوں کے لئے یہی مناسب ہے۔

محبوب خاں (جمیلہ سے مخاطب ہو کر کے) اب کیا رائے ہے؟

جمیلہ۔ دنیا میں ہر قسم کی عورتیں ہوتی ہیں کہ
نہ ہر زن زن ست و نہ ہر مرد مرد

آمنہ بیگم۔ ہاں بہن جمیلہ! میں سمجھتی ہوں کہ جو راستہ میں نے اختیار کیا ہے۔ وہی سب سے اچھا ہے اور منیر عالم صاحب نے بھی اپنا سب راز من و عن ظاہر کر دیا ہے اور اسی باعث ہم دونوں متحد ہو رہے ہیں۔ اب وہ ایک بچہ کی مانند بے خطر مجھ سے باتیں کر سکتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کا آنکو

ی اپنی زندگی میں اتفاق نہ ہوا تھا۔ اپنے بچپنے اور
نی میں جب وہ تندرست و خوب رو تھے۔ وہ سوائے
پنے گناہوں پر لعن طعن سننے کے اور کچھ نہ کرتے تھے
ر اکثر اوقات خطبوں کا زور زیادہ تر خیالی گناہوں
طبا اس پر صرف ہوتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوتا ہے ....

جمیلہ ۔ ہاں ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔

بلند اختر ۔ اگر آپ دونوں اس قسم کی باتیں
نی ہیں تو میں رخصت چاہتا ہوں ۔

آمنہ بیگم ۔ نہیں تم ٹھیرو۔ میں اب ایک لفظ
، نہ کہوں گی۔ میرا کہنے کا صرف یہ مطلب تھا کہ تم کو
لوم ہو جاتا کہ میں نے ذرا بھی تو مکاری، دھوکہ بازی
رنا جائز طور سے کام نہیں کیا۔ بہت ممکن ہے کہ تم یہ
ال کرو کہ میں دولت کے لالچ میں شادی کر رہی ہوں
رہاں ایک طرح پر یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن تاہم میں
ین نہیں کر سکتی کہ شادی سے مجھے زیادہ منفعت
ی۔ اتنا میں ضرور جانتی ہوں کہ میں منیر عالم صاحب کو
وڑ نہ دوں گی اور ان کی خبر گیری اور عالم مجبوری
اچاری میں ان کی کما حقہ خدمت کرنا میرا کام ہوگا۔

محبوب خاں ۔ مجبوری و لاچاری؟

بلند اختر (آمنہ سے) اس کا تذکرہ نہ کرو۔

آمنہ بیگم ۔ چھپانے سے اب کیا فائدہ ۔
چاہے وہ خود کتنا ہی چھپائیں۔ میاں ان کی آنکھوں کا
نور اڑ گیا۔

محبوب خاں (چونک کر) اندھا پن !
حیرت انگیز کیا واقعی یہ نوبت آ گئی؟

جمیلہ ۔ بہت سے آدمی اندھے ہو جاتے ہیں۔

آمنہ بیگم ۔ اور آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں
کہ ایک کاروباری آدمی کو اس سے کیا نقصان ہو سکتا
ہے؟ پس میں اپنی آنکھوں سے ان کا کام کروں گی
لیکن اب میں زیادہ نہیں ٹھیر سکتی۔ بہت مشغول ہوں
ہاں محبوب صاحب! یہ کہنا بھول گئی۔ اگر کچھ ضرورت
پیش آئے جس میں منیر عالم کی مدد درکار ہو تو منیم جی
سے کہہ دینا۔

بلند اختر ۔ یہ خوش خبری! محبوب صاحب
آپ کو شکر گزار ہونا چاہیئے۔

آمنہ بیگم ۔ واقعی؟ میں سمجھتی ہوں ایک
وقت تھا جب ....

جمیلہ ۔ بیگم صاحبہ! اختر صاحب بھی بجا فرماتے
ہیں اب ہمیں منیر عالم صاحب کی کسی مدد کی ضرورت نہیں۔

محبوب خاں (با آہستگی غور و فکر سے)
اپنے شوہر سے میرا سلام عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ میں
ضرور منیم جی کے پاس حاضر ہونگا۔

بلند اختر - کیا ؟ کیا واقعی آپ ایسا کرینگے؟

محبوب خاں - منیم جی کے پاس جانا - ہاں
ضرور میں جاؤں گا۔ اور اُس تمام قرضہ کی بابت دریافت
کروں گا جو منیر عالم صاحب کا میرے ذمہ ہے میں اُس
خوش دلی کے قرض کو ادا کردوں گا - ہاں - ہاں -
خوش دلی کا قرض بڑا پیارا نام ہے لیکن بس - میں
کل روپیہ ادا کردوں گا - مع پانچ فی صدی سود کے

جمیلہ - خدا علیم ہے - بھلا ہمارے پاس روپیہ
کہاں جو قرضہ ادا ہوسکے گا !

محبوب خاں - بیگم صاحبہ ! منیم جی سے
کہدینا کہ میں اپنی صنعت و ایجاد میں بہت مشغول ہوں
اور اس دشوار کام کی تکمیل میں جو چیز میری طاقت کو
قائم کئے ہوئے ہے وہ خواہش و تمنا ہے کہ کس طرح میں
اس جان گداز اور دل خراش بارِ قرضہ سے نجات
پا جاؤں اور یہی سبب ہے کہ میں اس ایجاد میں مر رہا
ہوں - اس کی کل آمدنی آپ کے شوہر کے احسانات
مال و دولت سے بری الذمہ ہونے کے لئے وقف
کردی جائے گی -

آمنہ بیگم - معلوم ہوتا ہے اس گھر میں چل گئی ہے -

محبوب خاں - آپ سچ کہتی ہیں -

آمنہ بیگم - لو خدا حافظ - جمیلہ بیگم ! میں
کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر دیکھا جائے گا - اچھا خدا ح
(محبوب و اختر سلام کرتے ہیں - جمیلہ دروازہ تک جاکر رخصت
کرآتی ہے)

محبوب خاں - بیگم دروازہ سے باہر
(آمنہ باہر چلی جاتی ہے جمیلہ دروازہ بند کردیتی ہے)
ہاں اختر صاحب وہ قرض میرے ہاتھوں ہوا

بلند اختر - تم جلد سبکدوش ہوجاؤ گے

محبوب خاں - میرا بھی یہی خیال ہے !

بلند اختر - تم وہ انسان ہو جس کی قدر و منزلت
ہمیشہ میرے دل میں رہی ہے -

محبوب خاں - بعض حالتوں میں آئیڈیل کو
فراموش کردینا ناممکن ہوجاتا ہے - گھر کاروزی سار
ہائے میں اسی خیال میں گھل گھل کر مرجاؤں گا - میں
آپ کو بتلانا چاہتا ہوں کہ آدمی کے لئے یہ کوئی
ہنسی مذاق نہیں ہے کہ غربت و عسرت کی حالت میں
قرضے سے آہ - برسوں کے قرضے سے جس پر
خود فراموشی و عدم توجہی کی خاک جم گئی ہو نجات
پا جائے - لیکن اس سے کچھ فرق واقع نہیں ہوتا
میری مردانگی اور قوت بھی مجھ سے اپنے جائز حقوق
کی طالب ہیں -

بلند اختر (اپنا ہاتھ محبوب کے کندھوں پر رکھکر)

ے محبوب ! کیا یہ اچھی بات نہ تھی کہ میں یہاں آیا ؟

محبوب خاں ۔ ہاں ۔

بلند اختر ۔ اور کیا یہ بھی عمدہ بات نہ ہوئی
پ کو اصل واقعہ کا علم ہو گیا ۔

محبوب خاں (ذرا تشویش سے) بے شک
ا اچھا ہوا لیکن ایک چیز میرے جذبات کے
ف ہوئی ۔

بلند اختر ۔ وہ کیا ؟

محبوب خاں ۔ وہ یہ کہ میں ۔۔۔
ں میں نہیں سمجھتا کہ آپ کے والد صاحب کے
ت کچھ بھی آزادی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ۔

بلند اختر ۔ اس کی کچھ پروا نہ کرو ۔ مجھے
کچھ تعلق نہیں ۔

محبوب خاں ۔ بہت مناسب ۔ مجھے اس
سے سخت کوفت ہو رہی ہے کہ اب میں نہیں بلکہ
مل شادی کے مزے لوٹیں گے

بلند اختر ۔ آپ یہ کیوں کر کہہ سکتے ہیں ؟

محبوب خاں ۔ یہ تو ہوگا ہی ۔ آپ کے باپ
منہ بیگم ایسے رشتہ کے پابند ہو رہے ہیں
ل بنا طرفین کے کامل اعتماد ۔ ہمہ تن و غیر محدود
و صداقت پر ہے ۔ وہ ایک دوسرے سے کچھ مخفی
نہیں رکھتے ۔ چیزوں کی تہ میں کوئی فریب نہیں ہے ۔
انھوں نے بالاعلان ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ۔ باہمی خطاؤں
اور کمزوریوں کو معاف کر دیا اور بھلا دیا ہے ۔

بلند اختر ۔ اس سے کیا ہوتا ہے ؟

محبوب خاں ۔ واہ یہی تو خاص بات ہے
یہی تو اس مشکل مسئلہ کا حل ہے کہ ایک اصلی اور سچی
شادی کی بنیاد ڈالی جائے ۔ ہاں آپ بھی تو یہی
کہہ رہے تھے ۔

بلند اختر ۔ لیکن یہ بالکل دوسری بات ہے یقیناً
آپ اپنا اور اپنی بیوی کا ان سے مقابلہ نہیں کر رہے
آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا کیا منشا تھا ؟

محبوب خاں ۔ تاہم میں یہ خیال کرنے پر
مجبور ہوں کہ ضرور کوئی ایسی لم ہے جو میرے جذبۂ انصاف
کو سخت ٹھیس لگا رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
کائنات میں کہیں اصلی خوشی کی جگہ نہیں ہے ۔

جمیلہ ۔ خدا رحم کرے ۔ محبوب صاحب !
خدا کے لئے ایسے الفاظ زبان پر نہ لائیے ۔ یہ
کفرانِ نعمت ہے ۔

بلند اختر ۔ اونہہ ۔ مناسب تو یہ ہے کہ ہم ان کا
تذکرہ ہی نہ کریں ۔

محبوب خاں ۔ لیکن دوسری طرف میں یقینی

طور پر دیکھ رہا ہوں کہ قسمت کا ہاتھ اپنا کام کر رہا ہے
وہ اندھے ہو چلے ہیں۔

جمیلہ - لیکن یہ یقینی تو نہیں کہ وہ . . .

محبوب خاں - اس میں شبہ بھی کیا ہے
اور ہمیں کیوں شک کرنا چاہیئے کہ وہ اندھے نہیں
ہونگے - یہ حرکت ہی اس سخت سزا کی مقتضی ہے کیونکہ
اُنھوں نے اپنے ایامِ تعیش میں ایک سیدھے سادے
بھلے مانس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔

بلند اختر - ہائے قسمت - انھوں نے ایسا
ہزاروں کے ساتھ کیا ہے !

محبوب خاں - اور اب وہ سخت قاہر
پُراسرار قوت جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کی آنکھوں کو
تباہ کئے ڈالتی ہے۔

جمیلہ - محبوب صاحب! آپ کیسے سخت دل
ہیں کہ ایسی خوف ناک باتیں کر رہے ہیں - میرے
تمام جسم میں رعشہ پڑ گیا۔

محبوب خاں - ہاں بعض اوقات زندگی
کے سیاہ و تاریک پہلو پر بھی غور کرنا انسان کے لئے
مفید ہوتا ہے۔

(رئیسہ دوڑتی آتی ہے اور دروازہ پر کھڑی ہو کر جھانکتی ہے
اُس کے چہرے پر بشاشت ہے)

جمیلہ - کیا تم واپس آگئیں ؟

رئیسہ - جی ہاں - میں اب باہر نہیں جاؤں
اور یہ اچھا ہوا کہ میں چلی آئی - کیوں کہ ابھی کوئی نہ
دروازے پر ملے -

محبوب خاں - آمنہ بیگم شاید !

رئیسہ - ہاں -

محبوب خاں (ٹہلتے ہوئے) شاید تم -
اُن کو آخری دفعہ دیکھا -

(خاموشی - رئیسہ پریشان ہو پہلے ایک کی طرف اور پھر
دوسرے کی طرف دیکھتی ہے گویا اُن کے خیالات کا جائزہ لے رہی ہے)

رئیسہ (باپ کے پاس دوڑ کر) ابا جان !

محبوب خاں - کیا ہے بیٹی ؟

رئیسہ - آمنہ بیگم میرے لئے کچھ لائی تھیں

محبوب خاں (خاموش کھڑا ہو کر) تمہارے
واسطے ؟

رئیسہ - ہاں کچھ - کل کے لئے -

جمیلہ - بیگم صاحبہ ہمیشہ اس کی سالگرہ کے
موقع پر کچھ نہ کچھ تحفہ تحائف بھیجا کرتی ہیں -

محبوب خاں - کیا ہے ؟

رئیسہ - ابھی آپ اس کی بابت کچھ نہ پوچھیں
اماں جان یہ چیز مجھے کل سویرے سب سے اول دینگی

محبوب خاں ۔ تمام سازو اخفا اور مجھے
طلق علم نہیں۔ ہوں !
رئیسہ (جلدی سے) نہیں آپ اگر مصر ہیں تو دیکھ لیجئے۔
یک بڑا لفافہ ہے (اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ
التی ہے)
محبوب خاں ۔ خط بھی !
رئیسہ ۔ مجھے صرف یہی دیا تھا۔ بقیہ بعد میں
ملے گا۔ ذرا سوچئے۔ ایک خط ۔ مجھے پیشتر کبھی خط نہیں ملا
ر لفافہ پر "برخورداری" لکھا ہے (پڑھتی ہے)
برخورداری رئیسہ بانو " دیکھئے میں ہی ہوں نا۔
محبوب خاں ۔ مجھے دیکھنے دو۔
رئیسہ (خط دے کر) لیجئے۔
محبوب خاں ۔ یہ تو منیر عسالم صاحب کی
تحریر ہے۔
جمیلہ ۔ کیا واقعی ؟
محبوب خاں ۔ خود دیکھ لو۔
جمیلہ ۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس کی
بت کچھ علم ہے۔
محبوب خاں ۔ رئیسہ کیا میں اس کو
ھول کر پڑھ لوں ؟
جمیلہ ۔ اس وقت نہیں۔ یہ کل کے لئے ہے۔

رئیسہ (نرمی سے) آپ کیوں نہیں پڑھنے دیتیں
ضرور کوئی عمدہ چیز ہے اور ابا جان خوش ہوں گے۔
محبوب خاں ۔ تو مجھے کھول لینے کی
اجازت ہے ؟
رئیسہ ۔ ہاں ابا جان ! کم از کم یہ دیکھ کر ہی
خوشی ہوگی کہ اس میں کیا ہے ؟
محبوب خاں ۔ بہت اچھا ! (خط کو کھولتا
ہے۔ کاغذ نکالتا ہے اور متحیر ہو کر پڑھنے لگتا ہے) اس کا
کیا مطلب ہے ؟
جمیلہ ۔ کیا لکھا ہے ؟
رئیسہ ۔ ہاں ابا جان ! ذرا بتلائیے تو۔
محبوب خاں ۔ خاموش رہو۔ (دوبارہ
پڑھتا ہے۔ چہرے کا رنگ فق ہے لیکن طبیعت کو قابو میں
کرتا ہے) رئیسہ ہبہ نامہ ہے ! انعام ہے !
رئیسہ ۔ واقعی۔ مجھے کیا ملا ؟
محبوب خاں ۔ لو خود پڑھ لو (رئیسہ لیمپ کے
پاس جا کر خط کو پڑھتی ہے۔ محبوب ہاتھوں کو بجاتا اور
چلاتا ہے) آنکھیں ! آنکھیں ! اور یہ خط !
رئیسہ (پڑھنا بند کر دیتی ہے لیکن اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ دادا ابا کے لئے ہے۔
محبوب خاں (اس سے خط لے کر) بیگم

تم کیا سمجھیں ؟

جمیلہ - خدا کی قسم ۔ مجھے کچھ علم نہیں ۔ للہ جلد بتلاؤ

محبوب خاں - منیر عالم صاحب نے رئیسہ کو لکھا ہے کہ تمھارے دادا کو نقل وغیرہ کے متعلق اب فکرمند نہ ہونا چاہیئے ۔ آج سے اُن کو تاحیات دفتر سے پچاس روپیہ ماہوار ملا کریں گے ۔

بلند اختر - اُفوہ !

رئیسہ - پچاس روپیہ ۔ اماں میں نے پڑھا تھا ۔

جمیلہ - دادا کی خوش قسمتی !

محبوب خاں - پچاس روپیہ ماہوار تمام عمر کے لئے ۔

جمیلہ - چلو ان غریب ہڈیوں کو سہارا ہوا ۔

محبوب خاں - لیکن یہیں بس نہیں ۔ رئیسہ تم نے سب نہیں پڑھا ۔ اُن کے بعد یہ بخشش تمھارے حق میں منتقل ہو جائے گی ۔

رئیسہ - میں اور یہ رقم !

محبوب خاں - ہاں ۔ اس میں لکھا ہے کہ تم کو پچاس روپیہ ماہانہ ملا کرے گا ۔ بیگم سنتی ہو ۔

جمیلہ - ہاں ۔ ہاں ۔ سنا ۔

رئیسہ - ذرا خیال تو کیجئے ۔ مجھے یہ سب دولت ملے گی ۔ ابا ۔ ابا جان ۔ کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی

محبوب خاں (اُس کو الگ کر کے) خوشی اونہہ (ٹہلنے لگتا ہے) کیسا اندوہ ناک مستقبل ! میری آنکھوں کے سامنے کیسا سماں پھر جاتا ہے ۔ رئیسہ دیکھو ۔ تمھارے حال پر کیسی مہربانی فرمائی ہے !

جمیلہ - ہاں رئیسہ کی سالگرہ کے باعث

رئیسہ - ابا جان ۔ یہ تو آپ کا ہی ہوا بے شک میں تمام روپیہ آپ کو اور اماں کو دیدیا کروں گی ۔

محبوب خاں - اماں کو ۔ ہاں یہی تو بات ہے

بلند اختر - محبوب خاں ! یہ وہ جال ہے جو آپ کے لئے بچھایا جا رہا ہے ۔

محبوب خاں - تو کیا آپ کا خیال ہے کہ یہ دوسرا جال ہے ؟

بلند اختر - آج صبح جب وہ یہاں تشریف رکھتے تھے ۔ انھوں نے فرمایا کہ "محبوب وہ آدمی نہیں جیسا کہ تم سمجھتے ہو" !

محبوب خاں - آدمی نہیں !

بلند اختر - اور یہ بھی کہا کہ "تم کو معلوم ہو جائیگا"

محبوب خاں - آپ دیکھیں گے کہ آیا یہ رشوت مجھے بہکا سکتی ہے ۔

رئیسہ - اماں جان ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟

جمیلہ - ذرا تم باہر چلی جاؤ اور اپنا سامان

لے جاؤ۔ (رئیسہ روتی ہوئی باورچی خانے میں چلی جاتی ہے)

بلند اختر۔ ہاں محبوب صاحب! اب معلوم
ہوجائے گا کہ کون صحیح راستہ پر ہے۔ وہ یا میں!

محبوب خاں (خط کے دو ٹکڑے کر دیتا
اور میز پر ڈال دیتا ہے) یہ میرا جواب ہے۔

بلند اختر۔ مجھے بھی یہی توقع تھی۔

محبوب خاں (جمیلہ کے پاس جاکر جو
نش دان کے نزدیک کھڑی ہے۔ چپکے چپکے کہتا ہے)
ب صاف صاف تبلا دو۔ جھوٹ نہ بولو۔ جب تم میں
ور اس میں ہر ایک بات طے ہو چکی تھی جب تم .....
ب تم مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ کیوں کہ تم اسے
بت کہتی ہو۔ تو پھر اس نے کیوں ہماری شادی کرا دی؟

جمیلہ۔ میں سمجھتی ہوں انھوں نے خیال کیا
اس طرح گھر میں پیر جم جائیں گے۔

محبوب خاں۔ صرف اتنا۔ کیا وہ کسی
ب وبد کے امکان سے خائف نہ تھے؟

جمیلہ۔ میں نہیں سمجھتی کہ آپ کا کیا مطلب ہے؟

محبوب خاں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ
..... آیا تمھاری بچی کو میرے گھر میں رہنے کا
ئی حق ہے؟

جمیلہ (نگاہ اوپر کرتی ہے۔ آنکھوں میں
خون جھلک رہا ہے) کیا تم یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتے ہو؟

محبوب خاں۔ تمھیں اس کا جواب دینا
ہوگا۔ رئیسہ میری اولاد ہے ... ... یا ... ...
... اچھا؟

جمیلہ (اس کی طرف سرد مہری سے) مجھے
نہیں معلوم۔

محبوب خاں (لڑکھڑاتی آواز میں) تم کو
نہیں معلوم!

جمیلہ۔ مجھے کیسے معلوم ہو ... مجھ جیسی
عورت کو ... ...

محبوب خاں (خاموشی سے الگ ہٹ کر)
تو مجھے اس گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بلند اختر۔ سوچ سمجھ لو۔ کیا کرنا ہے؟

محبوب خاں (کوٹ اٹھاکر) مجھ جیسے
آدمی کو کوئی سوچ بچار کا موقع نہیں۔

بلند اختر۔ فی الحقیقت بہت کچھ غور و فکر کا
موقع ہے۔ تم تینوں کو آپس میں رہنا چاہیئے۔ اگر چاہتے ہو
کہ باہمی عفو و درگزر کے اعلیٰ مقصد کو حاصل کر لو۔

محبوب خاں۔ مجھے اس کی کچھ خواہش
نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میری ٹوپی؟
(ٹوپی لیتا ہے) میرا گھر تباہ ہوگیا۔ اس پر ادبار آگیا۔

(روٹے لگتا ہی) اختر صاحب میرا کوئی بچہ بھی نہیں!

رئیسہ (جس نے باورچی خانے کے کواڑوں کو کھولا ہی تھا) آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ابّا ابّا جان؟ (اُس کے پاس آتی ہی)

جمیلہ۔ ہائے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟

محبوب خاں۔ رئیسہ! دُور۔ میرے پاس نہ آؤ۔ چلی جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔ میں تم کو دیکھ نہیں سکتا آہ۔ آنکھیں! خدا حافظ۔

(دروازہ کی طرف جاتا ہی)

رئیسہ (چلاتی ہوئی اس کو چمٹ جاتی ہے) نہیں۔ نہیں۔ مجھ سے نہ بھاگو۔

جمیلہ (چلاکر) محبوب صاحب! بچی کو دیکھو۔ خدا کے لئے بچی کو دیکھو

محبوب خاں۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ مجھے جانے دو۔ سب سے دور (رئیسہ سے دامن چھڑاکر باہر نکل جاتا ہے)

رئیسہ (یاس و حسرت سے) اماں۔ وہ جا رہے ہیں۔ ہمیں چھوڑکر جا رہے ہیں۔ وہ اب واپس نہ آئیں گے؟

جمیلہ۔ روؤ مت۔ رئیسہ! تمھارے ابّاجان واپس آجائیں گے

رئیسہ (صوفے پر گر پڑتی ہی اور سسکیاں لیتی ہی) نہیں نہیں۔ اب وہ ہرگز واپس آئیں

بلند اختر۔ بیگم صاحبہ! آپ یقین مانئے یہ بہتری و بہبودی کے خیال سے یہ کام کر رہا تھا۔

جمیلہ۔ مجھے یقین ہی یہ آگ آپ کی لگائی ہوئی ہی۔ لیکن خیر۔ خدا آپ کو معاف کرے۔

رئیسہ (صوفہ پر پڑی ہوئی) یہ غم مجھے ہلاک کر دے گا۔ بھلا میں نے کیا بگاڑا تھا؟۔ اماں جان آپ اُن کو گھر واپس لائیے۔

جمیلہ۔ ہاں۔ ہاں۔ ذرا خاموش رہو۔ میں باہر جاتی ہوں اور واپس لاتی ہوں (سر کو ڈھک لیتی ہی) شاید وہ حکیم جی کے ہاں ہونگے۔ اگر میں جاؤں تو تم رونا نہیں۔ اچھا وعدہ کرو۔

رئیسہ (سسکیاں لیتے ہوئے) ہاں۔ میں نہ روؤں گی۔ اگر ابّا واپس آگئے۔

بلند اختر (جمیلہ سے جب وہ چلی) کیا یہ مناسب نہیں ہی کہ وہ آخر تک اس جنگ میں لڑتے رہیں۔

جمیلہ۔ یہ تو بعد میں بھی ہو سکتا ہی۔ پہلے اور سب سے پہلے تو بچی کو چپ کرنے کا سوال ہی۔ (باہر جاتی ہی)

رئیسہ (سیدھی بیٹھ جاتی اور آنسوؤں کو پونچھتی ہی)۔ اب آپ مجھے بتلائیں کہ کیا واقع ہوا۔

کیوں ابا جان نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔
بلند اختر۔ تم یہ بات ابھی نہ پوچھو۔ جب
جوان اور سمجھ دار ہو جاؤگی تو خود جان جاؤگی۔
رئیسہ (آنسو نکلتے ہوئے) لیکن میں اس وقت
مصیبت برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ میں
جانتی ہوں . . . . شاید میں ابا جان کی بیٹی نہیں ہوں۔
بلند اختر (متوحش ہو کر) بھلا یہ کیسے ممکن
ہو سکتا ہے ؟
رئیسہ۔ اماں مجھے لے آئی ہوں اور
شاید اب اباکو بھی اس کا علم ہو گیا ہے۔ میں نے
یہ باتیں کتابوں میں پڑھی ہیں۔
بلند اختر۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہو
تو پھر . . . ؟
رئیسہ۔ ہاں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس
وقت تو انھیں مجھ سے اس قباحت کے باوجود
بھی محبت بلکہ زیادہ محبت کرنی چاہیئے۔ جنگلی بط اگرچہ
ہمیں تحفۃً ملی ہے لیکن تاہم میں اس سے محبت کرتی ہوں۔
بلند اختر۔ جنگلی بط ! ۔ بالکل ٹھیک
(توجہ ہٹاکر) اچھا اب ہمیں جنگلی بط کی بابت
کچھ بتلاؤ۔
رئیسہ۔ غریب جنگلی بط وہ اب اس کو
زیادہ دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ ذرا سوچئے تو وہ
اس کی گردن مروڑنا چاہتے تھے۔
بلند اختر۔ نہیں وہ ایسا نہ کریں گے۔
رئیسہ۔ نہیں۔ لیکن کہتے تو تھے اور میں
سمجھتی ہوں کہ ایسا کہنا بھی سخت بیرحمی ہے۔ کیونکہ
اُس کی سلامتی کے لئے میں ہر رات کو دعا مانگتی ہوں
کہ خدا اُسے ہر بلا سے محفوظ رکھے۔
بلند اختر (اُس کی طرف دیکھکر) تم دعا رات
میں مانگتی ہو۔
رئیسہ۔ بے شک۔
بلند اختر۔ کس نے سکھائی ؟
رئیسہ۔ میں نے خود سیکھ لی۔ ایک دفعہ
ابا جان سخت بیمار ہو گئے۔ اُن کی کمر میں دنبل نکل آیا
تھا اور وہ درد کے مارے بے تاب تھے۔
بلند اختر۔ واقعی ؟
رئیسہ۔ جب میں سونے گئی تو میں نے خدا سے
دعا مانگی اور اُس وقت سے میں برابر دعا مانگتی ہوں۔
بلند اختر۔ اور اب تم جنگلی بط کے لئے
بھی دعا مانگتی ہو ؟
رئیسہ۔ میں نے سوچا کہ اگر جنگلی بط کے لئے
بھی دعا مانگی جائے تو کچھ حرج نہ ہوگا۔ کیونکہ پہلے پہل

یہ بھی بہت بیمار تھی ۔

بلند اختر ۔ کیا تم صبح کے وقت بھی جاگتی ہو؟

رئیسہ ۔ نہیں صبح کو نہیں ۔

بلند اختر ۔ کیوں صبح کو کیوں نہیں جاگتیں؟

رئیسہ ۔ کیوں کہ صبح کو روشنی ہو جاتی ہے
اور کسی چیز کا خوف نہیں رہتا ۔

بلند اختر ۔ اور تمھارے باپ جنگلی بط کی
گردن مروڑنا چاہتے تھے ۔ جیسے تم اس رجہ چاہتی ہو ۔

رئیسہ ۔ نہیں وہ کہتے تھے کہ اس سے
مجھے مسرت ہوگی ۔ لیکن میری خاطر سے چھوڑ دیا ۔
اور میں سمجھتی ہوں کہ ان کی یہ عین مہربانی ہے ۔

بلند اختر (اس کے پاس آکر) لیکن اگر
بالفرض تم اپنی مرضی سے ابا کی خاطر بط کو قربان
کردو تو ......

رئیسہ (اٹھ کر) اونہہ ۔ یہ جنگلی بط !

بلند اختر ۔ فرض کرو اب تم اس کو اپنی
رضا و رغبت سے ۔ جو دنیا میں تمھاری سب سے
زیادہ عزیز نعمت ہے ۔ ابا پر قربان کردو

رئیسہ ۔ تو کیا اس سے کچھ فائدہ ہوگا؟

بلند اختر ۔ رئیسہ ! کوشش تو کرو ۔

رئیسہ (آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور

چہرے پر معصومیت کا اظہار ہوتا ہے) ہاں
کروں گی ۔

بلند اختر ۔ کیا تم میں ایسا کرنے کی ہ

رئیسہ ۔ میں دادا ابا سے کہوں گ
جنگلی بط کو میرے واسطے مار ڈالیں ۔

بلند اختر ۔ ہاں کہو ۔ لیکن اپنی ا
کچھ نہ کہنا ۔

رئیسہ ۔ کیوں ؟

بلند اختر ۔ وہ ایسی باتیں نہیں سمجھت

رئیسہ ۔ جنگلی بط ! تو میں کل سویر
اس کو ہی آزماؤں گی ۔ (جمیلہ بیرونی درو
داخل ہوتی ہے ۔ رئیسہ اس کے پاس دوڑی جا
اماں کیا ملے ؟

جمیلہ ۔ نہیں ۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ک
حکیم جی کے ہمراہ کہیں چلے گئے ۔

بلند اختر ۔ کیا واقعی ؟

جمیلہ ۔ ہاں ۔ ملن کی بیوی کہتی تھی
مولوی صاحب بھی گئے ہیں ۔

بلند اختر ۔ اور اس حالت میں جب
اس کے دماغ کو تنہائی میں جنگ کی سخت ضر

جمیلہ (برقعہ اتار کر) آپ کو کیا معلوم کہ کس

گئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حکیم جی کہاں لے گئے ہیں۔ میں حسینہ بیگم کے بھی گئی تھی لیکن وہ وہاں بھی نہ تھے۔

رئیسہ (آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے) اگر بالفرض وہ واپس نہ آئے تو ......

بلند اختر۔ وہ واپس آئیں گے۔ میں صبح اُن کو سمجھا دوں گا اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح وہ گھر آتے ہیں۔ رئیسہ! تم اطمینان سے سوؤ۔ اچھا۔ خدا حافظ۔

(جاتا ہے)

رئیسہ (روتے ہوئے جمیلہ کے پہلو میں گر پڑتی ہے) امّاں! امّاں!۔

جمیلہ (چمکارتے ہوئے) ہاں ہاں۔ حکیم جی صحیح کہتے تھے کہ جب ایسے پاگل آدمی اپنے نصب العین کو لے کر آتے ہیں جن کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا تو ایسا ہی واقع ہوتا ہے۔

پانچواں ایکٹ

(وہی منظر۔ صبح کی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی ہے۔ فضائے آسمان میں ہلکے ہلکے
بادل چکر لگا رہے ہیں۔ جمیلہ بیگم دھانی دوپٹہ اوڑھے۔ ہاتھ میں جھاڑو اور کپڑا لئے ہوئے
بیٹھک میں جاتی ہے۔ اسی وقت رئیسہ زینہ میں سے دوڑی آتی ہے)

جمیلہ (رک کر) کیا ہے رئیسہ ؟

رئیسہ ۔ اماں ۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ حکیم جی سے نیچے باتیں کر رہے ہیں ۔

جمیلہ ۔ کیا ٹھیک کہتی ہو ؟

رئیسہ ۔ ملّن کی بیوی کہتی تھی کہ اس نے رات دو آدمیوں کو حکیم جی سے باتیں کرتے سنا تھا ۔

جمیلہ ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔

رئیسہ ۔ لیکن اگر وہ یہاں نہیں آئے تو کیا فائدہ ؟

جمیلہ ۔ اچھا میں نیچے جاتی ہوں اور معلوم کرتی ہوں ۔

(نظیر خاں اپنے کمرے سے سگرٹ پیتا ہوا نکلتا ہے)

نظیر خاں ۔ محبوب ! محبوب ! کیا محبوب گھر میں نہیں ہے ؟

جمیلہ ۔ جی نہیں باہر گئے ہیں ۔

نظیر ۔ اتنا سویرے اور ایسی سردی کے وقت ۔ ہاں ہاں ۔ اس کی مرضی ۔ میں اپنا صبح کا کام خود کر سکتا ہوں (بالاخانہ کے دروازہ کو کھولتا ہے ۔ رئیسہ مدد کرتی ہے ۔ وہ اندر جاتا ہے اور رئیسہ کواڑ بند کر لیتی ہے)

رئیسہ (دبی زبان سے) اماں جان ذرا سوچو تو جب غریب دادا کو معلوم ہوگا کہ ابا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے

جمیلہ ۔ بے وقوف ! دادا ابا سے اس کی بابت کچھ نہ کہنا ۔ خدا کی مہربانی تھی کہ وہ کل اس وقت موجود نہ تھے ۔

رئیسہ ۔ ہاں ۔ لیکن

(بلند اختر اندر آتا ہے)

بلند اختر ۔ کیا کچھ پتا چلا ؟

جمیلہ۔ مجھے معلوم ہوا ہی کہ وہ نیچے حکیم جی سے باتیں کر رہے ہیں

بلند اختر۔ حکیم جی سے! کیا واقعی؟ وہ ان کے ساتھ گئے ہونگے

جمیلہ۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

بلند اختر۔ ہاں۔ لیکن وہ۔ . . . . جس کو شدید ضرورت تھی کہ تنہائی میں سنجیدگی سے اپنی حالت پر غور کرے

جمیلہ۔ اِن پہیلیوں کو آپ ہی جانیں۔

(حکیم جی اوپر آتے ہیں)

رئیسہ۔ (حکیم جی کے پاس دوڑ کر) کیا ابا جان آپ کے کمرے میں ہیں؟

جمیلہ۔ (اُسی وقت) کیا وہاں ہیں؟۔

حکیم جی۔ ہاں بیشک

رئیسہ۔ اور آپ نے ہمیں خبر بھی نہ کی۔

حکیم جی۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ میں حیوان ہوں لیکن پہلے میں دوسرے حیوانوں کو تو ٹھیک کر لیتا۔ (بلند اختر کی جانب اشارہ کرکے) میرا مطلب اِن ذات شریف سے ہی اور اس کے بعد میں ایسی غفلت کی نیند سو گیا کہ ——

جمیلہ۔ محبوب صاحب کا اب کیا خیال ہے؟

حکیم جی۔ وہ کچھ نہیں کہتے۔

رئیسہ۔ کیا آپ سے کوئی بات نہیں کی؟

حکیم جی۔ لیک ایسی بات ہی نہیں۔

بلند اختر۔ بیشک۔ میں اس کو بخوبی جانتا ہوں۔

جمیلہ۔ تو وہ تنہا کیا کر رہے ہیں؟۔

حکیم جی۔ صوفے پر پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

جمیلہ۔ کیا واقعی سونیکے بڑے شائق!۔

رئیسہ۔ کیا سو رہی ہیں! کیا وہ سو سکتے ہیں؟۔

حکیم جی۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

بلند اختر۔ اِس کا سمجھنا آسان ہی۔ روح کی جنگ کے بعد جس نے اُس کو گھائل کر دیا ہے وہ۔ . . . . .

جمیلہ۔ علاوہ ازیں وہ رات کو گھومنے کے بھی تو عادی نہیں ہیں۔

رئیسہ۔ اماں میں سمجھتی ہوں کہ سونا اچھی علامت ہے۔

جمیلہ۔ میرا بھی یہی خیال ہے اور اتنا سویرے جگا دینا بڑا ظلم ہوگا۔ شکریہ حکیم صاحب! پہلے میں گھر کو صاف کر لوں پھر۔ . . . رئیسہ آؤ اور مدد دو (رئیسہ کے ہمراہ بیٹھک میں جاتی ہی)

بلند اختر۔ (حکیم جی سے مخاطب ہوکر) آپ اس روحانی انقلاب اور ارتقا کی بابتہ جو محبوب پر گزر رہا ہے کیا رائے رکھتے ہیں؟۔

حکیم جی۔ جہانتک میرا تعلق ہی میں نے اُس میں روحانی انقلاب کی ذرا سی علامت بھی نہیں دیکھی۔

بلند اختر۔ کیا؟ اس قدر نازک حالت کے بعد جب اُس کی تمام زندگی بالکل ایک نئے قالب میں ڈھل گئی ہے؟ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ محبوب جیسی شخصیت ......

حکیم جی۔ شخصیت اور محبوب؟ اگر کبھی اس میں ایسا رجحان تھا جس کو آپ شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں تو معاف فرمائیے وہ بچپن میں ہی کلیتہً زائل و فنا ہوگیا تھا۔ میں آپ کو اِس کا یقین دلا سکتا ہوں۔

بلند اختر۔ اگر واقعی یہ بات ہے تو نہایت تعجب ہے اور ایسے شخص کے معاملہ میں جو اس قدر چاؤ چونچلوں میں پلا ہو۔

حکیم جی۔ آپ کا اشارہ اُن خبطی چچیوں کی طرف ہے

بلند اختر۔ میں آپ کو تبلانا چاہتا ہوں کہ وہی ایسی عورتیں تھیں جو ہرگز نصب العین کے مفہوم سے غافل نہ تھیں۔ لیکن اگر میں یہ کہتا ہوں تو آپ میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔

حکیم جی۔ نہیں۔ اب نہیں۔ علاوہ ازیں مجھے اُن کے متعلق بھی سب کچھ معلوم ہے۔ خود محبوب نے اپنی ان روحانی ماؤں کی بابت بہت کچھ تبلایا ہے۔ لیکن میں خیال نہیں کرتا کہ وہ اُن کا زیادہ زیر بار احسان ہے۔ اُس کی بدقسمتی دراصل یہ ہے کہ تمام عمر اُس کے یارانِ طریقت اس کو غیر معمولی ہستی تصور کرتے رہے۔

بلند اختر۔ تو کیا وہ ایسے نہیں ہیں۔ میرا مطلب ذہانتِ دماغ سے ہے۔

حکیم جی۔ مجھے اس کا کبھی انکشاف نہیں ہوا۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُس کے باپ کا بھی یہی خیال تھا۔ غریب بڈھا سردار اپنی تمام عمر سیدھا سادہ ہی رہا۔

بلند اختر۔ تمام عمر اُس میں بچوں کی سی عادتیں رہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔

حکیم جی۔ بہت اچھا اور جب ہمارا پیارا عزیز محبوب مکتب میں گیا تو اُس کے ہم مکتب اور ساتھیوں نے فوراً اُس کو شمعِ جان تصور کر لیا۔ قبول صورت تو تھا ہی۔ اُس پر بھولا پن۔ سرخ و سفید عورتوں کی نظروں کا نشانہ۔ نازک طبع۔ دردمند آواز۔ اور وہ قدرتی سہولت اور مقدرت جس سے وہ دوسرے لوگوں کی نظموں کو پڑھتا اور اُن کے خیالات کو ادا کرتا تھا سونے پر سہاگے کا مضمون ہوگیا۔

بلند اختر۔ (غضب ناک ہوکر) کیا آپ محبوب کی بابت یہ باتیں کہہ سکتے ہیں؟

حکیم جی۔ ہاں آپ کی اجازت سے۔ کیونکہ یہی

تو اصل محبوب ہے ۔ نہ کہ وہ بُت جس کے سامنے آپ
سربسجود ہیں ۔

بلند اختر ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ میں اسقدر
اندھا تو نہیں ہوں ۔

حکیم جی ۔ بہرحال یہ بھی حقیقت و اصلیت سے
عاری نہیں ۔ آپ کو معلوم ہو کہ آپ خود مریض ہیں ۔

بلند اختر ۔ حکیم جی ۔ ٹھیک کہتے ہیں ۔

حکیم جی ۔ جی ہاں ۔ بالکل ٹھیک ۔ آپ خود جہلِ
مرکب میں مبتلا ہیں ۔ اول تو آپ کا اصلاح و درستی
کا اہلک بخار اس پر غضب یہ کہ آپ ہمیشہ اوصاف
پرستی کے وہم میں مبتلا ۔ آپ کو سدا کوئی شے تعریف
و توصیف کرنے کے لیے چاہیئے ۔ اور اُس سے آپ
کو کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا ۔

بلند اختر ۔ دراصل میں اس کو اپنے تعلقات
کے دائرہ سے باہر تلاش کرنے سے ہی پا سکتا ہوں ۔

حکیم جی ۔ لیکن آپ ایسی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں
کہ اُن آدمیوں کو جو دنیا میں آپ کے آس پاس
رہتے ہیں معجز نگار و پُر اسرار ہستیاں خیال کرتے
ہیں یہ آپ کے نصب العین کو پیش کرنے کی دوسری
مثال ہے کہ آپ ایک معمولی کاروباری آدمی کے
جھونپڑے پر آئے ۔ لیکن اس گھر کے تمام آدمی پہلے ہی
دیوالیہ ہو چکے ہیں

بلند اختر ۔ جب آپ محبوب کے متعلق اِس سے زیادہ اعلیٰ
رائے قایم نہیں کر سکتے تو پھر کس طرح اُن کی صحبت سے
مسرت حاصل ہو سکتی ہے ؟

حکیم جی ۔ خدا آپ کو عقل دے ۔ میں آخر حکیم ہی ہوں
چاہے آپ نہ مانیں ۔ . . . . اور یہ میرا فرض ہے کہ میں ان
غریب لاچاروں کی طرف متوجہ ہوں جن کے مکان میں
میں رہتا ہوں ۔

بلند اختر ۔ واقعی ! تو کیا محبوب بھی روگی ہے ؟

حکیم جی ۔ اُسی پر کیا منحصر ہے تمام دنیا تقریباً روگی ہے

بلند اختر ۔ اور محبوب کے لیے آپ نے کیا علاج
تجویز کیا ؟

حکیم جی ۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ زندگی کو عمدہ
ظاہر کر سکوں ۔

بلند اختر ۔ عمدہ ! سننے میں تو غلطی نہیں ہوئی ۔

حکیم جی ۔ نہیں ۔ میں نے یہی کہا ۔ آپ کو معلوم ہو کہ
زندگی کا محرک اصول یہی ہے ۔

بلند اختر ۔ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ محبوب کی
زندگی کس طرح سُدھر سکتی ہے ؟

حکیم جی ۔ نہ پوچھیے ۔ میں اِس قسم کے راز ناتجربہ کار
عطائیوں کو نہیں بتلاتا ۔ آپ [illegible] بدتر حالت اُس

کی کئے دیتے ہیں۔ میرا طریق کارآزمایا جا چکا ہے۔ میں
نے اُس کو مولوی صاحب کی حالت میں بھی استعمال
کیا ہے۔ میں نے اُس کو آسیب زدہ بنا دیا ہے اور یہ تخیل
ہے جو ہر وقت اُس کی گردن پر سوار رہتا ہے۔

بلند اختر۔ تو کیا وہ آسیب زدہ نہیں ہیں؟

حکیم جی۔ خدا کے لیے یہ تو بتلائیے کہ آسیب زدہ سے
آپ کیا سمجھے؟ یہ محض ایک چال ہے جس سے میں اُس کو
زندہ رکھے ہوئے ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ غریب
بدبخت برسوں پہلے حسرت و یاس اور تنفر و استہزا کا شکار
ہو گیا ہوتا۔ اور یہی حالت اُس بوڑھے سردار کی ہے
لیکن علاج کو خود اُنھوں نے تلاش کر لیا ہے۔

بلند اختر۔ سردار نظیر خاں۔ اوہنہ! اُن کی بابت کیا؟

حکیم جی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ پرانا خرانٹ
تاریک بالاخانہ پر خرگوش مارنے جاتا ہے؟ اُس سے
زیادہ خوش قسمت و مسرور شکاری دنیا میں کہیں نہیں
ہے وہ اپنا وقت گزارتا ہے۔ چار پانچ چھوٹے پودے
جو وہاں موجود ہیں۔ بالکل بن کا منظر پیش کرتے ہیں
مرغ۔ مرغیاں۔ خرگوش اور دیگر جانور ہیں۔ ان کے
شکار کا اُس بڈھے کو بہت شوق تھا

بلند اختر۔ غریب بوڑھا سردار! ہاں فی الحقیقت
ایسے اپنی جوانی کے تخیلات کی شدت کو اب برداشت
کرنا پڑ رہا ہے۔

حکیم جی۔ بلند اختر صاحب۔ جہاں تک میں سمجھتا
آپ ان خوفناک الفاظ تخیل و نصب العین کو است
نہ کریں۔ ان کے مترادف ہمارے گھریلو لفظ جھوٹ
مکر و فریب ہیں۔

بلند اختر۔ کیا دراصل آپ کے خیال میں ان کا
ایک ہی ہے؟

حکیم جی۔ ہاں۔ کوئی فرق نہیں۔

بلند اختر۔ حکیم صاحب۔ جبتک میں محبوب کو آپ
پنجوں سے نجات نہ دلا دونگا مجھے صبر و قرار نہ آئیگا۔

حکیم جی۔ اوہنہ۔ اور خرابی واقع ہوگی۔ اگر آپ ا
معمولی آدمی کے سامنے سے یہ مغالطہ۔ یہ خیال دور کر دیں
تو اُس کی تمام مسرتوں کا خون ہو جائے گا۔ (رئیسہ سے
جو بیٹھک سے واپس آتی ہے) اچھا۔ چھوٹی جنگلی بط کی ما
میں تمہارے باپ کو نیچے دیکھنے جاتا ہوں کہ کہیں وہ لیٹے
ہوئے اپنی ایجاد کی ادھیڑ بن میں تو نہیں ہیں۔

(باہر چلا جاتا ہے)

بلند اختر۔ (رئیسہ کے پاس جاکر) تمہارے چہرے سے
پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک وہ کام پورا نہیں ہوا۔

رئیسہ۔ کونسا کام؟ جنگلی بط کی قربانی۔ آہ ابھی نہیں

بلند اختر۔ تو کیا عین وقت پر ہمت نے ساتھ نہ دیا؟

رئیسہ۔ نہیں یہ بات نہیں۔ بلکہ جب میں صبح سویرے جاگی اور رات کی گفتگو کو یاد کیا تو مجھے بہت تعجب ہوا۔

بلند اختر۔ تعجب آخر کیوں؟

رئیسہ۔ ہاں مجھے معلوم نہیں۔ کل رات جب ہم اس کی بابت گفتگو کر رہے تھے۔ تو یہ بہت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب سونے کے بعد میں نے دوبارہ یاد کیا تو بالکل مختلف مضمون تھا۔

بلند اختر۔ اونہہ اب سمجھا۔ معلوم ہوتا ہی کہ یہ ناممکن ہے کہ تم بغیر تکلیف اُٹھائے جوان بن جاؤ۔

رئیسہ۔ مجھے اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ اگر ابا جان واپس آجائیں تو......

بلند اختر۔ کاش تمہاری آنکھوں کو معلوم ہو جاتا کہ زندگی کس طرح قابل رہائش بنتی ہے۔ اگر تم میں نفس کشی کی اصلی۔ سچی باہمت جسارت ہوتی۔ تو تم کو پتہ چلتا کہ کس طرح تم ابا کو اپنے پاس بلالیتیں لیکن

رئیسہ مجھے اب بھی تمہاری ذات پر اعتماد ہے۔ (باہر چلا جاتا ہے رئیسہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور باورچی خانے کی طرف قدم اُٹھاتی ہی کہ عین اُس وقت بالاخانہ کے در پر دستک ہوتی ہے۔ وہ جاتی ہی اور قدرے کھول دیتی ہے۔ نظیر خاں اندر آتا ہی وہ کواڑ بند کر دیتی ہے)

نظیر خاں۔ اونہہ۔ یکہ و تنہا صبح کے وقت سیر میں لطف نہیں آتا۔

رئیسہ۔ دادا ابا۔ کیا شکار کو طبیعت نہیں چاہتی؟

نظیر خاں۔ آج شکار کا موسم نہیں۔ نہایت اندھیرا ہے۔ تھوڑی دور کی چیز بھی نظر نہیں آتی۔

رئیسہ۔ کیا خرگوش کے علاوہ کسی اور چیز کے شکار کو بھی آپ کا دل چاہتا ہے؟

نظیر خاں۔ اونہہ۔ کیا خرگوش کا شکار پُر لطف نہیں ہوتا۔

رئیسہ۔ ہاں لیکن جنگلی بط......؟

نظیر خاں۔ اوفوہ! کیا تم ڈرتی ہو کہ میں تمہاری جنگلی بط کو مار ڈالونگا۔ ہرگز نہیں۔ میں کبھی ایسا کرونگا

رئیسہ۔ نہیں۔ مجھے کافی امید ہے جنگلی بط کو شکار کرنا اہم کام ہے۔

نظیر خاں۔ نہیں نہیں۔ میں شکار تو کر سکتا ہوں۔

رئیسہ۔ بھلا آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ میری بط کو نہیں بلکہ اور کو۔

نظیر خاں۔ میں سینے پر گولی چلاؤنگا۔ کیونکہ یہی جگہ نازک اور یقینی ہوتی ہی۔ اور تم کو بازوؤں پر گولی چلانی چاہیئے۔ سمجھیں؟

رئیسہ۔ تب وہ مر جائے گی؟

نظیر خاں - یقینی۔ اگر نشانہ ٹھیک ہوا۔ اچھا میں اندر جاتا ہوں اور کپڑے بدلتا ہوں۔ اد ہنہ بھی۔ (دالیے کمرہ میں جاتا ہے۔ رئیسہ ٹھٹکتی ہے دروازہ پر دیکھتی ہی۔ پھر الماری کے پاس جاکر چپکے سے پستول اتار لیتی ہی اور دیکھتی ہے۔ جمیلہ جھاڑو اور جھاڑن سمیت بیٹھک سے واپس آجاتی ہے۔ رئیسہ جلدی سے پستول رکھدیتی ہی)۔

جمیلہ - رئیسہ۔ اپنے ابا کی چیزوں کو مت چھوؤ۔

رئیسہ - (الماری کے پاس سے ہٹ کر) میں ذرا چیزوں کو درست کر رہی تھی۔

جمیلہ - بہتر ہے کہ باورچی خانہ میں چلی جاؤ۔ اور دیکھو کہ چائے تیار ہے میں جب نیچے جاؤں گی تو خود کشتی میں چائے لیجاؤں گی۔

(رئیسہ چلی جاتی ہے۔ جمیلہ کمرے کو صاف کرنے لگتی ہی۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر کا دروازہ آہستہ سے کھلتا ہی! اور محبوب اندر جھانکتا ہے وہ کوٹ پہنے ہوئے ہی لیکن ٹوپی غائب ہے منہ بھی دُہلا ہوا نہیں بال بکھرے ہوئے ہیں! اور آنکھوں میں خمار ہی جمیلہ خاموش کھڑی رہ جاتی ہی اس کے ہاتھ میں جھاڑو ہے! اور محبوب کو تکنے لگتی ہے)

جمیلہ - کون؟ بابو صاحب! آپ تشریف لے آئے۔

محبوب خاں - (اندر آتا ہے اور بھری آواز میں کہتا ہے) میں آگیا لیکن واپس جانے کی نیت سے۔

جمیلہ - ہاں ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہی لیکن ذرا حالت پر تو رحم کرو کیسی صورت نکل آئی۔

محبوب خاں - کیسی صورت؟

جمیلہ - اور کوٹ! اس میں بھی سلوٹیں پڑی ہیں

رئیسہ - (باورچی خانے میں سے) اماں۔ کیا میں (محبوب کو دیکھتی ہی خوشی سے اچھل پڑتی ہے اور دوڑ ہی) ابا جان!۔ ابا جان!

محبوب خاں - (پیٹھ موڑ کر) چلی جاؤ۔ چلی جاؤ (جمیلہ سے) میں کہتا ہوں کہ اس کو میرے پاس سے بھگا دو۔

جمیلہ - (دبی زبان سے) رئیسہ! بیٹھک میں چلی جا۔
(وہ خاموش چلی جاتی ہے)

محبوب خاں - (میز کی کشتی نکال کر گویا بہت مشغو کار ہے) مجھے کتابیں درکار ہیں۔ کہاں گئیں؟

جمیلہ - کون سی کتابیں؟

محبوب خاں - میری سائنس کی کتابیں! اور د صنعت و حرفت کے رسالے جو مجھے ایجادیں دیتے ہیں

جمیلہ - (الماری میں دیکھکر) کیا وہ بغیر جلد کی ہیں

محبوب خاں - ہاں بیشک۔

جمیلہ - (رسالوں کا پلندہ میز پر ڈالکر) کیا میں ...

ے کہوں کہ ان کو درست کر دے۔

محبوب خاں۔ نہیں۔ درستی و صفائی کی حاجت نہیں۔ (قدرے خاموشی رہتی ہے)

جمیلہ۔ تو آپ نے طے کر لیا کہ ہمیں چھوڑ دیں گے

محبوب خاں۔ بالکل ظاہر ہے۔

جمیلہ۔ ہاں۔ ہاں۔ درست۔

محبوب خاں۔ (فکر مندی سے) میں یہاں رہ کر ہر گھڑی اپنے دل پر بجلیاں نہیں گرا سکتا۔

جمیلہ۔ خدا رحم کرے آپ میرے متعلق کیسے سخت سست الفاظ کہہ رہے ہیں۔

محبوب خاں۔ اچھا تو مجھے ثابت کر دو.....

جمیلہ۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ کو ثابت کرنا چاہئے۔

محبوب خاں۔ تمہاری گذشتہ زندگی؟ کچھ طلب و حاجت ہوتی ہیں جن کو ہم نصب العین سے تعبیر کرتے ہیں۔

جمیلہ۔ لیکن بڑے میاں کے متعلق کیا۔ اُن بوڑھی ہڈیوں کا کیا ہوگا؟۔

محبوب خاں۔ میں اپنے فرض کو سمجھتا ہوں۔ وہ بیچارہ غریب میرے دم کے ساتھ ہیں۔ میں شہر میں جا کر ان کا ٹھکانا کرونگا۔ اوہ۔ (جلدی سے) کیا کسی نے میری ٹوپی کو زینہ میں دیکھا؟۔

جمیلہ۔ نہیں کیا کھو گئی؟

محبوب خاں۔ بیشک۔ رات تو میرے پاس تھی لیکن صبح کو نہ مل سکی۔

جمیلہ۔ معاذ اللہ۔ آپ ان دونوں نقوں کے ساتھ کہاں گئے تھے؟

محبوب خاں۔ بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں بالتفصیل چیزوں کو یاد رکھ سکتا ہوں۔

جمیلہ۔ کہیں آپ کو سردی تو نہیں لگ گئی؟

(باورچی خانے میں جاتی ہے)

محبوب خاں۔ (میز کی کشتیاں خالی کرتا کرتا خود بخود غصہ میں بولنے لگتا ہے) حکیم جی۔ تم نہایت رذیل ہو۔ کمینہ ہو۔ ایک بے حیا دغا باز شخص۔ میرا بس چلے تو قتل ہی کر دوں۔ (کچھ پرانے خط ایک طرف رکھ دیتا ہے کل کے پھٹے خط کو اٹھا لیتا ہے۔ اور پرزوں کو دیکھتا ہے۔ لیکن جب جمیلہ اندر آتی ہے جلدی سے میز پر رکھ دیتا ہے)

جمیلہ۔ (میز پر ناشتہ رکھ کر) اگر پسند خاطر ہو تو گرم گرم چائے حاضر ہے۔ اور کچھ روٹی۔ مکھن اور قیمہ بھی۔

محبوب خاں۔ (کشتی پر دیکھ کر) قیمہ۔ اوہ نہ۔ پہلے کبھی بھی نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے چوبیس گھنٹے سے کچھ نہیں چکھا۔ لیکن اس سے کیا فائدہ میری تحریریں

میرے سوانح حیات کے ابتدائی مسودے۔ میرا روزنامچہ
اور میرے ضروری کاغذات آخر کہاں گئے (بیٹھک
کا دروازہ کھولتا ہے لیکن پیچھے ہٹ جاتا ہے) اونہہ۔
وہ یہاں بھی موجود ہے!

جمیلہ۔ خدا کی پناہ! آخر وہ غریب کہاں جائے؟

محبوب خاں۔ اندر آ جاؤ۔ (الگ کھڑا ہو جاتا ہے
رئیسہ کانپتی ہوئی کمرے میں آتی ہے۔ محبوب کواڑ کی چٹخنی
کو پکڑ لیتا ہے) اِن آخری لمحوں میں جو میں اِس مکان
میں گزار رہا ہوں میری دعا ہے کہ میں اُن تمام سے
جن کا یہاں کوئی کام نہیں ہے محفوظ رہوں۔
(کمرہ میں چلا جاتا ہے)

رئیسہ۔ (لپک کر اپنی ماں کے پاس جاتی ہے اور
دبی کپکپاتی آواز میں کہتی ہے) کیا اُن کا اشارہ میری
طرف ہے؟

جمیلہ۔ رئیسہ باورچی خانہ میں جاؤ۔ یا اچھا اپنے
کمرہ میں چلی جاؤ۔ (جمیلہ محبوب کے پاس جاتی ہے اور باتیں
کرنے لگتی ہے) ذرا تو ٹھہریئے۔ تمام کشتیوں کو تہ و بالا
نہ کرو مجھے بخوبی معلوم ہے کہ چیزیں کہاں کہاں رکھی ہیں؟
(رئیسہ ایک لمحہ تک بخوف ساکت کھڑی رہتی ہے آنسوؤں
کو روکنے کے لیے ہونٹوں کو چبا رہی ہے۔ پھر مٹھیوں کو
زور سے بند کرتی ہے اور آہستہ سے کہتی ہے) آہ جنگلی بلا!

(آہستہ جاتی ہے اور الماری سے پستول اُچک لیتی۔
بالاخانہ کا دروازہ کھولتی اندر داخل ہوتی اور کو
کو بند کر لیتی ہے۔ محبوب خاں اور جمیلہ بیگم بیٹھک میں مشـ
گفتگو ہیں۔ محبوب کچھ پرانے کاغذ لیکر باہر آتا ہے ا
ان کو میز پر رکھدیتا ہے)

محبوب خاں۔ اس خورجی میں سب سامان
آسکے گا۔ مجھے سینکڑوں چیزیں

جمیلہ۔ (خورجی کو اٹھاتے ہوئے) اچھا تو اور کـ
دیجیئے۔ ایک قمیص اور ایک میز ہی لیجائیے۔

محبوب خاں۔ اونہہ۔ یہ مہلک تیاریاں! (ا
کوٹ اتارتا ہے اور صوفہ پر پھینک دیتا ہے)

جمیلہ۔ اور یہاں چائے بھی ٹھنڈی ہوئی جاتی

محبوب خاں۔ (ایک گھونٹ پیتا ہے پھر اور گھونٹ

جمیلہ۔ (کرسیوں کو صاف کرتے ہوئے) تو کیا (
بالاخانہ خرگوشوں کے لیے بنانا پڑے گا؟

محبوب خاں۔ کیا! کیا میں خرگوشوں کو بھی ا
ساتھ لیجاؤں گا؟

جمیلہ۔ ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ بڑے میاں بغیر خرگـ
کے زندہ نہیں رہ سکتے۔

محبوب خاں۔ وہ اس کے بھی عادی ہو جائیں
مجھے تو خرگوشوں سے بھی زیادہ بیش قیمت ضروری چ

کو خیرباد کہنا پڑے گا

جمیلہ۔(کتابوں کی الماری کو صاف کرکے) کیا آپ کا الغوزہ بھی کشتی میں رکھدوں؟

محبوب خاں۔نہیں۔کوئی بانسری وانسری نہیں۔مجھے پستول چاہیئے۔

جمیلہ۔تو کیا پستول لیجانے کا ارادہ ہے؟

محبوب خاں۔ہاں میرا بھرا ہوا پستول!

جمیلہ۔(ڈھونڈھتے ہوئے) یہاں نہیں ہے شاید بڑے یہاں لے گئے ہوں

محبوب خاں۔کیا وہ بالاخانہ پر ہیں؟

جمیلہ۔ہاں ضرور۔

محبوب خاں۔اونہہ۔غریب مجبور تو تنہا! (ٹکیہ کھاتا ہے اور چائے پیتا ہے)

جمیلہ۔اگر ہم نے اپنا دوسرا کمرہ کرایہ پر نہ دیا ہوتا تو آپ وہیں چلے جاتے۔

محبوب خاں۔کیا اس مکان کی چھت کے نیچے رہونگا؟ نہیں۔ہرگز نہیں۔

جمیلہ۔لیکن کیا ایک دو دن کے لئے بیٹھک میں قیام کرنا بھی قباحت ہے۔یہ تو سب آپ کا ہی ہے۔

محبوب خاں۔اس گھر میں۔قطعی نہیں۔

جمیلہ۔اچھا تو پھر نیچے حکیم جی و مولوی صاحب کے ساتھ

محبوب خاں۔اُن کا نام نہ لو۔اُن کا خیال ہی میری بھوک کو مارے ڈالتا ہے۔نہیں۔نہیں۔میں ابھی جاؤنگا گھر گھر جاؤں گا اور اپنے اور باپ کے لیے جگہ ڈھونڈھونگا

جمیلہ۔لیکن سر پر ٹوپی تو ہے نہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ وہ گم ہو گئی

محبوب خاں۔کچھ مضائقہ نہیں۔میں ٹوپی خرید لونگا۔(دوسری ٹکیہ اٹھاتا ہے) مجھے ضروری انتظام کرلینا چاہیئے۔میں اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا (کسی چیز کو کشتی میں تلاش کرتا ہے)

جمیلہ۔کیا دیکھ رہے ہیں؟

محبوب خاں۔مکھن چاہیئے۔

جمیلہ۔بہت خوب۔میں ابھی لاتی ہوں۔

(باورچی خانے میں جاتی ہے)

محبوب خاں۔(پکارتے ہوئے) کچھ حاجت نہیں روکھی روٹی سے ہی کام چل جائیگا۔

جمیلہ۔(مکھن لاکر) دیکھئے تازہ مکھن ہے۔(دوسری پیالی چائے کی بناتی ہے۔محبوب صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے اور ٹکیہ پر مکھن لگا لیتا ہے۔تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھاتا اور پیتا ہے)

محبوب خاں۔اگر میں نے ایسا طے کر لیا تو کیا

......کسی کو تکلیف دیئے بغیر... ایک دو دن کے
لیے میں بیٹھک میں ٹھہر سکتا ہوں۔
جمیلہ۔ بلاشبہ۔ اگر قبول فرمائیں۔
محبوب خاں۔ ہاں۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوتا ہے
کہ میں ابا کی تمام چیزیں ایک منٹ میں نہیں نکال سکتا
جمیلہ۔ اور علاوہ ازیں آپ کو پہلے انھیں تبلانا
بھی تو ہے کہ آپ ہمارے ساتھ زیادہ نہیں رہ سکتے
محبوب خاں۔ (پیالی رکھ کر) بیشک۔ یہ دوسری
مصیبت ہے۔ مجھے پھر تمام پیچیدہ گتھیاں سلجھانی ہونگی۔
مجھے حالتِ معاملہ پر غور کر لینا چاہیئے۔ لیکن مجھے سانس
لینے کی بھی تو مہلت نہیں ہے۔ میں ایک دن میں ان تمام
مراحل کو طے نہیں کر سکتا
جمیلہ۔ بیشک نہیں۔ اور خصوصاً ایسے خراب موسم میں
محبوب خاں۔ (دھرعالم کے خط کو الٹ پلٹ کر)
میں دیکھتا ہوں کہ یہ خط ابھی تک یہاں پڑا ہوا ہے
جمیلہ۔ ہاں۔ میں نے اِس کو چھوا تک نہیں۔
محبوب خاں۔ اِس غلاظت کا مجھ سے کیا تعلق؟
جمیلہ۔ میرا خیال ہے کہ میرا بھی اِس سے کچھ مطلب نہیں
محبوب خاں۔ لیکن کیا یہ کافی نہیں کہ یہ نظروں
کے سامنے موجود ہے۔ میری یہاں سے حرکت میں یہ بھی
باآسانی....

جمیلہ۔ میں اس کی نگرانی کروں گی۔
محبوب خاں۔ ہبہ نامہ! نوازش نامہ ا
پہلے تو ابا جان کی ملکیت ہے۔ اور یہ اُن کا کام
اِس سے فائدہ اٹھائیں۔
جمیلہ۔ (آہ بھر کر) ہاں غریب مجبور بڑھے
محبوب خاں۔ ہاں حفاظت کی خاطر..
گوند تو لاؤ۔
جمیلہ۔ (کتابوں کی الماری کے پاس تلاش
ہوئے) لیجئے۔ یہ رہی گوند دانی۔
محبوب خاں۔ اور برش۔
جمیلہ۔ برش بھی یہ رہا۔ (اُس کے پاس لا
محبوب خاں۔ (قینچی لیکر خط کی پشت پر ا
لئے کاغذ کا ایک پرزہ کاٹتا ہے اور چسپاں کرتا ہے
دن نہ لائے کہ میں دوسروں کی حق تلفی کروں
میں دست اندازی کروں۔ اور خاصکر ایک غ
بوڑھے آدمی کی۔ اور فی الحقیقت دوسروں ک
لیجئے ذرا اسے یہیں رہنے دو۔ اور جب خشک ہ
تو اٹھا لینا۔ میں نہیں چاہتا کہ پھر اِس کاغذ پر نگاہ
ہرگز نہیں۔ (بلند اختر داخل ہوتا ہے)
بلند اختر۔ (قدرے متعجب ہو کر) محبوب خاں
آپ یہاں بیٹھے ہیں؟

محبوب خاں۔ (جلدی سے کھڑا ہو کر) ہاں۔ میں
ں کر بیٹھ گیا تھا۔

بلند اختر۔ اچھا۔ ناشتہ کر رہے ہو۔

محبوب خاں۔ جسم کا بھی حق ہوتا ہے اس کو بھی
ا کرنا چاہیے۔

بلند اختر۔ اونہہ۔ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟

محبوب خاں۔ میرے لیے صرف ایک راہ کھلی
ں ہے۔ فی الحال میں اپنی ضروری چیزیں ٹھیک کرنا
ں۔ لیکن آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس کے لیے بھی وقت
کار ہے۔

جمیلہ۔ (قدرے اضطراب سے) کیا میں کمرہ کو آراستہ
وں یا سامان کو باندھوں۔

محبوب خاں۔ (بلند اختر کی طرف جھنجھلا کر) باندھو
رکمرے کو بھی آراستہ کرو۔

بلند اختر۔ (تھوڑے توقف کے بعد) مجھے نہیں
لوم تھا کہ یہ انجام ہوگا۔ کیا دراصل یہ ضروری ہے کہ
ربار کو خیرباد کہہ دیا جائے۔

محبوب خاں۔ (اضطرابی سے ٹہلتے ہوئے) تب
ڈ میں کیا کروں؟ رنج و آلام کا مقابلہ تو ہو نہیں
تا۔ اختر صاحب مجھے امن و امان اور صلح و اطمینان
ب کی اشد ضرورت ہے۔

بلند اختر۔ لیکن امن و امان یہاں بھی تو مل سکتا ہے
ذرا کوشش کرو۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ کے پاس
اصلی زندگی کے شروع کرنے کے معقول وجوہات ہیں۔
اور ہاں یہ بھی یاد رہے کہ دلچسپی کی دیگر چیز ایجادات ہیں

محبوب خاں۔ اللہ۔ اُن کا تذکرہ نہ چھیڑو۔ مجھے ہرگز
تعجب نہ ہوگا اگر وہ ایسی ہی نا مکمل اور ادھوری رہ جائیں

بلند اختر۔ واقعی؟

محبوب خاں۔ خدا شاہد ہے۔ ہاں ذرا یہ تو بتلائیے
کہ میں کیا ایجاد کرنے والا ہوں۔ دوسرے آدمیوں نے
بہت کچھ بنا ڈالا اور اب روزانہ معاملہ مشکل ہوتا جاتا ہے

بلند اختر۔ لیکن آپ نے تو اس پر بہت محنت سے
کام کیا ہے۔

محبوب خاں۔ یہ وہ بدمعاش مرزا تھا جس نے
مجھے اس کام کی ترغیب دی۔

بلند اختر۔ مرزا عباس! حکیم جی! اوہ!

محبوب خاں۔ ہاں یہی وہ ذات شریف ہیں
جنھوں نے میری استعداد ایجاد کو ظاہر کیا۔ اور بتلایا
کہ فوٹو گرافی میں کوئی قابل قدر و حیرت انگیز ایجاد کروں

بلند اختر۔ اہا ہا۔ حکیم صاحب محرک بنے

محبوب خاں۔ اختر صاحب۔ مجھے اس میں اس
قدر لذت و مسرت نصیب ہوئی۔ خود ایجاد کی تمنا

ہیں۔ لیکن چونکہ رئیسہ اس پر ایک بچہ کی طرح پورے
وثوق و دلی جذبہ کے ساتھ یقین رکھتی تھی۔ اور یہ کہنا
غلط نہ ہوگا کہ میں بیوقوفی سے خیال کرنے لگا کہ وہ
اس پر یقین رکھتی ہے

بلند اختر۔ کیا دراصل آپ سمجھتے ہیں کہ رئیسہ اپنے خیالات
میں پاک وصاف نہ تھی

محبوب خاں۔ اب تو میں سب کچھ فرض کر سکتا
ہوں۔ رئیسہ ہی میری راہ میں حائل ہے اُس نے
میری زندگی کی تمام روح کھینچ لی ہے

بلند اختر۔ رئیسہ! کیا رئیسہ کی بابت کہہ رہے ہو۔
وہ یہ کس طرح کر سکتی تھی۔

محبوب خاں۔ (بغیر جواب دیئے خود بخود بولتا ہے)
آہ! میں کس طرح حدِ بیان سے باہر اس بچہ سے محبت
کرتا تھا۔ اور ہر مرتبہ جب میں اس تاریک گھر میں داخل
ہوتا مجھے بے اندازہ مسرت ہوتی تھی۔ اور وہ ملنے کے
لیے دوڑی آتی۔ اُس کی آنکھیں کچھ کھلی کچھ بند رہتی تھیں
آہ یہ انتہائی حماقت تھی! میں اس کو بیحد پیار کرتا
میں مغالطہ میں تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ بھی اسیقدر مجھ سے
محبت کرتی ہے

بلند اختر۔ تو کیا یہ محض دھوکا تھا۔ فریب تھا؟

محبوب خاں۔ میں کیسے بتلا سکتا ہوں! جمیلہ سے
تو مجھے کسی قسم کی امید نہیں۔ اور وہ بچی ان پیچید[illegible]
اور ژولیدگیوں کے اصلی پہلو کو سمجھنے سے قطعی[illegible]
لیکن اختر صاحب۔ میں آپ سے اپنے دل کا را[illegible]
کر سکتا ہوں۔ مجھے یہ خوفناک شبہ ہے۔۔۔ کہ [illegible]
رئیسہ نے کبھی بھی صحیح طور پر مجھ سے محبت نہیں کی

بلند اختر۔ یہ ممکن ہے مگر اس کا ثبوت مل سکتا
(سنتا ہے) وہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جنگلی
کو چیختے سنا۔

محبوب خاں۔ ہاں جنگلی بطخ چیخ رہی ہے۔ ا[illegible]
جان بالاخانہ پر ہیں۔

بلند اختر۔ کیا وہ ہیں؟ (اُس کے چہرے پر [illegible]
کے آثار نمایاں ہوتے ہیں) میں سمجھتا ہوں کہ آپ
اب بھی اس امر کا ثبوت مل سکتا ہے کہ غریب مظلو[م]
رئیسہ دراصل محبت کرتی ہے۔

محبوب خاں۔ وہ کیا ثبوت دے سکتی ہے؟
مجھے اُس کے کسی قسم کے ثبوت کا یقین نہیں ہو سکتا

بلند اختر۔ اس میں ایک شائبہ بھی مکر و فریب کا نہیں

محبوب خاں۔ آخاہ! یہی خار تو دل میں کھٹک ر[ہا]
ہے۔ اس کا کیسے یقین ہو۔ کون جانتا ہے کہ جمیلہ اور [illegible]
نے کس قسم کا جال پھیلایا ہے۔ اور رئیسہ ہمہ تن گوش[illegible]
ہے۔ میں خوب واقف ہوں۔ شاید یہ انعام کا وعدہ

بکایک ہی نہیں آگیا۔ دراصل دال میں کچھ کالا ہے۔

بلند اختر۔ محبوب صاحب آپ کو ہو کیا گیا ہے؟
ہوش میں آؤ۔

محبوب خاں۔ میں خوب ہوش میں ہوں۔ ذرا
ٹہرو اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ انعامی رقعہ محض
بتدا ہے آمنہ بیگم پہلے ہی سے رئیسہ پر خوب قابو رکھتی
ہ اور یہ اُس کے اختیار میں ہے کہ اس بچہ کے ساتھ
رچاہے کردے۔ اور جب چاہے بچہ کو مجھ سے جدا کر سکتی ہے

بلند اختر۔ رئیسہ آپ کو کبھی نہ چھوڑے گی۔۔۔۔
۔ ۔ یقین مانو۔

محبوب خاں۔ اس قدر دعویٰ نہ کرو۔ اگر وہ
پنے ہاتھوں میں تحفہ تحائف لیکر آئے اور اشارہ
ے۔۔۔۔۔ اور آہ میں حد سے زیادہ محبت کرتا
ا۔۔۔۔ میں جس کی بڑی حسرت یہی تھی کہ تمام عمر
ں کی نگاہ بانی کروں۔ مدد کروں۔ جس طرح کہ ایک
پہ کی مدد و نگرانی کیجاتی ہے۔ جو بڑے کمرے میں جانے
ے اندھیرے کے باعث ڈرتا ہو! اب مجھے خوفناک
رسے یقین ہوتا جاتا ہے کہ غریب مصور اس حقیر
ونپڑے میں رد کر ہر گز صحیح معنی میں اور جائز طور پر
ں کے ساتھ کچھ لگاؤ نہ رکھتا تھا۔ ہاں وہ نہایت
شیاری سے اُس بناوٹی تعلق کو نباہتی رہی۔

بلند اختر۔ محبوب صاحب۔ کیا واقعی آپ کا یہ خیال
ہے؟

محبوب خاں۔ یہی تو مقام افسوس ہے کہ میں خود
نہیں سمجھتا کہ کیا یقین کروں اور کیا نہ کروں! اور شاید
کبھی نہ جان سکوں گا لیکن کیا آپ کو اس کی صداقت
پر شبہ ہے۔ آہا ہا۔ پیارے اختر صاحب آپ اپنے
نصب العین کی واقعیت و صداقت پر کتنا یقین رکھتے
ہیں۔ آہ اگر دوسرے صاحب آئیں اور بچہ کو پکاریں
کہ "اِس کے پاس سے چلی آؤ۔" تب آپ کو معلوم
ہوگا کہ ہماری زندگی کس قابل ہے؟

بلند اختر۔ (جلدی سے) تو آپ کا کیا خیال ہے؟

محبوب خاں۔ اگر میں اس وقت اُس سے کہوں
کہ "رئیسہ میری خاطر اس قسم کی زندگی کو قبول نہ کرو"
(ہنستا ہے) تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کس
قسم کا جواب ملتا ہے۔ (اندر سے گولی چلنے کی آواز
آتی ہے)

محبوب خاں۔ سُنو وہ شکار میں مشغول ہیں۔

جمیلہ۔ (اندر آکر) بابو صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے
میاں بالاخانہ پر نشانہ بازی کر رہے ہیں

محبوب خاں۔ میں دیکھتا ہوں

بلند اختر۔ (جوش میں) ذرا ٹھہرو۔ معلوم ہے کیسی

آواز تھی؟۔

محبوب خاں۔ بیشک مجھے معلوم ہے

بلند اختر۔ نہیں آپ نہیں جانتے۔ یہی وہ مطلوبہ ثبوت ہے

محبوب خاں۔ کیسا ثبوت!

بلند اختر۔ بچی کا عملِ قربانی۔ اُس نے دادا سے جنگلی بط کو قربان کرا دیا۔

محبوب خاں۔ جنگلی بط کو!

جمیلہ۔ ذرا غور تو کیجئے۔

محبوب خاں۔ کس واسطے؟

بلند اختر۔ وہ آپ کی خاطر سب سے عزیز ترین دولت کو قربان کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح آپ اُس سے پھر محبت کرنے لگیں گے۔

محبوب خاں۔ (جذبہ سے متاثر ہو کر) غریب بیوقوف!

جمیلہ۔ دیکھئے تو کیا کیا سوچتی ہے!

بلند اختر۔ محبوب صاحب وہ آپ کی محبت کی طلبگار تھی۔ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ زندگی باپ بغیر محال ہے

جمیلہ۔ (آنسوؤں کو پونچھ کر) بابو صاحب ا... مجھے

محبوب خاں۔ بیگم وہ کہاں ہے؟

جمیلہ۔ (سانس لیکر) بیچاری۔ باورچی خانہ میں ہوگی۔

محبوب خاں۔ (دوڑ کر باورچی خانہ میں پکارتا ہے) رئیسہ! رئیسہ! یہاں آؤ۔ (چاروں طرف دیکھتا ہے) نہیں وہ یہاں نہیں ہے۔

جمیلہ۔ تو وہ اپنے کمرہ میں ہوگی۔

محبوب خاں۔ (کمرہ کی طرف جا کر) نہیں وہ یہاں بھی نہیں ہے۔ (اندر آتا ہے) شاید باہر چلی گئی ہو۔

جمیلہ۔ ہاں۔ آپ تو اُس کا گھر میں رہنا ہی پسند نہیں کرتے تھے۔

محبوب خاں۔ کاش وہ جلد آئے تاکہ میں اُسے بتلا سکوں ...... بلند اختر صاحب اب سب معاملات ٹھیک ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ضرور تجدیدِ زندگانی ہو سکتی ہے۔

بلند اختر۔ (چپکے چپکے) میں تو جانتا ہی تھا کہ بچہ کے ذریعہ تلافیٔ مافات ہو سکتی ہے

(نظیر خاں اپنے کمرہ کے دروازے تک آتا ہے۔ پوری وردی پہنے ہوئے ہے اور تلوار کو باندھ رہا ہے)

محبوب خاں۔ (تعجب میں) ابا جان آپ تو یہاں ہیں

جمیلہ۔ کیا آپ نے کمرہ میں گولی چلائی؟

نظیر خاں۔ (غصہ سے) محبوب کیا تم اکیلے شکار کو جانے لگے؟

محبوب خاں۔ (متوحش و بیقرار ہوکر) تو گیا بالاخانہ پر آپ شکار نہ کر رہے تھے؟

نظیر خاں۔ میں اور شکار! ٹھیک ہے۔

بلند اختر۔ (محبوب کو پکار کر) معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خود جنگلی بط کو مار ڈالا۔

محبوب خاں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ (فوراً بالاخانہ کی طرف جاتا ہے۔ کواڑ کھولتا ہے اور چلا اُٹھتا ہے۔ رئیسہ! رئیسہ!

جمیلہ۔ (کواڑوں تک دوڑ کر) خدارا۔ یہ کیا ہوا!

محبوب خاں۔ (اندر جاکر) وہ فرش پر پڑی ہے۔

بلند اختر۔ رئیسہ فرش پر! (محبوب کے پاس جاتا ہے)

جمیلہ۔ (اُسی وقت) رئیسہ! (اندر سے) نہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔

نظیر خاں۔ اوفوہ۔ کیا وہ بھی شکار کرنے لگی

(محبوب۔ جمیلہ اور اختر رئیسہ کو کمرہ میں لیجاتے ہیں پستول سختی سے اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ جو نیچے لٹک رہا ہے)

محبوب خاں۔ (دل شکستہ ہو کر) پستول چھوٹ گیا اور وہ زخمی ہوگئی۔ مدد! ارے مدد!

جمیلہ۔ (دوڑتی ہے اور پکارتی ہے) حکیم جی۔

حکیم جی۔ مرزا عباس صاحب بہت جلد آؤ خدا کیواسطے

(محبوب اور اختر رئیسہ کو صوفہ پر لٹا دیتے ہیں)

نظیر خاں۔ (خاموشی سے) بَن خود اپنا بدلا لے رہے ہیں۔

محبوب خاں۔ (رئیسہ کے پاس جھکے ہوئے) وہ ہوش میں آ رہی ہے۔ ہوش میں۔ ہاں ہاں۔

جمیلہ۔ (جو واپس آگئی ہے) گولی کہاں لگی؟ مجھے تو نظر نہیں آتی (حکیم جی بھاگے آتے ہیں اور مولوی صاحب بھی پیچھے پیچھے ہیں)

حکیم جی۔ کیا معاملہ ہے؟ خیریت!

جمیلہ۔ یہ کہتے ہیں رئیسہ نے گولی مارلی۔

محبوب خاں۔ یہاں۔ یہاں۔ دیکھو۔ یہ دیکھو۔

حکیم جی۔ اپنے گولی ماری۔ (میز کو الگ کرکے دیکھنے لگتا ہے)

محبوب خاں۔ (فکرمندانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے)

حکیم جی۔ کیا! شاید خطرناک نہیں۔ خون تو نکل ہی نہیں رہا۔ یہ مہلک نہیں۔

حکیم جی۔ کیسے لگی؟

محبوب خاں۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔

جمیلہ۔ جنگلی بط کو مارنا چاہتی تھی۔

حکیم جی۔ جنگلی بط کو! اوہ۔

محبوب خاں۔ آہ پستول چل گیا۔

حکیم جی۔ اوہ ۔ بالکل ٹھیک۔

نظیر خاں۔ بن اپنا بدلہ لے رہے ہیں۔ لیکن مجھے اندیشہ نہیں۔ (بالاخانہ پر جاتا ہے اور دروازہ بند کر لیتا ہے۔

محبوب خاں۔ ہاں حکیم جی۔ کچھ تو کیجیے۔

حکیم جی۔ گولی اندر سینہ میں گھس گئی۔

محبوب خاں۔ ہاں لیکن وہ ہوش میں آ رہی ہے

جمیلہ۔ (روتے ہوئے) میری بچی! میری بچی!

بلند اختر۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) سمندر کی تہ میں!

محبوب خاں۔ (اچھل کر) ہاں ہاں اُسے زندہ رہنا چاہیئے۔ ہاں حکیم جی۔ خدا کے لیے ایک لمحہ کے لیے! ذرا اتنی دیر تو کہ میں اس کو تبلا دوں کہ میری محبت کس درجہ تھی۔

حکیم جی۔ دل زخمی ہو گیا۔ اندرون سینہ گولی لگی اور وہ فوراً ختم ہو گئی۔

محبوب خاں۔ اور میں نے اس کو مار ڈالا۔ وہ ایک خوف زدہ جانور کی مانند بالاخانہ پر بھاگ گئی اور میری محبت میں مر گئی (سسکیاں لیتے ہوئے) میں کیا مداوا کر سکتا ہوں! میں ہرگز اُس کو نہیں تبلا سکتا۔

(مٹھیوں کو بند کر لیتا اور زور سے چلاتا ہے) اے خدا ہمارے سروں پر ہے اگر فی الحقیقت تو وہاں ہے کس لیے مجھے اس مصیبت میں ڈالا۔

جمیلہ۔ چپو۔ چپو۔ اس طرح شور نہ مچاؤ۔ ہم کو اُ روکنے کا کوئی حق نہ تھا۔

مولوی صاحب۔ بچی مری نہیں بلکہ سوتی ہے۔

حکیم جی۔ بیہودہ پن! خاموش!

محبوب خاں۔ (خاموشی سے صوفہ پر جاتا ہے ہاتھوں کو اُس کی گردن میں حمائل کر کے دیکھتا ہے ہائے کیسی خاموشی! کیسی سخت اکڑی ہوئی۔

حکیم جی۔ (پستول کو چھڑاتے ہوئے) کیسی جکڑا ہوئے۔ اللہ! اللہ!

جمیلہ۔ نہیں۔ نہیں حکیم جی اس کی انگلیوں کو نہ جھٹکا چھوؤ مت۔

محبوب خاں۔ وہ اس کو اپنے ساتھ لیجائے گی

جمیلہ۔ ہاں رہنے دو۔ لیکن تماشہ کے لئے اس کو یہا مت چھوڑو۔ اس کو اس کے چھوٹے سے کرہ میں پہنچا دو میرے ساتھ لیچلو (وہ اور محبوب رئیسہ کو لیجاتے ہیں)

محبوب خاں۔ (جب لیکر چلتے ہیں) بیگم۔ بیگم۔ کیا اس مصیبت سے سر لیجا سکتی ہو۔

جمیلہ۔ ہاں ایک دوسرے کی مدد سے۔ اب میں
سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں کا اس میں حصہ ہے۔

مولوی صاحب۔ (ہاتھوں کو پھیلا کر) سدا نام
[illegible] کا! مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں!

حکیم جی۔ (چپکے سے) بیوقوف! خاموش ہو
یا ہوش میں نہیں؟

(محبوب اور جمیلہ باورچی خانے میں سے نعش
باہر لیجاتے ہیں۔ حکیم جی اُن کو دیکھتے رہتے ہیں مولوی صاحب
[illegible]چکے سے باہر نکلجاتے ہیں)

حکیم جی۔ (اختر کے پاس جاکر) مجھے یقین نہیں
[illegible]سکتا کہ یہ محض اتفاق ہوا

بلند اختر۔ (خوف زدہ ہی اور چہرے کا رنگ زرد
[illegible]لیا ہی) کوئی نہیں بتلا سکتا کہ یہ اندوہناک واقعہ کیسے ہوا؟

حکیم جی۔ شعلہ نے اُس کی قمیص کو جلا دیا ہے۔ غالباً
[illegible]اس نے پستول کو اپنے سر پر رکھکر چلایا ہوگا

بلند اختر۔ رئیسہ نے بیکار محض جان نہیں دی۔ آپ
[illegible]نے دیکھا کہ کس طرح غم نے اُس کے جذبۂ شرافت کو اُبھارا۔

حکیم جی۔ موت کی موجودگی میں بہت لوگ اپنے
[illegible]جوہر شرافت کا اظہار کر دیتے ہیں۔ لیکن کب تک بھلائی و بہبودی
[illegible]کے جذبہ کی یہ امنگ محبوب کے دل میں قایم رہے گی؟

بلند اختر۔ تا بحیات۔ انشاء اللہ۔ بلکہ یہ جذبہ اور
[illegible]ترقی پذیر ہوگا۔

حکیم جی۔ آٹھ۔ نو مہینے میں چھوٹی رئیسہ محض ایک افسانہ
رہ جائے گی

بلند اختر۔ کیا آپ محبوب صاحب کی بابت یہ کہنے کی
جراءت کر سکتے ہیں۔

حکیم جی۔ ہم پھر اس مسئلہ پر گفتگو کریں گے جب اُس
کی قبر پر گھاس جم جائیگی۔ تب آپ کو معلوم ہوگا کہ کس
طرح وہ فخریہ کہتا ہوگا "بچی بیوقت اپنے پیارے باپ
کی گود سے چھین لی گئی"۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ خود ستائی
و خود برتری کے جذباتی ہیجان میں مبتلا ہوگا۔ ذرا
توقف کیجئے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

بلند اختر۔ اگر آپ کا خیال صحیح نکلا اور میرا غلط۔
تو زندگی قابل رہائش نہیں

حکیم جی۔ زندگی اچھی ہو سکتی ہے اگر ہمیں ان مردود
گدھوں سے نجات ملجائے جو غریب آدمیوں کے گھروں
پر آکر نصب العین زندگی کی ضرورتوں کو ظاہر کرتے ہیں

بلند اختر۔ (اُس کے چہرے پر غور سے دیکھکر) اگر یہ
واقعہ ہے تو مجھے اپنی قسمت پر۔ اچھی یا بُری جیسی بھی ہے
خوب نازاں ہونا چاہیے۔

حکیم جی۔ معاف کیجئے لیکن . . . کیا ہی آپ کی قسمت؟

بلند اختر۔ (جاتے ہوئے) کھانے پر تیرہ آدمیوں کا
اجتماع!

حکیم جی۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں!

(ہنرک ابسن) مترجمہ مدیر

غزل

ہر بند سے آزاد گرفتارِ بتاں ہے
عالم میں یہی شغل تو اک راحتِ جاں

منظورِ نظر کعبہ نہ درگاہِ بتاں ہے
مقصود مری خاکِ رہِ پیرِ مغاں

اے شیخ عجب معجزۂ پیرِ مغاں ہے
جس پیرِ خرابات کو دیکھا وہ جواں

مستانِ مئے عشق کی یہ بزم ہے زاہد
اللہ بھی ہے ساقیٔ کوثر بھی یہاں

اک تو ہی جسے نام سے عشاق کے نفرت
اک میں ہوں ترا نام جسے وردِ زباں

اُڑ جائیں دھوئیں چرخ کے وہ نالہ ہو اپنا
عالم تہ و بالا ہو ہماری وہ فغاں

کیا بادہ کشِ عشق کو ہو موت کا کھٹکا
پوشیدہ شریفؔ اس میں ہی آبِ حیواں ہے

حکیم محمد شریف الزماں شریفؔ

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم
سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی

میرا اسکول

میری عمر چالیس برس کے قریب تھی جب میں نے بنگال میں اپنے اسکول کی بنیاد ڈالی اور یقیناً مجھ ایسے شخص
ے جس کی تمام عمر مضمون نگاری اور شعر و شاعری میں گذری ہو اس بات کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی تھی
ں لیے لوگوں کا لازمی طور پر یہ خیال ہوا کہ بحیثیت اسکول کے یہ درسگاہ کسی اعلیٰ نوعیت کی نہیں ہو سکتی لیکن
ساتھ ہی ان کا یہ بھی خیال تھا کہ یہ مدرسہ جیسا کچھ بھی ہو اپنی شان کا انوکھا ہوگا

اکثر اصحاب مجھ سے دریافت کیا کرتے تھے کہ وہ کون سا خیال ہے جس پر میں نے اس اسکول کی بنیاد رکھی
ہے؟ یہ سوال میرے لیے نہایت پریشان کن تھا۔ کیونکہ میں ان کی توقعات کے بموجب کوئی تسلی بخش جواب
ہیں دے سکتا تھا۔ تاہم میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اپنی جدتِ طبع کی آزمائش کرونگا اور محض صداقت پر قانع
ہونگا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بتلانا دشوار ہے کہ میری درسگاہ کی بنیاد کس خیال پر قائم کی گئی ہے

کیونکہ یہ خیال اس مقررہ بنیاد کی طرح نہیں ہے جس پر عمارت استادہ کی جاتی ہے بلکہ اس بیج کی طرح
ہے جو اُگنے کے بعد نہ شناخت کیا جا سکتا ہے اور نہ پودے سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ گو مجھے اس سکول کے وجود
لی علتِ غائی معلوم ہے۔ لیکن اس تحریک کا اصلی سبب کوئی نادر نظریۂ تعلیم نہیں تھا بلکہ صرف ایام طالبعلمی
لی یاد کو قائم رکھنا

یں ان ایام کی ناخوشگواری پورے طور پر اپنی عجیب طبیعت سے منسوب نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی اُن مدارس
کا کوئی قصور ہے جن میں مجھے داخل کیا گیا۔ اگر مجھ میں احساس کا مادہ ذرا کم ہوتا تو شاید میں اپنے آپ کو صعوبتوں
کے لیے تیار کر سکتا اور کافی عرصہ تک یونیورسٹی کی اسناد حاصل کرنے میں مصروف رہتا۔ لیکن مدرسہ مدرسہ ہی
ہے گو ان میں سے بعض برے ہوتے ہیں بعض اچھے۔

ماں کا دودھ بچوں کی خوراک ہے۔ ماں ایک ہی وقت میں ان کے لیے خوراک کا سامان بھی مہیا و[illegible]

نگراں بھی۔ وہ اُن کی مکمل روحانی اور جسمانی غذا رہے۔ وہ ان کو اس زبردست صداقت سے متعارف کرائ
کہ آدمی کا دنیا سے حقیقی تعلق ذاتی جذبۂ محبت کی وجہ سے ہے نہ کہ علت و معلول کے سلسلہ پر ایک کتاب کے آغ
و انجام میں بہت کچھ مماثلت و مشابہت ہوتی ہے۔ ہر دو مواقع پر صداقت کا مکمل پہلو دکھلایا جاتا ہے۔ فرق ص
اتنا ہے کہ آغازِ کتاب میں یہ صداقت سادگی سے مملو ہوتی ہے کیونکہ مکمل نہیں ہوتی۔ لیکن خاتمہ پر پھر اُسی سادگ
کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ صورت مکمل ہو جاتی ہے۔ شاہ راہِ صداقت کا بھی وسط ہوتا ہے اور یہ نہایت نازک
اور پُر پیچ حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں صداقت اپنی تکمیل کی غرض سے ان تمام رکاوٹوں سے جو اس کے راس
میں حائل ہوتی ہیں نہ صرف جنگ آزما ہوتی ہے بلکہ اپنی تخریب پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ انسان کی غرضِ تخلیق بھی د
میں بعینہ یہی ہے۔ یہاں پر وہ صداقت کو نہایت سادہ صورت میں پاتا ہے۔ وہ ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے جہاں
کے مکمل اثرات موجود ہوتے ہیں۔ اور جہاں وہ بحیثیت ایک فردِ انسانی کے ماحول میں گھر جاتا ہے لیکن بالیدگ
کے ساتھ ساتھ اس کے جذبۂ صداقت میں شبہات ترقی کرنے لگتے ہیں۔ وہ موجوداتِ عالم کی پیچیدگیوں میں اپنے کو گم
کر دیتا ہے۔ اور اکثر مرتبہ کشمکش کے عالم میں اپنے ماحول سے جدائی بھی اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن اس اتحاد صداقت
کی پائمالی اور اس کی شخصیت اور بیرونِ عالم کی مہلک خانہ جنگی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ مناقشہ و منافرت کا ایک
غیر متناہی سلسلہ قائم ہو جائے لہذا اپنی زندگی کا صحیح مقصد جاننے کے لیے وہ شکوک کی اس جنگ میں اصل صداقت
کی سادگی کو ماننے اور تمام کائناتِ عالم سے غیر محدود رشتۂ محبت و اتحاد قائم کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے

پس ہمارا فرض ہے کہ ہمارا بچپن زندگی کے چشمہ سے جس کے لیے اس کی تشنگی بے پایاں ہوتی ہے۔ پورے طو
پر سیراب ہو جائے نوخیز دماغ کو اس خیال سے لبریز ہونا چاہیئے کہ وہ ایسی دنیائے انسانیت میں پیدا ہوا ہے جو
اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کا فقدان ہماری موجودہ قسم کی درس گاہو
میں پایا جاتا ہے۔ اور جو شاید قدرت سے سخت حقارت آمیز تنفر کا نتیجہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ طلبا کو زبردستی خدا کی
کاریگری اور اس دنیا سے محروم کر دیا جاتا ہے جو اُس کی ذات کی مظہر ہے یہ صرف ایک طریقۂ تادیب ہے جو جذبۂ
انفرادیت کو فنا کر دیتا ہے یا یہ کہئے کہ یہ ایک کارخانہ ہے جس میں بالکل یکساں چیزیں ڈھالی جاتی ہیں اور سیدھی
سادی تعلیم دی جاتی ہے لیکن خط زندگی مستقیم نہیں ہے اس میں ہزاروں کجیاں ہیں

اسکول کے نقطۂ نظر سے جب زندگی یکساں سولتوں میں منقسم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ مُردوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اس وقت یہ مکمل ہو جاتی ہے۔ جب مجھے اسکول میں داخل کیا گیا تو میری کوفت کا سبب سے بڑا ہی سبب تھا کیونکہ اچانک میری دنیا غائب ہونے لگی اور آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا آنے لگی جس کے لکڑی کے بنچین اور بلند دیواریں تحیرانہ مجھے گھورتے تھے۔ میں مدرسہ کے معلم کی مخلوق نہیں تھا۔ میری پیدائش کے وقت گورنمنٹ کے تعلیمی محکمہ سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن کیا کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ میرے خالق کی اس غلطی کا مجھ سے انتقام لیا جائے؟ مثل ہے کہ شجرِ علم چکھنا اور بہشت میں رہنا دونوں باتیں بیک وقت ممکن نہیں اسی لیے اولادِ آدم باغِ عدن سے جہانِ فانی میں ڈھکیل دی جاتی ہے جہاں محض ٹیپ ٹاپ ہوتی ہے پس مجھے بھی اپنے دماغ کو اسکول کے اس تنگ قالب میں ٹھونس دینا پڑا جس نے میری فطرت کو ہر طرف سے مجروح کر کے اسی طرح ناقابلِ حرکت بنا دیا جس طرح چینی عورتیں اپنے پاؤں کو چھوٹا رکھنے کے لیے بہت تنگ جوتے پہنکر زخمی ہو جاتی ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی کہئیے کہ پیشتر اس کے کہ میں بالکل فاترالعقل ہو جاؤں اس سے چھٹکارا ہو گیا

اگرچہ مجھے پوری میعادی سزا نہیں بھگتنا پڑی جیسی کہ میرے ہم رتبہ ساتھیوں کو متمدن معاشرت میں داخل ہونے کے لیے برداشت کرنا پڑی تاہم میں خوش ہوں کہ اس کے تلخ تجربات نے مجھے ان خرابیوں کی برائیوں کا علم عطا کر دیا جس سے اولادِ آدم کو سابقہ پڑتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ یہ خیال آدمی کا کہ بچے تعلیم کیسے حاصل کریں منشاءِ ایزدی کے خلاف ہوتا ہے۔ اپنا کاروبار انجام دینا ہمارا ذاتی کام ہے۔ ہم دفاتر میں اپنے مخصوص مقاصد کے لیے آزادانہ تدابیر عمل میں لا سکتے ہیں لیکن اس قسم کا دفتری انتظام خدائے تعالیٰ کی مخلوق یعنی بچوں کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ہم دنیا میں اس حقیقت پر عمل کرنے کے لیے آئے ہیں صرف جاننے کے لیے نہیں علم سے ہم طاقتور ہو سکتے ہیں لیکن تکمیل انسانیت ہمدردی سے ہوتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم وہ ہے جو صرف معلومات ہی ہم نہ پہنچائے بلکہ ہماری زندگی موجوداتِ عالم کے مطابق کر دے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں ہمدردی کے جذبات کی طرف سے صرف بے توجہی روا نہیں رکھی جاتی بلکہ اس کو بالکل نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ بچپن کی ابتدا ہی سے ہماری ایسی عادات ڈال دی جاتی ہیں اور تعلیم اس طرح پر دی جاتی ہے کہ ہماری زندگی فطرت سے جدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے دماغ اور دنیا کے مابین ابتدا ہی سے سخت مخالفت

ہو جاتی ہے اور اس طرح اعلیٰ تعلیم پر جس کے لیے ہم تیار ہو کر آئے ہیں غفلت کی نیند طاری ہو جاتی ہے (یعنی تعلیم کو سلا دیتے ہیں) اور ہم اصلی دنیا کو کھو کر بیکار معلومات سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ جغرافیہ پڑھا کر بچوں کی عمر معلومات زائل کر دیتے ہیں اور صرف و نحو رٹا رٹا کر انھیں زبان سے محروم کر دیتے ہیں۔ اُن کی اشتہا اصلی کے لیے ہوتی ہے لیکن واقعات و تواریخ کی ضخیم جلدیں انھیں پڑھنے کے لیے دی جاتی ہیں۔ وہ دنیائے انسانی میں پیدا ہوئے تھے اور مکر و فریب کی مصنوعی دنیا میں ڈھکیل دیے گئے۔ تاکہ اس اصلی گناہ کی کہ وہ جاہل پیدا ہوئے ہیں سزا پائیں۔ بچے کی فطرت کامل تحمل کیساتھ اس تباہی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے لیکن بالآخر سزا کے آگے خاموشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے

ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ بچوں کو خاک اور مٹی کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ان کا جسم اور دماغ پھولوں کی طرح دھوپ اور ہوا کا خواہاں رہتا ہے۔ ان کی طبیعت ان بہم مسرتوں سے کبھی منکر نہیں ہوتی جو ان کے قوائے ذہنی میں مرتسم ہوتی ہیں اور کائناتِ عالم کے درمیان بلا واسطہ تعلقات پیدا کرتی ہیں لیکن اُن کی بدقسمتی سے ان کے والدین معاشرتی مدارج کے لحاظ سے ان کے لیے پیشہ کی تلاش کرتے ہیں اور اپنی عادات کی ایک مخصوص دنیا بنا لیتے ہیں۔ اس کا کوئی علاج نہیں کیونکہ لوگوں کو حالات سے مجبور ہو کر اور سوسائٹی کی پیروی کرنے کی ضرورت سے اپنے آپ کو کسی پیشہ کے لیے مخصوص کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمارا بچپن کا وہ زمانہ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے جبکہ ہمیں معاشرتی اور اکتسابی رسمیات کی تنگ حدود سے کلّی آزادی حاصل ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک منتظم اور تجربہ کار ہیڈ ماسٹر کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے میرے اسکول کے ایک لڑکے کو دیکھا جو درخت پر چڑھا ہوا تھا اور مطالعہ کرنے کے لیے کوئی مناسب شاخ تلاش کرتا تھا مجھے اس کو یہ تفصیل سمجھانا پڑا کہ صرف بچپن ہی زندگی کا وہ حصّہ ہوتا ہے جب ایک مہذب شخص درختوں کی شاخوں اور اپنے ملاقات کے کمرے کی کرسیوں میں قوتِ انتخاب کا ٹھیک استعمال کر سکتا ہے اور کیا مجھے اس لڑکے کو اس نعمت سے محض اس لیے محروم کر دینا چاہیے کہ میں عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اس سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ سب سے زیادہ تحیر خیز امر یہ ہے کہ وہی ہیڈ ماسٹر لڑکے کے مطالعۂ نباتات کو بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ وہ درختوں کے غیر ذاتی علم کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ وہ سائنس ہے لیکن اس کے ذاتی تجربہ کو نہیں مانتا۔ تجربہ کی اس نشو و نما سے ایک

جذبہ پیدا ہوتا ہے جو قدرت کی اپنی ہدایت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میرے اسکول کے طلبار کو درختوں کے متعلق ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے علم حاصل ہوا ہے۔ معمولی طور پر چھونے سے وہ معلوم کرسکتے ہیں کہ درخت کے سینہ سے تنے میں کس جگہ انگوٹھا گڑونا چاہیئے۔ انھیں معلوم ہے کہ وہ کس طرح شاخوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں! ور اپنے جسم کے وزن کو اس طرح ڈال سکتے ہیں جس سے شاخوں پر زیادہ بار نہ پڑے۔ میرے طلبا درختوں کا خوب استعمال کرنا جانتے ہیں یعنی جہاں تک پھل اکٹھا کرنا، آرام کی جگہ تلاش کرنا اور تلاش کرنے والے لوگوں اور جانوروں وغیرہ سے اپنے آپ کو چھپانے کا تعلق ہے وہ اس میں طاق ہیں۔ میں نے خود شہر کے ایک متمدن گھر میں تربیت پائی اور جہاں تک میرے اپنے تجربہ کا تعلق ہے میں عمر بھر اس طرح کام کرنے کا عادی رہا ہوں گو میں ایسی دنیا میں پیدا ہوا تھا جہاں درختوں کا نشان تک نہ تھا۔ اس لیے میں اس کو بھی تعلیم کا ایک جزو تصور کرتا ہوں کہ بچوں کے ذہن نشیں کر دینا چاہیئے کہ اس کارزارِ ہستی میں درخت بھی ایک اصلی حقیقت رکھتے ہیں اور یہ کہ درختوں کا کام محض اپنے آپ کو سرسبز رکھنا اور ہوا سے 'کاربن' لینا ہی نہیں ہے بلکہ وہ بھی زندگی رکھتے ہیں ہمارے پاؤں کے تلوے فطری طور پر ایسی ساخت کے ہوتے ہیں کہ وہ زمین پر کھڑے ہونے اور چلنے پھرنے کے لیے بہترین ذریعہ ہیں جس روز سے ہم نے جوتے پہننا شروع کئے ہیں پاؤں کا اصلی مقصد بہت حد تک فوت ہوگیا ہے۔ ان کے فعل میں کمی واقع ہو جانے سے ان کی قدر و منزلت میں بھی فرق آگیا ہے۔ اور اب ہم نازک اور مختلف النوع خوش رنگ جرابیں۔ غیر متناسب شکل اور پیمانہ کے جوتے اور سلیپر پہن پہنکر با زوِ نعم میں پلتے ہیں۔ اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہم کفرانِ نعمت کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے خوبصورت اور حسّاس تلووں کی بجائے حیوانوں کی طرح سخت کُھر کیوں نہ عطا فرمائے میرا یہ مطلب نہیں کہ پاؤں کے ساز و سامان کو بالکل ملیا میٹ کر دیا جائے لیکن میں یہ بھی ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کرونگا کہ بچوں کے پاؤں کے تلووں کو اُس تربیت سے بالکل محروم کر دیا جائے جو قدرت نے اُن کے لیے بہم پہنچائی ہے۔ ہمارے تمام اعضار میں ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ محض مس سے زمین کی حالت معلوم کر لیتے ہیں کیونکہ زمین میں ایسے نازک حسّیات و تخیلات کا عنصر موجود ہے جس کو وہ اپنے صادق مشتاقوں یعنی پاؤں کے لیے پیش کرتی ہے

میں مکرر تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایک معزز گھرانے میں تربیت پائی ہے اور بچپن ہی سے میرے پاؤں بہت احتیاط سے خاک اور مٹی سے محفوظ رکھے گئے

جب میں اپنے طلبا کو ننگے پاؤں رہنے کا اشتعال انگیز سبق دیتا ہوں میں درد کیساتھ محسوس کرتا ہوں کہ ز
کے متعلق میری عقل پر تجاہل کے کسقدر گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لامحالہ میں اس طرح کانٹوں پر چلتا ہول
کہ وہ بھی فخر کرنے لگتے ہیں۔ میرے پاؤں معمولی سے معمولی رکاوٹ والے راستوں پر بھی چلنا گوارا نہیں کرتے
کیونکہ بالکل ہموار و مسطح زمین پر بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور تودے ہوتے ہیں جنھیں تربیت یافتہ پاؤں ہی معلوم کرسکتے
ہیں۔ اکثر مرتبہ میری حیرتوں کی کوئی حد نہیں رہی جب بالکل صاف اور ہموار زمین پر میں نے بہت ہی پیچیدہ اور ٹیڑھی
راستے پڑے ہوئے پائے۔ اور اس حیرت میں یہ معلوم کرکے اور اضافہ ہوجاتا ہے کہ یہ راستہ کسی واحد شخص کے وہم
یا میلانِ طبع کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ جب تک مسافروں میں سے اکثر کا بالکل یکساں رجحانِ طبع نہ ہو اس قسم کے ظاہراً ٹیڑھا
اور پیچیدہ راستے نہیں پڑ سکتے۔ لیکن اصلی سبب زمین کی نہایت خفیف ہدایت میں پنہاں ہے جس کا بلا شعور ہمارے
پاؤں جواب دیتے ہیں

جو شخص اس قسم کے واقعات سے ناواقف نہیں وہ بہت تیزی سے اپنے پاؤں کے رگ و ریشوں کو
ملا کر معمولی اشارہ کو سمجھ سکتے ہیں لہذا وہ اُس وقت جبکہ کانٹوں پر چل پھر رہے ہوں اپنے آپ کو اُن کی درد
انگیز سبق آموزی سے محفوظ رکھ سکتے ہیں اور پتھریلے راستوں پر بلا تکلف چل سکتے ہیں

مجھے معلوم ہے کہ عملی زندگی کے دور میں ہم جوتے بھی پہنیں گے اور ہمارے چلنے پھرنے کے لیے عجب سڑکیں
اور سا آرام کی موٹریں بھی ہونگی لیکن بچوں کے زمانۂ تربیت میں کیا اُن پر واضح نہیں کر دینا چاہیے کہ دنیا خوبصورت
نشست گاہ نہیں ہے اور یہ کہ فطرت بھی کوئی شے ہے جس کے ہر اشارہ پر لبیک کہنے کے لیے ہمارے پیر وضع کئے
گئے ہیں۔ میں نے اپنے اسکول میں سادہ زندگی بسر کرنے کا جو دستور قائم کیا ہے تو اکثر اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ میں
مفلس اور غریب رہنے کا وعظ کرتا ہوں جیسا کہ ازمنۂ وسطیٰ میں دنیا کی حالت تھی۔ اس بحث پر اظہار رائے کرنا
میرے حصہ سے باہر ہے لیکن تعلیمی نقطۂ نگاہ سے یہ ماننا پڑے گا کہ غربت ایک درسگاہ ہے جہاں انسان تعلیم کے
ابتدائی مراحل طے کرتا ہے اور بہترین تربیت سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک لکھ پتی کے لڑکے کو بھی غریب
بچے کی طرح پیدا ہونا پڑتا ہے اور ابتدا سے اسی طرح درسِ زندگی سیکھنا پڑتا ہے۔ وہ نہایت غربت زدہ بچوں
کی طرح چلنا سیکھنے پر مجبور ہے اگرچہ اُسے ایسے ذرائع میسا ہیں کہ وہ بغیر ٹانگوں کی مدد کے گذارا کرسکے۔ غربت زندگی

یا سے صحیح معنی میں آشنا کراتی ہی کیونکہ امیرانہ زندگی جمود و خمود کی زندگی ہی اور یہ وہ دنیا ہی جہاں آدمی
ت سے بہت دور جا پڑتا ہی۔ دولت فخر و انبساط کا موجب ہو سکتی ہی لیکن یہ کسی کے لیے تربیت کا ذریعہ نہیں
ی۔ یہ ایک سنہرا قفس ہی جس میں امرا کے بچوں کی پرورش ہوتی ہی اور ان کے قویٰ کند اور سست کر دیے
ہیں۔ لہذا مجھے اپنے اسکول میں اس زبردست معلم ——— یعنی عریانی ساز و سامان کو مقرر کرنا پڑا۔ مفلسی
بت کے خیال سے نہیں بلکہ اس لیے کہ اس سے دنیا کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اگرچہ اکثر فضول خرچ اسے حقارت
اہ سے دیکھتے ہیں

میرا منشا یہ ہی کہ انسان اپنی عمر کے کچھ حصہ کو ابتدائی باشندوں کی طرح گذارنے کے لیے وقف کر دے
ن اصحاب کو ابھی اتنی مقدرت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ نازائیدہ بچوں کو بنا یا بگاڑ سکیں۔ بچے رحم مادر میں
آزادانہ اپنی ابتدائی زندگی کے منازل طے کرتے ہیں اور دوسری منزل میں آنے کے لیے تمام مطلوبہ
ت سے بہرہ ور ہو کر آتے ہیں۔ یہ فطری زندگی کہلاتی ہے۔ معاشرت اس پر حملہ آور ہوتی ہی اور اس کے
انعاماتِ قدرت یعنی زمین۔ آسمان۔ پانی اور ہوا کو غصب کر لیتی ہی۔ شروع شروع میں وہ جدوجہد اور
کا کرتا ہی مگر آخر رفتہ رفتہ بالکل بھول جاتا ہے کہ اس دنیا میں وہ نائبِ خدا بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور اب
نی دنیا کے دروازے بند کر لیتا ہی۔ پردے گرا دیتا ہے اور لغو فضولیات میں گم ہو کر اپنے آپ کو تباہ کر دیتا
ور پھر اپنی دنیا بلکہ روح کے بدلے اس منفعت پر فخر کرتا ہے۔ انسان کو اپنی ترقی کے درمیانی حصہ میں بہت
ضولیات کی متمدن دنیا سے واسطہ پڑتا ہے۔ نہ یہ ابتدائی منزل ہوتی ہے اور نہ آخری۔ اس کی اہم [illegible]
ئین تہذیب و شائستگی اپنا اپنا محل استعمال رکھتے ہیں اور جب وہ ان کو منتہائے مقاصد تصور کر لیتا ہے
یہ کلیہ بنا لیتا ہی کہ انسان کے مزرعۂ حیات میں کوئی سبزہ زار جو عالمِ شور شغب۔ کرب و بلا اور آراستہ و
ستہ تکلفات سے دور ہو باقی نہ رہی تو بچوں کو درد و تکلیف ہوتی ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں دنیا سے نفرت
ہو جاتی ہی۔ بوڑھے امن و آسائش میں اپنی پیری کو بھول جاتے ہیں اور محض مسلوب القویٰ جوان بن کر
جاتے ہیں جو اپنی زندگی کی بدشکلی سے جس میں لاتعداد سوراخ و پیوند ہوتے ہیں نالاں ہوتے ہیں

تاہم بچے عین پیدائش کے وقت اس تاریک دنیا میں جہاں نفاست اور تکلفات کا چرچا ہی تھ

کے لیے ہرگز تیار نہ ہوتے اگر انہیں خیال ہوتا کہ انہیں سورج کی روشنی میں آنکھیں کھولنا اور اپنے آپ کو اس حد تک محکمۂ تعلیم کے سپرد کرنا ہوگا کہ ان کی نزہتِ طبع اور ذکاوتِ فہم زائل ہو جائے تو وہ انسانی زندگی گوارا کرنے سے پیشتر اس مسئلہ پر کئی مرتبہ غور و فکر کر لیتے۔ تمام چیزوں میں غیر منقطع تسلسل اور کمالیت کی روح موجود ہے لہٰذا ایام مکتب میں میرے لیے جو بات سوہانِ روح تھی وہ یہ تھی کہ اسکول صحیح معنی میں دنیا کا نمونہ پیش نہیں کر سکتا تھا بلکہ محض درس و تدریس کے لیے ایک مخصوص نظام تھا۔ یہ انتظام معمر لوگوں کے لیے مناسب ہو سکتا ہے کیونکہ انہیں اس قسم کی عالیشان عمارتوں کی خاص احتیاج کا شعور ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی زندگی سے علٰحدگی گوارا کر کے ان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں لیکن بچوں کو اپنی زندگی سے ایک خاص محبت ہوتی ہے اور یہی ان کی پہلی اور بے لوث محبت ہوتی ہے۔ اس کی نیرنگی اور چہل پہل اُن کی متجسس نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ کیا ہم اُن کے اِس جذبۂ محبت کو ملیا میٹ کر دینے میں حق بجانب ہیں؟ بچے پیدائشی طور پر تارک الدنیا اور گوشہ نشیں نہیں ہوتے کہ حصولِ علم کے لیے راہبانہ تادیب کی بندشوں کے قابل ہوں۔ سب سے پہلے انہیں زندگی کے متعلق عام واقفیت حاصل کرنی چاہیے پھر تعلیم کے لیے اپنی زندگی وقف کرنی اور اس کے بعد پختگی عقل سے آراستہ ہو کر اپنی زندگی کو کامل بنانے کی طرف مراجعت کرنی چاہیے لیکن انتظاماتِ معاشرت کچھ اس قسم کے ہیں کہ وہ انسانی دماغ اپنی مرضی و منشا کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور اس طرح ملوث ہو جاتے ہیں کہ پھر اُن کو سدھار نہیں سکتی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی روح کی محافظت کے لیے ذرا بھی آزادی سے کام لیتا ہے تو اُسے تاحیات مسلسل پاداش کا شکار ہونا پڑتا ہے اس لیے صداقت کو محسوس کرنا آسان ہے لیکن اس کو ایسی جگہ عملی جامہ پہنانا جہاں رواج اور رسمیات کی مہلک لہر تمام تر اُس کے خلاف بہہ رہی ہو۔ بہت دشوار ہے جب اپنے بیٹے کی تربیت کا مسئلہ میرے درپیش ہوا تو میں صداقت کو عملی صورت دینے کے بالکل ناقابل تھا اس لیے پہلی بات میں نے یہ کی کہ اُسے شہری آبادی سے دور ایک گاؤں میں لے گیا اور جس قدر بھی ہو سکتا تھا اسے کامل فطری آزادی دیدی۔ نزدیک ہی ایک دریا تھا جو اپنے بہاؤ کے لیے مشہور تھا۔ اس دریا میں اُسے تمام دن تیرنے اور کشتی چلانے کی اجازت تھی۔ وہ بلا خوف گھنٹے اس شغل میں مصروف رہتا۔ مویشیوں کو چراگاہ میں لے جانا اور ریتیلے میدانوں میں کھیلنا اس کی تفریح کے سامان تھے۔ وہ کھانا کھانے بھی بہت دیر سے آیا کرتا تھا کیونکہ ہر اس اور خوف اسے نہ تھا کہ کوئی اس

،اس تاخیر کا جواب طلب بھی کریگا۔ وہ اُن تمام جائز چونچلوں سے محروم رکھا گیا جو اُس جیسے خوشحال گھرانے والے
ؤں کے لیے ضروری خیال کئے جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے لیے معاشرت نے تمام دنیا کا دروازہ بند کر دیا
اس کی حالت پر افسوس کرتے اور اس کے والدین پر لعن وطعن کرتے تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ تعیش اور جائز چونچلے
ں کے لیے ایک ناقابلِ برداشت بار ہیں وہ اس بارِ لایعنی کے متحمل ہوتے ہیں جسے لوگ مفاخرت سے تعبیر کرتے
ں۔ اور ان کے والدین انھیں اس تعیش میں دیکھکر خوشیاں مناتے ہیں۔ لیکن میں نے ایک محدود ذرائع والے
می کی طرح اپنے بچے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کیونکہ میں اپنی تجویز کے مطابق اس کی تربیت چاہتا تھا۔ اُسے ہر
ت کی آزادی تھی۔ اُس کے اور اُس کی فطری دنیا کے مابین شرافت و دولت کے بہت کم پردے حائل تھے
ا نچہ کائنات کا حقیقی مطالعہ وتجربہ کرنے کے لیے میری نسبت اسے بہت کافی مواقعات حاصل تھے

تربیت کا اعلیٰ ترین مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو اتحادِ صداقت کی تعلیم دی جائے۔ شروع شروع میں
ب لوگ سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے تو انسان کے تمام مختلف عناصر پورے طور پر ہم ساز تھے۔ لیکن جب عقل
سم اور روح سے علحدہ کر دیا گیا تو مکتبوں کی تعلیم نے اپنا تمام زور اور قوت انسان کے عقلی اور جسمانی تربیت
صرف کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنی توجہات کو تمام تر اس نظریہ کی طرف مبذول کرنے لگے کہ بچوں
ں عام معلومات بہت وسیع ہونی چاہئیں۔ حالانکہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس پہلو پر اس قدر زور رہنے سے
قلی، طبعی اور روحانی زندگی کے مابین مغائرت پیدا ہوجاتی ہے

میں روحانی دنیا کا معتقد ہوں جو اس دنیا سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی حقیقت ہی کا دوسرا
م ہے ہمیں ہر نفس پر یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ ہم خداتعالیٰ کی ذات میں سمائے ہوئے ہیں۔ ہم طلسمات سے
ھری ہوئی عالیشان دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہم اپنی ہستی کو ایک لمحہ کے لیے بھی کسی واقعہ کا ایک اتفاقی
کشاف تسلیم کرنے کے لئیے تیار نہیں ہیں۔ جو مادہ کی رو میں نامعلوم ابدیت کی طرف جارہی ہے۔ ہم اپنی زندگی کو
س خوابیدہ آدمی کے خواب سے تعبیر نہیں کرسکتے جو بیدار ہونے کا نام ہی نہ لے۔ ہماری وہ شخصیت ہے جس کے
زدیک مادہ اور کشش دو مہمل الفاظ ہیں جب تک کہ وہ ایک ذاتِ بے پایاں سے متعلق نہ ہوں۔ اور جس کی
صلی حقیقت بنی نوعِ انسان سے محبت۔ نیکی کی عظمت۔ جانباز روح کی شہادت اور ناقابلِ بیان مظاہر قدرت

میں مضمر ہے۔ اور جو صرف ایک طبعی واقعہ یا کوئی عقدہ نہیں ہے بلکہ تفسیر شخصیت ہے روحانی دنیا کا تجربہ جس کی حقیقت کی طرف بچپن ہی سے لاپرواہی اور بے توجہی ہماری عادات میں داخل ہو جاتی ہے موجودہ طریقۂ تعلیم حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ عملی طور پر اس دنیا میں زندگی بسر کرنے سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اسے عمل میں کیونکر لایا جائے یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جس کا حل موجودہ زمانہ میں نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کیونکہ آجکل لوگ اپنے کاروبار میں اتنے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں یہ معلوم کرنے کے لیے ذرا بھی فرصت نہیں ملتی کہ اُن کی یہ مصروفیتیں محض جنجال و وہم ہیں ان میں "حقیقت" کو ذرا دخل نہیں اور یہ کہ روح اپنے مستقر کو نہیں پا سکی ہندوستان کے مقدس رشیوں کے جنگلوں میں عبادت کرنے کی یاد ابتک ہمارے دماغوں میں قائم ہے جنگلوں میں موجودہ طرز کے مکاتب نہ تھے اور نہ صومعے بلکہ چند معمولی گھر ہوتے تھے اور جن اشخاص کو وحدانیت کی جستجو ہوتی اور جو اپنی زندگی تلاشِ حق میں وقف کرنا چاہتے تھے وہ ان گھروں میں بسر اوقات کرکے تالیفِ قلوب کیا کرتے تھے اور اگرچہ وہ معاشرت سے بالکل الگ رہتے تھے لیکن درحقیقت صحیح معاشرت کے حامل ہوتے تھے جس طرح کہ سورج مختلف سیاروں کو اپنے مرکز سے روشنی پہنچاتا ہے۔ بیشتر اس کے کہ بچے اہلِ زندگی کے قابل ہوتے وہ اس طرح ابدی زندگی کی فضا میں ترقی پاتے تھے۔ پرانے زمانے میں ہندوستانی مکاتب وہاں ہوتے تھے جہاں زندگی بذاتِ خود موجود ہوتی تھی۔ یہاں طلبا کی حقیقی معنی میں تربیت ہوتی تھی یہاں ان کے لیے علم و عمل کی مکتبی فضا یا بالکل منقطع راہبانہ زندگی نہ تھی بلکہ زندہ دلی کی فضا تھی جہاں طلبار حقیقی معنی میں تربیت پاتے تھے وہ چراگاہوں میں مویشی چراتے تھے۔ پھل پھلواری اور جلانے کا ایندھن اکٹھا کرتے تھے۔ تمام مخلوق سے مہربانی کا سلوک کرتے اور اپنے مرشد کی روحانی ترقی کیساتھ ساتھ اپنی روح کو بھی ترقی یافتہ پاتے تھے۔ اس کی علّتِ غائی یہ تھی کہ ان تعلیم گاہوں کا مقصدِ اولی بچّوں کو صرف لکھنا پڑھانا نہ تھا بلکہ ان طلبار کو پناہ دینا مقصود ہوتا تھا جو خدائے تعالیٰ کی معرفت کی لَو میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے استاد اور شاگرد میں ایسا رشتۂ اتحاد محض افسانۂ روحانیت نہیں ہے بلکہ اُس کا ثبوت ہمیں قدیم دیہاتی طریقۂ تعلیم کی صورت میں ہنوز ملتا ہے۔ اور جو رفتہ رفتہ غیر ملکی دفتری حکومت کے اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرکے فنا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دارالعلوم موجودہ اسکولوں کی طرح نہیں ہوتے۔ طلبا استاد کے مکان میں اس کے بچوں کی طرح رہتے ہیں کسی قسم کی فیس وغیرہ بالکل نہیں ادا کرنی پڑتی استاد سادہ زندگی بسر

اپنا مطالعۂ علم بھی جاری رکھتا ہے اور طلبا کی ہر طرح سے اکتسابِ علم میں مدد کرتا ہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ یہ
پیشہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اس کارِ نیک کو اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا ہے

تربیت کا یہ مفہوم میرے دماغ میں پورے طور سے نقش ہو گیا اور کچھ مواقعات ایسے حاصل ہو گئے جس سے عملی کام
کا مجھے حوصلہ ہو گیا۔ دوسرے ممالک میں دنیوی خوشحالی کے لامحدود ذرائع جن کے معین و مددگار ہیں وہ اپنا
ربیت ان اصولوں کو سامنے رکھکر بنا سکتے ہیں اُن کی زندگی کا مطمحِ نظر جو ان کے قویٰ کی نشو و نما کے لیے آزادی
بں ضروری ہے بہت وسیع ہوتا ہے لیکن ہمیں اپنی خودداری قائم رکھنے کے لیے جو ہمارا فرضِ منصبی ہے تربیت
مداعلیٰ مقاصدِ انسانی یعنی مکمل بالیدگی اور آزادیٔ روح سے کسی طرح کم نہیں کرنا چاہیئے . . . .

ہمیں صرف حیاتِ بعد الممات میں یقین رکھنا اور خدائے تعالیٰ کی جستجو میں زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ ہمارا
العینِ حیات یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس انتہائی حقیقت کو معلوم کریں جو خاک اور مٹی کی قید سے آزادی دلاکر
بے بہا ابدی دولت بخشتی ہے یعنی نورِ حقانیت اور محبت الٰہی اس قسم کی آزادیٔ روح اکثر ان لوگوں میں دیکھی
جو نوشت و خواند سے بے بہرہ ہوتے اور نہایت عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان میں روحانی
و فہم کا مادہ ہمیں وراثت میں ملتا ہے۔ ہماری تربیت کا مقصدِ حقیقی یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اس کا بخوبی استعمال
جائیں اور جب وقت آئے تو دنیا کے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے مستفیض کریں۔ میں ادبی مشاغل میں
ف تھا کہ اچانک یہ دردافزا خیال میرے دماغ میں سما گیا۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بہت ہی نہیب
میں کوئی کراہ رہا ہو۔ یہ صرف میری روح نہیں تھی بلکہ میرے ہموطنوں کی روح تھی جو اپنے سانس کے لیے میرے
جد و جہد کرتی معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ جو چیز درکار تھی وہ کوئی خاص مادی شے جیسے
ت۔ آرام یا طاقت نہ تھی بلکہ طلبِ خدا اور آزادیٔ روح کے لیے شعوریت کی بیداری تھی اور یہ زندگی کی وہ
ہے جہاں ہم کشمکشِ حیات سے بالکل دور ہو جاتے ہیں۔ نہ جنگ آزماؤں سے کوئی دشمنی رہتی ہے اور نہ
ت کے دلدادوں سے کوئی جنگ

خوش قسمتی سے میں ایسی جگہ تھا جہاں میں اپنا کام آسانی سے شروع کر سکتا تھا والد صاحب نے اپنی متعدد
فتوں کے بعد ایک ایسا قطعۂ زمین منتخب کر لیا تھا جہاں انھوں نے ہنگامۂ عالم سے بچکر ریاضتِ الٰہی میں زندگی

ردی۔ اور پھر اسے انھوں نے ان نیک بندوں کے لیے وقف کر دیا جنھیں ریاضت و عبادت کے لیے یکسوئی و
یان کی تلاش ہوتی ہے۔ میرے زیر تربیت قریباً دس لڑکے تھے جب میں نے یہاں آکر ملا کسی گذشتہ تجربہ کے
ی زندگی کا نیا دور شروع کیا۔ ہمارے آشرم کے چاروں طرف ایک وسیع اور کشادہ میدان تھا جس میں صرف
ودوں کے چھوٹے چھوٹے پیڑ۔ خاردار جھاڑیاں۔ مختلف رنگ اور صورت کی کنکریوں کے ٹیلے اور برساتی نالے
ں کہیں موجود تھے گاؤں کے نزدیک ہی جنوب کی طرف کھجوروں کے جھنڈ میں ایک ہلکے نیلے پانی کا تالاب دکھائی
یا تھا۔ ایک پُر پیچ پگ ڈنڈی تھی جس پر سے دیہاتی لوگ شہر میں آتے جاتے تھے یہاں سے "شانتی نیکیتن" کی عمارت
وبی نظر آتی ہے۔ پندرہ سال سے زیادہ عرصہ سے یہاں پر اسکول جاری ہے جسے متعدد تغیرات اور سانحات سے
ابقہ پڑا ہے مجھے بحیثیت شاعر کے نکمّا ہو جانے کی وجہ سے دیہاتیوں میں اعتماد قایم کرنے اور آئینی حکومت کے
بہات دور کرنے میں بہت دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ اور ایک حد تک اس میں مجھے کامیابی حاصل ہو گئی
ہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کسی قسم کی بیرونی ہمدردی اور مشورہ کے بغیر کام کرتا رہا۔ میرے ذرائع آمدنی بہت کم
تھے اور ساتھ ہی قرض کا وزنی بار کندھوں پر تھا لیکن خود مفلسی و بیکسی نے مجھے جذبۂ حرّیت عطا فرمایا اور یقین
لا دیا کہ صداقت کے آگے مال اور دولت ہیچ ہیں۔ چونکہ اس اسکول کی ترقی نہ صرف میرے عقائدِ دین کی
نجام دہی تھی بلکہ میری زندگی کی اصلی ترقی تھی جس طرح پختگی کیساتھ ساتھ ایک پھل نہ صرف قد میں بڑھتا اور رنگ
یں گہرا ہوتا جاتا ہے بلکہ اس کے گودے اور ذائقہ میں بھی خاص تبدیلی ہو جاتی ہے اسی طرح پختگی کے ساتھ ساتھ
سکول کے اعلیٰ تخیلات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی چلی گئی۔ ایک نیک ارادہ کی تکمیل کو مد نظر رکھکر میں نے یہ جاری
یا تھا اس لیے محنت و جانفشانی سے کام کیا لیکن معمولی سا اطمینان صرف ایثارِ زر۔ ایثارِ قوت اور ایثارِ وقت
ی مقدار کا حساب رکھنے اور اپنے انتھک کاموں کی خود تعریف کرنے سے حاصل ہو سکا اس کے باوجود محصلہ نتیجہ کوئی
خاص اہمیت نہ رکھتا تھا۔ میں منصوبے باندھتا رہا اور فسخ کرتا رہا یہ صرف تضیعِ اوقات تھی اور نتیجہ صفر مجھے ٹھیک
یاد ہے کہ میرے والد کے ایک بزرگ مُرید میرے پاس آئے اور فرمایا کہ "مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ میں ایک شادی خانے
یں ہوں جو پوری کوشش کیساتھ سجایا گیا ہے جس میں کسی چیز کی کمی نہیں مگر دولہن غائب ہے"۔ مجھ سے جو غلطی
ہوئی وہ خیال کی تھی کیونکہ میرا اپنا مقصد وہی دولہن تھی لیکن رفتہ رفتہ میرے دل نے اس کا مرکز تلاش کر لیا۔

کام اور خواہش میں پنہاں نہ تھا بلکہ صداقت میں "شانتی نکیتن" کی عمارت کے چبوترے پر تنہا بیٹھ کر سامنے
ال کے درختوں کی دو رویہ روش پر گہری نگاہیں ڈال ڈال کر غور سے دیکھتا رہا۔ اور تمام منصوبوں۔ تجویزوں
ر ہر روز کی جد و جہد سے اپنا دل ہٹا کر اطمینان اور حضورِ قلب میں گم کر دیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ میرا قلب روشن
گیا۔ اور روحانی بصیرت سے میں اپنے گرد و پیش کی دنیا دیکھنے لگا۔ مجھے تمام درخت زمین کے بے زبان دل
ے اُٹھتے ہوئے خاموش راگوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے! اور لڑکوں کا شور و غوغا شام کی فضائے
سمانی میں مل کر میرے پاس اس طرح آ رہا تھا جیسے درختوں کی زندہ آوازیں حیاتِ انسانی کی گہرائیوں سے بلند
و رہی ہوں۔ میں نے سورج کی روشنی میں وہ پیغام پا لیا جس نے میرے باطن کو چھو کر احساس کرا دیا کہ روحانیت
محبت ہے۔ اور ایک بزرگ درویش کی زبان میں ندا آئی کہ "اس دنیا میں کون حرکت کر سکتا تھا۔ کون جانفشانی
ر سکتا تھا! اور کون زندہ رہ سکتا تھا اگر آسمان محبت سے لبریز نہ ہوتا!" پس جب میں نے دوسروں سے بہتری کا
سلوک کر کے نتائج حاصل کرنے کی جد و جہد سے منہ موڑ لیا اور اپنی دلی خواہشات کی طرف رجوع ہوا۔ اور جب میں
نے محسوس کر لیا کہ اپنی زندگی صداقت میں بسر کرنا تمام دنیا کی زندگی کے حظ اٹھانے کے مرادف ہے تو مادی
جد و جہد کی مکدّر فضا صاف ہو گئی اور خود قوتِ نمو نے ہر شے میں اپنا دخل کر لیا۔ اب بھی ہماری درسگاہ کے
انتظام میں جو بات سطحی اور مہمل ہے اُس کا سبب اُس جوشِ عمل کی بے اعتمادی میں مضمر ہے جو ہمارے دل و دماغ
پر مستولی رہتا ہے۔ اس کا سبب ہماری اپنی خود ساختہ اہمیت کے ایک غیر فانی احساس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سبب
ہماری ان عادات میں مضمر ہے کہ ہم اپنی ناکامیوں کی وجوہات اپنے ماسوا میں تلاش کرتے ہیں اور یہاں اس کا
سبب اس امر میں بھی پنہاں ہے کہ ہم اپنے کام میں تساہل کو دخیل پا کر تنظیم کے پیچوں کو اور مضبوطی کے ساتھ کس دیتے
ہیں۔ جب دوسروں کو ہدایت کرنے کا بے انتہا شوق خصوصاً روحانی معاملات میں ترقی پر ہوتا ہے تو نتیجہ بہت
خراب اور فریب دہ ہوتا ہے۔ ہمارے مذہبی معتقدات و رسومات میں جس قدر ریاکاری اور خود فریبی کو دخل ہے
اس کا سبب ہماری خود نمائی اور نمائشِ علم ہوتا ہے حصولِ روحانیت کے نزدیک لینا اور دینا مترادف ہیں جیسے چراغ
کہ جس کے خود روشن رہنے اور دوسروں کو روشنی پہنچانے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب کوئی شخص لوگوں کو خدائے
تعالیٰ کی وحدانیت کی ہدایت کرنا اپنا شعار بنا لیتا ہے تو وہ صحیح راستہ بتانے کی بجائے اُسے دھندلا کر دیتا ہے۔

ی حین درس و تدریس سے نہیں لی جاتی بلکہ یہ وہاں ہوا کرتی ہے جہاں مذہب خود موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کے
کی تلاش کرنے والوں کا فرقہ روحانیات (Spiritual) کی طرح جنگلوں میں رہائش اختیار کرنا موجودہ ز
میں بھی غیر مناسب نہیں ہے۔ مذہب کوئی اکتسابی شے نہیں ہے جو مکاتب میں مختلف مضامین کے نصاب
طرح روزانہ اور ہفتہ وار کی مقدار میں طلباء کو پڑھا دیا جائے۔ یہ ہمارے وجود کلّی کی "تفسیر" ہے۔ ایک لام
ذات سے ہمارے ذاتی تعلق کا علم ہے اور ہماری حیات کا حقیقی مرکز ثقل ہے۔ اس کو ہم اپنے بچپن میں اس طر
حاصل کر سکتے ہیں کہ ہم ایسی جگہ قیام کریں جہاں ضروریاتِ زندگی کی فراوانی جن کی کوئی خاص اہمیت
نہیں ہوتی روحانی دنیا کی حقیقت پر پردہ نہ ڈال رہی ہوں۔ جہاں سادہ زندگی کی روح ساری ہو اور جس کے
چاروں طرف وسیع میدان ہوں۔ تازہ اور خوشگوار ہوا ہو اور قدرت کا کامل امن و سکون طاری ہو اور
جہاں لوگ اپنی آیندہ ابدی زندگی پر پورا ایمان رکھتے ہوں۔ اب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا اس ادارہ سے یہ
مقصد حاصل ہو گیا؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہمارے تمام گہرے مطامحِ نظر کے حصول کا اندازہ بیرونی معیار سے لگانا
بہت دشوار ہے۔ اس کا عملی رویّہ نتائج سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ انسانی زندگی کے مذہبی
اور قومی اختلافات ہمارے آشرم میں یقینی طور پر ہیں۔ ہماری ہرگز یہ کوشش نہیں کہ ہم اپنے طلباء کی ذہنیت
اس نہج پر کریں کہ قدرتی اختلافات کی بیخ کنی ہو جائے اور ظاہری یکسانیت کی بنیاد پڑ جائے۔ ان میں بعض
برہمو سماجی ہیں بعض ہندو مذہب کے دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض عیسائی ہیں۔ چونکہ ہم کسی
مذہب اور عقیدہ کی طرف سے متعصبانہ خیال نہیں رکھتے اس لیے اختلافِ مذہب ہمارے راستہ میں کوئی
مشکلات پیدا نہیں کرتا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس آشرم میں جو لوگ جمع ہیں ان کے دلوں میں یہاں کے مقاصد
اور یہاں کی زندگی کی عزت کے جذبات میں خلوص و جوش کے لحاظ سے بہت فرق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ
دنیا کے مال و متاع اور شہرت کے لالچ کے مقابلہ میں اعلیٰ زندگی کا جذبہ ہمارے دلوں میں موجزن نہیں ہوتا
تاہم مجھے پورا وثوق ہے اور اس کی کئی ایک مثالیں بھی ہیں کہ اس آشرم کا نصب العین ہماری فطرت میں دن
بدن تیزی کے ساتھ راسخ ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے احساس بغیر ہماری حیات روحانیات سے پُر رہتی ہے
ہمارے یہاں آنے کا اصلی مقصد خواہ کچھ ہو مگر تمام نفرت خیز شور و شغب کے باوجود ہمیشہ ایک ندا آتی ہے کہ خدا

یک ہی، وہ قادرِ مطلق ہی اور امن مجسّم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لامکان کی یہ آواز آسمانوں کو چیر کر نکل کر آتی ہی اور
سحر کے سکوت اور رات کی خاموشی کو پُر اسرار اور پُر معانی بنا دیتی ہی۔ اور موسم خزاں میں سیوتی کے سفید پھولوں
ور بہار میں گلابی پھولوں کے ذریعہ سے ریاضت کے حسنِ کامل کے سامنے خود کو پیش کر دینے کا پیغام دیتی ہی۔
ہل ہند کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لیے ان تمام تخیلات کا سمجھنا مشکل ہوگا جو لفظ آشرم سے متعلق ہیں
کنول کے پھول کی طرح ہے جو اس فیاض آسمان کے سورج کی روشنی اور تاروں کی آب و تاب میں ہندوستان
یں کھلتا ہی۔ ہمارے ملک کے زبردست دریاؤں کے پُر سحر راگ سنجیدگی سے مملو ہیں اور اس کے میدانوں کی لامحدود
سعت بیرونی دنیا کے سکوت کے ساتھ ہمارے مکانات کا احاطہ کئے ہوئے ہی۔ یہاں کی سبزرمین کے کناروں
ے آفتاب اس طرح اٹھتا دکھائی دیتا ہے کہ گویا کوئی نیکدل ہستی ایک نامعلوم دیوتا کے معبد پر اپنا پیشکش
بار چڑھا رہی ہے۔ اور آخر دن کے اختتام پر وہ گوشۂ مغرب میں اس شان و شوکت سے غائب ہو جاتا ہی
یسے قدرت نے ابدیت کو شاندار طریقہ سے سلامی دی ہے۔ یہاں کے درختوں کا سایہ مہمان نواز ہی۔ یہاں کی
مین کی خاک پُر تپاک دامن ہماری طرف پھیلاتی ہے اور ہوا بغل گیر ہو کر لباس گرم ہمارے زیب تن کرتی ہی
وہ غیر متغیر حقائق ہیں جن سے ہمارے دل و دماغ برابر سبق حاصل کرتے رہتے ہیں۔ لہذا اس کو ہم ہندوستان
فرض محسوس کرتے ہیں کہ دنیا کے اتحاد روح کے ذریعہ روحِ کل میں انسانی روح کی حقیقت معلوم کریں زمانۂ
لف میں اس خیال نے قدرتی شکل اختیار کر لی تھی اور یہ ان مکاتب کی صورت میں تھا جہاں دنیا کے ہنگاموں
ے دور جنگلات میں درسِ روحانیات دیا جاتا تھا۔ اور ایک اندرونی قوت اب بھی ہمیں مجبور کرتی ہی کہ ہم
رشتے میں ذاتِ باری تعالیٰ کی تجلّیوں کو دیکھیں۔ ہوا جو سانس بنکر ہمارے اندر جاتی ہی اس میں محسوس کریں
وشنی جس میں ہم آنکھیں کھولتے ہیں اُس میں تلاش کریں۔ زمین میں جہاں ہم پیدا ہوتے اور مرتے ہیں
ھونڈھ نکالیں۔ پانی جس سے غسل کرتے ہیں اُس میں ڈھونڈیں۔ لہذا میں جانتا ہوں اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہی کہ
س آشرم کے اساتذہ و طلبا روز بروز علمِ معرفت میں ترقی کر رہے ہیں۔ اور یہ ظاہری تربیت اور درس و تدریس
ے ذریعے نہیں بلکہ عزم اور خواہش کے اُس نامعلوم ماحول کی باعث ہی جو اس جگہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اُس
کہنا زاہد کی روح کی معاونت سے جس نے خدا سے لو لگا کر اپنی تمام عمر یہاں گذار دی

مجھے یقین ہے کہ میں کامیابی کیساتھ یہ واضح کرچکا ہوں کہ میری قوتِ ارادی نے اِس آشرم پر کی بنیاد کیسے ڈالی۔ اور جو اپنی آزادی کو آہستہ آہستہ ضائع کرکے خود اُس وحدانیت میں گم ہوگئی۔ اور آخر مقصد یہی تھا۔ مختصر یہ کہ آشرم کے نصب العین نے میرے جوشِ عمل میں برقی رَو دوڑا دی۔ لیکن حا خ حسن و قبح کو بھی بالکل فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ اسکول کی بیرونی حالت سے ظاہر ہے۔ میں اس ا کے نظامِ تعلیم میں برابر کوشش کرتا رہا ہوں کہ میرا اپنا نظریۂ تعلیم عمل میں لایا جائے جو بچوں کے دماغوں کے میرے ذاتی تجربہ پر منحصر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ لڑکوں کا نیم شعوری دماغ اُن کے شعوری ذہن سے زیادہ ہوتا ہے اور ہماری تعلیم کے بہت ضروری حصہ کی تکمیل اسی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ لاتعداد نسلوں کے تجربا اسی کے اثر سے ہمارے ذہن نشین ہوتے ہیں اور بجائے نقصان پہنچانے کے موجبِ فرحت ہوتے ہیں۔ یہ نیم شعوری ہماری زندگی سے بالکل متحد ہوتی ہے۔ یہ اس لالٹین کی طرح نہیں جو باہر کی طرف سے روشن کی جاسکتی ہو یا باہر کی طرف سے بتی کتری جاسکتی ہو۔ بلکہ اس روشنی کے مانند ہے جو جگنو کی جزوِ حیات بنکر چمکتی ہے۔ خوش قسم سے میں نے ایسے گھرانے میں پرورش پائی جہاں ادب، صنعت و موسیقی کی طرف ہر شخص کا طبعی میلان تھا۔ میرے حقیقی اور چچیرے بھائی آزاد خیالی کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں اکثر فنِ لطیف کا فطری جذبہ لیکر پیدا ہوئے تھے۔ اس ماحول میں رہنے سے یہ فائدہ ہوا کہ میں بچپن ہی سے غور و فکر اور اظہارِ خیالات کا عادی ہوگیا۔ مذہبی معاشرتی نقطۂ نظر سے ہمارا خاندان رسومات کی تمام پابندیوں سے آزاد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم متعصب عقائد اور رواج کے قائل نہ تھے۔ لہذا معاشرت سے قطعی کنارہ کش تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں ذہنی آزادی مل گئی۔ اور ہم ہر شعبۂ زندگی میں تجربات کرنے لگے۔ میرے لیے بچپن میں جو تربیت موزوں خیال کی گئی وہ یہ تھ کہ مجھے پورے طور پر ذہنی استعداد کے استعمال کی آزادی دیدی تھی اور چونکہ متذکرۂ بالا امور کی وجہ سے میں اپنی پرورش کے قدرتی ماحول میں پڑھنے کا بہت زیادہ عادی ہوگیا تھا لہذا اسکول کا دل شکن طریقِ تعلیم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔

میری ابتدائی زندگی کا صرف یہ ایک تجربہ تھا جو اسکول کے اجرا میں میرا معین و مددگار رہا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ ضروری شئے تربیت تھی اور اسکول کا طرزِ تدریس کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا خوش قسمتی سے

شری یت ستیش چندر رائے جو بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے میرے اس اسکول میں بہت دلچسپی لینے
لگے اور میرے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اگرچہ ان کی عمر ۱۹ برس کے قریب
تھی لیکن وہ ایک قوی روح کے مالک تھے جو دنیائے تخیل میں مست رہتی تھی۔ قدرتی نظارے اور انسانی دماغ
اُن کی دلچسپیوں کا سامان تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور یقیناً وہ غیر فانی ادبی شعراء میں شمار ہوتے اگر موت کچھ عرصہ
زندہ رہنے کی مہلت دیتی۔ افسوس بیس برس کی عمر میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح ہمارا اسکول ان کی خدمات
سے صرف ایک سال کے مختصر عرصہ تک بہرہ یاب ہو سکا۔ ان کے کلاس میں طلباء کبھی بھی یہ محسوس نہیں کرتے
تھے کہ وہ اسکول کی چہار دیواری میں محبوس ہیں۔ انھیں ہر جگہ جانے کی آزادی تھی۔ موسم بہار میں جب سال کے
درخت اپنے شباب پر ہوتے ہیں وہ طلباء کو جنگلوں میں لیجا کر اپنی محبوب اور دل کو گرما دینے والی نظمیں وجد انگیز
ترنم میں سنایا کرتے تھے۔ وہ طلباء کے سامنے شیکسپیر اور براؤننگ کی منتخب نظموں کی اپنی حیرت انگیز قوتِ بیانیہ
کے ذریعہ بنگالی زبان میں تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ انھیں کبھی یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ ایسی مشکل چیزیں سمجھنے کی
لڑکوں میں اہلیت نہیں۔ جس مضمون میں ستیش بابو کو دلچسپی ہوتی تھی اُسی موضوع پر وہ طلباء کے سامنے بولتے اور پڑھتے
تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ضروری نہیں کہ بچے ٹھیک ٹھیک اور لفظ بلفظ سمجھیں بلکہ صرف یہ کہ اُن کی خوابیدہ ذہنیتوں
کو جگایا جائے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ وہ دوسرے اساتذہ کی طرح صرف اسی کتابوں کا گدھا بنکر
نہیں رہ گئے تھے۔ جو چیز وہ پڑھاتے تھے وہ اُن کی ذاتی ہوتی تھی یہی وجہ تھی کہ اُس میں زندگی کا مواد ہوتا تھا
اور وہ انسانی فطرت سے بہت مشابہ ہوتی تھی۔ اُن کی کامیابی کا حقیقی راز اسی بات میں مضمر تھا کہ وہ طلباء
تخیلات۔ زندگی اور اپنے گرد و پیش کی چیزوں میں بیحد دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں یہ جذبہ مطالعۂ کتب سے پیدا نہیں
ہوا تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی حساس ذہنیت کا کائناتِ عالم سے بلا واسطہ تعلق تھا۔ موسم کی تبدیلیوں کا اُن پر ایسا
ہی اثر ہوتا تھا جیسا درختوں پر۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے خون میں قدرت کے پوشیدہ پیغامات دوڑ
رہے ہیں۔ وہ پیغامات جو ہمیشہ سے فضا میں موجود ہیں آسمان پر چمک رہے ہیں اور زمین کے نیچے گھاس کی جڑوں
میں جان ڈال رہے ہیں جس ادب کا وہ مطالعہ کرتے تھے وہ کتب خانہ سے کوئی سروکار نہ رکھتا تھا۔ وہ خیالات
کو اپنے سامنے اس طرح دیکھ سکتے تھے جس طرح کہ ہم اپنے دوستوں کو انسانی شکل و صورت میں دیکھ سکتے ہیں

پس ہمارے طلبا نہایت خوش قسمت تھے کہ وہ نصابی کتب سے نہیں بلکہ ایک زندہ اُستاد سے سبق لیکر م[illegible]
ہوتے تھے

کیا دوسری ضروریات کی طرح ہماری کتابیں ہمارے اور ہماری دنیا کے مابین رخنہ انداز ہوتی [illegible]
ہم اس بات کے عادی ہوگئے ہیں کہ کتابوں کے صفحات سے ذہن کے دریچے بند کر لیتے ہیں اور ان کے
کو رٹ رٹ کر ذہن پر ایسا ضماد کر لیتے ہیں کہ راہِ صداقت طے کرنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ کتابی تعلیم کی
ایک سنگین حصار کے مانند ہے جہاں ہم پناہ لیکر تمام مخلوقات سے مامون و مصئون ہو جاتے ہیں۔ کتابوں [illegible]
فوائد سے انکارِ کلی ہونا بیشک غلطی ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کتابیں محدود ہوتی ہیں اور خطرات
سے لبریز۔ بہرحال ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں بچوں کو قدرت کا سبق قدرتی طریقوں ہی سے ملنا چاہئے یعنی بلا[illegible]
اشخاص اور اشیاء کے ذریعہ سے۔ اس حقیقت کے یقین کے بعد میں نے اپنے آشرم میں فضاء تخیل پیدا کرنے کا
ہر ممکن ذریعہ سے کوشش کی ہے۔ نوخیز دماغوں کو اکسانے کے لیے ترانہ ہائے حمد لکھے گئے ہیں۔ اور وہ ایسے ہوتے
ہیں جو شاعر خود بخود زورِ طبع سے متکیف ہو کر لکھتا ہے "گیتا نجلی" کے بہت سے ترانے یہیں لکھے گئے ہیں۔ یہ
اشعار جو گلہائے نوشگفتہ کی طرح ہوتے ہیں بچوں کے سامنے گائے جاتے ہیں۔ اور وہ مجتمع ہو کر یاد کرنے لگ جاتے
آتے ہیں۔ اور پھر فرصت کے وقت کھلی ہوا اور چاندنی راتوں میں اور جولائی کی ابر آلود فضاؤں میں جماعتیں
بنا بنا کر آزادانہ گاتے پھرتے ہیں۔ میرے تمام آخری ڈرامے یہیں لکھے گئے اور جب کبھی میں اساتذہ کو کوئی نئی چیز
لکھکر سناتا ہوں خواہ نظم ہو یا نثر طلبا سننے کے لیے ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح وہ بلا کسی جبر و اکراہ کے مستفید
ہوتے ہیں۔ ہندوستان سے رخصت ہونے سے چند ہفتہ پیشتر میں نے براؤننگ کے ڈرامہ لوریا ([illegible]
کا بنگالی میں ترجمہ کر کے سنایا اور یہ دو نشستوں میں ختم ہوا۔ دوسری نشست میں بھی اجتماع کی وہی کیفیت
تھی جو پہلی میں تھی جن اصحاب نے ان لڑکوں کو سوانگ بھرتے دیکھا ہے وہ ان کے ایکٹر ہونیکی تحیر خیز استعداد کے
بیحد معترف ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھیں کبھی باقاعدہ طور پر سوانگ بھرنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ وہ قدرتی
جذبہ کے ماتحت اُن ڈراموں کی روح تک پہنچ جاتے ہیں جن میں وہ حصہ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ ڈرامے معمولی اسکول
کے بچوں کی استعداد سے بلند تر ہوتے ہیں بحیثیتِ مصنف ان ڈراموں کے مظاہرے کے بارے

ہیں باوجود تمام نکتہ چینیوں اور پریشانیوں کے مجھے اپنے طلبا سے کبھی مایوسی نہیں ہوئی اور میں اساتذہ کو طلبا کے ایسے معاملات میں دخل دینے کی شاذونادر ہی اجازت دیتا ہوں۔ اکثر مرتبہ وہ خود ڈرامہ لکھتے ہیں یا برجستہ ایکٹ کرتے ہیں اور ہم اُن کے ان ڈراموں میں مدعو ہوتے ہیں۔ ان کی ادبی مجالس کے جلسے ہوتے ہیں اور تین رسالے سالانہ نکلتے ہیں جو تین حصص پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ چھوٹے بچوں کا حصہ ہوتا ہے۔ طلبا کی ایک کافی تعداد نے نقاشی اور مصوری میں قابل تعریف مہارت پیدا کرلی ہے اور یہ مہارت سختی کے ساتھ نمونوں کی نقل اتارنے سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ صرف اپنے میلانِ طبع کی پیروی سے اور کچھ اُن ماہر مصوروں کی گاہے بگاہے آمد سے جو اپنے شاہکار دکھا کر لڑکوں میں ایک روح پھونک دیتے ہیں

شروع شروع میں جب میں نے اسکول جاری کیا تو لڑکے موسیقی سے کوئی خاص رغبت نہیں رکھتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا میں موسیقی کے لیے میں نے کوئی استاد مقرر نہ کیا کہ انھیں جبریہ سبق دیں۔ محض مواقعات پیدا کردیئے گئے تا کہ جس جس کو قدرت نے موسیقی کا مادہ عطا کیا ہے وہ خود مشق شروع کردے یہ ایک تربیت غیر شعوری تھی جس کا اثر لڑکوں کے سامعہ پر ہوتا رہا اور جب رفتہ رفتہ ان میں سے اکثر نے موسیقی سے رغبت کا اظہار کیا اور میں نے خود دیکھ لیا کہ اب یہ استاد سے باضابطہ سیکھنے کے لیے رضامند ہیں تو میں نے موسیقی کا استاد مقرر کردیا

ہمارے اسکول میں تمام لڑکے علی الصباح اور اکثر مرتبہ پو پھٹنے سے پہلے اُٹھتے ہیں۔ خود اپنے بستر وغیرہ ٹھیک کرتے ہیں اور پھر تالاب میں نہاتے ہیں۔ تمام وہ باتیں جو اپنی مدد آپ کرنے کی عادت ڈالنے والی ہیں وہ خود انجام دیتے ہیں زہد و ریاض اور عزلت گزینی پر مجھے بہت زیادہ یقین ہے اور اسی مقصد سے صبح و شام میں پندرہ بیس منٹ کے لیے ضرور علیحدگی اختیار کرکے بیٹھتا ہوں۔ اور اس بات کے لیے طلبا پر بھی بہت زور دیتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ منافقانہ یا ریاکارانہ بیٹھکر غور و فکر کریں اور یہ سوچ لیں کہ وہ مراقبہ کررہے ہیں بلکہ مجھے خوشی ہوگی اگر وہ بالکل خاموش بیٹھ جائیں اور اپنے نفس کو قابو میں کرنے کے لیے پوری طاقت صرف کردیں۔ خواہ خدائے تعالیٰ کے تصور کے بجائے وہ ایک گلہری ہی کو دیکھ رہے ہوں جو درخت کے تنے پر دوڑ پھر رہی ہو

اس قسم کی درس گاہ کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس کا سب سے زیادہ عنصر وہ ماحول اور یہ حقیقت ہی کہ مدرس خود سر حاکموں کی طرح ان پر مسلط نہیں ہیں۔ میں ہمیشہ ان کے ذہن نشین کرنے کی سعی کرتا ہوں کہ یہ درس گاہ ان کی اپنی دنیا ہے جہاں انھیں اپنی زندگی کو آزادانہ طریقہ سے مکمل بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے مدرسہ کے انتظامات میں بھی انھیں دخل ہی اور جہاں تک سزا کا تعلق ہی اکثر وہ ان کی اپنے ہی جذبہ انصاف پر چھوڑ دی جاتی۔

اب اختتام مضمون پر میں ناظرین کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ اس آشرم کے متعلق کسی قسم کا غلط یا مبالغہ آمیز نقشہ اپنے ذہن میں نہ جمالیں۔ جب خیالات بذریعہ تحریر بیان کئے جاتے ہیں تو وہ بہت ہی سادہ اور مکمل معلوم ہوا کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اُن کا انکشاف اس مواد کے ذریعہ جو ہمیشہ مختلف اور تغیر پذیر ہوتا ہی صاف اور جامع نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت اور خارجی حالات کے مابین بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ ہم میں سے بعض لوگوں کا خفیف سا یقین ہی کہ بچوں کے ذہن بھی زندہ مشین کی طرح ہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک باجبر نیکی کے اصول ذہن نشین کرنا فطرت کا تقاضا ہے۔ برخلاف اس کے لڑکوں کی اثر پذیر طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اور اکثر ایسی ناکامیوں کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں جن سے کوئی مفر نہیں۔ جرائم توقع کے خلاف ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ہمیں اپنے مقاصد کے اثرات کے متعلق بدظنی پیدا ہو جاتی ہی اور اس طرح شبہات کے تاریک دور سے گزرنا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کشاکش و تذبذب حقیقت کے صحیح پہلو سے متعلق ہوتے ہیں۔ زندہ مقاصد گھڑی کے پرزوں کی طرح منظم نہیں ہوتے کہ ہر سکنڈ کا ٹھیک ٹھیک پتہ دیں جنھیں اپنے مقاصد پر پورا بھروسہ اور یقین ہوتا ہی وہ اُن کی ہمت کا امتحان متواتر ناکامیوں کے مواقع پر کرتے ہیں جن کا وقوع پذیر ہونا صحیح راستہ سے گمراہ کر دینے کے لیے لازمی ہے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہی میں ترتیب و قواعد کی بہ نسبت اصولِ زندگی اور روحِ انسانی کا زیادہ قائل ہوں مجھے یقین ہی کہ تربیت کا مقصد آزادیٔ دماغ ہے جو آزادی کے ذریعہ ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہی۔ اگرچہ وہ زندگی کی طرح خطرہ اور ذمہ داری سے لبریز ہی۔ میں وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لڑکے زندہ مخلوق ہیں اور معمر لوگوں کی بہ نسبت زیادہ زندہ دل ہوتے ہیں کیونکہ ان لوگوں کی عادتیں اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہو کر پختہ ہو جاتی ہیں لہٰذا ان کی دماغی صحت ترقی کے لیئے اشد ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کے لیے محض اسکول ہی مہیا نہ

جائیں بلکہ ایک ایسی دنیا ہونی چاہیے جہاں ذاتی محبت کا سبق ملتا ہو۔ یہ ایک آشرم ہونا چاہیے جہاں لوگ اعلیٰ
مقصد زیست کے حصول کے لیے جمع ہوں اور وہ ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں قدرت کے پُرامن نظاروں کے مواقع
ہوں۔ جہاں زندگی صرف خیالی شے نہ ہو بلکہ عملی طور پر بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں جہاں بچوں کے دماغوں
میں یہ بات راسخ کر دینے کی دائمی مشق جاری نہ ہو کہ قوم پرستی ہی صحیح مقصدِ حیات ہے۔ جہاں انھیں اس
حقیقت کی آگاہی سے نہ روکا جائے کہ یہ دنیائے فانی خدائے تعالیٰ کی سلطنت ہے جس میں لوگ شہری حقوق کے
مالک ہیں۔ جہاں روزانہ طلوع وغروب آفتاب اور ستاروں کے شاندار سکوت کی طرف سے بے توجہی نہ برتی جاتی
ہو۔ جہاں انسان پھول اور پھل کے قدرتی اجتماع کو مسرت کیساتھ قبول کرتا ہو۔ جہاں پیر و جواں۔ اُستاد
و شاگرد ایک دسترخوان پر بیٹھکر کھانا کھاتے ہوں اور ابدی روحانی فیض سے بہرہ یاب ہوتے ہوں

(ٹیگور)

ظہیر۔ شاہ آبادی

دل بر دل داں

وہ ہے اماں طلب کہ جو خود بے اماں تھا
دل دادہ آج ہو گیا جو دل ستان تھا
پیکاں کا جس کے سینۂ عالم نشان تھا
وہ آج دردِ عشق سے خود نیم جان تھا
جلتا ہے جو کہ آتشِ صد خانماں تھا

کیوں آج اس طرح سے ہے وہ شوخ بیقرار؟
کیوں ہے اسیرِ دام، زمانے کا وہ شکار؟
بیگانۂ ملال تھا، اب ہے ملول و زار
ہے اُس کا آج پیرہنِ صبر تار تار
عشاق کا جو کل تلک آرامِ جان تھا

ہے آج ایک کاکلِ زرتار کا اسیر
بے صبر و بے قرار ہے، رفتار کا اسیر
اک فتنہ زا نگاہِ طرب کار کا اسیر!
چھٹتا کہیں ہے غمزۂ عیّار کا اسیر!
کل تک وہ ملکِ ناز کا صاحبقران تھا

اب تک ہے یاد اس کی زمانے کو نخوتیں
لیکن ہیں آج دیکھئے کیا اس کی حالتیں
گر دل پہ بارِ غم ہے تو سر پر ہیں آفتیں
اک بانیٔ جفا سے ہیں اُس کو شکایتیں
خود جس کا ظلم سب کے لئے داستان تھا

(ماخوذ)

یلدرم

فرانس میں تعلیم کے مواقع ہندوستانیوں کے لیے

چند سال کے عرصہ میں جو ترقی طلبار کی تعداد میں فرانس کی یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں
ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ امر قابلِ قیاس ہے کہ زمانہ مستقبل قریب میں ہندوستانی طلبار کی کثرت
زیادہ اہمیت پکڑ جائے گی۔ یہ یونیورسٹیاں بعض شعبہ جات تعلیم اور تحقیقی و تدقیقی کام کے لئے ناگزیر
۔ اور اُن طلبار کے لئے جو اعلیٰ تعلیم میں مخصوص امتیاز چاہتے ہیں یہ ادارے ضروری ہیں۔ یہی
فرانس کی لائبریریوں اور کتب خانوں کا ہے۔ لہذا ذیل کے مضمون میں عام اطلاع اُن سہولتوں کی
ے گی جو فرانس میں ممکن ہیں:

انس کا نظامِ تعلیم

فرانس کا طریقِ تعلیم عامتہ اگرچہ برطانیہ یا ہندوستان سے مختلف ہے۔ لیکن اس کی
سادہ و معقول ساخت آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ کل نظام گورنمنٹ کے ہاتھ
ہے تمام فرانسیسی مکاتب۔ جوامع اور اعلیٰ و ابتدائی مدارس کا انتظام سرکاری افسران کے ہاتھ
ہے۔ جن کو اسی مقصد کے لئے تعلیم دی جاتی ہے اور جن کے نان ونفقہ کی ذمہ داری وزارت
مات پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے کسی پبلک اسکول کا مدرس یا اعلیٰ مدرسہ کا استاد یا یونیورسٹی کا پروفیسر
ب کے سب ریاست کے افسر ہیں اور جن کا تقرر حصولِ سند کے بعد ہوتا ہے۔ جو ریاست عطا کرتی ہے
نس میں صرف ریاست ہی کو امتحان لینے کا حق ہے۔ نتائج امتحان پر سند ملتی ہے۔ فرانس میں پرائیوٹ
رسے بھی بکثرت ہیں۔ اور جن میں نہ صرف ابتدائی و ثانوی مدارس بلکہ اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی شامل
۔ لیکن یہ ادارے بھی بجائے خود وہ سندیں نہیں دے سکتے جن کے اکتساب کے لئے یہ طلبار کو تیار
رتے ہیں۔ حالانکہ یہاں کے تمام اُستاد سرکاری سندیں لئے ہوئے ہوتے ہیں اور جو اُن کی لیاقت کی
مہر ہوتی ہیں۔ یہاں کے طلبار کو بھی سرکاری امتحان میں شرکت کرنی لازمی ہے تاکہ اُن کے معلومات

وحصول علم کی سرکاری طور پر تصدیق ہو جائے - اور وہ اُن سندوں کو حاصل کر سکیں جن کے ملنے پر مختلف النوع ملازمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں - بعض اعلیٰ اور مخصوص قسم کے آزاد مدرسے اپنے امتحان لیتے ہیں اور اپنے ڈپلومے عطا کرتے ہیں - اور جو صرف اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ حامل ڈپلومہ نے اُس نصاب کو پورا کر لیا ہے جو مدرسہ میں پڑھایا جاتا ہے - ان کے علاوہ "عالم جامعہ" کی سند کا دینا بھی یونیورسٹی کے ہاتھ میں ہے یا سلطنت کو مطلب نہیں

فرانس کا طریق تعلیم امتیازی طور سے مرکزی ہے - یونی ورسٹی اور ابتدائی و ثانوی مدارس سب کا انتظام پیرس سے ہوتا ہے - یہ یگانگت واتحاد عمل کسی حد تک ہندوستان کی ملحقہ یونیورسٹیوں کے اسکولوں اور کالجوں کے مشابہ ہے - فرانس میں امتحانات لینے اور سندیں عطا کرنے کے بارے میں سلطنت ہندوستانی یونیورسٹی جیسا کام کرتی ہے - تعلیم کے تمام ادارے اگر ایک ہی مدارج کے ہوں تو سرکاری طور پر اُن کی ایک ہی وقعت ہوتی ہے - جغرافیائی حالت اور رقبہ کا کچھ خیال نہیں ہوتا - اور اسی لئے سندیں جو عطا کی جاتی ہیں اُن کی ایک ہی قدر و قیمت ہوتی ہے چاہے وہ کسی مدرسے میں پڑھ کر حاصل کی جائیں - فرانس کا نظام تعلیم تین حصوں میں منقسم ہے - ابتدائی مدارس ثانوی مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے

ابتدائی تعلیم میں اُن مدارس کا شمار ہے جو کسی حد تک ہندوستان کے ہائی اسکولوں کی مانند ہیں لیکن اُن میں قدیم زبانوں (کلاسکل) کی تعلیم نہیں دی جاتی - اور ادنےٰ درجہ کے صنعتی مدرسے - اور نارمل مدرسے ابتدائی مدارس کے اُستادوں کی تربیت کے لئے بھی اس میں شامل ہیں - ابتدائی مدارس کا بڑا فائدہ عملی ہے نہ کہ ثانوی مدارس کا - جہاں پر تربیت صاف طور پر تمدنی ہے اور جہاں پر نصاب تعلیم میں لاطینی اور یونانی زبانوں کو بڑی اہمیت دی گئی ہے ابتدائی مدارس میں تعلیم ہر جگہ بالکل مفت ہے فرانس میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم از اول تا آخر ایک دوسرے کے متوازی جاری ہیں

ثانوی مدارس میں تعلیم مفت نہیں ہوتی - یہاں کا نصاب ختم کرنے کے بعد ایک سلسلۂ امتحان میں شرکت کرنا ہوتی ہے - اور کامیابی پر طالب علم کو بی اے کی سند عطا کر دی جاتی ہے - اور جس سے اُس کو یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے - بی اے کا معیار ہندوستان کے ایف اے اور بعض حالتوں میں

ے یا بی ایس سی امتحان کے برابر ہوتا ہے۔

فرانس کی اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں ۱۶ یونیورسٹیوں اور چند اعلیٰ مخصوص قسم کے صنعتی مدارس کا

رہے

تعلیم کے انتظام کے لحاظ سے فرانس کو ۱۷ اکاڈیمی میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک اکاڈیمی ایک انتظامی اور
ی اکائی ہے جس میں سیکڑوں سیاسی حصے شامل ہیں اور ہر ایک اکاڈیمی کا صدر ایک سرکاری افسر
تا ہے جس کو ریکٹر کہتے ہیں جو اپنے حدود میں وزیر تعلیمات عامہ کی نمایندگی کرتا ہے اور اس کو تعلیم کی تینوں
ڑیوں یعنی ابتدائی ۔ثانوی اور اعلیٰ پر پورا پورا اختیار رہتا ہے وہ اپنی اکاڈیمی میں یونیورسٹی کا ناظم
علےٰ بھی ہوتا ہے

علیٰ تعلیم کا ڈپلومہ | چند کتب نصاب کو پڑھ کر اور کچھ تحقیقی کام کرنے پر یہ ڈپلومہ مل سکتا ہے۔ اس کے لئے
کسی بحث پر مضمون فرانسیسی زبان میں لکھنا پڑتا ہے اور اس کی پورے طور پر تائید
رنی ہوتی ہے (طباعت ضروری نہیں)

شقہ (لائسنس | "ادب" کے لئے دو سال کی مدت اور ۴ سرٹیفکٹ امتحانوں میں کامیابی اور "سائنس"
کے لئے تین سال کی ضروری ہے ۔اس سند کو بلحاظ ادبی یا علمی مضامین کی نوعیت
کے "شقۂ ادب" یا "شقۂ علم" کہتے ہیں اور اس کا معیار برطانوی یونیورسٹیوں کے بی اے یا بی ایس امتیازی
کے برابر ہے ۔لیکن کسی مقالۂ تحقیقی کی ضرورت نہیں ۔ فرانسیسی یونیورسٹیوں میں دو قسم کی عالم کی سند عطا
کی جاتی ہے۔ "سرکاری سند" یا "جامعی سند"۔ ماسبق "شقہ" اور "سند اُستادی" کے ساتھ مل کر فرانسیسی
باشندوں کو چند پیشوں میں داخل ہونے کا مستحق بنا دیتی ہے۔ "جامعی سند" عام طور سے غیر ممالک کے طلبا
کے لئے ہے اگرچہ بعض اوقات فرانسیسی طلبا بھی اس کو حاصل کرتے ہیں۔ کم از کم دو سال کی مدت رہائش
جامعہ میں ابھی حال میں دونوں اسناد کے لئے لازمی قرار دے دی گئی ہے

سہولت و مراعات | مدت مدید سے فرانسیسی یونیورسٹیوں نے ربع مسکوں کے طلبا کو نہایت متواضع طور
سے اور بغیر کسی معاوضے کے نوازا ہے ۔ فرانس کے اعلیٰ تعلیم کے [illegible]

سب ملاکر اور پیرس کے بالخصوص موجودہ زمانہ کی اعلیٰ تعلیم کی یونیورسٹیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ پیرس
ابھی تک دنیا کا عقلی مرکز ہونے کے باوصف تمام شعبہ جاتِ تعلیم میں اعلیٰ قسم کی علمی سہولتیں بہم پہنچاتا۔
اور بعض اداروں میں تو لاثانی مراعات ہیں مثلاً رومانی زبان وادب۔ قانون بین الاقوامی۔ تواریخ
تنقیدِ ادب اور ادب کی مشق و تربیت میں فرانس کے جامعی شہر کسی نہ کسی شعبہ تعلیم میں پیرس کے ہم
ہیں اور تمام شعبہ جات میں فرانس کو سرچشمۂ علم بنا دیتے ہیں۔ صوبہ جاتی جامعوں میں سے بعض تو
کے سب سے قدیم جامعہ ہیں اور اُن کا ماضی نہایت طویل ہے۔ ان میں سے ۱۶ ادارے ایسے ہیں جو
شہروں کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض یونیورسٹی شہروں میں نہایت مفید فن و ہنر یا نادرات قدیم
مخزن اور کچھا کچھ بھرے ہوئے کتب خانے ہیں۔ اور کم و بیش سب میں تواریخی یادگاریں موجود ہیں
جو خوبصورتی و دلچسپی میں بے نظیر ہیں۔ ان میں سے چند شہروں کے متعلق دو چار لفظ کہہ دینا کہ کس طرح وہ اپنی
مختلف النوع دلبستگیوں سے ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں بے محل نہ ہوگا

اکیس مارسلیز
Aix. Marseilles

مارسلیز سے ۵۰۰ میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ اور اکیس مارسلیز سے
تقریباً ۱۰ میل شمال کی جانب۔ اکیس اور مارسلیز دونوں میں یونیورسٹی
منقسم ہے اکیس میں ادب و قانون کے شعبے ہیں اور مارسلیز میں علم (سائنس) اور ادویات کے درجے۔
مارسلیز کے شور و غوغا اور اکیس کی انتہائی خاموشی میں حیرت انگیز فرق ہے۔ اکیس پرووِنس کا پرانا دارالخلافہ ہے۔
اس کے قدیم محلات اور عمارات عامہ سنہرے پتھروں کی ساختہ ہیں۔ اور جنوبی دھوپ اور گرمی سے بعید
پر رونق ہیں سڑکوں پر اُڑتی ہوئی خاک۔ ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔ سیراب باغات اور
شہر کے باشندوں کی سادہ اور آرام دہ زندگی اس شہر کو بہت ہی پیارا بنائے ہوئے ہیں اور یہی صوبۂ
پرووِنس کی خصوصیت ہے اس سے متصل تھوڑے فاصلے پر دیگر مشہور شہر اور قصبے واقع ہیں

کلرمونٹ فرنڈ
Clermont. Ferrand.

(Auvergne.) آوَرن کا تاریخی اور مشہور عام دارالخلافہ کلرمونٹ
فرانس کے وسطی حدب کے پہاڑوں سے محدود ہے۔ اس سے تھوڑے فاصلہ پر
مشہور پانی کے چشمے اور تاریخی دلچسپی کی جگہیں ہیں۔ آس پاس کی سرزمین خوبصورت

اور دل کش مناظر کا منبع ہے۔ خود شہر کے بالکل نزدیک خاموش آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ ہے جس کا حُسن و خوبصورتی حیرت انگیز ہے

گری نوبل Grenoble | یہ شہر جس کے گرد ایلپس پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں مختلف دل چسپیوں سے معمور اور قدرتی مناظر سے پُر ہیں۔ اور جو دریائے اسرار کی روپہلی وادی میں واقع ہے اس کو نہایت دل کش اور نشاط انگیز بنا دیتے ہیں

کین Caen | پیرس سے ۱۴۰ میل مغرب کی طرف کین کا شہر "شمالی انگلینڈ" واقع ہے اور جو نارمنڈی (Normandy.) میں روئین (Rowen) کے بعد سب سے زیادہ پُر لطف شہر ہے۔ اس کی خوبصورتی کا دارومدار اس کے قدیم گرجاؤں پر ہے۔ اس کے میوزیم میں نفیس اشیاء کا مجمع ہے اور اس کا ماضی علم ادب کے باعث روشن ہے

فرانس کی یونیورسٹیوں میں موسم گرما کے اسکولوں میں بعض خاص منافع ہیں یہ گرمائی اسکول جون سے نومبر تک ۳ چار مہینے کے لئے جاری رہتے ہیں۔ یہاں ہر سال سیکڑوں کی تعداد میں غیر ممالک کے اُستاد اور طالب علم جوق جوق جمع ہو جاتے ہیں جو فرانسیسی زبان کی تکمیل کرنے آتے ہیں۔ بعض سرمائی اسکول اُن شہروں میں ہیں جن میں یونیورسٹیاں واقع ہیں اور جن کے ماتحت یہ کام کرتے ہیں - یہ بے سان کن (Besancon)، کلیرمونٹ فیرنڈ (Clermont. Ferrand)، ڈائیجن (Dijon)، گری نوبل (Grenoble)، نینسی (Nancy)، پیرس (Paris.)، اسٹراسبرگ (Strasbourg) میں عموماً ہوتے ہیں دوسرے گرمائی اسکول صوبہ جاتی یونیورسٹیوں کے لئے زیادہ باعثِ دل چسپی ہیں کیونکہ یہ خود جامعی شہروں میں واقع نہیں ہیں۔

فرانسیسی یونیورسٹیاں اور نیز وہ تمام شعبہ جات اور مدارس جو اُن کے زیر اثر ہیں۔ بہت زیادہ حد تک آزاد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں - اُن کے علمی و عقلی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر ایک یونیورسٹی اعلیٰ تعلیم کی قومی جامعہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ خاص توجہ اپنے آس پاس کے قطعہ زمین کی حالت۔ اس کی تاریخ۔ اس کی ضروریات اس کے اقتصادی

حالات وغیرہ پر کرتی ہے اور اس طرح اپنی مخصوص انفرادیت کو قائم کرتی ہے۔

اپنے ذرائع کا ایک معتد بہ حصہ، روایتی تعلیم پر صرف کرنے کے علاوہ - جوامع بہت ہی زیادہ تو
تحقیق علم اور دنیا کی ضروریات کو پورا کرنے کے عقل کے باقاعدہ استعمال پر صرف کرتی ہیں - ا
کوششوں کے نتائج سے اُن اداروں کی تنظیم عمل میں آئی ہے جو اُن تمام سہولتوں کے مرکز ہیں جو ایک
میں کسی خاص مضمون کے مطالعہ کے لئے اور خاصکر عملی سائینس میں (Applied) ممکن ہیں او
جو حرفتی اور پیشہ وری کے اعلیٰ اسکولوں کی ساخت کا باعث ہیں

فرانس کی تمام یونیورسٹیوں میں باستثنائے بیسان کن اور کلرمونٹ فیرنڈ کے جن میں قانون کے شعبے
نہیں ہیں ادب - علم - قانون اور دوویہ کے شعبے ہیں - ادب کے شعبے میں فلسفہ علم الالسنہ - زبان - تاریخ ادب - تاریخ - جغرافیہ - تعلیم او
مضمون کی تعلیم ہوتی ہے - قانون میں نہ صرف قانون کی بلکہ سیاسیات اقتصادیات - مالیات اور ہم رشتہ
مضامین کی تعلیم ہوتی ہے - طب اور دواسازی کے شعبے میں مختلف قسم کے مضمونوں کا شمار ہے فرانس کی
اکثر یونیورسٹیوں نے اپنے سال تعلیمی کے دوران میں فرانسیسی زبان کا خاص اور علیحدہ انتظام اجنبیوں کے
لئے کیا ہے - جہاں ۴ ماہ تک تعلیم دی جاتی ہے - پہلی ٹرم اوائل نومبر میں اور دوسری پہلی مارچ کو شروع ہوتی
ہے - پیرس یونیورسٹی میں خاص طور سے اجنبیوں کے لئے "فرانسیسی تمدن" کی تعلیم کا انتظام ہے - یہ زبان کی تعلیم
نہیں ہوتی بلکہ ازمنۂ وسطیٰ سے لیکر عہد حاضرہ تک کی تاریخ ادب اور علم وفن پر تبصرہ ہوتا ہے یا فرانسیسی تہذیب کا
سرسری مطالعہ - اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ اس سے مختلف پہلوؤں میں جن میں فرانس کی عقل و دانش نے کارنامے
انجام دیئے ہیں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے

پیرس اور خاص فوائد

ایک نمایاں اثر جو سیاح طلباء پر پیرس کا پڑتا ہے یہ ہے کہ تمام پیرس عقلی ہماہمی سے
ہمہ تن برق بنا ہوا ہے - اور جو تمام عالم کے تخیلات کا زبردست مخزن ہے - یونیورسٹی
اور مکتبہ کی چار دیواری کے باہر فہیم کے بہترین مواقع میسر ہیں - جو ہر قسم کی تعلیم میں مدد و معاون ہیں - کوئی طالب علم
تعلیم کا ایک سال بھی تو بغیر فائدہ اُٹھائے ہوئے پیرس میں صرف نہیں کرتا - اور یہ فائدہ اُس کے علاوہ ہی جو
اس کو یونیورسٹی میں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے - تمام سال علم و ادب کی مجالس اور جوامع کے مختلف قسم کے

جلاس ہوتے ہیں جن سے اجنبی عالموں اور طالب علموں کو بہت فائدہ پہونچتا ہے۔ فرنچ کالجوں کے
ابل توجہ نصاب۔ تعلیم گاہ علم وادب کے ترقی کے لئے شمع ہدایت ہیں کالجوں کے پبلک لکچرس اور پروفیسروں کے
کاموں سے عوام بھی بلامعاوضہ مستفیض ہوسکتے ہیں قومی کتب خانے کے جو دنیا کے بہترین کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے
دروازے ہر قسم کے طلباء کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ شام کے وقت مفت لیکچر دیئے جاتے ہیں جو طالبان علم
کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ ریڈیم کا ادارہ زیر نگرانی لیڈی کیوری (Mme Curie) ایکس رے کا
عمل اور نجوم کی رصدگاہ میوڈن (Meudon) جو پیرس کے بالکل نزدیک ہے۔ اور جو مشہور ماہر فلکیات و
پروفیسر طبیعیات ایم۔ ایچ دوس لینڈرس (Des landers) کے زیر نگرانی کام کررہے ہیں اور
سینکڑوں دیگر ادارے پیرس کی چند خصوصیات علمی کو ظاہر کرتے ہیں۔

پیرس کی کوششیں دیگر شعبہ جات علم میں بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتیں۔ تاریخی۔ تعمیراتی اور نباتاتی وغیرہ
اداروں میں سے بعض نہایت بہترین پیرس ہی میں ہیں۔ کوئی دوسرا ملک فرانس کی آثار قدیمہ اور انسیات کے
میوزیم کی خوبیوں میں ہمسری نہیں کرسکتا۔ کسی دوسری قوم نے ہڈیوں وغیرہ کی دریافت میں اتنی ترقی نہیں
کی جتنی کہ فرانس نے کی ہے۔ جامعہ پیرس کے علمی ادارے (سائنس) میں اس مضمون کی بھی تعلیم
دی جاتی ہے۔ اور جہاں تک فن تعمیرات کی تعلیم کا تعلق ہے فرانس اس میں بے مثل ہے۔ یہاں تعلیم بھی
دی جاتی ہے اور اس مضمون کی مختلف شقوں ——— مشرقی۔ مصری۔ یونانی۔ رومی۔ فرانسیسی وغیرہ
میں تحقیقات بھی ممکن ہے علوم الاجتماع Social science کی تعلیم میں پیرس میں بہت آسانیاں ہیں سماجی
اصول ہر قماش و ہر طبیعت کے آدمیوں کے لئے نہایت آزادی و فراخ دلی سے بتلائے جاتے ہیں
اور اکثر اوقات وہی شخص ان اصولوں کی تشریح کرتے ہیں جن کو ان میں ید طولیٰ حاصل ہوتا ہے۔ ہر شخص
بغیر کسی حیل وحجت کے ان مدارس میں داخل ہوسکتا ہے اور اسکول بھی ہیں جو بالکل ان ہی مضامین
کی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں

فرانسیسی دارالخلافہ دنیا کا مرکز فن ہے پیرس کے حسین ذرائع فن وہنر کے اکتساب کے لئے بمقابلہ
کسی دوسرے شہر کے لاجواب ہیں وہاں نہ صرف بکثرت خوبصورت عجائب گھر۔ پرائیویٹ [illegible]

اور تاریخی یادگاریں ہیں جو زمانۂ ماضی کے حیرت انگیز کامیابیوں اور یادگاروں کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ وہاں پر لا
تمائش گاہیں نو بہ نو اشیاء کی نمائش کیلئے مختلف مجالس کی زیر نگرانی منعقد ہوتی ہیں یا تجاروں کی دوکان پر نظر پڑتی ہیں ۔
وہ کتب اور مدارس جن میں فن و ہنر کی تمام شعبوں کی تعلیم ہوتی ہے - پیرس میں بے شمار ہیں - پیرس موسیقی
اور تماشا کا بھی بڑا مرکز ہے

پیرس میں ایک اور کشش ہے جو صنعت و حرفت میں دلچسپی لینے والوں کے لئے ایک علمی اور حسیاتی دعوت ہوتی ہے اور
وہ ماحول پیدا ہوتا ہے جس میں رہ کر صنّاع اور کاریگر نہایت آسودگی سے زندگی بسر کرتے بے تکلف
اور نہایت خوشی خوشی کام کرتے اور بہت فائدہ اٹھاتے ہیں شہر کے ایک حصہ میں تو ان ہی لوگوں کی آبادی ہے
پیرس کا وہ حصہ جس کو لاطینی محلہ کہتے ہیں اور جس کو طلباء اور صنّاع اپنی ملکیت خیال کرتے ہیں آج تک
اس سحر کو محفوظ کئے ہوئے ہے جو بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کو اپنا گرویدہ کر چکا تھا - گو اب وہ بات
باقی نہیں رہی ہے لیکن تاہم ایک باذوق سا بدذوق اور رغبی سا غبی انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں
گزر سکتا

ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر "نگار خانہ" ہے اور نیچے تھوڑے سے فاصلے پر جامعہ پیرس
مدرسۃ العلوم فرانس اور کتب خانے ہیں - اور پاس ہی نہایت حیرت انگیز باغات ہیں جن میں سایہ دار
درخت پھولوں سے پُر خیاباں اور خوش آیند منظر ہیں جہاں پر طالب علم جب وہ باغ کی ٹھنڈی سایہ دار
پیاری پیاری دھوپ میں آرام کرتا ہے - علم و ادب کے وسیع سمندر کے عمق میں غوطہ زن ہو جاتا ہے
ان تمام منافع سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو پیرس کا ماحول ہی ایسا ہے جس سے بین الاقوامی
اتحاد کی روح تر و تازگی پاتی ہے - وہ ہندوستانی طلباء جن میں تنقید کا مادہ اغلب ہے - اس بات
کو بالضرور محسوس کریں گے کہ وہ محدود الخیال اور تنگ نظر ہوتے ہیں وہ یقینی طور پر فرانس کے بالکل
آزاد ماحول میں قیام کرنے سے فائدہ اٹھائیں گے جہاں پر ان میں دوسرے لوگوں کی دماغی
کیفیت کو سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے وہاں وہ خود مشاہدہ کریں گے کہ کس طرح مختلف خیالات
حیات کی طرح یا جو حیات و فنون کے مختلف نظریہ کی حامل ہوتی ہیں ایک دوسرے سے تقاطع کرتی ہیں

ان تمام باتوں سے طالب علم کا چند روزہ قیام بہت زیادہ پُرلطف ہوجاتا ہے اور اس کو آزاد خیال اور سنساری بنا دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ نقاد اور صحیح الدماغ بھی بن جاتا ہے۔ نہ صرف وہ طلباء ہی جن کا تعلق براہِ راست سیاسیات اور بین الاقوامی قوانین سے ہے اس سے مستفیض ہوتے ہیں بلکہ وہ بھی جن کا دائرہ عمل واضح طور پر بالکل سیاست اور معاملات ملکی سے جُدا گانہ ہے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ اندر اور باہر۔ کتابوں اور اخباروں سے جو وہ پڑھتے ہیں اور روزمرہ کے تعلقات باہمی سے بخوبی طور پر غور و محسوسات اور اپنے سے جدا خیالات کی رُو سے واقف ہوجاتے ہیں کیونکہ پیرس میں رہنے والا طالبِ علم ضروری ذاتی طور پر دوسری قوموں کے نمائندوں اور خود فرانسیسیوں سے ملتا جلتا ہے

سماجی حالت اجنبیوں کی فرانس میں

اب کچھ اجنبیوں کی فرانس میں سماجی حالت کے متعلق بھی بیان کیا جائے گا کیونکہ کسی طالب علم کا خوش گوار قیام ایک غیر ملک میں بہت حد تک اُن تعلقات پر منحصر ہوتا ہے جو وہ اپنے ہمسایوں اور اُستادوں سے رکھتا ہے

فرانسیسی عالم حقیقی معنٰی میں انسان ہوتا ہے۔ اس کے تعلقات غیر انسانی یا لاہوتی روحوں سے نہیں ہوتے۔ چاہے وہ بڑا ادیب ہو یا سائنس داں۔ ایک فرانسیسی عالم اپنی شان علمیت کی ڈینگ نہیں مارتا اور نہ ہر وقت علم کے نشہ میں رہتا ہے۔ اس کی علمیت کا اظہار اس کے وقار و متانت کی وجہ سے ہوتا ہے اس کی ذات میں اُس انسان کا جوہر پوشیدہ ہوتا ہے جو ازمنۂ تجارت میں اس آزادی پر فخر کرتا ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو دماغ کی اعلیٰ و احسن کیفیات و عملیات اور اُس ماحول کے لئے جو دھن دولت کے حرص و آز سے بالاتر ہے وقف کر دیا ہے غیر ملکی طلباء اپنے فرانسیسی اُستادوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے دوسرا خاص فائدہ فرانس میں حصول تعلیم سے یہ ہے کہ اجنبی کو کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک میں پڑھ رہا ہے اس کا رنگ روپ یا نسل کسی طرح بھی اس کے حصول مقاصد میں حائل نہیں ہوتے رنگ دار قوموں میں سے افریقی اور ایشیائی دونوں کو سب کی برابر آمادگی

نقل وحرکت حاصل ہے - ایک واقعہ بھی ہمارے گوش زد نہیں ہوا جس میں کسی ہندوستانی دوسرے مشرقی اقوام کے باشندہ کو کسی طعام خانے - ناچ گھر یا کسی عمارتِ عامہ سے بے دخل کیا گیا ہو یا اس پر بندشیں عائد کی گئی ہوں

آخر میں فرانیسی تعلیمی فوائد کے متعلق کچھ بھی رائے قائم کی جائے یہ یقینی ہے کہ فرانس ایک ملک ہے جو ہر انداز و ادا میں پیارا اور دل کش ہے - اس کے باشندوں کو وہ کمال حاصل ہے جو قابلِ رشک ہے اور پیرس ایک شاندار شہر ہے جہاں پر علوم نقلیہ وعقلیہ کے لئے بہت گنجایش ہے اور جہاں سے ہندوستانی طلبا اپنے چندروزہ قیام سے بہت سی قابل ذکر یادگاریں خوش کن تجربات کی اپنے ساتھ لاسکیں گے اور وہ اثرات کا مرکز بنجائیں گے جہاں سے تخیلات اور جذبات وسیع طور پر منتشر ہو سکتے ہیں

(ماڈرن ریویو)

(ایم اے احمد انوری)

غزل

مرے دل کی یہ حالت ہی ہجومِ یاس وحرماں میں
کہ جیسے کوئی شب رو خوف سے کانپے بیاباں میں

محبت سے ہی کچھ رونق دلِ پُر داغِ انساں میں
یہی اک جھلملاتی شمع ہے گورِ غریباں میں

درست اے لذتِ غم اب یہی منظور ہے اُن کو
دکھا دوں چاکِ دل کے آج انھیں چاکِ گریباں میں

لقب ہے ناخدا اسکا جسے اُمید کہتے ہیں
وہ ہی اک طفلکِ بے دست و پا آغوشِ طوفاں میں

عبث اے سوز تجھ کو دل کی گمراہی پہ حسرت ہے
سرِ مو فرق ہو تو ہو مری جاں کفر و ایماں میں

سوز

رُوز و شب

میں دن رات کی تبدیلیوں پر بہت غور کیا کرتا ہوں اور اس غور و فکر سے جو نقوشِ حسّی میرے ذہن میں
رتسم ہوکر مبہوت کر دینے کے عادی ہیں اُن کو اصلی صورت میں پیش کر دینا کم از کم میرے بس سے باہر ہے
لر بہرحال تفاوتِ روز و شب کا انتہائی دُھندلا خاکہ پیش کرتا ہوں جس کا تعلق حقیقت میں فقط احساسِ
شعوری ہی سے ہے ادراکِ ذہنی سے نہیں

آفتاب نکلتے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا میں اس سرے سے لیکر اُس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی
بلکہ ہر سکون حرکت میں تبدیل ہوگیا، دُنیا کی تمام قوتیں گویا کہ سوتے سوتے جاگ اُٹھیں اور ہر ذرہ تڑپ
کے لئے تیار ہوگیا، دنیا ایک سمندر تھی کہ صبح ہوتے ہی طوفانی موجوں سے ہنگامۂ محشر کی تصویر بن گئی اور
نسانی ہستیاں کسی چشمہ کے سوتے تھے کہ رات کی سنگلاخ زمین سے بہ نکلے

اس کے مقابلہ پر رات ہوتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوشِ عمل ایک پھول تھا کہ شام ہوتے ہی مرجھا گیا
یا کسی حسین کا شباب تھا کہ سبزۂ خط آتے ہی ناز و انداز بھول گیا، کائنات گویا چھوئی موئی کا پودا تھا کہ
رات کے مس کرتے ہی سکڑ کر کُملا گیا۔ زندگی کسی کی نو رس رسیلی آنکھ تھی کہ محبت بھری نظر سے شرما کر سمٹ گئی
طرح شاید کوئی دلھن تھی کہ جس نے پہلو میں آتے ہی جھجک کر آنچل سے مُنھ چھپا لیا

غرضکہ دن اگر آفتاب تھا تو رات ماہتاب دن اگر مد تھا تو رات جزر، دن اگر فعل تھا تو رات دن اگر صنفِ کرخت تھا تو رات صنفِ نازک۔"

ابو النظر رضوی

دو شعر

روانی ہے یہ لہروں میں، کہ ساحل چوم لیتی ہیں — یہاں ہے بیخودی آئی کہ لب تک بھی نہیں ملتے
مٹایا ہے زمانہ نے مرا نام و نشاں برسوں — نقوشِ بخت ہیں لیکن کہ اس پر بھی نہیں مٹتے

ابو النظر رضوی

غزل

یاس نہیں اُمید نہیں تسکیں کا پہلو کوئی نہیں — دل کی حالت غیر ہے لیکن آنکھ میں آنسو کوئی نہیں
غافل یہ بلا کی دنیا ہے کچھ سیج نہیں ہے پھولوں کی — یہ سانس ہے جب تک انساں میں آرام کا پہلو کوئی نہیں
چینِ جبیں نے شوخ نگہ سے مل کر ہم کو مار لیا — دیدہ و دل میں آگ لگی ہے چین کا پہلو کوئی نہیں
مدت گزری یاد میں تیری دل ہی دل میں روتا ہوں — لب پر نالہ کوئی نہیں ہے آنکھ میں آنسو کوئی نہیں

سوز یہ شامِ ہجراں ہے یا بستر ہے انگاروں کا
کروٹ بدلی ہر پہلو پر چین کا پہلو کوئی نہیں

سوز

میرا پہلا سفر

مندرجۂ ذیل قصہ جمیس انتھونی فرانڈے کی تصانیف کا شاہکار ہے جو اس کی زندگی ۱۸۱۳ء تا ۱۹۴۲ء ہی میں فرنچ، جرمن، پالش۔ لاطینی اور یورپ کی مختلف دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبولِ انام ہو گیا تھا۔ عبدالعلیم نامی صاحب نے جو خاصا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ اس کو اُردو کا جامعہ پہنایا ہے ہمیں امید ہے کہ یہ دلچسپ فسانہ اپنے کیرکٹر کی بنا پر پسند کیا جائیگا۔ مترجم موصوف شکریہ کے مستحق ہیں۔

مدیر

چند سال گذرے کہ میں ایکمرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا اور یہ بعید از بیان ہے کہ کب اور کہاں؟ ایک انٹر کلاس درجے میں میری نشست تھی اور ریل ٹرک کے کنارے بہت دور تک چل چکی تھی پھر بھی بہت فاصلہ ابھی طے کرنا باقی تھا کہ یکایک ایک شام جب وہ کافی تیز رفتار سے جا رہی تھی ٹرک کے کنارے رک گئی گارڈ نے دروازہ کھولکر اطلاع دی کہ ہم اب آگے سفر نہیں کر سکتے اور ساتھ ہی نہایت متانت سے اُترنے کی درخواست کی۔ مسافر بے شمار اور مختلف حیثیتوں کے تھے جو فرسٹ۔ سیکنڈ۔ انٹر تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے اسکے علاوہ ایک سیلون تھا جس میں خاص خاص لوگ مثلاً نائب السلطنت۔ قاضی قضاۃ۔ ناظم تعلیمات۔ اسقف اعظم، چند خواتین، ایک نواب معہ بیگم اور کچھ نوجوان تھے جنھوں نے گاڑی میں اتنی جگہ گھیر رکھی تھی جو تقریباً اس سے زائد غرباء کے لئے کفایت کرتی۔ ان کے پاس اشیاء اسقدر کثیر تعداد میں تھیں کہ جس سے کل فرش تمام بالائی حصے اور سب کھونٹیاں گھری ہوئی تھیں ان میں خوبصورت گدے۔ قیمتی شالیں، اونی کمبل، لبادے، پھلوں سے بھری ٹوکریاں ناول اور میگزین تھیں جنسے وہ اپنا شغل کر رہے تھے۔ بقایا مسافروں میں زیادہ تر تجارت پیشہ۔ وکیل، مصوّر، مصنف، اور سیاح تھے جو یا تو کسی خاص مقصد سے سفر کر رہے تھے یا صرف دل بہلانے یا تفریح کرنے کی خاطر جا رہے تھے۔ تھرڈ کلاس میں زیادہ تر کسان اور مزدور پیشہ تھے جو کام کی تلاش میں جا رہے تھے عورتیں ملازمت کی جستجو میں یا شوہروں کی فکر میں اور فقیر بھوک پیاس سے تنگ آکر زر زکوٰۃ وصول کرتے غرضکہ ہر ایک مسافر تھا کسی نہ کسی اسٹیشن پر اترنے کا منتظر

گارڈ کا حکم سنتے ہی سب ایک جگہ جمع ہوگئے غربانے اپنے پلندے کھولے اور وہیں اپنا بچا کچا کھانا جو اپنے ساتھ لا
تھے یا راستے میں اسٹیشنوں پر خرید لیا تھا بڑی رغبت سے کھانے اور حسب معمول غل غپاڑا مچانے لگے ـــــــ یہ
صدائیں ایسے ناموزوں وقت میں جبکہ گاڑی کی بے جا رکاوٹ سے ایک ایک لمحہ پہاڑ معلوم ہو رہا تھا کانوں کو
تکلیف دہ معلوم ہو رہی تھیں۔ امرا، شرفا اور تعلیم یافتہ جو سنجیدہ اور سمجھدار تھے ان کی طرف توجہ نہ دیتے لیکن جنہیں ق
نے یہ مادہ ودیعت نہ کیا تھا ان سے بھڑ پڑتے، انکو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے اس پر بھی وہ اس زور سے قہ
مارتے کہ سارا پلیٹ فارم ہل جاتا اور ان کو مجبوراً خفیف ہو کر ہٹ جانا پڑتا۔ کھانا ختم ہوتے ہی پارٹی بندیاں ہ
ہم مذاق و ہم نوالہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ کچھ قصے کہانیوں میں لگ گئے، کچھ گانے ناچنے میں کچھ اس میں اور کچھ اوس میں
جس کا جدھر دل چاہا شامل ہوگیا اور اس بے فکری سے اس میں مشغول ہوگیا گویا کہ دنیا و ما فیہا سے اس کو سروکا
نہیں ہے۔ اس آبادی کا بیشتر حصہ آلام و مصائب میں گرفتار رہتا کچھ بھوکے پیاسے تھے اور کچھ نان جویں کے مار
بعض ایسے بھی تھے جن پر کئی کئی فاقوں کی نوبت پہونچ چکی تھی پھر بھی خوشی منانے میں برابر کے حصہ دار تھے یہ اس
کہ تکلیف اور مشکلات کی بلائیں چھٹ چکی تھیں اور وہ ضروریات پوری نہ ہونے کے عادی بن گئے تھے جس نے ا
خود غرض اور دوسروں کی طرف سے بے فکر بنا دیا تھا

اس اعلان نے کہ ہم اب آگے نہیں جا سکیں گے، سب پر ایک ناخوشگوار اثر ڈالا اور ہر ایک تعجب سے ایک
دوسرے کا منہ تکنے لگا۔ امرا اس اطلاع پر بہت برافروختہ ہوئے اپنے نوکروں کو طلب کیا لیکن کسی نے جواب
نہ دیا اور ٹال کر ادھر سے ادھر ہو گئے۔ اس وقت تمام مسافر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع تھے اور ایک ہی خیال پر
مبتلا وہ جانکاہ خیال۔ اختتام سفر تھا۔ اسی وقت ایک فقیرنی نواب بیگم کے پاس سے جو تعجب میں کھڑی یہ نظا ر
دیکھ رہی تھی گذری تو اس کو منہ چڑایا۔ نواب بیگم کو برداشت کہاں فوراً خادمہ کو طلب کیا کہ اس بے عزتی کی اس
قرار واقعی سزا دلوائے لیکن خادمہ اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر خود اپنا سامان اٹھانے چلی گئی۔ اس وقت ام
اور غربا دا ایسے مل گئے تھے گویا سب نے ایک ہی گھر میں جنم لیا ہے۔ سب چیخ چیخ کر اسٹیشن ماسٹر پر خفگی کا اظہار کر
رہے تھے، وزیر دیر ہونے کی وجہ سے سخت غصہ ہو رہا تھا اور چلا چلا کر کہہ رہا تھا" دیکھو ہوش میں آؤ۔ فوراً سگنل د
مجھے چند نہایت ضروری کاغذات کونسل میں پیش کرنے ہیں اور دیر ہو جانے میں نقصان عظیم کا اندیشہ ہے اور سا تھ

ہی کپنی کو ہزاروں صلواتیں سُنا رہا تھا" ایک شوقین مزاج جوان جس نے ابھی اپنے بڑے بھائی کی اچانک موت کی خبر سُنی تھی بھاگا ہوا گھر جا رہا تھا کہ جلد از جلد وارث بن سکے۔ ایک بیگم جنھوں نے اپنی جوان اکلوتی چہیتی بیٹی کے لئے شوہر کا انتخاب چند خاص وجوہات کی بنا پر کیا تھا خوفزدہ ہو رہی تھی کہ کہیں تاخیر اس کے اور اس کی بیٹی کے لئے تباہی کا باعث نہ بنجائے۔ ایک صرّاف اس بات پر زور دے رہا تھا کہ فلاں وقت اس کو مکان پر موجود ہونا ضروری ہے ورنہ ...... بنک دوالیہ ہو جائیگا۔ ایک وکیل اس لئے چلاّ رہا تھا کہ اس کے سوٹ کیس میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ فلاں خاندان حقیقی طور پر فلاں جائداد کا وارث ہے اور اس کی موجودگی ہی اس خاندان کو جائداد واپس دلا سکتی ہے۔ ایک ضعیف اس بات کا افسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی بیوی سے عہد کیا تھا کہ اگر وہ اس کے انتقال کے بعد دوسری شادی کریگی تو جائداد سے محروم سمجھی جائیگی عہد نامہ بغیر دستخط کے اس کے ڈسک میں پڑا ہوا تھا۔ اسقف اعظم جو گلیگرھ جا رہا تھا اس لئے متفکر تھا کہ وہ کیونکر اس جلسہ کی صدارت کر سکے گا جو عنقریب اس بات کے طے کرنے کے لئے ہونے والا ہے کہ قربان گاہ پر شمع کی بجائے برقی روشنی کی جاسکتی ہے یا نہیں اور کیا بجلی کی روشنی مثل شمع کی روشنی کے جو استعمال سے پیشتر بخشی گئی تھی بخشی جائیگی یا نہیں اس کا اپنا جواب موافقت میں تھا لیکن اس طریقہ سے کہ اگر گیس ٹیوب شمع کی صورت میں بنائے جائیں تو یہ مشکل رفع ہو سکتی ہے اس کو دوسرا خوف یہ بھی تھا کہ اس کی عدم موجودگی کہیں پادریوں کو آمادہ بہ فساد نہ کر دے۔ اسی طرح ہر شخص اپنی اپنی فکر میں منہمک تھا اور دوسروں کی طرف سے بالکل لاپرواہ۔ اس تمام مجمع میں صرف ایک خاتون تھی جو اگرچہ افسردہ اور غمگین تھی لیکن امید افزا نظروں سے ادھر اُدھر تک رہی تھی اور اس بات کی منتظر کہ ایک مرتبہ پھر اس کا مرحوم شوہر اس سے آکر لپٹ جائے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سب کے اعتراضات بے توجہی سے سُنے اور ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا "کسی کو خوفزدہ ہونیکی ضرورت نہیں۔ سلطنت خود وزیر کا انتظام کریگی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وزیر اپنے عہدہ کا حقدار بھی نہ تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اسی فکر میں ۔ ہتا تھا کہ کس طرح اس کو لارڈ کا عالی خطاب ملے اور وہ اس کی خوشی میں ایک عظیم الشان پارٹی دے اور رؤسا کو مدعو کرے۔ مرحوم کا دوسرا بھائی موجود ہے جو اس کا جائز وارث قرار پائیگا اور کسان اس تبدیلی کو محسوس بھی نہ کرینگے۔ حسین عورت کی دختر اپنی پسند سے شادی کریگی اور ماں کا کہنا خیال میں بھی نہ لاکر ہمیشہ اس سے خوشی کا اظہار کریگی۔ تجارتی بنک کی حالت پہلے ہی سے ناگفتہ بہ ہے اور اب جبتک قائم رہیگا لوگ اس

نقصان ہی اٹھائیگے۔ لڑکا جس کو کپل ایک دولتمند بیرن بنانا چاہتا ہے۔ ایک صنعتی اسکول میں کام کر گیا اور بڑا ہو کر ملک اور قوم
بنیگا اگر وہ دولت کا وارث قرار پا گیا تو اس کے سست اور کاہل بن جانے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ ضعیف ا
مبارکباد دے کہ وہ جس بدقسمتی میں گھرنے والا تھا اس سے بچ گیا ہے۔ اس کی بیوی ایک سیّاح سے شادی کرے گی اور اس کی
برے کاموں میں ضائع ہونے سے بچ جائیگی۔ اسقف صاحب کے تفکرات البتہ قابل قدر ہیں اس کا نرخ والا مسلسل ملک و
خدمت کے لئے ہے۔ لیکن پادریوں کیلئے بیشک مفید ثابت ہوا اور ان کو آمادہ بہ فساد ہونیکا اچھا موقع ہاتھ آیا...

”خاموش ہو جاؤ“ وزیر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”کیا تم نے رد کے رکھنے کا تہیّہ کر لیا ہے؟“

” ابھی معلوم ہو جائیگا“ اسٹیشن ماسٹر نے سنجیدہ صورت بناتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اُس شریف خاتون کی ر
جو رنج وغم کا مجسمہ بنی ایک کونے میں کھڑی تھی حسرت سے تک رہا تھا۔ لب بہ حرکت ہیں لیکن خموش ہے۔ اس نے اس سے
نہ کہا لیکن سمجھ گیا کہ اس وقت اس کا دماغ کن خیالات کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ وہ زیر لب مسکرایا اور اس کا اظہار لفظوں
کے بغیر اوس کی خواہش پوری ہوگئی وہ اس کے سامنے سے ہوتا ہوا گذر گیا۔

تیسرے درجہ کے مسافر پلیٹ فارم پر اس طرح خوش گپیّاں کر رہے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں سوچتے
کہ ان کے امیر ساتھیوں کے دلوں پر اس وقت کیا گذر رہی ہے حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے نشیب و فراز نے انکو اس قدر مض
بنا دیا تھا کہ جس کا مادہ اُن سے بالکل جاتا رہا تھا اور وہ اس فکر سے بالکل آزاد ہو گئے تھے کہ قسمت ان کے لئے کیا سامان
کرنے والی ہے۔ وہ اس خیال میں مگن تھے کہ جنّت ملے یا دوزخ مطلب رہنے سے ہے اور رہنے کے لئے کہیں نہ کہیں جگ
دی ہی جائیگی۔ ان کے پاس اسباب کی قسم کے سوائے ان کپڑوں کے جو ان کے جسم پر تھے یا اُن اوزاروں کے جن سے
اپنی معاش کماتے تھے اور کچھ نہ تھا۔ انکا خیال تھا کہ جہاں چند اللہ کے بندے آباد ہونگے وہاں ان کو خدمت کے عوض
مزدوری مل ہی جائیگی

گھنٹی یکایک تیزی سے بجنے لگی، دروازہ کھلا اور سب کو ویٹنگ روم میں چلے جانیکا حکم دیا گیا۔ یہاں پہونچکر معلو
کہ اسباب کا معائنہ کیا جائیگا ہم سب قطار در قطار بیٹھ گئے اور معائنہ کنندگان کا انتظام کرنے لگے۔ یہ ہال بہت وسیع اور
خوبصورت تھا اور بہت کچھ اس سے مشابہ جیسا کسی زمانہ میں فرانس کے دوران سفر میں پیرس کے شمالی ریلوے اسٹیشن

ﷲ Salledaattente S فرانسیسی زبان میں ویٹنگ روم کو کہتے ہیں (مترجم)

ں انٹے دیکھنے میں آیا تھا۔ اس کے دونوں طرفوں سے ریل کی پٹریاں گذرتی تھیں جس سے ذرا ہٹکر مضبوط دیواریں سٹیشن کا
اط کئے ہوئے تھیں۔ ہماری پشت پر ایک لمبی میز تھی جس پر صندوق، صندوقچے، بیگ، بقچے، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ اور
ے کے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ اس سے متصل افسروں کی ایک قطار اپنی پوری وردی میں کھڑی تھی۔ ان کے سروں پہ
صورت ٹوپیاں تھیں جن میں فیتے اور لیس کا کام نہایت خوبصورتی سے کیا ہوا تھا ان کے چہرے سنجیدہ اور بارعب تھے۔
ن ہیتوں میں بہت فرق تھا اور یہی عام مسافروں کے خوف کا باعث بنا ہوا تھا انکی پشت پر ایک بڑی سنہری چین تھی جو
ں کے آر پار چلی گئی تھی اور جس کا شمالی سرا نصف چھت تک پہونچکر یہ بتلا رہا تھا کہ اس کے پیچھے دفتر ہے
ہم سب اپنا سامان دیکھنے لپکے لیکن یہ دیکھکر ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ اس میں سے کسی کو ہم پہچان نہ سکے اگرچہ
مان چاروں درجوں کے مسافروں کا موجود تھا لیکن سارے کا سارا بدلا ہوا۔ زیادہ سامان اُن غریبوں کا نظر آتا تھا جو
ہٹ لگا کر آئے تھے اور جن کے پاس کل لوازمات اسقدر رہتے جو ہاتھوں میں آسکیں متوسط سامان سیکنڈ کلاس اور انٹر کلاس
ڈبوں کے سامنے تھا جو نہایت قیمتی اعلیٰ اور نفیس تھا لیکن افسوس اس وقت ہمارے لئے بیکار تھا اس لئے کہ ہم انکو خود بھی
پہان نہ سکتے تھے۔ لیڈیز اور جنٹلمین کا کثیر سامان جسکو ہم نے سیلون میں دیکھا تھا کہیں نظر نہ آتا تھا البتہ کچھ کرم خوردہ شال اور
ادے تھے جو بے ترتیبی سے ادھر ادھر پڑے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ لوگ اب بھی شور و غل مچانے میں
شغول تھے لیکن افسروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی اور وہ مطلق توجہ نہ دیتے تھے اور کیوں دیتے جبکہ وہ اس کے
ادی ہو چکے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر نے جسکے چارج میں ہم ابھی تک تھے امیروں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "سیلون کا سامان
دوسری ٹرین سے واپس جائیگا کیونکہ وہ اب مرحوموں کی ملکیت سے خالی ہے آیندہ وہ انکے عزیزوں اور وارثوں کی ملکیت ہوگا
"مرحوم مالک!" آہ! کیا حقیقت میں اب یہ لوگ مالک نہیں ہیں؟ یہ خیال میرے دماغ میں کئی مرتبہ آیا۔ میرا ذاتی نقصان
زیادہ نہ تھا اور اس لئے خوش تھا مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ ایک عجیب قسم کے بکس پر میرا نام کندہ ہے۔ اس کی بناوٹ اسقدر
موزوں اور اس کے نئے طرز کی نفاست اسقدر دلکش تھی کہ میں نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ اس کو اٹھا کر دیکھوں لیکن
ہر مرتبہ تہذیب مانع ہوئی اور میں اپنی جگہ خاموش رہا۔ میری طرح ہر شخص کے دل میں کچھ نہ کچھ تمنا تھی اور وہ اس میں غرق نظر
آتا تھا۔ ذریر کا خیال تھا کہ میں کہیں کمیونسٹ لوگوں کے درمیان تو نہیں آ پھنسا ہوں جن کا مقولہ ہے کہ شخصی دولت کوئی چیز نہیں
وہ ملکیت عوام ہے اور پبلک کے ہر فرد کو اس کے حاصل کرنیکا اختیار ہے، یکایک خاموش رہنے کی صدا بلند ہوئی اور

تھرڈ کلاس کے مسافر طلب کئے گئے کہ انکے صندوق معائنہ کئے جائیں۔ ہر شخص کو ایک پاسپورٹ عطا کیا گیا اور جانیکی دی گئی۔ ان کے صندوق کھلے اور ان میں کپڑے۔ جوتے، موزے۔ بنیائن اور اسی قسم کی دوسری چیزیں نکلنے کی بجائے کام کے نمونے نکلے جو انھوں نے دنیا میں پایۂ تکمیل کو پہنچائے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ہی کھاتہ جس پر ایام محنت، کھیت نمبر، ان کا رقبہ، اناج کا وزن جو انھوں نے بویا تھا، پانی کی مقدار جو انھوں نے دیا تھا۔ غلہ جو کاٹا تھا۔ دیواریں جو بنا دہائیں جو کھودیں، گلائیں اور اس سے انسانی ضروریات کی چیزیں بنائی تھیں، چمڑا جو انھوں نے دباغت سے تیار کپڑا جو انھوں نے بنا تھا غرضکہ تمام کام جو انھوں نے کئے تھے صحیح و سالم درج تھے اور اس کی پشت پر مزدوری جو پائی تھی اور رقم جو انھوں نے نیکیاں کرنے میں صرف کی تھی بہ تفصیل درج تھی اس کے علاوہ ان کے دوسرے اعمال تھے مثلاً والدین سے محبت، خیرات، نیکیاں، سچائیاں، ایمانداریاں، گناہ، جھوٹی قسمیں، شراب و کباب سے اشتغال، بُرا اور بد ذاتیاں وغیرہ پہلا معائنہ سطحی باتوں کے متعلق تھا۔ ہر ایک نے کہاں تک نیکیاں کیں ہیں، کسقدر مدد پہنچائی ہے، سو کے لئے کیا خدمات انجام دیں ہیں اور اس کے جواب میں سوسائٹی نے اس کے لئے کیا کیا ہے وغیرہ ایسے سوال اور سزا و جزا سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی کو اس وقت تک سرٹیفکٹ عطا نہیں ہوتا جبتک کہ وہ قابلِ اطمینان اور تشفی بخ نہ دے۔ اس وقت ذلیل مزدور جو دنیا میں حقارت آمیز نظروں سے دیکھے جاتے تھے زیادہ بھلائیوں کے مالک نظر آ تھے ان کے معاملات اس قدر صاف اور اعمال ایسے اچھے اور مکر و فریب سے پاک تھے کہ ان کا معائنہ جلدی ختم اور معہ سامان کے ہائی کورٹ میں جانیکی اجازت مل جاتی۔ تمام تھرڈ کلاس مسافروں میں سے صرف چند ایسے نکلے جن صندوق خالی تھے وجہ یہ تھی کہ انھوں نے دنیا میں کوئی مفید کام جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہونچا نہیں کیا تھا بلکہ اس برخلاف چوری اور خیرات پر بسر اوقات کی تھی ایسے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ ایک کونے میں کھڑے ہو جائیں تاوقتیکہ کا مسافروں کا معائنہ ختم نہ ہو جائے

دوسری بار پکار سیلون کے مسافروں کی ہوئی۔ ان میں زیادہ تعداد فیشن کے دلدادہ مذہب سے بیگانوں کی جو اگرچہ نہایت نفیس پوشاکوں میں ملبوس تھے لیکن دکھلانے کو پاس کچھ نہ رکھتے تھے اس لئے کئی کئی آدمی ایک ساتھ طلب کئے گئے اور دریافت کیا گیا کہ کون کون اعمال ساتھ لائے ہیں۔ ایک وجیہ صورت کا انسان جو اپنے کپڑوں اور رعب چہرے سے کہیں کا نواب معلوم ہوتا تھا آگے بڑھکر اپنے ساتھیوں کی طرف سے بولا "یہ تمام معاملات ہمارے لئے راز ہیں

چوری کے کوئی ممبر اسپر روشنی ڈالنا پسند کرینگے .... " وہ اور اس کے تمام ساتھی دولتمند گھرانوں میں پیدا ہوئے
زرے کھیلے اور اسی فضا میں پلے جوان ہوئے دولت نے ان کی معاونت کی اور انھوں نے اس کی رفاقت جو بھی
بادہ کیا کسی نے ان کو نہ ٹوکا کہ ان کو دل و دماغ سے بھی کام لینا ہے خواہ جسمانی کام ہو یا روحانی۔ سچ تو یہ ہے کہ محنت
یوں ہی کے لئے زیبا تھی کیونکہ وہ اس کے بغیر ایمانداری سے گذر اوقات بھی نہ کر سکتے تھے انھوں نے اپنا وقت عیش و نشاط،
غ البالی، بے فکری اور ناچ، گانے میں صرف کیا، جو کچھ خریدا معقول قیمت دی (اگر روپیہ نہ ہوا جاگیر مہاجن کے نام لکھکر دی)
غیری چیز پر کبھی نظر بد نہ ڈالی (سوائے صنف نازک کے) اور نہ کبھی زبردستی حاصل کی۔ جس کسی نے ان کے لئے محنت کی اسکا
ہی معاوضہ دیا۔ ان باتوں کا اقرار جیسا میں خود کرتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ دوسرے بھی میرے ہم آواز ہونگے۔

" شریف اور معزز لوگو" معائنہ کنندہ نے کہا " ہمنے ہر مرتبہ یہی تقریر سنی ہے اور جتنی مرتبہ اس کا اعادہ ہوتا ہے اتنا ہی
ب بڑھتا ہے تم اس کے مقر ہو کہ دنیا میں تھے اور اس کے بھی کہ زندگی کا مدار کام پر ہے اگر لوگ کام نہ کریں تو بھوکوں مر جائیں
ب ہے کسان جو اپنی محنت سے غلہ تیار کرتا ہے خود کھانے کا مستحق ہے یا تمھیں دینے کا تمھارے ہی الفاظوں وہ اپنی محنت سے
ستفید ہونیکا مستحق ہے اور تمنے جو محنت نہیں کی تو اس کی یہ سزا ہے کہ تم بھوکوں مرجاؤ۔ دنیا میں زندگی برقرار رکھنے کے لئے
ف تین طریقے ہیں اول محنت دوئم چوری سوئم بھیک۔ تمنے ان میں سے اول الذکر صورت ذریعہ معاش نہیں بنائی۔ یقیناً آخرالذکر
طریقوں کو استعمال کیا ہوگا اور اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ تم اپنے آپ کو خواہ کتنے ہی عالی مقدرت سمجھتے ہو یہاں سے
ں وقت تک گذر نہیں سکتے جبتک خود ساختہ چیزیں دکھلا نہ سکو۔ تم کو حق المحنت کافی سے زیادہ دیا گیا جس کے تم
رہو۔ اب بتلاؤ تم کیا دکھلانے کے لئے لائے ہو۔

"حق المحنت" اس نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا " ہم مزدور پیشہ نہ تھے ہمنے کبھی مزدوری نہیں پائی جو کچھ خرچ کیا
ہمارا اپنا تھا جو کچھ ہمکو ملا وہ صرف اس قدر تھا کہ برائیوں سے بچتے رہیں وہ ہمنے کیا۔ ہمنے کوئی برائیاں نہیں کیں
م ہائی کورٹ میں اپیل کرینگے

لیکن اپیل ان لوگوں کے لئے قطعی غیر ممکن تھی جن کے صندوق بالکل خالی تھے خواہ وہ کوئی ہوں اور ظاہری اعمال
تنے ہی اچھے کیوں نہ رکھتے ہوں ان کو ہمیشہ یہی جواب ملیگا " تم جبتک اپنے کو بہتر صورت میں پیش نہ کروگے اجازت غیر ممکن ہے"
تمام لوگ چوروں کی صفوں میں فوراً شامل کر دئے گئے۔ نواب بیگم نے یہ حکم سنکر تعظیم سے آگے بڑھتے ہوئے کہا " یا قاضی القضات

میں گنہگار ہوں اپنے اعمالوں پر شرمندہ ہوں، معافی کی خواستگار ہوں میں نے دنیا میں جو برے کام کئے وہ صرف اس
سوسائٹی اس سے خوش ہو سال کے مختلف موسموں میں اعلیٰ پارٹیاں اس لئے دیں کہ وقار قائم رہے ناچ گھروں میں ا
ناچی کہ لوگ محظوظ ہوں۔ پبلک پلیٹ فارم اور کلبوں میں اس لئے گائی کہ عوام و خواص تعریف کریں مختصر یہ ہے کہ
میں اس لئے گرفتار ہوئی تھی کہ دنیا کی مری طرف توجہ زیادہ ہو اور لوگ میری تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوا
حضور جو کچھ ہوا گذشتہ را صلوٰۃ اب اپنے اعمالوں پر نادم ہوں اور معافی کی خواستگار ہوں" لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی ا
کے تمام مسافروں کو یکدم چلے جانیکا حکم دیدیا گیا۔ وزیر، اسقف، وکیل، صراف، اور اسی قسم کے دوسرے لوگ جنکے ا
میں اگرچہ مادی کاموں کی فہرست کم تھی پھر بھی اُنھوں نے اپنا رزق محنت سے کمایا تھا اور خدمات متعلقہ مستعدی
دی تھیں اس لئے ان کو اعلیٰ ججوں کے معائنہ کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

اب ہماری باری آئی یعنی سیکنڈ اور انٹر کلاس مسافروں کی۔ ہم میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ہمیشہ اپنے کامو
مشغول رہے تھے اور وقت کو کسی نہ کسی کام میں صرف کیا تھا۔ موجد اپنی ایجادوں کے ساتھ تھے۔ وکیل اپنے وکالت ناموا
ڈاکٹر اور پادری اپنی جسم اور روحوں کے جو انھوں نے بچائی تھیں یا ملک الموت کے حوالہ کی تھیں۔ مصنف اپنی تصانیف
مصوّر اور بُت تراش اپنی تصاویروں اور بتوں کے ساتھ تھے غرضکہ جو کچھ ہمنے کیا تھا وہ ہمارے ساتھ تھا اس کے ع
مزدوریاں جو ہمنے پائی تھیں وہ بھی درج تھیں اور خدمات جو ہمنے کی تھیں وہ بھی لکھی ہوئی تھیں جس وقت یہ تمام چیزیں
نکال کر رکھی گئیں ایک ڈھیر لگ گیا اور مجھے پیرس کی اس عالمگیر نمایش کا دھوکہ ہونے لگا جہاں نواب آصف خاں کے
کسی زمانہ میں جانیکا اتفاق ہوا تھا۔ جس وقت سیکنڈ کلاس کے تمام مسافر معائنہ کے لئے قطار در قطار کھڑے ہوئے معائنہ ک
نے فوراً چند کو چُنکر چوروں کی صف میں شامل کردیا۔ ان میں زیادہ فیشن ایبل جنٹلمین اور لیڈیاں حسین طلبا اور آوارہ ا
تھیں جنھوں نے دنیا میں سوائے چوری و بدکاری کے اور کچھ کام نہ کیا تھا اور جن کے تمام جسم، ہاتھوں اور انگلیوں پر سلا
کے نشان نمایاں تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو دوسروں کو نصیحت کرتے لیکن خود اس پر کاربند نہ ہوتے تھے، ایسے خو
تقریر تھے جو اپنی سخن پروری کی رو میں وہ باتیں بیان کر جاتے جن کو وہ خود برا سمجھتے تھے ایسے فلاسفر تھے جنھوں نے ع
لاینحل پیش کئے تھے لیکن خود اُن سے ناآشنا تھے، وہ مشہور و معروف وکیل تھے جنھوں نے قانون کو شکست دیکر شکم
کی تھی، ایسے مصنف تھے جنھوں نے اپنی تصانیف سے ناظرین کو گمراہ کیا تھا، عیش و نشاط مہیا کرنے والے تاجر تھے جنھو

تندرستی اور قوت کو برباد کیا تھا وہ اطبا تھے جو ڈاکٹری کے اس پیشہ کا دم بھرتے تھے جس کے متعلق انکو بہت تھوڑا یا بالکل علم نہ تھا یہی
وہ لوگ تھے جن کے صندوق خالی تھے اور جن کے اعمال نامے انہیں کے خلاف گواہی میں پیش کئے گئے تھے۔ یہ سب گمراہ اور
تباہ حالت لوگوں میں دھکیل دیئے گئے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کے اعمال نامے کچھ اچھے نظر آرہے تھے لیکن۔ حرام مزدوری
نے سب پہ سیاہی پھیر دی تھی، ایماندار بنکر بے ایمانیاں کی گئی تھیں جواب ان کے سامنے تھیں۔ اسی صف میں میں بھی کھڑا تھا اور یہ خیال
کرکے خون کے آنسو بہا رہا تھا کہ حیف دنیا کچھ نہیں۔ وہ مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے۔ ہمنے دنیا میں جاکر کیا کیا!
کچھ نہیں۔ جیسے گئے تھے اس سے بھی بدتر آئے، سدا اس کے غلام رہے جس رُخ نے چلی۔ چلے۔ صرف شکم خوری کی خاطر دودھ میں
پانی اور شکر میں چاول ملائے۔ بڑھئی اور معماروں نے پوری مزدوری کے باوجود بھی ایمانداری نہ برتی، مصنفوں نے تصنیفوں
اور تالیفوں میں بغض و عداوت اور تنگ خیالی اس لئے بھری کہ ناظرین و ناظرات اس کے متعلق اچھی رائے قائم کریں۔ کسانوں
اور دوکانداروں نے اس لئے فریب کئے کہ تھوڑی پیداوار میں زیادہ پیدا کر سکیں۔ جھوٹ اس لئے بولے اور برائیاں اسلئے
اختیار کیں کہ پبلک اُن سے خوش ہو اور اُن کی تعریف کرے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو سستہ سامان خرید کر مہنگا بیچتے کم ناپتے
اور کم تولتے تھے۔ سوتی مال اون کے دھوکے فروخت کرتے اور ریٹو ریشم کے بدلے چلاتے وہ دوکاندار بھی تھے جو چھال اور
گھاس کے مکھن بناکر پنیر کے نام سے فروخت کرتے اور لکڑی پیسکر گندم کے آٹے کے نام سے پیش کرتے۔ ایسے تمام لوگ فوراً
اپنے پرانے ساتھیوں (چوروں) میں بھیج دیئے گئے۔ جن کے اعمال اچھے نکلے ان کو فوراً سرٹیفکٹ عطا کردیا گیا جب میرا صندوق
کھولا گیا میں نے دیکھا کہ اگرچہ مزدوری مختصر تھی لیکن کام اس سے بھی مختصر لیکن جلدی یہ معلوم کرکے خوش ہوگیا کہ میں بھی ان لوگوں
میں ہوں جن کو گذرنے کی اجازت عطا کی گئی ہے

اسی وقت سیٹی کی آواز سنائی دی گئی اور گاڑی بھک بھک کرتی پلیٹ فارم پر آگئی۔ ان لوگوں سے جو علیحدہ کردیئے
گئے تھے کہا گیا، جہاں وہ جارہے تھے وہاں جا سکتے ہیں گاڑی نصف گھنٹے کے اندر ہی روانہ ہونیوالی ہے، یہ خوشخبری سنکر مجمع
بہت محظوظ ہوا اور جانے کی جلدی جلدی تیاری کرنے لگا لیکن پاسپورٹ دینے سے پیشتر ہئیت کا سوال درپیش ہوا جو بہت
جلد طے پا گیا اور آئندہ کے لئے ان کی ہئیتوں میں تبدیلی کا انتظام کردیا گیا۔ اُن سے دریافت ہوا کہ وہ اس بری حالت میں
کیوں تھے میں نے حسب لیاقت جواب دئے جو بہت کچھ ایک دوسرے سے ملتے تھے یعنی واقعات زمانہ ان کے خلاف تھے
اور اس لئے وہ مجبور تھے ان کی بری طرح پرورش کی گئی اور ایسی جگہ رکھے گئے جہاں ترقی مفقود تھی امرا نے جواب دیا کہ ان کو

ی نے نہ تبلایا کہ آخرت کے لئے کچھ نیکیاں بھی کرنی ہیں ایسی صورت میں یہ قطعی غیر ممکن تھا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کام کرتے
لردہ غریب پیدا کئے جاتے۔ سب باتیں ٹھیک طور پر واقع ہوئیں۔ دھوکے باز تاجروں نے بیان کیا کہ رفتار زمانہ نے ان کو
بور کیا کہ ہر ممکن سعی سے دولت پیدا کریں اور اپنی حالت اچھی بنائیں۔ یہ گاہک کا کام تھا کہ مال کو پرکھے اور معمول سے
یادہ قیمت نہ دے تاجر تو اسی لئے دوکان کھولتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ قیمت پر اپنی مصنوعات اور اشیاء فروخت
ے۔ اسی طریقہ سے ہر ایک نے اپنی اپنی رام کہانی سنائی اور زمانہ پر بہتان باندھے۔ چوروں، لٹیروں اور ڈاکوؤں نے
ان کیا کہ ان کو دنیا میں بغیر پوچھے پیدا کیا گیا۔ وہ اس کی خواہش بھی نہ رکھتے تھے اور جب پیدا ہو گئے تو زندگی برقرار رکھنا
ی ضرور ہوا اسلئے جو کچھ نظر پڑا قدرت کا عطیہ سمجھا گیا قواعد اور قوانین کی جو انھیں جیسے چند ناقص العقل لوگوں کی دماغ کے نتائج تھے
وکیوں پیروی کرتے۔ اس کے علاوہ سوسائٹی نے ان کے لئے ایمانداری سے گذارہ کرنے کے ذرائع بھی مہیا نہیں کئے تھے
س لئے وہ مجبور تھے ـــــــ سوسائٹی نے ان کے لئے کیا کیا جو وہ سوسائٹی کے لئے کچھ کرتے

اسی طریقے پر ہر ایک نے جو علیحدہ کر دئے گئے تھے اپنے اپنے بچانے کی ترکیبیں کیں لیکن سب بے سود۔ اب وہ خموش
تھے اور چپکے چپکے آہ و زاری کر رہے تھے اور اپنے کئے پر نادم تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے اور آنکھوں سے اشک
جاری تھے۔ یہ صورت یکایک تبدیل ہوگئی۔ سُرخی۔ چہروں پر دوبارہ دوڑ گئی اور بحالی خط و خال سے وہ ایکمرتبہ پھر اس
علان کو سننے لگے "تم لوگوں کو اس مرتبہ پھر اس بات کا موقع دیا جاتا ہے کہ دنیا میں جا کر نئے حالات کے ماتحت از سر نو
ندگی شروع کرو۔" سب نے دوبارہ خوشی کا اظہار کیا اور درخواست کی کہ ان کی حلیتوں میں ایسی تبدیلی کر دی جائے جس سے
بلد از جلد تمام برائیاں ان کے خمیر سے نکل جائیں۔ جہاں تک میں غور کرتا تھا خمیر سے مراد غالباً "ذاتی خرابیاں" تھیں جن کا
ور کرنا انسان کا اپنا کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ چال چلن میں نصف کے قریب خرابیاں اور برائیاں لوگ اپنے ساتھ دنیا میں
لیکر آئے ہیں اور پیدائشی ہمت، ایمانداری قابلیت اسی قدر قدرت اور واقعات زمانہ پر موقوف ہوتی ہے جسقدر کہ خود
سمت پر ایسی صورتوں میں صرف تبدیلی ہی ان کو ان کے نقائص سے پاک کر سکتی ہے ان کی دوسری درخواست یہ تھی
ہ ان کی حیثیتوں میں بھی تبدیلی کر دی جائے۔ یہ خواہش بھی بہت جلد پوری کی گئی۔ بیگم فقیر کے جھونپڑے میں بھیجی گئیں اور حکم
ہوا کہ گاؤں کے مقامی اسکول میں تعلیم پائیں اور جوان ہو کر خادمہ کی خدمات انجام دیں یا گنواروں کی بہو بیٹیاں بنکر
ندگی بسر کریں، خوبصورت جوان کسانوں میں تبدیل کئے گئے، مصنف اور مقرر لوہار اور بڑھئی بنا کر مشینوں پر کام کرنیکے

لے بھیجے گئے، ایک فلسفی جو صحت و دولت سے مالامال تھا اور جس نے یہ خواہش کی تھی کہ دنیا اس کے لئے ایسی ہی عمدہ بنائی جائے جسقدر ممکن ہو سکتی ہے اندھا اور مفلوج پیدا کیا گیا غرضکہ اس طریقہ سے ان لوگوں کو از سرِ نو زندگی نئے حالات کے ماتحت گذارنے کا موقع دیا گیا۔ چور اور ردھوکے باز جن کو یہ شکایت تھی کہ تمام غلطیاں اور گناہ صرف غربت سے پیدا ہوتے ہیں محلاتِ شاہی میں بھیجے گئے۔ ان انتظامات کے بعد وہ سب گاڑی میں بٹھا دئے گئے انجن نے سیٹی دی اور ان سب کو لیکر غائب ہو گیا

"کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر یہیں ہونگے" اسٹیشن ماسٹر نے کہا "اور یہی قصہ درپیش ہوگا۔ یہی لوگ بیسوں مرتبہ میرے ہاتھوں سے گذر چکے ہیں ہر مرتبہ ان کو نئی صورت میں رکھا جاتا ہے پھر بھی جب آتے ہیں اسے ساتھ دکھلانے کے لئے کچھ نہیں لاتے ....
... کچھ نہیں سوائے زمانہ کی شکایت کے"۔

"یہ کب تک جاری رہیگا" میں نے دریافت کیا

"میں نہیں کہہ سکتا" اُس نے نہایت متانت سے جواب دیا "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہاں سے اُس وقت تک گذر نہیں سکتا جب تک وہ یہ ثابت نہ کر دے کہ اس نے بنی نوع انسان کی اچھی طرح خدمت کی

گاڑی بمشکل نظر سے دور ہوئی ہوگی کہ گھنٹی کی آواز پھر سُنائی دی تھیٹر کی طرح سین بدلا، پردہ ہٹا اور ہمارے سامنے چار سنجیدہ ممتحن جنکی شکل و صورت کالج کے ممبران بورڈ "آف اگزامینرز" سے مشابہ تھی نظر آئے۔ ہم میں سے ہر ایک کی طلبی ہوئی اور اعمال جس کی پہلے دیکھ بھال ہوئی تھی اب معائنہ کئے جانے لگے اور عطا کردہ عقل و فراست سے مقابلہ ہونے لگا جس سے یہ مطلب تھا کہ انسان نے اپنی انتہائی کوشش سے کہانتک اچھائیاں کی ہیں اور کہانتک برائیوں سے اجتناب کیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ نیکیاں اور برائیاں اس کو بتلائی جائیں کہ کب اور کیونکر اس سے عمل میں آئیں یا سرزد ہوئیں۔ میزان کے ایک پلڑے میں برائیاں، گناہ، خود غرضیاں اور خوش گپیاں تھیں اور دوسرے میں انسانی فرائض کی رحم و کرم، خیرات، حج، زکوٰۃ، روزہ، نماز وغیرہ جن میں بعض ایسی بھی تھیں کہ خود عامل کے ذہن میں نہ تھیں کہ کب اور کس خیال کے ماتحت عمل میں آئیں اسی لئے اس وقت بے سود تھیں ہم میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے اعمال بغور دیکھے اور افسوس وہ تمام نیکیاں جن کو ہم فتح کے سامان سمجھتے تھے بدیاں نکلیں اور اس قدر صاف اور روشن کہ ہم اس سے منکر بھی نہ ہو سکتے تھے۔ ان میں زیادہ تر خود غرضیاں، عیش پرستیاں اور کاہلیاں تھیں، باقی میں کچھ کمینہ حرکات، کچھ انعام کی خواہشات، کچھ دولت، عزت، ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول کی تمنائیں، کچھ بیوقوفیاں وغیرہ۔ یہ دیکھکر ایک شریف صورت نیک مزاج شخص نے جسکے اعمال بہ نسبت دوسروں کے

میزان میں اچھا اترے سے سر جھکا کر دست بستہ آگے بڑھتے ہوئے کہا اعمال کا تعلق جہانتک انسان سے ہے اس نے
ان تمام خدمات کو جو اس کے سپرد کی گئی تھیں بجالانے کی کوشش کی پھر بھی مختصر عمر میں ان کو اختتام تک نہ پہونچا سکا۔
اس نے برائیاں ترک کردیں اور بڑی بڑی گمراہیوں پر بھی غالب آگیا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور وہ دنیا کے ترقی یا
میں (جس کو دین سے نا آشنا اسی نام سے موسوم کرتے ہیں) قدم اٹھاتا گیا اس کا ایمان اس سے رخصت اور اس کا علم او
نیک اعمال سے زیادہ ترقی کرتا گیا۔ ہردن برائیاں اس کو اپنی بندشوں میں جکڑتی گئیں اور وہ اسی قدر آلام و مصا
گرفتار ہوتا گیا۔ اس کو بچپن ہی سے یہ سبق دیا گیا تھا اور اس کا عقیدہ بھی تھا کہ مذہب نے اس کے واسطے دیکھ بھالش کہ
اور اگر وہ اپنے حقوق سے دست بردار ہوجائیگا دو عالم کی رحمتیں اسپر نازل ہونگی۔ یہ عقیدہ اس نے مضبوطی سے اپنی گر
لیا اور اس پر کاربند ہوا لیکن افسوس پھر بھی اس کی محنتیں کارگر نہ ہوئیں اور وہ درجہ اس کو حاصل نہ ہوا جس کا بروز آخر
تھا میں نے جو کام کئے اچھے تھے یا برے لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دوسروں کی قوت سے باہر تھا
ممتحن نے اس پر ترحمانہ نظریں ڈالیں اور جواب دیا" ہم ناممکنات کے خواستگار نہیں ہیں اور نکو وہ کام کرنے پر الزام
دیتے جو تمہاری قوت سے باہر تھے۔ مکمل کاموں کی تشریح صرف انہیں سے درکار ہوتی ہے جو یہاں سے مکمل بھیجے جاتے
انسان جاہل اور لاچار پیدا کیا جاتا ہے۔ دماغ میں امتیاز و انتخاب کا مادہ قدرت کی طرف سے پہلے ہی سے ودیعہ
ہوتا ہے وہ دنیا میں جسوقت پہونچتا ہے دو راہیں اس کے سامنے ہوتی ہیں ایک اچھی اور دوسری بری اور اب یہ اس کا
ہوتی ہے کہ جو راہ چاہے پسند کرے جی چاہے دنیا کمائے یا آخرت کی فکر کرے۔ انسان ہر کام کی ابتدا غلطیوں سے کرتا
تم نے بھی گر گر چلنا سیکھا تھا اور تلخ تجربات سے زندگی شروع کی تھی بچپن کے تجربات جوانی میں کام آتے ہیں اور جو دنیا قدم
دنیا میں اٹھاتا ہے زیادہ مستعد، مستحکم اور ہوشیار ہوتا ہے ہم اس زمانہ کی غلطیوں کو نہیں لکھتے اور جوانی کی غفلتوں کو
ان گناہوں میں شریک نہیں کرتے جو کبیرہ یا صغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں یا انسانی فرائض کی انجام دہی کے دوران میں سر
ہوتی ہیں یا اس وقت عمل میں آتی ہیں جب انسان کسی نیک ارادہ سے کام شروع کرتا ہے اور وہ غلطی ناتجربہ کاری سے گناہ کی
ہو جاتا ہے سو خدائی کارخانے خدا ہی جانے۔ لیکن جب ہم دنیا میں انسان کی مختلف شبیہوں کے ساتھ ان کے دل و دماغ پر
نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں کچھ اوسط درجہ کے، کچھ نیم جاہل اور کچھ محض جاہل پس ہم ویسے ہی
جواب کی امیدیں رکھتے ہیں اور اگر وہ میزان میں اس سے کم اترتے ہیں سزا کے مستحق ٹھہرائے جاتے ہیں۔ تمہارا نظریہ کہ قدرت

ہر شخص میں وہ قوت و دیعت نہیں کرتی جس سے وہ اعمال کو مکمل صورت میں پیش کر سکے' ایک حد تک صحیح ہے اگر انسان اپنی حتمی کوششوں کے باوجود ناکامیاب رہتا ہے تو یہ اس کا قصور نہیں ہے بلکہ وہ قدرت کی مرضی ہے جس کے خلاف کرنے سے انسان لاچار ہے' غلطیاں' گناہ' اور جرائم دراصل وہی ہیں جو خود غرضی' سستی' بے ایمانی' بدذاتی اور بدمعاشی سے پیدا ہوں۔ نیکیاں کرنیکی قدرت رکھتا ہو لیکن اس سے برگشتہ ہو''

میں یہ دیکھکر خوش ہو رہا تھا کہ اسقف اعظم ممتحن کی تقریر سے بہت خوش تھے کیونکہ اس سے پیشتر جب وہ فرشتہ خصلت انسان سے اچھے اعمال کی بابت گفتگو کر رہا تھا اگر ممتحن دخل نہ دیتا تو یقیناً غریب ہار جاتا۔ اسقف جس عہدے پر فائز تھا اس سے مطلق اس کو دلچسپی نہ تھی اس کے اعمال جو بظاہر بہت معلوم ہو رہے تھے بالکل مختصر تھے اور اگر شروع زندگی کے واقعات ۔ مثلاً ایام طالب علمی میں اس کا کئی کئی پہر بھوکا رہنا کہ اس کی بیوہ ماں زیادہ تکلیف سے بچی رہے۔ اس وقت اس کے مددگار نہ بنتے تو وہ دنیا میں ایک غریب محرر کی زندگی بسر کرنیکے لئے پھر بھیجدیا جاتا ۔

اپنی نسبت کئی سوال تھے اور میں انھیں میں گم سوچ رہا تھا کہ آیا دریافت کروں یا نہ کروں۔ سب سے بڑا سوال' قدرتی دماغ تھا جس کی بابت میں ممتحن سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس سے اس کی کیا مراد ہے۔ آیا قدرت کی طرف سے ہر شخص ایسا دل و دماغ لیکر آتا ہے کہ جو اس کا جی چاہے بن سکے مثلاً ایک کامیاب درویش' اعلیٰ درجہ کا مصور یا ماہر موسیقی وغیرہ اور کیا ہر شخص قدرتی قوت کے دائرہ تک ہی ترقی کر سکتا ہے ۔ اس صورت میں سستی' بد ایمانی' خود غرضی وغیرہ کیا ہیں اور ان کے باعث لوگ کیوں مجرم قرار دیئے جاتے ہیں ۔ اگر ذرا دیر کے لئے ....''

اسی لمحہ گھنٹی کی آواز سنائی دی' میرا نام پکارا گیا۔ میں نے ایک سرسری نظر کپڑوں پر ڈالی اور دست بستہ آگے بڑھ گیا۔ رعب عدالت اور کچھ نامعلوم کشش سے آنکھیں اوپر نہ اٹھتی تھیں لیکن میرے کل اعمال میرے سامنے تھے اور اس قدر واضح کہ شک و شبہ کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہاں خلاف امید اس کا ذکر نہ تھا کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں اعمالنامہ آسانی کے لئے آگے بڑھا دیا گیا اور سوالات درپیش ہو گئے۔ اعمال لکھنے والوں نے اس قدر صفائی برتی تھی کہ غلطی کا احتمال نہ تھا۔ جو کچھ تحریر تھا میں اُس کا مقر تھا۔ اچھے اور برے دونوں اعمال تھے لیکن آخر الذکر کا پلڑا زیادہ بھاری تھا جو کچھ اچھائیاں تھیں وہ ذاتی اغراض اور خود غرضیوں سے جدا نہ تھیں۔ عملی صورت میں کوئی کام ایسا مکمل نہ تھا جو پیش کیا جاتا اور رہائی کی اُمید ہوتی البتہ چند تراجم' چند بزرگوں کی سوانح عمریاں اور کچھ اصلاحی مضامین تھے

جو میرے سامنے معائنہ کے لئے پھیلائے گئے کوئی رقیق شئے صفحوں پر پھری ہوئی تھی جس نے تمام سطروں کو چھپا لیا۔
خرابیاں اچھائیوں سے زیادہ تھیں۔ پورے پورے باب غائب تھے اور صفحات کے صفحات کورے گویا کسی مطبع نے
ان کو چھاپنے کی تکلیف ہی گوارا نہیں کی تھی۔ تحریروں کے کچھ اجزا یہاں اور وہاں بڑے فاصلہ کے بعد نظر آجاتے
تھے اور میں انہیں کو غنیمت جانکر ممتحن کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیتا گویا یہ اشارہ تھا کہ دیکھ لو یہ موجود ہیں اور
ان تحریروں کا نام و نشان تک نہ تھا جن پر میں اسقدر مغرور تھا اور جو میں نے کالج کے بیش قیمت لمحات میں محنت شاقہ
بعد لکھے تھے۔ جو کچھ باقی تھا وہ میری اس محنت کا نتیجہ تھا جس کے متعلق کبھی کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے کی امید بھی نہ تھی
جس کو میں ایک حد تک بھول بھی چکا تھا یا وہ خاص خاص جملے تھے جن کو انہیں اوروں نے بڑے لعن وطعن سے شائع
اور ان پر معاندانہ تنقیدیں لکھی تھیں۔ اس وقت یہی باتیں میرے موافق نظر آرہی تھیں کیونکہ میں نے حقیقتاً وہ باتیں لکھی تھیں
جن کو میں خود اچھی طرح سمجھتا تھا یا جن پر مجھے خود اعتماد نہ تھا۔ جاہلیت، سستی، بے جا طرفداری، حقیقت سے انکار، ضمیر کے
خلاف کارروائی اور رخنہ اندازی گنہگار بنانے والی چیزیں تھیں جن کا میں معترف تھا اور عامل۔ اگر میں کچھ عرصہ
اسی شاہراہ پر اور چلتا میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ کس انعام کا مستحق ہوتا شکر ہے کہ قدرت نے مجھے غار میں گرنے سے
بچا لیا۔ جب مزدوری کا سوال پیش ہوا میں خیال کرنے لگا کہ وزنی پلڑا میرے حصہ میں آئیگا اس لئے کہ معقول رقوم
کے چک وصول کئے تھے لیکن معائنہ برخلاف نکلا ــــ صدائے برنخاست۔ فضل ہوا کہ یہاں سے بھی صحیح سلامت
نکل گیا

یکایک عدالت کی دیواریں ایک موج نور سے جگمگا اٹھیں اور خالق کا جلوہ جو بے شک تمام موجودات عالم کا
پیدا کرنے والا ہے نظر آنے لگا اس روشنی میں وہ تمام چیزیں جو گذشتہ دور میں دیکھی تھیں نظروں کے سامنے سے
گذرنے لگیں۔ ان میں گائے، بیل، بھیڑ، بکری، کوا، طوطا، مینا، بلبل، شیر، چیتا، ہرن، اور تمام دوسرے قسم کے چرند
پرند اور درند تھے جو سامنے سے گذرے اور ٹھہر گئے۔ ان میں سے پرند سب سے پہلے آگے بڑھے اور میں یہ دیکھ کر کانپ گیا کہ
ان میں بیشتر وہ ہیں جو بچپن میں میری غلیل اور جوانی میں بندوق کا نشانہ بنے تھے اور اب یہاں اس لئے آئے ہیں کہ میرے
خلاف گواہی دیں۔ اُس وقت میری عجیب حالت تھی۔ آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، بدن میں رعشہ اور جوڑ جوڑ میں درد تھا
گرمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن دم بخود تھا اور ہر لحظہ حکم کا منتظر اور حقیقت بھی یہ ہے کہ میں نے اکیلی اپنی جان کی

ہزاروں کی جانیں لی تھیں اب وہ دہائی دے دیکر فریاد کر رہی تھیں اور پائے عرش کو جنبش دینے کی فکر میں مشغول
کی انصاف! انصاف کی صدا سے تمام فضا گونج رہی تھی۔ میں اشک بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور تعجب
ہا تھا کہ کیا ان سب نے میرے ہی شکم میں جگہ لی تھی۔ ان کے بعد درندوں اور چرندوں کی باری آئی وہ بھی
طرح آئے گواہی دی اور ماتم کرتے رخصت ہو گئے۔ میں اب بھی اپنی جگہ پر خاموش کھڑا تھا اور امید و بیم
ظروں سے پائے عرش کو دیکھ رہا تھا لیکن ایک خیال تھا جو دل و دماغ کو تقویت دے رہا تھا اور وہ پیارے
ب کی سفارش تھی۔ میں اس سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہا تھا اور معلوم نہیں کب تک ہوتا اگر اس ہرن پر
ڑ جاتی جو پائے مبارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ چند قدم چلکر رکا، اشک بہائے اور گلوگیر آواز میں کہنے لگا: "سرکار
ں وقار! کیا ہماری جانیں اس پیٹو پر اس لئے خرچ کی گئیں کہ چند چھپے ہوئے کاغذ پیش کر سکے۔ کیا ہماری زندگیاں
رے لئے قیمتی نہ تھیں اور کیا جنگل، چراگاہ، ہوا اور پانی ہمارے آسائش و آرام کے لئے پیدا نہ کئے گئے تھے اور
ے پوری طرح مستفید ہونے کا موقع نہ دیا گیا تھا۔ ہم قدرت کی طرف سے آزاد پیدا کئے گئے تھے۔ ہم سورج کی
نی میں کھیلتے اور چکور کی طرح ماہتاب کی روشنی سے لطف اندوز ہوتے۔ قدرت کی نیرنگیوں سے فیض اٹھاتے
اپنے کو اس قدر خاکسار سمجھتے تھے کہ انسان کو تکلیف دینے کا خیال تک نہ لاتے۔ اگر یہ شخص جو سامنے کھڑا ہے
بات کا اقرار کرے کہ دنیا میں اس کی جان ہماری برادری کی لاکھوں جانوں کے برابر تھی میں خاموش ہو جاؤنگا
ن اسقدر ضرور کہنے کی جرأت کرونگا کہ انسان میں اشرف مخلوقات بننے کی قابلیت بالکل نہیں ہے اور جہانتک میں
ں کا مطالعہ کر سکا ہوں میرا عقیدہ ہے کہ انسان مکار چالاک اور ایک مدت تک زندہ رہ کر چرند و پرند پر ہاتھ
ف کرنے والی ہستی کا نام ہے اس کی مخصوص خوشی قتل ہے وہ یہ کام صرف اسی وقت نہیں کرتا جبکہ بھوکا ہوتا ہے
تفریح کے لئے بھی کرتا ہے۔"

گائیں ڈکار رہی تھیں۔ کتے بھونک رہے تھے، شیر گونج رہے تھے، چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں، مچھلیاں
پ تڑپ کر دُمیں ہلا رہی تھیں اور میں گونگا حقیر و ذلیل بنا ان سب کو دیکھ رہا تھا، اس کا ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ
۔ اگر میں انصاف کی کرسی پر ہوتا تو ——————— فیصلہ سنایا جانے ہی والا تھا کہ
نظر دھندلا نظر آنے لگا، تیز رفتار، کھٹ کھٹ پر ہتھ ا ہو گیا، جلنے لوٹنے اور بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں جاگ اٹھا۔ میں دوبارہ گاڑی پر تھا۔ گاڑی ٹھہری، دروازہ کھلا اور قلی اندر داخل ہو کر اسباب اتارنے لگے ہم سب پلیٹ فارم پر اترے، وہی پرانا منظر تھا وہی علی گڑھ کا اسٹیشن۔ معزز اشخاص اور مقامی امراء۔ نواب اور نواب بیگم کو خوش آمدید کہتے آگے بڑھ رہے تھے۔ اسٹیشن ماسٹر ادب سے ٹوپی اتار کر مصافحہ کر رہا تھا۔ وزیر کا پرائیوٹ سکریٹری سرخ صندوق، لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ نواب نے روانہ ہونے سے پیشتر ایک ہم سفر سیٹھ سے جن کو علم نجوم میں کچھ دخل تھا مصافحہ کرتے ہوئے کہا آج غریب خانہ پر ماحضر تناول فرما کر مشکور فرمائیں اور ساتھ ہی میرے خواب کی تعبیر بتلائیں"۔ سیٹھ صاحب نے معافی مانگتے ہوئے جواب دیا" نواب صاحب مجھے سخت افسوس ہے کہ جناب کی دعوت فی الوقت قبول کرنے سے معذور رہوں۔ میں نے خود بھی ایک خواب دیکھا ہے لیکن میرے اور آپ کے واقعاتِ زندگی ایسے نہیں ہیں جو ہمیں دوسری طرف متوجہ ہونیکا موقع دیں"۔

(عبد العلیم نامی)

غزل

یہ جذبۂ اُلفت کی تاثیر نظر آئی — بالینِ مزاران کی تحریر نظر آئی

اب فلسفہ سمجھا میں اسرارِ محبت کا — اب دِل کی مجھے اپنی توقیر نظر آئی

میرا دلِ سوزاں بھی قندیلِ حرم نکلا — کعبہ کی مجھے جس سے تعمیر نظر آئی

دِل حُسن کی لیلےٰ کا آئینۂ معنی تھا — جان عشق کے مجنوں کی تصویر نظر آئی

غش کھا کے گرے موسیٰ اور طور بھی جل اٹھا
جب شمعِ تجلّی کی تنویر نظر آئی

(بدر عالم طور)

حسنِ کلام

محمد مصطفٰے آزاد

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر سے ملے

یہ شعر مرزا غالب کے اُن جواہر پاروں میں سے ہے جو اُن کی قادرالکلامی پر کافی روشنی ڈالتے ہیں مطلب یہ ہے کہ
ں کو محبوب کی جناب میں ایک عریضہ بھیجنا ہے محبوب حسن و خوبی میں یکتائے روزگار ہے۔ اسلئے عاشق کا عقیدہ ہے کہ نامہ بر
پہنچا خود محبوب پر عاشق ہو جائیگا۔ اسے کب گوارا ہے کہ کوئی اس کا رقیب اسی کی بدولت اور پیدا ہو جائے بیچارہ اسی کشمکش
کہ محبوب کو نامۂ شوق بھیجے کہ نہ بھیجے کہ حسن اتفاق بلکہ سوء اتفاق سے اس کی اس پریشانی کا حال اس کے ہم نشین کو معلوم ہوتا ہے
وہ براہ ہمدردی ایک ایسے شخص کو تلاش کرکے لاتا ہے جو نہایت مستقل مزاج اور معتمد الیہ ہے ندیم کہتا ہے لو یہ صاحب اس کام کے اہل
انکی جانب سے مطمئن رہو اپنے فرض منصبی کو بڑی خوبی سے ادا کرینگے عاشق اس خیال کی تردید کرتا ہے لیکن بے سود۔ اپنے ندیم کو
ت کچھ سمجھاتا ہے لیکن رائیگاں۔ بالآخر اس شخص سے ایک میثاق مستحکم اور عہد استوار لیا جاتا ہے۔ کہ امانت میں خیانت نہ کرنا۔ خط دینا
ب لینا اور الٹے پاؤں واپس آنا۔ اب تو عاشق کو اس پر ایمان لائے بغیر نہیں بنتی۔ اپنا کاغذی فریادی اس کے حوالہ کرتا ہے
نامہ بر حسن آباد میں پہنچتا ہے تو محبوب کو دیکھتے ہی کس کا خط اور کیسا جواب۔ کپڑے پھاڑ دیوانہ وار جنگل کو نکل جاتا ہے۔
شق کو یہ خبر ملتی ہے .... ہائے وہی ہوا جو میرا دل کہتا تھا۔ اب کیا ہوا ندیم سے کہتا ہے کہ دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ
ل جو جائیگا اُس کا یہی حشر ہوگا۔ خیر میں تم کو الزام نہیں دیتا۔ تم علم غیب تھوڑی پڑھے ہوئے تھے۔ ہاں اگر کبھی نامہ بر سے
قات ہو جائے تو میرا سلام ضرور کہدینا کہ کیوں حضرت خوب نامہ بری کی خوب جاسوسی کی۔ کیا تھا کیا ہو گیا وہ زہد و تقویٰ
تھا کیا ہو گیا وہ عہدِ وفا۔

دیکھیے کتنے بڑے مضمون کو شاعر نے صرف دو مصرعوں میں ادا کر دیا ہے اور کس حسن و خوبی سے کہ بایدو شاید بار بار پڑھئے اور اس بلاغت
و لطف بیان کی داد دیجئے ؎ تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ✣ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے۔ اے سبحان اللہ!

فلسفۂ خیامؒ

(یہ نظم مولانا عبدالودود صاحب دردؔ بریلوی مرحوم کی بیاض سے منقول ہے اور ٹائمز آف انڈیا مصوّر رسالہ کے سالانہ نمبر میں شائع شدہ تصویر خیام کو دیکھکر برجستہ لکھی گئی تھی۔ یہ اون کی قوّت تخیل اور اندازِ بیان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے)

مدیر

فلسفہ خیّام کا یہ تھا کہ ناؤ نوش ہو
عیشِ حاضر ہر ایک ذی فہم ہم آغوش ہو

عافیت کا ایک گوشہ ایک ساقی سادہ رُخ
اور صراحی میں ملبّب بادۂ پُر جوش ہو

جُھک کے آئے ساقیٔ گلفام کے سینہ پہ سر
ہمکو مدہوشی میں بھی اے کاش اتنا ہوش ہو

دِلِ نہادی کس طرح دنیائے دوں پر ہو سکے
جبکہ یہ روحِ مسافر غاشیہ بردوش ہو

اتھ سے جانے نہ پائے آج فرصت عیش کی
فکرِ فردا قصّۂ پارینہ کی ہم دوش ہو

استانِ این و آں ہو ایک ناخواندہ ورق
قصّۂ مہر و وفا البتہ وقفِ گوش ہو

گیا ہو جو کہ سودائے محبت سے تہی
کیوں نہ وہ از کار رفتہ سر و بالِ دوش ہو

ثِ تشویشِ خاطر ہو نہ فکرِ بیش و کم
چھوڑ دے تقدیر پر سب کام جو ذی ہوش ہو

ب جائے روح کے نغموں میں سازِ زندگی
اور نغمہ کے سوا جو چیز ہو خاموش ہو

زندگی میں اپنی تھی جو اس قدر پُرجوش روح
ہو گئی کیا سوچ کر خیّام کی خاموش روح

دردؔ بریلوی

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم

صاحبزادہ صاحب اپنے وطن کنجپورہ ضلع کرنال میں مئی ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ماجد نواب
م احمد خاں صاحب احمدی مرحوم دنیوی مرتبت کے علاوہ حسنِ اخلاق کے اعتبار سے بڑے بلند پایہ شخص تھے
ست گوالیار کی کونسل کی ممبری کے عہدہ پر پہونچے گورنمنٹ کی طرف سے نواب کا خطاب پایا اور خود کنجپورہ
، نواب خاندان سے تھے تاہم امیرانہ اور رئیسانہ ٹھاٹھ اور شان و شوکت سے اپنے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھا حتیٰ کہ
جود کثیر آمدنی کے کوئی جائداد نہیں خریدی۔ ان کی زندگی کا نصب العین اولاد کی تعلیم و تربیت اور مخلوقِ خدا
حقیقی خدمت تھا اور سادہ زندگی بسر کرکے اپنی آمدنی انہیں دونوں کاموں میں صرف کرتے تھے۔ اپنے دونوں
اجزادگان یعنی (نواب) سلطان احمد خاں صاحب اور (صاحبزادہ) آفتاب احمد خاں صاحب کو ۱۸۸۱ء میں مدرسۃ العلوم
ی گڑھ میں داخل کرکے ۱۸۹۱ء تک یہاں تعلیم دلائی اس کے بعد دونوں کو انگلستان بھیج دیا۔

بچپن سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ حد درجہ نیک چلن اور پاکباز تھے
سنِ صورت کے ساتھ اُن کی صحت اعلیٰ درجہ کی تھی وہ طالب علمی کے زمانہ کے علاوہ اخیر عمر میں سات سال تک
نگلستان میں رہے مگر سادگی اور پاک دامنی کا مسلک جو انھوں نے اختیار کیا تھا اُسے اخیر دم تک نباہ دیا۔
شیات تو درکنار، انھوں نے مدت العمر کسی شکل میں تماکو تک کا استعمال نہیں کیا حتیٰ کہ انگلستان جیسے سرد ملک کے
سات سال کے قیام میں چار تک کا استعمال نہیں کیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ فٹ بال
کھیلتے تھے اور اس کے سب سے پہلے کپتان تھے۔ سالانہ اسپورٹس میں وہ گولہ پھینکتے تھے اور اس میں یقینی طور پر نمبر اوّل
کا انعام پاتے تھے۔ جب نئی نئی بائیسکل آئی تو سالہا سال تک بائیسکل پر چڑھنے والوں میں تمام کالج میں صاحبزادہ صاحب تنہا تھے۔

بچپن میں سب سے پہلی انجمن جو انھوں نے قائم کی وہ لجنۃ الصلوٰۃ تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ طالب علم اپنے
شوق سے پابندی کے ساتھ نماز پڑھیں۔ انھیں اذان دینے کا شوق تھا اور بالخصوص مغرب کے وقت تو وہ

بالاستیعاب اذان دیتے تھے ۔ اذان وہ بڑے شوق سے دیتے تھے حتیٰ کہ جس دن اُنھوں نے وائس چانسلری کا چارج لیا اُس روز اُنھوں نے یونیورسٹی کی مسجد میں صبح کی اذان کہی ۔

کچھ عرصہ تک انھیں یہ شوق رہا کہ وہ طلبہ میں نیک چلنی اور حسنِ اخلاق کی ترویج کی کوشش کرتے تھے اور اس کے لئے اُنھوں نے ایک انجمن بنائی تھی جس کا نام مجھے اب یاد نہیں رہا ۔

صاحبزادہ صاحب بڑے خوش بیان تھے ۔ چنانچہ پہلا کیمبرج اسپیکنگ پرائز یعنی تقریری انعام مرحوم کو ملا ۔

جس قدر حالات صاحبزادہ صاحب کے اب تک بیان کئے گئے ہیں اور جو خوبیاں شمار کی گئی ہیں وہ کم وبیش اور لوگوں میں بھی ہوتی ہیں مگر جس صفت میں وہ بے مثل اور یکتائے زمانہ تھے وہ اُن کا قومی درد تھا جو انھیں کا حصّہ تھا ۔ سرسید مرحوم نے غدر کے بعد مسلمانوں کی تباہی سے متاثر ہو کر اُن کی فلاح اور ترقی کے واسطے مختلف تدابیر کرنا شروع کر دی تھیں اور ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم قائم کیا تھا ۔ اُس وقت سے اُن کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمان بچوں کو ہندوستان اور انگلستان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دے کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی پس ماندہ قوم کے درد مند بنیں اور اس کی خدمت کریں ۔ سرسید کا یہ منصوبہ پہلی بار صرف صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ڈیوٹی انجمن الفرض قائم کر کے پورا کیا ۔ اس سے قبل طلبا ر کو کوئی طریقہ اپنی قوم کی خدمت کا معلوم نہ تھا ۔ پہلی بار جب مجھ سے صاحبزادہ صاحب نے کالج کی خدمت کا منصوبہ بیان کیا تو وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا ۔ جن الفاظ میں انھوں نے مجھ سے فرمایا وہ تقریبًا یہ تھے کہ سرسید نے قوم سے بھیک مانگ کر علی گڑھ کالج قائم کیا اس کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ جو کچھ آتا ہے وہ سب خرچ ہو جاتا ہے اُسی کے ساتھ جس نسبت سے کالج کی ضروریات بڑھ رہی ہیں سرسید کی قوت گھٹ رہی ہے اور کالج چلانے کے افکار کے بار میں وہ روز بروز دبے چلے جاتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے جس سے اس قدر سرمایہ فراہم ہو کہ اس کی آمدنی سے کالج کا خرچ چلے اور روزمرّہ کے افکار سے وہ سبکدوش ہو جائیں ۔ اپنا یہ منصوبہ بیان کر کے صاحبزادہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تمھاری اس بارہ میں کیا رائے ہے ۔ میں نے عرض کیا کہ اس میں رائے کی کیا بات ہے یہ ایک عمدہ کام ہے ۔ فرمایا اگر عمدہ کام ہے تو تم اس میں شریک ہو جاؤ ۔ میں نے عرض کیا سبحان اللہ

دکام سرسید انجام نہ دے سکے کیا اسے ہم طالب علم انجام دے سکتے ہیں۔ میری قوت اور میرے امکان سے
یہ باہر ہے۔ فرمایا اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ کام تمہارے امکان میں ہے یا امکان سے باہر ہے۔ میں
رف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کالج کے لئے سرمایہ جمع کرنا ایک ضروری اور نیک کام سمجھتے ہو یا
ہیں۔ اگر سمجھتے ہو تو بس تم ہمارے شریک ہو۔ غرض میں نے اُن کے رعب میں آ کر اقرار کر لیا۔ تب انھوں نے
مجھے ایک مسودہ سنایا جو اللہ اکبر کے عنوان سے شروع تھا جس میں انھوں نے قومی خدمت کی تمام تر اسکیم
رج کی تھی اور اس کی ابتدا طلبہ کے لئے ایک ایک پیسہ جمع کرکے وظائف قائم کرنے کی تجویز تھی۔۔ یہ اسکیم
س وقت چھپ گئی تھی اور وہ اب تک موجود ہے۔

صاحبزادہ صاحب نے اس انجمن کا نام ڈیوٹی یا الفرض رکھا تھا اُس کے ممبر خادم قرار دئیے تھے۔ اُس
یں کوئی عہدہ بجز خزانچی یا امین کے نہ رکھا تھا اور یہ عہدہ بھی انھوں نے خود نہیں لیا بلکہ مسٹر آرنلڈ کو اس پر مقرر کیا
اور باوجود بانی ہونے کے خود محض خادم ہونے پر اکتفا کیا۔

اوّل آپ نے اس انجمن کو پرائیویٹ رکھا تھا اس لئے کہ بالعموم لوگ اول اپنی انجمنوں کی تشہیر کرتے ہیں
کچھ کام وام کرتے نہیں۔ مگر دقت یہ تھی کہ چندہ کے کام میں تشہیر نہ کی جائے تو چندہ کس طرح وصول ہو
اس لئے آپ نے یہ طے کیا کہ علی گڑھ سے باہر خود چندہ کیا جائے اس کے لئے اتوار اور دوسری تعطیلوں میں
اس کے ممبر اپنے اپنے صرف سے علی گڑھ سے باہر جا کر چندہ لاتے تھے اور خط و کتابت کے ذریعہ سے چندہ منگاتے
تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی یہ خصوصیت کہ انھوں نے قومی کام کے لئے کسی انجمن یا جماعت سے جس کی وہ خدمت
کرتے تھے سفر خرچ تک نہیں لیا طالب علمی سے لے کر آخر دم تک قایم رہی۔ نہ صرف یہ کہ کرایہ یا سفر خرچ نہ لینا بلکہ
جیسے قائم ہونے کے تین چار ماہ بعد ڈیوٹی کو چار کی دوکان قایم کرنی پڑی اور اُس کی وجہ سے وہ پرائیویٹ
سے پبلک میں آگئی تو صاحبزادہ صاحب وقتاً فوقتاً اپنے پاس سے بازار سے کوئی عمدہ مٹھائی لاکر دوکان
کو تحفۃً دیتے اور اس کی قیمت نہ لیتے اور وہی چیزیں دوکان سے لے کر کھاتے تو اس کی قیمت دیتے۔ ان
طریقوں کا اثر یہ تھا کہ شام کے وقت کیکوں کے جس قدر ٹکڑے بیکار سمجھے جاتے انھیں جمع کرکے ڈیوٹی میں کام
کرنے والے طلبا ان کی قیمت لگاتے اور خود خرید کر اُن کے دام دیتے اور تب انھیں کھاتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب

کو اسپورٹس میں جو انعام ملتا اُسے ڈیوٹی کو دے دیتے۔

صاحبزادہ صاحب ڈیوٹی قایم کرنے کے کچھ زمانہ بعد انگلستان چلے گئے اور اس کا کام اپنے بچپن کے دوست مولوی مظہر الحق صاحب بی اے کے سپرد کر گئے جنھوں نے تین سال تک اُن کی غیبت میں نہایت عمدگی سے چلایا اور واپسی پر اُن کے سپرد کر دیا۔ پھر ڈیوٹی نے یونیورسٹی کی جو خدمت کی ہے وہ سب قوم کے سامنے ہے۔

انگلستان سے لوٹ کر صاحبزادہ صاحب نے ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ میں وکالت شروع کی۔ دراں حالیکہ اس وقت کسی اولڈ بوائے کو علی گڑھ میں بیرسٹری میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔ مگر سرسید کے حکم سے اور قومی خدمت کے خیال سے آپ نے یہاں قیام کیا۔ حتیٰ کہ پہلا مکان جو کسی اولڈ بوائے نے علی گڑھ میں بنایا وہ آفتاب منزل ہے۔

ابتدا میں کچھ عرصہ تک تو اور وکیلوں کی طرح روزانہ کچہری جاتے تھے مگر آگے چل کر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب تک کہ موکل انھیں اپنا وکیل بنا کر کسی مقدمہ میں نہ لے جاتا وہ کچہری نہ جاتے۔ روزانہ وہ صبح اُٹھ کر کالج کے کاموں میں مصروف ہو جاتے اور کسی طرح یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کوئی کام بجز خدمت کالج کے کچھ اور ہے۔ ۱۸۹۷ء میں صاحبزادہ صاحب کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد کا انتقال ہو گیا۔ تب سرسید میموریل فنڈ قایم ہوا تو آپ اُس کے اول سکرٹری مقرر ہوئے۔ اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں اس کے لئے دورہ کیا۔ ۱۸۹۹ء میں کلکتہ کی کانفرنس میں اور ۱۹۰۱ء میں دہلی کانفرنس میں اس مقصد کے متعلق کوشش کی۔ ۱۹۰۲ء میں صاحبزادہ صاحب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکرٹری مقرر ہوئے اور اپنے چار سال کے زمانہ میں اس کی آمدنی اس قدر بڑھا دی کہ اس میں سے تین سو روپیہ ماہوار کالج کو دیتے تھے اور اولڈ بوائز کی طرف کے ٹرسٹیوں کی جماعت میں اپنا قائم مقام منظور کرا دیا۔

صاحبزادہ صاحب کا مسلک سلطنت کے بارہ میں وہی تھا جو سرسید کا تھا۔ سرسید کی طرح وہ بھی بڑے جری اور دلیر تھے اور جب قومی مفاد کو خطرہ میں پاتے تھے تو بڑے سے بڑے حاکم کے مقابلہ میں اُجانے میں تامل نہ کرتے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کو اس قسم کا موقع سب سے اوّل ۱۹۰۲ء میں پیش آیا جب کہ لارڈ کرزن نے یونیورسٹی کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے پر قومی یونیورسٹیوں کے قیام کے بارہ میں اختلاف کیا تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے کانفرنس کے اجلاس میں لارڈ کرزن کی پالیسی کے خلاف زبردست تقریریں کیں۔ اور مسلم یونیورسٹی کے قیام

نہایت زور دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا صاحبزادہ صاحب نے کالج کے متصل زمین لے کر اپنا مکان بنالیا تھا اور وہاں
کر تمام تر وقت کالج کے کاموں میں صرف کرتے تھے تعمیرات سے بڑی دلچسپی تھی جس کی وجہ سے ۱۹۰۴ء
ں صیغۂ تعمیرات کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ ممتاز بورڈنگ ہاؤس، لائبریری، کرزن ہاسٹل، سرسید کورٹ
کا ایک حصہ، منٹو سرکل تا تمام مسجد کی تکمیل انھیں کے زمانہ کی یادگاریں ہیں۔ پھر اُن کے زمانۂ وائس چانسلری میں اس
ملہ نے جس قدر ترقی کی وہ چونکہ گزشتہ چند سال ہی میں ہوئی ہے اس لئے اس وقت اس کی تفصیل نہیں
لی جاتی ہے۔

جنوری ۱۸۹۹ء سے جب کہ نواب محسن الملک مرحوم سکریٹری منتخب ہوئے، کالج کے تمام اہم امور میں
صاحبزادہ صاحب کا حصہ رہا۔ پبلک معاملات میں قومی پالیسی قرار دینا۔ اہم امور میں گورنمنٹ سے خط و کتابت کرنا
وائسرائے اور گورنروں کے لئے ایڈریس تیار کرنا۔ انتظامی معاملات کے متعلق اصول قرار دینا۔ بڑے جلسوں
میں اسپیچیں دینا اس قسم کے تمام کام صاحبزادہ صاحب کے ذمہ ہوتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں مرحوم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے اُس وقت کانفرنس کے
پاس نہ کوئی سرمایہ تھا نہ کوئی مستقل آمدنی تھی نہ کوئی اس کی عمارت تھی آپ نے کانفرنس کو جو ترقی دی اُس کی
تفصیلات آگے چل کر بیان کی جائیں گی۔ اِس وقت صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے کانفرنس کو
بطور محمڈن کالج کے صیغۂ تبلیغ اور اشاعت کے چلایا۔ اور کلیتاً اس کے تحت میں رکھا۔ اگرچہ تمام تر اس کا کام پوری
ذمہ داری کے ساتھ کرتے تھے مگر اصرار کے ساتھ کالج کے آنریری سکریٹری کو کانفرنس کا آنریری سکریٹری رکھا
اور خود بارہ سال تک جوائنٹ سکریٹری رہے۔ مسلمانوں میں تعلیم پھیلانے کے کام کے ساتھ آپ نے علی گڑھ کالج کو
یونیورسٹی بنانے میں پوری قوت صرف کی۔ کانفرنس کے اجلاسوں میں بجائے کانفرنس کے کالج کے لئے چندے
ہوتے تھے۔ اور صرف ممبروں کی فیس کی آمدنی بڑھا کر کانفرنس کو ترقی دیتے تھے۔ ہز ہائنس سر آغا خاں نے ۱۰-۱۹۱۱ء
میں مُسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک میں از سرِ نو جان ڈالی۔ اُس میں صاحبزادہ صاحب کا خاص حصہ تھا۔ صاحبزادہ
صاحب نے اُس کے لئے بکثرت لکھے دئے۔ بہت سے پمفلٹ تیار کر کے شائع کئے اور چند نمونے کی اسپیچیں ایک

پمفلٹ کی شکل میں لکھ کر شایع کیں۔ جن سے مختلف مقامات پر جلسے منعقد کرنے والوں کو مدد ملے۔ آپ یونیورسٹی کے ڈیپوٹیشنوں کے ساتھ لکھنؤ، لاہور، کراچی، کوئٹہ، شاہ جہاں پور اور بہت سے مقامات پر گئے اور وہاں معرکۃ الآرا تقریریں کیں۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں جو ڈپوٹیشن بمقام شملہ سر ہارکورٹ بٹلر صاحب ممبر تعلیمات سے مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کرنے گیا تھا اور جس میں نواب وقارالملک مرحوم، مہاراجہ صاحب محمود آباد، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد شریک تھے اس وقت مجوزہ یونیورسٹی کی اسکیم صاحبزادہ صاحب نے ہی پیش کی تھی۔ گورنمنٹ کے اور قومی نقطۂ نظر میں محض اصولی اختلاف تھا اس سلسلہ میں صاحبزادہ صاحب نے جو تقریر کی اس کا اس وقت نواب وقارالملک مرحوم پر ایسا اثر ہوا تھا کہ جب ڈیپوٹیشن کے ممبران ممبر تعلیمات کے کمرہ سے باہر نکلے تو نواب صاحب نے صاحبزادہ صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

اس ستمبر ۱۹۱۱ء میں جب دوسرا ڈپوٹیشن ممبر صاحب تعلیمات موصوف سے مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کرنے گیا اس وقت گورنمنٹ کی رائے یہ تھی کہ استادوں کے تقرر کا اختیار گورنمنٹ کو ہو۔ گورنمنٹ کی اس تجویز سے ممبران ڈیپوٹیشن میں سے بجز صاحبزادہ صاحب اور مولوی عزیز مرزا مرحوم اور سید نبی اللہ مرحوم کے سب کو اتفاق تھا۔ مگر صاحبزادہ صاحب نے اس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور وجوہ اختلاف تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ بالآخر جب مسئلہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کے سامنے پہونچا تو انھوں نے صاحبزادہ صاحب کے عذرات کو تسلیم کرکے استادوں کا تقرر اراکین یونیورسٹی کے اختیار میں رکھا۔ اس وقت سر تھیوڈور ماریسن سابق پرنسپل علی گڑھ کالج انڈیا کونسل کے ممبر تھے انھوں نے صاحبزادہ صاحب کا عذر تسلیم کرانے میں بہت مدد دی تھی۔ یونیورسٹی کے لئے جو قانون تجویز ہوا اور جس کے متعلق ملک میں عرصہ تک اختلاف رہا اس کے وضع کرنے میں صاحبزادہ صاحب کا خاص حصّہ تھا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا اس کے ذریعہ سے صاحبزادہ صاحب نے قومی شیرازہ بندی کرکے قوم کو تعلیمی پستی سے ابھارنے میں مسلسل بارہ سال تک سخت جد وجہد کی۔ انھوں نے نواب محسن الملک کے ساتھ ساتھ اور اُن کے بعد بھی کانفرنس کے دائرۂ عمل کو اکناف ہند میں وسعت دینے کی کوشش کی اور ڈھاکہ، رنگون، کراچی، دہلی، راولپنڈی، ناگپور، پونا، امرتسر وغیرہ میں کانفرنس کے عظیم الشان اجلاس منعقد کرائے۔ ہز ہائنس نواب

سلطان جہاں بیگم صاحبہ سابق فرماں روائے بھوپال اور اُن کے اہلِ خاندان سے پچاس ہزار روپیہ کا عطیہ حاصل کے دفتر کانفرنس کی عمارت تعمیر کرائی ۔ اعلیٰ حضرت نظام الملک میر عثمان علی خاں بہادر خلد اللہ ملکہ کے حضور میں حاضر ہوکر ایک لاکھ ستر ہزار کا گراں قدر عطیہ حاصل کرکے اس کا مستقل سرمایہ قایم کیا جس کی آمدنی سے دفتر کانفرنس چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر ریاستوں سے مستقل امدادیں حاصل کیں جن کی وجہ سے کانفرنس کی مستقل آمدنی ... ہزار روپیہ ماہوار تک پہونچ گئی ۔

کانفرنس کے متعلق آپ نے فنِ تعلیم کے لٹریچر کا ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ قائم کیا جو اب ٹیچرس ٹرننگ کالج کے کام آرہا ہے ۔ اسی کتب خانہ کے ساتھ تعلیم کے متعلق ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کی جس قدر رپورٹیں شائع ہوئی ہیں وہ سب صاحبزادہ صاحب نے جمع کیں اور تعلیمی اعداد و شمار اور معلومات کا ایک عمدہ ذخیرہ جمع کر دیا۔

صاحبزادہ صاحب کی مسلسل کوششوں سے سنہ ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ صوبہ متحدہ نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیمی حالت کی تحقیقات کے لئے جسٹس مولوی کرامت حسین صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس کی سفارش پر سر جیمس مسٹن نے اسلامیہ اسکولوں اور مکاتب کی مشہور اسکیم سنہ ۱۹۱۴ء میں منظور فرمائی اور جس کی رو سے ایک مسلمان انسپکٹر اور آٹھ مسلمان ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے اس کے تحت میں مکاتب قائم کرانے کے لئے صاحبزادہ صاحب نے تمام صوبہ میں سفیرانِ کانفرنس بھیجے اور ہر ضلع میں مکاتب قائم کرائے ۔غرض کہ مرحوم نے کانفرنس کے ذریعہ سے ایک طرف تو علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا کام لیا اور دوسری طرف تمام ملک میں تعلیم عامہ کی تبلیغ کی، ہزارہا تعلیمی اور اخلاقی رسائل چھاپ کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہونچائے ملک میں دورے کئے تقریریں کیں اور مسلمانوں کو بیدار کرکے مختلف مقامات میں مسلمانوں کے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس قائم کرائے ۔

صاحبزادہ صاحب نے سنہ ۱۹۰۹ء میں ٹیچروں کی ایک کانفرنس کی جس میں تعلیمی مسائل پر بحث مباحثے ہوئے اس زمانہ میں اس قسم کے جلسوں کا ملک میں نام بھی نہ تھا پھر جب انگلستان سے واپس آئے تو علی گڑھ میں دسمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں کانفرنس کے ساتھ تعلیمی لکچروں اور تعلیمی نمائش کا جس وسیع پیمانہ پر صاحبزادہ صاحب نے انتظام کیا اس کی مثال ہندوستان میں اس سے قبل قائم نہ ہوئی تھی ۔ ہر قوم و ملت کے ماہرین تعلیم کو تمام ہندوستان سے جمع کرکے مسلسل ایک ہفتہ تک ... بلکہ ... وسیع پیمانہ پر تعلیمی نمائش کا انتظام تھا جسے دیکھ کر قابل ترین لوگ بہت

ہو کر رہ جاتے تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کی وہ پہلی نمائش اور کانفرنس تھی۔ اب اس نمونہ پر مگر چھوٹے پیمانہ پر پنجاب اور دوسرے صوبوں میں کانفرنسیں ہونے لگی ہیں۔ اس کانفرنس کے تمام عالمانہ لکچر کانفرنس کی رپورٹوں میں محفوظ ہیں۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ باوجودے کہ علی گڑھ میں بیرسٹروں کے لئے کوئی امید افزا میدان نہ تھا تاہم کالج کی محبت میں اور سرسید مرحوم کے فرمانے سے صاحبزادہ صاحب نے علی گڑھ میں وکالت شروع کی۔ آپ کا منصوبہ علی گڑھ میں علی گڑھ کے شیدائیوں کی ایک آبادی قایم کرنے کا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں آپ نے زمین لے کر ۱۹۰۴ء میں آفتاب منزل کو مکمل کر دیا۔ اور کالج کے قریب رہنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ آپ کے کاموں کا دائرہ بڑھ گیا۔ اسی زمانہ سے آپ نے صیغہ 'تعمیرات' اولڈ بوائے ایسوسی ایشن، ممبری تعلیمات' ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسرے متفرق کام ہاتھ میں لے کر قومی کام کرنے کی ایک بہترین نظیر قائم کی۔ ان کاموں کے علاوہ آپ لا کلاس کو لکچر دیتے رہے جس کا معاوضہ وہ کالج فنڈ میں جمع کرا دیتے تھے۔ اس قدر کثیر تعداد میں قومی کام کرنے کے ساتھ آپ اپنے بچوں کی کسب معاش کے لئے کچھ وقت نکالتے تھے۔ اور اگرچہ آپ کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں مگر آمدنی کے ذرائع بڑھانے کے لئے نہ علی گڑھ میں اپنے پیشہ میں زیادہ وقت صرف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے نہ ہائی کورٹ کی ججی وغیرہ کے لئے کسی صدر مقام میں منتقل ہونے کے لئے۔ آپ کا خاندانی تعلق ریاست گوالیار سے تھا اس لئے مہاراجہ صاحب نے آپ کو اپنی ریاست میں دو مرتبہ ایک بڑا عہدہ دینا چاہا جس سے آپ نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ریاست کا ایک مقدمہ آپ کے سپرد حیدرآباد دکن میں پیروی کے لئے کیا۔ اس کے لئے آپ کو حیدرآباد جاکر کچھ عرصہ تک وہاں قیام کرنا پڑا وہاں آپ کی قابلیت کا سکہ جلد قایم ہو گیا اور آمدنی میں معقول اضافہ ہوا۔ وہاں ترقی کے بہترین مواقع تھے اس لئے آپ کے عزیزوں، بہی خواہوں اور دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ کچھ عرصہ وہاں رہ کر اپنی مالی حالت کو ترقی دے لیں۔ مگر علی گڑھ کی کشش انہیں وہاں کیسے ٹھہرنے دیتی۔ بالآخر سب چھوڑ چھاڑ کر وہ علی گڑھ واپس آگئے وکالت کے پیشہ سے انہیں مناسبت نہ تھی۔ یہ پیشہ انھیں دل سے ناپسند تھا مگر مجبوراً اُسے کرتے تھے۔ کیوں کہ کوئی کام ایسا نہ تھا جسے اختیار کر کے اپنا وقت اس میں جتنا چاہیں صرف کریں اور جتنا چاہیں قومی کاموں میں صرف کریں۔ چنانچہ جب کانفرنس کے اجلاس کا یا دوسرے قومی جلسوں کا زمانہ آتا تھا تو وہ ہفتوں اور مہینوں تک کوئی مقدمہ نہ لیتے تھے

... ہوئے مؤکلوں اور صدہا روپیہ کو واپس کر دیے تھے۔ وہ ہر طرح محمڈن کالج کی سکرٹری شپ کے
... لوگوں نے اُن سے بار ہا کہا کہ وہ اُس کے لئے آمادہ ہو جائیں مگر اُن کا نصب العین یہ تھا
... ذاتی اور خاندانی ضروریات سے فارغ ہو کر اس اہم قومی خدمت کو ہمہ تن مصروف ہو کر کریں۔
... میں انھیں انڈیا کونسل کی ممبری پیش ہوئی۔ اس وقت انھیں علی گڑھ چھوڑنے میں تامل ہوا۔
... وکالت کے پیشہ سے متنفر تھے اور چاہتے تھے کہ کچھ عرصہ علی گڑھ کی کشمکش سے علحدہ رہ کر سکون کے
... اپنی علمی معلومات میں اضافہ کریں تاکہ وہ زیادہ کارآمد بن کر پھر یکسوئی کے ساتھ قوم کی خدمت
... انھیں۔ چنانچہ اسی منصوبہ کے ساتھ انھوں نے بعض احباب کے سخت اصرار سے اُسے منظور فرمالیا
انڈیا کونسل کی ممبری گویا ایک قسم کی پنشن ہے۔ اوس کے ممبروں کے سپرد کوئی خاص خدمت نہیں ہوتی۔
جس قدر کام وہ چاہیں کریں۔ مگر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی قسمت میں انگلستان میں بھی آرام
... تھا۔ انھوں نے وہاں اس قدر زیادہ کام کیا جس کی نظیر ملنی مشکل ہوگی۔ تمام دن حتیٰ کہ بعض راتوں
کو وہ کام کرتے تھے۔ اور اُن کی وجہ سے انڈیا کونسل کے ملازموں کو چونکہ حاضر رہنا پڑتا تھا اس لیے وہ لوگ
پریشان رہتے تھے تمام مسلوں کو وہ بتمامہ پڑھتے اور اُن پر بڑے بڑے نوٹ لکھتے اور پھر اپنے روزنامچوں اور
ڈائریوں میں آکر اُن امور کو تفصیل کے ساتھ لکھتے۔ اس قسم کے رجسٹروں اور کاغذات کے جو خود انھوں
نے انڈیا کونسل کے متعلق لکھے ہیں انبار لگے پڑے ہیں۔ نہ معلوم خود دفتر سکرٹری آف اسٹیٹ میں اُن کی
تحریرات کا کتنا بڑا ذخیرہ ہوگا۔ پھر یہ کہ جس جبر کے ساتھ وہ وہاں کام کرتے تھے ہندوستان کے بڑے سے بڑے
سِولین اُس کے معترف تھے۔ اس کام کی تفصیل بہت زیادہ وقت چاہتی ہے اور وہ ہر ایک رسالہ ماہواری کے صفحات
کے حدود سے باہر ہے۔

انگلستان میں کام کے ساتھ تفریح کے سامانوں کی کمی نہیں مگر وہاں بھی ملکی اور قومی بہبودی کے کام
انجام دینے میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اور صرف اُسی قسم کے لوگوں سے مل کر خوش ہوتے تھے جو ملکی
اور قومی باتیں کرتے ہوں۔ چنانچہ حال میں لندن سے کسی صاحب نے اخبار لیڈر میں ایک چٹھی شائع کی
ہے جس میں لکھا ہے کہ ۱۹۱۷ء میں وہ صاحب جو غالباً ہندو ہیں جہاز میں صاحبزادہ کے ہم سفر تھے انھوں نے

لکھا ہے کہ صاحبزادہ صاحب کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی پس ماندہ قوم کو اُبھار کر اپنے ہم وطنوں
برابر لا کھڑا کر دیں تاکہ وہ اُن کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو اُبھاریں۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ جہاز کے
کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس پایہ کے شخص ہیں جب اُسے معلوم ہوا کہ انڈیا کونسل کے ممبر ہو کر انگلستان جا
ہیں تو کھانے کی میز پر اپنے قریب اُنھیں خاص جگہ دینی چاہی۔ مگر اُنھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ ا
ہم خیالوں کے ساتھ بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ اُنھیں ہندوستانیوں کے ساتھ جو ملک و قوم کی
کی باتیں کیا کرتے تھے وہ بیٹھے رہے اور وہاں خوش رہے۔ غرضکہ وہ اعلیٰ سوسائٹی میں جہاں محض تکلف
ہوں زیادہ خوش نہ رہتے تھے۔ اُنھیں انگلستان کی آب و ہوا طالب علمی کے زمانہ میں بھی موافق نہ
تھی اب آخر عمر میں وہاں کے قیام نے بدرجہ اولی اُن کی صحت کو نقصان پہنچایا۔ اس لیئے وہاں کا زمانہ
کر کے جب وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تو اُن کی صحت پر جو ہندوستان میں غیر معمولی طور پر عمدہ تھی
خراب اثر پڑ چکا تھا۔ انڈیا کونسل کا دستور ہے کہ جو ممبر وہاں پوری مدت کام کرتے ہیں اُنھیں گورنمنٹ
طرف سے سَر کا خطاب ملتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب اس سے محروم رہے۔ وہ ہر دو سال بعد رخصت
لیکر ہندوستان آتے تھے۔ ایک بار یہاں آئے ہوئے تھے۔ اُس زمانہ میں اُن کے پاس گورنمنٹ
ایک خط کسی سرکاری مسئلہ کے بارہ میں آیا۔ اُس میں اُن کے نام کے ساتھ میں سَر کا لفظ لکھا ہوا تھا۔ ا
اندیشہ ہوا کہ کہیں اُن کے لیئے یہ خطاب تو تجویز نہیں ہوا ہے۔ آپ نے فوراً گورنمنٹ کو ایک چھٹی لکھی جس
مضمون یہ تھا کہ فلاں چھٹی میں اُن کے نام کے ساتھ سَر کا اضافہ کیا گیا ہے۔ غالباً یہ سہواً دفتر کی غلطی سے لکھا
ہے لیکن اگر یہ سہواً نہیں لکھا گیا ہے بلکہ سر کا خطاب ملنے کا پیش خیمہ ہے تو میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں
کہ میں اس اعزاز کو منظور نہ کر سکوں گا۔ صحیح الفاظ مجھے یاد نہیں کہ اس سلسلہ میں اور کیا لکھے گئے مگر خلاصہ
کہ اُنھوں نے تہذیب کے ساتھ اس قسم کے اعزاز قبول کرنے سے سے انکار کر دیا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ اُن کو
سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندوستان ہی میں پیش آیا تھا اور اُس وقت بھی مرحوم نے صوبۂ ہذا کی گورنمنٹ میں ایک تحریر بھیجی تھی
خطاب کے متعلق صاحبزادہ صاحب کے اصول و خیالات ایک خاص قسم کے تھے کہ جن پر اُس وقت تک بحث نہیں
ہو سکتی جب تک کہ اُن کی تحریرات مندرجۂ بالا سامنے نہ ہوں یہ خیالات کچھ اس بنیاد پر نہ تھے کہ وہ خطاب

خاص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض خطاب یافتہ اشخاص اور اُن کے خطابات کی وہ
سے عزت کرتے تھے مگر خود اپنی ذات کے واسطے چونکہ اُن کا معیار قومی و ملکی خدمات کا خدا ترسی اور خدمتِ خلق
کے اعلیٰ و ارفع اصول پر تھا اس لیئے وہ خطابات کو اپنے واسطے پسند نہیں کرتے تھے۔

غرضکہ سات سال کے انگلستان کے قیام کے بعد صاحبزادہ صاحب ہندوستان واپس آئے۔ آپ کا انتخاب
مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ہوا جس کا چارج آپ نے یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو لیا۔ جس انہماک کے ساتھ آپ نے
مسلم یونیورسٹی کا کام کیا وہ ملک اور قوم کے سامنے ہے۔ آپ کے سامنے عرصہ دراز کے بعد سرمایہ کی فراہمی کا کام
شروع کیا گیا۔ گورنمنٹ ہند سے بھی پانچ لاکھ نقد اور پچیس ہزار ماہوار کی امداد حاصل کی اور سولہ سال سے جو
وائسرائے کا آنا علی گڑھ میں بند تھا وہ لارڈ ریڈنگ کو لاکر کھولا گیا۔ جس یکمشت اور سالانہ امداد کا آپ کے زمانہ
میں اضافہ ہوا اُس کا حساب مستقل سرمایہ کے طور پر لگایا جائے تو سولہ لاکھ تک پہونچتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ نے
مسلم یونیورسٹی کی جوبلی منانے کا وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا۔ آپ کے پروگرام کا ایک جزو یہ تھا کہ قوم کے سامنے پنجاہ
سالہ کوشش کے نتائج پیش کرکے قوم سے ایک کروڑ روپیہ مانگیں گے۔ مگر جلسہ کے قریب آپ کی صحت نے جواب دیدیا
اس لیئے تمام کام نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب کے سپرد کر دیا۔

وائس چانسلری کی میعاد سہ سالہ جب ختم ہوئی تو خرابیِ صحت کی وجہ سے آپ پھر اُس کے لیئے کھڑے نہیں ہوئے
اور اپنی قوت اور صحت کے مطابق نسبتاً ایک ہلکے کام میں مصروف ہوگئے۔ صاحبزادہ صاحب کے والدِ ماجد کو
نابیناؤں کی آنکھیں بنوانے اور معذور اور محتاج لوگوں کی خدمت کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُن کی یادگار میں صاحبزادہ
صاحب نے اپنی کوٹھی کے متصل نابیناؤں کا ایک مدرسہ قایم کیا اور ساٹھ ہزار روپیہ کی لاگت کی عمارت اپنے
پاس سے تعمیر کی اور مدرسہ کو جاری کر دیا۔ ہزاکسلنسی سر ولیم میرس گورنر صاحب صوبہ متحدہ کو اُس کے ملاحظہ کے
لیئے مدعو کیا۔ اُن کا ارادہ تھا کہ اُسے وسیع پیمانہ پر چلائیں گے۔ مگر جنوری ۱۹۲۸ء میں مرضِ فالج میں مبتلا ہوجانے
سے وہ تمام منصوبے خاک میں مل گئے۔ پورے دو سال تک آپ بسترِ علالت پر پڑے رہنے پر مجبور رہے حتےٰ کہ
۱۶ر جنوری ۱۹۳۰ء کو فالج کا دورہ دوسری بار دوسری جانب پڑا اور آپ نے ۱۸ر جنوری ۱۹۳۰ء کو انتقال
فرمایا۔

دو سال تک آپ کی لایق اولاد نے جس اعلیٰ پیمانہ پر اُن کی تیمارداری اور خدمت کی ہے اُس کی
ملنی مشکل ہے۔

صاحبزادہ صاحب نوابی خاندان سے تھے۔ نواب اور ممبر کونسل کے بیٹے تھے اُن کی تعلیم و تربیت
اعلیٰ درجہ کی ہوئی۔ وجاہت اور صورت شکل میں ممتاز تھے۔ انگلستان جانے سے قبل وہ ہندوستانی
لباس پہنتے تھے انگلستان جانے کے وقت سے اُنھوں نے انگریزی لباس اختیار کیا تھا۔ اُن کی ہمیشہ یہ
کو دھوکا ہوتا تھا کہ وہ انگریز ہیں۔ مگر باوجود اس کے اُنھوں نے غریب مسلمانوں کی صف سے آگے
بڑھایا۔ ایک بار وہ ریل میں سفر کر رہے تھے۔ اور فرسٹ کلاس کے اُس کمرے میں بیٹھے تھے جس میں انڈین
اُس میں بہت سے ہندوستانی بیٹھے تھے۔ ایک انگریز گارڈ نے اُن سے آکر کہا کہ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔
یورپینیوں کا درجہ خالی پڑا ہے وہاں چلے جاؤ۔ صاحبزادہ صاحب نے فرمایا مگر میں تو ہندوستانی ہوں
اُسے تعجب ہوا۔ وہ ہندوستانی تعلیم یافتوں سے حتی الامکان اُردو بولتے تھے۔ انگریزی کم بولتے تھے۔
اعلیٰ طبقوں میں ملنے کے ہمیشہ غربا ریں ملتے تھے۔ میں اُن سے کہا کرتا تھا کہ اس بارہ میں آپ حضرت عیسیٰ
مشابہ ہیں جو باوجود پیغمبر ہونے کے اپنے غریب حواریوں سے ملتے تھے۔ ریل میں وہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے
بالعموم اُن کی یہ عادت تھی کہ ریل میں جب کوئی علی گڑھ والا یا کوئی اور ہمخیال ساتھ ہوتا تو اُس کے پاس تیسرے درجہ
میں آ بیٹھتے اور گھنٹوں ساتھ سفر کرتے اور قومی باتوں میں منہمک رہتے۔

جب مقدمات کی پیروی کے سلسلے میں کسی مقام پر جاتے تو وقت نکال کر تلاش کر کر کے اولڈ بوائز کے
گھر ملنے کے لیئے جاتے۔ یہ اُس زمانہ کی حالت تھی جبکہ انگلستان کے تعلیم یافتہ کم تھے اور اُن کی عزت زیادہ تھی
اور انگلستان سے لوٹے ہوئے لوگ معمولی درجہ کے آدمیوں سے ملنے سے گریز کرتے تھے۔

باوجود اتنے بڑے آدمی ہونے کے وہ اپنے مکان کے باہر کے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے جہاں ہر شخص
آسانی سے بلا تکلف اُن سے مل سکتا تھا۔ وہ ہر ادنیٰ واعلیٰ سے حتیٰ کہ مزدوروں سے بے تکلفی سے باتیں کرتے
تھے۔ چونکہ صیغۂ تعمیرات سے مدتوں واسطہ رہا تھا اس لیئے بہ کثرت مزدوروں سے وہ ذاتی واقفیت رکھتے تھے
راستہ میں وہ لوگ ملجاتے تھے تو محبت سے سلام کا جواب دیتے اور اُن کا حال پوچھتے۔

خیرات کے بارہ میں وہ اپنے والد بزرگوار کی سنت پر عامل تھے۔ وہ ہٹے کٹے فقیروں کو کچھ نہ دیتے تھے البتہ معذور لوگوں کی ایک فہرست مرتب رکھتے تھے جنھیں ہفتہ وار معین امداد دیتے تھے اور جو شخص اُنھیں معذور ملتا اُسے اچھی طرح دیتے

اُن کے دل میں غربا کا بڑا درد تھا۔ انگلستان جانے سے قبل اپنے والد ماجد کے سالانہ عرس میں ہزاروں سائلین کو اعلیٰ قسم کی بریانی اور زردہ پکوا کر کھلاتے اور یہ کہتے کہ امرا تو چیزیں روزانہ کھاتے ہیں۔ غربا کو نصیب نہیں ہوتیں اس لیئے اُن کے لیئے خاص اہتمام سے عمدہ باورچی بلوا کر کھانا تیار کراتا ہوں۔

برخلاف اس کے اپنے ہم چشموں اور احباب کی دعوت میں اُن کی عادت تھی کہ تین کھانوں سے متجاوز نہ ہوتے تھے۔ اور اس کو وہ قومی دعوت کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اس قسم کی دعوت کو اختیار کریں۔

مدتوں تک یہ معمول رہا کہ بڑے اسپتال میں جاتے۔ ایک ایک مریض کے پاس جا کر اُس کا حال پوچھتے اور اُس کی تکلیف رفع کرتے۔

سیاسی خیالات کے اعتبار سے وہ بہت بڑے نیشنلسٹ تھے۔ اُن کے دل میں دیگر اقوام کی طرف سے ذرہ بھر تعصب نہ تھا جس کا اعتراف خود لیڈر نے بارہا کیا ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ مگر مسلمانوں کی پستی کا اُن کے دل پر اتنا گہرا اثر تھا کہ خالص مسلمانوں کی بہبودی کے کاموں سے کبھی اُن کو فرصت ہی نہ ہوئی کہ وہ مختص ملک کے کاموں میں پورا پورا حصہ لے سکیں اُن کی سیاسی خیالات اور ملکی خدمات کی تفصیل جداگانہ وقت اور موقعہ چاہتی ہے۔

اُن کی زندگی اور اُن کے مشاغل دیکھ کر ہر شخص کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اُنھوں نے دل بھر کر قومی خدمت کر لی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ باوجود ہمہ وقت قومی کام میں مصروف رہنے کے اور اس قدر عظیم الشان نتائج حاصل کرنے کے وہ سمجھتے تھے کہ اُنھوں نے اب تک کچھ بھی نہیں کیا۔ مسلمانوں کی مذہبی خدمت کا اُنھوں نے ایک عظیم الشان پروگرام بنا رکھا تھا جس کے لیئے وہ برسوں سے تیاری کر رہے تھے۔ وہ بغیر پوری تیاری کے مذہبی کام میں ہاتھ ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کلام پاک کا مطالعہ کر کے مذہبی تعلیم اور مذہبی مشن کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کیئے ہیں جو اُنھوں نے اپنی زندگی میں کسی کو نہیں دکھائے۔ اُن کا ارادہ

تھا کہ تمام کام چھوڑ کر وہ ایک ایک شہر میں جائیں گے ہر شہر میں چند ماہ قیام کرکے وہاں کے لوگوں کو تمدن ا
معاشرت اور حصول تعلیم کے طریقے بتائیں گے اور جب ایک جگہ کام چلتا کر دیں گے تب دوسری جگہ کا ارادہ
کریں گے۔ غرضکہ جتنے بڑے شخص وہ تھے اُسی نسبت سے اُن کے اعلیٰ ترین منصوبے تھے۔

الحاصل طالب علمی سے لے کر آخر دم تک اُنھوں نے یکساں مصروفیت یکساں انہماک اور یکساں
قومی خدمت میں اپنی زندگی کے لمحوں کو صرف کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ۵

طفیل احمد
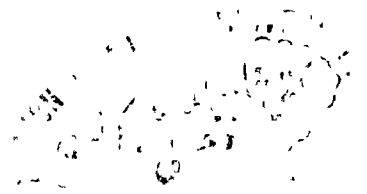
غروبِ آفتاب

یعنی

مرثیہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم و مغفور نور اللہ مرقدہٗ

از جناب چودہری خوشی محمدؐ صاحب ناظرؔ

یہ نظم ۱۶ فروری سن ۳۰ء کو لائل لائبریری علی گڑھ میں جلسۂ تعزیت کے موقعہ پر پڑھی گئی۔ چودہری صاحب ہمارے علوم کے اولڈ بوائے ہیں اور صاحبزادہ صاحب مرحوم کے ہم سبق تھے اور عزیز ترین دوستوں میں ان کا تھا۔ دوست کی جدائی سے بیتاب ہو کر رنج و غم کے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔

حسرت برس رہی ہی یہ کیوں صحنِ باغ میں
بزمِ چمن کی آج وہ رنگیں فضا نہیں

کل بزمِ گل میں جس کے ترانوں کی دہوم تھی
گلشن میں اب وہ بلبلِ دستانسرا نہیں

ہے غم سے آفتاب کے ہر سینہ داغ داغ
وہ دل نہیں کہ جس کو یہ چرکا لگا نہیں

طے ہو گی اپنی منزلِ مقصود کس طرح
گم کردہ راہ قوم ہے اور رہنما نہیں

اٹھتا ہے کارواں سے بس آہ و بکا کا دہواں
شورِ جرس نہیں کہیں بانگِ درا نہیں

یارانِ نجد قیس کو رولیں کہ دشت میں
پھر رہ نوردِ شوق کوئی دوسرا نہیں

ہو گا کسی فلک پہ وہ خورشیدِ جلوہ گر
کہتے ہیں آفتاب کبھی ڈوبتا نہیں

قامت پہ اس کے پڑتی تھی سرو و سمن کی آنکھ
گلزار احمدیؔ[1] میں جب وہ نونہال تھا

اُس جنتِ نظارہ میں سورج مکھی کی طرح
ناظرؔ بھی آفتاب کا محوِ جمال تھا

---

[1] صاحبزادہ صاحب کے والد کا احمدیؔ تخلص تھا۔

گرد و غبارِ دہر کی آلائشوں سے پاک / پاکیزہ دامنی میں وہ برفِ جبال تھا

تحریر اُس کی بحرِ فصاحت کی موج تھی / تقریر اُس کی چشمۂ آبِ زُلال تھا

عمرِ عزیز خدمتِ قومی میں صرف کی / اِس دھن میں محو روز و شب و ماہ و سال تھا

علم و ادب کی ہاتھ میں مشعل لیے ہوئے / تنہا وہ رہ نوردِ جنوب و شمال تھا

لایا پیام قوم میں تعلیمِ عام کا
سیّد کا خاص قاصدِ فرخندہ فال تھا

افسوس بزمِ قوم میں جو انتخاب تھا / اُس پر پڑی اجل کی نگہ انتخاب کی

ظلمت کی رات مطلعِ قومی پہ چھا گئی / جس دن سے آنکھ بند ہوئی آفتاب کی

پہلو میں دردِ قوم کا طوفاں لیے ہوئے / ڈوبی فنا کی موج میں کشتی حباب کی

شام و پگاہ اُس کے امانت تھی دوش پر / محبوبِ قوم سیّدِ عالی جناب کی

کرتا تھا نیک و بد کا ہمیشہ موازنہ / طفلی سے عادت اُس کی رہی احتساب کی

حسرت بھری نگاہ وہ چشمِ پُر آب کی / یہ آخری کرن تھی مرے آفتاب کی

ظلمت میں جس کی نورِ سحر کا گذر نہ ہو
حالت وہی ہے اب دلِ خانہ خراب کی

تن پر ہو آفتاب کے یارب ردائے نور / جنت کی جلوہ گاہ میں وہ ضَوفشاں رہے

چمکے یہ آفتاب نئے آسمان پر / اور اُس کے گرد حلقۂ سیّارگاں رہے

یہ کشتگانِ عشق ہیں وہ طائرانِ قدس / برقِ فنا سے جن کا بلند آشیاں رہے

گلزارِ آفتاب میں تا دورِ آفتاب / شمشاد و سرو و لالہ و گُل کا سماں رہے

اُس ایک آفتاب کے پانچ آفتاب ہوں / اور اُن کی آب و تاب تہِ آسماں رہے

لایا تھا کوہسار سے جس کو یہ کوہکن / وہ زندگی کا چشمۂ شیریں رواں رہے

اُس آفتاب نے رُخِ انور چھپا لیا
ناظرؔ شبِ فراق میں اب نوحہ خواں رہے

قطعۂ تاریخِ وفات

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم

ای زندگی سے ہو گیا کوئی مطمئن — ہوتے ہیں ایک دن میں ہزاروں ہی انقلاب

ن اپنی شان دکھاتی ہے نو بنو — ہر صبح سوزِ مہر سے ہے گرم التہاب

تصر تغیرِ پیہم سے رات دن — پھیلا ہے آسماں سے زمیں تک اک اضطراب

آفتاب احمدِ نام آورِ جہاں — واقف ہیں جن کے حال سے دنیا کے شیخ و شاب

ات قوم و ملک و سیاست میں عمر بھر — مشغول و منہمک رہے بے خوف و بے حجاب

محنت اتنی خدمتِ دارالعلوم میں — افراطِ کاروبار سے صحت ہوئی خراب

ج کی بے خودی کا اثر دو برس رہا — زندہ رہے، مگر نہ رہی زندگی کی آب

آخر آگئی وہ گھڑی جو نہ رُک سکی — ہرچند حکمتوں نے کیا لاکھ سدِّباب

شنبے کو جنوری کی تھی اٹھارھویں کہ آہ — بعدِ زوالِ مہر اٹھا وہ فلک جناب

تاریخ جس کی احسنِ مغموم نے کہی

افسوس ہے غروب ہوا آج آفتاب

---

۳۰ ۶ ۱۹

احسن مارہروی

غزل

جھکے گی سب کی گردن ابروئے خمدار کے نیچے
ہزاروں سر کٹیں گے ایک ہی تلوار کے نیچے

انا الحق حضرتِ منصور کو کتنا مبارک ہو
ہمارا خونِ ناحق۔ حق کہے گا دار کے نیچے

ہمیں پر منحصر کیا ہے کہ زاہد سر جھکاتے ہیں
کہاں؟ نامِ خدا اُس ابروئے خمدار کے نیچے

عجب شوقِ شہادت تھا کہ سر تھا میرا مقتل میں
کبھی تلوار کے اوپر۔ کبھی تلوار کے نیچے

قسم اے ضبط تجھکو آج میری لاج رکھ لینا
نظر قاتل کے رُخ پر سر رہے تلوار کے نیچے

قیامت ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے مقتل میں
دبے جاتے ہیں فتنے شوخیٔ رفتار کے نیچے

اگر محفل میں آنا ہے منع اچھا سہی لیکن
پڑا رہنے دے ہم کو سایۂ دیوار کے نیچے

ابھی گویا مرا کہنا ہے قبل از مرگ وا ویلا
مرے جوہر کھلیں گے تیغ جوہر دار کے نیچے

مرے شوقِ شہادت کے جنوں کو دیکھکر یوسف
قضا نے دوڑ کر سر رکھدیا تلوار کے نیچے

قاضی محمد یوسف علی بلگرامی

ہنگامۂ الکشن

"از نامہ نگار"

ضرات ! کلاس جا رہے تھے کہ یکایک راستہ میں زبیری صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی ۔ ہوش و حواس کو
ست کر کے فرمایا " اماں ! کچھ اور بھی سنا ۔ الکشن کی تاریخ مقرر ہوگئی ، ۲ تاریخ رکھدی گئی "۔ کلیجہ دھک سے
ہ گیا کہ ابھی تو ہم نے اپنے کام کا نام بھی نہیں لیا تھا اور یہاں تاریخ بھی مقرر ہوگئی ۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ
ں مشکل آٹھ دن سے بھی کم باقی رہ گئے ہیں ۔ بہرحال قہرِ درویش برجانِ درویش یا یوں کہئے کہ " آفتِ الکشن
بانِ کیبنٹ ،، آفتاب صاحب کے کمرے پر پہنچے اور خوشامد کی " کہ بھئی الکشن آگیا ہے ذرا " ورک " کردینا ۔ لیکن
رسن لو پارٹی وارٹی ابھی نہیں دیں گے ۔ جب ہو جائیں گے تو انشاءاللہ نمایش میں بڑی ٹھاٹھ دار دعوت رہیگی "
حضرت چونکہ کافی لمبے واقع ہوئے ہیں اس لئے گول ہو گئے اور لگے باتیں بنانے ۔ فرمایا کہ " تم جانتے ہوا بھئی تو مجکو
رست ملی ہے " حافظ صاحب " ویسے ہی کلاس میں خفا ہوتے رہتے ہیں ۔ میں تمہارا " ورک ارک " کچھ نہیں کرونگا
ں " سالڈ (Solid) " ووٹ دے دونگا " (اردو داں حضرات اس کو یوں سمجھیں کہ " ٹھوس رائے دے دونگا "
تو ہوا لفظی ترجمہ ۔ اب محاورہ میں یوں کہیں گے کہ " صرف تمہیں کو رائے دونگا ") ہم نے کہا " حضور ! ہم کو آپ
کے ووٹ کی ضرورت نہیں ہے ۔ تھوڑا ورک کر دیجئے گا " خیر ان کو کچھ راضی کچھ ناراضی کر کے روانہ ہوئے ۔ انہی
کے کمرے میں ایک صاحب اور رہتے ہیں ۔ ان سے وعدہ لے کر اپنے مخلص و دیرینہ کرم فرما جناب خاں صاحب کے
اسے پر جا دھمکے ۔ (نام لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ خاں صاحب خود سمجھ جائیں گے) آپ ہمارے ہمدم دیرینہ اور
کرم فرما قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں ۔ ان سے یہ مشورہ ہوا کہ کس طرح کے کارڈ چھپوائے جائیں ۔ خاں صاحب
سے گفتگو کر ہی رہے تھے کہ جناب احسن صاحب نمودار ہو گئے ۔ ان سے یہ وعدہ ہوا کہ " پروپوزل میٹنگ " میں
وہ ہم کو " سیکنڈ " کریں گے ۔ ان صاحبان سے رخصت ہو کر سیدھے " اختر پرنٹنگ ورکس " (جہاں پر صرف الکشن
کے زمانے میں رات کو کام ہوا کرتا ہے) پہنچے ۔ اپنے سامنے کارڈ چھپوائے اور لیکر واپس ہوئے اور ہر خدا بھلا کرے

کارکنان یونیورسٹی کا۔ ان کو مذاق سوجھا اور بے کرا گھٹے چار روز کی چھٹی دیدی۔ مت پوچھیے ہمارا کیا حال ہوا۔ کلاس میں ایک کافی تعداد ڈے اسکالر قسم کے صاحبان کی ہوتی ہے۔ کلاس میں ان پر کافی رعب جما کر ووٹ نہایت آسانی سے حاصل ہو سکتے ہیں کمرے پر جانا تو یہ معنی رکھتا ہے کہ پیاسا کنوئیں پر جا رہا ہے۔ اس لیے کوئیں صاحب ذرا خشک واقع ہو جاتے ہیں۔

بہرکیف بقول آپ کے 'ورک شروع ہوا' سو سو کارڈ سب صاحبان کو تقسیم کر دیئے گئے۔ ذرا اکڑ اکڑ کر چلنا بھی شروع ہو گیا کہ لوگوں پر کچھ اثر ہو۔ بڑے لوگوں میں "موو" (move) کرنا شروع کیا۔ انہیں دوستی کے وعدے یاد دلائے گئے۔ "نیو کمرز" (New Comers) پر رعب گانٹھا۔ وغیرہ وغیرہ غرضکہ ہر وہ ممکن تدبیر اختیار کی جس سے ووٹر صاحبان ہم کو بھی ووٹ دیں۔

آپ صاحبان میں سے ۹۹ء۹۹ فی صدی اصحاب نے سینما ضرور دیکھا ہوگا اور یہ بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ آدھا وقت ختم ہونے کے بعد پردے پر موٹے موٹے الفاظ سے 'وقفہ' لکھا ہوا ہوتا ہے اور کچھ دیر کے لیے تماشہ بین حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ سینما ہال یا سینما کی چار دیواری میں ہیں۔ بجنسہ یہی حال امسال ہمارے یہاں کے الکشن کا ہوا۔ اب حضور والا! الکشن کا نوٹس ہوئے دو دن گزر چکے تھے کہ درمیان میں کانووکیشن آ پہنچا۔ بس اب آپ الکشن کو سینما کا فلم مان کر کانووکیشن کو 'وقفہ' تصور فرمالیجئے۔ یعنی دو دن لوگ الکشن کو ایسا بھول گئے کہ گویا 'دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد'۔ لیکن ہمارے لیے "اک آگ سی تھی سینہ کے اندر لگی ہوئی"۔ خدا خدا کر کے کانووکیشن ختم ہوا۔

گورنر کی آمد۔ نمایش کی ابتداء۔ کانووکیشن کا انعقاد۔ ان سب سے ہم کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ یونین کی طرف سے سر میلکم ہیلی کو جو دعوت نامہ دیا گیا تھا اس میں ہم نے ضرور دلچسپی لی۔ یونین میں جس وقت سب لوگ بیٹھ چکے تھے اور ہر شخص اسٹیج پر بیٹھے ہوئے صاحبان پر نظر جمائے ہوئے تھا تو ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے تھے، کہ اگر خدا نے چاہا تو اگلے مہینہ میں ہم بھی اسٹیج پر بیٹھیں گے اور لوگوں کی نگاہیں ہم پر بھی پڑیں گی۔ یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا اب ہمارا صبح سے لے کر شام تک یہ پروگرام تھا کہ کبھی ۶۳ و ۵۶ اور ۳۱ نمبر میں نظر آرہے ہیں تو کبھی یوٹی ہوسٹل میں۔ صبح کو کسی کی خوشامد کر رہے ہیں تو شام کو کسی کے ہاتھ جوڑ رہے ہیں۔ دوپہر میں "منٹو سر" جا رہے ہیں

وہاں پر جو لائف ممبر صاحبان ہیں ان سے اظہارِ حال کریں۔ الغرض حالت یہ تھی کہ "ایک چکر تھا مرے پاؤں میں زنجیر
ں" ایک روز خاں صاحب موصوف کے پاس بیٹھکر اندازہ لگایا گیا کہ کتنے ووٹ ہم کو ملیں گے "ہوسٹل وار" حسب ذیل
تخمینہ ہوا :-

ایس۔ ایس۔ کورٹ۔ (شرقی و غربی)	۷۰
مرحوم کچی بارک و عثمانیہ (تلے اوپر)	۳۰
محسن الملک ہال	۵۰
ڈے اسکالر صاحبان	۴۰
کل میزان	۱۹۰ ط

یونیورسٹی میں کل گیارہ ہوسٹل ہیں اوپر کے میزان سے جو اوسط نکالا تو معلوم ہوا فی ہوسٹل ہمارے حصہ میں سولہ عشاریہ سات ووٹ پڑیں گے۔ چنانچہ ہر بورڈنگ میں آپ کی دعا سے ایک ایک "کنویسنگ ایجنٹ" (Canvassing Agent) عرف "ورکر" صاحبان مقرر ہو گئے۔

شنبہ کا دن تو کانووکیشن کی نظر ہوا۔ خدا خدا کرکے اتوار گزرا اور دوشنبہ صاحب نمودار ہوئے (چونکہ یکشنبہ کے سمجھنے میں حافظہ پر زیادہ زور پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اتوار جو کہ بہت عام فہم ہے استعمال کیا گیا] اس روز رات کو اگرچہ ہم تھیٹر گئے تھے لیکن خلافِ عادت صبح پانچ بجے ہی اُٹھ بیٹھے۔ وضو کیا اور نماز پڑھی (سچ ہے اللہ میاں بھی اڑے وقت میں یاد آتے ہیں) اور گڑگڑا کر دعا مانگی "خدایا۔ انٹر کالج کے الکشن میں ہم فیل ہو چکے ہیں اس مرتبہ تو ہم پر رحم فرما اور ہمیں کیبنٹ بنا دے۔ اگر ہم کیبنٹ ممبر ہو گئے تو انشاء اللہ سلیکٹ کمیٹی میں بجٹ ممبر ہونے کی کوشش کریں گے اور اگر وہاں بھی کامیابی ہو گئی تو اگلے سال کے بجٹ میں ایک مد Item اس قسم کی اضافہ کرائیں گے کہ "کچھ روپیہ غربا اور مساکین کو یونین کی طرف سے تقسیم ہو"۔ اس روز کی نماز میں آدھ گھنٹہ لگا۔ اب جناب سورج نکلنے سے پہلے چاء وغیرہ سے فراغت حاصل کر لی۔ کارڈ نکال کر تیار کئے۔ سو سو کی پانچ گڈیاں الگ لگائیں اور ہر گڈی پر ایک چٹ ہیڈ ورکر کے نام کی رکھدی کہ اگر ہمارے غریب

۱؎ غریب "پرائیویٹ" یہاں پر بھی ستم ظریفی کا شکار رہے۔ کاش آج ہی انہیں حق رائے دہندگی ملتا۔ تاکہ وہ صحیح معنی میں "ٹھیک" ہو جاتے۔ داؤدی

میں کوئی صاحب تشریف لائیں تو بغیر تلاشی کے اٹھا لیے جائیں۔ اور خود "کلاک ٹاور" کی آواز پر کان لگا کر
سے گئے کہ دیکھیں تو کب بجتے ہیں۔ نو بھی جناب اس روز بڑی دیر میں یعنی کوئی گیارہ بارہ بجے کے قریب بجے کئی مرتبہ
یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ کہیں کلاک ٹاور بند یا سست تو نہیں ہو گیا ہے کیونکہ یہ غریب مرحوم بیک صاحب
عمر کا ہے۔ اب سنا ہے کہ (Observatory) کے سلسلہ میں یہ اور اوپر اٹھائے جائیں گے۔ یونیورسٹی کے
میں جو صاحبان رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہاں پر ہر گھنٹہ کی کئی جگہ سے آواز آتی ہے۔ ایک جیل کے گھنٹہ کی آ
ہوتی ہے۔ ایک کلکٹری سے آتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس روز اتفاق سے کہیں سے بھی آواز نہ آئی اور ہم بیٹھے
جھلا رہے تھے اور دانت پیس پیس کر رہ جاتے تھے اور بار بار یہی کہتے "واللہ اگر کورٹ کی میٹنگ آج ہوتی تو
بغیر استخارہ اندر چلے جاتے۔ اور بآوازِ دُہل یہ فرماتے " الا یا ایھا الحاضرین ! اما بعد وا
ہے آپ سب بزرگوں پر اس بات کی کوشش کرنا کہ یہ سامنے والا یونیورسٹی کا کلاک ٹاور ٹھیک ہو جائے ا
ہمیشہ یہ نو نو ہی بجے بجایا کرے۔ آج ہم کو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس کلاک ٹاور میں نو پونے دس بجے
بجیں گے اور چونکہ یونیورسٹی کا کام اسی ٹاور کے "ماتحت" کیا جاتا ہے۔ لہذا ہمارا الکشن بھی دیر میں شروع ہوگا
جس کا وقت نو بجے رکھا گیا تھا اس لیے الا یا ساکن القصر المعلیٰ قسم دیتے ہیں ہم آپ کو اس ہری "گون" کی جو
آپ بزرگان پہنے ہوئے ہیں اور جس پر ایک سفید تپلی گوٹ لگی ہوئی ہے کہ آپ سب بزرگان اس معاملہ میں ہمارا
ہاتھ بٹائیں اور اس منحوس کلاک ٹاور کو درست کرا دیں"۔ ہم اپنے دل میں اسی پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ ٹن
ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ ٹن۔ کی آواز آئی اور ہم خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ کوٹ تو پہلے ہی سے پہنے بیٹھے
تھے کچھ کارڈ جیب میں ڈال اور کچھ ہاتھ میں لے کر باہر آئے دریافت پر معلوم ہوا کہ ابھی تو صرف آٹھ بجے ہیں۔
نہ پوچھیے اس وقت کیا حال ہوا۔ بس یہی جی میں آتا تھا کہ کوئی بھلے بھائی ہماری مدد کریں اور ہم خود اوپر جا کر نو بجا
آئیں۔ بھلے کو "مجید صاحب" اس وقت سامنے نہ پڑے ورنہ ہم ان سے یہی کہتے کہ "بھئی آپ کا بھی فائدہ ہی ذرا
مدد کیجیے تو ابھی نو بجے جاتے ہیں"۔

حضرات کہاں تک رونا روئیں۔ بارے خدا خدا کرکے نو بجے۔ الکشن کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ "بھئی ہمیں
ووٹ دو"۔ "اماں انھیں ووٹ دو"۔ "نمبر ۱۲ کو ووٹ دو۔ نمبر ۳ بہت "ڈیزروِنگ" ہے"۔ "بسمل کا خیال رکھنا"۔ وغیرہ
[illegible]

ہ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں کچھ لوگ ہمارا ابھی نمبر پکار رہے تھے۔ لائبریری والے "جلیل صاحب" اس
زبہت مفید ثابت ہوئے۔ انھوں نے وہی لائبریری کی منہ والی Hutting(^{له}) جمائی۔ اور یار لوگوں کو پیچھے
یا یونین والوں کو ان کا بہت ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ ہمارے ذمہ ہمارے ورکر صاحبان نے یہ کام
رکوں پر سے ہم ووٹر صاحبان کو پکڑ پکڑ لاتے اور دور ہی سے یہ کہتے ہوئے آتے "لینا ان کو کوئی ہاتھ
گے۔ یہ ہمارے --- مسلم ہیں" بہزار دقت و دشواری ان کو اندر بھیجا جاتا وہاں سے وہ صاحب ووٹ دیکر
تے تو ہم ان سے دریافت کرتے تو ان میں سے ۵۰ فی صدی ایسے بزرگ نکلے جو ہم کو ووٹ دینا بھول گئے اور فرماتے
ارے یار۔ لاحول ولا قوۃ دماغ پر بہت زور دیا۔ مگر تمہارا نمبر ہی یاد نہیں آیا" ان حضرات کی اس حرکت پر ہم کو
حوم شاعر کا یہ مصرعہ یاد آتا "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا"
المختصر ساڑھے پانچ بجے شام تک یہی ہنگامہ برپا رہا۔ اس کے بعد پھر کچھ دیر کے لیے سکون نصیب ہوا۔ چار
یر دینے کے بعد نتیجہ علوم کرنے کی دھن سوار ہوئی اور پھر پہنچے یونین کچھ من چلے ہم سے بھی پہلے وہاں موجود تھے
وٹوں کا شمار اوپر والے کمرہ میں ہو رہا تھا۔ ہمارے ماسبق نیچے سے کان لگا کر سن رہے تھے۔ ہم کوئی ترکیب
وچی۔ "انڈور گیم" (Indoor Games) والے کمرہ کے پاس والے زینے پر پہنچے۔ وائس پریسیڈنٹ نمبر۲ سکریٹری
بر۔ لائبریرین نمبر ا کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کیبنٹ کا نام جب آتا تھا تو ہم "احتیاطاً" اپنا کلیجہ تھام لیتے تھے۔ تھوڑی
یر کے بعد ہم نے لوگوں کو آکر یہ سندیسہ دیا "صاف صاف سن لو۔ ہم لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ ہمارے سننے کے حساب
سے تو نمبر۲ وائس پریسیڈنٹ۔ نمبر ا سکریٹری اور نمبر ا۔ لائبریرین ہو رہے ہیں" کچھ لوگ تو خوش ہو گئے اور کچھ جن کھلے
جھاگئے" ایک صاحب ان میں ایسے بھی تھے جن کی نگاہ بار بار اوپر کھڑکیوں پر جا رہی تھی۔ دریافت پر معلوم ہوا
ان کے ایک نمایندے نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کا (Candidate^{ته}) ہوا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر
سگریٹ پئیں گے کئی بار ایسا ہوا کہ بجلی کی روشنی کا عکس کھڑکی پر ایسا پڑا جیسے کوئی دیا سلائی جلاتا ہو۔ اس لئے ان
صاحب کو بہت مغالطہ ہوا کیونکہ "اللہ بھی مجنوں کو لیلیٰ نظر آتا ہے"۔ اور خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے۔ خدا
کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ نہ ہوئے [احسن صاحب معاف فرمائیں]
ٹھیک پونے دس بجے الٰہی بخش نے گھنٹی بجائی۔ اور یاران طریقت ہال میں جمع ہونا شروع ہوئے۔ ہم

له شان۔ رعب دم)۔ ته اُمیدوار۔

فی پیچی بیچوں پر دبلے لڑ بیٹھ گئے۔ وائس پریسیڈنٹ صاحب نمودار ہوئے اور انھوں نے گیلری میں سے کھڑے
ہو کر اس طرح نتیجہ سنایا کہ گویا وہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے (اور خدا کرے وہ آیندہ ہوں۔ آمین اور ہم
سب پر دخاکم بدہن) عبور دریائے شور کا حکم لگایا جانے والا تھا نتیجہ جو انھوں نے سنایا وہ سب کو معلوم ہے۔
اس کے دہرانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ مختصر یہ کہ ہم منتخب نہیں کیے گئے اور بعد میں ہم یہ کہتے سے گئے
'اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'

نوٹ:۔ ہمارے منتخب نہ ہونے میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ بلکہ اس سے ممبران یونین کی بد مذاقی کا ثبوت
ملتا ہے۔ کمرے پر پہنچکر ہم نے بہت لوگوں سے یہ بھی کہا "چلو اچھا ہوا۔ ہم نہ ہوئے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوتا کیونکہ
ہم نے آنرز کورس لینا ہے۔" (اس آخری فقرہ کی تصحیح میں اگر کسی صاحب کو کچھ شبہ ہو تو براہِ کرم حکیم یوسف صاحب
اڈیٹر نیرنگ خیال۔ کوٹھی سکندر خاں نزد بارود خانہ لاہور یا حافظ محمد عالم عفی عنہ اڈیٹر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور سے
خط و کتابت کریں)

چلتے چلاتے ایک بات اور بھی آپ سے کہنا ہے کہ امسال تو ہم آپ کی دعا سے ناکام رہے۔ لیکن اگلے سال
نیت شب/روز (جس وقت مضمون ہذا پڑھا جائے وہ لفظ رہنے دیا جائے۔ دوسرا کاٹ دیا جائے) بخیر ہم ——— کے
لیے کھڑے ہوں گے۔ آپ ہم کو اپنا ووٹ دیجئے گا۔ دیجئے گا نا؟ اچھا "تھینک یو"۔

سلسلہ (۸)　　　　شمارہ (۱و۲و۳)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی اور ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مُدیر:- محمد ممتاز احمد بسملؔ- بی اے (علیگ)

طابع وناشر:- اشفاق محمد

مقام طبع ونشر:- علی گڑھ پرنٹنگ ورکس علی گڑھ

مجلسِ عاملہ علی گڑھ میگزین

سنئیر چیرمین

خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) بی اے آنرز (آکسن)

مُدیر

محمد ممتاز احمد بسمل بی اے (علیگ)

فہرستِ مضامین

تصاویر

(۱) حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ (۲) سلطان جہاں منزل

(۳) [illegible] مرحوم [illegible] (۴) سابق مدیران میگزین

یادِ رفتگاں

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نامِ نیکت برقرار

اعلیٰ حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ سابق فرماں روائے بھوپال

خدا معلوم قوم کی کشتی کب تک گردابِ بلا میں محصور رہے گی اور مصائب و آفات کی سرکش موجیں کب تک اس کو ساحلِ مراد سے آشنا نہ ہونے دیں گی۔ اس پُرآشوب زمانے میں جب قوم کے سر پر ادبار کی [illegible] رہی ہیں، قوم کے اُن برگزیدہ افراد کی شمعِ حیات جو بچھڑی ہوئی عظمت اور روٹھے ہوئے اقبال کا [illegible] نہیں نظر کر سکتی تھی آئے دن بادِ حوادث کے تیز و تند جھونکوں سے گُل ہوتی جارہی ہے۔

[illegible] حضرت مرحومہ کی وفات ایک برق تھی جو قوم کے خرمنِ آرزو کو خاک سیاہ کر گئی۔ ایسے نازک وقت [illegible] بیدار مغز، دردمند اور مصلحِ قوم والیۂ ملک کی دائمی مفارقت مسلمانوں کے لیے وہ صدمۂ جانسوز ہے [illegible] سے جذباتِ غم ہمیشہ مشتعل رہیں گے۔ حکومتِ ہند، والیانِ ریاست اور ملک کے امرا و غربا سب کے سب [illegible] مذہبی امتیاز کے بغیر اس سانحۂ الم سے متاثر ہوئے۔ مختلف رسائل اور جرائد حسبِ ظرف اپنے اپنے ادارتی کالم سیاہ پوش کر چکے اور مختلف علمی اور سیاسی انجمنیں حسبِ مقدرت صفِ ماتم بچھا چکیں۔ علیا حضرت [illegible] اُن تمام منتخبہ صفات کا مظہر تھیں جو قوم و ملت کے ممتاز اور سر برآوردہ افراد میں پائی جا سکتی ہیں۔ شذرات [illegible] اس وقت مرحومہ کی زندگی کے مختلف محاسن کی توضیح و تفصیل محض رسمی تقلید سمجھی جائیں گی کیونکہ [illegible] سے میگزین کی اشاعت میں خلافِ توقع تاخیر ہو چکی، اور ملک کے تمام ادبی رسالے زمانہ ہوا اس فرض کی ادائیگی [illegible] حاصل کر چکے۔ اس کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر جناب ذکر تا فیاض صاحب کا سرکارِ عالیہ کی حیات پر

ایک مفصل مضمون اسی نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔

مرے نہ رونے سے یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوشِ رشک دل میں
یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایتِ ظرفِ آستیں ہے

مسلم یونیورسٹی سے بیگم صاحبہ مرحومہ کو جو مخصوص دلچسپی رہی ہے، وہ محتاجِ وضاحت نہیں
علیا حضرت ابتدائے قیام یونیورسٹی سے اس کی چانسلر رہیں۔ اس کی اصلاح و ترقی میں
دامے، درمے، سخنے، قدمے، اُنھوں نے جس شاہانہ بخشش اور فیاضانہ اعانت سے کام لیا وہ یونیورسٹی
کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھی جائیں گی، اور قوم کی گردن اُن کے احسانات کے بار سے ہمیشہ
خم رہے گی۔

یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع کے خلوصِ جذبات سے
لبریز، اور حقیقت میں ڈوبے ہوئے کلمات اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ جناب موصوف نے
دورانِ تقریر میں فرمایا تھا کہ ہماری یونیورسٹی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کی چانسلر ایک والیہ ملک
روشن ضمیر، معاملہ فہم، وربیدار مغز خاتون ہے، اور دنیا کی کوئی یونیورسٹی اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔
افسوس قضا و قدر نے آج ہم سے یہ طرۂ امتیاز چھین لیا۔

آخر میں ہم مرحومہ کے پیارے فرزند، علیگ برادری کے ممتاز ترین رکن ہز ہائینس حاجی نواب
سر حمید اللہ خاں بہادر دام اقبالہٗ فرماں روائے حال کی خدمتِ گرامی میں میگزین کی طرف سے پر درد
اظہارِ تعزیت کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ مولیٰ تعالیٰ بیگم صاحبہ مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں خطیرۂ قدس
عطا فرمائے، اسی کے ساتھ ہمیں کامل وثوق ہے کہ جواں ہمت، جواں بخت نوجواں سال فرماں روا ہر شعبۂ
حیات میں اپنی قابلِ تقلید مادرِ بزرگوار کا سچا پیرو ثابت ہوگا۔

مسٹر ای۔ اے ہارن آنجہانی

رحمت اللہ تحقیقاتی کمیشن کے بعد مسلم یونیورسٹی کی گرد آلود
فضا صاف ہو چلی تھی، اور نواب مسعود یار جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود
اور مسٹر ہارن کی متحدہ کوششوں کی بدولت ہماری درس گاہ عظمتِ دیرینہ سے ہم آغوش ہونے لگی تھی مگر افسوس

آج مسٹر ہارن کی مرگِ ناگہانی اپنی آئندہ آرزوؤں اور امیدوں کا ماتم کر رہی ہے۔

مسٹر ہارن انگلستان کی اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۱۱ء میں ہندوستان تشریف لائے اور صوبہ بہار و اڑیسہ کے محکمۂ تعلیمات میں ملازمت کے فرائض انجام دینے لگے۔ آپ پٹنہ کالج کے پرنسپل تھے اور آپ کی شخصیت تعلیمی حلقوں میں امتیاز حاصل کر چکی تھی۔ ستمبر ۱۹۲۹ء میں نواب مسعود جنگ کی رفاقت کا عملی ثبوت دینے کو مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری منظور کر لی۔ مرحوم کے تعلیمی اور انتظامی محاسن اور کمالات، انس و محبت، خلوص و ایثار، صداقت اور بے ریا کاوشوں سے طلبائے جامعہ اور قوم دونوں اس قدر جلد اور تھوڑے عرصہ میں مانوس اور آشنا ہو گئے تھے جس کی مثال مشکل سے ملے گی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر ہارن کے کالبدِ خاکی میں بیک مرحوم کی روح سرگرم عمل ہے۔

تعطیل کے بعد مسٹر ہارن شملہ تشریف لے گئے تھے۔ مئی میں نئے تقررات کے سلسلہ میں اور یونیورسٹی کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کی غرض سے علیگڑھ واپس آئے۔ جون کی قیامت خیز دھوپ اور شرر انگیز لوؤں کی لپٹ۔ ایسے میں ان کا علی گڑھ میں قیام۔ غیر معمولی انہماک۔ تعمیرات کی ذاتی نگرانی اور احاطۂ یونیورسٹی کا بے وقت طواف۔ یہ سب ایسے واقعات ہیں جو آپ کی علی گڑھ سے دلچسپی اور محبت کی زندہ یادگار رکھے جا سکتے ہیں۔ جون کی سموم آمیز ہوا اور گرم موسم میں آپ کا علی گڑھ میں قیام شیشہ و سنگ کا منظر پیش نظر کر گیا، اور آپ چند دن بخار میں مبتلا رہ کر ۲ جون کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مسٹر ہارن کی خلاف توقع موت مسلمانانِ ہند کے لئے قومی حادثہ ہے۔ ان کی دائمی مفارقت سے قوم کی آئندہ امیدوں پر جو اوس پڑ گئی ہے وہ نہ صرف جسم تر بلکہ ہمارا دل جانتا ہے کاش زمانہ جلد ہماری جامعہ کے اس نقصانِ عظیم کی تلافی کر سکے۔

ہز ہائنس نواب سید سر حامد علی خاں صاحب بہادر فردوس مکانی والیٔ رامپور

ہمارے آنسو ابھی خشک نہ ہونے پائے تھے کہ ہز ہائنس نواب صاحب رامپور بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ نواب صاحب مرحوم بعارضۂ فالج عرصہ تک بیمار رہے۔ اور ۳۰ر جون ۳۰ء کی شب کو اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے

نواب صاحب فردوس مکانی کو دولتِ برطانیہ کی نظروں میں جو عزت حاصل تھی اور جس حسنِ تدبر اور خوبیٔ انتظام سے

ریاست شاہراہِ ترقی پر گامزن تھی وہ اظہر من الشمس ہے۔ ریاست اور ہماری درس گاہ میں قدیم سے جو تعلقات رہے ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہماری یونیورسٹی یونین کا "رام پور حامد ہال" مرحوم کی شاہانہ فیاضیوں کی زندہ یادگار ہے اور کیوں نہ ہو، یہ وہ یادگار ہے جس کی چہار دیواریوں کے اندر علم و سیاست اور تاریخ و ادب کے معرکہ آرا مباحثے اور مباحثے مشاغلِ علمی کی رنگینیوں کو ہمیشہ بے نقاب کرتے رہتے ہیں اور جس کے لب فرش و بالا... منظر ملکی اور غیر ملکی مایۂ ناز ہستیوں کی جلوہ آرائیوں سے ہم ضیا افگن اور گل بدامن رہتے ہیں۔

میگزین کی جانب سے ہم بھی بہ خلوص تمام شاہی صفِ ماتم میں شریک ہو کر کچھ اشکہائے غم نذر کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوندِ کریم والیٔ مرحوم کو اورنگِ رحمت عطا فرمائے۔ آمین

ارتحالِ پُرملال کا سلسلۂ دراز

ہز ہائنس نواب صاحب ٹونک، ڈاکٹر ناصر ... (سابق پروفیسر ... کالج) اور سید حیدر حسن بی۔ اے کنٹب بار ایٹ لا ... رہگزائے ملک عدم ہو جانا ہمارے لئے بس قدر جانکاہ ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ... کو اس جامعہ سے جو دلچسپیاں رہی ہیں اُن کے تذکرے زبانوں پر ہیں جن کی ... نہیں۔ میگزین کی دعا ہے کہ خدا ان بزرگوں کی مغفرت کرے۔ ہم بخلوص ان کے پس ماندوں کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں۔

عزیز الرحمٰن جعفری

"ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد"

عزیز مرحوم پٹنہ کے ایک مقتدر خاندان کے ایک ہونہار رُکن اور یونیورسٹی کے ایک سنجیدہ، خوش مذاق اور زندہ دل طالب علم تھے۔ مرحوم تعطیل کے بعد مکان چلے گئے تھے مگر افسوس کیا خبر تھی کہ ان کو واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔ تھرڈ ایر کے امتحان میں ترقی میں کامیاب ہو چکے تھے۔ یہ مژدہ اُن کے کانوں تک پہنچ چکا تھا اور آئندہ آرزوئیں اُن کے دل میں نشو و نما پانے لگی تھیں کہ ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء کو دو دن بیمار رہ کر موت کی آغوش میں مصروفِ خواب ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خدا تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندوں کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

ہدیۂ مبارکباد

عید آمد از خلدِ بریں شد تحفہ روئے زمیں

ہاں ماہِ نو طغراش بین امروز بر کار آمدہ

ریاست رامپور اور ہماری جامعہ کے درمیان جو کچھ بھی تعلقات ہیں وہ اپنی قدامت اور لطافتِ خصوصیت کی نوعیت کے اعتبار سے وضاحت طلب نہیں۔ میگزین چونکہ ہماری جامعہ کا ایک مقتدر جزو اور طلباء جامعہ کے جذبات کا واحد ترجمان ہے اس لیئے اس کا فرض ہے کہ وہ ریاستِ مذکورہ کے بزم و شادی میں شریک ہو کر اتحادِ قدیم کا حق ادا کرتا ہے۔

ہم بہ خلوصِ تمام میگزین کی طرف سے ہز ہائینس ہیجر سید رضا علی خاں موجودہ سریرآرائے اورنگِ رامپور کی مسند نشینی پر اظہارِ مسرت کرتے ہیں اور خدمتِ شاہانہ میں گلدستۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اُمیدیں اغلب ہیں کہ ہماری جامعہ کا موجودہ رامپور حامد ہال جو آج اپنی تنگیٔ دامن سے تشنگیٔ نظر ہے کل ہی شاہانہ فیاضیوں کے تصرّف سے اس درجہ گلزار بداماں ہو جائے کہ گلچینوں کے لیے مرکزِ حسن وانبساط کہا جا سکے۔

در جہاں ملک جاودانت باد

خود چنیں ملک جاودان باشد

جلد ۸	اشاعت جون تا اگست سنہ ۱۹۳ء	غبر ۱۔۲۔۳

شذرات

روایاتِ قدیمہ علی گڑھ میگزین کی ادبی شان روایاتِ قدیمہ کا احترام ہے۔ میگزین اپنی تلوّن مزاجی کی وجہ سے ملک کے دیگر ادبی رسائل کی صف میں چند نمایاں خصوصیات کی علم برداری کرتا رہا ہے۔ ہر نیا سال عملۂ ادارت کی نئی بساط بچھا دیتا ہے جس پر ادبی مہرے اپنی شطرنجی چالوں سے علمی معرکہ آرائیوں کے مختلف نقشے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اسی آئینِ تغیر کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے پیش رو جناب زکریا فیاضی صاحب بھی اسکی محفلِ ادارت سے "خدا حافظ" کہکر اُٹھ گئے، اور جمہور بہت

ایس (لندن) کافی عرصے تک اس کے معتبر چیرمین رہے۔ ان کے بعد مکرمی خواجہ غلام السیدین [illegible]
ایم۔ ای۔ ڈی (لیڈز) اس کی صدارت فرماتے رہے اور بسا اوقات اپنے گراں بہا رشحات قلم [illegible]
تخیلات سے میگزین کے وقار کو رشک آفریں بناتے رہے۔

تعطیلِ کلاں کے بعد جب جامعہ کے مایۂ ناز فرزند اور اردو دنیا کے نامور ادیب خواجہ منظور [illegible]
ایم۔ اے (علیگ) بی۔ اے (آکسن) سابق مدیر میگزین شعبۂ انگریزی [illegible] مقرر ہو کر علی گڑھ [illegible]
سیدین صاحب نے اپنی رفاقتِ قدیمہ کے جوش میں اور میگزین سے منظور صاحب کے [illegible]
ہوئے اس کی صدارت کا سہرا منظور صاحب کے سر باندھ دیا۔

میگزین آج بجا طور پر نازاں ہے کہ اس کا صدر [illegible] جو [illegible]
کلیۂ آشنا ہے اور اس کی امیدیں پھر اسی کے دامن سے وابستہ ہو گئی ہیں جو کبھی کسی دور [illegible]
اس کی غمخواری کر چکا ہے۔

میگزین دونوں خواجگانِ ادب کی خدمات میں گلہائے نیاز پیش کرتا ہے اور [illegible]
داد و دہش کا متمنی ہے۔

امتحان کے نتائج

مختلف حلقوں میں یونیورسٹی کے امتحانات کے متعلق یہ عام شکایت [illegible] غیر معمولی سختی برتی گئی۔ معلمین اور متعلمین بھی اس خیال کی ہمنوائی [illegible]
اس نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ اس سال داخلہ میں جو تخفیف رونما ہوئی اس کی تمام [illegible] نتائج [illegible]
اتنے بلند معیار اور خلاف توقع سختی کے باوجود کئی طلبا امتیازی خصوصیت کے ساتھ مختلف امتحانات [illegible]
کامیاب رہے۔ ہم اُن تمام طلبا کو جو سال بھر کی دماغ سوزی اور انتھک کوششوں کے بعد [illegible] میدان
میں فتح و ظفر کا پرچم بلند کر گئے گلدستۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور یقین کے ساتھ اس کی امید کرتے ہیں کہ
یہ مایۂ ناز نونہالانِ جامعہ آیندہ کارزارِ حیات میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس مادرِ علمی کو
فراموش نہ کریں گے۔ اور جامعہ کے ساتھ اپنے تعلیمی رشتہ کو عملی اتحاد سے زیادہ اُستوار بنانے کی کوشش
فرمائیں گے۔

آخر میں ہم اُن طلباء کے ساتھ جو حُسنِ اتفاق کی ستم ظریفیوں کے سبب اور واقعات کی نامساعدت کے باعث حصولِ مراد میں ناکامیاب رہے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ صبر و استقلال سے پھر اپنے کامگار مستقبل سے جلد ہم آغوش ہونے کی سعی فرمائیں گے۔

ڈاکٹر سید راس مسعود

نواب مسعود یار جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود کی ذات علی گڑھ کے لیے جس قدر بھی مایۂ ناز سمجھی جائے اس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ سر سید مرحوم کے نقشِ ثانی ہونے کی حیثیت سے ان کی جیتی جاگتی تصویر سے علی گڑھ کی جو اُمیدیں وابستہ ہیں اور جناب موصوف کی رگ و پے میں قوم، جامعہ یعنی چمنستانِ سید کی محبت کا خون جس حدت اور سرعت کے ساتھ موجزن ہے اس کا اندازہ ان کے مخلص احباب ہی کر سکتے ہیں۔ قوم اور طلباء کے جوش و انبساط کے خوشگوار مناظر اب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ نواب مسعود یار جنگ کا حیدر آباد کا مبارک سفر اور نظام الملک شہر یار دکن کے شاہانہ عطیہ اس جامعہ کے شاندار مستقبل اور آئندہ عظمت کا پیش خیمہ سمجھے جا سکتے ہیں۔

نواب مسعود یار جنگ جب وائس چانسلر منتخب ہوئے اور انھیں اس امر کی اطلاع ملی تو وہ اپنے معالجوں کے خلاف اور صحت کُلی نہ ہونے کے باوجود قوم کے بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے یورپ سے ہندوستان تشریف لائے اور اپنے قیام کے تھوڑے عرصہ میں جس تندہی اور خلوص و انہماک سے اس جامعہ کی خدمات انجام دیں اس کا اثر جو کچھ بھی ان کی صحت پر ہوا وہ ہر شخص کی نظر کے سامنے ہے۔

اپریل میں موصوف کی صحت اس درجہ غیر قابلِ اطمینان ہو چکی تھی کہ ڈاکٹروں کے مشوروں سے انھیں پھر عازمِ یورپ ہونا پڑا۔ صحت کی خرابی، جامعہ کے تفکرات، چانسلر کی رحلت اور ایک عزیز دوست مسٹر ای لے ارن پرو وائس چانسلر کی وفات، یہ تمام واقعات مل ملا کر ہمارے عزیز اور مقتدر وائس چانسلر کے لیے جس قدر سوہانِ روح ثابت ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ خود اُن کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

ہم اُن کی صحت و حصولِ مقاصد کے لیے دست بدعا ہیں۔

سر محمد سلیمان

قوم کی غایت خوش نصیبی یہ ہے کہ اس میں اب تک کچھ افراد ایسے ہیں جو آڑے وقتوں میں خلوص و محبت کا ثبوت دینے کے لیئے پیش پیش نظر آجاتے ہیں۔ ہماری جامعہ کے لیئے کچھ دن ایسے حوصلہ شکن گزرے ہیں جن کی مثال مشکل سے مل سکے گی۔ وائس چانسلر کی عدم موجودگی، چانسلر کی مفارقت، پرو وائس چانسلر کی موت، جامعہ کیا تھی منجدھار میں ایک کشتی جس میں نہ ناخدا تھا نہ کوئی ساحل آشنا۔ موج اور ہوا کے رحم و کرم پر بیگانۂ مراد چلی جا رہی تھی۔ ایسے وقت میں ایک ساحل آشنا اور خیراندیش ناخدا کا اس کی امداد کو، گو عارضی سہی آپہنچنا خدا ساز بات ہی۔

آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ سر محمد سلیمان کا جامعہ کی عارضی وائس چانسلری منظور فرمالینا اس امر کی بین دلیل ہے کہ انھیں نواب مسعود یار جنگ سے کس درجہ ذاتی محبت اور خلوص ہے۔ اس کس مپرسی کی حالت میں جسٹس موصوف کا نواب مسعود یار جنگ کی واپسی تک جامعہ کی ساری ذمہ داریوں کو اپنے سر لے لینے سے یہ ہوا کہ بہت سے تلخ اور ناگوار واقعات کو جو ایسے وقت میں منظرِ عام پر آجاتے ہیں سر اٹھانے کا موقعہ نہ ملا۔ ہم میگزین کی طرف سے جسٹس موصوف کا بدل شکریہ ادا کرتے ہیں۔

مسٹر ہنری مارٹن

مسٹر ای۔ اے ہارن کی وفات کے بعد قوم کے سامنے یہ اہم مسئلہ تھا کہ آنجہانی کی جانشینی کا اہل کون ہوسکتا ہی؟ گو یہ مسئلہ نواب مسعود یار جنگ کی عدم موجودگی کی وجہ سے مستقل طور پر طے نہیں ہوسکا لیکن ہواخواہانِ جامعہ نے مسٹر ہنری مارٹن ایم۔ اے۔ بی۔ ای۔ پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور کو پرو وائس چانسلری کی ذمہ داریوں کا اہل سمجھا اور ۳۰ر نومبر تک کے لیئے (جس کی توسیع جنوری ۱۹۳۱ء تک ہوگئی ہے) اُن کا عارضی تقرر عمل میں آیا۔ مسٹر مارٹن دس سال سے اسلامیہ کالج پشاور کے پرنسپل تھے اور اس سے پہلے اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے۔ یہ واقعات ہمارے اطمینان کے لیے کافی ہیں کہ وہ مسلمانوں کی ضروریات، اُن کی اقتصادی اور مالی حالات کا بغور مطالعہ فرما چکے ہیں، اور اُن کی روایات اور احساسات سے بدرجۂ اتم آشنا ہو چکے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں وسیع النظری سے کام لیں گے اور مسلمانوں کے مطالبات کو پیش نظر رکھ کر ان کی کامیابی کے لیئے کوشاں رہیں گے۔ یونیورسٹی ایک قومی امانت ہے اور وہ اس کے امین مقرر کیئے گئے ہیں۔

ش

اوور ہالنگ کمیٹی

اوور ہالنگ کمیٹی کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے سے مختلف شعبوں میں اساتذہ کی کئی جگہیں خالی ہوگئیں۔ اُن کے پُر کرنے کا کام تقریباً ختم ہوچکا۔ ریاضی، تاریخ، فلسفہ، انگریزی ادب، طبعیات وغیرہ میں قابل اساتذہ کا تقرر ہوچکا۔ شعبۂ کیمیا میں ڈاکٹر ہنٹر کا تقرر عمل میں آچکا ہے۔ ڈاکٹر عبیدالرحمن صاحب بھی شعبۂ جغرافیہ کے چیرمین ہو کر علی گڑھ تشریف لے آئے ہیں۔

ہم ان تمام ماہرینِ فن کی خدمات میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ اس جامعہ کی خدمت میں غایت خلوص و محبت اور انتہائی ہمدردانہ کاوش کو اپنا نصب العین سمجھیں گے اور وہ دن دور نہیں کہ ان کی موجودگی ہماری جامعہ کی عظمت و شہرت کا باعث ہوگی۔

ہمیں اُمید ہے کہ جو جگہیں خالی رہ گئی ہیں وہ جلد تر بہتر سے بہتر اربابِ علم و فن سے پُر کر دی جائیں گی۔

انگریزی کے علاوہ دیگر زبانیں

ہماری یونیورسٹی کے طلباء جو اعلیٰ تعلیم کے لیے عازمِ یورپ ہوجاتے ہیں انکو دوسری دقتوں کے ساتھ ساتھ پہلی اور بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ وہ یورپ کی دیگر مروجہ زبانوں سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہیں کافی وقت اور زرِ کثیر صرف کرنا پڑتا ہے۔

ہمارے محترم بزرگ جناب رشید احمد صاحب صدیقی "سہیل" میں اراکینِ جامعہ اور قوم کی توجہ کو اس کمی کی تلافی کے لیے عرصہ ہوا دعوت دے چکے ہیں مگر افسوس اب تک کوئی خاطر خواہ صورت اس کی پیدا نہ ہوسکی۔ گو ڈاکٹر ایف۔ کرنکاؤ صاحب عارضی طور پر فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے درس دیتے رہے مگر اسکی اہمیت اس بات کی مقتضی ہے کہ کم سے کم فرانسیسی اور جرمن زبانوں کو نصاب میں داخل کرکے اور مضامین کے ساتھ ساتھ طلباء کو حقِ انتخاب دیا جائے تاکہ وہ آئندہ دشواریوں کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہوجائیں۔ اور تاریخ و ادب، فلسفہ و سائنس کے بہترین جواہر پارے جو یورپ کی انہی چند زبانوں میں محفوظ ہیں اُن کو کامیابی اور آسانی کے ساتھ حاصل کرسکیں۔

اُمید ہے کہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد اس کی طرف توجہ فرمائیں گے اور کم از کم فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی تعلیم و تدریس کا مستقل اور خاطر خواہ انتظام کرسکیں گے۔

نئے طلبا سے گزارش

ممکن نہیں بلکہ اغلب ہے کہ وہ نئے طلبا، جو علی گڑھ کو اپنے لیے ایک نئی فضا سمجھتے تھوڑی دیر کے لیے طبعی اُلجھن کا شکار ہو رہے ہوں مگر ہم یقین دلاتے ہیں [illegible] درسگاہ کے ماحول سے اور اس کی رسوم و روایات سے مانوس و روشناس ہونے میں وہ جس قدر جلد [illegible] کام لیں گے اُتنی ہی زیادہ اُنھیں دماغی تفریح اور دلی مسرت حاصل ہوگی۔ انسان کا خاصہ ہے کہ وہ [illegible] وعادات سے علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے جھجکتا ہے مگر یہ واضح رہے کہ ہر سوسائٹی کے کچھ اپنے اصول [illegible] اصولوں کا پابند رہ کے آزاد رہنا صحیح آزادی ہے۔

ہماری جامعہ کی رسوم و روایات میں ایک یہ بھی ہے کہ محض قمیص یا جاموں میں دار الاقامہ [illegible] سے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں افسوس ہوتا ہے جب ہم کچھ طلبا کو خانگی اور بے تکلفانہ وضع [illegible] قمیص اور پاجامے یا شلوار اور یا زیادہ سے زیادہ شارٹ کوٹ زیبِ تن کئے شاہراہِ عام پر بھی [illegible] دیکھتے ہیں۔

ممکن ہے یہ اُن کی روایاتِ جامعہ کی لاعلمی کا نتیجہ ہو۔ ہم جامعہ کے پُرانے اور ذمہ دار [illegible] سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ مناسب طریق پر اپنی ذمہ دارانہ طرزِ عمل سے اپنی ٹولیوں کے [illegible] کے لئے مناسب اور مفید تمثیلیں پیش کرتے رہیں۔

ممبرانِ کورٹ کا جدید انتخاب

امسال مندرجۂ ذیل حضرات یونیورسٹی کورٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں

(۱) سیٹھ یعقوب حسن صاحب
(۲) حاجی سیٹھ سر محمد اسمٰعیل
(۳) نواب زادہ کیپٹن سعید الظفر خاں
(۴) مولوی سراج احمد صاحب
(۵) سیٹھ عبد الکریم صاحب
(۶) نواب صدر یار جنگ بہادر
(۷) مسٹر ایم۔ اے جناح
(۸) سردار سلطان احمد خاں صاحب
(۹) نواب سالار جنگ بہادر
(۱۰) سر فضل بھائی کریم بھائی

مضامین

آسیا | یہ دنیائے ادب کے مشہور روسی افسانہ نگار "ٹرگنیف" کے افسانہ سے ماخوذ ہے۔ مکرمی خواجہ [illegible] نے اس فسانے کو اپنے مخصوص انداز میں سپردِ قلم فرماکر اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ روسی [illegible] دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی روسی افسانے جن رغبتوں اور دلچسپیوں کے ساتھ منقول کیئے جا رہے ہیں یہ ان کی مقبولیتِ عامہ کی زندہ یادگاریں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو کے شیدائیوں کو اس فسانے میں اکثر انوکھے انداز اور روسی تخیل کی بیگانگی سے دوچار ہونا پڑے گا مگر بتدریج اُن کی دلچسپیاں اپنے کو اس ماحول سے خود مانوس کرلیں گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ خواجہ صاحب آیندہ بھی اپنی جنبشِ قلم سے میگزین کے صفحات کو نوازتے رہیں گے۔ ہم میگزین اور عملہ دونوں کی طرف سے خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ممکن ہے بعض حضرات اس افسانے کی طوالت پرچیں بجبیں ہوں مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو بالاقساط شائع کرنے میں اس کی دلچسپی کا وہ سلسلہ باقی نہیں رہتا جو موجودہ صورت میں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ناظرین کو زحمتِ انتظار سے محفوظ رکھنے کی یہی ایک صورت ہوسکتی تھی جو پیشِ نظر ہے۔

ادبی دنیا کا خیر مقدم | یہ تنقیدی مضمون حضرت احسن صاحب مارہروی کی ادبی ادا شناسی کا ثبوت ہے۔ نقد و تبصرہ کے صفحات سے الگ جو جگہ اس کو دی گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مضمون کی طوالت کے علاوہ اس میں فنی اور ادبی مسائل پر اس پیرائے میں بحث کی گئی ہے جس کی حیثیت مختصر تبصروں سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم مولنا موصوف کے بدل مشکور ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ آیندہ بھی میگزین ان کی عنایات و اکرام سے گل بدامن ہوتا رہے گا۔

ایک بُت پرست محمود

مکرمی سجاد صاحب یلدرم اُردو انشا پردازی کے علاوہ نظم میں بھی ایک لطیف طرزِ بیان کے موجد ہیں - یہ نظم اُنھوں نے مکرمی خواجہ غلام السیدین صاحب کی شادی میں لکھی تھی - اس نظم سے وہی لوگ زیادہ محظوظ ہو سکیں گے جو سجاد صاحب کے بے تکلفانہ اندازِ بیان، جدتِ تخیل، ازدواجی زندگی کے مسئلہ پر سیدین صاحب کی ذاتی رائے اور اس وقت کی مقامی فضا سے کافی آشنا ہوں گے - ہم بھی اس موقع کو غنیمت جان کر سیدین صاحب کو شادی کی مبارکباد پیش کرتے ہیں -

---

پارہ ہائے جگر

حضرتِ جگر کے کیف انگیز تغزل سے علی گڑھ کی فضا برابر مخمور رہی ہے ، موجودہ نمبر میں جگر صاحب کی دو غزلیں ایک ہی ردیف و قافیہ میں شائع ہو رہی ہیں جن کا ہر شعر اپنی جگہ ایک عالم کیف و انبساط پیدا کر رہا ہے - ہماری میگزین کی خوش نصیبی تھی کہ جگر صاحب اُن دنوں علی گڑھ تشریف لائے ہوئے تھے - اور جناب موصوف نے اپنی زبان سے مخصوص ترنم کے ساتھ یہ دو غزلیں سُنا کر خاکسار کو عنایت فرما دیں - آئندہ کے لیئے بہت کچھ امیدیں دلائی گئیں ہیں - میگزین ہمہ تن چشم براہ ہے -

---

علی گڑھ سے خطاب

حضرتِ جوش سے علی گڑھ کے طلبہ کو صوری و معنوی تعارف حاصل ہے - حضرتِ جوش کے سینے میں وہ دل ہے جو نیرنگِ روزگار سے بیزار ہو چکا ہے - اور اُن کے مشتعل جذبات کی ترشیح ان کے کلام میں نمایاں ہے - علی گڑھ سے جوش صاحب کو کافی اُنس ہے اور اسی وجہ سے علی گڑھ کے متعلق اُن کے جذبات زیادہ مشتعل ہیں اور ان کے کلام میں اس درجہ تلخی پائی جاتی ہے - ہم جوش صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ علی گڑھ سے مایوس نہ ہوں -

---

تصاویر

اس نمبر میں چار تصاویر شائع ہو رہی ہیں پہلی تصویر علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ کی ہے ، اور دوسری سلطان جہاں منزل کی ہے جو بیگم صاحبہ مرحومہ کی یادگار جاوید ہے اور ہماری جامعہ کی حسین ترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے - تیسری تصویر ہز ہائینس میجر نواب سر حامد علیخاں مرحوم

والیٔ رامپور کی ہے۔ چوتھی تصویر سابق مدیران میگزین کی ہے۔

اس تصویر سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تمام حضرات اُردو میگزین ہی کے مدیر رہ چکے ہیں۔ بلکہ [illegible] غلام السیدین صاحب انگریزی میگزین کی ادارت فرماتے تھے باقی حضرات اُردو میگزین [illegible] مرد میدان تھے۔ اسی غرض سے مشترکہ مفہوم کو ادا کرنے کے لیے مدیرانِ اُردو میگزین کی بجائے [illegible] مرقوم ہے۔

یہ تصویر ہمارے پیشرو جناب زکریا فیاضی صاحب نے خود ہی اُسکی طباعت کا سارا کام ختم کرا کے [illegible] لیے ارسال فرمایا ہے

بدگمانی

یہ فسانہ آسکر وائلڈ کے فسانے سے ماخوذ ہے۔ ترجمہ میں ہمارے محترم [illegible] صاحب بی۔ اے (علیگ) نے زبان کی پاکیزگی اور فقروں کی دلچسپی کو قائم [illegible] کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حسنی صاحب اُس تغافل بیجا سے جو اُن کا [illegible] ترک کیا کریں گے۔ جلیل صاحب کے وعدے تو اُمید افزا ہیں مگر

اے مگسے وعدۂ فراموش اگر یاد ہے

معذرت

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ میگزین کی اشاعت میں خلاف توقع تاخیر ہوئی۔ اگست [illegible] جب میگزین کی ادارت کی ذمہ داریاں ہمارے سپرد ہوئیں ہم اُسی وقت ارادہ کر چکے [illegible] کو ستمبر کی ۱۵ تاریخ تک ضرور شائع کر دیں گے اور ہمیں ایک حد تک اس ارادہ میں کامیابی بھی ہو چکی [illegible] ضروریات کی بنا پر ہمیں علی گڑھ سے کوہِ منصوری چلا جانا پڑا اور وہاں جاکر علالت نے تمام [illegible] میں ملا دیں۔ ۱۶ اکتوبر کو منصوری میں ایک تار ملا [illegible] ہمیں فوراً گھر جانا پڑا۔ گھر پہونچکر واقعات [illegible] حُسنِ اتفاق کی شورشیں اس قدر مجبور کرتی ہیں کہ ۲۰ نومبر تک وہیں رہنا پڑا اور بڑی دشواریوں کے بعد [illegible] علی گڑھ پہونچے۔ ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اُمید ہے کہ میگزین کی تاخیرِ اشاعت قابلِ معافی سمجھی جائے گی۔ آیندہ کے متعلق ہم یقین دلاتے ہیں کہ میگزین کی اشاعت میں انشاءاللہ تاخیر نہ ہوگی اور پابندی [illegible]

ہر ممکن لحاظ رکھا جائے گا۔

شکریہ ہمارے نزدیک شذرات اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اُن چند مخلص او رادب نوازوں کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنھوں نے اس کی اشاعت میں اپنے حُسن خدمات کا ثبوت دیا اور ہماری پریشانیوں میں خود کو شریک کرتے رہے۔ مضامین کی ترتیب' پروف کی دیکھ بھال' اور مطبع کی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں ہم خصوصیت کے ساتھ اپنے عزیز ترین احباب مسٹر حفیظ الرحمٰن بی۔ اے' مسٹر محمد عبد الحمید بی۔ اے اور مسٹر سید احسن شبیر بی۔ اے کا میگزین کی طرف سے بہ خلوص تمام شکریہ ادا کرتے ہیں اور آیندہ بھی ان کی عنایات کے اُمیدوار ہیں۔ اسی سلسلہ میں ہم اپنے خوش فکر دوست مسٹر کاظم حسین چودھری بی۔ اے کے مفید مشوروں کے بھی ممنون ہیں۔

منظر جنوبی

سلطان جہاں منزل

۱
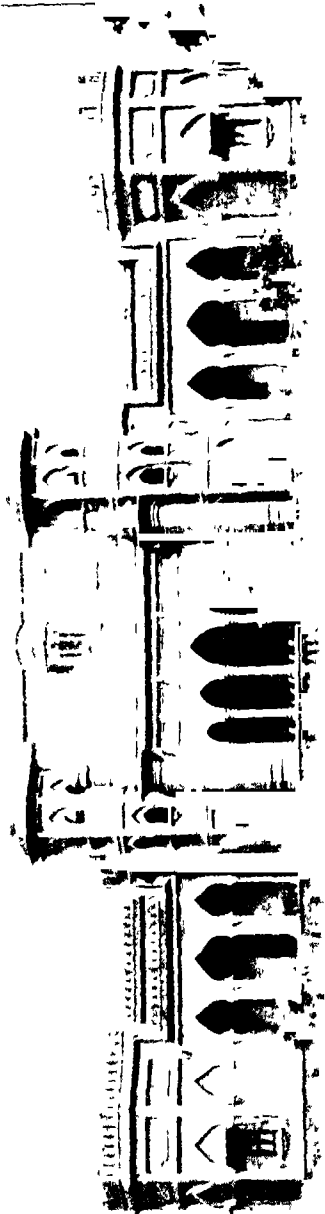
ن۔ن نے کہنا شروع کیا :

میں اُس وقت تقریباً پچیس سال کا تھا۔ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ یہ بہت مدت کا ذکر ہے۔ مجھے
ہی وقت آزادی ملی تھی، اور پہلے پہل سیاحت کے لئے نکلا تھا۔ "تکمیلِ تعلیم" کی غرض سے نہیں، جیسا کہ
ں زمانے میں دستور تھا؛ میں تو صرف ملک خدا پر ایک نظر ڈالنی چاہتا تھا۔ اُٹھتی جوانی تھی، صحت اچھی تھی،
ل میں جوش تھا، اور دولت کی کمی نہ تھی۔ دُکھ درد سے ابھی پالا نہیں پڑا تھا۔ فکر سے آزاد تھا، جو چاہتا تھا
رتا تھا: الغرض پھولوں کی طرح شگفتہ و شاداب تھا۔ اُن دِنوں مجھے اس کا گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ
ان نباتات نہیں ہے، اور زیادہ عرصے تک پھل پھول نہیں سکتا۔ شباب چاندی سونے کے ورق میں لپٹی
ہوئی غذا کھاتا ہے، اور اُسے معمولی کھانا سمجھتا ہے؛ مگر ایک وقت آتا ہے کہ انسان سوکھے ٹکڑوں کا
محتاج ہو جاتا ہے۔ مگر ابھی اس ذکر میں کیوں پڑوں؟

بغیر کسی التزام کے، بِلا کسی مقصد کے سفر کرتا تھا؛ جہاں جی چاہا ٹھہر گیا، جونہی نئی شکلیں دیکھنے کی خواہش
پیدا ہوئی، چل کھڑا ہوا ——— میری دلچسپی کا واحد مرکز انسان تھے؛ مشہور آثار اور عجائب خانوں

سے مجھے وحشت ہوتی تھی، "گائیڈ" کو دیکھ کر دم الٹتا تھا۔ نیچر ذ مجھ پر بے حد اثر ہوتا تھا، مگر اُن چیزوں سے کوئی رغبت نہیں تھی جنھیں نیچر کی زیب و زینت قرار دیا جاتا ہے: مثلاً غیر معمولی پہاڑ، گھاٹیاں، آبشار؛ یہ گرا نہ تھا کہ نیچر خود نمائی کرے، دانستہ میری توجہ اپنی طرف کھینچے۔ مگر انسان، جیتے جاگتے، چلتے پھرتے آدمیوں کی شکلیں، اُن کی گفتگو، اُن کے اشارے اور ہنسی۔ ان کے بغیر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ ہجوم میں مجھے ہمیشہ ایک خاص فرحت ہوتی تھی۔ جہاں اور لوگ جاتے تھے، وہاں جانے میں، لوگوں کے ساتھ غل مچانے میں دوسروں کو غل مچاتے دیکھنے میں مزا آتا تھا۔ لوگوں کو دیکھ کر میرا جی بہلتا تھا… گو میں اُنھیں دیکھتا بھی نہ تھا۔ ایک قسم کے مسرت آمیز، پُرشوق تجسس سے اُنھیں تکتا رہتا تھا۔ مگر میں پھر بہک رہا ہوں۔

ہاں، تو کوئی بیس سال کا ذکر ہے کہ میں دریائے رائن کے بائیں کنارے ایک چھوٹے سے جرمن قصبے "ز" میں آکر ٹھہرا۔ مجھے تنہائی کی تلاش تھی؛ اُنہی دنوں ایک جوان بیوہ نے مجھے گھائل کیا تھا اُس سے میری شناسائی ایک صحت گاہ میں ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش وضع اور عیار تھی: ہر ایک سے عشوہ فروشی کرتی تھی — مجھ غریب شامت زدہ سے بھی۔ شروع میں اُس نے خود میرے حوصلے بڑھائے، مگر بعد میں اُنھیں بے دردی سے کچل ڈالا، اور بیویریا کے ایک جوان سرخ و سپید فوجی افسر پر مجھے بھینٹ چڑھا دیا۔ میں مانتا ہوں کہ میرے دل کی چوٹ کچھ بہت کاری نہ تھی، تاہم میں نے اپنا فرض سمجھا کہ کچھ دن کے لئے اپنے اوپر پژمردگی طاری کروں اور گوشہ نشین ہو جاؤں — شباب ہر سانحے سے لطف اٹھاتا ہے! اور اس تقریب سے میں "ز" میں آکر مقیم ہوا۔

وہ چھوٹی سی جگہ دو اونچی پہاڑیوں کی ترائی میں واقع تھی اور مجھے اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بہت پسند تھی۔ اُس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور مینار، اُس کے پُرانے لیموں کے درخت، اُس کی چھوٹی سی صاف شفاف ندی کا پل جو رائن میں گرتی تھی، اور سب سے زیادہ اُس کی نفیس شراب — یہ سب چیزیں مجھے بھاتی تھیں۔ شام کو سورج ڈوبتے ہی (جون کا مہینہ تھا) بھورے بالوں والی پیاری پیاری جرمن لڑکیاں پُرانے قصبے کے تنگ بازاروں میں ہوا خوری کے لئے نکلتیں اور جب کسی باہر والے کو دیکھتیں تو دھیمی دل پذیر آواز سے سلام کرتیں؛ اُن میں سے بعض اُس وقت بھی اپنے گھروں کو واپس نہ جاتیں

جب چاند پُرانے پُرانے مکانوں کی نوک دار چھتوں کے نیچے سے نمودار ہو جاتا، اور بازار کی انیٹیں چاندنی میں دمکنے لگتیں۔ میں اُس وقت قصبے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا تھا؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند شفاف آسمان پر سے قصبے کو گھور رہا ہے، اور قصبے کو اس نظر بازی کا احساس ہے، اور وہ چاندنی میں ڈوبا ہوا امن اور لطافتِ حُسن کا مُرقع بنا کھڑا ہے؛ چاندنی گو پُر سکون ہے، مگر روح میں ایک نرم لہر پیدا کرتی ہے۔ گاتھک وضع کے اونچے گھنٹہ گھر کے بادنما پر ہلکی سنہری شعاعیں پڑتی اور نور کی چادر بن کر ندی کی تاریک سطح پر موجوں کو جگمگاتی تھیں؛ سلیٹ کی چھتوں کے نیچے، تنگ کھڑکیوں میں، پتلی موم بتیاں (جرمن جزرس واقع ہوا ہے!) دھیمی دھیمی ٹمٹماتی تھیں؛ انگور کی شاخیں اپنی بیدار کونپلوں کا سرپُر اسرار انداز سے پتھر کی دیواروں پر سے نکالتی تھیں؛ تکونی منڈی میں پُرانی وضع کے فوارے کے قریب سے کوئی چیز اندھیرے میں گھس جاتی تھی؛ نیند کے ماتے چوکیدار کی سیٹی کی آواز یکایک خاموشی کو توڑ دیتی تھی؛ ایک خوش مزاج کتا دبی آواز سے بھونکتا تھا؛ ہوا گالوں کو پیار سے تھپکتی تھی، اور لیموں کے درختوں میں سے ایسی بھینی بھینی خوشبو نکلتی تھی کہ سانس کی حرکت خود بخود تیز ہو جاتی تھی۔

ز کا چھوٹا سا قصبہ رائن سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں اکثر اُس پُر شوکت دریا کو دیکھنے جاتا تھا، اور ایک بہت تناور درخت کے سائے میں بیٹھا گھنٹوں اُس سنگ دل بیوہ کے تصور کے نقوش کو، جو کسی قدر ماند ہو چلے تھے، چمکاتا رہتا تھا۔ مریم کی مورت جس کے چہرے سے بچپن برستا تھا اور جس کا سُرخ دل اُس کی چھاتی پر تلواروں سے چھدا ہوا تھا، غمگین انداز سے درخت کی شاخوں میں سے جھانکتی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ز سے کچھ بڑا ل کا قصبہ تھا۔ ایک دن شام کے وقت میں اپنے پسندیدہ بینچ پر بیٹھا، آسمان، دریا، یا انگور کے تختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے چند بھورے بالوں والے لڑکے ایک اُلٹی ہوئی کشتی کی تارکول ملی ہوئی پشت پر کھیل رہے تھے۔ کشتیاں آہستہ آہستہ تیر رہی تھیں۔ اُن کے بادبانوں میں ہلکی ہلکی شکنیں تھیں۔ ناگہاں موسیقی کی آواز میرے کان میں آئی۔ ل کے قصبے میں والٹز کی کوئی چیز بجائی جا رہی تھی۔

ایک بوڑھا آدمی میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ مخمل کی واسکٹ، نیلی جرابیں، اور

بکسوئے دار جوتے پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا 'یہ کیا ہے ؟'
پائپ کو منہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں منتقل کر کے اُس نے کہا 'ب سے
کچھ طالب علم "کومرش" منانے آئے ہوئے ہیں۔'
میں نے سوچا میں بھی چل کر اس "کومرش" کا تماشا دیکھوں۔ اور ہاں خوب یاد
آیا، میں ل کو ابھی دیکھنے بھی نہیں گیا۔ ایک ملاح کو ڈھونڈا اور دریا کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔

۲

سب شاید واقف نہ ہوں کہ یہ "کومرش" کیا چیز ہے۔ یہ ایک خاص قسم کا جشن ہے جس
میں ایک ضلع یا حلقے کے طالب علم ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اس تقریب میں سب حاضرین جرمن طالبعلموں
کا پرانا رسمی لباس پہنتے ہیں: ہنگری کی جاکٹیں، بڑے بڑے بوٹ، اور چھوٹی ٹوپیاں جن کے گرد
خاص رنگوں کی پٹیاں ہوتی ہیں۔ طلبا عموماً رات کا کھانا ساتھ کھاتے ہیں، ان کا ایک پرانا رکن میر مجلس
قرار پاتا ہے۔ شراب پیتے ہیں، گیت گاتے ہیں، تنباکو کا دھواں اُڑاتے ہیں، دنیا داروں کو بُرا بھلا
کہتے ہیں۔ صبح تک اُن کی رنگ رلیاں جاری رہتی ہیں۔ بعض اوقات ڈھول باجا کرائے پر لے لیتے ہیں۔
اسی قسم کا جشن ل میں ایک چھوٹی سرائے کے پائیں باغ میں جس کا رُخ گلی کی طرف تھا
منایا جا رہا تھا۔ سرائے اور باغ کی دیواروں پر جھنڈے لہرا رہے تھے؛ طلبہ قرینے سے ترشے
ہوئے لیموں کے درختوں کے نیچے میزوں کے آگے بیٹھے تھے؛ ایک زبردست کتا ایک میز کے نیچے لیٹا
تھا۔ ایک طرف بیل سے چھپی ہوئی کُنج میں، سازندے گا بجا رہے تھے اور گھڑی گھڑی جو کی شراب سے
تازہ دم ہوتے جاتے تھے۔ گلی میں نیچی دیوار کے دوسری طرف بہت سے لوگ آ کر کھڑے ہو گئے؛ ل
کے بھلے باشندے باہر والوں کو گھورنے کا موقع کیسے ہاتھ سے جانے دیتے؛ میں بھی تماشائیوں کے
ہجوم میں مل گیا۔ طالب علموں کی شکلیں میں بہت شوق سے دیکھتا تھا؛ اُن کی بغل گیریاں
اُن کے استعجاب کے کلمے، نوجوانی کی بے لوث آن بان، آگ بھری نگاہیں، آپ ہی آپ ہنسنا۔

دُنیا کی سب سے زیادہ میٹھی ہنسی — نوجوان، تازہ کار، تازہ خیال زندگی کا یہ جوشیلا اُبال، یہ مشتاقانہ گام زنی۔ کسی سمت ہو، شرط یہ ہے کہ آگے کے رُخ ہو۔ اس سادہ دل آزادی کو دیکھ کر میرا خون رگوں میں دوڑنے لگتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا، 'میں بھی اس جشن میں کیوں نہ شریک ہو جاؤں؟'

اتنے میں ایک آدمی کو اپنے پیچھے روسی میں کہتے سُنا 'آسیا، بس اب دیکھ چکیں؟'

دوسری آواز، ایک عورت کی آواز نے اسی زبان میں جواب دیا 'ابھی ذرا اور ٹھیرو۔'

میں نے جلدی سے مُڑ کر دیکھا ... میری نگاہ میں ایک اچھی شکل کے نوجوان پر پڑیں جو نوک دار ٹوپی اوڑھے اور ڈھیلی ڈھالی جاکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اُس کے بازو پر سہارا دیے ہوئے ایک ذرا نکلتے ہوئے قد کی نوجوان لڑکی تھی جس کے سر پر تنکوں کی بنی ہوئی ٹوپی تھی۔ ٹوپی نے اُس کے چہرے کے تمام بالائی حصے کو ڈھک لیا تھا۔

میری زبان سے بے ساختہ نکلا 'آپ لوگ روسی ہیں؟'

نوجوان نے مسکرا کر کہا 'جی ہاں، ہم روسی ہیں۔'

'مجھے مطلق اُمید نہیں تھی کہ اتنی دور دراز جگہ ... '

اُس نے قطع کلام کر کے کہا 'نہ ہمیں اس کا گمان تھا۔ خیر، اس سے دُونی خوشی ہوئی۔ اجازت دیجے کہ میں اپنا تعارف کروں۔ میرا نام گاگن ہے، اور یہ میری — ' ایک لمحے کے لئے وہ ہچکچایا 'میری بہن ہے۔ آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'

میں نے اُسے اپنا نام بتایا اور ہم باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ گاگن بھی میری طرح تفریح کے طور پر سیاحت کر رہا تھا، اور ایک ہفتے سے ل۔ میں مقیم تھا۔ سچ پوچھیے تو میں سیلانی روسیوں سے ملتے ہوئے جھجکتا تھا۔ میں اُن کی چال ڈھال دیکھ کر اُنھیں دور سے بھانپ لیتا ہوں۔ اُن کی مطمئن، حقارت آمیز، متکبرانہ ہیئت یکایک شرم اور احتیاط سے بدل جاتی ہے۔ وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں، آنکھیں گھبراہٹ کے مارے ایک جگہ نہیں ٹھیرتیں، بے چین نظروں سے یہ سوال نکلتا ہے 'خدا خیر کرے، کہیں میں نے کوئی

بے وقوفی کی بات تو نہیں کہہ دی؟ یہ لوگ کہیں مجھ پر تو نہیں ہنستے ؟' تھوڑی دیر میں یہ کیفیت جاتی رہتی ہے اور وہی پرانی شان غالب آجاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ حیران پریشان نظر آنے لگتے ہیں۔ الغرض، میں روسیوں سے کتراتا تھا، مگر گاگن نے شروع ہی سے میرا دل موہ لیا۔ دنیا میں اس قسم کے مسرت افروز چہرے بھی ہوتے ہیں، جنھیں دیکھ کر ہر شخص خوش ہوتا ہے، گویا وہ کسی ترکیب سے حرارت پہنچاتے یا تسکین بخشتے ہیں۔ گاگن کا چہرا ایسا ہی تھا، متواضع اور لطف آگیں۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی اور نرم تھیں اور بال ملایم اور گھونگر والے۔ وہ اس وضع سے باتیں کرتا تھا کہ گو چہرا چھپا ہوا ہو، مگر آواز کہے دیتی تھی کہ وہ ہنس رہا ہے۔

لڑکی جسے اُس نے اپنی بہن بتایا تھا، پہلی نظر میں مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ اُس کے سنولائے ہوئے کتابی چہرے کے خطوط میں، اُس کی چھوٹی کھڑی ناک میں، بچوں کے سے گالوں میں، چمکیلی سیاہ آنکھوں میں ایک سب سے الگ، اچھوتی ادا تھی۔ اُس کے جسم کی ترکیب سڈول تھی، مگر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی وہ پوری طرح موزونیت کے سانچے میں نہیں ڈھلا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے بالکل نہیں ملتی تھی۔

گاگن نے مجھ سے کہا، 'آپ ہمارے ساتھ گھر تک چلیں گے؟ جرمنوں کو ہم خوب جی بھر کر گھور چکے۔ ہمارے روسی بھائی ہوتے، تو کھڑکیاں چور چور کر دیتے، کرسیاں توڑ پھوڑ ڈالتے، مگر ان لونڈوں کے مزاج میں بہت رکھ رکھاؤ ہے۔ کیوں، آسیا، کیا کہتی ہو، گھر چلیں؟'

لڑکی نے سر کے اشارے سے اظہار اتفاق کیا۔

گاگن نے پھر گفتگو شروع کی۔ 'ہم انگور کے ایک بلند تختے پر ایک چھوٹے سے الگ تھلگ مکان میں رہتے ہیں۔ چل کر دیکھیے، وہاں کا منظر بہت دلکش ہے۔ ہماری مکان والی نے آج فالو بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ رات کو چاندنی میں عبور کریں۔'

ہم روانہ ہوگئے۔ قصبے کے ایک نیچے پھاٹک سے گزر کر جو ہر طرف سے گول پتھروں کی ایک پرانی فصیل سے گھرا ہوا تھا (فصیل کے بعض برج ابھی قائم تھے) ہم ایک کھلے ہوئے میدان میں

پہنچے، اور پتھر کی دیوار کے سہارے کوئی سو قدم چل کر ایک چھوٹے، تنگ دروازے کے آگے رُکے۔ گاگن نے اُسے کھولا اور ہمیں ایک دشوار گزار پگ ڈنڈی کے راستے چڑھائی کی طرف لے چلا۔ بانسوں پر چڑھی ہوئی انگور کی سبز بیلوں پر، خشک زمین پر بچھے ہوئے بھر بھرے پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکڑوں پر، چھوٹے مکان کی سفید دیواروں پر گلابی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مکان کی کڑیاں سیاہ اور ترچھی تھیں۔ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کے متصل اُس میں چار روشن کھڑکیاں تھیں۔

ہم آگے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ گاگن نے کہا 'دیکھئے، ہمارا گھر آگیا! یہ ہماری مکان والی فالودہ لئے آرہی ہیں۔ ہم ابھی کھانا کھانے آتے ہیں۔ پہلے ذرا مناظر پر ایک نظر ڈال لیں... کہئے، کیسا نظارہ ہے؟'

نظارہ واقعی بہت شاندار تھا۔ روپہلی رائن پہاڑی کے دامن میں سبز کناروں کے بیچ میں بہہ رہا تھا، اور ایک مقام پر ڈوبتے ہوئے سورج کی گنگا جمنی کرنوں سے دمک رہا تھا۔ چھوٹا سا لب دریا سے ہم آغوش قصبہ اپنے بازار اور مکانوں کی نمائش کر رہا تھا؛ ڈھلوان پہاڑیاں اور مرغزار وسیع قطعوں میں ہر طرف چلے گئے تھے۔ مکان کے نیچے کا منظر خوب تھا؛ مگر اوپر کا اُس سے بھی نفیس تھا؛ میں آسمان کی پاکیزگی اور عمق سے، فضا کی شفاف چمک دمک سے خاص طور سے متاثر تھا۔ تازہ، دھیمی دھیمی ہوا میں نرم تموج تھا، گویا ان بلندیوں پر وہ بھی زیادہ آزاد اور آسودہ ہے۔

'آپ لوگوں نے نہایت خوش نما مکان منتخب کیا ہے۔'

'یہ آسیا کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ آسیا، جاؤ، ذرا کھانے کی دیکھ بھال کرو۔ سب چیزیں یہیں منگوا لو۔ کھانا کھلی ہوا میں کھائیں گے۔ یہاں سے گانا زیادہ صاف سنائی دیتا ہے۔' اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا 'آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ والز پاس سے اکثر مہمل بازاری گانا معلوم ہوتا ہے، مگر دور سے نہایت لطیف ہو جاتا ہے؛ ہمارے ہر ایک شعری تار کو چھیڑ دیتا ہے۔'

آسیا (اُس کا اصلی نام اینا تھا، مگر گاگن اُسے آسیا کہتا تھا؛ اجازت دیجے کہ میں بھی اسی نام سے اُس کا ذکر کروں) مکان کے اندر گئی، اور تھوڑی دیر میں مکان والی کے ساتھ

واپس آئی. دونوں ایک بڑی کشتی لائیں جس میں فالودہ کا ایک پیالہ، طشتریاں، چمچے، شکر، پھل اور روٹی رکھی تھی. ہم بیٹھ گئے اور کھانا شروع کیا. آسیا نے ٹوپی اتار ڈالی؛ اُس کے کالے کالے، ترشے ہوئے اور کنگھی کئے ہوئے بال، جیسے کسی لڑکے کے ہوں، موٹی موٹی لٹوں میں اُس کی گردن اور کانوں پر آپڑے. اوّل اوّل وہ مجھ سے شرماتی رہی، پھر گاگن نے اُس سے کہا:

'بس اب شرما چکیں! یہ تمھیں کاٹیں گے نہیں.'

آسیا مسکرائی اور تھوڑی دیر میں خود بخود مجھ سے باتیں کرنے لگی. میں نے اُس سے زیادہ چلبلی طبیعت کسی کی نہیں دیکھی. منٹ بھر کو نچلی نہیں بیٹھی. گھڑی گھڑی اُٹھتی تھی، گھر میں بھاگ جاتی تھی، پھر دوڑتی ہوئی باہر آتی تھی، زیرِ لب کچھ گنگناتی تھی، ہنستی بھی تھی تو ایک عجیب انداز سے: ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ سنتی ہے اُس پر نہیں، بلکہ اُس کے دل میں جو طرح طرح کے خیالات آتے ہیں، اُن پر ہنس رہی ہے. اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بے لاگ، چمک دار، سیدھی شعاعیں نکلتی تھیں؛ مگر کبھی کبھی اُس کی پلکیں کچھ جھک جاتیں، تو اُن کا انداز اکبارگی گہرا اور نرم پڑ جاتا تھا.

ہم ڈیڑھ ڈھائی گھنٹے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، دن کی روشنی ختم ہوئے دیر ہو چکی تھی، اور شفق، پہلے آگ کی طرح دہکتی ہوئی، پھر شفاف اور یاقوتی، پھر زرد اور مدہم، آہستہ آہستہ پگھل کر رات میں جذب ہو چکی تھی. مگر ہماری دھیمی اور پُرسکون گفتگو، جیسے اردگرد کی ہوا تھی، جاری رہی. گاگن نے شراب کی ایک بوتل منگوائی؛ ہم اُسے ٹھیر ٹھیر کے پی گئے. گانے کی آواز بدستور تیرتی ہوئی ہم تک پہنچ رہی تھی. اُس کی تانیں زیادہ سُریلی، زیادہ نازک ہوتی جاتی تھیں؛ قصبے میں اور دریا پر روشنیاں جھلملا رہی تھیں. یکایک آسیا کا سر جھک گیا، اس وضع سے کہ اُس کی لٹیں آنکھوں پر آپڑیں، چپ ہو گئی اور گہرا گہرا سانس لینے لگی. یہ کہہ کر کہ 'مجھے نیند آرہی ہے'، گھر میں چلی گئی. میں نے دیکھا کہ اُس نے موم بتی نہیں جلائی اور دیر تک بند کھڑکی سے لگی کھڑی رہی. آخر چاند نمودار ہوا اور رائن پر چمکنے لگا. ہر ایک چیز نور اور تاریکی میں بٹ گئی، منقلب ہو گئی. ہوا رُک گئی، گویا اُس نے پر بند کر لئے اور سو گئی؛ زمین سے رات کی خوشبو دار حرارت کے بھپکے اُٹھنے لگے.

'مجھے بھی اب چلنا چاہیے، ورنہ پھر شاید ملاح نہ ملے۔'

'جی ہاں، چلنے کا وقت ہو گیا۔'

ہم پگ ڈنڈی کی راہ نیچے اُتر رہے تھے کہ کچھ لڑھکتے ہوئے کنکر پتھر ہم تک پہنچے۔ آسیا ہمیں پکڑنے آ رہی تھی۔

اس کے بھائی نے پوچھا 'تم ابھی سوئی نہیں؟' مگر وہ بغیر جواب دیے ہمارے پاس سے دوڑتی ہوئی گزر گئی۔

آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ جو طالب علموں نے سرائے کے باغ میں جلا رکھے تھے، شہتوت کے پتوں پر نیچے سے روشنی ڈال رہے تھے جن سے اُن کی شکل عجیب غریب اکڑی پکڑی اور پھڑکیلی ہو گئی تھی۔ آسیا ہمیں دریا کے کنارے ملی۔ وہ کشتی والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے نئے دوستوں سے رخصت ہو کر میں جہل کے کشتی میں بیٹھ گیا۔ گاگن نے اگلے دن میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا۔ میں نے اُس سے ہاتھ ملایا اور آسیا کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا، مگر اُس نے صرف میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ کشتی روانہ ہو گئی اور تیز دریا پر بہنے لگی۔ بوڑھا قوی ہیکل ملّاح چپوؤں پر جھکا اور انھیں تاریک پانی میں ڈال دیا۔

آسیا نے چلّا کر کہا 'آپ نے بیچ میں آ کر چاندنی کی لکیر کو توڑ دیا۔'

میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ کشتی کے چاروں طرف تاریک موجیں رقص کر رہی تھیں۔

'خدا حافظ!' میں نے پھر اُس کی آواز سُنی۔

'کل ملاقات ہو گی،' گاگن کی آواز آئی۔

کشتی دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ میں اُترا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ مقابل کے کنارے پر اب کوئی نہیں تھا۔ چاندنی کی چادر اب بھی سنہری پل کی طرح دریا پر بچھی ہوئی تھی۔ لانر کے ایک پرانے والز کی آخری تیز تانیں ٹوٹتی سنائی دیتی تھیں۔ گاگن نے ٹھیک کہا تھا: اس جادو بھرے ترنم نے میرے دل کے ہر تار کو تھرتھرا دیا۔ اندھیرے کھیتوں میں سے ہوتا، معطر ہوا میں سانس لیتا میں گھر کی طرف چلا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو ایک نامعلوم، بے پایاں اشتیاق کے کیف سے مضمحل تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میری طبیعت بشاش ہے... لیکن میں کیوں بشاش تھا؟ نہ مجھے کسی چیز کی خواہش تھی، نہ کسی بات کا دھیان تھا...

میرا دل باغ باغ تھا۔

شیریں اور شگفتہ احساسات کے ہنگامے سے میرا جی ابھرا پڑتا تھا۔ ابھی بچھونے پر لیٹا ہی تھا،
آنکھیں پوری طرح بند نہیں ہوئی تھیں کہ یکایک خیال آیا آج تمام دن میں نے اپنی جفا کار حسینہ کو یاد نہیں کیا
کیا بات ہے؟ کہیں اس کا عشق زائل تو نہیں ہو گیا؟' میں نے اپنے دل میں یہ سوال تو کیا
مگر میرا خیال ہے کہ میری آنکھ فوراً لگ گئی' جیسے بچے کی ہنگورے میں لگ جاتی ہے۔

۳

اگلے دن صبح کو دیر میں جاگ چکا تھا' مگر ابھی بستر پر سے نہیں اٹھا تھا، میں نے کھڑکی کے نیچے دبا
سنی۔ کوئی دھیمے سُروں میں (سمجھ گیا کہ گاگن کی آواز ہے) گنگنا رہا تھا:

آنکھیں ہیں بند تیری جو افسونِ خواب سے
تجھ کو جگاؤں نغمۂ تارِ رباب سے

میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

گاگن نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا 'کہئے مزاج کیسا ہے۔ ذرا سویرے آپ کو جگا د
مگر اٹھ کے دیکھئے کیسی سہانی' اوس بھری صبح ہے۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔'

اُس کے گھونگر والے' چمک دار بالوں' اُس کی کھلی ہوئی گردن اور گلابی رخساروں کو دیکھ
خیال ہوتا تھا کہ اُس میں بھی صبح کی سی طراوت اور تازگی ہے۔

میں نے کپڑے پہنے، ہم باغ میں پہنچے' ایک بنچ پر بیٹھ گئے' قہوہ منگایا' اور باتیں کرنے
لگے۔ گاگن نے مجھے اپنے ارادوں سے مطلع کیا؛ وہ کافی فارغ البال تھا' کسی کا دست نگر نہ تھا' اور
تھا کہ خود کو نقاشی کے لئے وقف کر دے۔ اسے افسوس تھا کہ اتنی دیر میں ہوش آیا اور اتنا وقت یو
برباد ہو گیا۔ میں نے اپنے منصوبوں کا ذکر کیا' اور سرسری طور سے اپنی ناکام محبت کا قصہ بھی سنا دیا۔
لطف اور مروت سے میری باتیں سنتا رہا' مگر جہاں تک میں اندازہ لگا سکا' میری داستان عشق کا اُس
دل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ مجھے دیکھ کر اخلاقاً دو ایک مرتبہ اُس نے بھی ٹھنڈا سانس بھرا؛ پھر مجھ سے

لگا " چلیے، اپنی نقاشی کے کچھ نمونے دکھاؤں۔
میں فوراً تیار ہوگیا۔
آسیا گھر پر نہیں تھی۔ مکان والی نے بتایا کہ وہ کھنڈر کی طرف گئی ہوئی ہے۔ (ل میں، ڈیڑھ میل کے فاصلے پر، ایک پرانے جاگیری قلعے کے آثار تھے۔ گاگن نے اپنی تمام تصویریں مجھے دکھائیں۔ اس کے تخیل میں بہت کچھ اصلیت اور صداقت، ایک قسم کی روانی اور وسعت تھی؛ مگر ان میں سے ایک تصویر کو بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دی۔
اُس نے ٹھنڈا سانس کھینچا اور کہنے لگا " آپ سچ کہتے ہیں؛ یہ سب کی سب بہت بُری اور ادھوری ہیں، مگر کیا کیا جائے؟ مجھے وہ مشق نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی؛ اس کے علاوہ یہ کم بخت سلافی سستی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب ہم کام کے خواب دیکھتے ہیں، تو ہماری پرواز میں ایک عقابی شان ہوتی ہے، گمان گزرتا ہے کہ زمین کو محور سے ہلا کے چھوڑیں گے۔ مگر جب کام کا وقت آتا ہے تو ہمارے ہاتھ پاؤں بھول جاتے ہیں اور طبیعت بھاری ہو جاتی ہے۔"
میں نے اُس کا دل بڑھانے کی کوشش کی، مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کر دیا، اور اپنے خاکے اکٹھے کر کے صوفا پر پھینک دیے۔
" مجھ میں استقلال ہوا، تو ممکن ہے کچھ ہو رہوں۔ نہیں تو ادھ کچرے عطائی کے درجے سے نہیں بڑھ سکتا۔ چلیے، آسیا کو ڈھونڈیں۔"
ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔

۴

کھنڈروں کو راستہ ایک کھڑی چڑھائی کے گرد پیچ کھاتا ہوا ایک تنگ سایہ دار وادی میں سے گیا تھا۔ وادی کے دامن میں ایک چھوٹی سی ندی پتھروں پر سے اچھل اچھل کر شور مچاتی ہوئی

بہتی تھی، گویا دریائے عظیم میں ملنے کے لئے بے تاب ہے۔ ڈھلواں چوٹیوں اور پہاڑ کے دروں کی تاریک حدود سے پرے دریا امن و وقار سے چمک رہا تھا۔ گاگن نے میری توجہ بعض ایسی مقامات کی طرف مبذول کرائی جہاں روشنی خاص آب و تاب سے پڑ رہی تھی۔ اُس کی باتوں سے صاف ٹپکتا تھا کہ نقاش ہو یا نہ ہو، وہ آرٹسٹ ضرور ہے۔ کھنڈر جلد آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ایک چٹیل چٹان کی چوٹی پر ایک مربع مینار کھڑا تھا، جو بالکل سیاہ مگر ابھی صحیح سالم تھا، گولمبائی کے رُخ ایک شگاف سے دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ مینار کے متصل کائی دار دیواریں تھیں، کہیں کہیں اُس پر بیل چمٹ گئی تھی، خاکی مناروں، زوال آمادہ محرابوں میں سے ٹیڑھی ترچھی بوٹیاں پھوٹی ہوئی تھیں۔ ایک پتھریلی پگ ڈنڈی کھنڈر کے دروازے کو جاتی تھی جو ابھی مستحکم تھا۔ ہم دروازے تک پہنچے تھے، کہ ایک لڑکی تیر کی طرح، ہمارے سامنے سے گزری، ملبے کے ڈھیر پر تیزی سے چڑھ گئی اور اُس کے آگے کو نکلے ہوئے چھجے پر، عین غار کے اوپر کھڑی ہو گئی۔

گاگن نے چیخ کر کہا، ارے، یہ آسیا ہی تو ہے! کتنی دیوانی ہے!' دروازے سے گزر کر ہم ایک مختصر صحن میں پہنچے جو جنگلی سیب اور بچھوؤں کے پودوں سے پٹا ہوا تھا۔ ڈھال کے چھجے پر آسیا بیٹھی تھی۔ اُس نے پہلو بدلا اور ہنس کر ہماری طرف رُخ کیا، مگر اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ گاگن نے انگلی کے اشارے سے اُسے روکا، اور میں چلا کر اُس کی بے احتیاطی کی شکایت کرنے لگا۔

گاگن نے میرے کان میں کہا 'بس، زیادہ نہ چھیڑئے۔ آپ اس کے مزاج سے واقف نہیں ہیں۔ ممکن ہے سیدھی مینار کی چوٹی پر چڑھ جائے۔ اس علاقے کے لوگوں کی ذہانت کی داد دیجئے!'

میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں، لکڑی کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی کے آگے، ایک بڑھیا بیٹھی جرابیں بُن رہی تھی اور اپنی عینک میں سے ہمیں ترچھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سیاحوں کے ہاتھ کچھ کھانے پینے کی چیزیں بیچتی تھی۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے اور جست کے بھاری قدح میں جو کی ٹھنڈی شراب پینے لگے۔ آسیا بغیر ہلے جلے، پاؤں اندر کی طرف کئے، برابر دو...

بیٹھی رہی۔ ململ کا رومال اس کے سر پر بندھا ہوا تھا۔ اُس کا کتابی ناک نقشہ آسمان کی روشنی میں صفائی اور نزاکت سے جھلک رہا تھا۔ میں نے اُسے مخاصمانہ نظروں سے دیکھا۔ کل شام کو مجھے اس کی حرکتوں میں ایک قسم کا تصنع، ایک طرح کی دکھاوٹ کا شبہ ہوا تھا، گویا چاہتی ہے کہ ہم اُسے دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا 'چاہتی کیا ہے؟ کیسی بچپن کی حرکت ہے!' کچھ اس وضع سے گویا وہ میرے خیالات کو تاڑ گئی، اس نے ایک تیز، ٹٹولتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی، دوبارہ ہنسی، دو جستوں میں دیوار پر سے کود ی، اور بڑھیا کے پاس پہنچ کر اُس سے پانی کا ایک گلاس مانگنے لگی۔

پھر اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر بولی 'تم سمجھتے ہو میں پیاسی ہوں؟ نہیں، دیواروں پر کچھ پھولوں کی بوٹیاں ہیں، انھیں پانی دینے کی ضرورت ہے۔'

گاگن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گلاس لے کر وہ کھنڈروں پر بچوں کے بل چڑھنے لگی۔ رکتی تھی، آگے کو جھکتی تھی، اور مضحک سنجیدگی سے پانی کے قطرے چھڑکتی تھی۔ قطرے دھوپ میں تیزی سے چمکتے تھے۔ اُس کی حرکتوں میں بہت دلاویزی تھی، گر میں اس سے کشیدہ خاطر تھا، گو اپنے دل میں اُس کی چستی و چابکدستی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک خطرناک مقام پر پہنچ کر ہمیں ڈرانے کے لئے اُس نے جان بوجھ کر چیخ ماری اور ہنسنے لگی ... مجھے اُس پر اور بھی غصہ آیا۔

بڑھیا نے منٹ بھر کے لئے جراب پر سے نظر اٹھا کر منہ ہی منہ میں کہا 'لڑکی کیا ہے، اچھی خاصی ہرنی ہے۔'

گلاس کا پانی ختم ہو گیا اور آسیا شوخی سے اٹھلاتی ہوئی ہمارے پاس آ گئی۔ ایک خاص وضع کی مسکراہٹ اُس کی پلکوں، نتھنوں اور ہونٹوں کے ارد گرد کپکپاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھیں ایک نیم بشاش، نیم گستاخ نگاہ سے جھلک رہی تھیں۔

گویا اُس کے بشرے کا انداز کہتا تھا 'تم میری حرکتوں کو ناشائستہ خیال کرتے ہو، مگر میں جانتی ہوں کہ اپنے دل میں تم مجھے سراہنے پر مجبور رہو۔'

گاگن نے چپکے سے کہا 'شاباش، آسیا، شاباش!'

یکایک وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی، اُس کی لمبی لمبی پلکیں جھک گئیں، اور محجوب ہوکر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اُس وقت پہلی مرتبہ میں نے اُس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس سے زیادہ متلون چہرہ میں نے نہیں دیکھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کا رنگ اڑ گیا، اور ایک فکر انگیز، کسی قدر مخزون کیفیت اُس پر چھا گئی، اُس کے نقش و نگار زیادہ نمایاں، زیادہ پختہ، زیادہ سادہ نظر آنے لگے۔ وہ بالکل دھیمی پڑ گئی۔ ہم کھنڈروں میں اِدھر اُدھر چلے پھرے اور مناظر سے خوب لطف اندوز ہوئے۔ آسیا ہمارے پیچھے پیچھے رہی۔ اس اثنا میں رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ بڑھیا کو شراب کی قیمت ادا کرتے وقت گاگن نے جَو کی شراب کا ایک اور جگ مانگا اور پُر رمز شوخی سے میری طرف دیکھ کر بلند آواز سے کہا۔

'آپ کی دِلرُبا خاتون کا جامِ صحت!'

آسیا کی زبان سے بے ساختہ نکلا' اچھا' کیا اِن کی۔کیا آپ کی کوئی ایسی خاتون بھی ہیں؟'

گاگن نے کہا 'سبھی کی ہوتی ہیں۔'

لمحہ بھر کے لئے آسیا کسی خیال میں ڈوب گئی۔ اُس کا رنگ دگرگوں ہوگیا، اور اس میں ایک خاص صلا افگن، بلکہ گستاخ انداز جھلکنے لگا۔

گھر جاتے وقت وہ ہنستی اور اٹکھیلیاں کرتی رہی۔ ایک لمبی شاخ توڑ کر بندوق کی طرح اپنے شانے پر رکھ لی اور رومال سر کے گرد لپیٹ لیا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیں بھورے بالوں والے انگریزوں کا ایک خاندان ملا تھا۔ اِن سب نے، گویا کسی کے حسبِ حکم، اپنی پتھر کی سی آنکھوں سے، آسیا کا سرد مہر حیرت سے جائزہ لیا۔ آسیا نے اُنھیں دیکھ کر زور زور سے گانا شروع کر دیا، جیسے اُنھیں چڑا رہی ہے۔ گھر پہنچ کر سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور اُس وقت برآمد ہوئی جب کھانا چُنا جا چکا تھا۔ وہ اپنی بہترین پوشاک میں ملبوس، خاص اہتمام سے بال سنوارے، کمر بستی سے فیتا لگائے اور ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوئے تھی۔ کھانے پر اس کی وضع سے بہت تمیز بلکہ تصنع ٹپکتا تھا۔ اس نے

مشکل سے کچھ چکھا اور شراب کے پیالے میں پانی پیتی رہی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میرے سامنے وہ خود کو ایک نئے برن میں، ایک شائستہ، سگھڑ نوجوان خاتون کے رنگ میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ گاگن نے اُسے نہیں ٹوکا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہر بات میں اس کی دل جوئی کرنے کا کس قدر عادی ہے۔ کبھی کبھی میری طرف مسکرا کر دیکھتا تھا اور اپنے شانے ہلاتا تھا، گویا کہتا ہے 'آسیا ابھی نادان ہے؛ اسے سختی سے نہ جانچئے'۔ کھانا ختم ہوتے ہی آسیا اُٹھی، تعظیماً جھکی اور ٹوپی اوڑھ کر مسز لوئیس کے ہاں جانے کی اجازت مانگنے لگی۔

گاگن نے اپنی عادت کے مطابق مسکرا کر (اُس کی مسکراہٹ میں اس وقت کسی قدر آشفتگی تھی)، پوچھا 'یہ اجازت آپ کب سے مانگنے لگیں! ہم لوگوں سے جی بھر گیا؟'

'جی نہیں' بات یہ ہے میں کل مسز لوئیس سے ملنے کا وعدہ کر چکی ہوں۔ یوں بھی میں نے سوچا کہ آپ لوگ شاید تنہائی کو پسند کریں۔ مسٹر ن (اُس نے میری طرف اشارہ کیا) کچھ اور راز کی باتیں سنائیں گے۔'

وہ چلی گئی۔

گاگن نے میری نگاہوں سے بچ بچ کر کہنا شروع کیا 'یہ مسز لوئیس یہاں کے ایک سابق برگو ماسٹر کی نیک دل مگر سیدھی سادی بیوہ ہے۔ آسیا سے اسے بے حد شغف ہو گیا ہے۔ آسیا کو نیچے کے طبقے کے لوگوں سے ملنے جلنے کا بہت شوق ہے۔ میرے نزدیک اس شوق کی تہ میں ہمیشہ غرور کا جذبہ کام کرتا ہے۔ آپ نے خود محسوس کیا ہوگا کہ میرے لاڈ پیار نے اُسے بگاڑ دیا ہے' مگر آپ ہی کہئے میں کیا کروں؟ مجھ سے کسی پر سختی نہیں ہوتی' اور اس پر تو اوروں سے بھی کم۔ میرا وعدہ ہے کہ اس سے نرمی سے پیش آؤں گا۔'

میں چپ بیٹھا سنتا رہا۔ گاگن نے اور باتیں چھیڑ دیں۔ جس قدر میں اُس سے واقف ہوتا جاتا تھا' اُسی قدر اُس کی کشش بڑھتی جاتی تھی۔ میں بہت جلد اس کی طبیعت کو پہچان گیا اُس کی فطرت خالص روسی تھی: شباب اُس کے اندر چشمے کی طرح اُبل نہیں رہا تھا' بلکہ دھیمی

روشنی سے فروزاں تھا۔ وہ بہت دِل کش اور ذہین تھا، مگر میرے تصوّر میں نہیں آتا تھا کہ پختہ عمر کو پہنچ کر اُس کی وضع کیا ہوگی۔ بغیر گہرے، مُسلسل استغراق کے آرٹسٹ بننا ممکن نہیں۔ رہا استغراق، سو اُس کے ملائم خط و خال کو دیکھ کر، اُس کی نرم، رُکی رُکی گفتگو کو سُن کر، مجھے خیال ہوا 'نہیں' یہ تم سے نہیں ہوگا۔ تم ہمیشہ محنت سے جی چُراتے رہوگے۔ تمھیں اپنے پر دباؤ ڈالنا نہیں آتا۔' مگر اس سے محبّت نہ کرنا، یہ ناممکن تھا۔ انسان کا دل خود بخود اُس کی طرف کھنچتا تھا۔ چار گھنٹے تک، کبھی صوفا پر بیٹھے، کبھی مکان کے آگے ٹہلتے، اُس کا اور میرا ساتھ رہا۔ ان چار گھنٹوں میں ہم میں بہت بے تکلفی ہوگئی۔

سورج ڈوب گیا۔ میرے چلنے کا وقت ہوگیا تھا۔ آسیا ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

گاگن نے کہا، کیتنی خود سر لڑکی ہے! کہو تو تمھیں گھر چھوڑ آؤں۔ راستے میں مسز لوئیس کے ہاں آسیا کو بھی پوچھ لوں گا۔ اُس کا مکان راستے سے زیادہ ہٹا ہوا نہیں ہے۔'

ہم قصبے کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک تنگ پیچ دار گلی میں مڑ کر ایک چار منزلہ مکان کے آگے رُک گئے۔ اُس کی ہر منزل میں دو کھڑکیاں تھیں۔ دوسری منزل پہلی سے آگے کو نکلی ہوئی تھی، تیسری اور چوتھی، دوسری سے بھی آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ پورا مکان اپنے بوسیدہ چوبی نقش و نگار، اپنے دو موٹے ستونوں، اپنی نوک دار اینٹ کی چھت اور چونچ کی طرح آگے کو نکلے ہوئے چھجے کی وجہ سے ایک جسیم، سکڑے ہوئے پرندے سے ملتا جلتا تھا۔

گاگن نے آواز دی 'آسیا، یہاں ہو؟'

تیسری منزل کی ایک کھڑکی جس میں روشنی تھی کھڑکھڑائی، پھر کھلی۔ آسیا کا سیاہ سر دکھائی دیا۔ اُس کے پیچھے ایک بوڑھی جرمن عورت جھانک رہی تھی۔

'آسیا نے' شرارت سے، کھڑکی کے باہر کہنیاں نکال کر جواب دیا 'جی ہاں، یہاں بہت آرام سے ہوں۔ لو پکڑو،' یہ کہہ کر اُس نے گاگن پر ایک پھول دار ٹہنی پھینکی، 'تم سمجھنا میں ہی تمھاری دلبر ہوں۔'

مسز لوئیس ہنی ۔

گاگن نے کہا ' ن جا رہی ہیں ۔ تم سے رخصت ہونے آئے ہیں ۔ '

' واقعی ؟ اچھا ' تو انھیں میری طرف سے یہ پھول پیش کرو ۔ میں ابھی آتی ہوں ۔ '

کھڑکی بند ہوگئی ۔ ایسی آواز آئی جیسے وہ مسز لوئیس کا منہ چوم رہی ہو ۔ گاگن نے بغیر کچھ کہے شاخ میرے حوالے کردی ۔ میں نے بھی چپ چاپ اُسے جیب میں رکھ لیا ۔ اس کے بعد میں دریا کے پار اتر گیا ۔

مجھے یاد ہے کہ راستے میں مجھے کسی خاص بات کا دھیان نہ تھا ، مگر دل پر ایک عجیب قسم کا بوجھ تھا ۔ یکایک ایک ایسی تیز ، مانوس خوشبو کی لپٹ آئی جو عام طور سے جرمنی میں نہیں پائی جاتی ۔ میں رک گیا ' سڑک کے کنارے سن کا ایک تختہ نظر پڑا ۔ اُس کی خوشبو نے جو استیپی میں اس قدر عام ہے فوراً وطن کی یاد دلاکر حب وطن کی آنچ بھڑکا دی ۔ میرے دل میں یہ آرزو چٹکیاں لینے لگی کہ روسی فضا میں سانس لوں ، روسی سرزمین پر پاؤں رکھوں ۔ میں نے چیخ کر کہا ' میرا یہاں کیا کام ہے ؟ غیر ملکوں میں ، اجنبیوں میں کیوں مارا مارا پھر رہا ہوں ؟ ' جو گرانی دل میں تھی ' وہ ایک تیز چبھن اور اختلاج میں بدل گئی ۔ گھر پہنچا تو ایک دن پہلے سے بالکل مختلف جذبات دل میں تھے ۔ غصّے کے مارے اپنے آپ میں نہ تھا ۔ طبیعت بہت دیر میں بحال ہوئی ۔ اس غصّے کی میں کوئی تاویل نہ کرسکا ۔ آخر بیٹھ گیا اور عیار بیوہ کا خیال کرنے لگا (ہر روز شام کو بلاناغہ ' فرض کے طور پر خاتون مذکورہ کا تصوّر باندھتا تھا) ۔ اُس کا ایک خط نکالا ، مگر اُسے کھولا تک نہیں ۔ خیالات نے فوراً دوسرا پلٹا کھایا ۔ میں نے آسیا کو دل میں رکھ کر طرح طرح کے نقشے بنانے شروع کئے ۔ خیال آیا کہ گاگن نے گفتگو کے دوران میں بعض دشواریوں ' بعض رکاوٹوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو اُس کے روس واپس جانے میں حائل تھیں ... میں نے بلند آواز سے کہا ' تو کیا واقعی وہ اُس کی بہن ہے ؟ '

کپڑے بدل کر میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا ' مگر گھنٹہ بھر بعد پھر بچھونے پر بیٹھا تھا ، کہنی تکئے پر ٹکی ہوئی تھی اور اس سیماب وش ' بناوٹی ہنسی والی چھوکری ' کے خیال میں غرق

تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا "اس کا نقشہ ریفیل کی گلیٹیا سے جو فارنیز محل میں ہے کتنا ملتا جلتا ہے۔ کچھ ہو، وہ اُس کی بہن نہیں ہے۔"

بیوہ کا خط، چاندنی میں ایک سفید دھبے کی طرح ساکت وساکن، فرش پر پڑا تھا۔

۵

اگلے دن صبح کو میں پھر آ پہنچا۔ اپنے دل میں کہا کہ گاگن سے ملنے جاتا ہوں، مگر اصل غرض یہی کہ دیکھوں آسیا کیا کرتی ہے: کیا وہ پھر منٹ منٹ میں چولا بدلے گی؟ وہ دونوں گول کمرے میں ملے۔ شاید اس وجہ سے کہ تمام دن اور تمام رات روس کا خیال میرے دماغ پر چھایا رہا تھا، آسیا مجھے ٹھیٹ روسی لڑکی معلوم ہوئی، اور وہ بھی ایک فرد تر طبقے کی لڑکی، کم وبیش ایک خادمہ۔ وہ ایک پرانا گاؤن پہنے، بال کانوں کے پیچھے سلجھائے، چوہیا کی طرح کھڑکی سے لگی بیٹھی تھی اور اس انہماک سے کچھ کاڑھ رہی تھی گویا اُس کی تمام عمر اسی کام میں گزری ہے۔ اُس کی شکل سے سادگی اور نرمی برستی تھی۔ اس نے مشکل سے کوئی بات کی اور خاموشی سے اپنے کام پر نظر جمائے رکھی۔ اُس کے بشرے سے ایسا معمولی، عامیانہ انداز ٹپکتا تھا، کہ میری نظر میں عام روسی لڑکیوں کا نقشہ پھر گیا۔ اس مشابہت کو پورا کرنے کے لئے وہ ایک ہلکا سا گیت گنگنانے لگی۔ اس کا سبک چہرا اُترا ہوا تھا اور اُس پر اُداسی تھی۔ مجھے پچھلی رات کے نقشے یاد آئے اور میرے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔

موسم بہت دل فریب تھا، گاگن بولا "آج کسی منظر کی نقاشی کروں گا۔" میں نے پوچھا "میں تمھارے ساتھ چلوں تو تمھارے کام میں ہرج تو نہ ہوگا؟" اُس نے کہا "ضرور چلو۔ تمھارے مشورے سے مستفید ہوسکوں گا۔"

اُس نے وان ڈائک کی وضع کی ٹوپی اوڑھی، لبادہ پہنا، بغل میں قرطاس دبایا، اور روانہ ہوگیا۔ میں اُس کے پیچھے ہولیا۔ آسیا گھر پر ٹھیر گئی۔ گاگن نے چلتے وقت اُس سے کہا "ذرا خیال

رکھنا شوربہ زیادہ پتلا نہ ہو۔' آسیا نے کہا' باورچی خانے میں ہو آؤں گی۔' گاگن اُس وادی میں پہنچا جہاں میں پہلے جا چکا تھا، ایک پتھر پر بیٹھ گیا' اور ایک کھوکھلے بلوط کی جس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں تصویر بنانے لگا۔ میں نے گھاس پر لیٹ کر ایک کتاب نکالی۔ مگر میں دو صفحے بھی نہ پڑھ سکا اور اُس نے مفت میں کاغذ کا ایک قطعہ خراب کیا۔ ہم نے سوائے باتوں کے کچھ نہیں کیا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکتا ہوں، ہم کافی دانائی اور باریکی سے اس قسم کے مباحث پر باتیں کرتے رہے: کام کرنے کے صحیح طریقے، کن چیزوں سے بچنا چاہیئے، کن باتوں پر عمل کرنا چاہیئے' ہماری صدی میں آرٹسٹ کی حقیقی قدر وقیمت کیا ہے۔ آخر گاگن نے یہ طے کیا' میری طبیعت آج حاضر نہیں ہے' اور میرے برابر گھاس پر لیٹ گیا۔ پھر تو ہماری ولولے، تخیل اور جوش سے لبریز فصاحت بہ نکلی۔ یہ گفتگو اُن عام اصول پر مشتمل تھی جن کا ذکر روسی خوب پھیلاؤ کے ساتھ کرتا ہے۔ جب ہم خوب جی بھر کے باتیں کر چکے اور اطمینان کے جذبے سے اس طرح معمور ہو گئے' گویا ہم نے کوئی مہم سر کر لی' کوئی بڑی بازی جیت لی' تو گھر کا رُخ کیا۔ آسیا اُسی حالت میں ملی جس میں میں اُسے چھوڑ گیا تھا۔ غور کرنے کے باوجود نہ اُس میں جھوٹی لگاوٹ کی جھلک نظر آئی' نہ یہ خیال ہوا کہ اُس نے جان بوجھ کر کوئی نیا سانگ بھرا ہے۔ اس مرتبہ ناممکن تھا کہ اُسے بناوٹ کا الزام دیا جا سکے۔

گاگن نے کہا 'آہا! آسیا نے آج اپنے پر روزہ اور ریاضت عائد کی ہے۔'

شام کے قریب اُس نے کئی بار انگڑائی لی اور اُسے چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی سویرے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی جلد گھر آ گیا۔ واپسی میں کسی قسم کے خیالات میرے دل میں نہیں آئے؛ وہ دن سنجیدہ قسم کے احساسات کی نذر ہوا۔ صرف اِتنا یاد ہے کہ جب میں سونے کے لئے لیٹا' تو میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

'لڑکی کیا ہے گرگٹ ہے!' تھوڑی دیر سوچ کر پھر کہا' کچھ ہو' اُس کی بہن نہیں ہے۔'

۶

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ گاگن اور آسیا سے میں روز ملتا تھا۔ آسیا مجھ سے کھنچی تھی لیکن اُس سے وہ چلبلی حرکتیں پھر کبھی سرزد نہیں ہوئیں جنھوں نے ملاقات کے پہلے دو دن مجھے اس قدر شکنجے میں ڈالا تھا۔ وہ کچھ اندر ہی اندر گھائل اور مضطرب نظر آتی تھی؛ ہنستی بھی پہلے سے کم تھی، میں اُسے تجسّس کی نظروں سے دیکھتا تھا۔

وہ جرمن اور فرانسیسی کافی روانی سے بولتی تھی؛ مگر اُس کی ہر بات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بچپن سے عورت کے سائے سے محروم رہی ہے، نیز یہ کہ اُس کی تعلیم غیر معمولی، بے قاعدہ اور گاگن سے مختلف قسم کی رہی ہے۔ وہ، اپنی وان ڈائک کی وضع کی ٹوپی اور لبادے کے باوجود، ایک سرتاپا ملائم، نیم نسائی روسی رئیس معلوم ہوتا تھا، مگر آسیا میں اس طبقے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس کی حرکتوں میں ایک قسم کی بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ خود رو گلاب کا پیوند لگے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا؛ نئی شراب میں ابھی اُبال تھا۔ وہ فطرتاً شرمیلی اور حیادار تھی، مگر اپنے شرمیلے پن سے برہم تھی؛ اور اس غصّے کو چھپانے کے لئے ظاہر یہ کرنا چاہتی تھی، کہ میں بالکل بے باک، آزاد اور مطمئن ہوں۔ اس میں وہ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتی تھی۔ میں جب کبھی اُس سے، روسی میں، اُس کی زندگی، اُس کے ماضی کی بابت گفتگو کرتا، تو وہ میرے سوالوں کا بادلِ ناخواستہ جواب دیتی۔ تاہم میں سمجھ گیا کہ سیاحت کے لئے نکلنے سے پہلے وہ عرصے تک دیہات میں رہ چکی ہے۔ ایک دفعہ اتفاقاً اُس کے پاس آنکلا۔ محویت کے عالم میں اکیلی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ سر ہاتھوں میں تھا، انگلیوں کو بالوں میں پرو لیا تھا، اور کتاب کی سطروں کو ذوق و شوق سے جذب کر رہی تھی۔

میں نے قریب پہنچ کر کہا 'شاباش! پڑھنے کی کتنی شوقین ہو!' اُس نے سر اُوپر اُٹھا کر متانت اور سختی سے میری طرف دیکھا۔ 'آپ سمجھتے ہیں کہ ہی ہی کرنے کے سوا مجھے کچھ نہیں آتا۔' قریب تھا کہ وہ اُٹھ کر چلی جائے۔

میں نے کتاب کے عنوان پر نظر ڈالی ؛ کوئی فرانسیسی ناول تھا۔

'میں تمھارے انتخاب کی داد نہیں دے سکتا۔'

'پھر کیا پڑھوں ؟' یہ کہہ کر اُس نے کتاب میز پر پٹخ دی' اور کہنے لگی 'تو یونہی وقت ضائع کرتی رہوں ؟' یہ کہہ کر باغ میں بھاگ گئی۔

اُس دن شام کو میں گاگن کو "ہرمان اور ڈورو تھی" پڑھ کر سنا رہا تھا۔ آسیا شروع میں آس پاس ٹہلتی رہی ؛ یک لخت ٹھیر گئی ' غور سے سننے لگی ' چپکے سے میرے پاس آکر بیٹھ گئی ' اور آخر تک بیٹھی سنتی رہی۔ اگلے دن اُسے پہچاننے میں مجھے تامل ہُوا۔ پہلے میں نہیں سمجھا کہ اسے خیال ہوگیا ہے میں بھی ڈورو تھی کی طرح سگھڑ اور سلیقہ مند بن جاؤں۔ الغرض' میری نظروں میں وہ ایک نیم سربستہ راز تھی۔ رعونت اور خود پسندی کا مادّہ اُس میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا جب میں اس سے آزردہ ہوتا تھا' اُس وقت بھی اُس کی کشش میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ ایک بات کا مجھے ہر گھڑی زیادہ یقین ہوتا جاتا جاتا تھا' اور وہ یہ تھی کہ یہ گاگن کی بہن نہیں ہے۔ اُس کے ساتھ گاگن کا برتاؤ بھائی کا سا نہ تھا۔ اس میں زیادہ لاڈ' زیادہ چاپلوسی' اور ساتھ ہی کچھ کھنچاؤ پایا جاتا تھا۔

ایک عجیب واقعے سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔

ایک دن شام کو میں اُن کے مکان پر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ یہ دیکھ کر میں بلا تامل ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر سے اندر کود گیا۔ وہاں سے تھوڑی دور سڑک کے ایک رُخ ' پھولوں کا ایک کنج تھا۔ میں اُدھر سے گزرنے والا تھا کہ اتنے میں آسیا کی آواز میرے کان میں آئی۔ وہ پُر جوش' بھرائی ہوئی آواز سے ذیل کے الفاظ ادا کر رہی تھی :

'نہیں ! مجھے تمھارے سوا ہرگز کسی سے محبت نہیں ہے۔ نہیں' ہرگز نہیں ! میں صرف تمھیں چاہوں گی' ہمیشہ' ہمیشہ !'

'دیکھو' آسیا' اپنے دل کو سنبھالو۔ تم جانتی ہو مجھے تمھارا اعتبار ہے۔'

اُن کی آوازیں کنج میں سے آرہی تھیں۔ میں دونوں کو پتوں کی ایک جالی میں

سے دیکھ رہا تھا۔ اُنھوں نے مجھے نہیں دیکھا۔

اُس نے پھر کہا ' ہاں ، تمھیں ، صرف تمھیں ' اور خود کو گاگن کے بازوؤں کے سپرد کردیا۔ ہچکیاں لے لے کر اُسے پیار کرنے لگی ' اور اُس کے سینے سے چمٹ گئی۔

اپنا ہاتھ اُس کے بالوں پر آہستہ آہستہ پھیر کر وہ کہہ رہا تھا ' بس ، بس ! '

تھوڑی دیر کے لئے میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کیا اُن کے پاس جاؤں۔ تیر کی طرح دماغ میں یہ خیال گزرا کہ نہیں جانا چاہیے ' ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ یہ طے کر کے تیز قدم ڈالتا ہوا چار دیواری کے پاس پہنچا اور اُس پر سے کود کر سڑک پر آگیا۔ بھاگا بھاگ کر گھر پہنچا۔ راستے میں آپ ہی آپ مسکرایا ' ہاتھ سے ہاتھ ملا ' اس عجیب اتفاق پر دل میں حیرت ظاہر کی جس سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ (اپنے شکوک کے صحیح ہونے میں مجھے کبھی شبہ نہ تھا)۔ با ایں ہمہ ' میرے دل میں بے حد تلخی تھی۔ میں نے سوچا ' اُن لوگوں کو بننا خوب آتا ہے۔ اس سے کیا حاصل ہوا ؟ گاگن نے مجھے کیوں دھوکا دیا ؟ اُس سے اس کی توقع نہ تھی .... روٹھوں کے منانے کا نظارہ کس قدر اثر انگیز تھا۔

۷

رات کو نیند اچھی طرح نہیں آئی۔ صبح سویرے اُٹھا ' پشت پر سامان کا تھیلا باندھا ' مکان والی سے کہا کہ رات کو میرا انتظار نہ کرنا ' اور ندی کے بالائی حصّے کے رُخ جس پر ز۔ واقع ہے ' پہاڑوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ پہاڑیاں علم طبقات الارض کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہیں ' مگر ارضیاتی مشاہدات سے مجھے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی۔ میں خود نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ صرف ایک خیال ۔ گاگن اور آسیا کی ملاقات سے گریز ۔ میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ ان سے اس فوری بے زاری کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُنھوں نے مجھے دھوکا دیا۔ کس نے کہا تھا کہ وہ اپنے کو بھائی بہن ظاہر کریں ؟ میں نے چاہا کہ اُن کا خیال دل میں نہ آنے دوں۔ پہاڑیوں اور وادیوں کے دامن میں قدم قدم چلا ' گاؤں کی سراؤں میں بیٹھا ' سرائے والوں سے ' اُن لوگوں کے

جو وہاں کھاتے پیتے نظر آئے اطمینان سے بات چیت کی، دھوپ سے تپتے ہوئے چپٹے پتھر پر لیٹ کر بادلوں کو تیرتا ہوا دیکھا جسن اتفاق سے موسم بہت نفیس تھا۔ ان مشغلوں میں تین دن گزر گئے، اور یہ وقت لطف سے خالی نہیں گزرا، گو کبھی کبھی میرا دل درد سے بھر آتا تھا۔ میرے دماغ کے میلان کو اس خاموش علاقے کے سکون سے ایک خاص ربط تھا۔

میں نے اپنے دماغ کو اتفاقی اثرات کے لئے وقف کر دیا؛ یہ تسلسل کے ساتھ، نرم روی سے میری روح میں سے گزرتے تھے، اور اُس پر ایک عام نقش چھوڑ جاتے تھے۔ اس میں وہ سب گھلو ملا ہوتا تھا جو میں نے اِن تین دن میں دیکھا تھا، محسوس کیا تھا، اور سنا تھا۔ سب، جنگل میں کشمکش کی بھینی بھینی خوشبو، ہُد ہُد کی آواز اور کھٹ کھٹ، شفاف ندیوں کی روانی کا شور جاری، اُن کی رتیلی تہ میں تیرتی ہوئی دھاری دار مچھلیاں، پہاڑ کے نرم خاکے، سیاہ چٹانیں، چھوٹے چھوٹے پاک صاف گاؤں اور اُن کے پُرانے پُرانے مقدّس گرجا اور درخت، مرغزاروں میں بگلے، خوشنما پن چکیاں اور اُن کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیے، گاؤں والوں کی ہنس مکھ شکلیں، اُن کے نیلے نیلے لبادے اور خاکی جرابیں، چر چر کرتی، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گاڑیاں جنہیں مسکین گھوڑے اور بعض اوقات بیل کھینچتے تھے، لمبے لمبے بالوں والے نوجوان جو صاف سڑکوں پر ٹہلتے تھے، سڑکوں کے کنارے کنارے سیب اور ناسپاتی کے درخت . . .

اب بھی میں اُن ایام کے نقوش کو یاد کر کے لطف اُٹھاتا ہوں۔ تجھ پر رحمت ہو، جرمنی کے سادہ گوشے! تیرے باشندوں کی بے لوث قناعت اور صبر و سکون سے ملی ہوئی محنت پر امن اور سلامتی ہو، !

تیسرے دن شام کو گھر پہنچا۔ یہ کہنا بھول گیا کہ گاگن اور آسیا کے علی الرغم میں نے سنگدل بیوہ کے تصوّر میں جان ڈالنی چاہی، مگر میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں۔ مجھے خوب یاد ہے جب اُس کا تصوّر باندھنے پر دل کو رجوع کیا، تو میری نظروں کے سامنے ایک پانچ سال کی چھوٹی سی دیہاتی لڑکی آ گئی۔ اُس کا چہرہ گول گول تھا، اور وہ کچھ ایسی بھولی بھولی نظروں سے مجھے تک

رہی تھی کہ اُس کی معصوم ٹکٹکی کے روبرو میں پانی پانی ہوگیا ؛ اُس کے سامنے اپنے دل کو دھوکا نہ دے سکا ، اور اپنی سابق منظور نظر کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا۔

گھر پر گاگن کا رقعہ ملا۔ میرے اس طرح چلے جانے پر حیرت ظاہر کی تھی ؛ شکایت کی تھی کہ مجھے ساتھ کیوں نہ لیا ؛ اصرار کیا تھا کہ واپس آتے ہی ملو۔ خط پڑھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر اگلے دن صبح کو اُن سے ملنے پہنچا۔

۸

گاگن نہایت تپاک سے ملا اور محبت بھرے شکوے شکایت کی بھرمار کردی ' لیکن آسیا دانستہ ، بلا کسی وجہ کے ، مجھے دیکھتے ہی کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور اپنی عادت کے مطابق فوراً بھاگ گئی۔ گاگن بدحواس ہوگیا۔ آہستہ سے کہنے لگا " لڑکی کا دماغ چل گیا ہے ' اور اس کی طرف سے معذرت کرنے لگا۔ آسیا کی اس حرکت سے میں بہت آزردہ ہوا۔ یوں ہی میری طبیعت قابو میں نہیں تھی ' اور اُس پر یہ ہنسی جو دراصل ہنسی نہیں تھی ' یہ نئے نئے انداز سے منہ بنانا ... میں نے یہ ظاہر کیا جیسے کچھ نہیں دیکھا اور گاگن کو اپنی مختصر سیاحت کے کچھ واقعات سنانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ میری موجودگی میں وہ کیا کرتا رہا۔ مگر ہماری گفتگو ڈھیلی پڑ گئی۔ آسیا کمرے میں آئی اور پھر بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا " مجھے گھر پر ایک ضروری کام ہے۔ اب جاؤں گا۔ ' گاگن نے شروع میں ٹھیرانے کی کوشش کی ' پھر میری طرف غور سے دیکھ کر تھوڑی دور ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگیا۔ دروازے میں اچانک آسیا میرے پاس پہنچی اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے ہلکے سے اُس کی اُنگلیوں کو چھوا اور سر کو خفیف سی جنبش دی۔ گاگن نے ساتھ رائن کو عبور کرکے ہم اُس درخت کے پاس پہنچے جہاں مریم کا بت تھا اور منظر سے لطف اُٹھانے کے لئے بنچ پر بیٹھ گئے۔ ہم میں جو باتیں ہوئیں ، وہ قابلِ ذکر ہیں۔

پہلے کچھ رسمی گفتگو ہوتی رہی ' پھر دونوں چپ چاپ بیٹھے چمکتے ہوئے دریا کی طرف دیکھتے رہے۔

گاگن نے اکبارگی مسکرا کر پوچھا ' یہ بتاؤ ' آسیا کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے؟ غالباً تم
ںگے کہ عجیب انوکھی لڑکی ہے۔ '
یں نے حیرت سے کہا ' ہاں۔ ' مجھے یہ خیال نہیں تھا کہ وہ آسیا کا ذکر چھیڑ دے گا۔
' اس کی نسبت رائے قائم کرنے سے پہلے ضرورت اس کی ہے کہ اس سے اچھی طرح
ہو۔ وہ دل کی بہت اچھی ہے ' مگر اس کے مزاج میں ہٹ ہے۔ اس کے ساتھ نباہنا آسان کام
ن تھیں اس کے حالات معلوم ہوں ' تو اسے قابلِ الزام نہ ٹھیراؤ۔ '
' اس کے حالات ؟ کیوں ' کیا وہ تمھاری — '   گاگن نے میری طرف دیکھا۔
' شاید تم سمجھتے ہو کہ وہ میری بہن نہیں ہے ؟ ' میری گھبراہٹ کو نظر انداز کر کے '
فتگو جاری رکھی۔ ' نہیں ' وہ واقعی میری بہن ' میرے باپ کی بیٹی ہے۔ تمھیں اس کی پوری
ناتا ہوں۔ تم پر مجھے پورا بھروسا ہے۔
' میرے والد بہت خلیق ' ذہین ' شائستہ مگر بدبخت آدمی تھے۔ قسمت نے اُن کی
سلوک کیا جو وہ سب کے ساتھ کرتی ہے ' لیکن وہ اس کی پہلی ضرب سے سنبھل نہ سکے۔ انھوں
دی کر لی جو محبت کا نتیجہ تھی ؛ اُن کی بیوی ' میری والدہ کا اس کے تھوڑے عرصے بعد انتقال ہوگیا۔
وقت صرف چھ مہینہ کا تھا۔ میرے والد مجھے اپنے گاؤں کی جاگیر پر لے گئے اور بارہ سال تک
ے باہر قدم نہیں رکھا۔ وہ خود مجھے پڑھاتے تھے ؛ اگر اُن کے بھائی ' میرے چچا ہم سے ملنے گاؤں
تے ' تو کبھی مجھ سے جدا نہ ہوتے۔ یہ چچا ہمیشہ پیٹرز برگ میں رہتے تھے۔ وہاں وہ ایک بہت
ے پر مامور تھے۔ انھوں نے میرے والد کو ترغیب دی کہ ' اسے میرے سپرد کر دو ' کیونکہ
حال میں گاؤں سے نکلنا نہیں چاہتے۔ اس عمر کے بچے کے لئے اس طرح رہنا مضر ہے۔ تم
ردہ خاطر ' کم سخن اتالیق کی صحبت میں یہ لامحالہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے تعلیم میں پیچھے رہ
اور بہت ممکن ہو اس کی طبیعت پر بھی تنہائی کا برا اثر پڑے۔ ' میرے والد نے بہت دن تک
بھائی کا کہنا نہیں سنا ' مگر آخر مان گئے۔ والد سے رخصت ہوتے وقت میں رونے لگا۔ مجھے

اُن سے محبت تھی، گو اُن کو کبھی مُسکراتے نہیں دیکھا تھا... لیکن پیٹرز برگ پہنچ کر میں بہت جلد اپنے تاریک سنسان گھر کو بھول گیا۔ میں فوجی مدرسے میں داخل ہوگیا اور وہاں سے ایک پلٹن میں منتقل ہوگیا ہر سال چند ہفتے کے لئے گھر جاتا تھا اور ہر بار والد کو پہلے سے زیادہ افسردہ، اپنے حال میں محو، مغموم اور حیران پریشان پاتا تھا۔ وہ روز گرجا جاتے تھے، اور بات چیت کرنے کی عادت سے دست کش ہوگئے تھے۔ ایک دفعہ گھر پہنچا - میری عمر اُس وقت کوئی بیس سال کی تھی - تو میں نے ایک دُبلی پتلی کالی آنکھوں والی دس سال کی لڑکی کو دیکھا۔ یہ آسیا تھی۔ میرے والد نے کہا "یہ یتیم ہے۔ میں نے ترس کھا کر رکھ لیا ہے۔" یہ بجنسہٖ اُن کے الفاظ ہیں۔ میں نے آسیا کی طرف کوئی خاص التفات نہیں کیا۔ وہ شرمیلی، ہاتھ پیر کی چست اور چپ چپ سی تھی۔ جونہی میں اپنے والد کے خاص کمرے میں داخل ہوتا یہ لمبا تاریک کمرا تھا! میری والدہ کا انتقال اسی میں ہوا تھا اور یہاں دن کو بھی موم بتیاں جلائی جاتی تھیں - وہ فوراً جھپٹ کر اُن کی آرام کرسی یا اُن کی کتابوں کی الماری کے پیچھے چھپ جاتی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اُس دفعہ کے بعد تین چار سال تک ملازمت کے فرائض نے مجھے گھر جانے کا موقع نہ دیا۔ ہر مہینے میرے پاس والد کا مختصر خط آتا تھا! آسیا کا وہ بہت کم ذکر کرتے تھے، اور وہ بھی ضمناً۔ وہ پچاس سال سے متجاوز تھے، مگر جوان معلوم ہوتے تھے۔ اچانک ہمارے داروغہ کا خط پہنچا کہ "آپ کے والد صاحب سخت بیمار ہیں۔ اگر آپ انکی صورت دیکھنا چاہتے ہیں تو فوراً تشریف لائیے۔" سمجھ سکتے ہو کہ یہ خط پڑھ کر میرے دل پر کیا گزری ہوگی۔ بے سروپائی کے عالم میں گھر پہنچا۔ والد کوئی دم کے مہمان تھے۔ مجھے دیکھ کر اُنھیں تسکین ہوئی۔ اپنے نحیف بازوؤں سے اُنھوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور ایک نیم متجسّس، نیم ملتجی نظر سے دیر تک مجھے دیکھتے رہے۔ مجھ سے وعدہ لے کر کہ میں اُن کی آخری درخواست کو پورا کروں گا، اُنھوں نے اپنے قدیم خدمت گار سے آسیا کو بلوایا۔ بڑے میاں اُسے بلا لائے۔ وہ سیدھی کھڑی نہیں ہوسکتی تھی اور تھر تھر کانپ رہی تھی۔

والد نے بہ دشواری کہا "اب میں اپنی بیٹی، تمھاری بہن کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اس کا پورا حال تمھیں یاکوف سے معلوم ہوجائے گا!" اُنھوں نے اپنے خدمت گار کی طرف اشارہ کیا۔

آسیا کے ہچکیاں بندھ گئیں اور وہ منہ کے بل بستر پر گر پڑی ... اُس کے آدھ گھنٹے بعد میرے والد کا انتقال ہو گیا۔

جو کچھ مجھے معلوم ہوا، یہ تھا۔ آسیا میری والدہ کی ایک قدیم خادمہ ٹاٹیانا کے وطن سے میرے والد کی بیٹی تھی۔ یہ ٹاٹیانا مجھے خوب یاد ہے۔ اُس کا بلند بالا، متناسب جسم، اس کا حسین، سنجیدہ چہرا، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میری نظروں میں ہیں۔ وہ ایک مغرور، اکل کھری لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ جہاں تک میں یاکوف کے مودب، نامکمل فقروں سے اندازہ لگا سکا، میرے والد کو اُس سے میری والدہ کے انتقال کے چند سال بعد محبّت ہو گئی۔ اُس وقت ٹاٹیانا والد کے ساتھ ہمارے مکان میں نہیں رہتی تھی، بلکہ اپنی شادی شدہ بہن کے ہاں تھی۔ یہ بہن ہماری گوالن تھی۔ میرے والد کو اُس سے بہت محبت ہو گئی اور میرے گاؤں سے چلے جانے کے بعد اُنھوں نے اُس سے شادی بھی کرنی چاہی، مگر اُن کے پیہم اصرار کے باوجود وہ اُن کی بیوی بننے پر تیار نہ ہوئی۔

یاکوف نے، جو اپنے ہاتھ پیچھے کئے دروازے میں کھڑا تھا، مجھے بتایا "مرحومہ ٹاٹیانا وسیلیونا بہت سمجھدار عورت تھی اور آپ کے والد صاحب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ 'مجھ میں حوصلہ نہیں کہ آپ کی بیوی بنوں؛ بیگم بننے کی قابلیت مجھ غریب میں کہاں!' حضور، یہ لفظ اُس نے خود اپنی زبان سے میری موجودگی میں کہے۔" ٹاٹیانا نے یہ بھی منظور نہ کیا کہ ہمارے یہاں آکر رہے۔ آسیا کے ساتھ آخر وقت تک اپنے بہن ہی کے ہاں رہی۔ بچپن میں صرف خاص مذہبی تہواروں پر میں ٹاٹیانا کو گرجا میں دیکھتا تھا۔ سیاہ رومال سر پر بندھا ہوا، زرد دوشالہ کندھے پر ڈالے، وہ ایک کھڑکی کے قریب والے مجمع میں کھڑی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے شفاف شیشوں میں سے اُس کے نقشے کا ایک رُخ جھلکتا تھا۔ متانت اور وقار سے قدیم وضع سے سربسجود ہو کر دعا مانگتی تھی۔ جب میرے چچا مجھے اپنے ساتھ لے گئے تو آسیا صرف دو سال کی تھی؛ جب اُس کی ماں کا انتقال ہوا تو اُس کی عمر نو برس کی تھی۔

ٹاٹیانا کی موت کے فوراً بعد میرے والد نے آسیا کو اپنے ہاں بلا لیا۔ اس سے پہلے بھی اُنھوں نے اُسے اپنے ساتھ رکھنے کی خواہش کی تھی، مگر ٹاٹیانا نے اُسے بھیجنے سے انکار کر دیا

تھا. سمجھ سکتے ہو کہ اپنے آقا کے مکان میں پہنچ کر اُس کے دل میں کیا خیالات آئے ہوں گے. آج تک اسے
وہ دن یاد ہے جب اُسے پہلی مرتبہ ریشمی پوشاک پہنائی گئی اور نوکروں نے تعظیماً اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا.
اُس کی ماں نے اپنی زندگی میں اُسے بہت سختی سے پالا تھا؛ میرے والد کے پاس پہنچ کر اُسے پوری
آزادی مل گئی. مرحوم اُس کے اتالیق تھے؛ ان کے علاوہ وہ کسی اور سے نہیں ملتی تھی. اُنھوں نے
اُسے بگاڑا تو نہیں، یعنی وہ اُس کا زیادہ چاؤ چونچلا نہیں کرتے تھے، مگر اُنھیں اُس سے بے انتہا محبت
تھی اور کسی بات میں اُس کا کہنا نہیں ٹالتے تھے. اُن کے دل میں خیال تھا کہ میں نے اُس کے ساتھ
زیادتی کی ہے. آسیا کو جلد اندازہ ہو گیا کہ میں گھر کی رانی ہوں. وہ جان گئی کہ جسے میں آقا سمجھتی تھی،
وہ میرا باپ ہے؛ مگر اسی قدر جلد اپنی ناجائز حیثیت سے بھی آگاہ ہو گئی. خود پرستی اُس میں شدت سے
ترقی پا گئی، نیز بے اعتباری؛ بُری خصلتیں جڑ پکڑ گئیں، سادگی جاتی رہی. وہ چاہتی تھی (ایک دفعہ
خود اُس نے مجھ سے اس کا اقرار کیا) کہ میں ساری دنیا کو مجبور کر دوں کہ میری اصلیت کو بھول جائے.
اپنی ماں کے ذکر سے اُسے عار آتا تھا، اور اس شرمندگی پر خفیف ہوتی تھی، اور ساتھ ہی اپنی ماں پر
ناز بھی کرتی تھی. بات یہ ہے کہ وہ بہت سی ایسی باتیں جان گئی تھی، اور جانتی ہے، جو اُس کی عمر کے
لئے نازیبا تھیں... مگر اس میں اُس کا کیا قصور؟ شباب کی قوتیں اس میں کام کر رہی تھیں؛ خون
میں حرارت تھی، اور ایسا کوئی تھا نہیں جو اس کی دیکھ بھال کرتا. ہر بات میں پوری آزادی. ایسی
آزادی وبال سے کم نہیں ہوتی! شریف گھرانوں کی لڑکیوں سے وہ کسی بات میں پیچھے نہیں رہنا چاہتی
تھی. اس نے کتابوں کی طرف رجوع کیا، مگر اُن سے کیا حاصل ہوتا؟ اُس کی زندگی کی بے ترتیبی میں
کوئی فرق نہیں آیا، مگر اُس کا دل خراب نہیں ہوا تھا، اُس کا دماغ صحیح تھا.

دوسری طرف میں تھا، ایک بیس سال کا لڑکا جسے ایک تیرہ سال کی لڑکی سونپ دی
گئی تھی. والد کے انتقال کے کچھ دن بعد تک اُس کی یہ کیفیت تھی کہ میری آواز سے بھڑکتی تھی، میرا
پیار اُس کے لئے موجب اذیت تھا. بہت دنوں میں رفتہ رفتہ میں نے اُسے پرچایا. یہ سچ ہے کہ جب
اُسے یقین ہو گیا کہ میں اُسے واقعی اپنی بہن سمجھتا ہوں اور اُس کا خیال رکھتا ہوں، تو وہ دل و جان

سے میری گرویدہ ہوگئی: اُس کی کوئی بات ادھوری، سموئی ہوئی نہیں ہوتی۔

میں اُسے پیٹرزبرگ لے گیا۔ اُس کی جُدائی مجھے شاق تھی، مگر ہمارا ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ وہاں میں نے اُسے ایک اعلیٰ درجے کے بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ آسیا سمجھ گئی کہ اب جُدائی سے مفر نہیں، مگر کڑھ کڑھ کر اتنا بُرا حال کرلیا کہ مرتے مرتے بچی۔ لیکن بعد میں دل کڑا کرکے اُس نے چار سال اسکول میں گزار دیئے۔ مگر میری امید کے برخلاف جیسی تھی ہوبہو ویسی ہی رہی۔ مدرسے کی بڑی اُستانی اکثر بہ سبیل شکایت کہتی رہتی تھی "ہم اسے سزا بھی نہیں دے سکتے، اور نرمی سے یہ مانتی نہیں۔" آسیا سب لڑکیوں سے زیادہ تیز اور ذہین تھی، مگر قاعدے کی پابندی اُس سے کبھی نہیں ہوئی۔ وہ خود سر تھی اور ملنے جلنے سے بھاگتی تھی... الزام اُسے میں کس دل سے دیتا؟ اس کی حیثیت کا تقاضا تھا کہ یا تو دب کر رہے یا پھر سب سے کھنچی رہے۔ اپنی ہمجولیوں میں صرف ایک سے وہ بے تکلف ہوئی۔ یہ غریب خاندان کی ایک بدشکل لڑکی تھی جسے اور سب حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ دُوسری لڑکیاں جو اچھے گھرانوں کی تھیں اُسے پسند نہیں کرتی تھیں اور جہاں تک بن پڑتا تھا ستاتی اور چھیڑتی تھیں۔ آسیا نے اُن کی ذرا پروا نہ کی۔ ایک دن انجیل کے سبق میں اُستانی بدیوں کا ذکر کر رہی تھی۔ آسیا نے بلند آواز سے کہا "خوشامد اور بزدلی بدترین عیب ہیں۔" الغرض اس کی دنیا سب سے الگ تھی۔ اس میں کسی قدر آدمیت ضرور آ گئی تھی، گو میرے نزدیک اس لحاظ سے اُس نے کچھ بہت حاصل نہیں کیا۔

آخر وہ سترہ سال کی ہوگئی۔ اب اُسے مدرسے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ میں بڑی دشواری میں پھنس گیا۔ یکایک میرے ذہن میں خیال آیا کہ فوجی نوکری سے استعفا دے دوں اور آسیا کو ساتھ لیکر سال دو سال کے لئے کہیں باہر چلا جاؤں۔ خیال کے آتے ہی اُس پر عمل کیا، چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ ہم رائن کے کنارے ٹھیرے ہوئے ہیں۔ میں یہاں نقاشی اختیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور وہ ... اس کی حرکتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب بھی ایسی ہی شوخ اور منچلی ہے جیسی پہلے تھی۔ امید ہے کہ اب اُس کی نسبت تم بُری رائے قائم نہ کرو گے۔ گو وہ اسے ظاہر نہیں کرتا

چاہتی، مگر اچھی رائے کی اُس کے دل میں قدر ہے اور خاص کر تمھاری اچھی رائے کی۔'
گاگن اپنے ملائم انداز سے مسکرایا۔ میں نے گرم جوشی سے اُس کا ہاتھ دبایا۔
اُس نے پھر کہنا شروع کیا ' تو یہ قصّہ ہے۔ گر وہ مجھے کانٹوں پر رکھتی ہے۔ اُس کی مثال بارود کی ہے، معلوم نہیں کہ کس وقت پھٹ جائے۔ اب تک اُس کا دل کسی پر نہیں آیا۔ اگر کہیں کسی سے عشق ہو گیا تو خیر نہیں! بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔ جانتے ہو' ابھی چند دن ہوئے اُس نے کیا کیا؟ بیٹھے بیٹھے خبر نہیں کیا سوجھی، کہنے لگی ' تم پہلے کی نسبت سرد مہر ہو گئے ہو۔ میں تمھارے علاوہ کسی کو نہیں چاہتی اور کبھی کسی کو نہیں چاہوں گی۔' یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔
میں کہنے کو تھا ' اچھا' یہ بات تھی' مگر میں نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔
میں نے گاگن سے کہا (ہم میں کافی بے تکلفی ہو گئی تھی) ' اچھا' یہ بتاؤ کیا واقعی آسیا کا دل ابھی تک کسی پر نہیں آیا۔ پیٹرزبرگ میں وہ نوجوانوں سے ضرور ملتی ہوگی؟'
' ان لوگوں میں اُسے کوئی پسند نہیں تھا۔ بات یہ ہے آسیا کو کسی سُورما کی، کسی دنیا سے نرالے شخص کی، یا پھر پہاڑ کے درے میں کسی سراپا شعر چرواہے کی تلاش ہے.... میں ہو کہ باتیں کئے جاتا ہوں اور تمھیں روک رہا ہوں۔' یہ کہہ کر وہ اُٹھنے لگا۔
میں نے کہا ' چلو' تمھارے ہاں چلیں۔ ابھی گھر نہیں جانا چاہتا۔'
' تمھارے کام کا کیا ہوگا؟'
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گاگن مسکرایا۔ تھوڑی دیر میں ہم ل پہنچ گئے۔
جب میری نظر اُس انگور کے تختے اور سفید مکان پر پڑی' تو میرے دل میں ایک قسم کی مٹھاس تھی' گویا اُس کے اندر مخفی طور سے رَس بھر دیا گیا ہے۔ گاگن کی باتیں سُن کر میرے دل پر سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

۹

آسیا ہمیں مکان کے دروازے میں ملی. خیال تھا کہ میرا استقبال بھرپور ہنسی سے ہوگا، مگر وہ ہم سے ملنے کے لئے بڑھی، تو چہرا کمھلایا ہُوا، چُپ چُپ، نظریں نیچی کئے ہوئے.

گاگن نے کہا 'یہ اُلٹے پھر آئے، اور براہِ کرم یہ ملحوظ رہے کہ بالکل اپنی مرضی سے آئے ہیں.'

آسیا نے ازراہِ استفسار میری طرف دیکھا. اب میری باری تھی کہ اپنا ہاتھ پیش کروں؛ میں نے اس کی ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کو زور سے دبایا. اُس کی حالت پر مجھے بہت رحم آیا. اس اَن بوجھی پہیلی کا حل اب میری سمجھ میں آنے لگا؛ اس کی اندرونی بھڑک، ضبط کی کمی، سج دھج دکھانے کی کوشش کا راز آئینہ ہوگیا؛ میں نے اُس کی روح کی گہرائیوں کی ایک جھلک دیکھ لی. وہ اندر ہی اندر ایک عذاب میں مبتلا تھی. اس کا ناآزمودہ احساسِ نفس ایک انتشار، ایک کشاکش میں گرفتار تھا؛ لیکن اس کا پورا وجود جد و جہد کرتا تھا کہ سچائی کی طرف بڑھے، حقیقت پر قابو پائے. اب میں سمجھا کہ اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف میرا دل کیوں کھنچتا تھا — میں اُس کے نازک جسم کے نیم وحشی جادو ہی سے مسحور نہ تھا: میں اس کی روح کا متوالا تھا.

گاگن اپنی تصویریں الٹنے پلٹنے لگا. میں نے آسیا سے کہا 'چلو، انگور کے باغ میں ٹہلیں،' وہ فوراً شوق اور فروتنی سے تیار ہوگئی. ہم کچھ دور پہاڑی کی طرف گئے اور ایک چوڑے پتھر پر بیٹھ گئے.

آسیا کہنے لگی 'ہمارے بغیر تمھارا جی نہیں گھبرایا؟'

میں نے پوچھا 'تمھارا دل میرے بغیر گھبرایا؟'

اُس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا اور جواب دیا 'ہاں... اچھا، یہ بتاؤ پہاڑوں پر کیا بہت لطف آیا؟ بہت شاندار تھے؟ اونچے اونچے؟ بادلوں سے بھی اونچے؟ بتاؤ تم نے

کیا کیا دیکھا۔ تم بھائی کو بتا رہے تھے، مگر میں نے کچھ نہیں سُنا۔'

'اُس وقت تم خود اُٹھ کر چلی گئیں۔'

'ہاں' میں چلی گئی ... کیونکہ ... اب نہیں جاؤں گی۔' یہ اُس نے ایسے لہجے سے کہا گویا مجھے دلاسا دے رہی ہے۔ 'تم آج ناراض تھے۔'

'میں؟'

'ہاں' تم۔'

'خوب! کس بات پر؟'

یہ تو میں جانتی نہیں، مگر تم ناراض ضرور تھے' اور غصّے میں اُٹھ کر چلے گئے تھے۔ تمھارے اِس طرح چلے جانے کا مجھے صدمہ تھا۔ بہت خوشی ہوئی کہ تم واپس آ گئے۔'

مجھے بھی بہت خوشی ہوئی کہ واپس آ گیا۔'

آسیا نے آہستہ سے اپنے شانے پھڑکائے، جس طرح بچے خوشی کی حالت میں پھڑکاتے ہیں۔

'میں تاڑتی خوب ہوں! بعض اوقات صرف آبا کے کھنکارنے کی وضع سے دوسرے کمرے میں سمجھ جاتی تھی کہ وہ مجھ سے خوش ہیں یا نہیں۔'

اس سے پہلے اُس نے کبھی اپنے والد کا میرے سامنے نام نہیں لیا' اس وجہ سے مجھے حیرت ہوئی۔'

میں نے پوچھا' اپنے والد کو تم بہت چاہتی تھیں؟' یہ محسوس کر کے کوفت ہوئی کہ میرا چہرہ شرم کے مارے سُرخ ہو گیا۔

اُس نے جواب دیا۔ وہ بھی شرما گئی۔ دونوں چپ بیٹھے رہے۔ کچھ فاصلے پر ایک دُخانی جہاز غل مچاتا ہوا رائن پر سے گزر رہا تھا' دونوں اُسے دیکھنے لگے۔

آسیا نے آہستہ سے کہا' کچھ کہتے کیوں نہیں؟'

میں نے پوچھا' آج مجھے دیکھتے ہی کیوں ہنسنے لگی تھیں؟'

'میں خود نہیں جانتی۔ بعض اوقات جی چیخنے کو چاہتا ہے، مگر اس کی بجائے ہنستی ہوں۔ جو کچھ کرتی ہوں، اس سے میری نسبت رائے قائم نہ کرو۔ ہاں، خوب یاد آیا، یہ لوری لائی کا کیا قصہ ہے؟ وہ چٹان جو نظر آ رہی ہے، اُسی کی ہے؟ کہتے ہیں جب تک وہ عاشق نہیں ہوئی تھی، ہر ایک کو ڈبو دیتی تھی، مگر پھر خود دریا میں کود پڑی۔ مجھے یہ قصہ بہت پسند ہے۔ مسز لوئیس مجھے طرح طرح کی کہانیاں سناتی ہے۔ اُس کے پاس ایک کالی بلی ہے جس کی آنکھیں پیلی پیلی ہیں...'

آسیا نے اوپر کی طرف دیکھا اور لٹوں کو جھٹک کر بولی 'آہ، میں خوش ہوں'

اُسی وقت ہمارے کانوں میں ٹوٹی ہوئی، یکساں صدائیں آئیں۔ ہزاروں آدا میں ایک مناجات کو جو گائی جا رہی تھی مقررہ وقفوں سے دُہرا رہی تھیں۔ زائرین کا ہجوم نیچے سڑک پر صلیبوں اور علموں کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا...

آوازیں رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی جاتی تھیں۔ انھیں سُن کر آسیا نے کہا 'کاش ہم بھی ان کے ساتھ جا سکتے!'

'اتنی اللہ والی ہو؟'

'اگر کہیں دور دراز دعا مانگنے، کوئی بڑی مہم سر کرنے نکل جاتی... مگر ہوتا یہ ہے کہ دن گزرے جاتے ہیں، زندگی گزری جاتی ہے، اور ہم سے کچھ بن نہیں پڑتا۔'

'تم میں حوصلہ ہے۔ چاہتی ہو کہ اپنی زندگی کسی پاک مقصد کے لئے تج دو، اپنے پیچھے کوئی یادگار چھوڑ جاؤ...'

'تو کیا یہ ناممکن ہے؟'

'ناممکن' میری زبان سے نکلنے والا تھا، مگر میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں سے ایک تیز چمک نکل رہی تھی، اور صرف یہ کہا:

'کوشش کر کے دیکھ لو۔'

تھوڑی دیر چُپ بیٹھی وہ کچھ سوچتی رہی۔ ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا

تھا' چہرا اتر گیا تھا ۔ یکا یک بولی ' یہ بتاؤ ' اُن خاتون سے تمھیں بہت لگاؤ تھا ؟ ... تمھیں ہوگا ، کھنڈروں میں تم سے ملاقات کے دوسرے دن بھائی نے اُن کا جامِ صحت پیا تھا ۔'

' میں ہنسا ۔'

' تمھارے بھائی مذاق کر رہے تھے ۔ مجھے کبھی کسی خاتون سے لگاؤ نہیں کم از کم فی الحال کسی سے نہیں ہے ۔'

اُس نے بے ساختہ پن سے ' گویا کسی بات کا کھوج لگانا چاہتی ہے ' سر کے رُخ جھٹک کر پوچھا ' یہ بتاؤ عورتوں کی کیا بات تمھیں بھلی معلوم ہوتی ہے ۔'

' کس قدر عجیب سوال ہے ! '

آسیا شرما گئی ۔

' مجھے ایسا سوال نہیں کرنا چاہیے ' کیوں ؟ معاف کرو ، کیا کروں ' عادت ہے جو دل میں آتا ہے کہ ڈالتی ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ بات کرتے ہوئے ڈرتی ہوں ۔'

میں نے جلدی سے اُس کی بات کاٹ کر کہا ' جو دل میں آئے کہو ۔ خ لے ڈرو مت ۔ میں بہت خوش ہوں کہ آخر تم نے مجھ سے شرمانا کم کر دیا ۔'

آسیا نے نظریں جھکا لیں اور خوش ہو کر نرمی سے ہنسی ۔ میں نے اس ایسی ہنسی نہیں سُنی تھی ۔

اپنے لباس کا دامن تھپکتے ہوئے ' اُس کی ٹخنوں کو اپنے گھٹنے پر سنو ہوئے ' گویا بہت دیر تک بیٹھنے کی تیاری کر رہی ہے ' اس نے فرمائش کی ' کچھ کہو یا کچھ پڑھ جیسے تمھیں یاد ہوگا اُس روز ' اونیٹ گن ' میں سے سنایا تھا ... '

یکا یک کسی سوچ میں ڈوب گئی ' پھر دھیمی آواز سے ' پوشکن کا ایک شعر گنگ میں نے کہا ' پوشکن نے تو یوں نہیں لکھا ۔'

وہ اُسی طرح کہے گئی گویا عالمِ خیال میں ہے ' کاش میں ٹاٹیانا ہو

اکبارگی ہمہ تن اشتیاق ہو کے بولی 'اچھا، کوئی کہانی سناؤ۔'

مگر کہانیاں سنانے کو میری طبیعت حاضر نہ تھی۔ میری نظر اُس پر گڑی ہوئی تھی: چمک دار دھوپ میں ڈوبی ہوئی، سرتاپا سکون اور نرمی۔ اِردگرد، نیچے اوپر، ہر چیز۔ زمین آسمان، دریا۔ طرب ناک تھی، ہوا ایک تیز روشنی سے معمور تھی۔

میں نے بے اختیار ہوکر دھیمی آواز سے کہا 'دیکھو، کیسا سہانا سماں ہے!'

اُس نے اُسی آواز سے جواب دیا 'واقعی بہت سہانا ہے۔' وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ 'کاش ہم تم پرندے ہوتے۔ کیسی کیسی بلند پروازیاں کرتے، فضا میں کیسے اُڑتے پھرتے... نیل گوں آسمان میں غوطے لگاتے!... لیکن ہم پرندے نہیں ہیں۔'

'مگر ہم پر پیدا کرسکتے ہیں؟'

'یہ کیسے؟'

'کچھ دن اور جیو۔ خود بخود جان جاؤ گی۔ بعض جذبے ہوتے ہیں جو انسان کو زمین سے بلند کردیتے ہیں۔ فکر مت کرو، تمھارے پر نکل آئیں گے۔'

'تمھارے نکل آئے؟'

'کیا جواب دوں... میرا خیال ہے میں نے ابھی تک پرواز نہیں کی۔'

آسیا پھر اپنے خیالات میں غرق ہوگئی۔ میں قدرے اُس کی طرف جھکا۔

یکایک بولی 'تمھیں ناچنا آتا ہے؟'

میں نے حیران ہوکر جواب دیا 'ہاں'

'تو آؤ، میرے ساتھ آؤ... بھائی سے کہوں گی کہ وہ ناچ کی کوئی چیز بجائیں... ہم سمجھیں گے ہم اُڑ رہے ہیں، ہمارے پر نکل آئے۔'

وہ دوڑی ہوئی گھر کے اندر گئی۔ میں اُس کے پیچھے بھاگا۔ چند منٹ بعد، لانر کی سُریلی تانوں سے ہم آہنگ ہوکر ہم ایک تنگ کمرے میں ناچنے لگے۔ آسیا بہت لطف وخوبی سے

جوش کے ساتھ ناچتی تھی۔ اُس کی بالین کے نقش ونگار میں سے اکبارگی نرمی اور نسوانیت جھانکنے لگی۔ بہت دیر بعد تک اُس کی ملائم کمر کے اتصال کا احساس میرے بازو میں باقی تھا؛ بہت دیر بعد تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ کان کے قریب اُس کا تیز تیز، گرم گرم سانس آتا ہے، جاتا ہے؛ بہت دیر بعد تک اُس کی کالی کالی، پُرسکون کچھ کھُلی، کچھ بند آنکھیں، اُس کا پیلا پیلا، پُر اشتیاق مکھڑا جس کے گرد گھونگروالی لٹیں لہرا رہی تھیں، میری آنکھوں میں خواب کی طرح پھرتا رہا۔

۱۰

وہ دن بہت لطف سے گزرا، ہم بچّوں کی طرح چونچال تھے۔ آسیا میں اُس روز ایک سادہ پھبن تھی۔ گاگن اُسے دیکھتا تھا اور خوش ہوتا تھا۔ میں دیر سے گھر پہنچا۔ کشتی منجدھار میں پہنچی تو میں نے ملاح سے کہا کہ اسے بہاؤ کے رُخ بہنے دو۔ بوڑھے ملاح نے چپو کھینچ لئے۔ دریائے عظیم ہمیں بہائے لئے گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، کان لگا کر سُنا، جو بیتی تھی اُس پر دھیان دیا۔ اچانک ایک مخفی درد کا احساس ہوا... اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھائی؛ آسمان پر بھی سکون نہ تھا؛ وہ بھی تاروں سے لدا پھندا، چلتا ہوا، لہراتا ہوا، جگمگ جگمگ کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا؛ پھر دریا کی طرف دیکھا — وہاں بھی، ان بار د گہرائیوں میں بھی تارے کانپ رہے تھے، جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ہر طرف زندگی کے تیز تر اضطراب، تیز تر ہیجان کا احساس ہوتا تھا۔ میرا اضطراب بڑھ گیا۔ میں کشتی کے ایک طرف جھک گیا... کانوں میں ہوا کی دھیمی سرگوشی، کشتی کے پیچھے لہروں کی نرم آواز مجھے مضطرب کر رہی تھی۔ دریا کی تازہ ہوا مجھے ٹھنڈک نہیں پہنچاتی تھی۔ ایک بلبل ساحل پر چہک چہک کر اپنے زہریلے سُریلے نغموں سے مجھے دگار کر رہی تھی۔ آنسو میری آنکھوں میں ڈبڈبا آئے۔ یہ بے مقصد وجد کے آنسو نہ تھے... میری کیفیت اس بسیط، ہمہ گیر جذبے سے مختلف تھی جس کے زیر تصرف دیہ کیفیت اِنہی دنوں میں مجھ پر گزر چکی تھی)، نفس میں کشادگی اور گونج پیدا ہوتی ہے، اور وہ سب باتوں پر قادر ہو جاتا ہے، سب کی چاہ کا دم بھرنے لگتا ہے... نہیں! میرے دل میں ولولۂ نشاط کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ ابھی میں اس کیفیت کا اصلی نام لیتے ہوئے ڈرتا تھا، مگر میرا

دل کا رانی کے لبالب، چھلکتے ہوئے جام کا پیا سا تھا... کشتی بہہ گئی! بوڑھا ملاح چپوؤں کے سہارے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

۱۱

اگلے دن میں اُن سے ملنے چلا تو میں نے یہ نہیں سوچا کہ کہیں آسیا سے مجھے محبت تو نہیں ہوگئی، لیکن اس کے خیال میں غلطاں و پیچاں رہا۔ میری چشمِ شوق اُس کی قسمت پر لگی ہوئی تھی خوش تھا کہ اس سے اختلاط کا یہ غیر مترقبہ موقع ملا۔ خیال ہوتا تھا کہ ہماری شناسائی ایک دن پہلے سے شروع ہوئی ہے۔ اس وقت تک وہ مجھ سے دور دور رہی تھی، اور اب، کہ اُس کے دل کے دریچے مجھ پر وا ہوگئے تھے، اُس کا تصور میرے لئے کس درجہ پُر سحر، کسی قدر ہرا بھرا تھا، کیسی کیسی لجائی، شرمائی کششیں اُس میں سے جھانک رہی تھیں...

تیز تیز قدم رکھتا ہُوا اُن کے مکان کی طرف بڑھا جو دور سے ایک سفید نقطہ سا معلوم ہوتا تھا۔ نہ اس کا خیال تھا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے! نہ یہ خیال تھا کہ کل کیا ہوگا۔ میں بے حد خوش تھا۔

جونہی کمرے میں داخل ہُوا، آسیا کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ پھر اپنی بہترین پوشاک میں تھی، مگر اس کا چہرہ اُس کے بھڑک دار ملبوس سے میل نہیں کھاتا تھا! اُس پر اُداسی تھی۔ اور میں اتنا خوش خوش آیا تھا! یہ بھی خیال گزرا کہ اپنی عادت کے بموجب، وہ اُٹھ کے بھاگنا چاہتی ہے، مگر اُس نے اپنے آپ کو روکا اور ٹھیری رہی۔ گاگن اس جذب و استغراق کی عالم میں تھا جو عطائیوں پر دورے کی طرح پڑتا ہے۔ اس حالت میں اُنھیں خیال ہوتا ہے کہ نیچر اُن کے موقلم کے جال میں گرفتار ہو رہی ہے اور وہ اُسے پر تیغ کر رہے ہیں۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور رنگوں سے لتھڑا وہ ایک پھیلے ہوئے قرطاس کے آگے کھڑا تھا! موقلم گردش میں تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے وحشیوں کی طرح سر ہلایا، منہ پھیر لیا، آنکھیں سکیڑ لیں اور پھر اپنی تصویر میں محو ہوگیا۔

میں اُس کے کام میں مخل نہیں ہوا، آسیا کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اُس کی کالی آنکھیں میری طرف اُٹھیں۔

میں نے چاہا کہ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا ہو، مگر ناکام رہا۔ پھر اس سے کہا 'تم میں جو بات کل تھی، وہ آج نہیں ہے۔'

اُس نے دیکھی، محزون آواز سے کہا 'ہاں، مگر کوئی خاص بات نہیں ہے۔ نیند اچھی طرح نہیں آئی؛ تمام رات سوچتی رہی۔'

'کیا سوچتی رہیں؟'

'کچھ نہیں؛ بہت سی باتیں۔ بچپن سے یہ میری عادت ہے، جب سے میں اماں کے پاس رہتی تھی۔'

اماں کا لفظ اُس نے کوشش سے ادا کیا۔

'جب میں اماں کے ساتھ رہتی تھی... سوچا کرتی تھی کہ کیوں کوئی نہیں بتا سکتا کہ مجھے کیا پیش آنے والا ہے، اور یہ کہ بعض اوقات مصیبت انسان کو آتی دکھائی دیتی ہے، مگر اُس سے گریز کی صورت نظر نہیں آتی، اور کیوں پوری پوری سچائی ناممکن ہے... پھر سوچتی تھی کہ مجھے کچھ نہیں آتا، چاہیئے کہ سیکھوں۔ چاہتی ہوں کہ نئے سرے سے تعلیم پاؤں؛ میری تعلیم بہت ناقص ہے: پیانو نہیں بجا سکتی، نقاشی نہیں کر سکتی، اور سینا تک ڈھنگ سے نہیں آتا۔ مجھ میں کسی کام کا سلیقہ نہیں ہے۔ میری صحبت بہت روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہوگی؟'

'اپنے پر ظلم کرتی ہو۔ تم نے بہت کچھ پڑھا ہے؛ تم میں شائستگی ہے، اور اپنی ذہانت کی مدد سے۔'

'اچھا، تم مجھے ذہین سمجھتے ہو؟' اُس نے اس بے ساختگی سے پوچھا کہ مجھ سے ہنسے بغیر نہ رہا گیا، مگر وہ مسکرائی تک نہیں۔ گاگن سے پوچھنے لگی 'کیوں، بھائی، کیا واقعی میں ذہین ہوں؟'

اُس نے جواب نہیں دیا، برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ بار بار موقلم بدلتا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر میں ہاتھ اوپر کو اُٹھاتا تھا۔

'میں خود نہیں جانتی میرے اندر کیا ہے،' اُس نے یہ اس انداز سے کہا کہ گویا عالمِ خیال میں ہے اور اپنے دل سے باتیں کر رہی ہے 'خدا جانتا ہے بعض اوقات اپنے آپ سے ڈر جاتی ہوں۔ آہ کتنا جی چاہتا ہے کہ ... کیا واقعی عورتوں کو بہت زیادہ نہیں پڑھنا چاہیئے ؟'

'بہت زیادہ کی ضرورت نہیں' مگر...'

بتاؤ کیا پڑھنا چاہیئے 'کیا کرنا چاہیئے ؟ جو کہو گے کروں گی' یہ کہہ کر بھولی نظروں سے جن میں اعتماد جھلکتا تھا مجھے دیکھنے لگی۔

کچھ دیر تک مجھے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

'میرے پاس بیٹھنے سے گھبراتے تو نہیں ؟'

'کیسی باتیں کرتی ہو!'

'اس نوازش کا شکریہ۔ میں سمجھتی تھی گھبرا جاؤ گے۔'

اُس نے اپنے چھوٹے سے ہاتھ سے جس میں سے آگ نکل رہی تھی میرا ہاتھ زور سے دبایا۔

گاگن نے اُسی وقت مجھے آواز دی 'ن! اس تصویر کا پس منظر زیادہ تاریک تو نہیں ہے ؟'

میں اُس کے پاس گیا۔ آسیا اُٹھ کر چلی گئی۔

۱۲

گھنٹہ بھر بعد واپس آئی، دروازے میں کھڑی ہو گئی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا

'سنو، اگر میں مر گئی تو تمھیں رنج ہوگا ؟'

میں نے پریشان ہو کر کہا 'آج تمہارے دل میں کیسے خیالات آ رہے ہیں!'

'میرا دل کہتا ہے کہ تھوڑے دنوں میں مر جاؤں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز مجھے خیر
کہہ رہی ہے، مجھ سے رخصت ہو رہی ہے۔ ایسے جینے سے مرنا بہتر ہے ... آہ! مجھے اپنی نظروں
نہ دیکھو۔ میں جو کہتی ہوں، اُس میں ذرا بناوٹ نہیں ہے۔ نہیں تو میں پھر تم سے ڈرنے لگوں گی
'کبھی مجھ سے تم ڈرتی بھی تھیں؟'

'اگر میری باتیں سارے جہاں سے نرالی ہیں، تو اس میں میرا کیا قصور؟ دیکھو
اس وقت میں ہنس بھی نہیں سکتی ...'

شام تک وہ اُداس اور کھوئی ہوئی رہی۔ اُس پر کیا گزر رہی تھی، یہ میں نہیں سم
اُس کی نظریں اکثر مجھ پر پڑتی تھیں یا اُس کی پُر اسرار نگاہ کے روبرو میرا دل آہستہ آہستہ دھڑکنے
تھا۔ اُس کی طبیعت ٹھہری ہوئی تھی، تاہم میری نظر جب اُس پر پڑتی تھی تو بے اختیار دل چاہتا تھا
اُس سے کہوں اپنے جی کو تھامو۔ مجھے وہ بہت بھلی معلوم ہوتی تھی: اُس کے زرد چہرے، اُس کے ر
رُکے، پُر فکر تیوروں میں ایک اثر انگیز کشش تھی۔ خیر نہیں کیوں، اُسے خیال ہو گیا تھا کہ میری طبیع
پژمردہ ہے۔

رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے اُس نے کہا 'سنو، مجھے اس خیال سے اذیت
ہے کہ تم سمجھتے ہو مجھ میں سنجیدگی کا مادہ نہیں ہے ... اب سے جو بات کہوں اُس پر یقین کرو! ا
تم بھی میرے ساتھ بے تکلفی برتو۔ تم سے ہمیشہ سچ بولوں گی، قسم کھا کے کہتی ہوں ...'

اس قسم کو سن کر مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

'دیکھو، ہنسو مت نہیں تو میں بھی تم سے وہی بات کہوں گی جو کل تم نے مجھ
کہی تھی 'ہنستے کیوں ہو' ... تھوڑی دیر کے بعد کچھ سوچ کر بولی 'یاد ہے کل تم نے 'پروں' کا
کیا تھا؟ ... میرے پر نکل آئے ہیں، مگر اُڑنے کے لئے فضا نہیں ہے۔'

میں نے آہستہ سے کہا 'یقین مانو تمہارے لئے سب راہیں کھلی ہوئی ہیں۔'

آسیا نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھا اور کہنے لگی :

'آج میری نسبت تمھارا خیال اچھا نہیں ہے .'

'میں اور تمھاری نسبت بُرا خیال ! . . .'

گاگن نے میری بات کاٹ کر کہا 'تم دونوں آج اس قدر افسردہ کیوں ہو ؟ کہو تو کل کی طرح آج بھی والز بجا کر سناؤں .'

آسیا نے ہاتھ مل کر کہا 'نہیں ، نہیں ! آج نہیں ، خدا کے لئے آج نہیں !'

'مجبور تھوڑی کرتا ہوں . پریشان کیوں ہوتی ہو ؟'

اُس نے پھر کہا 'ہرگز نہیں !' اور اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا .

× × × ×

'کہیں اُسے مجھ سے عشق تو نہیں ہو گیا ؟' رائن کی تاریک موجوں کے قریب پہنچ کر یہ سوال میرے دل میں پیدا ہوا .

۱۳

دوسرے دن صبح کو آنکھ کھلتے ہی میں نے سوچا 'کہیں اُسے مجھ سے عشق تو نہیں ہو گیا ؟' میں اپنے خیالات کا جائزہ لینا نہیں چاہتا تھا ؛ مجھے احساس تھا کہ اُس کے خیال ، اُس بناوٹی ہنسی والی لڑکی' کے خیال نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے ، نیز یہ کہ وہ آسانی سے نہیں نکلے گا. میں ل پہنچا اور دن بھر وہاں ٹھیرا ، مگر آسیا کی ایک آدھ بار صرف جھلک دکھائی دی. اُس کی طبیعت اچھی نہیں تھی ، سر میں درد تھا. منٹ بھر کے لئے نیچے اُتری بھی ، تو پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی مُنہ اترا ہوا ، آنکھیں بند بند. خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر کہنے لگی 'معمولی شکایت ہے. جلد جاتی رہے گی : دُنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں ہے .' یہ کہہ کر چلی گئی ، میری طبیعت اُچاٹ اور پریشان تھی ، پھر بھی دیر تک اُٹھنے کو دل نہ چاہا اور آسیا سے ملے بغیر گھر پہنچا .

اگلی صبح نیم مدہوشی کی حالت میں بسر ہوئی۔ کام شروع کرنا چاہا، مگر نہ کرسکا۔ چاہا کہ کچھ نہ کروں، کچھ نہ سوچوں — یہ بھی نہ ہوا۔ گاؤں میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ گھر واپس آیا، پھر باہر نکلا۔

پیچھے سے ایک بچّے کی آواز آئی 'آپ مسٹر ن ہیں؟' پلٹ کر دیکھا۔ ایک چھوٹے لڑکے نے ایک رقعہ یہ کہہ کر دیا 'یہ مس اینت نے آپ کو دیا ہے۔'

میں نے اُسے کھولتے ہی آسیا کا شکستہ خط پہچان لیا۔ اُس نے لکھا تھا۔

'میں آج ہی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ کھنڈر کے قریب جو پتھر کا گرجا ہے وہاں آج چار بجے آؤ۔ مجھ سے آج ایک بڑی حماقت ہوئی ہے۔ خدا کے واسطے ضرور آؤ۔ تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ نامہ بر سے 'ہاں' کہہ دو۔'

لڑکے نے پوچھا 'کوئی جواب ہے؟'

'جا کر کہنا 'ہاں'۔ لڑکا بھاگ گیا۔

۱۴

میں اپنے کمرے میں پہنچا، بیٹھ گیا، اور سوچ میں پڑ گیا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آسیا کا رقعہ کئی بار پڑھا۔ گھنٹہ دیکھا؛ ابھی بارہ نہیں بجے تھے۔

دروازہ کھُلا۔ گاگن اندر داخل ہُوا۔

اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اُس نے میرا ہاتھ اپنی طرف کھینچا اور اُسے زور سے دبایا۔ وہ بہت بے اوسان تھا۔

میں نے پوچھا 'بات کیا ہے؟'

گاگن کرسی کھینچ کر میرے مقابل بیٹھ گیا۔ کوشش سے مُسکرا کر' اٹک اٹک کر کہنے لگا 'چار دن ہوئے تم سے جو باتیں ہوئیں تھیں، اُنھیں سُن کر تمھیں حیرت ہوئی تھی؛

اور بھی متعجب ہو گے. کوئی اور ہوتا تو بہت ممکن ہے میں... اس طرح بے تکلفی سے گفتگو نہ کرسکتا. مگر تم معقول آدمی ہو، میرے دوست ہو، ہے نا؟ سنو، میری بہن آسیا کو تم سے عشق ہو گیا ہے.'

میں گھبرا کے اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا.

'تمھاری بہن کو۔ تم کہتے ہو۔'

گاگن نے میری بات کاٹ کر کہا 'ہاں' میں کہتا ہوں وہ دیوانی ہو گئی ہے اور مجھے بھی دیوانہ بنا کے چھوڑے گی. مگر غنیمت ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی اور مجھ سے سب کچھ کہہ دیتی ہے. آہ! اس لڑکی نے کیسی عجیب روح پائی ہے... مگر یقین جانو وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے گی.'

'شاید تمھیں دھوکا ہوا؟'

'نہیں' دھوکے کا کوئی امکان نہیں. جانتے ہو، کل تمام دن بغیر کھائے پیے پڑی رہی، مگر کسی بات کی شکایت نہیں کی... کبھی شکایت نہیں کرتی. مجھے کچھ خیال نہیں ہوا. شام کے قریب اسے ہلکا سا بخار ہو گیا. رات کے دو بجے کے قریب ہماری مکان والی نے آ کر مجھے جگایا 'اپنی بہن کی خبر لیجیے' ان کی طبیعت خراب ہے.' میں گھبرایا ہوا پہنچا. دیکھا کہ دن کے کپڑوں میں لیٹی ہے. تیز حرارت تھی، آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی؛ سر جل رہا تھا، دانت بج رہے تھے. میں نے پوچھا 'کیا ہوا؟ بیمار پڑ گئیں؟' اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور التجائیں کرنے لگی کہ 'میری زندگی چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً کہیں لے چلو.' میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے. تسکین دینی چاہی۔ اس کی ہچکیاں اور بڑھ گئیں. آخر اس سے نہ رہا گیا؛ میں سمجھ گیا۔ مختصر یہ کہ میں سمجھ گیا کہ اسے تم سے عشق ہو گیا ہے. ہم تم دونوں سمجھ دار ہیں، مگر یقین مانو ہمیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا احساس کس قدر شدید ہے اور اپنے جذبات کو وہ کتنی حرارت کس قدر جوش سے ادا کرتی ہے. یہ کیفیت اس پر گرج کڑک کی طرح چھا جاتی ہے. تم بہت بھلے

آدمی ہو، مگر صاف بات ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا اُسے تم سے کیوں محبت ہوئی. کہتی ہے کہ پہلی نظر
میں تمھاری طرف ملتفت ہو گئی. یہی وجہ ہے کہ کل جب وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ تمھارے علاوہ
کسی اور سے محبت نہیں کروں گی، تو زار و قطار رو رہی تھی. اُسے خیال ہو گیا ہے کہ تم اُسے حقیر
سمجھتے ہو اور اُس کی اصلیت سے واقف ہو. پوچھنے لگی 'تم نے میری اصلیت کا حال اُن سے تو نہیں
کہا ؟' ظاہر ہے، میں نے کہہ دیا 'نہیں.' اُس کی سوجھ بوجھ غضب کی ہے. اب وہ صرف یہ چاہتی
ہے کہ یہاں سے چلی جاؤں، فوراً چلی جاؤں. میں صبح تک اُس کے پاس بیٹھا رہا. جب تک اُس
نے وعدہ نہ لے لیا کہ ہم کل روانہ ہو جائیں گے. اُس وقت تک پلک نہیں جھپکائی. میں اُس وقت
سے برابر سوچ میں ہوں. آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ تم سے باتیں کر لوں. میرے نزدیک آسیا کی
رائے صحیح ہے. ہم دونوں کے لئے بہترین صورت یہی ہے کہ یہاں سے چلے جائیں. میرے دل
میں تم سے ملنے کا خیال نہ آتا جس کی وجہ سے رُک گیا، تو اُسے آج ہی لے جاتا. شاید... کون کہہ
سکتا ہے ؟ تمھیں میری بہن پسند ہو ؟ یہ بات ہو تو اُسے کیوں لے جاؤں ؟ اس لئے میں نے
سوچا کہ تکلف برطرف، لاؤ تم سے باتیں کر لوں... علاوہ ازیں دو ایک باتیں میں اپنی آنکھ سے
دیکھ چکا تھا... آخر یہ طے کیا... کہ پہلے تم سے پوچھ لوں...، بچارا گاگن شرم کے مارے پانی
پانی ہوا جاتا تھا. 'معافی چاہتا ہوں، اس قسم کے جھمیلوں کا میں عادی نہیں ہوں.'

میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا.

پھر ایک ایک لفظ صاف ادا کر کے کہا 'تم جاننا چاہتے ہو کہ مجھے تمھاری بہن پسند
ہے یا نہیں. ہاں، مجھے وہ پسند ضرور ہے.'

گاگن نے میری طرف دیکھا، پھر ذرا جھجک کر کہا 'مگر تم شادی تو اُس سے
کیا کرو گے ؟'

'اس سوال کا کیا جواب دوں ؟ تمھیں کہو، کیسے اتنی جلدی.'

'ٹھیک ہے، ٹھیک ہے. مجھے کوئی حق نہیں کہ تم سے جواب مانگوں. سخت

بدتمیزی تھی کہ ایسا سوال کیا ... مگر کیا کروں ؟ آگ سے کھیلنا نہیں چاہیے ۔ تم آسیا کو نہیں جانتے !
اس سے بالکل بعید نہیں کہ بیمار پڑ جائے ، بھاگ جائے ' یا تم سے الگ ملنے کو کہے ... کوئی اور
لڑکی ہوتی تو ممکن ہے یہ سب کچھ چھپائے رکھتی اور موقع کی منتظر رہتی ۔ مگر وہ ایسی نہیں ہے ۔ یہ
اُس کا پہلا اتفاق ہے ! یہ اور بھی بُرا ہے ! اگر تم دیکھتے کہ آج صبح میرے پاؤں پر وہ کس طرح
بلک بلک کے رو رہی تھی ' تو تمھاری سمجھ میں آ جاتا کہ میں کیوں اس قدر خوف زدہ ہوں ۔ '

میں سوچنے لگا ۔ گاگن کا یہ جملہ کہ ' تم سے الگ ملنے کو کہے ' میرے دل میں اتر
گیا ۔ خیال آیا کہ شرمناک بات ہوگی اگر اُس کی شریفانہ بے تکلفی کا جواب میں نے بے تکلفی سے
نہ دیا ۔

آخر میں نے کہا ' تمھارا خیال صحیح ہے ۔ گھنٹہ بھر ہوا مجھے تمھاری بہن کا رقعہ ملا ہے '
یہ گاگن نے رقعہ تیزی سے پڑھا اور ہاتھ گھٹنے پر رکھ لئے ۔ اُس کے چہرے پر حیرانی کی علامت بہت
مضحک معلوم ہوتی تھی ، مگر معنی مجھ سے کوسوں دور تھی ۔

' میں پھر کہتا ہوں ' تم بہت شریف آدمی ہو ' مگر اب کیا کیا جائے ؟ عجیب بات ہے '
وہ خود ہی جانے پر اصرار کرتی ہے ' ساتھ ہی تمھیں بھی بلاتی ہے اور اس حماقت پر نادم بھی ہے ...
خط لکھنے کا اُسے وقت کب ملا ؟ تم سے آخر چاہتی کیا ہے ؟ '

میں نے اُس کا غصہ دھیما کیا اور جتنے ٹھنڈے دل سے ہو سکا ہم سوچنے لگے کہ کیا
تدبیر اختیار کی جائے ۔

آخر ہم نے یہ طے کیا کہ اس خیال سے کہ کہیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے ' میں جاؤں
اور اُس سے ملوں اور اُسے صاف صاف سب کچھ سمجھا دوں ۔ گاگن نے کہا ' میں گھر پر رہوں گا
اور اُس پر ظاہر نہ ہونے دوں گا کہ مجھے رقعے کا علم ہے اور شام کو تم سے ملوں گا ۔ '

گاگن نے زور سے ہاتھ ملا کر کہا ' مجھے تم پر پورا بھروسا ہے ۔ اُس پر اور مجھ پر رحم
کھاؤ ۔ بہرحال ' ہم کل چلے جائیں گے ۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم شادی نہیں کرو گے ۔ '

'شام تک تو سوچنے کی مہلت دو۔'

'اچھی بات ہے، مگر تم شادی نہیں کروگے۔'

وہ چلا گیا اور میں صوفا پر ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میرا سر چکرا رہا تھا؛ خیالات کا ہجوم اُس پر ٹوٹ رہا تھا۔ میں گاگن کی صاف گوئی سے پریشان تھا، آسیا سے پریشان تھا۔ اُس کی محبت سے مجھے راحت بھی تھی، تشویش بھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بھائی سے اُس نے کیوں کہا۔ اس بات پر طبیعت بدحواس تھی، کہ فوراً کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔

'ایک سترہ سال کی لڑکی سے جس کا مزاج ایسا ہو کیسے شادی کی جا سکتی ہے؟' یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

۱۵

رائن میں نے مقررہ وقت پر عبور کیا۔ دوسرے کنارے سب سے پہلے اُس لڑکے پر نظر پڑی جو صبح کو میرے پاس آیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ میرا انتظار کر رہا ہے۔

'مس اینت کے پاس سے' یہ کہہ کر اُس نے دوسرا پرچہ دیا۔

آسیا نے مطلع کیا تھا کہ 'میں نے ملاقات کی جگہ تبدیل کر دی۔ گرجا کی بجائے ڈیڑھ گھنٹے میں مسز لوئیس کے مکان پر پہنچ کر دستک دینا اور سیدھے تیسرے منزل پر چڑھ جانا۔'

'پھر وہی جواب ہے؟'

'ہاں' کہہ کر میں رائن کے کنارے کنارے روانہ ہو گیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ گھر واپس جاؤں؛ بازاروں میں مارا مارا پھرنا مجھے منظور نہ تھا۔ قصبے کی فصیل کے باہر ایک چھوٹا سا باغ تھا جہاں گیند پھینکنے کی زمین اور شراب پینے والوں کے لئے میزوں کا انتظام تھا۔ میں وہاں پہنچا۔ چند ادھیڑ عمر کے جرمن گیند پھینک رہے تھے؛ کاٹ کی گیند کھٹاکے کے ساتھ گردش کر رہی تھی؛ کبھی کبھی داد کی آواز آتی تھی۔ ایک طرح دار خادمہ جس کی آنکھیں روتے روتے سوج

سوج گئی تھیں ' میرے لئے جَو کی شراب کا جگ آئی ؛ میں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی. وہ جلدی سے پلٹ کر چلی گئی .

ایک موٹا ' سُرخ رخساروں والا شہری میرے پاس بیٹھا کہہ رہا تھا ' ہماری ہنیشن آج بہت اُداس ہے . اُس کا محبوب فوج میں بھرتی ہو کے چلا گیا ، ' میں نے اُس کی طرف دیکھا . جگ ہاتھوں میں لئے ' وہ ایک کونے میں دبکی سکڑی بیٹھی تھی ؛ انگلیوں میں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے. کسی نے شراب مانگی ؛ وہ اُسے گلاس دے آئی اور پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھی . اُس کے غم کا میرے دل پر اثر ہوا . میں نے اُس ملاقات کا تصور باندھا جس کا مجھے انتظار تھا : میری نظروں میں باہمی پیار اور محبت کا نقشہ نہ تھا ؛ میرے دل میں فرحت و انبساط نہ تھا . بے چینی تھی . میرا دل بھاری تھا : مجھے محض اپنا وعدہ پورا کرنا ' ایک دشوار فرض انجام دینا تھا . آسیا کی بات کو مذاق میں نہیں اُڑایا جا سکتا ' گاگن کا یہ جملہ تیر کی طرح میرے دل میں بیٹھ گیا تھا . چار دن پہلے اُس کشتی میں جو بہاؤ کی رُخ بہتی چلی جا رہی تھی ' میں عیش و مسرت کی پیاس میں تڑپ رہا تھا ' اور اب ' کہ یہ مسرت نظروں کے سامنے تھی ؛ میں ہچکچا رہا تھا ' اُسے اپنے سامنے سے ہٹا رہا تھا ' ہٹانے پر مجبور تھا . اُس کے اچانک ظہور نے مجھے بے اوسان کر دیا تھا . مجھے اعتراف ہے کہ خود آسیا سے ' اس پُر کشش اچھوتی لڑکی کی شعلہ مزاجی ' اُس کے ماضی ' اُس کی اُٹھان سے میں خائف تھا . دیر تک جذبات کی کشمکش ہوتی رہی . ملاقات کا وقت قریب تھا . آخر میں نے طے کر لیا کہ ' اُس سے شادی نہیں کر سکتا ' اُس پر ظاہر نہ ہونے دوں گا کہ مجھے بھی اُس سے عشق ہے . '

میں اُٹھا اور بیچاری ہنیشن کے ہاتھ میں ایک تھالر رکھ کر (اُس نے میرا شکریہ بھی نہیں ادا کیا) مسز لوئیس کے مکان کی طرف چلا . فضا شام کے سائے سے تاریک ہو چلی تھی . اندھیری سڑک کے اوپر آسمان کے تنگ ٹکڑے پر شفق پھولی ہوئی تھی . میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا وہ فوراً کھل گیا . دہلیز میں داخل ہوا . اندر اندھیرا گھپ تھا .

ایک بوڑھی عورت کی آواز آئی ' تمھارا انتظار ہو رہا ہے . '

راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک ہاتھ نے جس میں ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے پوچھا 'مسز لوئیس تم ہی ہو؟'

'ہاں، صاحب زادے، میں ہی ہوں۔'

بڑھیا مجھے ایک دشوار گزار زینے سے اوپر لے گئی اور تیسری منزل پر پہنچ کر رُکی۔ ایک چھوٹی کھڑکی کی مدہم روشنی میں میں نے برگو ماسٹر کی بیوہ کا جھریوں دار چہرا دیکھا۔ اُس کے نیلے ہونٹوں پر ایک پُرمعنی، ناگوار قسم کی مسکراہٹ تھی اور اُس کی دھندلی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اُس نے ایک چھوٹے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے لپک کر ہاتھ کے جھٹکے سے اُسے کھولا اور اندر پہنچ کر زور سے بند کر لیا۔

۱۶

جس مختصر کمرے میں میں نے قدم رکھا، وہ کسی قدر تاریک تھا۔ تھوڑی دیر تک آسیا کا چہرا نظر نہیں آیا۔ وہ کھڑکی کے پاس ایک بڑے دوشالے میں لپٹی، بدن کو چُرائے، سہمے ہوئے پرندے کی طرح سر چھپائے کُرسی پر بیٹھی تھی۔ تیز تیز سانس لے رہی تھی اور سر سے پیر تک کانپ رہی تھی۔ اُس کی حالت پر مجھے بے انتہا ترس آیا۔ اُس کے قریب پہنچا، اُس نے سر اور پرے کھینچ لیا۔

میں نے کہا 'آسیا! آنا!'

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا، میری طرف دیکھنے کی کوشش کی، مگر نہ دیکھ سکی۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑا، ٹھنڈا پڑا تھا، کسی بے جان چیز کی طرح میرے ہاتھ میں پڑا رہا۔

مسکرانے کی کوشش کر کے اُس نے کہنا چاہا 'میں چاہتی تھی—' مگر اُس کے نیلے نیلے ہونٹ اس کے قابو میں نہ تھے؛ 'میں چاہتی تھی—نہیں، مجھ سے نہیں کہا جاتا،' اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ آواز میں ہر لفظ پر رعشہ تھا۔

میں اُس کے پاس ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے پھر کہا "اپنا بچّو لیونا!" اور میری زبان سے بھی اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔

اس کے بعد ہم دونوں چُپ ہو گئے۔ اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں ٹکٹکی باندھے ہوئے اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُسی طرح سمٹی سمٹائی، مشکل سے سانس لیتی، آنکھ بچا کر اپنے زیریں ہونٹ کو چباتی ہوئی بیٹھی تھی کہ کہیں آنسو نہ ٹپک پڑیں۔ اُس کی ترساں و لرزاں بے حسی میں ایک دل دوز بیچارگی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اتنی خستہ تھی کہ بمشکل کرسی تک پہنچ کر اُس پر گر پڑی تھی۔ میرا دل پسیجنے لگا۔

میں نے کہا، بمشکل اپنی آواز سے "آسیا!"

آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں میری طرف اُٹھیں۔ آہ، اُس عورت کی آنکھیں جسے عشق ہو۔ اُنھیں کون بیان کر سکتا ہے؟ اُن میں التجا تھی، افشائے راز تھا، سوال تھا، ایک اشارہ تھا کہ اپنے تئیں تمھیں سونپتی ہوں ... میں اُن کے سحر کی تاب نہ لا سکا۔ ایک خفی شعلے کی لپٹ، جلتی ہوئی سوئیوں کی طرح میرے اندر دوڑ گئی۔ میں جھکا اور اپنے ہونٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دئے۔

میں نے ایک لرزتی ہوئی آہ سُنی اور اپنے بالوں میں ایک پتّے کی طرح کپکپاتے ہوئے ہاتھ کا اتصال محسوس کیا۔ سر اُٹھا کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا: یکایک کس قدر بدل گیا تھا! ہراس کی جھلک اُس میں سے جاتی رہی تھی؛ آنکھیں بہت دور گڑی ہوئی تھیں اور مجھے اپنے ساتھ کھینچ رہی تھیں؛ لب کسی قدر وا تھے؛ پیشانی مرمر کی طرح سپید تھی؛ زلفیں پیچھے کی طرف لہرا رہی تھیں، گویا ہوا سے جنبش میں ہیں۔ میں سب عہد و پیمان بھول گیا۔ اُسے اپنے قریب کھینچا: اُس کا ہاتھ بلا مقاومت میرے قابو میں آ گیا، اُس کے تمام جسم نے ہاتھ کی متابعت کی۔ دوشالہ اُس کے شانوں پر سے سرک گیا اور اس کا سر نرمی سے میرے سینے سے

آلگا، میرے دہکتے ہوئے ہونٹوں کے تصرف میں آگیا...

'لبوں کی خفیف سی لرزش سے اُس نے کہا ' تمھاری.'

میرے ہاتھ اُس کی کمر میں حائل ہوتے جاتے تھے... اکبارگی گاگن کا خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں دوڑ گیا، جلدی سے پیچھے ہٹ کر میں نے کہا ' یہ ہم کیا کر رہے ہیں ؟ تمھارے بھائی کو سب کچھ معلوم ہے ... اُنھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے پاس ہوں.'

آسیا اپنی کرسی میں ڈوب گئی.

اُٹھ کر کمرے کے دوسرے کونے میں جاتے ہوئے میں نے پھر کہا ' ہاں' تمھارے بھائی کو سب کچھ معلوم ہے... مجھے بتانا پڑا.'

تمھیں بتانا پڑا ؟' اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی. معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تئیں سنبھال نہیں سکتی اور میرا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھی.

میں نے جھنجلا کر کہا ' ہاں ' بتانا پڑا ' اور یہ سب تمھاری کارستانی ہے' سب تمھارا قصور ہے. اپنے دل کی بات تم نے اُن سے کیوں کہی ؟ کس نے مجبور کیا تھا ؟ وہ آج میرے پاس آئے اور تم نے جو کچھ کہا تھا مجھے بتا گئے.' میں نے کوشش کی کہ آسیا سے آنکھ نہ ملاؤں تیز تیز کمرے میں ٹہلنے لگا.

آسیا نے کرسی پر سے اُٹھنے کی کوشش کی.

' ٹھیرو ' میں التجا کرتا ہوں، تھوڑی دیر اور ٹھیرو. تمھارا سابقہ ایک شریف آدمی سے ہے ، ایک ایسے آدمی سے جسے عزت کا پاس ہے. مگر خدارا ' یہ تو بتاؤ تم اس قدر بوکھلا کیوں گئیں. مجھ میں کوئی فرق دیکھا تھا ؟ تمھارے بھائی مجھ سے ملنے آئے تو میں اپنے جذبات کو اُن سے نہ چھپا سکا.'

میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا ' یہ میں کیا کہہ رہا ہوں ؟ یہ سراسر جھوٹ اور فریب ہے.'

گاگن کو اس ملاقات کا حال معلوم ہے، سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا، معاملہ کھل گیا ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خیالات میرے دماغ میں سائیں سائیں کر رہے ہیں۔

آسیا سہم گئی۔ چپکے سے کہنے لگی "میں نے بھائی کو نہیں بلایا۔ وہ خود میرے پاس پہنچ گئے۔"

میں کہے گیا "یہ سب تمھارے کرتوت ہیں، اور اب تم چاہتی ہو کہ ملی جاؤ۔"

اُس نے آہستہ سے کہا "ہاں، مجھے چلا جانا چاہیے۔ تمھیں صرف اس لئے بلایا تھا کہ رخصت ہو لوں۔"

میں نے جل کر کہا "تم سمجھتی ہو تمھاری جدائی مجھ پر شاق نہ ہوگی؟"

آسیا نے حیرت سے پوچھا "تم نے بھائی سے کیوں ذکر کیا؟"

"کہہ تو چکا مجھے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر تم نے اپنا راز خود نہ ظاہر کر دیا ہوتا۔ ـــــ"

اُس نے سادگی سے جواب دیا "میں تو صرف اپنے کمرے میں قفل لگا کے بیٹھ رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہماری مکان والی کے پاس بھی اُس کی کنجی ہے ۔۔۔"

اُس وقت اُس کی زبان سے یہ بھولے پن کا عذر سن کر مجھے بہت غصہ آیا ۔۔۔ اور اب اُس کا خیال کر کے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ ہائے بیچاری ایماندار، راستباز بچی!

میں نے پھر کہنا شروع کیا "اب سب قصہ ختم ہو گیا، سب۔ اب ہمیں جدا ہونا پڑے گا۔" میں نے آنکھ بچا کر آسیا کی طرف دیکھا ۔۔۔ اُس کا چہرا تمتما اُٹھا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ شرمسار اور خائف ہے۔ میں انتہائی اضطراب کی حالت میں ٹہل ٹہل کے کہے گیا "تم نے اُس جذبے کو پھلنے پھولنے نہ دیا جو پیدا ہو چلا تھا۔ ہمارے ارتباط کو تم نے خود توڑا۔ تمھیں مجھ پر بھروسا نہ تھا! تم شک کرتی تھیں ۔۔۔"

میں دیکھ رہا تھا، کہ آسیا آگے کو جھکتی گئی اور یکایک گھٹنوں کے بل

کھڑی ہوگئی ۔ سر بازوؤں پر جھکا لیا اور ہچکیاں لینے لگی ۔ میں دوڑ کے اُس کے قریب پہنچا اور اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا ، مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی ۔ میں عورتوں کو روتا نہیں دیکھ سکتا ۔ انہیں روتا دیکھ کر میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں ۔

میں بار بار کہے جاتا تھا ' اپنا تو کو لینا ! آسیا ! دیکھو ، میں التجا کرتا ہوں خدا کے لئے چُپ ہو جاؤ ۔ ۔ ۔ ، میں نے اُس کا ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں لیا ۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ طرارہ بھر کے اُٹھی ، بجلی کی رفتار سے دروازے تک پہنچی اور غائب ہوگئی ۔ ۔ ۔

جب ، چند منٹ بعد ، مسز لوئیس داخل ہوئی ، تو میں کمرے کے عین وسط میں مبہوت بت بنا کھڑا تھا ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا اس ملاقات کا ایسا فوری ، ایسا بے معنی انجام کیوں کر ہوا ، دراں حالے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا ، جو کچھ مجھے کہنا چاہئے تھا ، اُس کا عشر عشیر بھی نہ کہہ سکا تھا ، دراں حالے کہ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ کیا انجام ہونے والا ہے ۔ ۔ ۔ '

مسز لوئیس نے اپنے زرد ابرو پیشانی تک چڑھا کر پوچھا ' کیا وہ گئیں ؟ '

میں نے دیوانوں کی طرح اُسے گھورا ، اور وہاں سے روانہ ہوگیا ۔

۱۷

میں آبادی سے نکل کر سیدھا کھُلے میدانوں میں پہنچا ۔ غصہ ، مجنونانہ غصہ مجھے نگلے جاتا تھا ۔ میں اپنے پر لعنت ملامت کے تیر برسا رہا تھا ۔ کیسے ہوا کہ آسیا جس وجہ سے ملاقات کی جگہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی ، اُسے میں نہ سمجھا ؛ کیسے ہوا کہ اُس بڑھیا کے ہاں جانے میں حیا اور شوق کی جو خانہ جنگی آسیا کے دل میں ہوئی ہوگی ، اُس کی میں نے قدر نہ کی ؛ کیسے ہوا کہ میں نے اُسے نہ روکا ؟ اُس کے ساتھ تنہا ، اُس نیم تاریک کمرے کی مدہم روشنی میں میں نے کس دل سے ، کس جگر سے اُسے رد کیا ، بُرا بھلا کہا ۔ ۔ ۔ اب اُس کا خیال میرا تعاقب کر رہا تھا ۔ میں اس سے عفو کا خواستگار

تھا۔ اُس پیلے چہرے، اُن نم آلود سہمی ہوئی آنکھوں کا تصور، اُن بکھرے ہوئے بالوں کی یاد جو اُس کی ڈھلواں گردن پر پریشان تھے، میرے سینے سے اُس کے سر کا لطیف اتصال مجھے جلا رہے تھے، دیوانہ بنا رہے تھے۔ اُس کی دھیمی آواز، 'تمھاری'، کہتی ہوئی میرے کان میں گونج رہی تھی۔ اپنے دل کو دلاسا دینے کے لئے میں نے سمجھایا کہ جو کچھ کیا، نیک نیتی سے کیا... سراسر غلط! کیا واقعی میں ایسے انجام کا طالب تھا؟ کیا مجھ میں اُس سے جدائی کی تاب تھی؟ کیا میں اُس کے بغیر رہ سکتا تھا؟

غم و غصے کی حالت میں کہے جاتا تھا 'دیوانے! دیوانے!'

رات ہو چلی تھی۔ لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا میں آسیا کے مکان کی طرف چلا۔

۱۸

گاگن مجھے لینے باہر آیا۔

ابھی گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اُس نے چیخ کر پوچھا 'آسیا ملی؟'

'کیوں، کیا وہ گھر نہیں پہنچی؟'

'نہیں۔'

'ابھی تک نہیں آئی؟'

'نہیں، قصور میرا ہی تھا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور گرجا پہنچا۔ وہاں وہ نہیں تھی : کیا تم سے ملنے نہیں پہنچی؟'

'وہ گرجا نہیں گئی۔'

'تو تم اُس سے نہیں ملے؟'

مجھے اقرار کرنا پڑا کہ مل چکا ہوں۔

'کہاں؟'

'مسز لوئیں کے ہاں۔ اُس سے رخصت ہوئے گھنٹہ بھر ہوا۔ میں سمجھتا تھا گھر پہنچ گئی ہوگی۔'

'آؤ، کچھ دیر اور انتظار کرتے ہیں۔'

گھر میں داخل ہوئے اور پاس پاس بیٹھ گئے۔ دونوں چپ، حیران پریشان دروازے پر نظریں گاڑے، آہٹ پر کان لگائے بیٹھے تھے۔ آخر گاگن اپنی جگہ سے اُٹھا۔

'حد ہوگئی! میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ یہ لڑکی مجھے ہلاک کرکے رہے گی۔ چلو اُسے ڈھونڈیں۔'

ہم آسیا کی تلاش میں نکلے۔ بالکل اندھیرا ہوگیا تھا۔

گاگن نے آنکھوں تک ٹوپی منڈھ کے پوچھا 'کیا باتیں ہوئیں؟'

'صرف پانچ منٹ کے لیے ملا اور اقرار کے مطابق گفتگو کی۔'

'میرے نزدیک بہتر ہوگا اگر ہم الگ الگ اُسے ڈھونڈیں۔ یوں زیادہ اُمید ہے کہ وہ ہم میں سے ایک کو مل جائے۔ گھنٹہ بھر میں یہاں ملنا۔'

۱۹

میں انگور کے باغ میں سے تیزی سے گزر گیا۔ بازاروں میں سے تیز تیز نکلتا ہوا، چاروں طرف نظر ڈالتا ہوا (مسز لوئیں کی کھڑکیوں تک پر نظر ڈالی) آبادی سے باہر نکل گیا۔ پھر دریا پر پہنچا اور اُس کے کنارے کنارے دوڑا۔ وقتاً فوقتاً عورتوں کی شکلیں نظر آئیں مگر آسیا کا کہیں پتا نہ تھا۔ اب میرا سینہ غصّے کے کرب سے خالی تھا۔ ایک پوشیدہ دہشت اندر ہی اندر مجھے اذیت پہنچا رہی تھی۔ میں صرف دہشت زدہ ہی نہ تھا... نہیں مجھے پشیمانی تھی، نہایت سخت قلق، اور محبت — ہاں، نازک ترین محبت — دل میں سے اُبلی پڑتی تھی۔ میں نے حسرت و تاسف سے ہاتھ ملے۔ رات کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں آسیا کو نام لے لے کر پکارا، پہلے دھیمی

'وازسے' پھر زور زور سے' ہزاروں بار اپنے عشق کا اقرار کیا، قسمیں کھا کھا کے کہا کہ اُسے
بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دوں گا۔ اُس کے ٹھنڈے ہاتھ کو ہاتھ میں لینے، اُس کی نرم آواز
دوبارہ سننے، اُس کو پھر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے لئے میں سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار
تھا... وہ اتنی قریب آ چکی تھی' اپنے جذبات اور قلب کی مکمل معصومیت کے ساتھ' پوری طرح
فیصلہ کرکے' اپنا پُر عصمت شباب پیش کرنے آئی تھی... اور میں نے اُسے چھاتی سے نہیں لگایا'
اُس کے ہیرے کے کنول کو سُرور اور وجد و بیخودی کے سکون سے کھلتا دیکھنے کی لذت سے اپنے کو
محروم رکھا... یہ حسرت مجھے دیوانہ بنا رہی تھی۔

یاس و اندوہ سے بے بس ہو کر میں نے چیخ کر کہا 'کہاں ہو گی؟ اپنا کیا
حال کیا ہوگا؟'... دریا کے کنارے کسی سفید چیز کی جھلک دکھائی دی۔ اس مقام سے میں واقف
تھا: وہاں' اُس آدمی کی قبر کے سرہانے جو ستر سال ہوئے ڈوب کر مر گیا تھا' ایک نیم مدفون پتھر
کی صلیب تھی جس پر کتبہ تھا۔ میرا دل بیٹھ گیا... صلیب کی طرف دوڑا۔ سفید شکل غائب ہو گئی۔ میں
چلّایا 'آسیا!' اور خود اپنی ڈراونی آواز سے سہم گیا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔

آخر میں نے فیصلہ کیا کہ گاگن سے جاکر پوچھوں کہ کہیں تو آسیا نہیں ملی۔

۲۰

تیزی سے انگور والی سڑک پر چڑھ رہا تھا' کہ آسیا کے کمرے میں روشنی نظر آئی
س سے کسی قدر اطمینان ہوا۔

مکان کی طرف بڑھا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے کھٹکھٹایا۔ احتیاط سے ایک کھڑکی
کھلی اور گاگن کا سر نمودار ہوا۔

'کچھ پتا چلا؟'

'ہاں' واپس آ گئی۔ اپنے کمرے میں کپڑے بدل رہی ہے۔ سب

خیریت ہے۔'

خوشی کے ناقابل بیان جوش سے مغلوب ہو کر میں نے کہا:

'شکر ہے! شکر ہے! مگر ذرا سنو، تم سے ابھی کچھ اور کہنا ہے۔'

'پھر کبھی' پھر کبھی۔ فی الحال' خدا حافظ!' یہ کہہ کر اُس نے آہستہ سے کھڑکی کے کواڑ اپنی طرف کھینچے۔

'کل تک خدا حافظ۔ کل سب باتیں طے ہو جائیں گی۔'

گاگن نے پھر خدا حافظ کہا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ میں چاہتا تھا کہ کھڑکی پر دستک دوں۔ اُسی دم گاگن سے کہنے والا تھا کہ تمھاری بہن کا خواستگار ہوں۔ مگر ایسا پیغام، ایسے ڈھنگ ... میں نے سوچا کہ کل میں خوشی سے باغ باغ ہوں گا۔

کل میں باغ باغ ہوں گا! مسرت' دوش و فردا سے بے نیاز ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کا وہ خیال نہیں کرتی اور آئندہ کے خواب نہیں دیکھتی؛ حال اُس کا ہے۔ ایک دن بھی نہیں — صرف ایک لمحہ۔

مجھے یاد نہیں کہ میں Z کیسے پہنچا۔ نہ میری ٹانگیں مجھے لے جا رہی تھیں۔ کشتی مجھے پار اُتار رہی تھی؛ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بڑے' قوی پر اُڑائے لئے جا رہے ہیں۔ ایک جھاڑی کے قریب سے گزرا جس میں ایک بلبل چہک رہی تھی۔ بیٹھ گیا' اور دیر تک کان لگا سنتا رہا؛ ایسا معلوم ہوا کہ وہ میرے عشق اور کامرانی کا ترانہ الاپ رہی ہے۔

۲۱

دوسرے دن صبح کو گاگن کے مکان کے قریب پہنچا تو ایک خاص بات نظر آئی؛ گھر کی سب کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور دروازہ بھی کھلا تھا؛ کاغذ کے پرزے دروازے کے آگے اڑتے پھر رہے تھے۔ ایک ماما' جھاڑو ہاتھ میں لئے' دروازے میں نمودار ہوئی۔

میں اُس کے پاس گیا ..

قبل اس کے کہ میں پوچھوں گاگن گھر پہ ہیں، اُس نے زور سے کہا' وہ تو گئے بھی! '

'گئے؟ کیا مطلب ہے؟ کہاں گئے؟'

'آج صبح چھ بجے چلے گئے، یہ نہیں بتایا کہاں جا رہے ہیں - ذرا ٹھیریے ، آپ مسٹر اِن ہی ہیں نا؟'

'ہاں میں مسٹر اِن ہوں -'

'بیگم صاحبہ کے پاس آپ کے لیئے ایک خط ہے' ماما اوپر گئی اور خط لے کر واپس آئی، 'یہ لیجیے، حضور'۔

میں نے کہنا شروع کیا۔ 'ناممکن ہے... کیسے ہو سکتا ہے؟'... ماما نے آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا اور جھاڑو دینے لگی۔

میں نے خط کھولا: گاگن کے قلم کا تھا؛ آسیا کی طرف سے ایک لفظ بھی نہ تھا۔ اُس نے اپنے یکایک چلے جانے پر معذرت کی تھی، اور لکھا تھا، 'مجھے یقین ہے کہ مزید غور کے بعد تمھیں میرے فیصلے سے اتفاق ہوگا۔ ایسے حالات میں جن کے زیادہ نازک اور خطرناک بننے کا احتمال تھا، میرے لیئے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ کل شام کو جب ہم چُپ چاپ بیٹھے آسیا کا انتظار کر رہے تھے، تو مجھے قطعی طور سے احساس ہوا کہ اب جُدائی ناگزیر ہے۔ کچھ تعصبات ہیں جن کا میں لحاظ کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آسیا سے تم شادی نہیں کر سکتے، اُس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اس کی تسکینِ خاطر کے لیے مجھے اُس کی شدید پُر اصرار التجا، کو ماننا پڑا۔ خط کے آخر میں اُس نے افسوس ظاہر کیا تھا کہ ہماری شناسائی اس قدر جلد ختم ہو گئی اور درخواست کی تھی کہ ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔

میں نے چیخ کر کہا، گویا وہ مجھے سُن رہا ہے۔ 'کیسے تعصبات؟ کیا واہیات ہے! کسی کو کیا حق ہے کہ آسیا کو مجھ سے چھین لے؟'.... میں اپنے سر کے بال کھسوٹنے لگا۔

ماما نے زور سے مکان والی کو آواز دی اُس کے غل نے مجھے مجبور کیا کہ ضبط سے

کام لوں۔ایک خیال میرے اندر پھڑک رہا تھا: انھیں ڈھونڈوں، جس طرح بن پڑے ڈھونڈوں۔
اس چوٹ اس حادثے کو چپ چپاتے برداشت کرنا ناممکن تھا۔مکان والی سے معلوم ہوا کہ وہ صبح کے
چھ بجے دُخانی جہاز میں سوار ہوئے ہیں اور رائن کے بہاؤ پر گئے ہیں۔ٹکٹ گھر پہنچا؛ وہاں معلوم
ہوا کہ اُن کے پاس کالون کے ٹکٹ ہیں۔گھر جا رہا تھا کہ اپنا اسباب باندھوں اور اُن کا تعاقب کروں،
مسز لوئیس کے مکان پر سے گزر ہوا۔یکایک سنا کہ کوئی پکار رہا ہے۔سر اُٹھا کر دیکھا۔اُسی کمرے کی
کھڑکی میں جس میں آسیا سے ملاقات ہوئی تھی برگو ماسٹر کی بیوہ نظر آئی۔چہرے پر اُس کی مخصوص کنی
قسم کی مسکراہٹ تھی۔مجھے بُلا رہی تھی۔میں نے مُنہ پھیر لیا اور چلنے لگا۔اُس نے پھر آواز دی کہ کچھ
دینا ہے۔یہ لفظ سُن کر میں ٹھہر گیا اور اُس کے مکان میں داخل ہوا۔اُن احساسات کو کس طرح بیان
کروں جو اُس کمرے کو دوبارہ دیکھ کر پیدا ہوئے؟...

مسز لوئیس نے ایک مختصر پرچہ دکھا کر کہا، "قاعدے کی رو سے تو یہ پرچہ تمھیں اُسی وقت دینا چاہیے
تھا جب تم خود لینے آتے، مگر خیر، تمھاری حالت پر ترس کھا کے دیئے دیتی ہوں،"

میں نے رقعہ لے لیا۔

کاغذ کے چھوٹے سے پُرزے پر ذیل کی عبارت پنسل سے لکھی ہوئی تھی:

'خدا حافظ! اب ہم ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔میں اس وجہ نہیں جا رہی
ہوں کہ مجھ میں غرور ہے۔نہیں، میں جانے پر مجبور ہوں۔کل، جب میں تمھارے سامنے
رو رہی تھی، اگر تم مجھ سے ایک لفظ کہہ دیتے، صرف ایک لفظ، تو میں ٹھہر جاتی
مگر تم نے وہ لفظ نہیں کہا۔بہتری شاید اسی میں ہو۔ہمیشہ کے واسطے خدا حافظ!'

ایک لفظ! آہ، میں بھی کتنا مخبوط الحواس تھا! وہ لفظ... ایک رات پہلے آنکھوں
میں آنسو تھے اور وہ لفظ میری زبان پر تھا؛ میں نے اُسے فضا میں بکھیرا تھا۔میدانوں میں بار بار ادا
کیا تھا، مگر اُس سے وہ لفظ نہیں کہا، اپنے عشق کا راز اُسے نہیں بتایا... بات یہ ہے کہ یہ لفظ میری
زبان سے اُس وقت نکلتا ہی نہیں اُس منحوس کمرے میں جب میں اُس سے ملا، تو میرے دل میں عشق کا کوئی

س احساس نہ تھا، جب بے حسی کے ایک مہمل انداز سے، ایک بوجھ سینے پر لیے، اُس کے بھائی کے ساتھ
ا اُس کا انتظار کر رہا تھا، اُس وقت بھی یہ جذبہ پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا... یہ اُس وقت
ل مزاحمت جوش سے بھڑکا جب، محرومی کے خوف سے، میں نے آسیا کو ڈھونڈنا اور پکارنا شروع
ا مگر اُس وقت موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کہا جائے گا 'یہ کیسے ہو سکتا ہے؟' مجھے اس کے امکان
ے بحث نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یونہی ہوا۔ آسیا چلی نہ جاتی اگر اُس میں عشوہ گری کا رتی برابر بھی شائبہ
نا اور اگر وہ ناجائز اولاد نہ ہوتی۔ جو اور لڑکیاں اُٹھالیتیں، وہ اُس کی برداشت سے باہر تھا؛ مجھے
ں کا اندازہ نہیں ہوا۔ میری بدبختی تھی کہ جب گاگن اُس تاریک کھڑکی میں سے مجھ سے باتیں کر رہا تھا،
عشق کا اظہار میرے ہونٹوں تک آ کر رہ گیا، اور آخری تنکا جس کا سہارا میں لے سکتا تھا، اُسے میں نے
تھ سے نکل جانے دیا۔

اُسی دن میں اپنا سامان لے کر ل پہنچا اور وہاں سے کالون روانہ ہوگیا۔ مجھے یاد ہے کہ جہاز چل چکا تھا
رمیں اُن بازاروں اور اُن مقامات سے جن کا نقشہ اب تک میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے، دل ہی دل
ں ایک ایک کرکے رخصت ہو رہا تھا۔ کہ اتنے میں ہینیش کی شکل نظر پڑی۔ وہ دریا کے کنارے ایک
شست پر بیٹھی تھی۔ چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا، مگر اُداس نہ تھا۔ ایک شکیل نوجوان اُس کے پاس کھڑا ہنس ہنس کے
مجھ کہہ رہا تھا۔ ر اُن کی دوسری طرف میری ننھی منی مریم، بلوط کے پُرانے درخت کی ہریالی میں سے، اپنے
ماص محزوں انداز سے جھانک رہی تھی۔

۲۲

کالون میں مجھے اُن کے آثار ملے۔ معلوم ہوا کہ وہ لندن چلے گئے۔ میں نے ان کا تعاقب جاری رکھا،
مگر لندن میں میری تمام تفتیش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ابھی مایوس ہونے کے لیے میں آمادہ نہ تھا۔ مدت تک
تلاش جاری رکھی۔ مگر آخر مجبور ہو گیا کہ اُن سے ملنے کی اُمید ہاتھ سے دے دوں۔

اس کے بعد میں نے اُنھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے آسیا کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گاگن کے متعلق
اُڑتی ہوئی خبریں مجھ تک پہنچتی رہیں، مگر آسیا میری نظروں سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئی۔ مجھے یہ بھی

معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ایک دن، چند سال بعد، ریل میں مجھے ایک عورت کی جھلک دکھائی دی جس کے چہرے کو دیکھ وہ خط و خال آنکھوں میں پھر گئے جو میرے دل پر نقش ہیں ... مگر ممکن ہے مجھے دھوکا ہوا ہو۔ آسیا میری نظروں میں وہی بالی لڑکی رہی جسے میں نے اپنی زندگی کی بہاریں دیکھا تھا، جسے آخری مرتبہ دیکھا تھا تو لکڑی کی ایک نیچی کرسی کی پشت سے لگی بیٹھی تھی۔

میں مانتا ہوں کہ اس کا سوگ میں نے بہت دنوں تک نہیں کیا، بلکہ اس خیال سے تسکین حاصل کی کہ بیوی کے ساتھ غالباً میری نہ نبھتی۔ میں اُس وقت جوان تھا۔ اور مستقبل، سریع الزوال مستقبل میری نظر میں بے پایاں تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں، میں نے سوچا، کہ اس قصّے کی تکرار ہو، اس سے بہتر، خوب تر طور پر ہو؟ ... اور عورتوں سے میرا ربط ضبط ہوا۔ مگر جو جذبہ آسیا نے مجھ میں بیدار کر دیا تھا، وہ عمیق اور پُرسوز جذبہ پھر کبھی نہیں اُبھرا۔ اُن آنکھوں کی جگہ جن کی محبت بھری نظریں ایک دفعہ مجھ پر پڑی تھیں اور کسی کی آنکھوں نے نہیں لی۔ کسی قلب سے جسے میں نے اپنے سینے سے لگایا، میرا دل اُس اولیں پُرنشاط، نوشیں جذبے کی طرح نہیں دھڑکا۔ عزلت گزینی پر مجبور، بے واسطہ، خاندان سے بیگانہ میں نے بے رنگ و آہنگ زندگی بسر کی ہے، مگر اُن مختصر رقعوں اور اُس خشک پھول کو جو اُس نے مجھ پر ایک دفعہ کھڑکی پر سے پھینکا تھا، میں مقدس تبرّکات کی طرح رکھتا ہوں۔ پھول میں اب تک ہلکی سی خوشبو باقی ہے، مگر وہ ہاتھ جس نے مجھے یہ دیا تھا، وہ ہاتھ جسے میں صرف ایک دفعہ ہونٹوں تک لے جا سکا ممکن ہے مدتوں پہلے خاک ہو چکا ہو ... اور خود میں، میرا کیا حشر ہوا؟ مجھ میں اُن پُرسرور، ہیجان انگیز ایام، اُن فلک پیما اُمیدوں اور اُمنگوں میں سے کیا رہ گیا ہے؟ ایک ناچیز پھول کی ہلکی خوشبو انسان کے دُکھ سُکھ سے زیادہ قائم رہتی ہے۔ خود انسان سے زیادہ قائم رہتی ہے۔

(ترگنیف)

خواجہ منظور حسین

نواب سید محمد حامد علی خاں مرحوم
والی رامپور

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے خطاب

اے علی گڑھ اے جوانِ قسمتِ دبستانِ کہن عقل کے فانوس سے روشن ہے تیری انجمن
حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن

روحِ سرسید سے روشن تیرا میخانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

ایک دن ہم بھی تیری آنکھوں کے بیماروں میں تھے تیری زلفِ خم بخم کے نو گرفتاروں میں تھے
تیری جنسِ علم پرور کے خریداروں میں تھے جان و دل سے تیرے جلووں کے پرستاروں میں تھے

موجِ کوثر تھا ترا سیلِ ادا اپنے لیے
آبِ حیواں تھی تری آب و ہوا اپنے لیے

علم کا پہلا سبق تو نے پڑھایا تھا ہمیں کس طرح جیتے ہیں تو نے ہی بتایا تھا ہمیں
خواب سے طفلی کے تو نے ہی جگایا تھا ہمیں ناز سے پروان تو نے ہی چڑھایا تھا ہمیں

موسمِ گل کی خبر تیری زبانی آئی تھی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کر جوانی آئی تھی

لیکن اے علم و ہنر کے درخشاں آفتاب کچھ بہ الفاظِ دگر بھی تجھ سے کرنا ہے خطاب
گو یہ دھڑکا ہے کہ ہوں گا موردِ قہر و عتاب کہہ ہی دوں جو کچھ ہے دل میں تا کجا یہ پیچ و تاب

بن پڑے جو بھی اپنے سے وہ کرنا چاہیے
مرد کو کہنے کے موقع پر نہ ڈرنا چاہیے

اے علی گڑھ! اے ہلاکِ تابشِ وضعِ فرنگ — ٹھہرے آغوش میں تیرے بجائے موجِ گنگ
وادیِ مغرب میں گم ہے تیرے دل کی ہر امنگ — ولولوں میں تیرے شاید عرصۂ مشرق ہے تنگ
کب ہے مغرب کعبۂ حاجت روا تیرے لیے
آ! کہ ہے بے چین روحِ ایشیا تیرے لیے

کشتۂ مغرب! نگارِ شرق کے ابرو بھی دیکھ — سازِ بے رنگ جو! یا سوزِ رنگ و بو بھی دیکھ
نرگسِ ازرق کے شیدا! دیدۂ آہو بھی دیکھ — اے سنہری زلف کے قیدی! سیاہ گیسو بھی دیکھ
کر چکا سیر، اصل مرکز پہ بھی آنا چاہیے
اپنے گھر کی سمت بھی آنکھیں اٹھانا چاہیے

پختہ کاری سیکھ! یہ آئینِ خامی تابکے — جادۂ افرنگ پر یوں تیز گامی تابکے
سوچ تو جی میں یہ جھوٹی نیک نامی تابکے — مغربی تہذیب کا طوقِ غلامی تابکے
مرد اگر ہے غیر کی تقلید کرنا چھوڑ دے
چھوڑ دے للہ بالاخانہ مرنا چھوڑ دے

جوش ملیح آبادی

ادبی دُنیا

کا

خیر مقدم

کچھ عرصہ ہوا کہ یہ مضمون ادبی دنیا میں بغرض اشاعت بھیجا گیا تھا مگر ابھی تک شائع نہ ہو سکا۔ چوں کہ اس مضمون میں اُن ادبی مسائل سے بحث کی گئی ہے جو اہلِ قلم اور ارباب ادب کی فوری توجہ کے مستحق ہیں اس کی اشاعت میں تاخیر ادب تغافل کے مرادف ہے۔ ہمارے اصرار پر جناب احسن صاحب مارہروی نے نظر ثانی کئے بغیر یہ مضمون ہمیں عنایت فرمایا ہے۔ (مدیر)

جب سے ادبی دنیا کی اشاعت عالم وجود میں آئی ہے، ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں نقد و نظر کا سلسلہ جاری ہے۔ مختلف تنقیدوں اور تبصروں کو پڑھ کر میرا اشتیاق بھی اُس کی سیر کے لئے اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ یہ اضطراب اس سبب سے اور زیادہ بڑھ رہا تھا کہ پہلا نمبر دو مرتبہ دفتر اشاعت سے میرے نام بھیجا گیا مگر مجھ تک نہ پہنچا، بالآخر ڈاک والوں نے تیسری خطا کو عنایت و عطا سے مبدّل کیا اور میں ادبی دنیا کی سیر سے لطف اندوز ہوا۔ اس وقت تک تین نمبر میں نے دیکھے ہیں جو کچھ عرض کروں گا انھیں شائع شدہ نمبروں سے متعلق ہوگا

تبصرہ نویسی کے طریقے اپنی روشوں کے اعتبار سے اگرچہ ایک ہی منزلِ مقصود کی رہ نمائی کرتے ہیں، لیکن رہ نوردوں کے اکثر انداز رفتار ایک دوسرے کے قدم بقدم نہیں۔ جن کے امتیازی عنوانات حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) اشتہار نما ریویو

(۲) مدیر رسالہ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر تعریفی تنقید۔

(۳) مغربی اخلاق کے ماتحت رسید یا خیر مقدم کے انداز پر اظہارِ مسرت۔

(۴) معاصرانہ ادائے فرض کے لئے ع من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔ کی رسم بازدید۔

(۵) تبصرہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہونے کے لئے دوسروں کی تحریروں سے اقتباس کرکے اپنا شوق پورا کرنا
(۶) بے لاگ اور سچی پرکھ۔

آخری طرز کے سوا باقی جتنی قسمیں نقد و نظر کی ہو سکتی ہیں اس شعر کی مصداق ہوں گی۔

ایں سطرِ جادہا کہ بصحرا نوشتہ اند
مضمونِ رفتہ ایست کہ از پا نوشتہ اند

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ تنقید اس احتیاط کے باوجود کہ مضامینِ رفتہ و پامال سے الگ رہے، سچی پرکھ اور بے لاگ تبصروں میں شامل ہونے کی صلاحیت پیدا کر سکے گی یا نہیں۔ یہ تذبذب اس لئے اور مشکوک بن جاتا ہے کہ ادبی دنیا کے چیف ایڈیٹر سے خصوصی تعارف اور دنیائے ادب کے سربرآوردہ سرپرست سے مخلصانہ ارادت رکھتا ہوں یعنی کلام کی تائید اور کسی دعوے کے ثبوت کی غرض سے سخن آرائی کے ایسے پہلو اختیار کرتا جن کے واسطے اور وسیلے سے اثباتِ دعوے کی صورت پیدا ہو ایک صنعت مہمل ہے۔ حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ یہ تنقید اس انداز سے پیش کی جائے جس کے الفاظ خود شاہدِ صداقت ہوں۔ چنانچہ ابتداءً ادبی دنیا کے مندرجات پر نظر ڈالی گئی ہے اور چند ضوابط کی تنقید اور تشریح کے بعد اپنے مشورے کو قلم بند کر دیا ہے اور یہ نہ اس لئے کہ بے چون و چرا مان لیا جائے بلکہ اس لئے کہ مبصرینِ باخبر کی بحث و تمحیص کے بعد ادبی دنیا کا ایک ایسا لائحہ عمل بنا دیا جائے جس سے ہر طبقہ کے ادیب اور طالبِ ادب مستفید ہو سکیں۔ یا ایں ہمہ جانتا ہوں کہ اس اظہارِ حقیقت پر بھی چہ میگوئیاں ہوں گی اور کیوں نہ ہوں

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اسماء و اعلام کا مقصدِ اصلی اگرچہ بالعموم صرف ذاتِ مسمّٰی کا تعارف ہوا کرتا ہے، لیکن نام رکھتے وقت مختلف مناسبات و قرائن پر نظر ڈالتے ہوئے صفاتِ ذاتی و اضافی کا لحاظ بھی ضرور کیا جاتا ہے۔ یہ مناسبتیں، صورت، آواز، رفتار، گفتار، انداز غرض کہ تمام اچھی بری نسبتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ آج مولانا ثلاثہ کے ناموں میں تمام یا بکثرت صفاتی مناسبتوں

کی عدم معلومات سے اس خیال کو غلط نہیں کہا جا سکتا ہے، بے شمار واقعات وارادات قدیم کا تاریخی ثبوت بالتفصیل ہبوط آدم سے تا ایں دم مفقود ہیں۔ مگر ان کے وقوع وجود امکانی کو کسی نہ کسی اشارے اور کنائے سے بالصراحت تسلیم کیا جا رہا ہے اور بالفرض اگر یہ پرانی منطق مہمل مان لی جائے تو بھی فی زمانہ کوئی نام ایسا نہیں ملتا یا نہیں رکھا جاتا جس میں ذات کے ساتھ صفات کی رعایتیں نہ پائی جاتی ہوں۔ چنانچہ ادبی دنیا میں بھی یہی عالم نظر آتا ہے۔

ادبی دنیا کا نام سن کر گمان کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے رسالوں کی طرح یہ موقت الشیوع جریدہ بھی مروجہ مضامین ترتیب کا حاصل ہوگا۔ مگر نہیں۔ بلکہ اس کے نام کی ترکیب میں لفظ دنیا کا اضافہ ادبی جامعیت اور معنوی وسعت کی ایسی نمائندگی کر رہا ہے جس کی افزائش وگنجائش فضائے ادراک کی انتہائی سرحدوں تک نظر آتی ہے۔ دوسرے رسالے مضامین کی نوعیت سے دو چار افسانوں، دس پانچ نظموں، اور چند تاریخی یا علمی عنوانات پر ختم ہو جاتے ہیں، مگر ادبی دنیا "گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن" کا مصداق ہے۔ یعنی عالم اجسام میں جتنی شکلیں الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی سے "الف مخنی نود ہمزہ" تک، یا کل طویل احمق سے کل صغیر فتنہ تک نظر آتی ہیں، اتنے ہی تنوعات ادب کے عنوانات ذرا مبالغے کے ساتھ ادبی دنیا میں جلوہ ریز ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ادبی دنیا ہر حیثیت سے اسم بامسمیٰ ہے۔

سرورق (ٹائٹل پیج) اور نام کے بعد فہرست مضامین دعوت نظر دیتی ہے۔ جس کی ترتیب ذیل کی مثالوں سے مطابقت رکھتی ہے:-

دیکھا جاتا ہے کہ کثرت انبوہ اور زیادتی ہجوم میں جاندار مخلوقات (انسان وحیوان) کی نوع اور جنس مدغم ہو کر بے ترتیبی پیدا کر دیتی ہے۔ دائرہ تہذیب کی تنظیم چھوٹوں کو بڑوں سے اور ایک جنس کو دوسری جنس سے علیحدہ رکھنے کی موید ہوتی ہے مگر بسا اوقات تصادم انبوہ کے ریلے میں صف نعال گوشہ نشین صدر پر دیکھا گیا ہے۔ یا کسی نمائشی اور اجتماعی شاہراہ میں چراگاہ سے پلٹتے وقت مویشیوں کا ریوڑ بجائے اس کے کہ سڑک کی کچی پگ ڈنڈی پر بھیڑ یا چال کی تقلید کرے ہجوم غفیر کو دیکھ کر اپنی وحشیانہ فطرت سے گھبرا کر بے راہ روی اختیار کرنے لگتا ہے اور بے تحاشا جدھر سینگ سماتا ہے صفوف انسانی میں دراتا ہوا چلا جاتا ہے۔ بجنسہ یہی تماشا ادبی دنیا کی فہرست میں نظر آتا ہے۔ تفصیل سے اس مفہوم کو سمجھانا آسان نہیں اور امید نہیں کہ تشریحی الفاظ اس کے متحمل ہو سکیں

تاہم کوشش کی جاتی ہے کہ عملۂ ادارت کے ساتھ ادارتمندانِ ادبی دنیا بھی اصل مطلب سمجھ سکیں۔

ٹائیٹل کے بعد پہلے نمبر کا پہلا صفحہ دیکھئے، مضمونِ اول کے الفاظ یہ ہیں "اردو ادب کا انقلابی پروگرام" فہرست میں اس کا اندراج صفحہ (۲) پر دکھایا گیا ہے، مگر یہ عنوان بحرفہ صفحۂ مذکور میں نہیں بلکہ وہاں دو سطروں میں جس عنوان کو تقسیم کیا گیا ہے، اُس کی عبارت یہ ہے۔ "ادبی دنیا کا مقصد اشاعت

ایک انقلابی پروگرام

کیا اس عنوانی اضافہ و ترمیم سے عام طالبانِ علم اور کم سواد اُردو خواں الجھن میں نہ پڑ جائیں گے؟ خیر اس لفظی بحث میں نہ پڑیئے، بلکہ دیکھئے کہ یہ مضمون بہ ترتیبِ فہرست کہاں ختم ہوا ہے۔ فہرست کے نقشے میں صفحہ ۲ کے بعد صفحہ ۱۵ مندرج ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ صفحہ (۲) سے صفحہ (۱۴) تک عنوانِ اول کا سلسلہ قائم ہوگا۔ لیکن دیکھئے والا صفحہ (۷) پر "آئینۂ علم اور تعلیم کا مالی معاوضہ" دیکھ کر فہرست کے نقشے میں ٹٹولتا ہے کہ یہ عنوان کہاں ہے مگر کہیں نہیں ملتا۔ آگے چل کر صفحہ (۱۰) نظر افروز ہوتا ہے جس کا عنوان فہرست میں سلسلہ حصّہ تنقیدی "پنجابی اور اردو" ہے اور متن رسالہ میں تقلیب "اردو اور پنجابی"

اسی طرح صفحہ (۱۴) پر مختلف عنوانات دیکھے جاتے ہیں۔ جن کا اندراج فہرست کی ترتیب میں اُسی طرح ہے جیسا کہ تصادم حیوانی کی مثال میں بتایا گیا ہے۔ صفحہ (۱۵)، جس کے عنواناتِ مضمون "افسانے" کے تحت میں "چند خطوط" وغیرہ ہیں اُن کی ترتیبِ صفحات ملاحظہ طلب ہے (۱۵ - ۲۹ - ۱۴ - ۲۱ - ۳۹) ان ہندسوں کی بے ترتیبی کے دکھانے سے مدعا یہ ہے کہ فہرست کے مندرجہ عنوانوں اور ہندسوں کی ترتیب میں ایسا بعد المشرقین ہے کہ جب تک اردو دنیا کے علم ہندسہ میں ایک اور ایک تین کی طرح کوئی نیا طریقہ مفروضہ ایجاد نہ ہوگا یہ گورکھ دھندا آسانی سمجھ میں نہ آسکے گا۔

اس وقت تک کے شائع شدہ نمبروں کی فہرستِ مضامین دیکھ کر قیاساً اندازہ کیا جاتا ہے کہ مضامین کے عنوانات مستقل نہیں ہیں۔ یا یہ کہ حسبِ ضرورت کم و بیش اور ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً پہلے نمبر میں "کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائبانہ کیا" کا عنوان نہ تھا اور نمبر (۲) میں موجود ہے۔ نمبر اول میں صرف "افسانے" کا عنوان تھا اب ڈرامے بھی عنوان میں آگئے۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی نئے عنوان پر کوئی نیا مضمون آجاتا ہے تو جدید عنوان

قائم کردیا جاتا ہے اور آئندہ اُس عنوان پر اگر کوئی مضمون نہیں ملتا تو وہ عنوان خارج سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضامین
کا ثبات و زوال مضمون نگاروں کے اختیار میں ہے۔ ہماری رائے میں ضروری اور مفید عنوانوں کی ایک کافی مقدار مستقلاً قائم
ہونی چاہیے۔ اگر کسی مہینہ میں بیرونی مضامین دستیاب نہ ہوں تو مجلسِ ادارت کو اپنی جنبشِ قلم سے کام لینا چاہیے اور عنوانات
مستقل میں اصولِ مذہب، جغرافیہ، سیر و تاریخ، ہیات، سائنس وغیرہ بھی شامل رہیں تو مناسب ہے۔

اس تبصرہ نویسی کی تمہید کا اقتضا تو یہی تھا کہ ادبی دنیا کے ایک ایک مضمون پر بالتفصیل نظر ڈالی جاتی مگر چوں کہ اس
ریویو کو مستقل تالیف بنانا مناسب وقت نہیں، اس لئے صرف قواعد و ضوابط اور مقاصد پڑھ کر اُن مطالب کو ادا
کیا جائے گا جن سے فرائضِ نقد و نظر ادا ہو سکیں۔

تمام اہلِ مذاق کا کسی ایک چیز کو پڑھنا اور بغیر اختلاف یکساں پسندیدہ نظروں سے دیکھنا نیرنگِ فطرت
کے منافی ہے اس لئے یہ امید رکھنا کہ ادبی دنیا کے مقاصد و ضوابط سے ساری دنیا متفق ہوگی غلط خیال ہے۔ یہ
مختلف المذاقی مٹ نہیں سکتی کیوں کہ قدرت نے ودیعت کی ہے جس کے اسباب بھی چند در چند ہیں۔
(۱) رجحانِ طبع اور مذاقِ خاص اس کا عادی بنا دیتا ہے کہ جس کسی ایک رنگ کی عادت ہو جاتی ہے طبیعت
اس کے سوا کسی اور انداز کو نہ پسند کرتی ہے۔ اس سے دلچسپی لیتی ہے۔
(۲) بعض کاروباری اشخاص اتنا وقت نہیں رکھتے کہ بیک وقت مختلف نوعیت کے مضامین میں اپنے دل و دماغ
کو مصروف رکھ سکیں بلکہ دماغی تھکن اتارنے کے لئے وہ چاہتے ہیں کہ سہل الحصول اور عام فہم مضامین پڑھ لئے جائیں جن کا
زیادہ سے زیادہ یہ ماحصل ہو کہ وقت آسانی کٹ جائے اور اس تفنن سے طبیعت کو تفریح حاصل ہو جائے۔
(۳) خیال کی پستی۔ عمر کی بدمستی علمی یا سیاسی مضامین پڑھنے کی قابلیت یا صلاحیت نہیں رکھتی اس لئے بجز افسانہ
و قصص کسی اور طرف متوجہ نہیں ہوتی۔
غرض کہ اسی قسم کے موانع و عوارض کسی مجموعۂ ادب کو عام پسند نہیں بنا سکتے۔ لہذا مناسب ہوگا کہ اگر ادبی دنیا
کو گہوارۂ ادب بنانا ہے تو مذاقِ عوام کو نظر انداز کر کے صرف ایسے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مخصوص مواد فراہم کیا جائے

جو خود مکمل ادیب ہیں یا اپنی تعلیمی تکمیل کے خواہشمند۔

مقاصد و ضوابط کی پہلی دفعہ۔ "تفضیفی اُردو سے عربی، فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ کم کرنا" سرسری نگاہ سے دیکھنے کے قابل نہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ہر زبان اپنے بولنے والوں کی حیثیت اور قابلیت کے لحاظ سے مختلف اندازِ بیان کی حامل ہے۔ جو بات ہے ایک ہی چیز کے متعلق ان پڑھ سے کی جائے گی لکھے پڑھوں سے اُس کا اظہار دوسرے الفاظ میں کیا جائے گا۔ مثلاً کسی معمولی بے تکلف شخص کو بلاتے وقت "یہاں آؤ" کہا جائے گا تو اسی مفہوم کو اجنبی اور پڑھے لکھے کے لئے "یہاں تشریف لائیے" کہہ کر پورا کیا جائے گا۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں فقروں میں تفضیفی فقرہ کسے کہیں گے۔ اگر پہلا فقرہ تفضیفی اردو ہے تو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کوشش کی کامیابی کے بعد (بشرطیکہ اردو میں نئے لغت ایجاد نہ ہوئے) وہ اردو رہ جائے گی جس کو آج صرف ناخواندہ بولتے ہیں اور اگر دوسرا فقرہ تفضیفی اُردو میں شامل ہے تو قبل اس کے کہ اُردو سے عربی فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ نکالے جائیں مشکل الفاظ کا ایک معیار قائم کرنا چاہیئے۔

فارسی جو بجائے خود ایک مکمل اور علمی زبان مانی جاتی ہے۔ تسلطِ عرب کے بعد سے اس وقت تک تقریباً نصف عربی الفاظ شامل کئے بغیر ادائے مطلب پر قادر نہیں تو اردو جس کی تخلیق ہی عربی فارسی اور سنسکرت کے صلب و رحم اور شیر تشنمی سے ہوئی ہے کیا زندہ رہ سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم نے عربی فارسی کی تعلیم چھوڑ دی ہے اور بکثرت چھوڑتے جاتے ہیں اور بضرورت معاش انگریزی کو حصول اغراض کا تنہا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اس لئے معمولی لفظوں کو بھی مشکل سمجھا جاتا ہے ورنہ جن الفاظ کی آج ادبی دنیا میں فرہنگ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کل تک شرفا اور اہل علم کے ان پڑھ خدمتگار ایسے بلکہ ان سے زیادہ گراں اور مشکل الفاظ بولا کرتے تھے۔

اُردو کے تفضیفی عہد کا آغاز اُس زمانہ میں ہوا ہے جب کہ اہل زمانہ عموماً علوم مشرقی اور خصوصاً عربی فارسی سے بخوبی آگاہ ہوتے تھے، اور چونکہ اُردو کا ادبی لباس بھاشا کے تانے بانے پر عربی و فارسی کی مقراضوں سے تراشا گیا تھا اس لئے اس کے

تا بتار سے وہی رشتہ دست وگریباں نظر آتا ہے جس سے خود عربی و فارسی کا پیراہن آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس طرفداری کا منشا یہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ کے نام نہاد ادبِ لطیف کی بعض اُن تحریروں سے موافقت کی جائے جن میں قصد و اہتمام کے ساتھ اجنبی الفاظ ٹھونسے جاتے ہیں۔ بلکہ مدعائے اصلی یہ ہے کہ اس ضابطے کو اتنا سخت نہ کیا جائے کہ اردو نویسوں کی سہل پسندی عبدالرحمٰن کو (ایدرّہمان) لکھنے لگیں جب کہ اس وقت بھی جدول اور مسطر کے معنی عموم کو متوسط جماعت کے اکثر طالبانِ علم نہیں جانتے۔

اُردو کے دورِ اوّلین میں جب کہ عربی و فارسی کا نصاب عام تھا صنائع بدائع۔ استعارہ، تشبیہ اور ترکیب اضافی وغیرہ لک کا ایسا دور دورہ تھا کہ کوئی معمولی سی معمولی تالیف بھی اس ملمع سازی سے خالی نہیں۔ اردو لٹریچر پر یہ اثر تقریباً نصف صدی تک چھایا رہا اور اس رنگ کو اُس وقت تک عام مقبولیت حاصل رہی۔ سرسید جن کی تحریروں کی سلاست و روانی مسلم ہے وہ اپنی جوانی کے عالم میں ایسا لکھتے تھے :-

> بہتر ہے کہ فکر مآل اندیش اس داعیۂ محال سے ہاتھ اٹھا کر اپنے اندازے سے باہر پاؤں نہ نکالے اور اس امرِ صعب میں ہاتھ نہ ڈالے .. ایک نسخۂ عجیب اور مجموعۂ غریب خامہ چابک رقم کی مدد اور فکرِ آسماں سیر کی عنایت سے لکھا جائے .. اور مکانات درونِ شہر اور قلعۂ مبارک کا حال اس میں مندرج اور اطوار و اوضاعِ ساکنین کا حال اس میں مندرج ہو۔
>
> (آثار الصنادید)

یہ ایک معمولی نمونہ لکھا گیا ہے جو اُس زمانے کی زبان کے لحاظ سے بہت صاف ہے۔ پھر بھی اس میں ایسے اجنبی اور مشکل الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے قبل ایسی مصنوعی عبارتوں کا سمجھنا معمولی بات تھی۔ کیوں کہ مؤلف و مبصر سب کے سب مروجہ علوم مشرقی کے ماہر ہوتے تھے۔ اس دور کے بعد یہی سرسید تھے جن کی وقت شناسی اور نباضی نے جہاں اور بہت سے امراضِ مزمن اپنی غافل اور مریض قوم سے دور کئے وہاں اپنی ملکی اور مادری زبان کو بھی اُن فاسد خیالوں سے پاک کیا جن کی وجہ سے اردو سطحِ علمی پر رونما نہیں ہو سکتی تھی۔

محمد حسین آزاد - حالی - شبلی - مولوی نذیر احمد - مولوی ذکاء اللہ وغیرہم کا زمانہ اردو زبان کے لئے وہ ارتقائی زمانہ ہے جس نے اس مشترکہ زبان میں انفرادی حیثیت پیدا کی - اس عہد کی تصانیف یقیناً اہلِ ادب کی نگاہوں میں وقعت خاص رکھتی ہیں، اور انھیں تصانیف کو علمی تصانیف کہا جا سکتا ہے - چوں کہ متذکرہ بالا اہلِ قلم کے کارنامے سب کے پیشِ نظر ہیں اس لئے ان کے نمونے لکھنے فضول ہیں - صرف یہ پوچھنا ہے کہ ادبی دنیا میں ان کتابوں کی زبان مقبول ہے یا نہیں - اور یہ کہ ان میں بھی ایسے مشکل الفاظ پائے جاتے ہیں جن کا کم کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے ؟ خلاصہ یہ کہ حامیانِ اردو اگر اس عہد کی زبان کو تصنیفی زبان سمجھتے ہیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد - ورنہ وائے برجانِ اردو -

---

بے شک بیسویں صدی عیسوی کے آغاز سے بعض جرائد و رسائل میں چند اہلِ قلم نے اردو میں ایسے اجنبی اور مشکل الفاظ شامل کرنے شروع کئے جن کی عزایت ادبی دنیا کے ابنائے وطن کو ایک آنکھ نہیں بھاتی - خصوصاً اس حالت میں کہ اُن کے ہم معنی اور مترادف الفاظ عام طور سے بول چال میں شامل ہوں - مثلاً

(۱) اس کی سطح پر کھیلنے والی وہ دل فریب روحیں جن کے العابِ حیات سے اس کی ساری رونق ہے -

عالمِ نباتات کی وہ ارواحِ طیبہ جن کے مظاہرِ جمال سے الوانِ مختلفہ سے اس کا چہرہ اجرامِ سماوی کے حسن کو بھی شرمندہ کر دیتا ہے - خزاں کے لطماتِ ہلاکت کی تاب نہ لاکر .... جان دے دیتی ہیں - (الہلال ۱۹۱۲ء)

(۲) آہ وہ غمگین آواز ...... وہ بیمار نغمہ جو .... ایک قصرِ زریں کے افقِ حسین پر درد کی طرح اُٹھا ... جب وہ چلتی تو نغمۂ خراماں، اٹھتی تو نشیدِ پرّاں، بیٹھتی تو نوائے ساکت اور سوتی تو موسیقیِ خوابیدہ معلوم ہوتی - (ہمایوں ۱۹۲۴ء)

(۳) اس فکر نے میرے اندر ایک شعور پیدا کیا اور میں ایک عمیق دل گرفتگی محسوس کرنے لگی میرے وطن کی نسیم میں خوشبوئیں ؟ ملی ہوئی تھیں - وہاں مظاہر جمود سے ماورا را ایک حیات درخشندہ نظر آتی تھی اور میرے بلاد کے معانی ظاہر ہو رہے تھے اور ظہورِ شفق

کے وقت ارواحِ اشیا ایسی متحمل نظر آتی ہیں گویا کہ یہ کوئی نئی دنیا ہے۔ اُس زمین کے
رائج سے . . . میں محبت کرتی ہوں۔ اے فیلسوف قدیم میں تیرے خاموش تفکر کی
پرستش کرتی ہوں۔" (رسالہ نگار ۱۹۲۵ء)

(۴) پرماتما کا بارم باردھنیا رداریہ کہ میں اپنے پیارے پاٹھکوں کی سیوا میں اپنے
اخبار کا تلک نمبر پیش کر سکوں . . . . مانیہ نیتا ویشر کے واجب التعظیم مہیہ
ودنتر نادیوی سچے بچاری سوئے ہوئے بھارت کو جگانے والے بھگوان تلک کی یادیں . . . .
دلی خلوص وعقیدت اکادہ پریم بھگوان کے درشن کرنے کا سو بھاگیہ مجھ کو پراپت ہوا ہے
(بندے ماترم ۱۹۲۴ء)

یہ ہیں وہ نمونے جن کی بدولت فی الحقیقۃ اردو بہت جلد دیوبانی اور آسمانی زبان بن جائے گی۔ اس
بدعتِ جدت نے اکثر بدمذاقوں اور کم سوادوں کو ایسا گمراہ کیا کہ انھوں نے اپنی اظہار قابلیت اور غلط رعب ادب
جمانے کے لئے خواہ مخواہ اور بلا ضرورت ایسی عبارت آرائی شروع کر دی جن کی لفاظی کے سامنے معانی کو دامنِ
شرم میں روپوش ہونا پڑا۔ لہذا ادبی دنیا نے اگر اس اندازِ تحریر کے مٹانے پر کمرِ ہمت باندھی ہے تو ہر سلیم الطبع
حامیِ اردو کو ہمت افزائی کرنی چاہئے۔

مقاصد اور قواعد و ضوابط کی دفعہ (۲) کا مقصد (مشرق و مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے تراجم) نہایت
مفید ہے۔ لیکن معاف کیا جائے اگر اس وقت تک کے شائع شدہ نمونے قابلِ نظر سمجھے جائیں۔ مثلاً ہسپانوی
گیت کا یہ فقرہ "اُس نے کہا میں تمھیں اپنی زمین اور اپنا سیاہ طویل قامت گھوڑا دوں گا۔ میں تمھیں اپنی
ماہ پارہ لڑکی بیاہ میں دوں گا" اسی طرح علایا کا فرشتۂ محبت کہتا ہے۔ "میں جس کے ہاتھ سے محبت کا غنچہ
اُڑ گیا ہے اس قدر جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے جہاں تیرے پانوں پڑیں گے محبت کے بازو دل کو ڈھک
دیں گے" وغیرہ وغیرہ

اگر ان چھوٹے چھوٹے خیالی فقروں کی جگہ غیر زبانوں کی مستقل علمی یا تاریخی کتابوں کا ترجمہ سبقاً سبقاً

لکھا جائے تو غالباً ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔

مقاصد کی دفعہ ۳ بھی بے حد کار آمد ہے لیکن اب تک جدید الفاظ کا اضافہ، اردو گرامر کا تغیر و تبدل نئے الفاظ کی تذکیر و تانیث وغیرہ کے متعلق کوئی مضمون ادبی دنیا میں نہیں دیکھا گیا۔ حالاں کہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو مدت مختلف فیہ چلے آتے ہیں اور موجودہ اہلِ ادب نے کوئی مختتم فیصلہ اس کے لئے نہیں کیا ہے۔ عام و خاص جس طرح چاہتے ہیں بولتے ہیں۔ نیز دو ایک پنجابی الفاظ جو تمام اخباروں اور رسالوں میں لکھے جاتے ہیں اُن کے لئے بھی کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاتا۔ مثلاً مشکور بمعنی شاکر۔ ایجاد بحالتِ تانیث۔ برف بصورتِ تذکیر۔ اپیل۔ موٹر۔ تولیہ۔ بنیائن کہیں مذکر کہیں مونث۔ مورخہ ۰ر اگست کو بارش ہوئی۔ نہ زید آیا نہ ہی خالد آیا۔ وغیر ذالک۔ اگر یہ امور دفعہ ۳ کے مطابق ہیں تو آئندہ دن کے لئے ادبی دنیا کا کم از کم ایک کالم ہی مخصوص ہونا چاہئے۔ اور اس خصوص میں بیرونی مضامین کا انتظار کئے بغیر کارکنانِ ادبی دنیا کو خود دفعہ مذکورہ کا منشا پورا کرنا چاہئے۔

مقاصد کی تمام دفعات میں دفعہ (۴) بہت زیادہ غور طلب ہے۔ کیوں کہ اس دفعہ میں اُردو شاعری کی اصولی تبدیلیاں ضروری سمجھی گئی ہیں۔ جن کی شکلیں یہ ہوں گی کہ عربی عروض میں پنگل (ہندی عروض) کے پرتے (کلیے) شامل کئے جائیں گے۔ بے قافیہ نظموں کی ترویج ہوگی اور قافیہ و ردیف میں تخفیف کی جائے گی۔

اگر اس دفعہ کی اصولی تبدیلی کی تردید کو مذاق نہ سمجھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری بقول مرزا غالب کھنڈ ہو کر رہ جائے گی۔ وہ اوزانِ عروض جو ہندی میں مروج ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے مذاق کی تبدیلی لازمی ہے جس کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے سنسکرت کی بیاکرن (صرف و نحو) کا جاننا ضروری ہے۔ غرض کہ اُس فنِ لطیف کو جو محض تفنناً حاصل کیا جاتا ہے (موجودہ زمانے میں جب کہ تعلیمی نصاب کی مقدار پورے ایک اونٹ پر لادنے کے قابل ہو) اتنا گراں بار بنا دینا پسند نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ فی زمانہ تعلیم کا مقصود بالذات صرف ملازمت ہے نہ قابلیت۔

اسی طرح بے قافیہ نظموں کی ترویج کا خیال اُردو شاعری کی توہین ہے۔ جس فن کی بنیاد دل ودماغ اور غور وفکر کے عناصر پر قایم ہو اُس کی ابتری کا سامان اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ایشیائی مذاق میں قافیہ ہی خیالات لطیف کا محرک ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ذہن میں جودت اور طبیعت میں روانی پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ وصف شاعری کے لئے ضروری ہی تو اس کے خلاف اسباب مہیا کرنا کس طرح فائدہ مند ہو سکتے ہیں۔ عشاق سخن جانتے ہیں کہ نظم بے قافیہ بچوں کے کھیل سے زیادہ وقیع نہیں۔ ایسے تکلم کی بالکل وہی حیثیت ہے جس کی مثالیں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر خوانچہ والوں کی رنگ برنگی آوازوں میں ملتی ہیں۔ اگرچہ اُن میں قافیوں کی گٹ کریاں بھی ہوتی ہیں مثلاً۔ چنے ہیں۔ گھر بنے ہیں۔ بھربھرے ہیں۔ مرمرے ہیں۔ یا لیلیٰ کی اُنگلیاں ہیں۔ مجنوں کی پسلیاں ہیں۔ کیا خوب ککڑیاں ہیں۔

اس دفعہ کی تیسری شق یعنی قافیہ وردیف کی تخفیف تشنۂ تشریح ہے۔ ذرا وضاحت سے لکھنا چاہیئے تھا کہ وہ کمی کس قسم کی ہوگی۔ اگر یہ منشا رہی کہ مروجہ طریقے میں قافیہ وردیف دونوں کا التزام ضروری نہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں اکثر غزلیں اور بافراط رباعیات وقصائد وغیرہ غیر مردف کہے جاتے ہیں اور قدیم سے کہے جاتے ہیں اور اگر کوئی دوسری غرض ہی تو اس کے سوا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ذیل کے مستزاد کی طرح ترخیم یا تقلیب کی جائے:۔

آسماں کے تم چاہ ہو اسے دولہ بشیرو   تم ریل پہ اسوار ہوائے دولہ بشیرو ۔ بس تم کو بھی دیکھا

مہدی وگرامی وفریدون وارسطو   بامعتمد جار ہوائے دولہ بشیرو ۔ بس تم کو بھی دیکھا

(مہدی علی خاں) (سید حسین بلگرامی) (فریدوں جنگ) (ارسطو جنگ)

چوتھی دفعہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں خوش طبعی کے طور پر دو ایک مثالیں ایسی آگئی ہیں جن کی ظرافت کے انداز سے تمسخر واستہزا کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے مختصر الفاظ میں مخلصانہ نیک نیتی کا اظہار کرتے ہوئے یقین دلایا جاتا ہے کہ اس تبصرہ نگاری میں حمایت اردو کے سوا کسی عنوان سے حامیانِ اُردو کی اہانت منظور نہیں۔ اس کے ساتھ اصولاً اس خیال کی تائید ضروری سمجھی جاتی ہے کہ اگر اردو کے علم عروض کی تنقیح تاریخی طور پر ہو جائے یا بے کار قافیہ پیمائی کے

مقابل میں مشرقی مذاق شاعری کو قائم رکھتے ہوئے شعرا کو آزادی مل جائے تو یہ اضافے یقیناً ہماری شاعری کو بہت کچھ نشوونما دے سکتے ہیں۔ یہ سخن گسترانہ مذاق صرف اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ جس طرح سلاست اردو کی لطافت کو بڑے بڑے لغتوں کی ضخامت سے لدھڑ بنایا جا رہا ہے اسی طرح آثار نظر آتے ہیں کہ وہ لوگ جو مشرقی مذاق ادب سے بے بہرہ ہیں اُن کی بے قید شاعری اردو میں بہت زیادہ سخافت پیدا کر دے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ دس پندرہ برس کے بعد جب کہ موجودہ شماری مشرقی مذاق والے نہ رہیں گے اُردو شاعری بازاری شاعری ہو جائے گی اور بآسانی ناگری یا رومن کیرکٹر میں تبدیل ہو سکے گی!!!

ہر کس از دستِ غیر نالہ کند
اُردو از دستِ ہندیاں فریاد

بسلسلۂ مقاصد دفعہ (۴) کے بعد جتنے نمبر ہیں وہ سب اردو ادب کے لئے کارآمد ہیں اور اُن میں کسی اضافہ ذریم کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ تمام اقوال کو عملی ثبوت سے مکمل کرنا چاہیئے۔ جس کے لئے اس سے بہتر اور آسان کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ادبی دنیا کے ہر نمبر میں تھوڑے بہت نمونے اُن باتوں کے پیش ہوتے رہیں جن کا ذکر دفعات ۵ - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ میں کیا گیا ہے۔

اس قدر لکھنے کے بعد قواعد و ضوابط کی دفعہ ۱۳ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ دراز قلمی شاید ضوابط مقررہ کے خلاف ہوئی جاتی ہے اس لئے اب چند مشورہ طلب امور لکھ کر آئندہ فرصت کے لئے باقی خیالات محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

"کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا" اس عنوان کے تحت میں دوسرے نمبر سے اہل لڑائی کی جو تحریریں شائع کی جا رہی ہیں اُن میں اتنی طوالت نہ ہونی چاہیئے۔ اس وسیع الاخلاقی کی اتنی فراخی موزوں نہیں کہ ہر کس و ناکس، معمولی اور غیر معروف، شہرت طلب افراد بھی مسلم رلئے دہندوں کی فہرست میں شامل ہو جائیں۔ اس سے نہ صرف وقارِ ادارت کو صدمہ پہنچتا ہے بلکہ صحیح رہنماؤں کا امتیاز بھی باقی نہیں رہتا۔ اسی سلسلے میں بعض القابِ توصیفی کا اضافہ بھی قابل نظر ہے۔

"مشک آنست کہ خود ببوید..."

اس نقد و نظر کو فی الحال سرِ ورق اور فہرست و مقاصد تک محدود رکھا گیا ہے۔ مضامین مندرجہ کے معیار اور انداز تحریر کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے تاہم اتنا اظہار ضروری ہے کہ پنجاب میں ادب اردو کی خدمت کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ وہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ کیا اُسی پنجاب سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ اُردو املا اور بعض ترکیبوں کے متعلق بھی توجہ خاص کرنی چاہیئے۔

ادبی دنیا کے مضامین سے قطع کر کے دو چار الفاظ بطور مثال لکھے جاتے ہیں کہ اگر یہ املا اور ترکیب صحیح ہی تو بدلائل اس کی صحت کو ثابت کر دیا جائے۔ ورنہ اصلاح و احتیاط کی جائے۔ گذر۔ گذشتہ وغیرہ (ذال معجمہ سے) پردہ (ہائے ہوز سے) "اس نے کھایا ہوا تھا" ہوا ہوا تھا۔ وغیر ذٰلک۔

"فرہنگ الفاظ" کا ضمیمہ جس پیمانے پر شامل کیا گیا ہے اطفالِ دبستاں کے لئے تو مفید ہو سکتا ہی مگر ادبی دنیا کے مبصرین اس پر نظر بھی نہیں ڈالتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن کو ان مضامین کے پڑھنے اور ایسے معمولی الفاظ کے معنی سمجھنے میں دقت ہوگی وہ اُسے کیا پڑھ سکیں گے۔ اور اگر یہ التزام ضروری ہے تو انتخاب لغات کا معیار سمجھ میں نہیں آتا تفسیر۔ افکار۔ جلال۔ خیر مقدم۔ رسائل۔ ساز۔ صداقت۔ قلب۔ حُسن۔ موذن۔ واقفیت کے معنی تو بتائے جائیں مگر خراجِ تحسین۔ حیا سوز۔ فرسودہ۔ قطع نظر۔ عیار۔ خوشگوار کو چھوڑ دیا جائے۔

ادبی دنیا کی اشاعت کے بعد دو ایک نشست گاہوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا اور سنا گیا کہ اس مفید رسالے کی عام پسندیدگی کے ساتھ اضافۂ فرہنگ کو ناپسند کیا گیا۔ غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ چند نامانوس اور دقیق انگریزی عربی اور سنسکرت الفاظ کے سوا معمولی لفظوں کی فرہنگ کو قلم انداز کر دیا جائے۔

متذکرہ بالا اظہارِ خیالات کے بعد کامل وثوق اور سچے اعتماد کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ ادبی دنیا بے حد مفید اور وقت شناس رسالہ ہی۔ یقیناً ہندوستان میں ایسا رسالہ اس وقت تک شائع نہیں ہوا اور اس جامعیت کا لحاظ کسی اور موقت الشیوع رسالے میں نہیں کیا گیا۔ جس سیرچشمی اور اُولوالعزمی سے اس کی اشاعت کی جا رہی ہے فی الحقیقت یہ ارا کین ادارت کی کرامت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کا ہر علمی کام اصولِ تجارت پر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا ہو

تو یہ عمل کوئی گناہ نہیں اور بفرضِ سطحی نگاہ والے اس کو گناہ ہی سمجھتے ہیں تو اُن کو بھی ماننا پڑے گا کہ اس تجارت علمی میں جتنی محنت کی جاتی ہے اُتنی منفعت کسی حساب سے کارکنانِ ادبی کو نہیں پہنچ سکتی بلکہ اس خدمت و حمایتِ اُردو کے تمام فائدے زبان اور اہلِ زبان کے لئے لیمیٹڈ ہیں۔

کیا ہندوستان میں کوئی اردو رسالہ ایسا ہے جو بالاعلان مضامین کا معاوضہ دے رہا ہو اور جس نے ادبیہ قائم کر کے ادبی ذوق رکھنے والوں کو دعوت عام دی ہو؟

بہرحال مجیب الدعوات سے دعا ہے کہ رہتی دنیا تک ادبی دنیا علمی اور عملی فیوض سے مالا مال رہے اور ناظرینِ رفیع الدرجات سے استدعا کہ قومی، ملکی اور علمی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے حمایتِ اُردو کو فرضِ کفائی نہیں بلکہ فرضِ خدائی سمجھیں۔

باوجود اس خیال و کوشش کے کہ یہ تبصرہ مختصر سے مختصر الفاظ میں تمام ہو جائے۔ میری کاپی کے ۱۲ صفحوں پر ختم ہوا ہے جس کا سبب اس کے سوا کیا کہوں

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ لفظِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

احسن مارہروی

''

پارہ ہائے جگر

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں

یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا

لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسّم، وہی ترنّم

میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا، وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے، نظر سے مستی اُبل رہی ہے

چھلک رہی ہے، اُچھل رہی ہے، پیئے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں

خرامِ رنگیں، نظامِ رنگیں، کلامِ رنگیں، پیامِ رنگیں

قدم قدم پر، روش روش پر، نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

شباب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں

تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں و موجۂ یم - کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حسن کا ہے عالم - عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں

یہ مست بلبل بہک رہی ہے، قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے، وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

یہ موج و دریا، یہ ریگ و صحرا، یہ غنچۂ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے، وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر، رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم اُن کا دامن پکڑ رہے ہیں، وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

یہ اشک جو بہہ رہے ہیں پیہم، اگرچہ سب ہیں یہ حاصلِ غم
مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ مسکرا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگرؔ کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

دیگر

کدھر ہے تیرا خیال اے دل، یہ وہم کیا کیا سما رہے ہیں
نظر اُٹھا کر تو دیکھ ظالم کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں

تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں، وہ جیسے خود ہیں بنا رہے ہیں
نظر نظر میں سما چکے ہیں، نفس نفس میں سما رہے ہیں

کرشمے ذات وصفات کے ہیں، جمال قدرت دکھا رہے ہیں
کہ ہر تصور سے دور رہ کر، وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں

یہ حادثات زمانہ کیا ہیں، اسی کے حُسنِ طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا کر، دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

کرشمے ہیں حُسنِ بے جہت کے، فسوں ہیں چشم مناسبت کے
ادھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں، اُدھر سے دیکھو تو آ رہے ہیں

کہاں کی دید، و کس کا عرفاں، حواس گُم ہیں، نظر پریشاں
جو ایک پردہ اُٹھا رہے ہیں، تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

نفس نفس میں صفاتِ تازہ، ثبات تازہ، حیات تازہ
اُنھیں میسّر ہے ذاتِ تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

ذرا سا ایک وقفۂ محبت، اُٹھا گیا اور رہی قیامت
ابھی ہم آنسو بہا رہے تھے، ابھی وہ آنسو بہا رہے ہیں

نظر نظر التجائے پیہم، ادا، ادا، شکوۂ مجسّم
ذرا جو بن کر بگڑ گئے ہیں ہمیں وہ کیا کیا منا رہے ہیں

گلوں سے مستی چھلک رہی ہے سر اپنا بلبل پٹک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں

جگر مرادآبادی

علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال

عہدِ حاضرہ کی اُن قابلِ قدر اور مبارک ہستیوں میں جنھوں نے ملک وقوم کی خاطر دنیا میں کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں خلد آشیاں علیا حضرت بیگم صاحبہ مرحومہ کی سچی مثال پیش پیش ہے۔ مشرق کے ایک فرماں روا کی سعید اولاد ہونے کے باوجود انھوں نے ہر قسم کے عمدہ خیالات سے مستفیض ہو کر اپنے تخیلات سے بذریعہ تحریر و تقریر وغیرہ اپنی رعایا۔ متعلقین اور ریاست کے باہر ایک بڑے طبقہ کی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اُن کی زندگی ایک مثالِ مجسم ہے۔ اور اس کے مطالعہ سے ہر قوم کے افراد بہرہ مند ہو سکتے ہیں ۱۸۵۸ء کے ہوش ربا ہنگامہ کے ایام میں نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ فردوس مکانی کے بطن مبارک سے یہ نیک بخت خاتون دنیا میں تشریف فرما ہوئیں۔ آپ کی پیدائش پر آپ کی نانی نواب سکندر بیگم صاحبہ نے جو اس وقت حکمراں تھیں بڑی دھوم دھام کے ساتھ جشنِ ولادت قائم کیا۔ اور رعایا کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ آپ کی پرورش کا نہایت احتیاط سے اہتمام کیا گیا۔ آپ کے والد ماجد نواب اُمراؤ دولہ باقی محمد خاں صاحب تھے۔ آپ کی نانی صاحبہ نے آپ کی تعلیم و تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا۔ پانچ برس کی عمر میں آپ کی تعلیم کی باقاعدہ بنیاد قائم کی گئی۔ اور اسلامی طریق پر بسم اللہ کی مبارک رسم ادا کی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی علمی فضا مغربی طرزِ تعلیم سے آشنا تک نہ ہونے پائی تھی اور اسی بنا پر خیال تھا کہ عربی و فارسی کی درسی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم کی طرف سے بے اعتنائی برتی جائے گی۔ مگر واقعات اس کے خلاف ثابت ہوئے۔ آپ کی تعلیم میں ہر ممکن نگہداشت سے کام لیا گیا۔ معمولی بچوں کی طرح آپ کو محنت کا ورزش کا عادی بنایا گیا عربی و فارسی کی انتہائی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو علومِ جدیدہ و فنونِ لطیفہ سے بھی کافی طور پر بہرہ اندوز ہونے کے سامان مہیا کیے گئے۔ کلام مجید کو با معنی پڑھنے کے بعد

تفسیر وغیرہ کی طرف توجہ کو منعطف کرایا گیا۔ اور فارسی، پشتو، انگریزی زبان کی تعلیم بھی ہوتی رہی۔ خوشخطی کا خاص خیال رکھا گیا۔ فنونِ سپہ گری۔ مثلاً سواری اور بانک بنوٹ وغیرہ سب سکھائے گئے۔ اور مصوری کی تعلیم بھی دلائی گئی۔ آپ کی زندگی اس اعلیٰ تعلیم وتربیت کی سچی آئینہ دار رہی۔ مصوری سے جو دلچسپی ابتدائے عمر میں پیدا ہو گئی تھی وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ آپ نے اپنے دستِ خاص سے ہزارہا مناظرِ قدرت کی تصاویر بنا کر محل کو آراستہ کیا اور نیز آپ نے احبا کو تحفۃً بھی وہ تصاویر دیں۔ مناظرِ فطرت کی مصوری کا اس قدر شوق تھا کہ محل سے نکلتے وقت موٹر میں تمام سامان ضروری ساتھ رکھتیں اور جہاں کہیں عمدہ منظر پیش نظر ہوتا اُس کی نقل اُتارتیں اور مناسب رنگ بھردیتیں۔ آپ کو سوزن کاری اور کشیدہ کاری میں بھی کافی مہارت تھی۔ مغربی مشرقی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے مردوں اور عورتوں کے لباس میں قابلِ قدر ترمیم سے کام لیا ہے۔

۱۸۶۸ء میں نواب سکندر بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد جب آپ کی ولی عہدی کا باقاعدہ اعلان ہوا اُس وقت آپ کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس صغر سنی میں ہی آپ نے سرِ دربار ایسی سنجیدہ اور بے عیب تقریر فرمائی کہ سامعین پر آپ کی جودتِ طبع کا سکہ بیٹھ گیا۔ تیرہ سال کی عمر میں آپ کی قرآن خوانی کی رسم ادا ہوئی۔

والیانِ ملک امراء و رؤساء کے لئے بچوں کی شادی کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ معقول خاطر خواہ اور موزوں شریکِ حیات کا ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے اس بارے میں کافی احتیاط سے کام لیا۔ اور بالآخر اس نوجوان اور شریف النفس شہزادی کے لئے اُنھیں کے خاندان کا ایک ہونہار اور لائق شوہر مل گیا۔ غرض ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ کو آپ کی شادی نواب احمد علی خاں سے ہوئی۔ یہ جلال آباد کے مشہور خاندان سے تعلق رکھتے دو کروڑ روپیہ کا مہر مقرر ہوا۔ اور نوشہ کو چالیس ہزار روپیے کی آمدنی کی جاگیر جہیز میں ملی۔ علیا حضرت نے اپنے شوہر کی زندگی بھر اُن کو خوش رکھا اور معمولی لڑکیوں کی طرح اطاعت و فرماں برداری کی۔ اور ثابت کر دیا کہ وہ ایک قابل بیوی بننے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ اس مبارک رشتہ سے آپ کے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تولد ہوئے۔ لیکن مشیت

بردی سے صاحبزادیاں تو عالمِ طفولیت ہی میں راہیِ ملک عدم ہو گئیں۔ صاحبزادی بلقیس جہاں بیگم صاحبہ بعمر ۱۲ ½ سال اور صاحبزادی آصف جہاں بیگم بعمر ۱۴ سال انتقال کر گئیں۔ صاحبزادوں میں نواب محمد نصر اللہ خاں اور کرنیل حافظ محمد عبید اللہ خاں عالمِ جوانی میں اس دنیا کو خیرباد کہہ گئے اور اب آپ کے تیسرے صاحبزادے جناب نواب حاجی حافظ حمید اللہ خاں صاحب خلد اللہ ملکہ بھوپال کے فرمانروا ہیں۔

علیا حضرت مرحومہ نے اپنی اولاد کی تربیت اپنی زیرِ نگرانی کرائی۔ اور اُن کی تعلیم اور پرورش کے لیے مختلف کتابوں کو پڑھا اور عوام کے فائدہ کے لیے کتابیں تصنیف کیں۔ پرورش و تعلیم اطفال پر سب سے پہلے آپ ہی نے کتابیں لکھیں جو بہت مفید ہیں۔

۱۲۹۸ھ میں آپ کی والدہ ماجدہ نے آپ کی مرضی کے خلاف نواب مولوی محمد صدیق حسن صاحب سے نکاحِ ثانی کر لیا۔ آپ کے والد صاحب قبلہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس واقعہ سے دونوں ماں بیٹیوں میں نا چاقی ہو گئی اور تعلقات کی کشیدگی بڑھتی گئی۔ تاریخِ بھوپال کا یہ وہ ناگوار واقعہ ہے کہ جس کے مضر اثرات سے ریاست کے لوگ ہر وقت اندیشہ میں تھے اور یہ حالت ۲۷ سال تک قائم رہی۔ آپ نے کبھی کنایۃً یا اشارۃً نہ ہی اپنی ذات سے کسی کو نقصان پہنچانے یا حاسدوں سے انتقام لینے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس طویل عرصہ تک تنہائی میں زندگی بسر کرتی رہیں۔ لیکن اس فرصت کے وقت کو آپ نے بیکار ضائع نہیں کیا۔ بلکہ تمام وقت بچوں کی تربیت۔ باغات کی پرداخت اور کتابوں کی تالیف و تصنیف اور مطالعہ میں صرف کیا اور یہی وجہ ہے کہ جب کبھی آپ کو تقریر کرنے کا موقع ملا تو آپ نے تبحرِ علمی کا ثبوت دیا۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں آپ کی والدۂ محترمہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ ریاست کے تمام کاموں کی ذمہ داری یکایک آپ کے کاندھوں پر آ گئی۔ ایک عرصہ تک ریاست کے کاموں سے علیحدگی کے باعث یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ آپ کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن آپ نے اپنے حسنِ تدبیر و انصرامِ امورِ ملکی سے ثابت کر دکھایا کہ ان کی ذات میں ایک قابل فرمانروائی کا مادہ موجود تھا اور وہ ہمہ وقت کام کر رہی تھی۔ چنانچہ جب آپ نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو ہر شعبہ میں ابتری

پھیلی ہوئی تھی۔ اور خزانہ قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ آپ دن دن بھر کام کرتیں اور حساب و کتاب کی جانچ نفس
نفیس کرتیں۔ کاغذات کو پڑھتیں اور اُن پر احکامات لکھتیں۔ ریاست میں دورہ کرتیں اور رعایا کی شکایتیں
سُن کر اُن کی داد رسی کرتیں۔ آپ نے اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی۔ آپ ریاست کو ایک امانتِ الٰہی سمجھتی تھیں
اور اس لیئے اس کے کاموں کو باحسن کمال انجام دیتیں۔ آپ کی ان کوششوں کے حسب منشا نتائج برآمد ہوئے
آمدنی بڑھ گئی اور تمام شعبہ جات میں اصلاح ہو گئی۔ پولیس۔ فوج۔ جیل اور تعلیم وغیرہ میں اصلاح و ترقی ہوئی
ذرائع آمد و رفت اور آبپاشی میں اضافہ کیا گیا۔ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے مدرسہ کھولا۔

اسی اثنا میں آپ کے شوہرِ محترم احتشام الملک عالیجاہ نواب احمد علی خاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ نواب صاحب
موصوف ریاست کے کاموں میں علیا حضرت کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔ ان کی وفات پر ایک مرتبہ پھر لوگوں کو خیال ہوا
کہ اب ریاست کی حالت کچھ خراب ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا اُن کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ریاست کی اصل رکن
خود عُلیا حضرت کی ذات ستودہ صفات تھی جو کسی امر میں کسی کی اصلاح و مشورہ کی محتاج نہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب
نہیں ہے کہ وہ کبھی کسی کی بات نہیں سُنتی تھیں ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ اکثر موقعوں
پر آپ نے افسرانِ ریاست کی باتوں کو مان کر اُن پر عمل کیا ہے۔ لیکن جب تک آپ معقول دلائل
سے قائل نہ ہو جاتیں اُس وقت تک البتہ کوئی بات قابلِ پذیرائی نہ ہوتی۔ آپ اپنے مخالفوں
کو ممکن دلائل و براہین سے قائل کر دیتی تھیں۔ آپ کی زندگی کا سب سے زیادہ عظیم الشان
کارنامہ تعلیمی شغف ہے۔ تعلیمی اُمور سے آپ کو فطرتاً دلچسپی تھی یہ وہ پاک و لطیف جذبہ تھا جس سے
ہزار ہا مفید اداروں کی بنا قائم ہوئی۔ آپ نے نہ صرف حدودِ ریاست ہی میں تعلیم کی ترویج کی
کوشش کی بلکہ آپ کے اس فیض سے تمام ہندوستان مستفیض ہوتا رہا ہے۔

چونکہ آپ کا تعلق جنسِ لطیف سے تھا۔ اس لیئے قدرتاً آپ نے لڑکیوں کی تعلیم پر زیادہ زور دیا۔
اور اس لحاظ سے آپ کو عورتوں کا سرسیّد کہنا بیجا نہ ہوگا۔ بھوپال میں الگزینڈرا ہائی اسکول کھولا۔
اور ہندو و مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے بہت سے مکاتب اور پاٹ شالے اور مدرسہ سلطانیہ جاری کیئے۔
غریب عورتوں میں صنعت و حرفت کی ترویج کے لیئے بھی ایک مدرسہ جاری کیا۔ طبی معلومات بہم پہنچانے کی

غرض سے مدرسہ طبی آصفیہ جاری کیا جس میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لیئے وظائف بھی مقرر کیئے ہندوستان میں لڑکوں کی مذہبی تعلیم کے لیے تو مختلف اطراف واکناف ہند میں مکاتب موجود ہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم سے قطعی طور پر چشم پوشی کی جاتی ہی - آپ نے اس کمی کو محسوس کیا - اور چونکہ اولاد کی دماغی نشوونما کا انحصار ابتدائی منازل میں زیادہ تر ماں ہی کی تعلیم و تربیت پر مبنی ہوتا ہی اور الحاد وبدوینی کے بڑھتے ہوئے زور کو روکنے کے لیئے آپ نے عدیم النظیر اسلامی مدرسہ حمیدیہ قائم کیا۔ جس میں لڑکیوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم دیجاتی ہے - یہ وہ زبردست اسلامی خدمت ہے جس کا جواب شاید ہی کوئی اس ملک میں دے سکے

آپ نے فوج میں بھرتی ہونے والے رنگروٹوں کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا اور فوج کو انگریزی طرز پر ترتیب دے کر اس قابل کر دیا کہ وہ بوقتِ ضرورت جنگ میں شریک ہو سکے - چنانچہ اس کے مقصد کے لیئے ایک مدرسہ حربیہ بھی کھولا - آپ کی ان تعلیمی دلچسپیوں کے باعث بیرونِ ریاست کے بہت سے تعلیمی ادارے فائدہ اُٹھاتے رہے - علی گڑھ کالج اور یونیورسٹی - گرلس کالج - مدرسہ دیوبند - ندوہ وغیرہ سیکڑوں مدرسے اطرافِ ملک میں ایسے ہیں جو آپ کی مالی مدد سے چل رہے ہیں - آپ نے اکثر موقعوں پر پبلک زندگی میں بھی نمایاں حصہ لیا ہے - ۱۹۱۱ء میں جب دہلی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے تو اس کے زنانے شعبہ کی صدارت آپ نے ہی نبھائی تھی - اور اب آخری مرتبہ ۱۹۲۸ء میں بھی آپ نے خواتین ہند کی کانفرنس منعقدہ دہلی میں صدارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیئے - بھوپال میں آپ نے لیڈیز کلب کی سرپرستی کی اور زنانہ نمائش کی بنیاد ڈالی - اس کے علاوہ بہت سے مدرسوں اور مکتبوں کا سنگ بنیاد نصب کیا۔

آپ کے علم و فن کا اکثر مستند عالموں نے اعتراف کیا ہے - آپ علم دوست اور حامیِ علم و ادب تھیں۔ مولانا شبلی مرحوم کی تصنیف سیرۃ النبی آپ ہی کی بذل و کرم کے باعث معرضِ وجود میں آئی - مولانا مرحوم نے ذیل کا قطعہ اسی موقعہ پر کہا تھا -

کہ ابرِ فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہی　　مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت

رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی   تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل   کہ جس میں اک نقیبہ بنوا ہے ایک سلطاں ہے

آپ کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جس میں علم و فن - تاریخ و سیر - حفظان صحت - خانہ داری - تربیت اولاد - دستکاری - باغبانی - اور تقاریر شامل ہیں - تعمیرات کا بھی شوق تھا - ریاست کو ٹیلیفون اور بجلی کی روشنی سے آراستہ کیا اور بجلی کا ایک حصہ مسلم یونیورسٹی کو تفویض کیا جس کی آپ آخر وقت تک چانسلر رہیں۔

آپ کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا - دورانِ سفر میں آپ ہمیشہ عالم و فاضل لوگوں کی صحبت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتیں - مختلف موضوع پر بحث کرتیں - نئی تصانیف کو پڑھتیں اور سب مطلب باتوں کو نوٹ کرتیں -

سب سے پہلی مرتبہ آپ ۱۸۷۵ء میں اپنی والدہ محترمہ کی معیت میں پرنس آف ویلز کے دربار میں شریک ہوئیں - ۱۸۷۷ء میں دہلی کے دربارِ قیصری میں گئیں - ۱۸۸۴ء میں آپ لارڈ رپن کے دربار میں تشریف لے گئیں اور ۱۹۰۲ء میں اپنی تاجپوشی کے بعد ایڈورڈ ہفتم کے دربار کے جشن میں شرکت کی غرض سے گئیں - ۱۹۰۴ء میں آپ کو گورنمنٹ کی جانب سے جی - سی - آئی - ای کا خطاب عطا ہوا - ۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں شاہِ افغانستان ہندوستان میں سیر کی غرض سے تشریف لائے تو طلبا حضرت نے اُن سے بمقام آگرہ پشتو زبان میں گفتگو کی - امیر مرحوم آپ کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے - اور آپ کی تعریف کی - آپ زیارت کعبہ شریف سے ۱۳۲۱ھ میں مشرف ہوئی تھیں اور اس موقعہ پر اپنے صاحبزادہ کو اپنے ہمراہ لے گئی تھیں - حجاز میں حکومت ترکیہ کی طرف سے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا - اس سفر کے حالات آپ نے نہایت مؤثر انداز میں تحریر کیے ہیں - ۱۹۱۱ء میں شہنشاہِ جارج پنجم کی رسمِ تاجپوشی میں شرکت کی غرض سے آپ انگلستان تشریف لے گئیں اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ شریک ہوئیں - واپسی میں آپ پیرس - اور جنیوا اور بحرۂ الیسٹ بھی گئیں - اور مصر و قسطنطنیہ کی بھی سیر کی - دارالخلافہ قسطنطنیہ میں آپ نے سلطان و سلطانہ سے ملاقات کی - وہاں سے لوٹ کر آپ دہلی دربار میں شریک ہوئیں - اور جی - سی - ایس

آئی کا خطاب ملا۔

۱۹۲۵ء میں جب ولی عہد بہادر کا انتقال ہوگیا اور گورنمنٹ نے اُن کے صاحبزادے یعنی علیا حضرت کے پوتے کو ولی عہد بنانا چاہا تو آپ نے اس کی مخالفت کی اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے نواب حمیداللہ خاں کی ولی عہدی کی کوشش کے لیئے انگلستان تشریف لے گئیں نواب حمیداللہ خاں صاحب علی گڑھ کے گریجویٹ اور ہونہار پرنس تھے اور اُن سے زیادہ موزوں شخص ریاست کے کام کے لائق کوئی نہ تھا۔ اور شرعی حیثیت سے بھی وہی مالک تاج و تخت تھے۔ انگلستان میں علیا حضرت ایک سال تک مقیم رہیں۔ اور جب تک کہ اُنھیں مقصد میں کامیابی نہ ہوگئی وہ واپس نہ آئیں۔ وہاں کے جس عمدگی اور لیاقت سے آپ نے اس مشکل کام کو سرانجام دیا ہے اُس سے بڑے بڑے مُدبّر انتہائی حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ دراصل یہ انھیں کے بل بوتے کا کام تھا کہ اُنھوں نے برٹش پارلیمنٹ کو اپنا جائز مطالبہ تسلیم کرنے پہ مجبور کر دیا۔ ہند میں واپسی پر اُنھوں نے نواب حمیداللہ خاں صاحب کو اپنی عین حیات ہی ریاست کا جائز مالک بنا کر خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اور اب اُنھیں قلبی اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔ کیونکہ ریاست جس پر وہ ۲۵ سال حکمراں رہیں ایک قابل اور سعید شخص کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔

علیا حضرت نہایت منکسر مزاج، انصاف پسند اور سخاوجود کی دلدادہ تھیں۔ غریبوں کی مدد کرتیں مجبوروں کو مشورہ دیتیں اور طالب علموں اور عالموں کی وظائف سے مدد کرتی تھیں۔ نماز و روزہ کی سختی کے ساتھ پابند تھیں۔ رمضان شریف میں قرآن شریف سُنا کرتی تھیں۔ اپنے نوکروں اور ماتحتوں سے نرمی و ملائمت کا برتاؤ کرتی تھیں۔ اُن کی خطاؤں کو معاف اور اُن کے قصوروں سے درگزر کرتیں۔ کسی کو بُرا بھلا کہنا یا غرور و نخوت سے پیش آنا اُن کی عادت کے منافی تھا۔ جب وہ کسی سے ملاقات کرتی تھیں تو یہ معلوم ہوتا کہ گویا ایک مادرِ مہربان اپنے بچے سے پیاری پیاری باتیں کر رہی ہیں۔

افسوس ہے کہ ایسی خوبیوں والی خاتون اس دنیا سے اس قدر جلد کوچ کر گئی۔ آپ کی وفات

سے ملک و قوم کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے اور بالخصوص ہماری یونیورسٹی کو جس کی کشتی کا آپ ناخدا تھیں اور مالی و اخلاقی غرض ہر لحاظ سے جنسِ گراں تھیں

اکبر مرحوم نے آپ کے حسن و اخلاق کے بارے میں عرصہ ہوا ایک نظم لکھی تھی جس پر (تہذیب نسواں سے لے کر) ہم مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

اللہ والی والیہ

اگرچہ والیانِ ملک سب رُتبے میں عالی ہیں — مگر یہ والیہ بھوپال کی اللہ والی ہیں

نہایت ہی مفیدِ قوم ہیں فیاضیاں اِن کی — بہت راہیں اُنھوں نے خیر و برکت کی نکالی ہیں

فلک ہی شانِ ملک کی تو وہ ہیں اخترِ تاباں — چمن ہے بزمِ اسلامی تو وہ پھولوں کی ڈالی ہیں

ترقی اُن کو ہے مدِ نظر روشن خیالی کی — اُنھوں نے اپنی فکریں نور کے سانچے میں ڈھالی ہیں

حریمِ مشرقی نازاں ہے اُن کے علم و دانش پر — یہ روشن ہے کہ وہ اک نورِ شمعِ باکمالی ہیں

سوئے تعلیمِ نسواں منعطف اُن کی توجہ ہے — بنائیں جابجا اس مقصدِ عظمےٰ کی ڈالی ہیں

مساجد اور مکاتب کی بھی حامی ہیں دل و جاں سے — شیوخِ دین و ملت نے مرادیں دل کی پالی ہیں

عظیم القدر ہیں فرزندِ عالیشاں بھی اُن کے　　رہِ حُسنِ عمل ہیں وہ بھی صرفِ خوشنما لی ہیں

زمانہ گو بہت نازک ہے بے بس ہیں طریق اگلے　　مگر دل جن کے اچھے ہیں وہ کب نیکی سے خالی ہیں

دعا اُن کو بھی دیتے ہیں اُن کے جاننے والے

ولی اللہ ہو اُن کا کہ وہ اللہ والی ہیں

"اکبر"

زکریّا فیاضی

قولِ مسلم

یہ نظم یونیورسٹی اولڈ بوائز ڈنر کے موقعہ پر پڑھی گئی تھی (مدیر)

اغیار سے یہ کہدو، ہے یہ مکاں ہمارا ۔۔۔ یہ سرزمیں ہماری، یہ آسماں ہمارا

یہ باغ و راغ سارے جتنے ہیں سب ہمارے ۔۔۔ یہ آب جو ہماری، یہ گلستاں ہمارا

ہوتے ہیں کون اس میں صیّاد اور گلچیں ۔۔۔ مدت سے اس چمن میں ہے آشیاں ہمارا

اپنے لہو سے ہمنے ہر نخل کو ہے سینچا ۔۔۔ ہم باغباں ہیں اس کے یہ گلستاں ہمارا

گلگشت ہم کو بھائی کچھ ایسی اس چمن کی

جس سے نہ یاد آئی پھر بھول کر وطن کی

اے اجنبی، مگر تو واقف نہیں عرب سے ۔۔۔ جو پوچھتا ہے ہم سے نام و نشاں ہمارا

مسکن قدیم اپنا ہے سرزمینِ بطحا ۔۔۔ پہلے ہوا جہاں سے چشمہ رواں ہمارا

جو چاہے دیکھ آئے بیت الحرامِ مکّہ ۔۔۔ قایم ہے اس زمیں پر ابتک نشاں ہمارا

مرجع ہمارا ابتک ہے خاکِ پاکِ یثرب ۔۔۔ جس خاک میں ہے سوتا وہ گلّہ باں ہمارا

ہم اہلِ بادیہ ہیں اسلام کے فدائی

اس دین کے فدائی اس نام کے فدائی

ضرب المثل ہماری مہماں نوازیاں ہیں ۔۔۔ ہم کو عزیز جاں سے ہے میہماں ہمارا

حاتم سے نام روشن ہمت کا ہی ہماری ۔۔۔ جود و سخا میں عالم ہی مدح خواں ہمارا
ہمنے کبھی کسی سے آنکھیں نہیں چرائیں ۔۔۔ مانگا ہو ہم سے اس نے گو نقدِ جاں ہمارا
دب کر کسی کے آگے گردن نہیں جھکائی ۔۔۔ اس واسطے لقب ہے شبیرِ ژیاں ہمارا

ابنائے بادیہ ہم ڈرتے نہیں کسی سے
البتہ چھیڑ پہلے کرتے نہیں کسی سے

وہ آبنائے مغرب یعنی کہ جبل طارق ۔۔۔ صدیوں اُڑا کیا ہی اس پر نشاں ہمارا
یہ سرزمین مشرق کہتے ہیں ہند جس کو ۔۔۔ قرنوں رہا ہی اس پر سکہ رواں ہمارا
تاجِ ہرقل اب بھی ہے زیب سر ہمارے ۔۔۔ ہی پائے بوس ابتک تختِ کیاں ہمارا
دشمن جو ہم سے آکر میدان میں لڑے ہیں ۔۔۔ بھولے نہیں ابھی تک زخمِ سناں ہمارا
اس تیغِ خونفشاں کی بیٹھی ہی دھاک سب پہ ۔۔۔ اور مانتا ہی لوہا سارا جہاں ہمارا

ہم فخر جانتے ہیں جنگ و جہاد کرنا
حق بات کہہ کے اڑنا اور اس پہ لڑ کے مرنا

محمد فاروق

نمودِ سحر

یہ مضمون جناب سید ناصر حبیب صاحب وکیل نبیرۂ حضرت مومن دہلوی مرحوم کی دخترِ نیک اختر کی جنبشِ قلم کا نتیجہ ہے

(مدیر)

اے عروسِ سحر جب تو نمودار ہوئی !

خوش آواز طیور کے سُریلے گیت ۔ آبِ رواں کا دل کش ترنّم ۔ اور آبشاروں کی روح پرور صدائیں تیرے خیر مقدم کے لیے بڑھیں ۔ بہار نے پھولوں کی ڈالی ۔ شبنم نے موتیوں کی نذر پیش کی ۔

تیری پذیرائی کے لیئے میرے لب سے ایک سامعہ خراش نالہ بلند ہوا اور آنسوؤں کا ایک قطرہ آنکھ سے گر کر دامن پر لوٹنے لگا ۔ آہ ! یہ وہ قطرہ تھا جس پر دنیا کے گراں قدر موتی قربان کیے جا سکتے ہیں ۔

ستارے جو تمام رات فضائے ملیح کے وحشت زا منظر کو اپنی ضیا باریوں سے منوّر کیے ہوئے تھے بام فلک سے جست کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ۔ میری آنکھیں بھی جو خدا معلوم کیوں تمام رات کھُلی رہی تھیں جھپکنے اور بے نور ہونے لگیں ۔

اضطرابی و بے قراری کے مجسّمے ۔ وفا داری و جانبازی کے پُتلے اور جور و ستم کے خوگر پروانے ننھے دلوں میں ارمان و تمنّا کی پوٹ ۔ اور شکوہ و شکایات کے دفتر لیئے جوشِ جانبازی میں رقص کرتے ہوئے شمعِ شبستاں کے لپکتے ہوئے شعلے کی نذر ہو چکے تھے ۔

جذبِ محبت نے شمع کی بے نیازی اور خود داری کا طلسم توڑ دیا ۔ وہ خود بھی جانباز پروانوں کی جدائی میں گھُلتے گھُلتے اُس عالم کی طرف رخصت ہو گئی جہاں پہونچنے کے بعد اندیشۂ فنا اور خوفِ بربادی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے ۔

میں بھی ایک ایسے ہی جہاں کی متلاشی ہوں جس پر سکون و اطمینان کا تسلّط اور عیش و نشاط کی حکومت ہے !!!

مستِ خرام نسیمِ چمن کے کسی نامعلوم گوشۂ تاریک سے نکل کر سبزۂ خوابیدہ کو چونکاتی ۔ جوانانِ چمن

ـے شوخیاں کرتی - غنچہ نودمیدہ کو چھیڑتی چلی گئی - خوش رنگ پھول برس پڑے اور چمن مہک اُٹھا۔

داغہائے غم سے میرا سینہ بھی لالہ زار تھا - میرے دل کی عمیق ترین گہرائی سے ایک آہ نکلی شرارے
ـنے لگے اور شعلے بھڑک اُٹھے -

تیرے چہرۂ عریاں کی بے حجابانہ جلوہ ریزیوں پر شفق نے اپنی قرمزی نقاب ڈال دی - مگر تیرے
ـوے شوقِ خود نمائی میں سراسیمہ و بیتاب ہو کر اُس نقابِ آتشیں رنگ سے چھن چھن کر کائنات کے ذرّے
ـرے کو منور کرنے لگے -

ضبطِ غم سے میرا دل سینہ سے باہر نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا - میں ایک آہِ سرد کھینچنے پر مجبو
وگئی - دیکھنے والوں نے میرے راز کو پا لیا !!!

کنیز فاطمہ

ایک بُت پرست محمود

(نظم بہ تقریب شادی خانہ آبادی جناب خواجہ غلام السیدین صاحب - پرنسپل ٹریننگ کالج)

آج تو مائلِ مقصود ہوا خوب ہوا — اپنے ہم چشموں کا محسود ہوا خوب ہوا

ثروت و علم کا ہی آج قِران السعدین — علم ثروت پہ جو افزود ہوا خوب ہوا

مائلِ عشق ہے جو آج پروفیسر ہے — علم کا عشق جو مقصود ہوا خوب ہوا

آج تک کوئی بھی کیوپڈ سے بھلا جیتا ہے — اس سے لڑنا ترا بے سود ہوا خوب ہوا

زاہدِ خشک ہوا معتکفِ بیتِ صنم — بُت پرست آج یہ محمود ہوا خوب ہوا

سچ تو یہ ہے کہ یہی کیوں نہ کہے اب سجّاد

قصرِ ساجد ترا مسجود ہوا خوب ہوا

سجّاد حیدر یلدرم

بدگمانی

ایک دن میں سہ پہر کے وقت ڈی - لا - پکس کے قہوہ خانہ میں بیٹھا ہوا اہل پیرس کی گوناگوں مصروفیتوں، اُن کی بود و باش اور طرز رہائش کے مطالعہ میں بغور مصروف تھا - افلاس کے ساتھ ساتھ اُن کے احساس خودداری نے مجھے متحیر کر رکھا تھا - حقیقت تو یہ ہے چشم عبرت کے لیئے اُن ہی میں سینکڑوں درخشندہ مثالیں موجود تھیں - دفعتاً کسی نے آواز دے کے مجھے چونکا دیا - سامنے دیکھا تو لارڈ مرحین کو کھڑا پایا - ایک قدیم مخلص رفیق کے ملنے سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے میں اُسی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا - زمانۂ طالبِ علمی میں ہم دونوں اکسفورڈ میں تھے ہماری دوستی ایک حقیقی اور سچے ارتباط و اختلاط کی تمثیل تھی - وہ علاوہ حسین ہونے کے خوش اخلاق بذلہ سنج اور مہذب بھی تھا - اور یہی وجہ تھی کہ مجھے اُس سے شدید ترین اُنس تھا - وہ ہر سوسائیٹی میں وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا - اُس کی صاف گوئی لوگوں کو اکثر رنج پہنچایا کرتی تھی - مگر سچ پوچھیئے تو اُس کے اسی وصف نے اُسے میری نظروں میں وقیع تر ثابت کر دیا تھا - زمانۂ طالبعلمی کے بعد ہم لوگ بچھڑ گئے - پیکار حیات نے ہماری یاد بھی فراموش کرا دی - اتنے عرصہ کے بعد کی ملاقات نے ہمارے سامنے ماضی کے پر لطف زمانہ کا نقشہ کھینچ دیا - لیکن گردشِ ایام نے بڑی حد تک اس میں تغیّر پیدا کر دیا تھا - اُس کے چہرہ سے انتشار و فکر کے ثبت شدہ نقوش ہویدا تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی مستقل نکوہش نے اُس کی زندگی تلخ کر رکھی ہے - مجھے یقین تھا کہ سیاست مدنی اور مذہب کی قیود اُس کی بشاشت کو زائل کرنے کی سبب نہیں ہو سکتیں - ہاں یہ ممکن ہے کہ محبت کی دیوی کے قربانگاہ پر اُس کی مسرتیں بھینٹ چڑھ گئی ہوں اُس کی مغموم اور پژمردہ حالت دیکھ کر میری جُرأت مجھے جواب دے رہی تھی مگر میں نے سخت دماغی جد و جہد کے بعد اُس سے دریافت کیا کہ کیا اُس کی شادی ہو چکی ہے ؟ جس کے جواب میں اُس نے کہا " عورت ! آہ عورت میرے خیال میں ایک پُر اسرار مجسمہ ہے جس کی حقیقت کا انکشاف باوجود سعی بسیار نہیں ہو سکا "

میں ۔ میرے عزیز جیرالڈ عورت کی تخلیق محض محبت کیے جانے کے لیئے ہی اُس کی حقیقت سمجھنے کے لیئے نہیں"
جیرالڈ ۔ "لیکن جو شے پردۂ راز میں ہو اُس سے محبت کیسی؟
میں ۔ "تمہاری گفتگو کی بنا پر میں وثوق سے کہتا ہوں کہ تمہارا سینہ کسی ایسے سرِ سربستہ کا حامل ہے جس نے
تمہاری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ میں تمھیں اُس خلوص کا واسطہ دلاتا ہوں جو تم کو میرے
ساتھ ہے کہ مجھے اس میں شامل کرنے میں بخل نہ کرو"
جیرالڈ ۔ "یہاں آیند و روند کی کشمکش سے میرا دم گھٹنے لگا ہے چلو کسی تفریح کے مقام پر چلیں۔ لیکن میں خود
اس زرد رنگ کی موٹر پر میں نہیں بیٹھنا چاہتا۔ سامنے والی سبز رنگ کی موٹر کرایہ پر لیلو"
چند لمحات کے عرصہ میں ہماری موٹر میڈیلین کی طرف تیزی سے چلنے لگی۔
میں خاموش تھا اور وہ کسی گہرے خیال میں محو اسی حالت میں نصف سے زیادہ حصہ طے ہو گیا۔ آخر کار
مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اُس سے دریافت کیا "کیوں جیرالڈ! ہماری کوئی منزل بھی قرار پائی ہے؟"
جیرالڈ ۔ "منزل کا تعین کیا کیجیئے آؤ بوائس کے ریسٹورانٹ میں چلیں وہاں پر کھانا بھی کھائیں گے اور تم اپنی زندگی
کی روداد بیان کرنا"
میں ۔ "لیکن میں پہلے تمہاری حیات کی تلخیوں اور دلچسپیوں سے واقف ہونا چاہتا ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے
تمہارا راز معلوم کرنے کے لیئے مجھ میں کیسی ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے"
میری اس یاد دہانی پر اُس نے ایک نقرئی چرمی کیس جیب سے نکال کر مجھے دیا
ایک تصویر برآمد ہوئی یہ تصویر ایک حسین لڑکی کی تھی جس پر حُسن نسوانی کی بہاریں مع اپنی جملہ گلشن طرازیوں کی
آن بان سے مملکت عشق کے نظم و نسق کو درہم برہم کرنے کی قسم کھا رہی تھیں۔ حسن و شباب اپنی پوری توانائی
سے کرشمہ سازیاں کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ نازک اندام قد متوسط تھا جس نے اعضا کی کشش اور دل آویزی
میں اور چاند لگا دیئے تھے۔ گو تصویر تھی لیکن مصور نے اپنے کمال کی حدیں مقرر کرنے کی غرض سے اس حسینہ
کی غزالی آنکھوں کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن نگاہوں کی بار ان کیف و مستی دیکھنے
والوں کو خود فراموشی کا سبق دینے کے لیئے بنائی گئی ہے۔ پیچ و خم کھائے ہوئے بال پشت پر رقصاں تھے ایک

قیمتی سمور، صراحی دار گردن اور سینے کا محافظ تھا۔ مختصر یہ کہ حُسن کے منتہائے تخیل کا مجسمہ تھی۔ بے جان حُسن کی تنویریں ابھی مجھ پر ضیا پاشی کر رہی تھیں اور میں اپنے خیالات کی روانی میں بہ رہا تھا کہ دفعتاً جرالڈ نے مجھ سے سوال کیا۔ "اس کے بشرہ سے کیسا ظاہر ہوتا ہے؟ کیا چہرہ کے ظاہر آثار کی واقعیت سے کوئی مناسبت ہو سکتی ہے"؟ میں تصویر کو پھر غور سے دیکھنے لگا لیکن اس سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب ہم کالج میں تھے تو ہمارا تصویر یا آدمی کے چہرہ کو دیکھ کر اُس کے خیالات کا پتہ لگانا ایک دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جرالڈ کے کہنے پر میں اُس پر غور کرنے لگا۔ اُس سے میرا اتنا تو مطلب حل ہو گیا کہ وہ چہرہ کسی رازِ نہفتہ کا آئینہ دار ہے لیکن یہ کہ وہ راز حسن کی طرف رجوع ہے یا شر کے تحت میں ہے میں نہ معلوم کر سکا۔ حسن بے پناہ تھا لیکن ایسا حُسن جو بہت سے رازوں کی روح۔ ایسا حُسن جو زمانہ کے گرم و سرد سے آگاہ خفیف تبسم جو لبوں پہ رقصاں تھا خلافِ قیاس بجائے شیرینی کے متانت اور سنجیدگی کا مظہر تھا۔

اُس نے بے صبری کے عالم میں پھر مجھ سے پوچھا "کیوں! تم نے بتایا نہیں تمھاری کیا رائے ہے"!

میں:- "تاوقتیکہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ ہو میرے لیئے یہ راز ناقابلِ فہم ہے اُس کے متعلق جو راز ہو تو مجھ سے کہو"۔

جرالڈ:- اگر تم اتنے ہی مصر ہو تو کھانے کے بعد تمھیں بتاؤں گا۔ اس کے بعد ہماری دوسرے موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ملازم چار اور سگریٹ لایا۔ میرے خیالات میں ابھی تک وہی برہم کن عالم جذبات تصویر جلوہ پاشیاں کر رہی تھی۔ میں نے یہ وقت غنیمت سمجھا اور اُسے اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ وہ دفعتاً اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس کی ہر جنبش قدم سے اور چہرہ کے مختلف رنگوں سے اُس کی قلبی کیفیات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سخت ملال نیش زنی کر رہا ہے اور وہ تا امکان اُسے ضبط کرنے کی کوشش میں مصروف مگر جوں جوں وہ اُس کی کوشش کرتا تھا اُس کی بے چینی اور تیزی سے بڑھتی جاتی تھی اور اضطراب کے کانٹے دل میں چبھ چبھ کر درد پیدا کر رہے تھے۔ قریب نصف ساعت یہی عالم اُس پہ طاری رہا اس کے بعد میرے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اپنی روداد اس طرح سُنائی

شروع کی - ایک دن میں ۵ بجے شام کو بانڈا سٹریٹ پر جا رہا تھا - گاڑیوں اور موٹروں کی کثرت نے راستہ چلنے والوں پر راہ بند کر دی تھی - سڑک کے قریب ہی ایک زرد رنگ کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی - میں نہیں سمجھا کہ اُس میں کونسی ایسی کہربائی قوت موجود تھی جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کر لی - ایسا معلوم ہوا کہ کوئی پوشیدہ کشش ہے جو مجھے گاڑی کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے مجھے گاڑی کے اندر ایک حسین چہرہ نظر آیا جس کی شبیہہ سہیر کو تمھیں دکھا چکا ہوں - میرے عزیز رفیق! میں تم سے کیا کہوں میں ایک ہی نظر میں کچھ ایسا مخمور سا ہو گیا کہ خود کی بھی خبر نہ رہی دن کا باقی حصہ گزر گیا رات بھی مع اپنی جملہ آسایش کے دنیا پر چھیل گئی چاند اپنی خنک کرنوں سے عالم کو معمور کرنے لگا ہر شے پر ایک سکوت اور جمود کا عالم طاری و ساری ہو گیا مگر میں اب بھی خیالات کے تسلسل میں اُلجھا ہوا زندگی کے چند بیش قیمت لمحات کی یاد کے مزے لے رہا تھا اور میرے دل کے سمندر میں خیالات کی لہروں پر وہی دلربا صورت تیر رہی تھی خدا خدا کر کے اس رات کی بھی صبح ہوئی نسیم سحر کے فرحت افزا جھونکے اشیاء عالم میں پرلطف ہمہمی کی روح پھونک رہے تھے ہر شے شگفتہ و مسرور نظر آتی تھی - لیکن میں نے تمام شب آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی تھی اس لیے یہ صبح میرے لیے پیغام غم و یاس لانے والی ثابت ہوئی - گشتہ اُمید و بیم دل لیکر بستر سے اُٹھا اور آہ اُس سڑک پر جہاں میں نے غم عشق کا سرور آگیں درس لیا تھا ٹہلنے لگا - میری حالت اُس وقت اُس مجنونِ فلسفی کی سی تھی جسے ہر شے میں اپنے مقصد کی جھلک نظر آئے مگر اپنی افتادِ طبع سے اُس کی حقیقت و ماہیت کے جزئیات کے کاوش میں مبتلا ہو - اس وقت بھی گاڑیوں اور موٹروں کا ایک سیلاب رواں تھا - میرا تخیل میرے سامنے ہر گزرنے والی گاڑی پر وہی تھا اپنی حُسن کی تصویر پیش کر دیتا تھا اور میں پروانہ وار اُس شمع جمال پر فدا ہونے کے لیئے دوڑتا لیکن قریب پہونچنے پر معلوم ہوتا کہ وہاں سے مملکتِ یاس شروع ہوتی ہے - متواتر ناکامیوں کا جب تا دیر یہی سلسلہ قایم رہا تو مجھے سارے واقعات پر افسانۂ خواب کا شک ہونے لگا رفتہ رفتہ میری طبیعت میں سکون پذیر ہونے لگی -

قریب ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا - ایک دن شام کے وقت میں میڈم رسٹائیل کے یہاں کھانے پر مدعو تھا دعوت ۸ بجے شروع ہونے والی تھی میں شام ہی میں کھانے کا عادی تھا اس لیئے مجھے بھوک معلوم ہونے

نگ نشست کے کمرہ میں اور دوسرے مہمان بیٹھے ہوئے تھے جن میں مختلف موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی میزبان کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی اُسے کسی اور کا انتظار ہے۔ ۸½ بجے ملازم کمرہ میں داخل ہوا اور لیڈی الرائے کی آمد کی اطلاع دی ملازم اُلٹے پاؤں واپس گیا۔ دروازہ پھر کھلا اور ایک متوسط قامت عورت داخل ہوئی نگاہ کا اس کی جانب اُٹھنا تھا کہ میں مبہوت ساکت و صامت جوں کا توں رہ گیا ایسا معلوم ہونے لگا کہ مجھ سے تمام حیات کی قوتیں سلب کر لی گئی ہیں۔ آہ یہ وہی نشاطِ روح تھی جس کا میں طالب تھا اور میری آنکھیں متلاشی تھیں ایک شعاع آفتابی کی طرح جو جمالیات اور جلالیات سے مرصع ہو تراما خراما چل کر میرے ظلمتکدۂ دل کو معمور و منور کرنے کے لیے میرے قریب ایک کرسی پر جلوہ فگن ہوئی۔ یہ میری خوش نصیبی کا انتہائی عروج تھا۔

کھانا تیار تھا ہم لوگ بیٹھ گئے۔ میں اپنے حرکات و سکنات پر خود بھی قادر نہ تھا اس لیئے جو کچھ ہوا مجھے اس کا علم نہیں میں اُس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری ہمت یارا نہ کرتی تھی۔ حواس مختل۔ حسیات بے کس اور میں اگر میری ہستی کوئی ہو سکتی تھی تو مجبور بہت کدو کاوش کے بعد میں دماغ و دل کو توازن پر لا سکا میری پہلی بات جو اُس سے میں نے کی اصل میں معصومیت اور سادگی کی سرمایہ دار تھی۔ میں نے کہا "لیڈی صاحبہ! اگر آپ اس تخاطب کو جسارت بیجا پر نہ محمول فرمائیں تو میں عرض کروں کہ شاید جناب کو کچھ عرصہ پہلے Bow Street پر دیکھا ہے! خدا جانے میرے ان الفاظ میں کونسا سحر مضمر تھا کہ یکا یک اُس کے چہرہ پر سفیدی دوڑ گئی اور آہستہ سے ان الفاظ میں جس سے اُس کی قلبی پریشانی متصوّر تھی کہنے لگی۔ "للہ آپ آہستہ آہستہ گفتگو فرمایئے دیوار ہم گوش دارد" اے کاش تم اسی کا اندازہ کر سکتے کہ آغاز کار کی یہ مایوس کن گفتگو میرے لیے کتنی روح فرسا ثابت ہوئی۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ زندگی کے جملہ آلام و مصائب کی گھنگھور گھٹائیں مجھ پر مستولی ہو گئی ہیں اُس نے مجھے گفتگو کا بہت کم موقع دیا لیکن پھر بھی اس کے کلام کا ایک ایک لفظ نغمہ بن بن کر میری روح کو آج تک تازگی بخش رہا ہے۔ اُس کا حُسن معصوم۔ دلربا انداز۔ روح پرور سادگی کچھ ایسے نہ تھے کہ میرے خرمنِ ضبط پر بجلی نہ گراتے ہاں مجھے تشویش اور فکر تھی تو اس فضا کی جس سے وہ پُر اسرار زندگی کے انفاس حاصل کر رہی تھی۔ یہ دلچسپ منظر تا دیر کیوں قائم رہتا! آخر وہ وقت آہی گیا جب وہ رخصت ہونے

لگی - میرا دل خود بخود بیٹھنے لگا - اُس وقت یاس و اُمید میں سخت کشمکش شروع ہو گئی اور آہ اس کشمکش کی آماجگاہ میری نوزائیدہ تمنائیں - میں نے ہمت سے کام لے کر اُس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے یہاں حاضر ہونے کی اجازت دے -

جس کے جواب میں چند لمحات تو وہ کچھ متحیر سی ہو گئی اور اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی مبادا اُس کی گفتگو کوئی سن رہا ہو پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "ضرور لیکن کل ۵ بجے ٹھیک آنے کی زحمت گوارا فرمایئے"۔ اُسے رخصت کر کے میں میڈم رستائیل سے اُس کے متعلق دریافت کرنے لگا لیکن وہ بھی میری اس شدت تشنگی جو اُس کے حالات معلوم کرنے کے لیئے پیدا ہو گئی تھی نہ رفع کر سکی - مجھے میڈیم سے اُس کے متعلق اتنا ہی علم حاصل ہو سکا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور پارک لین میں ایک شاندار حویلی میں مقیم ہے - تھوڑی دیر بعد میں نے میڈم سے اجازت چاہی راستہ بھر میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آتے رہے اور میں اپنی طبعی تاویلات سے اُن کی شدت کو دور کرتا رہا - کبھی اُس کے سکوت کو بیوگی سے تعبیر کرتا کبھی اُس کے حزن و ملال کو عالم تنہائی سے تعلیل کرتا اور کبھی اُس کی پُر اسرار زندگی کو دنیا سے کبیدہ خاطری کی وجہ بتاتا مگر میرا دماغ کسی خاص نتیجہ پر پہونچنے سے عاری تھا -

دوسرے روز تمام دن کے جانکاہ انتظار کے بعد ٹھیک ۵ بجے اُس کے مکان پر پہنچا لیکن ملازم سے اُسکی غیر موجودگی کی خبر سُن کر میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی - قہر درویش بجانِ درویش بادل ناخواستہ میں شام کے کلب میں شرکت کرنے کے لیئے واپس ہوا - خیال ہوا کہ شاید وہاں طبیعت بہل جائے لیکن ستم کش طبائع سکون سے بے نیاز ہوتی ہیں ہر شے پر پژمردگی کا پردہ پڑا ہوا دکھائی پڑتا تھا - ہر چیز خار کی طرح کھٹک رہی تھی - اندرون سینہ ایک آگ سی لگی ہوئی تھی دل ہی دل میں سوزش محسوس کر رہا تھا - کلب کے احباب مسرت انگیز گفتگو سے خوش ہو رہے تھے - اور میں علحدہ تنہا بیٹھا ہوا ایک تصویر سے خیالی باتیں کر رہا تھا - میری سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں - چارۂ کار دل نے رائے دی کہ اُسے ایک خط لکھنا چاہیئے - ستمکش عشق کے خلافِ معمول میں نے اُسے ایک مختصر تحریر لکھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ مجھے کبھی قسمت آزمائی کا موقع دیا جائے کہ میں اُس حُسنِ مجسم سے شرفِ ملاقات حاصل کروں - کئی روز

اُمید و یاس اور انتظار کی کشمکش میں گزر گئے آخر کار مجھے اُس غارتگر صبر و سکون کے نازک ہاتھوں کی ایک تحریر ملی جس میں اُس نے اگلے شنبہ کو مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ اُس پتہ سے اُسے خط نہ لکھا جائے جس کی وجہ وہ بروقت ملاقات بتائے گی۔ اس خط نے میرے ارمانوں کی خشک کھیتی کو پھر سے سرسبز و شاداب کر دیا۔ مجھے آنے والے شنبہ کا سخت انتظار رہنے لگا۔ روز موعود مع اپنی تمام رعنائیوں کے آیا اور میں دیوانہ وار اُس کے مکان پر پہنچا۔ دیکھتا ہوں کہ وہ ایک صوفہ پر بیٹھی ہوئی اپنے حُسن کی برق پاشیاں کر رہی ہے۔ میں اس سے پہلے خدا جانے کیا کیا منصوبے گانٹھ چکا تھا کہ اُس سے عندالملاقات کیا کیا نہ کہونگا۔ مگر افسوس میری جرارت۔ میری گویائی مجھے جواب دے گئی۔ میری نظر بجائے اس کے کہ اُس ماہ منور کے رُخ کی خوشہ چینی کرتی زمین پر گڑ کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر یہ سلسلہ قایم رہا آخر کار مجھے اجازت لیتے ہی بن پڑی۔ میرے چلتے وقت اُس نے پھر مجھ پر ایک التجایانہ نگاہ ڈالی جس سے میں نے اپنے تمام جسم میں کپکپی محسوس کی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کسی ایسے ہی شش و پنج میں مبتلا ہے جو خاموش ہے۔ میں دو چار قدم چلا ہونگا کہ اُس نے مجھے پھر ٹھہرایا اور کہا "سنیئے! میرے پاس کچھ وجوہ ہیں جن کا اظہار میں مناسب نہیں سمجھتی لیکن آپ جو بھی خط لکھیں وہ مسز ائس ہو یکر لائبریری گرین اسٹریٹ کے پتہ پر لکھا کریں"۔

قریب قریب چار ماہ اسی طرح گزر گئے میں اُس سے برابر ملتا رہا لیکن بہ سعیٔ امکانی بھی اُس کی پُراسرار زندگی کے رُخ سے نقاب نہ اُٹھا سکا کبھی کبھی مجھے اس کا خیال گزرتا تھا کہ اُس کا دامنِ حیات کسی دوسرے شخص سے وابستہ ہے۔ مگر پھر اُس کا طرز رہائش اور طریق کار پر نظر ڈال کر خود ہی میری بدگمانی دور ہو جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سکوتِ ناروا کی کوئی صحیح تعلیل میرے فہم و ادراک سے بالا تھی اُس کی مثال اس صاف پارچہ کی تھی جو ہر قسم کے رنگ کو قبول کر لے مگر پھر بھی اپنے اصلی رنگ پر آسکے۔ اس کشمکشِ پیہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ مصمم قصد کر لیا کہ اُسے شادی کا پیام دیدوں۔ اس لیئے کہ میں ان چوری چھپے کی ملاقاتوں سے بہت تنگ آگیا تھا۔ اس کا تہیہ کر کے میں نے اُسے لائبریری کے پتہ پر خط لکھ کر اجازت طلب کی کہ میں اُن سے آنے والے دوشنبہ کو مل سکوں۔ خلاف اُمید ابکی اس کا جواب مجھے

جلد مل گیا۔ جس میں مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ میرے عزیز رفیق میری اس طویل داستان گوئی کو معاف کرنا لیکن تم نے مجھے خود چھیڑا ہے اس لیئے اب سنو بھی۔ ہاں اب میں تم سے کہتا ہوں کہ میں اُس وقت محبت کی آخر منازل طے کر رہا تھا مجھے دنیا کی ہر شے کیف انگیز نظر آرہی تھی۔ اور میں بے خود و متوالا عالم سرمستی میں ہل من مزید کا نعرہ لگا رہا تھا۔ گو اُس کی زندگی پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا لیکن وہ حجاب بھی مجھے رنگین نظر آتا تھا جس میں سینکڑوں ملاحتیں پنہاں تھیں۔ اے کاش آغاز کار ہی میں میں نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی ہوتی تو میری مسرتیں کیوں نذرِ مایوسی ہوتیں۔ لیکن میں اُس جنوں میں مبتلا تھا جس کا علاج بجز مرگ کے اور کچھ نہ تھا۔ میں دیوانہ تھا اور ایسا دیوانہ جو غم و مسرت کی سراب انگیز قیامت سامانیوں سے واقف ہو۔ اے نوشتۂ تقدیر! یہ تیرا بے پناہ تیر تھا جس نے میری حیات کی تابانی کو تلف کر دیا۔"

میں :- "تو پھر تم نے اُس کی پُر اسرار زندگی کے متعلق کچھ معلوم کیا؟"

جبرالڈ :- "ہاں کچھ ایسا ہی ہوا۔ اب تم خود ہی میری قسمت کی نارسائی کا اندازہ کر لو۔ دوشنبہ آیا۔ اتفاق دیکھو اس روز بھی میں اپنے چچا کے یہاں چاء پر بلایا گیا تھا۔ قریب چار بجے میں اُن کے گھر کے لیئے روانہ ہوا۔ میرے چچا غالباً تم کو بھی علم ہوگا پارک میں رہتے ہیں۔ اس لیئے راستہ مختصر کرنے کی غرض سے شاہ راہِ عام کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتا ہوا جا رہا تھا کہ دفعتاً لیڈی الراۓ چہرہ نقاب سے چھپائے ہوئے گلی کے آخری مکان کے نزدیک ٹھیری اور جیب سے کنجی نکال مکان کا قفل کھول کر اندر داخل ہوئی۔ میں نے دل میں شکر کیا کہ آج مجھے بھید مل گیا۔ مکان کے قریب میں بھی گیا اور اُسے یاد کرنے کی غرض سے اچھی طرح دیکھنے لگا۔ ظاہراً آثار تو اس مکان کے ایسے تھے کہ گویا وہ کرایہ پر اٹھایا جانے والا مکان ہے۔ دروازہ کے نزدیک ایک رومال پڑا ہوا تھا جو غالباً اُس کی جیب سے اتفاقیہ گر پڑا تھا۔ میں نے اُسے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر میں غور کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ آخر الامر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جاسوسوں کی طرح اس کی آمد و رفت کو نظر میں رکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں کلب واپس گیا۔ ٹھیک چھ بجے میں اُس کے مکان پر پہنچا اِس وقت وہ ایک سوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ پھولدار گون میں ملبوس تھی۔ سیاہ زلفیں سینہ پر بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ حسن مع اپنی تمام شعلہ سامانیوں کے آنکھیں خیرہ کر رہا ہے مجھے دیکھ کر ظاہرا مراسم کو بجالاتے ہوئے کہا تشریف لے آیئے آپ کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی مجھے انتظار ہی تھا آج تمام دن میں کہیں گئی نہیں۔" مجھے یہ سُن کر نہایت تعجب ہوا۔ دل میں سوچا یہ وقت ہے کہ اُسے شرمندہ کیا جائے۔ چنانچہ جیب سے رومال نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اور اُس سے دریافت کیا' کیا آپ ہی کا رومال ہے ؟ اُس کے چہرہ سے خوف وہراس کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن رومال اُٹھانے کی اُس نے کوئی کوشش نہیں کی چند لمحات کے بعد میں نے کہا۔

"جناب آپ وہاں کیا کرتی تھیں"؟

وہ:۔ "آپ کو ایسے سوالات کرنے کا کیا حق ہے"؟

میں:" حق ہاں حق بظاہر تو کچھ نہیں لیکن وہ جذبۂ لطیف جو تمہاری روح میں مدغم ہونا چاہتا ہے مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں تم سے اس قسم کے سوالات کروں۔ میں آج اپنے درد کے علاج کی غرض سے آیا ہوں اور تم سے استدعا ہے کہ مجھے مایوس نہ واپس کرو میں ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کر چکا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں وہ رومال سے چہرہ چھپائے ہوئے زار وقطار رو رہی ہے۔

میرے دل پر ایک چوٹ لگی غم وناامیدی کا متلاطم سمندر میرے قلب کی گہرائیوں میں جوش مارنے لگا۔ بات کو جاری رکھتے ہوئے اُس سے کہا " مجھے جواب دو کہ اپنی آیندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کروں"

اب وہ ایک غضبناک شیرنی کی طرح کھڑی ہو گئی اور میری طرف بغور دیکھنے لگی پھر بولی " لارڈ مربی مجھ میں کوئی ایسا راز نہیں جسے تمھیں بتانے کی ضرورت ہو"۔

میں:" تب ہی تو آپ کسی سے ملنے کے لیئے اُس مکان میں تشریف لے گئی تھیں۔ ذرا سچ کہیئے یہ کوئی راز نہیں ؟"

میرے یہ الفاظ میری اُس قلبی کیفیت کے حامل تھے جو کسی محبوب سے بدگمان ہونے پر اور اُس کے اپنی بات پر اڑے رہنے پر ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر فوری ہوا اُس کا چہرہ سپید ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا "معاف کیجئے گا آپ غلطی پر ہیں میں کسی سے ملنے نہیں گئی تھی"۔

میں ۔" کیا آپ میں اتنی بھی جرات نہیں کہ آپ سچ بول سکیں"۔
وہ ۔" خیر مجھے جو کہنا تھا کہہ چکی"۔

میں غصہ اور مایوسی کے جوش میں دیوانہ سا ہو رہا تھا اور حالتِ بے اختیاری میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا مگر ہاں کچھ خیال ہوتا ہے کہ میرے الفاظ نہایت سخت اور درشت تھے۔

اس گفتگو کے بعد مکان سے واپس آیا۔ دوسرے دن اُس نے مجھے ایک خط لکھا جسے میں نے بلا پڑھے ہوئے واپس کر دیا۔ اور اُسی روز ملک ناروے چلا گیا۔ ایک ماہ میں ناروے میں رہا۔ مگر سچ کہتا ہوں اُس ساحرہ نے میرے خیالات اس حد تک مسحور کر لیئے تھے کہ میں ہر وقت اُسی کے خیال میں محو رہتا تھا۔ ایک ماہ کے گزرنے پر میں وطن واپس آیا اسٹیشن پر اخبار مارننگ پوسٹ خرید لیا قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے جس خبر پر سب سے پہلے میری نظر پڑی وہ آہ لیڈی الرائے کی موت کی تھی۔

اس خبر نے میرے دل پر جو ستم ڈھایا وہ بیان سے باہر ہے مجھے اپنی شومی بختی پہ انتہائی حیرت تھی مگر قدرت کا حکم اٹل ہوتا ہے جس کے سامنے مخلوق بے بس و بیچارہ۔ وطن آنے پر بجائے اعزا و احباب سے ملنے کے مکان پر آ کر ایک کمرہ میں بند ہو گیا۔ آنسوؤں کا ایک دریا رواں ہو گیا۔ معلوم نہیں میں کب تک روتا رہا۔ مگر ہاں جب دل کی بھڑاس نکل گئی اور کمرے سے باہر نکلا تو دیکھا شام ہو چکی تھی۔ آہ پیارے دوست مجھے اُس سے شدید ترین محبت تھی۔ میں اُس کا پرستار تھا وہ میری دیوی، سچ کہنا کیا ایسی قیمتی شے بھی اس قابل ہوتی ہے کہ اُسے زمین میں پوشیدہ کیا جائے؟"

میں ۔ تو کیا پھر تم اس کے مکان پر نہیں گئے؟"

وہ ۔ ہاں گیا تو تھا مگر اُس کے خاص مکان پر نہیں بلکہ اُس جگہ جہاں اُسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اُس کے راز کو معلوم کرنے کی کوشش نہ کرونگا مبادا میرے اس فعل سے اُسکی روح کو تکلیف ہو لیکن میرے دل میں چند شبہات ایسے سخت جاگزیں تھے، کہ مجھے اپنے تمام ارادوں میں ناکامی ہوئی اور میں اس مکان تک گیا دروازہ پر آواز دینے سے ایک سن رسیدہ عورت برآمد ہوئی میں نے اُس سے دریافت کیا کہ رہنے کے لیئے کوئی کمرہ خالی ہے؟ جس کے جواب میں اُس نے کہا

جی ہاں ایک کمرہ خالی ہے - مگر وہ بھی ایک عورت لے چکی تھی لیکن تین ماہ سے اُس کا کوئی پتہ نہیں اُس پر اس کمرہ کا کرایہ بھی واجب ہو چکا ہے - اس لیئے اب آپ اُسے لے سکتے ہیں - میں نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور اُسے دکھاتے ہوئے دریافت کیا "کیا اِسی عورت نے کمرہ لیا تھا" اُس نے کہا ہاں ہاں یہی عورت ہے مگر یہ تو فرمایئے وہ کب تک یہاں آئے گی" جس کے جواب میں نے کہا افسوس وہ تو دنیا سے چل بسی -

وہ :- خدایا ایسا نہ کہیئے - میری بہترین کرایہ دار تھی جس سے سچ پوچھیئے تو مجھے اُنس بھی تھا وہ یہاں محض چند گھنٹے بیٹھنے کے لیئے آیا کرتی تھی - اور تین گنی فی ہفتہ دیا کرتی تھی"

میں :- کیا وہ یہاں کسی سے ملنے آیا کرتی تھی ؟"

جس کے جواب میں اُس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ تنہا آیا کرتی تھی وہاں کبھی کسی سے ملی نہیں -

اس بیان نے مجھے اور حیرت ہوئی - اسی استعجاب میں اُس سے پوچھا " تو پھر آخر وہ یہاں کرتی کیا تھی" اس کا جواب اس عورت نے نہایت خاموشی سے دیا جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بات نہیں بنا رہی ہے - " وہ ... نشست کے کمرے میں بیٹھا کرتی تھی - کتابوں کا مطالعہ کرتی رہتی تھی اور کبھی کبھی چائے پیتی تھی" - اس سے زیادہ اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا خاموشی اختیار کرنی پڑی میں نے چلتے وقت اُسے ایک اشرفی دی - اب تم بتاؤ ان تمام باتوں سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو میرا خیال ہے تم یہی کہو گے کہ اس عورت کا بیان درست نہ تھا -

میں :- مجھے یقین ہے اس عورت نے جو بھی کہا وہ واقعہ ہے"

وہ :- "تو پھر لیڈی الرائے وہاں کس غرض سے جاتی تھی"

میں :- "پیارے جرالڈ ! لیڈی الرائے کو محض اس کا جنون تھا کہ وہ اپنے کو دنیا میں معمہ راز کی حیثیت سے پیش کرے اُس نے کمرہ محض اس خواہش کی تکمیل کی غرض سے لیئے تھا - نقاب چہرہ پر صرف اسی لیئے ڈالے رہتی تھی کہ دنیا میں اُس کی ہستی ایک مخصوص ہیروئن کی سمجھی جائے وہ دیوانی تھی اس کی کہ راز

بن کر رہے لیکن اُس کی حقیقت اتنی ہی تھی جتنی کہ ایک پھول بلا خوشبو کے ہوتا ہے۔"

وہ :- "کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو حقیقت میں ویسا ہی خیال بھی کرتے ہو؟"

میں :- "بلا کسی پس و پیش اور بلا خوف و تردید میں کہتا ہوں کہ اُس کی صرف اتنی ہی اصلیت تھی۔"

یہ سُن کر اُس نے مرا فتنی چمڑے کے کیس کو پھر نکالا اور اُس سے تصویر نکال کر غور سے دیکھنے لگا۔ وفعتاً ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہنے لگا "آہ اگر یہ حقیقت ہے تو میری تمناؤں کا خون، میری ہی گردن پر ہے۔"

(ماخوذ از آسکر وائلڈ)

جلیل حسنی

ترانۂ دل

میں نہ آنی ہوں ورنہ فانی ہوں	جلوۂ حُسنِ جاودانی ہوں
اے کفِ خاک! مختصر یہ ہے	نے زمانی ہوں، نے مکانی ہوں
مطربِ بزمِ زندگانی ہوں	بادۂ تندِ کامرانی ہوں
خاکِ تیرہ! ہے شمع تو جس سے	میں، وہی نورِ آسمانی ہوں
بے نشاں کی ہیں! نشانی ہوں	میں بھی اک سازِ لن ترانی ہوں
مادہ میں نہیں ہوں اے نادان!	میں تو اک شئے غیرِ فانی ہوں
غیرِ فانی ہوں۔ جاودانی ہوں	ایک اعجازِ کُن فکانی ہوں
خاک ہوں میں نہ باد ہوں واللہ	آگ بخدا ہوں میں نہ پانی ہوں

امینِ حزیں

پیامِ شوق

آ ادھر اے نامرادِ آرزو! کیا ہوا تیرا جنونِ جستجو

کیا ہوئیں دن رات کی بیتابیاں کیوں نہیں آنکھوں میں اب بیخوابیاں

کیوں گلا فرقت کا اب کرتا نہیں سرد آہیں شب میں کیوں بھرتا نہیں

ہوگیا کیوں اس قدر بیزار اب کیوں نہیں محفل میں ذکرِ یار اب

کب سے سُونا ہے جہانِ آرزو بے مکیں کیوں ہے مکانِ آرزو

کیا ہوئی بادہ پرستی عشق کی کیوں نہیں آنکھوں میں مستی عشق کی

آرزوؤں کی وہ بستی کیا ہوئی زندہ تھی جو تجھ میں ہستی کیا ہوئی؟

تو وہی ہے تیری فطرت بھی وہی

کائناتِ حُسن واُلفت بھی وہی

اُٹھ اُٹھا لے پھر شبابِ عاشقی   جامِ دل میں بھر شرابِ عاشقی

حُسن کے ساقی کا پھر اشیار ہو   بادۂ اُلفت سے پھر سرشار ہو

پھر نوائے شوق کی اک لَے رہے   بن کے مطربِ دل کی اک لَے رہے

عندلیبِ گلشنِ فطرت ہے تو   نغمہ سنجِ محفلِ اُلفت ہے تو

چل چمن میں داستانِ دل سُنا   بکھرے پھولوں کو بنا لے ہمنوا

سازِ دل میں سوزِ جاں مسطور کر   درد سے ساری فضا معمور کر

چُھپ کے تنہائی میں ایسا نغمہ ہو   حُسنِ پردہ پوش بھی بے پردہ ہو

اپنے عہدِ رفتہ کو پھر یاد کر

بستیاں اُجڑی ہوئی آباد کر

صلاپر

دو آنسو

میں گاؤں میں ایک مکان کی چھت پر کھڑا ہوا نیچر کی نظرزیب گلکاریوں سے روحانی سرور اور وجدانی کیف حاصل کر رہا تھا۔ گیہوں اور جو کی نازک نازک پتیاں اپنی تازہ روح مجھ میں پھونک رہی تھیں۔ میں کائنات میں جذب تھا میری روح فطرت کی روح سے سرگرم راز و نیاز تھی۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا گویا آس پاس کی جھونپڑیاں بھی مجھ سے ہمکلام ہوا چاہتی ہیں۔ ہوا کے پیارے پیارے جھونکے ایک ادائے مستانہ سے آسمانی روئی کے نرم گالوں کو اپنے دوش پر بٹھائے کبھی اس سمت تیزی سے گذر جاتے تھے اور کبھی اس جانب اٹھکیلیاں کرتے ہوئے آہستگی سے چلے جاتے تھے۔ کچھ فاصلہ پر ایک بیل گاڑی لہراتے ہوئے راستہ پر سست رفتاری سے چلی جا رہی تھی اور بیلوں کی گردنوں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز خوشگوار غنودگی کے اثرات لیئے ہوئے میری سامعہ نوازی کر رہی تھی۔ فطرت کے نشاط افزا مناظر کے مطالعہ سے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ فطرت کی لطافتیں اور پاکیزگیاں حقیقتاً بہت بلند ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سے ملتفت نہیں ہو سکتیں۔

میں اِسی قسم کے خیالات میں مصروف تھا کہ یکایک گاؤں کی ایک لڑکی کو میں نے دیکھا۔ وہ ایک کھیت میں بیٹھی ہوئی سبز سبز گھاس کے بے زبان چھوٹے پودوں کو بے تکان اُکھاڑ اُکھاڑ کر ایک ٹوکری میں ڈالتی جاتی تھی۔ زندگی کی ملکہ نے پودوں پر رحم نہ کھایا۔ ٹوکری کو بیجان پودوں سے بھر کر سر پر رکھا اور اپنی جھونپڑی کی طرف چلدی۔ جاتے ہوئے اُس نے میری جانب دیکھا اور مجھے دیکھ کر خود ہی اُس نے اپنی شرمگیں نگاہیں نیچی کرلیں۔ اور خاموشی سے اپنا راستہ طے کرتی ہوئی چلی گئی۔ میں فطرت کی جلوہ آفرینیوں کی پرستش میں غرق تھا۔ لیکن مجھے اس لڑکی کے یوں دیکھنے اور شرما کر چلے جانے کا احساس ضرور ہوا۔

دوبارہ وہ پھر آئی پہلے کی طرح ٹوکری کو ننگے ہوئے پودوں سے بھرا اور جاتے ہوئے اُس نے پہلے کی طرح پھر میری طرف دیکھا۔ میرے خوابیدہ جذبات میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی، ایک نامعلوم

آرزو مجھے گدگدانے لگی جس کے انجام میں میری نگاہیں اُس کے چہرہ کی طرف اُٹھ گئیں لیکن آہ! یہ نظ
تادیر قائم نہ رہا یہ لمحاتِ مسرت کچھ ہی دیر کے لیے تھے۔

گاؤں کی لڑکیاں دن بھر مصروف رہتی ہیں۔ مردوں کی طرح وہ بھی مختلف کام انجام دیتی ہیں
وہ لڑکی اسی طرح پھر آئی اور جن پودوں کی سرسبزی اُسے گوارا نہ تھی اُنھیں اُکھاڑا اور
ٹوکری میں بھر کر پھر اُسی راستہ پر جاتے ہوئے اُس نے اُسی مخصوص انداز سے میری جانب نظر
کی جو ہر معصوم اور بے نیاز دوشیزہ کا حصہ ہوتا ہے۔ نہیں معلوم وہ نگاہیں کتنی سحر آلود تھیں کہ
میرے سینہ میں دل تڑپ گیا۔ میری خودداری سلب ہوگئی، میری روح درد سے معمور ہوگئی، میری
آنکھیں کسی کو ڈھونڈنے لگیں، اس کی نظر بجلی تھی جو میرے جسم کے ذرہ ذرہ میں اپنی تمام بے تابیاں
لیئے ہوئے کوند گئی۔ میری رگ رگ میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں وہ کیف
جس نے مجھے مدہوش کر دیا، اس کی نظروں میں وہ جادو تھا جس کا رد حدودِ امکان سے باہر تھا، اُس کی
نظریں میرے قرار و سکون کی دشمن تھیں، میری مسرت و عافیت کی قاتل، وہ بجلی بن کر دوڑیں اور مجھ میں لرزہ
پیدا کر گئیں۔ وہ مجسمہ حقیقت تھی، وہ میرے لیئے پیکرِ حسن تھی۔ وہ میرے لیے زندگی تھی۔ میرا دل
دھڑک رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اب دھڑک کر پھر نہ دھڑکے گا۔ میری رگوں میں ایک
تڑپ پیدا ہوگئی، میرا خون طوفانی ندی کی طرح متلاطم ہوگیا، اور میں محوِ حیرت۔

میرے سینہ میں ایک تشنگی تھی اور زبان میں لکنت، میں دنیا کو بھول گیا، فطرت کی دلکشی میرے
لیئے بے کیف تھی میں فطرت کا گویا تھا، میں فطرت کا پرستار تھا، فطرت کا حُسن میرے لیئے سب کچھ تھا لیکن
حُسن نے حُسن کو نیچا دکھایا۔ افضلیت کی کشمکش انسانی زندگی کو مشکل اور پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ میری زندگی
میں یہ پہلا موقعہ تھا جب مجھے یہ محسوس ہوا کہ فطرت صرف سجاوٹ کا ایک عنصر ہے۔ نیچر بذاتِ خود
اپنے اندر کوئی حُسن نہیں رکھتی بلکہ ہم اُسے حسین بنا دیتے ہیں۔ وہ دوشیزہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی
چلی گئی اور اپنے ساتھ میرے سکون و طمانیت راحت و آرام بھی لے گئی۔

مجھے محسوس ہوا کہ میرا دل خون ہوکر آہوں میں بہہ نکلے گا۔ میرے نفس میں انتہائی بے ترتیبی واقع

ہوگئی۔ میری آنکھوں نے حسنِ ازلی کا ایک پرتو دیکھا۔ ہنستا ہاں افقِ مشرق سے نمودار ہو چکا تھا اور وسعتِ عرضی و سماوی کو منور کرتا جا رہا تھا، بدلیوں کی رنگینی، درختوں کی چوٹیوں کی جگمگاہٹ، سبزہ زاروں کی سرت انگیز جھلکیاں دوسروں کو مکیف کرنے کے لیئے کافی ہوں تو ہوں لیکن میرے لیئے سب بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔

ہر ساعت آفتاب زندہ کا مرثیہ پڑھتی ہوئی گزر جاتی تھی، دن اپنی زندگی کے آخری منازل طے کر رہا تھا۔ اور آفتاب دن بھر کی فلک پیمائی کے بعد نصف النہار کی بلندی سے اُتر کر اُفقِ مغرب میں غروب ہونے کے لیئے نیچے اُتر آیا تھا اور ہوا میں قدرے خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ میں اپنی مشتاق نگاہیں اور بے چین دل لیے چھت سے نیچے اُتر آیا۔ شام کا وقت تھا۔

تمام دن کی کشمکش کے بعد ہر شے سکون و جمود کی متلاشی نظر آتی تھی، چڑیاں بسیرے سے قبل چہچہا رہی تھیں گویا دن کے بخیر و خوبی گزر جانے پر خلاقِ عالم کی تمجید کے گیت گا رہی تھیں، ہر چیز مائل بہ راحت تھی، ہاں لیلِ شب کی آمد آمد کا غلغلہ بلند تھا۔ میرا اشتیاق مجھے تڑپا رہا تھا۔ اسی دل کی لگن نے مجھے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ میں نے دیکھا کہ چند لڑکیاں پانی سے بھرے ہوئے ظروف اپنے سروں پر رکھے ہوئے گھروں کو واپس ہو رہی ہیں۔ اُن ہی میں وہ بھی تھی جس کی تلاش میں میری روح آوارہ پھر رہی تھی۔

سورج غروب ہو گیا، کاشتکاروں کی مصروفیتیں ختم ہو گئیں، اُن کی پیشانیوں پر محنت اور تھکن کے آثار نمایاں تھے، کاندھوں پر ہل اُٹھائے بیلوں کو آگے آگے ہانکتے چلے آرہے تھے، اُن میں سے بعض کے چہروں پر طمانیت جھلک رہی تھی اور مسرور نظر آتے تھے اور بعض کے چہرے مایوسی اور تفکرات کا پتہ دیتے تھے یہ فرق زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے لیئے ایک دلیلِ روشن کا حکم رکھتا تھا۔ عموماً اُن کی پیشانیاں خوشی کا سرچشمہ تھیں اور اطمینانِ کلی کا مرکز۔ مگر میں بالکل ہی مختلف کیفیات اپنے غمگین سینے میں لیئے ہوئے اپنی قیام گاہ کو واپس آ گیا۔

شمعیں روشن کر دی گئیں چاند نے چادرِ فلک کو منور کر دیا، ستارے جگمگا اُٹھے، راستے خاموش

ہوگئے اور پرندے آشیانوں میں جا چھپے۔ ہوا رک گئی شاخیں جھک گئیں۔ آسمان سے شفاف چاند کی کرنیں جلوہ پاشیاں کرنے لگیں۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں کسی کے دیدار کی تمنا تھی۔ میرے جذبات میں ایک تموج بپا تھا۔ اس ہی حالتِ کشمکش میں میری آنکھ لگی۔ اُس ہی کو سامنے پایا جس کے خیال نے تمام دن میری طبیعت میں ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میرے دل میں جذباتِ مشتعل ہوئے اور میں بے تاب ہو کر تڑپنے لگا۔ اُس سے شاید میری یہ حالت دیکھی نہ گئی اس لیئے فوراً آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس ہی گھبراہٹ میں میری آنکھ کھل گئی اور کچھ دیر تک میں خواب وحقیقت میں امتیاز کرنے سے عاجز رہا۔ کاش وہ خواب ابدی و دائمی ہوتا!

رات کا باقی حصہ میرے لیئے ایک مستقل تکومش، ایک غیر فانی بے کلی، ایک لامتناہی انتشار، ایک نہ ختم ہونے والی اُلجھن کا سرمایہ وار تھا۔ یادات کے لمحات مجھ سے ہمدردی کے اظہار میں عاری تھے۔ دن کے متعلق جتنا زیادہ سوچتا تھا رات کی گھڑیاں میرے لیئے اتنی ہی درازتر ہوتی جاتی تھیں۔ اور قیامت یہ کہ جاڑوں کی رات۔ لیکن نہیں فطرت کے اصول بھی بدل جاتے ہیں میری بے کلی قدرت سے نہ دیکھی گئی آخر ایک دھندلی سی روشنی بند کواڑوں کی درازمیں سے چپکے سے آئی اور مجھے پیامِ مسرت سُنانے لگی۔ میں اُٹھا کواڑ کھول کر کپڑے پہنے اور باہر چلا گیا۔ عروسِ فطرت یعنی صبح کا ذب نمودار ہو چکی تھی، آسمانی شمعیں ٹمٹما رہی تھیں۔ نغموں کا ایک تلاطم بپا تھا۔ جلووں کا طوفان اُٹھ رہا تھا، سبزہ جھوم رہا تھا، کھیت لہلہا رہے تھے، مشرق قبضِ انوار پہ آمادہ ہو رہا تھا، بادل کے ٹکڑوں میں صبح صادق کا حُسن جھلک رہا تھا۔ ہوا کے ترنم ریز جھونکے آرہے تھے، روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی ملکۂ صبح کے سر پر نور کا ایک تاجِ زرنگار رکھا جا چکا تھا، نرم نرم شعاعیں شبنم کی لطافتوں کو پی رہی تھیں، کاشتکار اپنے اپنے ہل سنبھالے کھیتوں کو جا رہے تھے، مگر میں محبت کی پاکیزگیوں میں غرق تلاشِ محبوب میں آوارہ پھر رہا تھا۔

سامنے میناؤں کا ایک غول اُڑا اور اس کے بعد ایک لڑکی سامنے سے دکھائی دی۔ وائے

بدنصیبی "وہ" نہ تھی جس کا تصور میرے لیئے باعثِ صد سکون تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا نا اُمیدی
ہو سکتی تھی۔ میں اس تلخی کو برداشت نہ کر سکا۔ میرے ہونٹ لرزنے لگے، میرا گلا گھٹنے لگا۔ میرے
سینے میں ایک دھواں سا اُٹھا اور وہ دھواں دونوں آنکھوں سے "دو آنسوؤں" کی شکل میں
بہ نکلا۔ وہ آنسو پلکوں کے نیچے آ کر رہ گئے۔ میں نے ان کو ہوا کے رحم پر چھوڑ دیا۔ اس درد
نے میری روح میں اور زیادہ شفافیت پیدا کر دی۔ میری آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہو گئیں۔
اب جو نظر اُٹھاتا ہوں تو اُف! میرے دل کی مالکہ، میری زندگی کی فرمانروا، نغموں کی جانِ رنگینیوں
کا مست روحانی نغمہ میرے پیشِ نظر تھا۔

مختار احمد

غزل

صبحدم مست سوئے بادہ فروشاں رفتم — رفتم از خویش و ندانم بچہ عنواں رفتم

دلِ احباب بحالِ دلِ زارم نگداخت — شمع گر دیدم و در محفلِ یاراں رفتم

بہ لبم بود حدیثِ سرِ گیسوئے کسے — وائے زاں فکرِ غم آمیز پریشاں رفتم

دیدۂ دوست بہ بے برگیٔم اشکے نفشاند — آخر از کوئے کسے مضطر و گریاں رفتم

ناخنش عقدۂ اسرارِ محبت نکشود — با دلِ آزردہ پر از حسرت و ارماں رفتم

عیبِ رندانِ خرابات مجو اے واعظ — من ز رندی بدرِ روضۂ رضواں رفتم

پرسشِ حالِ گدا خُلقِ کریماں باشد — من ازاں پیشِ شما بے سر و ساماں رفتم

باز از فن گلۂ جور و جفا مے جویند — من ز بے مہریٔ احباب پریشاں رفتم

راہ دادند نہ در بزمِ من دلِ شدہ راہ — ار چہ پیش از ہمہ اغیار غزلخواں رفتم

حاشا للہ کہ کنم شکوۂ بے برگیٔ خویش — بجز ایں کز سرِ کوئے تو پشیماں رفتم

من منجم نیم و لیک بتائیدِ خرد — از حریفانِ جہاں پیشِ سلیماں رفتم

نیر و بخت و کواکب ہمہ محکومِ قضاست — از قضا سوئے قضا خرم و شاداں رفتم

بختم آزاد ز پا مردیٔ دیگر ز ازل
بے وسیلہ بسرِ چشمۂ حیواں رفتم

سجّاد علی

کاش میں دیوانہ ہوتا!

رات کے سناٹے میں دریا کے کنارے تاروں کا خاموشی کے ساتھ جھلملانا آنکھوں کے سامنے کچھ عجیب کیف انگیز نقشہ پیش کرتا ہے۔ ایسے وقت میں ایک خوشنما باغ کے اندر کسی غیر معمولی ہستی کا محوِ خرام ہونا اور وہ بھی اس طرح کہ جوانی کی موجیں اس کی ہر رگ و پے میں لہریں لے رہی ہوں، اُس کی ہر ادا میں ایک بے خودی اور ہر جنبش میں ایک لغزش مستانہ مضمر ہو نہ معلوم کتنوں کے خرمنِ دل پہ بجلی گرانے کے لیئے کافی ہو گا۔

وہ باغ میں مصروف گلگشت ہے، لیکن اس طرح کہ آنکھیں تو پھولوں کے حُسنِ خداداد کا معائنہ کر رہی ہیں مگر کان ہر منٹ پر کسی کے پُر کیف نعروں کے سُننے کے لیئے بے چین نظر آتے ہیں۔ لیجیئے وہ وقت بھی آ ہی گیا۔ فضا میں ایک غیر معمولی خاموشی طاری ہو گئی، بجلی چمکی، بادل گرجے، اور وہ غیر معمولی ہستی، اپنے اختیارات سے بے خبر لیکن اپنے جذبات سے متاثر، ایک خاص شان دلبری کے ساتھ کسی آنے والے کا انتظار کرنے لگی۔ چند ساعتوں کے بعد فضا میں کسی کے جانسوز نعرے گونجنے لگے۔ زمین سے دھوئیں کا ایک پہاڑ اُٹھا جس نے باغ کو اپنے اندر چھپا لیا۔

قدرت کی نیرنگیاں تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہی تھیں۔ دھوئیں کے اس غبار میں کسی کی صورت دکھائی دی، اور اس طرح کہ قیدِ لباس سے آزاد لیکن آنکھوں سے دو چشمے بہاتی ہوئی کسی کو بے چینی کے ساتھ تلاش کر رہی ہے۔ جذبات کی متلاطم لہروں نے آن کی آن میں ایک کو دوسرے کے پاس پہنچا دیا۔ آنکھوں کا چار ہونا تھا کہ حُسن کے دیوتا نے مسکرا کر اشارہ کیا اور حُسن کا پُجاری اس کی پوجا کے لیئے بے ساختہ سجدہ میں گر پڑا۔

چند لمحوں کی تسبیح کے بعد قدرت نے دونوں کی صورتوں میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں رکھی۔ یہ اس کی دیوانگی کی آخری کڑی تھی............ ... اے کاش میں دیوانہ ہوتا!

شرف الدین احمد

دوستوں کی یاد

(ایچ وادھن کی انگریزی نظم کا ترجمہ)

ہوگئے ہمدم ہزاروں راہیٔ ملکِ بقا　　ساتھیوں سے چھوٹ کر میں یاں اکیلا رہ گیا

یاد سے اُن کی مگر روشن ہی رہتا دل مرا　　جذبہ ہائے غم مرے ہو جاتے ہیں مجھ سے جدا

یوں دلِ مضطر میں ہو اک روشنی سی رونما

وادیٔ تاریک میں جیسے ستاروں کی... ضیا

یا کسی کہسار پر ہلکی سی کرنوں کی چمک

جب کہ مہرِ نور افشاں غرب میں ہو ڈوبتا

ان کی جولانگاہ ہے اک نور کا عالم تمام　　جسکی ضوباری سے شرمندہ ہیں میرے صبح و شام

ہیچ ہیں نیرنگیاں میرے جہانِ تار کی　　روشنی بھی ہو گئی جب مجھ کو ظلمت کا پیام

اے امیدِ جانفزا! اے جذبۂ عجز و نیاز!

اے کہ تو ہے صورتِ گردونِ گرداں سرفراز

تو ہی دکھلاتی ہے یوں فردوس کی راہیں مجھے

تیرے ہی دم سے ہے قائم یہ مرے دل کا گداز

اے اجل انساں کو کیا کیا سحر دکھلاتی ہے تو   جن کے راز ادراکِ انسانی پہ چھا جاتی ہے تو

ظلمت آبادِ جہاں میں مثلِ خضرِ راہ بر   راستہ بھولے ہوؤں کو راہ دکھلاتی ہے تو

منظور حسین شور

ادبی اپیل

شریف منزل ۔ بلیماران

دہلی۔

مکرمی۔ تسلیم

مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب کی وفات کو ڈھائی برس سے زیادہ گزر چکے لیکن وہ ایک ای
تباہ حال قوم اور مصیبت زدہ ملک میں پیدا ہوئے تھے کہ آج ڈھائی سال بعد سوائے اُن کے خاص احباب
اعزا کے شاید اُن کا نام بھی کسی کو یاد نہ رہا ہوگا۔ مردہ قوموں اور غلام ملکوں میں یہی دستور ہے۔ باوجودیکہ عا
مسلمانوں اور ملک کی طرف سے مسیح الملک مرحوم کی یادگار قایم کیئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا تاہم طبیہ کالج۔
ٹرسٹی جو مرحوم کی سب سے بڑی قومی یادگار کے محافظ و امین ہیں ملک کی عام پستی کو دیکھتے ہوئے اس حقیقت
سے غافل نہ تھے کہ نہ صرف مسیح الملک مغفور کی بیش بہا قومی خدمات اور قربانیوں کو مدنظر رکھ کر بلکہ ملک وقو
کی آیندہ نسلوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیئے بھی اس کی ضرورت ہے کہ مرحوم کی روئدادِ زندگی مرتب کر
شائع کی جائے۔ چنانچہ طبیہ کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز نے اس کام کا آغاز کرنے کے لیئے آٹھ ہزار روپیہ منظور کر لیا
اور ایک سب کمیٹی کی نگرانی میں ترتیب اور فراہمی معلومات کا کام شروع کردیا گیا ہے جس کے ممبران علاوہ میرے
حسب ذیل ہیں:۔

(۱) جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری۔

(۲) جناب سید آصف علی صاحب بیرسٹر۔

(۳) جناب لالہ رام پرشاد صاحب سیکرٹری مالیات۔

جو اسکیم بورڈ نے منظور کی ہے اُس کے چند الفاظ کا حوالہ دیکر میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ
مسیح الملک مرحوم کی سوانح نگاری کا کیا تخیل پیشِ نظر ہے۔ ہم اُن کی زندگی کو وسیع ترین معنی میں ملک کے رو

پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس لیئے ہمارا مطمح نظر وہ ہوگا جو اسکیم کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے یعنی:۔

سوانحعمری کی صحیح ترتیب وہی ہوگی جس میں ہندوستان کے دورِ جدید کی داستان ایک جزوِ لازمی ہو۔ فنِ طب اور اُس کے متعلقات کے علاوہ کہ اُن کی ترقی کا انحصار یکسر مسیح الملک مغفور کی ذاتِ گرامی پر تھا، سیاست، معاشرت، فنِ تعلیم، ادبیات۔ یہ سب مرحوم کی روئداد زندگی کی ضروری اور لازمی جزیات ہیں جو بجائے خود مسیح الملک کی سیرت کے مستقل ابواب قرار دیئے جائیں گے۔ اُردو زبان فنِ سیرت نگاری سے بہت کم آشنا ہے "شبلی" و "حالی" کے سوا کسی اہلِ قلم نے اس میدان کا صحیح نقشہ نہیں بنایا اور فی الجملہ یہ فن اُردو زبان کے لٹریچر میں بہت نیچی سطح پر ہے جدید سیرت نگاری کا بہترین تخیل "حالی" نے حیاتِ جاوید کے صفحات پر پیش کیا ہے۔ اگر مسیح الملک کی سیرت پر قلم اُٹھایا جائے تو وہ اسی اصول پر ہونا چاہیئے کہ لکھنے والا مسیح الملک کی شخصی زندگی کو اُن کے عہد کی تمام تاریخ سے پرکرتے۔ اس طرح کہ اس کتاب کا ہر صفحہ ایک تاریخی آئینہ ہو۔ جس کے اندر مسیح الملک کی شخصیت کا نقش سب سے جدا اور سب میں ملا ہوا نظر آئے۔ یعنی جو شخص مسیح الملک کی زندگی کا ایک ورق پڑھے وہ ساتھ ہی اس ورق کے اندر ہندوستان کی تاریخ حاضرہ کا ایک صحیح خاکہ بھی دیکھ لے اور سمجھ سکے کہ زمانہ کی کس فضا میں گرد و پیش کے کن حالات میں مسیح الملک کی زندگی بسر ہوئی تھی اور وہ کیونکر قومی حالات اور سیاسیات کی کشمکش میں گزر جاتے تھے۔ اس کے خلاف جو سوانحعمری لکھی جائے گی وہ وہی ہوگی جو کتب فروشوں کی دوکانوں پر چار چار آنہ فی جلد کے حساب سے بکا کرتی ہے۔ مسیح الملک مرحوم کے نام کی اس سے بڑی توہین کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس عامیانہ انداز میں ان کی سیرت لکھی جائے۔

بلحاظ اس کے کہ جناب کے تعلقات مسیح الملک مرحوم کی شخصی یا پبلک زندگی سے بہت گہرے رہے ہیں۔ میں ملتجی ہوں کہ اس ضروری کام میں آپ ہماری امداد فرمائیں۔ بغیر آپ جیسے حضرات کی امداد کے اس کام کی تکمیل مشکل ہوگی۔ سب سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ جناب مرحوم کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کی مختصر مگر واضح روئداد تحریر فرما کر مجھے عنایت فرمائیں یعنی آپ کے اور مرحوم کے تعلقات کی تفصیلات حسب ذیل اُمور پر حاوی ہوں۔

(الف) آغازِ ملاقات کے اسباب۔

(ب) مرحوم کی زندگی کے خاص خاص واقعات جن سے آپ کو ذاتی تعلق رہا ہو یا جو آپ کی نظروں کے سامنے پیش آئے ہوں۔

(ج) مرحوم کے خیالات جن کا اظہار آپ سے یا کسی اور سے آپ کے سامنے کیا گیا ہو۔

(د) مرحوم کے احباب جو آپ کے علم میں مرحوم کے ساتھ مخصوص تعلق رکھتے ہوں۔

(ہ) مرحوم کے خطوط یا اور دیگر تحریریں جو جناب کے پاس ہوں یا جناب کے علم میں دوسرے احباب کے پاس ہوں۔

(و) فنِ طب و معالجہ کے متعلق خاص خاص واقعات جن کا جناب کو ذاتی علم ہو۔

میں نے ابتدائی مسودات کی تیاری کا انتظام مکمل کر دیا ہے اور فراہمی معلومات کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت سب سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ آپ جیسے حضرات بورڈ کی اور میری امداد فرمائیں اور اس کام کو ایک قومی خدمت تصور کر کے اپنے عزیز وقت کا بہت قلیل حصہ مجھے عنایت کریں۔

نیاز مند

محمد جمیل

رنگ برنگ کی تصاویر - سرخ - سبز - اور نیلی روشنائی میں مطبوعہ نظمیں اور اعلیٰ قسم کے مضامین اس کی زینت کو بڑھا رہے ہیں - ہم حافظ محمد عالم صاحب کو اُن کی اِس کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہیں -

انکشاف لکھنؤ سالگرہ نمبر } ضخامت ۱۸۴ صفحات - علاوہ ۲۰ رنگین تصاویر و اشتہارات کے -
نسیم رہنولوی صاحب نے ابھی پچھلے دنوں انکشاف کا ظریف نمبر شائع کرکے اپنی جودتِ طبع کا جو ثبوت دیا تھا - اُس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھی لاہوری رسائل کی طرح انکشاف کے مخصوص نمبر ضرور شائع کرینگے - چنانچہ اِس رسالہ میں مضامین و نظم مختلف رنگوں کی روشنائی میں بیل بوٹوں کے ساتھ شائع کیے گئے ہیں - نظمیں - افسانے اور مقالے مضامین قابلِ دید ہیں - سرورق نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے - اور اڈیٹر کی کاوش خیال کا پتہ دیتا ہے - ع اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ -

دورِ آزاد } اڈیٹر محمد واحد علی قریشی صاحب لطف لکھنوی - ضخامت ۷۶ صفحات تقطیع چھوٹی لکھائی چھپائی معمولی - چندہ سالانہ عہ

یہ ادبی اور تنقیدی ماہوار رسالہ ابھی حال ہی میں لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے اس کا مقصد اردو زبان کے ادب پر لکھنوی رنگ میں تنقید پیش کرنا ہے - نثر و نظم کا انتخاب خاصا ہوتا ہے - ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی ترقی کے خواہاں ہیں -

کوثر دہلی } یہ چالیس صفحہ کا رسالہ ظفر تاباںؔ صاحب کی اڈیٹری میں دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے سرورق سادہ ہے - تصاویر کا انتظام بھی ہے لکھائی چھپائی اچھی ہے - چندہ سالانہ صرف عہ ہے - اور اِس لحاظ سے اِتنے کم داموں میں ایک عمدہ قسم کے رسالہ کو جاری رکھنا ادارۂ اہتمام کی بلند ہمتی کی دلیل ہے - اور اس پر بقیمت کہتر بقامت بہتر کی مثل صادق آتی ہے - نظم و نثر کا انتخاب قابلِ دید ہے - عطاء الرحمٰن صاحب منیجر رسالہ ہذا سے

سرتاج ماہوار لاہور } زیرِ ادارت جناب سیدہ امتیاز فاطمہ بیگم صاحبہ۔ لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ضخامت ۶۵ صفحے اور قیمت ص ر سالانہ ہے جو غالباً زیادہ ہے یہ زنانہ رسالہ ہے اور زنانہ رسالہ جس قدر بھی جاری کیے جائیں ملک کی خواتین کے لیے تعلیم کا موجب ہونگے۔ ہم اِس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی بقائے حیات کے لیے دست بدعا ہیں۔ اس میں اصلاحی۔ معاشرتی۔ تمدنی اور اسلامی تاریخی مضامین اور مفید افسانے ہوتے ہیں جو زیادہ تر خواتین کے لکھے ہوتے ہیں۔ دارالاشاعت سرتاج لاہور سے مل سکتا ہے۔

علی گڑھ پرنٹنگ ورکس علی گڑھ

پرنٹر اشفاق محمد

جلد (۸)

شمارہ (۴، ۵، ۶، ۷)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کا

علمی و ادبی رسالہ

علی گڑھ میگزین

مدیر :- محمد ممتاز احمد سنبھلی بی اے (علیگ)

طابع و ناشر :- محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مقام طبع و نشر :- مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ

مجلسِ عاملہ علی گڑھ میگزین

سنسر چیرمین

خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) بی اے آنرز (آکسن)

مُدیر

مُحمد ممتاز احمد سنبھلی بی اے (علیگ)

فہرستِ مضامین

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی گڑھ میگزین

مرتبہ

محمد ممتاز احمد بسمل بی اے (علیگ)

نمبر ۴ و ۵ و ۶ و ۷	من ابتدائے ستمبر لغایۃ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء	جلد (۸)

شذرات

حادثاتِ ارتحال

مرزا علی محمد خاں اور سر ابراہیم ہارون جعفر

حادثاتِ ارتحال سے کبھی مفر نہیں۔ میگزین کو پچھلے نمبر میں بہت کچھ ماتم کرنا پڑا۔ اس بار بھی اس کی آنکھیں جوش غم میں ڈبڈبائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قوم کے دو مقتدر اور سربرآوردہ افراد مرزا علی محمد خاں وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی اور سر ابراہیم ہارون جعفر داعی اجل کو لبیک کہکر ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ دونوں بزرگ کے دل میں قوم کا درد تھا، وہ اس کے سوز و گداز سے آشنا تھے اور اس کی فلاح و بہبود کے کوشاں اور متمنی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان المناک حادثات سے قوم کو بہت کچھ نقصان پہنچا۔ میگزین بھی فرطِ غم سے متاثر ہو کر پس ماندوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے

محمد اسلم چودھری محمد اسلم متوطن فیروزآباد یونیورسٹی میں تھرڈ ایر کی تعلیم پا رہے تھے اکتوبر کی چھٹیوں میں وطن چلے گئے تھے وہیں بیمار پڑے اور ۱۱ اکتوبر کو عالم فانی سے رحلت کر گئے۔ مرحوم کے والدین کو اپنے اس اکلوتے نورِ نظر سے کیا کچھ اُمیدیں نہ تھیں مگر افسوس قضا و قدر نے سرِ شام ہی گھر بھر کے تن تنہا چراغ کو بادِ اجل کے سپرد کر دیا۔ ہم اس جوانا مرگ پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں اور پس ماندوں کے ساتھ مراسم ہمدردی کی تقدیم۔
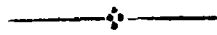
ضمیر احمد ضمیر احمد مرحوم ڈبائی کے رہنے والے تھے۔ فرسٹ ایر سے برابر علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ فطری اخلاقی محاسن کی بدولت حلقۂ احباب بہت وسیع تھا گزشتہ سال ایل۔ایل۔بی کی ڈگری لے چکے تھے۔ ایک طرف عملی دنیا مرحوم کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ تھی، دوسری طرف شادی کے ولولہ انگیز اور رنگین ترانے گوش تمنا کو گدگدا رہے تھے۔ یکایک ۱۵ دسمبر کی صبح کو تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ پچھلی شب ہمارے روشن ضمیر اولڈ بوائے الہ آباد کی ایک سہ منزلہ عمارت سے گر پڑے اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ آہ! اس اتفاق ناگہانی نے ساری آرزوئیں خاک میں ملا دیں۔

میگزین کو اس حسرت ناک موت پر دلی غم و تاسف ہے۔ خدائے عزوجل پس ماندوں کو صبر کی توفیق دے اور مرنے والے کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

اکتوبر کی تعطیل جولائی سے ستمبر تک بڑی چہل پہل رہی۔ ہر طرف جوش و خروش اور ہماہمی کے نظارے تھے۔ غرض تین مہینے متواتر علمی مشاغل کا سلسلہ جاری رہا۔ اتوار یا معمولی تہوار کے سوا کوئی قابلِ ذکر تعطیل اس درمیان میں نصیب نہیں ہوئی۔

خدا خدا کر کے مصروفیتوں کی پہلی میعاد ختم ہوئی اور یکم اکتوبر کو یونیورسٹی بند ہوئی۔ بہ استثنائے چند تمام طلبا جو اس موقع کے منتظر تھے ہنسی خوشی اپنے اپنے وطن چلے گئے۔ بیس دن کے بعد پھر "سیدی میکدے" کا دروازہ کھلا۔ زندانِ خانہ نشیں کی ٹولیاں پھر واپس آگئیں اور وہی پرانی ہُو حق پھر شروع ہو گئی۔

چانسلر کا انتخاب علیا حضرت تاحینِ حیات یونیورسٹی کی چانسلر رہیں۔ ان کی وفات کے بعد نئے چانسلر کا انتخاب بڑا

نام پڑتا ہے۔ غرض ۱۲ ستمبر کو کورٹ کی ایک میٹنگ ہوئی۔ ڈاکٹر سیدراس مسعود اُس وقت یورپ میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کے قائم مقام آنریبل جسٹس سر محمد سلیمان نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی اور جیسا کہ بہ قیاس مختلف حلقوں میں یقین کے مدارج طے کرچکا تھا ممبرانِ کورٹ نے بھی فرطِ انبساط میں ہم آہنگ ہوکر چانسلری کا سہرا بھوپال کے جواں بخت وجوان سال تاجدار کے سر باندھ دیا۔

میگزین بھی جوشِ مسرت کے جذبہ سے متاثر ہوکر والئ بھوپال کی خدمت عالی میں اس امر کی مبارکباد پیش کرتا ہے کہ نواب صاحب موصوف کو حدودِ ریاست کے باہر جامعہ میں بھی علیا حضرت بیگم صاحبہ مرحومہ کی جانشینی نصیب ہوئی۔ ہماری اُمیدیں کہتی ہیں کہ یونیورسٹی اپنے اپنے چانسلر کے دَور میں بہت کچھ پھولے پھلے گی۔

وائس چانسلر کی یورپ سے واپسی

میگزین کے پچھلے نمبر میں ڈاکٹر سیدراس مسعود کے یورپ جانے کی غرض وغایت کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے ان کی انتشارِ صحت پر بہت کچھ افسوس ظاہر کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یکم نومبر کو نواب مسعود جنگ علی گڑھ واپس آگئے اور ان کی صحت یابی پر آج ہمیں اظہارِ مسرت کا موقع ملا۔

میگزین کی طرف سے ہم اپنے محبوب وعزیز وائس چانسلر کو ان کی مع الخیر مراجعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدائے برتر آیندہ بھی ان کی صحت کو ہر ناموافق اثر سے محفوظ رکھے۔

مسٹر رشید احمد صدیقی کی صحت یابی

عرصہ سے ہمارے محترم بزرگ اور اُردو کے مایۂ ناز ادیب مسٹر رشید احمد صدیقی گردہ کے مرض میں مبتلا تھے۔ گزشتہ مہینوں میں ان کی حالت حد درجہ خطرناک ہوگئی تھی آخرکار دوبارہ عملِ جراحی کے لئے لکھنؤ جانے پر مجبور ہوگئے۔ اس دفعہ طلبا کی تشویش انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ہر عقیدت گزار دست بدعا تھا کہ خالق اکبر ان کو شفائے کامل نصیب کرے۔ چشم ما روشن دلِ ما شاد کہ رشید صاحب صحت یاب ہوکر علی گڑھ تشریف لے آئے۔

میگزین اپنے غمخوارِ دیرینہ کے افاقہ پر بارگاہِ باری میں ہدیۂ نیاز وتشکر پیش کرتا ہے۔

ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کی آمد

شروع نومبر سے ہز ایکسیلنسی لارڈ اَروِن وائسرائے ہند کی آمد آمد کا غلغلہ تھا۔ یونیورسٹی کی عمارات ایک نئی دُلھن کی طرح سرخ و سپید قلعی میں نہا دھو کر نکھر چکی تھیں، باغات آراستہ ہو چکے تھے روشیں بن سنور کر حسن دل کش کی جلوہ آرائیوں میں مصروف تھیں۔ غرض جامعہ کا گوشہ گوشہ تر و تازگی اور دل کشی کے باعث اہلِ تماشا کے لئے جاذبِ نظر بن گیا تھا۔

یکم دسمبر کو اساتذہ اور طلبا اسٹریچی ہال میں جمع ہوئے، وائس چانسلر نے ضروری ہدایات کے بعد موقع کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور حاضرین کی مشترکہ ذمہ داریوں کے احساسات کو بیدار کرتے ہوئے چند اصولی پابندیوں کی ضرورت جتائی۔

۲ دسمبر کی شام کو ۴ بجے ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کی اسپیشل (special) علی گڑھ پہنچی۔ اسٹیشن پر مندرجہ ذیل حضرات نے وائسرائے اور لیڈی اروِن کا خیر مقدم کیا:-

(۱) نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود (وائس چانسلر)

(۲) آنریبل مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں کے سی۔ ایس۔ آئی۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ (رکن)

(۳) آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں کے بی، کے سی۔ آئی۔ ای، او بی۔ ای (رکن)

(۴) کمشنر (آگرہ)

(۵) مجسٹریٹ و کلکٹر (علی گڑھ) (۶) پولس سپرنٹنڈنٹ (علی گڑھ)

ظہور گیٹ سے یونیورسٹی کے شہسواروں کا دستہ وائسرائے کی موٹر کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور عجیب محافظانہ تیور کے ساتھ وکٹوریہ گیٹ تک بڑے تزک و احتشام سے آیا۔ وائسرائے نے وکٹوریہ گیٹ کے باہر گارڈ آف آنر (guard of honour) کا معائنہ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہوتے وائس چانسلر نے وائسرائے سے اور سر مزمل اللہ خاں نے لیڈی اروِن سے ممبران کورٹ کا تعارف کرایا۔ ممبران اسٹاف بھی نظام میوزیم (Nizam museum) میں وائسرائے اور لیڈی اروِن سے ملائے گئے۔

وائسرائے اور لیڈی اروِن نے مسجد کا معائنہ کیا اور سرسید مرحوم کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھائے۔ مسجد سے اس کے بعد وائسرائے اسٹریچی ہال میں آئے۔ مولانا ابو بکر محمد شیث صاحب ڈین یونیورسٹی نے قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت کیں۔ وائس چانسلر نے مخصوص انداز میں اپنا فاضلانہ ایڈریس پڑھا اور مہاراجہ صاحب محمود آباد نے وہ کاسکٹ جس میں ایڈریس تھا وائسرائے کو

[illegible]

چلتے وقت اسٹریچی ہال کے برآمدہ میں وائس چانسلر نے چند سینیر (Senior) اور عہدہ دار طلبا کو وائسرائے سے ملایا اور جلوس بہ ترتیبِ سابق اسٹیشن کو روانہ ہوگیا۔

بھاول پور کے تاجدار کا ورودِ مسعود

۲ دسمبر کو صبح کے آٹھ بجے ہز ہائینس رکن الدولہ نصرت جنگ، حافظ الملک مخلص الدولہ کیپٹن نواب سر صادق محمد خاں بہادر عباسی پنجم کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، کے۔ سی۔ وی۔ او۔ والیٔ بھاولپور علی گڑھ میں رونق افروز ہوئے۔ اسٹیشن کی تزئین و آرائش جنت نگاہ تھی۔ یونیورسٹی کے رائیڈنگ اسکواڈ کی شان و شوکت اور یو۔ ٹی۔ سی کی صف آرائیاں وقارِ خسروی کی سطوت کو بے نقاب کر رہی تھیں۔ بینڈ کے دلکش نغمات ساری فضا کو آمادۂ تکلم کئے ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ ہمارے عباسی شہریار کے شایانِ شان استقبال نے ہر تماشائی کی نظر کو یکا چوند کر دیا تھا۔

کانووکیشن سے فارغ ہو کر ہز ہائینس نے نظام میوزیم میں لنچ کھایا۔ شام کے چار بجے اس ورودِ مسعود کے اعزاز میں یونیورسٹی کی طرف سے کرکٹ لان میں ایک بڑی شاندار پارٹی ہوئی۔ رؤسائے شہر، ممبران کورٹ و اسٹاف اور غیر مقامی مہمانوں کے علاوہ سینیر طلبا بھی اس میں مدعو تھے۔

نواب صاحب بھاولپور جتنی دیر علی گڑھ میں رہے خسروانہ انعام و اکرام کی بارشیں جاری رہیں۔ یونیورسٹی کو ایک لاکھ کی گراں قدر اور شاہانہ رقم تو ملی ہی، یونین اور ڈیوٹی سوسائٹی کو بھی ایک ایک ہزار روپئے مرحمت فرمائے۔ علاوہ بریں ہز ہائینس نے وائس چانسلر کو پانچ ہزار روپئے اور دیئے اور اختیار دیدیا کہ خود جناب وائس چانسلر اپنی حسب منشا جس شعبے میں چاہیں خرچ کریں۔ یہی نہیں بلکہ نواب صاحب موصوف نے چند اساتذہ اور عہدہ دار طلبا کو بھی بیش قیمت تحائف عنایت کئے۔

ہم ہز ہائینس نواب صاحب بھاول پور کو طلبا کے خلوص و عقیدت کا یقین دلاتے ہیں اور اس شاہانہ ورود کو جامعہ کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز اور مسلمانوں کے لئے ایک مایۂ ناز یادگار قرار دیتے ہیں۔

میگزین کی دعا ہے کہ خدا بھاول پور کے اس روشن ضمیر اور دریا دل فرماں روا کی جاہ و حشم اور دولت و اقبال میں چار چاند لگائے۔ اسی سلسلہ میں ہم مسٹر انعام اللہ خاں کی خدمت میں طلبا جامعہ کے دیرینہ نیاز و عقیدت کا ہدیہ پیش کرتے ہیں میگزین کی

مسٹر مقبول حسین ہماری یونیورسٹی کے اولڈ بوائے بھی ہیں۔

کانووکیشن وائسرائے کی روانگی کے بعد دوسرے ہی دن کانووکیشن کی تاریخ تھی۔ کامیاب طلبا ر پہونچتے ہی اپنے اپنے رنگین گاؤن پہنکر دعوتِ نظر دینے لگے۔ رسمی مظاہرے کی غرض سے اساتذہ بھی اپنے مخصوص گاؤن میں ملبوس تھے۔ اس کے علاوہ باہر کے متعدد مہمانوں سے یونیورسٹی میں عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ قوم کی ساری عظمتیں اُس روز جامعہ کی چار دیواری کے اندر مجتمع ہوگئی تھیں۔

دس بجتے بجتے اسٹریچی ہال میں سب جمع ہو چکے تھے۔ تلاوت قرآن کے بعد مسٹر ہنری مارٹن پرو وائس چانسلر نے اپنی سالانہ رودادِ پڑھی اور وائس چانسلر نے تقسیم اسناد کی مبارک رسم ادا کی۔ آخر میں ہز ہائینس نواب سر صادق محمد خان والیٔ بہاولپور نے اپنا پُر معنی کانووکیشن ایڈریس پڑھا جو ہر اعتبار سے قابلِ تحسین تھا۔

میگزین کی طرف سے ہم کامیاب طلباء کو جنھیں امسال ڈگریاں ملی ہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کی آئندہ اور روشن تر کامیابیوں کے متمنّی ہیں۔

امتحانات کے نتائج پرو وائس چانسلر کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۳۰ء کے مختلف امتحانات کے نتائج حسب ذیل ہیں :-

امتحانات	تعداد طلباء [illegible]	تعداد طلباء جو کامیاب ہوئے مع ڈویژن I	II	III	[illegible]	[illegible]	کیفیت
ایم۔ اے	۵۹	۲	۱۵	۲۳	۴۰	۶۸	مشترکہ حساب فی صدی ۶۹
ایم۔ ایس۔ سی	۱۳	۲	۸	۰	۱۰	۷۶	
بی۔ اے (آنرز)	۶	۰	۳	۱	۴	۶۶ء۶	مشترکہ حساب فی صدی ۵۵

بی۔ اے	۲۱۶	۲	۱۳۶	۰	۱۳۸	۶۴
بی۔ ایس۔ سی	۵۱	۰	۳۰	۰	۳۰	۵۹
انٹرمیڈیٹ	۲۶۵	۶	۷۶	۹۵	۱۷۷	۶۷
ہائی اسکول	۲۳۲	۶	۳۳	۶۱	۱۰۰	۴۳
بی۔ ٹی (اصول)	۴۱	۳	۲۱	۱۵	۳۹	۹۵
بی ٹی (مشق)	۴۰	۹	۲۵	۶	۴۰	۱۰۰
سی۔ ٹی (اصول)	۱۵	۱	۴	۷	۱۲	۸۰
سی۔ ٹی (مشق)	۱۱	۰	۷	۴	۱۱	۱۰۰
ایل۔ ایل۔ بی (پریویس)	۱۳۵	۱۷	۵۲	۰	۶۹	۵۱
ایل۔ ایل۔ بی (فائنل)	۱۳۰	۳۱	۸۲	۰	۱۱۳	۸۷
بی۔ ٹی ایچ (پریویس)	۳	۱	۲	۰	۳	۱۰۰

مشترکہ حساب فی صدی ۶۳ (بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی)

ڈاکٹر ایف کرنکاؤ

ڈاکٹر ایف۔ کرنکاؤ پروفیسر شعبۂ اسلامیات کو علی گڑھ کی آب وہوا راس نہ آئی چھٹیوں میں سخت بیمار رہے اور آخر کار دس ماہ کی رخصت لے کر علی گڑھ سے چلے گئے۔ بڑی تعطیل کے بعد واپسی کی امید کی جاتی ہے۔ میگزین اتنے بڑے جرمن مستشرق کی بے وقت اور طویل علیحدگی پر اظہار تاسف کرتا ہے۔

مسٹر ٹی۔ کے۔ بیرٹ

مسٹر ٹی۔ کے۔ بیرٹ بی اے (کنٹب) شعبۂ انگریزی میں ریڈر مقرر ہوئے تھے علی گڑھ آتے ہی ٹائیفائڈ (میعادی بخار) میں کچھ ایسے مبتلا ہوئے کہ انگلستان واپس جانا پڑا۔ ان کی جگہ مسٹر خواجہ منظور حسین ایم۔ اے (علیگ) پی اے آنرز (آکسن) اس شعبہ کے چیرمین ہیں۔

ڈاکٹر اے۔ ایس۔ ٹرٹین

ڈاکٹر اے۔ ایس۔ ٹرٹین صدر شعبۂ عربی بھی دسمبر میں مستعفی ہوگئے۔ اب ان کی جگہ پروفیسر عبدالعزیز میمن عربی کے چیرمین ہیں۔

نئے تقررات

انگریزی کے شعبہ میں مسٹر دراب اور مسٹر فضل آوان کا بحیثیت لکچرر عارضی تقرر ہوا۔ فرانسیسی زبان کی تدریس کے لئے مسٹر احسان سامی اور جرمنی زبان کی تعلیم کے لئے ڈاکٹر ٹوپا علی گڑھ آگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میگزین کی صدا آویزۂ گوشِ قبول بنی۔

آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں

آنریبل نواب سر احمد سعید خاں رئیس چھتاری، گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن تشریف لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں آنریبل نواب سر محمد مزمل اللہ خاں سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ کے ہوم ممبر مقرر ہوئے ہیں۔ ہم اپنے سابق وائس چانسلر کو اس اعزاز نو پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ۲۰ ہزار روپے کے فیاضانہ عطیہ کا شکریہ بھی

[د]سمبر کی انجمن آرائیاں

دسمبر کے آخری دو ہفتے ہندوستان کے لئے نعمت غیر مترقبہ کہے جا سکتے ہیں۔ ان ہی دنوں میں حیاتِ انسانی کے مختلف النوع مظاہر ہیں جو ہندوستان کے لئے تمام سال ایک بے جان مجسمہ سے [ز]یادہ وقعت نہیں رکھتے، خود نمائی کی ایک عارضی روح حلول کرجاتی ہے۔ اسی زمانے میں علمی اور سیاسی، ادبی اور فنی [غر]ض مختلف قسم کی مجلسیں اپنے اپنے اجلاس برپا کرتی ہیں اور تزئین و آرائش کا نظر فریب اہتمام کرلیتی ہیں۔ ساتھ ہی [س]اتھ اس مہینے میں دنیائے اردو کے رسائل بھی اپنے اپنے "سال گرہ نمبر" خاص رنگینیوں کے ساتھ بڑی آن بان سے [ہد]یہ ناظرین کرتے ہیں مگر بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہمارا میگزین اس مسلکِ عام کا رہینِ منت نہیں۔ غرض یہ کہ یہی دو ہفتے

کے لئے "ارتقائے ہند" کے مطالعہ کی خاطر ہندیہ زن بک بڑی مناسب اور خاطر خواہ فضا رہتی ہے۔

آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس

پٹنہ (عظیم آباد) قدیم سے ادبی دلچسپیوں کا مرکز رہا ہے اور اردو کی توسیع و اشاعت کو اس نے برابر اپنا فرض عین سمجھا ہے۔ آل انڈیا اردو کانفرنس کے اجلاس کے بعد اس شہر میں علمی جوشش روز افزوں ہوتا گیا اور آج بھی اس کی تعمیری کوششیں اردو کے لئے مفید اور کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔ ۱۹ دسمبر کو پٹنہ میں آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس کا شاندار اجلاس منعقد ہوا ہماری یونیورسٹی کے نمائندے بھی اس میں شریک تھے۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے ایک بصیرت افروز مقالہ بھی پڑھا جو شائقین علم و ادب کے لئے حقائق علمی کا ایک عالمانہ اور فاضلانہ انکشاف تھا۔ میمن صاحب کے علاوہ ڈاکٹر سید ہادی حسن چیرمین شعبۂ فارسی و ڈاکٹر اندرے وائل چیرمین شعبۂ ریاضی بھی بغرضِ شرکت پٹنہ تشریف لے گئے تھے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے اپنا اجلاس بنارس میں منعقد کیا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس اجلاس کو جو علمی اور قومی امتیاز حاصل تھا وہ ظاہر ہے نواب مسعود جنگ ڈاکٹر سید راس مسعود اس کے صدر تھے اور سر سید مرحوم کے خواب کی تعبیر قوم کے پیش نظر تھی بڑے بڑے ادب نواز اور علم دوست افراد شریک تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم اور اردو کی ترقی کے متعلق بہت سی مفید تجاویز پیش ہوئیں مجملہ ملا رموزی صاحب نے ایک تجویز پیش کی تھی جو اہمیت خصوصی اور مفادِ اردو کی بنا پر ارباب ادب کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔

ذیل میں ہم "ملائے اردو" کی اس تجویز کو ناظرین میگزین کی دلچسپی کے لئے درج کر دینا مناسب سمجھتے ہیں:

"میں تحریک کرتا ہوں کہ یہ مجلس ماہرین صحافتِ وطنیہ کی ایک ایسی مجلس منتخب اور مقرر کرے جو بعد تحقیق مجلس عالیہ تعلیمی کو بتائے کہ کس طرح حکومت کو متوجہ کیا جائے کہ وہ سرکاری درسگاہوں میں باقاعدہ اخبار نویسی کے نصاب کو رواج دے تاکہ ہندوستان میں سند یافتہ اخبار نویس پیدا ہوں۔"

میگزین کی طرف سے دو انعامات کا فیصلہ

علی گڑھ میگزین (اُردو) کے عملۂ ادارت نے یہ طے کیا ہے کہ اپریل ۱۹۳۱ء میں پچیس پچیس روپئے کے دو انعامات کتابوں کی صورت میں اپنی یونیورسٹی کے مضمون نگار طلبا کو بہ تفصیل ذیل دیئے جائیں۔

(۱) ایک انعام اس مضمون (نثر) کے لئے جو میگزین کے سال بھر کے نمبروں کو ملا کر طلبا کے مضامین میں بہترین قرار دیا جائے۔

(۲) ایک انعام اس نظم کے لئے جو میگزین کی اس سال تمام اشاعتوں کو ملا کر طلبا کی نظموں میں بہترین سمجھی جائے۔

اُمید ہے کہ طلبا رجامعہ اپنے قلم کو زحمتِ جنبش دے کر میگزین کی ادبی معاونت اور انعامی مقابلہ کے لئے جوشِ عمل سے کام لیں گے۔

ایڈیٹر

محمد ممتاز احمد بسمل بی اے (علیگ)

مرقّعِ مضامین

حصّۂ نثر

چینو پاشا آ گئے

محترمی ڈاکٹر محمد بابر مرزا شعبۂ حیوانیات کے صدر ہیں - مرزا صاحب کے مضامین انگریزی میگزین میں اکثر شایع ہو چکے ہیں مگر اُردو میگزین میں بے شک یہ پہلا موقعہ ہے - یہ افسانہ چینو پاشا کی تعلیمی زندگی کا چربہ ہے اور تہذیب و معاشرت کی انقلابی جد و جہد کا ایک عبرتناک منظر - اسلوبِ بیان سے قطع نظر اس کا اخلاقی پہلو ہندوستانی طلبا کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً بہت مفید ہے - مسلمان نوجوانوں کے لئے جو مغرب میں تحصیلِ علم کا ارادہ رکھتے ہیں اس افسانے میں بہت بڑا اصلاحی اور تنبیہی سبق ہے - ہمیں امید ہے کہ یہ افسانہ طلبا کے لئے کافی دلچسپ و سبق آموز ثابت ہوگا -

افسوس ہے کہ یہ افسانہ پچھلے نمبر میں شایع نہیں ہو سکا - اس کی وجہ اشاعت کی عجلت اور کاتب کی عدیم الفرصتی تھی - قدرۃً ڈاکٹر صاحب کو اس کی شکایت ہونی چاہئے مگر اتفاقی مجبوریوں پر نظر کرنے کے بعد شاید اس کی گنجائش نہ ہو - امید ہے کہ اگر کوئی شکایت ہوئی بھی ہوگی تو اب جاتی رہے گی -

درسِ عبرت

مقبول حسین صاحب لکھنؤ کے ذی علم بزرگ اور مقبول ادیب ہیں - جناب کی تحریریں اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں - میر جیسے شاعر پر قلم اُٹھانا کچھ آسان کام نہیں - بڑے بڑے ادیب، مبصّر، نقاد، شاعر اور ناثر کچھ نہ کچھ میر کے متعلق ضرور لکھتے رہے ہیں - اور جو کچھ بھی نہ لکھ سکے اُنھوں نے اتنا ضرور کیا کہ کلامِ میر کا انتخاب ہی شائع کر کے اظہارِ عقیدت سے سُبکدوش ہوئے بہرحال مقبول صاحب نے انتخاب موضوع میں ایک بات پیدا کی ہے - اور بات ہی نہیں بلکہ دعوے اور ثبوت کی تلاش میں محنت کی ہے - ذرا حُسنِ تلاش ملاحظہ ہو - انگلستان کے شہرہ آفاق شاعر اور تمثیل نگار شیکسپیر سے چراغ مانگا - شیلی سے دیا سلائی لی - سوینٹ اور فونٹ نیل کو ساتھ لیا - غالب، اکبر

اور اقبال سے راستہ پوچھا تب کہیں میر کی شاعری کے معنوی نہ خانہ میں عبرت کا اندوختہ حاصل کر سکے۔ مختصر یہ کہ اس مضمون میں ادبی مذاق کا گہرا رنگ ہے اور مطالعہ کی وسعت، تحقیق کی کاوش، ترتیب کی موزونیت داد کی مستحق ہے۔

طامات ایک روسی افسانہ ہے اردو کو روسی ادب سے جو اُنسیت پیدا ہوگئی ہے اسی کے اعتراف پر پیر منتوف کی ذہنی نقاشی کا روسی مرقع اردو کے رنگ میں ناظرین کی خدمت میں حاضر ہے۔ ایک نمایاں شان اس ترجمہ کی یہ ہے کہ فہرست مضامین یا افسانہ کے آخر میں کہیں بھی مترجم کا نام نہیں۔ یہ امر بھی ناظرین کے لئے ایک دلچسپ معمہ ہے۔ مگر اس کی روش کچھ اس قدر مانوس معلوم ہوگی کہ تھوڑی سی دماغی تفتیش مترجم کا سراغ لگانے کے لئے کافی ہے۔ ع

آشنا ہیں کان اس آواز سے

روسی شاعری یہ بات لگی ہوئی ہے کہ جس ملک اور جس ادب کے افسانوں سے علم دوست افراد اس قدر دلچسپی لیں اُس ملک اور اُس ادب کی شاعری بھی ان کے لئے ضرور دلچسپ ہوگی۔ یہ رویہ ہرگز مناسب نہیں کہ روسی افسانوں سے اُن کا تعارف کرا کے روس کی شاعرانہ تخئیل سے ان کو بے بہرہ رکھا جائے۔ صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ ناظرین کے پیشِ نظر ہوں۔ اسی نظریہ کی پیروی کرتے ہوئے ہم محمد مجیب صاحب بی۔ اے آنرز (آکسن) کے "روسی ادب" سے جو رسالہ "اردو" میں شائع ہو چکا ہے پشکن کی دو نظموں کے ترجمے نقل کر کے اپنے میگزین میں شائع کر رہے ہیں۔

کمرے کا بھوت ایک مزاحیہ افسانہ ہے۔ اسلم صاحب نے اس میں ظرافت پیدا کرنے کی کافی کوشش کی ہے یقیناً یہ طلباء کے لئے دلچسپ ہوگا۔ خصوصاً اُن کے لئے جنھیں دارالاقامہ کی طالب علمانہ زندگی میں اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس قسم کے رفیق بھوتوں سے آئے دن سابقہ پڑتا ہو۔

مذکورۂ بالا مضامین کے علاوہ "از ماست کہ بر ماست" "شانتی" "شاہی محبت (ترجمہ)" "ہمارا ناٹک" "شہزادہ کا خواب" خاص طلبا کے مضامین ہیں اور سب اپنی اپنی جگہ اچھے خاصے دلچسپ اور ستھرے ہیں۔ ہمیں بے انتہا خوشی ہے کہ طلبا نے میگزین کی طرف توجہ شروع کر دی اور اپنے قیمتی وقت کا تھوڑا سا حصہ میگزین کی قلمی معاونت میں صرف کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے۔ امید ہے کہ دیکھا دیکھی دوسرے احباب بھی اس علمی تعاون میں شرکت کی کوشش فرمائیں گے۔

حصۂ نظم

مقصدِ ہستی

فرخ صاحب ایک خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُنھوں نے فلسفۂ ہستی کو اپنے مخصوص انداز میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرخ صاحب اس باب میں کامیاب ضرور رہے مگر کہاں تک؟ اس کا فیصلہ خود ناظرین کے ذوق و تخیل پر موقوف ہے۔

رباعیات قتیل

جناب قتیل ایک نوجوان مگر قادر الکلام شاعر ہیں۔ باوجود شاعرانہ کمال کے وہ شہرت سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ یہی سبب ہے کہ ناظرین میگزین بھی شاید ہمارے سجادہ نشین اور گمنام شاعر سے اب تک واقف نہ ہوں۔ ہم جناب قتیل کے بے حد ممنون ہیں کہ ہمارے اصرار پر آپ نے اپنی چند رباعیاں ہمارے پاس بھیج دی ہیں۔ یہ تو ناظرین خود کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کا شاعر جو نظم کی سنگلاخ زمین یعنی "رباعی" میں اس قدر کامیاب نظر آئے کہاں تک گمنامی میں پڑا رہنے کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے۔

جوگی

یہ گولڈ اسمتھ کی مشہور نظم "دی ہرمٹ" کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالغفور صاحب شہباز مرحوم عظیم آباد کے ایک نازک خیال اور ذہین شاعر تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی زیادہ وفا نہ کر سکی۔ اس نظم میں ترجمہ کی مناسبت سے انگریزی کے عوض ہندی نام لائے گئے ہیں۔ اس کی زبان بھی ٹھیٹھ اُردو ہے جس کی وجہ سے دیہاتی تخیل کی سادگی زیادہ دلکش ہو گئی ہے۔ ہم مولوی سید محمد ابراہیم صاحب صدر انجمن ترقیٔ اُردو پٹنہ کے بدل مشکور ہیں کہ اُنھوں نے شہباز مرحوم کے شہپاروں میں سے ایک نظم میگزین کے لئے عنایت کی ہے۔

عہد کی پابندی و اخلاقِ رسول

جمیل صاحب نے اس نظم میں آں حضرت صلعم کے ایک واقعہ کو پیش کیا ہے۔ اگر اسی طرح دیگر روایات نبوی کو نظم کا جامہ پہنایا جائے تو یہ طریقہ مسلمان بچوں کے لئے مفید ہی نہیں بلکہ اُردو میں اسلامی تاریخ کے ایک گراں قدر اور دلچسپ اضافہ کا باعث ہوگا۔ اس سلسلہ میں پنجاب کے مشہور اور ہردلعزیز شاعر حفیظ جالندھری کی کوششیں بہت کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور اُنھوں نے اپنی کتاب کا نام بھی "شاہنامۂ اسلام" رکھا ہے۔ محترمی ضیاء صاحب بدایونی نے بھی تاریخِ اسلام کے اکثر اخلاقی واقعات نظم کئے ہیں اور اُنہیں سے چند "تذکارِ سلف" کے نام سے انٹرمیڈیٹ کالج لٹریری سوسائٹی کی طرف سے شایع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

مرغزار

مسٹر اندرجیت شرما کی نظمیں ہمارے میگزین میں اکثر شایع ہوتی رہی ہیں۔ اس نظم میں مناظرِ فطرت پر ایک شاعرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ چھوٹی بحر میں اس قسم کی نظمیں بیان کی سادگی سے زیادہ دلچسپ ہو جاتی ہیں

بحری گیت سردار انور صاحب بی اے ہی تھے اور علیگ بھی۔ ناثر بھی ہیں اور شاعر بھی۔ یہ نظم ان کی طبع زاد ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ اس نظم کی محرک کوئی انگریزی نظم ضرور ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی دماغ بحری فضاؤں سے اس قدر مانوس اور آشنا نہیں ہیں جتنا انور صاحب کا ذاتی خیال ہے۔ بایں ہمہ اس نظم کے دلچسپ ہونے میں کلام نہیں اور خصوصاً اُن طبیعتوں کے لئے جو مغربی تخئیل سے محظوظ ہوتی رہتی ہیں۔

سیرِ نمائش یہ نظم ظفر احمد صدیقی متعلم انٹرمیڈیٹ کالج کی ہے اور خاص جذباتی کیفیات کے تحت میں حسنِ ادا کے ساتھ سپردِ قلم کی گئی ہے۔ ان میں جن خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے وہ مفید مصلحانہ اور شرعی ضرور ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ ہر واقعہ اور ہر طرز عمل کی اہمیت اس کی اچھائی اور برائی افراد کے ذاتی مذاق اور حسنِ ظن پر مبنی ہے۔ محفوظ طریقہ تو یہی ہے کہ ہم وسیع النظری سے کام لیں اور بعض کمزوریوں کی وجہ سے کسی چیز کے روشن پہلو کو نظر انداز نہ کریں۔

اڈیٹر

عطیۂ حمید

عالیجناب نواب سید راس مسعود صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو کسی نے اطلاع دی کہ محمد حمید اللہ صاحب احراری سرولوی (پھتیا۔ ضلع غازی پور) کے پاس حضرت شاہ عالم ثانی بادشاہ (یکے از شاہان مغلیہ) کا ایک مکتوب ہے جو انھیں بجان و دل عزیز ہے۔

ممدوح نے فوراً ایک خط محمد حمید اللہ صاحب احراری کے نام روانہ کیا اور مکتوب مذکورہ کو معین الدین احمد لکچر گیلری کے لئے طلب کیا اور اطمینان دلایا کہ پوری حفاظت کی جائے گی۔

اس خط کے پہونچتے ہی احراری صاحب نے بلا تأمل اپنے عزیز ترین اور نایاب تحفہ کو جناب حاجی مولوی ابو الحسن صاحب انسپکٹر مدارس گورکھپور کی معرفت بطور عطیہ یہاں بھیجدیا جو اس وقت لکچر گیلری کی زینت ہے۔ جزاک اللہ

مکتوب مصدقہ اور معتبر ہے۔

وحید اللہ احراری

چُنوّ پاشا آ گئے!!!

چھ سال کا عرصہ ہوا کہ چنّو پاشا نے اپنے عزیز و اقارب کو خدا حافظ کہا اور مغربی تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر ایک ہجوم تھا۔ پاشا کے دونوں بازو امام ضامنوں سے لدے ہوئے تھے۔ گلے میں اس قدر پھولوں کے ہار تھے کہ گردن اٹھانا دشوار ہوگیا تھا۔ عزیز و اقارب کا رونا دھونا اس غضب کا کہ ماہ محرم کو بھی مات کیا تھا۔ چنّو پاشا کی آنکھیں بھی ڈبڈبا نے لگیں اور سسکیوں کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ ریل نے سیٹی دی۔ چنّو پاشا نے باپ کے پیٹ میں منڈی ڈالی" اور گاڑی پر سوار ہوگئے۔ باپ کے دل میں عجیب و غریب پراگندہ خیالات تھے کہ ہائے نہ معلوم کیا ہوتا ہے۔ کبھی تو غریب کی ہمت نہایت ہی پست ہوجاتی تھی اور کبھی چنّو پاشا کی مغرب میں کامیابی کا تصور کرکے دل کو سکون ہوتا تھا۔ لیکن ایک بات سے بہت اطمینان تھا کہ چنّو پاشا کی شادی سفرِ انگلستان سے قبل کردی تھی تاکہ وہ کسی یورپ کی نازنین کو گلے کا ہار بنا کر نہ لے آئیں۔

چنّو پاشا بمبئی پہنچے طبیعت بحال تھی کہ ماں باپ کی سختیوں سے آزادی ملی۔ مغربی زندگی کے خیالات ابھی سے دل میں پکنے لگے۔ جہاز پر سوار ہوئے۔ کبھی گوری شکلوں کے ساتھ بات کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اسٹیوارڈ (Steward) نے کمرہ کا نمبر پوچھا۔ بہت ہی مؤدبانہ اس کو جھک کر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور گھبرائی ہوئی آواز میں اپنے کمرہ کا نمبر بتایا۔ ٹھیک ۱ بجے دن کے جہاز نے ساحل چھوڑا۔ دو دن خیریت سے گزرے۔ تیسرے دن طوفان نے آگھیرا۔ چنّو پاشا بستر پر پچھڑ گئے اور ایسی طبیعت خراب ہوئی کہ سفرِ یورپ سے کان پکڑا اور وہیں سے اپنے وطن واپس ہونے کا قصد کیا لیکن ہمسفر اور ہموطنوں کے اصرار سے طبیعت کو سخت کیا اور آگے بڑھنے پر راضی ہوگئے۔ جہاز عدن پہنچا۔ لیکن چنّو پاشا میں اس قدر طاقت نہ رہی تھی کہ عدن کی سیر کرتے۔ ایک تو بیماری نے غریب کو نحیف کردیا تھا اور دوسرے غذا نے۔ اس بات کا عہد کرکے نکلے تھے کہ سوا آلو اور روٹی کے کسی چیز کو نہ چھوئیں گے۔ ممکن ہے کہ مرغی بھی سور کی چربی میں پکائی ہو۔ غرض کہ اُن کا خیال تھا کہ سور اور سور کی چربی کے سوا کوئی چیز جہاز پر استعمال نہیں کی جاتی ہے۔ فاقہ زدہ اور پریشان حال بحیرۂ احمر میں پہنچے۔ صبح کا وقت تھا' ہوا تیز چل رہی تھی اکثر مسافر چہل قدمی کر رہے تھے چنّو پاشا لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے سے نکلے اور کھڑے ہوکر ساحلِ عرب کو دیکھ رہے تھے گلے میں کچھ خراش سی تھی کھنکار کر تھوکا۔ ہوا کے جھونکے نے بلغم کو اڑایا اور ایک انگریز کے منہ پر لتھیڑ دیا۔ صاحب کو اس قدر غصہ آیا کہ بلبلا کر چنّو پاشا کے پیچھے پڑ

دلتی جھاڑی منجھی سی جان نے چار قلابازیاں کھائیں اور تہذیب کی پہلی منزل کو اس حماقت کے بعد طے کیا۔ اس دن سے
کھنکار کھنکار کر تھوکنے سے کان پکڑا۔

پورٹ سعید پہنچے اس خیال سے کہ یہاں پر کم از کم کسی مسلمان ہوٹل میں اچھا کھانا ملے گا خشکی پر قدم رکھا۔ پورٹ سعید کے
بچپن اور بدمعاشی میں دنیا میں یکتا ہیں خشکی پر قدم رکھا ہی تھا کہ پانچ چھ آدمی چمٹ گئے۔ کوئی تو ان کو پورٹ سعید کی سیر
چاہتا تھا، کوئی پیرس کے کارڈ یعنی برہنہ تصویریں دکھا کر ان کی طبیعت کو اشتعال دے رہا تھا کہ چلیے آپ کو برہنہ ناچ دکھائیں، کوئی
سگریٹ بیچ رہا تھا کہ دنیا کے بہترین سگریٹ مصر میں بنتے ہیں، کوئی ان کے ہاتھ کھینچ کر ترکی مٹھائی دے رہا تھا کہ اس سے بہتر
دنیا میں نہیں۔ غرض کہ چنو پاشا کے ہوش و حواس باختہ ہو گئے۔ آخر کار انھوں نے ایک رہبر کو اپنے ساتھ لیا جس نے ان سے
مانگے اور اس شرط پر کہ رقم قبل از وقت ادا کر دی جائے۔ چنو پاشا کی جیب میں کافی رقم تھی۔ ۲۰ پونڈ اپنے ساتھ لے کر جہاز سے اترے
دس شلنگ فوراً ہی رہبر کو نذر کئے اور پہلا کام یہ بتایا کہ کسی مسلمان ہوٹل میں ان کو کھانا کھلائے۔ ایک نہایت ہی غلیظ اور چھوٹے
ہوٹل میں جو شاید اس رہبر کے کسی قرابت دار ہی کا تھا، چنو پاشا نے مشرقی کھانوں کی خوشبو سونگھ کر نہایت ہی اطمینان بخش سانس لیا
اس جگہ دو چار ٹوٹی پھوٹی میز اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہزارہا مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ چنو پاشا نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا
اور دل کھول کر ڈکاریں لیں اور اتنی ڈکاریں لیں کہ دس دن کا بدلہ اتار لیا۔ کھانا نہایت ہی سادہ تھا لیکن ان کو چھ شلنگ دینے
پیٹ بھرنے کے بعد سیر و تفریح کی سوجھی۔ رہبر نے ایسی جگہ پہنچایا کہ جہاز بھی پورٹ سعید سے روانہ ہو گیا اور چنو پاشا فارغ نہ ہوئے
جیبوں میں جو کچھ تھا سب لٹ گیا اور یہ پریشان حال بندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جہاز روانہ ہو چکا ہے۔ مجبوراً ایک نہایت قیمتی سونے کی
گھڑی اور سسرال کی بخشی ہوئی انگوٹھی کو کوڑیوں کے مول بیچا اور گھر تار دیا کہ بیماری کی وجہ سے پورٹ سعید میں قیام کرنا پڑا۔
روپیہ جو کچھ بھی ساتھ تھا ڈاکٹروں کی نذر ہو گیا۔ فوراً روپیہ بھیجو تاکہ دوسرے جہاز سے سفر کی تکمیل کروں۔

بیچارے بڈھے باپ کو تار ملنے کے بعد اس کی حالت کا بیان کرنا از حد دشوار ہے۔ غریب کو غش آ گیا۔ روتے روتے
آنکھیں سوج گئیں۔ ماں اور بیوی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ فوراً ہی تار سے روپیہ بھیجا۔ چنو پاشا نے دوسرا جہاز لیا اور مارسلیز پہنچے
ان کا تمام اسباب لندن پہنچ چکا تھا۔ پہلی ریل سے پیرس پہنچے۔ پیرس ایک ایسا شہر ہے کہ آدمی جس قدر بھی روپیہ خرچ کرے کم ہے اور
دوسری طرف نہایت کم رقم میں بھی اچھی اور سستی زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ یہاں پر پیرس کی خوبیوں اور برائیوں کا ذکر کرنا بیجا ہوگا۔ ہم
صرف چنو پاشا کے عجیب و غریب تجربات پر اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ اسٹیشن پر اترے تو عجب حال تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں

اور کہاں ٹھیریں۔ یہ بھی نہیں کر سکتے تھے کہ پیرس پہنچکر فوراً ہی دوسری گاڑی سے لندن روانہ ہوجائیں۔ پیرس کی سیر کرنا بھی لازمی امر تھا۔ سیدھے ٹامس کک کے ہاں پہنچے۔ روپیہ بدلوا کر موٹر والے کو کرایہ ادا کیا اور ٹامس کک کے دفتر میں دریافت کیا کہ کہاں قیام کرنا چاہیئے۔ اس نے پیرس کے نہایت عمدہ ہوٹلوں کے نام بتائے جہاں پر کہ اکثر امریکن روساء ٹھیرتے ہیں۔ یہ ایک ہوٹل میں پہنچے۔ خیر بڑے ہوٹل میں زبان فہمی کی دقت نہ تھی۔ جہاں زیادہ روپیہ خرچ ہوتا ہے وہاں انگریزی ضرور بولی جاتی ہے۔ چنو پاشا کو بغیر ساز و سامان کے دیکھکر ہوٹل والے نے پہلے ہی رقم رکھوالی۔ انھوں نے تین دن قیام کرنے کا قصد کیا اور رقم ادا کردی۔ ہوٹل والے سے پوچھا کہ کپڑے کہاں خریدنے چاہییں۔ اس نے رو دے ریولی پر ایک دوکان کا نام بتایا۔ یہ سڑک ایسی ہے کہ جہاں پر ہر چیز کے سہ گنا دام دینے ہوتے ہیں۔ چنو پاشا نے کچھ قمیص، کالر اور رومال وغیرہ خریدے اور خوشی خوشی ہوٹل آئے۔ نہائے دھوئے اور اجلے کپڑے پہنکر پیرس کی سیر کرنے چلے۔ ایک موٹر پر چند زبانوں میں لکھا ہوا "پیرس شب میں" پڑھا۔ دلالوں نے نہایت میٹھی زبان میں ۵۰ فرانک میں تمام پیرس کی سیر کرانے کے لئے کہا۔ چنو پاشا نے کچھ لوگوں کو موٹر لاری میں بیٹھے دیکھا۔ خود بھی سوار ہوگئے۔ پیرس کی دو گھنٹے سیر کی۔ کھانا کھانے ایسے ہوٹل میں اتفاق سے پہنچے کہ جہاں پر کوئی انگریزی نہ بولتا تھا۔ مینو (فہرست طعام) پڑھنے کی کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کھائیں۔ آنکھیں بند کرکے کسی چیز پر ہاتھ رکھا۔ ویٹر نے گھونگے لاکر سامنے رکھدیئے۔ چنو پاشا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ابکائیاں آنے لگیں۔ بہت چکرائے۔ دوسری چیز پر ہاتھ رکھا۔ ویٹر نے ایک نہایت بڑی سینی میں ایک خلال کا تنکا لاکر سامنے رکھدیا۔ بل ادا کرکے اٹھ آئے۔ ایک چائے کی دوکان نظر آئی وہاں پر کیک اور چائے سے خوب پیٹ بھرلیا۔ سفر کی تکان نے ناکارا کردیا تھا۔ سیدھے ہوٹل آئے اور سوگئے۔

دوسرے روز چنو پاشا نے کچھ مشہور عمارتوں کا معائنہ کیا۔ شام کو مونا مارتر گئے۔ لیکن پورٹ سعید میں ایسا سبق حاصل کیا تھا کہ یہاں کے کسی ناچ اور رنگ میں حصہ نہ لیا۔ اور بہت جلد ہوٹل واپس ہوگئے۔ چنو پاشا نے قسم کھانے کے لئے کافی پیرس دیکھ لیا تھا۔

تیسرے روز لندن روانہ ہوگئے اور سیدھے شیکسپیئر ہٹ میں جاکر دم لیا۔

بہت سے بھوکے ہندوستانی طلباء نے ان کی وہاں آؤ بھگت کی کہ شاید چنو پاشا سے کچھ قرضہ ہی مل جائے۔ اگر قرضہ نہ ملا تو ممکن ہے کہ کم از کم ان کے ساتھ کھانا ہی نکل آئے۔ کئی ایک نے جو لندن تعلیم کی غرض سے آئے تھے لیکن آوارگی میں پڑگئے تھے چنو پاشا کو لندن کی سیر کرانے کا وعدہ کیا۔ افسوس کہ چنو پاشا کو لندن میں قدم رکھتے ہی ایسے آوارہ لوگوں کی صحبت ملی کہ ان کے تمام عظیم الشان ارادوں پر پانی پھرتا ہوا معلوم ہوا۔ چنو پاشا ہندوستان سے کوئی خاص ارادہ کرکے

لیس آئے تھے۔ پیرس میں ٹامس کک سے انگلستان کی یونیورسٹیوں کی بابت دریافت کیا تھا کہ کہاں جانا چاہیئے۔ باپ کا ارادہ تھا کہ اپنے اس اکلوتے اور سعادت مند گھر کے دیئے کو انجینیری پڑھائے۔

چنو پاشا کو اپنی ہندوستان میں کامیابی کا ناز تھا۔ یہ مڈل اور میٹرک پاس تھے۔ دو مرتبہ لندن یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے امتحان دیا لیکن ناکامیاب رہے۔ ایک سال اس میں گزر گیا۔ روپیہ اس قدر خرچ کیا کہ باپ کو شک ہو گیا کہ وہ لڑکے کو اور دو سال کیسے لندن میں تعلیم دے سکتا ہے۔ عجیب عجیب مضامین کے تار گھر آتے تھے۔ کبھی تو یہ کہ سردی غضب کی ہے گرم کپڑوں کی ضرورت ہے روپیہ بھیجو۔ کبھی تار آتا تھا کہ بیمار ہوں اسپتال میں بستر مرگ پر لیٹا ہوں روپیہ کی سخت ضرورت ہے کبھی اس کی خبر دی جاتی تھی کہ امتحان پاس کر لیا ہے بڑے درجے کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے۔ غرض کہ باپ نے اپنے اخراجات کو کاٹا، گھر میں تین وقت سے دو وقت کا کھانا ہونے لگا۔ چنو پاشا کی ناکامیابی نے اُن کو نہایت پست کر دیا تھا لندن یونیورسٹی چھوڑ کر کیمبرج پہنچے۔ ایک سال بعد وہاں داخلہ ہوا۔ چار سال بعد چنو پاشا بی اے (کینٹب) ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

اس عرصہ میں گھر پر مفلوک الحالی کی گھٹا چھا چکی تھی۔ ماں اور بیوی کا تمام زیور بک چکا تھا۔ باپ کی تھوڑی بہت جائداد چنو پاشا کی تعلیم کی نذر ہو چکی تھی۔ اب والدین اس اُمید میں تھے کہ بیٹے کو عمدہ تعلیم دلائی ہے۔ بیٹا خوب کما کما کر ہماری فاقہ مستی کو دُور کر کے خوش حال کرے گا۔ غرض کہ بیٹے کو اپنی پیری کا عصا سمجھ رکھا تھا۔ کسی کو اس بات کا علم نہ تھا کہ چنو پاشا کے تین بچے لندن میں پیدا ہو چکے ہیں۔ بی اے کی ڈگری کے قبل بی بی کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ روپیہ زیادہ خرچ ہونے کا بڑا راز یہی تھا ہندوستان واپس ہونے سے قبل باپ کو اس کی اطلاع دی تاکہ پورے خاندان کا سفر خرچ بھیجا جائے۔ گھر میں ماتم ہونے لگا کہ ہائے لڑکے نے میم کر لی ہے اور تین بچے ساتھ لا رہا ہے۔

سارے محلے میں آگ لگ گئی۔ گھر گھر میں اس پر گفتگو ہونے لگی۔ اب وہ دن بھی آ گیا کہ چنو پاشا مع بیوی اور بچوں کے وارد ہندوستان ہوئے۔

چنو پاشا کو شرم آتی تھی کہ اپنے باپ کی مشرقی تہذیب کے گھرانے میں کیسے میم صاحبہ کو ٹھیرائیں۔ نہ تو روپیہ ہی رہا کہ کسی انگریزی ہوٹل میں اُن کو پہنچا دیں۔ ہندوستانی گھروں میں میم صاحبہ کی ایسی آؤ بھگت ہوئی اور ان کو ایسا سر آنکھوں پر بٹھایا کہ واقعی یہ کچھ عرصہ نہایت ہی خوش رہیں۔ ان کو اس بات کا ایک عرصہ تک علم نہ ہونے دیا کہ ایک ہندوستانی بیوی بھی موجود ہیں۔ میم

صاحبہ کے آنے سے قبل ہندوستانی لڑکی اپنے میکے چلی گئی اور گھٹ گھٹ کر دق کے حوالہ ہوئی اور چل بسی۔ بیرسٹر اس قدر بھرے پڑے تھے کہ چنو پاشا کو نوکری نہ ملتی تھی کہ خود مختار ہو کر الگ مکان میں اور بیوی کی اس ناپائدار خوشی کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ چنو پاشا کو مغربی تہذیب نے بالکل بدل دیا تھا۔ پہلے ہی دن ایسی جگہ قدم رکھنے کی حاجت ہوئی جہاں سارا خاندان حاجت رفع کرتا ہے۔ مرغیوں کی غلاظت کو جگہ جگہ دیکھ کر اور مچھروں اور کھٹملوں سے اپنے آپ کو کٹوا کر میم صاحبہ الگ پریشان تھیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اس آزاد چڑیا کو اپنے ملک میں لا کر کنج قفس میں ڈال دیا۔ سخت پردہ کرانے لگے۔ بھلا ایسا شخص جس کی تربیت ہمیشہ مغربی اصول پر ہوئی ہو اپنی طبیعت کو کیسے بدل سکتا ہے۔ بیوی کی طبیعت گھٹنا شروع ہوئی لڑائی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ آخر کار وہ دن آیا کہ بیوی نے اپنے بچوں کو چھوڑا اور انگلستان بھاگ نکلیں۔ چنو پاشا کو اس عرصہ میں منصفی مل چکی تھی۔ آدھی تنخواہ کٹنے لگی۔ بیوی نے ہندوستان واپس آنے سے کان پکڑا۔ چنو پاشا کے والدین تفکرات اور مفلوک الحالی کے شکار ہوئے اور رخصت ہو گئے۔

محمد بابر مرزا

مقصدِ ہستی

جلوہ سازِ عالمِ ایجاد ہے نورِ وجود
کائناتِ دہر میں ہستی کی ہے شانِ نمود

کوندتی پھرتی ہے ذرہ ذرہ میں برقِ حیات
جس کی ضو سے جگمگا اٹھتی ہے بزمِ کائنات

پیکرِ ہستی میں ہے جلوہ نمائی روح کی
کارفرما ساری موجودات میں ہے زندگی

پھر بھی رازِ مقصدِ ہستی کو پا سکتے نہیں
دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن کچھ بتا سکتے نہیں

زندگی درمانِ دردِ دل بھی ہے آزار بھی
زندگی کا مرحلہ آساں بھی ہے دشوار بھی

کون سمجھے مقصدِ ہستی ہے ان بچوں کا کیا
کھلتے ہی آنکھیں حباب آسا جو ہوتے ہیں فنا

کون سمجھے کیوں کسی کو ناقص الاعضا کیا
کور مادر زاد کی خلقت کا کیا ہے مدعا

[illegible]

کیوں ہوا کرتا ہے دریاؤں میں ہیم مد و جزر — آسماں پر گھٹتا بڑھتا کیوں نظر آتا ہے بدر
کیوں چلا کرتی ہے صبحدم نسیم مشک بار — دوپہر کو خاک کا اُٹھتا ہے کیوں اکثر غبار
خاتمہ پر دن کے کیوں ہوتی ہے تاریکی عیاں — چشمۂ خورشید کیوں ہوتا ہے آنکھوں سے نہاں
رات دن گردش میں ہیں کس واسطے شمس و قمر — ہے دگرگوں رنگ کیوں عالم کا ہر شام و سحر
ابر و باراں کیوں بناتے ہیں زمیں کو لالہ زار — دھوپ کی تیزی سے کیوں اُٹھتا ہے پانی ابخرہ
کس لئے فصلوں میں تبدیلی کا ہوتا ہے اثر — کس لئے شاداب ہو کر خشک ہوتے ہیں شجر
تازگی کیوں دل کو دیتی ہے ہوائے مرغزار — کیوں خزاں کے بعد آتی ہے زمانہ میں بہار
اس تغیر کی بتائے کوئی آخر حد بھی ہے — زندگی کیا چیز ہے؟ اس کا کوئی مقصد بھی ہے

پیکرِ ہر ذرہ دورِ ارتقا میں ہے اسیر — ہر عمل کے بعد گو ردِّ عمل ہے ناگزیر
ایک حالت پر نظر آتا نہیں عالم کا رنگ — کیوں ہمیں ترغیب پھر دیتی ہے ہستی کی امنگ
گوہرِ مقصد بھی ہاتھ آیا تو کیا ہو جائے گا — جب سمجھتے ہیں کہ یہ عالم فنا ہو جائے گا
مقصدِ تخلیق کیا ہے حاصلِ ہستی ہے کیا — ارتقائے روح کیا ہے نفس کی پستی ہے کیا
نفس کی پستی سے دل رہتا ہے سرگرمِ فغاں — ارتقائے نفس سے ہوتی ہے راحت بے گماں
پھر یہ راحت طلب راحت کو کیوں ملتی نہیں — دل کی پژمردہ کلی پھر کس لئے کھلتی نہیں
ہوتا ہے ہر ہر قدم پر غم کا پھر کیوں سامنا — کس لئے رہتا نہیں دل رنج سے ناآشنا

اصل یہ ہے اپنا نصب العین ہی کوئی نہیں — ورنہ ہوتا بار آور نخلِ حسرت بالیقیں
جس کا مقصد روشنیٔ کعبۂ اُمید ہے — اس کی خاکِ دل کا ذرّہ ذرّہ اک خورشید ہے
روشنیٔ کعبۂ دل کیا ہے اک تسکینِ دل — جس سے ہو جاتے ہیں بالیدہ قوائے مضمحل

مقصدِ ہستی اسی بالیدگی کا نام ہے
اک سکونِ دائمی کا روح کو پیغام ہے

فرّخ بنارسی

درسِ عبرت

اور

میر محمد تقی میرؔ دہلوی

هستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اِس ہی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

میرؔ

شعرائے مشرق میں جس قدر شیخ شیرازؔ نے عبرت آموز اشعار لکھے ہیں شاید ہی اس کا مقابلہ کسی دوسرے شاعر سے ہو سکے
اُردو زبان میں میرؔ صاحب کا کلام بھی عبرت آموز کہا جا سکتا ہے۔ مگر اندازِ بیان میں ناصحِ شیراز کی سی موعظت نہیں۔ میر صاحب
کا کلام تو زیادہ تر تاثرات پر مبنی ہے اور خود ان کے قلب کا ترجمان ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دل پر اثر ڈالنے والا کیف خلوص تو
سی وقت ممکن ہے جب دل میں درد ہو۔ صاحبِ درد کی ہر آہ بوئے گل کی طرح شامہ نواز ہو اور ہر نالہ نوائے بلبل کی
طرح سامعہ فریب ہو غرض شاعر کا ہر شعر کیفِ مسرت کا حامل ہو۔ اور حقیقی کیفِ مسرت بغیر جذبات غم کے ممکن نہیں، اس لئے
غم و حرماں کی آمیزش لازمی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کیفِ حرماں اور اُداسی و مایوسی پیدا کرنے والے جذبات دورِ جدید کی معاشرت کے لئے
سمِ قاتل سے کم مہلک نہیں۔ مگر وہ اُداسی اور مایوسی جس میں افادیت پنہاں ہو نظرانداز کرنا مناسب نہیں۔ گو یہ ظاہر ہے
کہ جذباتِ لطیف میں محو ہونے والے انسان کو اس دور میں خود اپنے مفاد کی بہت کم امید رکھنا چاہئے۔ اس لئے اگر
خدا اپنے بندوں کو غم و اندوہ سے محفوظ ہی رکھے تو اچھا، مگر بقول میر صاحب ع

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم

انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ اس کا دل فطرۃً معمورۂ حزن و ملال واقع ہوا ہے اور اگرچہ حیاتِ دنیوی میں

حاصل نہیں اور کیوں ہو قدرت نے تو انسان کے خمیر میں امید کی مسرت سے کہیں زیادہ کیفِ مایوسی کا جذبہ رکھا ہے۔
بقول شیلی (Shelley) "ہمارے سب سے زیادہ سامعہ نواز نغمے وہی ہیں جو دُکھے ہوئے دلوں کی ترجمانی کریں" لیکن اگر غم سے تکلیف پہونچے تو اُس میں کیفیت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ کیفیت کلفت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انتہا ہر چیز کی بُری ہے۔ ضرورت تو صرف اعتدال کی ہے خواہ خوشی ہو خواہ غم، اور یہی اعتدال معاشرت کی جان ہے شبِ تار اور نصف النہار کا اعتدال صبح ہے، نصف النہار اور شبِ تار کا اعتدال شام ہے۔ اسی طرح خوشی و غم کا باہم معتدل ہونا بھی سمجھنا چاہیئے۔ پیغمبر اسلام نے تو ہر کام کا دستور العمل اعتدال ہی کو قرار دیا ہے اور یہی اجتماعِ اضداد میں "وسطِ زریں" ہو سکتا ہے۔ غرض تکلیف و راحت اعتدال ہی سے ذریعۂ مسرت ہیں اور یہ کہ دونوں کے ہم آہنگ ہونے میں ایک قسم کی کیفیت ہے۔ ایک فرنچ محقق[۵۲] نے کیا خوب لکھا ہے:

"راحت و تکلیف جو بذاتِ خود اس قدر مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ علت اور سبب کے اعتبار سے اس قدر مختلف نہیں۔ گدگدانے کی مثال سے ظاہر ہے کہ اگر خوشی پیدا کرنے والی حرکات دور تک جاری جائیں تو وہی باعث تکلیف ہو جائیں گی اور یہ کہ تکلیف دینے والے جذبات اگر اعتدال پر قائم رکھے جائیں تو وہی ذریعۂ مسرت ہوں گے"۔[۵۲] بمصداق ع

"اک لحن بھی پنہاں ہو اشکوں کی روانی میں"

الغرض حقیقی کیفِ مسرت ہلکے سے غم اور دھیمی سی خوشی ہی میں پایا گیا ہے اس لئے جذبات میں تاثیر بھی اُسی وقت ممکن ہے۔ جب راحت و تکلیف شیر و شکر ہو کر اُن کو جذباتِ لطیف بنا دیں۔

خوشی اور غم ہی پر انسان کے تمام جذبات کا انحصار ہے۔ ان میں سے بعض تو بذاتِ خود انتہائی حالت رکھتے ہیں بعض معتدل ہیں۔ جو معتدل ہیں وہ ہمیشہ دو متضاد کیفیتوں سے مرکب ہوں گے مثلاً عبرت جس میں مسرت کا شائبہ تک نہیں مگر اطمینان ضرور ہے۔ ایسا اطمینان جس کو نہ تو سکون کہہ سکتے ہیں نہ راحت بلکہ ایک ایسی کیفیت جو اصلاحِ قلب کا ذریعہ ہوتے ہوئے ہمدردی اور ترحم کے جذبات کو بھی اُکسا دے۔ یعنی جس چیز سے ہم کو عبرت حاصل ہو اس پر ہم ترس کھانے لگیں اور یہ کہ جو واقعہ عبرت کا باعث ہو اُس سے ہم سبق حاصل کر سکیں اور ہم پر اُس کا رُعب طاری ہو جائے۔

---

[۵۲] Fontenelle (Reflexions sur la poetique)

جس طرح کیفِ غم کا وجود امید و بیم کی آمیزش سے ہے اُسی طرح عبرت کو بھی نفرت اور ترحم، خوف اور اطمینان کی نمایت
لطیف کیفیتوں سے مرکب سمجھنا چاہئے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ عبرت میں افادیت سے متعلق ایک اجتنابی پہلو بھی شامل ہے
ن کو "سبق" حاصل کرنا کہتے ہیں یعنی عبرت پیدا کرنے والے واقعات سے ہم کو ایک یقینی بات معلوم ہو جاتی ہے اس لئے
ہ بات جس کو ہم "اوہو" کہکر ٹال جایا کرتے تھے۔ ایک اٹل مستقل اور یقینی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہو جاتی ہے اور
جہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی غفلت اور لاپرواہی پر نادم ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ افسوس کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح ہم غفلت سے اجتناب
تے ہیں اور اُن باتوں سے جو غفلت کا باعث ہو سکتی ہیں کشیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی عبرت ہے۔ اگر جذبۂ عبرت کی دو
یتوں یعنی نفرت اور ترحم میں سے نفرت اعتدال سے متجاوز ہو کر انتہائی مدارج تک پہنچ جائے تو مرعوب کرنے والا خوف
ا ہوگا۔ اگر ترحم اس انتہا کو پہنچے تو تکلیف دہ غم ہو جائے گا۔ اس طرح عبرت میں اجتناب و ترحم کے ساتھ ایک قسم کا رعب
ر اُداس کن جذبہ بھی شامل ہے۔ اور چونکہ "رعب" میں تعظیم و خوف دونوں کو دخل ہے اور "غم" کسی دل پسند، مرغوب
وب یا پیارے جذبہ اور اس کے ذرائع سے محرومی کا نام ہے۔ اس لئے عبرت میں رُعب، بڑائی، تعظیم، تعجب، ترس
اور محبت وغیرہ کی کیفیات کو بھی شامل سمجھنا چاہئے۔

عبرت کی نمایاں مثال دُنیا اور اُس سے متعلق اشیاء کی بے ثباتی ہے۔ کسی کمال کا ایکا ایکی زوال پذیر ہونا۔ کسی
ل کا مبدل بہ غم ہونا — بے عزتی، رسوائی، حرماں نصیبی اور تباہی و بربادی کی ایسی ہی دوسری صورتیں جو واقعات
ذریعہ سے ظاہر ہوں عبرت کی مثالیں ہیں۔ شاعر ایسی ہی مثالوں کو طرزِ ادا کی مختلف نوعیتوں کے ساتھ ظاہر کر کے
بات انسانی کی تنقید" اور جذبات قلب کی تفسیر اپنے دلفریب تنوع کے ساتھ ظاہر کرتا ہے اور یہ دلفریب تنوع
قی شاعروں میں زیادہ تر یاس و حرماں پر مبنی ہے مگر اس میں طنز بھی شامل ہو سکتا ہے اور ظرافت بھی۔ مثلاً شیخ شیرازی
شعر ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

یا اکبر الٰہ آبادی کا یہ مشہور شعر ؎

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

دونوں اشعار ظرافت کا پہلو لئے ہوئے ہیں مگر حیاتِ انسانی کی اچھی خاصی تنقید بھی ہیں اور اُن سے عبرت کا ہی سبق نکلتا ہے۔

غرض اس قسم کی مثالیں مولانا شہباز اور مولانا شبلی کی نظموں اور اکبر الہ آبادی کی غزلوں میں بکثرت ہیں مگر یہاں ہم میر کے اندازِ بیان پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ میر صاحب کا عبرت آموز کلام زیادہ تر یاس و حرماں ظاہر کرنے والے جذبات پر مبنی ہے حتیٰ کہ ان کی ظرافت میں بھی بجائے طنز کے شکایات کا پہلو زیادہ نمایاں نظر آئے گا اور گو طنز بھی شکایت کا دوسرا نام ہے مگر اس میں جذباتِ لطیف کو دخل نہیں۔ شکایت میں یہ بھی ممکن ہے۔ مثلاً ؎

کیا کروں شرح خستہ جانی کی

میں نے مر مر کے زندگانی کی

وہ مثالیں جن سے میر صاحب نے عبرت آمیز نصائح کئے ہیں ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔
دنیا کی بے ثباتی، ہر کمالے را زوال، انسان کی موت، یادِ رفتگاں اور زمانہ کی ستم ظریفی۔ غرض اسی طرح کی دوسری باتیں درسِ عبرت کا باعث ہیں اور دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں نے ان پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مثالوں کو ایک ایک کرکے دیکھنا چاہئے۔

(۱) دنیا کی بے ثباتی

ہر زبان کی لٹریچر میں دنیا محض خواب و خیال مانی گئی ہے۔ بڑے بڑے فلسفی مانتے ہوئے ہیں کہ نمودِ عالم خواب سے زیادہ نہیں۔ خود شکسپیر کے نزدیک دنیا ایک Empty Dream ہے۔ ایک جادوگر کی زبان سے شکسپیر کیا ہی خوبصورتی کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی ثابت کرتا ہے۔

"غرض ہماری رنگ رلیاں ختم ہوتی ہیں۔ یہ ہمارے ایکٹر جیسا کہ میں نے تم سے پیشتر کہا سب عالمِ ارواح سے آئے تھے (تماشا ہو جانے پر) سب ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ اور جس طرح دھواں ساکن ہوا میں حل ہو کر غائب ہو جاتا ہے (سب) غائب ہو گئے۔ ہماری زندگی اور اس دنیا کا وجود بھی منظرِ خواب کی طرح ہے۔ یہ بڑے بڑے منارے، عالی شان محل، رعب و جبروت والے عبادت خانے، اور خود یہ کرۂ زمین اور سب جو کچھ ہیں حاصل ہے اسی طرح وجود سے عدم میں تحلیل ہو جائے گا۔ اور اس فنا ہو جانے والے سین کی طرح کچھ باقی نہ بچے گا۔ ہمارا وجود محض ایک خواب کا سا ہے۔ اور ہماری اس مختصر سی زندگی کو ایک نیند

احاطہ کئے ہوئے ہے۔"[۵۱]

یہی وہ خیالات ہیں جن کو غالب نے "حلقۂ دامِ خیال" سے تعبیر کیا۔ اور جن پر میر نے متعدد اشعار لکھے مثلاً ؎

۱ بودِ آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں پس ہوا ہے یہ

۲ عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے — کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

۳ کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا — خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

۴ آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اور چوں کہ اندازِ بیان سے ہی شاعرانہ آن بان کا ظہور ہوتا ہے اس لئے ہم یہ دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جن خیالات کو شکسپیر نے ایک طویل عبارت میں ظاہر کیا ہے میر صاحب نے محض ایک شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کر دیا ؎

کہا میں نے گُل کا ہے کتنا ثبات

کلی نے یہ سُنکر تبسم کیا

غالب اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں کہ زندگی موت کی دلیل ہے۔[۵۲] لیکن میر نے کیا ہی کیفیت بھرے انداز میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر

دیکھو تو انتظار سا ہے ایک

اس شعر کو خواہ بہ اعتبارِ فلسفہ دیکھا جائے خواہ جذبات کے تحت میں اس کو درسِ عبرت کہا جائے نزاکتِ خیال کی مثال اس سے بڑھ کر ذرا مشکل سے ملے گی اور بقول علامہ ابن خلدون اس قسم کے خیالات کا کامیابی کے ساتھ الفاظ میں ظاہر کرنا ہی کمالِ شاعری ہے۔

(۲) کمال و زوال

"ہر کمالے را زوال" ——— عبرت سے متعلق ایک عام کہاوت ہے۔ ایسی کوئی زبان نہیں جس میں ایسا ہی مفہوم رکھنے والی کوئی نہ کوئی مثل مشہور نہ ہو۔ ایک انگریز شاعر گورستانِ شاہی میں قبروں کو دیکھ کر

---

[۵۱] The Tempest. Act IV Scene I [۵۲] غالب۔ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

"خاک کے نیچے یہاں وہ دبے ہوئے ہیں جو اقالیم و سلطنت کے مالک تھے۔ اب وہ اپنا ہاتھ تک نہیں ہلا سکتے۔ دیکھو لوحِ مزار کے منبر سے وہ یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ :-

جاہ و ثروت کا کوئی اعتبار نہیں"

اور ہماری زبان میں خود ہمارے مایۂ ناز شاعر اقبالؔ نے لکھا ہے[2] ؎

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل | جن کی تدبیرِ جہاں بانی سے ڈرتا تھا زوال
رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری | ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

واقعی دنیا "اجتماعِ اضداد" ہے۔ کوئی ابتدا ایسی نہیں جس میں اس کی انتہا نہ موجود ہو۔ اس انتہا پر غور کرنا ہی سے عبرت حاصل کرنا ہے۔ اور اس طرح غور کرنے پر اظہارِ تاسف کا باعث کسی بادشاہ کی موت، کسی سلطنت کی تباہی یا کسی بڑے شہر کا ویران ہونا ہے۔ میرؔ صاحب نے بھی دہلی کی عظمت کا مرثیہ اکثر اشعار میں لکھا۔ اور درد بھرے دل سے لکھا

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب | رہتے تھے منتخب ہی وہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا | ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

وہ دلی جس کے کوچے اوراقِ مصور[3] تھے اس کو انقلابِ حکومت، زوالِ سلطنت ایک اجنبی قوم کی زبردستیوں اور سے مزانے ظلم و ستم کے طریقوں نے بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اسی تباہی کو میرؔ صاحب نے ذیل کے پُر تاثیر اور عبرت آموز شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

۱۔ F. Beaumont

۲۔ گورستانِ شاہی

۳۔ میرؔ — دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے | جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شہروں اور بادشاہوں کی عظمت کے زوال پر ہمیشہ حسرت روتی رہی اور روئے گی مگر قومیں بھی جن کی بہار رفتہ کی تصویر "ہے اپنے عروج کے اعتبار سے وابستۂ زوال ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں   دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں

آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی "شام" نے   عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے

آہ مسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا

آسماں سے ابرِ آزاری اٹھا، برسا، گیا ؎

(۳) و (۴) یادِ رفتگاں اور افراد کی موت

جب اقوام کی یہ حالت ہو تو افراد کا کیا ٹھکانا۔ بقول شکسپیر[۲]: "آرام کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا۔"

ہم کو تو قبر اور لوحِ مزار کی باتیں کرنا چاہئیں۔ خاک پر آنسو بہانے والی آنکھ سے داستانِ غم لکھنا چاہئے۔ آؤ وصیت کا ارادہ اور وارثوں کی فکر کریں۔ یہ بھی نہیں کیونکہ ہم ترکہ میں چھوڑ ہی کیا سکتے ہیں۔ سوا اس کے ہمارا معزول کیا ہوا جسم سپردِ خاک کر دیا جائے۔

مگر میر صاحب نے تو اس سے بھی بڑھ کر کچھ کہا ہے اور وہ یہ کہ ؎

پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا

کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

اسی لئے آپ نے بطورِ درسِ عبرت کیا ہی پیارے انداز میں میانہ روی کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

یہ میانہ روی کی تاکید اس آیۂ پاک کی تفسیر بھی ہو سکتی جس کا مفہوم یہ ہے کہ

زمین پر خود کو لئے ہوئے نہ چلو کیونکہ ؎

نہ زمیں کو چیر سکو گے تم   نہ پہاڑ کو توڑ سکو گے تم

یہی وہ درسِ اخلاق ہے جو فلسفۂ عبرت میں پنہاں ہے اور چوں کہ عبرت حاصل کرنا کسی نہ کسی سبق آموز بات سے آگاہ ہونا ہے اس لئے عبرت کو بھی " Ethics " اور اخلاق کے تحت میں لایا جا سکتا ہے۔

(۵) زمانہ کی ستم ظریفی غرض عبرت حاصل کرنا گویا میانہ روی پر کاربند ہونا ہے۔ میانہ روی پر کاربند ہونا کیا ہے؟ "اس عالمِ فانی کو ہنس ہنس کے نبھا جانا" یعنی زمانہ کی ستم ظریفی کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرنا۔ اگر بقول حافظ شیراز ع

" ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند است " تو ہم کو قند و گلاب کی تمنا میں ابلہ بن جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو تو خشک روٹی پر اپنی وضع قائم رکھنا چاہیئے۔ بقول عرفی ع ہمت نخورد نشتر لا و نعم را " اور جہاں تک خودداری اور وضعداری کو دخل ہے میر صاحب غالب تو کیا عرفی سے بھی کم نہ تھے۔ رہا دنیا کی ستم ظریفی کا شکوہ۔ اس سے تو کوئی فرد بشر بچا نہیں۔ اس لئے میر صاحب نے بھی کہا کہ ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

یعنی کبھی ہم بھی کسی گلستاں کے پھول تھے مگر اب ہماری یہ حالت ہوئی کہ تم ہم پر ہنستے ہو۔

(۶) عبرت اور اخلاق المختصر میر صاحب کا درس عبرت نہ تو حیاتِ دنیا کو برتنے کا منافی ہے نہ بالکل اُداس جذبات یعنی حرمان و مایوسی پر مبنی ہے۔ اس میں اخلاق کی نورانیت اور موعظت کی روشنی موجود ہے اگر کہیں کہیں اضمحلال و بیم کا دخل ہے بھی تو وہ افادیت سے خالی نہیں۔ ان کے عبرت آموز اشعار سے ہم اسی طرح استفادہ حاصل کر سکتے ہیں جس طرح شاگرد استاد سے میر صاحب کے اخلاق سے متعلق اشعار ہمارے اخلاق کی درستی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا دار المحن ہے، تاہم میر صاحب یہ نہیں کہتے کہ رنج و مصیبت کا رونا ہی رویا کرو بلکہ کیا ہی پیارے انداز میں ایک بے تکلف دوست کی طرح کہتے ہیں کہ ؎

یارو دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

اور یہ کہ دنیا کی بے ثباتی خواہ مخواہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اعتدال اور میانہ روی کو برقرار رکھیں یعنی ؎

حافظ شیراز کی طرح میر صاحب بھی "ظلم" کے دشمن تھے اور سچ تو یہ ہے کہ ظالموں اور محبت والے دلوں میں آگ اور
پانی کا سا تضاد ہے۔ اس لئے میر صاحب نے کہا ہے کہ ؎

اور جو چاہے کیجیو پیارے ایک ہو جیو نہ درپے آزار

اور یہ کہ ؎ ڈر ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی۔

میر صاحب تو اپنے سچے دل سے ہر ایک کو مصداق آیۂ کریمہ " وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا "
یہی مشورہ دیتے ہیں کہ ؎

معیشت ہم فقیروں کی سی اپنائے زماں سے رکھ
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہو گا

درس عبرت اور مفہوم "عبرت" کو مدنظر رکھ کے کیا ہی مخلصانہ انداز میں نصیحت کی ہے کہ ؎

سب سے مل جل کہ حادثہ ہے پھر کہیں ڈھونڈھا بھی تو نہ پائے گا

اس لفظ "حادثہ" میں تو عبرت کا مفہوم کوٹ کوٹ کر بھر دیا گیا ہے انسان اس شعر پہ غور کر سکتا ہے اور ڈر سکتا ہے
اس کو سمجھ سکتا ہے اور خوف سے کانپ سکتا ہے۔ اس سے نتائج اخذ کر سکتا ہے اور ٹھرا سکتا ہے۔ وہ میر صاحب ہی کا دل
تھا جس نے اس کو محسوس کیا اور صرف انھیں کی زبان اس کو ظاہر بھی کر سکی۔

میر صاحب کی بے نفسی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ کسی کی رسوائی دیکھ نہ سکتے تھے۔ ان کے نزدیک
انسان کی بدبختی اور تباہی خود اپنے اعمال سے ہے۔ کوئی دوسرا اس کا ذمہ دار نہیں اس لئے اپنے اخلاق کی اصلاح ضروری
ہے۔ ہر کسی کا شکوہ کرنا مناسب نہیں ؎

اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے
کس کو لے مریئے میاں اور کس کو تہمت دیجئے

ظلم سے عداوت کی طرح غرور سے بھی میر صاحب کو حقیقی بغض تھا۔ ان کے زیادہ تر اشعار "شکست پندار" کے حامی
ہیں۔ مثلاً ؎

... آرزو آخر جواں مارا گیا

اگر عروج حاصل کرنا ہے تو ؎

بسانِ خاک ہو پامالِ راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

اس لئے لازم ہے کہ ہر قدم پر سوچ سمجھ کر چلیں کیونکہ "دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا" یہی نصیحت ان اشعار سے
بھی ظاہر ہے یعنی ؎

سرسری مت جہاں سے جا غافل   پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
ہونٹھ اپنا ہلا نہ سمجھے بن   یعنی جب کھولے تو زباں ٹک سوچ

اور اس قسم کے اکثر اشعار لکھے ہیں ؎

ہر مشتِ خاک یاں کی چاہے ہے کچھ تامل   بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

غرض میر صاحب نے اپنے تاثیر سے بھرے ہوئے اشعار میں اپنے دردِ دل کو سنایا۔ اگر اُن پر غور کیا جائے تو وہ
صلاحِ معاشرت کا باعث ہوں گے۔ ان سے اخلاقِ صحیح کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ انسان کے دل میں محبت ہمدردی
ر مہربانی کے خصائل پیدا کریں گے۔ اور اگر ان کو پرانے لوگوں کی گفتگو سمجھ کر ٹال دیا گیا تو گویا ایک ناصحِ مشفق کی نصیحتوں
پر پشت ڈال دیا گیا۔

المختصر عبرت کسی نہ کسی پُر تاثیر مثال سے خوف، رُعب۔ ترس اور ہمدردی کے جذبات اُکساتی ہے۔ حسن و جمال
ن و شوکت اور عیش و مسرت سب اس کی وجہ سے وابستۂ کیفِ غم ہو جاتے ہیں۔ دولت کو کتنا ہی اطمینان بخش کیوں نہ
ھا جائے، درسِ عبرت کی ذرا سی جھلک سے اس کی وقعت جاتی رہتی ہے۔ قوت کتنی ہی زبردست کیوں نہ مانی جائے
رت کی ایک معمولی سی مثال سے ثابت ہو سکتا ہے کہ مورِ مسکین نے فیلِ مست کو پیوندِ خاک کر دیا۔ حُسن کتنا ہی عالم فریب
ہو مگر عبرت کا ایک ذرا سا اشارہ شکستِ ناز کا باعث ہو سکتا ہے۔ عبرت رُلاتی بھی ہے ڈراتی بھی۔ سمجھاتی بھی ہے
ہمارے دل میں جذباتِ ترحم و محبت بھی پیدا کرتی ہے۔ اگر عبرت نہ ہو تو دُنیا سے ہمدردی اُٹھ جائے، محبت کا نشان
انند ہے۔ عبرت شوکت و شان کو اعتدال پر رکھتی ہے، ہر غصہ کو بجھانے والی، ہر عیب کو چھپانے والی، ہر تقصیر کو معاف کرانے
امن و امان والے دلوں کی حکمراں اور جوشیلے قلوب کی اتالیق ہے۔ کون ایسا ہے جو قبرستان سے گزرتے ہوئے

ساز حسرت کی اس دھیمی سی نوا کو نہ سُنے کہ سہ

یہاں لاکھوں حسین خوابِ عدم میں سو رہے ہوں گے
یہاں اُن کے سُنہرے بال مٹی ہو گئے ہوں گے

کون ایسا ہے جو دشمن کی وفات سے عبرت حاصل نہ کرے۔ اور اس کی میت کو دیکھ کر ترحم پیدا کرنے والے احساس کے ساتھ یہ نہ کہے کہ "آہ میں اس مشتِ خاک سے لڑا تھا!" اگر انسان میں عقلِ صحیح ہے، اگر واقعی دنیا میں وہ خود کو مسافر سمجھتا ہے، اگر اس کے دل میں درد ہے اور اس کو خدا سے لاگ ہے تو اپنے ہم جنسوں کی تکلیف نہ دیکھ سکے گا اور وہ صحیح معنی میں درسِ عبرت سے سبق لے چکا ہے تو اس کو کسی بے زبان جاندار کی تکلیف بھی گوارا نہ ہوگی چہ جائیکہ انسان۔

سید مقبول حسین

غزل

کیا نظر سوز ہے جلوہ تری رعنائی کا
جل اٹھا دامنِ نظارہ تماشائی کا

جلوہ محسوسِ نظر ہو تری زیبائی کا
پردہ اُٹھ جائے اگر چشمِ تماشائی کا

خلوتِ خاص کہاں جلوہ گہِ عام کہاں
کھینچ لایا انھیں شوق انجمن آرائی کا

اللہ اللہ ترے جلوے کی حیرت اثری
نہ تماشے کا پتہ ہے نہ تماشائی کا

صدقے اے مشقِ تصور تری رنگینی کے
خلد نظارہ ہے گوشہ مری تنہائی کا

شوخیٔ برقِ تجلی کی حقیقت معلوم
اک کرشمہ ہے ترے نازِ خود آرائی کا

ہر طرف جلوہ گہہِ ناز میں چھایا ہے ضیاؔ
عکس ذوقِ نظرِ چشمِ تماشائی کا

ضیا۔ بدایونی

رباعیاتِ قتیلؔ

آنکھیں ہیں چڑھی ہاتھ میں پیمانہ ہے   ہر گام پہ اک لغزشِ مستانہ ہے
ساقی پہ نظر زباں پہ تکرارِ عطش   کوثر کا مقام ہے کہ میخانہ ہے

ساغر ہے، سبو ہے، دورِ پیمانہ ہے   ہر چار طرف جلوۂ مستانہ ہے
شیشوں میں اُتر پڑی ہیں پریاں ساقی   یا یہ کہ پرستان میں میخانہ ہے

غنچوں کی طرح کبھی کھلائے گا مجھے   پھولوں کی طرح کبھی ہنسائے گا مجھے
میں موجۂ بوئے گُل ہوں اے عہدِ بہار   نکلا جو چمن سے پھر نہ پائے گا مجھے

جلوہ کبھی حُسن کا دکھائے گا مجھے   ساغر کبھی وصل کا پلائے گا مجھے
بھیگے شبِ عمر اب کہاں تک اے غم   شبنم ہوں کہ رات بھر رلائے گا مجھے

کیفیتِ ایامِ بہاری نہ گئی   اور مستیِ خوش گوار اُتاری نہ گئی
ہے زیرِ لحد بھی یادِ چشمِ میگوں   ہم مٹ بھی گئے تو مے گساری نہ گئی

لبریز سبوئے عمر کر ڈالے گی   کیفیتِ چشمِ یار بھر ڈالے گی
اُڑ جانے پہ آئے گا اگر طائرِ دل   مقراضِ نگاہ پر کتر ڈالے گی

قتیل دانا پوری

طامان

طامان روس کے ساحل پر سب سے ذلیل قصبہ ہے - ایک تو وہاں بھوک سے مرتے مرتے بچا؛ دوسرے مجھے ڈبونے کی کوشش کی گئی - میں وہاں رات گئے ڈاک گاڑی سے پہنچا - قصبے کے پھاٹک کے قریب جو پہلا پختہ مکان ملا اُس کے سامنے کوچوان نے اپنے تھکے ہوئے گھوڑوں کو روکا - چوکیدار نے گھنٹیوں کی آواز سُن کر اُکھڑی نیند بھری آواز سے پکارا ' کون ہے ؟ ' ایک فوجی افسر اور ایک اردلی باہر آئے - میں نے انھیں سمجھایا کہ میں افسر ہوں اور فوجی کام سے سرحد پر جا رہا ہوں اور اُن سے قیام گاہ کا پتہ پوچھا - اردلی میرے ساتھ مکان ڈھونڈنے چلا - کسی مکان میں جگہ نہیں تھی - ٹھنڈی رات تھی ، میں تین راتوں سے نہیں سویا تھا اور تھکا ہوا تھا - آخر مجھے غصہ آگیا اور میں نے جھلا کر کہا ' بدمعاش ، چاہے جہنم میں لے چل ، مگر کہیں سے مکان ڈھونڈھ کر دے ! ' اردلی نے گُدّی کھجا کر کہا ' ابھی ایک جگہ باقی ہے مگر وہ حضور کو پسند نہیں آئے گی - وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے ' اُس کے آخری جملے کا مطلب میں نہیں سمجھا - میں نے کہا ' اچھا ' وہیں لے چل - غلیظ گلیوں میں دیر تک چکر کھانے کے بعد ہم ساحل کے قریب ایک جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر رُکے -

چودھویں کا چاند میرے نئے مسکن کے سرکنڈوں کی چھت اور سفید دیواروں پر روشنی ڈال رہا تھا - صحن کے چاروں طرف کُھردرے گول پتھروں کی ایک دیوار تھی - بیچ میں ایک طرف کو جھکی ہوئی ، پہلی جھونپڑی سے پرانی اور چھوٹی ، ایک اور جھونپڑی تھی - اس کی دیوار سے بالکل ملی ہوئی ایک چٹان چلی گئی تھی نیچے چڑھی ہوئی لہریں متواتر موجیں مار رہی تھیں - چاند اپنے بے تاب ، مطیع عنصر کو اوپر سے دیکھ رہا تھا - چاندنی میں کنارے سے لگی ہوئی مجھے دو کشتیاں نظر آئیں - جن کی کالی رسیاں ، ساکن مکڑی کے جالے کی طرح اُفق کی مدھم روشنی میں جھلک رہی تھیں - میں نے اپنے دل میں کہا ' جہاز موجود ہیں - کل گلینزنک روانہ ہوجاؤں گا '

ایک فوجی قفقازی اردلی کے طور پر میرے ساتھ تھا - اُس سے کہہ کر سامان اُتارے اور گاڑی والے کو چکادے ، میں نے مالک مکان کو آواز دی - کوئی جواب نہیں ملا - کھٹکھٹایا - پھر جواب ندارد - کیا بات ہے ...

آخر کوئی چودہ برس کا ایک لڑکا دروازے میں سے نکلا۔

'مالک مکان کون ہے؟'

'کوئی مالک نہیں ہے۔'

'کوئی مالک نہیں ہے؟'

'کوئی نہیں۔'

'اچھا تو گھر والی؟'

'گاؤں گئی ہوئی ہے۔'

دروازے پر لات مار کر میں نے کہا 'میرے لئے دروازہ کون کھولے گا؟' دروازہ خود بخود کھل گیا۔ جھونپڑی پر سے سیل کی بو آئی۔ میں نے گندھک کی دیا سلائی جلائی اور لڑکے کی ناک کے پاس لے گیا، روشنی دو سفید پتلیوں پر پڑی۔ وہ بالکل اندھا، مادر زاد اندھا تھا۔ میرے سامنے بت بنا کھڑا تھا۔ میں نے اُس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

ایسے لوگوں کی طرف سے جو اندھے، لنگڑے، لولے، بہرے، گونگے، کبڑے ہوں یا جن میں کسی اور قسم کا جسمانی نقص ہو، میرے دل میں ایک خاص تعصب ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جسم اور روح میں ایک خاص قسم کا رشتہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی عضو یا حس کے کم ہونے سے روح کی ذکاوت احساس کو صدمہ پہنچتا ہے۔

چنانچہ میں نے اندھے لڑکے کا چہرا غور سے دیکھا؛ مگر جس چہرے پر آنکھیں نہ ہوں، وہاں دیکھنے کو کیا رکھا ہے! پھر تک رحم کے جذبے سے بے اختیار ہو کر اُسے دیکھتا رہا۔ یکایک اُس کے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی؛ معلوم نہیں کیوں مجھ پر اُس کا سخت ناگوار اثر پڑا۔ میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ یہ اندھا لڑکا اتنا اندھا نہیں ہے جتنا دکھائی دیتا ہے۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ موتیا بند کی نقل نہیں اُتاری جا سکتی، اور نہ ایسا کرنے کی کوئی وجہ نظر آتی تھی۔ مگر شبہ میرے دل سے نہیں نکلا۔ میں اکثر تعصب سے مغلوب ہو جاتا ہوں۔

آخر میں نے اُس سے پوچھا 'تم گھر والی کے بیٹے ہو؟'

'نہیں۔'

'پھر کون ہو؟'

'ایک بیچارہ یتیم۔'

'گھر والی کے بچے ہیں؟'

'نہیں۔ ایک لڑکی تھی، وہ ایک تاتاری کے ساتھ سمندر پر چلی گئی۔'

'کیسا تاتاری؟'

'خدا جانے۔ کریمیا کا، کرچ کا ایک ملّاح۔'

میں جھونپڑی میں داخل ہوا، اندر کل یہ سامان تھا: دو بنچ، ایک میز، ایک زبردست ٹرنک جو چولھے کے پاس رکھا تھا، دیواروں پر ایک بھی مقدس مورت نہیں تھی۔ یہ بُری فال تھی۔ ٹوٹی ہوئی کھڑکی میں سے سمندر کی ہوا آتی تھی۔ میں نے اپنے بیگ میں سے ایک موم بتی کا بچا ہوا ٹکڑا نکالا۔ اُسے جلایا اور اپنی چیزیں قرینے سے رکھنے لگا۔ تلوار اور بندوق کمرے کے کونے میں اور پستولیں میز پر رکھ دیں۔ چادر ایک بنچ پر پھیلادی؛ دوسری بنچ پر میرے اردلی نے اپنی چادر بچھالی۔ دس منٹ نہیں گزرے تھے کہ وہ خراٹے لینے لگا۔ مگر مجھے نیند نہیں آئی؛ سفید دیدوں والا لڑکا برابر گھر بڑ کرتا رہا۔

اس طرح کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ چاندی روشنی کھڑکی میں سے آرہی تھی اور اس کی شعاعیں جھونپڑی کے کچّے فرش پر پڑ رہی تھیں۔ یکایک روشنی پر سے ایک سایہ گزرا۔ میں اُٹھ بیٹھا اور کھڑکی میں سے جھانکنے لگا۔ کوئی چیز دوبارہ دوڑی، اور خدا جانے کہاں غائب ہوگئی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ کوئی سلامی دار چٹانوں پر سے اُترا ہو۔ لیکن اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا، قمیص پہنا، کمر خنجر سے باندھا اور چپکے سے جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اندھا لڑکا میری طرف آیا۔ اُس کی بغل میں ایک بڑی گٹھری تھی۔ میں دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ اور وہ احتیاط سے مضبوط قدم رکھتا ہوا گزر گیا اور گھاٹ کی طرف رُخ کر کے تپلی دشوار گزار پگ ڈنڈی سے نیچے اُترنے لگا۔ میں نے دل میں کہا 'پھر اندھوں کو دکھائی دینے لگے گا اور گونگے گانے لگیں گے'، کچھ فاصلے سے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور اُسے نظر میں رکھا۔

چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا اور سمندر پر کُہر چھا گیا تھا؛ کُہر میں سب سے پاس والے جہاز کے پچھلے حصّے کی روشنی دھیمی دھیمی ساحل کی طرف آرہی تھی۔ موجوں کا کف جگمگا رہا تھا اور جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ بہ مشکل ترچھی پگ ڈنڈی سے نیچے اُترا۔ جب زمین پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ اندھا لڑکا ساحل سے ریت پر پہنچ کر رُکا اور دائیں ہاتھ کو مڑا۔ وہ پانی کے اتنے قریب جارہا تھا کہ خیال ہوتا تھا تھوڑی دیر میں موجوں کے تھپیڑے اُسے بہالے جائیں گے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ

وہ اس سے پہلے وہاں آ چکا ہے۔ ایک سے دوسرے پتھر پر اس کا قدم بے تکان پڑتا تھا اور وہ پانی کے گڑھوں سے بچ بچ کر چل رہا تھا۔ آخر وہ رکا: منٹ بھر کے لئے کسی چیز کی آواز سننے لگا۔ پھر زمین پر بیٹھ گیا اور گٹھری اپنے پاس رکھی۔
میں ایک آگے کو نکلی ہوئی چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور اُس کی حرکتوں کو دیکھتا رہا چند منٹ بعد ایک سفید شکل نمودار ہوئی اور اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ ہوا کا رُخ جب میری طرف ہوتا تھا تو اُن کی آواز اُڑتی ہوئی مجھ تک پہنچی تھی
ایک عورت کی آواز نے کہا 'اندھے لڑکے، بلا کا طوفان ہے۔ جانکو نہیں آئے گا۔'
لڑکے نے جواب دیا 'جانکو طوفان سے نہیں ڈرتا۔'
عورت نے افسوس کے لہجے میں کہا 'کہر گھیرا ہوا ہے۔'
جواب ملا 'کہر میں پاسبان کشتیوں کے پاس سے گزرنا زیادہ آسان ہے۔'
'فرض کرو وہ ڈوب گیا؟'
'تو کیا ہوگا؟ اتوار کو تمھیں نئے فیتے کے بغیر گرجا جانا پڑے گا!'
اس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی: اندھے لڑکے نے مجھ سے روس کو چک کی بولی میں گفتگو کی تھی اور اب وہ روسی بول رہا تھا۔
اندھے لڑکے نے تالی بجا کر کہا 'وہ دیکھو، میرا خیال ٹھیک نکلا۔ جانکو کے دل میں نہ سمندر کا ڈر ہے، نہ ہوا کا، نہ کہر کا، نہ پاسبان کشتیوں کا۔ کان لگا کر سنو۔ یہ موجوں کا شور نہیں ہے۔ مجھے دھوکا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور اس کے لمبے پتواروں کی آواز ہے۔'
عورت جو بہت پریشان نظر آتی تھی اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور گردن اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ بولی 'اندھے لڑکے تم ہی باتیں بناتے ہو۔ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'
میں نے بھی دیکھنا چاہا کہ فاصلے پر کشتی کی قسم کی کوئی چیز ہے یا نہیں، مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ کوئی دس منٹ گزر گئے۔ سر بفلک موجوں کے بیچ میں ایک نقطہ سا نظر پڑا۔ کبھی بڑا ہو جاتا، کبھی پھر چھوٹا ہو جاتا تھا۔ ایک کشتی موجوں کی چوٹی پر چڑھتی ہوئی، تیزی سے پانی کے کونڈے میں گرتی ہوئی رفتہ رفتہ ساحل کی طرف آ رہی تھی۔ اُس کی جدوجہد دیکھ کر میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے سوچا کہ ایسی رات کو چودہ پندرہ میل چوڑی خلیج پار کرنے کے لئے کشتی پانی میں

ال دینا معمولی ملّاح کا کام نہیں ہے کسی ضروری کام سے آتا ہوگا۔ کشتی نے مرغابی کی طرح ڈبکی لگائی۔ پھر تیز جپوؤں کی
ردسے جو کسی پرندے کے پر معلوم ہوتے تھے، پانی کی جھال سے ڈھکی ہوئی گہرائیوں میں سے اُبھری۔ مجھے خیال ہوا
لہ ساحل کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ مگر وہ پھرتی سے ترچھی ہوگئی اور صحیح سالم ساحل سے آلگی۔ ایک
بیانہ قد کے آدمی نے جس کے سر پر بھیڑ کی کھال کی تاتاری ٹوپی تھی اُتر کر دونوں کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا، اور
ینوں کشتی میں سے کوئی چیز کھینچنے لگے؛ سامان اتنا زیادہ تھا کہ اب بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کشتی ڈوبی کیوں نہیں۔ ایک
یک بلندہ ہاتھ میں لے کر وہ ساحل کی طرف چلے اور تھوڑی دیر میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ مجھے جھونپڑی
ں واپس آنا تھا۔ مگر ان عجیب و غریب واقعات نے مجھے اتنا بدحواس کر دیا کہ صبح کرنا دوبھر ہوگیا۔

میرے قفقازی نے جب اُٹھ کر دیکھا کہ میں کپڑے پہنے تیار ہوں تو اُسے بہت تعجب ہوا۔ میں نے اُسے اس
ہ وجہ نہیں بتائی۔ تھوڑی دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا میں نیلے آسمان کا لطف اُٹھاتا رہا، جو بادل کے چھوٹے چھوٹے
ٹکڑوں سے پٹا پڑا تھا۔ فاصلے پر کریمیا کا ساحل ایک اودے خط کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک گھاٹی پر آکر ختم ہوتا تھا
س کی چوٹی پر ایک روشنی کے مینار کا کنگرہ دکھائی دیتا تھا۔ پھر میں فینا گوریا کے قلعے پہنچا تاکہ کمیدان سے گلینر تک کی
روانگی کا وقت معلوم کروں۔

مگر افسوس کہ کمیدان کوئی ٹھیک بات نہ بتا سکا۔ بندرگاہ میں یا تو حراست کی یا تجارتی کشتیاں تھیں جن پر ابھی
سامان لادا جانا شروع نہیں ہوا تھا۔

کمیدان نے کہا 'شاید تین چار دن میں ڈاک کی کشتی آجائے۔ اُس وقت دیکھا جائے گا۔ میں ملول اور رنجیدہ
ر پہنچا۔ دروازے میں قفقازی ملا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

کہنے لگا 'حضور، رنگ بگڑا ہوا ہے۔'

'ہاں، بھائی، خدا جانے یہاں سے کب چھٹکارا ہو!'

یہ سُن کر وہ اور بھی بے اوسان ہوگیا! جھک کر میرے کان میں بولا:

'یہ گھر ٹھیک نہیں ہے۔ آج صبح مجھے بحیرۂ اسود کے ایک فوجی افسر ملے۔ میں اُن سے واقف ہوں؛ پچھلے سال
ن کے دستے میں تھا۔ جب میں نے اُنھیں بتایا کہ ہم کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں، تو اُنھوں نے کہا 'بھائی، وہ جگہ

ٹھیک نہیں۔ وہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔۔۔‘ میری رائے میں ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ یہ کس قسم کا اندھا لڑکا ہے؟ اکیلا پڑا پھرتا ہے۔ بازار سے روٹی لاتا ہے۔ پانی لینے جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سب لوگ دیکھتے دیکھتے عادی ہو گئے ہیں۔

’اس سے کیا ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔ گھر والی کی شکل نظر آئی؟‘

’جی ہاں‘ بڑھیا آپ کے جانے کے بعد آ گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیٹی ہے۔‘

’بیٹی کیسی؟ اُس کی تو کوئی لڑکی نہیں ہے‘

’خدا جانے بیٹی نہیں تو کون ہے۔ وہ دیکھئے بڑھیا اپنی جھونپڑی میں بیٹھی ہے۔‘

میں جھونپڑی کے اندر گیا۔ چولہا دہکا ہوا تھا، اور کھانا پک رہا تھا جو غریب لوگوں کی حیثیت سے زیادہ پُرتکلف تھا۔ میرے سوالوں کے جواب میں بڑھیا نے یہی کہا کہ ’بہری ہوں، سنائی نہیں دیتا میں کیا کرتا؟ میں نے اندھے لڑکے کی طرف رُخ کیا۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھا آگ میں ایندھن ڈال رہا تھا۔

میں نے اُس کے کان کھینچ کر پوچھا ’اندھے شیطان‘ یہ بتا کل رات کو وہ گٹھری لے کر کہاں گیا تھا؟ اندھے نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا ’کہاں جاتا؟ کہیں بھی نہیں گیا۔ کیسی گٹھریاں؟ مجھے گٹھریوں کا حال کیا معلوم —

اب بڑھیا کے کان میں آواز پہنچ گئی اور وہ بڑبڑانے لگی:

’بچارے اپاہج پر خواہ مخواہ الزام تھوپتے ہو۔ کیوں ڈرا دھمکا رہے ہو؟ اُس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟‘

مجھے اس پر بہت طیش آیا اور یہ فیصلہ کر کے وہاں سے چلا کہ اس معاملہ کی تہ تک پہنچ کر رہوں گا۔

میں نے چادر لپیٹی، دیوار کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور حدِ نظر کی طرف دیکھنے لگا۔ میری نظروں کے سامنے سمندر پھیلا ہوا تھا جس پر رات کے طوفان کا اثر باقی تھا۔ موجوں کے یکساں شور سے گزرے ہوئے زمانے کی یاد تازہ ہو گئی، اور میرے خیالات شمال کی طرف، ہمارے سرد پایۂ تخت کی طرف جا پہنچے۔ پُرانی باتیں خواب کی طرح آنکھوں میں پھرنے لگیں۔۔۔۔۔

اس طرح گھنٹہ بھر کے قریب گزر گیا۔ یکایک گیت کی سی آواز میرے کانوں میں آئی۔۔۔۔

گیت ہی تھا، عورت کی پاکیزہ آواز میں گایا جا رہا تھا۔ یہ آواز کدھر سے آئی؟ میں سننے لگا۔ ساز دار لَے تھی۔ کبھی کھنچی ہوئی اور اُداس، کبھی تیز اور شگفتہ۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر کوئی نظر نہیں آتا۔۔۔ میں سننے لگا۔۔۔۔

معلوم ہوتا تھا کہ آواز آسمان پر سے آرہی ہے۔ میں نے نظر اٹھائی۔ جھونپڑی کی چھت پر لمبی لمبی، گُھٹی ہوئی کالکوں والی ایک لڑکی دھاری دار لباس پہنے کھڑی تھی۔ بالکل سمندر کی پری معلوم ہوتی تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لئے ہاتھ آنکھوں پر رکھے، دور نظریں گاڑے ہوئے تھی، کبھی ہنستی تھی اور آپ ہی آپ باتیں کرتی تھی۔ پھر گانے لگی تھی۔

مجھے اُس کے گیت[1] کا ایک ایک لفظ یاد ہے:

گہرے، زمردیں سمندر کی لہراتی ہوئی موجوں پر بہت سی سفید بادبانوں والی کشتیاں میرے پاس سے ہو کر گزرتی ہیں۔ ان کشتیوں میں سے ایک میری طرف آتی ہے۔ سمندری موجوں پر اُسے دو چپو کھیتے ہیں۔ جب جھکڑ چلتے ہیں اور طوفان اُٹھتے ہیں، تو بڑی بڑی کشتیاں اپنے پر پھیلا دیتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنا کٹھن سفر جاری رکھتی ہے۔ میں اپنا سر جھکا لیتی ہوں اور دعا مانگتی ہوں: اپنی شریر موج کو ہلاک کر دے! میری ننھی سی پیاری کشتی کو اپنے سینے پر محفوظ رکھ! میری کشتی میرے لئے انواع واقسام کے زر و جواہر لاتی ہے۔ ایک بڑے دل اور دماغ والا اُسے رات کو طوفان میں چلاتا ہے۔

مجھے بے ساختہ خیال گزرا کہ یہ آواز پچھلی رات کو سن چکا ہوں۔ لمحہ بھر کے لئے میں کسی خیال میں ڈوب گیا۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو لڑکی وہاں نہیں تھی۔ یکایک وہ میرے سامنے سے ایک اور گیت گنگناتی ہوئی جھپٹ کر گزری اور انگلیاں چٹخاتی ہوئی بڑھیا کے پاس پہنچی اور دونوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ بڑھیا بگڑ رہی تھی۔ لڑکی کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا کہ میری سمندر کی پری اچھلتی کودتی میری طرف آرہی ہے۔ جب میرے قریب پہنچی تو ٹھہر گئی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیر تک مجھے گھورتی رہی، گویا مجھے وہاں دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی۔ پھر بے پروائی سے منہ پھیر لیا، اور گھاٹ کی طرف چلی گئی۔ اسی پر اکتفا نہیں کی۔ دن بھر میرے کمرے کے ارد گرد منڈلاتی رہی۔ ذرا سی دیر کو گانا اور ناچنا موقوف نہیں کیا۔ عجیب لڑکی تھی! چہرے پر جنون کے آثار نہیں تھے۔ اُس کی تیز، دل میں گھر کرنے والی نگاہیں مجھ پر ٹھہرتی تھیں۔ ان میں ایک مقناطیسی قوت تھی۔ جب میری نظریں اُس سے لڑتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہیں کہ میں کچھ سوال کروں۔ مگر جب کچھ پوچھنے کے لئے میرے ہونٹوں کو جنبش ہوتی تو وہ ایک پُرفن انداز سے مسکرا کر بھاگ جاتی۔

اس سے پہلے ایسی عورت کبھی میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ اُسے حسین نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مگر حسن کے متعلق بھی

[1] ہماگیت نظم ہے۔

میں خاص خیالات رکھتا ہوں - وہ اصیل تھی - گھوڑوں کی طرح عورتوں میں بھی نسل بڑی چیز ہے - اس انکشاف کے لئے ہم نئی روشنی کے نوجوان فرانسیسیوں کے ممنون ہیں - اس کا اثر سب سے زیادہ چال میں، ہاتھوں میں، پاؤں میں نمایاں ہوتا ہے خصوصاً ناک کی خاص اہمیت ہے - ستواں ناک روس میں خوش قطع پاؤں کی نسبت کم پائی جاتی ہے - میری پولتی ہوئی مینا کی عمر کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی - اُس کے جسم کا غیر معمولی پھرتیلا پن، خاص کر اُس کے سر کا خم، اُس کے لمبے لمبے بھورے بال صندلی رنگت جس نے اُس کی سنولائی ہوئی گردن اور شانوں میں ہلکی سی گلگوں جھلک پیدا کر دی تھی، اس سے بھی بڑھ کر اُس کی ستواں ناک، یہ سب چیزیں مجھ پر جادو کا کام کرتی تھیں - گو اُس کی ترچھی نظروں سے ایک گونہ رمیدگی اور شک ٹپکتا تھا، گو اُس کی مسکراہٹ میں ایک خاص ناقابلِ وضاحت بات تھی، مگر میرے خاص خیالات کا کرشمہ تھا کہ اُس کی ستواں ناک نے مجھے دیوانہ بنا دیا

مجھے اُس پر گوئٹے کی جرمن تخیل کے اُس متغیر الالوان مرقع 'میگنوں' کا دھوکا ہوا - دراصل وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں، وہی پارے کا سا تلوّن: ابھی نہایت شدید چلبلاپن - ابھی انتہائی سکون، وہی پُر رمز باتیں، وہی حرکات و سکنات اور عجیب عجیب گیت

شام کے قریب وہ مجھے دروازے کے پاس ملی - اُس سے میری حسب ذیل باتیں ہوئیں:

'بنّو، آج چھت پر کیا ہو رہا تھا؟'

'دیکھتی تھی ہوا کس رُخ کی ہے'

'یہ جاننے کی کیا ضرورت تھی؟'

'جس رُخ سے ہوا چلتی ہے، وہی بھاگوان ہوتا ہے۔'

'کیا اپنے گیتوں سے خوشی کو رام کرنا چاہتی تھیں؟'

'جہاں گیت گائے جاتے ہیں، وہیں خوشی پائی جاتی ہے۔'

'اور اگر اتفاق سے گیت منحوس ثابت ہوں؟'

'تو کیا ہوا؟ قسمت اگر بہتر نہیں تو بدتر ہوگی - بُرے اور بھلے میں بہت کم فرق ہے'

'وہ گیت تمھیں کس نے سکھایا؟'

'کسی نے بھی نہیں - وہی چیز گاتی ہوں جو دل میں آتی ہے - جسے سُننا چاہئے، وہ سُن لے گا اور جسے نہیں سننا چاہئے وہ سمجھے گا نہیں۔'

'میری مطربہ، تمھارا نام کیا ہے؟'

'وہی جانتے ہیں جنھوں نے بپتسمہ دیا۔'

'بپتسمہ کس نے دیا؟'

'مجھے کیا معلوم؟'

'پُراسرار بچّی، لو سنو مجھے تمھاری نسبت کیا کیا باتیں معلوم ہوئی ہیں' اُس کے چہرے کی رنگت میں مطلق فرق نہیں آیا، نہ اُس نے اپنے لبوں کو جنبش دی۔ بالکل اس طرح کھڑی رہی جیسے اُسے اس بات سے کسی قسم کا سروکار نہیں ہے۔ 'مجھے علم ہے کہ کل رات کو تم گھاٹ پر پہنچی تھیں' اس کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا تھا نہایت سنجیدہ انداز سے سب سُنا دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ سُن کر گھبرا جائے گی وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

'تم نے دیکھا بہت کچھ ہے، مگر سمجھتے کم ہو' اور جو کچھ سمجھتے ہو، اُسے مقفل رکھو'

'اور اگر میں کمیدان سے کہہ دوں؟' یہ میں نے بہت متانت سے' بلکہ غضب ناک مُنہ بنا کر کہا۔

اُس چڑیا کی طرح جو اپنی جھاڑی میں سہم کے رہ گئی ہو، وہ زقند بھر کر گاتی ہوئی غائب ہو گئی۔ میرے آخری الفاظ بالکل بے محل تھے۔ ان کی اہمیت کا مجھے اُس وقت اندازہ نہیں ہوا۔ مگر بعد کے واقعات دیکھ کر افسوس ہوا کہ ناحق زبان سے نکالے۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ میں نے اپنے قفقازی سے چائے کی کیتلی گرم کرنے کو کہا، موم بتی جلائی اور بیٹھ کر پائپ کا مزا لینے لگا۔ چائے کا دوسرا گلاس ختم کرنے کو تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اپنے پیچھے دبے پاؤں کی آہٹ اور لباس کی ہلکی سرسراہٹ سنائی دی۔ چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سمندر کی پری کھڑی تھی۔ آہستہ سے میرے سامنے آکر بیٹھ گئی اور چُپ چاپ غور سے میرا مُنہ تکنے لگی۔ خبر نہیں کیوں، مجھے یہ محسوس ہوا کہ اُس کی نظر پیار میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میری آنکھوں میں وہ نگاہ پھر گئی جس نے کئی سال ہوئے میری زندگی کو جابرانہ طریقے سے تہ و بالا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کسی سوال کا انتظار ہے، مگر میں دم بخود بیٹھا تھا۔ طبیعت مضطرب تھی، مگر اس اضطراب کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ زردی مائل تھا جس سے اُس کے اندرونی اضطرار کا حال کھلتا تھا۔ اُس کا ہاتھ یوں ہی بے خیالی کے عالم میں میز پر پھر رہا تھا، اور میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کانپ رہی تھی۔ کبھی اُس کا سینہ اُبھرتا تھا، کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانس روکے بیٹھی

[illegible] کر کے اس خاموشی کو انتہائی روکھے پھیکے طریقے

توڑ دوں، کہ اتنے میں وہ تڑپ کر اٹھی، بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور میرے ہونٹوں کا ایک رسیلا، دہکتا بوسہ لیا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا، میرا سر چکرا گیا، اور میں نے اپنے جوشِ جوانی کی پوری قوت سے بھینچ کر سینے سے چمٹا لیا، مگر وہ سانپ کی طرح میرے بازوؤں میں سے سٹک گئی اور میرے کان میں کہنے لگی:

'آج رات کو جب سب سو جائیں تو ساحل پر آنا'، اور یہ کہہ کر تیر کی طرح گھر سے نکل گئی۔ راستے میں چائے دانی اور موم بتی جو زمین پر رکھی ہوئی تھیں اُس کی ٹھوکر سے اُلٹ گئیں۔ قفقازی جو پھونس پر بیٹھا اپنی چائے ختم کر رہا تھا بولا 'لڑکی کیا ہے بھونچال ہے!'

تب جاکر میں ہوش میں آیا۔

دو گھنٹے بعد جب سناٹا ہو چکا تھا، میں نے قفقازی کو جگا کر کہا 'اگر میری پستول کی آواز سنو تو بھاگ کر سا پر آجانا'۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور حسبِ عادت کہا 'بہت بہتر حضور!' میں نے پستول اپنی پیٹی میں ٹھ لی اور باہر نکلا۔ وہ انار کے پاس میرا انتظار کر رہی تھی۔ بہت کم اور ہلکے کپڑوں میں تھی۔ اُس کے چست جسم سے ایک شا لپٹی ہوئی تھی۔

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا 'میرے ساتھ آؤ'، اور ہم نیچے اُترنے لگے۔ حیرت ہے کہ میری گردن کیسے سلامت رہی۔ نیچے پہنچ کر ہم دائیں ہاتھ کو مڑے، اور اُسی طرف چلے جدھر پچھلی رات کو میں نے اندھے لڑکے کو جاتے دیکھا تھا۔ چاند نہیں نکلا تھا۔ اور صرف دو تارے، روشنی کے میناروں کی طرح، گنبدِ نیلوفری میں چمک رہے تھے۔ چڑھی ہوئی لہریں، پے بہ پے، موجیں مار رہی تھیں اور کنارے سے بندھی ہوئی کشتی کو آہستہ آہستہ ہچکولے کھلا رہی تھیں۔ میری رفیق نے کہا۔ 'کشتی میں بیٹھ جاؤ'۔

میں جھجکا۔ سمندر پر جذبات سے مملو گلگشت کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ مگر اب پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ وہ کود کے کشتی میں بیٹھ گئی، اُس کے بعد میں سوار ہوا۔ قبل اس کے کہ میں دم مار سکوں، دیکھتا کیا ہوں کہ کشتی بہی چلی جارہی ہے۔

میں نے برہم ہو کر پوچھا: 'اس کے کیا معنی؟'

اُس نے مجھے اپنے برابر بٹھا کر اور ...

اُس کا رخسار میرے گال سے ملا ہوا تھا اور میرے منہ پر اُس کا گرم گرم سانس محسوس ہوتا تھا۔ یکایک پانی کی چھینٹیں اُڑیں۔ میں نے پیٹی پر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ میری پستول غائب تھی۔ چاروں طرف نظر دوڑائی — ہم ساحل سے کوئی سو گز ہوں گے۔ اور مجھے تیرنا نہیں آتا۔ کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہم بے تحاشا ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے۔

مگر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ چستی میں میں اپنی حریف سے کم ہوں۔

میں نے اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کے پوچھا 'آخر تم چاہتی کیا ہو؟' اُس کی انگلیاں چٹخنے لگیں مگر اپنی ناگن کی سی قوت برداشت سے اُس نے یہ تکلیف سہہ لی۔

وہ بولی 'تم دیکھ چکے تھے۔ چاہتے تھے کہ ہماری مخبری کرو!' اور مافوق الفطرت زور لگا کر اُس نے مجھے نیچے پٹخ دیا۔ ہمارا آدھا دھڑ کشتی کے باہر لٹکا ہوا تھا۔ اُس کے بال پانی کو چھو رہے تھے۔ توڑ کا موقع تھا۔ اِدھر یا اُدھر میں نے کشتی کے تختے پر گھٹنا ٹکا کر زور سے دبایا، ایک ہاتھ سے اُس کے بال پکڑ لئے اور دوسرے ہاتھ سے اُس کا ٹینٹوا دبایا!

اُس نے میرے کپڑے چھوڑ دیئے اور میں نے آناً فاناً اُسے پانی میں دھکا دے دیا۔

اچھا خاصہ اندھیرا ہو گیا تھا! اُس کا سر دو ایک بار سمندر کے جھاگ میں سے اُبھرا پھر کچھ نظر نہیں آیا۔

کشتی میں مجھے ٹوٹا ہوا آدھا چپو ملا۔ کسی نہ کسی طرح بڑی دقتوں سے میں کنارے تک پہنچا۔ ساحل سے اپنی جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے میری نظر غیر اختیاری طور سے اُس طرف پڑی جہاں کل رات میں نے اندھے لڑکے کو آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر کھویئے کا انتظار کرتے دیکھا تھا۔ چاند آسمان پر تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ کوئی سفید چیز سمندر کے کنارے بیٹھی ہے۔ یہ دیکھنے کو کہ کون ہے آگے کی طرف سرکا اور چٹانوں کے سائے میں جو گھاس تھی اُس میں چھپ کر لیٹ گیا۔ چٹان پر سر اُٹھا کر دیکھنے سے صاف نظر آتا تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی، بلکہ خوشی ہوئی جب میں نے اپنی سمندر کی پری کو پہچانا۔ وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں سے جھاگ نچوڑ رہی تھی۔ اُس کا گیلا لباس اُس کے چست جسم اور بھری بھری چھاتیوں پر چپکا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں فاصلے پر ایک کشتی نظر آئی اور اُس کے پاس پہنچ کر ٹھہری۔ پچھلی دفعہ کی طرح تاتاری ٹوپی پہنے ایک آدمی اترا۔ مگر اب اُس کے بال قفقازیوں کے سے تھے، اور اُس کی چہرے کی پٹی میں ایک لمبا

عورت نے کہا 'جانکو، بھانڈا پھوٹ گیا!' اس کے بعد وہ اتنی دبی آواز سے باتیں کرنے لگے کہ میں نے کچھ نہیں سنا
جانکو نے بلند آواز سے پوچھا 'اندھا لڑکا کہاں ہے؟'

جواب ملا 'میں نے بھیجا ہے...' چند منٹ بعد اندھا لڑکا ایک بیگ کمر پر لادے ہوئے پہنچا جسے انھوں نے کشتی میں رکھ لیا۔

جانکو نے کہا 'اندھے لڑکے سنو۔ اس جگہ کا خیال رکھنا۔ سمجھے؟ وہاں قیمتی سامان ہے۔۔ (کسی کا نام لے کر جو میں نہیں سن سکا) سے کہنا کہ اب میں تمھارا نوکر نہیں رہا۔ ہوا اکھڑ گئی۔۔ اب اسے شکل نہیں دکھاؤں گا، خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اب کہیں اور جا کر کام تلاش کروں گا، مجھ جیسا دلاور آدمی اسے نہیں ملے گا۔ ہاں، اس سے یہ بھی کہنا کہ کام کا معاوضہ زیادہ ہوتا، تو جانکو کبھی تیری ملازمت نہ چھوڑتا۔ جہاں ہوائیں چلتی ہیں اور سمندر گرجتا ہے، وہاں میرے لئے ہر طرف راستہ کھلا ہوا ہے' تھوڑی دیر چپ رہ کر بولا 'یہ بھی میرے ساتھ چلے گی، یہاں نہیں ٹھہر سکتی، اور بڑھیا سے کہنا کہیں مر بھی چکے، بہت دن جی۔ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے۔ اب ہم اس کی شکل نہیں دیکھیں گے۔'

اندھے لڑکے نے اداس ہو کر پوچھا 'اور میں؟'

جواب ملا 'تم میرے کس کام کے؟'

اس اثنا میں میری سمندر کی پری کود کر کشتی میں بیٹھ چکی تھی اور اپنے رفیق کو ہاتھ کے اشارے سے بلا رہی تھی۔ اس نے اندھے لڑکے کے ہاتھ میں کچھ رکھا اور کہنے لگی 'لو، اس کی اپنے لئے کچھ مٹھائی خرید لینا۔'

اندھے لڑکے نے کہا 'بس یہی؟'

'اور کیا چاہتے ہو؟' سکہ پتھر پر چھن سے گرا ۔ اندھے لڑکے نے اسے نہیں اٹھایا۔ جانکو کشتی میں بیٹھ گیا۔ ہوا ساحل کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹا بادبان چڑھایا اور کشتی تیزی سے چلنے لگی۔ بادبان دیر تک چاندنی میں تاریک موجوں پر جھلکتا ہوا نظر آتا رہا۔ اندھا لڑکا سمندر کے کنارے بیٹھا رہا۔ ہچکیوں کی سی آواز میرے کان میں آئی؛ لڑکا رو رہا تھا۔ دیر تک، بہت دیر تک بیٹھا روتا رہا۔ میرا دل بھر آیا۔
قسمت نے ناحق مجھے اپنے کھرے دل کے گھاٹ ماروں کی صحبت میں لا کر ڈالا۔ اس پتھر کی طرح جو کنوئیں کے
[illegible]

یں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ دروازے میں موم بتی کاٹ کی طشتری میں جھلملا رہی تھی، اور میرا قفقازی 'میرے
ے خلاف، بندوق مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑے گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے اُسے نہیں چھیڑا۔ موم بتی لی اور
پڑی میں داخل ہوا۔ افسوس، میرا روپئے کا صندوقچہ، میری چاندی کے کام کی تلوار، میرا داغستانی خنجر۔
دست کا تحفہ۔ سب غائب تھے! اب میں سمجھا کہ وہ ملعون اندھا کیا چیزیں ساحل پر لے گیا تھا۔ میں نے
ی کو جھنجوڑ کر جگایا۔ اور خوب ڈانٹا اور خفا ہوا۔ مگر اس سے کیا ہوتا تھا؟ کیا میرا مضحکہ نہ اُڑتا اگر میں حکام میں
بت کرتا کہ ایک اندھے لڑکے نے مجھے لوٹ لیا۔ اور ایک اٹھارہ برس کی لڑکی نے مجھے ڈبو ہی دیا تھا؟
ے کہ اگلے دن وہاں سے نکلنے کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور میں طامان روانہ ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ
اور اندھے لڑکے کا کیا ہوا۔ یوں بھی ایک افسر کو جو ڈاک گاڑی میں سرکاری کام سے جا رہا ہو، انسانوں
کھ سکھ سے کیا سروکار؟

(لیرمنتوف)

روسی شاعری

(روس کے مشہور شاعر پشکن کی دو نظمیں مجیب صاحب کی اُردو نثر میں) (مدیر)

'زندگی کی رتھ'

رتھ پر اگرچہ بوجھ بہت ہے
مگر وہ آسانی سے چل رہی ہے۔
زمانہ، ایک سن رسیدہ مشّاق ہانکنے والے کی طرح
بغیر ستائے ہم کو بھگائے لئے چلا جاتا ہے۔
ہم سویرے سے رتھ میں بیٹھتے ہیں،
جب ہمیں ہڈی پسلی ٹوٹنے کا اندیشہ نہیں ہوتا،
آرام اور آسودگی کی فکر نہیں ہوتی،
اور تب ہم چلاتے ہیں: چل جلدی چل
لیکن آدھا دن گزرنے تک یہ جولانی نہیں رہتی۔

ہم بہت ہچکولے کھا چکے ہوتے ہیں،
ڈھلوان زمین اور خندقوں کا ہمیں خوف ہوتا ہے،
اور تب ہم چلاتے ہیں: سنبھل کر چل، بیوقوف!
رتھ پہلے کی طرح چلتا رہتا ہے۔
شام تک ہم اس میں بیٹھنے کے عادی ہو جاتے ہیں،
زمانہ رتھ کو تیزی سے چلاتا رہتا ہے
اور ہم اونگھتے ہوئے خواب گاہ تک پہنچ جاتے ہیں

بھوت

بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے
کہیں سے چھپ کر چاند
اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے؛
آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔
میں سپاٹ میدان میں گاڑی پر چلا جا رہا ہوں، چلا جا رہا ہوں۔
گھوڑوں کی گھنٹی ٹن ٹن ٹن بول رہی ہے۔
انجان مقاموں سے گذرتے ہوئے۔
دل بے اختیار کانپ اٹھتا ہے۔
"ارے کوچوان، جلدی کر!" "حضور مجھ میں سکت نہیں،
اور گھوڑوں کے پیر مشکل سے اٹھتے ہیں:
برف کا طوفان میری آنکھیں اندھی کئے دیتا ہے،
تمام رستے نظر سے چھپا دئے ہیں،
مجھے تو اب کوئی مارے بھی تو میں رستہ نہیں بتا سکتا۔

ہم بھٹک گئے ہیں، کریں تو کیا کریں ؟
ہم کو بھوت میدان میں گھسیٹے لئے جاتا ہے
اور اِدھر اُدھر چکر دے رہا ہے۔
دیکھیے وہاں کھیل رہا ہے، وہاں،
میرے مُنہ پر کچھ پھونکتا ہے اور تھوکتا ہے،
وہ دیکھیے اب ہچکنے والے گھوڑے کو
گڑھے میں دھکیل رہا ہے:
وہ لیجیے اب جھوٹ موٹ میل کا پتھر بن کر
میرے سامنے زمین میں گڑ گیا،
اب دیکھیے وہ چنگاری کی طرح چمکا
اور اندھیرے میں غائب ہو گیا"
بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،
کہیں سے چھپ کر (چاند)
اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے؛
آسمان نیلا ہے، رات نیلی۔
ہم میں اب چکر لگانے کی طاقت نہیں،
گھوڑوں کی گھنٹی خاموش ہے،
گھوڑے کھڑے ہو گئے ہیں ... "اے وہ سامنے کیا ہے ؟"
"میں کیا بتاؤں ؟ کسی درخت کی جڑ ہوگی، یا بھیڑیا۔"
طوفان جھلاتا ہے، طوفان روتا ہے؛
بھڑکنے والے گھوڑے پھنکارتے ہیں؛

لو! اب بھوت دور بھاگا جاتا ہے،
صرف وہ آنکھیں اندھیرے میں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔
گھوڑے پھر سے چلنے لگتے ہیں،
گھنٹی ٹن ٹن ٹن بولتی ہے۔

برف سے سفید میدانوں پر
مجھے بھوت جمع ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔
بے شمار، بدصورت اور ڈراونے،
چاند کی مٹیالی روشنی میں
ہر ہر طرح کے بھوت چکر لگا رہے ہیں،
جیسے پت جھڑ میں پتیاں۔
کتنے ہیں، کدھر بھاگے ہوئے جا رہے ہیں۔
کیوں سب ایسی دردناک آواز میں گا رہے ہیں؟
کیا کوئی بھوت دفن کیا جا رہا ہے،
یا کسی چڑیل کی شادی ہے؟
بادلوں کے بھونچال ہیں، بادلوں کا طوفان ہے،
کہیں سے چھپ کر چاند
اڑتی ہوئی برف کو چمکا رہا ہے؛
آسمان مٹیالا ہے، رات مٹیالی۔
گروہ در گروہ، بھوتوں کا بھونچال
آسمان کی بلندی میں غائب ہو رہا ہے۔
اُن کی دردناک چیخیں اور آہیں
میرے دل کو زخمی کر رہی ہیں۔

(اُردو)

کمرے کا بھوت

بھوتوں کے افسانے تو آپ نے اکثر پڑھے ہوں گے اور لوگوں سے سنے بھی ہونگے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا آپ نے کبھی کوئی بھوت دیکھا بھی ہے؟ بھوت کے وجود کے متعلق اختلاف رائے ہے کوئی تو اسے محض وہم سمجھتا ہے۔ کوئی اسے شعبدہ بازی کے نام سے تعبیر کرتا ہے! اور اکثریت تو اس کے وجود کی قائل ہی نہیں، اور اس قسم کے افسانے "ڈھکوسلے" کہلاتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ایک بھوت سے کئی بار سابقہ پڑ چکا ہے! اور اب تو شاید ہی کوئی دن ایسا گذرتا ہو جو اس کے کارنامے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو اور سچ پوچھئے تو مجھے اس سے کچھ خاص لگاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ لوگ اسے میرے کمرے کا بھوت کہتے ہیں۔

باہر مردانے میں میری نشست کے دو کمرے ہیں۔ ایک میں تو میری کتابیں وغیرہ رکھی رہتی ہیں، اور دوسرا انگریزی اصطلاح میں "ڈرائنگ روم" کہلاتا ہے۔ اس ڈرائنگ روم میں نیلام گھر کی طرح مختلف قسم کا سامان ادھر ادھر بکھرا پڑا رہتا ہے دیواروں کی بدنما عریانی کو یہاں وہاں تصویریں ڈھانکتی ہیں۔ ایک "منٹل پیس" بھی ہے۔ یہ بھی خاصا سجا ہوا ہے اس پر دو چار قسم کے پھولدان بھی رکھے ہیں۔ ایک جانب ضلع حصار کے ایک کالے ہرن کا چہرہ بھی دیوار سے چسپاں ہے۔ کرسیاں اور صوفے بھی ہیں۔ ایک آدھ ٹکڑا قالین کا بھی ہے۔ دری بھی ہے اور دری کے نیچے چٹائی بھی۔ ایک جانب ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے! اور اس پر پھولدار میز پوش کی بجائے "ہڑیال" (پہاڑی بکرے) کی ایک بہت خوبصورت اور ملائم کھال پڑی ہے۔ اس کھال کو گرد و غبار سے بچانے کے لئے اوپر "ہز ماسٹرز وائس" رکھا رہتا ہے۔ چند ڈبے ریکارڈوں کے بھی ہیں۔

ان کرسیوں میں سے دو تو خصوصیت سے میرے ایک عزیز کی چیزوں کے لئے وقف ہیں۔ یہ محترم عزیز ایم۔ اے واقع ہوئے ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے کالج میں لڑکے پڑھانے کا کام کرتے ہیں۔ آپ ادیب بھی ہیں اور شاعر بھی

لو ایک بجے سے پہلے سونا اور صبح آٹھ سے پیشتر بستر کو الوداع کہنا آپ کی فلسفیانہ شریعت میں ممنوع ہے۔ ایک کرسی تو آپ کی پتلون۔ کوٹ اور عالیجناب کمپنی بہادر کے وقتوں کی ایک تاریخی نکٹائی کے لئے وقف ہے اور دوسری پر آپ کی کتابوں کا انبار لگا رہتا ہے اور ان کتابوں کے اوپر آپ کی جرابیں دراز رہتی ہیں۔

کمرے کی یہ مختصر سی کیفیت جو عرض کی گئی ہے ممکن ہے کہ بعض اصحاب اصحابِ کہف نہیں بلکہ مثل ملک صاحب سلم اؤٹ لک والے۔ بہزادِ ہند چغتائی جی غالب والے میاں عباس پھول والے۔ حضرت حفیظ شاہ نامۂ اسلام والے۔ اور جناب بدر مخزن والے وغیرہم اسے خودستائی پر محمول فرمادیں۔ لیکن بھوت کے کارنامے بیان کرنے کے لیے یہ تمہید ضروری تھی۔ کیونکہ جناب بھوت اسی کمرے میں اپنے شعبدے دکھایا کرتے ہیں۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ کوئی دس بجے کے قریب جب میں شکار کھیل کر واپس آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا ہونکہ اندر سے زہرہ کے ایک مشہور ریکارڈ۔

"نرالی شوخیاں ہیں خود بخود اترائی جاتی ہیں"

دلکش آواز آرہی تھی۔ کمرے میں جاکر دیکھا کہ گراموفون تو بج رہا ہے اور بہت سے ریکارڈ بھی ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں لیکن بجانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس خیال سے کہ اگر ریکارڈیوں ہی پڑا رہا تو یقیناً خراب ہوجاتا جی جل گیا۔ میں نے بندوق فرش پر ڈال دی اور گراموفون بند کر دیا۔ اور پھر ریکارڈ اٹھا اٹھا کر ڈبوں میں رکھنے لگا۔ ابھی نصف کے قریب رکھ چکا تھا کہ جناب بھوت دوسرے کمرے کے راستہ سے بکری کی طرح جگالی کرتے آموجود ہوئے سر پر ٹوپی رکھنے کے تو آپ ازل سے مخالف ہیں گریبان کھلا تھا اور پاؤں میں کرنال والوں کی دوکان کے سیلیپر تھے۔ آتے ہی گرجے۔

"اجی! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ میں نے تو ابھی ایک دو ریکارڈ ہی بجائے تھے"۔

میں نے عرض کیا۔

"آپ گئے کہاں تھے؟"

فرمانے لگے۔

"ذرا پان کھانے گیا تھا لیکن آپ نے باجا کیوں بند کر دیا۔ میں کوئی دس ایک منٹ میں تو واپس آگیا ہوں"۔
"تو گویا ایک ریکارڈ دس منٹ چلا کرتا ہے"۔ میں نے ہنسی اور غصہ کو ضبط کر کے کہا۔
کہنے لگے۔
"میں لفظی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا"۔ اور پھر باجا کھول کر
"کچھ سنو گے"۔
"کیوں نہیں"۔
"کیا سنو گے"۔
"کہئے دہلی کالج سے کوئی جواب آیا یا نہیں"۔
میری طرف دیکھ کر بولے۔
"اس وقت اس بیہودہ سوال کا مطلب!"
"آپ ملازم ہو جائیں تو شاید آپ کی عادات کی اصلاح ہو جائے"۔
آپ مسکرا کر پھر ریکارڈوں کا جائزہ لینے لگے۔

ایک اور واقعہ سنئے۔
ایک روز میں کھانا کھانے کے بعد صوفے پر پڑا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی کرسی پر ترکوں کی بدنام کی ہوئی میری ٹوپی رکھی تھی۔ پڑھتے پڑھتے نیند آگئی کچھ دیر بعد جب میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹوپی ایک رومال میں بندھی میز پر پڑی ہے میں سوچنے لگا کہ ٹوپی تو میں نے کرسی پر رکھی تھی اور پھر رومال میں باندھنے کی مجھے کیا ضرورت تھی۔ خیر اٹھکر رومال کھول کر جو دیکھا تو ٹوپی میں ایک مینڈک رکھا تھا لاحول ولا یہ مکروہ چیز دیکھ کر طبیعت لوٹ پوٹ ہی تو ہو گئی۔ چارو ناچار ٹوپی اٹھا کر باہر آیا اور مینڈک بازار میں پھینکدیا اور ٹوپی دھوپ میں رکھدی۔ میں دل میں حیران تھا کہ یہ حماقت یا شرارت کس نے کی۔
تھوڑی دیر بعد جناب بہوت پان چباتے ہوئے تشریف لے آئے اور بڑے غور سے ادہر ادہر دیکھنے لگے

میں نے پوچھا۔

"کیا تلاش کرتے ہیں آپ؟"

"یہاں میز پر آپ کی ٹوپی رکھی تھی"

"ہاں میں نے وہ دھوپ میں باہر رکھدی ہے"

آپ دونوں ہاتھ کمر پر رکھکر بولے۔

"اور وہ مینڈک کیا ہوا؟"

"تو گویا آپ نے ہی وہ پلپلا سا مکروہ جانور میری ٹوپی میں رکھدیا تھا..... میں نے باہر پھینکدیا"

"آپ نے بھی غضب کر دیا...... میں نے ہی تو رکھا تھا باہر برآمدہ میں بلی پھر رہی تھی اسی لئے تو ٹوپی میں تھا..... بس محنت اکارت گئی"

"تو گویا مینڈک رکھنے کو ٹوپی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ تھی"

آپ میری طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھ کر بولے۔

"تو اس میں نقصان کیا ہوا۔ آخر وہ بھی تمہاری طرح خدا کی مخلوق ہے"

ایک اور واقعہ سنئے۔

جناب بہوت گرمی کے ایام میں چار پانچ بار غسل فرمانے کے عادی ہیں میرے خیال میں کسی نزلے کے بیمار کو جتنی دیر میں پانچ سات چھینکیں آجائیں اتنی دیر میں آپ غسل فرما لیتے ہیں۔

دس بجے کے قریب غسل فرما کر کمرے میں تشریف لاتے ہیں شکل سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی اخبار بیچ کر آئے ہیں۔ اندر آتے ہی فرش پر دراز ہو جاتے ہیں کوئی موٹی سی کتاب سرہانے کا کام دیتی ہے۔ ایک بجے تک یونہی پڑے پڑے گاہے گراموفون کا شوق فرماتے ہیں اور گاہے مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ مطالعہ کے دوران میں اکثر خراٹوں کی آواز بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ سونے کا طریق یہ ہے کہ قالین پر ہرن کی کھال بچھالی جاتی ہے اور قطب شمالی کی جانب پاؤں پھیلا کر دنیا کی ناثباتی پر آنکھیں بند کئے غور فرماتے رہتے ہیں اور اکثر ناک کے راستے سے متوجہ کا شہ [illegible]

جب اس طرح وجد کی حالت میں ہوتے ہیں تو مجھ پر لکھنا پڑھنا حرام ہو جاتا ہے۔

ایک روز جو میں کمرے میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قالین اور دری ایک جانب سے اٹھا دی گئی ہے پاس ہی ادھر ادھر کتابیں بکھری پڑی ہیں۔ ایک جانب ایک پھولدان رکھا ہوا ہے اور اس میں پھولوں کی بجائے گھونگھے پڑے ہوئے ہیں اب میں حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں جناب بھوت ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اسٹرا پکڑے آ رہے ہوئے۔ اور آتے ہی پوچھا۔

"کیوں جی کہیں اس روز کی طرح آج گھونگھے ہی تو نہیں پھینکدیے آپ نے؟"

میں نے عرض کیا۔

"یہ گھونگھے تو آپ کے ویسے ہی رکھے ہیں لیکن یہ قالین اور دری اٹھا کر چٹائی بھگونے میں کونسی حکمت مضمر ہے؟"

"معمولی سی تو بات ہے" پھولدان میں سے ایک گھونگھا نکال کر اور اسے بغور ملاحظہ فرماتے ہوئے بولے "قالین ری گرم تھی۔ پنکھے کی ہوا سے اور بھی گرم ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک طرف سرکا دیا اور چٹائی پر پانی چھڑک دیا کہ بدن کو ٹھنڈک پہنچے۔ اب دیکھو پنکھے کی ہوا بھی ٹھنڈی معلوم ہونے لگی ہے۔"

"تو اب جو اس پر فرش کیا جائیگا تو دوسری چیزیں تو گیلی نہ ہونگی؟"

آپ جھنجلا کر بولے۔

"ارے یار کب تک مغز چاٹوگے۔ جاؤ کوئی افسانہ لکھو تم۔ مجھے ان گھونگھوں کے متعلق کچھ سوچنے دو۔"

"خدا ہی تم سے سمجھے" کہکر میں دوسرے کمرے میں جا بیٹھا۔

ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ساون کے دن تھے برکھا ہو رہی تھی۔ میں اس خیال میں تھا کہ ذرا برکھا تھمے تو کہیں باہر نکلوں۔ میں برآمدہ میں بیٹھا کتاب دیکھ رہا تھا۔ پاس ہی ایک کرسی پر میرا "واٹر پروف" اور ایک سپید تولیہ پڑا تھا۔ اتنے میں بازار کی جانب سے آواز آئی

"میٹھے آم"

"دے جائیو۔ ادھر" یہ آواز میرے کمرے کے اندر سے سنائی دی تھوڑی دیر بعد میں گھر سے اپنا چھاتا لانے چلا گیا جب

باہر آیا تو دیکھا کہ میرا واٹر پروف جو میں نے چند دن ہوئے خرید اتھا باہر پڑا بھیگ رہا ہے اور اس کے اوپر دس پندرہ آم رکھے ہیں یہ دیکھ کر میں بہت سٹ پٹایا۔ اور غصہ سے واٹر پروف اُٹھا کر نوکر کو دیا کہ صاف کرلائے اتنے میں جناب بھوت نیلے رنگ کا تہ والا لباس پہنے ننگے سر اور ننگے پاؤں ہاتھ میں ایک ہاکی اسٹک پکڑے آنازل ہوئے اور آموں کو کیچڑ پڑا دیکھ کر بولے۔

"ارے یہ کس کم بخت نے پھینک دیئے" اور پھر میری طرف دیکھکر

"ہو نہ ہو حضرت یہ آپ ہی کی شرارت ہے"

"اور میرا واٹر پروف کس شریر نے خراب کیا؟"

آپ ناک بھوں چڑھا کر بولے۔

"وہ تو دُھل کر صاف ہو جاتا"

"اور یہ بھی دُھل کر صاف ہو جائیں گے"

"نہیں اب دریا پر جا کر دھوئیں گے"

یہ کہکر آپ نے میرا سپید تولیہ اٹھا کر کیچڑ میں لت پت آم اس میں باندھ لئے اور چلتے بنے۔

اس قسم کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ تو آپ کا روزانہ دستور ہے کہ بازار سے پان لاتے ہیں اور ہر جگہ چہرہ پر رکھدیتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا کہ داغ لگ کر چہرہ خراب ہو جائیگا لیکن آپ ہمیشہ یہ فرمادیا کرتے ہیں کہ اگر کسی اور جگہ رکھوں گا تو مکھیاں بیٹھیں گی۔ گویا اونچی جگہ پر مکھی نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر کہوں کہ ڈبیا رکھو تو ارشاد ہوتا ہے کہ ڈبیا کا کھولنا اور بند کرنا مفت کی دردسری ہے۔

یہ جناب بھوت میرے عزیز دوست حضرت سید۔ . . . صاحب ہیں آپ خدا کے فضل سے کلکتہ یونیورسٹی کے ایم ایس سی ہیں اور آج کل کالج میں لڑکوں کو مینڈک چیرنے پھاڑنے کا کام سکھاتے ہیں۔

اللہ کرے زورِ وحشت اور زیادہ

اکم-اسلم

جوگی

یہ نظم گولڈ اسمتھ کی مشہور نظم 'دی ہرمٹ' کا ترجمہ ہے۔ — مدیر

"مڑ پیارے جوگی گھاٹی کے
لے چل ہے باٹ کٹھن
اس چلتی پتی تک جس سے
ہے جگمگ پرلا بن

یاں بھٹکا بھٹکا پھرتا ہوں
ہیں سو سو من کے پاؤں
جنگل یہ میں کیسے کاٹوں
جو رہتے نہیں اک ٹھاؤں"

"تھم جا بابا" بولا جوگی
جس میں ہو دکھ کچھ کم
یہ بستی ہے راکس کوئی
ہر گھات میں تیری تھم

بے گھر کے بے بس تجھ پر
یاں کھلا اب میرا دوار
سائیں کی دین ہے جتنی بھر
لے لے کوئی ہانک پکار

اس رات تو آجی کھول کے لے
ہے بھنڈارے میں جو
بھر پیٹ تو روکھے بھوجن سے
رہ گھر سے گھاٹ پہ سو

جو بیوڑ چرتے پھرتے ہیں
کیوں ماروں ان کا جیو
کیوں ترس نہ کھاؤں اُن پر میں
جب کھائے مجھ پر شیو

ہیں پربت پر جو ساگ اور پات
بن دوس کے میں بھوجن
پھل پھول یہ کٹتی ہیں دن رات
ہوں کنڈ کے جل میں مگن

آ پیارے تو ہی سوچ نہ کر
ہے بھول نہ سوچ بچار
یاں جگ میں چاہیئے تھوڑا بھر
سو وہ بھی کبھو کبھار"

یہ سلجھی باتیں جوگی کی
سن واں سے تو ہی پھرا
تم آگے آگے جوگی جی
وہ پیچھے پیچھے چلا

اک گجلی بن میں ٹیلے پر
تھا جھونپڑا جوگی کا
جو دکھیاروں کا تھا سکھ گھر
تھی بھٹکوں کی بٹیا

نا ناج کا واں کوئی ڈھیر ہی تھا
نا چوکسی کرتا کوئی
جب جوگی کا وہ دوار کھلا
تو ٹٹی لینے بڑھی

اُس جوگی نے کچھ لکڑیوں کو
سلگایا سانجھ پڑے
آنند تو ہی جس میں ہو
سب دکھ کے مٹیں جھگڑے

دیئے ساگ اور پات اس نے پھیلا
پھر ہنس ہنس کر وہ کھلائے
گن ہر کے گا اور گن دکھلا
پھر کٹھن گھڑی وہ گنوائے

کچھ ہنس مکھ بلی کے بچے
واں اچھلیں کودیں آئیں
کریں چوسلے پر جھینگر چرچے
اُڑ چپٹیاں سیر دکھائیں

پر کسی جتن سے بدیسی کا
بہلائے نہ جی بہلے
پچھتاوا تھا جو من میں بھرا
تو آنسو بہہ نکلے

یہ بات جو دیکھی جوگی نے
تو سوچ میں کچھ آ کے
یوں پوچھا روتے گبھرو سے
"کیوں روتا ہے پیارے

کس اچھے گھر سے چھوٹا ہے
کیا گئی ہے تجھ پہ بیت
کس اوچھے میت کا مارا ہے
کس تریا کی ہے پیت

دھن کا کیا کوئی سوچ کرے
دھن ہے یہ چلتی چھاؤں
جو مورکھ دھن پر دھیان دھرے
مت لے تو اس کا ناؤں

یاں دکھ میں کون سنگھاتی ہے
ہے پیت کہانی ایک
سکھ سمپت کا جگ ساتھی ہے
دے پرے کو دکھ میں ٹیک

اور پیت ہے اس سے بھی بڑھکر   ہے تریا کا یہ کھیل
اس سوچ کو چھوڑ اور لاج توکر   اور تریا سے منہ موڑ"
جوگی نے دیکھے اچنبھے سے   وہ روپ اس گبھرو کے
تھے لاج بھرے وہ نین اس کے   اور جوبن ابھرا ہوا
تب کہنے لگی وہ جی سے مٹا   "جو مجھ سے ہوئی بھول
کرا نہی دیا مجھ تریا پر   ہے پیت میں چھوٹا دیس
جمنا کے تیر تھا باپ مرا   سکھ سمپت بیچ مگن
لیں موہ مجھے اتنے کے لئے   واں سیکڑوں گبھرو آئے
تھی بھیڑ اک چاہنے والوں کی   ہر کوئی لالچ دے
تھے کپڑے بھی کچھ یوں ہی سے   بل بوتا اور نہ دھن
جب بیٹھے وہ میرے پاس کبھی   تھا گاتا پیت کے گیت
تھیں لاج سے کلیاں مرجھائی   کہیں ڈوب مرے نا اوس
جوں اوس کی بوندیں اور کلیاں   ہیں سدا لبھاتی جی
تھی دیکھتی تیکھی چتون سے   اور روٹھتی تھی پل پل
میں اس پر بھی منتی تھی کہاں   جب توڑ لی اس کی آس
کیا بیٹھے بٹھائے پاپ چڑھا   کب بھولے گا یہ سوگ
پچھتاتی ہوئی اس بن میں جا   میں دوں گی اپنا جی
"ایسا مت کہہ" جوگی نے کہا   چھاتی سے اس کو لگا
"اے سندر پیاری دیکھ ادھر   بلہاری نینوں کے
لا چھاتی سے تجکو لگائے رہوں   اور سوچ کو ماروں لات
رکھینگے پیار سے کام سدا   اب الگ نا ہونگے کبھی
یاں تک تھے بچن اس جوگی کے   ملا دھن جو گیا تھا چھن
شہباز یہ گیت انگریزی تھا   ہندی میں گایا میں

ہاں رکھتے ہیں اس دھرتی پر   کچھ چکوا چکوی میل
یہ اس نے کہا گبھرو نے ادھر   دیا جھیپ کے بھانڈا پھوڑ
جوں رات کے جاتے بھور ہوئے   جو دیس پڑا [illegible]
دیا بھانڈا پھوڑ ان دونوں نے   اس بھیس میں [illegible]
کیا کام یہاں مجھ پاپن کا   جہاں بھولیں دھرم کے [illegible]
یاں چین کہاں اور آن کدھر   ہے بتیا میں یہ [illegible]
اور مجھ اکلوتی بیٹی کا تھا   جو کچھ اس کا دھن
رہے ہر کوئی جی مجھ پہ دیئے   ہر کوئی مرا گن گائے
تھا ان میں پیارا موہن بھی   جو پیت کا ناول نہ [illegible]
گن گیان ہی تھا کچھ پاس اس کے   تھا اپنا وہ ہی بھجن
جو لے تھی اس کی رس کی بھری   جو دھن تھی اس کی پیت
ان سے وہ من کی ستھرائی   تھی آگے سیکڑوں کوس
وہ میرے جی کو لبھاتا واں   یاں دھن تھی رکھوالی کی
تھے ڈھنگ ستانے کے سارے   وہ جائے پرے پل پل
بھایا اس کو جنگل کا سماں   جہاں جی سے گیا وہ اوار
جل جاؤں اس کی چتا پہ جا   اس کارن لیا ہے جوگ
ایسا ہی اس موہن نے کیا   ایسا ہی کروں میں بھی
مانا ناری نے جی میں برا   پر دیکھے تو موہن ہی ہو
دیکھ اپنے موہن کو جی بھر   جو آن ملا تجھ سے
تو جی ہے تجھ سے الگ نا ہوں   اور چین کروں دن رات
کیا کام اب ٹھنڈے سانسوں کا   آمل لیں کھول کے جی
جوں ہرنے ان کے دن پھیرے   یوں ہی پھیرے سب کے دن
اب نیاؤ کریں اس گانے کا   جو سننے والے ہیں

عبدالغفور شہباز

"ازماست کہ برماست"

عزیز کو گو وہ عہدِ طفولیت میں تھا، ایسی دنیا ملی جہاں سنجیدگی، متانت، صداقت کا دور دورہ تھا اور یہی وہ خوبیاں
تھیں جو اس کے گزشتہ دور میں ممد و معاون رہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی سے جو نیکیاں یا برائیاں طبیعت کا جزو بن جائیں گی وہی
تاحیات قائم ہو جاتی ہیں عزیز کے خاندان میں یوں تو ہر شخص جدا مزاج اور طبیعت رکھتا تھا لیکن جہاں تک توکل الی اللہ
اور خدا ترسی کا تعلق ہے سب ایک سے تھے اور ممکن تھا کہ یہ خوبیاں عزیز میں بھی فطرت ہو جاتیں۔ اگر شروع ہی سے اُسے درسِ آزادی
نہ دیا جاتا۔ جہاں ایک طرف اس کا تعلیمی انہماک و شغف بڑھا ہوا تھا اور علم کے حاصل کرنے کے لئے اس کی طبیعت بے چین رہتی
تھی وہاں اپنی آزادی کے صدقہ میں اس کا مزاج حسن پرست ہو گیا تھا۔ باوجود چند مستقل اصولوں کے جن کا وہ سختی سے پابند تھا اور
جن کی تلقین ہر وہ ایسے مخلص رفیق کو کیا کرتا تھا جس کے اخلاص و صداقت پر اُسے اعتماد اور اعتبار تھا لیکن پھر بھی دلدادگانِ حسن
کی طبائع ہمیشہ گردش میں رہتی ہیں اور یہی وجہ اکثر حسنِ ظاہرہ کی فریب کاریوں سے متاثر ہو کر اس کے دل پر ایک انتشاری
کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت اس کے سارے اصول نقش بر آب سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔ کہنے کو تو وہ کہا
کرتا تھا کہ جسمانی زیب و زینت، خوش پوشاکی، وقت کا زیادہ حصہ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں گزارنا، ہر شے
میں لطف و تفریح کی تلاش کرنا، اخلاقیات کی یہ وہ بدترین مضحک آمیز جزئیات ہیں جس میں انسان پڑ کر امید کامیابی کو اوجھل
کر کے قعرِ مذلت کی طرف جا پڑتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک عرصہ تک وہ ان تمام باتوں سے متنفر بھی رہا اور محترز
بھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے یہ خیالات راسخ ہو جاتے۔ اگر زمانہ کی ستم ظریفی اسے اس دُنیا سے نکال کر ایک ایسے ماحول
میں نہ لے جاتی جہاں کی فضا، حسنِ سحر آگیں کی جلوہ پاشیوں سے گل بداماں، جہاں کی آب و ہوا کیف آور، جہاں کا ذرہ
ذرہ غارت گرِ صبر و سکون، جہاں اگر صبح دم بارانِ کیف و مستی تو وقتِ شام مئے حسن کے جام لنڈھائے جاتے تھے۔
جہاں کی معاشرت آرائیاں " دامانِ باغبان و کفِ گل فروش "۔ جہاں کے عالم سرمستی کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ
تھے۔ ایسی دنیا میں پہنچ کر عزیز نے گو ہزار سعیٔ امکانی سے کام لیا مگر دامنِ صبر و قرار چھوڑتے ہی بن پڑی گزشتہ زمانے
کے وہ مقاصد جن پر کبھی وہ جان دیتا تھا، تخیل کی وہ سادگیاں جو اس کے پیشِ نظر رہتی تھیں، مزاج کی [illegible]

جو اس کی عین فطرت تھی، متانت آمیز شگفتگی جو اُس کی اصل جوہر تھی' آہستہ آہستہ اس سے رخصت ہونی شروع ہوگئیں۔ یہ دنیا جس نے اس کی طبیعت میں یہ انقلابِ عظیم پیدا کیا علی گڑھ کی زمینِ جنوں نواز تھی۔

یہ کہنا کہ اب عزیز میں متانت و سنجیدگی مفقود ہو گئی تھی بے جا ہوگا۔ عہدِ ماضی کے نقوش ایسے دُھندے نہیں تھے کہ نئی زندگی کی "قیامت سامانیاں" چند گردشوں میں مٹا دیتیں۔ یہ وہ خطوط تھے جو اس کے لوحِ دل پر ثبت تھے جنھیں صرف زمانہ ہی اپنی مستقل گردش سے مٹا سکتی تھی۔ شبانہ روز کی سرمستیاں کتنی ہی کیف انگیز کیوں نہ ہوں مگر فطرت کی سادگیاں اُس کیف کے لئے ترشیوں کا کام دیتی رہتی ہیں۔ بالآخر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ماحول کے تاثرات فطری کمزوریوں پر غالب آتے ہیں اور ضمیر کی صدا بے معنی ثابت ہوتی ہے۔ ابتدا میں عزیز اپنے اصولوں کا دلدادہ اس ہنگامہ شر کی دنیا سے علیٰحدہ رہا۔ مگر چوں کہ طبیعت میں خلقِ عظیم تھا اس لئے وہ ہر شخص سے ملتا ضرور تھا اور یہاں تک کہ اُس کے اخلاق نے بہت سے دلوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ قدرت نے اسے صوری اور سیری دونوں صورتوں سے بہت کچھ عطا فرمایا تھا۔ مگر باوجود ان عطایاتِ الٰہی کے اسے خود اس کی خبر نہ تھی۔ اس کے اعمال و اقوال' ریاکاری اور کیّادی سے پاک ہوا کرتے تھے۔ ایک فرشتہ تھا عالمِ معصومیت کا، ایک دُرِّ بے بہا تھا دُنیائے اخلاقیات کا، ایک پھول تھا چمنستانِ خُلق کا لیکن ایسا فرشتہ جس کے متعلق منشا باری تھا کہ کشمکشِ حیات کی مسموم فضا میں انفاس حاصل کرے۔ ایسا موتی تھا جو جہانِ ناپائدار کی آب و ہوا سے بیرنگ ہو جائے۔ ایسا پھول تھا جو بادِ صَرصَر کے جھونکوں سے بہت جلد پژمُردہ ہو جائے۔ عہدِ طفلی کی معصوم روش تھوڑے ہی عرصہ میں غمّازی سے بدل گئی۔ اب نہ وہ سادگی باقی تھی اور نہ وہ متانت۔ شب و روز احباب کی مجلسیں (جن کی نظروں میں عزیز حُسنِ کامل بنکر نہاں تھا) گرم رہنے لگیں۔ دنیا کی ہر قسم کی دلچسپیاں بہم کی جانے لگیں۔ ہر شخص دیدہ و دل سے اُسے خیر مقدم کہتا تھا۔ اور وہ تھا کہ ان احباب کی گندم نما جو فروشی پر آمنّا و صدّقنا کہنے پر آمادہ۔ اس کیفیتِ گوناگوں کو اگر اُس کے مخلص دوست صحیح معنوں میں تلخ کرنا بھی چاہتے تو یہ تلخی اتنی شدید معلوم ہوتی کہ زہر آلود نشتر بھی اس کے سامنے بے کار ثابت ہوتا۔ لطف و مسرت کی صحبتیں اتنی حیرت انگیز طریقہ پر مکیّف ہوتی ہیں کہ بے چارہ انسان اپنی جرأت اپنی شرافت کو کھو کر سپر ڈال دیتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ میلانِ طبع کچھ برائیوں کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ نیکیاں حقیقت میں گلِ صحرائی کے مانند ہوتی ہیں جو تنہا کھل کر خود ہی خشک ہو جاتا ہے مگر برائیاں اس شرابِ آتشیں کے مانند ہیں جو قوی میں سرور پیدا کر کے آہستہ آہستہ فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ عزیز کے دل و دماغ سے رفتہ رفتہ اصولِ حسنہ محو ہوتے گئے اور ان کی جگہ بد دماغی

تعیش پرستی۔ خود نمائی اور خودی کے اثرات قائم ہوتے گئے اور سچ تو یہ ہے کہ عزیز کی بدصحبت نے اُسے ایسے سانچے میں ڈھالا
کہ اس کے ماضی اور حال میں کسی طرح کی مناسبت ہی نہ رہی۔ اب جس طرف بھی اس کی نگاہ اُٹھتی۔ اس کے احباب اس نگاہ
کو سرمایۂ زیست سمجھ کر دل میں جگہ دیتے۔ اس کی ہر روش کو اپنی حیات کا انقلابِ عظیم سمجھتے۔ اس کا معصومانہ اندازِ کلام
ایسا سحر تھا کہ سامع کی قوتِ امتیاز و مدرکہ پر اپنا فوری اثر زائل نہ ہونے دیتا۔ دیکھا گیا ہے کہ ایسی صورتیں اکثر ذہنیات میں
تغیر پیدا کرتی رہتی ہیں۔ یہ تو کیسے کہا جائے کہ اس کشمکش سے نا واقف تھا جو خاموشی سے اس کی شہرت میں گھن لگا رہی
تھی لیکن شاید یہ ضرور تھا کہ تفنّنِ طبع اُسے اس راہ پر گامزن کرنے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ اُس کی شہرت اب صرف ان ہی
معنوں میں رہ گئی تھی کہ اوباش قسم کے لوگوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

اس کا نظریہ اب اس حد تک مختلف ہوگیا تھا کہ ہر فعلِ شنیعہ کا ارتکاب اس لئے ضرور کرنا چاہیئے کہ اس سے انسان
تجربہ کار ہو جاتا ہے لیکن اس سے اس کی خبر نہ تھی کہ ہم اپنی طبعی تاویلات سے گناہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بدخصائل رفتہ رفتہ
نشو و نما پاکر ہماری حیات کی تابانی کو تلف کر دیتی ہیں۔ یوں تو کائنات کی ہر شے میں حسن و قبح دونوں کے پہلو پائے جاتے
ہیں لیکن انسان مشعلِ عقل کو اپنی رہنمائی کے لئے کام لادے تو کوئی وجہ نہیں کہ صرف تاریک پہلو ہی ہمارے تجربہ حاصل
کرنے کے لئے ضروری سمجھ لیا جائے۔ عمل صالح بظاہر اپنے اندر کوئی دلچسپیاں نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ ہماری طبیعتیں اس
سے بہت کم مانوس ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی کسی حد تک درست ہے کہ عمل صالح بھی ارتقاءِ انسانی میں ممد رہا ہے لیکن یکسر امورِ
حسنہ کو نظر انداز کر دینا یہ نفسِ امارہ کی دلیلِ باطل ہے۔ عزیز کا قوائے شہوانیہ کو یک دم آزادی دے دینا حسن صوری کی
گرویدگی کے پردے میں مسلکِ نفس پرستی اختیار کر لینا کسی صورت بھی فعلِ مستحسن نہیں قرار دیا جاسکتا اور اسی لئے اس کے
گم کردہ راہی کی ذمہ داری صرف اُسی پر رکھی گئی۔ عزیز کی زندگی اسی ماحول میں تین برس گزر گئی۔ شب و روز ایک ہی
قسم کے مناظر سامنے رہے۔ ایک ہی فضا میں سانس لیتا رہا یہاں تک کہ وہ اس ماحول کے تاثرات کا عادی ہوگیا۔ اب
اسے وہی باتیں بھلی معلوم ہونے لگیں جن سے کبھی اُسے عار آتی تھی۔ اس وقت علی گڑھ میں یوں تو سب ہی قسم کی ہستیاں
موجود تھیں لیکن وہ حضرات جو علمبردارِ اصولِ حسنہ سمجھے جاتے تھے اُن کی یہ حالت تھی کہ وہ مجسمۂ خودی اور خود نمائی
تھے۔ ان کی جبلی فطرت ہوگئی تھی کہ بہ استثنا رچند مخصوص ہستیوں کے ہر شخص کو بہ نظرِ حقارت دیکھیں۔ ہر شخص سے اس کی
توقع کریں کہ عوام ان کی جبروتیت اور قہاریت کا دم بھرتے ہوئے نہایت خلوص کے ساتھ اپنی بیچارگی کا شاہد

کریں۔ چند عالی موالی ضرور تھے جن کے ذمہ یہ کام تھا کہ نہایت بلند آہنگی کے ساتھ ان کی قدامت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں اس کے صدقے میں وہ لوگ ان دربار خاص سے مقربین کا امتیازی تمغہ حاصل کر لیتے تھے۔ انسان فطرتاً سوشل واقع ہوا ہے اس لئے یہ حضرات بہ حیثیت انسان ہونے کے ان قیود سے کیسے آزادی حاصل کرتے لیکن پھر بھی انھوں نے اس قید کو آزادی سے یوں ممزوج کیا کہ صرف ایسے لوگوں سے ملتے جو خود بھی اس حالت سے گزر کر اب فراغت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ تھی کہ اپنے کو بلند حوصلہ ثابت کرنے کے لئے یہ حضرات صوفی مشرب بھی تھے۔ آپ لوگوں کے تفریحی مشاغل بھی دہی کچھ تھے جن پر مغربی دنیا لوٹ ہے یعنی قمار بازی مگر مہذب طریقہ پر شراب کا تھوڑا بہت استعمال مگر کبھی کبھی۔ شریف گانا جن سے مذاق کی شستگی کا اظہار منظور ہوتا ورد زبان رہتی تھیں۔ مگر غنیمت یہ بھی تھا کہ مذاق چند ہی لوگوں میں محدود تھا۔ عزیز فطرتاً جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں حوصلہ مند واقع ہوا تھا۔ کسی شخص کا حوصلہ مند ہونا فی نفسہ بُرا نہیں لیکن اشیا کی تحصیل خود ہی اس میں نیک و بد کا امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ ایسی صحبت میں عزیز کے شب و روز بسر ہوتے تھے۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ یہ باتیں اس کی طبیعت میں ذہن نشین نہ ہو جاتیں اُسے اپنی موجودہ روش پر افتخار بھی تھا اور فخر بھی کیا کرتا تھا اسے ان کی تہذیب پر حیرت تھی۔ غرور اور خود بینی کی نمائش سے اُس کی آنکھیں چکاچوند تھیں۔ مزاج خود پسند ہو گیا۔ غرض یہ کہ اُس کی مثال اُس زاہد مرتاض کی تھی جو اہل دنیا کے سامنے اپنے زہد و اتقا کی مثال پیش کرے۔ مگر چوں بخلوت می رود آں کار دیگری کند پر عمل پیرا ہو۔

عزیز کو اب نیک مشورہ دینا تحصیل حاصل تھا۔ موسم گرما کی تعطیلیں ہوئیں۔ علی گڑھ جو اب سے چند روز قبل ایک محشر ہنگامہ بنا ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ایک محفلِ خاموش بن گیا۔ اب نہ وہ چہل پہل باقی رہی اور نہ وہ شور و شر۔ ہاں ان کے بجائے ایک سائیں سائیں کا عالم رہ گیا۔ تمام طلبا اپنے اپنے وطن جا چکے۔ عزیز بھی اس نئی زندگی کی یاد دل میں لے کر اپنے وطن پہنچا۔ چند دنوں دوستوں کی یاد ستاتی رہی۔ تہذیب کے ساتھ تعیش پرستی یہاں مفقود تھی۔ کسی شے میں جی نہ لگا۔ مگر نفسِ ضرورت اُن اسباق کو دہرانا چاہا جنھیں اس سے پیشتر اپنے دارالعلوم میں حاصل کر چکا تھا مگر موجودہ ماحول میں اس تہذیب [illegible] سے وہ اپنی طبیعت کو محظوظ کیا کرتا تھا نہ ملتی تھیں۔ پھر بھی وقت اور موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے تجربہ کو وسیع [illegible] اس زمین پر [illegible] شروع کر دی۔ چوں کہ [illegible] جانے سے پیشتر وہ اپنی نیک نامی اور قطع کل

[illegible]

اتفاق وقت دیکھئے یہ گمان باطل بھی اُس کا اور زیادہ معاون ہوا۔ اُس کی جولانگاہیاں اور مزاج کی تیزیاں ہمیشہ اوپر ہی اوپر رہنے لگیں۔ نوگرفتارِ قفس اُس دام کو جس میں وہ گرفتار تھا اپنا آشیاں سمجھنے لگا۔ پھر کیا تھا آزادی اور بے باکی کے ساتھ گُل چھرے اُڑنے لگے۔ بادہ نیم رس شباب انگیزیوں کے نظر ہونے لگا۔

جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ موسم گرما ہے۔ مہرِ عالم تاب تمام دن ضیا پاشی کرکے اب رخصت ہو چکا ہے۔

عزیز اپنے چند دوستوں کے ساتھ سینما دیکھنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ راستہ بھر طرح طرح کی دلچسپیاں ہنسی اور مذاق ہوتا رہا۔ ۷½ بجے سینما ہوس پہونچ گیا۔ اسپیشل کی چند جگہیں رزرو (Reserve) کرائی گئیں۔ سینما کا دوسرا شو نو بجے سے شروع ہونے والا تھا اس لئے نزدیک کے ہوٹل میں شربت پینے کی غرض سے سب چلے گئے۔

اس وقت سینما ہال بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بجلی کے پنکھے اپنی مستقل ترنم آمیز گردش سے ہوا پہونچا رہے تھے۔ ٹھیک نو بجے سینما شروع ہوا اور روشنی غائب ہوگئی۔ عزیز مع اپنے ساتھیوں کے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ سینما کی حیرت انگیز ایجاد اور برق کے محیر العقول کارناموں دلچسپ سین اور پلاٹوں پر تنقید ہونے لگی۔ اس دلچسپ بحث میں عزیز بھی کبھی کبھی حصہ لیتا تھا مگر کچھ ایسی بے خبری کے عالم میں جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کی خیالی دنیا میں کسی دوسری شے کا پرتو پڑ رہا ہے۔ عزیز کے دوستوں میں نعیم سب سے زیادہ سمجھدار تھا۔ عزیز کی اُس بے خبری سے کچھ کھٹک گیا۔ اب اسے اس کی تشویش ہوئی کہ کسی طرح اس کا سبب معلوم کرے۔ خیر تھوڑے عرصہ بعد روشنی ہوئی۔ ہال میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا۔ عزیز کے دوسرے ہمراہی بھی اس ہنگامہ میں شریک ہوگئے لیکن عزیز خاموشی سے اپنے بائیں طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نعیم اُس کی اس غیر حاضر دماغی کی وجہ معلوم کرنے کی فکر میں تھا ہی وہ بھی اسی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتا کیا ہے کہ عزیز سے چند نشستوں کے فاصلہ پر ایک حسین فرشتہ بیٹھا ہوا ہے۔ یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ حسن کا کوئی معیار قرار دیا جا سکتا ہے اس لئے کہ ہر وہ شے جو نظر فریب ہو حسین کہی جا سکتی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اُس میں چند باتیں ایسی ہیں جن کی نسبت سے کہا جا سکتا ہے کہ حُسن کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ حسین ضرور تھی۔ غزالی سیاہ چشم۔ جسم گداز۔ گردن ... بلکہ قدرت کی صناعی کا بہترین نمونہ تھی۔ چہرہ سے سادگی و معصومیت ظاہر۔ آنکھوں سے حیا ٹپک رہی تھی۔ ... یہ ... کے لئے زہر کا کام دیتی ہے۔ لیکن اُس کے بھولے چہرے سے صاف ... عصمت و حیا کے ...

دہر کے مسموم جھونکوں کی رسائی اُس کے دامن تک نہیں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ کسی شے کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دینے سے ایک برقی کشش پیدا ہو کر جاتی ہے۔ شے متوجہ کے خیالات میں ایک لہر دوڑا دیتی ہے۔ چنانچہ یہ قوت یہاں بھی کارفرما ہو کر رہی یکایک اس حسینہ کی نگاہِ برق پاش اُٹھی۔ عزیز کی نظروں سے ملی اور پھر پھر دونوں نگاہیں زمین پر تھیں۔ سچ ہے کہ حسن اس وسعت آباد کے ہر گوشہ میں اپنی غالب حریفی کا ثبوت دے چکا ہے۔ کائنات کا کوئی حصہ نہیں جو حسن کے جذب و کشش سے خالی ہو۔ نعیم کے لبوں پر یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار ایک تبسم آگیا۔ چاہتا تھا کہ عزیز کو اسی وقت چھیڑے مگر اس خیال سے کہ مبادا یہ راز قبل از وقت طشت از بام ہو جائے خاموش رہا۔ لیکن یہاں عزیز پر کچھ ایسی بجلی گری کہ چند لمحات کے لئے کھوسے گئے۔ یکایک یہ عالمِ مدہوشی رخصت ہوا۔ نظر پھر اُٹھی سامنے پھر وہی بہ ہم کُن جذبات مجسمہ موجود تھا اب کی یہ ہوا کہ شوقِ نظارگی نگاہیں صرف سینہ تک جرأت کر سکیں۔ آگے بڑھنا اُن کے لئے ختم ہو گیا۔ شوق کی مضطرب نظریں یاس آفریں خیالات کی موجوں میں غرق ہو گئیں۔ عزیز کی بوالہوس طبیعت چاہتی تھی کہ ملالک فریب چہرہ کی نظر ہی نظر میں اچھی طرح خوشہ چینی کی جائے لیکن دامنِ حسن کی عصمت مآبیاں برق خاطف بن بن کر ان والہانہ جذبات کو جلا کر خاک کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ نعیم سے تادیر صبر نہ ہو سکا آہستہ سے عزیز کے شانہ کو حرکت دے کر کہا ؎

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

عزیز کو مطلق علم نہ تھا کہ اُس کی اس سوادِ نظری کی مجرمانہ کیفیت کا کوئی دوسرا مطالعہ کر رہا ہے نعیم سے یہ شعر سُن کر پریشان ہو گیا۔ لیکن پھر فوراً حواس درست کر کے کہنے لگا۔ نعیم قدرت کی صنعتِ اعلیٰ کا مطالعہ کرنا تمھارے مسلک میں گناہ ہو تو ہو لیکن میرے خیال میں یہ بہترین عبادت ہے کہ خالق کی جلوہ آرائیوں کی جستجو اس کی مخلوق میں کی جائے۔ تم ہی کہو کہ کیا تمھیں اس حقیقت سے انکار ہے کہ یہ حسین لڑکی اپنے خلاق صنعتوں کا بہترین نمونہ نہ تھی؟ کیا اس سے ہم اس نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتے کہ اس کا خلق کرنے والا کہیں زیادہ حسین ہو سکتا ہے؟ اگر ہمارا تخیل اس حد تک پہونچ سکتا ہے تو پھر یہ کتنا غلط مسلک ہے کہ ایسے روشن ترین دلائل و براہین منہیات کے تحت میں اُٹھ جائیں۔

نعیم ــ درست اور بالکل درست اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے جمالیات کی مظہر ہیں لیکن یہ خیال کرتے وقت اس کا لحاظ رکھئے کہ خالق کی صفات مخلوق میں بدرجۂ اتم ہیں۔ اُس بحرِ ذخار کے ایک قطرہ سے کُل

کائنات کی سیرابی ہوتی ہے اس لئے جزو سے کل کا پتہ لگا لینا ناممکن الوقوع ہے۔ خیر اس کو بھی جانے دیجئے۔ اگر آپ مخلوق میں
خالق کی جلوہ پاشیوں کے متلاشی ہیں تو عالمِ اسباب کے ہر ذرّہ سے اُس کی حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ آپ اپنی
ہی جیسی مخلوق میں اُس پرتو کے جویا ہوں اور دوسری اشیاءِ عالم کو قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھیں۔ آپ کہتے ہیں کہ قدرت کی صنعتوں کا
اعلیٰ نمونہ ہے۔ میں کہوں گا کہ آپ اپنے کوٹ کے اس پھول کو لے لیجئے۔ کیا اس کا رنگ اُس حسینہ کے رنگ سے زیادہ
دلفریب نہیں۔ کیا اس کی خوشبو اُس حسینہ کے تنفس سے زیادہ فرحت افزا نہیں؟ کیا اس کی گدازگی اور ملائمت اُس حسینہ
کے جسم سے کم ہے۔ اس کی سادگی اور دلفریبی اُس کی رعنائی معصومیت سے زیادہ ہی ہی تو پھر آپ اس پر اُسے کیوں ترجیح دیتے
ہیں۔ آپ کے خیالات اس پھول کے حسن کی طرف منعطف کیوں نہیں ہوتے۔

عزیز۔ یہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ اُسی شے کی طرف راغب ہوتی ہے جو اُس سے مناسبت میں قریب ترین
ہو۔ مانا کہ اُس حسن کا شائبہ اس پھول میں بھی پایا جاتا ہے لیکن طبائع انسانی اُس چیز کو جلد قبول کر لیتی ہیں جو سہل الفہم ہوں
ایک انسان پر دوسرے انسان کی نیکیاں اور برائیاں جلد منکشف ہو جایا کرتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جذبات نفرت و محبت
کا اثر جلد ہو سکتا ہے برخلاف ایک بے جان شے گو اپنے اندر رعنائیاں نہاں رکھتی ہے لیکن اُن رعنائیوں کے احساس
کے لئے قوتِ ادراک کے تیز ہونے کی ضرورت ہے۔ ماسوا اس کے انسان اشرف المخلوقات ہے احسن الخالقین کا طرۂ
امتیازی رکھتا ہے اس لئے لازمی طور پر اُسے خالق کے صفاتِ حسنہ زیادہ ودیعت کئے گئے ہوں گے۔ لہٰذا اس کے
حسن میں عین حقیقت کی تنویریں زیادہ نمایاں ہوں گی۔ اب جو شے بلا کد و کاوش کے حاصل ہو سکتی ہے تو کیا ضرور کہ اس کے
لئے صرف جستجو ہی کر رہئے۔"

نعیم۔ آپ جس چیز کو فطرت انسانی کا تقاضا کہتے ہیں میرے خیال میں وہی فطرت کی سہل انگاری کا دل خوش کن فریب
ہے۔ ہماری نظریں اشیاء کی سطحی دلفریبیوں پر لوٹ جاتی ہیں۔ ہمارا دل اُن ہی بالائی کیفیات پر محو ہو جاتا ہے۔ کاش اشیاء
کی ظاہری حالت کو نظر انداز کریں۔ ہماری وسعتِ نظری مدد کرے تو ہم ایک ایسے عالم میں پہنچیں جہاں مجاز نہ کچھ
نظر آئے لیکن نفسِ امارہ طبعی تاویلات سے ہر صحرائے ناپیدا کنار کو گلشنِ صد بہار کر کے پیش کرتی ہے۔ ادہم جوہرِ انسانی
اُس کے ہاتھوں بیع کرنے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔ اشیاء کی سطحی صورت کچھ اتنی زیادہ دلچسپ ہوتی ہے کہ ہم ایک لمحہ
بھی اس کی ماہیت اور اصلیت سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ ظاہری اسباب و نقوش پر نظر ڈالتے

بلسگونہ تسکین ہوجاتی ہے۔ لیکن اُن کے اسباب وعلل پر قیاس دوڑانے کی جرأت بھی نہیں ہوتی۔ میرا مطلب اس ساری
ح خراشی سے صرف اتنا ہی کہ حسن سے انسان پر تزکیۂ نفس سے زیادہ خواہشِ نفس کا اثر پڑتا ہے۔ اگر ضمیر کی خلوص آمیز بروقت
پر اس خوشگواری میں تلخی کا سامان مہیا کردے تو اس تلخی کو خواہشِ نفس بے معنی ثابت کرنے کے لئے بظاہر
ی استدلال سے کام لیتی ہے۔ انسان کی فطرت کا جوں کہ برائیوں سے زیادہ لگاؤ ہے اس لئے خواہش کو اس میں کامیابی بھی
تی ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے مجھے انکار نہیں لیکن اہلِ دانش وبینش پر یہ اچھی طرح واضح ہے کہ یہ شرف محض
ل و دانائی کی بنا پر ہے نہ کہ حسن دلفریبی کی وجہ سے اور ہاں آپ نے یہ کیا کہا کہ "جو شے بلاکدوکاوش حاصل ہوسکتی ہے
س کے لئے صرف جستجو بن کر رہئے۔ معاف کیجئے گا مجھے اول تو اسی سے انکار ہے کہ اتنا اہم مقصد جو فی الحال ہمارا موضوع ہے
دوکاوش سے حاصل ہوسکتا بھی ہے لیکن بالفرضِ محال اُس کی ایک جھلک بھی ہم پالیں تو آپ ہی فرمائیے ایسی شے کی
ری نظروں میں قدر وقیمت ہی کیا ہوسکتی ہے۔ اور اگر قدر وقیمت بھی ہوئی تو اُسے قرار ہی کب ہوسکتا ہے۔

عزیزہ۔ نعیم میں اپنے قول کے جواز میں صوفیائے کرام کی تمثیلات پیش کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو اُن بزرگ ہستیوں نے
کو حقیقت کا زینہ قرار دیا ہے۔ ماسوا اگر اس کو قبول کرنے میں ہمیں پس وپیش بھی ہو تو بھی فطرت کے صاف وصریح اصولوں سے
لیسے چشم پوشی اختیار کرسکتے ہیں۔ مقناطیس لوہے کو دیکھو کہ اُس کی کشش کی زد میں صرف لوہا ہی آسکتا ہے۔ انسانی طبیعت
ہی خاصہ ہے کہ وہ صرف اپنے ہم جنس ہی کی طرف مائل ہوسکتی ہے۔

نعیم: یہ صوفیائے کرام سے اگر آپ کا مطلب آج کل کے رنگیلے پیاروں سے ہے تو میں یہ کہوں گا کہ ان کی تقلید
ہے آپ کو جس قدر جلد آزاد کرسکیں کیجئے اس لئے کہ نئی روشنی کے یہ اصحاب سالکِ جادۂ طریقت بن کر صوفیت کے پردے
میں دو آتشے بندے ہیں اگر بہ نظرِ تحقیق دیکھئے تو ان کے دامن ایسے ایسے بدترین گناہوں سے ملوث ہیں جن سے انسانیت
ہے۔ ہاں اگر صوفیوں سے عبارت ہے اُن درخشندہ ہستیوں کی جو قرونِ اولےٰ میں اپنے زہد وتقا کی مثالیں دنیا کے سامنے
پیش کرچکے ہیں تو اُنھیں جلوۂ حقیقی کی عریانیاں دنیا کی ہر شے میں نظر آتی تھیں نہ انسان کی تخصیص تھی نہ گل وخار کی قید۔ وہ
ن حقیقی سے مخمور تھے۔ اُنھیں دنیا جلوہ گاہِ ناز نظر آتی تھی۔ اور ہر شے میں تنویرِ حسن کی ضیا پاشیاں نظر آتی تھیں۔ ہماری
کسی شے پہ مائل ہونے اور نہ ہونے سے نہیں کسی چیز پر مائل ہونا اور کسی چیز میں ایک مخصوص صفت کا جو یا ہونا تراف
جہاں تک کہ اُس جوہر سے تعلق ہے مجھے بھی تسلیم ہے کسی جنس کی کشش کا اثر اپنی ہی جیسی جنس پر ہوسکتا ہے۔ لیکن میں

کشش و انجذاب کو معرض بحث میں نہیں لانا چاہتا۔

نعیم اور عزیز کی گفتگو کا سلسلہ یہیں تک پہونچا تھا کہ سینما ختم ہو گیا۔

نعیم کی مسلسل گفتگو نے عزیز کو اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہ اپنے دلچسپ مشغلہ کو قائم رکھ سکتا جس سے یہ ہوا کہ اُس حسینہ کے قوتِ پندار کو ایک ٹھیس لگی، اِدھر سینما ختم ہوا اُدھر گفتگو کا سلسلہ بھی ختم ہوا۔ عزیز کے دل میں پھر ایک گدگدی پیدا ہوئی چلتے چلتے ایک جھجکتی ہوئی نظر اُس حسینہ پر ڈالی۔ یہ آخری نظر خدا جانے کتنی سحر انگیز تھی اور کن کن تمناؤں و مسرتوں کی سرمایہ دار کہ اُس حسینہ کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی اور دونوں کی نگاہیں نیچی عزیز اُس وقت تمناؤں کی خارزار وادی میں متلاشی سکون تھا۔ طرح طرح کی امنگیں اور خواہش اُس کے دامنِ صبر کو پارہ پارہ کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اُسے علم تھا یہ منظر تادیر قائم نہ رہے گا۔ اور یہ صبر و ضبط کو لوٹنے والی ہستی کچھ ہی عرصہ میں ایک خواب کا نقشہ پیش کر کے غائب ہو جائے گی۔ اُس کا قلب اس وقت یاس و امید کی ہنگامہ آرائیوں سے دوچار تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ غارتگرِ صبر و سکون کون ہے اور نہ اس کی خبر تھی کہ "قزاقِ ہوش و عقل" کا مسکن کہاں ہے۔ چاہتا تھا کہ سرِ نیاز اُس ماہوش کے قدموں پر جھکا دے اور پھر دربارِ حسن سے جو بھی سزا اس کے لئے تجویز ہو وہی دائمی مسرت کا سرمایہ قرار دے۔ اُدھر دل کی فضا پر یاس کی تاریک گھٹائیں مستولی تھیں اِدھر حسرت شوق کی بے پناہ یورشوں کی داروگیر کا ہجوم تھا۔ عزیز کو اس کشاکش میں اس کا بھی خیال نہ رہا کہ اس کے ہمراہ چند اوباش قسم کے لوگ بھی ہیں جنھیں عزیز کے اس بڑھتے ہوئے والہانہ کیفیت کی ذرا بھی خبر ہو جاتی تو خدا ہی جانتا ہے صورت حالات کیا سے کیا ہو جاتی۔ نعیم ہی ایک ایسا شخص تھا جسے ان تمام حالات کی خبر تھی۔ اُس نے عزیز کی حد سے بڑھی ہوئی متغیر صورت دیکھی تو چہنک گیا کہ اسے اس وقت دوسروں کی نقادانہ نگاہوں سے نہ بچایا گیا تو معاملہ دگرگوں ہو جائے گا۔ لہٰذا دوستوں سے اُسی جگہ سے رخصت ہو گیا اور عزیز کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ اب عزیز و نعیم تنہا رہ گئے۔ حسینہ ہال سے نکل کر خراماں خراماں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جانے لگی۔ لیکن جاتے وقت پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ جب عزیز کو ہمہ تن اپنی ہی طرف مصروف نظارہ دیکھا تو رُکی جیب سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکال کر اس پر کچھ لکھا اُسے ایک شخص کے حوالہ کیا دور سے عزیز کا نشان بتلا کر آپ خود ٹیکسی پر بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

عزیز گو دیکھ اُسی طرف رہا تھا مگر جذبات کی دُنیا میں کچھ ایسا بھٹک رہا تھا کہ اُسے اس ساری کارروائی کی کچھ خبر بھی نہیں ہوئی مگر نعیم ذی نفس نے سب کچھ دیکھا اور ایک اطمینان کا سانس لیا۔ اُسے یقین تھا کہ عزیز کو اگر اُس حسینہ کا کچھ پتہ نہ ملا تو دیوانہ

کے بے تھاہ سمندر میں ہاتھ پیر مارتا نظر آئے گا۔ دو ڈاکٹر اس شخص سے وہ خط مذکور لے لیا اور عزیز سے کہا کہ اسے پڑھو۔ عزیز کی نظروں سے چونکہ حسینہ اب اوجھل ہو چکی تھی اس لئے پہلی سی محویت طاری نہ تھی۔ پرچہ کھول کر پڑھا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا:

"عالم اسباب کی بے ثبات اشیاء کی ظاہر احسن وخوبی پر نہ جائیے مبادا یہ لازوال پریشانیوں کی ——

پیش خیمہ ثابت ہو۔ پھر بجز تحسر و تاسف کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

نعیم:۔ تم سمجھے کیا اس سے درس عبرت نہیں حاصل کر سکتے؟

عزیز:۔ ہاں کیوں نہیں لیکن عالم اسباب کی تمام اشیاء نظر انداز کر دی جائیں تو زندگی انجام کار ایک تلخ حقیقت رہ جائے گی۔

نعیم۔ لیکن کیا ضروری ہے ان اشیاء میں آپ دلفریبی کا سامان بھی پیدا کریں۔

عزیز۔ اگر ایسا نہ ہو تو کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت کا انکشاف ہی نہیں۔

نعیم:۔ بہ خوش۔ ماہیت وحقیقت کے پردے میں فدا ہونا آپ ہی کا کام ہے۔

عزیز۔ اگر اسے آپ فدا ہی ہونے سے منسوب کرتے ہیں تو یہ میرا فعل ہے جس کی ذمہ داری صرف مجھی پر عاید ہوتی ہے۔

نعیم سمجھ گیا کہ عزیز کو زیادہ چھیڑنا آگ پر تیل ڈالنے کا مترادف ہوگا۔ مناسب یہی سمجھا کہ بات زیادہ نہ بڑھائی جائے اس لئے عزیز سے رخصت ہو کر اپنے مکان واپس آیا۔

عزیز اب یکہ و تنہا رہ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر جو پوشیدہ جذبات رقصاں تھے اُن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دل میں ایک کھٹک محسوس کر رہا تھا۔ تشنۂ غم کی جوں جکانی کامیاب تھی۔ خیالات کے پے در پے ہجوم دماغ کو مختل کر رہے تھے۔ خیر کسی نہ کسی طرح مکان پہونچا۔ مکان میں نیند کا بہانہ کر کے پلنگ پر لیٹ رہا۔ لیٹنا تھا کہ پھر وہی خیالی دنیا میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ چونکہ خاموش لیٹا ہوا تھا سب کو خواب کا گمان ہو گیا۔ لیکن عزیز کو نیند کہاں؛ بجائے نیند کے سکون بخش آغوش کے عالم بیداری کے پُر آشوب سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ ساحل آنکھوں سے اوجھل تھا لیکن فرسودہ امیدیں، سراب آسا کنارے کی جھلک پیش کر جایا کرتی تھیں۔ کبھی استقلال و صبر کے دامن کو مضبوط پکڑنے کا عزم مصمم کرتا تھا۔ گاہ مایوسی اس دامن کو دھجیاں اڑاتی نظر آتی تھیں۔ کروٹ بدلتا کہ شاید چین آجائے۔ لیکن اس کے بستر پر آج انگارے بچھے ہوئے تھے۔ کسی پہلو قرار کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ آرزوئیں اکساتی تھیں۔ تمنائیں بے تاب کرتی تھیں۔ حسرتیں تڑپتی تھیں۔ لیکن ناامیدی ان سب کو مغلوب کر رہی تھی۔

مریضِ غم کی یہ بےچینی نیند سے بھی نہ دیکھی گئی۔ آخر اُسے بھی رحم آ ہی گیا۔ پچھلا پہر تھا۔ ہوا میں تازگی بخش خنکی پیدا ہوگئی
عزیز کی بھی آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کا لگنا تھا کہ اُس کے سامنے پھر وہی شام کا منظر پیش ہوگیا۔ وہی حسینہ تھی، وہی سینما
اور وہی نظارہ بازی کی مصروفیت۔ عزیز تو عالمِ خواب کو عالمِ حقیقی سمجھا طبیعت پہلے ہی سے مضطرب تھی۔ دوڑ کر اُس
حسینہ کے پائے ناز پر سر رکھ دیا۔ حسینہ کے جذبات اُبھرے۔ حیاءِ نسوانی نے جواب دیدیا۔ خلشہائے تمنا نے پر
پھیلائے اور پھر اُس نے عزیز کا سر اُٹھا کر اپنے آغوش میں لے لیا۔ عزیز کے لئے یہ معراجِ محبت تھی۔ شوق و آرزو
کی بے پناہ وسعتیں انتہا سے مانوس نہیں ہوتیں۔ محبوب کا ہر کرم ایک نئی آرزو کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ انسانی طبائع اکثر و بیشتر
متلون ہوتی ہیں۔ صحرائے تمنا میں ہر قدم پُرفریب لہلہاتی ہوئی وادی کا منظر پیش کرتا رہتا ہے۔ آغوشِ محبوب
میں خود کو دیکھ کر عزیز کے جذبات بھڑکے لیکن رُعبِ حُسن اُن پر غالب تھا۔ یہ نظارہ کچھ اتنا دلچسپ تھا کہ اُس پر محویت
طاری ہوگئی۔ یکایک پھر کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ سینما ہے نہ وہ حسینہ اور نہ وہ آغوشِ شوق ایک صحرائے لق و دق
ہے جس میں وہ سراسیمہ و پریشان پھر رہا ہے۔ خود کے سوا کوئی متنفس وہاں نظر نہیں آتا چاہتا ہے کہ اس مصیبت سے
چھٹکارہ حاصل کرے لیکن رہائی و مخلصی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تھوڑی دیر میں یہ منظر بھی رخصت ہوگیا۔ اب کی
یہ نہایت خوب صورت پُرفضا وادی نظر آتی ہے۔ وہاں آیند و روند کی کثرت ہے لیکن اتنے لوگوں میں کوئی بھی اس
کی شناخت کا نہیں۔ اگر کسی کی طرف مخاطب بھی ہوتا ہے تو کسی کو اتنی بھی فرصت نہیں کہ اس کے سوال کا جواب بھی
دے۔ سخت حیرت میں تھا کہ یا الٰہی یہ عالمِ خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ اتنا بڑا مجمع مگر کوئی کسی کے حال کا
پرساں نہیں۔ ناچار تھک کر شاہ راہِ عام کے کنارہ پر بیٹھ گیا ناگاہ اُسی طرف سے اُسے ایک موٹر آتی ہوئی نظر پڑی
موٹر آہستہ آہستہ قریب سے گزر گئی۔ موٹر کے اندر بھی اُسے وہی اُس کی سرمایۂ مسرت ہستی دکھائی دی۔ گو تھکا ہوا تھا
ناامیدی کی سخت کشمکش نے اُسے چور چور کر دیا تھا۔ لیکن یاس کی گھنگور گھٹاؤں میں اُس کی بجلی کوند کر وہ کام کر جاتی
ہے جس کے سامنے سارے مصائب بادِ ہوا ثابت ہوتے ہیں۔ اُٹھا تکلیفوں کو بھول کر دوڑا اس خیال سے کہ شاید
اُس تک رسائی ہو جائے۔ چونکہ ممکن ہے سن کر اُسے رحم آ جائے۔ مگر یہ خیال ایک جنون تھا ایک وہم تھا۔ ایک
گمانِ باطل تھا۔ اپنی اس بے بسی پر رونے لگا۔ اپنی حرماں نصیبی پر واویلا کرنے لگا۔ اپنی شومیِ بختی پر اشک افشانی
شروع کر دی لیکن نہ کوئی سننے والا تھا نہ کوئی دیکھنے ہی والا اور نہ کوئی ہمدرد اس قدر رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

کا طلبند ہوتا تھا کہ اُسے جگا دیا گیا۔ اس وقت اُس سے ہر شخص گریہ کا سبب دریافت کرنے لگا۔ مگر اُس نے ایک پرخود خواب کا بہانہ کر کے سب کو ٹال دیا۔ آنکھوں سے نیند اُچاٹ ہو گئی۔ پھر وہی خیالی شبیہ نظر کے سامنے پھر گئی۔ ہجر یار کی تکلیف کچھ اس لئے زیادہ الم انگیز ہوتی ہے کہ محبوب کے تغافلِ روح فرسا کا تصور نیش زنی کرتا رہتا ہے اگر محبت کے جذبات کی قدر کا یقین ہو جائے تو آسودگیِ مزاج مزہ دے جائے لیکن ہر آرزو کی شکستگی ضبط و صبر کے نظام کو برہم کرتی رہتی ہے عزیز۔ محبت بہ یک نظر کا قائل نہ تھا" وہ سمجھتا تھا کہ جس ابتلا سے وہ گزر رہا ہے اُس کا اثر صرف اُسی کی ذات تک ہے اُسے اس کی بھی خبر تھی اس کی نو زائیدہ تمنائیں جذباتِ رکیک کی رہینِ منت ہیں جو محض آسودگی سے ہم کنار ہو کر پردۂ عدم میں چھپ جائیں گی وہ خوب واقف تھا کہ موجودہ ہیجان میں جو زہرہ گداز شان پیدا ہو گئی ہے وہ صرف مقصد پر دسترس نہ ہونے تک ہے لیکن مجبور تھا کہ اُسے اپنے نفس پر قابو نہ تھا۔ رات کی سیاہی ساعت بساعت سپیدہ سحری کے دامن میں چھپنے لگی۔ نسیمِ سحری کے تازگی بخش جھونکے اپنی خرامیدگی سے فضائے عالم کو درسِ بیداری دینے لگے۔ عزیز پر گو شب کی گوناگوں بے خودیوں کا اثر اب غالب نہ تھا لیکن خمار سحر آگیں کا رنگ اب بھی جھلک رہا تھا۔ بالآخر بستر سے اُٹھا اور اُٹھا تو اس طور سے کہ کچھ تو شب کی بیداری سے کسلمند اور بہت کچھ خواب کے تصور میں محو۔ خیر تمام ضروری کاموں سے فرصت حاصل کر کے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دل میں کچھ سوچتا ہوا ٹیکسی اسٹینڈ پہونچا۔ خدا جانے کیوں ہر ٹیکسی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہر نگاہ جو اُٹھتی امیدوں کی سرمایہ دار ہوتی مگر نگاہِ واپسیں سے حسرت و مایوسی ٹپکتی۔ جب ہر طرح پر مایوس ہو چکا تو واپسی کا رادہ کیا۔ ناگہاں ایک ٹیکسی پر نظر رُکی۔ کچھ ٹھٹکا لیکن پھر اُسے یقین کامل ہو گیا کہ جس ٹیکسی کا وہ جویا تھا وہ وہی ہے۔ لہٰذا اس پر بیٹھ گیا۔ شوفر نے دریافت کیا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ عزیز گو بیٹھ چکا تھا لیکن اُس کو سخت تشویش ہوئی کہ اپنے منزلِ مقصود کا کیا پتہ دے۔ اُسے خود علم نہیں تھا کہ کہاں جاتا ہے گو یہ جانتا تھا کہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ اب اس کے خیال میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ کبھی بے صبریِ طبع اس پر مجبور کرتی کہ منزلِ یار کا پتہ خود اُس سے پوچھے مگر پھر خیالِ رسوائی اس سے روکتی۔ آخر وارفتگیِ مزاج غالب آئی شوفر سے کہا "تم مجھے اُس کوٹھی پر لے چلو جہاں کل تم سینما ختم ہونے کے بعد گئے تھے شوفر نے چند لمحات کے عرصہ میں وہاں پہنچا دیا۔ عزیز نے اُسے رخصت کیا۔ خود اس فکر میں لگ گیا کہ کس طرح اُس کوٹھی کے رہنے والوں کا پتہ لگائے۔ تھوڑی دیر کسی آنے والے کے انتظار میں کھڑا رہا۔ جب کوئی آتا نظر نہ آیا تو ٹہلنا شروع کیا۔ اب خدا جانے کہ یہ اُس کی جذب کا اثر تھا یا محض اتفاق وقت کہ حسینہ نقرئی لباس زیب جسم کئے ہوئے نکلی۔ عزیز

کے لئے اب اور کیا چاہئے تھا۔ پہلے نظر ملتے ہی مبہوت ہو گیا لیکن پھر ہوش و حواس درست کئے۔ قلب کی عمیق ترین گہرائیوں میں طوفان بپا ہو گیا۔ سوئی ہوئی تمنائیں نئے سرے سے جاگ اٹھیں۔ دیوانہ وار دوڑا چاہتا تھا کہ اپنی ہستی اس کی ہستی میں مدغم کر دے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ سامنا ہونا ہی تھا کہ سب ارادے خاک میں مل گئے۔ حواس گم۔ دل بے قرار۔ طاقتِ گفتار جواب دے گئی۔ نگاہیں قدموں پر کسی شے کی متلاشی ہو گئیں۔ یہ ہی نہیں کہ صرف عزیز ہی پر یہ عالم کیف طاری ہوا ہو۔ حسینہ بھی کچھ کم متاثر نہ تھی۔ ایسے مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ جرأت سے کام لیتی ہے۔ عورت کی تخلیق میں فطرت نے کچھ ایسی قوتیں پنہاں کر دی ہیں کہ باوجود حیاء نسوانی کی کارفرمائی کے ہمت مردانہ کو بروئے کار لاتی ہے۔ عزیز خاموش تھا۔ حسینہ کو جرأتِ گویائی ہوئی۔ "میں نے جو کچھ لکھا کیا وہ قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا گیا یا یہ کہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی"۔ یہ وہ الفاظ تھے جو حسینہ کی زبان سے نکل کر فضا میں جذب ہو گئے۔ عزیز خاموش کھڑا ہوا جواب کی فکر میں خیال ہی خیال میں پریشان ہو رہا تھا۔ ہزاروں منصوبے باندھتا تھا لیکن زبان سے نطق سلب ہو چکا تھا۔ جب تھوڑی دیر اسی نوعیت سے گزر گئی اور عزیز کوئی جواب نہ دے سکا تو اس حسینہ نے پھر کہا۔

"میری ہستی جناب سے کسی صورت میں ادنیٰ نہیں۔ میں مانتی ہوں کہ اس وقت کی خاموشی ہزار گویائی کی آئینہ دار ہے لیکن میں پھر کہتی ہوں اس سے پیشتر کہ ہم لوگوں کا عکس ایک دوسرے کے آئینۂ ہستی میں نظر آئے۔ زمانہ کا نشیب و فراز ہمارے سامنے رہے۔ لیکن جذبات کے سطحی ہیجان کا رہینِ منت نہ ہونا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ مغلوب نظر آ رہے ہیں لیکن کاش یہ مغلوبیت دائمی خلوص سے آشنا ہو۔

عزیز نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر کہا۔ آپ خدارا میری خاموشی کو میری کج خلقی پر محمول نہ کیجئے۔ میں چاہتا ہوں کہ جواب دوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ آپ میں کون سی قوت کہربائی ہے جس نے میری گویائی کو میرے بس میں نہیں رکھا۔ حاکم کے فرمان کو نہ ماننے پر میں جانتا ہوں محکوم لائق تعزیر ہوتا ہے۔ لیکن ایک مجنون ایسی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ میرا یوں بے محابا ہونا میرے حسیاتِ لطیفہ کی توہین ہے۔ لیکن جب امیدوں کے منقطع ہونے کی صورت پیش آ جائے اور احساسات کی دنیا میں تموج برپا ہو تو آپ ہی فرمائیے کہ ایسے وقت میں انسان وہ الفاظ کہاں سے لائے جن سے قلب کے ہیجان انگیز کیفیات کی ترجمانی ہو سکے۔

حسینہ۔ میں جناب کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا یہ سکوت آپ کے جذبات کی ترجمانی پوری طور سے کر رہا ہے۔

شاید آپ نہیں جانتے عورت کا دل ملہم ہے اور مرد کے جذبات کا عکس اُس پر فوراً پڑتا ہے۔ آپ اسے کبھی یقین نہ کیجئے گا اگر کوئی عورت اب سے احساسِ لطیفہ کی تشریح پر مصر ہو۔ عورت فطرتاً زیادہ ذکی الاحساس ہے۔ اُس کا دل گو زمانہ کے نشیب و فراز سے آشنا نہیں ہوتا مگر جذباتِ محبت کی قوتِ ادراک میں بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ آپ کہیں یا نہ کہیں میں جانتی ہوں کہ اس وقت آپ کن خیالات کی رَو میں بہے جا رہے ہیں۔

عزیز:۔ جس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں مگر دنیائے تخیل کی فضا میں طوفان برپا تھا۔ تمنائیں دل کی گہرائیوں میں چٹکیاں لے رہی تھیں گلے میں جذبات کی کشمکش کی وجہ سے پھندے پڑ رہے تھے زبان خشک ہوئی جاتی تھی۔ خیالات اس تیزی کے ساتھ پلٹے کھا رہے تھے کہ کسی ایک نتیجہ پر پہونچنا ہی محال تھا۔ حسینہ کی گفتگو کا ایک ایک حرف کانوں سے گزر کر اُس کے دل میں گھر کر رہا تھا مگر جواب کا یارا نہ تھا۔ آخر کمال جدوجہد کے بعد کہا "اگر یہ سچ ہے کہ ہر کمال کا دامن زوال سے وابستہ ہی تو مجھے خوف ہے مبادا میرا قدم اول ہی میری تباہی سے ہمکنار نہ ہو۔ خوشی اور مسرت اگر کوئی حقیقت رکھتی ہے تو میرا خیال ہے نہیں صرف خیال ہی نہیں یقینِ کامل ہے کہ میری خوشی کی یہ تکمیل ہے۔ اے کاش اس مسرت کے لئے زوال نہ ہو۔ آپ کی گفتگو نے میرے لئے عالمِ مایوسی کا وہم بھی نہیں چھوڑا۔ کاش ناسازگار دہر ہمارے دلوں کو نہ بدلے۔

حسینہ۔ میں جناب سے پھر التجا کروں گی کہ آپ عالمِ اسباب کی ہنگامہ آرائیوں کے نذر اپنے جذبات کو نہ کیجئے۔ خوب سمجھ لیجئے رشتۂ مودت جوڑنا مرد کے لئے بہت آسان ہے اُس کا مرکزِ محبت اُس کشتی کی طرح ہی جو طوفان میں گھری ہے جو موجوں کے ہر تھپیڑے سے اپنا رُخ بدل سکتی ہو۔ اُس کا دل لذت یابی کا جویا ہے وہ مایوسی کی ہمت شکن رستخیزیوں کی تاب نہیں لاسکتا وہ سکون بخش سکون آمیز راحت کا طلبگار ہے۔ وہ محبت کا متلاشی محض محبت کی لذت کے لئے ہے لیکن آہ عورت کی تخلیق میں قدرت نے صبر آزما ابتلا کی شان مستور رکھی ہے۔ اُس کے لئے محبت کا یقین کرنا ضرور مشکل ہے لیکن یقین کے بعد دُنیا کی بڑی سے بڑی قوت اُس کے عزم و استقلال کو جنبش نہیں دے سکتی۔ وہ محبت محبت کے لئے کرتی ہے۔ عورت ایک پھول کے مانند ہے اور محبت اُس کی بدرجۂ خوشبو جس کی فنا پھول کے دامن سے وابستہ ہو۔ آپ اُس کا دل بآسانی توڑ سکتے ہیں مگر اُس کی روح آپ کی دار و گیر سے آزاد ہے۔ اس لئے سوچ لیجئے کہ کسی کی زندگی کا آسرا بنکر اُسے مایوس نہ کیجئے گا۔

عزیز۔ میں نہیں کہتا کہ مرد محبت کے اظہار میں بے باک نہیں۔ اگر دوسری طرف کی بے اعتنائیاں اُسے مجبور نہ کردیں تو وہ بھی ضبط سے کام لے سکتا ہے۔ زمانہ کی سرد مہریاں۔ حیاتِ چندروزہ کی کشاکش اُس کی ہمت پست کر دیتی ہیں اور عالمِ مایوسی

یں وہ وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جو اُس سے متوقع بھی نہیں ہوتا۔ آپ یہ نہ کہئے کہ مرد کے لئے یہ آسان ہے کہ رشتۂ مودت جلد منقطع کر دے یا یہ کہ وہ لذت یابی کا جویا ہے۔ وہ محبت کے لئے بڑی بڑی قربانی کے لئے تیار ہے مگر سرد مہریوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ کے ہر لفظ سے موافقت کروں لیکن آہ ایسا کرنے سے میری جنس دنیا میں اور آپ کی نگاہوں میں ذلیل ثابت ہوگی۔ یوں سمجھئے کہ مرد لوہے کے ایک ٹکڑے کی مانند ہے۔ عورت کی مقناطیسی قوت کے اثر کی زد سے خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتا لیکن اُس کا متصل اور منفصل ہونا قوت کی کمی اور زیادتی پر مبنی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مرد محبت کے اظہار میں بے باک اور جلد باز ہوتا ہے لیکن یہ اُس کی عین فطرت ہے۔ نشترِ غم کی خونچکانیاں اُس کے دامنِ صبر و قرار کو پارہ پارہ کرنے پر تُلی رہتی ہیں لیکن خارزارِ تمنا کے یہ اُلجھاوے اُسے اپنے مقصد سے بعید نہیں کر سکتے۔ جذبۂ لطف کا احساس ہر متنفس کو ہوتا ہے اس کے لئے کسی مخصوص صنف کا تعین کر دینا قدرت کی آزادیوں میں پابندیاں عائد کر دینا ہے۔ جس طرح ہر عورت عورت کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر مرد مرد بھی نہیں کہلایا جا سکتا۔ غالباً اس سے آپ بھی موافقت کریں گے۔ کہ عورت کی نسوانی کمزوریاں جب اُس پر غالب آجاتی ہیں تو پھر بکھیرِ دامنِ ضبط تار تار نظر آتا ہے۔ لیکن یہی جذبات اگر اعتدال سے آشنا رہیں تو شاید تحسر و تاسف کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو۔

حسینہ:- میں اسے ماننے کے لئے تیار ہوں کہ عورت فطرتاً کمزور واقع ہوئی ہے لیکن حسیاتِ لطیفہ اُس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ وہ کچھ کرنے پر آمادہ ہوتی ہے تو شاید کوئی قوت اُس کے ارادہ میں حائل نہ ہو سکے۔ چونکہ اُس کا دل خلوص سے مملو ہوتا ہے۔ اس لئے مرد کے جذبات کا اُس پر کافی اثر ہوتا ہے۔

عزیز:- اور غالباً اس کے بعد آپ یہ فرمائیں گی کہ مرد اس سے معرّا ہے؟

حسینہ:- نہیں میں یہ نہیں کہہ سکتی لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ صفت اُس میں کمال پر نہیں۔

عزیز:- ہر کمال کے ساتھ زوال کا دامن وابستہ ہے۔ ہر آغاز کے لئے انجام کا ہونا ضروری ہے لیکن ایک مستقل کاوش ایک مسلسل ہیجان۔ ایک غیر متناہی کشمکش جو سکون سے نا آشنا ہو جو جمود سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ اسی کا غم لازوال رہینِ منت اور یہی غم لازوال زندگی کا ماحصل۔ بالفرض ہم اس نتیجہ پر بھی پہونچیں کہ صنفِ کرخت جدت پسند ہونے کی وجہ سے ہمیشہ نئی دلچسپیاں کا جویا ہوتا ہے لیکن کیا ان نئی دلچسپیوں کی تحصیل میں اُسے اُن مصائب سے اُن افکار سے دو چار نہیں ہونا پڑتا جو سوہانِ روح کی ایک دائمی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس لئے مشکل پسندی کس کی طبیعت ہے۔

ہمارا ناٹک

وہ بھی زمانہ تھا جب ہندوستان میں ناٹک کا فن اوج پر تھا یہاں کا اسٹیج، اس کا سازو سامان، یہاں
یاں کے تمثیل نگار لوگوں کے لئے ایک معجزہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں کے ناٹک اور تمثیل نگاروں کی
دیکھکر بڑے بڑے سیاحوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے سفرناموں میں شدومد کے
ذکر کرتے تھے اور صفحے کے صفحے اسی کی تعریف و توصیف میں رنگ ڈالتے تھے۔

اُس زمانے میں تہذیب کا جزو تھا، معزز شرفا اس میں حصہ لینا فخر سمجھتے تھے۔ برہمن اپنی ذاتی بزرگی کے
اس فن کا سب سے بہتر اہل سمجھتے تھے۔ شودر تو نیر شودر ہی تھے یہاں ویشوں تک کو اس معزز کام میں
اجازت نہ ہوتی تھی ہر راجہ اور رجواڑے کے محل میں ایک ناٹک گھر ضرور رہتا تھا کوئی تقریب بغیر ناٹکوں
کے پر لطف نہ دیتی تھی۔ ہر شخص ناٹک کا شائق تھا، ناٹک دیکھتا، ناٹک سمجھتا اور شاعر کی دل کھولکر داد دیتا تھا۔
یہ اُس زمانے کا ہے جب ناٹک کا فن قدر کی انتہائی منزل پر تھا، عوام اسے آنکھوں سے لگاتے اور بادشاہ
تے تھے یہ ایک پسندیدہ چیز تھی۔ راجاؤں کی دلچسپی جو اس فن سے تھی اس کی مثال خود مہا راجہ سری
وہ ایک زبردست عالم اور تمثیل نگار تھا بہتیرے ایکٹر اور شاعر اس کے دربار میں ملازم تھے۔ خود جب
ہو تو پرجا کا کیا کہنا۔

زمانے کو ناٹک کا زرین زمانہ کہا جاتا ہے اسی زمانے نے کالی داس، بھبھوتی اور رام بھدر کنی جیسے
نگار پیدا کئے، جن کی تصانیف نے شہرتِ ابدی اور بقائے دوام کا مرتبہ پالیا۔ ابتدا اس شان کی ہو
... ترقی کرے گا کہ دیگر ممالک اس کے سامنے طفل

ں ۔ ۔ انھیں اس سے کوئی مطلب نہیں کہ جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں وہ ڈرامہ ہے یا کوئی فضولیات کا دفتر کیونکہ ایسی چیزوں سے ملاقاتی کو دلچسپی ہوتی ہی نہیں اور نہ کوئی اس کا خیال کرتا ہے اور نہ کوئی اعتراض کہ بےکار کی دردسری مول لینے سے فائدہ جو گڑ سے مرے تو زہر کیوں دو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہمارے موجودہ تمثیل نگاروں میں ایک یا دو کے سوا کوئی ایسا ہوا ہے جو ملک کے سامنے صحیح ڈرامہ پیش کر سکے یقیناً ایسے جواب نفی میں ملے گا۔

ہمارے یہاں کے تمثیل نگار ناٹک والوں کی اصطلاح میں منشی کہلاتے ہیں منشی صاحب یقیناً کسی تھیٹر میں ملازم ہوتے ہیں بعد وہ چند ایسے بھی ہیں جو گھر بیٹھے منشی کہلاتے ہیں مگر یہ لوگ ہمیشہ ناٹک والوں کے موردِ عتاب رہتے ہیں کیونکہ ان کے کہنے پر نہیں چلتے ان کے مطلب کے ڈرامے نہیں لکھتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر ان میں سے کوئی ڈرامہ لے کر پہونچا ادھر وہ کاٹ کھانے کو لپکے ہ ... جو ... ہوگی وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں یہ تو خیر ایک جملہ معترضہ تھا اب منشی صاحب کی سنئے ... ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کام تو مالکوں کا ہے مالکوں کے دماغ میں اور یہ دماغ عموماً فن ڈرامہ سے ناواقف اور روپے سے زیادہ آشنا ہوتے ہیں ایک نہ ایک نئی بات سوجھ پڑتی ہے بھلا پبلک میں رات دن ... پر انگلیاں گھمی رہیں لوگ خوب ٹوٹیں گے غرض منشی جی بلائے جاتے ہیں کہانی بیان کی جاتی ہے منشی صاحب تو منشی ٹھیرے دس پانچ دنوں میں وہ قصہ یا واقعہ گفتگو کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے گانے بھرے جاتے ہیں وہاں سے چلا ایکٹروں کی نوک زبان پر پہونچ جاتا ہے چلئے صاحب اسی طرح ڈرامہ اسٹیج پہ آ جاتا ہے اب چاہے اس کی ادبی حیثیت کیسی ہی ہو واقعات کتنے ہی لچر اور غیر ممکن ہوں ڈرامیت کتنی ہی مفقود ہو یہ ساری باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں کیونکہ مطلب تو صرف لوگوں کو خوش کرنا ہے اور وہ ہو جاتا ہے چلئے قصہ ختم یہ حالت ہے جس میں ہمارے نوے فی صدی ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔

اب ذرا ایکٹروں کی طرف توجہ کیجئے۔ حال یہ ہے کہ نوے فی صدی ان میں جاہل ہوتے ہیں، ایسے جاہل جنھیں حروف تک پہچاننے کی مطلق صلاحیت نہیں، روزانہ ان کو پارٹ رٹائے جاتے ہیں، اور انھیں وہ طوطے کی طرح کھیل کے وقت بول دیتے ہیں ـــــ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ جو الفاظ ان کے منہ سے نکل رہے ہیں ان کے معنی کیا ہیں یہ طوطے جیسی تقریر اور بے سمجھے بوجھے ہوئے برزبان چلے اکثر نہایت مضحکہ انگیز واقعات پیدا کر دیتے ہیں بعض حضرات

جواب ملا تو یہی ملا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " صاحب انھیں چیزوں سے پبلک خوش ہوتی ہے، اگر ہم ایسا نہ کریں تو دوسرے دن سے ہم لوگوں کو منڈوے میں آگ لگا دینی پڑے" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی صاحب ذرا مجھے یہ تبلا دیں کہ اب اس کا بھی کوئی جواب دیا جا سکتا ہے؟ کیا آگے بھی ہمت پڑ سکتی ہے کہ کوئی رائے پیش کیجا سکے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ذرا غور کیجئے وہ بیچارے بھی ایک حد تک درست کہتے ہیں، خود ہم نے اپنی لاپروائی سے اسٹیج کی یہ حالت بنا دی ہے کہ جب تک وہاں طوفانِ بدتمیزی نہ پھیلایا جائے، ڈرامہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مالکوں کا مطمح نظر روپیہ پیدا کرنا ہے ۔ ۔ ۔ اس کے پیچھے وہ اس طرح آنکھیں بند کرکے پڑتے ہیں کہ درست راستے سے بھٹک کر کہاں سے کہاں جا پہونچتے ہیں ——— اسی روپے کی دھن میں وہ صحیح ڈرامہ کو بالائے طاق رکھکر گندی چیزوں کو اسٹیج پر لے آتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ روپیہ تو ان کے ہتھے ضرور چڑھ جاتا ہے لیکن اس کا زہر اسٹیج پر ایسا پھیلتا ہے جو لاکھ تدبیروں سے بھی زائل نہیں ہوتا یہی لوگ ہیں جنھوں نے زیادہ تر عوام کا مذاق بگاڑا ہے۔ میرے خیال میں اگر ناٹک کی دنیا میں کبھی انقلاب ہو تو سب سے پہلے اُن مالکوں کو تہ تیغ کرنا چاہیئے کیونکہ جب تک یہ زندہ ہیں اسٹیج کی ترقی معلوم۔

انھیں لالچی مالکوں، بے پرواہ تمثیل نگاروں اور نیچے درجے کے ایکٹروں نے ناٹک کو اس گہرے غار میں ڈال رکھا ہے جہاں روشنی کی ایک ہلکی کرن بھی نہیں پہونچ سکتی۔ ایک جدوجہد کی، زبردست جدوجہد کی ضرورت ہے کہ ڈرامہ پھر دنیا میں صحیح طور پر لوگوں کے سامنے آ سکے۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا، بالکل یک طرفہ بات تھی، ہم نے الزام اسٹیج والوں پر تھوپا ہے مگر ذرا اپنی طرف غور کیجئے، ذرا گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیے، ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ جتنا ان خرابیوں کے لئے تھیٹر والے لائقِ الزام ہیں، کیا اس سے زیادہ ہم خود نہیں ہیں؟ اگر آپ انھیں اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو ذرا خود بھی اپنے آپ سے پوچھئے کہ ہم نے اس کی خاطر کیا کیا۔ اگر انھوں نے کوئی خراب ناٹک کھیلا تو کیا ہم نے کبھی بھولے سے بھی صدائے احتجاج بلند کی؟ اگر ان میں سے کسی نے کوئی بات لائق تعریف کی تو کبھی ہم نے داد دی؟ اگر ان میں کوئی اچھا تمثیل نگار پیدا ہوا تو کبھی ہم نے قدر کی؟ کسی ایکٹر کے صاحبِ کمال ہونے پر اس کی عزت افزائی کی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ بالکل نہیں ۔ ہر طرف یہی جواب ملے گا۔ ہم ان سے بے توجہ رہے اس بری طرح بے توجہ رہے کہ اس کی بھی خبر نہیں کہ اُن کی دنیا میں ہوتا کیا ہے

آئی، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

ہمارے ڈرامے کا موجودہ دفتر گو علم و ادب کا خزانہ اور شاہکاروں کا مجموعہ نہیں مگر ہماری بڑی خوش قسمتی ہوتی کہ یہی کم سے کم ہمارے سامنے اصلی حالت میں ہوتے۔ مگر ایسا نہیں ہے، ہمارے بہترین تمثیل نگاروں کی کوئی کتاب صحیح حالت میں ہمارے پاس نہیں آئی، یوں تو خدا ہمارے چند کتب فروشوں کو سلامت رکھے صرف ڈراموں ہی سے آپ کی ایک الماری بھر دیں گے مگر جیسی ذلیل حالت میں انھوں نے ڈرامہ پیش کیا ہے اور جیسی کند چھری اس کی گردن پر پھیری ہے اس دنیا میں معاف ہونے کے قابل تو ہے نہیں .... اس کی دو وجہیں ہیں؛ اول تو ملک والوں کی لاپروائی، انھوں نے صحیح کتابیں رکھنے کی اور درست چیزیں دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہ کی، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ یہ بھدّے کاغذ، یہ غلط مضامین، یہ ذلیل روشنائی اور ایسا بدترین چھاپا صرف ہمارے ڈراموں ہی کے لئے مخصوص ہوتا۔ دوسرے خود تمثیل نگار صاحبان کی بے توجہی، یہ اپنے کو صرف تھیٹر کا بندہ جانتے ہیں، انھیں اس کا قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ دوسرے لوگ اُن کے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں اور غلط ڈرامہ چھپنے سے ملک والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا، اس کے علاوہ یا تو غیر معمولی انہماک یا کوئی اور وجہ ہوگی جس کے سبب بیچاروں کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ ان کا کونسا ڈرامہ بغیر ان کی مرضی کے چھپ گیا ہے اور کس حال میں چھپا ہے اور پھر اگر غلطی سے کبھی معلوم بھی ہو جاتا ہے تو اس کی کوشش کرنا کہ کوئی حرجانہ دائر کر دیا جائے یا اُس کتاب کو صحیح کر کے طبع کرایا جائے ایک طولِ عمل اور فضول سی بات معلوم ہوتی ہے، میرے خیال میں ہندوستان میں شاید ایک یا دو ڈرامہ نگار ایسے ہیں جو اپنی تصانیف کو صحیح طور پر چھپواتے ہیں ورنہ دوسروں کے لئے یہ بات بدتر از گناہ ہے۔ اسٹیج کی حالت گو بدل چلی ہے مگر تمثیل نگار صاحبان کی آنکھ ابھی نہیں کھلی۔ ایک مشہور تمثیل نگار صاحب سے جن کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہے میں اسی کے متعلق گفتگو کر رہا تھا باتوں ہی باتوں میں میں نے یہ کہہ دیا کہ ملک کے لئے اور خاصکر ہمارے ادب کے لئے بہت ضروری ہے کہ ڈرامے شائع ہوں اور صحیح شائع ہوں تاکہ کم سے کم لوگوں کی نظر تو پڑ سکے۔ ورنہ شائع تو وہ یوں بھی ہو جاتے ہیں لیکن ایسی ذلیل حالت میں کہ طبیعت دیکھنے تک کو گوارا نہیں کرتی .... جواب قابلِ غور ہے "صاحب ہم ڈرامہ شائع کرنے کو تو کر دیں مگر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

نے ایسے ایسے ایکٹر پیدا کئے جو کسی لحاظ سے یورپ کے کسی ایکٹر سے کم نہیں لیکن یورپ والوں نے قدر کی اور ایسی قدر کی کہ ان کے ایکٹروں کا نام جہاں لکھا جاتا ہے عزت سے لکھا جاتا ہے ہر انسائیکلوپیڈیا ان کے حالات سے فرتین اور ہر بچہ ان کے نام سے واقف ہے....... مگر ذرا ہندوستانیوں کی قدر ملاحظہ ہو کہ آج کسی کتاب میں ذکر ہونا تو علیحدہ چیز ہے جناب ڈھونڈنے سے بھی ان کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ میرے خیال میں جناب نورالٰہی و محمد عمر صاحبان ہی ایسے اصحاب ہیں جنہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی کتاب ناٹک ساگر میں جمع کئے ہیں مگر وہ کتنے کم اور غیر تشفی بخش ہیں یہ ہر شخص دیکھتا ہے ضرورت ہے کہ ایکٹروں کی مفصل سوانح حیات شائع کی جائے گو یہ کام آسان نہیں لیکن مجھے امید ہے کہ وہ آج یا کل میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ نہایت ضروری ہے کہ اردو رسالوں میں ڈرامے برابر شائع ہوا کریں، ان پر تنقیدیں لکھی جائیں ایکٹروں کے حالات درج ہوں، ان کے کاموں پر نکتہ چینیاں کی جائیں اور ان کے کمالات کی داد دی جائے، تب کچھ امید ہو سکتی ہے کہ لوگ اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت اور اپنے کام کو سدھارنے کی کوشش کریں گے۔ بیشک ابتدا میں نیرنگ خیال نے نہایت مستعدی سے اس کام کی ترقی اور توسیع میں حصہ لیا تھا چنانچہ "تحفۂ تیاتر" اس کا شاہد ہے لیکن پھر ایڈیٹر صاحب نے میرے خیال میں پہلی جیسی توجہ چھوڑ دی سب سے پہلے جناب امتیاز علی صاحب تاج کے ڈرامہ "رتنا ولی" کا ایک باب "تحفۂ تیاتر" میں شائع ہوا جسے نہایت پسند کیا گیا اور لوگ انتظار میں رہے کہ اب دوسرے باب میں چھپتے ہیں۔ اگست سنہ ۱۹۲۶ء کے پرچے میں جناب موصوف نے لکھا کہ دوسرا باب دفتر میں پہنچ چکا ہے تیسرے باب کے پہنچنے پر دونوں ساتھ شائع کئے جائیں گے پھر ستمبر کے رسالے میں دو مضامین ڈرامے پر شائع ہوئے ایڈیٹر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کسی دوسرے پرچے میں کریں گے لیکن جب سے آج تک ۴ سال ہونے کو آئے نہ رتنا ولی ہی شائع ہوا اور نہ ایڈیٹر صاحب ہی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ضرورت ہے کہ جناب ایڈیٹر صاحب اپنے خیالات کا اظہار کریں اور دوسروں کو بھی اظہار کرنے کی ترغیب دیں۔ دو تین پرچوں نے اگر کمر باندھی تو پھر میں دیکھتا ہوں کس طرح ڈرامہ پر لگا کر ترقی کے زینے طے نہیں کرتا۔

آفتاب حسن

شانتی

جنوری کی ایک ... اری کا آنچل سر سے
وہ ہر سنگھار ... وں کی لٹیں بل کھا رہی تھیں
ڈھلک گیا تھا او ... ا ہوئی تھیں۔ کھلتا ہوا گندمی
اُس کی سڈول ... یں جھکی ہوئی تھیں۔ گلابی ہونٹ
رنگ تھا ...
ایک ... ن ہو کر جھلک رہے تھے۔ کامنی اور مہوے کے

رگاؤں کی معصوم لڑکی بھولے پن سے ہر سنگھار
فطرت کی دلربائی کی انتہائی تخیل جھلک رہی تھی اس
ی رنگینی کھینچ کر آ گئی تھی وہ ننھی سن کی "دوشیزہ بیاباں"
کی مانگ کے سیندور ...... شاعری کی جنت تھی! معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کی ساری
تھی جس پر صبح کی ساری شادابی ..
تازگی سمٹ کر انسان ہو گئی ہے اور ٹھنڈی ہوا کے مست جھونکے اس کے اعضا میں ڈھل گئے ہیں۔ میں خاموش تھا
...... میری روح اُس کے حسن کی پُر کیف شعاعوں میں گھر کر جھوم رہی تھی۔ میری نگاہیں اس مجسمۂ شباب و دوشیزگی
کی پرستش میں محو تھیں...... دبے پاؤں چلنے والی نسیم میرے کانوں میں کہہ رہی تھی ؎

یوں چُپ ہیں جیسے کوئی اب کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

لو دیکھ کے ان میں ڈوب کر خوش ہوں۔ ہولی کے دن تھے۔ نہ معلوم کیوں کبھی میں خوش اور کبھی غمگین ہوجاتا
تھا۔ فطرت کے نئے روپ اس کے البیلے سنگھار میرے جذبات میں تلاطم پیدا کرتے تھے۔ دوپہر کی ہلکی گرمی میں
ہر طرف سناٹا ہوتا تھا اور فاختہ اور کبوتر اپنے خواب آور گیت گاتے تھے جب کوئل آموں کے درختوں کے
سائے میں بوروں کی بھینی خوشبو سے دیوانی ہو کر اپنی پُر درد آواز سے کوکتی تھی۔ جب خوبصورت قوس قزح کی
سی رنگین تتلیاں ہوا میں رقص کرتی تھیں تو میں بے چین ہوجاتا تھا اور ایک پُر لطف تکلیف میں میری آنکھیں آدھی بند ہوجاتی
تھیں۔ مجھ پر نیم خوابی کی سی کیفیت چھا جاتی تھی اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں پریم نگر کی سنہری اور جادو بھری فضا میں
کھڑا ہوں جہاں ہر چیز بہشت ہے۔ جہاں درختوں کے ٹھنڈے اور خوشگوار سایوں میں تتلیاں بے خودی میں آکر ایک دوسرے
سے اپنے محبت کے فسانے کہتی تھیں۔ جہاں ایک سانولے رنگ کا خوبصورت نوجوان لڑکا۔ نشۂ محبت میں چور ہو کر بانسری
بجا رہا ہے اس کے پاس ایک جھولی میں گلال اور عبیر بھرا ہوا ہے۔ وہ بانسری بجاتا ہے اور بسنت کی بے صبر کر دینے والی
راگنی کی الاپ ہوا میں بہنے لگتے ہیں۔ کافر حسن والی ایمان اور صبر کی حسین دشمن چنچل اور شوخ دیویاں گیسو سنوارے
ہوئے چوٹیوں میں بیلے کے ہار باندھے ہوئے مانگ میں سیندور ماتھے پہ بندی آنکھوں میں دنبالے، سر پر گھڑا اور
کمر پہ چھاگل لئے ہوئے دھانی انگیوں سے ساری کا اڑتا ہوا آنچل سنبھالتی ہوئی جمنا جل بھرنے کے لئے بدن چراتی
ہوئی چلتی ہیں۔ دوشیزگی کے نشے میں سرشار قدم شباب کے بار سے لڑکھڑائے جاتے ہیں۔ ادھر وہ خوبصورت
سانولا لڑکا پھر بانسری بجاتا ہے۔ چھیڑتا ہے۔ جان بوجھ کے ستاتا ہے۔ رنگ کی پچکاری بھر کر وہ شوخی سے ان پر چلاتا
ہے جیسے یونان کے باغ میں کیوپڈ نے تیر چلائے تھے۔ درد اور محبت سے نا آشنا دل نازک پہلوؤں میں دھڑکنے
لگتے ہیں۔ وہ بھاگتی ہیں۔ دوڑتی ہیں چیختی ہیں چلاتی ہیں ہنستی ہیں اور ان کے قہقہوں کی آواز ان کی چوڑیوں اور کڑوں
کی چھما چھم کے ساتھ لطیف ترین نغمہ بن کر ہوا میں بہتے بہتے ڈوب جاتی ہے......... میں مضطرب ہوگیا... میرے
دل میں ٹیسیں اٹھنے لگیں... کچھ یاد آیا آنسو میری آنکھوں کے قریب آگئے اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔
"میری فردوسِ تخیل کی سراپا ناز حور!!! اے گاؤں کی بھولی اور معصوم ملکۂ حسن! جذبات کا مرکز خواب
کی حیرت! آہ تو شام کے گلابی بادلوں کی طرح میرے دل پر چھا گئی ہے..... تیری ایک نگاہ میرے لئے بہشت ہے،
[illegible] سہانی صبح کی بہار ہے۔ خاموشی میں گہرے گہرے سمندر کی سطح کی شانِ سکون ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شانتی!"—— اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ اس کی آواز بہت دھیمی اور نیچی تھی۔ وہی جو ایک ختم ہوتے ہوئے نغمے میں ہوتی ہے...... جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہو...... جیسے پاس سے ایک جلدی میں گزرتی ہوئی پری کا نرم لباس "فرفر" ہوتا ہے۔

وہ مجھ سے بول رہی تھی۔ وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے بدظن نہیں ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بالکل تنہا ہے اور میں اس کا آنچل چھو رہا ہوں مگر وہ ویسی ہی رہی۔ وہ بھی یہ سب محسوس کر رہی ہے اور خاموش ہے!!!

یہ سوچ کر—— خوشی سے میرے آنسو نکل آئے —— پیمانۂ دل محبت کی لطیف امنگوں کی شراب سے لبریز ہو کر چھلکنے لگا... جذبات سے متاثر ہو کر میری آواز بہت بھاری ہونے لگی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"پاس کے گاؤں میں!"

"تم یہاں روز آتی ہو؟"

"ہاں... مگر... مگر اب نہیں آؤں گی"

"کیوں؟"

"مجھے فرصت نہیں ملے گی۔ کھیتوں میں بہت کام ہے"

"تم اکیلی کام کرتی ہو؟"

"نہیں میری ماں میری مدد کرتی ہے"

اس کے بعد وہ چپ ہو گئی۔ ایک مشکل خاموشی طاری ہو گئی۔

میری روح مضطرب ہو گئی۔ دل میں آگ لگ گئی۔ شباب کے جذبات میں پاگل ہو گیا... شیکسپیئر کے رومیو کی طرح... میں نے جوش میں اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اُف وہ کیسے نرم تھے۔ مخمل سے زیادہ نرم۔ اُس کا چہرہ زرد ہو گیا اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ جیسے گلاب کی دو پتیاں ہوا میں تھرتھرا رہی ہوں۔ نرگسی آنکھوں سے نکل کر دو آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ گلے میں رُکے ہوئے آنسوؤں سے میرا دم گھٹنے لگا۔

ڈال دیتی تھی۔ اور عالم تصور میں ایک ایسی دنیا میں لیجاتی تھی جہاں ہر چیز پُر مسرت اور پُر کیف ہوتی۔ پہلو میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگتا اور میں لطف میں آنکھیں بند کر لیتا۔ شانتی سے مجھے محبت تھی۔ وہ کیسی معصوم تھی۔ اپنے حسن کی کرشمہ سازیوں سے بے خبر تصنع سے بیگانہ۔ اس کی روح پاک اور ہیرے کی طرح شفاف تھی۔ اس کی عادتیں کس قدر سادہ تھیں! اس کا دل کتنا صاف تھا۔ زندگی کو بھی بھولی بھالی سمجھتی تھی۔ اس کے خیالات کی نازک شیشہ نما دنیا کو زمانے کی کسی چیز نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس کے جذبات کے دلفریب اور بکھرے محل میں اس کی حیات بھی کوئی کہانی نے منتشر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس لئے دنیا اور اس کی پیچیدگیوں سے وہ بے خبر تھی۔ اپنے باپ ماں کی طرح وہ اکثر لوگوں کو مہربان اور محبت کرنے والا سمجھتی تھی۔ اپنے بھائی اور بہنوں کی طرح وہ بہت سے لوگوں کو بے لوث، بے غرض اور ہمدرد خیال کرتی تھی۔

شانتی غریب تھی اور غریب وہ ... تمام گھرانے کی طرح غریب تھے اس لئے وہ دولت اور اس کے آرام اور تکلیف کو نہیں جانتی تھی اور نہ اس کی پروا کرتی تھی۔

مجھے اس کی ان انوکھی خوبیوں سے زیادہ محبت تھی۔ میں اس کی سادگی پر جان دیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی محبت میرے دل سے کبھی نکل نہیں سکتی اور نہ کم ہو سکتی ہے۔ مجھے اس کی روح سے تعلق تھا اور شانتی کے لئے صرف ایک خواہش میرے دل میں تھی۔۔۔۔ کہ وہ ہمیشہ رہے اور ہمیشہ خوشی اور آرام سے زندگی بسر کرے۔ مجھ سے دور ہو یا مجھ سے قریب۔ میرا خیال کرے یا نہ کرے مجھ سے محبت کرے یا نہ کرے مجھے اس کی زیادہ پروا نہ تھی۔ ہاں اگر وہ بھی مجھے چاہتی تو دنیا میں میرے ایسا خوش قسمت کوئی نہ ہوتا۔ مگر مجھے اس کا اسی قدر یقین تھا جتنا اس کی بابت شبہ تھا۔

میرے جذبات اس کے جسم کی خوبصورتیوں سے زیادہ وابستہ نہ تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی روح مجھ سے قریب ہو جائے۔

اکتوبر میں یونیورسٹی بند تھی اور میں گھر پر تھا۔ مجھے ایک دن معلوم ہوا کہ شانتی کی شادی ہو گئی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی جب میں نے سنا کہ وہ آرام سے ہے اور اس کے باپ ماں کو یہ امید ہے کہ وہ کبھی تکلیف سے نہ رہے گی۔ مجھے افسوس صرف اس قدر ہوا کہ اب وہ زیادہ تر یہاں نہ رہے گی اور میں اُسے روزانہ نہ دیکھ سکوں گا۔

شام تھی اور دن بھر کی دھوپ ٹھنڈی ہو کر غائب ہو گئی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں نہر کے پانی کی خاموش سطح کو سیپ کی طرح گوناگوں رنگوں میں بدل رہی تھیں۔ دن بھر کے چرنے کے بعد گلے واپس ہو رہے تھے۔ افق پر ہلکا ہلکا کہرا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ دور پر چھوٹے چھوٹے سفید مکانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ قریب ہی آم کا ایک گھنا باغ تھا جس کے درختوں کی شاخیں نہر پر جھکی تھیں۔ ... ایک ... شاخ پر بیٹھا۔ پانی میں پاؤں لٹکائے بانسری بجا رہا تھا۔ مدھم سروں میں شیام کلیان الاپ رہا تھا۔

مرغزار

(۱)

رخ سے حسینۂ شام برقع اٹھا رہی تھی
رنگین جوڑا پہنے دل کو لبھا رہی تھی
... نازِ ادا سے جادو جگا رہی تھی
... اس جہاں پر بجلی گرا رہی تھی
تھا دل فریب منظر
پیشِ نظر فلک پر

(۲)

دل گھرا ہوا تھا پانی چمک رہا تھا
مغرب میں مہرِ تاباں کچھ کچھ چمک رہا تھا
دن کی جو زندگی کا ساغر چھلک رہا تھا
دنیا سے آرزو کو حسرت سے تک رہا تھا
نظارہ روح فرسا
یہ آسمان پر تھا

(۳)

تھوڑے سے فاصلہ پر اک مرغزار بھی تھا
پیشِ نظر خزاں کے رنگِ بہار بھی تھا
بیتابیٔ نظر میں صبر و قرار بھی تھا
غم تھا مگر خوشی کا آئینہ دار بھی تھا
چشمِ بشر تھی حیراں
ضدین سے پریشاں

(۴)

وہ مرغزار جس کو کچھ بیل چر گئے تھے
گھوڑے گدھے سموں سے پامال کر گئے تھے
سرگیں سے جانور سب جس گھر کو بھر گئے تھے
جس کے تمام تنکے جل بھن کے مر گئے تھے
نام و نشاں نہیں تھا
جس میں کہیں جڑوں کا

(۵)

جو کا سماں جہاں میں جو ہو گیا تھا یکسر
وحشت کا ہر طرف سے جو بن گیا تھا منظر
بربادیوں سے جس کی حالت ہوئی تھی ابتر
اک داغِ بدنما تھا جو دامنِ زمیں پر
جس کے مٹے ہوئے تھے
سب نقش زندگی کے

(۶)

قدرت نے دی اسی کو اب شانِ دل ربائی
سبزے نے پھر اسی کے صورت نئی دکھائی
جلوہ کی اب اسی کے خلقت ہوئی فدائی
نظارہ سے اسی کے تسکیں دلوں نے پائی
وہ دشت بے حقیقت
پھر بن گیا ہے جنت

(۷)

ذرّوں کو کیا خدا نے یہ زندگی عطا کی
تصویر سامنے ہے سب کے فنا بقا کی
جو آج پس رہا ہے دنیا میں جسمِ خاکی
پھر اس پہ مہربانی ہوگی کبھی خدا کی
جو خاک ہو گیا ہے
رتبہ اسے ملا ہے

(۸)

دورِ زماں نے چھوڑا جس قوم کو کچل کر
نام و نشاں نہ رکھا جس کا کہیں زمیں پر
اٹھی وہی زمیں سے بن کر جہاں میں گوہر
قسمت کا پھر اسی کی چمکا فلک پہ اختر
قدرت کا یہ کرشمہ
دھوکا ہے یا تماشہ

اندرجیت شرما

شاہی محبّت

اسکر وائلڈ نے یہ غیر فانی ڈرامہ [illegible] کا سگریو [illegible] آف انکاشائر کو جو بعد میں مسز جان ٹون کہلائیں تحفہ میں [illegible] کے لیے لکھا تھا۔ اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی منسلک تھا۔ مسٹر رابرٹ راس نے اس کو شائع کرنے کی بے انتہا کوششیں کیں [illegible] اب [illegible] سال کے بعد [illegible] کی صورت میں شائع ہوا اور چھپن سال کے بعد ترجمہ ہو کر ناظرین کے سامنے [illegible] ہوتا ہے

خط

مورخہ ۲ نومبر سنہ ۱۸۹۴ء

[illegible]

عزیزمن مسز جان ٹون

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ [illegible] کی رسید نہ دے سکا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کے قصّوں کو دل چسپی سے پڑھا [illegible] بہت محظوظ ہوا اور بار بار دیکھنے کا متمنی ہوں۔

آئندہ صحبت میں [illegible] آپ کی دل چسپی کے لئے لکھ رہا ہوں۔ یہ اس گفتگو کا نتیجہ ہے جو آپ کے قابل فخر شوہر کے اور میرے درمیان ہوئی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں اس وقت ایک ایسا دلکش ناول لکھنے میں مشغول تھا جیسی ایرانی جانمازیں [illegible] واقعات کو اصل جامہ پہنانے میں کامیاب ہوا ہوں۔

میری انتہائی خواہش ہے کہ اس کو باغیچہ میں کھیلتا ہوا دیکھوں جب ہوا آسمان مخمل کی طرح صاف ہو اور ستارے صنف نازک کی آنکھوں کی طرح چمک رہے ہوں۔

میں آج کل ایک مخمصے میں گرفتار ہوں کل ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی جس نے خیالات میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ طرز سے [illegible] کا نواب معلوم ہوتا تھا۔ رفتار و گفتار سے فرانسیسی خیالات سے یونانی اور نتائج قائم کرنے میں ایک مشرقی۔ اس کی صحبت ایک الہام تھی

میں کل پنجشنبہ کو اوکلے اسٹریٹ گیا تھا [illegible] نے کہا کہ وہ تقریباً ہر ہفتہ ایک خط آپ کو لکھتی ہیں۔

آپ کی یاد آوری کا خواہش مند

اسکر وائلڈ

ایکٹ پہلا۔ منظرِ اوّل

شاہ برما کا محل۔ ایک صدر دروازے والے ہال کا
منظر، دور پر گہری خندقیں اور انتظار کرتے ہوئے ہاتھی۔ سہ پہر کی
خیرہ کر دینے والی روشنی میں غرور سے ٹہلتے ہوئے طاؤس
ہیرے جواہرات سے مزین تخت پر شاہ منگ بنگ کو چھتر کے
نیچے بیٹھا ہوا پیش کرتا ہی۔ چاروں کونوں پر خدام ایستادہ ہیں جو
پتھر کے مجسموں کی طرح بے حس ہیں۔

قریب ہی ہیروں سے چمکتا ہوا خاصدان ہی اور دوسری
جانب شاہ سیلون کے دو قاصد جو اس کی اکلوتی بیٹی کی شادی
شاہ منگ بنگ سے دو سال کے اندر طے کرنے آئے ہیں۔ ان کی
صورتیں سنجیدہ ہیں۔ چہرے رعب دار اور سفید کپڑوں میں
ملبوس ہیں منگ بنگ کے اشارے سے سگریٹ پی رہے ہیں۔

چاروں طرف امراء دربار و شرفاء شہر جمع ہیں۔ خدّام
دست بستہ اور طوائفیں منتظر ہیں۔ شاہی پھریرا دل نواز
نغموں کے ساتھ لہرا رہا ہی۔ بڑی طلائی میز پر زریں ساغروں
اور میووں کی افراط ہی۔ ہر جگہ مقدس طاؤس شاہی اور
سفید ہاتھی کا نشان ہی۔ برما کا مسرور کن باجا کچھ بے ترتیبی کے ساتھ
بج رہا ہی۔ چند مکھی کے پھول زیبائش دے رہے ہیں۔ برمی
خوشبوئیں مہک رہی ہیں۔ آفتاب اپنی تمام رنگینیوں اور
زیبائش حسن کے ساتھ مغرب کی طرف گامزن ہی۔ — شاہ نے
ہاتھوں کو ہلایا، طائفے اشارہ پاکر آگے بڑھے۔ ان کی پوشاکیں
مچھلیوں کی ہیں اور ان میں ہیرے اور زمرد جڑے ہیں جو
ہلکے تبسم کے اشارہ پر ایک عجیب سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ رقص
ختم ہوا۔ قاصد اٹھے اور تعظیم کے ساتھ جانے کی اجازت چاہی۔
شاہ نے ہز مجسٹی آف سیلون کے نام پتوں پہ لکھا ہوا خط جو
جواہرات کے ایک صندوقچے میں بند تھا وزیر کے ہاتھ سے
ان کو عطا کیا۔ چند باتیں ہوئیں اور وہ الٹے قدم واپس گئے۔

شاہ منگ بنگ نے آرام کرنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ گل زریں
پگوڈا میں ٹانبگ کا تہوار منا سکے اور رخصت ہوا۔

ساٹن کا ایک پردہ بڑے ہال کا منظر پیش کرتا ہی۔

مجمع مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ یورائے گیان تھو
اور منگ پھومن بادشاہ کے ملکی ردیہ، اس کے شباب، پاکیزگی
خیال، شادی میں وقفہ کا افسوس اور درمیانی بے ترتیبی کے
متعلق باتیں کرتے ہیں۔

یکایک ٹن ٹن کی آواز سنائی دیتی ہی۔ رفتاروں میں
سرعت آجاتی ہی۔ ماہتاب بحری حلقہ پورا کرتا ہی اور مشعلیں خدام کی
چہل پہل کے ساتھ باغ میں حرکت کرتی ہیں۔

وہ اس کو اپنے جھونپڑے پہ جنگل میں مدعو کرتی ہے تاکہ
[illegible] کی تحقیقات کرے۔ بادشاہ اشارے سے کہتا ہے کہ وہ
[illegible] کے ساتھ ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہے [illegible]
[illegible] ہو جاتے ہیں خاموشی طاری ہوتی ہے بادشاہ [illegible]
[illegible] ان لوگوں کو ایک طرف [illegible]
[illegible] ہوتے ہیں وہ گھوڑا نکل کر آگے بڑھتی ہے [illegible]
[illegible] ہوتی ہے تو موت [illegible]
منظر بے پناہ حسن کی جولانگاہ [illegible]

منظر سوم

ایک دہقانی کا چھایا ہوا جھونپڑا عالی شان درختوں کے درمیان واقع ہے۔ راستے فیرآباد اور معلوم ہوتے ہیں ہر طرف بھیانک سکوت طاری ہے۔ پردہ کی پشت پر مہ جبیں اور بادشاہ نظر آتے ہیں بادشاہ اس کی تنہائی اور غربت پر اظہار افسوس کرتا ہے وہ بیان کرتی ہے کہ غربت اس کی خوف کا باعث نہیں لیکن لوگوں کی دشمنی ہے جو سامنے رہتے ہیں اور اس کو کھیرا گاڑی بیچنے نہیں دیتے بادشاہ کی نظریں اس کے حسین چہرے اور بدن کا طواف کرتی ہیں وہ اس کو اطمینان دلاتا ہے کہ اس کی خبرگیری کی جائیگی اور ٹھنڈے سایہ میں ایک خوبصورت مکان اس کے لئے بنوا دیا جائیگا۔ دو سال کی آزادی اس کے پاس ہے اور دو سال تک وہ اپنی زندگی کا مختار ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے —— اس کو چاہتا ہے —— دونوں جنت کا لطف اٹھائیں گے۔ لڑکی خوشی سے کانپ اٹھتی ہے۔ خوف اور تعجب اس پر طاری ہو جاتا ہے "اور دو سال بعد" وہ دریافت کرتی ہے "موت" اس کو جواب ملتا ہے۔

ایکٹ دوسرا۔ منظر اول

پھر ایک مرتبہ جنگل کا منظر۔ دوپہر کا وقت جھونپڑے کے بجائے نصف بدی اور نصف اطالوی طرز پر سفید چام کی عمارت۔ یکے بعد دیگرے گھومی ہوئی مینا کار اور مرصع چھتیں، سنہری اور جواہرات سے مزین گھنٹیاں، وسیع برآمدہ میں قالینیں دریاں اور کشیدہ کاری کی دوسری اشیاء۔

دنیا آفتاب سے روشن اور اطراف و جوانب کے درخت پہرے داروں کی طرح روشنی سے منور، برمی خادم بے حس و حرکت اس زینہ پر تمباکو نوشی میں مشغول جو مکان سے باغ کو جاتا ہے کوؤں کا سستی سے قائیں قائیں کرنا، طوطوں کا شور مچانا، ستار کے سروں سے محبت کا ونسی گیت۔ باقی ہر جگہ خاموشی۔

دو ادھیڑ عمر کے لوگ اس طرح پھر سکوت توڑتے ہیں:

"تھیکن کب چھٹکارا پائے گا؟"

"وقت قریب ہے۔ مجھے صبح ہی اطلاع ملی تھی"

"آخر کب؟"

"میں یہ نہیں جانتا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک کی موت واقع ہوگی"

ٹوٹ پڑتا ہے۔

"آپ ایک دن بعد تشریف لا سکتے ہیں" وزیر عرض
کرتا ہے "میں پگوڈا میں ملوں گا جہاں خالق بندہ و ہستی کی عبادت
کی جائے گی۔"

منگ بنگ مہ بھرو کو سمجھاتا ہے کہ وہ ایک ضروری کام پر
جا رہا ہے اور نیا چاند نکلنے سے پہلے اس کے اور بچوں کے پاس
آ جائے گا۔ ان کی جدائی انتہائی غمناک منظر پیش کرتی ہے
جس کے لئے مشرق ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔

منگ بنگ یورائے گیان تھو کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔
مہ بھرو پردہ کی پشت سے ان کو جاتا ہوا دیکھنے کے لئے
برآمدہ پر چڑھتی ہے ـــــ آہستہ آہستہ گرتی ہے اور بیہوش
ہو جاتی ہے۔

آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ راگ بند میں بوروں کی المناک
آوازیں فضا میں گونج رہی ہیں۔

ـــــ ایکٹ ڈراپ

ایکٹ تیسرا ۔ منظر اوّل

(سات سال بعد دوسرا منظر)

پردہ مہ بھرو کو ایک اونچے برآمدہ میں بیٹھا ہوا پیش کرتا
ہے۔ درخت، سڑک کا پورا منظر پیش کرنے کے لئے حرف غلط کی
طرح مٹائے جا چکے ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہے اور دیکھتی رہی ہے
اس کے قریب اس کے دونوں خوبصورت بچے ہیں۔

"غالباً آج" وہ دل میں کہتی ہے "شاید کل
لیکن یقیناً ـــــ ایک دن"

"آہا" وہ فرطِ مسرت سے چلّا اُٹھتی ہے۔ "آخر
میرا مالک لوٹ آیا"

جنگل والی سڑک پر سواروں کا ایک گروہ دکھلائی دیتا ہے
مہ بھرو تعجب کے ساتھ مبارکباد دینے کے لئے نیچے
اُترتی ہے۔ یورائے گیان تھو داخل ہوتا ہے۔ وہ سفید
لباس میں ملبوس ہے جو برمی ماتمی لباس ہے۔ وہ گر پڑتی ہے
بُری خبر سننے کا خوف دامنگیر ہو جاتا ہے۔ بڈھا اس کو دوبارہ
یقین دلاتا ہے اور اس سے کہتا ہے۔

"منگ بنگ نے اپنے بچوں کو بلایا ہے۔ ملکہ کا انتقال
ہو چکا ہے۔ اور کوئی وارثِ سلطنت موجود نہیں ہے۔"

"ملکہ! کونسی ملکہ؟" مہ بھرو دریافت کرتی ہے۔

"ملکہ برما"

مہ بھرو کو پہلی مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عاشق ملک کا
حکمران ہے۔ سب کا افسر اور ہادی ثانی

روتے ہوئے لیکن حکم عدولی سے مجبور وہ بچوں کو
بلاتی ہے۔ گھٹنوں کے بل جھک کر ان کو دلاسا دیتی ہے اور
نہایت عاجزانہ لہجہ میں خادمہ کی حیثیت سے ان کے ساتھ

ایک سفید دیہاتی چڑیا کی شکل میں کیوں کہ صنفِ نازک کی
حیثیت سے بیوقوف ہو اور دندانِ فیل کی طرح سفید ——
اے اولادِ آدم اور محبت کی بندی

مہ پیرو نے رضامندی ظاہر کی اور قدم آگے بڑھایا
"مجھے مور کی شکل عطا کر دیجئے وہ زیادہ خوبصورت
ہوتے ہیں"

جادوگر کمنی پر جھک کر مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں
تلخی مضمر تھی۔

"کُن" اس نے سر جھکا لیا۔

شمعیں ایک ایک کر کے دھیمی پڑ گئیں۔

(پردہ گرتا ہے)

منظرِ سوم

شاہی محل کے باغات
... کے بعد

گلاب کے درخت بسترِ خاکی پر پھیلے ہوئے ہیں
فوارے چل رہے ہیں اور موتی اس سے نکل نکل کر بڑے
کنولوں پر گرتے ہیں۔ مور غرور سے سبزہ زار پر آہستہ
آہستہ چل رہے ہیں لیکن سب سے بڑا اور سب میں خوبصورت
خاموش ہے۔ سر جھکا ہوا ہے پر سکڑے ہوئے ہیں منظر خوبصورت
... لیکن سب پر سکوت طاری ہے۔

چند درباری داخل ہوتے ہیں اور محل کے راستہ پر
مضطربانہ باتیں کرتے ہیں۔

مونگ پھومن اور یوراۓ گیان تھو درباری وید
اور جوتشی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں

"بادشاہ آج رات سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا"
وید بیان کرتا ہے۔ اس فوری اور پوشیدہ بیماری نے ان کی
عقلوں کو پراگندہ کر دیا ہے۔ جوتشی کہتا ہے کہ ستارے اس کی
صحت سے علیحدہ ہٹ رہے ہیں اور جب تک کوئی معجزہ ظاہر
نہ ہو اس کو دوسرا دن دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔

وزراء گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں اور سر
جھکا کر چبوترہ پر آگے بڑھ جاتے ہیں

دیوار پر بیٹھا ہوا مور اپنی دم پھیلاتا ہے اور غم میں
ڈوبی ہوئی ایک تکلیف دہ آواز نکالتا ہے۔ باطل خیالی غالب آتی
ہے اور سننے والے خوف سے کانپ جاتے ہیں۔

مور اپنے پروں کو بند کر لیتا ہے اور پہلے کی طرح کسی
خیال میں غرق ہو جاتا ہے۔

"یہ چڑیا مثل دوسروں کے نہیں ہے" ایک نجومی
کہتا ہے "اس کو میں مدتوں سے دیکھ رہا ہوں ——
تنہا ہمیشہ تنہا۔ دوسرے بھی اس سے اجتناب کرتے ہیں
میں خیال کرتا ہوں کہ اس کے اندر کوئی ذی شعور روح ہے"

"آپ غلطی پر ہیں" اس کے ساتھی نے جواب دیا

کے ساتھ عیش کی گھڑیاں گزارے گا۔ یہ درست ہے تمھاری
زندگی اس کے لئے ہے۔ یہ اس کی قیمت ہے۔"
"قیمت! کچھ بھی نہیں کیا میں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو
۴ سال تک کانپتی ہوئی خوشیوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟
ن کے چہرے نہیں دیکھے؟ ان کی آوازیں نہیں سنیں؟
کیا میں نے انتظار کی تکلیف دہ گھڑیاں نہیں گزاریں؟
کیا اپنے بیٹوں کو شاہی وقار کے ساتھ نہیں دیکھا اور ان کی
تھپکیاں محسوس نہیں کیں؟"
"تب تم کو مطمئن ہو جانا چاہیے!
آپ جادوگر ہیں اور آپ جان سکتے ہیں ——"
"یہ اس لئے نہیں کہ میں جادوگر ہوں یہ محبت ہے اور
یہی وہ جادو ہے جس کو دنیا جانتی ہے۔"
(پردہ گرتا ہے)

منظر پانچواں

شاہی خواب گاہ وسیع اور سایہ دار، گدّوں کے
خوبصورت انبار اور مخمل چادر کے درمیان جس پر مور کی
گلکاریاں زیبائش دے رہی ہیں۔ منگ تنگ بیمار پڑا ہے
چہرہ خاکستر سے زیادہ سفید ہے۔ وزراء، غلام، درباری اور
دوسرے مشرقی دربار کے معززین بے چینی سے اس کو
دیکھ رہے ہیں۔ منتظر ہیں اور کانا پھوسی کرتے ہیں۔ کوچ کے قریب کی
جگہ خالی ہے۔ سمندر پر آفتاب طلوع ہو رہا ہے اس کی شعاعیں چھن کر
اندر داخل ہوتی ہیں اور ایک مرتبہ شب کی تاریکی کو پھر روشنی
بخشتی ہیں۔ گھنٹے کی آوازیں اور پرندوں کی چہچہاہٹ محل کی
خاموشی میں رخنہ انداز ہوتی ہیں۔
"روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی ہے" طبیب کہتا ہے
اور سب کی نظریں مریض کی طرف جھک جاتی ہیں۔
"لیکن اس کا ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔" نجومی کہتا ہے "طلوعِ
آفتاب اس کو اپنی پناہ میں لوریاں دے رہا ہے۔" وہ آنکھیں
کھول دیتا ہے۔ اس کے بیٹے آگے بڑھتے ہیں اور سہارا دے کر
دوا پلاتے ہیں۔ وقت قریب ہے — وہ پھر ہوش میں آجاتا ہے۔
دور کا دروازہ بے تحاشا کھلتا ہے۔ ایک خوبصورت جوان عورت
آگے بڑھتی ہے اور ان رکاوٹوں کو ایک طرف کر دیتی ہے جو اس کی
راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ وہ بادشاہ تک پہونچ جاتی ہے۔
"میں آپ کی زندگی لائی ہوں — میری روح کے مالک"
وہ چلا اٹھتی ہے "میں آپ کی زندگی لائی ہوں" یہ کہتے ہوئے
اس کے قدموں پر گر پڑتی ہے اور جانِ عزیز دے دیتی ہے۔
درباری جھک پڑتے ہیں — بادشاہ اٹھ بیٹھتا ہے
بالکل کھڑا ہو جاتا ہے — سورج اپنی روشنی سے سب کو
فیضیاب کرتا ہے۔ جواہرات چمکتے ہیں۔ دنیا یکسر نغمہ بن جاتی ہے۔
[پردہ گرتا ہے]

آخری سحر

آفتابِ امید کا رخِ روشن شبِ دیجور کی دراز اور کالی کالی زلفیں اپنی آغوشِ عاطفت میں چھپا چکیں۔ مرادوں کی رات تاریک ہوگئی۔ نحوست اور نحوستِ بختی کی مہیب گھنگھور گھٹائیں مطلعِ امید پر چھا گئیں۔ ناکامی اور نامرادی کے بادل گرج گرج کر ترشح بار ہیں۔

اضطراب و اضطرار کا ایک ایک لمحہ ایک غیر محدود عمرِ نوح ہے جو کاٹے نہیں کٹتی۔ ناکام زندگی کا بالآخر یہ دورِ ابتلا اک ایسی حد میں جا ملا کہ صبر و سکون بھی دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ....

آدھی ...... رات کی تاریکی میں سناٹے کا عالم اور تنہا دہے .... مگر اک خفتہ قسمت اپنے نیم بیداری کے احساس کے ذوق سے لطف اندوز ہے بھی بیداری کی بیدار مغزی دردِ دل کی دھیمی دھیمی ٹیسوں سے وارفتہ بنادیتی ہے، کبھی نیم خوابی کا فریب سکون ملی جلی کیفیت اطمینانِ حقیقی کا سامان بہم پہونچاتا ہے۔

اس کشمکشِ حیات کے تلاطم نے ٹوٹے ہوئے دل کی شکستہ کشتیِ امید کو پھر اک لمحہ کے لئے گردابِ ہلاکت سے ساحلِ حیرت تک پہنچا دیا۔

بیمارِ محبت نے دلِ مایوس سے اک سرد آہ کھینچی ...... اور .... کچھ وقفے کے بعد بے ہوشِ ازل اپنی محبت بھری خمار آلود آنکھیں کھولکر حسرت بھری نگاہ رات کے جھکے ہوئے تاروں پر ڈالکر وقت کا اندازہ کرتا ہے۔ اور ہوش میں آجاتا ہے اپنی بیکسی و بے بسی پر کس مپرسی پر نہیں بلکہ نامرادی پر دیدۂ دل کا ایک ایک پردہ در پردہ اشکبار رہے مگر خیالستان کا ایک ایک ذرہ ہمہ تن غمخوار ہے۔

اس عالمِ بے کیفی کے کیف میں غیب سے اِک دل بڑھانے والی آواز آئی کہ "اے ملجائے درد و خلش تیری تصویر کا ہر ایک رخ گو خود تیرا سوگوار ہے مگر تو اس تیرہ بختی کے اندھیرے میں گم گشتہ راہ نہ ہو۔ میری تھوڑی سی ہم آہنگی تیری اور سچ مچ تیری پوری پوری غمگسار ہے .... اُف ....

حقیقتِ عریاں

گه در شمارِ سبحهٔ صد دانه گشته‌ایم
گه جبه‌سای بر درِ بت‌خانه گشته‌ایم

گاهی به شیخ و صوفی و واعظ به مسجدے
با صد خلوص سجدهٔ شکرانه گشته‌ایم

گاہے زمین ما طفت پیرِ میکده
با مستِ ناز بر سرِ پیمانه گشته‌ایم

بردیم گوئے دشت ز قیس حزیں گہے
گاہی به نجد نعرهٔ مستانه گشته‌ایم

گاہی ز قدسیان فلک برگذشته‌ایم
گاہی به نفسِ سرکشے همخانه گشته‌ایم

رفتیم گه به طور به آتش تجلیش
گاہی نثارِ عارضِ جانانه گشته‌ایم

گه "اسجدوا لآدم" بود از برائے ما
بیرون ز خلد گاه به یک دانه گشته‌ایم

گاہی ریا و مکر به پیختیم بر زهد
گاہی ز صدق صوفی و مستانه گشته‌ایم

گه دستِ رد به همتِ شاهان زدیم گه
پیشِ امیر دستِ فقیرانه گشته‌ایم

گاہے نموده‌ایم به دونان تهی ابه
گاہی به دهر همتِ مردانه گشته‌ایم

دامِ ریا نهیم پئے عامیان گہے
گه خود شکارِ دامِ تهِ دانه گشته‌ایم

رازِ الست و سرّ بهم بر کشوده‌ایم
لیکن ز رازِ خود همه بیگانه گشته‌ایم

خلقم گہے به "احسنِ تقویم" بود و گه
در "سافلین" به خانهٔ ویرانه گشته‌ایم

شہزادہ کا خواب

شہزادہ سلیم علمی دنیا میں ایک ممتاز ہستی رکھتا تھا اور مختلف علوم پر عبور حاصل کر چکا تھا لیکن اُس کو فارسی سے زیادہ دلچسپی تھی اور فارسی ہی میں اکثر شعر بھی کہا کرتا تھا اگرچہ دائرۂ شاعری میں ہنوز قدم ہی رکھا تھا لیکن اُس کی ذہانت اور علمی قابلیت اُس کو ترقی کی جانب بسرعت تمام کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اس کو شاعری کا خبط اس قدر بڑھ رہا تھا کہ روز و شب یہی اُس کے واسطے سامانِ عیش تھا۔ حسب اتفاق ایک دن شام کے وقت خراماں خراماں جنگل کی جانب روانہ ہوا لیکن اپنے شاعرانہ خیالات میں کچھ ایسا محو تھا کہ اُس کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ کدھر جا رہا ہے اور کسقدر راہ طے کر چکا ہے اُس کے قدموں کا یکے بعد دیگرے اٹھنا کسی حد تک ایک فعل غیر ارادی تھا۔ حالانکہ موسم گرما تھا لیکن اس وقت آفتاب ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد منزل مقصود کے جوار میں قدم رکھ چکا تھا اور قریب تھا کہ گوشۂ [illegible] میں پہنچ جائے۔ اس سے کچھ قبل ترشح ہو کر مطلع صاف ہو چکا تھا لہٰذا ہوا میں کچھ عجیب دل آویز خنکی پیدا ہو گئی تھی اور تمام دن کے تپش زدہ اور مردہ پودوں میں وہ ہوا ایک نئی روح پھونک رہی تھی جس کا اندازہ ایک شاعر بخوبی کر سکتا ہے۔

سلیم کے واسطے یہ منظر روکشِ صد جام ہو گیا ایک بیخودی سی طاری ہو گئی دل میں جوش پیدا ہونے لگا تخیلات کا دریا اُمنڈنے لگا۔ بس مستانہ وار ہر شے پر نظر ڈالکر جھومنے لگا اور پنسل سے کاغذ کو رنگنا شروع کر دیا۔ یہ کیفیت تقریباً نصف گھنٹہ سے زیادہ رہی۔ آخر کار اُس کے چہرہ سے تکان کے آثار نمایاں ہونے لگے آنکھوں میں خمار سا پیدا ہو گیا کاغذ پنسل کو جیب میں رکھا اور فوراً ایک مقام پر بیٹھ گیا اور ایک پتھر کی چٹان سے جو کہ اُس کی پشت پر تھی تکیہ لگا کر آرام کرنے لگا۔ ایسے موسم میں ٹھنڈی ہوا کا چلنا کھلے میدان کی فضا ہرے بھرے درختوں اور پودوں کا ہوا کے جھونکوں سے ہم آغوش ہو ہو کر زبانِ حال سے تبادلۂ مبارکباد ایک پُر احساس دل کے واسطے رشکِ فردوس تھا۔ الغرض سلیم کا سرور دمبدم بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرنا تھا کہ نیند غالب آ گئی اور کیا دیکھتا ہے کہ وہ

ں آپ میں اور مجھ میں فرق ہے اگر آپ بھی شاعر ہوتے تو آپ کے بھی اسی طرح سینگ نکل آتے۔

سلیم:۔ (کچھ سکوت کے بعد) جناب شاعری کا تو کچھ تھوڑا سا شوق مجھ کو بھی ہے لیکن میں نے اپنے سر پر کوئی سینگ نہیں پایا۔

شاعر:۔ ہاں یہی تو بات ہے کہ آپ کو ابھی محض تھوڑا سا شوق پیدا ہوا ہے۔ ان سینگوں کا مادہ ضرور آپ کے دماغ میں پیدا ہو گیا ہوگا اگر کوئی سال اور آپ شاعری کریں گے تو سینگ ضرور نکل آئیں گے اور تب آپ پورے پورے شاعر ہو جائیں گے۔

سلیم:۔ اچھا یہ بتائیے کہ ان سینگوں کی کیا خصوصیات ہیں؟

شاعر:۔ ان تینوں سینگوں کے جدا جدا نام ہیں اور مختلف صفات ہیں۔

سلیم:۔ حضرت میں بہت بہت مشکور ہوں گا اگر آپ مہربانی کر کے ان کے نام اور صفات جلد سے جلد بیان کر دیں گے۔

شاعر:۔ بہت خوب سنیے سنیے اول سینگ کا نام مبالغہ ہے دوسرے کا نام مغالطہ اور تیسرے کا نام عسرت ہے۔ اول سینگ کی صفات یہ ہیں کہ اس کے نکلتے ہی انسان میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے ایک فقیر کی تعریف کرتا ہے تو بادشاہوں کو ہیچ دکھا دیتا ہے اور اگر محبوب کی تعریف پر آتا ہے تو ایسی ایسی تشبیہات سے کام لیتا ہے کہ اگر اس کے بیان ہی کے موافق محبوب ہو تو انسان اس محبوب سے ڈر کر بھاگ جائیں۔ اگر کسی بادشاہ یا آقا کی تعریف کرتا ہے تو توبہ توبہ خدا کا ثانی بنا دیتا ہے۔ اس کے واسطے آسمان کے ستارے توڑ لانا چاند اور سورج کو اس کا غلام بنانا، آسمان کو اس ممدوح کا سجدہ کرانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اب دوسرے سینگ کی تعریف سنیے جس کا نام مغالطہ ہے اس سینگ کے نکلنے سے دماغ بالکل خراب ہو جاتا ہے یعنی فرعونیت سما جاتی ہے۔ ہمچو ما دیگرے نیست کا مادہ دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنے کو بہت قابل اور لاثانی تصور کرتا ہے۔ یہ وہم دماغ میں پختہ طور سے جم جاتا ہے کہ مجھ میں جو ہنر موجود ہے وہ دنیا میں کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اس کو ہر شخص بیوقوف اور بے دماغ نظر آتا ہے خود ستائی اس کا پیشہ ہو جاتا ہے۔ تیسرا سینگ جس کا نام عسرت ہے اس کا اثر بھی بہت مہلک ہوتا ہے جوں جوں شاعری میں انسان ترقی کرتا جاتا ہے اس منحوس سینگ کی نشوونما ہوتی ہے۔ انسان کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا ہمیشہ خستہ حالی کا گدھ سر پر منڈلاتا رہتا [illegible] اگر کبھی ہاتھ تنگ ہو گیا تو اس کو قناعت نہیں ہوتی اگر حسن اتفاق سے وہ شخص

مواخات

کانوں سے کہہ دو سن لیں دل سے کہو صدا دے — بھولے ہوئے فسانے مسلم کو پھر سنا دے
خاموشئ فضا کو وہ شوخئ نوا دے — مدت سے سو رہے ہیں جو اُنکو اب جگا دے

ہشیار دیکھتے ہیں خورشید کو نکلتے
بدمستِ خواب لیکن کروٹ نہیں بدلتے

اوروں کے کارواں تو منزل پہ کب کے پہنچے — شب ہو رہی گی لیکن مسلم کو قصد کرتے
رہبر کے منتظر ہیں، محتاج ہیں جرس کے — آتی نہیں حیا کچھ غیروں کے مُنہ کو تکتے

رہبر ہے ذوق اُن کا، دل اُن کا خود جرس ہے
احساس اُن کا لیکن معدوم ہر نفس ہے

جس مے سے تھے عرب میں مسرورِ کیفِ ہستی — ہندوستاں میں آکر زائل کی اُسکی مستی
رفعت سے ہوں نہ کیوں وہ آشنا غریقِ پستی — تقلید حسن کی خو ہو، شیوہ صنم پرستی

جس شمعِ دیں کے مسلم فانوس تھے ازل سے
یارانہ کر رہے ہیں اب بادِ مبتذل سے

اسلام کے فسانے بھولے ہوئے ہیں یکسر — عظمت کے آستانے بھولے ہوئے ہیں یکسر
اگلوں کے سب ترانے بھولے ہوئے ہیں یکسر — اجداد کے زمانے بھولے ہوئے ہیں یکسر

یہ نورِ عرشِ بالا یہ رونقِ جہاں تھے
اُن کی ہی یہ زمیں تھی، اُنکے ہی آسماں تھے

مجلسِ نقد و نظر

کتب

حیاتِ مومن

مسمّے بہ تاریخِ مومن

مؤلفہ
جناب ضمیر الدین احمد صاحب عرشؔ گیاوی

قیمت عہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ۔ مؤلف دُلہن گنج گیا

عرشؔ صاحب،

آپ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ گیا کو بجا ناز ہے کہ آپ یادگارِ مومنؔ و تسلیمؔ کہے جاتے ہیں۔ آپ کی تازہ تصنیف حیاتِ مومن نظر سے گذری۔ سیاہ جلد پر سنہری تحریر غور کرنے کی بات ہے۔ میں اس نفاست مذاق پر داد دیتا ہوں۔ شروع میں حضرت مومنؔ دہلوی کی تصویر بڑے موقع سے ہے۔ سچ ہے صوری تعارف کے بعد معنوی تعارف میں بڑا لطف آتا ہے۔ دیباچہ کی طرز ادا بھی کافی دلچسپ ہے۔ صفحہ ۵ سے ۱۲ تک "آغاز داستان" میں عجیب لطافت ہے۔ اُردو بیگم کی کہانی خود بیگم کی زبانی سنکر تو کچھ نہ پوچھئے کیا اثر ہوا۔ واقعات کی سچائی سے دل بے ساختہ بھر آیا۔ سکیئے حالاتِ مومنؔ کی فراہمی اور چھان بین میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئی ہونگی۔ کتاب تو صرف ۱۴۴ صفحات کی لکھی مگر عصر مومنؔ کی مکمل فضا پیش نظر کردی۔ حکیم الشعرا حکیم مومن خاں مرحوم کی سوانح عمری، صحیح روایات اور ان کے حوالے، معاصرین و شاگردانِ مومنؔ کے تذکرے اور اشعار ان سب باتوں نے جناب کی تحریر کی رنگین چھینٹوں سے ملکر جنّتستانِ مومنؔ کو سدابہار کردیا۔ غرض جس عرق ریزی اور جاں فشانی سے آپ نے دہلی کے ایک مایۂ ناز شاعر کی یادگار قائم کی وہ آپ کے ذوقِ سخن کی آئینہ داری کر رہی ہے۔ "حیاتِ مومن" کے اوراق میں ایک پڑھنے والا اپنے آپ کو مومنؔ کے حضور میں پاتا ہے۔ ان کے علمی اور اخلاقی ماحول کے علاوہ اُن کا شاعرانہ وقار اور تمام مشاغل زندگی آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔ غالبؔ کی زندگی میں بہت کم لوگ غالبؔ کی عظمت سے آشنا ہو سکے تھے۔ وفات کے بعد شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی نے تبصرہ لکھا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے "محاسنِ کلامِ غالبؔ" کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا۔ پڑھنے والوں نے پڑھا اور غالبؔ کے مرتبہ سے اس قدر واقف ہوئے کہ آج ہر ایک

رہنمائے صحت

مترجمہ
محمد اعظم صاحب

قیمت ۱۲
ملنے کا پتہ: نصیر الدین عثمان پورہ حیدرآباد دکن

اعظم صاحب،

آپ سے ملکر بڑی مسرت ہوئی۔ اُردو کی خدمت تو حیدرآباد میں رہکر فرض ہو جاتی
ہی ہے صرف اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ شہریار دکن کے ادب نواز حوصلے ہیں کہ
ملک کے نامور اہل قلم اور اُردو کے ماہرین ادب اطراف واکناف سے کھنچکر دکن میں
ہوئے ادب نوازیاں فرما رہے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ کے قلم کو جنبش نہ ہوتی۔ یہ ضرور ہے کہ جہاں لکھنے والوں
ز تحریر مختلف ہوتی ہے وہاں انتخابِ موضوع بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ آپ نے جس موضوع کو انتخاب کیا وہ نفع
ور مفید ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ہندوستان میں عموماً اردو داں طبقہ اس کو نظرانداز کرتا رہا ہے جس کی وجہ
اس کی اہمیت ہمیشہ پسِ پردہ رہی۔ "رہنمائے صحت" لکھکر آپ نے صحت کی قدر و قیمت کو عوام پر واضح کرنے کی
شش کی ہے اور ہندوستان کی ایک صائب الرائے اور معاملہ فہم ہستی مہاتما گاندھی کے ذاتی تجربات کو گجراتی زبان
اُردو میں منتقل کر دیا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اسکول کے طلباء کو زندگی کے اس اہم مسئلہ سے دلچسپی پیدا کرانے
صحیح اور باقاعدہ طریقے بہت کم اختیار کئے جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سنِ شعور کو پہنچکر اور زندگی
مشاغل میں اُلجھکر حفظِ صحت سے قطعی بے نیاز رہتے ہیں۔ "رہنمائے صحت" کے ۱۲۴ صفحات میں جو نو باب ہیں وہ
رات کی ضروریات پر مشتمل ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کی یہ تصنیف اسکول کے نصابِ تعلیم میں داخل کر لی جائے
کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ ہے۔ لڑکوں کو اس سے دلچسپی سی ہو جائیگی۔ دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کی [illegible]
پ کو اس کے دوسرے حصہ کی اشاعت پر مجبور کر دے۔ دوسری ملاقات کا متمنی ہوں۔ خدا حافظ

رسائل

مستانہ جوگی

ایڈیٹر صوفی لچھمن پرشاد
سالانہ ۔ روپے ممالک غیر سے ۔ نمونہ فی پرچہ ۔
ملنے کا پتہ: دفتر رسالہ مستانہ جوگی شاہی محلہ لاہور

صوفی جی،

نومبر میں آپ کے مستانہ جوگی سے ملاقات ہوئی۔ اپنے جوگی کی تو کچھ نہ پوچھ [illegible]
آنکھیں چار ہوتے ہی میں چلا اٹھا ع "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" [illegible]

دستکاری

اڈیٹر ڈاکٹر شفیع احمد حبیبی۔ ایچ ڈی۔
سالانہ چندہ [illegible] روپے
ملنے کا پتہ [illegible] دہلی

ڈاکٹر صاحب،

آپ کا رسالہ دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ سرورق سبز، کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت بھی غنیمت ہے۔ اس کا نام ہی عنوانات کا شارح ہے، اس کی توضیح کی ضرورت نہیں کہ اس کے ۴۸ صفحات میں کیا کیا ہوگا۔ ہر قسم کی صنعت و حرفت کے متعلق مفید مضامین ہیں اور مختلف اقسام کی چیزیں تیار کرنے کے نسخے ہیں۔ معاشی نقطۂ نظر سے یہ رسالہ ملک کے لئے سودمند ہے۔ اس کے مطالعہ سے آدمی ہر قسم کی دستکاری گھر بیٹھے سیکھ سکتا ہے۔ خدا کرے "دستکاری" کی اٹھارہ سال کی کوششیں برابر جاری ہیں اور ملک و قوم کو اس سے فائدہ پہنچتا رہے۔ خدا حافظ

اخبارات

پیام

اڈیٹر۔ ملا جان محمد صاحب
قیمت سالانہ چار روپے آٹھ آنے
ششماہی دو روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ [illegible]
ملنے کا پتہ۔ نمبر [illegible] راجندر [illegible] اسٹریٹ کلکتہ

جان محمد صاحب،

آپ اردو کے مجاہد ہیں۔ آپ نے بڑی ہمت کی کہ کلکتہ میں اشاعت اردو کی داغ بیل ڈالی۔ ایک ہفتہ وار مصور اخبار جاری کیا اور "پیام" اس کا نام رکھا۔ آپ کا "پیام" مجھ تک پہنچا، ابھی ابھی اسی کو دیکھ رہا ہوں۔ بڑا ستھرا اور رنگین ہے، لکھائی بھی اچھی چھپائی بھی اچھی۔ سب سے پہلے میں نے تصویریں دیکھیں۔ ایک دو کا کیا ذکر، ایک صفحہ پر چھ تصویریں تھیں۔ اگر آپ بھول گئے ہوں تو گن لیجئے۔ پہلی "مسجد عمر" دوسری "فلسطین میں یہودیوں کا محلہ" تیسری فلسطین کا ہائی کمشنر، چوتھی "فلسطین میں مسلمانوں کا محلہ" پانچویں "یہودی مسلمانوں کے خوف سے دروازوں پہ [illegible] مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں" اور چھٹی "فلسطین میں پولیس عربوں کو گرفتار کر رہی ہے"۔ ہاں یہ کہنا بھول گیا صفحہ پر نحاس پاشا مصری وفد پارٹی کے رئیس کی تنہا اور شاندار تصویر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملکی اور غیر ملکی خبریں بھی اس میں نظر آتی ہیں مگر جہاں تک میرا خیال ہے اسلامی دنیا کے واقعات ماضی اور حالات حاضرہ سے "پیام" کو روشناس کرانا آپ کا خاص مطمح نظر ہے۔ تفنن طبع کے لئے افسانوں کی گنجائش بھی نکال رکھی ہے۔ [illegible] جیسے غیر مانوس یا یوں کہئے نیم مانوس جوار میں اس قسم کے اخبار کی شدید ضرورت تھی۔ ہلال مرحوم کے بعد [illegible]